جنوری ۱۹۸۷ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلا

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

معاون مدیر اقتدار احمد

جلد ۳۶

شمارہ ۱

جنوری ۱۹۸۷ء

بمطابق

جمادی الاولیٰ ۱۴۰۷ھ

زر سالانہ ۵۰ روپے

فی شمارہ ۵/- روپے

مکتبہ تنظیم اسلامی ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴ فون ۸۵۲۶۸۳

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی: فون ۲۱۶۵۸۲

شخصیت کا یہ "انکشاف" جو نوائے وقت میں یوں ثانوی شہ سرخی بنا کہ "فسادات میں تخریبی عناصر کا ہاتھ ہے"۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے۔ ہمارے روائتی کردار حضرت لال بجھکڑ کی رُوح پھڑک اٹھی ہوگی جنہوں نے ایک چوری کی تفتیش کے خواہشمند لوگوں سے صد درجہ تیقن کے ساتھ کہا تھا کہ ــــ میں سمجھ گیا ہوں یہ کس کا کام ہے اور پھر گوش بر آواز سامعین کو بتایا "یہ حرکت یقیناً کسی چور ہی کی ہے"۔

اس خاکسار راقم کے ایک اعلیٰ تعلیمیافتہ دوست جو سیاسیاتِ عالم اور عمرانیات کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب محترم کو اکثر سنتے ہیں، اس مقالے کی اوّلین چند قسطیں پڑھ کر ہی متحیر اور مبہوت سے ہوگئے، بے ساختہ بولے کہ انہیں ہرگز اندازہ نہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب قرآن مجید کے متعلم و معلّم ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں کے تاریخی و عمرانی پس منظر کا اتنا گہرا مطالعہ اور موجودہ حالات کا اس قدر عمیق مشاہدہ بھی رکھتے ہیں، اس پر خاکسار کو یاد آیا کہ اسلام کے معاشی نظام کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب محترم کی تقریر سن کر زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کے اس وقت کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر غلام رسول صاحب بھی ایسے ہی تحیّر کا شکار ہوئے تھے۔ بعد میں انہوں نے اپنے اہتمام سے اس تقریر کو پمفلٹ کی شکل میں بڑے پیمانے پر مفت تقسیم کے لئے شائع کیا اور دیباچہ میں لکھا۔

"ڈاکٹر صاحب کے اس خطاب سے جہاں اسلام کی تعلیمات کے نئے گوشے سامنے آئے وہاں یہ امر سب حاضرین کے لئے حیرت کا باعث ہوا کہ ڈاکٹر صاحب معاشیات کے نہ تو کبھی طالب علم رہے تھے اور نہ ہی اس شعبہ سے کبھی متعلق۔ لیکن اپنی بصیرتِ باطنی کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب ایک بہت بڑے معیشت دان معلوم ہو رہے تھے۔"

گویا ؎ این سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

واقعہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالےٰ نے کسی اہلِ علم کو ذہانت و فطانت اور سلامتیٔ طبع کے ساتھ مقصد سے خلوص اور موضوع سے بے لوث وابستگی بھی عطا فرمائی ہو تو وہ کسی بھی میدان میں ٹھوکر نہیں کھاتا۔ ایک علیم و حکیم ذات قدم بقدم اس کی رہنمائی فرماتی ہے۔

حاشیہ کے ایک نوٹ میں ڈاکٹر صاحب نے سندھ کی زمینوں کے ہندو ساہوکاروں کے غاصبانہ قبضے میں رہ جانے میں قیام پاکستان سے متصلاً قبل خود سندھ کے مسلمان سیاستدانوں

اور وڈیروں کے کردار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ سارا قصہ گھوٹکی (سندھ) میں انہیں ایک بزرگ نے سنایا جن کی یادداشت میں سب واقعات تقریباً محفوظ تھے۔ اب رفیق محترم نجیب صدیقی صاحب (سکھر) نے جو اس وقت بھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تھے ایک بار ان صاحب سے مل کر واقعات کی ترتیب حاصل کی ہے۔ ان کا نام ماسٹر القادر رکھا ہے اور وہ ایک قدیم سندھی ہونے کے علاوہ علاقے کی ایک معروف سماجی و سیاسی شخصیت ہیں۔ ان کی روایت کا خلاصہ کچھ یوں ہے

—— ۱۹۳۶ء کے صوبائی انتخاب میں جو غیر جماعتی لیکن جداگانہ بنیاد پر ہوئے تھے سندھ میں مسلمانوں نے ساٹھ ۶۰ میں سے پینتیس ۳۵ نشستیں لے کر حکومت بنائی۔ پہلے وزیر اعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ تھے۔

—— مارچ ۱۹۳۸ء میں صوبائی اسمبلی کے ایجنڈے میں یہ چار بل تھے (۱) انتقالِ اراضی کا بل جس کی رو سے ہر اُس سندھی کو اپنی زمین واپس ملتی جو ۱۹۰۱ء میں مالک تھا لیکن بعد میں کسی بھی وجہ (بشمول رہن) سے محروم ہو گیا (۲) قرض بل جس کا منشا یہ تھا کہ تمام قرض (جو ظاہر ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے مسلمان زمینداروں پر تھے) بلا سود ہو جائیں گے اور بالاقساط واپس ہوں گے (۳) سُود بل یعنی ہر طرح کے سود کی منسوخی اور قرض کے صرف اصل زر کی واپسی اور (۴) شرعی بل جس کے ذریعے چیدہ چیدہ شرعی قوانین نافذ کئے جانے مقصود تھے۔

—— مارچ ۱۹۳۸ء تک تمام (یعنی پینتیس ۳۵) مسلمان ممبرانِ اسمبلی ایک حلف کے تحت متحد تھے چنانچہ ۱۹۳۸ء میں بجٹ بھی متفقہ طور پر پاس ہوا لیکن اس خاص اجلاس میں محرم اور ہولی کی تعطیلات کے باعث پانچ دنوں کا وقفہ ہو گیا۔

—— ان پانچ دنوں میں ہندوؤں نے مل جل کر سات مسلمان ارکانِ اسمبلی کو "توڑ" لیا۔ تین نام ماسٹر صاحب کو یاد نہیں (ریکارڈ میں بہرحال محفوظ ہوں گے) باقی چار "اسمائے گرامی" تھے: جناب جی ایم سید، پیرزادہ عبدالستار، پیر الٰہی بخش اور اللہ بخش سومرو۔

—— ۱۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو اجلاس وقفہ کے بعد دوبارہ شروع ہوا تو سر غلام حسین ہدایت اللہ کے خلاف تحریکِ عدم اعتماد سامنے آ گئی۔ سر غلام حسین نے انتظار کی درخواست کی تاکہ سات "غیر حاضر" مسلمان ارکانِ اسمبلی میں پہنچ جائیں لیکن

" وہ سات " نہ آنے تھے نہ آئے ، وہ طلائی زنجیروں میں جکڑے جا چکے تھے یا طلسم سامری کے اسیر ہو چکے تھے۔ چنانچہ سپیکر (بھوج سنگھ وکیل) نے شام تک بحث کے بعد جب رائے شماری کرائی تو ساٹھ کے ایوان میں پینتیس(۲۷) کی اکثریت اٹھائیس(۲۸) کی اقلیت میں تبدیل ہو چکی تھی۔

—— سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت ختم ہوئی اور " اُن سات " میں کے " ایک " اللہ بخش سومرو نئے وزیر اعلیٰ ہوئے اور اسی کے ساتھ اُن چار دل بلوں کی بساط لپیٹ گئی جو سندھی مسلمانوں کے لئے حیاتِ نو کی نوید جانفزا بنتے۔

میثاق کے صفحات میں گنجائش ہوئی تو انشاء اللہ اگلے ماہ نجیب صدیقی صاحب کا اصل خط شائع کر دیا جائے گا تاکہ دجل و دسیسہ کاری کی یہ داستان پوری تفصیل سے ریکارڈ پر آجائے۔

افکار و آراء کے سلسلے میں یہ شمارہ بہت سے قیمتی خطوط اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان میں سے تین خطوط کا تعلق ' مسئلہ سندھ ' سے ہے :

آئی اُئی کاکا صاحب کا خط چند روز پہلے تک بڑا ہی دُکھ بھرا لگتا تھا لیکن اب تو اُس سے کہیں زیادہ دردناک کہانیاں اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ ذرا تخیل کو مہمیز دیجیے اور سوچئے کہ کراچی کے چونتیس سال میں سرد ترین دن میں جن لوگوں کو گولیوں اور خنجروں کے زخم آئے اُن کی ٹیسیں کیسی ہوں گی۔ جن خواتین اور معصوم بچوں نے اپنے خاکستر گھروں کے باہر یخ بستہ شب بسر کی اس رات کے گھنٹے کتنے طویل ہوں گے۔ جو لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے وہ تو ان تمام مصائب و شدائد سے نجات پا گئے، ان کے لئے آگ میں کوئلہ ہو جانا یا سردی میں اکڑ جانا برابر تھا لیکن پس ماندگان پر کیا گذری ہوگی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ——

پر بھوت علی تالپور کا خط بہتوں کی آنکھیں کھولنے کی سعی (شاید، لاحاصل) ہے —— " مرونیسوں سندنہ ڈیسوں " کی تکرار اور اس کا مفہوم آپ انہی کی تحریر میں دیکھیے۔ ہمیں اس خط سے متعلق ایک ناگوار واقعہ کا ذکر کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ یہ خط لگ بھگ پانچ ماہ قبل روزنامہ جنگ کراچی کو موصول ہوا تھا لیکن اسے ۲۳ نومبر کو محض اتفاقاً ہمارے حوالے کرنے سے پہلے کھول کر دیکھا بھی نہ گیا۔ معلوم ہوا کہ امیر محترم کے گذشتہ سلسلہ مضامین

—

(استحکامِ پاکستان) پر بہت سے خطوط انہیں پہنچے تھے جو سب تغافل کا شکار ہوئے۔ ہم جہاں "جنگ" کے ممنونِ احسان ہیں کہ اُس نے ہماری آواز ایک وسیع حلقے میں پہنچانے کا کام قرینے سے انجام دیا وہاں اس تغافل پر شاکی بھی ہیں۔ نجانے کتنے بندگانِ خدا کے ذہن صاف کرنے کا موقع ہمیں مل جاتا اگر "جنگ" متعلقہ ڈاک ہم تک پہنچانے کے اہتمام میں بھی سلیقہ برت لیتا۔

حسن احمد صدیقی صاحب سندھ کے حالات کا تجزیہ ایک اور زاویے سے کرتے ہیں تاہم ہماری رائے یہ ہے کہ صدیقی صاحب کا مطالعہ خاصا ہی جزوی اور سطحی ہے۔

برِصغیر ہند و پاک بلکہ عالمِ اسلام کی بزرگ ترین بقیدِ حیات دینی شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مکتوبِ گرامی اگرچہ تعزیتی خطوط کے ذیل میں آتا ہے لیکن اس میں تعزیت کا ایک نیا اسلوب سامنے آیا۔ مولانا علی میاں (اللہ تعالیٰ اُمت پر ان کا سایہ تا دیر باقی رکھے) خود اسی نوع کی آزمائش یعنی نَقصٍ من الانفس کا مواجہہ کر چکے ہیں لہٰذا انہوں نے ہمارے دکھ کو جیسے محسوس کیا ویسے ہمارے دوسرے بزرگ اور احباب شائد ہی محسوس کر سکے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سانحے نے خود ان کے زخم کو ہرا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں بھی صبرِ جمیل کی توفیق عطا کئے رکھے اور تلافیٔ مافات کی کوئی شکل نکالے اور ہم پر بھی اس کرم کی ارزانی فرمائے۔ آمین۔ اگرچہ بہت دنوں سے مولانا نے بقلمِ خود خطوط نویسی کو اپنے معمولات سے خارج کر رکھا ہے لیکن دردِ مشترک کے باعث یہ خط از اوّل تا آخر بشمول مکتوب الیہ کا پتہ (بزبانِ انگریزی) مولانا کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ہم مولانا کے اس لطفِ خاص کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر بشیر بہادر چیمہ کا نام قارئینِ میثاق کی اکثریت کے لئے اجنبی نہیں۔ اُن کا کرب جس طرح ان کے مکتوب سے جھلک رہا ہے وہ دیدنی ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے المیوں کے شکار عمر کی آخری منزلوں سے گذرتے بزرگ ہر جگہ آس پاس موجود ہیں۔ یاد ش بخیر لاہور میں تنظیمِ اسلامی کے ایک محترم اور سالخوردہ رفیق جن کے تین بیٹے دیارِ غیر میں جا بسے ہیں جبکہ چوتھا اور آخری اگرچہ ابھی تعلیم کے وسطی مرحلے میں ہے تاہم وہ بھی پرواز کے لئے پر پھیلائے رہتا ہے، ایک بار خاکسار کے قریب بیٹھے امیرِ محترم سے سورۃ المدثر کا درس سُن رہے تھے، جب وَبَنِينَ شُهُودًا

کا مقام آیا اور اس کی شرح ڈاکٹر صاحب نے بیان کی تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھالر لٹک آئی تھی ۔ پھر جب کچھ لوگ کسی بھی جذبہ کے تحت وطن مراجعت کی ٹھان لیں تو اُن پر یہاں جو بیتی ہے اس میں بھی خیریت کا کوئی پہلو نہیں ۔ ایک کھلا راز ہے کہ انہیں اپنے بستر بوریے طرح کھولنے سے پہلے ہی ایسی لاینحل مشکلات کا سامنا ہوتا ہے کہ عافیت واپسی میں ہی نظر آتی ہے ۔

"اردو ڈائجسٹ" کے شکریے کے ساتھ اس کے شمارۂ دسمبر ۸۶ء میں شائع شدہ ایک تحریر کا عکس بھی اس دفعہ 'میثاق' کا حصہ ہے ۔ اسے پڑھنا شروع کیا تو نظر کو آنسوؤں نے دھندلا دیا ۔ (چنانچہ حاضرین مجلس میں سے ایک صاحب کو پڑھنے کی زحمت دی) اس خاکسار راقم کے دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلی کہ رب کریم اُسے واقعتاً ایسا بنا بھی دے جیسا کہ وہ محترم مضمون نگار کو نظر آیا ۔ جن بزرگوں اور عزیزوں کے چہروں کو اس تحریر میں روشن قرار دیا گیا ہے ان کی ضیا ریاشیوں کو اللہ تعالیٰ اور بڑھائے ۔ اپنا جو حال ہے وہ عرض کر ہی دیا ۔

آخر میں ایک لطیفہ بھی ہو ہی جائے ۔ ایک صاحب کا یہ ادّعا لاہور کے کثیر الاشاعت اخبار میں شائع ہوا کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اُن سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہو گئے ہیں ۔ وغیرہ ۔ خبر کا انداز خاصا "سنسنی خیز" تھا چنانچہ اس کی تردید اخبارات کو بھیجی گئی جسے بدقسمتی سے وہ نمایاں جگہ نہ ملی جو اصل (خبر) کو دی گئی تھی چنانچہ اُسے یہاں نقل کیا جا رہا ہے تاکہ رفقائے تنظیم اسلامی اور دیگر احباب جو مجسّم سوال ہیں ان کی تشفی کا سامان ہو سکے ۔

"امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ میں اصولاً بیعتِ سلوک و ارشاد کا قائل ہوں لیکن عملاً میں نے کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی ۔ روزنامہ 'جنگ' لاہور میں قائد آباد کے نامہ نگار کے حوالے سے شائع شدہ ایک خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ایسی خبریں تراشنا جن سے معاشرے کے مختلف طبقوں میں غلط فہمیاں پیدا ہوں کسی طرح بھی مناسب نہیں ۔ بلا تصدیق ہر طرح کی خبروں کو چھاپ دینا صحت مند صحافت کی علامت نہیں ہے ۔ میں اسی شہر میں رہتا ہوں اور میرے پاس ٹیلیفون کی سہولت بھی موجود ہے ۔ اگر اس خبر کی اشاعت سے پہلے مجھ سے تصدیق کر لی جاتی تو وہ سب لوگ جو میری ذات اور فکر سے دلچسپی

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

سندھ کا مسئلہ اور قارئین

ہم سندھ کے مسئلہ سے متعلق قارئین کے خطوط میں سے تین منتخب خطوط پیش کر رہے ہیں جن کے ذریعے سندھ میں موجود مختلف طرزِ فکر کے حامل تین طبقات کی نمائندگی ہو جاتی ہے۔ ان خطوط کا کسی قدر تعارف "عرضِ احوال" میں بھی شامل ہے

(۱)

جناب محترم ڈاکٹر اسرار احمد قبلہ صاحب

السلام علیکم: یہاں پر خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں۔ آپ کا سلسلۂ مضمون "سندھ کی صورتِ حال" کی تیسری قسط تک بہت غور سے پڑھی پہلی قسط پڑھتے وقت اتنا متوجہ نہیں ہوا تھا دوسری تیسری قسط پڑھنے کے بعد تو اچانک چوکنا ہو گیا ہوں، کاش ہمارے حزبِ اقتدار کو کچھ سمجھ آ جائے اور وہ سندھ کے موڈ کو سمجھے آپ نے ابتک جو کچھ لکھا ہے اور آئندہ لکھنے کا موڈ ہے وہ صحیح اور درست ہے اور ہوگا میری طرف سے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں آپ کا عقیدہ اور میرا عقیدہ تو مختلف ہو سکتے ہیں مگر ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم اور آپ ایک ہیں اور ہونا بھی چاہیئے۔ میں آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ آپ جس طرح سندھ کی صورتِ حال کا جائزہ پیش کر رہے ہیں اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیے اس وقت میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ آپ سندھ اور سندھیوں پر احسان کر رہے ہیں اور ہمیں ۴۲ سال پرانا نعرہ یاد دلا رہے ہیں جو ہمارے جرنیل ہوش محمد شیدی نے لگایا تھا وہ نعرہ انگریز کے خلاف تھا کہ (مر ویسوں سندھ نہ ڈیسوں) جیسا کہ وہ نعرہ ایک غیر مسلم کے خلاف اور غاصب کے خلاف تھا کسی مسلمان کے خلاف نہیں تھا مگر اب یہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ سندھ پر پھر فتح کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور سندھیوں کو وہی نعرہ یاد دلایا جا رہا ہے کہ (مر ویسوں سندھ نہ ڈیسوں) کیا حالیہ حکومت انگریزوں کی طرح ہماری سندھ پر حکومت کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ آپ کیا ہیں یہ مجھے پتہ نہیں۔ عالم ہیں۔ مدبر ہیں۔ صحافی ہیں سندھی ہیں۔ پنجابی ہیں یا کچھ اور ہیں مگر اس وقت

ہمارے ترجمان اور سندھ کے وکیل ہیں اس کے ساتھ میں روزنامہ جنگ کراچی کا شکرگزار ہوں ، جنہوں نے آپ کا مضمون شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اُمید ہے آپ کا جاری مضمون پایۂ تکمیل کو پہنچے گا جو کہ موجودہ حکومت کے لئے ایک سبق ہے اُمید ہے موجودہ حکومت اس پر سنجیدگی سے غور کرے گی اور سندھیوں کے حقوق ان کو دلائے گی بلکہ واپس کرے گی اس وقت فوج واپس سندھ میں پہنچ گئی ہے پتہ نہیں کیا فتح کرنے آئی ہے اگر وہ سندھ کو فتح کرنے آئی ہے تو وہ اس کی بھول ہے اگر ہراساں کرنے آئی ہے تو وہ بھی اس کی بھول ہے سندھیوں کو وہ نعرہ یاد ہے بھی یاد ہے کہ (مر ویسوں سندھ نہ ڈیسوں) اور شاہ عبداللطیف کا وہ حکم بھی یاد ہے۔

سوڈہ مریں سوپ کی متہ دل جاوھو وسار
ھٹ پالاوڑہ پاکریں آڈیے دال مر دار
متابیع ترا رمارتہ متاروتیئن - شاہ

جناب عالی سندھ ایک اپنی خاص تاریخ رکھتی ہے یہ بزرگوں کی سرزمین ہے۔ یہ راجا ڈاہر یہ محمد بن قاسم - سمون - سومرہ - علہوڑا - تالپور قوم کی حکمرانی میں رہی ہے۔ کسی مغل افغان یا غلجی وغیرہ کے قبضہ میں نہیں رہی اس کی اپنی ایک الگ حیثیت ہے ایک قبضہ ہماری سندھ پر انگریزوں نے کیا دوسرا قبضہ ہم پر پاکستان بننے کے بعد ہوا ہے دوسرا قبضہ تو ہم نے مصلحتاً برداشت کیا کہ چلو مسلمان ہیں مگر انہوں نے تو ہمارے روزگار، تجارت، زمین ہر چیز ہم سے چھین لی ہماری ثقافت پر ڈاکہ ڈالا عریانی، فحاشی، ملاوٹ - چور بازاری چرس، آفیم، شراب، ہیروئن کے تحفے ہم کو دیئے - ڈاکٹر صاحب بتایئے ہم نے کون سا گناہ کیا ہے - آپ کو میں دعوت دیتا ہوں ہمارے دیہاتوں میں چلیئے وہاں آپ کو اتنی سادگی نظر آئے گی کہ آپ حیران ہو جائیں ہمارے بوڑھے بزرگ تو دیسی گھی لسی مکھن اور سبزیوں کے علاوہ کوئی چیز پسند ہی نہیں کرتے پھر ہمیں ہیروئن ، چرس کیوں دی جا رہی ہے ؟ ہماری زمینیں پنجابی فوجیوں کو کیوں دی گئی ہیں - آخر میں میں آپ سے ملاقات کا بہت شوق رکھتا ہوں اُمید ہے آپ اپنا پتہ اور ملاقات کا ٹائم اوپر دی ہوئی ایڈریس پر بھیج دیں گے۔

جناب عالی : اس وقت سندھ کی صورتحال پیار محبت سے جیو اور جینے دو کے اصول پر قابو میں آ سکتی ہے مگر محبت کے بغیر اور سختی سے کچل دیں گے کے اصول پر عمل

کرنے سے اور قابو سے باہر ہو جائے گی۔

آپ کو یاد ہوگا کہ سندھو دیش کا نعرہ ۱۹۷۲ء میں جی ایم سید نے لگایا تھا اب اسی طرح کے کئی نعرے اور لگ رہے ہیں وہ کیوں لگ رہے ہیں ان کی وجہ کیا ہے اس کو کسی نے نہیں جاننا چاہا صرف یہ کہا کہ لگایا کیوں ان کی زبان کھینچ دو۔ ان کے ہاتھ توڑ دیئے جائیں گے کچل دیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ امید ہے آپ نے جو بیڑا اٹھایا ہے اس کو تکمیل تک پہنچائیں گے۔ آپ کا خیر اندیش

میر ہوت علی تالپور خیر پور میرس

(۲)

مکرمی و محترمی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب۔

السلام علیکم۔ مزاج گرامی۔

روزنامہ جنگ میں آپ کے سابقہ اور حالیہ سلسلہ ہائے مضامین پیشِ نظر ہیں۔ آپ کے جذبہ اور خلوص پر شک نہیں لیکن میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ آپ نے سندھ کا حقیقی مسئلہ اور اس کا حل پیش نہیں کیا۔ سندھ کی حقیقی صورتحال کچھ یوں ہے کہ تقسیمِ ہند کے وقت سندھ کی ۴۵ لاکھ آبادی میں ۳۳ فی صد ہندو تھے۔ ہندوؤں کی اکثریت شہروں میں آباد تھی لیکن انتقالِ آبادی کے نتیجے میں سندھ کے تمام شہر جو پہلے ہندو شہر تھے، مہاجر شہر بن گئے۔ کراچی کی جس ۴ لاکھ آبادی میں ۸۰ فیصد ہندو تھے ۱۹۴۷ء کے بعد بڑھ کر ۸ لاکھ ہو گئی اور اسی طرح حیدر آباد کی ایک لاکھ آبادی جس میں ۸۰ فیصد ہندو تھے بڑھ کر تین لاکھ ہو گئی۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ ہندو سندھی ان ہی کی زبان یعنی سندھی بولتا تھا۔ مہاجر اُردو بولتے ہیں۔ ان مہاجرین نے کراچی، حیدر آباد اور دیگر شہروں میں کارخانے اور تجارتی مرکز قائم کیے اور ان اداروں سے نہ صرف اپنا معاشی مسئلہ حل کیا بلکہ دیگر لوگوں کو بھی ذریعہ معاش فراہم کیا۔ آج صرف کراچی جس کی آبادی ۷۰ لاکھ ہے پنجاب اور سرحد اور دیگر علاقوں کے تقریباً ۲۵ لاکھ افراد ہیں۔

سندھ میں کیونکہ سندھی ہندو اپنے ساتھ سندھ کا کوئی حصہ نہیں لے گیا اس لیے سندھ میں ہندوستان کے اقلیتی صوبوں کے مسلمان مہاجر آئے جو سندھی کے بجائے اردو یا کوئی دوسری زبان بولتے ہیں اس لیے یہاں لسانی مسئلہ ہے اور سندھی اور مہاجر کی تفریق بھی

ہے جو پہلے ہندو اور مسلمان کی تفریق تھی۔ چونکہ مہاجر ہندوؤں کی تعداد سے زیادہ آگئے اس لیے یہ تفریق اور بھی واضح ہوگئی۔ اس کے باوجود میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کوئی سندھی خواہ وہ کسی چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں ہی کیوں نہ رہتا ہو ایسا نہیں جو اُردو نہ سمجھتا یا بولتا ہو جبکہ پنجاب میں ذریعہ تعلیم شروع سے ہی بلکہ پاکستان بننے سے پہلے سے ہی اُردو تھا۔ اس کے باوجود اُردو سندھ میں پنجاب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ پنجابی لکھتا تو اُردو میں ہے لیکن بولتا پنجابی میں ہے خواہ وہ کتنا ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہی کیوں نہ ہو۔ پنجاب میں کیونکہ ہندو اور سکھ پنجاب کا حصہ بھی اپنی آبادی کے حساب سے لے گئے اور ان کی جگہ مشرقی پنجاب کے مسلمان مہاجر آئے جن کی زبان پنجابی تھی اس لیے وہاں لسانی مسئلہ پیدا نہیں ہوا حالانکہ وہاں بھی تفریق ہے۔ مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے پنجابی مہاجر جو آکر لاہور میں آباد ہوئے وہ اپنے کو راولپنڈی کا کہتے ہیں اور جو راولپنڈی میں جا کر آباد ہوئے وہ خود کو لاہور کا بتلاتے ہیں۔ یہ اسی تعصب کی وجہ سے ہے جو مقامی پنجابی مہاجروں سے رکھتے ہیں خواہ وہ مشرقی پنجاب کے ہی کیوں نہ ہوں۔

سندھ میں موجودہ خلش ایک فطری بات ہے سندھیوں کو مہاجروں سے کوئی پُرخاش نہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ ہندو سندھی کی جگہ آئے ہیں اور انہیں کی جگہ جن شہروں میں ہندو آباد تھے یہ آباد ہوگئے۔ کراچی اور حیدرآباد وغیرہ میں کیونکہ آبادی کا تناسب فوراً ہی بدل گیا اس لیے مہاجروں کو سندھیوں میں ضم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ ان شہروں میں کیونکہ مقامی سندھی مسلمان آٹے میں نمک کے برابر ہیں اس لیے وہ مہاجروں میں ضم ہوگئے۔ اسی طرح ان چھوٹی جگہوں پر جہاں مہاجر برائے نام ہیں وہ بھی سندھیوں میں ضم ہوگئے۔

سندھیوں کو پنجاب اور دیگر صوبوں کے لوگوں کے اس وسیع پیمانے پر نقلِ مکانی پر تشویش ہے اور اب تو سندھیوں کی طرح مہاجر بھی پریشان ہیں کیونکہ روزگار کے مسائل تشویشناک حد تک بڑھ گئے ہیں۔ صرف کراچی میں پنجاب اور سرحد کے ۲۰ سے ۲۵ لاکھ تک افراد آباد ہیں۔ سندھ کے اندر بھی وسیع پیمانے پر پنجابی آباد ہوگئے ہیں۔ اس سے مسائل پیدا ہوگئے ہیں اس کا ECONOMIC FACTOR تو ہے لیکن اس سے SOCIAL PROBLEMS بھی پیدا ہوگئے ہیں۔ سندھی ہو یا مہاجر دونوں کے لیے روزگار کی دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں۔ کوٹہ سسٹم کی وجہ سے ۵۶٪ روزگار کے مواقع سندھ میں یا کراچی میں وفاقی ملازمتوں میں آکر پنجابی لے جاتے ہیں اور یہ دونوں دیکھتے رہ جاتے ہیں جبکہ پنجاب میں کوئی سندھی یا مہاجر اپنا کوٹہ حاصل کرنے نہیں جاتا۔ کم از کم گریڈ ایک سے پندرہ تک

کی اسامیاں صرف مقامی لوگوں سے پُر کرنی چاہئیں۔ کوٹہ سسٹم سکیل سولہ اور اس سے اُوپر کی اسامیوں کے لیے ہونا چاہیئے۔ یہ دوسرا سوال ہے کہ سندھی یا مہاجر پنجاب یا دوسری جگہ چھوٹی ملازمتیں حاصل کرنے کیوں نہیں جاتے۔ شاید یہ اسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ ہر مرکزی کارپوریشن کا ہیڈ آفس اسلام آباد اُٹھا کر لے جایا جاتا ہے کہ اس طرح کراچی کے لوگ ملازمتیں چھوڑ دیں گے یا اگر اسلام آباد وغیرہ گئے بھی تو کراچی واپس جانے کی فکر کریں گے یہی وجہ ہے کہ ہر بنک کا ہیڈ آفس بھی اسلام آباد منتقل کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے کہ جو کچھ باقی رہ جاتے ہیں انہیں بھی اسی طرح دھکا دے دیا جائے۔ ایوب خان نے اپنی مہاجر دشمنی اور پنجاب کو نوازنے کی وجہ سے دارالخلافہ بھی اسلام آباد منتقل کر دیا تھا۔ حالانکہ اس وقت مشرقی پاکستان کے تمام محبِ وطن لیڈروں نے اس کی مخالفت کی تھی اور سہروردی نے کہا تھا کہ اسے بذریعہ ریل لے جایا گیا ہے اگر بذریعہ ہوائی جہاز واپس نہ لایا گیا تو ملک کو یکجا رکھنا مشکل کیا ناممکن ہوگا۔ قائد اعظم کے طے شدہ دارالخلافہ کو بھی صرف نوکریوں کی خاطر تبدیل کر کے ملک کو دولخت کر دیا گیا اور اب بھی جب تک اسلام آباد موجود ہے ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔

ملازمتوں اور روزگار کے علاوہ سیاسی مسائل بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ صوبہ سرحد کے لوگ قبائلی طرز پر رہتے ہیں۔ سمگلروں کی اکثریت جو چرس وغیرہ اسمگل کرتی ہے وہ انہی لوگوں پر مشتمل ہے۔ اب بعض علاقے تو ان کی CONSTITUENCY بن گئے ہیں۔ جہاں سے وہ اپنے ممبران قومی و صوبائی اسمبلی اور مقامی نمائندے بھی چُن لیتے ہیں۔ اسی طرح آزاد علاقے بھی قائم کر لیے ہیں۔ مہاجر اور سندھی دونوں اِس صورتِ حال سے نہ صرف پریشان بلکہ بد دل بھی ہو گئے ہیں۔ مہاجر قومی موومنٹ کے جلوس پر حملہ ایک سازش کے تحت کر کے ان کا رُخ اپنے مسائل سے ہٹا کر فروعی معاملات میں اُلجھانا ہے۔ مہاجر یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ یہاں پولیس، مرکزی و صوبائی محکموں اور PUBLIC SECTOR انڈسٹریز میں دوسری جگہ کے لوگ کیوں اس طرح بھرتی کر لیے گئے ہیں جنہیں یہاں کے لوگوں سے کوئی ہمدردی تو درکنار بلکہ وہ تو خود یہ کہتے ہیں کہ ہم تو یہاں مال کمانے آئے ہیں۔ یہ صورتِ حال کسی دوسری جگہ موجود نہیں۔ فوج اور دیگر اداروں کا بھی یہی حال ہے۔ PIA تو پنجاب ایرلائنز کہلانے لگی ہے۔ اس وجہ سے یہاں کے مقامی تعلیم یافتہ طبقہ میں خواہ وہ مہاجر ہو یا اندرون سندھ رہنے والا سندھی مایوسی کا ہونا فطری بات ہے اور موجودہ صورتِ حال اس کا ردِ عمل ہے۔

مسئلہ کا حل

سندھ کی سطح تک اس کا حل یہ ہے کہ کیونکہ سندھ دو لسانی صوبہ ہے اور واضح تفریق ہے جو پاکستان بننے سے پہلے ہندو اور مسلمان

سندھی کی شکل میں تھی اور اب مہاجر اور سندھی کی شکل میں ہے اس لیے اسے دو انتظامی حصوں (REGIONS) میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک کا صدر مقام کراچی۔ جس میں کراچی اور حیدر آباد شامل ہوں۔ اور دوسرے کا صدر مقام سکھر جس میں سکھر اور لاڑکانہ شامل ہوں۔ یعنی ایک علاقہ کراچی سے ٹنڈو آدم تک اور دوسرا ٹنڈو آدم سے ماچھی گوٹھ تک۔ جس کا صدر مقام سکھر ہو جو سندھ کے پرانے دارالخلافے کے قریب ہے سکھر کو اس طرح ترقی دی جائے کہ وہ ہر طرح ایک شایان شان دارالخلافہ بن سکے۔ کوشش کی جائے کہ اس ریجن میں سندھی زیادہ سے زیادہ آباد ہوں تاکہ زبان اور کلچر کا مسئلہ نہ ہو۔ مرکزی اور صوبائی ملازمتوں میں اور PUBLIC SECTOR INDUSTRIES میں صرف اسی علاقہ کے لوگوں کو رکھا جائے۔

ہندوستان نے بھی اپنے لسانی اور علاقائی مسائل کا حل اسی طرح کیا ہے اور آج مشرقی پنجاب کو ۳ حصوں میں تقسیم کرنے سے یہ فائدہ ہوا کہ سکھوں کی شورش صرف ایک حصے تک محدود ہے۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی اسی طرح کی انتظامی تقسیم کی گئی جس کے مثبت نتائج نکلے۔ پاکستان کو بھی اپنے انتظامی حالات اور دیگر مسائل کو حل کرنے کے لیے صوبوں کی از سر نو موجودہ حالات میں ترتیب دینا چاہیئے۔ تاکہ نہ صرف انتظامی حالات بہتر ہو سکیں بلکہ سیاسی مسائل کو بھی حل کیا جا سکے۔

یونیورسٹیوں کا شہر سے باہر لے جانا اور ہوسٹلوں کا قیام طلبہ میں جرائم اور شورش کا باعث ہے۔ خاص طور پر سندھ یونیورسٹی جب سے شہر سے باہر بنائی گئی ہے وہ تعلیم گاہ کے بجائے غنڈہ گردی اور بدنظمی کا مرکز بن گئی ہے۔ میرے خیال میں موجودہ جگہ سندھ یونیورسٹی کو تبدیل کر کے ایک اقامتی درسگاہ (RESIDENTIAL UNIVERSITY) بنائی جائے جہاں حقیقی طلباء کو اقامتی درسگاہ میں تعلیم دی جائے۔ اس میں ملک کے تمام علاقوں کے لوگوں کو داخلہ دیا جا سکتا ہے اور اس کا خرچ اور انتظام مرکزی حکومت کرے۔ اس طرح ملک کو علی گڑھ کے طرز پر پہلی اقامتی درسگاہ بھی مل جائے گی۔ اور موجودہ گڑ بڑ سے بھی نجات ہو جائے گی۔ حیدر آباد کی ضروریات کے لیے سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں ایک نئی یونیورسٹی بنائی جائے جو حیدر آباد کے طلباء کی تعلیمی ضروریات کو پوری کرے۔ اسی طرح سکھر میں ایک نئی یونیورسٹی بنائی جائے جو شہر میں ہو اور وہاں کی ضروریات پوری کر سکے۔ طلباء میں ڈسپلن پیدا کرنے کے لیے انہیں لازمی فوجی تربیت بھی دی جائے تاکہ وہ بہتر شہری بن سکیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر فوری طور پر مثبت اقدام نہ اٹھائے گئے تو ہمارے دشمن اس سے پورا فائدہ اٹھائیں گے۔ پیشتر اس کے کہ ہمارے دشمن ہماری کوتاہیوں سے سیاسی فائدے حاصل کر پائیں، ہمیں اپنے معاملات بہتر اور معقول طور پر حل کر لینا چاہئیں۔

مرسلہ : حسن احمد صدیقی، کراچی

(۳)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ　　جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

اُمید ہے کہ آپ کی طبیعت اچھی ہوگی دُعا گو ہوں کہ اللہ تعالےٰ آپ کو صحت یاب رکھے (آمین)
میں دیر سے تعزیت کر رہا ہوں دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے دونوں عزیزوں کو جو اللہ کے سپاہی
تھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے' دونوں کے گناہوں کو معاف فرما دے اور اُن کے درجات
کو بلند فرما دے (آمین)

دیر سے تعزیت کی وجہ کراچی کے نسلی فسادات ہیں ۔ توحید کالونی میں پٹھانوں نے
روسی ہتھیاروں سے حملہ کیا اسمیں میرا گھر بھی تباہ ہوگیا ۔ میرا پڑوسی ڈنڈا لے کر نکلا ۔
اُس کی ہمت کا جواب نہیں ۔ مگر گولیوں نے اس کو موت کی آغوش میں پہنچا دیا ۔ چار
لڑکے ہیں سب سے بڑے لڑکے کی عمر ۵ سال کی ہے ۔ اس نے مجھکو دیکھتے ہوئے دور
سے کہا "نانا ابو نہیں آئے" "ابو نہیں آئے" میں آگیا ہوں بیٹا میں نے گود میں اٹھا کر
پیار کیا ۔ تین دنوں سے زمین پر سونے کی وجہ سے بخار اور کھانسی بھی ہوگئی ہے بڑی
مشکل سے انٹی بیوٹک دوائے کرآیا ہوں ۔ رات جب سب سو گئے تو میں اپنے گھر کی طرف
غور سے دیکھتا رہا ۔ بڑی مشکل سے بنا تھا ۔ کراچی میں مزدور کی زندگی ایک سخت ترین
زندگی ہوتی ہے ۔ مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے بار بار گھر نہیں بنا سکتے ابھی میں
خیالوں کی دُنیا میں گم تھا کہ یکایک آواز آئی "بیٹا" گھر پر آنسو بہا رہے ہو پلٹ کر
دیکھا تو ایک بڑی بی تھیں ۔ بولیں یہاں تو پوری زندگی قربانیوں میں ختم ہو رہی ہے ۔
ہندوستان میں ایک اُمید پر قربانی دی تھی' پھر بنگال میں مال وجان کی قربانی دینی پڑی'
اتنی قربانیوں کے باوجود سکون حاصل نہ ہوا ۔ میرا نواسہ اور پوتا دونوں گولیوں کا شکار ہو
گئے ۔ پتہ نہیں اللہ تعالےٰ کو کیا منظور ہے میرے سامنے سارا خاندان ایک ایک کر کے
اسلام اور پاکستان پر قربان ہوگیا مگر . . . میں رہ گئی ہوں صرف ماتم کرنے کیلئے ۔
اب تو آنکھوں میں آنسوں تک نہیں ۔ "بیٹا تمہارا صرف گھر قربان ہوگیا ہے" ۔ یہاں تو ہر
دور میں قربانی دینی پڑی ' پاکستان یوں تو اسلام کے لئے بنا تھا مگر اسلام تو خیر قیامت
کے بعد ہی آئے گا ابھی تو پاکستان قربانیوں کا قبرستان ہے ۔ بڑی بی اتنا کہہ کر لاٹھی ٹیکتی
ٹیکتی گزر گئیں ۔ میں کچھ بھی جواب نہ دے سکا ۔

تاریخ اسلام اور احادیث میں مہاجر اور انصار کی داستان بیان ہوئی ہے ڈاکٹر صاحب صرف سنانے کے لئے ہمارے اصحاب ایسے تھے اور ایسے تھے مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو سب کچھ احادیث اور تاریخ اسلام کے خلاف نظر آتا ہے نسلی امتیازات اسی کے سلسلے کی ایک کڑی ہیں ۔

اور یہ نسلی فسادات بھی ۔ ایک طرف چار قوموں کے درمیاں مہاجر جو ہندوستان کے مختلف شہروں سے آتے ہیں ۴۰ سال بعد بھی مہاجر کہلاتے ہیں ۔

ایک طرف عربوں کو دیکھتے ہیں کہ عرب قومیت کے ہوتے ہوئے بھی انہوں نے مہاجر فلسطینیوں کو اپنایا نہیں ۔ کبھی یہودیوں نے قتل عام کرتے ہیں ، کبھی عیسائیوں موت کے گھاٹ اتارتے ہیں اور آج شیعہ عمل ملیشیا پوری طرح صفایا کر رہی ہے ۔ ایک ہی زبان ایک ہی تہذیب وتمدن ایک ہی خطہ مگر عرب میں بھی عربی مہاجر کو سکون نہیں ملا ۔

یہاں تو بہت مشکل ہے زبان اردو نہیں تہذیب وتمدن ہندوستانی نہیں ، نسل بھی علیحدہ ہے ۔ ہاں ! ایک صرف ہندوستانی اسلام ہے ۔ جس کی بنا پر دونوں میں اتحاد ہو سکتا ہے ۔ مگر بریلوی ، دیوبندی ، اہل حدیث اور شیعہ کی تقسیم جو دنیا کے کسی اور مقام پر نہیں وہ ہندوستانی اسلام کا لازمی حصّہ ہے ۔

وہ اسلام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا اب نہیں ہے ۔ نماز ہی کو لیجئے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز آج دُنیائے اسلام میں کہیں نہیں ہے ۔ ۲۳ سال تک نماز ادا کرتے رہے پھر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے نہیں ۔ ہاں ! حج جو اپنی زندگی میں صرف ایک بار کیا ۔ وہ موجود ہے اپنی اصلی حالت میں ہندوستانی اسلام میں بھی کوئی انصاف نہیں ہے ۔

اجھاب اجازت دیجئے ۔ والسلام آئی آئی ۔ کا کا سائٹ کراچی ۔

بقیہ : 'عرض احوال'

رکھتے ہیں پریشانی میں مبتلا نہ ہوتے ۔ انہوں نے کہا کہ اسلام تو انفرادی سطح پر بھی ہر سنی سنائی بات کو بلا تصدیق آگے بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتا چہ جائیکہ اخبار جیسے مؤثر ذریعۂ ابلاغ کے ذریعے یہ کام کیا جائے انہوں نے صحافی برادری سے اپیل کی کہ وہ اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں ۔ اگر اس دنیا میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے تو مرنے کے بعد تو بہر حال ہر شخص کو اپنے ہر قول اور فعل کا حساب دینا ہے ۔"

ضمیمہ
استحکام پاکستان
سندھ کا مسئلہ
جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے، عقل، فطرت سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں
اکبر
اسرار احمد

تمہید
قدیم سندھی مسلمانوں
کی عمومی بے چینی
کے عناصرِ ثلاثہ
مہاجرین کا ردِّ عمل
جنرل محمدؐ ضیاء الحق کا دورِ حکومت
اور موجودہ صورتِ حال

تمہید

فلسفۂ وجود (جس کی ایک تعبیر ہمہ اوست ہے، دوسری وحدت الوجود اور تیسری وحدت الشہود)
کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں کی جانب حضرت اکبر الٰہ آبادی نے اپنے ایک فلسفیانہ اور عارفانہ شعر
میں یوں اشارہ کیا ہے کہ ؎

"جہاں ہستی ہوئی محدود، لاکھوں پیچ پڑتے ہیں — عقیدے، عقل، فطرت سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں"

تو واقعہ یہ ہے کہ دولت خداداد پاکستان کے صوبۂ سندھ کی سرزمین اس وقت قسم قسم کے تصادم
رنگا رنگ شکایتوں اور طرح طرح کی محرومیوں کے احساس کی بناء پر اس شعر کے مصرع ثانی کی
منہ بولتی تصویر بن گئی ہے — اس لئے کہ اوّل تو نسلوں اور زبانوں اور ان پر مبنی 'قومیتوں' کی
جتنی بڑی کھچڑی سندھ میں تیار ہوئی ہے ایسا معجون مرکب کم از کم پاکستان کے کسی اور حصے میں
موجود نہیں ہے — پھر کراچی میں صنعت و تجارت کے ارتقاء اور ارتکاز اور انتہائی برق رفتاری
سے بڑھنے والی آبادی نے جن پیچیدہ مسائل کو جنم دیا ہے ان کی شدت کی بھی کوئی دوسری مثال
پاکستان کے کسی دوسرے مقام یا علاقے میں نظر نہیں آتی — بنابریں اس وقت سندھ کا کوئی
ایک سادہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ بے شمار مسائل کا ایک طویل اور پیچیدہ سلسلہ ہے، اور یہاں کسی
ایک ہی طبقے میں احساس محرومی نہیں پایا جاتا بلکہ مختلف گروہوں اور طبقوں میں مختلف قسم کی
محرومیوں کا احساس موجود ہے، اور ان کی بناء پر پیدا ہونے والے گلے شکوے بلکہ ان سے بھی
بڑھ کر نفرتیں اور عداوتیں باہم اتنی گڈمڈ ہو گئی ہیں کہ بسا اوقات انسان کو خود بھی معلوم نہیں
ہوتا کہ کسی خاص موقع پر درہ کونسے احساس محرومی کے باعث ردّعمل کا شکار ہو رہا ہے اور
اس کی نفرت و عداوت اور غیظ و غضب کا اصل سبب کون ہے اور ان کا اظہار وہ کس کے
خلاف کر رہا ہے — چنانچہ اسی مرکب اور پیچ در پیچ احساس محرومی کے باعث سندھ میں
وقتاً فوقتاً آتش فشاں کے پھٹنے کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے دوران اچھے بھلے
انسان ہسٹیریا کی سی کیفیت میں مبتلا نظر آتے ہیں!

دوسری طرف، جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، سندھ اس وقت نہ صرف

پاکستان بلکہ اس پورے علاقے میں خود اسلام کے مستقبل کے ضمن میں جسم کے نازک حصے (SOFT UNDER-BELLY) کی حیثیت اختیار کر چکا ہے ـــــ لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس کے مسائل کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے اور امکانی حد تک معروضی اور غیر جانبدارانہ انداز میں جائزہ لیا جائے کہ سندھ کے مختلف طبقات کو کیا کیا شکایتیں ہیں، اور کون کون سے اندیشے لاحق ہیں، مزید یہ کہ ان کا کتنا حصہ حقیقی اور واقعی ہے، کتنا اضافہ انسان کی اس طبعی کمزوری کا مظہر ہے کہ ع " بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لئے!" اور کتنا ملک و ملت کے دشمنوں کی ریشہ کاری اور "ایجاد بندہ" کا نتیجہ ہے جس کی نہ کوئی اصل ہے نہ اساس! ـــــ پھر غور کرنا چاہیئے کہ حقیقی اور واقعی شکایات کے مستقل ازالے کی صورت کیا ہے اور فوری طور پر ان کی شدت میں کمی پیدا کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔

اس طرح کیا عجب کہ سندھ کے مسائل کا یہ تجزیاتی مطالعہ پورے پاکستان کے مسائل کی پہچان کا ذریعہ بن جائے اور ع "روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب" کے مصداق اس وقت سندھ جس بحرانی کیفیت سے دوچار ہے اور جس اضطراب اور کرب میں مبتلا ہے کیا عجب کہ وہ کسی نئے عہدِ سعادت کی ولادت کے درد کی لہریں (BIRTH PANGS) ثابت ہوں اور اللہ تعالٰے شر سے خیر برآمد فرما دے، اس لئے کہ اسی کی شان یہ ہے کہ:

" يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا " (سورہ روم: آیت ۱۹)

"وہ نکالتا ہے مُردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مُردہ کو اور زندہ کر دیتا ہے زمین کو اس کے مُردہ ہو جانے کے بعد"

لہٰذا اس کی قدرت سے کچھ بعید نہیں ہے اگرچہ بقول علامہ اقبال ع "رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں!"

اس تجزیے میں چونکہ مختلف طبقات کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا ذکر بھی لامحالہ آئے گا، لہٰذا اندیشہ ہے کہ ع " اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش!" کے مصداق راقم کے خلاف سب ہی کی جانب سے برہمی اور خفگی کا اظہار ہو، اس لئے کہ فی زمانہ ہر شخص اور ہر گروہ سارا الزام دوسروں ہی پر ڈال دینے کا عادی ہو چکا ہے اور کوئی بھی خود اپنے دامن کے داغ اور دھبے

دیکھنے پر آمادہ نہیں ہوتا ــــ چنانچہ حال ہی میں راقم کو اس کا ایک تلخ تجربہ ہو بھی چکا ہے کہ خود احتسابی ــ (SELF CRITICISM) کی ایک خدا ہی دعوت پر ایک گروہ اس درجہ ناراض ہوا کہ اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین سے قطع نظر کہ اُن میں تو ظاہر ہے کہ تہذیب و شائستگی کا دامن ہاتھ سے بالکلیہ چھوڑ دینا ممکن نہیں ہوتا نجی خطوط میں غلیظ گالیوں تک کی نوبت آگئی ــــ لیکن راقم الحروف کے پیش نظر الحمد للہ کہ حسب ذیل قرآنی ہدایات ہیں:

"وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ" (سورۂ انعام: آیت ۱۵۲)

ترجمہ "اور جب بھی بات کرو انصاف ہی کی کرو خواہ کوئی تمہارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو!"

"كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ"

(سورۂ نساء: آیت ۱۳۵)

ترجمہ "عدل و انصاف کے علمبردار اور اللہ کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ خواہ وہ خود تمہارے اپنے یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں ہی کے خلاف ہو!"

"كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ"

(سورۂ مائدہ: آیت ۸)

ترجمہ "اللہ کے علمبردار اور عدل و انصاف کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں ناانصافی پر آمادہ نہ کرے۔ (ہر حال میں) انصاف کرو، یہی تقویٰ کے شایان شان ہے!"

لہٰذا اس تجزیے میں راقم الحروف اپنے امکان بھر تو حق و انصاف ہی کی بات کرنے کی کوشش کرے گا ــــ تاہم معاذ اللہ اس کا ہرگز مدعی نہیں ہے کہ اس کی ہر رائے حرف آخر ہے اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص معاملے میں اس کے مشاہدات محدود اور معلومات ناقص ہوں۔ یا نتیجہ اخذ کرنے میں غلطی ہو جائے۔ لہٰذا کسی بھی جانب سے ایسی کسی بھی نشاندہی پر راقم ان شاء اللہ العزیز ممنون و مشکور بھی ہوگا اور اس پر کھلے دل و دماغ کے ساتھ غور کرنے کی کوشش بھی کرے گا۔ اس لئے کہ راقم کے نزدیک ملک و ملت کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ قومی و ملی مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور بھی کیا جائے اور اپنی آراء کا بلاجھجک اظہار بھی کیا جائے اور پھر دوسروں کی آراء پر بھی کھلے دل

کے ساتھ غور کیا جائے۔ اللہ تعالےٰ ہم سب کو حق کہنے، حق سننے، حق کو پہچاننے اور حق کو قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے: اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ۔ اٰمین!

قدیم سندھی مسلمانوں کی عمومی بے چینی

کے عناصرِ ثلاثہ

ذرا بنظرِ غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ سندھ کے دوسرے طبقوں اور گروہوں جیسے اردو بولنے والے مہاجروں، پنجابی آبادکاروں اور پٹھان محنت کاروں کے گوناگوں مسائل سے قطعِ نظر، خود قدیم سندھیوں کا احساسِ محرومی بھی کوئی سادہ اور بسیط شے نہیں ہے بلکہ بہت سی مختلف النوع محرومیوں اور بے چینیوں کا معجونِ مرکب ہے جو کئی تہوں اور متعدد سطحوں پر مشتمل ہے ــــ چنانچہ اس کی سب سے زیریں سطح پر تو وہ بے چینی اور اضطراب پایا جاتا ہے جس کے اسباب کسی ایک صوبے یا علاقے تک محدود نہیں ہیں بلکہ ملک گیر ہیں، اگرچہ ان کے نتائج اور اثرات کو بعض ثانوی اسباب کی بنا پر محسوس سب سے بڑھ کر سندھ میں کیا گیا ہے۔ پھر اس کے اوپر کئی اضافی سطحیں ہیں جن کا تعلق سندھ کے خاص حالات سے ہے اور جنہوں نے صورتِ حال کو بے حد پیچیدہ اور سنگین بنا دیا ہے۔

۱۔ ملک گیر سیاسی محرومی اور معاشی استحصال

سندھ کی عمومی بے چینی اور عوامی اضطراب کا سب سے گہرا اور بنیادی سبب وہ ظالمانہ اور استحصالی سیاسی و معاشی نظام ہے جو پورے ملک پر مسلّط ہے اور جس کے نتیجے میں پوری پاکستانی قوم شدید قسم کی افقی تقسیم اور محاذ آرائی (HORIZONTAL POLARISATION) کا شکار ہوگئی ہے۔ چنانچہ ظالم و مظلوم، قاہر و مقہور اور جابر و مجبور کی تقسیم بھی نمایاں نظر آتی ہے اور

'مستکبرین' (ARISTOCRATES) اور 'مستضعفین' (OPRESSED) کے علاوہ
'مستحصلین' (EXPLOITERS) اور 'مستحصلین' (EXPLOITED) کے مستقل
طبقات بھی وجود میں آچکے ہیں۔ چنانچہ اس کا رد عمل بھی کم و بیش تو پورے ملک اور اس کے
چاروں صوبوں میں موجود ہے۔ لیکن بوجوہ اس کی شدت اور تلخی سب سے زیادہ صوبہ سندھ میں
محسوس کی جارہی ہے۔

اس کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ اولاً ـــــــ خود سلطنت مغلیہ کی اساس ازمنۂ وسطیٰ
کے اس ظالمانہ جاگیرداری نظام پر قائم تھی جو پوری دنیا میں صدیوں سے رائج چلا آرہا تھا۔ پھر
جب وہ کمزور پڑ گئی اور برعظیم پاک و ہند کے طول و عرض میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا تو
"جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا قدیم قانون مزید گھناؤنی صورت میں نافذ ہو گیا اور ہر جگہ جتھے داروں
اور قبائلی سرداروں نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کرلیں ـــــ اس کے بعد انگریز کا دور آیا تو اس
نے کمال حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی نظام کو اپنے جبر و استحصال کا ذریعہ اور آلہ بنا لیا۔
اور اپنے اور مقامی جاگیرداروں اور وڈیروں کے مابین رابطے کے لئے ایک مضبوط اور مستحکم
سول سروس قائم کی جو اکثر و بیشتر ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو رنگ اور شکل و صورت کے اعتبار سے
تو ہندوستانی تھے لیکن ذہن و فکر اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے خالص انگریز بن گئے تھے

بعد ازاں جب ملک آزاد ہوا تو بھارت میں تو حکومت ایک ایسی سیاسی جماعت کے
ہاتھ میں آئی جس کے پاس مخلص کارکنوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی اور ایسے لیڈروں
کی بھی کمی نہ تھی جو ایک طویل عوامی جدوجہد کے دوران ایثار اور قربانی کی شاندار مثالیں اور
اپنے خلوص و اخلاص کے بے شمار ثبوت پیش کر چکے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس
کی تنظیم کا ڈھانچہ دیہات اور قصبات سے لے کر کل ہند سطح تک قائم تھا۔ اور اس کے
کارکنوں کی صفیں بھی مرتب و منظم تھیں اور عہدوں اور منصبوں کا نظام بھی معین و مستحکم
تھا ـــ مزید برآں اس جماعت نے حکومت ہاتھ میں لیتے ہی دیسی ریاستوں کا بھی خاتمہ
کر دیا اور سابق برٹش انڈیا میں قائم جاگیرداری اور زمینداری نظام کو بھی ختم کر دیا ـــــ نتیجۃً وہاں
کم از کم سیاسی آزادی براہ راست عوام تک پہنچ گئی اور حکومت بنانے یا بدلنے کا اختیار بالکلیہ

اُن ہی کے ہاتھوں میں آگیا۔

اس کے برعکس ــــ پاکستان بھی اگرچہ قائم تو عوامی جدّوجہد اور عوامی رائے (VOTE) کے نتیجے میں ہوا تھا لیکن چونکہ مسلم لیگ کی حیثیت اصلاً ایک تحریک (MOVEMENT) کی تھی نہ کہ جماعت (PARTY) کی، اور جیسا کہ تحریکوں کا خاصہ ہے اُس کی کُل جدّوجہد ایک شخص یعنی قائداعظم محمد علی جناح کی 'معجزانہ' اور کرشماتی شخصیت (دیکھیے "استحکام پاکستان" کا باب ہفتم) کی مرہونِ منّت تھی اور بدقسمتی سے اُن کا انتقال قیامِ پاکستان کے تقریباً فوراً ہی بعد ہوگیا ــــ لہٰذا یہاں آزادی کے ثمرات اور حکومت کے اختیارات کسی مضبوط اور مستحکم سیاسی جماعت کی وساطت سے عوام تک پہنچے ہی نہیں پائے بلکہ انہیں نوابوں اور جاگیرداروں میروں اور پیروں، اور زمینداروں اور وڈیروں نے بیچ ہی میں اُچک لیا ــــ لیکن پھر چونکہ خود ان کے مابین نہ کسی سیاسی نظریئے اور فلسفے کا رشتہ موجود تھا، نہ باہمی معاملے کے کوئی اصول طے تھے، نہ افہام وتفہیم کے کوئی خطوط ہی معیّن تھے، لہٰذا ان کی باہمی بندر بانٹ اور چھینا جھپٹی سے وہ افراتفری پیدا ہوئی کہ الاماں والحفیظ!! ــــ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر سول سروس نے خوب پرپرزے نکالے اور بیوروکریسی نے اپنے اختیارات کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے حکومت کی باگ ڈور خود سنبھال لی ــــ اور اس کے بھی کچھ ہی دن بعد قوت ہی برحق ہے (MIGHT IS RIGHT) کا اصول مزید عریاں انداز میں سامنے آیا اور زمامِ اقتدار قوم کے سب سے طاقت ور اور منظّم ادارے یعنی فوج نے سنبھال لی۔ گویا ؎

"وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا   تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو!"

یعنی جب حکومت کا اختیار اس کے اصل حقداروں یعنی عوام سے چھیننا ہی ٹھہرا تو پھر یہ سول سروس کے نرم و نازک ہاتھوں میں کیوں رہے؟ اور کیوں نہ فوج کے تندرست و توانا ہاتھ اس کے مالک بن جائیں؟!

وہ دن اور آج کا دن، پاکستان میں اصل قوت و اقتدار تو فوج کے ہاتھ میں ہے اور اس کے مستقل نائب و مددگار اور وزیر و مشیر کی حیثیت سول سروس کو حاصل ہے۔ البتہ گاہے گاہے فوجی حکمران وقتی مصالح

کے تحت اور بالخصوص عوام کے تیور بدلتے دیکھ کر عارضی طور پر زمینداروں اور وڈیروں کو بھی اقتدار و اختیار میں کسی قدر حصہ دار بنا لیتے ہیں اور اس طرح "بحالی جمہوریت" کا ڈھونگ رچاتے رہتے ہیں ۔۔۔!!!

چنانچہ مختلف ادوار میں حکومت کی ظاہری شکل و صورت بھی کسی قدر بدلتی رہتی ہے اور اصل کے متذکرہ بالا اجزائے ترکیبی کی باہمی نسبت و تناسب میں بھی کچھ فرق واقع ہوتا رہتا ہے ۔ لیکن بہر صورت اصل "دولتِ اقتدار" بالکل " دُوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ " کی سی شان کے ساتھ ان تین طبقوں ہی کے مابین گردش کرتی رہتی ہے ۔ (سورۃ حشر: آیت ۷: "تاکہ نہ رہے وہ گردش میں تمہارے امراء ہی کے مابین!") اور ظاہر ہے کہ یہ صورت حال کم از کم بیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جبکہ عرصہ ہوا کہ علامہ اقبال کے بقول ابلیس لعین نے بھی عوامی بیداری کے پیشِ نظر ملوکیتِ مطلقہ کو عوامی جمہوریت کا لباس پہنا دیا ہے ؎

"ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس — جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خودنگر!"

چنانچہ پوری پاکستانی قوم کے تحت الشعور میں ایک بے چینی اور احساسِ محرومی سرایت کیے ہوئے ہے اگرچہ بعض اسباب کی بنا پر، جن کا ذکر ابھی ہوگا، اس کا احساس و شعور سب سے بڑھ کر سندھ کے قدیم باسیوں کو ہوا!

فوج، سول سروس اور "خداوندانِ زمین"[1] (LAND LORDS) کے ساتھ ساتھ "سرمایہ داروں" کا ایک چوتھا طبقہ بھی پاکستان میں نہایت تیزی کے ساتھ پروان چڑھا جس نے سیاسی جبر و استبداد اور معاشی استحصال کا "بالاخانہ" تعمیر کیا اور اس طرح متذکرہ بالا افقی تقسیم اور محاذ آرائی کو مزید گہرا اور نمایاں کر دیا ۔۔۔ اس طبقے کے بارے میں یہ اہم حقیقت لائقِ توجہ ہے کہ چند قدیم کاروباری خاندانوں اور تجارت پیشہ برادریوں کے سوا، جیسے گجرات کے میمن، بمبئی کے خوجے اور بوہرے، دہلی اور یوپی کی "پنجابی سوداگر برادری" اور پنجاب کی قدیم شیخ برادریاں، پاکستان کے "نو دولتیے" طبقے کی عظیم اکثریت اسی "اتحادِ ثلاثہ" کی کوکھ سے برآمد ہوئی ہے اور اسی کی جائز و ناجائز سرپرستی سے پروان بھی چڑھی ہے ۔۔۔ چنانچہ ایک

---

[1] ؎ "دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں — تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں!" اقبال

طرف پاکستان کے اکثر و بیشتر بڑے زمیں دار اب بڑے کارخانہ دار بھی بن گئے ہیں اور دوسری طرف فوجی جرنیلوں کی اکثریت بھی نہ صرف یہ کہ فرداً فرداً بھی زمیندار اور کارخانہ دار بن گئی ہے، حالانکہ ان کی غالب اکثریت نے انگریزی فوج کے حوالداروں اور صوبیداروں یا ادنیٰ اور متوسط طبقے کے سول ملازمین کے گھروں میں آنکھ کھولی تھی، بلکہ 'فوجی فاؤنڈیشن' کو اب غالباً ملک کے سب سے بڑے صنعتی ادارے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے ـــــ رہی سول سروس تو وہ بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے میں کسی سے پیچھے نہیں رہی، اگرچہ اس کی اکثریت نے صرف جائدادوں اور سرکاری تمسکات اور صنعتی حصص کی صورت میں 'سرمایہ کاری' ہی پر قناعت اور اکتفا کی ہے!

الغرض، یہ ہے اُس سیاسی و معاشی ناانصافی اور عمومی ظلم و استحصال اور اس سے پیدا شدہ احساسِ محرومی کا پس منظر، جو اگرچہ فی نفسہٖ تو ملک گیر ہے لیکن اس کا ردِّ عمل پاکستان کے مختلف علاقوں میں کم و بیش شدّت کے ساتھ ظاہر ہوا ہے ـــــ تو آئیے کہ اب ایک نظر عمومی ظلم و استحصال کے خلاف ردِّ عمل کی شدّت کی اس کمی اور بیشی کے اسباب پر ڈال لیں۔

اس ملک گیر سیاسی ظلم اور معاشی استحصال کے شعور و احساس اور ان کے خلاف ردِّ عمل کے ظہور کے ضمن میں ایک فرق تو یہ ہے کہ اس کی شدّت پاکستان کے شمالی صوبوں یعنی پنجاب اور سرحد کے مقابلے میں جنوبی صوبوں یعنی سندھ اور بلوچستان میں نمایاں طور پر زیادہ نظر آتی ہے ـــــ اور دوسرا فرق یہ ہے کہ جنوبی صوبوں میں سے بلوچستان میں اس کا ظہور مختلف انداز سے ہوا اور سندھ میں مختلف صورت میں!

ان میں سے مقدم الذکر فرق و تفاوت کی ایک وجہ قدیم تاریخ سے متعلق ہے اور اس کا ایک دوسرا سبب ماضی قریب کی تاریخ کے ایک اہم واقعہ سے تعلق رکھتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ پنجاب اور سرحد اور بالخصوص ان کے وسطی علاقے قدیم زمانے سے حملہ آوروں اور فاتحوں کی گذرگاہ رہے ہیں ـــــ چنانچہ اس علاقے میں کوئی اہم اور قابلِ ذکر مقامی حکومت کبھی زیادہ دیر قائم نہیں رہ

سکی ، یہی وجہ ہے کہ تین صدی قبل کے راجہ پورس کے بعد پھر انیسویں صدی عیسوی کے مہاراجہ رنجیت سنگھ ہی کا نام ملتا ہے ! علاوہ ازیں ، اس علاقے میں کوئی مضبوط مقامی نیشنلزم بھی جڑیں نہیں پکڑ سکا بلکہ اس کے برعکس یہاں کے لوگوں میں "گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز ــ کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں" کے مصداق نت نئے فاتحین کے ساتھ معاملہ کرنے اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ سازگاری اختیار کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم پیدا ہو گئی ـــ چنانچہ سکھوں کے عروج و زوال کی تاریخ کے یہ دو نکتے بہت قابلِ توجہ ہیں کہ ایک طرف مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سیاسی عروج کا آغاز ہی ابدالی کی توپوں کو دریا پار کرا دینے کی 'خدمت' کے معاوضے کا مرہونِ منت ہے ـــ اور دوسری طرف اس کے باوجود کہ انگریزوں نے حکومت سکھوں سے چھینی تھی ، سکھوں کو فوراً ہی انگریز کے ساتھ سازگاری اختیار کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی ـــ حتّیٰ کہ انہوں نے انگریز کی فوج میں بھرتی ہو کر "کارہائے نمایاں" سرانجام دینے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی !

اس کے برعکس سندھ اور بلوچستان تاریخ کے دوران زیادہ تر الگ تھلگ رہے اور وہاں بیرونی فاتحین کا عمل دخل بہت کم رہا۔ نتیجتہً وہاں مقامی نیشنلزم کی جڑیں بھی خوب گہری ہوئیں اور تہذیبی و ثقافتی روایات بھی پختگی کے ساتھ قائم ہوئیں ـــ مزید برآں وہاں کے لوگ مقامی سرداروں اور حکمرانوں کی تو بدترین غلامی کو بھی برداشت کرنے کے عادی بنے اس لئے کہ یہ مقامی سردار اور حکمران سہ "خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر۔ پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری" کے مصداق اپنے مقاصد اور مفادات کے لئے مقامی نیشنلزم کو بھی استعمال کرتے رہے ہیں ـــ لیکن یہ واقعہ ہے کہ سندھیوں اور بلوچوں میں بیرونی فاتحین اور بدیسی حکمرانوں کے ساتھ سازگاری کی صلاحیت پیدا نہیں ہو سکی بلکہ ان کے دلوں میں ایسی حکومتوں کے خلاف ہمیشہ نفرت اور بغاوت کے جذبات موجود رہے !

اس طویل تاریخی پس منظر پر مستزاد ماضیٔ قریب کی تاریخ کا وہ اہم واقعہ جس نے پاکستان کے شمالی اور جنوبی حصّوں کے لوگوں ، خصوصاً پنجابیوں اور سندھیوں کے مابین موجودہ ذہنی و نفسیاتی بُعد پیدا کرنے میں سب سے مؤثر حصّہ ادا کیا ہے ، یہ ہے کہ اگرچہ اس پورے

علاقے میں انگریزی راج تقریباً ایک ہی وقت شروع ہوا، یعنی انیسویں صدی کے وسط کے لگ بھگ ـــــ لیکن اس وقت تک سندھ اور بلوچستان دونوں آزاد تھے ـــــ چنانچہ سندھ میں تالپوروں کی باضابطہ حکومت قائم تھی اور بلوچستان میں خان آف قلات کی سربراہی میں قبائلی نظام قائم تھا، گویا انگریز نے حکومت براہِ راست مسلمانوں سے چھینی؛ لہٰذا سندھیوں اور بلوچوں میں انگریز کی جبری غلامی کے باوجود انگریزوں سے نفرت و عداوت ہی نہیں باضابطہ بغاوت کے جذبات مسلسل موجود رہے ـــــ جبکہ انگریز کی آمد سے قبل پنجاب پر سکھا شاہی، مسلط تھی جو محض غلامی ہی نہیں ظلم و ستم اور قہر و عذاب کی بدترین صورت تھی ـــــ لہٰذا یہاں انگریز گویا مسلمانوں کا محسن اور نجات دہندہ بن کر آیا اور اس نے پنجابی مسلمانوں کو توہین و تذلیل، لوٹ مار، اور بدترین جبر و استبداد کے پنجے سے چھڑا کر ایک قانونی اور رفاہی حکومت کا تحفہ دیا ـــــ نتیجۃً یہاں کے مسلمانوں میں انگریز دشمنی کی بجائے "هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ" کے عین مطابق انگریزوں کی خیر خواہی اور وفاداری کے جذبات پیدا ہوئے۔ اگرچہ انگریزوں نے اپنی روایتی چال بازی اور عیاری سے کام لیتے ہوئے اس کا بہت ناجائز فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ اولاً پنجابی مسلمانوں کی مدد سے ہندوستان میں اپنے استعمار کو مستحکم کیا اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران دارالسلطنت دہلی جو ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اُن ہی کی مدد سے دوبارہ فتح کیا ـــــ اور پھر بیسویں صدی کے آغاز میں پہلی جنگِ عظیم کے دوران پنجابی مسلمانوں کا ستا خون خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے لیے استعمال کیا ـــــ واضح رہے کہ سکھوں کی براہِ راست عملداری میں پنجاب کے ساتھ ساتھ صوبہ سرحد کے بعض علاقے تو مستقلاً شامل تھے اور باقی اکثر حصے کی حیثیت بھی ان کے باج گذار کی سی تھی، یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے ضمن میں متذکرہ بالا نفسیاتی کیفیت پنجاب کے ساتھ ساتھ سرحد کے بھی بہت سے علاقوں کے لوگوں میں پیدا ہوئی اور انگریزی فوج میں پنجابی مسلمانوں کے شانہ بشانہ سرحد کے بعض علاقوں بالخصوص مردان، پشاور اور کوہاٹ کے اضلاع کے لوگ بھی شریک ہوئے!

ان دو اہم وجوہات کی بنا پر پاکستان میں قائم ہونے والے جابرانہ اور استحصالی نظام کے

خلاف "جسے "دیسی نوآبادیاتی نظام" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے" پنجاب اور سرحد کے لوگوں میں تو کوئی خاص ردِ عمل پیدا نہیں ہوا لیکن سندھ اور بلوچستان میں شدید ردِ عمل رونما ہوا خصوصاً اس لئے کہ، جیسے کہ ابھی وضاحت کی جائے گی، اس "دیسی امپیریلزم" میں پنجاب کی بالادستی کا عنصر بھی شامل ہو گیا جو سندھ اور بلوچستان کے مقامی نیشنلزم کی نگاہ میں بہرحال "بدیسی" تھا۔

سندھ اور بلوچستان میں اس ردِ عمل کے ظہور کی مختلف صورتوں کا سبب یہ ہے کہ چونکہ بلوچستان میں از منۂ قدیم کا قبائلی نظام پوری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ قائم تھا، چنانچہ وہاں یا تو مالک مطلق اور مختارِ کل قبائلی سردار تھے یا ایسے جاہل و غافل عوام جو ہر اعتبار سے "کالانعام" تھے اور کوئی درمیانی طبقہ سرے سے موجود ہی نہیں تھا لہٰذا وہاں ردِ عمل وقتاً فوقتاً قبائلی شورش اور بغاوت کی صورت میں تو ظاہر ہوا لیکن اس نے کسی مستقل عوامی تحریک کی صورت اختیار نہیں کی ـــــ جبکہ سندھ میں اس کے برعکس ایک مضبوط مڈل کلاس بھی موجود تھی اور تعلیمیافتہ طبقہ بھی لہٰذا وہاں اس ردِ عمل نے ایک مسلسل سلگنے والی آگ کی صورت اختیار کر لی جو اگرچہ فوری طور پر تو ظاہر نہیں ہوتی لیکن اندر ہی اندر بڑھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے!

افسوس کہ اس صورتِ حال کی جانب نہ پاکستان کے بہی خواہوں نے توجہ دی نہ اسلام کے علمبرداروں نے۔ بلکہ پاکستان اور پاکستانی قومیت کے نام لیوا سیاسی زعماء تو اختیارات اور مفادات کی بندربانٹ اور چھینا جھپٹی ہی میں مصروف رہے ـــــ رہے دین کے علمبردار تو ان میں سے قدیم مزاج کے بزرگوں کی اکثریت تو ماحول سے بالکل لاتعلق رہتے ہوئے صرف قال اللہ اور قال الرسولؐ میں منہمک رہی، ایک عظیم مذہبی تحریک صرف عبادات اور اتباعِ سنّت کی تلقین کرتی رہی، بعض فرقہ پرست لوگ اسلام کے نام کو اپنی سیاسی مہم جوئی کے لئے استعمال کرتے رہے اور بعض بظاہر وسیع النظر اور جدید مسائل سے واقفیت رکھنے والے لوگ بھی عمرانیات کے مختلف گوشوں بالخصوص اقتصادیات اور معاشیات کے ضمن میں اسلام کی ان تعبیرات سے آگے نہ بڑھ سکے جو دورِ ملوکیت میں مرتب ہوئی تھیں ـــــ مزید برآں انہوں نے "اقامتِ دین" ایسے بلند و بالا نصب العین کے لئے انقلابی کے بجائے سیاسی طریق کار اور انتخابی سیاست کا راستہ اختیار کر کے اپنے آپ کو کم از کم ظاہری طور پر ان لوگوں سے

کے "مشابہ" بنالیا جو سیاسی میدان میں اسلام کا نعرہ محض اپنی مطلب برآری کے لئے لگاتے ہیں ـــ بہرحال ان سب باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ سندھ اور بلوچستان کے "غیر مطمئن عناصر" علامہ اقبال کے الفاظ میں "حاضر و موجود سے بیزار" عناصر کو ظلم و استحصال کے اسباب کی توجیہہ و تشخیص مارکس کے نظریات میں، اور اس کا مداوا اور ازالہ، اور عدل و انصاف کے قیام کی واحد صورت اشتراکی نظام میں نظر آئی ـــ اور سندھ اور بلوچستان کی نوجوان تعلیم یافتہ نسل کا فیصلہ کن رجحان مارکس ازم اور کمیونزم کی جانب ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ بلوچستان میں اُس کا ظہور "بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن" (B.S.O.) کی صورت میں ہوا ـــ اور سندھ میں اس نے اچانک "سندھ عوامی تحریک" (S.A.T.) کی صورت میں منظرِ عام پر آکر عوام ہی نہیں، سیاسی مبصرین اور تجزیہ نگاروں تک کو حیران و ششدر کر دیا۔

الغرض، یہ ہے سندھ کی عمومی بے چینی اور احساس محرومی کی سب سے زیریں اور تحتانی سطح جو بعض ثانوی عوامل کے زیادہ نمایاں ہونے کے باعث نظر آتی ہے لیکن ہے سب سے بڑھ کر اہم اور سب سے زیادہ طاقت ور ـــ اور اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا علاج نہ مارشل لاء میں ہے، نہ طاقت کے استعمال میں، اس لئے کہ ایسے معاملات میں طاقت کا استعمال تو "بڑھتا ہے ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے بعد!" کے مصداق اُلٹے نتائج پیدا کرتا ہے! ـــ اسی طرح اس کا مداوا نہ کفر کے فتوے جاری کرنے سے ہو سکتا ہے، نہ پاکستانی قومیت کی دہائی دینے سے اور نہ ہی مذہبی اور قومی تقریبات پر پانی کی طرح پیسہ بہانے سے ـــ بلکہ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اسلام کے نظامِ عدل و قسط کو بالفعل قائم کیا جائے جس کے نتیجے میں نہ سماجی سطح پر کوئی امتیاز (DISCRIMINATION) باقی رہے، نہ سیاسی سطح پر جبر و استبداد (REPRESSION) اور نہ معاشی سطح پر ظلم و استحصال (EXPLOITATION)! بلکہ معاشرتی سطح پر گہری اسلامی اخوت اور کامل سماجی مساوات کا دور دورہ ہو اور سیاسی سطح پر اسلامی حریت اور دستوری و قانونی برابری کا نظام قائم ہو بقول اقبال:

؎ کُلُّ مُؤمِنٍ اِخْوَۃٌ اندر دلش ۔۔۔ حُریت سرمایۂ آب و گلش
ناشکیبِ امتیازات آمدہ ۔۔۔ در نہادِ او مساوات آمدہ!!

اور اس کے ساتھ ساتھ معاشی میدان میں ملکیت کی بجائے امانت کا تصور محسوس و مشہود ہو اور کفالت عامہ کا اصول اور حصولِ رزق کے ذرائع اور ترقی کے مواقع کے ضمن میں کامل برابری بالفعل موجود ہو، بقول سعدیؒ

؎ این امانت چند روزہ نزد ماست — درحقیقت مالکِ ہر شئے خداست

اور بقول اقبالؒ

؎ رزقِ خود را از زمیں بُردن رَواست — ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خداست

اور ؎ کس نہ باشد در جہاں محتاجِ کس — نکتۂ شرعِ مبین این است و بس!

اور چونکہ یہ جملہ مقاصد ایک ہمہ گیر اور کُلّی اسلامی انقلاب کے بغیر حاصل نہیں کئے جا سکتے لہٰذا نہ صرف صوبۂ سندھ بلکہ پورے پاکستان کے اصل اور بنیادی مسئلے کا واحد حل ـــــ اسلامی انقلاب ہے جو پیشِ نظر کتاب کا اصل موضوع ہے!

---

۲ پنجاب سے شدید نفرت

سندھ کے پیچ دَر پیچ مسئلے کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ قدیم سندھی آبادی اور خاص طور پر اُس کی نوجوان نسل میں پنجاب اور اہلِ پنجاب سے شدید نفرت کے جذبات پیدا ہو چکے ہیں، اور نفرت چونکہ نفرت ہی کو جنم دے سکتی ہے لہٰذا رفتہ رفتہ صورت باہمی بغض و عداوت کی بن رہی ہے اور اس صورتِ حال میں بلاشبہ پاکستان کی سالمیت کے لئے سب سے اہم خطرہ مضمر ہے!

اس سلسلے میں بجائے اس کے کہ لیپا پوتی سے کام لیا جائے اور اس روایتی کبوتر کا طرزِ عمل اختیار کیا جائے جو بلّی کو دیکھ کر آنکھ بند کر لیتا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ حقائق کو تسلیم کیا جائے اور ان کے اسباب و محرّکات کا سراغ لگایا جائے تاکہ ایک دوسرے کی صحیح پوزیشن کے فہم و ادراک سے ایک دوسرے کے لئے حقارت کی بجائے 'ہمدردی' کے جذبات پیدا ہوں۔

اس وقت واقعہ یہ ہے کہ ایک عام سندھی نوجوان پنجابیوں کو 'دیسی سامراج' کی علامت اور اس قسم کے 'نوآبادیاتی نظام' کے ذریعے ظلم و استحصال کا 'مجرم' گردانتا ہے

جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اور جیسے کہ عرض کیا جا چکا ہے، اس احساس کی پیدائش کا اولین سبب تو پاکستان کی اس مرکزی سول سروس کی بدعنوانیاں تھیں جس میں پنجابیوں کا تناسب "حصہ بقدر جثہ" کے اصول کے مطابق سب سے بڑھ کر تھا۔ پھر اس جلتی آگ پہ تیل کا کام کیا مارشل لا کے تسلسل اور طوالت نے ـــــ اور اس پر مزید اضافہ ہوا کچھ ان پنجابی آبادکاروں کے ذریعے جنہوں نے، بقول اہلِ سندھ، سندھ کی بہترین زمینوں پر "قبضہ" کر لیا۔ اور کچھ ان پنجابی صنعت کاروں اور تاجروں کے ذریعے جو خصوصاً کراچی کی صنعت و تجارت کے قابلِ لحاظ حصے پر "قابض" ہو گئے۔ (واضح رہے کہ سول اور فوجی افسروں کو جو زمینیں 'باندازِ خسروانہ' سندھ میں نئے تعمیر شدہ بیراجوں سے سیراب ہونے والے علاقوں میں مرحمت فرمائی گئیں اُن کا مسئلہ جداگانہ اور اُس نئے نوآبادیاتی نظام کا شاخسانہ ہے جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔)

موجودہ صورتِ حال کے کامل فہم و شعور کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ بھی نوٹ کر لیا جائے کہ جواباً ایک عام پنجابی سندھیوں کو سست اور کاہل، اور آرام پسند اور نااہل، اور سفر سے خوف کھانے والا ہی نہیں بزدل اور ڈرپوک بھی سمجھتا ہے! (اگرچہ ۸۳ء اور ۸۶ء کے اندرونِ سندھ ہنگاموں اور سندھ میں ڈاکوؤں کی حالیہ ترک تازیوں نے کم از کم مؤخر الذکر تاثر کو بہت حد تک ختم کر دیا ہے!)

اس صورتِ حال کا اہم ترین سبب تو سندھ اور پنجاب کے قدیم تاریخی پس منظر اور بالخصوص انگریزی دَور میں پیدا شدہ اجتماعی نفسیات کے اُس فرق و تفاوت کے پیشِ نظر بآسانی سمجھا جا سکتا ہے جس پر اس سے قبل تفصیلی روشنی ڈالی جا چکی ہے ـــــ یعنی یہ کہ چونکہ انگریزوں نے سندھیوں میں نفرت و عداوت ہی نہیں بغاوت کے جذبات محسوس کئے لہٰذا اس نے اپنی فوج کے دروازے بھی ان پر بالکل بند کر دیئے اور اس کی وجہ جواز کے طور پر یہ مشہور کر دیا کہ سندھی بزدل اور غیر عسکری قوم (NON-MARTIAL RACE) ہیں اور تعلیم کے میدان میں بھی سندھ میں کوئی خاص پیش رفت نہیں کی۔ جس کے نتیجے میں انگریزی فوج میں تو سندھیوں کا تناسب صفر رہا ہی، عام تعلیم کے میدان میں بھی سندھی مسلمان بحیثیتِ مجموعی پیچھے رہ گئے۔

اور ایک تو عام سندھی ویسے ہی خاموش اور شرمیلا اور اپنی قدیم تہذیبی روایات کے زیر اثر کچھ لئے دیئے اور الگ تھلگ (RESERVED) رہنے والا تھا، اس پر مستزاد مسلسل ایک سو سال کے مخالفانہ پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے خول میں بالکل ہی بند ہو کر رہ گیا اور کم از کم وقتی طور پر اس کے اندر حدود سندھ سے باہر کسی قسمت آزمائی (ENTERPRISE) کا رجحان نہ رہا۔ حالانکہ اس سے قبل خصوصاً خلیج کے علاقے اور حجاز مقدس کے ساتھ سندھیوں کے تجارتی روابط بہت مضبوط تھے، چنانچہ جب ۱۹۶۲ء میں پہلی بار حج کی سعادت نصیب ہوئی تو راقم الحروف نے مکہ مکرمہ کے بازاروں میں سائن بورڈوں پر "السندی" کا لفظ بکثرت لکھا دیکھا اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ لوگ سندھی تو ہیں لیکن چونکہ انہیں وہاں سے نقل مکانی کئے کئی نسلیں بیت گئی ہیں لہٰذا یہ معلوم نہیں کہ وہ سندھ کے کس شہر سے عرب آئے تھے۔ (واضح رہے کہ بالکل یہی معاملہ بہت سے بہاری مسلمانوں کا ہے جو جزائر غرب الہند (WEST INDIES) میں آباد ہیں لیکن کئی نسلیں بیت جانے کے باعث اب انہیں اپنے جدی وطن کا نام بھی صحیح یاد نہیں ہے۔ اور وہ 'بہار' کا تلفظ 'بیار' کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انگریز کی آمد کے بعد یا تو کچھ حریت پسند لوگ از خود ہجرت کر کے دنیا کے دوسرے حصوں میں چلے گئے تھے۔ یا انگریزوں نے ان میں بغاوت کے جراثیم دیکھ کر ان کو جہازوں میں بھر بھر کر قریب کے "کالے پانی" کے بجائے ایک نہایت دور کے 'کالے پانی' بھیج دیا۔ چنانچہ اس علاقے کے ایک مسلمان سے جب امریکہ میں ملاقات ہوئی تو اس نے بعینہ یہی بات کہی۔ راقم کا گمان غالب ہے کہ کچھ اسی طرح کا معاملہ سندھ میں پیش آیا کہ انگریز کی آمد پر کچھ حریت پسند سندھی عرب ہجرت کر گئے اور تین چار نسلوں کے بعد اب انہیں ان شہروں کے نام بھی یاد نہیں رہے جن سے انہوں نے نقل مکانی کی تھی)۔

اس کے برعکس پنجابیوں کے لئے انگریز نے نہ صرف یہ کہ اپنی فوج کے دروازے چوپٹ کھول دیئے بلکہ ان کی باضابطہ حوصلہ افزائی کی، مزید برآں ان ہی میں سے اپنی سول سروس کے لئے بہترین کل پرزے حاصل کرنے کے لئے سکولوں اور کالجوں اور خصوصاً مشنری اداروں کا جال پنجاب بھر میں پھیلا دیا۔ ادھر پنجابیوں نے بھی بحیثیت مجموعی بدیسی حکمرانوں کی ان

نوازشوں کا پوری خوشدلی اور قلبی و ذہنی آمادگی کے ساتھ خیر مقدم کیا اور اس طرح انگریز کی سول سروس اور فوج میں پنجابی مسلمانوں کو اہم مقام حاصل ہو گیا۔ اور اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اپنی اس پوزیشن سے تحریک مسلم لیگ کو تقویت پہنچائی اور قیام پاکستان کے ضمن میں مؤثر رول ادا کیا ـــ لیکن اس کا یہ نتیجہ بہرحال نکلا کہ انگریز کے رخصت ہونے اور خصوصاً قائد اعظم کے انتقال فرمانے کے بعد جو لوگ "تاج و تخت" حکومت پاکستان کے وارث بنے یعنی مرکزی بیوروکریسی کے ارکان اور فوج کے جرنیل ان میں اہل پنجاب کا پلڑا سب سے بھاری تھا۔ چنانچہ وہی اس نئے "دیسی سامراج" کے سربراہ یا علامت بن گئے۔

یہی وجہ ہے کہ مغربی پاکستان میں ون یونٹ کے قیام کو بھی، جو اصلاً پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کے مابین لاینحل دستوری مسئلے کا واحد ممکن حل تھا، سندھ میں اسی نظر سے دیکھا گیا کہ یہ پنجابی سامراج کے پورے مغربی پاکستان پر فیصلہ کن اور بلا شرکت غیرے قبضے کی آخری اور بھرپور کوشش ہے۔ اور بد قسمتی سے پاکستان کی اس وقت کی بے بصیرت قیادت نے ون یونٹ کا صدر مقام لاہور کو قرار دے کر اس کا ثبوت بھی فراہم کر دیا ـــ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اگر ون یونٹ کا صدر مقام ملتان کو بنایا جاتا جو لسانی اور ثقافتی، اور جغرافیائی اور مواصلاتی ہر اعتبار سے مغربی پاکستان کا مرکز تھا تو اتنا شدید ردّ عمل ہرگز پیدا نہ ہوتا۔

حاصل کلام یہ کہ ـــ اصولی اور مجموعی اعتبار سے پنجاب سے سندھ کی شکایات بے بنیاد نہیں ہیں۔ اگرچہ، جیسے کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، اس ضمن میں اصل موردِ الزام پوری پنجابی قوم نہیں بلکہ اس کے صرف دو طبقے بنتے ہیں۔ یعنی ایک فوج جو اکثر و بیشتر پنجاب کے صرف شمالی حصے سے تعلق رکھتی ہے اور دوسرے سول بیوروکریسی جو زیادہ تر بھارتی اور پاکستانی پنجاب کے وسطی اضلاع سے ہے۔ بقیہ پورے پنجاب کو بحیثیت مجموعی اور مذکورہ حصوں کے بھی عام لوگوں کو موردِ الزام ٹھہرانا یقیناً زیادتی ہے۔

اسی طرح ان زمینوں سے قطع نظر جو اسی سول اور ملٹری بیوروکریسی نے بطورِ "انعام" غصب کیں، ان تمام پنجابی آبادکاروں کو مطعون کرنا یقیناً بہت بڑی ناانصافی ہے جنہیں قدرت نے بنجر اور غیر آباد زمینوں کو آباد کرنے اور ان سے بطور "رزقِ خود را از زمیں بُردن رواست"

ی مصداق ہے اور اہل وطن کے لئے غذا حاصل کرنے کی بے پناہ صلاحیت سے نوازا ہے
ہیں ابتدا میں تو بڑی تحریص و ترغیب یہاں تک کہ ... کے ساتھ ... لایا
یا تھا۔

اس ضمن میں بھی اس تاریخی پس منظر کی وضاحت مفید ہوگی کہ انگریزوں کے تعمیر کردہ
ری آبپاشی کے نظام سے قبل مغربی پنجاب کے بھی اکثر و بیشتر حصے کی معیشت اور وہاں کے
ہنے والوں کی مزاجی کیفیت بالکل ویسی ہی تھی جیسی اہل سندھ کی ——— یعنی چونکہ علاقہ اکثر و بیشتر
ار صحرائی تھا اور زرعی معیشت کا کل دار و مدار دریاؤں کی طغیانی کے ذریعے سیراب ہونے
ی زمینوں پر تھا یا کچھ تھوڑا بہت بارانی کاشت پر، لہٰذا زیادہ محنت و مشقت کا مادّہ نہ یہاں
ے لوگوں میں تھا نہ وہاں کے لوگوں میں اور توکل و قناعت کا دور دورہ وہاں بھی تھا اور
یہاں بھی ——— اس کے برعکس سابق متحدہ پنجاب کے تلہیٹی کے علاقے یعنی سیالکوٹ، گورداسپور،
امرتسر، جالندھر اور ہوشیارپور کے اضلاع بے حد سرسبز بھی تھے اور گنجان آباد بھی۔ چنانچہ
یہاں کے لوگوں میں (بشمول سکھ اور مسلمان) زراعت اور کاشت کاری کی بے پناہ مہارت
ور استعداد پیدا ہوگئی۔ اور چونکہ آبادی میں اضافے کی بنا پر رفتہ رفتہ رقبے چھوٹے چھوٹے
رہ گئے تھے لہٰذا ——— ایک جانب تھوڑی زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے
کی جدّ و جہد نے ان کی زراعت میں مہارت میں مزید اضافہ کیا، دوسری طرف متبادل ذرائع
معاش کی تلاش نے لوگوں کو نہ صرف عام تعلیم بلکہ فنّی اور پیشہ ورانہ مہارت کے حصول کی طرف
متوجّہ کیا، یہی وجہ ہے کہ پنجاب نے جو بہترین بیوروکریٹ اور ٹیکنوکریٹ پیدا کیے اُن کی
اکثریت کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔ اور تیسری طرف حصولِ معاش کے لئے نہ صرف اپنے
ملک کے دوسرے علاقوں بلکہ ملک سے باہر جا کر قسمت آزمائی کرنے پر بھی آمادہ کیا۔

یہی وجہ ہے کہ جب وسطی اور مغربی پنجاب میں نہروں کا جال بچھا اور نئے آبادکاروں کی
ضرورت پیش آئی تو ان ہی علاقوں کے لوگ ترکِ سکونت کر کے آئے اور انہوں نے کمال محنت
و مشقت اور مہارت و اہلیت کا ثبوت دیتے ہوئے ان علاقوں کو آباد کیا۔ اور اس کام میں
مناسب کہ ان علاقوں میں پہلے سے رہنے والے لوگوں نے کم از کم ابتدائی دور میں کوئی حصّہ

نہیں لیا۔ بعد میں جب سابق ریاست بہاولپور اور پر سندھ میں نہریں نکلیں اور بیراج بنے تو بعینہ یہی صورت وہاں بھی پیش آتی رہی۔ اور سندھ کے سابق قناعت پسند اور آرام طلب لوگوں نے بھی بالکل مغربی پنجاب کے پرانے باشندوں کی طرح ان پنجابی آبادکاروں کو حیرت و استعجاب کے ساتھ بالکل مٹی ہو کر مٹی میں ملتے دیکھا ــــ لیکن جب ان کی محنت و مشقت کے نتائج برآمد ہوئے اور زمینوں نے سونا اگلنا شروع کر دیا تو انسان کی طبعی کمزوری کے باعث منفی جذبات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ حالانکہ سندھی بھائیوں کو سوچنا چاہیے کہ اپنی محنت و مشقت کی عادت کے بل پر یہ پنجابی آبادکار اور محنت کش صرف سندھ ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے کونے کونے حتّٰی کہ امریکہ اور کینیڈا کے مغربی ساحل تک پر موجود ہیں۔

بالکل اسی طرح کا معاملہ پنجابی صنعت کاروں اور تاجروں کا ہے۔ عجیب بات ہے کہ آبادکاروں کے برعکس پنجاب کی تاجر برادریوں کی اکثریت کا تعلق مغربی پنجاب سے ہے، یعنی چنیوٹ، چکوال، پنڈ دادنخان، جھنگ اور ملتان کی شیخ برادریاں، اور ان لوگوں کو اللہ نے تجارت کی جو مہارت عطا فرمائی ہے اس کے طفیل یہ لوگ تقسیم ہند سے بہت پہلے پنجاب سے نکل کر دہلی اور یوپی، حتّٰی کہ بنگال تک کی تجارت میں نمایاں حصہ دار بن گئے تھے۔ ان میں سے بعض برادریوں مثلاً چنیوٹی شیخوں نے تو اپنی پنجابی زبان اور ثقافت کو بھی برقرار رکھا اور اپنے آبائی شہروں سے بھی تعلق رکھا اور بعض برادریوں نے (جن کا مجموعی نام "قوم پنجابی سوداگران دہلی" ہے) بالکلیہ یوپی ہی کی طرزِ معاشرت اور اردو زبان کو اختیار کر لیا۔ چنانچہ اب وہ صرف نام کے پنجابی رہ گئے ہیں ــــ اب اگر ان لوگوں نے قیام پاکستان کے بعد گجرات کے میمنوں اور بمبئی کے خوجوں اور بوہروں کے ساتھ ساتھ اپنی محنت اور مہارت کی جولانگاہ کراچی اور سندھ کو بنایا تو اس میں کون سے جرم کی بات ہے ــــ اگرچہ یہ بحث بالکل جدا ہے کہ موجودہ سرمایہ داری اور ارتکازِ دولت میں اصل محنت و مہارت کا حصہ کتنا ہے اور سودی اور ساہوکاری نظام، غیر شرعی بیع و شرای، سرکاری واجبات کی چوری اور سب سے بڑھ کر رشوت اور بددیانتی کا حصہ کتنا! ــــ اس لئے کہ یہ معاملات افراد و اشخاص سے نہیں بلکہ "نظام" سے متعلق ہیں اور ان کا تعلق کسی ایک قوم یا قومیت سے نہیں بلکہ پوری پاکستانی قوم اور معاشرے

سے بحیثیت مجموعی ہے اور اِن خباثتوں کا کلّی علاج بھی ایک کامل اسلامی انقلاب کے بغیر ناممکن ہے، جس کے بعد زمین کا بھی شریعتِ اسلامی کے مطابق بالکل "نیا بندوبست" ہوگا اور "سرمایہ کاری" کے لئے صحت مند فضا کے برقرار رہتے ہوئے "سرمایہ داری" کی جملہ راہیں بھی مسدود ہو جائیں گی۔

لہٰذا سندھی بھائیوں کو پنجاب اور اہلِ پنجاب کے خلاف اپنے "مقدمے" پر نظرِ ثانی کرنی چاہیئے اور معاملہ فی الواقع جیسا کچھ اور جتنا کچھ ہے اسی حد تک رکھنا چاہیئے اور جذبات کی رَو میں بہہ کر اس میں غلط اضافے نہیں کر لینے چاہئیں!

اسی طرح، پنجابیوں کا بھی ایک مغالطہ تو، جیسے کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، رفع ہو ہی گیا ہے، یعنی یہ کہ سندھی لڑاکا یا بہادر قوم نہیں ہیں، اس پورے تاریخی پس منظر کے سامنے آجانے کے بعد باقی غلط فہمیاں بھی رفع ہو جانی چاہئیں اور اپنے سندھی بھائیوں کی عظمت کا نقش ان کے دل پر قائم ہو جانا چاہیئے کہ انہوں نے انگریزی حکومت کو ایک دن کے لئے بھی ذہناً قبول نہیں کیا۔ بلکہ ۱۹۴۵-۴۶ء تک جب کہ سندھ پر انگریزوں کے تسلّط کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا تھا سندھ کے "حُر" اپنے خون سے حریت پسندی کی داستانیں رقم کر رہے تھے یہاں تک کہ انگریزوں نے موجودہ پیر پگاڑا صاحب کے والد ماجد ایسی عظیم دینی و روحانی شخصیت کو نہ صرف یہ کہ موت کی سزا دی بلکہ ان کا جسدِ خاکی بھی اس لئے واپس نہیں کیا کہ انہیں یقین تھا کہ ان کا مزار جہاں بھی ہوگا تحریکِ حریت و جہاد کا عظیم مرکز بن جائے گا!

پھر یہ سندھ کی اسی حریت پرور فضا کا ثمرہ ہے کہ اس نے قائدِ اعظم محمد علی جناح ایسی عظیم شخصیت کا تحفہ پوری ملتِ اسلامیہ پاک و ہند کی خدمت میں پیش کیا ـــــ مزید برآں پاکستان کے موجودہ صوبوں میں سے سندھ ہی وہ واحد صوبہ تھا جہاں مسلم لیگ کی حکومت قائم ہوئی ـــــ بلکہ ہندوستان کے پورے طول و عرض میں سندھ ہی وہ واحد صوبہ تھا جس کی اسمبلی نے ۱۹۴۳ء میں پاکستان کے حق میں قرار داد پاس کی تھی۔ الغرض! برِ عظیم پاک و ہند میں صوبۂ سندھ مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے اعتبار سے کسی سے پیچھے تھا نہ خود اختیاری

کی جدوجہد میں، بلکہ واقعہ اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ ان جملہ اعتبارات سے سندھ کم از کم موجودہ پاکستان کے تمام علاقوں سے تو بہت آگے تھا!

گویا اصل ضرورت اس کی ہے کہ ایک دوسرے کو سمجھا جائے، ایک دوسرے کی خوبیوں کا اعتراف کیا جائے اور ایک دوسرے کی خامیوں اور کوتاہیوں پر باہم طعنہ زنی کی بجائے ان کے اسباب و علل کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے ہمدردی کی جائے[1]، بمصداق آیۂ قرآنی:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	ترجمہ " اے ایمان والو! تم میں سے کوئی
لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ	قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے کیا عجب
عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا	کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ نہ ہی کوئی عورتیں
مِّنْھُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ	دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا
نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا	ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور اپنے آپ
مِّنْھُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا	کو عیب مت لگایا کرو، نہ ہی ایک دوسرے
اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ	کے (چڑانے والے) نام رکھ لیا کرو۔
بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ	ایمان کے بعد تو برائی کا نام بھی برا ہے۔
الْاِیْمَانِ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ	اور جو باز نہیں آئے گا تو وہی لوگ ظالم قرار
فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝	پائیں گے۔" (سورۂ حجرات: آیت ۱۱)

---

[1] یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ قبل امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد کے کسی بیان میں سندھیوں کے فوج میں بھرتی نہ ہونے کا ذکر طعن آمیز انداز میں تھا جس کے جواب میں سید غلام مصطفیٰ شاہ صاحب نے کہا تھا "ہمیں فخر ہے کہ ہم کبھی کرائے کے فوجی نہیں رہے۔!" گویا ع "دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی!"

قرآن —— معیارِ حق و باطل اور
سنت —— صراطِ مستقیم کا عملی نمونہ ہے

۴۔ مہاجرین کا خوف

سندھ کی قدیم آبادی میں عیسرا احساس محرومی ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ترک وطن کر کے پاکستان آنے والوں یعنی "مہاجرین" کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ متعدد اسباب کی بنا پر مہاجرین کا "خوف" بھی قدیم سندھیوں کی اجتماعی نفسیات کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔

ان اسباب میں سے بھی اولین تو یہی تھا کہ پاکستان کی مرکزی حکومت پر ابتداءً مہاجرین کا "غلبہ" تھا اور نہ صرف یہ کہ پہلی مرکزی کابینہ میں سب سے بڑی تعداد مہاجرین کی تھی اور مرکزی بیوروکریسی میں بھی وہ معتدبہ تعداد میں موجود تھے (چنانچہ جب تک مرکزی دارالحکومت کراچی میں رہا دیکھنے والوں کو یہی محسوس ہوا کہ پاکستان پر مہاجرین کی "حکومت" ہے) بلکہ سندھ کی عمومی تعلیمی پسماندگی کی بنا پر صوبائی محکموں میں بھی مہاجرین کا پلڑا بھاری تھا اور ایک عام دیہاتی سندھی بھی یہی محسوس کرتا تھا کہ مہاجر ہم پر حاکم ہو گئے ہیں، اگرچہ بعد میں یہ صورتحال تیزی سے تبدیل ہو گئی۔

ثانیاً ـــ ہندوؤں کے ترک وطن سے، اگرچہ وہ جزوی تھا، جو معاشی اور اقتصادی خلاء پیدا ہوا وہ بھی لامحالہ مہاجرین ہی کے ذریعے پُر ہوا، چنانچہ ایک جانب سندھ کی شہری جائداد اور تجارت پر مہاجرین کا "قبضہ" ہو گیا۔ تو دوسری جانب سندھ کی وہ چالیس فی صد کے لگ بھگ زرعی زمین بھی، جو ہندوؤں نے مقامی مسلمانوں سے اپنے سودی اور ساہوکارانہ ہتھکنڈوں کے ذریعے ہتھیالی تھی، متروکہ جائداد کی حیثیت سے مہاجرین کو الاٹ ہو گئی[1] (اگرچہ اب سندھی نیشنلزم کے دباؤ کے تحت مہاجرین اس زرعی زمین کا اکثر و بیشتر حصہ یا تو اونے پونے بیچ چکے ہیں یا ویسے ہی چھوڑ دینے پر مجبور ہو چکے ہیں۔)

اس ضمن میں یہ بات اہمیت کے ساتھ نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ سندھ میں ہندوؤں نے انگریزوں کی زیرِ سرپرستی اور ان کی باضابطہ حوصلہ افزائی اور تائید و امداد سے (جس کا

---

[1] اس سلسلے کی تلخ ترین حقیقت یہ ہے کہ تقسیم ہند سے قبل سندھ و ہندوؤں (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

سبب وہی تھا جو پہلے بیان ہو چکا، یعنی یہ کہ چونکہ انگریز سندھی مسلمان سے شدت سے
خائف تھا اور اُسے اُس میں بغاوت کے جراثیم نظر آتے تھے، لہٰذا اُس نے اسے دبانے
کے لئے ہندو کی حوصلہ افزائی کی) معاشی استحصال کا جو جال پھیلایا تھا اس کی بنا پر سندھ
کے باشعور مسلمان اُن سے سخت نالاں تھے۔ چنانچہ یہ بات بہت سے لوگوں کے لئے حیرت
و استعجاب کا باعث ہوگی کہ، پاکستان کے ایک قومی روزنامے[1] میں حال ہی میں شائع ہونے
والے مضمون کے مطابق، قیام پاکستان سے لگ بھگ چار سال قبل اس شخص نے جو آج
سندھی نیشنلزم کا سب سے بڑا علمبردار اور "مہاجر و پنجابی سامراج" سے نفرت و عداوت
کی سب سے بڑی علامت، بن چکا ہے سندھی ہندوؤں کی دہائی دیتے ہوئے ہندوستان
کے مسلمانوں کو دعوت دی تھی کہ وہ سندھ آکر یہاں کے مسلمانوں کو ہندوؤں کی چیرہ دستیوں
سے نجات دلائیں۔ چنانچہ اواخر دسمبر ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جو سالانہ اجلاس قائداعظم
مرحوم کی زیر صدارت کراچی میں منعقد ہوا تھا اس میں تقریر کرتے ہوئے استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین
جی ایم سید نے کہا تھا:

"ہندو سندھ میں رہنے کے باوجود بھارت کے ہندوؤں سے تعلقات رکھتے ہیں، اس

(تسلسل، اور ساہوکاروں کی دست بُرد سے زمینداروں کو بچانے کی جو کوششیں پنجاب میں سر چھوٹو رام
اور ان کے ساتھیوں نے کی تھیں، اسی طرح کی ایک کوشش سندھ میں بھی صوبائی اسمبلی کے بعض
مسلمان اراکین نے کی تھی۔ لیکن اس موقع پر بہت سے نام نہاد مسلمان وڈیرے ہندو سرمایہ داروں
کے ہاتھوں بک گئے اور انہوں نے طرح طرح کے تاخیری ہتھکنڈوں سے کام لے کر مجوزہ بل کو پاس
ہونے سے روک دیا۔ ورنہ وہ ساری زرعی زمینیں جو ہندو ساہوکاروں کے پاس رہن تھیں
اور اسی بنا پر تقسیم کے بعد متروکہ جائداد قرار پاکر مہاجرین کو الاٹ ہوئیں اسی وقت سندھ کے مسلمانوں
کو واپس مل جاتیں ـــــ واضح رہے کہ پنجاب میں تو زمیندار مسلمان بھی تھے اور ہندو اور سکھ بھی
تھے، لیکن سندھ میں کوئی غیر مسلم اصلاً زرعی زمین کا مالک نہیں تھا اور زرعی اراضی کُل کی کُل مسلمانوں
کی ملکیت تھیں!

[1] روزنامہ "نوائے وقت" تحریر جناب محمد علی

لئے سندھ کے مسلمان بھی امید رکھتے ہیں کہ برِصغیر کے مسلمان ان (یعنی سندھی مسلمانوں) کے ساتھ اشتراکِ عمل کریں گے۔ بھارت کے مسلمان ہماری بڑی مدد کر سکتے ہیں۔ سندھ کے رہنے والے زراعت سے وابستہ ہیں اور تجارت میں بہت پیچھے ہیں۔ اس لئے بھارت کے مسلمان سندھ میں آکر اپنے تجربے اور مہارت سے تجارت میں سندھی مسلمانوں کی پس ماندگی کو ختم کر سکتے ہیں اور سندھ خوشحالی اور ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔"

لیکن اوّل تو اس وقت یہ ایک خالص نظری سی بات تھی اور اس کا حقیقت و واقعہ کا روپ دھار لینا بہت ہی بعید از قیاس تھا، پھر یہ تو کسی طرح بھی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ تبادلۂ آبادی اتنے بڑے پیمانے پر ہو جائے گا۔ لہٰذا اس میں مضمر 'خطرات' کی طرف اور کسی کا تو کیا خود جی ایم سیّد صاحب کا ذہن بھی منتقل نہیں ہو سکا ——— چنانچہ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد سندھ میں آنے والے مہاجرین کا سندھی مسلمانوں نے نہایت پُرتپاک خیر مقدم کیا اور انہیں تمام ممکن سہولتیں اور مراعات بہم پہنچائیں لیکن افسوس کہ یہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی اور دو اہم اسباب کی بنا پر اوّلاً ' (ANTI-CLIMAX) [illegible] (REACTION) کی صورت پیدا ہوتی چلی گئی۔

اوّلاً اس بنا پر کہ ——— بھارت سے ہجرت کر کے آنے والوں کا معاملہ [illegible] ہی میں ختم نہیں ہو گیا۔ بلکہ یہ سلسلہ اس کے بعد بھی تواتر کے ساتھ جاری رہا اور اس طرح آبادی میں مہاجرین کا تناسب مسلسل بڑھتا چلا گیا۔ نتیجۃً قدیم سندھیوں کے تحت الشعور میں یہ 'خوف' کلبلانے لگا کہ کہیں وہ اپنے ہی صوبے میں اقلیت بن کر نہ رہ جائیں۔ اس جلتی آگ پر تیل کا اثر ہوا اس سے کہ جب پاکستان میں صنعت نے تیزی کے ساتھ ترقی کی اور اس کا سب سے بڑا مرکز کراچی بن گیا تو پاکستان کے شمالی صوبوں سے پنجابی اور پٹھان محنت کاروں کی سندھ منتقلی کی رفتار بھی بہت بڑھ گئی اور 'مہاجرین' پنجابیوں اور پٹھانوں کی مجموعی تعداد قدیم سندھیوں کی تعداد کے تقریباً برابر ہو گئی ——— اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خوف بھی جو ابتدا میں صرف 'مہاجر فوبیا' (PHOBIA) تھا دہ چند ہو گیا۔ چنانچہ اب قدیم سندھی برملا اس خطرے کا اظہار کر رہے ہیں کہ اگر یہ صورت جاری رہی تو ان کا حشر ریڈ انڈین لوگوں کا سا ہو گا اور اگرچہ اس میں

یقیناً حد درجہ مبالغے کا عنصر شامل ہے تاہم قدیم سندھیوں کے اپنے ہی صوبے میں اقلیت میں تبدیل ہو جانے کا اندیشہ بے بنیاد نہیں ہے، چنانچہ محولہ بالا مضمون کے مطابق:

"ایک ریٹائرڈ سندھی سی ایس پی آفیسر کے تحقیق و تجزیئے میں کہا گیا ہے کہ کراچی میں ہر سال ڈھائی لاکھ کے حساب سے پنجاب اور سرحد سے افراد آ رہے ہیں۔ اگر یہی رفتار برقرار رہی تو ۱۹۹۱ء تک سندھ میں پنجابی بولنے والوں کی آبادی پچاسی لاکھ پانچ ہزار چار سو دس ہو گی ۱۹۹۱ء تک پشتو بولنے والوں کی تعداد چوبیس لاکھ ہو گی۔ ۱۹۹۱ء میں اردو بولنے والوں کی تعداد اٹھانوے لاکھ چار ہزار دو سو بیس ہو گی۔ ۱۹۹۱ء تک پانچ لاکھ کشمیری سندھ میں آباد ہوں گے۔ اگر آبادی کی منتقلی کی یہی صورت حال رہی تو سندھ کی کل آبادی چار کروڑ چوبیس لاکھ ہو گی جس میں سندھی بولنے والے دو کروڑ نو لاکھ، پنجابی بولنے والے پچاسی لاکھ، پشتو بولنے والے ستائیس لاکھ اور اردو بولنے والے اٹھانوے لاکھ اور کشمیری پانچ لاکھ ہوں گے۔ اس طرح مجموعی طور پر آئندہ چند سالوں میں سندھی بولنے والے مستقل طور پر اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے۔"

تو اگرچہ یہ "خطرہ" مہاجروں، پنجابیوں اور پٹھانوں کی مجموعی تعداد سے ہے، لیکن چونکہ اس غیر سندھی آبادی کا جزوِ اعظم بہرحال مہاجرین ہی پر مشتمل ہے، لہٰذا اس سے پیدا شدہ احساسِ محرومی اور نفرت و عداوت کا سب سے بڑا حصہ بھی لامحالہ ان ہی کے ساتھ منسلک ہو گیا ہے۔

چنانچہ یہی پس منظر ہے اس انتہائی تکلیف دہ اور افسوسناک صورتِ حال کا کہ قدیم سندھی مسلمان ان بہاری مسلمانوں کی منتقلی کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے جنہیں اپنے "پاکستانی" ہونے پر اصرار رہا ہے اور جو اس وقت بنگلہ دیش میں انتہائی ذلت و افلاس اور کس مپرسی کے عالم میں زندگی کے دن گن رہے ہیں اور منتظر ہیں کہ کب پاکستانی مسلمانوں کو رحم آئے اور انہیں بھی آزاد اور باوقار زندگی گذارنے کا موقع ملے۔ اس لئے کہ سندھی مسلمانوں کو یقین ہے کہ خواہ اس وقت پاکستان کے دوسرے صوبوں کے لوگ کتنی ہی فراخدلی کا مظاہرہ کریں اور ان بہاریوں کو اپنے یہاں آباد کرنے کی پیشکش کریں، وہ جلد یا بدیر لازماً سندھ ہی منتقل ہو کر رہیں گے ا

اس طرح آبادی کا توازن مزید بگڑ جائے گا۔

ثانیاً ـــــ راقم کے تجزیئے کے مطابق قدیم سندھیوں کے "خوف" میں تناسب آبادی اور دیگر معاشی و اقتصادی عوامل سے بھی کہیں زیادہ دخل لسانی اور ثقافتی عوامل کو حاصل ہے۔ اس لئے کہ انہیں شدید اندیشہ لاحق ہے کہ کہیں وہ قدیم سندھی تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب بالکل ختم ہو کر نہ رہ جائیں جو انہیں بے حد عزیز ہیں۔ اور چونکہ یہ اندیشہ انہیں نہ پنجابیوں سے ہے نہ پٹھانوں سے بلکہ صرف مہاجروں اور ان میں سے بھی خاص طور پر خالص اردو بولنے والوں سے ہے۔ لہٰذا اس کے جذبے کا ردِ عمل تو بالکلیہ ان ہی کے حصے میں آیا ہے ـــــ ادھر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ کراچی تو سرے سے سندھ کا شہر معلوم ہی نہیں ہوتا، حیدرآباد اور سکھر جیسے سندھ کے دوسرے بڑے شہروں پر بھی اردو زبان اور مہاجر تہذیب کا صریح غلبہ ہے، رہے باقی نسبتاً چھوٹے شہر تو ان میں بھی سندھی اور اردو زبانیں اور مہاجر اور مقامی تہذیبیں ایک دوسرے کی مدِ مقابل اور بالکل برابر کی چوٹ نظر آتی ہیں۔ لہٰذا قدیم سندھی زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کو درپیش خطرہ وہمی اور خیالی نہیں، حقیقی اور واقعی ہے۔ چنانچہ اسی کو ملک و ملت کے دشمنوں نے سب سے بڑھ کر استعمال (EXPLOIT) کیا اور اس "خوف" کو اس جدید سندھی نیشنلزم کا سب سے بڑا جذبۂ محرکہ بنا دیا جس نے بچے کھچے پاکستان کی سالمیت کے لئے سب سے بڑے خطرے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ (واضح رہے کہ خوف کے جذبے کی بنیاد پر دنیا میں بڑی انہونی باتیں بھی ہو جاتی ہیں، چنانچہ خود پاکستان کے قیام کے اسباب و عوامل میں سب سے مؤثر عامل ہندوستان کی مسلم قوم کا یہ "خوف" ہی تھا کہ ہندو اس سے نہ صرف یہ کہ انصاف نہیں کرے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام لے!) ـــــ اور چونکہ قدیم سندھی مسلمانوں کی جدید اجتماعی نفسیات کے اس پہلو پر عام طور پر توجہ نہیں دی جاتی اور یہ بات خاص طور پر پنجاب کے مسلمانوں کے تو بالکل سمجھ ہی میں نہیں آتی لہٰذا اس کے ضمن میں قدرے تفصیل کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں اوّلین اور اہم ترین حقیقت تو یہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ پنجاب اور سندھ

یں تبادلۂ آبادی کی نوعیت اور اس سے پیدا شدہ صورتِ حال ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے (بقیہ دو صوبوں یعنی سرحد اور بلوچستان تک تو مہاجرین کی بالکل نہ ہونے کے برابر تعداد ہی پہنچی لہٰذا ان کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے) اس لئے کہ اگرچہ آبادی کے تناسب کے اعتبار سے ان دونوں صوبوں میں تبادلۂ آبادی تقریباً ایک ہی پیمانے پر ہوا، لیکن پنجاب میں صورت یہ تھی کہ پنجابی بولنے والے ہندو اور سکھ گئے تو ان کی جگہ جو لوگ آئے ان کی غالب اکثریت پنجابی بولنے والوں ہی پر مشتمل تھی، مزید برآں ان میں سے اکثر کے ہم قوم بلکہ قریبی رشتہ دار مغربی پنجاب میں پہلے ہی "آبادکاروں" کی صورت میں موجود تھے ـــــ صرف انبالہ ڈویژن (حالیہ ہریانہ اسٹیٹ) سے آنے والوں لوگوں کی زبان و تہذیب قدرے مختلف تھی، لیکن ایک تو ان کی تعداد بہت کم تھی، دوسرے انہیں بارڈر کی طویل پٹی کے ساتھ ساتھ بہت منتشر صورت میں آباد کیا گیا ـــــ رہے خالص اردو بولنے والے دہلی، یوپی اور بہار وغیرہ کے مہاجرین تو پنجاب میں آباد ہونے والوں میں ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تھی ـــــ لہٰذا پنجاب میں کوئی لسانی یا تہذیبی مسئلہ خالص عوامی اور دیہاتی سطح پر بھی پیدا نہیں ہوا۔ رہے پڑھے لکھے، روشن خیال اور باشعور شہری پنجابی تو وہ خواہ مغربی پنجاب سے تعلق رکھتے تھے خواہ مشرقی پنجاب سے، سب قیامِ پاکستان سے بہت پہلے اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے قبول کر چکے تھے یہاں تک کہ پنجاب کے علمی و تعلیمی اور تہذیبی و ثقافتی مرکز لاہور کو تقسیمِ ہند سے بہت قبل پورے ہندوستان میں اردو و ادب و صحافت کے سب سے بڑے مرکز کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ نتیجۃً یہاں اعلیٰ ثقافتی سطح پر بھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا ـــــ جب کہ اس کے بالکل برعکس سندھ میں سندھی بولنے والے ہندوؤں کی جگہ جو لوگ آئے ان میں غالب اکثریت تو دہلی، یوپی، بہار، سی پی اور حیدرآباد دکن کے خالص اردو بولنے والے لوگوں کی تھی، ان کے علاوہ راجپوتانہ سے آنے والوں کی زبان بھی اردو ہی تھی اگرچہ ذرا بھولی اور گھسی ہوئی، بمبئی، مدراس، کرناٹک اور کیرالا وغیرہ سے آنے والے بھی خواہ اپنے گھروں میں علاقائی زبانیں بولتے ہوں گھر سے باہر اردو ہی بولتے ہیں ـــــ ادھر سندھیوں کی تعلیم [illegible]

جا چکا ہے، سندھی زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کی تاریخ بہت طویل اور ان کی جڑیں بہت گہری ہیں اور سندھیوں کو اپنی زبان اور تہذیب سے والہانہ عشق ہے اور وہ ان پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں ـــــ لہٰذا یہاں اردو اور سندھی کے مابین ویسا ہی تصادم پیدا ہو گیا جیسا تقسیم ہند سے کچھ عرصہ قبل اردو اور ہندی کے درمیان پیدا ہوا تھا۔ جس کا ذکر علامہ اقبال کے ظریفانہ اشعار میں اس طرح ہے ؎

اے شیخ و برہمن سنتے ہو کیا اہلِ بصیرت کہتے ہیں گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے
یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستورِ محبت قائم تھا! یا بحث میں اردو ہندی ہے، یا قربانی یا جھٹکا ہے

اردو اور سندھی کی اس بحث میں شدت اور تلخی پیدا کرنے میں، مہاجر بھائیوں سے معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ، کچھ دخل ان کے "احساسِ برتری" اور اس کے جا و بیجا اظہار کو بھی حاصل ہے ـــــ چنانچہ وہ اہلِ سندھ کے بظاہر سادہ اور دیہاتی طور طریقوں میں مضمر اعلیٰ تہذیبی اقدار کو نہیں دیکھ پائے بلکہ انہوں نے دہلی، لکھنؤ اور حیدر آباد دکن کی تکلف سے مرصّع اور تصنّع سے مزیّن تہذیب ہی کو معیاری گردانتے ہوئے قدیم سندھیوں کو بنظرِ استحقار دیکھا، یہاں تک کہ اُن کا مذاق اڑانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ (واضح رہے کہ یہ طرزِ عمل ان میں سے بعض زیادہ مہذب و مثقف لوگوں کا پنجابیوں کے ساتھ بھی رہا جنہیں وہ ازراہِ تفننِ طبع "پنجابی ڈھگے" کہتے رہے!) ـــــ اسی طرح انہوں نے اپنے "اہلِ زبان" ہونے کے گھمنڈ میں سندھی زبان و ادب کی جانب کوئی توجہ نہیں کی ـــــ اور اگرچہ اندرون سندھ مہاجرین کی نئی نسل اب سندھی زبان میں بلا تکلف گفتگو کر لیتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ عام بول چال کی زبان کا استعمال اور شے ہے اور کسی زبان کے اعلیٰ ادب کا ذوق پیدا ہونا اور اس میں علمی و ادبی تحریر و تقریر پر قادر ہونا بالکل دوسری بات ہے ـــــ بہرحال اس کا ردِ عمل مقامی سندھی آبادی میں شدت کے ساتھ پیدا ہوا، اور یہی وہ چیز تھی جس کا سندھ کے ہندو مدت سے گھات لگائے انتظار کر رہے تھے ـــــ چنانچہ انہوں نے اس صورتِ حال سے بھرپور فائدہ اٹھایا ـــــ اور اس معاملے میں انہیں کوئی "دوش" بھی نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے کہ انہوں نے "بھارت ماتا" کی تقسیم اور

اسلام کے نام پر بننے والے ملک پاکستان کو، ظاہر ہے کہ 'مجھوراً ہی گوارا کیا تھا۔ اور یہاں سے یہ تو تسلیم کوئی عقل و خرد سے بالکل عاری انسان ہی کر سکتا ہے کہ وہ پاکستان کو ذہنی یا قلبی طور پر قبول کر سکتے ہیں ۔۔۔ لہٰذا مشرقی پاکستان کی تاریخ سندھ میں بھی دہرائی گئی۔ اور وہاں تو بنگلہ زبان و ادب کی راہ سے صرف 'مسلم قومیت'، یا دو قومی نظریہ ہی پر ضرب لگائی گئی تھی جس سے پاکستان کے دولخت ہونے کی راہ ہموار ہوئی۔ یہاں اس سے بھی آگے بڑھ کر 'نظریۂ پاکستان' اور اسلام کے اساسی عقائد و نظریات پر وار کیا گیا جس کے نتائج آج روزِ روشن کے مانند نگاہوں کے سامنے موجود ہیں۔

تہذیب و ثقافت کے قدرے نظری و نفسیاتی معاملے کے ساتھ ساتھ زبان کے مسئلے کا ایک خالص مادی اور مالیاتی پہلو بھی ہے ۔۔۔ اور وہ یہ کہ دنیوی ترقی اور مسابقت کی دوڑ میں، ظاہر بات ہے کہ، وہ لوگ ہمیشہ آگے رہتے ہیں جو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کر رہے ہوں، بہ نسبت ان کے جنہیں کسی غیر مادری یا اجنبی زبان میں تعلیم حاصل کرنی پڑے۔ چنانچہ سندھیوں نے بالکل بجا طور پر محسوس کیا کہ اوّل تو وہ اس طویل تاریخی پس منظر کی بنیاد پر جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ویسے ہی تعلیم کے میدان میں پسماندہ ہیں، اب اگر مستقل طور پر اردو ہی ذریعہ تعلیم بن گئی تو سندھی نوجوان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اردو بولنے والوں سے پیچھے رہ جائیں گے ۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ میں 'احساسِ محرومی' سب سے پہلے نوجوان طلبہ ہی میں پیدا ہوا۔ اور خاص طور پر جب ۱۹۵۸ء میں جنرل محمد ایوب خاں کے پہلے مارشل لاء کے دوران سندھی طلبہ کو 'دھکا' اردو پڑھنے پر مجبور کیا گیا تو سندھ کی نوجوان نسل میں شدید ناراضگی کی لہر دوڑ گئی جس نے رفتہ رفتہ غم و غصّے کے طوفان کی صورت اختیار کر لی۔

الغرض! یہ ہے پاکستان میں عمومی سیاسی استبداد اور معاشی استحصال سے پیدا شدہ ملک گیر احساسِ محرومی پر مستزاد سندھ کی قدیم آبادی کی اضافی ناراضگی اور بےچینی و بے اطمینانی کا پس منظر جس نے اس 'جدید سندھی نیشنلزم' کو ڈھ نہایت قوی لیکن منفی عوامل مہیا کر دیئے ہیں جس نے پاکستان کی سالمیت کے لئے چیلنج کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور 'باباے سندھ' مسٹر جی ایم سیّد کے قول کے مطابق پاکستان کی تاریخ کے طویل ترین

مارشل لا رنے ، جس کے باقیات السیئات ، تا حال برقرار ہیں ، اسے اتنی تقویت بخش دی ہے کہ اب کھلم کھلا پاکستان کو توڑ دینے اور بھارت کے ساتھ کنفیڈریشن کی باتیں ہونے لگی ہیں۔ ــــ اور واقعہ یہ ہے کہ بظاہر احوال یہی نظر آتا ہے کہ اللہ کی کوئی خصوصی مشیت اور کوئی خاص خدائی تدبیر ہی پاکستان کی سالمیت کو برقرار رکھ سکتی ہے ۔ ــــ اور اس پر بہرحال ہمارا پختہ ایمان ہے کہ اللہ " فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ "(سورۂ بروج : " جو ارادہ فرمالے اُسے بہر صورت پورا کرنے والا ! ") بھی ہے اور " غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ " (سورۂ یوسف ، آیت ۲۱ : " اپنے کام پر پوری قدرت رکھنے والا ! ") بھی ، اگرچہ اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے !! (وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ) ۔

مہاجرین کا ردِّ عمل

ہندوستان " دو قومی نظریہ " کی بنیاد پر تقسیم ہوا تھا اور پاکستان کا قیام " مسلم قومیت " کی اساس پر عمل میں آیا تھا ــــ اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ یہ قائد اعظم محمد علی جناح کا عظیم کارنامہ تھا کہ انہوں نے اس دور میں جبکہ الحاد اور مادّہ پرستی کو پورے کرّۂ ارضی پر فیصلہ کن غلبہ حاصل ہے اور لادینیت اور وطنی قومیت سیاسیات کے " مسلّمات " میں سے ہیں اپنی خداداد ذہانت و قابلیت اور بے پناہ محنت و مشقت کے بل پر یہ حقیقت منوالی کہ " قومیت کی ہر تعریف کی رُو سے ہندوستان کے مسلمان ایک قوم ہیں ! " قائد اعظم مرحوم کے اس کارنامے کی عظمت کا صحیح انکشاف اس وقت ہوتا ہے جب یہ حقیقت پیش نظر ہو کہ آج کل تو پھر بھی پوری دنیا میں بالعموم اور عالم اسلام میں بالخصوص مذہب کا کچھ نہ کچھ چرچا موجود ہے لیکن آج سے نصف صدی قبل تو صورتِ حال بالکل حضرت اکبر کے اس شعر کے مطابق تھی کہ ؎

" رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں ۔ کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں ! "

پھر اگرچہ تحریکِ پاکستان کا اصل جذبۂ محرکہ مذہبی نہیں تھا بلکہ صرف یہ " خوف " تھا کہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ انصاف اور برابری کا سلوک نہیں کریں گے بلکہ اپنی عددی فوقیت کے بل

پر ان کے حقوق غصب کریں گے اور یہ بھی بعید نہیں کہ ان سے (شریمتی اندرا گاندھی کے الفاظ میں) اپنی ہزار سالہ شکست کا انتقام لیں ـــــ لیکن چونکہ مسلم قومیت کی اساس نہ نسل پر تھی نہ زبان پر بلکہ صرف اور صرف اسلام پر تھی لہٰذا جیسے جیسے قومی تحریک نے قوت پکڑی، مذہبی جوش و خروش بھی، کم از کم زبانی کلامی حد تک، بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ تقسیم ہند سے متصلاً قبل پورے برّ ِعظیم کا طول و عرض ان نعروں سے گونج اٹھا کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ!" اور "پاکستان کا مطلب کیا؟ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ!" ـــــ نتیجۃً اس جذباتی اور ہیجانی فضا میں زمینی و جغرافیائی، تہذیبی و ثقافتی اور نسلی و لسانی، الغرض جملہ 'مادّی' حقائق نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ـــــ بلکہ اگر کسی نے ان کی جانب توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی بھی تو اسے بلاتوقف غدّار اور "ہندو کا زرخرید ایجنٹ" قرار دے دیا گیا۔

بنابریں قیامِ پاکستان سے متصلاً قبل اور اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پاکستان میں مسلم قومیت کا جذبہ ؎ "طبیعت کوئی دم میں پھر جائے گی۔ چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی" کے مصداق اس قدر جلد سرد پڑ جائے گا اور نسلی اور لسانی عصبیتیں اتنی سُرعت سے سر اٹھا لیں گی ـــــ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر پاکستان واقعتہً اسلام کا گہوارہ اور قائدِ اعظم کے قول کے مطابق "اسلام کے اصولِ حرّیت و اخوّت و مساوات" کا نمونہ بن جاتا۔ اور ملّت کا قافلہ اُس سمت میں رواں ہو جاتا جس سے گاندھی جی سب سے زیادہ خائف تھے یعنی "پان اسلام ازم" یا عالمی ملّتِ اسلامی کی نشأۃِ ثانیہ، تو پاکستان میں نسلی و لسانی اور صوبائی و علاقائی عصبیتیں ہرگز پروان نہ چڑھ سکتیں۔

لیکن افسوس کہ ہم من حیث القوم آزادی کے مادّی فوائد کو سمیٹنے میں اس درجہ منہمک ہوئے کہ نہ اپنے مقصد کا دھیان رہا نہ منزل کی فکر ـــــ اور ستم بالائے ستم یہ کہ پاکستان کی سول بیوروکریسی اور ملٹری لیڈرشپ نے سیاسی عمل کو مسلسل روکے رکھا۔ چنانچہ یہاں نہ کُل پاکستان بنیاد پر کوئی مضبوط سیاسی جماعت وجود میں آ سکی، نہ سیاسی روایات مستحکم ہو سکیں نہ ہی سیاسی ادارے پروان چڑھ سکے ـــــ کہ نئے رجحانات کو جمہوری و دستوری خطوط پر ڈالا جا سکتا اور نظریاتی جوش و خروش کے ٹھنڈے پڑنے سے جو 'زمینی حقائق' منظرِ عام

پر آ گئے اور انہوں نے جن نئے مسائل کو جنم دیا انہیں خوش اسلوبی سے حل کیا جا سکتا۔ نتیجتہً پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ "دھماکوں" کی داستان بن کر رہ گئی!

اس سلسلے کا اوّلین اور عظیم ترین دھماکہ مشرقی پاکستان میں ہوا اور وہاں ایک لسانی عصبیت نے باضابطہ "قومیت" کی شکل اختیار کر کے نہ صرف یہ کہ پاکستان کو دولخت کر دیا بلکہ مشرقی پاکستان کو "بنگلہ دیش" میں تبدیل کر کے گویا "مسلم قومیت" کی علی الاعلان نفی کر دی۔ اس ضمن میں یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان میں زبان کا مسئلہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد قائدِاعظم مرحوم کی زندگی ہی میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس میں ایک تو تعجب اور عبرت کا سامان ہے کہ "کجا آں شورا شوری، کجا ایں بے نمکی!" کے مصداق کہاں تو مسلم بنگال میں مسلم قومیت کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۴۶ء میں وہاں کی مسلم لیگی قیادت نے اصرار کر کے ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان میں ترمیم کرائی اور مجوزہ پاکستان کے لئے "ریاستوں" کی بجائے "ریاست" کا لفظ طے کرایا ——— کجا یہ حال کہ ۱۹۴۸ء ہی میں زبان کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا جس کے لئے خود قائدِاعظم مرحوم کو اپنی ضعیفی اور علالت کے باوجود بنفسِ نفیس مشرقی پاکستان کا سفر کرنا پڑا۔ اور دوسرے یہ سبق مضمر ہے کہ زمینی حقائق کو نظرانداز کرنے اور حقیقی و واقعی مسائل سے مسلسل صرفِ نظر کرنے کے نتائج بہت خوفناک ہو سکتے ہیں ——— اس لئے کہ قدرت نے ہمیں ۴۸ء سے ۷۱ء تک لگ بھگ ربع صدی کی مہلت دی لیکن ہم نے مسائل کو حل کرنے کی کوئی کوشش نہ کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک انتہائی رسوا کن شکست اور عبرت ناک ہزیمت کا کلنک کا ٹیکہ نہ صرف ہماری بلکہ پوری عالمی ملتِ اسلامیہ کی پیشانی پر لگ گیا۔

مغربی پاکستان کے صوبہ سندھ میں بھی زبان کے مسئلہ پر بے چینی کے آثار قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ظاہر ہو گئے تھے۔ اور یہاں بھی لسانی عصبیت کی آگ اندر ہی اندر سلگنی شروع ہو گئی تھی لیکن افسوس کہ اس کے ضمن میں بھی ہم تغافل ہی کی روش پر قائم رہے۔ مشرقی پاکستان کے ضمن میں تو یہ عذر بھی پیش کیا جا سکتا تھا کہ وہ ہم سے دور تھا اور ذرائع آمد و رفت نہ اتنے آسان تھے نہ سستے کہ عام لوگ اِدھر اُدھر آجا سکتے اور ایک دوسرے کے حالات سے

واقفیت حاصل کی جا سکتی لیکن سندھ تو ناک تلے کا معاملہ تھا۔ اس کے ضمن میں تو ہم اپنی اجتماعی بے بصیرتی کے سوا اور کسی چیز کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے کہ سندھی نیشنلزم کی آگ اندر ہی اندر پھیلتی رہی اور اس کا دائرہ اثر و نفوذ تیزی سے بڑھتا رہا اور پوری قوم ؏ " تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا ! " کی تصویر بنی رہی۔

لیکن ؏ " فطرت لہو ترنگ ہے غافل، نہ جل ترنگ ! " کے مصداق قدرت کا قانون تو خاموش تماشائی نہیں بنا بیٹھا رہ سکتا تھا —— اور نیوٹن کے بیان کردہ قوانینِ حرکت کے مطابق " ہر عمل کا ایک ردِ عمل ہوتا ہے جو قوت و شدت میں اس عمل کے مساوی لیکن سمت اور رُخ کے اعتبار سے متضاد ہوتا ہے ! " —— چنانچہ جیسے جیسے سندھ میں سندھی نیشنلزم نے زور پکڑا، سندھ میں آباد جملہ غیر سندھی لوگوں میں بالعموم اور اردو بولنے والے "مہاجرین" میں بالخصوص ردِ عمل کا ظہور بھی شروع ہو گیا۔ جو ابتداءً صرف ایک موہوم سی بے چینی اور بے اطمینانی کی صورت میں تھا۔ پھر اس میں مایوسی اور خوف کے منفی احساسات پیدا ہوئے، جن کا عملی ظہور متعدد مراحل سے گزر کر اور " طبقاً عن طبقٍ " ترقی کرتا ہوا آج اتنی خوفناک اور مہیب صورت اختیار کر چکا ہے کہ علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

" اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز !!!
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نون ! "

بالکل ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے پاکستان کی سالمیت پر آخری اور سب سے کاری ضرب لگانے کے لئے ان ہی لوگوں کی نوجوان نسل نے کمر کس لی ہے جو اس عالمِ اسباب میں اس کے قیام کے کریڈٹ کے سب سے بڑے دعویدار تھے ؏ کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں !

پہلا مرحلہ : بیرونِ ملک فرار

اس ردِ عمل کے پہلے مرحلے کو غیر شعوری پسپائی یا خاموش فرار یا بائبل کی اصطلاح میں " خروج " (EXODUS) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے یعنی جب اولاً پاکستان کا دارالخلافہ

کراچی سے اسلام آباد منتقل کیا گیا ـــــ اور ثانیاً مہاجرین کی نوجوان نسل کے کانوں میں "فرزندانِ زمین" (SONS OF THE SOIL) کے قبیل کے الفاظ بار بار پڑنے لگے اور انہوں نے محسوس کیا کہ خود وہ اس زمرے سے خارج ہیں۔ مزید برآں، یہ صدا بھی پیہم سنائی دینے لگی کہ "پاکستان میں چار قومیتیں آباد ہیں: پنجابی، سندھی، پٹھان، اور بلوچ" اور اس فہرست میں بھی انہیں اپنا کوئی ذکر نہیں ملا تو انہیں بالکل اس کیفیت کا سا احساس ہونے لگا جو حضرت مسیحؑ کے ان الفاظ میں جھلکتی ہے کہ "پرندوں کے لئے گھونسلے ہیں، اور جانوروں کے لئے بھٹ، لیکن ابنِ آدم کے لئے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں ہے!" اور انہیں شدت کے ساتھ محسوس ہوا کہ وہ پاکستان کی سرزمین میں 'ناپسندیدہ عنصر'، نہیں تو کم از کم 'بن بلائے مہمان' کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں اور پاکستان فی الواقع ان کا وطن نہیں ہے! ـــــ اور ان زبانی کلامی باتوں پر مستزاد جب سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں داخلے کے ضمن میں 'کوٹہ سسٹم' اور دیہی اور شہری کی تقسیم نے ان پر بالفعل معیشت کا دائرہ تنگ اور ترقی کی راہیں مسدود کرنی شروع کر دیں تو مہاجرین کی نئی نسل نے پاکستان میں اپنے مستقبل سے مایوس ہو کر باہر کا رُخ کیا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے وطن کو خیرباد کہہ کر دیارِ غیر میں جا ڈیرہ لگایا۔ چنانچہ اب خصوصاً کراچی میں ایک بڑی تعداد ایسے مہاجر خاندانوں کی ہے جن کی پوری نوجوان نسل ملک سے باہر جا چکی ہے اور یورپ اور امریکہ کے مختلف ممالک میں مستقل سکونت اختیار کر چکی ہے۔ یہاں تک کہ کراچی میں بہت سے بڑے بڑے مکانوں اور عالیشان کوٹھیوں میں اب صرف بوڑھے والدین رہتے ہیں یا، جب وہ بھی کسی بیٹے یا بیٹی کے پاس گئے ہوتے ہیں تو صرف مالی اور چوکیدار!

ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کے سامنے اس معاملے کا یہ روشن پہلو ہو کہ ان باہر جانیوالوں کے ارسال کردہ زرِ مبادلہ سے ملکی معیشت کو سہارا ملا اور اس طرح ملک و ملت کو فائدہ پہنچا لیکن اگر ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ اس میں ایک بہت بڑا مغالطہ مضمر ہے ـــــ اس لئے کہ اوّل تو یہ زرِ مبادلہ ان اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے ذریعے آیا ہی نہیں جو مختلف مغربی ممالک کی شہریت اختیار کر کے وہاں مستقلاً آباد (SETTLE)

ہو گئے ہیں بلکہ اس کا اکثر و بیشتر حصّہ ان مزدوروں اور کاریگروں کی محنت و مشقت کا حاصل ہے جو خالص عارضی طور پر باہر گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے خون پسینے کی کمائی وطن بھیج رہے ہیں تاکہ واپسی پر بہتر زندگی گذار سکیں ـــــ ثانیاً اگر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی ملک بدری سے کوئی مالی فائدہ ہوا ہو تب بھی علاّمہ اقبال کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

"دیں ہاتھ سے دیکر اگر آزاد ہو ملت ! ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا!"

یہ بڑے گھاٹے اور خسارے کا سودا ہے۔ اس لئے کہ اس تلخ ترین حقیقت سے قطع نظر کہ دیارِ مغرب میں مستقل طور پر آباد ہونے والوں کی آئندہ نسل کی عظیم اکثریت کے بارے میں شدید خطرہ ہے کہ وہ اپنے دین و مذہب ہی نہیں، اپنی ثقافت و معاشرت حتّٰی کہ ملی غیرت و حمیت سے محروم ہو کر مغرب کی بے خدا تہذیب اور مادر پدر آزاد معاشرت میں گم ہو جائے گی، خود پاکستان کے مستقبل کے اعتبار سے قابلیت و مہارت کا یہ نقصان (TALENT LOSS) اور ذہانت و فطانت سے یہ محرومی (BRAIN DRAIN) مُضر ہی نہیں مہلک ہے!

اور کم از کم ان سطور کے راقم کو تو اس صورتِ حال میں ع "توسے فرو ختند و چہ ارزاں فرو ختند!" کی سی کیفیت کا احساس ہوتا ہے! ـــــ اور جب ذاتی احساس کی بات آ ہی گئی تو یہ عرض کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ راقم کے لئے اس معاملے کا سب سے زیادہ دردناک اور تکلیف دِہ پہلو یہ ہے کہ پاکستان سے مستقلاً باہر چلے جانے والے ان تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک کثیر تعداد اُن کی بھی ہے جو اپنی جوانی کے دَور میں مختلف دینی تحریکوں کے زیرِ اثر آنے کے باعث احیائے دین و ملّت کے جذبے سے سرشار ہو گئے تھے۔ اور اگر یہ پوری قوت ملک میں موجود رہتی تو کم از کم بظاہر احوال یہی نظر آتا ہے کہ پاکستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی تعمیر بھی زیادہ مستحکم بنیادوں پر ہوتی اور یہاں اسلامی انقلاب کے امکانات بھی کہیں زیادہ روشن ہوتے ـــــ واللہ اعلم!

اس ضمن میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگرچہ غیر ممالک میں مستقلاً آباد ہو جانے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ پاکستانیوں میں مہاجرین کے ساتھ ساتھ ایک بڑی تعداد پنجابیوں اور قدرِ قلیل مقدار پٹھانوں کی بھی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک و ملت کی تعمیر و ترقی

اور قوم کی عمومی خوشحالی اور عوامی بہبود کے نقطۂ نظر سے ان سب ہی کی صلاحیتوں سے محرومی عظیم زیاں کاری ہے ـــــ لیکن مہاجرین کا معاملہ کئی اعتبارات سے مختلف بھی ہے اور اہم تر بھی! مثلاً ایک اس اعتبار سے کہ ان کی نوجوان اعلیٰ تعلیم یافتہ نسل کا یہ 'خروج' بہت بڑے پیمانے (MASS SCALE) پر ہوا ـــــ دوسرے یہ کہ ان کی اکثریت کی وطن سے ہجرت کا اصل سبب "ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!" کے مصداق اعلیٰ سے اعلیٰ تر کی تلاش نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ وطن میں اپنا مستقبل انہیں بالکل ہی تاریک نظر آرہا تھا ـــــ اور آخری لیکن اہم ترین بات یہ کہ چونکہ وہ خود یا اُن کے والدین بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے لہٰذا ان میں خواہ شعوری سطح پر دین کے فہم و ادراک میں کمی رہی ہو، اور عملی سطح پر ٹھیٹھ دینی اخلاق و کردار بھی وافر مقدار میں موجود نہ ہوں، کم از کم جذبۂ ملی بدرجۂ اتم موجود تھا اور امتِ مسلمہ کی عظمت و سطوتِ گذشتہ کی بازیافت کی شدید خواہش بہرحال موجود تھی ـــــ اور آج پاکستان کے استحکام ہی نہیں، وجود و بقا تک کو سب سے بڑا خطرہ اسی جذبے اور آرزو کے فقدان سے لاحق ہے! ـــــ اور اگر دل کے کان بند نہ ہوں تو ہر حساس و مخلص پاکستانی مسلمان کو جذبۂ ملی سے سرشار اور ملتِ اسلامی کی نشأۃ ثانیہ کی آرزومند اس نوجوان قوت کے وطن سے فرار پر علامہ اقبال کی روح یہ فریاد کرتی سُنائی دے گی کہ ؎

"آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر ـــ ڈھونڈ اب ان کو چراغِ رُخِ زیبا لے کر!"

اور ؎ میں کہ میری نوا میں ہے آتشِ رفتہ کا سُراغ ـــ میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!"

دوسرا مرحلہ: پنجابیوں اور پٹھانوں کے ساتھ دفاعی اتحاد

ملک سے باہر چلے جانے والوں کا معاملہ جذباتی اور نفسیاتی نقطۂ نظر اور ملک و ملت کے مستقبل کے اعتبار سے نہایت اہم ہونے کے باوجود، ظاہر ہے کہ 'مقدار اور کمیت' کے اعتبار سے اتنا موثر نہیں تھا کہ اندرونِ ملک ردِ عمل کی مزید پیش رفت کے لئے زینہ بن سکتا: اس لئے کہ اوّل تو باہر جانے والے صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے، نسبتاً کم تر

علمی صلاحیتوں کے حامل لوگوں کے لئے باہر کا راستہ بہت بعد میں کھلا (اور وہ بھی امریکہ وغیرہ میں نہیں بلکہ اکثر و بیشتر صرف سعودی عرب اور خلیج کی ریاستوں میں، جہاں کا معاملہ خالص عارضی ہے!) ــــــ پھر جیسے جیسے وقت گذرا یورپ اور امریکہ وغیرہ کی ضروریات بھی پوری ہوتی چلی گئیں اور اس طرح گویا دنیا کی "انسانی منڈیوں" میں "مانگ" کم ہوتی گئی اور بیرونِ ملک امکانات بھی روشن نہ رہے تو ملک کے اندر رہتے ہوئے اپنے مستقبل کے تحفظ کی فکر لاحق ہوئی ــــــ اور اس طرح عملی جوابی کارروائی کا آغاز ہوا، جسے اس ردِ عمل کا دوسرا مرحلہ قرار دیا جاسکتا ہے!

اس سلسلے میں پہلے قدم کے طور پر مسٹر جی ایم سید کے قائم کردہ "سندھ متحدہ محاذ" کے مقابلے میں "سندھ کراچی مہاجر پنجابی پٹھان متحدہ محاذ" کا قیام عمل میں آیا جس کے بانی و مؤسس اور روحِ رواں نواب مظفر حسین خاں مرحوم تھے۔ جس نے پہلی بار کھلے الفاظ میں سندھی نیشنلزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھنے اور سندھ میں آباد دوسری قومیتوں کے حقوق کے تحفظ کی بات کی۔ یہ محاذ اوائل اکتوبر ۱۹۶۹ء میں حیدرآباد سندھ میں منعقدہ کنونشن میں قائم ہوا جس میں یہ طے کیا گیا کہ "محاذ کی رکنیت ہر اس بالغ مرد اور عورت کو دی جائے گی جسے مسٹر جی ایم سید کے جدید فلسفۂ قومیت کے اصول پر غیر سندھی یا نیا سندھی پکارا جاتا ہے" ــــــ روزنامہ نوائے وقت کے سیاسی مبصر جناب محمد علی کے مضمون کے مطابق:

"کنونشن کے ابتدائی اجلاس میں جو قراردادیں منظور کی گئیں تھیں ان میں کہا گیا تھا کہ ان اعلیٰ افسران کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کی جائے جو نظریۂ پاکستان اور اسلام سے انحراف کر کے تعصب و عصبیت کی بنیاد پر کاروبار زندگی چلا رہے ہیں۔ بھارت میں فسادات سے متاثرہ افراد کے لئے پاکستانی سرحد کھولی جائے اور بھارتی حکومت کے مسلمان دشمن طرزِ عمل کی مذمت کی جائے۔ صوبائی و لسانی تعصب کا خاتمہ کیا جائے۔ سندھ کے آبادکاروں کی زبردستی بے دخلی روکی جائے۔ پنجابی آبادکاروں کو قانونی تحفظ فراہم کیا جائے ان ہندوؤں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے جو تقسیم کے وقت

بھارت چلے گئے تھے۔ لیکن اب واپس آکر مسلمانوں کی املاک پر قبضہ کر رہے ہیں۔ کوٹہ سسٹم ختم کیا جائے۔ فنی تعلیمی اداروں میں اہلیت وقابلیت کے اصول پر عمل کیا جائے۔ مارشل لاء ریگولیشن ۸۹٫۸۹٫۹۱ کی تنسیخ کی جائے۔"

نتیجہ : خونی تصادم

اندرون سندھ اس وقت تک جو فضا تیار ہو چکی تھی اس کے پیش نظر یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ قدیم سندھیوں نے اس محاذ کے قیام اور اس کی مندرجہ بالا قرار داد کو اپنے خلاف "اعلانِ جنگ" سمجھا اور اس طرح جو آگ اب تک اندر ہی اندر سُلگ رہی تھی اُس کے بھڑک اُٹھنے اور منظر عام پر آجانے کا وقت آگیا۔ چنانچہ اولاً ۲۶ جنوری ۷۱ء ہی کو (گویا محاذ کے قیام کے چار پانچ ماہ کے اندر اندر) حیدرآباد میں مہاجر اور سندھی طلبہ کے مابین خوں ریز تصادم ہوا اور اس کے کُل دو ہی سال بعد ۱۹۷۲ء میں سندھ کے طول و عرض میں "لسانی فسادات" کا دھماکہ ہو گیا۔

۷۲ء کے ان لسانی فسادات کی وسعت اور تیزی و تُندی سے قطع نظر اولاً یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ یہ ۷۱ء کے سقوطِ مشرقی پاکستان کے حادثۂ فاجعہ کے فوراً بعد ہوئے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں "روح فرسا واقعات" کا تعلق کسی ایک ہی بین الاقوامی سازش سے تھا ـــــــ ثانیاً اس بظاہر خالص اندرونی معاملے اور داخلی مسئلے کے ڈانڈے کس طرح سندھی ہندوؤں کی وساطت سے بھارت کے ساتھ ملے ہوئے تھے اس کا اندازہ ان الفاظ سے کیا جاسکتا ہے جو "ٹھ نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں" کے مصداق مشرقی پاکستان کی "فتح" کے نشے میں بدمست ہونے کے باعث آنجہانی اندرا گاندھی کی زبان سے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے نکل گئے تھے کہ "میں بہت جلد آپ لوگوں کو ایک اور بہت بڑی خوشخبری بھی سنانے والی ہوں!" ـــــــ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت میں ابھی ہمارے لئے مزید مہلت مقدر تھی اور عذاب کے یہ کوڑے دراصل اس سُنّتِ الٰہی کا مظہر تھے جو سورۂ سجدہ کی آیت ۲۱ میں

بریں الفاظ وارد ہوئی ہے ــــ " وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ " یعنی " ہم انہیں اپنے آخری اور بڑے عذاب سے پہلے چھوٹے عذاب کا مزہ چکھائیں گے، شاید کہ یہ اپنی روش سے باز آجائیں " ــــ لہٰذا ملک وملت کے دشمنوں کی دلی آرزوئیں پوری نہ ہو سکیں اور پاکستان کا نام صفحۂ ہستی سے بالکلیہ نہ مٹایا جاسکا!

واضح رہے کہ ارادۂ خداوندی سے قطع نظر، عالم اسباب میں اس کے تین نمایاں سبب تھے: ایک یہ کہ امریکہ میں اس وقت عارضی طور پر صدر نکسن برسرِ اقتدار تھے جن کے پاکستان کی جانب جھکاؤ (PRO-PAKISTAN TILT) کا آنجہانی اندرا گاندھی کو عمر بھر گلہ رہا۔ دوسرے یہ کہ پاکستان میں اس وقت مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت قائم تھی جو خود تو سندھی تھے مگر انہیں سیاسی تائید (SUPPORT) سندھ سے بھی کہیں زیادہ پنجاب سے حاصل تھی اور اس طرح ان کی شخصیت کو اس وقت مغربی پاکستان کے ان دو سب سے بڑے صوبوں کے مابین رابطے (LINK) کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور تیسرے یہ کہ سندھی نیشنلزم کے انتہا پسند علمبرداروں سے اس موقع پر ایک اہم غلطی یہ سرزد ہوگئی کہ انہوں نے مہاجروں اور پنجابیوں دونوں کے خلاف اپنی نفرت وعداوت کا اظہار بیک وقت کر دیا اور سندھی انتہا پسندی ابھی اتنی مضبوط اور توانا نہ تھی کہ بیک وقت دونوں محاذوں پر مقابلہ کر سکتی!

بھٹو دَور کی نظریاتی محاذ آرائی

اس وقت، ظاہر ہے کہ، نہ مسٹر بھٹو کے ذاتی محاسن و معائب کا جائزہ لینا پیشِ نظر ہے، نہ ان کے پانچ سالہ دورِ حکومت کا تفصیلی میزانیۂ نفع و نقصان مرتب کرنا مطلوب ہے، البتہ موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے اس حقیقت کی جانب اشارہ ضروری ہے کہ اس دَور کے آغاز و اختتام، دونوں مواقع پر ملک میں نظریاتی تقسیم اور اس سے پیدا شدہ افقی محاذ آرائی (HORIZONTAL POLARISATION) اتنی شدت کے ساتھ پیدا ہوئی کہ اس کے نتیجے

میں علاقائی اور نسلی و لسانی اختلافات اور ان سے پیدا ہونے والی عمودی تقسیم ———
(VERTICAL POLARISATION) کسی قدر پس منظر میں چلی گئی۔ چنانچہ اس دور کا آغاز گویا دائیں اور
بائیں بازو کے پُر زور تصادم اور "اسلام" اور "سوشلزم" کے مابین دھواں دھار
جنگ سے ہوا تھا (اگرچہ اس تصادم اور جنگ کی حیثیت زیادہ تر محض کاغذی اور ہوائی
تھی!) اور اس کا اختتام بھی پاکستان قومی اتحاد (P.N.A.) کی اُس تحریک کے ذریعے
ہوا جو اگرچہ ابتدا میں تو خالص سیاسی نوعیت کی تھی لیکن بعد میں رفتہ رفتہ تحریکِ نظام مصطفےٰ
(صلی اللہ علیہ وسلم) کی صورت اختیار کر گئی۔ چنانچہ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں
کہ اس کے دوران تحریکِ پاکستان کے آخری اور فیصلہ کن ایام کی کیفیات عود کر آئی تھیں
اور صرف قومی و ملی ہی نہیں، دینی اور مذہبی جوش و خروش بھی ایک بار پھر نقطۂ عروج کو پہنچ
گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں علاقائی اور لسانی عصبیتوں کا معاملہ لامحالہ پس منظر میں چلا گیا،
یہاں تک کہ بالکل ایسے جیسے تحریکِ خلافت کے عروج کے دوران گاندھی ایسے ہندو
'مہاتما' کو اس میں شمولیت اختیار کرنی پڑی تھی، سندھی نیشنلزم کے 'گورو' یعنی
مسٹر جی ایم سیّد کو بھی، خواہ دبی زبان ہی سے سہی، پاکستان قومی اتحاد کی تحریک کی تائید
کرنی پڑی۔

اس نظریاتی تصادم کے اثرات کے علاوہ چونکہ بھٹو دور میں پاکستان میں ایک طویل
عرصے کے بعد پہلی مرتبہ 'عوامی سیاست' کی گہما گہمی پیدا ہوئی تھی اور عوام میں خواہ صحیح
خواہ غلط، یہ احساس ضرور پیدا ہوا تھا کہ اب ہمارے معاملات ہمارے اپنے ہاتھوں
میں ہیں (اور یہ احساس بجائے خود بہت تسکین بخش ہوتا ہے!) لہٰذا اس دور میں
سیاسی محرومی کے اس عمومی احساس میں بھی کمی پیدا ہوئی جسے سندھ میں خصوصی شدت کے
ساتھ محسوس کیا گیا تھا ——— اور ان سب پر 'مستزاد' اس واقعے نے بھی سندھ
کے خصوصی احساسِ محرومی میں بہت کمی کر دی تھی، بلکہ اہلِ سندھ کے زخموں پر مرہم کا کام
کیا تھا، کہ اب پاکستان کی مرکزی حکومت کے سنگھاسن پر ایک سندھی براجمان ہے!
اِن جملہ عوامل کے باوجود اس دور میں بھی سندھی نیشنلزم کا جذبہ بالکل سرد نہیں

پڑا تھا بلکہ یہ ”آگ بجھی ہوئی نہ جان، آگ دبی ہوئی سمجھ!“ کے مصداق اُس نے دوبارہ صرف اندر ہی اندر سلگنے والی آگ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خود بھٹو صاحب کو سندھی نوجوانوں کی جذباتی کیفیت کے پیشِ نظر ”کوٹہ سسٹم“ کو دس سال تک کے لئے دستوری تحفظ فراہم کرنا پڑا۔ مزید برآں ـــــ کل پاکستان سطح پر ”قائدِ عوام“ کی حیثیت تو صرف ذوالفقار علی بھٹو کو حاصل ہوئی تھی، اُن کے دوسرے سندھی رفقاء اور اعزہ و اقارب کو تو بہرحال اپنی سیاست کی بساط سندھ ہی کی اساس پر بچھانی تھی۔ لہٰذا انہوں نے بھی درپردہ سندھی نیشنلزم کی حمایت کی۔ چنانچہ اس دور میں بھی انتہاپسند سندھی قوم پرستی کا لاوا اندر ہی اندر کھولتا رہا اور اس کی سوزش اور جلن جملہ ”نئے سندھیوں“، اور خاص طور پر اردو بولنے والے مہاجرین کی نوجوان نسل کو محسوس ہوتی رہی۔ نتیجۃً جوابی ردِ عمل کا مواد بھی اندر ہی اندر پکتا رہا ـــــ اور کون کہہ سکتا ہے کہ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں دھاندلی کے خلاف جو ”دھماکہ خیز“ تحریک سندھ کے تمام شہروں اور خاص طور پر کراچی میں شروع ہوئی تھی اس کے اسباب و عوامل میں ”نئے سندھیوں“ اور خصوصاً ان کی نوجوان نسل کے اس ردِ عمل کو فیصلہ کن دخل حاصل نہ تھا!

جنرل ضیاالحق
کا دورِ حکومت اور موجودہ صورتِ حال

جنرل محمد ضیاء الحق بالقابہ کا نو سالہ دورِ حکومت اِس داستان کا المناک ترین باب ہے۔ چنانچہ اس عرصے کے دوران وہ جملہ کیفیات جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اپنے آخری نقطۂ عروج کو پہنچ گئیں۔

اِس عہد کے ابتدائی پانچ سالوں کے دوران ـــــ ایک طرف تو مارشل لاء کے نفسیاتی رعب کی وجہ سے ملک میں جیل کے ”سب اچھا“ کا سا سماں بندھا رہا، اور ـــــ دوسری

ف کچھ نفاذِ شریعت کے دعووں اور شرعی عدالتوں کے قیام، کچھ مذہبی تقریبات کی رونق روزی اور رویتِ ہلال کے شاندار اہتمام اور کچھ علمائے کرام کی خاطر مدارات اور مشائخِ عظام کے اعزاز و اکرام کی وجہ سے فضا پر مذہبیت کا ظاہری اور سطحی رنگ قائم رہا، مزید برآں جشنِ ستقلال اور یوم اقبال کے قبیل کی قومی تقریبات، پر پانی کی طرح پیسہ بہانے سے پاکستانیت کا بھی چرچا رہا ——— اور اس طرح مجموعی طور پر یہ تاثر قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی کہ اسلام اور نظریۂ پاکستان کی جانب فیصلہ کن مراجعت ہو رہی ہے اور ان کے منافی رجحانات رفتہ رفتہ ختم ہو رہے ہیں!

لیکن افسوس کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی اور حضرت اکبر کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

"مذہب کی لیپ پوت سے دبتی نہیں ہے عقل — بس عشق ہی مٹاتا ہے اس کی کُرید کو!"

اِس ظاہری ٹیپ ٹاپ کے پردے میں زیرِ سطح رجحانات (UNDER-CURRENTS) مسلسل قوت پکڑتے اور شدّت اختیار کرتے چلے گئے۔ جن میں دو اگرچہ ملک گیر تھے۔ لیکن ان کی شدّت کا سب سے زیادہ ظہور سندھ میں ہوا اور تیسرا تو تھا ہی خالصتہً (EXCLUSIVELY) سندھ سے متعلق۔

تین منفی نتائج

مقدّم الذکر ملک گیر اثرات میں سے پہلا یہ کہ مارشل لاء کے نفاذ سے فطری اور منطقی طور پر سیاسی محرومی کا اِحساس دوبارہ شدّت کے ساتھ پیدا ہو گیا اور اس بار چونکہ فوری تقابل بہت نمایاں تھا کہ کہاں بھٹو دَور کی عوامی سیاست کی گہما گہمی اور کہاں مارشل لاء کا قبرستان کا سا سکوت، لہٰذا اِس مرتبہ اُس کا اِحساس بھی بہت شدّت سے ہوا۔ بالخصوص سندھ میں تو اس نے غالب کے "جوہرِ اندیشہ" کی سی حدّت اختیار کر لی (؎ "عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں۔ کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل اٹھا"!) اور ریگزارِ سندھ واقعتہً نفرت اور بغاوت

بڑھنے لگی اور دوسری جانب ملک وملت کے کھلے دشمنوں اور اغیار کے ایجنٹوں کو بھرپور کی آگ میں جلنے لگا! چنانچہ ایک جانب سندھی قوم پرستی تیزی کے ساتھ انتہا پسندی کی طرف
موقع مل گیا کہ وہ 'پنجابی فوج' اور 'پنجابی سامراج' کے حوالے سے پنجاب اور اہل پنجاب کے
خلاف نفرت و عداوت کی آگ کو پوری شدت کے ساتھ بھڑکائیں ——— اور سندھ کی مظلومیت
اور اہلِ سندھ کے حقوق کی دہائی دے کر قدیم سندھیوں کے جذبات کو مشتعل کریں اور بھولے
بھالے عوام الناس ہی نہیں بیٹھے دینی مزاج کے حامل لوگوں حتّٰی کہ علماء کرام تک کو 'حقوق
کی بازیافت' کے جذبے سے سرشار کر کے بالفعل ایجی ٹیشن کے میدان میں لے آئیں!۔
اور اس جلتی آگ پر تیل ہی نہیں، پٹرول کا کام کیا مسٹر بھٹو کی پھانسی نے ——— خصوصاً
اس لیے کہ بدقسمتی سے سپریم کورٹ کے جس فیصلے کی رُو سے انہیں یہ سزا ملی وہ متفقہ
(UNANIMOUS) نہیں تھا بلکہ کثرتِ رائے پر مبنی تھا، اور ستم بالائے ستم یہ کہ جن چار جج
حضرات نے ہائی کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھا وہ سب پنجاب سے تعلق رکھتے تھے اور بقیہ
تین جج جنہوں نے انہیں بری کرنے کی رائے دی وہ سب غیر پنجابی تھے۔ نتیجتہً پنجاب کے
خلاف اہلِ سندھ کی نفرت میں انتقامی جذبہ بھی شامل ہو گیا۔

مختصر یہ کہ اس عرصے کے دوران رفتہ رفتہ اندرونِ سندھ بالکل وہ حالات پیدا ہو گئے
جو کبھی مشرقی پاکستان میں ہوئے تھے اور جس طرح وہاں بنگالی نیشنلزم کے علمبرداروں کے
مقابلے میں محبِّ وطن عناصر بے بس ہو کر رہ گئے تھے اسی طرح سندھ میں بھی 'سندھو دیش'
کے حامیوں کے مقابلے میں پاکستان کی یکجہتی اور سالمیت کے علمبردار غیر مؤثر ہوتے چلے گئے
چنانچہ بعینہٖ اس طرح جیسے ایک بار مولوی فرید احمد مرحوم و مغفور کے خلاف ڈھاکہ ائیرپورٹ
پر ایک مظاہرے میں نعرے لگے تھے کہ" پنجابار دلّال پھیری جاؤ" یعنی "پنجابیوں کے
ایجنٹ اور دلّال واپس چلے جاؤ"، اسی طرح کا نقشہ سامنے آتا ہے مس بے نظیر بھٹو کے
اس حالیہ بیان میں کہ" اب سندھ میں جو بھی وفاق کی بات کرتا ہے اُسے پنجاب کا ایجنٹ
قرار دے دیا جاتا ہے!" ——— راقم الحروف کو اس صورتِ حال کا اندازہ ۱۹۸۲ء ہی
میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے دسمبر ۱۹۸۲ء میں جنرل ضیاء الحق کے نام خط میں واضح طور پر

لکھ دیا تھا کہ :-

"... ــــ اس ضمن میں غالباً آپ کے اطمینان کا باعث یہ امر ہے کہ آپ کے
خلاف کوئی عوامی تحریک تاحال نہ چل سکی ہے، نہ ہی اس کا کوئی فوری اندیشہ
موجود ہے ـــــ اس سلسلہ میں میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں
کہ خدارا اس صورتِ حال سے دھوکا نہ کھایئے۔ اس لیے کہ اس کا اصل
سبب بین الاقوامی حالات ہیں جن کے باعث پاکستان کے محبِّ وطن بالخصوص
دینی و مذہبی مزاج کے لوگ کوئی 'RISK' لینے کو تیار نہیں ہیں ـــــ لیکن
ایک تو کون نہیں جانتا کہ بین الاقوامی حالات میں کوئی بھی تبدیلی کسی بھی وقت
رُونما ہو سکتی ہے اور دوسرے ملک کے بقا و استحکام کے لیے یقیناً بین الاقوامی
صورتِ حال بھی کسی قدر اہم ہوتی ہے لیکن اصل اہمیت اس ملک کے اپنے
عوام کے اطمینان کی ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں بالخصوص اندرونِ صوبۂ سندھ جو لاوا پک رہا ہے، مجھے یقین
ہے کہ اس کا علم آپ کو بھی لازماً ہو گا۔ لیکن میں اس امکان کو بھی یکسر نظر انداز
نہیں کر سکتا کہ بعض اوقات صاحبِ اقتدار لوگوں کے ارد گرد جن لوگوں کا
حصار قائم ہو جاتا ہے وہ اُسے صحیح صورتِ حال سے مطلع نہیں ہونے دیتے۔
میرے اندازے میں سندھ میں "سندھو دیش" کے لیے میدان پوری طرح
اُسی طرح ہموار ہو چکا ہے جیسے مشرقی پاکستان میں "بنگلہ دیش" کے لیے ہوا تھا
اور اب فرق صرف یہ ہے کہ چونکہ مشرقی پاکستان ہم سے دُور اور کٹا ہوا تھا،
اس لیے مرکزی حکومت وہاں مؤثر کنٹرول نہ کر سکی اور سندھ چونکہ زمینی طور
پر ملحق ہے لہٰذا یہاں ایسی کسی بھی تحریک کو بآسانی کچلا جا سکتا ہے لیکن میرے
نزدیک اس عامل (FACTOR) پر بہت زیادہ انحصار بھی سخت
ناعاقبت اندیشی ہے ......"

افسوس صد افسوس کہ راقم کے اندیشے صحیح ثابت ہوئے اور اس تحریر کے سات آٹھ

ماہ کے اندر اندر ایم۔آر۔ڈی کی تحریک کے ضمن میں سندھ کا آتش فشاں پھٹ گیا اور اتنا زور دار 'دھماکہ' ہوا کہ اچھے اچھے سیاسی مدبر و مبصر بھی حیران رہ گئے! ــــــ لیکن سورۃ قیامہ کے الفاظ " اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی ثُمَّ اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی " کے مصداق مزید افسوس اور پھر مزید افسوس ہے اس پر کہ تاحال نہ سندھ کے اصل مرض کی تشخیص کی جانب کوئی توجہ ہے نہ اُس کے ازالے کی کوئی فکر، بلکہ کل تکیہ اور بھروسہ بالکل المیہ مشرقی پاکستان کے مانند صرف طاقت کی دلیل یا پھر ایک سُپر پاور کی موہوم تائید پر ہے۔

(۲) دوسرا ملک گیر نتیجہ برآمد ہوا اس سے کہ اسلام اور نفاذِ اسلام کا نعرہ جس شد و مد اور جس بلند بانگ انداز میں لگایا گیا اُس کے مقابلے میں حقیقی اور واقعی پیش رفت کا تناسب بالکل نہ ہونے کے برابر رہا اور معاشرہ اور قوم کا حال نہ صرف یہ کہ جُوں کا توں رہا بلکہ پہلے سے بھی بدتر ہو گیا چنانچہ انفرادی اخلاق و کردار کی پستی بھی بڑھتی چلی گئی، انتظامی ابتری اور امن و امان کی زبوں حالی بھی روز افزوں ہوتی گئی۔ (جس کا نمایاں ترین مظہر یہ کہ خود " مقتدر اعلیٰ " کے قول کے مطابق رشوت پہلے سے بھی کئی گنا بڑھ گئی) اور اس کے ساتھ ساتھ سماجی ظلم اور معاشی استحصال کی جملہ صورتیں بھی جُوں کی توں برقرار رہیں ــــــ لہٰذا اسلام دشمن قوتوں کو بھرپور موقع ملا کہ اسلام کو بدنام کریں اور پاکستان کی سالمیت کے خلاف ریشہ دوانیوں سے بھی آگے بڑھ کر خود 'نظریۂ پاکستان' پر کاری ضرب لگائیں۔ اسلام اور نظام اسلامی کے ساتھ تمسخر و استہزاء کے اِس سنہری موقعے سے پورا فائدہ اٹھانے والوں میں غیر مسلموں، کمیونسٹوں اور مارکسسٹوں کے علاوہ وہ مغرب زدہ اور جدیدیت گزیدہ 'لبرل' مسلمان بھی شامل ہو گئے جو یا تو باضابطہ الحاد کا شکار ہو چکے ہیں یا کم از کم نظامِ اجتماعی کی حد تک لادینیت (سیکولرزم) کے قائل ہیں۔ چنانچہ اوّلاً نماز آرڈیننس کا مذاق اڑا، پھر زکوٰۃ اور حدود آرڈیننس کی مٹی پلید ہوئی، پھر نظام زکوٰۃ کے سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہونے کا چرچا ہوا، آخر میں "نظام صلوٰۃ" کی باری آ ہی رہی تھی کہ وہ دورانِ ولادت ہی راہیٔ ملکِ عدم ہو گیا ــــ

اِس سلسلے میں بھی راقم کوئی تازہ رائے یا تبصرہ پیش کرنے کی بجائے اپنے اُنہی احساسات کو دوبارہ ریکارڈ پر لانا زیادہ مناسب سمجھتا ہے جن کا اظہار اُس نے ۱۹۸۲ء میں صدر ضیاء الحق

کے نام اپنے متذکرہ بالا خط میں کیا تھا :-

"۔۔۔۔۔ جہاں تک اِس ملک میں اِسلامی شعائر کی ترویج اور شریعت اسلامی کے نفاذ ــــــ یا بالفاظِ دیگر 'اسلامی نظام' کے قیام کا تعلق ہے اُس کے بارے میں مجھے اِس وقت کچھ عرض نہیں کرنا جس کا اصل سبب' میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں' یہ ہے کہ اس معاملے میں میں آپ سے قطعاً مایوس ہو چکا ہوں اور عرض و معروض اور گلہ شکوہ وہیں ہوتا ہے جہاں کوئی توقع موجود ہو ۔۔۔ اِس ضمن میں' جیسا کہ میں نے ۲۰ اگست ۸۰ء کو علماء کنونشن میں اپنی تقریر میں عرض کیا تھا' ابتدائی تین سال' جو اِس اعتبار سے نہایت قیمتی تھے کہ "تحریک نظام مصطفےٰ" کا جوش و خروش برقرار تھا اور ملکی فضا میں وہ کیفیت قائم تھی کہ نظامِ اسلامی کے نفاذ کے ضمن میں بڑے سے بڑا اقدام بھی بلا روک ٹوک کیا جا سکتا تھا' تعطّل و تربّص کے نذر کر دیئے گئے۔

پھر جب حدود اور زکوٰۃ آرڈیننس کا اجراء ہوا اور اس پر اہلِ تشیع کی جانب سے جارحانہ ردِّ عمل ظاہر ہوا تو نہ صرف یہ کہ گھٹنے ٹیک دیئے گئے بلکہ ــــــ زیادہ قابلِ افسوس اور اہم تر بات یہ کہ نظامِ زکوٰۃ کے ضمن میں شیعہ اور سُنّی کے مابین تفریق کر کے ضعیف الایمان یا ناواقف سنیوں کے شیعہ بن جانے کا دروازہ کھول دیا گیا ــــــ اِس کے باوجود کہ میں نے ۱۸ اگست ۸۰ء کے مشاورتی اجلاس میں خدا کا واسطہ دے کر عرض کیا تھا کہ اِس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ آپ زکوٰۃ آرڈیننس پورے کا پورا واپس لے لیں اور زکوٰۃ کی ادائیگی کو حسبِ سابق عوام کا نجی معاملہ قرار دے دیں ــــــ لیکن خدا را اِس میں شیعہ اور سُنّی میں فرق و امتیاز نہ قائم فرمائیے گا۔

اجتماعیاتِ انسانیہ کے ذیل میں اوّلین معاملہ عائلی اور سماجی نظام کا ہے اور اِس کے ضمن میں ایک طرف عائلی قوانین کو شریعت کورٹ کے دائرہ کار اور

حدود اختیار میں لانے کی جرأت آپ اس لیے نہیں کر پا رہے کہ بعض اعلیٰ
طبقات کی بیگمات اور کچھ مغرب زدہ خواتین کی جانب سے ناموافق ردِّ عمل
کا اندیشہ ہے ـــــــ اور دوسری طرف معاشرہ میں خواتین کے مقام و
کردار اور ستر و حجاب یا خود آپ کے الفاظ میں "چادر اور چار دیواری" کے
ضمن میں اسلام کے نقطۂ نظر کے بارے میں جو اختلافات گذشتہ دنوں ہمارے
ملک میں زور شور سے ظاہر ہوتے، اُس کے بارے میں اگرچہ زبانی تو آپ
نے کچھ باتیں ایسی بھی کہیں جو دینی طبقات کے لیے اطمینان بخش تھیں، لیکن
عملاً اپنا پورا وزن مغرب زدہ اور اباحیت پسند طبقے میں ڈال رکھا ہے ۔
(بالخصوص آپ کے حالیہ غیر ملکی دوروں کے دوران آپ کی اہلیہ صاحبہ
محترمہ کا یہ طرزِ عمل کہ سر سے چادر بھی اُتر گئی اور نامحرموں سے مصافحہ بھی ہو
گیا، از خود فیصلہ کن تھا، لیکن اس پر مزید مہر تصدیق آپ کے اُن فرمودات
سے ثبت ہو گئی جو آپ نے اغلباً ہوسٹن میں ارشاد فرمائے تھے)
بنا بریں پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کے عظیم معرکے کے آپ کے
ہاتھوں سر ہونے کی اب کم از کم مجھے کوئی امید باقی نہیں رہی ـــــــ اور
مجھے اِس رائے تک پہنچنے میں کہ یہاں اسلام صرف انقلابی طریق کار ہی سے
آسکتا ہے، آپ کے اِس جملے نے بھی مدد دی جو بلدیاتی نمائندوں کے
ایک اجلاس میں ایک برقع پوش خاتون کونسلر کے تابڑ توڑ سوالات کے
جواب میں، کہ آپ نفاذِ اسلام کے لیے یہ کیوں نہیں کرتے اور وہ کیوں نہیں
کرتے ؟ آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "بیٹی! اس ملک میں اسلام کسی انقلابی
عمل کے نتیجے میں نہیں آ رہا کہ ہم اتنے بڑے بڑے قدم اٹھا سکیں !"

نفاذِ اسلام کے دعووں اور اُس کے ضمن میں ظاہری اور سطحی، اور نیم دلانہ ہی نہیں خالص
نمائشی اقدامات کا متذکرہ بالا ردِّ عمل، جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ملک گیر تھا ۔ بلکہ جن
لوگوں کو بیرونِ ملک جانے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے اُن سے کانوں سنے یہاں کے تمسخر و

استہزا کی بازگشت دُور دراز کے ممالک میں بھی سُنی، لیکن اندرونِ سندھ تو یہ گویا ملحد اور بے دین
لوگوں، کمیونسٹوں اور مارکسسٹوں، اور سب سے بڑھ کر روس اور بھارت کے ایجنٹوں کے لیے
سنہری موقع تھا جس سے اگر وہ بھرپور فائدہ اٹھاتے تو خود اپنے نظریہ حیات سے غداری
کے مرتکب ہوتے۔ نتیجہ نگاہوں کے سامنے ہے کہ آج اُن قدیم سندھی مسلمانوں کی تعلیم یافتہ
نوجوان نسل کا بہت بڑا حصہ، جو خود اب بھی نہایت گہرے مذہبی مزاج کے حامل ہیں، مذہب
کا نام تک سننے کو تیار نہیں، اور دین اور شعائرِ دینی سے کھلم کھلا بیزاری کا اظہار کر رہا ہے

(۳) مارشل لا کے تسلسل کا تیسرا نتیجہ جو صوبہ سندھ کے ساتھ خاص تھا یہ نکلا کہ اِس
عرصے کے دوران مہاجرین اور خصوصاً ان کی نوجوان نسل کے ردِّعمل میں مزید شدّت پیدا
ہوتی۔ یہاں تک کہ اُن کی جوابی کارروائی میں "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مطابق جارحانہ
انداز بھی پیدا ہوگیا۔ اِس کا سبب یہ ہوا کہ ایک تو اِس دَور میں بھی کوٹہ سسٹم اور دیہی
اور شہری کی تقسیم جُوں کی تُوں برقرار رہی۔ دوسرے مارشل لا نے اپنے براہِ راست
عمل دخل کو بالخصوص صوبہ سندھ میں، لا اینڈ آرڈر اور امن و امان کے زیادہ بڑے
اور اہم معاملات تک محدود رکھا اور نسبتاً چھوٹے اور بظاہر غیر اہم واقعات کے ضمن میں صرفِ
نظر ہی نہیں غضِّ بصر سے کام لیا۔ لہٰذا انتہا پسند سندھی قوم پرستوں کو کھلی چھٹی مل گئی کہ وہ
غیر سندھی نوجوانوں پر تعلیم اور معیشت کا دائرہ تنگ سے تنگ تر کرتے چلے جائیں ——
اور نوبت بایں جا رسید کہ لاڑکانہ اور نواب شاہ کے کالجوں میں پنجابی اور مہاجر طلبہ کے داخلے
کے فارم پھاڑ ڈالے گئے اور انہیں زدوکوب کر کے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ اور
لطف یہ کہ یہ سب کچھ مارشل لا انتظامیہ کی عین ناک تلے ہوتا رہا۔ اِس عدمِ تحفّظ کے احساس
سے جو مایوسی اور دل شکستگی پیدا ہوئی تھی اب اُس میں غصّے اور جھنجھلاہٹ کا عنصر
بھی شامل ہوگیا اور وہ مرنے مارنے پر تُل گئے! —— چنانچہ اِس وقت راقم الحروف
کو مہاجر نوجوانوں میں بالکل اُن کیفیات کا مشاہدہ ہو رہا ہے جن کا اظہار بھارت کے بعض
مسلمانوں نے ۱۹۸۰ء میں تقسیم ہند کے بعد راقم کے پہلے سفرِ بھارت کے موقع پر کیا
تھا۔ جو اُن ہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ: "۱۹۷۱ء تک ہمارا یہ خیال تھا کہ ہمارا محافظ

پاکستان ہے، لیکن اُس کے بعد سے ہمارا احساس یہ ہے کہ پاکستان تو اب اپنی حفاظت ہی کر لے تو بڑی بات ہے، ہمیں تو اب بھارت میں خود اپنے زورِ بازو کے بل پر جینا ہے اور اپنی حفاظت آپ کرنی ہے، لہٰذا ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح نہیں ہوں گے بلکہ مرنا ہی ہوا تو مار کر مریں گے!" ——— چنانچہ سندھ میں آباد اُردو بولنے والے مہاجرین کی نوجوان نسل کے بھی کچھ ایسے ہی احساسات اور جذبات ہیں جن کی کوکھ سے پہلے تو جنم لیا بعض مہاجر طلبا تنظیموں اور نیو سندھی کلچرل ایسوسی ایشنوں، نے جو نسبتاً دھیمی بھی تھیں اور دفاعی انداز کی حامل بھی ——— اور بعد ازاں ان ہی احساسات و جذبات کی کوکھ سے برآمد ہوئیں مہاجر اتحاد تحریک' (M.I.T.) اور مہاجر قومی موومنٹ' (M.Q.M.) ایسی فعال و متحرک بلکہ طوفانی انداز کی حامل تحریکیں جن کا اثر و نفوذ دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔

اب تک کے بچاؤ کے دو اسباب

مارشل لاء کے تسلسل کے تین متذکرہ بالا نتائج کا مجموعی حاصل تو فطری اور منطقی اعتبار سے یہ ہونا چاہیئے تھا کہ سندھ میں ۷۲ء کی تاریخ بار بار دہرائی جاتی اور لسانی فسادات آئے دن ہوتے رہتے لیکن دو اسباب کی بنا پر، جن میں سے ایک کو مثبت قرار دیا جا سکتا ہے اور دوسرے کو منفی، ایسا نہیں ہوا ——— اور سندھی نیشنلزم کی آگ اندر ہی اندر تو سلگتی بھی رہی اور پھیلتی بھی چلی گئی لیکن، الحمدللہ کہ ۷۲ء کے بعد سے آج تک سندھ میں نہ کوئی نمایاں سندھی مہاجر تصادم ہوا نہ سندھی پنجابی۔ تو آیئے کہ اب ذرا اُن اسباب کا جائزہ لے لیں!

(۱) ان میں سے مثبت سبب، کا کریڈٹ تو مولانا مفتی محمودؒ کی قائم کردہ ایم آر ڈی کو جاتا ہے جس نے قومی سطح پر بحالی جمہوریت کی تحریک چلا کر محاذ آرائی کو اُفقی سمت میں موڑ سے رکھا اور سیاسی عناصر کی توجہات کو جمہوریت کی بحالی اور مارشل لاء کے خاتمے پر مرکوز کر کے لسانی اور علاقائی تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والی عمودی محاذ آرائی کو پس منظر میں دھکیل دیا۔

چنانچہ ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۶ء میں دو مرتبہ سندھ میں جو آتش فشاں پھٹا وہ بحالی جمہوریت ہی کے نام پر پھٹا، یہ دوسری بات ہے کہ دونوں بار اس سے جو لاوا برآمد ہوا وہ سندھی نیشنلزم ہی کا پیدا کردہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں مواقع پر یہ تحریک جو اصلاً ملک گیر تھی، صرف صوبۂ سندھ اور اس کے بھی صرف اندرونی دیہی علاقوں کی عوامی شورش کی صورت اختیار کر کے رہ گئی۔

(۲) اب تک کے بچاؤ کی دوسری اور منفی وجہ سندھی نیشنلزم کی انتہا پسند قیادت اور اسلام اور پاکستان کے دشمنوں کی یہ حقیقت پسندی (REALISM) ہے، جس پر وہ بلاشبہ "شیطان کو بھی اُس کا حق ادا کرو" (GIVE THE DEVIL HIS DUE) کے اصول کے مطابق داد کے مستحق ہیں، کہ وہ بیک وقت پاکستان آرمی، پنجابی آبادکاروں اور اُردو بولنے والے مہاجروں سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا انہوں نے یہ دوہری حکمت عملی اختیار کی کہ ایک طرف اپنی اصل قوت کو کسی براہ راست تصادم سے بچا کر گویا "محفوظ" (RESERVE) رکھا جائے اور اس سے صرف نظریاتی پرچار کا کام لے کر اپنے حلقۂ اثر اور دائرہ نفوذ کو بڑھایا جاتا رہے اور انتظار کیا جائے کہ حکومت پاکستان کے عمائدین اور تحریک بحالی جمہوریت کے قائدین میں سے کسی ایک یا دونوں کی بے بصیرتی اور بے تدبیری سے ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ مشرقی پاکستان کی طرح سندھ میں بھی بھارت کو دخل اندازی کا کوئی جھوٹ موٹ کا بہانہ حاصل ہو جائے اور اس طرح اُن کی تمنا باسانی بر آئے!۔ اور چونکہ یہ مقصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتا تھا کہ حکومت پاکستان اور ایم آر ڈی کے مابین کشمکش طول کھینچے اور اس میں زیادہ سے زیادہ تلخی پیدا ہو لہٰذا مسٹر جی ایم سید اور اُن کے حواری ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں پر طنز و طعن کے تیر برسا کر اُن کے لیے ع "تیز ترک گامزن" کی صورت بھی پیدا کرتے رہے اور مارشل لاء کے تسلسل کو خوش آئند قرار دینے کے علاوہ صدر ضیاء الحق کی ذاتی خوش اخلاقی کی تعریفیں بھی کرتے رہے۔ انتہا پسند سندھی قوم پرستی کی دوہری حکمت عملی کا دوسرا اور زیادہ خطرناک رُخ یہ تھا کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں کہ سندھ میں آباد غیر سندھی اقوام آپس میں لڑ پڑیں اور افراتفری

"لِيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ" (سورۃ انعام: آیت نمبر ۶۵) کے مطابق آپس میں ایک دوسرے ہی کی قوت کا مزہ چکھیں۔ اور اس طرح بجائے اس کے کہ سندھو دلیش کی آبیاری قدیم سندھیوں کے خون سے ہو، اس درخت کی جڑوں کو دشمنوں ہی کے خون سے سینچا جائے! ——— چنانچہ انتہا پسند سندھی قیادت نے ۱۹۷۲ء کے فوراً بعد ہی اس برملا اعتراف کے ساتھ کہ ہم نے بیک وقت دو محاذوں پر جنگ چھیڑ کر غلطی کا ارتکاب کیا تھا، آئندہ کے لیے اپنی اس نئی حکمتِ عملی (STRATEGY) کا کھلم کھلا اظہار شروع کر دیا تھا کہ آئندہ ہم پنجابیوں اور مہاجروں کو 'ISOLATE' کر کے ان دونوں سے باری باری اور علیحدہ علیحدہ نمٹیں گے۔ چنانچہ ابتداءً تو یہ کہا گیا کہ پنجابی اور سندھی تو فرزندانِ زمین بھی ہیں اور ان کے مابین ہزاروں سال پرانے تہذیبی و ثقافتی مراسم بھی ہیں۔ جبکہ اردو بولنے والے "ماکڑ" بھک منگے" "پناہ گیر" ہیں جن سے چھٹکارا حاصل کرنا پنجابیوں اور سندھیوں دونوں کے لیے ضروری ہے۔ لیکن جب یہ محسوس ہوا کہ یہ دال گلنی مشکل ہے اور سندھ میں پنجابیوں کی تعداد بھی بہت کم ہے جبکہ تعداد کے اعتبار سے کسی درجے میں مقابلے میں آنے کے قابل اور خاص طور پر سندھ کے شہروں پر "قابض" تو مہاجر ہیں تو رُخ بدل کر یہ کہا جانے لگا کہ مہاجرین یعنی نئے سندھی اور پرانے اور اصل سندھی تو آپس میں بھائی بھائی ہیں اور انہیں ہمیشہ سندھ ہی میں رہنا ہے، البتہ پنجاب کے لوگ سندھ میں ایک خارجی اور بدیسی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں اور فی الحقیقت وہی سیاسی اور معاشی دونوں اعتبارات سے اصل استحصالی طاقت بھی ہیں، لہٰذا نئے اور پرانے سندھیوں کو متحد ہو کر ان سے گلوخلاصی کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ یہی ہے وہ فلسفہ اور حکمتِ عملی جس کی کوکھ سے سندھ میں مہاجرین کے ردِ عمل کے تیسرے دَور کا آغاز ہوا تھا اور سندھی نیشنلزم کے انتہا پسند علمبرداروں اور اسلام اور پاکستان کے کھلے دشمنوں کی ہوشیاری اور چابک دستی کو ایک بار پھر داد دینی پڑتی ہے کہ گزشتہ دو تین سال کے دَوران حالات واقعتہً اُن ہی کے بنائے ہوئے نقشے کے مطابق آگے بڑھتے نظر آرہے تھے۔ چنانچہ ایک جانب سندھی قوم پرستوں اور مہاجر رہنماؤں کے مابین ملاقاتوں

اور مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجے میں "سندھ یونٹی بورڈ" کی قسم کے ادارے وجود میں آتے اور دوسری طرف عوامی سطح پر گلی کوچوں میں "مہاجر سندھی بھائی بھائی۔ تیسری قوم کہاں سے آئی" کے ترانے سنائی دینے لگے اور نوبت بایں جارسید کہ کراچی کے بعض تعلیمی اداروں کے بارے میں خبریں ملیں کہ وہاں طلبہ کی باہمی محاذ آرائی اسی اساس پر استوار ہوگئی ہے کہ ایک جانب قدیم سندھی اور اردو بولنے والے مہاجر طلبہ کا متحدہ محاذ ہے اور دوسری طرف پنجابی طلبہ۔ لیکن ابھی یہ معاملہ ابتدائی مراحل ہی میں تھا اور طالب علموں کے حلقے سے شروع ہونے والی بات کو گلی کوچوں تک آنے کے لیے ابھی کچھ مزید وقت درکار تھا کہ اچانک مہاجرین کی نوجوان نسل کی "تنگ آمد بجنگ آمد" والی نفسیاتی کیفیت نے ایک نیا 'دھماکہ' کر دیا۔

مہاجر پٹھان تصادم

اس تازہ دھماکے سے مراد ظاہر ہے کہ وہ انتہائی خوفناک اور وحشیانہ خونی تصادم ہے جو سندھ میں 'مہاجرین' کے دو سب سے بڑے مراکز یعنی کراچی اور حیدرآباد میں 'اردو بولنے والوں' اور پٹھانوں کے مابین ہوا اور جسے پاکستان کے اساسی نظریئے اور مسلم قومیت کے تصوّر کے تابوت میں آخری میخ یا مریض کی آخری ہچکی نہیں تو کم ازکم خطرے کے آخری سگنل سے ضرور تعبیر کیا جا سکتا ہے!

اس انتہائی افسوسناک تصادم کے بارے میں تاحال نہ خود راقم الحروف کسی نظریاتی پس منظر یا کسی سوچی سمجھی اسکیم کا سراغ لگا سکا ہے ——— نہ ہی کسی اور مبصر یا تجزیہ نگار نے ایسی کسی چیز کی نشاندہی کی ہے۔ اور اس کے اصل اسباب میں سوائے دو عوامل کے، کوئی تیسرا سبب کم ازکم بظاہر احوال نظر نہیں آتا: (یہ دوسری بات ہے کہ مستقبل میں ثانوی طور پر اسے ملک و ملّت کے دشمن اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کریں، جس کے بعض آثار ظاہر ہو بھی رہے ہیں۔)

(۱) اس کا پہلا سبب مہاجرین کی نوجوان نسل کی وہ مایوسی اور بددلی ہے جس کے تاریخی

پس منظر اور اسباب و عوامل کا بیان بھی تفصیلاً ہو چکا ہے اور جس میں درجہ بدرجہ تیزی و تُندی، اور غصّے اور جھنجھلاہٹ کے اضافے کی داستان بھی بیان ہو چکی ہے۔ یہاں یہ مزید نوٹ کر لیا جائے کہ یہ احساسات و کیفیات بھارت کے دوسرے علاقوں سے تعلق رکھنے والے مہاجرین کے مقابلے میں بہاری مسلمانوں میں نہایت شدید ہیں۔ اس لیے کہ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کا قتل عام بھی یا مشرقی پنجاب اور کسی قدر دہلی اور اس کے گرد و نواح میں ہوا تھا یا بنگال و بہار میں۔ اور ان علاقوں سے مسلمانوں کا انخلاء جبری بھی تھا اور پُرتشدّد بھی۔ جبکہ جنوبی ہند کے علاوہ یوپی، سی پی اور راجپوتانہ سے مسلمانوں کی ہجرت زیادہ تر اختیاری بھی تھی اور نسبتاً پُرامن بھی۔ مزید برآں ۱۹۷۱ء کی قیامت تو تقریباً کلیتہً ٹوٹی ہی صرف بہاری مسلمانوں پر۔ جن میں سے کئی لاکھ آج پندرہ سال گزر جانے کے باوجود بھی بنگلہ دیش میں "ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ" (سورۃ الاعلیٰ: آیت نمبر ۱۳ "پھر اُس میں نہ جئیں گے نہ مریں گے") کی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے حالات میں اگر انسان ہوش کھو بیٹھے اور جذبات سے مغلوب ہو جائے تو اسے دوش نہیں دیا جا سکتا۔

(۲) اس کا دوسرا سبب یہ ہے کہ شہروں کے معاملے میں کسی منصوبہ بندی اور کنٹرول کے فقدان کی بنا پر بالکل خود رَو جھاڑیوں کی مانند پھیل جانے والی بستیوں اور بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ بڑھنے والی آبادی کی بنا پر شہری زندگی کی مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے جن میں ٹریفک کے مسائل سرفہرست ہیں ——— پھر جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں ابتری اور افراتفری کا دَور دَورہ ہے اسی طرح اِس شعبے میں بھی بدعنوانیاں، اور بے پروا ہی اور سنگدلی کے مظاہر عام ہیں جن کی بنا پر ٹریفک کے حادثات اور انسانی جانوں کا ضیاع روز افزوں ہے ——— یہ صورتِ حال یوں تو ملک کے تمام ہی بڑے شہروں میں موجود ہے۔ لیکن "حِصّہ بقدرِ جُثّہ" کے اصول کے مطابق اور اُس پر مستزاد بعض دوسرے عوامل کی بنا پر کراچی میں انتہائی شدّت کے ساتھ پیدا ہو گئی ہے۔

کراچی کی مزید بدقسمتی یہ ہے کہ وہاں ایک طرف اِس شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے اکثر و بیشتر لوگ، یعنی منی بسوں، ویگنوں اور ٹیکسیوں کے مالک اور ڈرائیور نہ صرف ایک ہی قوم بلکہ زیادہ تر ایک ہی علاقے کے باشندے ہیں یعنی وزیرستان کے قبائلی پٹھان، اور دوسری طرف کراچی کی آبادی کی عظیم اکثریت ویسے بھی اُردو بولنے والے 'مہاجرین' پر مشتمل ہے، مزید برآں بعض گنجان آباد علاقے جن میں سے کراچی کی مضافاتی بستیوں کا تیز و تند اور اندھا دھند ٹریفک گزرتا ہے اور جنہوں نے ٹریفک کی فنی اصطلاح کے مطابق "بوتلوں کے تنگ دہانوں" (BOTTLE-NECKS) کی صورت اختیار کرلی ہے، وہاں کی آبادی صد فی صد مہاجرین پر مشتمل ہے۔ اس طرح کراچی میں ٹریفک کی مخصوص صورتِ حال نے دو 'قومیتوں' کے مابین ابتداً شکر رنجی اور پھر باضابطہ کشیدگی پیدا کردی۔

چنانچہ ایک جانب معاشی اور معاشرتی مسائل اور شہری زندگی کی عام مشکلات کی بنا پر اعصاب کے مستقل تناؤ اور دوسری جانب اندھا دھند ڈرائیونگ کے نتیجے میں رونما ہونے والے ٹریفک کے حادثات کا یہ نتیجہ تو کئی سال سے نکل رہا تھا کہ جہاں کسی حادثے میں کوئی انسانی جان ضائع ہوئی فوراً متعلقہ بس یا منی بس یا ویگن نذرِ آتش کردی گئی۔ جب بات اور آگے بڑھی تو آتشِ غیظ و غضب نے صرف متعلقہ گاڑی ہی نہیں مزید گاڑیوں کو بھی بھسم کرنا شروع کردیا۔ اور اِس طرح دو 'قومیتوں' کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا جس نے بڑھتے بڑھتے 'تصادم' کی صورت اختیار کرلی جس کا عنوان ابتداً "بہاری پٹھان تصادم" بنا تھا جس کی ایک نہایت افسوسناک صورت کچھ عرصہ قبل اورنگی ٹاؤن، پٹھان کالونی اور بنارس چوک کے علاقے میں پیدا ہوئی تھی جس کے ضمن میں بعض نہایت دلدوز اور لرزہ خیز واقعات بھی اخبارات میں رپورٹ ہوئے تھے۔ چنانچہ حساس اور صاحب شعور لوگوں کا ماتھا اُسی وقت ٹھنکا تھا کہ ؎ "یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین۔ پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!" ——— لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب وہ پردہ اکتوبر ۱۹۸۶ء کے آخری دن اور نومبر کے ابتدائی ایام میں اچانک اُٹھا تو جو بھیانک منظر سامنے آیا اور اِس تصادم نے مزید وسعت اختیار کرکے "مہاجر پٹھان آویزش"

کی جو صورت اختیار کی اُس کا کسی بڑے سے بڑے صاحب بصیرت انسان کو بھی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ان ایّام میں رُونما ہونے والے واقعات و حوادث نے وحشت و بربریت کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ کم از کم مغربی پاکستان کی پوری چالیس سالہ تاریخ کے جملہ ریکارڈ توڑ ڈالے ——— بلکہ بلا مبالغہ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۱ء کی یاد تازہ کر دی !

حالات کی پیچیدگی اور منطقی نتیجہ !

انتہا پسند سندھی قوم پرستوں کے نزدیک تو یہ مہاجر پٹھان تصادم بھی یقیناً بہت خوش آئند ہو گا۔ اس لیے کہ اُن کے نزدیک تو سندھ کی سرزمین پر ہر غیر سندھی ناپسندیدہ ہے خواہ وہ مہاجر ہو یا پنجابی یا پٹھان۔ اور ان میں سے کوئی سے دو فریق بھی آپس میں لڑیں اُن کی منزلِ مقصود بہر صورت قریب آتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ یہ تصادم اُن کے موجودہ نقشۂ کار کے مطابق نہیں ہوا بلکہ اس نے اُنہیں فوری طور پر ایک مشکل سے دوچار کر دیا ہے۔ اِس لیے کہ اِس وقت اُنہیں وسیع تر ملکی سیاست کی سطح پر پنجاب کے خلاف پٹھانوں اور بلوچوں دونوں کا تعاون درکار ہے۔ جس کے حصول کی سعی کا مظہرِ اوّل ممتاز بھٹو اور حفیظ پیرزادہ کا "سندھی بلوچی پختون متحدہ محاذ" ہے اور مظہرِ ثانی سندھی نیشنلزم کے گُرو مسٹر جی ایم سیّد اور سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان کے مابین حال ہی میں شدّت اختیار کرنے والی محبت اور خیر سگالی ہے ——— اور مقامی سطح پر سندھ میں وہ فی الوقت لڑانا چاہتے تھے مہاجروں اور پنجابیوں کو، جبکہ بالفعل تصادم ہو گیا مہاجروں اور پٹھانوں میں۔ گویا اُن کے موجودہ نقشۂ کار کے مطابق اُن کے دو دوست اور اتحادی آپس میں لڑ پڑے ہیں، یہی وجہ ہے کہ 'بابائے سندھ' ایک جانب درپردہ پیٹھ ٹھونک رہے ہیں مہاجر قومی موومنٹ کی اور دوسری جانب تعزیتی پیغام ارسال کر رہے ہیں بابائے پختون باچا خان کی خدمت میں۔ (چنانچہ اسی اساس پر مہاجر اتحاد تحریک' مہاجر قومی موومنٹ کو ہدفِ تنقید بنا رہی ہے)

اِس سے بھی بڑی پیچیدگی جو نوشتۂ دیوار کے مانند ہر صاحب عقل و بصیرت کے سامنے ہے، (خواہ کوئی اُسے اپنی کسی وقتی مصلحت کے تحت کتنا ہی نظر انداز کرنا چاہے۔) وہ یہ ہے کہ اگر موجودہ صورتِ حال میں کوئی انقلابی تبدیلی نہیں آتی اور متحدہ مسلم قومیت کے متعدد قومیتوں میں تحلیل ہونے کا عمل جاری رہتا ہے تو اس کا لازمی اور منطقی تقاضا وہی ہے جو مہاجر نوجوانوں کی دونوں فعال تحریکوں کا مشترک نعرہ بن گیا ہے یعنی یہ کہ ایک کروڑ کے لگ بھگ اُردو بولنے والوں کو بھی ایک مستقل اور جداگانہ قومیت کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتے جس کا آخری منطقی نتیجہ سندھ کی تقسیم ہوگا جسے سندھی قوم پرستی کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اگر حالات کا رُخ یہی رہتا ہے جو اب ہے تو اصل مقابلہ اور ہولناک ترین تصادم قدیم اور جدید سندھیوں ہی کے مابین ہوگا جس کے ضمن میں حال ہی میں مکہ مکرّمہ میں مقیم ایک دینی مزاج کے حامل سندھی دانشور کی زبان سے نہایت گہرے تأثر کے ساتھ جو الفاظ نکلے انہیں سُن کر راقم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ ——— "ڈاکٹر صاحب! بہت خون بہے گا!"

الغرض! برّعظیم ہند و پاک کے اوّلین 'بابُ الاسلام'، سندھ کی موجودہ صورتِ حال بالکل وہی ہے جس کی جانب عظیم فتنوں کی پیشین گوئیوں پر مشتمل احادیث نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں اشارات ملتے ہیں کہ اُن کے دَوران اپنے اور غیر کے مابین تمیز اور دوست دشمن کی پہچان ناممکن ہو جائے گی اور اچھے اچھے صاحب عقل و بصیرت لوگ بھی حیران و پریشان کھڑے رہ جائیں گے کہ ع "کس طرف جاؤں، کدھر دیکھوں، کسے آواز دوں!" یہی وجہ ہے کہ راقم نے اس سلسلۂ مضامین کا عنوان بنایا تھا حضرت اکبر کے اِس شعر کو کہ ؎

جہاں ہستی ہوئی محدود، لاکھوں پیچ پڑتے ہیں!
عقیدے، عقل، فطرت سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

شر میں سے خیر

منطقی اعتبار سے متذکرہ بالا صورتِ حال کے دو ہی نتائج ممکن ہیں: یا کامل تباہی، یا کوئی فوری انقلابی تبدیلی اور بالکل جڑ بنیاد سے نئی تعمیر اور نشاۃِ ثانیہ! ـــــ اور اگر حالات کے رُخ اور واقعات کی رفتار کا صُغریٰ کبریٰ جوڑا جائے تب تو مقدم الذکر ہی کے دَل بادل چھائے نظر آتے ہیں لیکن ؎

"تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے و لیکن پیرانِ کلیسا کی دعا ہے کہ ٹل جائے!"

کے مصداق ہر مومن و مسلم اور ہر مخلص پاکستانی کی دعا تو یہی ہو گی کہ ؎

"رحم کر اپنے نہ آئینِ کرم کو بھول جا ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا!"

مزید برآں، ہمارا ایمان ہے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے اور جو بھی ارادہ فرمالے اُسے پورا کر گزرنے والا ہے ـــــ اور اُس کی شان یہ ہے کہ "یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَیُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" (سورۃ روم: آیت نمبر ۱۹۔ ترجمہ: "وہ نکال لاتا ہے زندہ کو مردہ میں سے اور مردہ کو زندہ میں سے اور زندہ کر دیتا ہے زمین کو اُس کے مُردہ ہونے کے بعد!") لہٰذا اُس کے رحم و کرم اور قوّت و قدرت سے ہرگز بعید نہیں کہ وہ موجُودہ صورتِ حال کو یکسر تبدیل کر دے ـــــ اور الحمدُ للہ کہ ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کی 'چشمِ قلب' (MIND'S EYE) "مہاجر سندھی بھائی بھائی" کے نعرہ ہی میں جو اصلاً انتہا پسند سندھی نیشنلزم کی جنگی حکمتِ عملی کا مظہر بن کر سامنے آیا ہے، ایک ممکنہ خیر کا پہلو دیکھ رہی ہے اور ان شاء اللہ العزیز "وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ" (سورۃ آلِ عمران: آیت نمبر ۵۴، ترجمہ" اور انہوں نے چال چلی اور اللہ نے بھی چال چلی اور اللہ تو سب سے بہتر چال چلنے والا ہے ہی!) کے مصداق اسلام اور پاکستان کے دشمن خود اپنی ہی تدبیروں کے ہاتھوں مات کھائیں گے ـــــ بقول علامہ اقبال ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی ۔ جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا ۔
چنانچہ اگر اللہ نے چاہا تو قدیم سندھی مسلمانوں اور ہندوستان سے ہجرت کرکے پاکستان آنے والوں ہی کے دینی اتحاد سے برِعظیم ہند و پاک میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے سب سے مؤثر قوت فراہم ہوگی ۔ اس لیے کہ ایک طرف صنم خانہ ہند میں اسلام کی قدیم ترین اور عربی الاصل روایات کی امین سرزمینِ سندھ ہے اور دوسری طرف ہندوستان کے مختلف علاقوں سے 'اختیاری ہجرت' کرکے پاکستان آنے والے مہاجرین اُس وقت بھی جذبۂ ملی سے دوسروں کی نسبت زیادہ سرشار تھے اور گوناگوں قسم کی مایوسیوں اور حالات کی شدید ابتری کے باوجود ان میں تاحال بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو سے "ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک ۔ اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک!" کے مصداق دینی و ملّی جذبے کی وافر مقدار سے بہرہ ور ہیں اور اُن کے دل کے کانوں میں اب بھی علاّمہ اقبال کا یہ ترانۂ ملّی گونج رہا ہے کہ سے "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا ۔ مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!" مزید برآں ان میں ایک معتدبہ تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جنہیں بجا طور پر برعظیم پاک و ہند میں 'الفِ ثانی' یعنی امتِ مسلمہ کے دوسرے ہزار سالہ دَور کی چار سو سال پر محیط تجدیدی مساعی کا وارث قرار دیا جا سکتا ہے ۔

اور اب ضرورت صرف اِس امر کی ہے کہ ان دونوں طبقات میں سے اُن لوگوں کی غیرتِ دینی اور حمیّتِ ملی کو للکارا جائے جو اللہ، اُس کے رسول ؐ، اس کی کتاب اور اُس کے دین کے ساتھ ع "جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں" کے مصداق خلوص و اخلاص کا تعلق رکھتے ہوں اور اُنہیں آمادہ کیا جائے کہ وہ ع "میری دنیا لٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا!" پر عمل کرنے اور ملک و ملت کے مستقبل کو جذباتی نوجوانوں کے حوالے کرکے خود گوشۂ عافیت میں پڑے رہنے کی روش کو ترک کریں اور وقت کی نزاکت اور حالات کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے ع "نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری!" کے مطابق کمرِ ہمت کس کر میدانِ عمل میں آ جائیں ۔

اگر ایسا ہو جائے تو کیا عجب اللہ تعالیٰ انہیں الفاظِ مبارکہ " وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ

التَّقْوٰی وَکَانُوْٓا اَحَقَّ بِہَا وَاَھْلَہَا ۔ (سورۃ فتح : آیت نمبر ۲۶ - ترجمہ "اور اُس نے
چسپاں کر دی اُن پر تقویٰ کی بات اور وہ اس کے حقدار بھی تھے اور اہل بھی") کا مصداق بنا
دے اور چشم فلک ایک بار پھر وہ نظارہ دیکھ سکے جو اُس نے آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال
قبل رائی پور اور پیر جو گوٹھ کی خانقاہوں میں سیّد احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید دہلوی رحمۃ اللہ
علیہما اور اُن کے ان ساتھیوں کی مہمان نوازی اور خاطر مدارات کی صورت میں دیکھا تھا جن کا
تعلق دہلی و یوپی، بنگال و بہار اور راجپوتانہ وغیرہ کے علاقوں سے تھا۔!

البتہ یہ کب اور کیسے ہو سکتا ہے ؟ اس کے جواب کے لیے ہمیں موجودہ خوفناک صورت حال
کے پس منظر اور اسباب و عوامل کا جائزہ لینے کے بعد اب یہ سوچنا ہو گا کہ اس کا بنیادی اور مستقل علاج
کیا ہے اور اس مزمن مرض میں جو ثانوی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں اُن کے ازالے کیلئے کیا فوری اقدامات
ضروری ہیں۔ چنانچہ اِن شاء اللہ آئندہ صحبت میں اسی موضوع پر گفتگو ہو گی۔

ٹیلی ویژن پر نشر شدہ دروس کا سلسلہ (درس ۱۱)

مباحث عمل صالح

بندۂ مومن کی شخصیت کے خدوخال

(سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں)

ڈاکٹر اسرار احمد

۳

السلام علیکم - نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم - اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم   بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۙ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۖ

صدق اللہ العظیم

"اور وہ لوگ جو نہیں پکارتے اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو۔ اور نہ وہ قتل کرتے ہیں کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ۔ اور نہ ہی وہ زنا کرتے ہیں۔ اور جو کوئی یہ کام کرے گا وہ اسکی پاداش پائیگا۔ دگنا کیا جائے گا اس کے لئے عذاب کو قیامت کے دن، اور وہ رہے گا

اس میں ہمیشہ ہمیش نہایت ذلیل وخوار ہو کر"۔

معزز حاضرین اور محترم ناظرین!

یہ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی وہ درمیانی آیات ہیں جن کی تلاوت اور ترجمہ ابھی آپ نے سماعت فرمایا۔ سلسلۂ مضمون وہی ہے کہ اللہ کے محبوب بندوں میں کون سے اوصاف ہوتے ہیں اور وہ کون سے کام ہیں جن سے وہ مجتنب رہتے ہیں۔ پچھلے درس میں ہمارے سامنے وہ مثبت اوصاف اور مثبت اقدار آئیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔ جن سے ایک بندۂ مومن کی شخصیت میں دل آویزی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے جو ایک مومن کی شخصیت کی پختگی اور ' MATURITY ' کی علامات ہیں۔ آج کی ان دو آیات میں اندازِ بیان منفی ہے۔ یعنی یہ یہ چیزیں اُن میں بالکل نہیں ہوتیں۔ وہ ان چیزوں کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ لیکن اس سلسلے میں قرآن مجید کی حکمت کا اہم باب ہمارے سامنے آ رہا ہے، جس سے ہمیں اندازہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند کون سی صفات ہیں! وہ کون کون سے کام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مغضوب اور مبغوض ہیں جن سے وہ سخت ناراض ہوتا ہے اور جن سے اس کا غیض وغضب شدید ترین طور پر بھڑکتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ ہمارے یہاں جو یہ تصور ہے کہ ایک ہوتے ہیں گناہ کبیرہ ــ اور ایک گناہ ہوتے ہیں گناہ صغیرہ ــ تو ہم سمجھیں کہ کبیرہ گناہوں میں چوٹی کے گناہ کون سے ہیں!! آج کی پہلی آیت چوٹی کے تین گناہوں کو معین کرتی ہے۔ یعنی اس ایک آیت میں کبائر میں سے درجہ بدرجہ تین سب سے بڑے گناہوں کا ذکر ہے۔ سب سے کبیرہ گناہ، عظیم ترین گناہ، جس کے بارے میں سورۃ النساء میں دو مرتبہ یہ الفاظ وارد ہوئے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ "اللہ اُس کو تو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس سے کمتر (گناہ)، جس کے لئے چاہے گا معاف فرما دے گا"۔ گویا قرآن مجید کی رُو سے ہمارے دین میں سب سے بڑا جرم، سب سے بڑا اور قطعی ناقابلِ معافی گناہ شرک ہے۔ یاد ہوگا کہ سورہ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس کے ضمن میں "اقسام شرک" کے موضوع پر کچھ مختصر گفتگو ہوئی تھی کہ ایک شرک ہے شرک فی الذات ــ اللہ کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا۔ ایک

شرک وہ ہے جو اللہ کی صفات کے ضمن میں ہے ۔ یعنی شرک فی الصفات ۔ اور تیسرا شرک ہے شرک فی العبادت ۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کے لب لباب کی حیثیت دی ہے دُعا کو : اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ اور اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ ۔ " دُعا ہی عبادت کا اصل جوہر ہے " اور " دُعا ہی اصل عبادت ہے " ۔ لہٰذا یہاں آپ نے دیکھا کہ فرمایا : وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ " وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے " ۔ یہ پکارنا کس مقصد کے لئے ہوتا ہے ! استمداد ، استدعار ، استغاثہ ، استعانت کے لئے یعنی کسی کو پکارنا اپنی کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ۔ پکارنا کسی کو اپنی کسی مصیبت کو دور کرنے کے لئے ۔ پکارنا کسی کو اپنی حاجت روائی کے لئے ۔ پکارنا کسی کو اپنی مشکل کشائی اور دستگیری کے لئے ۔ پکارنا کسی کو اپنی مدد واعانت کے لئے ۔ نوٹ کیجئے کہ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اللہ کو چھوڑ کر کسی اور معبود کو پکارے بلکہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو پکارنا یہ شرک ہے ۔ پس یوں سمجھئے کہ ہمارے دین میں شرک تو اکبر الکبائر ہے ۔ کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا کبیرہ گناہ شرک ہے ۔ چنانچہ آغاز میں سب سے پہلے تو اُسی کا ذکر ہوا ۔ اس لئے کہ درحقیقت شرک سے انسان کا نقطۂ نظر غلط ہو جاتا ہے گویا پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی لگ گئی ۔ اس کے بعد اس کا جو نتیجہ نکلے گا وہ ظاہر ہے کہ

؎ خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج   تا ثریا می رود دیوار کج

پھر تو کجی ہی کجی ہوگی ۔ انسان کی اپنی ذاتی سیرت میں بھی کجی ہوگی ۔ ایسے لوگوں پر مشتمل جو معاشرہ وجود میں آئے گا وہ بھی کج ہوگا ۔ لہٰذا یہاں سب سے پہلے شرک کا ذکر ہوا ۔

دوسرا : وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ یہ انسانی جان کے احترام سے متعلق ہے ۔ یہ بات جان لیجئے کہ شرک کے بعد قتل عمد سب سے بڑا گناہ ہے ۔ یہ اس لئے کہ اس سے تمدن کی جڑ کٹ جاتی ہے یہ جو ہم کہتے ہیں کہ انسان ایک متمدن حیوان ہے ۔ انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ : "MAN IS A GREGORIOUS ANIMAL" تمدن کی بنیاد مل جل کر رہنا ہے ۔ تہذیب تمدن اور حضارت مل جل کر رہنے سے ہی وجود میں آتی ہے ، اور اس کی جڑ اور بنیاد یہ ہے کہ

ن ایک دوسرے کی جانوں کا احترام کرے۔ اگر احترامِ جان ہی ختم ہوگیا تو گویا تمدن کی اساس ہی منہدم ہوگئی۔ لہٰذا تہذیب و تمدن کی بقا کے لئے لازم ہے کہ معاشرے کے اندر احترامِ جان کا پورا پورا اہتمام و التزام ہے۔ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کو بہت محترم ٹھہرایا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بعض ایسی صورتیں ہیں کہ جہاں کوئی شخص قانون کی زد میں آکر قتل کا مستوجب قرار پائے گا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

شریعت میں اس کی چار صورتیں ہیں پہلی یہ کہ قتلِ عمد کی صورت میں اگر مقتول کے وارث دیت یا خون بہا لینے کے لئے بھی آمادہ نہ ہوں اور معاف کرنے کے لئے بھی تیار نہ ہوں تو جان کے بدلے جان لی جائے گی: اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ۔ دوسری یہ کہ کوئی شخص شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے تو شریعت میں اس کے لئے سزا رجم ہے کہ اُس کو سنگسار کیا جائے تاآنکہ وہ ہلاک ہو جائے۔ تیسری یہ کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل ہے۔ چوتھی یہ کا فرجو حربی ہو۔ جس کے ساتھ جنگ باقاعدہ ہو رہی ہو اعلانیہ جنگ ہو رہی ہو۔ ذمّی نہیں، معاذ اللہ۔ کسی اسلامی ریاست کا پر امن ذمی یا معاہد غیر مسلم نہیں۔ اسکی جان تو اتنی ہی محترم ہے جتنی کسی مسلمان کی جان محترم ہے اُسے وہی تحفظات حاصل ہیں جو کسی مسلمان کو حاصل ہوتے ہیں۔ البتہ جہاں کفار و مشرکین کے ساتھ جنگ ہو رہی ہو وہاں کا فرکی جان مومن کے لئے حلال ہوگی۔ ان چار صورتوں کے سوا کسی بھی حالت میں انسانی جان کا لینا قتلِ ناحق ہوگا۔ اور اس آیت مبارکہ کی رو سے قتلِ ناحق کے متعلق یہ جان لیجئے کہ دینِ اسلام کے نظام میں شرک کے بعد یہ سب سے بڑا جرم ہے۔

تیسری بات فرمائی کہ: وَلَا يَزْنُوْنَ "اور وہ زنا نہیں کرتے"۔ ہم اس سے پہلے سورۃ مومنون اور سورہ معارج کی بعض آیات کے درس میں دیکھ چکے ہیں کہ اپنے شہوانی جذبات پر قابو پانے (SEX DISCIPLINE) کی کتنی اہمیت بیان ہوئی تھی۔ دونوں سورتوں میں فرمایا: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ

یہاں وہی بات ہے لیکن اسلوب منفی ہے۔ وہاں مثبت پہلو سے بیان کیا کہ وہ لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، اپنی شہوت پر قابو یافتہ ہیں، حلال راستہ کے علاوہ اپنی شہوت کی تسکین کے لئے کوئی حرام راستہ اختیار نہیں کرتے۔
یہاں وہی بات منفی اسلوب سے فرمائی: وَلَا یَزْنُوْنَ "اور وہ زنا نہیں کرتے"۔
البتہ یہاں جس سیاق (CONTEXT) میں یہ بات آئی ہے، اس سے ایک عظیم حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ قتل ناحق کے بعد سب سے بڑا جرم زنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس معاشرے میں یہ فعلِ بد رواج پا جائے اس میں سے اعتماد، باہمی محبت و الفت بالکل ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لئے کہ باہمی محبت کا سرچشمہ ایک شوہر اور اس کی بیوی کے مابین اعتماد کا احساس لازمی ہے۔ اگر یہ اعتماد ہے تو محبت بھی ہوگی، مودّت بھی ہوگی اور یہ خاندان اِس دُنیا میں جنّت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ کی کیفیت کا مظہر بن جائے گا۔
لیکن اگر کسی معاشرہ میں بدچلنی کا رواج ہو جائے، شوہر کو بیوی پر اعتماد نہ رہے، بیوی کا شوہر پر سے اعتماد اٹھ جائے۔ تو جس معاشرہ میں سے یہ باہمی اعتماد رخصت ہو جائے اور بے اعتمادی اسکی جگہ لے لے۔ اس معاشرے میں اعلیٰ اوصاف کبھی ترقی نہیں کریں گے۔ جو نئی نسل اس گھر میں پرورش پائے گی، اس میں حسنات اور اعلیٰ اخلاق کبھی بھی نشوونما نہیں پا سکیں گے بلکہ ایک منفی کردار پیدا ہو جائے گا۔ اُس نسل میں جو ایسے ماحول میں پرورش پا رہی ہو۔ تو گویا زنا وہ چیز ہے جو تمدن میں حسن وخوبی کے پھول کھلانے کے بجائے اُسے ایک متعفن سنڈاس بنا کر رکھ دے گی۔ لہٰذا تیسری چیز ہے: وَلَا یَزْنُوْنَ ط۔ "اور وہ زنا نہیں کرتے"
سب سے بڑے ان تین گناہوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًا ہ۔ جو کوئی ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب کرے گا۔ شرک کرے گا، اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی حاجت روائی کے لئے پکارے گا۔ مشکل کشائی کے لئے پکارے گا، کسی اور کی بھی عبادت کرے گا۔ یا وہ انسانی جان ناحق لے گا، انسانی خون ناحق بہائے گا۔ یا وہ زنا کرے گا۔ تو وہ جان لے کہ اس کی پاداش اس کو بھگتنی پڑے گی: یَلْقَ اَثَامًا۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ بچ نکلے گا، کوئی گرفت نہیں ہے، کوئی سزا نہیں ہے

اگر اس دنیا میں اُسے سزا نہیں ملی تو آخرت میں اُسے اس کا بھرپور خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ آج کے درس کی پہلی آیت کا مطالعہ یہاں ختم ہوا — اگلی آیت میں فرمایا: يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ — "قیامت کے دن اس کے لئے عذاب دُگنا کر دیا جائے گا"۔ اس کا ایک مفہوم تو یہ لیا گیا ہے کہ یہ عذاب بڑھتا چلا جائے گا، اس میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ بجائے اس کے کہ سزا اور عذاب میں تخفیف ہو، کمی واقع ہو، اس کی تندی اور سختی میں زیادتی ہوتی چلی جائے گی۔ لیکن اس کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے۔ غور کیجئے اس میں ایک لطیف نکتہ ہے۔ بعض حضرات کا یہ گمان ہے کہ عذاب اُخروی اور یوم القیامہ سے قبل عالمِ برزخ کے عذاب یا بالفاظ دیگر قبر کے عذاب کی جو خبریں احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ہیں، قرآن مجید میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ تو ایسے سب حضرات کے لئے جو قرآن میں ذکر نہ ہونے کی وجہ سے عذاب قبر کو تسلیم کرنے میں متأمل ہیں، یہ مقام بہت ہی لائق توجہ ہے فرمایا: يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ — "دُگنا کر دیا جائے گا اس کے لئے عذاب قیامت کے دن"۔ اس سے آپ سے آپ یہ بات نکل رہی ہے کہ قیامت کے دن سے پہلے بھی عذاب ہے۔ جس کو دُگنا کرنے یا جس میں اضافہ کرنے کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہی وہ عذاب ہے جسے ہم عذاب قبر سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس کی خبر ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں دی ہے اور یہ احادیث محدثین کے مقررہ کردہ سخت سے سخت معیار کے مطابق مستند اور صحیح تسلیم کی گئی ہیں۔

اگر یہ اشکال ہو کہ ابھی قیامت کی عدالت تو لگی ہی نہیں، ابھی حساب کتاب اور وزن اعمال تو ہوا ہی نہیں تو اس سے پہلے سزا کیسی! ان کے اطمینان کے لئے یہ عرض ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے، اُسے خوب جانتا ہے: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ یہ آیت سورہ قیامہ میں ہم پڑھ چکے ہیں۔ وہ طالب علم جس نے امتحان میں کچھ نہیں کیا، وہ جانتا ہے کہ اس نے پرچے کیسے کئے ہیں تو امتحان کا نتیجہ نکلنے اور DECLARE ہونے سے پہلے ہی اس کی جان سوکھتی رہتی ہے۔ اس کو معلوم ہوتا ہے کہ میری کارکردگی کیا ہے جس کا نتیجہ کے طور پر اعلان ہونے والا ہے۔ نتیجہ کے اعلان کے دن سے پہلے ہی وہ گویا ایک نوع کے کرب اور کوفت کی

یفیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ تو یہی ہے اصل حقیقت کہ اس دنیا سے اُس عالم آخرہ
کی طرف منتقل ہونے کے فوراً بعد اُس چیز کا ایک عکس انسان کی رُوح پر پڑنا شروع
ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اس نے اس دُنیا میں کیا ہے۔ یہی ہے وہ بات جس کو نبی اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں تعبیر فرمایا کہ "قبر یا جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے
یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے"۔ اِدھر آنکھ بند ہوئی، اُدھر عالم
برزخ میں آنکھ کھل گئی۔ اور اس میں انسان پر ان کیفیات کا ایک عکس پڑنا شروع
ہو جاتا ہے جن سے اُسے بالآخر اپنے اعمال کی پاداشن میں قیامت کے دن دوچار
ہونا ہے۔ اس آیت مبارکہ کے ایک حصہ میں کس قدر خوبصورتی سے اس طرف ایک
لطیف اشارہ آگیا کہ: يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ قیامت کے دن
تو عذاب دگنا ہو جائے گا۔ عذاب بڑھ چڑھ کر آئے گا، اور پھر انسان اس میں
ہمیشہ ہمیش رہے گا: وَيَخْلُدْ۔ خلود، دوام اس کا مقدر ہو گا۔ فِيهِ مُهَانًا۔
اس میں رہے گا نہایت ذلیل وخوار ہو کر، رسوا ہو کر، اور یہ ذلت بھی دائمی ہو گی، اس
سے رستگاری ممکن نہیں ہو گی۔

البتہ ایک استثنیٰ ہے۔ اگر انسان نے توبہ کر لی ہو تو بچت کی صورت ہے
یہ چونکہ ایک مستقل مضمون ہے جو اِلَّا مَنْ تَابَ (آیت نمبر ۷۰) سے شروع ہو گا
اور مَتَابًا (آیت نمبر ۷۱) پر ختم ہو گا تو ان شاء اللہ اس پر اگلی نشست میں
گفتگو ہو گی۔ آج ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ ان دو آیاتِ مبارکہ میں حکمتِ دین
کا ایک اہم باب ہمارے سامنے آیا۔ یہ کہ قرآن مجید کی رو سے ہمارے دین میں عظیم ترین
گناہ کون سے ہیں جن کی پاداشن انسان کو لازماً بھگتنا پڑے گی، عالمِ برزخ میں
بھی اور عالم آخرہ میں بھی۔

آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے اُس کے بارے میں کوئی سوال ہے یا اشکال ہے۔
تو حاضر ہوں۔

سوال وجواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! کیا گناہ کبیرہ کا مرتکب مسلمان رہ سکتا ہے؟

جواب: یہ بہت اہم سوال ہے۔ اس کے دو رُخ ہیں۔ بعض احادیث سے یہ معلوم

ہوتا ہے کہ انسان حالتِ ایمان میں گناہ نہیں کرتا ۔ چنانچہ ایک متفق علیہ روایت ہے یعنی صحیح بخاری میں بھی ہے اور صحیح مسلم میں بھی ۔ اور اس کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں ۔ رضی اللہ تعالےٰ عنہ ۔ جس کی رو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : لَا یَزْنِیْ الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِیْنَ یَشْرَبُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ "کوئی شخص حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرتا ، کوئی شخص حالتِ ایمان میں چوری نہیں کرتا ، کوئی شخص حالتِ ایمان میں شراب نہیں پیتا " یعنی جس وقت وہ ان میں سے کوئی گناہ کر رہا ہوتا ہے اس وقت ایمان اس کے دل میں نہیں ہوتا ۔ تو ایک طرف اس نوع کی متعدد احادیث ہیں ۔ دوسری طرف ہمیں یہ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی قرآن مجید سے اور احادیث نبویہ سے سامنے آتی ہے کہ گناہ کبیرہ سے کوئی مسلمان کافر نہیں ہو جائے گا ،، بلکہ اُسے مسلمان ہی سمجھا جائے گا اگرچہ وہ ایک فاسق و فاجر مسلمان ہے ۔ چنانچہ یہی موقف ہے امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا کہ گناہ کبیرہ سے کوئی مسلمان کافر نہیں ہو جاتا ۔ ان دو چیزوں میں تطبیق یہ ہے کہ ایک ہے قانونی ایمان جس کی بنیاد پر ہم دُنیا میں کسی کو مسلمان سمجھتے ہیں ۔ اس کی بات بالکل علیحدہ ہے ۔ ایک ہے قلبی کیفیت اور قلبی یقین والا ایمان ۔ اس کی بات بالکل دوسری ہے ۔ چنانچہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر اس دُنیا میں کسی کو کافر قرار نہیں دیا جائے گا ۔ قانونی طور پر وہ مسلمان اور مومن تسلیم کیا جائے گا ۔ البتہ حقیقتِ ایمان کے اعتبار سے غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگر دل میں یقین ہو کہ اللہ ہے اور وہ مجھے دیکھ رہا ہے تو گناہ کا صدور کیسے ہو گا ! یہ بات دو اور دو چار کی طرح منطقی و یقینی نظر آتی ہے کہ قلبی یقین والے ایمان کے ہوتے ہوئے ایک مسلمان گناہ نہیں کر سکتا ۔ تو یہ دونوں چیزیں بیک وقت درست ہیں اور دونوں کو بیک وقت اپنے سامنے رکھنا چاہیئے ۔ پہلی سے اُمید پیدا ہوتی ہے ، رجا پیدا ہوتی ہے ۔ دوسری طرف سے خوف پیدا ہوتا ہے ۔ تقویٰ کا احساس پیدا ہوتا ہے ۔ اور یہ دونوں چیزیں اپنے اپنے محل و مقام پر درست ہیں ۔

سوال : ڈاکٹر صاحب ! آپ نے قبر کے عذاب کا ذکر کیا ہے تو کچھ لوگ چلا دیئے

جاتے ہیں، کچھ سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں اور ان کی لاشیں نہیں ملتیں ان کو دفنایا
نہیں جاتا تو ان کو قبر کا عذاب کیسے ملے گا۔

جواب : اصل میں لفظِ قبر استعارہ ہے عالم برزخ کے لئے چونکہ عظیم تعداد
ایسے ہی لوگوں کی ہے جو دفن کئے جاتے ہیں اور ان کی ایک قبر وجود میں آتی ہے۔
مزید یہ کہ عرب لاش کو DISPOSE OFF کرنے کے اس طریقے سے واقف تھے۔ لہٰذا
لفظِ قبر ہی احادیث میں استعمال ہوا۔ لیکن اس سے مراد ہے عالم برزخ۔ یہ عالم
اس ہماری دنیا اور عالم آخرہ کا درمیانی عرصہ ہے۔ اس عالم برزخ کو استعارۂ قبر
سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چاہے کوئی شخص سمندر میں غرق ہو کر مرا ہو اور ہو سکتا ہے کہ
کسی وھیل مچھلی کا پیٹ اس کی قبر بنے، خواہ کسی کو کوئی درندہ چیر پھاڑ کر چٹ کر
گیا ہو۔ اور اس کا پیٹ اس کی قبر بن گئی ہو۔ خواہ کسی کی لاش کو جلا دیا جائے
یا وہ حادثہ کے طور پر جل کر مر جائے اور اس کی راکھ پانی میں بہا دی جائے یا ہوا
میں اڑا دی جائے۔ تو ان تمام شکلوں سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ عالم برزخ
میں انکی ارواح کو تو جانا ہی جانا ہے اور جس عذاب کو ہم عذاب قبر سے تعبیر کرتے
ہیں، وہ درحقیقت عالمِ برزخ کا عذاب ہے۔

حضرات! آج جو مضمون ہمارے سامنے آیا ہے، وہ عملی اعتبار سے نہایت اہم ہے۔
اچھی طرح جان لیجئے کہ جن کبیرہ گناہوں کا یہاں ذکر ہوا ہے، ان میں سے کسی کا بھی
خیال کسی بندہ مومن و مسلم کے دل و دماغ میں نہیں آنا چاہیئے۔ یعنی وہ کسی نوع
کے شرک میں مبتلا ہو، یا ناحق کسی کا خون بہائے یا زنا کی طرف اس کا خیال بھی
جائے اس میں ہلاکت ہی ہلاکت اور بربادی ہی بربادی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں
ان تینوں کبیرہ گناہوں سے مجتنب رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

۱۵۷

"یہ گریہ و نالہ تو رحمت ہے۔ جو دوسروں پر رحم محسوس نہیں
کرتا اس پر رحم کیا بھی نہیں جاتا۔ میں نے لوگوں کو جو روکا ہے وہ
بے جا نوحہ و زاری سے اور اس بات سے کہ وہ مُردے کی ان
صفات پر نالہ و زاری کریں جو اس میں نہ ہوں۔"
پھر اپنے دل کے ٹکڑے ابراہیم کو مخاطب کر کے فرمایا:

"ہم جانتے ہیں کہ موت تو امر حق ہے اور وقت پر اس کا آنا
یقینی ہے۔ ہم اس امر سے بھی واقف ہیں کہ پیچھے رہ جانے والے
بھی پہلے جانے والوں کے ساتھ جا ملیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو
تمہارے جانے کا غم اور بھی زیادہ ہوتا۔ آنکھیں آنسو برسا رہی ہیں،
دل غمزدہ ہے مگر ہماری زبان سے وہی نکلے گا جو ہمارے رب کو
پسند ہے۔ اے ابراہیم، ہم تمہاری جدائی سے غمگین ہیں۔" (بخاری)

تعزیتی خطوط

مکتوبِ گرامی حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

رائے بریلی
۱۵ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ

محب گرامی منزلت ڈاکٹر صاحب زید لطفہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ "میثاق" کا شمارہ ۱۱ جلد ۴۵ (ربیع الاول ۱۴۲۰ھ) پہنچا۔ اس سے آپ کے خاندان بلکہ خاص گھر کے حادثۂ فاجعہ کا تفصیلی علم ہوا۔ ستمبر سے لے کر وسط نومبر تک میں تقریباً مسلسل بیرونی واندرونی سفروں اور دوروں پر رہا، اسی وجہ سے یہ اہم تعزیتی مکتوب لکھنے کی نوبت بہت تاخیر سے آرہی ہے۔ حادثہ ایسا اندوہناک ہے کہ اس کے لیے تعزیتی لفظ ملنے مشکل ہیں لیکن آپ نے خود ہی "عرض احوال" کے مضمون میں اپنے رضا بالقضا، قوتِ ایمانی ومطالعہ قرآنی کا جو اظہار فرمایا ہے وہ صبر وتسکین کے الفاظ لکھنے سے بہت حد تک مستغنی کر دیتا ہے۔ میں اپنے دو جواں مرگ لائق وسعید بلکہ قوّتِ بازو عزیزوں (محمد الحسنی مرحوم مدیر رسالہ "البعث الاسلامی" اور مولوی سید محمّد ثانی مرحوم مصنّف کتب کثیرہ ومدیر رسالہ "رضوان") کی وفات کا صدمہ اٹھا چکا ہوں۔ جن میں سے اوّل الذکر میرے حقیقی بھتیجے اور ثانی الذکر حقیقی بھانجے تھے، اور دونوں میرے علمی، تصنیفی، دعوتی اور خانگی امور میں دستِ راست تھے، اس لیے مجھے اندازہ ہے کہ ایسے موقع پر کیا ابتلاء پیش آتا ہے، اور صبر ورضا بالقضاء کا کیسا امتحان ہے۔

آپ میرے اور میرے رفقاء واعزہ کی طرف سے دلی تعزیت قبول کیجیے، اس وقت آپ کا دل مجروح اور شکستہ ہے، اور حدیث قدسی ہے "اَنا عند المنکسرۃ قلوبھم" اس لیے آپ کی دعا بھی ان شاء اللہ قبول و مؤثر ہوگی، آپ ہم سب کے لیے اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے دعا کیجیے۔

مرحوم حمید احمد کے شیر خوار بچے سیّد احمد کو اللہ تعالیٰ اس نام کی برکت عطا فرمائے اور وہ اپنے والد شہید کا نعم البدل اور اسم بامسمّٰی ثابت ہوں۔ محترمی اللہ بخش سیال صاحب اور محترمی اقتدار احمد صاحب سے بھی سلام کہیے اور تعزیت کیجیے، خدا کرے آپ کا مزاج بخیر ہو۔

والسلام
مخلص ابوالحسن علی

مکتوب گرامی ڈاکٹر شیر بہادر خان پنّی، پشاور

محترمی زاد عنایتہ،

السلام علیکم

اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ میری طبیعت اب کمزور رہتی ہے۔ یہ عمر کا تقاضا ہے۔ کاروانِ زندگی ۸۹ کی منزل میں ہے۔ اور ارذل العمر کا مرحلہ ہے مگر زندگی عطیہ خداوندی ہے لہٰذا اس کو بسر کرنا ہی پڑتا ہے۔ دُعا فرمائیں کہ یہ رضاءِ الٰہی ہی میں بسر ہو جائے۔

ماہ نومبر ۱۹۸۶ء کے "میثاق" میں جو "تأثرات" "عرضِ احوال کے تحت بہ ضمن حادثۂ فاجعہ آپ نے تحریر فرمائے۔ وہ صد درجہ فکر انگیز اور سبق آموز ہیں۔ اور یہ آپ کا ہی حصہ اور حوصلہ ہے کہ آپ اس منزل سے باحوصلہ و باوقار طور سے گزرے۔

آپ کو خدا نے جن صلاحیتوں سے نوازا اور پھر ان صلاحیتوں کو دعوت قرآن میں صرف فرمائے ہیں اُس کی ایک تاریخ بھی ہے اور پس منظر بھی، اور اس کو آپ نے بطور تحدیثِ نعمت بیان بھی کر دیا ہے۔ یہ انعام خداوندی ہے۔ جس کو مولانا ابو الکلام آزادؒ نے اپنی تصنیف "تذکرہ" میں یوں تحریر فرمایا:۔

> "اللہ تعالیٰ نے اُن نعمتوں میں سے جن کے ذریعے وہ اس دنیا میں اپنے بندوں کو سعادت بخشتا ہے۔ ایک بڑی نعمت "آباءِ صالحین" کے لئے یہ ہے۔ کہ اولادِ صالح عطا فرمائے کہ "رب ھب لی من الصالحین" اور "وھبنا لہ اسحق ویعقوب کلا ھدینا" اور اولاد کے لئے یہ ہے کہ والدین صالح ہوں (سورہ کہف) صاحبِ موسیٰ علیہ السلام نے ایک گرتی ہوئی دیوار کو چُن کر یتیموں کے دفینہ کی حفاظت کی تو فرمایا: "وکان ابوھما صالحا" اور حضرت یوسف کی نسبت آنحضرتؐ نے فرمایا: "انما الکریم ابن الکریم، ابن الکریم، ابن الکریم، ابن الکریم" اور یہ ظاہر ہے کہ کسی خاندان میں عرصہ تک علم و صلاح کا باقی و جاری رہنا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ان دو نعمتوں سے فیض یاب ہو۔ آباء کو اولاد صالح اور اولاد کو آباء صالح نصیب ہوں"

آپ کے خاندان میں بھی یہ شرف چار پشتوں تک چلتا دکھائی دیتا ہے۔ اَللّٰھم زد فزد۔ اور آپ کے خاندان سے دو عزیزان کا حادثاتی موت (شہادت) سے دوچار ہونا، مزید عظمت کی نشانی ہے۔

آپ نے دیارِ مغرب میں مکین ہو جانے والے افراد کے متعلق تحریر فرمایا:

"اوّل تو ان لوگوں کو مراجعت وطن پہ آمادہ کرنا ہی محال ہے اور اس کے ثبوت میں میں علامہ اقبال کا قول نقل فرمایا:

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
واں کنٹر سب بلوری ہیں، یاں ایک پرانا مٹکا ہے

یہ یقیناً ٹھیک تجزیہ ہے۔

اور امریکہ میں ایک مقیم ڈاکٹر صاحب کا مقولہ "یہ امریکی لوگ، افریقہ کے لوگوں کو تو لوہے کی زنجیروں میں باندھ کر یہاں لائے تھے اور ہمیں انہوں نے یہاں سنہری زنجیروں میں جکڑ دیا ہے" اور معلوم ہے کہ سونے کی زنجیر لوہے کی زنجیر سے قوی تر ہوتی ہے بلکہ دولت و محبت کی زنجیر تو کچے دھاگے میں بندھی آئے گی سرکار بیری" والا معاملہ ہے۔

اور پھر آپ کا فرمانا کہ "کہ جو لوگ ہمت کر کے وہاں سے واپس آ جاتے ہیں متعدد مثالیں اس کی موجود ہیں کہ وہ لاکھ کوشش کے باوجود اور شدید مالی نقصان کے علی الرغم، یہاں کے اس دفتری اور کاروباری ماحول کے ساتھ کسی طرح سازگاری اختیار نہ کر سکے جس میں قدم قدم پر رشوت، سفارش ہی نہیں، دھوکا، فریب، جانبداری اور کنبہ پروری اور ان سب پہ مستزاد ایک دوسرے کی ٹانگیں گھسیٹنے اور بیٹھ پیچھے برائی کا جال بچھا ہوا ہے لہٰذا انہیں بصد حسرت و یاس دوبارہ وطنِ عزیز کو خیرباد کہتے ہی بنی"

یہ المیہ عام ہے۔ میں خود بھی اسی المیہ کی زد میں ہوں۔ میں تین بیٹوں کا باپ ہوں، اور وہ سب امریکہ، سویڈن اور انگلینڈ میں عرصہ سے مقیم اور وہاں خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ بلکہ ارضی جنت میں وقت گزار رہے ہیں۔ وہاں ہی شادیاں کر لی ہیں۔

میں نے اپنی تنہائی کی زندگی کی اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لئے انکو واپس
آنے پر مجبور کیا پہلے بڑا - جو ڈاکٹر ہے آیا - دو سال یہاں رہا - لیکن بوجوہ متذکرہ بالا ،
مجبوراً اس کو واپس جانا پڑا - اس کے بعد دوسرا بیٹا جو انجینئر ہے اور سویڈن میں
تھا - مع سویڈش بیوی اور بچوں کے ساتھ یہاں آیا - پانچ سال یہاں رہا - محنت کی -
دولت خرچ کی ، اور ایک چھوٹا سا کارخانہ بنانے میں کامیاب بھی ہو گیا - لیکن وطن
عزیز میں قدم قدم پر ، حد سے بڑھی ہوئی رشوت نے اُس کو بے دم کر دیا - اور بنا بنایا
کارخانہ چھوڑ کر واپس جانے پر مجبور ہو گیا - میں ان دونوں بیٹوں کی بے کسی نہ دیکھ
سکا اور اُن کو واپس جانے کی اجازت دے دی کیوں کہ وہ دونوں عزت نفس اور
خودی کے زیاں کو برداشت نہ کر سکے -

زمانہ کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو - کہ یہ ملک جو علامہ اقبالؒ کے نظریہ خودی کے تحت
ظہور میں آیا - اور اسلام کے نام سے موسوم ہوا - اُس میں جس بے دردی و شقاوت
کے ساتھ عزتِ نفس و جذبہ خودی پامال ہو رہا ہے - اس کی مثال نہیں ملتی -

پاکستانی دُعا تو پانچ وقت یہی کرتا ہے ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ
وفی الاخرۃ حسنۃ - لیکن یہ دُعائیں کس طرح منظور ہو سکتی ہیں جہاں رشوت
کا بازار سرِعام گرم ہو - اور حضورؐ کی حدیث مبارک ہے - " رشوت لینے والا - رشوت
دینے والا - اور رشوت کا دلال - سب جہنمی ہیں - "

ان حالات میں حیرت کا مقام ہے - کہ ہر سو ایمانیات (عقیدہ) پر بحثیں ہیں
جدل ہے سر پھٹول ہے - لیکن معاملات (اعمال) پر کوئی نقد و نظر نہیں - حالانکہ
اعمال صالحہ پر ہی ایمانیات کی عمارت کھڑی ہوتی ہے - اور انہی میں کد و کاوش
کی ضرورت ہے - خاص کر اس زمانہ میں -

ایمانیات کے متعلق ایک بات کی طرف اشارہ ضروری سمجھتا ہوں
ایک صحرانشین بدو تھوڑی دیر کے لئے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا
اور پوچھتا تھا " نجات کا طریقہ کیا ہے "؟ آپ اُس کے جواب میں کہتے "پانچ باتیں
شہادتین کا اقرار اور نماز ، روزہ ، حج زکوٰۃ کے اعمال " وہ اقرار کرتا تھا اور یہ پکارتا
ہوا واپس چلا جاتا تھا - " واللہ لا ازید ولا انقص " آپؐ اُس کی پیٹھ کی طرف

اشارہ کرکے کہتے "جو کوئی نجات یافتہ انسان کو دیکھنا چاہتا ہے وہ اس بڈھے کو دیکھ لے"۔
آخر میں آپ کی حضرت مولانا امین احسن صاحب اصلاحی سے صلح و صفائی پر تہ دل سے مبارک عرض کرتا ہوں۔ اور اس کو قران السعدین جانتا ہوں۔
اس طویل سمع خراشی کے لئے معافی چاہتا ہوں۔

بہ حرفے مے تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از شوقِ حضوری، طول دادم داستانے را

میں عمر کی آخری منزل میں تنہائی کی اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لئے بیٹی کے ہاں۔ ۷۔ چنار روڈ۔ یونیورسٹی ٹاؤن پشاور۔ آگیا ہوں، اور اس کی مخلصانہ خدمت سے، زندگی کا یہ عرصہ بڑے آرام سے گزار رہا ہوں۔ میرے لئے خاتمہ بالخیر کی دعا فرمائیں۔ والسلام

طالب دعا شیر بہادر پنی

حافظ فروغ حسن

عبداللہ طاہر سیال کے ماں باپ منڈی صادق آباد میں مقیم ہیں۔ وہ کچھ دنوں سے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۸۹ء کو اس نے اپنے ماموں زاد بھائی حمید احمد کو اپنے ساتھ صادق آباد چلنے پر آمادہ کر لیا۔ پروگرام کے مطابق دونوں بھائی ۲۷ ستمبر کو علی الصبح ساڑھے چار بجے لاہور سے روانہ ہوئے۔ کار وہ خود چلا رہے تھے۔ دس بجے کے قریب کبیر والا پہنچے۔ یہاں طاہر کے چچا محمد نواز سیال رہتے ہیں۔

کبیر والا میں دونوں بھائیوں نے آرام کیا۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور دو بجے کے قریب پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔ جب اُن کی کار دُنیاپور کے قصبے کے چوراہے کے قریب پہنچی تو بائیں جانب سے سامان سے لدا ہوا ایک تیز رفتار ٹرک آیا۔ ٹرک اور کار کی پوزیشن اُس وقت کچھ ایسی تھی کہ اُن میں تصادم یقینی تھا۔ ٹرک ڈرائیور نے کار کو حادثے سے بچانے کے لیے ایک دم بریک لگا دی۔ بریک لگاتے ہی ٹرک ایک سمت دھماکے کے ساتھ اُلٹ گیا اور اُسی کار پر جا گرا جسے بچانے کے لیے ڈرائیور نے بریک لگا کر ایک ہولناک خطرہ مول لیا تھا۔

یہ ناگہانی تصادم اتنا خوفناک تھا کہ کار میں سوار دونوں نوجوان موقع ہی پر ہلاک ہو گئے۔ کار بُری طرح کچلی گئی تھی اور اس میں جسم چنس اور پھنس گئے تھے۔ مقامی پولیس موقع پر پہنچ گئی۔ گاڑی کے کاغذات

سے اُسے یہ معلوم کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ حادثے میں ہلاک ہونے والے نوجوان کون ہیں اور اُن کا تعلق کس خاندان سے ہے؛ چنانچہ حادثے کی اطلاع بذریعہ ٹیلیفون اہلِ خاندان کو لاہور بھی دے دی گئی اور صادق آباد میں بھی۔

یہ سانحہ اتنا درد انگیز تھا کہ اس کی خبر سنتے ہی انسان تڑپ کر کانپ اُٹھتا تھا۔ تقریباً شام سات بجے اس کی اطلاع عزیزم سعادت اعجاز نے مجھے اچھرے میں دی۔ سنتے ہی تمام جسم لرز گیا۔ اوسان خطا ہو گئے۔ محسوس ہوتا تھا کہ دل و دماغ کی مشینری نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ رگوں میں خون کی گردش رک گئی ہے اور تمام اعصابی نظام معطل ہو گیا ہے۔

عبداللہ طاہر سیال جو اکتیس سالہ نوجوان تھا، انجینئرنگ میں اُس کی قابلیت اور مہارت قابلِ رشک تھی۔ قدرت نے اُسے ذہانت و فطانت کی نعمتوں سے فیاضی کے ساتھ نوازا تھا۔ نیک طبیعت اسلامی سانچے میں ڈھلی ہوئی۔ چہرے پر سیاہ مگر نورانی داڑھی کے ساتھ ساتھ متانت اور سنجیدگی کارفرما رہتی۔

یہ نوجوان اللہ بخش سیال کا لختِ جگر، ڈاکٹر اسرار احمد کا حقیقی بھانجا اور اُن کے چھوٹے بھائی اقتدار احمد کا داماد تھا۔ اللہ نے اُسے پانچ بچے بھی عطا کر دیے تھے۔

دوسرا نوجوان حمید احمد جس کی عمر صرف چوبیس سال تھی، اقتدار احمد کی آنکھوں کا نور اور ڈاکٹر اسرار احمد کا داماد تھا۔ ننھے منّے دو معصوم بچوں کی پرورش و تربیت کی ذمّے داری بھی ربِّ کریم نے اُس کے سپرد کر دی تھی۔ یہ نوجوان اعلیٰ درجے کی ذہنی، فکری، عملی اور قلمی صلاحیتوں سے آراستہ اور اسلامی اخلاق کی دلنواز خوبیوں سے پیراستہ تھا۔ چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی دل کے اُس جذبۂ صادق کی علامت تھی کہ سُنتِ رسولؐ کی اتباع ہی ایک مسلمان کی زندگی کا سب سے اہم اور مقدس مشن ہے۔

اس دلگداز المیے کی خبر سن کر میں فوراً برادرِ محترم حاجی گل حسن صاحب کے ہمراہ اقتدار احمد کے مکان افغانی روڈ سمن آباد پہنچا۔ وہاں خاندان کے سبھی افراد جمع تھے۔ ان سوگواروں میں مرحوم حمید احمد کے والد، تایا، چچا اور بھائی بھی موجود تھے۔ صبر کا دامن تھامے ہوئے مشیتِ ایزدی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے۔ کرب و اضطراب اور غم و اندوہ کے آثار چہروں پر نمایاں ضرور تھے مگر کیا مجال کہ زبان سے بے صبری اور

بے قراری کا ایک لفظ بھی ادا ہوا ہو یا کوئی اضطراری حرکت سرزد ہوئی ہو۔

غم و کرب کی یہ سیاہ اور تاریک رات گھر والوں نے جس طرح گذاری اسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ تقریباً چار بجے صبح نوجوانوں کی لاشیں گھر پہنچیں۔

یہ وہی وقت تھا جب یہ دونوں نوجوان ایک دن پہلے اپنے گھروں سے خوشی خوشی سفر پر روانہ ہوئے تھے اور آج چوبیس گھنٹوں بعد واپس آئے تو پورا ماحول سوگوار تھا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی اور ہر دل بے قرار تھا۔ ایسے موقع پر بڑے بڑے حوصلہ مند انسانوں کے ہاتھ سے صبر و ضبط کا دامن چھوٹ جاتا ہے ـــــ مگر گھر والوں نے جس ضبط و تحمل اور صبر و تسلیم کا مظاہرہ کیا وہ ایک عام آدمی کے لیے حیرت انگیز بھی تھا اور سبق آموز بھی۔

ان جوانمرگ نوجوانوں کی میتوں کو ان کے بزرگوں اور عزیزوں نے خود غسل دیا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک یہی پسندیدہ اور مستحسن طریقہ ہے۔ حادثے کی شدت نے جسم بُری طرح کچل دیے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ تڑپ اُٹھے۔ غم کی شدت سے کلیجے منہ کو آ گئے۔ رنج و الم کی بے پایاں تپش سے دل پگھل کر آنکھوں کے راستے بہنے لگے مگر زبانیں خاموش تھیں اور غسل دینے اور کفنانے کے سارے مراحل پورے سکون و قرار سے پورے ہوئے۔

تقریباً صبح سات بجے طاہر سیال کے ماں باپ بھی پہنچ گئے۔ یہ پہلے صادق آباد میں اپنے بیٹے کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔ جب وہ نہ پہنچا تو اُسے ملنے خود لاہور آ گئے۔ وہ صرف ملنے ہی نہیں اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے آئے تھے، کیونکہ اس کے مالک نے اُسے واپس لینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور امین کا کام ہی یہ ہے کہ جب اس سے امانت واپس طلب کی جائے تو اسے ادا کرنے اور واپس دینے میں کسی قسم کے ضد اور ہچکچاہٹ سے کام نہ لے۔

عبداللہ طاہر سیال کے والد اللہ بخش سیال سے ملاقات ہوئی۔ جوان بیٹے کی اچانک اور حادثاتی موت کے اس کربناک اور دردناک موقع پر صبر و قناعت اور توکل علی اللہ کے مومنانہ طرزِ عمل نے اُن کے چہرے کو نورانی بنا دیا تھا۔

سانحے نے بیک وقت اس گھر سے دو جوانوں کو جُدا کر دیا تھا۔ یہ وقت قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھا۔ عام طور پر ایسے موقعوں پر گھروں میں محشر سا بپا ہو جاتا ہے۔ گریہ و زاری، آہ و بکا اور نالہ و شیون کا ایک ایسا شور اُٹھتا ہے کہ پتھروں کے دل بھی پھٹ پڑتے ہیں مگر اس گھر کے مکینوں اور سوگواروں نے اس نازک اور جان لیوا موقع پر جس ضبط و تحمل، بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کا ثبوت دیا وہ دیدنی بھی تھا اور قابلِ اتباع بھی۔ آہ و بکا کا شور نہ شکوہ و شکایت کی فلک شگاف صدائیں۔ ماتم کی صدائیں نہ سینہ کوبی کی آوازیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ امانتیں مالک کے حوالے کرنے کا عمل بڑے سلیقے اور وقار سے انجام پا رہا ہے۔

اس گھر کی خواتین نے جو شان کردار ادا کیا وہ قابلِ تحسین ہے اور لائقِ رشک بھی۔ ان غمزدہ اور سوگوار عورتوں میں اللہ کو پیارے ہو جانے والے نوجوانوں کی مائیں بھی تھیں اور بہنیں بھی۔ خالائیں بھی تھیں اور بہنیں بھی۔ بیویاں بھی تھیں اور پھوپھیاں بھی۔ ان سب کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلِ رواں اُمڈا ہوا تھا جو درد و غم سے چُور دلوں کا ترجمان تھا۔ وہ سب کی سب مجسمۂ صبر اور پیکرِ تسلیم و رضا بنی ہوئی تھیں۔

صبر و ضبط اور تحمل و بُردباری کے محیر العقول واقعات تاریخ کے اوراق میں پڑھے ضرور تھے مگر آنکھوں سے ایسے مناظر دیکھنے کا موقع کم ہی ملا تھا۔ ماتم کی مجلس میں ایمان پرور مناظر دیکھ کر اس یقین میں پختگی اور گہرائی پیدا ہو گئی کہ اسلام کے نظریے، اُس کے فلسفے اور اُس کے عقیدے میں ایک ایسی معجزانہ قوت ہے کہ جو اسے سوچ سمجھ کر اپنا لیتا ہے تو اُس کی روح میں وہ بالیدگی، اُس کے دل میں وہ ہمت و وسعت، اُس کے ذہن میں وہ ارجمندی اور اُس کے جسم میں وہ توانائی پیدا ہو جاتی ہے کہ پھر وہ سخت سے سخت آزمائش اور شدید سے شدید مصائب کا پامردی اور جرأت سے مقابلہ کرنے کی اپنے اندر سکت بھی پاتا ہے اور سلیقہ بھی۔ کچھ یہی حالت اس گھر کے مکینوں اور سوگواروں کی تھی۔

صبرِ جمیل کی اس بے مثل کیفیت پر دل کی آنکھیں کسی حجاب کے بغیر یہ مشاہدہ کر رہی تھیں کہ قرآن مجید کی بشارت ان گھر والوں کی بلائیں لے رہی ہے اور صبر سے شعوروں میں بلند ترین مراتب و انعامات کا مژدہ سنا رہی ہے۔ کتنی پیاری اور جاں نواز ہے یہ بشارت!

"اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ اُنہیں خوشخبری دے دو۔ اُن پر اُن کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی۔ اُس کی رحمت اُن پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔" (سورہ بقرہ)

اس موقع پر دل کی گہرائی سے یہ دُعا نکل رہی تھی کہ الٰہ العالمین جس طرح ان نوجوانوں کے لواحقین نے صبرِ جمیل کا دامن مضبوطی سے تھام کر تیری رحمت کو دعوت دی ہے، اسی طرح تُو ان کی اچانک اور ناگہانی موت کو شہادت کا اعلیٰ ترین مرتبہ اور اعزاز عطا فرما اور جنت الفردوس کی نُورانی اور شاداب بہاروں کو ان کا مسکن بنا جیسا کہ شہداء کے متعلق خود تیرا اعلان ہے :

"جو شخص اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں، اُنہیں مُردہ نہ کہو۔ وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں۔ اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں۔ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس پر خوش و خرم ہیں اور مطمئن ہیں کہ جو اہلِ ایمان اُن کے پیچھے دُنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں، اُن کے لیے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اُس کے فضل پر شاداں و فرحاں ہیں اور اُن کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔" (سورہ آلِ عمران)

اسلام کے سایۂ عاطفت میں آ جانے والا خوش قسمت انسان اپنی زندگی کے ہر موڑ پر ہدایت و رہنمائی کے لیے جس ذات کی طرف دیکھتا ہے وہ اللہ کے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکت ہے۔ غم ہو یا خوشی، امن کا دور ہو یا میدانِ کارزار، خاندان اور رشتے داروں کے معاملات ہوں یا قومی سطح کے سیاسی امور، ہر معاملے اور ہر شعبے میں اسی ذاتِ اقدس کی تعلیم اور ہدایت سرچشمۂ فیض و برکت ہے۔ اسی در سے دلوں کو سکون و تقویت اور عملی زندگی کو راستی و ہمواری نصیب ہوتی ہے۔

انسانیت کے اس محسنِ اعظم کی حیاتِ مبارکہ میں بھی ایسے اتفاقات رُونما ہوئے جب موت نے آپؐ کے چہیتے عزیزوں اور دل کے ٹکڑے آپ سے چھین لیے، آپ پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ایسے مواقع پر آپؐ نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اور اپنی اُمت کے سامنے جو نمونہ پیش کیا اُس کی اتباع پوری اُمت کے لیے موجبِ سعادت اور باعثِ رحمت ہے۔ ان کی چند جھلکیاں پیشِ خدمت ہیں:

حضرت حمزہؓ کی شہادت

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حضورؐ کے چچا، ہم عمر اور دودھ شریک بھائی تھے۔ غزوۂ احد میں خدا کی راہ میں بہادری اور جرأت سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ دشمنوں نے شقاوت اور بدبختی کی حد کر دی۔ جوشِ انتقام میں آپ کے جسم کا مثلہ کیا اور کلیجہ چبا لیا۔ حضورؐ اپنے محبوب چچا کے جسم کی یہ حالت دیکھ کر شدتِ غم سے حُزن و ملال کی تصویر بن گئے۔

حضرت صفیہؓ کو اپنے بھائی کی شہادت اور لاش کے ساتھ کافروں کے بہیمانہ سلوک کی اطلاع ملی تو وہ مدینے سے خود میدانِ جنگ میں پہنچ گئیں۔ حضورؐ نے اُن کے بیٹے حضرت زبیرؓ کو ہدایت کی کہ بہن اپنے بھائی کی لاش نہ دیکھنے پائے۔ آپؐ کا یہ پیغام سُن کر بولیں کہ مجھے اپنے بھائی کے متعلق تمام حالات کا علم ہو چکا ہے لیکن خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔ حضورؐ کی طرف سے اجازت ملنے پر لاش پر گئیں۔ خُون کا جوش تھا۔ پیارے بھائی کے ٹکڑے بکھرے ہُوئے تھے۔ فرطِ الم سے تڑپ اُٹھیں لیکن زبان سے صرف اتنا کہا:

"ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور اُسی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں۔"

اس جنگ میں حضورؐ کے ستر جاں نثار ساتھی کام آئے تھے، اس لیے آپؐ جب تشریف لائے تو پُورا شہر ماتم کدہ بنا ہُوا تھا۔ آپؐ جس طرف سے گزرتے ماتمی چیخ پکار کی آوازیں گھروں سے آتی ہُوئی سُنتے۔

عرب کا دستور تھا کہ مُردوں پر عورتیں زور زور سے نوحہ اور بَین کرتیں، کپڑے پھاڑ ڈالتیں، چہروں پر تھپیڑ مارتیں اور چیخ چیخ کر ماتم کرتیں۔ یہ دل دوز منظر دیکھ کر رقت کے جوش میں حضورؐ کی زبانِ مبارک سے بے اختیار نکلا:

"حمزہ کا کوئی رونے والا نہیں۔"

انصارِ مدینہ یہ سُن کر تڑپ اُٹھے۔ اُنھوں نے اپنی عورتوں کو حکم دیا کہ وہ حضورؐ کے دولت کدہ پر جا کر حضرت حمزہؓ کا ماتم کریں۔ آپؐ گھر تشریف لائے، دیکھا دروازے پر عورتوں کی ایک بھیڑ ہے

ہے اور حضرت حمزہؓ کا ماتم بند ہے۔

حضورؐ نے اُن کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا اور اُن کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ ساتھ ہی ارشاد فرمایا:

"عرب کے قدیم رواج کے مطابق ماتم کرنا مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ آج سے کسی مُردے پر ماتم نہ کیا جائے۔" (بخاری)

تمام محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اسی دن سے مُردے پر نوحہ و بین اور ماتم کی پُرانی رسم بند ہو گئی۔

سیدہ رقیہؓ کی وفات

حضورؐ ابھی بدر ہی کے میدان میں تھے کہ آپؐ کی پیاری بیٹی حضرت رقیہؓ چیچک کی بیماری سے رحلت فرما گئیں۔ جب اُن کی قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی عین اُس وقت حضرت زیدؓ بن حارثہ بدر کی لڑائی میں مسلمانوں کی فتح کی خوشخبری لے کر مدینے میں داخل ہوئے۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی لختِ جگر کی وفات کی خبر پا کر بہت مغموم ہوئے۔ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آپؐ اپنی بیٹی کی قبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

"عثمان بن مظعون جا چکے ہیں۔ اب تم بھی اُن سے جا ملو۔"

حضرت عثمانؓ بن مظعون پہلے مہاجر تھے جنہوں نے مدینے میں آ کر وفات پائی تھی۔

حضورؐ کے یہ رقت آمیز الفاظ سُن کر عورتوں نے ماتم کا ایک کہرام برپا کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے اُنہیں روکنا چاہا۔ اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"عمر! انہیں رونے دو۔ دل اور آنکھ کے رونے میں کوئی حرج نہیں، البتہ نوحہ اور بین سے بچنا چاہیے۔"

حضرت فاطمۃ الزہراؓ بھی اپنی بہن کی قبر پر تشریف لائیں اور قبر کے پاس بیٹھ کر رونے لگیں۔ حضورؐ اپنی چادر سے اُن کے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔

سیدہ اُمِ کلثومؓ موت کی آغوش میں

شعبان ۹ھ میں آپؐ کی محبوب بیٹی حضرت اُمِ کلثوم جو حضرت عثمانؓ کے نکاح میں تھیں، پیامِ اجل کو لبیک کہتے ہوئے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ اُن کے کفن کے لیے حضورؐ نے اپنی چادر عنایت فرمائی۔ خود ہی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ آپؐ کی اجازت سے حضرت علیؓ، حضرت ابو طلحہؓ، حضرت اسامہؓ اور حضرت فضلؓ بن عباسؓ نے سیدہ مکرمہ کو قبر میں اتارا۔ جب سیدہ اُمِ کلثومؓ کو قبر میں اتارا جا رہا تھا اُس وقت حضورؐ قبر کے پاس موجود تھے اور آپؐ کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا۔

حضورؐ کا نواسہ عالمِ نزع میں

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی سیدہ زینبؓ کا بچہ بیمار ہوا۔ اُس کی حالت غیر ہو گئی۔ آپؐ کو اطلاع دی گئی۔ آپؐ اپنی بیٹی کے گھر تشریف لے گئے۔ حضرت سعدؓ بن وقاص آپؐ کے ہمراہ تھے۔ بچہ آپؐ کے پاس لایا گیا۔ اس پر سکرات کا عالم طاری تھا۔ لختِ جگر کی یہ حالت دیکھ کر آپؐ کا دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت سعدؓ نے عرض کی "یا رسول اللہ! یہ کیا؟"

آپؐ نے فرمایا: "یہ رحمت و شفقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھی ہے۔ خدائے رحیم اپنے انہی بندوں پر رحم فرماتا ہے جو مہربان، شفیق اور رحمدل ہوتے ہیں۔" (بخاری و مسلم)

حضورؐ کا نورِ چشم، موت کے دروازے پر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند حضرت ابراہیم ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے ۸ھ میں پیدا ہوئے۔ آپؐ کو اُن کی ولادت کی خوشی ہوئی کہ پیدائش کی خبر لانے والے ابو رافع کو بطور انعام ایک غلام عطا فرمایا اور اُن کی دایہ یعنی دودھ پلانے والی اُمِ بردہ کو کھجوروں کا ایک باغ بخشا۔ حضرت ابراہیم کی عمر ابھی ۱۶ ماہ ہی ہوئی تھی کہ مالکِ حقیقی کی طرف سے بُلاوا آ گیا۔ بیمار ہوئے۔ حضورؐ کو خبر ملی اور اپنے بچے کے پاس گئے۔ اُن پر نزع کی کیفیت طاری تھی۔ حضورؐ نے انہیں اپنی گود میں لیا اور اُس نازنین نے اپنے عظیم باپ کی آغوشِ شفقت میں دم توڑا۔ آپؐ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ پڑا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے جو حضورؐ کے پاس موجود تھے عرض کی "یا رسول اللہ! رونے سے تو آپ نے منع فرمایا تھا۔ آپ روئیں گے تو مسلمان بھی روئیں گے۔"

جب آپؐ کے آنسو تھمے تو ارشاد فرمایا:

(باقی صفحہ ۹۸ پر)

4 FEB 1986

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

جلد ــــ ۳۶

شمارہ ــــ ۲

بمطابق

جمادی الاُخریٰ ۱۴۰۶ھ

فی شمارہ -/۵ روپے

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی: فون

مشمولات

إن شاء الله العزيز

امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

۸ تا ۱۹ فروری ۸۷ء

سندھ کا دورہ

کریں گے ـــــ جس کے دوران

۹ فروری بروز سوموار بعد نمازِ مغرب تاج محل ہوٹل میں

شامِ الہدیٰ کراچی

کی ماہانہ نشست میں درسِ قرآن دینگے

۱۰ تا ۱۴ فروری حیدرآباد میں قیام رہیگا ـــ اور

وہیں سے آس پاس کے شہروں اور قصبوں میں آمد و رفت رہے گی۔

۱۵ تا ۱۹ فروری سکھر میں قیام رہیگا ـــ اور

اس کے گرد و نواح کا دورہ ہوگا!

رابطے کے لئے

حیدرآباد: شیخ عبدالقادر، حیدرآباد کاٹن اینڈ آئل ملز،
فون: ۳۴۲۰۴، ۳۴۲۳۵، ۲۴۸۳۵

سکھر: نجیب صدیقی، سندھ جنرل اسٹور، شاہی بازار
فون دکان: ۸۵۸۳۳ مکان: ۸۲۲۲۲

المعلن: میاں محمد نعیم، قیم تنظیم اسلامی پاکستان

۶۷ - اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور (فون: ۳۰۵۱۱۰)

اقتدار احمد

عرضِ احوال

مسئلہ سندھ کا تجزیہ اور استحکام پاکستان سے اسکے تعلق پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا مقالہ شمارہ زیرِ نظر میں مکمل ہوگیا ہے۔ اس کی اقساط مؤقر روزنامہ جنگ میں ابھی چل ہی رہی تھیں کہ قارئین کے خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ اور بعض خطوط تو اتنے مفصل اور طولانی تھے کہ بطورِ خود مضامین اور مقالے بنتے ہیں۔ انہیں سرسری نظر دیکھنے سے ہی اندازہ ہوا کہ اس مسئلے کے پہلو کتنے ہمہ جہتی ہیں اور لوگ کیا کچھ دلوں میں لئے پھرتے ہیں۔ ع ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو

اس بات سے قطع نظر کہ مکتوب نگار نے ہمارے نقطۂ نظر سے اتفاق کیا ہے یا اختلاف، قابلِ ذکر اور توجہ طلب مراسلات میں سے چند کو اس شمارے میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری محدود ضخامت اس سے زیادہ مواد فی الحال اپنے دامن میں سمیٹ ہی نہ سکتی تھی۔ ان مراسلات کی تدوین کے بعد ایک ٹریکٹ چھ صفحاتی فولڈر کی شکل میں سندھ کے بڑے شہروں بشمول کراچی میں زیرِ گردش پایا گیا۔ عنوان ہے "جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب! ہم مہاجروں کو معاف رکھیں۔ اب ہم سندھیوں کے ساتھ نہیں لڑیں گے۔" مصنف اور ناشر ہیں جناب لئیق احمد قریشی۔ سیکرٹری "انجمن تحفظ مہاجرین (حقیقی) سندھ"۔ ہم قریشی صاحب سے متعارف نہیں اور نہ ہی فولڈر پر ایسا کوئی سراغ چھوڑا گیا ہے جس سے اُن کا اَتا پتا معلوم ہو سکے لیکن "خط کا مضمون" واضح ہے۔ پنجاب کے باسی ہرگز نفرت کی اس شدت کا اندازہ نہیں کر سکتے جو اُن کے قدیم سندھی ہی نہیں، جدید سندھی یعنی مہاجر بھائی بھی "پنجابی" کے لئے رکھتے ہیں۔ یہاں تو ہر سمت راوی چین لکھتا ہے، کوئی ادھر توجہ نہیں دلاتا کہ ؎

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا کہتی ہے تجھکو خلقِ خدا غائبانہ کیا

اس ٹریکٹ کے بعض مندرجات چونکا دینے والے ہیں۔ پنجاب پر فردِ جرم اتنی سنگین بھی ہو سکتی ہے! بعض الزامات تو اسی طور معلوم و معروف ہیں جیسے سابق مشرقی پاکستان میں ہمارے بھائیوں کی نوکِ زبان پر تھے اور انگلیوں پر گنے جاتے تھے لیکن چند حقائق جن کی صداقت ذہن کی سکرین سے محو تھی۔ اس ٹریکٹ نے گویا منکشف (FLASH) کئے ہیں۔ بجا طور پر کہا گیا ہے کہ مرزائیت کا فتنہ کالم اور انکارِ حدیث کا

یہیں سے اٹھا۔ عیسائیت کو جو توسیع اور فروغ اس صوبے میں ملا اس کا عشرِ عشیر بھی دوسرے صوبوں میں نہیں اور "پاکستان بھر میں کمیونزم کو پھیلانے والا بابائے کمیونزم فیض احمد فیض سندھی نہیں پنجابی تھا۔ اور استادِ کمیونزم جناب سبطِ حسن صاحب بھی پنجابی تھے" وغیرہ گویا پنجاب سے کہا گیا ہے کہ ؎

اے بادِ صبا! ایں ہمہ آوردۂ تست

دریں اثناء کراچی اور حیدرآباد میں ہنگاموں اور تشدد کا ایک دَور اور چلا اور اب کے اس صورتحال کا فوری سبب جو سانحہ بنا ہے اس کی تفصیلات رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہیں۔ اپنی دو جواں سال بیٹیوں کے ساتھ شادی کی تقریب سے واپس آتے ہوئے ایک ضعیف باپ سے نہ صرف اس کے جگر کے ٹکڑے چھین لیے گئے بلکہ اسے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑے ـــــ اور شاید یہی اس کے حق میں بہتر تھا۔ کیونکہ ان بچیوں پر جو کچھ بعد میں گذرا اس کے آثار دیکھنے کی تاب شاید ہی کوئی باپ لا سکتا ہو۔ قلم اس سانحے کی تفصیل پر بس اسی قدر چل سکتا ہے، اس سے زیادہ خامہ فرسائی کی تاب اور طاقت نہیں۔

صاف نظر آتا ہے کہ یہ بہیمیت ایک فردِ واحد کی کارستانی یا چند افراد کے مجرمانہ گٹھ جوڑ کا شاخسانہ نہیں۔ اس لیے کہ بڑے سے بڑے خونخوار مجرم بھی آدمیت کی حدود پھلانگتے آخر ایک مقام پر آکر ٹھٹھک جاتے ہیں۔ یہ شقاوتِ قلبی یقیناً کسی بڑے گروہ کی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے جس کے افراد کو ادنیٰ ترین اقدارِ انسانی کا پیرہن بھی چاک کر دینے کی خصوصی تربیت ملی اور جس کے پیشِ نظر چند افراد کی بے حرمتی اور جان لینا ہی نہیں بلکہ اہلِ کراچی کے درمیان پہلے سے موجود تناؤ کو ایک بار پھر ہولناک فسادات میں تبدیل کرنا تھا۔ اس گروہ کی شناخت کے بارے میں بہت سی گفتنی ناگفتنی باتیں گردش میں ہیں۔ حکومت کے کان اگر کھلے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے یہ باتیں نہ پہنچی ہوں۔ کسی بیرونی طاقت کے فرستادہ تخریب کاروں کے ملوّث ہونے کا خدشہ تو سرکاری حلقے بھی بار بار اور برملا ظاہر کرتے ہیں لیکن اس کا نام ذمّہ دار حکام کے لب پہ کیوں نہیں آتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ؎

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

ایک دشمن تو سامنے ہے ہی، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور مہربان بھی دوستی کے پردے میں اپنے مذمومہ مقاصد کی تکمیل کے لیے اسی موقع کو غنیمت جانتا ہے۔

انتظامیہ اور پولیس اور بحیثیت مجموعی حکومت کے لمبے ہاتھوں کی نارسائی کا تماشا کراچی والوں

نے بچشمِ سر دیکھا ہے لیکن یہ تو مجرموں اور مفسدوں کے سامنے بے بسی کا مظاہرہ تھا، اب کھلی بغاوت اور سرکشی کے آگے گھٹنے ٹیکنے کا مرحلہ بھی آگیا ہے۔ کون قانون پسند شہری یہ تسلیم کرے گا کہ جی ایم سید کا طرزِ عمل اعلانِ بغاوت نہ تھا۔ گرفتاری دینے سے انکاری، 'سن' سے کراچی منتقل ہونے کے حکم کی خلاف ورزی اور پاکستان — یعنی حکومت ہی نہیں خود ریاستِ پاکستان — کو تسلیم نہ کرنے کے اعلان پہ بات ختم نہیں ہو گئی بلکہ فرائض کی ادائیگی کے لئے آنے والے مجسٹریٹ اور پولیس گارڈ کو اسلحے کی نمائش کر کے پسپائی پر مجبور کر دیا گیا۔ دفعہ ایک سو چوالیس کی ڈنکے کی چوٹ پر خلاف ورزی کی گئی۔ مسلح گروہ پورے علاقے میں دندناتے پھرے اور 'سن' (ضلع دادو) میں جمع ہو کر "پیر و مرشد" کی چوراسیویں سالگرہ کے جشن کو وہ رونق بخشی کہ باید و شاید۔ "سندھو دیش" کا پرچم بلند ہوا اور اس کا قومی ترانہ بھی گایا گیا۔ عبدالحفیظ پیرزادہ اصطلاحاً "مفرور" ہیں لیکن وہاں وہ سٹیج پر موجود ہی نہ تھے، مقررین میں شامل ہوتے اور جو زہر افشانی انہوں نے فرمائی ہو گی اس کا اندازہ لگانے میں کسے مغالطہ ہو گا۔ اُن کا پنجابیوں کو یہ الٹی میٹم اخبارات میں بھی جلی سرخیوں کے تحت شائع ہوا کہ اپنے پیروں چل کر سندھ سے نکل جاؤ ورنہ دست بہ دگرے پا بہ دگرے باہر پھینک دیئے جاؤ گے۔ ایک اور مقررہ حمیدہ کھوڑو نے نوجوانوں کو بندوق چلانے کا اذنِ عام دیا۔ کہیئے بغاوت کیا کسی اور شے کا نام ہے۔ ؎

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

ہمیں اندیشہ ہے کہ اس صورتِ حال سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں قانون صرف امن پسند اور شریف شہریوں پہ دادِ حکمرانی دیتا ہے۔ اُسے اُن لوگوں سے تعرض کی اجازت نہیں جو بقول صدر جنرل محمد ضیاء الحق "مضبوط کلّے" والے ہیں۔ ہم اللہ تعالےٰ کی پناہ مانگتے ہیں اور دُعا کرتے کہ یہ احساس عام نہ ہونے پائے۔ روزنامہ نوائے وقت نے ۱۹ر جنوری کو اپنے ادارتی نوٹ میں اسی واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

> "ان بزرگوں (جی ایم سید اور غفار خاں وغیرہ) کی سرگرمیاں اور نظریات حکومت کے سامنے ہیں، لیکن ان کے سدِّباب کے لئے کوئی کارروائی نہیں کی جاتی۔ شاید اس وقت کا انتظار کیا جا رہا ہے جب حمیدہ کھوڑو کے ان الفاظ پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا کہ "نوجوانو! ہمّت ہے تو بندوق چلاؤ، کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں"۔ معلوم نہیں حکومت اتنی کمزور کیوں واقع ہو گئی ہے۔ نظریاتی محاذ پہ یہ شکست خوردگی اور پست ہمتی چہ معنی دارد"۔

لیکن یہ شکست خوردگی اور پست ہمتی جس محاذ پر دکھائی گئی ہے کیا اُسے صرف نظریاتی کہنا کافی ہے ؟ ۔
نہیں ۔ یہ محاذ انتظامی بھی ہے بلکہ یہاں ریاست کی سالمیت اور حکومت کا وقار زد پر ہے ۔
ہمارا معلوم و معروف موقف ہے کہ پاکستان میں رہنے والے لوگ قبائلی، نسلی، ثقافتی اور لسانی تفضلات کے باوجود ملت کی وحدت میں گم ہو سکتے ہیں گیسوئے ملت کی تابداری بلکہ ایک اسلامی معاشرہ برپا کرنے کے لیے بھی یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ متذکرہ صدر تحفظات کو پامال ہی کیا جائے ۔ انہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے پیمانوں سے ماپ کر صرف فالتو مواد کو تلف کیا جائیگا۔
ہمارے دین کا اس باب میں واضح فلسفہ یہ ہے کہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ	اے لوگو ہم نے تمہیں ایک ہی مرد اور
مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَ	عورت سے پیدا کیا ہے ۔ اور تمہارے
جَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ	خاندان اور قومیں جو بنائی ہیں تاکہ
لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ	تمہیں آپس میں پہچان ہو بے شک
عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ	زیادہ عزت والا تم میں سے اللہ کے
اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿﴾	نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ

پرہیز گار ہے ۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے ۔
چنانچہ ہم نے کبھی اس طرزِ عمل کی وکالت نہیں کی کہ علاقائی زبانوں کو نظر انداز کیا جائے، رنگ برنگی تہذیبوں کو زبردستی ایک ہی رنگ میں رنگ دیا جائے ۔ اور رہن سہن کے سب انداز ایک ہی سانچے میں ڈھال دیئے جائیں ۔ تہذیبوں کی اس بوقلمونی میں بھی ایک حُسن ہے دلکشی ہے جب تک یہ دین کی مقرر کردہ حلال و حرام کی حدود سے متجاوز نہ ہو ۔
بہ ایں ہمہ چھٹی حس ہمیں خبردار کر رہی ہے کہ پنجاب سے اُٹھنے والی ایک نئی آواز عظیم خطرات کا پیش خیمہ ہے ۔ سندھی زبان و ادب اور ثقافت کے تقدس کے نام سے شروع ہونے والی بے ضرر سی تحریک ہمارے غلط رویے اور اپنی عاقبت نااندیشی کے باعث دیکھتے ہی دیکھتے دہاڑتی ہوئی عفریت میں تبدیل ہو چکی ہے ۔ کاش ہم ملّی معاملات میں بالعموم اور اپنے نظریات کے تحفظ کے معاملے میں بالخصوص "گربہ کشتن روزِ اوّل" کا طرزِ عمل اختیار کر سکتے ۔ ہماری بر خود غلط رواداری نے یہ دن دکھائے ہیں اور ابھی تو پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ ــــ یہاں کچھ لوگوں نے پنجابی ادب اور پنجاب کے تہذیبی ورثہ کا رونا روتے ہوئے فریاد کی لے اتنی بلند کر لی ہے کہ اس کی طرف سے کان بند کر لینا

ہوش مندی نہیں ۔ پنجاب کی جن روایات کا احیاء مطلوب ہے اُن کا اوّلین نشان مہاراجہ رنجیت سنگھ علیہ ما علیہ کو بنا لیا گیا جبکہ درۂ خیبر سے در آنے والے ہمارے اسلاف غاصب قرار دیئے جا رہے ہیں۔ اِن لوگوں میں غیر معروف سے دانشوروں کے ساتھ ایک نام سب سے زیادہ توجہ کے لائق ہے۔ یہ صاحب خاصے بڑے صنعت کار خانوادے کے سربراہ اور مرزائیوں کی لاہوری شاخ سے تعلق رکھتے ہیں (واضح رہے کہ غیر مسلم قرار دیئے جانے کے بعد لاہوری اور قادیانی اب عصبیت جاہلیہ کے زیر اثر بنیانٌ مرصوص کی شکل اختیار کر گئے ہیں) ۔ مرزائیوں کو پنجاب بلکہ بھارتی پنجاب سے جو دلچسپی ہے وہ ڈھکی چھپی نہیں اور اس دلچسپی کی وجوہات اظہر من الشمس ہیں ۔ ان صاحب کا اور ان کے مخصوص گروہ کا پیسہ اور اثر و رسوخ 'پنجابیت' کی کونپل کو سینچ کر تناور درخت نہیں تو ایک مضبوط پودا تو بنا ہی سکتا ہے ۔ یعنی ہم 'سندھو دیش' کے بعد 'دیس پنجاب' کی آفت سے دوچار ہوں گے ۔ یک نہ شُد دو شُد ۔ ہم حکومتِ وقت کے علاوہ ہر اس مسلمان سے جو ملک خداداد پاکستان کو اُس دین کی نشاۃِ ثانیہ کے سلسلے میں ایک خُدائی تدبیر کا حصّہ سمجھتا ہے اپیل کریں گے کہ کان اور آنکھیں کھلی رکھیں ۔ 'سندھو دیش' کی بات بھی راجہ داہر کو ہیرو اور محمد بن قاسمؒ کو غاصب قرار دینے سے شروع ہوئی تھی اور یہ کوئی صدیوں پُرانی بات نہیں کہ حافظے سے محو ہو جائے، چند سال پہلے کا قصہ ہے ۔

" پنجابیت" کے احیاء کی اس کوشش میں مرزائیوں کی شرکت ایک پُراسرار مثلّث کو جنم دیتی ہے ۔ جس کا ایک ضلع اُن کے رُوحانی مرکز قادیان کا بھارت میں رہ جانا، دوسرا سکھوں کے متبرک ترین مقامات کا پاکستانی پنجاب میں واقع ہونا اور تیسرا ضلع پنجابیت کی علامت کے طور پر رنجیت سنگھ کا انتخاب ہے ۔ تاہم ؎ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں

پہلے ذکر آ چکا ہے کہ جدید سندھی یعنی مہاجر پنجاب بھائی پنجاب پر جو فردِ جرم عائد کرتے ہیں اس میں عیسائیت کو پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کرنا بھی شامل ہے ۔ اس بات کا اعتراف بھی ہم کر چکے ہیں کہ سرسری سے اندازوں کے سوا ہمیں ـــــ اور عام مسلمانوں کو بھی ـــــ اس بارے میں صورت حال کی اُس گہرائی اور گیرائی کا شعور نہ تھا جو اچانک کُھل کر سامنے آئی ہے ۔ عجیب اتّفاق ہے کہ اُدھر کراچی سے یہ الزام آیا اور اِدھر لاہور میں اس کا عملی ثبوت فراہم ہو گیا ۔ پاکستان کی عیسائی اقلیت نہ صرف جائز اور قانونی حقوق سے متمتّع ہو رہی ہے بلکہ ایک طرح سے مراعات یافتہ طبقے میں شامل ہے جس کا مظہر

باقی ص ۹۳

استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ (۲)

تشخیص و علاج

اصل سبب کیا ہے اور ذمّہ دار کون ہے
مستقل علاج اور فوری تدابیر

ڈاکٹر اسرار احمد

اصل سبب کیا؟
اور ذمہ دار کون؟

۹ نومبر ۸۶ء کو مکہ مکرمہ میں راقم نے قلم اُٹھایا تو تھا "پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا، کیوں؟ اور کیسے؟" کی تسوید کے لیے لیکن چونکہ اُن دنوں کراچی میں حالات بہت تشویشناک تھے اور جمعہ ۳۱ اکتوبر کو مہاجر قومی موومنٹ کی بسوں پر سہراب گوٹھ کے علاقے میں فائرنگ سے کراچی اور حیدر آباد میں اردو اور پشتو بولنے والوں کے مابین جس خونی تصادم کا آغاز ہوا تھا اور حجاز جاتے ہوئے ۳ نومبر کو کراچی میں ایک روزہ قیام کے دوران جو حالات سننے میں آئے تھے اور پاکستان کے اس "عروس البلاد" کو جس حال میں دیکھا تھا اس کا طبیعت پر بے حد اثر تھا، مزید برآں اُس سے متصلاً قبل صوبۂ سرحد کے حالات و واقعات، پھر پنجاب کے شیعہ سُنی فسادات اور کوئٹہ میں پٹھانوں اور بلوچوں کے مابین مسلح تصادم کی خبروں سے بھی دل بہت مغموم اور متفکر تھا، لہٰذا اشہب قلم نے بے اختیار پہلے تو "پاکستان کے عدم استحکام کی نئی جہتوں" کی جانب رُخ کیا اور اس کے بعد "مسئلہ سندھ" کی پیچ در پیچ گھاٹیوں کی طرف دوڑ لگادی ——— اور چونکہ راقم کے یہ الفاظ کسی تکلّف یا تصنّع پر بلکہ اُس کے حقیقی اور واقعی احساسات پر مبنی ہیں کہ:-

"راقم کے اندازے کے مطابق آئندہ چند سال کے دوران میں نہ صرف یہ کہ پاکستان کی قسمت اور اس کے ضمن میں "TO BE OR NOT TO BE"

کا فیصلہ سرزمین سندھ میں ہوگا بلکہ خود سندھ کی سعادت وشقاوت کا آخری فیصلہ بھی ہو جائے گا کہ آیا برِّ عظیم پاک وہند کا یہ اوّلین 'بابُ الاسلام' جو پہلی صدی ہجری کے اواخر میں صنم خانۂ ہند میں توحیدِ ربّانی اور حریّت و اخوّت و مساواتِ انسانی کے انقلاب آفریں پیغام کا 'مدخل' (یعنی داخل ہونے کی جگہ) بنا تھا، پندرھویں صدی ہجری کے آغاز میں اسلام کا 'مخرج' بلکہ 'مدفن' بنتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا یہ قطعۂ ارضی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اوّلاً پاکستان، پھر برِّ عظیم پاک وہند اور بالآخر پورے عالمِ انسانی میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق کے نقطۂ آغاز کی صورت اختیار کرتا ہے"!

لہٰذا سندھ کے مسئلے پر بات لمبی ہوتی چلی گئی۔ اور چونکہ راقم کے نہاں خانۂ قلب میں اس اُمّید کا چراغ بھی روشن تھا کہ :۔

> "کیا عجب کہ سندھ کے مسائل کا تجزیاتی مطالعہ پورے پاکستان کے مسائل کی پہچان کا ذریعہ بن جائے، اور ؏ 'روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب' کے مصداق اس وقت سندھ جس بحرانی کیفیت سے دوچار ہے اور جس اضطراب اور کرب میں مبتلا ہے کیا عجب کہ وہ کسی نئے عہدِ سعادت کی ولادت کے درد کی لہریں (BIRTH PANGS) ثابت ہوں اور اللہ شر سے خیر برآمد فرما دے۔۔"

لہٰذا راقم نے مقدور بھر تجزیے کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ——— اس کے نتیجے میں جو کچھ اب تک رقم ہوا اُس نے "استحکامِ پاکستان" ہی کے ضمیمے یا تتمّے کی صورت اختیار کر لی اور اصل موضوع پر گفتگو کا تا حال آغاز بھی نہیں ہو سکا!

جس طرح آج سے چار سال قبل جنرل محمّد ضیاء الحق کے نام خط میں راقم نے سندھ کے بارے میں جن خدشات کا اظہار کیا تھا اسے مخالفین نے تو خللِ دماغی سے تعبیر کیا تھا، اور احباب نے بھی شدّتِ احساس کا مظہر قرار دیا تھا، (اگرچہ اس خط کی تحریر کے آٹھ دس ماہ کے اندر ہی سندھ میں ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران جو لاوا پھٹا تھا اُس

نے راقم کے مشاہدات اور قیاسات کی پوری تصدیق کر دی تھی) بالکل اُسی طرح اکثر و بیشتر لوگوں نے "استحکام پاکستان" کے آخری باب کے ان الفاظ کو بھی مبالغے پر مبنی قرار دیا کہ:

"ایک جانب ہمارے قومی و ملی وجود کا موجودہ دینی و مذہبی، دستوری و سیاسی اور اخلاقی و عملی 'منظر' اور اس کا چالیس سالہ 'پس منظر' جو بظاہر شیکسپیئر کے الفاظ "TO BE OR NOT TO BE IS THE کے سوالیہ نشان کے ساتھ ایک عقدۂ لاینحل کی صورت اختیار کر چکا ہے نتیجۃً ملک و ملت بالکل اُس کیفیت میں نظر آ رہے ہیں جس کا نقشہ سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر ۱۰۳ میں ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ "وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ" یعنی "تم لوگ آگ کے ایک گڑھے کے بالکل کنارے پر تھے"! اور بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ 'خاکم بدہن' مکمل تباہی ہمارا مقدر بن چکی ہے!

اسی طرح راقم کی نومبر دسمبر ۸۶ء کی تحریروں کو بھی عوام ہی نہیں اچھے بھلے تعلیم یافتہ اور دانشور لوگوں نے بھی قنوطیت پر مبنی اور یاسیت پسندی (PESSIMISM) کا مظہر قرار دیا ــــــ لیکن جو کچھ کراچی میں وسط دسمبر میں ہوا اُس نے ہر شخص کے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے اور اس وقت ہر صاحب احساس و شعور انسان خائف اور پریشان نظر آ رہا ہے کہ ہم کدھر جا رہے ہیں ؟ اور اس کا آخری نتیجہ کیا نکلے گا؟

اِن چند دنوں کے دوران کتنی جانیں ضائع ہوئیں، کتنے لوگ اپاہج ہوئے، کتنے گھر اُجڑے، کتنے کنبے نیست و نابود ہوئے، کتنے سہاگ لٹے، کتنے معصوم یتیم ہوئے، کتنوں کی ضعیفی کے سہارے ختم ہوئے، کتنے مکان نذرِ آتش ہوئے، کتنی دکانیں جلیں، کتنے کارخانے تباہ ہوئے، کتنی گاڑیاں بھسم ہوئیں ــــــ اور اِن سب سے بڑھ کر، ذہنوں میں کتنے فاصلے بڑھے، دلوں میں کتنی نئی نفرتوں نے جنم لیا، آتشِ غیظ و غضب کہاں تک پہنچی، اور انتقام در انتقام کا سلسلہ کتنا وسیع ہوا! اس کا صحیح اندازہ

مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے! ——— مختصر یہ کہ پاکستان میں مختلف النوع محرومیاں کے احساس کا سب سے بڑا مظہر اور سیاسی و معاشی، سماجی و معاشرتی، نسلی و لسانی، اور تہذیبی و ثقافتی جملہ اقسام کے تصادموں کا سب سے بڑا مرکز سندھ بن گیا تھا، اور کراچی چونکہ سندھ ہی نہیں پورے پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے اور وہاں نسلی و لسانی اکائیاں بالکل اس کیفیت کے ساتھ باہم گڈمڈ اور گتھم گتھا ہیں جس کا نقشہ سورۂ کہف کے ان الفاظ مبارکہ میں سامنے آتا ہے کہ: "وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ" ترجمہ "اور ہم کھلا چھوڑ دیں گے انہیں اس دن کہ موجوں کے مانند ایک دوسرے میں گھس جائیں" لہٰذا محرومیوں اور مایوسیوں اور ان کے ہیچ در ہیچ ردِّعمل کا جو لاوا کئی سال سے اندر ہی اندر کھول رہا تھا وہ بالآخر پھٹا کراچی میں، اور نفرتوں اور عداوتوں کے اس بارود میں آگ لگی۔ پاکستان کے اس 'عروس البلاد' میں جو دیکھتے ہی دیکھتے بیروت کی صورت اختیار کر گیا، اور وہاں ہندوستان کے کونے کونے سے آکر آباد ہونے والے مہاجروں پر وہ قیامت ٹوٹی کہ ۱۹۷۱ء کے المیے کی صرف یاد ہی تازہ نہیں ہوئی بلکہ اس کا عملی اعادہ (ACTION REPLAY) بھی ہو گیا! اور قدرت کی ستم ظریفی یہ کہ سب کچھ اس شہر میں ہوا جسے مہاجرین اپنا سب سے بڑا گڑھ سمجھتے ہیں اور سب سے محفوظ مامن (امن کی جگہ) بھی۔ چنانچہ ۱۹۷۲ء کے لسانی فسادات کے بعد بہت سے مہاجر کنبے، بالخصوص آسودہ حال تاجر اندرون سندھ سے کراچی منتقل ہو گئے تھے، واحسرتا کہ آج زمانہ اُن سے بزبانِ حال و بالفاظ جگر یہ کہہ رہا ہے کہ:

آسودۂ ساحل تو ہے مگر شاید یہ تجھے معلوم نہیں!!
ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں، خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں

جیسا کہ عام معمول ہے، اب بہت سے 'پنڈت' جاگ جائیں گے اور نہ صرف یہ کہ حالات و واقعات کی بھرپور عکاسی ہو گی اور رنج و غم کا اظہار ہو گا بلکہ ایک سے بڑھ کر ایک تبصرے اور تجزیئے بھی تحریر ہوں گے ——— لیکن اندیشہ ہے کہ اب بھی روایتی سطحیت اور ظاہر بینی ہی کا مظاہرہ ہو گا اور ساری توجہات فوری اسباب و عوامل ہی پر مرکوز ہو کر رہ جائیں

گی اور نہ گہرائی میں اُتر کر یہ دیکھنے کی کوشش ہوگی کہ اس صورتِ حال کا اصل سبب کیا ہے اور نہ اس پر غور ہوگا کہ اس کا اصل علاج اور مستقل حل کیا ہے؟

اصل سبب!

ان سطور کا عاجز و ناچیز راقم پوری طرح مطمئن ہے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اُس نے اسی تعالیٰ کی توفیق سے اپنی تالیف "استحکام پاکستان" میں اِس المیے کا اصل سبب عمرانیات کے مسلّمہ دلائل اور سیاسیات کے ناقابلِ تردید شواہد کے حوالے سے بھی بیان کر دیا ہے اور حکمتِ قرآنی کی محکم اساسات اور قانونِ خداوندی کے اٹل اصولوں کی روشنی میں بھی واضح کر دیا ہے۔

چنانچہ حسبِ ذیل حقائق عمرانیات و سیاسیات کے تفصیلی دلائل کے ساتھ مبرہن کیے جا چکے ہیں کہ:

(۱) اگرچہ پاکستان کا قیام کسی مثبت اور فعّال دینی جذبے کا مرہونِ منّت نہیں تھا بلکہ اصلاً برّعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی قومی جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ لیکن چونکہ مسلمانانِ ہند کی قومیت کی بنیاد سوائے دین و مذہب کے اور کوئی نہیں تھی لہٰذا پاکستان کی اساس بھی صرف اور صرف اسلام ہے!

(۲) اس تاریخی پس منظر سے قطع نظر، پاکستان کے بقا و استحکام کے لیے بھی نہ تاریخی تقدّس کا عامل موجود ہے، نہ ہی اُسے قدرتی اور محکم جغرافیائی حدود کا تحفّظ حاصل ہے، پھر کسی طاقتور قومی جذبے یا نیشنلزم کے لیے دنیا کی مرّوجہ اساسات میں سے بھی کوئی ایسی اساس یہاں موجود نہیں جو کُل پاکستان سطح پر فعّال انداز میں بروئے کار آسکے۔ چنانچہ ملکی سطح پر یہاں نہ کوئی نسلی نیشنلزم موجود ہے نہ لسانی، رہی وطنی قومیت تو وہ یہاں اس لیے قابلِ عمل نہیں کہ اُس کی کلّی نفی ہی کی بنیاد پر تو پاکستان کی تحریک چلائی گئی تھی ——— لہٰذا ؏
"کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو!" کے مصداق پاکستان کے بقا و استحکام کے لیے سوائے مذہبی جذبے کے کوئی اور سہارا موجود نہیں ہے!

(۳) لیکن اس ضمن میں اب وہ 'قومی مذہبیت' کفایت نہیں کر سکتی جو ہندو کے خوف کے باعث تقویت پاکر پاکستان کے قیام کا ذریعہ بن گئی تھی، بلکہ اب ایک ایسا فعّال اور متحرک دینی جذبہ درکار ہے جس کی جڑیں حقیقی ایمان و یقین اور اسلام کے ساتھ واقعی اور عملی وابستگی میں گہری اتری ہوئی ہوں۔

(۴) اور چونکہ قیام پاکستان کے بعد اس سمت میں کوئی موثّر اور حقیقی و واقعی پیش رفت نہیں ہوئی۔ لہٰذا مسلم قومیّت کا جذبہ رفتہ رفتہ سرد پڑتا چلا گیا اور اس کی جگہ نسلی و لسانی قومیتوں اور علاقائی و صوبائی عصبیتوں نے لے لی۔ اور اب انہوں نے اتنی قوّت حاصل کرلی ہے اور اتنی شدّت پکڑ لی ہے کہ اُن کے مابین خونی تصادم تک کی نوبت آگئی ہے۔ اور کم از کم وقتی طور پر پاکستان میں 'مسلم قومیّت' اس شعر کی مصداق کامل نظر آتی ہے کہ ؎

"دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میّت نہ ہو — اک جنازہ جارہا ہے دوش پر تقدیر کے!"

اور کم از کم بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ اب پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے صرف کوئی 'معجزہ' ہی بچا سکتا ہے!

مزید برآں خالص حکمتِ قرآنی کی اساسات اور قوانین و نوامیس الٰہیہ کی بنا پر واضح کیا جاچکا ہے کہ:۔

(۱) قیامِ پاکستان کا 'معجزہ' اس بنا پر ظہور میں آیا تھا کہ پورے برّعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں نے اللہ تعالےٰ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پاکستان میں اُس تعؐ کے دین کا بول بالا کریں گے اور اُس نظام عدلِ اجتماعی کو نافذ کریں گے جو اس تعؐ نے اپنے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے عطا فرمایا تھا اور جو بالفعل اور بہ تمام و کمال عہدِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہؓ کے دَوران قائم رہا تھا۔

(۲) اس وعدے کی مسلسل خلاف ورزی کی ایک سزا جو سورۃ توبہ کی آیت نمبر ۷۷ میں بیان شدہ سنّتِ الٰہی کے مطابق مسلمانانِ پاکستان کو ملی وہ اخلاق و کردار کا وہ شدید بحران اور نفاقِ عملی کا وہ ہمہ گیر تسلط ہے جس سے ہم بحیثیت قوم دوچار ہیں۔ چنانچہ جھوٹ، خیانت، وعدہ خلافی اور ذرا سے اختلاف پر آپے سے باہر ہوجانے کے وہ چاروں اوصاف

پاکستان کے شہریوں کی عظیم اکثریت کے کردار کا جزو لاینفک بن گئے ہیں جو نفاق کی علامات کی حیثیت سے متعدد متفق علیہ احادیث نبویہ میں بیان ہوئے ہیں!

(۳) اس کی دوسری سزا وہ تشتت و انتشار یا 'نفاق باہمی' - اور فرقوں اور گروہوں اور قومیتوں اور عصبیتوں کا وہ تصادم ہے جس کا نقشہ سورۃ انعام کی آیت نمبر ۶۵ کے ان الفاظ مبارکہ میں کھینچا گیا ہے کہ: "اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ" ترجمہ: "یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے باہم ٹکرا دے اور تمہیں خود ایک دوسرے ہی کی جنگی قوت کا مزہ چکھائے!

(۴) اس کی ایک انتہائی شدید اور ہولناک صورت ۱۹۷۱ء میں ظاہر ہوئی تھی جس کی بنا پر بھارت کو یہ جرأت ہوئی تھی کہ مشرقی پاکستان پر حملہ کر کے اُسے مغربی پاکستان سے علیحدہ بھی کر دے اور اُسے 'بنگلہ دیش' میں تبدیل کر کے مسلم قومیت کے خاتمے کا اعلان کرے! تاہم مغربی پاکستان کی حد تک عذابِ خداوندی کا یہ کوڑا اُس سنّتِ الٰہی کا مظہر تھا جو قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر بیان ہوئی ہے اور کمالِ اختصار کے ساتھ سورۃ سجدہ کی آیت نمبر ۲۱ میں وارد ہوئی ہے یعنی: "وَلَنُذِیْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰی دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَکْبَرِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ" ترجمہ: "اور ہم انہیں آخری اور بڑے عذاب سے قبل نسبتاً چھوٹے عذاب کا مزہ لازماً چکھائیں گے، شاید کہ وہ اپنی روش سے باز آجائیں!"

(۵) لیکن چونکہ ہم، مغربی پاکستان کے مسلمان، اس کے بعد بھی ہوش میں نہیں آئے اور بقول "نہ تم بدلے، نہ ہم بدلے، نہ دل کی آرزو بدلی!" کے مصداق نہ ہماری انفرادی زندگی کے رنگ ڈھنگ میں کوئی فرق آیا نہ ہی قومی و اجتماعی سطح پر دین کی جانب کوئی فیصلہ کن پیش قدمی ہوئی لہٰذا اب بعینہٖ وہی صورتِ حال اس بچے کھچے پاکستان میں پیدا ہو چکی ہے اور گذشتہ دو تین ماہ کے دوران پنجاب کے شیعہ سُنی فسادات، کوئٹہ کے بلوچ پختون تصادم اور سب سے بڑھ کر کراچی اور حیدر آباد میں پشتو اور اُردو بولنے والوں کے مابین خانہ جنگی کی صورت میں اس کی جو شدّت ظاہر ہوئی ہے اُس کے پیشِ نظر اس وقت جو سب سے بڑی دعا کی جاسکتی ہے وہ یہی ہے کہ خدا کرے کہ یہ واقعات و حوادث ہمیں

ہات کے مانند ایک 'تنبیہ' ہی کی حیثیت رکھتے ہوں اور اللہ تعالیٰ آخری تباہی والے عذاب اکبر' سے قبل اپنے خصوصی رحم وکرم کے طفیل ہمیں کچھ مزید مہلت عمل اور تلافی مافات ایک موقع عطا فرما دے! وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ! (اور یہ اللہ کے لیے کچھ مشکل ہیں ہے!)

ذمّہ دار کون؟

آگے بڑھنے سے قبل ایک نظر اس سوال پر بھی ڈال لی جائے کہ ہمارے اس قومی لیے کی ذمّہ داری کس پر ہے؟

اس سلسلے کی اوّلین اور اہم ترین حقیقت تو یہ ہے کہ حکمتِ قرآنی کی رُو سے قوموں اور اشروں پر جو اجتماعی مصائب نازل ہوتے ہیں وہ اُن کے اپنے کرتوتوں کا نتیجہ ہوتے ں۔ چنانچہ سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۳۰ میں نہایت جامعیت و اختصار کے ساتھ یہ قاعدہ یہ بیان ہوا ہے کہ: "وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ" ترجمہ: "اور جو مصیبتیں بھی تم پر آتی ہیں وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی مائی کے طفیل آتی ہیں، اور تمہاری بہت سی بداعمالیوں سے تو اللہ درگذر بھی فرماتا رہتا ے"! اور یہ بات تو قرآن حکیم میں بے شمار مرتبہ بیان ہوئی ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ہرگز لم نہیں کرتا ـــــــ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ہماری موجودہ زبوں حالی اور تشویشناک ورتِ حال ع" اے بادِ صبا! ایں ہمہ آوردۂ تست!" کے مصداق بالکلیہ ہماری اپنی کوتاہیوں ر بداعمالیوں کا نتیجہ ہے اور اس وقت ہم پر سورۂ روم کی آیت نمبر ۴۱ کے یہ الفاظ صد فیصد طبق ہوتے ہیں کہ "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ" جمہ: "لوگوں کے کرتوتوں کی بنا پر خشکی اور تری ہر جگہ فساد رونما ہو چکا ہے"! ـــــــ

ر جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، حالات کے تیور اتنے خطرناک ہیں کہ فی الوقت جو سب سے بڑی تمنا کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس آیۂ مبارکہ کے آخری الفاظ بھی، جو سورۂ سجدہ کی محولہ بالا آیت نمبر ۲۱ کے مشابہ ہیں، یعنی: "لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ

عَمِلُوْا لَعَلَّھُمْ یَرْجِعُوْنَ ۝ ترجمہ: "تاکہ اللہ انہیں ان کے کچھ اعمال کا مزہ چکھائے، شاید کہ وہ (اپنی موجودہ روش سے) باز آجائیں"۔ ہم پر صادق آجائیں اور موجودہ حالات آخری عذابِ ہلاکت کے آثار و مقدمات نہ ہوں بلکہ ایک تنبیہہ اور تازیانۂ عبرت کا کام کریں اور ہم ہوش میں آجائیں۔!

دوسری اہم حقیقت یہ پیشِ نظر رہنی ضروری ہے کہ قوموں کے اجتماعی فساد کی ذمہ داری اگرچہ اصلاً تو پوری قوم پر بحیثیتِ مجموعی عائد ہوتی ہے اور قوم کا کوئی فرد اس سے بالکلیہ بری الذمہ نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ "فطرت افراد سے اغماض بھی کرلیتی ہے۔ نہیں کرتی کبھی ملّت کے گناہوں کو معاف!" کے مطابق جب قوموں پر عذاب آتا ہے تو وہ سورۂ انفال کی آیت نمبر ۲۵ میں واردشدہ الفاظ "وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً" ترجمہ: "اور ڈرو اُس عذاب سے جو خاص طور پر صرف ان ہی کو لپیٹ میں نہیں لے گا جنہوں نے بالفعل ظلم کیا ہوگا!" کے مطابق گیہوں کے ساتھ گھُن بھی پس جاتا ہے ——— تاہم سورۂ نور میں واقعۂ افک کے ضمن میں جو اصول بیان ہوا ہے یعنی "لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ" ترجمہ: "ان میں سے ہر ایک نے جو گناہ کمایا وہ اس کا ذمہ دار ہے، رہا وہ جس نے سب سے بڑی ذمہ داری کا بوجھ اپنے سر لیا تو اس کے لیے تو بہت بڑی سزا ہے!" اس کے مطابق مختلف افراد، گروہوں اور طبقات کی ذمہ داری اُن کے مرتبہ و مقام، اہمیّت و صلاحیّت، اور اختیار و اقتدار کی نسبت سے کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ عوام الناس کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذمہ داری ان لوگوں اور طبقوں پر عائد ہوتی ہے جو سیاسی حیثیت و اقتدار کے مالک یا علمی و دینی مرتبہ و وجاہت کے حامل ہوں، یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ نے دین میں فساد و ابتری کا ذمہ دار سلاطین، علماء اور صوفیاء کو قرار دیا ہے:

"وَمَا اَفْسَدَ الدِّيْنَ اِلَّا الْمُلُوْكُ وَاَحْبَارُ سُوْءٍ وَرُهْبَانُهَا"

یعنی دین میں بگاڑ عوام نہیں، بلکہ بدکردار بادشاہ، علماء سوء اور دنیادار راہب و درویش

پیدا کرتے ہیں، (علامہ اقبالؔ کا یہ خیال بھی غالباً اسی شعر سے مستعار ہے کہ "نہ باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری ٭ اے کشتۂ مُلّائی و سلطانی و پیری"!)

اس اصول پر قیاس کرتے ہوئے' ہمارے قومی المیے کی سب سے بڑی ذمہ داری بھی سیاسی زعماء و قائدین' علماء کرام' اور صوفیائے عظام ہی پر عائد ہوتی ہے ——— اور ان میں سے بھی "وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ" کا مصداق ایک جانب وہ سیاسی جماعتیں قرار پائیں گی جنہوں نے اسلام کے نعرہ کو سیاسی حربے کے طور پر استعمال کیا اور دوسری جانب وہ دینی و مذہبی تنظیمیں جنہوں نے اپنی توانائیاں فرقہ وارانہ اختلافات کی آگ کو بھڑکانے میں صرف کیں یا اپنے ترک و اختیار' ردّ و قبول' تقدیم و تاخیر' اور تائید و مخالفت کے لیے اصل معیار خالص سیاسی مصلحتوں کو بنا لیا ———

علیٰ ہٰذا القیاس' ملک کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ذمہ داری بھی یکساں اور برابر نہیں بلکہ کم و بیش ہے ——— (اور اس ضمن میں بنیادی اصول یہ ہوگا کہ جن لوگوں کا حصّہ قیام پاکستان کے سلسلے میں سب سے زیادہ تھا فطری اور منطقی طور پر وہی اس کی تعمیر و ترقی کے بھی سب سے بڑھ کر ذمہ دار تھے اور یہ ذمہ داری اصلاً اُن ہی کی تھی کہ وہ اِس قافلۂ ملّی کو صحیح سمت میں رواں دواں رکھیں نہ کہ خود ہی ع "یہ صور پھونک کے تم سو گئے کہاں آخر؟" کے مصداق بن جائیں) ——— لہٰذا پاکستان کے استحکام اور یہاں اسلام کے نفاذ و قیام کے ضمن میں اُن کی کوتاہی اگر دوسروں کے برابر ہو تب بھی وہ سب سے بڑھ کر ذمہ دار اور قصور وار قرار پائیں گے !

اس اصول کے مطابق پاکستان کے المیے کی ذمہ داری موجودہ پاکستان کے چاروں صوبوں میں پہلے سے آباد لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ عائد ہوتی ہے اُن لوگوں پر جو ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ترکِ وطن کر کے پاکستان آئے اور عرفِ عام میں 'مہاجر' کہلاتے ہیں اس لیے کہ اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ عالمِ اسباب میں پاکستان کے قیام کے سب سے بڑے کریڈٹ کے مستحق بھی وہی ہیں۔

ہر شخص جانتا ہے کہ تحریک پاکستان اصلاً ہندوستان کے مسلم اقلیت والے علاقوں ہی سے اُبھری تھی جہاں کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے مزاج اور افتادِ طبع، اُن کے قلبی احساسات اور ذہنی رجحانات، اور اُن کے ارادوں اور منصوبوں کا علم ذاتی مشاہدے اور عملی تجربے کی بنا پر حاصل تھا، لہٰذا 'اکھنڈ بھارت' میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں سب سے بڑھ کر خوف اور خدشہ بھی اُن ہی کو لاحق تھا! عقل اور منطق کی رُو سے یہ صورت مسلم اکثریت والے علاقوں میں ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صوبۂ سرحد اور بلوچستان میں، جہاں ہندو آٹے میں نمک کے مانند تھے، مسلم قومیت پر مبنی کسی تحریک کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا، چنانچہ سرحد میں آخر وقت تک کانگریس کی وزارت قائم رہی اور بلوچ سرداروں کی اکثریت نے بھی مجبوراً اور بادلِ ناخواستہ ہی پاکستان میں شمولیت قبول کی تھی۔ اسی طرح پنجاب اور سندھ میں بھی ۳۷ء تک تو مسلم لیگ کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ اور دونوں صوبوں میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مشترک جماعتوں کا طوطی بول رہا تھا، یعنی پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کا سکہ رواں تھا اور سندھ میں سندھ یونائیٹڈ پارٹی ہی سب سے بڑی جماعت تھی۔ چنانچہ پنجاب میں ۱۷۵ کے ہاؤس میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کل دو ممبر کامیاب ہوئے تھے اور اُن میں سے بھی ایک فوراً دوسروں سے جا ملا تھا ـــــ اور سندھ میں تو ۵۸ کے ہاؤس میں ایک بھی مسلم لیگی نہ تھا۔

الغرض، تحریک پاکستان بنیادی طور پر ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی تحریک تھی اور اکثریتی صوبوں کے مسلمان تو بعد میں ان کے معین و مددگار (یعنی 'انصار') بنے تھے، اور قیام پاکستان کا سہرا اصلاً ہندی مسلمانوں ہی کے سر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں قیام پاکستان کے وقت بھی بے پناہ قربانیاں دینی پڑی تھیں ـــــ اور وہ آج تک بھی اسی ناقابلِ معافی جرم کی بنا پر بھارت میں ہندو اکثریت کے معتوب ہیں کہ اُن ہی نے بھارت ماتا کے ٹکڑے کرائے تھے ـــــ لہٰذا ع "جن کے رُتبے ہیں سوا، ان کی سوا مشکل ہے!" کے مطابق قیامِ پاکستان کے مقاصد کی تکمیل اور اُس سمت میں فیصلہ کُن پیشقدمی کی ذمہ داری بھی سب سے بڑھ کر ان ہی لوگوں پر عائد ہوتی تھی جنہوں نے اقلیتی

صوبوں سے ترکِ وطن کرکے پاکستان میں سکونت اختیار کی ——— اور اُن میں سے بھی خاص طور پر وہ جن کی یہ ہجرت، جبری نہیں اختیاری تھی! اور راقم کو یقین ہے کہ ایسے لوگوں میں سے قدرِ قلیل کے سوا اکثر و بیشتر لوگوں کی یہ نقل مکانی اصلاً مال و دولت کے حصول اور دنیوی امنگوں کی تکمیل کے لیے نہیں تھی بلکہ قومی و ملّی جذبات اور ملّتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کے ولولہ و امنگ کی بنا پر تھی ——— پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اُن میں ایک بہت بڑی تعداد سرہند و سہارنپور، دیوبند و علی گڑھ، دہلی و اجمیر، لکھنؤ، اعظم گڑھ، فرنگی محل والے بریلی اور خیرآباد و عظیم آباد (پٹنہ) کی علمی، دینی اور روحانی وراثت کے حاملوں اور خاص طور پر تحریکِ شہیدینؒ کے جوشِ جہاد اور ذوقِ شہادت کے وارثوں پر مشتمل تھی!

اب اگر ان کی اکثریت بھی پاکستان آکر آزادی کے مادّی ثمرات ہی کو سمیٹنے میں منہمک ہوگئی اور انہوں نے کاروبار بھی چمکائے اور فیکٹریاں بھی تعمیر کیں، دولت بھی کمائی اور جائدادیں بھی بنائیں، عالی شان محل بھی تعمیر کیے اور دنیوی آسائشوں کے جملہ ساز و سامان بھی فراہم کیے لیکن نہ ملّت کی تعمیرِ نو کی جانب توجہ کی، نہ دین کے احیاء کی فکر کی، نہ سماجی انصاف اور سیاسی و معاشی عدل کے قیام کی جدّ و جہد کی، نہ ملکی سیاست کو صحتمند خطوط پر پروان چڑھانے میں مؤثر حصّہ لیا، نہ قافلۂ ملّی کو صحیح سمت میں رواں رکھنے میں فیصلہ کُن کردار ادا کیا ——— بلکہ اس کے برعکس جس کے پاس چار پیسے آگئے اُس نے اپنی سابقہ سماجی و معاشی روایات تک کو خیرباد کہہ کر مغربی تہذیب اور جدید طرزِ معاشرت کو اختیار کر لیا۔ تو محض یہ دلیل کہ ان امور میں مقامی لوگ یعنی پنجابی، سندھی، پٹھان اور بلوچ بھی تو اُن سے پیچھے نہیں اور اس حمام میں تو سب ہی ننگے ہیں، انہیں اپنی خصوصی اور اضافی ذمّہ داری سے بری نہیں کرسکتی!

چنانچہ یہی بات تھی جو راقم کی ایک تقریر کے حوالے سے اخبار میں شائع ہوگئی تھی جس پر 'مہاجرین' کی جانب سے ناراضگی کا اظہار ہوا۔ حالانکہ میں گذشتہ کئی سالوں سے کراچی، حیدرآباد اور سکھر میں اپنے دروس و خطابات کے دوران "نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی!" پر عمل کرتے ہوئے اِس سے کہیں زیادہ تلخ انداز میں کہتا رہا ہوں کہ مہاجر ہی ہوش میں آئیں! ورنہ اگر پاکستان پر اپنے مقصدِ قیام سے انحراف کی بنا پر عذاب آیا

تو اُس کی شدید ترین صورت اُن مہاجرین ہی کے حصے میں آئے گی۔ اور اسلامی عصبیت کے کمزور پڑنے سے سبب علاقائی اور لسانی قومیتوں کا سیلاب آئے گا تو اس میں سب سے پہلے اُن کے گھروندے بہیں گے اور بالخصوص سندھی نیشنلزم کا جو طوفان تیزی سے اُمڈ رہا ہے وہ سب سر سے گزرا تو اس سے جو تباہی اُن پر آئے گی اُس کا اِس وقت تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مختصر یہ کہ وہ صورت بنے گی کہ ؎ "دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں!" — یہ دوسری بات ہے کہ "وَاِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ" (سورۃ انبیاء: آیت ۱۰۹، ترجمہ "اور مجھے نہیں معلوم کہ جس عذاب کی خبر تمہیں دی جا رہی ہے وہ قریب ہی آن پہنچا ہے یا ابھی دُور ہے!") کے مصداق راقم کو قطعاً اندازہ نہ تھا کہ اس عذاب کی پہلی قسط اتنی جلد آجائے گی، اور وہ بھی مہاجرین کے گڑھ اور قلعے کراچی میں، مزید برآں انتہا پسند سندھی قوم پرستوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ کچھ اور لوگوں کے ذریعے!! چنانچہ راقم اس پر شدید صدمے کی کیفیت سے دوچار رہا اور ۳۰ نومبر ۱۹۸۶ء کو راقم نے کراچی کو جس حال میں دیکھا اور وہاں ظلم و بربریت کی جو داستانیں سُننے میں آئیں اُن کے باعث لگ بھگ ایک ہفتہ راقم پر سکتہ سا طاری رہا! اور اب بھی اُس کے دل و دماغ سخت صدمہ محسوس کر رہے ہیں، اس لیے کہ ؎ "بدنصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا!" کے مصداق بدقسمتی سے اُسے کسی قدر اندازہ ہے کہ معاملہ ہے "ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!" والا معاملہ ہے اور اگر حالات میں کوئی فوری اور انقلابی تبدیلی نہ آئی تو اس سے کہیں زیادہ بھیانک اور ہولناک صورتیں سامنے آئیں گی! اَللّٰھُمَّ اَعِذْنَا مِنْ ذٰلِکَ۔

پاکستان میں پہلے سے آباد لوگوں میں سے میرے نزدیک اُس کی تعمیر و ترقی اور اس میں اسلامی اقدار کے احیاء اور اسلام کے نظامِ عدل و قسط کے قیام کی سب سے زیادہ ذمہ داری سندھی مسلمانوں پر تھی۔ اس لیے کہ اوّلاً: پاکستان کے موجودہ صوبوں میں سے وہ واحد صوبہ جس میں قبل از تقسیم ہند مسلم لیگ کی حکومت قائم تھی سندھ ہی تھا۔ ثانیاً

ندھ ہی وہ واحد صوبہ ہے جو اپنی پوری صحیح و سالم صوبائی حدود اور ایک ایسے مکمل کلچرل
نٹ کی حیثیت سے پاکستان میں شامل ہوا جس کے لیے ملکی حدود سے باہر کوئی لسانی
قافتی کشش (PULL) موجود نہ تھی۔ اس کے مقابلے میں پنجاب تقسیم کے دردناک صدمے
ے دوچار ہوا، اور سرحد اور بلوچستان کے لیے زبان و قومیت کی زوردار کشش بیرونِ
ستان موجود تھی۔ ثالثاً: پاکستان کے موجودہ صوبوں میں سے وہ واحد صوبہ بھی سندھ
ی تھا جہاں کے مسلمانوں کو ہندوؤں کی ذہنیت کا کسی قدر اندازہ تھا۔ اس لیے کہ سرحد
ر بلوچستان میں تو سرے سے ہندو مسلم مسئلہ موجود ہی نہیں تھا۔ پنجاب میں اُن عوامل
ی بنا پر جن پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے انگریز نے مسلمانوں کو دبانے کی بجائے کسی نہ کسی درجے میں
ہارا دیا اور اُن کی حوصلہ افزائی کی لہٰذا ہندو اُن کا زیادہ استحصال نہیں کر سکے جبکہ سندھ
ں اُن اسباب کی بنا پر جن کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے، انگریز نے بقیہ پورے ہندوستان اور
خصوصی بنگال کی طرح مسلمانوں کو شدت کے ساتھ دبایا اور اُن کے مقابلے میں ہندوؤں کی
قاعدہ سرپرستی کی۔ لہٰذا ہندوؤں کے ساہوکارانہ ہتھکنڈوں کا تلخ تجربہ سندھی مسلمانوں کو
ھا اور اِس اعتبار سے اُنہیں مہاجرین کے ساتھ ایک گونہ مشابہت حاصل تھی ـــــ
بعاً: یہ کہ تاریخی اعتبار سے یہ شرف تو پورے برِعظیم ہندو پاک میں صرف سندھ ہی کو
اصل ہے کہ اسلام کی قدیم ترین اور خالص عربی الاصل روایات نے وہاں گہری جڑیں جمائیں
ور اگرچہ یہ سلسلہ مغربی پنجاب کے بھی ایک بہت بڑے حصے تک پھیل گیا تھا لیکن
"الاقدم فالاقدم" کے اصول کے مطابق اِس سلسلے میں فیصلہ کُن فضیلت سندھ کو
حاصل ہے ـــــ مزید برآں سندھ طویل ترین عرصے تک اسلامی علوم کا عظیم گہوارہ بنا رہا۔
چنانچہ ابتدائی دور میں یہ شرف زیادہ تر سندھ کے زیریں علاقے خصوصاً ٹھٹھہ شہر کو حاصل
رہا جس میں ایک قدیم سفرنامے کی روایت کے مطابق ایک دَور میں تین صد دارالعلوم قائم
تھے! بعد کے زمانے میں اَپر سندھ نے اِس ضمن میں زیادہ اہمیت حاصل کر لی جہاں
بڑے بڑے دینی و رُوحانی مراکز قائم رہے۔ چنانچہ قصبہ گھوٹکی نے شیخ محمد حیات سندھیؒ
ایسا عظیم محدث پیدا کیا جس کے شاگردوں میں بارہویں صدی ہجری کے وہ مجدّد محمد ابن

عبدالوہاب نجدیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ ایسی عظیم شخصیتیں شامل ہیں (بعدازاں تحریک ولی اللّٰہی کا بھی بہت بڑا مرکز سندھ بنا۔ نیتجۃً اس کے زیراثر اٹھنے والی عظیم تحریک شہیدینؒ کے قافلے کی سندھ میں رانی پور اور پیر جو گوٹھ کے دینی و روحانی مراکز میں شایانِ شان پذیرائی بھی ہوئی اور پنجاب اور سرحد کو سکھوں کے تسلط سے نجات دلانے کے لیے یہ تقسیم کار بھی طے ہوئی کہ مجاہدینؒ کا قافلہ بلوچستان اور افغانستان ہوتا ہوا شمال مغربی جانب سے سکھوں پر حملہ کرے ــــ اور سندھی مجاہدینؒ بہاولپور اور ڈیرہ غازی خان سے ہوتے ہوئے سکھوں کی سلطنت پر جنوب مغرب سے حملہ آور ہوں، ــــ یہ دوسری بات ہے کہ کچھ خوانین سرحد کی غداری اور کچھ اپنی تدبیری غلطیوں کے باعث یہ جہاد پہلے ہی مرحلے میں دنیوی اعتبار سے ناکام ہوگیا۔ اگرچہ مجاہدینؒ نے جامِ شہادت کی صورت میں وہ سب سے بڑی کامیابی حاصل کر لی جس سے بڑی کامیابی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ــ پھر یہ تو اسی صدی کا واقعہ ہے کہ حکمتِ ولی اللّٰہی کا وہ عظیم شارح جس نے پنجاب کے ایک سکھ خاندان میں آنکھ کھولی تھی مشرف بہ اسلام ہو کر سندھ پہنچا تو اُسے وہاں کی فضا ایسی پسند آئی کہ وہیں کا ہو رہا اور اب دنیا اُسے جانتی ہی مولانا سندھیؒ کے نام سے ہے۔ ہماری مراد مولانا عبیدؒ اللہ سندھی سے ہے۔

الغرض ع " جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے!"، کا اصول مہاجرین کی طرح قدیم سندھی مسلمانوں پر بھی منطبق ہوتا ہے ــــ اور اگر اس شاندار ماضی کے حامل صوبے میں دین و شریعت کا استہزاء ہو، اسلامی اقدار و شعائر کا مذاق اُڑے، لسانی صوبائی عصبیت دینی و اسلامی عصبیت سے بالاتر ہو جائے، ملی وحدت پارہ پارہ ہو اور اُس کی جگہ زبان اور کلچر کے نام پر ہندوؤں کے ساتھ متحدہ قومیت کا پرچار ہو ــــ یا خالص مادی نظریات کو فروغ حاصل ہو اور نوجوانوں میں مارکس ازم اور کمیونزم جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہے ہوں، اور دین دار عناصر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور علماء کرام نہ صرف یہ کہ قال اللہ اور قال الرسولؐ ہی میں منہمک رہیں، بلکہ اپنی سادہ لوحی سے دشمنِ دین و ملت عناصر کی تقویت کا باعث بن جائیں تو جو ہلکی سے ہلکی بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے

جب آگ اور خون کا طوفان آئے گا تو قدیم سندھی مسلمان اور اُن کے دیندار عناصر بھی نہیں بچ سکیں گے!! اور اگر خدانخواستہ پاکستان کو کچھ ہو گیا تو اُس کی ذمّہ داری مہاجرین کے بعد سب سے زیادہ قدیم سندھی مسلمانوں ہی پر عائد ہوگی!

اِس کے برعکس اگر ع "کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو!" کے مصداق مہاجرین بھی ہوش میں آ جائیں اور قدیم سندھی مسلمان بھی ۔۔۔ اور ع "اپنی خودی پہچان! او غافل افغان!" کے مطابق اُنہیں اپنے اصل مرتبہ و مقام کا شعور اور اپنی خصوصی و اضافی ذمّہ داری کا احساس ہو جائے اور ع "معمارِ حرم باز بر تعمیرِ جہاں خیز!" کے مطابق احیاءِ اسلام اور اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے کمر کس لیں تو جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ان شاءاللہ العزیز وہ "كَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا" کا مصداق بن سکتے ہیں! ۔۔۔ بہرحال راقم الحروف صرف اپنے امکانی حد تک حقِ نصح و اخلاص ہی ادا کر سکتا ہے، بلفوائے الفاظِ قرآنی: اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ" ۔۔۔ (سورہ ہود، آیت ۸۸، ترجمہ: "میں تو صرف اصلاح ہی کا طلبگار ہوں جس قدر بھی میرے امکان میں ہو اور مجھے توفیق تو اللہ کے سہارے ہی مل سکتی ہے!") ۔۔۔ رہا فیصلہ تو وہ تیرے اور پُرانے سندھیوں کے ہاتھ میں ہے۔ بقول اقبال ع "فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم!" ۔۔۔ البتہ راقم الحروف کے نزدیک ایک بات بالکل یقینی ہے کہ "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ" (سورۃ انبیاء، آیت ۱، ترجمہ: "لوگوں کے حساب کی گھڑی آن پہنچی ہے لیکن وہ غفلت ہی میں پڑے اعراض کر رہے ہیں") کے مصداق فیصلہ کن وقت آن پہنچا ہے اور مہلت بہت کم ہے

اِس کا یہ مطلب ہرگز نہ سمجھا جائے کہ راقم کے نزدیک پنجاب، سرحد اور بلوچستان کی نہ کوئی ذمہ داری اور مسئولیت ہے نہ کوئی قصور یا کوتاہی، اُن کے بارے میں گفتگو ان شاءاللہ پھر کبھی ہوگی اِس لیے کہ اِس وقت ایک تو اصلاً مسئلہ سندھ زیرِ بحث ہے۔ دوسرے یہ حقیقت واقعۃً ناقابلِ تردید ہے کہ پاکستان کے خیر یا شر کی ذمہ داری کا بوجھ

بقیہ تینوں صوبوں کے لوگوں کے مقابلے میں تھے اور پرانے سندھیوں پر کہیں زیادہ ہے ۔ — ورنہ جیسے خورشید درخشاں کے مقابلے میں "ذرۂ فانی" انتہائی حقیر اور ناچیز ہے۔ لیکن اپنی جگہ خود "ذرۂ فانی" اتنی عظمت کا حامل ہے کہ "لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں!" بالکل اسی طرح پاکستان کے بناؤ اور بگاڑ میں ایک جانب 'بڑے بھائی' کی حیثیت سے اور دوسری جانب اِس بنا پر کہ اس صدی کے عظیم ترین اسلامی مفکر آقائے ملّی کے سب سے بڑے حُدی خواں اور پاکستان کے مصوّر و مجوّز علامہ اقبال کا تعلق پنجاب سے تھا پنجاب کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے، اِسی طرح اِس اعتبار سے کہ صوبۂ سرحد تقریباً صد فی صد مسلمانوں ہی کی آبادی پر مشتمل ہے اور وہاں کے عوامی کلچر میں مذہب رچا بسا ہُوا ہے اور خاص طور پر اِس پہلو سے کہ اُس کے ذمے تحریکِ شہیدین رح کا قرض بھی واجب الادا ہے۔ سرحد کے مسلمانوں کے شانوں پر بھی عظیم ذمہ داری کا بوجھ ہے۔

مہاجر بھائیوں کو میں نے خود احتسابی کی جو ذرا سی دعوت دی تھی اُس پر میرے لئے غیظ و غضب کے اظہار کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ یہ شخص خود کیا ہے؟ مہاجر یا مقامی اور پنجابی یا ہندوستانی؟ اِس کے جواب میں اوّلاً تو پنجاب کے ایک درویش سائیں بلّھے شاہ کا یہ عارفانہ مصرعہ پیشِ خدمت ہے کہ:

ع "بُلّھیا! کی جاناں مَیں کون!"

یعنی "اے بُلّھے شاہ! مجھے کیا معلوم کہ مَیں (حقیقت میں) کون (یا کیا) ہوں!" اور پھر عرض ہے کہ راقم پنجابی بھی ہے اور ہندوستانی بھی، اِس لیے کہ اُس کی پیدائش بھی پنجاب کے ضلع حصار میں ہوئی تھی جو اَب بھارت کے ہریانہ سٹیٹ میں شامل ہے اور وہیں اُس کی زندگی کے ابتدائی پندرہ سال گزرے تھے اور اُس کے بعد کے چالیس سال کا اکثر و بیشتر حصّہ تو پنجاب کے دل اور شہرِ اقبال لاہور میں بسر ہوا ہے، لیکن اُس کا خاندان (ننھیال اور ددھیال دونوں) کا تعلق یوپی کے ضلع مظفر نگر سے ہے جہاں

سے راقم کے پڑدادا حافظ شیخ نور اللہ مرحوم و مغفور کو ۱۸۵۷ء میں زیرِ عتاب آنے کے باعث نقلِ مکانی کرنی پڑی تھی ـــــ رہا مقامی اور مہاجر کا معاملہ تو اوّلاً تو راقم اِس پوری دنیا میں کسی انسان کو مقامی سمجھتا ہی نہیں یہاں تو سب مہاجر ہیں۔ اِس لیے کہ ہمارا اصل گھر تو 'دارالخلد' ہے جہاں سے ہمارا جبری انخلاء ہُوا تھا ـــــ اور اب ہمارے "جہادِ زندگانی" کا اصل مقصد اپنے اصل 'مقام' کی بازیافت کے سوا کچھ نہیں! مزید برآں اگر اُس حدیثِ نبویؐ کو پیشِ نظر رکھا جائے جس کی رُو سے اِس سوال کے جواب میں کہ "اَیُّ الْهِجْرَةِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ" (یعنی "اے اللہ کے رسولؐ! سب سے افضل ہجرت کونسی ہے؟") نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ "اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ" (یعنی یہ کہ تم ہر اُس چیز کو ترک کر دو جو اللہ کو ناپسند ہے) تو کم از کم ہر صاحبِ ایمان تو ہر دم حالتِ ہجرت ہی میں ہوتا ہے ـــــ تاہم اگر مہاجر کے پاکستان میں مروّجہ مفہوم کو پیشِ نظر رکھا جائے تو بھی راقم لاکھوں ہی نہیں کروڑوں مہاجروں سے زیادہ 'مہاجر' ہے۔ اِس لیے کہ وہ ہندوستان سے پاکستان استعارے یا محاورے کے طور پر نہیں حقیقتاً اور واقعتہً آگ اور خون کے دریا عبور کر کے آیا تھا۔ اور اُس نے اپنے خاندان کے ساتھ حصار سے سلیمانکی ہیڈ ورکس تک ایک سو ستر میل کا فاصلہ ایک پیدل قافلے کے ساتھ بیس دنوں میں طے کیا تھا اور لگ بھگ ایک ماہ تک حصار میں محصوری اور پھر اُس پُرخطر اور جاں گسل سفر کے دوران جس میں ہر وقت موت زندگی سے قریب تر محسوس ہوتی تھی، ایسے ایسے مصائب جھیلے اور سختیاں برداشت کیں جن کا اُن لوگوں کو تصوّر تک نہیں ہو سکتا جو آج پاکستان میں 'مہاجر کاز' کے چیمپئن بن گئے ہیں!

اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی عرض کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہو گا کہ راقم کو لاہور اور پنجاب کی فضاؤں سے تو پیار ہے ہی اِس لیے کہ اُن میں اُس کی زندگی کے پورے چالیس سال گزرے ہیں، اور یہیں اُس کا گھر بار بھی ہے اور اُس کے تمام بہن بھائی بھی آباد ہیں۔ اور کُل کی کُل اولاد بھی ـــــ مزید برآں یہیں اُس کی بیس برس کی محنتِ شاقہ کا ایک محسوس

مشہور نتیجہ بھی قرآن اکیڈمی کی صورت میں موجود ہے ــــ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کراچی بھی اُسے اپنا گھر ہی معلوم ہوتا ہے، ــــ جہاں اُس کے بے شمار اعزہ و اقارب بھی آباد ہیں اور ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی موجود ہے جو اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے لیے ابتدائی سرمایہ (STARTING CAPITAL) کا کام دے سکیں ــــ پھر جب راقم کو سرحد کے اندرونی علاقوں میں جانے کا اتفاق ہوا تو اُسے پٹھانوں کی سادہ معاشرت میں بڑی کشش محسوس ہوئی اور اُن کی غیرت و حمیت پر رشک آیا۔ اور گذشتہ سال جب سندھ کے بعض اندرونی علاقوں میں جانے کا اتفاق ہوا تو واقعہ یہ ہے کہ اُس نے بالکل ایسے محسوس کیا کہ ؏ "آئی صدائے جبریل تیرا مقام ہے یہی!"

مزید برآں جب چند سال قبل اوّلاً دہلی اور علی گڑھ اور پھر دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ جشن کے موقع پر یوپی کے دوآبے (ضلع مظفر نگر اور سہارنپور) میں جانا ہوا تو وہاں کی فضا بھی بہت مانوس لگی تھی اور بالکل ایسے محسوس ہوا تھا کہ "جا ایں جاست!" اور دوبار حیدر آباد دکن جانا ہوا تو وہاں کے لوگوں کے خلوص و محبت اور دینی غیرت و حمیت کی بنا پر دل نے یہ محسوس کیا تھا کہ جیسے یہ ہی اصلی وطن ہے! ــــ اور یہ کہنے کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں ہے کہ جب حرمین شریفین کی جانب محوِ سفر ہوتا ہوں تو کیفیت بالکل وہی ہوتی ہے جو علامہ اقبال نے اپنے ان اشعار میں بیان فرمائی ہے کہ:

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم — نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام — کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ!

گویا راقم کی کیفیت اپنے فکری مرشد کے اِس شعر کے بالکل مطابق ہے کہ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا — مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!

علاوہ ازیں ریکارڈ کی تکمیل کے لیے یہ بھی عرض کر دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے کہ یوپی کے مذکورہ بالا دوآبے میں "شیوخ" کی ایک وسیع و عریض برادری رہائش پذیر تھی جس میں عرب سے آئے ہوئے قرشی النسل لوگ اور مقامی آبادی کے نومسلم باہمی رشتوں میں بندھے اور بندھے ہوئے تھے، قرشیوں میں غالباً صدیقی سب سے زیادہ تھے، پھر عثمانی ا

ردنی ۔۔۔ چنانچہ راقم الحروف کی والدہ صدیقی ہیں اور شیخ حیّان یمنی کی اولاد سے ہیں،
بلہ والد صاحب مرحوم و مغفور کے قول کے مطابق راقم کا ددھیال ہندی الاصل نومسلموں پر
شتمل ہے اور ہم نسلاً 'اگروال' ہیں جن کے بارے میں عام طور پر تو یہ مشہور رہے کہ یہ بنیوں
گوت ہے لیکن مولانا عبدالقدوس ہاشمی مدظلہٗ ایسے عالم محقق کی رائے ہے کہ یہ اصلاً برہمن
، لیکن انہیں کسی موقع پر کسی سبب سے برہمنوں نے "ذات باہر" کر دیا تھا۔ راقم الحروف کو بھی
رائے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ میرے ددھیالی خاندان میں کاروبار یا
نداری کا معاملہ دُور دُور تک نظر نہیں آتا اور ہمارے بزرگوں کا مشغلہ جہاں تک معلومات
م کرتی ہیں درس و تدریس و تعلیم اور تعلم ہی تھا! ۔۔۔ گویا اس اعتبار سے بھی راقم کو اُس
اعرِ ہندی" سے ایک گونہ نسبت حاصل ہے جس نے "ایک فلسفہ زدہ سیّد زادے" سے
اطب ہو کر کہا تھا:

یئں اصل کا خاص سومناتی آبا مرے لاتی و مناتی!
تُو سیّدِ ہاشمی کی اولاد میری کفِ خاک برہمن زاد

اور اگر یہ اطلاع نہ ملی ہوتی کہ جناب جی۔ ایم سیّد نے اپنی ایک حالیہ تصنیف میں اپنے
شمی ہونے سے انکار کیا ہے تو راقم اقبال کے مندرجہ بالا اشعار کو خود اُن کے مزید دو اشعار
ور خاقانی کے دو شعروں کے ساتھ اُن کی خدمت میں پیش کرتا ؎

تُو اپنی خودی اگر نہ کھوتا زنّاریٔ برگساں نہ ہوتا
شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز سُن لے مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز

"دل در سخن محمدی بند اے پورِ علیؓ ز بُوعلی چند
چوں دیدۂ راہ بیں نہ داری قائدِ قرشی بہ از بخاری!"

مُستقِل علاج اور فوری تدابیر

ہمارے قومی و ملّی عوارض کے اصل سبب کے مُعیّن ہو جانے کے بعد اس کے مستقل حل اور دائمی علاج کا تعیّن بھی خود بخود ہو جاتا ہے ـــــ یعنی بقول "علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!" کے مصداق ایک ایسا کامل، ہمہ گیر اور ہمہ جہتی اسلامی انقلاب جو ذہنیتوں اور نیتوں کی تصحیح اور انفرادی اخلاق و اعمال کی اصلاح کے علاوہ دینِ حق کے اُس کامل نظامِ عدل و قسط کو بالفعل قائم و نافذ کر دے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو نبی خاتم اور رسولِ کامل صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعے عطا فرمایا ہے۔

گویا "استحکامِ پاکستان" میں ہم مجموعی حیثیت سے قیامِ پاکستان کے تاریخی پس منظر اور اس کے محرّکات و عوامل کے تجزیئے اور اس کے بقاء و استحکام کے تقاضوں کے تفصیلی جائزے کے بعد جس نتیجے تک پہنچے تھے، صوبۂ سندھ کے مخصوص مسائل و معاملات پر تفصیلی بحث کا حاصل بھی وہی ہے۔ لہٰذا "استحکامِ پاکستان" کے آخر میں راقم نے "پاکستان کے بقاء و استحکام کے لوازم" کے عنوان سے جو کچھ عرض کیا تھا مناسب ہے کہ اُسے اُن ہی الفاظ میں دُہرا دیا جائے:

"اِس پس منظر میں ہر صاحبِ فہم و شعور انسان لامحالہ اسی نتیجے تک پہنچے گا کہ ملک و ملّت کے استحکام ہی نہیں بقا تک کے لئے حسبِ ذیل چیزیں ناگزیر اور لازمی ہیں:

(۱) ایک ایسا طاقتور انسانی جذبہ جو جُملہ حیوانی جبلتوں پر غالب آ جائے اور قوم کے افراد میں کسی مقصد کے لئے تَن مَن دَھن لگا دینے حتّٰی کہ جان تک قربان کر دینے کا مضبوط ارادہ اور قوی داعیہ پیدا کر دے۔

(۲) ایک ایسا ہمہ گیر نظریہ جو افرادِ قوم کو ایک ایسے مضبوط ذہنی و فکری رشتے میں منسلک کر کے بُنیانِ مرصوص بنا دے جو رنگ، نسل، زبان اور

زمین کے تمام رشتوں پر حاوی ہو جائے اور اِس طرح قومی یک جہتی اور ہم آہنگی کا ضامن بن جائے!

(۳) عام انسانی سطح پر اخلاق کی تعمیرِ نَو جو صداقت، امانت، دیانت اور ایفاءِ عہد کی اساسات کو اَز سرِ نَو مضبوط کر دے اور قومی و ملّی زندگی کو رشوت، خیانت، مِلاوٹ، جھوٹ، فریب، ناانصافی، جانبداری، ناجائز اقربا پروری) اور وعدہ خلافی ایسی تباہ کن بیماریوں سے پاک کر دے۔

(۴) ایک ایسا نظامِ عدلِ اجتماعی (SYSTEM OF SOCIAL JUSTICE) جو مرد اور عورت، فرد اور ریاست، اور سرمایہ اور محنت کے مابین عدل و اعتدال اور قسط و انصاف اور فی الجملہ حقوق و فرائض کا صحیح و حسین توازن پیدا کر دے!

تحریکِ پاکستان کے تاریخی اور واقعاتی پس منظر، اور پاکستان میں بسنے والوں کی عظیم اکثریت کی فکری و جذباتی ساخت، دونوں کے اعتبار سے یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اِس ملک میں یہ تمام تقاضے صرف اور صرف دین و مذہب کے ذریعے اور اسلام کے حوالے اور ناطے سے پورے کئے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ، جیسے کہ ہم ناقابلِ تردید دلائل اور شواہد سے ثابت کر چکے ہیں، علامہ اقبال مرحوم کے حسبِ ذیل اشعار خواہ اس وقت دنیا کی کسی دوسری مسلمان قوم پر پورے طور پر صادق نہ آتے ہوں، مِلّتِ اسلامیہ پاکستان کے ضمن میں صد فی صد درست اور کمالِ صداقت و حقّانیت کے مظہر ہیں کہ

اپنی مِلّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ؐ
اُن کی جمعیّت کا ہے مُلک و نسب پر انحصار — قوّتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیّت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیّت کہاں — اور جمعیّت ہوئی رُخصت تو مِلّت بھی گئی

لہٰذا ہم اُن تمام لوگوں کو جو پاکستان کی بقا اور سالمیت کے دل سے خواہشمند ہوں، دعوت دیتے ہیں کہ پوری دیانت داری کے ساتھ امکانی حد تک غور

کریں کہ آیا متذکرہ بالا پانچ اُمور پاکستان کی سالمیت اور استحکام کے لوازم ہیں یا نہیں ؟ اور آیا اُن میں سے کوئی ایک تقاضا بھی اسلام کے سوا کسی اور نظریے یا نظام کے حوالے سے پُورا ہونے کا کوئی امکان ہے !! "

چنانچہ ' استحکام پاکستان ' کا اختتام ان الفاظ پر ہوا تھا کہ :

" ہماری اب تک کی کُل گذارشات کا لُبِّ لباب اور حاصلِ کلام صرف یہ ایک جُملہ ہے کہ :

" پاکستان کے استحکام کا واحد ذریعہ اسلامی انقلاب ہے ! "

اور اسی پر ہم اس کتاب کو ختم کر رہے ہیں ۔

اس مرحلے پر ایک نہایت اہم اور بنیادی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ وہ اسلامی انقلاب کیسے آئے گا ؟ اُس کے اساسی لوازم کیا ہیں ؟ بنیادی طریق کار کیا ہے ؟ ابتدائی مراحل کیا ہیں ! اور تکمیلی اقدامات کیا ہوں گے ؟ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اُن اُمور کی بھی تفصیلی وضاحت کی ضرورت ہے کہ اسلامی انقلاب سے مراد کیا ہے ؟ اور اس کے نتیجے میں جو سماجی، معاشی اور سیاسی نظام وجود میں آئے گا اس کے اہم خدوخال کیا ہوں گے ؟

چنانچہ " پاکستان میں اسلامی انقلاب : کیا اور کیسے ؟ " کے موضوع پر راقم الحروف ان شاء اللہ جلد ہی اپنی دوسری تالیف کا آغاز کر دے گا ۔

وَمَا توفیقی اِلَّا بِاللّٰہِ العلی العظیم !! "

راقم کی یہ تحریر ۱۷ فروری ۸۶ء کی ہے اور ان سطور کی تحریر کے وقت اس پر پورے سوا دس ماہ گذر چکے ہیں ۔ اور اصل موضوع پر گفتگو کا تاحال آغاز بھی نہیں ہوا ۔ راقم اس تاخیر پر نادم بھی ہے اور معذرت خواہ بھی ، لیکن ع " ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا ! " کے مصداق یہ تاخیر دیسے بھی بلا سبب نہ تھی اور خاص طور پر اس کے دوران ' مسئلہ سندھ ' پر جو تفصیلی گفتگو ہو گئی وہ نہایت اہم بھی ہے اور ' استحکام پاکستان ' سے براہِ راست متعلق بھی ! تاہم ان شاء اللہ العزیز اب بلا تاخیر براہِ راست اصل

موضوع پر گفتگو کا آغاز ہو جائے گا۔ لیکن اس سے قبل، اس طویل ’جملہ معترضہ‘ کے آخری جزو کی حیثیت سے، آج کی صحبت میں پاکستان کے بقا کے بعض فوری اور لازمی تقاضوں کی جانب اشارہ مطلوب ہے!

اس سلسلے میں پہلے دو باتیں بطور تمہید ذہن نشین کرنی ضروری ہیں:

ایک یہ کہ جیسے افراد کے جسمانی امراض کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ اصل مرض اور اس کی ظاہری علامات بھی دو مختلف چیزیں ہیں، اور بنیادی بیماری اور ثانوی پیچیدگیوں کی بھی علیحدہ علیحدہ تشخیص و تعیین ضروری ہوتی ہے ـــــ اور بسا اوقات مرض کی بحرانی کیفیت یا مریض کی شدید تکلیف کے پیش نظر مرض کی تشخیص سے پہلے علامات و شکایات کے ازالے اور اصل مرض کے علاج سے قبل ثانوی پیچیدگیوں سے نبرد آزمائی ضروری ہو جاتی ہے ـــــ اسی طرح قوموں اور معاشروں کے اجتماعی عوارض کے ضمن میں بھی مستقل علاج کی فکر کے ساتھ ساتھ بحرانی کیفیات سے فوری طور پر نمٹنا ضروری ہوتا ہے اور ان سے کُلّی صرفِ نظر ”تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مُردہ شود“ کے مطابق نہایت خطرناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اگرچہ ؏ ”تصوّر ملکوتی وجذبہ ہائے بلند!“ کے مصداق ’تصوّر پسندی‘ (IDEALISM) مفید اور مطلوب شے ہے، لیکن ایسی نِری نظری تصوّریت جس کے ساتھ متناسب اور ہم وزن ’واقعیت پسندی‘ (REALISM) موجود نہ ہو نہایت مہلک نتائج پیدا کر سکتی ہے اور جہاں ؏ ”منزلِ ما کبریا ست!“ کے مصداق مطلوب و مقصود اعلیٰ سے اعلیٰ اور نصب العین بلند سے بلند تر معیّن کرنا ضروری ہے وہاں حقائق و واقعات کو بالکل نظر انداز کر دینا بھی سخت عاقبت نا اندیشی ہے۔ ـــــ چنانچہ ایسے لیڈر اور رہنما جو قوم کو ہواؤں ہی میں اڑائیں اور فضاؤں ہی کی سیر کرائیں لیکن نہ زمین پر قدم بقدم چلنا سکھائیں نہ ”طبقاً عن طبقٍ“ یعنی درجہ بدرجہ ترقی کے لئے محنت و مشقت کا عادی بنائیں وہ بالآخر قوم کو ایسے مقام پر پہنچا دیتے ہیں جہاں وہ لامحالہ ؏ ”جب آنکھ کھلی گُل کی تو موسم تھا خزاں کا!“ کی کیفیت سے

دوچار ہوکر رہتی ہے!

الحمد للہ کہ پاکستان کا ہر باشعور شہری اس حقیقت سے واقف ہے کہ راقم کے نزدیک پاکستان کے جملہ قومی و ملّی عوارض کا اصل علاج اور ہمارے تمام مسائل کا مستقل حل بھی ایک مکمل اسلامی انقلاب کے سوا اور کوئی نہیں ــــ اور وہی از روئے دین و ایمان اس دن میں ہماری جدّ وجہد کا آخری مطلوب اور ہمارے سفرِ حیات کی منزلِ مقصود بھی ہے ــ لیکن عم "یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات" کے مصداق جس بات کو عام لوگ ہی نہیں میرے بعض احباب اور بہی خواہ بھی سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ میرے نزدیک پاکستان کے موجودہ بحرانی حالات کے پیشِ نظر اس کی بقا کے لیے بعض فوری دستوری و سیاسی اقدامات بھی اتنے ہی اہم اور ناگزیر ہیں اور اگر ان سے اعراض کیا گیا یا ان کے ضمن میں مسلسل تاخیر و تعویق سے کام لیا جاتا رہا تو شدید اندیشہ ہے کہ مستقبل قریب میں پاکستان کے مزید حصّے بخرے ہونے (BALKANISATION) کے عمل کو روکنا ناممکن ہو جائے گا

اس سلسلے میں ایک مشورہ راقم نے صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی خدمت میں اپنے دسمبر ۸۲ء والے خط میں بھی پیش کیا تھا۔ جس کے ضمن میں تمہیداً عرض کیا تھا:

"مجھے یقین ہے کہ آپ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ میں معروف اور مروّجہ معنی میں ہرگز سیاسی آدمی نہیں اور میرے بیشتر اوقات اور تمام تر مساعی مستقبل کے اسلامی انقلاب کے لئے میدان ہموار کرنے کی غرض سے دعوتی و تبلیغی اور تعلیمی و تدریسی سرگرمیوں کے لئے وقف ہیں......... ساتھ ہی مجھے اس امر کا بھی یقین ہے کہ یہ حقیقت بھی آپ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتی کہ کوئی باشعور مسلمان خالص غیر سیاسی نہیں ہو سکتا۔ بایں معنی کہ وہ ملک و ملّت کے حالات سے قطعاً بے خبر یا لاتعلق رہے اور قوم و وطن کی صلاح و فلاح یا ان کو درپیش خطرات و خدشات کے بارے میں سوچ بچار اور غور و فکر سے بھی کام نہ لے"

چنانچہ میں بھی اس ضمن میں اپنی امکانی حد تک حالات کا مشاہدہ بھی کھلی آنکھوں سے کرتا ہوں اور دوسروں سے تبادلۂ خیال بھی کھلے قلب و ذہن کے ساتھ

کرتا ہوں (اور اس سلسلے میں مجھے اپنے اُن دَوروں اور سفروں سے بھی مدد ملتی ہے جو جب مجھے اپنی دعوتی و تبلیغی مساعی کے ضمن میں اندرونِ ملک یا بیرونِ وطن کرنے پڑتے ہیں) ـــــ اور پھر خود غور و فکر بھی کرتا ہوں اور اس کے نتیجے میں جو رائے بھی میری بنے، میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس کے مطابق مشورہ پورے نصح و خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ عوام کو بھی دوں اور ان کو بھی جن کے ہاتھوں میں ملک و قوم کی زمام کار ہے۔ از روئے فرمانِ نبویؐ : " اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ " یعنی - دین تو نام ہی نصح و اخلاص اور خیر خواہی اور وفاداری کا ہے "۔ اور جب پوچھا گیا : " لِمَنْ يَا رسول الله ؟ " یعنی " حضورؐ کس کے ساتھ ؟ " تو ارشاد ہوا : " لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ المسلمين وَعَامَّتِهِمْ " یعنی " اللہ اور اس کی کتاب اور اس کے رسولؐ کے ساتھ اخلاص و وفاداری اور مسلمانوں کے اولی الامر اور عوام دونوں کے ساتھ نصح و خیر خواہی۔ "

فوری تدابیر

ملک و ملت کے ساتھ اسی نصح و اخلاص اور وفاداری و خیر خواہی کے جذبے سے مجبور ہو کر، اُن حضرات سے معذرت کے ساتھ جو مجھے سیاسی و دستوری مسائل میں رائے دینے کا اہل یا حقدار ہی نہیں سمجھتے یا اسے میری دینی سرگرمیوں اور مذہبی مشاغل کے منافی گردانتے ہیں، آج پھر قوم کے عوام اور اس کے سربرآوردہ لوگوں کی خدمت میں چند گزارشات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

راقم کے نزدیک قوم اور ملک کی کشتی کو موجودہ خوفناک بھنور سے نکالنے کے لئے جو فوری اقدامات لازمی و لابدی ہیں اُن کا اصل الاصول تو یہ ہے کہ عوام کو اُن کے سیاسی حقوق فی الفور لوٹا دیئے جائیں اور اس سلسلے میں جو ظاہری خطرات و خدشات نظر آتے ہیں اُن سے بالکل خائف نہ ہوا جائے۔ اس لئے کہ بصورتِ دیگر جو اندیشے ملک و ملت کے مستقبل کو لاحق ہیں وہ اُن سے کئی گنا زیادہ خوفناک ہیں! ـــــ اور دوسرا رہنما

اصول یہ ہے کہ اس حقیقتِ واقعی کو تسلیم کرتے ہوئے کہ اِس وقت پاکستان میں مسلم قومیت کا جذبہ بہت کمزور پڑ چکا ہے اور اس کی جگہ نسلی، لسانی اور علاقائی عصبیتوں نے لے لی ہے، ملکی دستور میں علاقائی زبانوں اور ثقافتوں کے مناسب تحفظ کی ضمانت دی جائے۔

فوری اقدام ممکن ہے

اس سلسلے میں اوّلاً اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اگرچہ ہمارے ملک میں حق تلفی اور ناانصافی صرف سیاسی سطح پر ہی نہیں ہے بلکہ سماجی اور معاشی سطح پر بھی ظلم و استحصال کا دور دورہ ہے لیکن سماجی و معاشرتی اصلاح کے لئے بنیادی ذہنی و نفسیاتی تبدیلی لازمی ہوتی ہے اس لئے کہ معاشرتی اقدار کا گہرا تعلق فلسفۂ حیات سے ہوتا ہے اور جب تک اس میں بنیادی تبدیلی نہ آئے، ذات پات کی تفریق، اونچ نیچ کی تقسیم، اعلیٰ و ادنیٰ کے معیارات، سماجی رسومات اور بحیثیت مجموعی طرزِ معاشرت میں تبدیلی ممکن نہیں ہوتی ——— اسی طرح معاشی نظام کی تبدیلی بھی ایک کُلّی اور ہمہ گیر انقلاب کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے کہ استحصالی طبقات آسانی کے ساتھ اپنے ناجائز مفادات سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں کہ کوئی ایسی تبدیلی نہ آنے پائے جس سے ان کے مفادات پر آنچ آسکتی ہو ——— ان کے مقابلہ میں سیاسی عدل و مساوات کے قیام اور جمہوری حقوق کی بحالی کے لئے کوئی ذہنی و فکری 'انقلاب' بھی لازمی نہیں ہے، اس لئے کہ یہ عین اس 'رُوحِ عصر' (SIPIRIT OF THE AGE) کے مطابق ہے جو اس وقت پوری دنیا میں جاری و ساری ہے اور 'انقلابی تصادم' بھی ناگزیر نہیں ہے اس لئے کہ کم از کم نظری طور پر اس کے ضمن میں کوئی اختلاف موجود نہیں ہے لہٰذا اس میں کسی تاخیر کی ضرورت نہیں ہے۔ اور کم از کم بحالاتِ موجودہ اگر معدودے چند لوگوں کی نیت درست ہو جائے اور وہ اپنی ذاتی انا کے مقابلے میں ملت کی اجتماعی خودی اور ذاتی مفادات کے مقابلے میں ملک و قوم کی مصلحتوں کو ترجیح دینے پر آمادہ ہو جائیں تو یہ اقدام فی الفور ہو سکتا ہے!

جمہوری حقوق کی دو اہم مدّیں

ثانیاً یہ وضاحت بھی مفید ہے کہ کسی ملک کے باشندوں کے سیاسی وجمہوری حقوق کی دو مدّیں اہم اور بنیادی ہیں:

ایک یہ کہ ملک میں باہم مل جل کر رہنے کے اصول وضوابط، جن کے مجموعے کو اصطلاح میں 'ملکی دستور' سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان کی مرضی اور رائے سے طے ہوں اور اس میں کسی قسم کے جبر و اکراہ کو دخل نہ ہو ——— اور

دوسرے یہ کہ اس دستور کے مطابق حکومت کی تشکیل یا کسی ناپسندیدہ حکومت کی معزولی کا اختیار بالکلیہ ان کے ہاتھ میں ہو!

اور سب جانتے ہیں کہ ان دونوں ہی کے اعتبار سے پاکستان کے شہری گذشتہ چالیس سالوں کے دوران مسلسل محرومی اور حق تلفی کا شکار رہے ہیں۔ چنانچہ قیام پاکستان کے لگ بھگ دس برس کے بعد اور شدید محنت و کاوش سے اوائل ۵۶ء میں قوم کو ایک آئین کا تحفہ ملا، ہی تھا کہ ع "اثر نے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے!" کے مصداق ۵۸ء کے مارشل لاء نے اُسے منسوخ کر دیا اور فی الواقع اس غریب کو دن کی روشنی دیکھنی نصیب ہی نہیں ہوئی اس لئے کہ اگرچہ نظری طور پر اس کی تنفید ۲۳، مارچ ۵۶ء کو ہو گئی تھی لیکن اس کا بالفعل اجراء تو نئے انتخابات کے بعد ہی ہو سکتا تھا جن کی نوبت ہی نہیں آنے پائی! ——— اس کے بعد کہنے کو تو ۱۹۶۲ء میں بھی ایک آئین نافذ ہوا تھا لیکن اس کی تدوین میں عوام یا اُن کے نمائندوں کا جھوٹ موٹ کا بھی کوئی حصہ نہیں تھا اور وہ کھلے بندوں مارشل لاء ہی کے بطن سے برآمد ہوا تھا ——— بعد ازاں پھر ایک طویل توڑ پھوڑ اور اکھیڑ پچھاڑ، جس میں سقوطِ مشرقی پاکستان کا حادثۂ فاجعہ بھی شامل ہے، کے بعد مسٹر بھٹو نے واقعتہً ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا کہ ۱۹۷۳ء کے آئین پر 'بچے کھچے پاکستان' کے باشندوں کے جملہ نمائندوں کا اتفاقِ رائے حاصل کر لیا ——— لیکن افسوس کہ اوّلاً خود انہوں نے اس کی روح کو پامال کیا ——— اور پھر ۱۹۷۷ء سے شروع ہونے والے مارشل لاء نے

پہلے اُسے جزواً معطّل کیا اور پھر اپنے اختیارِ حاکمانہ سے اس میں من مانی ترمیمیں بھی کر دیں۔ چنانچہ ۱۹۸۵ء میں وہ اپنی قلبِ ماہیت کے ساتھ از سرِ نو مارشل لا ہی کی کوکھ سے برآمد ہوا۔ اور اگرچہ رسماً تو اُسے ۱۹۷۳ء کے ترمیم شدہ آئین ہی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن اکثر لوگ اُسے ۱۹۸۵ء کا آئین کہتے ہیں! اور اگرچہ اس کی توثیق ایک منتخب شدہ نیشنل اسمبلی کر چکی ہے لیکن چونکہ وہ اسمبلی خود اس ترمیم شدہ آئین ہی کے تحت وجود میں آئی اور اُس کے لئے جو انتخابات ہوئے ان سے سیاسی جماعتوں کے عمل دخل کو خارج رکھا گیا لہٰذا اُس کی نمائندہ حیثیت مسلّم نہیں ہے ــــــ الغرض اس وقت پاکستان پھر کسی ایسے آئین و دستور سے محروم ہے جو ملک کے باشندوں کی تائید یا قبولیت کا دعویٰ کر سکتا ہو۔

یہی معاملہ انتخابات کا رہا کہ اُن کی "روایت" اس ملک میں قائم ہی نہیں ہونے دی گئی کہ عوام میں سیاسی شعور پروان چڑھ سکتا اور حکومتوں کی تشکیل یا معزولی معروف جمہوری خطوط پر ممکن ہوتی۔ اس کے برعکس یہاں جس کے ہاتھ میں جائز یا ناجائز طور پر ایک بار اقتدار آ گیا اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ صحیح یا غلط جس طور سے بھی ممکن ہو اس پر قبضہ برقرار رکھے، نتیجتہً پاکستان کی تاریخ "دھماکوں" کی داستان بن گئی۔ اور ان تحریکوں سے قطع نظر جنہوں نے عوامی ایجی ٹیشن کے ذریعے "دھماکے" کیے یہاں اگر کبھی مجبوراً انتخاب کرانے پڑے تو اُن سے بھی منفی نتائج ہی برآمد ہوئے اور انہوں نے بھی "دھماکوں" ہی کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ پہلا دھماکہ "جگتو فرنٹ" نے ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان میں کیا ـــ اور دوسرا دھماکہ ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی نے کیا ــــــ اور چونکہ اس "دھماکے" کے نتیجے میں ملک بھی دولخت ہو گیا لہٰذا اب بعض عام اور سادہ لوح پاکستانی "سانپ کا ڈسا رسّی سے بھی ڈرتا ہے" کے مطابق عام انتخابات کے نام سے بھی گھبراتے ہیں۔ اور اسی بنا پر کچھ ہوشیار لوگوں کو موقع مل گیا کہ نوّے دن کے اندر اندر انتخابات منعقد کرانے کے وعدے کو آٹھ برس تک ٹالے رکھیں!

بہرحال اب پاکستان کے حالات جو صورت اختیار کر چکے ہیں اور ہم آخری تباہی کے جس گڑھے کے عین کنارے تک پہنچ گئے ہیں اُس کے پیشِ نظر لازم ہے کہ متذکرہ بالا

دونوں حقوق کو فی الفور اور بالکل غیر مشروط طور پر عوام کے حوالے کیا جائے ــــــــ اور ایک جانب ایسے عام انتخابات کا انعقاد جلد از جلد عمل میں لایا جائے جن میں حصہ لینے کے ضمن میں کسی پارٹی پر کوئی پابندی نہ ہو اور دوسری جانب ملکی دستور کے ضمن میں بھی اختلافات کے جس بکسے (PANDORAS BOX) کو خود جنرل محمد ضیاء الحق نے کھول دیا ہے اور جس کے بارے میں بعض انتہا پسند لوگوں نے بھی ایک متحدہ محاذ بنالیا ہے، کھلی بحث و تمحیص کی پوری اجازت دی جائے اور آزادانہ اظہار خیال اور باہمی گفت و شنید کے ساتھ ملکی و قومی سطح پر اتفاق رائے حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے ــــــــ اور ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کو یقین ہے کہ اگرچہ حالات بہت خراب ہو چکے ہیں تاہم ابھی وقت ہے کہ اگر فوری طور پر اس معاملے میں قوم کو فیصلے کی آزادی اور اختیار دے دیا جائے تو نتائج منفی نہیں مثبت ہی برآمد ہونگے۔ لیکن اگر اس کے ضمن میں حسب سابق تاخیر و تعویق کی روش جاری رکھی گئی تو شاید جلد ہی وہ وقت آجائے کہ جب یہ اقدام بھی ــــ "ہرچہ دانا کند کند ناداں ۔ لیک بعد از خرابیٔ بسیار!" کے مصداق بالکل بے نتیجہ اور غیر مؤثر ہو جائے گا ــــــــ معاذ اللہ!

لسانی قومیتوں کی مناسب حد تک پذیرائی

پاکستان میں بحالیٔ جمہوریت کے متذکرہ عمل ہی کے ایک جزو لاینفک کی حیثیت سے ملک و قوم کے حقیقی اور واقعی حالات کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ قوم کے بعض طبقات میں لسانی و ثقافتی عصبیتوں کے ضمن میں جو شدید حساسیت، (ALLERGY) پائی جاتی ہے وہ اس پر نظر ثانی کریں ــــ اور تصور پسندی کے بلند و بالا مقام سے ذرا نیچے اتر کر کسی قدر واقعیت پسندی کا ثبوت دیں ــــ اور لسانی اور ثقافتی اکائیوں کو حقیقت واقعی کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہوئے اُن کے لئے ملکی دستور میں مناسب تحفظات کے لئے خود کو ذہناً تیار کریں۔

اس سلسلے میں ایک نہایت عمدہ مثال علامہ اقبال مرحوم کی موجود ہے ــــــــ کون نہیں جانتا کہ اس صدی میں پورے عالم اسلام میں " وحدتِ ملی " کا اُن سے بڑا قائل و

داعی کوئی پیدا نہیں ہوا اور وہ آخر وقت تک اس اعلیٰ نصب العین کا پرچار کرتے رہے کہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر!

اور ؎ بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملّت میں گم ہو جا نہ ایرانی رہے باقی نہ افغانی نہ تورانی

لیکن یہی اقبالؔ جب اس آئیڈیل کے مقابلے میں دنیا میں موجود واقعی صورتِ حال پر نظر ڈالتا ہے تو اسے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں ہوتا کہ فی الوقت دنیا میں کوئی ایک امّتِ مسلمہ موجود نہیں ہے بلکہ عملاً بہت سی مسلمان قومیں پائی جاتی ہیں۔ اور سردست اگر عالمی سطح پر مسلمان اقوام کا کوئی 'کامن ویلتھ' (COMMON WEALTH) بھی قائم ہو جائے تو بہت بڑی کامیابی ہوگی ــــ (اور حقیقتِ واقعی اتنی تلخ ہے کہ علامہ اقبال مرحوم کے انتقال کو نصف صدی بیت چکی ہے اور تا حال ایسے کسی ادارے کے قیام کے بھی کوئی آثار دُور دُور تک نظر نہیں آتے) ــــ بالکل اسی طرح سردست ہم اگر پاکستان میں 'قومیتوں کے مجموعے' ہی کے لئے کوئی قابلِ قبول دستور اور لائحۂ عمل تیار کر سکیں اور پھر اپنے عمل سے باہمی اعتماد کی فضا کو پروان چڑھائیں اور وحدتِ ملّی کی جانب پیش قدمی کریں تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی ــــ اس کے برعکس اگر جذباتی انداز میں قومیتوں کی نفیِ مطلق ہی پر اصرار رہا تو باہمی بے اعتمادی اور تشتّت و انتشار ہی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

ساتھ ہی یہ بھی واضح رہنا چاہیئے کہ اسلام قبائلی یا علاقائی عصبیتوں کی کُلّی نفی نہیں کرتا بلکہ عصبیّتِ جاہلی کی نفی کرتا ہے یعنی جب یہ عصبیّتیں اللہ اور رسولؐ کے احکام سے بھی بالاتر ہو جائیں تب اُن کی حیثیت معبودانِ باطل کی بن جاتی ہے ــــ بالکل ایسے جیسے مال یا اولاد کی محبّت اصلاً غلط نہیں ہے لیکن اگر یہ محبّتیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبّت سے بھی بڑھ جائیں اور اُن کے احکام سے آزاد اور بالاتر ہو جائیں تو یہ بھی شرکِ عملی کے ذیل میں آجاتی ہیں ــــ (چنانچہ اسی اصول پر قیاس کرتے ہوئے علامہ اقبالؔ نے اس دَور کے مروّج و مقبول نظریۂ وطنیت کو شرک سے تعبیر کیا تھا! اگرچہ حبّ الوطنی ہرگز غلط نہیں بلکہ مطلوب اور پسندیدہ شے ہے!)

ایک ظاہری تضاد اور اُس کا ازالہ

اس سلسلے میں راقم اس ظاہری تضاد کو بھی رفع کرنا چاہتا ہے جو بہت سے لوگوں کو
ں کی بعض آراء کے مابین نظر آتا ہے۔ یعنی یہ کہ ایک جانب راقم کا پختہ اور طے شدہ موقف
ہے کہ پاکستان میں اسلام انتخابات کے ذریعے نہیں آسکتا بلکہ اس کے لیئے ایک انقلاب
زی ہے ـــــ یہی وجہ ہے کہ راقم نے خود اپنی ذات اور اپنی جماعت یعنی تنظیم اسلامی
دنوں کے بارے میں یہ قطعی اور حتمی فیصلہ کیا ہوا ہے کہ ہم انتخابات میں کبھی حصہ نہیں لیں گے
لہ اپنے تمام اوقات اور اپنی کل مساعی کو ایک ہمہ گیر اسلامی انقلاب کی تیاری کے لئے وقف
میں گے ـــــ لیکن دوسری جانب راقم اس قدر شدّ ومدّ اور یقین و اذعان کے ساتھ
ں رائے کا حامل بھی ہے کہ ملک میں سیاسی عمل بہرصورت جاری رہنا چاہیئے اور جدید
نیا کی مسلّم روایات کے مطابق آزادانہ انتخابات کا سلسلہ کسی صورت میں بھی نہیں
رکنا چاہیئے۔

یہ ظاہری تضاد ایک سادہ سی مثال سے بآسانی رفع ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جیسے ایک انسان
کے مسلمان بننے کے تقاضے کچھ اور ہیں اور زندہ رہنے کے لوازم کچھ اور' ـــــ اسی طرح کسی ملک
کے بالفعل مسلمان بننے یعنی اس میں عملاً اسلام کے نظام معاشرت و سیاست و معیشت کے قیام کے
وازم کچھ اور ہیں اور مجرّد زندہ رہنے یا قائم و برقرار رہنے کی شرائط کچھ اور ہیں۔ چنانچہ جیسے ایک انسان
کو مسلمان بننے کے لئے کسی نہ کسی مقدار میں ایمان کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے کہ اگر ایمان کی
کوئی رمق بھی اس کے دل میں نہیں ہوگی تو وہ خواہ زبان سے اپنے اسلام کا کتنا ہی دعویٰ کرے
اسلام پر بالفعل عمل پیرا نہیں ہو سکتا، جبکہ کسی بھی انسان کو خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم زندہ رہنے
کے لیئے غذا، پانی اور ہوا کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر ان میں سے کسی ایک کا سلسلہ بھی منقطع
ہو جائے تو اس کی موت واقع ہو جانا لازمی ہے۔ چنانچہ ہوا کی بندش سے تو موت چند منٹوں
ہی میں آجائے گی، پانی اور خوراک کے انقطاع سے بھی موت یقینی ہے اگرچہ فوری نہیں! ـــــ
ـــــ بالکل اسی طرح کسی ملک یا معاشرے کے عملاً "مسلمان" بننے کے لئے تو ضروری ہے

کہ اس میں مجموعی طور پر اسلام پر فی الجملہ اعتماد اور اسلام پر عمل پیرا ہونے کا ایک ایسا قوی جذبہ اور زوردار داعیہ پیدا ہو جائے جو پوری قوت و شدت کے ساتھ بروئے کار آئے ـــــ لیکن اُس کے آزادانہ اور باوقار بقا کے لئے لازم ہے کہ اس میں ایک جانب ایک مؤثر "عصبیت"، موجود ہو جو نہ صرف افراد بلکہ مختلف گروہوں اور طبقوں کو باہم متحد و مربوط رکھ سکے اور دوسری جانب تمدنی ارتقا کی جس سطح تک وہ معاشرہ بالفعل پہنچ چکا ہو اس کے معیارات کے مطابق اطمینان بخش حد تک سماجی عدل و انصاف قائم ہو اور لوگوں میں شمولیت کا احساس (SENSE OF PARTICIPATION) برقرار رہے۔

چنانچہ ان معاشروں اور ملکوں سے قطع نظر جو تا حال ازمنۂ قدیم کے قبائلی نظام یا ازمنۂ وسطیٰ کے جاگیردارانہ نظام ہی کے ذہنی و فکری اور جذباتی و نفسیاتی ماحول میں جی رہے ہوں، عہدِ جدید کے کسی ملک اور معاشرے میں سیاسی اور جمہوری عمل کو مصنوعی طور پر روکے رکھنا اجتماعی خودکشی کے مترادف ہے! بالخصوص ایسے ممالک یا معاشرے جو مختلف لسانی و ثقافتی اکائیوں پر مشتمل ہوں، اُن کے لئے تو انتخابی و سیاسی عمل کا جاری رہنا بالکل تنفس کے جاری رہنے کے مشابہ ہے اور اس کا تعطل خوفناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

لیکن دوسری جانب اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہ راقم اس حقیقت سے بھی پوری طرح باخبر ہے کہ انتخابی یا سیاسی عمل کے ذریعے کسی ملک یا معاشرے میں قائم سماجی و معاشرتی اور سیاسی و معاشی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ پہلے سے قائم نظام کو بہتر انداز اور زیادہ خوش اسلوبی سے چلایا جا سکے۔ اس لئے کہ انتخابی عمل کے ذریعے اکثر و بیشتر صرف وہی لوگ آگے آ سکتے ہیں جو اس ملک میں قائم معاشرتی اور معاشی ڈھانچے میں قوت و طاقت کے مراکز (CENTRES OF POWER) پر قابض ہوں اور اُن سے یہ توقع کرنا عبث بلکہ حماقت ہے کہ وہ اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماریں گے اور اُن مراکزِ قوت ہی میں کوئی بنیادی تبدیلی گوارا کریں گے جن کی اساس پر وہ خود برسرِ اقتدار آئے ہوں۔

لہٰذا راقم پوری شدت کے ساتھ یہ رائے رکھتا ہے کہ پاکستان میں اسلام تو انقلاب ہی کے ذریعے آ سکتا ہے، انتخابات کے ذریعے نہیں ـــــ البتہ اگر انتخابات کے سلسلے

ر د کے رکھا گیا' یا اس میں غیر فطری قدغنیں عائد کی گئیں تو اس کا شدید اندیشہ ہے کہ وہ ملک باقی نہ رہے جس میں اسلامی انقلاب لایا جا سکے ــــــ اور بات وہ ہو جائے جو مرزا محمد منوّر صاحب کے اس شعر میں بیان ہوئی ہے کہ ؎

چہ دارد سعیٔ ما سودے نمی یابیم مقصودے — کہ برگ و خس بیاوردیم و شاخِ آشیاں گم شد!

یہ دوسری بات کہ بقول "خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ" کے مصداق پاکستان کے مخصوص تاریخی پس منظر کے پیشِ نظر اور خاص طور پر اس وجہ سے کہ یہاں سوائے اسلامی عصبیت کے اور کوئی عصبیت ایسی موجود نہیں ہے جو کل پاکستان سطح پر بروئے کار آسکے۔ راقم کی سوچی سمجھی رائے یہ بھی ہے کہ محض جمہوریت بھی اس ملک کے بقاء و استحکام کی دیرپا اساس نہیں بن سکتی اور بحالیٔ جمہوریت سے بلاشبہ فوری بحران تو ختم ہو جائے گا لیکن پاکستان کے دوام و استحکام کی مستقل بنیاد صرف ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہتی اسلامی انقلاب ہی بن سکتا ہے! یہی وجہ ہے کہ راقم نے گذشتہ کم از کم بیس برس سے اپنے اکثر و بیشتر اوقات اور بہتر و بیشتر مساعی کو تو مستقبل کے "اسلامی انقلاب" کے لئے "برگ و خس" کی فراہمی کے لئے وقف کر رکھا ہے ــــــ البتہ ہمیشہ سیاسی و جمہوری عمل کے جاری رہنے کی وکالت کی ہے!

چنانچہ جنرل ضیاءُ الحق صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کے موقع پر جو ۱۸ راگست ۱۹۸۰ء کو پہلے علماء کنونشن سے متصلاً قبل ایک مختصر مشاورت پر ہوئی تھی راقم نے اپنے اس نقطۂ نظر کو پیش کر دیا تھا کہ مارشل لاء کا تسلسل ملک و ملت کے لئے خودکشی کے مترادف ہے۔ چنانچہ ۲۰ر دسمبر ۸۲ء کو جو خط راقم نے جنرل صاحب کو ارسال کیا تھا اس میں بھی اس گفتگو کا حوالہ موجود ہے:

"آپ کو یاد ہو گا کہ ۱۸ر اگست ۸۰ء کو بالکل علیحدگی میں گفتگو کے دوران میں نے آپ سے سوال کیا تھا کہ "ملک میں جو سیاسی خلاء مارشل لاء کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے' اس کو دور کرنے کے لئے آپ کے ذہن میں کیا نقشہ ہے! میری رائے میں تو یہ سیاسی خلاء (POLITICAL VACUUM) خودکشی کے مترادف ہے!!"......... سقوطِ

مشرقی پاکستان کے بعد ہمارے سیاسی مبصروں اور تجزیہ نگاروں نے مشرقی پاکستان کی
علیحدگی کے اسباب میں سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ اس سبب کو بیان کیا
تھا کہ پاکستان میں (ایوب خاں مرحوم کے) مارشل لاء کے نفاذ نے وہاں کے لوگوں
میں سیاسی محرومی کا احساس پیدا کر دیا تھا اور علیحدگی پسندوں کے ہاتھ میں سب سے
بڑی دلیل یہ آگئی تھی کہ فوج چونکہ ساری مغربی پاکستان کی ہے لہٰذا فوج کی حکومت
کے معنی یہ ہیں کہ مغربی پاکستان مشرقی پاکستان پر حکومت کر رہا ہے۔ آج بعینہٖ یہی
دلیل سندھ کے علیحدگی پسندوں کے ہاتھوں میں ہے کہ فوج کا اکثر و بیشتر حصّہ پنجاب
سے ہے اور کچھ تھوڑا سا سرحد سے ۔ لہٰذا مارشل لاء کے پردے میں اصلاً 'پنجاب'
ہم پر حکومت کر رہا ہے ـــــ اور ہر گزرنے والا دن اس دلیل کو قوی سے قوی تر
کر رہا ہے! ـــــ بنا بریں میں عرض کرتا ہوں کہ خدارا اس تعطّل کو جلد از جلد
رفع کرنے کی جانب واضح پیش قدمی فرمائیے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ آتش فشاں پھٹ پڑے
اور پھر ملک و ملّت کے کسی بھی بہی خواہ کے کئے کچھ نہ ہو سکے۔!!"

دو ممکنہ عملی صورتیں

پاکستان میں بحالیٔ جمہوریت کا عمل چونکہ دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ یعنی ایک یہ کہ تشکیلِ
حکومت بالکلیہ عوام کے آزادانہ ووٹ کی بنیاد پر ہو اور دوسرے ملکی دستور بھی بالکلیہ عوام کی
اکثریت کی رضا اور پسند کے مطابق ہو ـــــ لہٰذا اس کے ضمن میں عملی راہیں بھی دو ممکن
ہیں: یعنی ایک یہ کہ پہلے ۱۹۷۳ء کے اصل دستور کے مطابق ملک میں انتخابات ہوں اور پھر جو اسمبلی
اس طرح وجود میں آئے وہ اسی دستوری طریق کار کے مطابق دستور میں ترمیم کرے جو خود آ
دستور میں طے شدہ ہے ـــــ اور دوسرے یہ کہ پہلے ایک دستور ساز اسمبلی کا انتخ
عمل میں لے آیا جائے اور وہ ایک قابل قبول دستور تیار کرے جس کے مطابق انتقالِ
اقتدار کے لئے دوبارہ انتخاب ہو! اور اس وقت تک جو بھی انتظامی ڈھانچہ فی الوقت م
ہے وہ ایک عارضی نگران (CARE TAKER) ادارے کی حیثیت سے برقرار رہے

اس وقت ملک و ملت جس صورت حال سے دوچار ہیں اُن کے پیشِ نظر تو راقم کی رائے پہلے طریقے ہی کے حق میں ہے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہ ملک میں اس کے لئے تدریجاً ایک اتفاقِ رائے وجود میں آتا نظر آ رہا ہے ـــــ لیکن آج سے چار سال قبل کے حالات میں جبکہ جنرل محمد ضیاء الحق ایک غیر جماعتی انتخاب ہی پر تلے ہوئے تھے، راقم نے جو تجویز جنرل صاحب کے نام خط میں پیش کی تھی اسے بھی دوبارہ ریکارڈ پر لے آنا مناسب ہے تاکہ اُس کا ذہن بلاکم و کاست قوم کے سامنے آجائے! چنانچہ وہ لفظ بلفظ درج ذیل ہے:

" مجھے خوب اندازہ ہے کہ ایک جانب ہم اس وقت جس صورت حال سے دوچار ہیں، اس میں اکثر سیاسی جماعتوں کے 'مبیّنہ' موقف کے مطابق ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت انتقالِ اقتدار کیلئے فوری انتخاب میں بہت سی پیچیدگیاں مضمر ہیں۔ دوسری جانب ملک کے آئندہ نظام کے بارے میں آپ کے ذہن میں جو مختلف تجویزیں ہیں، وہ بھی ملک و ملت کی خیر خواہی کے جذبے پر مبنی ہیں ـــــ اور تیسری جانب مختلف سیاسی حلقوں کی طرف سے بھی جو اختلاف رائے ان موضوعات پر سامنے آ رہا ہے کہ انتخابات جداگانہ ہوں یا مخلوط! اور حسبِ سابق ہوں یا متناسب نمائندگی کے اصول پر! وغیرہ وغیرہ ـــ وہ بھی یقیناً خلوص و اخلاص ہی پر مبنی ہیں ـــــ لیکن میرے نزدیک اصل سوال یہ ہے کہ ان معاملات میں آخری فیصلہ کرنے کا مجاز کون ہے؟ کیا صرف آپ اور آپ کے رُفقاءِ کار، یعنی مارشل لاء انتظامیہ! یا زیادہ سے زیادہ وہ سیاسی جماعتیں جو کسی درجے میں آپ کی منظورِ نظر ہیں یا کم از کم آپ کے لئے قابلِ قبول ہیں ـــ؟؟ یا کوئی اور ـــ؟؟؟

میں اس مسئلے پر کم از کم چھ ماہ سے مسلسل غور کرتا آ رہا ہوں ـــ اور ایک رائے جس پر میرا دل ٹھک گیا ہے، تجویز کی صورت میں خالصتہً ملک و ملت اور خود آپ کی خیر خواہی کے جذبے کے تحت آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں ۔ وہ تجویز یہ ہے کہ:

(۱) ملک میں ایک انتخاب فوراً ہو ۔یعنی فروری یا مارچ ۸۲ء ۔لیکن یہ انتخاب

انتقالِ اقتدار یا تشکیلِ حکومت کے لئے نہ ہو بلکہ ایک ' منتخب مجلسِ شوریٰ ' یا ' مجلسِ ملّی ' کے لئے ہو ـــــ اس میں حق رائے دہی کی اساس اور حلقہ جات کی تشکیل تو بالکل وہی ہو جس پر فروری ۷۷ء میں انتخابات ہوئے تھے۔ لیکن ہو یہ خالص غیر جماعتی بنیاد پر!

(۲) اس طرح جو مجلسِ شوریٰ یا مجلسِ ملّی وجود میں آئے اس کے سامنے ملک کے آئندہ نظام کے بارے میں جو تجاویز آپ کے سامنے ہیں، وہ آپ رکھیں اور طرزِ انتخاب وغیرہ کے ضمن میں جو باتیں دوسرے لوگوں کے سامنے ہیں، انہیں وہ رکھیں اور ان تمام پر یہ مجلس ایک سال کے عرصے کے اندر اندر فیصلہ دے، جو نہ صرف یہ کہ دو تہائی اکثریت پر مبنی ہو بلکہ ہر صوبے سے منتخب شدہ لوگوں کی بھی کم از کم نصف تعداد لازماً اس میں شامل ہو ـــــ!

(۳) اگر یہ مجلس اس مشکل مرحلے کو کامیابی سے سر کرلے اور مطلوبہ اکثریت کے ساتھ نظام تجویز کر دے تو مارشل لا ر انتظامیہ تین سے چھ ماہ کے اندر اندر اس کے مطابق انتقالِ اقتدار اور تشکیلِ حکومت کے لئے الیکشن کرا دینے کی پابند ہو ـــــ اور اگر وہ مجلس ایک سال کے اندر اندر تفویض کردہ ذمّہ داری سے عہدہ برآنہ ہو سکے تو وہ از خود تحلیل (DISSOLVE) ہو جائے اور پھر تین سے چھ ماہ کے عرصے میں اسی ' مجلسِ شوریٰ ' یا ' مجلسِ ملّی ' کا انتخاب دوبارہ ہو اور جب تک مطلوبہ اتفاقِ رائے (CONCENSUS) حاصل نہ ہو یہ سلسلہ جاری رہے ـــــ اور اس دوران میں فوج کے لئے نہ صرف اخلاقاً جائز بلکہ ملک و قوم کی حفاظت و سالمیت کے اعتبار سے لازم سمجھا جائے کہ وہ 'CARE TAKER' کی حیثیت سے کاروبارِ حکومت چلاتی رہے ـــــ!

اس تجویز کے محاسن یا روشن پہلوؤں پر گفتگو کو میں اس لئے تحصیل حاصل سمجھتا ہوں کہ وہ اظہر من الشمس ہیں ـــــ البتہ اس کے خلاف اس واحد دلیل کا جائزہ لینا لازمی ہے جو بادی النظر میں بہت قوی معلوم ہوتی ہے یعنی یہ کہ کہیں مجوّزہ

مجلسِ شوریٰ یا مجلسِ ملّی ایک بھرپور دستوریہ (FULL FLEDGED CONSTITUENT ASSEMBLY) کا کردار اختیار نہ کرلے اور دستورِ ملکی کے خطرناک صندوقچے (PANDORAS BOX) کو کھول کر اُن نازک اور پیچیدہ مسائل کو از سرِ نو نزاعی نہ بنادے جو ۱۹۷۳ء کے دستور میں طے شدہ ہیں۔

میرے نزدیک یہ دلیل بہت کمزور اور بودی ہے، اس لئے کہ مسائل کا حل اِن سے اعراض اور صرفِ نظر سے نہیں بلکہ مقابلے اور مواجہے (یعنی 'FACE' کرنے) ہی سے ممکن ہوتا ہے۔ پاکستان کا قیام محض ایک وقتی حادثہ نہ تھا بلکہ۔ ہندو جیسی منظم اور بیدار قوم اور وقت کی حکمران طاقت (لیبر گورنمنٹ) کی متفقہ خواہشات کے علی الرغم پاکستان صرف اس لئے قائم ہوا کہ ایک طرف مسلمانانِ ہند کے لئے ہندوؤں کے انتقامی طرزِ عمل کے اندیشے کا منفی محرک موجود تھا تو دوسری طرف احیاءِ اسلام کا مثبت جذبہ بھی موجود تھا جسے قائدِ اعظم مرحوم کے مسلسل اعلانات نے ایک نہایت قوی اُمید کی صورت دے دی تھی — اور تیسری طرف ارادۂ الٰہی اور مشیّتِ ایزدی بھی شامل تھی جو اصل فیصلہ کن عامل (FACTOR) ہے۔ اور یہ تینوں عوامل اب بھی پوری قوت و شدّت کے ساتھ موجود ہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ان کو بروئے کار لانے کی کوشش کی جائے (یعنی انہیں 'MOBILISE' کیا جائے) اور یہ کام ان شاء اللہ اس مجوزہ مجلسِ شوریٰ یا مجلسِ ملّی اور اس کے لئے منعقد ہونے والے انتخابات کے ذریعے ہو جائے گا۔ اس لئے کہ چونکہ یہ انتخابات نہ تشکیلِ حکومت کے لئے ہوں گے اور نہ ہی جماعتی بنیادوں پر ہوں گے۔ لہٰذا اس میں سیاسی حلقوں اور جماعتوں کی صف بندی (POLARISATION) خالصتہً اس اساس پر ہو گی کہ کون محبِّ دین اور محبِّ وطن ہے! اور کون لادینیت، الحاد، مادہ پرستی، اباحیت اور علاقائی و لسانی قومیتوں کا عاشق اور پرستار —!! اور مجھے یقین ہے کہ اگر تقسیم اس واضح اساس پر ہو تو ان شاء اللہ فیصلہ کن فتح محبِّ اسلام اور محبِّ پاکستان قوتوں

کو حاصل ہوگی ۔ جیسے کہ اکثر مبصرین اور تجزیہ نگار حضرات نے سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد کہا تھا کہ وہاں اگر لوگوں کے سامنے اصل مسئلہ یہ رکھا جاتا کہ ' پاکستان ' کے ساتھ رہنا چاہتے ہو یا اس سے علیحدہ ہونا ؟ تو وہاں کے عوام کی غالب اکثریت لامحالہ ' متحدہ پاکستان ' کے حق میں رائے دیتی ! مجھے اس تجزیئے سے کامل اتفاق ہے ــــ اور مجھے یقینِ واثق ہے کہ میری تجویز پر عمل درآمد کے نتیجہ میں ان شاء اللہ العزیز ' تحریکِ پاکستان ' کے از سرِ نو احیاء کا وہ مقصد بااحسن بوجوہ حاصل ہو جائے گا جس کے لئے آپ ہر سال ' یوم پاکستان ' ــــ ' یوم اقبال ' ــــ اور ' عید میلاد النبیؐ ' منانے کے ضمن میں کروڑوں روپے صرف کر رہے ہیں ۔ (جو معاف فرمائیے اکثر و بیشتر ضیاعِ محض ہے "۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہ ان سطور پر وہ تحریر ختم ہوتی ہے جو ' استحکام پاکستان ' کے بعد اور " پاکستان میں اسلامی انقلاب : کیا ؟ کیوں ؟ اور کیسے ؟ " سے پہلے صوبۂ سندھ اور خاص طور پر کراچی کے حالات واقعات سے شدید تاثر کی بنا پر ایک طویل جملۂ معترضہ کے طور پر سپردِ قلم ہوگئی ــــ

اب انشاء اللہ جلد ہی اسلامی انقلاب کے موضوع پر اصل کتاب کی تسوید شروع ہو جائے گی جس کا مکمل مواد بحمد اللہ ذہن میں موجود ہے ــــ اور جس پر راقم نے پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں تو مفصّل تقریریں کی ہی ہیں، اس سال ماہ اگست کے اوائل میں امریکہ میں اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ I.S.N.A کے مرکز واقع پلین فیلڈ میں منعقدہ ایک چھ روزہ کیمپ میں بھی مفصّل تقریریں ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کیں جن کے دو دو گھنٹوں کے چھ وڈیو کیسٹ تیار ہوئے ، اور اس طرح گویا زبان و بیان کی حد تک یہ بات پورے شرح و بسط کے ساتھ بیرونِ پاکستان بھی پہنچ چکی ہے ۔

ضمیمہ

دستور سازی کا مسئلہ پاکستان میں اوّل روز سے مشکلات اور پیچیدگیوں کا حامل رہا ہے اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں بھی اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ برادرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا ذہن اِس سلسلے میں ابتدا ہی سے واضح اور صاف رہا ہے مشرقی پاکستان کے مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے موصوف نے جولائی ۶۹ء کے 'میثاق' میں 'تذکرہ و تبصرہ' کے عنوان سے جو فکر پیش کی تھی اُسی انداز کی سوچ ۸۲ء میں باقی ماندہ پاکستان کے دستوری مسئلے کے حل کے لیے صدر ضیاء الحق کے نام خط میں سامنے آئی۔ مسئلہ سندھ کے حوالے سے یہ کتاب بھی اُن کے اُسی اندازِ فکر کی آئینہ دار ہے۔ اِس سلسلے میں انہوں نے کراچی کے حالیہ ہنگاموں کے فوراً بعد ۱۷ دسمبر ۸۶ء کو ایک پریس کانفرنس سے بھی خطاب کیا تھا۔ اسی مناسبت سے پریس کانفرنس میں پڑھے گئے بیان کا مکمل متن جواب تک اپنی مکمل شکل میں کہیں شائع نہیں ہوا اور جولائی ۶۹ء کے تذکرہ و تبصرہ کے اقتباس کی نقل اِس ضمیمے میں شامل کیا جا رہا ہے۔ اِس کے علاوہ سندھ کی زمینوں کے مسئلے سے متعلق ایک سندھی بزرگ ماسٹر اللہ رکھا صاحب کی تاریخی روایت پر مبنی رفیقِ محترم نجیب صدیقی صاحب کے خط کے مشمولات جو جنوری ۸۷ء کے 'میثاق' میں شائع ہو چکے ہیں 'قندِ مکرر' کے طور پر پیشِ خدمت ہیں۔ (ناشر)

دستور سازی کا مسئلہ اور مشرقی پاکستان

(اقتباس از میثاق بابت جولائی ۱۹۶۹ء)

اور یہ اسی پیچیدگی اور اشکال کا نتیجہ ہے کہ بائیس سال کی طویل مدت میں بھی پاکستان کا کوئی دستور نہیں بن سکا اور دستور سازی کے میدان میں نہ صرف یہ کہ ہنوز روزِ اوّل کا معاملہ ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دور دور تک امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی اور الجھاؤ

روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے !!!

اس اشکال اور الجھاؤ کا مستقل حل تو ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ دینی جذبات اور ملّی احساسات کو مسلسل اُجاگر کیا جاتا رہے اور اس جذبہ کے دوام اور تسلسل کا مستقل اور پائدار بندوبست کیا جائے جو ایک دوسرے سے اتنے بعید اور باہم اس قدر مختلف خطّوں کے ایک مملکت میں شامل ہونے کا سبب بنا تھا۔ تاہم فوری طور پر بعض دوسری چیزیں بھی پیشِ نظر رہنی ضروری ہیں:

ایک یہ کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے اس سنجوگ کا برقرار رہنا مشرقی پاکستان کے عوام کی آزاد مرضی ہی پر منحصر ہے اور اسے کسی طرح بھی ان پر ٹھونسا نہیں جا سکتا۔ بلکہ اس معاملے میں جبر و تشدد کا ردِّ عمل نہایت خوفناک ہو سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس "آزاد مرضی" کا انحصار بھی جتنا کچھ دینی جذبات اور ملّی احساسات پر ہے اتنا ہی اس امر پر بھی ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ یہ محسوس کریں کہ ہمارے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہو رہی بلکہ مثبت طور پر انہیں یہ احساس بھی ہو کہ خود ان کا مفاد مغربی پاکستان کے ساتھ رہنے ہی سے وابستہ ہے اور مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں ایک دوسرے سے پیوستہ رہ کر ہی دنیا میں ایک باعزّت اور باوقار آزاد مملکت کی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں۔

مزید برآں یہ کہ اگر خدانخواستہ کبھی "علیحدگی" کی صورت پیدا ہوئی تو مغربی پاکستان کے لئے تو پھر بھی امکان غالب موجود ہے کہ وہ اپنی آزاد اور باوقار حیثیت کو برقرار رکھ سکے گا، لیکن مشرقی پاکستان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوگا کہ کسی دوسری وسیع تر قومیت میں ضم اور کسی دوسری بڑی مملکت میں جذب ہو کر رہ جائے۔

ان دو امور کی روشنی میں جائزہ لیا جانا چاہیئے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی مرضی دراصل ہے کیا؟ ـــــ اگر وہ واقعۃً مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو کر ایک آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے کے خواہش مند ہیں تو ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کی اس خواہش کے آڑے نہیں آسکتی۔ بین الانسانی علائق میں سب سے زیادہ مقدس رشتہ میاں اور بیوی کا ہوتا ہے لیکن اس میں بھی دینِ فطرت نے علیحدگی کی ایک سبیل رکھ دی ہے اور صاف ہدایت کی ہے کہ اگرچہ طلاق "حلال چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے تاہم "معلق" رکھنے سے بہتر یہی ہے کہ علیحدگی اختیار کر لی جائے ـــــ بالکل اسی طرح اگر ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی واقعۃً یہ محسوس کرتے ہوں کہ مغربی پاکستان کے ساتھ

رہنے میں انہیں کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے تو اُن کی بے اطمینانی کے سبب سے پورے ملک کی سیاسی و دستوری زندگی کو مسلسل ''معطّل'' رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ اُن کی مرضی کو بروئے کار آنے کا موقع دے دیا جائے۔

ہم نے اوپر بھی عرض کیا تھا ——— اور اب مزید وضاحت سے کہے دیتے ہیں کہ مشرقی و مغربی پاکستان کے مابین ''مساوات'' کا مفہوم اگر یہ ہے کہ دارالحکومت ایک مغربی پاکستان میں ہو اور دوسرا مشرقی پاکستان میں اور مرکزی حکومت چھ ماہ وہاں رہے اور چھ ماہ یہاں۔ اور دفاعی اخراجات میں بھی لازماً کامل مساوات برتی جائے تو یہ خالص احمقانہ تصوّر ہے۔ ایسی مساوات خاندان کے مختصر سے ادارے میں بھی نہیں چل سکتی۔ کجا یہ کہ ایک عظیم مملکت جو طرح طرح کی پیچیدگیوں سے دوچار ہو، اس کے انتظام و انصرام میں برتی جاسکے اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ دونوں خطّے آزاد ہو کر اپنے اپنے بقا و استحکام اور تعمیر و ترقی کی فکر کریں ———!!

لیکن ہمیں یقین ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی خواہش ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ مغربی پاکستان سے علیحدہ ہوں۔ اور اگرچہ ماضی قریب میں ان پر یہ ''بہتان'' کثرت سے لگایا گیا ہے کہ ان میں ''علیحدگی پسندی'' کا رجحان موجود ہے۔ ہم یہ باور نہیں کرسکتے کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان حقائق و واقعات اور موجود الوقت ظروف و احوال سے اتنے بے خبر ہوسکتے ہیں کہ ان خطرات کا اندازہ نہ کرسکیں جو ایسی کسی تجویز میں لازماً مضمر ہیں ——— ہمارا اندازہ یہ ہے کہ ان میں زیادہ سے زیادہ بس ''صوبائی خود اختیاری'' کے حصول کی خواہش ہے اور وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ صوبائی معاملات میں انہیں زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو اور یہ ہمارے نزدیک ان کا ایک ایسا حق ہے جس سے کسی بھی معقول انسان کو کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ اور مرکزی حکومت کے مؤثر طور پر اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جو امور ضروری ہیں انہیں مرکز کی تحویل میں دینے کے بعد بقیہ تمام معاملات میں مشرقی پاکستان کو کامل صوبائی خود اختیاری لازماً ملنی چاہیئے۔

انہی متذکرہ بالا دو امور کی روشنی میں دستور کے مسئلے پر بھی ایک بار حتمی طور پر فیصلہ کر لینے کی شدید ضرورت ہے اور تمام حالات و واقعات کا مردانہ وار مواجہہ کر کے اس مسئلے کو ایک بار قطعی طور پر طے کر لینا لازمی ہے اور اگرچہ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جن کے نزدیک

- کسی مملکت کے انتظام و انصرام میں اصل فیصلہ کن عامل کی حیثیت دیانت و امانت کو حاصل ہے نہ کہ قواعد و ضوابط اور تدابیر تحدید و توازن (CHECKS AND BALANCES) کے اس بے جان ڈھانچے کو جسے " دستور " کہا جاتا ہے۔ تاہم ہمارے یہاں جو خلا اس میدان میں چلا آرہا ہے اسے ایک بار جرأت و ہمت کے ساتھ عوام کی آزادانہ رائے کے مطابق پُر کر لینا ہی بہتر ہے۔

بیان پریس کانفرنس

منعقدہ ۱۷ دسمبر ۱۹۸۶ء

کراچی اور حیدرآباد میں ان دنوں جس قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے، ایسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے آخری تنبیہ ہے اور اگر ہم اب بھی ہوش میں نہ آئے تو اللہ کی شان بے نیازی سے کچھ بعید نہیں کہ نہ صرف پاکستان بلکہ پورے جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کا وہی حشر ہو جو اب سے لگ بھگ پانچ سو سال قبل سپین میں ہوا تھا ـــــــ اس لئے کہ ہم نے قیام پاکستان کے ضمن میں اللہ تعالیٰ سے جو وعدے کئے تھے اُن کی مسلسل خلاف ورزی کے باعث اللہ کے اٹل قانون کے مطابق عملی نفاق کی سزا تو ہم پر بہت عرصے سے مسلط ہے۔

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰی یَوْمِ یَلْقَوْنَهٗ بِمَا اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ۝	ـــــ "تو اللہ نے سزا کے طور پر اُن کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا اُس دن تک کے لیے جب وہ اس کے حضور حاضر ہوں گے بہ سبب اس کے کہ انہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا، اس کی خلاف ورزی کی اور بوجہ اس جھوٹ کے جو وہ بولتے تھے۔

جس کے نتیجے میں پوری قوم کے اخلاق و کردار کا دیوالہ نکل چکا ہے' اور جھوٹ، خیانت، بدعہدی اور ذرا سے اختلاف پر آپے سے باہر ہو جانے کی جن چار صفات کا ذکر ایک متفق علیہ حدیث میں نفاق کی علامات کے طور پر آیا ہے وہ سب کی سب قوم کی اکثریت میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

وعن عبد الله ابن عمروؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ منهن كانت فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا: اِذَا ائْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ. (متفق علیہ)

حضرت عبداللہ ابنِ عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "چار باتیں جس شخص میں موجود ہوں گی، وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی اس میں اسی کی نسبت سے نفاق ہوگا۔ یہاں تک کہ اُسے چھوڑ دے۔ جب[1] امانت کا حامل بنایا جائے خیانت کا ارتکاب کرے۔ جب[2] بات کرے جھوٹ بولے۔ جب[3] عہد کرے تو بے وفائی کرے اور جب[4] (کسی سے) جھگڑے تو آپے سے باہر ہو جائے۔"

اخلاق اور کردار کے اس بُحران (CRISIS) کے علاوہ ہماری پیٹھ پر عذابِ خداوندی کا جو کوڑا اب سے ٹھیک پندرہ سال قبل سقوطِ مشرقی پاکستان اور اس کے ضمن میں اپنے پیدائشی دشمن بھارت کے ہاتھوں ایک انتہائی ذلت آمیز شکست کی صورت میں پڑا تھا اُس کی حیثیت قرآن میں بیان شدہ قانونِ خداوندی (سورۂ سجدہ آیت ۲۱) کے مطابق آخری سزا سے پہلے خوابِ خرگوش سے بیدار کرنے والی تنبیہہ کی تھی لیکن چونکہ ہم اس پر بھی ہوش میں نہیں آئے، اور نہ ہماری ذاتی زندگی کے رنگ ڈھنگ بدلے نہ اجتماعی سطح پر قومی و ملی تعمیر کی کوئی مؤثر کوشش ہوئی، لہٰذا

اب عذابِ الٰہی کی اُس شدید ترین صورت کا آغاز ہوگیا ہے ۔
جس کا ذکر سُورۃ الانعام کی آیت ۶۵ میں ملتا ہے :

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ	کہہ دو (اے نبی) وہ اس پر قادر ہے
يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ	کہ تم پر عذاب اوپر سے بھیجے یا تمہارے
فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ	پاؤں کے نیچے سے یا تمہیں مختلف
أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا	فرقے (گروہ) کرکے ٹکرا دے
وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ	اور ایک کو دوسرے کی جنگی قوت کا
بَعْضٍ ﻂ (الانعام: ۶۵)	مزہ چکھاوے ۔

——— چنانچہ ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ مملکتِ خداداد پاکستان میں مسلم قومیت کا تصور رفتہ رفتہ تحلیل ہوکر نسلی اور لسانی قومیتوں کی صورت اختیار کر چکا ہے اور اب ان قومیتوں کے مابین ذہنی و قلبی بُعد ہی نہیں، نفرت و عداوت کے جذبات بھی پیدا ہوگئے ہیں جن سے ہمارے اندرونی اور بیرونی دشمن بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں، جس کی بدترین مثال کراچی کی حالیہ وحشیانہ ہی نہیں، سفاکانہ قتل و غارت گری ہے !۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ بحالاتِ موجودہ جو سب سے بڑی دُعا کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ عذاب بھی سُورۃ سجدہ کی آیات کے مطابق سابقہ تنبیہات کی طرح ایک تنبیہہ ہو ۔

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ	اور ہم اُنہیں لازماً قریب کا عذاب
الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ	بھی اُس بڑے عذاب سے پہلے
الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ○	چکھائیں گے تاکہ وہ باز آجائیں ۔
(السجدۃ: ۲۱)	

اور ہمیں سُورۃ انبیاء کی آیت ۱۱۱ کے مصداق کلّی خاتمے والے عذاب سے قبل کچھ مزید مہلت عمل مل جائے ،

وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ	اور میں نہیں جانتا شاید کہ یہ
فِتْنَةٌ لَكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ	(مہلت) تمہارے لئے مزید ایک

حیثیت ہو | الانبیاء: ۱۱۱ | آزمائش اور ایک وقت معین تک مزید فائدہ اٹھالینے کا موقع ہو۔

——— لیکن اس کی شرط لازم یہ ہے کہ پوری قوم کامل خلوص و اخلاص کے ساتھ اللہ کی جناب میں توبہ کرے اور ایک طرف ہر مسلمان صمیم قلب کے ساتھ عہد کرے کہ وہ آئندہ انفرادی طور پر خود اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف ورزی نہیں کرے گا، اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے اجتماعی جدّوجہد میں تن من دھن لگادے گا۔ اور دوسری طرف جملہ سیاسی تنظیمیں اور خاص طور پر دینی جماعتیں بھی حالات کی سنگینی اور وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے اپنے موقف اور طریق کار پر نظرثانی کریں اور اس راہ میں نہ ضد اور ہٹ دھرمی کو رکاوٹ بننے دیں، نہ گروہی یا جماعتی مصلحتوں کو آڑے آنے دیں۔

اس کے علاوہ سیاسی اور انتظامی سطح پر بھی چند فوری اقدامات لازمی اور ناگزیر ہیں۔ اور ان کے ضمن میں اللہ تعالیٰ ہی سے دعا ہے کہ وہ ارباب اقتدار اور اصحاب حل و عقد کو توفیق دے کہ وہ ذاتی انا کے خول اور خوشامدیوں کے حصار سے نکل کر حقائق کا مشاہدہ کرسکیں اور صحیح اور بروقت اقدامات کے لئے مناسب قوتِ ارادی کو بروئے کار لاسکیں ——— وہ ناگزیر اقدامات حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ سندھ کی صوبائی حکومت کی نااہلی اور ناکامی کے اس بیّن اور خوفناک ثبوت کے بعد اس کا مزید ایک دن برقرار رہنا بھی غلط ہے۔ لہٰذا اُسے فوراً برطرف کرکے گورنر راج قائم کیا جائے اور گورنری کی ذمّہ داریاں سنبھالنے کے لئے صوبہ سندھ ہی سے تعلق رکھنے والی کسی معروف اور بااثر شخصیت کو آمادہ کیا جائے!

۲۔ جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی نااہلی اور ناکامی بھی اظہر من الشمس ہوچکی ہے اور اگرچہ اصولاً تو انہیں فوری طور پر پاکستان کی صدارت اور فوج کے چیف آف سٹاف دونوں عہدوں کے سبکدوش ہوجانا چاہیئے ——— لیکن اگر اس صورت میں کسی فوری دستوری بحران کا اندیشہ ہو تو انہیں کم از کم ان میں سے ایک عہدے کو تو فوراً چھوڑ دینا چاہیئے ——— تاکہ یہ تأثر کسی قدر کم ہوسکے کہ موجودہ حکومت سابقہ مارشل لاء ہی کے تسلسل کی حیثیت رکھتی ہے

۴ ۔ اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ فی الوقت ملکی سطح پر مسلم قومیت کا جذبہ بے حد کمزور پڑ چکا ہے اور فی الواقع اُس کی جگہ نسلی اور لسانی قومیتوں نے لے لی ہے - لہذا اصلاح کے عمل کا آغاز اُن کی نفی سے نہیں بلکہ انہیں مناسب حد تک تسلیم کرتے ہوئے ہی کیا جا سکتا ہے ملکی دستور کے ضمن میں مرکز اور صوبوں کے مابین اختیارات کی تقسیم کے علاوہ زبان اور ثقافت کی اساس پر نئے صوبوں کی تشکیل کے مطالبات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے اور اس معاملے میں قومی سطح پر اتفاقِ رائے (CONCENSUS) کے حصول کو اوّلین ترجیح دی جانی چاہیئے - جس کے لئے حسب ذیل دو صورتوں میں سے کوئی سی صورت اختیار کی جا سکتی ہے -

ا ۔ ۷۳ء کے اصل متفق علیہ آئین کو صرف قادیانیوں سے متعلق ترمیم کے ساتھ فوراً بحال کر دیا جائے اور اس کے تحت جماعتی بنیاد پر جلد از جلد انتخابات کرائے جائیں جن کے ضمن میں رجسٹرڈ اور غیر رجسٹرڈ کی کوئی تقسیم حائل نہ ہو - اس کے بعد آئندہ قومی اسمبلی ہی دستور میں طے شدہ طریق پر دستور میں مطلوبہ ترامیم کرے!

ب ۔ فوری طور پر غیر جماعتی بنیاد پر ایک دستور ساز اسمبلی کا انتخاب کرا دیا جائے جو ایک سال کے اندر اندر ایسا دستور تیار کرے جس پر پوری اسمبلی کے ارکان کی کم از کم دو تہائی تعداد متفق ہو جس میں ہر صوبے کے اراکین اسمبلی کی بھی کم از کم نصف تعداد ضرور شامل ہو - پھر اس نئے دستور کے مطابق انتقال اقتدار کے لئے از سر نو انتخاب ہو!

آخر میں ایک بار پھر اللہ تعالٰی سے دُعا ہے کہ وہ اپنے خصوصی فضل و کرم سے پاکستان کی کشتی کو، جو اس کے دین ہی کے نام پر قائم ہوا تھا موجودہ مسائل و مشکلات کے بھنور سے نکال لے — اور قوم کے خواص و عوام سب کو صحیح فہم اور مناسب عمل کی صلاحیت عطا فرمائے - آمین -

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ
۱۰ دسمبر ۸۶ء
امیر تنظیم اسلامی و صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

خاتم النبیین

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

کا آخری تحریری ہدایت نامہ

از:- سیّد وصی مظہر ندوی

حضرت عمرو بن حزم انصاری خزرجی ان نوجوان صحابیوں میں سے ہیں جن کے جوہر قابل کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نوعمری ہی میں بڑی اہم ذمّہ داریوں پر مامور فرمایا۔ ان کی عمر ابھی ۱۷ سال تھی کہ ان کو اہم سفارتی ذمّہ داریوں پر مقرر کیا گیا۔ چنانچہ نجران کے وہ عیسائی پادری جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مناظرہ کے لئے آئے تھے اور جو اپنے علم پر بڑے نازاں تھے، ان کے علاقہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن حزم کو عامل (حاکم)، محصّل (ریونیو افسر) اور معلّم (مبلّغ اور مُربّی) کی حیثیت سے بھیجا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے صرف چند ماہ قبل ان کو نجران (یمن) میں گورنر مقرر کرتے ہوئے جو تحریری ہدایات دی تھیں، ان کو امام ابُو جعفر دیبلی سندھی متوفی ۳۲۲ھ نے "مکاتیب النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے نام سے اپنے ایک مجموعہ میں شامل کیا ہے۔ یہ ہدایت نامہ حضرت عمرو بن حزم کے خاندان میں محفوظ چلا آتا تھا۔ امام ابُو جعفر دیبلی کو ان کے پڑپوتے سے ملا ہے۔

حافظ ابن طولون نے اپنی کتاب "اعلام السائلین" میں امام ابُو جعفر دیبلی کے پورے مجموعہ کو سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت عمرو ابن حزم کے نام یہ ہدایت نامہ بہت معمولی فرق کے ساتھ احادیث اور تاریخ کی اکثر کتابوں میں محفوظ ہے۔

حضرت عمرو بن حزم کے نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ہدایت نامہ کا جو پس منظر بیان ہوا ہے اس سے ہدایت نامہ کی چند اہم خصوصیات واضح ہوتی ہیں:

۱ - حجۃ الوداع سے صرف چند ماہ قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایات تحریری

صورت میں جاری فرمائی تھیں۔ اس لحاظ سے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری تحریری ہدایات ہیں۔

۲ - یہ انتہائی مستند ہیں - تحریر اور زبانی سند کے لحاظ سے یہ قطعی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جاری کردہ ہدایات ہیں جن کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

۳ - خوش قسمتی سے ہم کو یہ ہدایات ایک سندھی (پاکستانی) محدث امام ابوجعفر دیبلی کے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہیں۔

۴ - ان ہدایات سے واضح ہوتا ہے کہ کسی حاکم کی نگاہ میں کن امور کو اولیت حاصل ہونی چاہیئے اور حاکم کو کن صفات کا حامل ہونا چاہیئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	"اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے
هٰذا بيان من الله ورسوله "يا ايها الذين آمنوا اوفوا بالعقود"	یہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان ہے: "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو عہد و پیمان کو پورا کرو" (القرآن)
عهد من عند النبي (صلى الله عليه وسلم) لعمرو ابن حزم الانصاري حين بعثه الى اليمن۔	عمرو بن حزم انصاری کو یمن بھیجنے کے موقع پر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے یہ ہدایات عمرو بن حزم کو دی جا رہی ہیں۔
(۱) امره بتقوى الله فى امره كله فـ "ان الله مع الذين اتقوا والذين هم محسنون"	(۱) وہ اس کو حکم دیتے ہیں کہ وہ (عمر ابن حزم) اپنے تمام معاملات و نظام میں اللہ سے ڈرتا رہے - کیونکہ: اللہ ان کے ساتھ ہے جو (اس سے) ڈریں اور جو خوبی کے ساتھ اپنے کام انجام دیں" (القرآن)
۲ وامره ان ياخذ الحق كما امره الله۔	وہ اس کو حکم دیتے ہیں کہ وہ (حکومت) کے واجبات اسی طرح وصول کرے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم دیا ہے۔

(۳) وان یبشر الناس بالخیر ویامرھو بہ	(۳) لوگوں میں بھلائی کی تلقین کرے اور اسی کا حکم دے۔
(۴) ویعلموالناس القرآن ویفقھھو فیہ۔	(۴) لوگوں کو قرآن سکھائے اور قرآن کی سمجھ پیدا کرے۔
(۵) وینھٰی الناس ان لا یمس احد القرآن الاوھو طاھر۔	(۵) اور لوگوں کو اس بات سے منع کرے کہ کوئی شخص ناپاکی کی حالت میں قرآن کو ہاتھ لگائے۔[1]
(۶) ویخبر الناس بالذی لھم والذی علیھو	(۶) اور لوگوں کو (صاف طور پر) باخبر کر دے کہ ان کے کیا حقوق ہیں اور کیا فرائض ہیں۔[2]
(۷) ویلین للناس فی الحق۔	(۷) لوگوں کے حقوق دینے میں نرمی کا رویہ اختیار کرے۔
ویشتد علیھو فی الظلو وان اللہ کرہ الظلو ونھٰی عنہ فقال "الا لعنۃ اللہ علی الظالمین"	والتہ، اگر کوئی ظلم کرے تو اس پر سختی کرے۔ اللہ نے ظلم کو ناپسند فرمایا ہے اور اس سے منع فرمایا ہے، چنانچہ اس کا ارشاد ہے: "سنو! ظالموں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔"
(۸) ویبشر الناس بالجنۃ وبعملھا۔	(۸) لوگوں میں جنت اور جنت دلانے والے اعمال کی تبلیغ کرے۔

---

[1] نمبر ۴ پر چونکہ تعلیمِ قرآن کا ذکر تھا، اس لئے نمبر ۵ پہ اسی کی مناسبت سے ادبِ قرآن کا بھی ذکر کر دیا گیا۔ تاکہ اس باب میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے۔

[2] اسلامی حکومت کا وجود ایک معاہدۂ عمرانی کے تصور پر قائم ہے، جس میں عوام اور حکومت کے حقوق و فرائض دستوری طور پر متعین کر دیے گئے ہیں۔ ان حقوق و فرائض کی تفصیل چونکہ قرآن حکیم میں ملتی ہے، اس لئے قرآن کی تعلیم کے ساتھ ہی عوام کے حقوق و فرائض کی عمومی تعلیم و تشہیر کا بھی حکم دے دیا گیا۔

(۹) وینذر الناس بالنار وبعملها۔

(۹) اور لوگوں کو جہنم اور جہنم والے اعمال سے ڈراتے۔

(۱۰) ویتألف الناس حتی یفقھوا فی الدین -

(۱۰) اور لوگوں کی دلداری کرے تاکہ وہ دین کو سمجھنے کے لئے آمادہ ہوں۔

(۱۱) وَ یعلم الناس معالم الحج وسننه وفرائضه وما امر الله به والحج الاکبر والحج الاصغر (وھو العمرۃ)

(۱۱) اور وہ لوگوں کو حج کے مناسک، اس طریقے اور اس کے فرائض سکھائے اور اللہ کے احکام کی تعلیم دے اور حج اکبر اور حج اصغر (عمرہ) سکھائے۔

(۱۲) وینھی الناس ان یصلی احد فی ثوب واحد الا ان یکون ثوبًا واحدًا یثنی طرفیه علی عاتقیه -

(۱۲) لوگوں کو اس بات سے منع کرے کہ وہ ایک چھوٹے سے کپڑے میں نماز ادا کریں - البتہ اگر کپڑا بڑا ہو اور اس کے دونوں کنارے دونوں شانوں پر ڈال لئے جائیں تو ایسا کیا جا سکتا ہے۔

(۱۳) وینھی ان یحتبی احد فی ثوب واحد یفضی بفرجه الی السماء

(۱۳) (نماز میں) کوئی شخص ایک کپڑا پہن کر اس طرح اکڑوں نہ بیٹھے کہ اس کی ستر کھلی ہوئی ہو۔

(۱۴) ولا یعقص احد شعر رأسه اذا اعفاه علی قفاہ -

(۱۴) اگر کسی نے اپنے بال بڑھا کر گدی پر لٹکا لیے ہوں تو ان کا (نماز میں) جوڑا نہ باندھے۔

(۱۵) وینھی اذا کان بین الناس ھیج عن الدعاء الی العشائر والقبائل ولیکن دعاءھم الی الله وحدہٗ لا شریک له فمن

(۱۵) [1] اور لوگوں کے درمیان اگر اختلاف ختم کرنے کیلئے صلح ہو رہی ہو تو لوگوں کو اس بات سے منع کرو کہ وہ (اپنے اپنے) قبیلہ یا اپنے اپنے، خاندان کا نعرہ

---

[1] نماز کے ساتھ وحدتِ اسلامی کے احکام مذکور ہیں، کیونکہ نماز وحدتِ اسلامی کی اساس ہے

لو یدع الی اللہ ودعا الی العشائر والقبائل فلیعطفوا بالسیف حتی یکون دعاءھم الی اللہ وحدہ لاشریک لہ

لگائیں۔ انکو صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ کا نعرہ لگانا چاہیئے۔ لیکن جو لوگ اللہ کا نعرہ نہ لگائیں اور خاندانوں اور قبیلوں کی طرف بلائیں تو ان کو تلوار کے ذریعہ سے جھکایا جائے۔ یہاں تک کہ وہ صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کا نعرہ لگائیں۔[1]

(۱۶) ویامر الناس باسباغ الوضوء وجوھھم وایدیھم الی المرافق وارجلھم الی الکعبین ویمسحوا برؤوسھم کما امر اللہ۔

(۱۶) اور وہ لوگوں کو حکم دے کہ وہ وضو میں اپنے چہروں کو اچھی طرح دھوئیں ہاتھوں کی کہنیوں اور پیروں کے ٹخنوں تک پانی پہنچائیں۔ وہ اپنے سروں پر اس طرح مسح کریں جس طرح اللہ نے حکم دیا ہے۔

(۱۷) وامرہ بالصلوٰۃ لوقتھا

(۱۷) اور انہوں نے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] یہ ہدایات دراصل سورہ حجرات کی مندرجہ ذیل آیات کی تفسیر ہیں:-

"اگر مومنوں کے دو گروہ لڑ پڑیں تو ان دونوں کے درمیان صلح کرا دو۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرنے پر تل جائے تو زیادتی کرنے والے گروہ کے خلاف لڑو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹنے پر آمادہ ہو جائے۔ اگر گروہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹنے پر آمادہ ہو جائے تو دونوں کے درمیان مصالحت کرا دو۔ اور جس کا حق ہے اس کا حق اسے دلا دو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ حق دلانے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

اس آیت اور اس سے ماقبل کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر خاندان، ذات اور قبیلے وغیرہ کی فطری بنیادوں پر اگر فطری حد تک قرب و یگانگی پیدا ہو جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ فطری تنظیمیں اگر عصبیت کے دائرہ میں داخل ہو کر اسلامی وحدت کو مجروح کرنے لگیں تو ان کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا چاہیئے۔

[2] چونکہ اسلامی تعلیمات اور روایات کے مطابق نماز باجماعت کا اہتمام کرنا حاکم کا فرض ہے، اسلئے نماز باجماعت کے جملہ احکام براہ راست عمرو بن حزم کو دیئے گئے ہیں۔ عام مسلمان اس حکم میں تبعاً شامل ہیں

واتمام الركوع والخشوع۔ ويغلس بالصبح ويهجر بالهاجرة حتى تميل الشمس وصلوٰة العصر والشمس في الارض مدبرة والمغرب حين يقبل الليل ولا يؤخر حتى تبدو النجوم في السماء والعشاء اوّل الليل۔ وامره بالسعي الى الجمعة اذا نودي لها۔ والغسل عند الرواح۔

نے) اس کو (عمرو بن حزم) حکم دیا ہے کہ وہ نمازیں وقت پر ادا کرے، رکوع اور خشوع (قلبی جھکاؤ) کو مکمل کرے نمازِ فجر اندھیرے میں ادا کرے اور سورج کے مغرب کی جانب جھکنے سے قبل نمازِ ظہر ادا کرے اور عصر کی نماز اس وقت ادا کرے جب دھوپ زمین سے واپس ہونا شروع ہو اور رات کی آمد کے وقت مغرب ادا کرے اور مغرب میں اتنی تاخیر نہ کرے کہ ستارے ظاہر ہو جائیں۔ اور نمازِ عشاء رات کے پہلے حصہ میں ادا کرے۔ اور اس کو یہ بھی حکم دیا ہے کہ جب جمعہ کی اذان ہو تو نماز کے لئے لپک کر پہنچے اور نماز جمعہ کے لئے جاتے وقت غسل کرے۔

(۱۸) وامره ان يأخذ من المغانم خمس الله۔

(۱۸) اور اسے حکم دیا ہے وہ مالِ غنیمت میں سے اللہ کا مقرر کردہ خمس وصول کرے

(۱۹) وما كتب على المؤمنين في الصدقة من العقار عشر ما سقى البعل وما سقت السماء۔ وعلى ما سقى الغرب نصف العشر۔

(۱۹) اور زکوٰۃ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جو فرض کیا ہے اسے وصول کرے، جس کی تفصیل اس طرح ہے: جس زمین کو دریا یا بارش نے سیراب کیا ہو اس کی پیداوار کا ۱/۱۰ حصہ۔ اور جس کو ڈول (مصنوعی آبپاشی) سے سیراب کیا گیا ہو اس کی پیداوار کا ۱/۲۰ حصہ۔

وفي كل عشر من الابل شاتان وفي كل عشرين من الابل اربع شياه وفي كل اربعين من البقر بقرة۔ وفي كل ثلاثين من

ہر دس اونٹوں پر دو بکریاں۔ اور ہر بیس اونٹوں پر چار بکریاں۔

البقر جذع او جذعة
وفي كل اربعين من
الغنم سائمة شاة.
فانها فريضة الله التي
افترض على المؤمنين
في الصدقة فمن زاد
خيرا فهو خير له۔

اور ہر چالیس گائیوں پر ایک گائے۔
اور ہر تیس گائیوں پر ایک نر یا مادہ یک سالہ بچہ۔
اور ہر چالیس چرنے والی بھیڑوں پر ایک بکری۔
زکوٰۃ کے سلسلہ میں یہ اللہ تعالٰی کا مقرر
کردہ ضابطہ ہے جو اس نے اپنے بندوں
پر نافذ کیا ہے جو شخص اس سے زیادہ
دے تو وہ خود اس کے لئے بہتر ہے

(۲۰) وانه من اسلم من
يهودي او نصراني اسلاما
خالصا فانه من المؤمنين
له مثل ما لهم وعليه
ما عليهم۔

(۲۰) یہ کہ اگر کوئی یہودی یا عیسائی مخلصانہ
طور پر مسلمان ہو جائے اور دین اسلام
اختیار کرلے تو وہ مومنوں میں سے ہوگا۔
اس کے وہی حقوق ہونگے جو اہلِ ایمان
کے ہوتے ہیں اور اس کے فرائض بھی
انہی جیسے ہوں گے۔

ومن كان على نصرانيته
او يهوديته فانه لا يفتتن
عليها۔

اور جو اپنی نصرانیت یا یہودیت پر قائم
رہے تو اس کو اس کے دین سے پھیرنے
کے لئے سختیوں میں نہیں ڈالا جائے گا۔

وعلى كل حالم ذكر او
انثى حر او عبد دينار واف
او عرضه ثيابا۔
فمن ادى ذلك فان له
ذمة الله وذمة رسوله
ومن منع ذلك فانه عدو لله
ورسوله وللمومنين جميعا۔

اور ہر بالغ مرد یا عورت آزاد یا غلام
سے ایک پورا دینار یا اسکی قیمت کے مساوی
کپڑے بطور جزیہ وصول کئے جائیں گے۔
جو شخص یہ (جزیہ) ادا کرے گا تو وہ اللہ
اور اس کے رسول کی امان میں ہوگا اور
جو اس کو دینے سے انکار کرے گا تو وہ
اللہ، اس کے رسول اور مومنین، سب
کا دشمن سمجھا جائے گا۔

(بشکریہ: تنظیم اصلاح و خدمت حیدرآباد، سندھ)

رفتار کار

لاہور میں
تربیّت و تزکیہ اور توسیع دعوت کے نئے پروگرام

مرتّب : چوہدری غلام محمّد

اس پُرفتن اور پُرآشوب دور میں جبکہ معاشرے کی عظیم اکثریت حبِ عاجلہ میں گرفتار اور فکرِ آخرت سے کلیتہً بے نیاز زندگی بسر کر رہی ہے۔ محض رضائے الٰہی اور نجاتِ اُخروی پر مبنی خالص اسلامی دعوت کا علمبردار بننا اور اس کے نفوذ کے لئے ایثار و قربانی اور محنت و جانفشانی سے کام لینا اصحابِ عزم و ہمت کا کام ہے۔ اللہ تعالےٰ کی توفیق خصوصی اور تائید و نصرت سے رفقائے تنظیم اسلامی نے اس راستہ پر پیشقدمی کا عزم کیا۔ انہوں نے اللہ تعالےٰ کے دین کی اقامت اور اس کے کلمے کی سربلندی کے لئے ترک و اختیار اور انفاقِ مال و جان کا عہد کیا۔ تاہم ہر چہار سو ترغیباتِ شیطان و نفس کی بہتات ہے۔ بعض اوقات ماحول کی ناموافقت بھی حوصلہ شکن ہو جاتی ہے۔ غفلت اور تن آسانی کے پردے بھی حائل ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ رفقائے تنظیم اسلامی اللہ تعالےٰ سے اپنے اس عہد و پیمان کو تازہ کرتے رہیں۔ جس کا اقرار انہوں نے پورے شعور و ادراک کے ساتھ تنظیم اسلامی میں شمولیت کے وقت کیا تھا اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بھرپور محنت و کوشش ضروری ہے۔ لہذا یہ محسوس ہوا کہ رفقائے تنظیم میں غور و فکر اور خود احتسابی کی دعوت راسخ ہونی چاہیئے تاکہ وہ اپنی کوتاہیوں کے احساس پر سنجیدہ خاطر ہوں اور تلافیٔ مافات کی فکر کریں اور اگر کسی پہلو سے پیش قدمی کی توفیق نصیب ہوئی ہو تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں اور مزید توفیق کے لئے دست بدُعا رہیں۔ مزید برآں انکی عملی تربیت کے لئے یہ ضروری محسوس ہوا کہ وہ اپنے عزیز و اقارب اور حلقۂ تعارف میں دین کی بنیادی دعوت اور تنظیم اسلامی سے اپنے تعلق کا واشگاف اظہار کریں۔ دعوت الی الخیر کی اس محنت سے اپنی تربیت اور پیش رفت کے علاوہ اصلاحِ معاشرہ اور ملک و

ملت کی خیر خواہی کا بھی کچھ حق ادا ہو سکے گا۔ علاوہ ازیں راہ حق کے مسافر کی اصل پونجی تو تعلق باللہ کی وہ کیفیت خصوصی ہے۔ جس کی بدولت بندگانِ خدا حوصلہ شکن مراحل میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ناساعد حالات میں بھی کیف و سرور محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے دین میں اس کے لئے نمازوں میں اہتمام اور خشوع و خضوع کی تلقین ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے رفقائے تنظیم اسلامی کو مندرجہ ذیل پندرہ روزہ پروگرام دیا گیا تھا۔

۱۔ روزانہ قبل از نماز فجر (قبل از اذانِ فجر زیادہ مناسب ہوگا) عہد نامۂ رفاقت تنظیم اسلامی کا باقاعدہ بغور مطالعہ فرمائیں اور اس کے اجزاء پر شق وار غور وتدبر کریں۔ اپنے عہد کی پاسداری کے لئے جو کچھ ہو سکا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔ اپنی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں پر ندامت کے آنسو بہائیں۔ الحاح وزاری کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے معافی کے طلب گار ہوں۔ دوبارہ عہد کریں اور آئندہ کے لئے عزم مصمم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے استقامت کی خصوصی دعا کریں (عہد نامہ رفاقت تنظیم اسلامی درج ذیل ہے:

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

- میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اُس کا کوئی ساجھی نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔
- میں اللہ تعالیٰ سے اپنے (آج تک کے) تمام گناہوں کی معافی کا خواستگار ہوں اور آئندہ کے لئے، خلوصِ دل کے ساتھ اس کی جناب میں توبہ کرتا ہوں۔

میں اللہ تعالےٰ سے عہد کرتا ہوں کہ:

- اُن تمام چیزوں کو ترک کر دُوں گا جو اُسے ناپسند ہیں
- اور اُس کی راہ میں مقدور بھر جہاد کروں گا
- اور اُس کے دین کی اقامت اور اُس کے کلمہ کی سربلندی کے لئے اپنا مال بھی صرف کروں گا اور جان بھی کھپاؤں گا۔

اور اسی مقصد کی خاطر

مَیں امیرِ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد سے بیعت کرتا ہوں کہ :

- ان کا ہر حکم سنوں گا اور مانوں گا جو شریعت کے دائرے سے باہر نہ ہو۔
  خواہ تنگی ہو خواہ آسانی
  خواہ میری طبیعت آمادہ ہو خواہ مجھے اس پر جبر کرنا پڑے، اور
  خواہ دوسروں کو مجھ پر ترجیح دی جائے !
- اور یہ کہ نظم کے ذمہ دار لوگوں سے ہرگز نہیں جھگڑوں گا،
- اور یہ کہ ہر حال میں حق بات ضرور کہوں گا۔

اور اللہ کے دین کے معاملے میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کرونگا۔

- مَیں اللہ ہی سے مدد اور توفیق کا طالب ہوں کہ وہ مجھے دین پر استقامت اور اس عہد کے پورا کرنے کی ہمت عطا فرمائے،

۲ - نمازیں تکبیرِ اولیٰ کے ساتھ ادا کرنے کا اہتمام کریں ۔

۳ - اپنے عزیز و اقارب ۔ احباب اور حلقہ تعارف میں سے کم از کم پچیس حضرات کے نام خطوط ارسال فرمائیں ۔ جن میں دین کی دعوت کے علاوہ اس کے تقاضوں پر خود کاربند ہونے کے عزمِ مصمم کا اظہار ہو ۔

لاہور اور اس کے گرد و نواح میں اس پندرہ روزہ لائحہ عمل پر عمل درآمد کے لئے خصوصی محنت کی گئی اور الحمد للہ اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ۔ اکثر رفقاء نے از خود اس کو چالیس روز تک مکمل کرنے کا اہتمام کیا اور اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے اب یہ ان کا معمول بن گیا ہے ۔ بقیہ رفقاء بھی اس محنت اور تگ و دو کے طفیل اب نماز باجماعت سے کبھی محروم نہیں ہوتے ۔ عہد نامۂ رفاقتِ تنظیمِ اسلامی پر غور و تدبر کا بھی اکثر رفقاء نے اہتمام کیا ۔ توقع ہے کہ ذاتی جائزہ اور سحر خیزی کے اس اہتمام کی برکات کا بھی ظہور ہوگا۔ الحمد للہ کافی رفقاء نے عزیز و اقارب اور احباب کو دعوتی خطوط کی ترسیل کا اہتمام کیا ۔ اس سے توسیعِ دعوت کا ایک سلسلہ جاری ہوا ہے ۔ کافی وسیع حلقہ میں عہد نامۂ رفاقتِ تنظیم کا تعارف ہوا ہے ۔ رفقاء کو جوابی خطوط موصول ہو رہے ہیں ۔ اس طرح

خط و کتابت میں سوال و جواب کا ایک سلسلہ قائم ہوا ہے ۔ جس کے نتیجے میں بعض نئے رفقائے کار بھی میسر آئے ہیں ۔

لاہور کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی اس پندرہ روزہ پروگرام پر عمل درآمد کی کوشش کی گئی ۔

گذشتہ ماہ کے دوران تنظیم اسلامی لاہور کے اسرہ مصطفیٰ آباد کے رفقاء نے از خو غور و فکر کر کے اپنے علاقہ میں توسیع دعوت اور اپنی ذاتی تربیت کے بعض مفید پروگرا ترتیب دیئے ۔ ان کی عملی تفصیلات طے کیں اور ان کی تکمیل کے لئے بھرپور محنت کی ۔ ا کے تمام رفقاء روزانہ سہ پہر کو کسی رفیق کے گھر جمع ہوتے اور مختلف دعوتی تحریروں و کتبے اٹھا کر ملحقہ گلی بازار اور محلہ میں گشت کرتے ۔ وہ تنظیم اسلامی کا تعارف اور انقلا منشور" نامی پمفلٹ لوگوں میں تقسیم کرتے اور حسب ضرورت گفتگو کے علاوہ مختلف پر مختصر خطاب کا بھی اہتمام کرتے ۔ محلہ کی ایک جامع مسجد میں اسرہ کے ایک نوجوان رف ہفتہ وار درس قرآن دیتے ہیں ۔ رفقاء نے دعوتی مہموں کے ذریعہ اس کی کامیابی کے ل بھرپور محنت کی اور اس مجلس کے شرکاء کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہو گیا ۔ صبح کے اوق میں انہی رفقاء نے مرکز اور دوسرے اسرہ جات میں بعض رفقاء کے تعاون سے کئی ا پُرہجوم دفاتر کے باہر تعارفی پمفلٹ کی وسیع بنیادوں پر تقسیم کا اہتمام کیا ۔ اللہ تعالےٰ ا رفقاء کی محنت کو قبول فرمائے ۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ انہوں نے کسی بالاتر نظم ہدایات کا انتظار کئے بغیر خود ہی غور و فکر کر کے اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے کام کر کے راستے تلاش کئے ہیں ۔ اللہ تعالےٰ نے ان کی اس طرح دست گیری فرمائی کہ مختلف موانعات اور عملی تجربات سے گذارتے ہوئے ان کو خوب سے خوب تر اندازِ کار سمجھا ۔ انہوں نے اپنی بھرپور ذاتی مصروفیات کے باوجود خدمت و دعوتِ دین کے لئے اپنا محنت اور صلاحیتوں کے ایثار کی ایک قابل تقلید مثال قائم کی ہے ۔

اس سال کے دوران کراچی اور فیصل آباد کے مقامات پر دو علاقائی تربیت اجتماعات کے انعقاد کا فیصلہ ہوا تھا ۔ رفقاءِ سندھ اور بلوچستان کو اکتوبر کے دو کراچی میں جمع ہونا تھا اور رفقائے پنجاب اور سرحد کے لئے اواخر دسمبر میں فیصل کے مقام پر اجتماع کا اہتمام تھا ۔ ابتدائی انتظامات مکمل ہو چکے تھے ۔ لیکن کراچی بد

ن و امان کی مخدوش صورتِ حال کے پیش نظر وہاں کے اجتماع کو منسوخ کرنا پڑا۔ بعدازاں
صورتِ حال کے کچھ بہتر ہونے پر دونوں علاقائی اجتماعات کے قائم مقام کے طور پر کراچی
میں ۲۵ دسمبر تا یکم جنوری ایک کُل پاکستان تربیتی اجتماع کے انعقاد کا فیصلہ ہوا۔ اس
کے لئے بھی انتظامات مکمل کر لئے گئے۔ ملک کے مختلف حصوں سے رفقائے تنظیم اسلامی
اس اجتماع میں شرکت کے لئے پا بہ رکاب تھے کہ اچانک کراچی کے حالات کی دھماکہ خیز،
انتہائی اندوہ ناک اور تشویش انگیز صورتِ حال درپیش آ گئی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف
فرمائے انتہائی عجلت میں کل پاکستان تربیتی اجتماع طے شدہ تاریخوں کے دوران ہی
کراچی کی بجائے قرآن اکیڈمی لاہور میں منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ یہ اجتماع بخیر و خوبی منعقد ہو چکا ہے۔ کراچی اور سندھ
کے دوسرے مقامات کے رفقاء کو وہاں کے مخدوش حالات کی بنا پر رخصت دے دی گئی
تھی اس کے باوجود کچھ رفقاء نے شرکت کا اہتمام کیا۔ تاہم ملک کے دوسرے مقامات سے
رفقاء کی معتدبہ تعداد اس میں شریک ہوئی۔ اس ہفت روزہ تربیتی اجتماع کے پروگرام
کے غالب حصہ پر وطنِ عزیز کو درپیش شدید خطرات کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ روزانہ بعد
نمازِ عشاء قریباً دو گھنٹے کی نشست میں جناب امیر تنظیم اسلامی نے اپنی تازہ تالیف
"استحکام پاکستان" کا اجتماعی مطالعہ کرایا۔ آپ نے اپنے مخصوص انداز میں استحکام پاکستان
کی بنیادوں کی وضاحت فرمائی اور حاضرینِ مجلس کے استفسارات کے جوابات ارشاد
فرمائے۔ کراچی میں مسلمانوں کی باہمی قتل و غارت گری اور بہیمانہ تشدد کے واقعات
اور ملک کے دوسرے حصوں میں بدامنی اور بے سکونی کی کیفیات اسی سلسلۂ عذاب کی
کڑیاں معلوم ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے کئے گئے عہد و پیمان کو پاؤں تلے روندنے اور
اس کے احکام سے روگردانی کرنے کی پاداش میں قوموں کا مقدر بن جاتا ہے۔ اس بات کی
شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ ابنائے قوم کو متنبہ کیا جائے کہ لوگ انفرادی اور
اجتماعی سطح پر توبہ کریں۔ تلافیٔ مافات کے لئے خلوصِ دل سے محنت کریں۔ شاید ہمیں
معاف کر دیا جائے۔ اس ہفت روزہ اجتماع کے دوران رفقائے تنظیم اسلامی میں
پچیس رفقاء پر مشتمل گروپس کی شکل میں نکلے۔ مختلف کتبے اور بلے کارڈز تیار
کروائے گئے تھے۔ جن پر مناسب تحریریں درج تھیں۔ کراچی میں لوگوں پر جو قیامت

صغریٰ گذر گئی ہے ، اس کے بارہ میں بھی ایک دو ورقہ تیار کروالیا گیا تھا ۔ لاہور کے تیئیس حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا رفقائے تنظیم اسلامی کے آٹھ گروپ چار دن روزانہ صبح نو بجے سے سہ پہر تک لاہور کی گلیوں ، سڑکوں ، بازاروں ، مارکیٹوں اور دیگر پُر ہجوم مقامات پر توبہ کی منادی کرتے پھرتے رہے ۔ دو ورقہ وسیع حلقہ میں تقسیم ہوا ۔ میثاق کے حالیہ شمارہ میں جناب امیر تنظیم اسلامی کے سندھ کے بارہ میں مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں ۔ اسی حوالہ سے لوگوں کو متوجہ کیا گیا کہ سلطنت خداداد پاکستان میں اس راستہ سے نقب لگ رہی ہے اور برصغیر پاک و ہند میں ملتِ اسلامیہ کا مستقبل سخت خطرے میں ہے ۔ اس مہم کے دوران رفقائے تنظیم اسلامی نے جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے اجتماعات میں مختصر خطاب بھی کیا ۔ ان چار دنوں کے دوران روزانہ رفقاء کے تمام گروپس قبل از نمازِ عصر مسجد شہداء چوک ریگل میں پہنچتے رہے ۔ جہاں جناب امیر تنظیم اسلامی کا عصر تا مغرب خطابِ عام ہوتا رہا ۔ جس میں ہم پر عذاب الٰہی کی موجودہ صورت اور اس سے نجات کی سبیل ہی کا مفصل و مدلل بیان ہوتا تھا ۔ اس تربیتی اجتماع کے آخری روز رفقائے تنظیم اسلامی لاہور کے گرد و نواح میں بعض مقامات پر توبہ کی منادی کے لئے نکلے چنانچہ اس روز فیصل آباد ، گوجرانوالہ ، نندی پور ، وزیر آباد ، گجرات ، مریدکے اور کاموکی کے مقامات پر صبح سے شام تک بھرپور کام کیا گیا ۔ اس تربیتی اجتماع کے دوران اس مہم سے اصل مقصود تو ابنائے وطن کو متنبہ کرنا تھا ۔ تاہم اضافی طور پر تربیتی نقطۂ نظر سے بھی اس سے بہت فوائد حاصل ہوئے ۔ رفقاء رابطہ عوام کی اس وسیع مہم کے تجربہ سے گذرے ہیں ۔ مختلف سطح پر عملی معاملات کی تربیت ہوئی ہے ۔ اللہ تعالےٰ کا ہم پر فضل ہوا کہ نظم کی ہمارے ہاں جو خصوصی اہمیت بیان ہوتی تھی اس کا عملی مظاہرہ بھی سامنے آگیا ۔ فللّٰہ الحمد ۔

اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو اپنی حفاظت میں رکھے ۔ اپنا پسندیدہ بندہ بننے کی توفیق مرحمت فرمائے اور اس ملک میں اقامتِ دین کی جدوجہد کی کامیابی کے لئے راستہ کشادہ کرے ۔ آمین ۔

"سندھ کا مسئلہ" اور قارئین

وطنِ عزیز میں گذشتہ چالیس برس سے ایک استحصالی گروہ کسی نہ کسی شکل میں برسرِاقتدار چلا آرہا ہے۔ حکومت کا ظاہری چہرہ خواہ فوجی ہو یا سویلین اُس طبقے کے مفادات بہرحال محفوظ رہتے ہیں۔ اسی طبقے کی ظاہری اور پوشیدہ کاوشوں اور سازشوں کی وجہ سے آج چالیس برس گزرنے کے باوجود نہ ملک کا دستوری مسئلہ حل ہو سکا اور نہ ملکی معیشت اُن بنیادوں پر استوار ہو سکی جس سے عوام کی وہ توقعات پوری ہوتیں جو ایک اسلامی فلاحی ریاست کا خاصہ ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں سیاسی اور معاشی حقوق سے محرومی کے اسی ردعمل کو استعمال کرتے ہوئے بھارت دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کو دولخت کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ آج پھر سندھ میں وہی صورتِ حال ہمارے ملی وجود کے لئے ایک مہیب خطرہ بن کر سامنے کھڑی ہے۔

روزنامہ "جنگ" میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے قلم سے سندھ کی معاشی اور سیاسی محرومیوں کے تجزیے پر مشتمل سلسلۂ مضامین کی اشاعت کے بعد ہمیں ملک بھر سے خطوط موصول ہوئے ہیں۔ جن میں مختلف علاقوں اور مختلف ذہنی سطح کے افراد نے اپنے اپنے انداز میں ردعمل کا اظہار کیا ہے چونکہ اکثر مراسلہ نگار حضرات کے سامنے پورا سلسلۂ مضامین نہیں تھا بلکہ انہوں نے کسی ایک قسط یا اُس کے کسی ایک نکتے سے متاثر ہو کر قلم اٹھایا ہے اس لئے وہ بالعموم زیرِ بحث مسئلے سے بحیثیتِ مجموعی انصاف نہیں کر سکے۔ لیکن بہرحال ان خطوط کے مطالعے سے معاشرے کے مختلف طبقوں کی محرومیوں اور اُن کے نقطہ ہائے نظر کو سمجھنے میں بھرپور مدد ملتی ہے ہمیں نہ ان تمام خطوط کے مندرجات سے مکمل اتفاق ہے اور نہ ان کی اشاعت کا مقصد کسی کی دل آزاری ہے ان خطوط کی اشاعت کا مقصد صرف یہ ہے کہ عوامی سطح پر ایک ایسی بحث کا آغاز ہو جو ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے میں مدد دے اور نتیجۃً مسئلے کا کوئی مثبت حل سامنے آئے۔ ہمیں اُمید ہے کہ قارئین 'میثاق' اسی جذبے سے ان کا مطالعہ کریں گے۔

زیرِ بحث سلسلۂ مضامین اب "استحکام پاکستان اور مسئلۂ سندھ" کے عنوان سے کتابی صورت میں انتہائی رعایتی قیمت پر شائع کر دیا گیا ہے۔ ہم جملہ قارئین "میثاق" اور مراسلہ نگار حضرات کی خدمت میں گزارش کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بحث میں شریک ہوں (ادارہ)

اندرونِ سندھ اسلامی جمعیت طلبہ کا خاتمہ کیسے ہوا ہے

ڈاکٹر صاحب! آپ کا نام تو زمانہ طالب علمی میں اکثر سنتا تھا جب میں اور میرے ساتھی بھی اسی تنظیم میں شامل تھے جس کے آپ بھی سابق ناظم اعلیٰ رہے ہیں۔ اکثر و بیشتر اسٹڈی سرکلز اور تربیت گاہ میں آپ کا کسی نہ کسی

تعلق سے ذکر کیا جاتا تھا۔ یا کبھی سکھر کی مسجد میں آپ کے درسِ قرآن کا اشتہار پڑھتے تھے۔ کیونکہ قریب ہی شکار پور (سندھ) میرا آبائی گاؤں ہے۔ لیکن ناظمین آپ کے پروگرام اپنے یہاں رکھوانے میں منع کرتے تھے۔

اس وقت ہم بھی جذباتی اور ایمان کے جذبہ سے سرشار تھے اور سے

تم دن کو اگر رات کہو رات کہیں گے — جو تم کو ہو پسند وہی بات کہیں گے

کا فلسفہ کارفرما رہتا تھا۔ روزنامہ جنگ " میں مسئلہ سندھ پر آپ کے مضامین پڑھ کر سوچتا ہوں کہ آپ نے پنجاب میں رہ کر اتنی صاف اور واضح بات لکھی ہے جو شاید سندھ کے کسی سچے قوم پرست کو بھی معلوم نہ ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب! میں بھی اسی تنظیم کا سابق رکن اور ڈویژن کا ناظم اور مرکزی شوریٰ کا رکن رہا ہوں۔ آپ نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ " صوبہ سندھ کے دورے میں ایک بات جو میرے سامنے آئی کہ اسلامی جمعیت طلبہ کا وجود بالکل نیست و نابود ہوگیا ہے۔" اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ جب تک پاکستان قائم ہے شاید صوبہ سندھ میں کسی بھی اسلامی تنظیم کا وجود میں آنا ایک معجزہ ہوگا۔ میں تمام اسباب آپ کے سامنے مختصر انداز میں پیش کر رہا ہوں کیا عوامل تھے جو اس نوجوان تحریک کو ختم کرنے کا سبب بنے۔

صوبہ سندھ میں جمعیت کے کام کی ابتدا رجناب نعمان بھٹو صاحب نے کی۔ انھوں نے پورے سندھ میں اکثر و بیشتر مقامات پر یونٹ قائم کیے۔ اس وقت تک قوم پرستی کی تحریک بھی اتنی عروج پر نہ تھی۔ اس شخص نے اپنی صلاحیتوں کو خوب استعمال کیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس سے پہلے صوبہ سندھ میں صرف جہاں مہاجروں کی اکثریت ہوتی تھی وہیں پر کام ہوتا تھا۔ اور ناظم صوبہ بھی مہاجر ہوتا تھا۔

نعمان بھٹو نے جس انداز سے محنت کی جید۔ رآباد جمعیت میں مہاجر لابی اسے برداشت نہ کرسکی۔ اس پر نماز نہ پڑھنے کا الزام لگا کر جبراً استعفیٰ لیا گیا۔ کچھ عرصہ تک انصاف کی اپیل کرتا رہا لیکن مرکز کے فنڈز اور قیادت پر ان لوگوں کا قبضہ تھا اس لئے ناکامی ہوئی۔ ان کی جگہ سکھر کے مہاجر سرفراز کو ناظم صوبہ مقرر کیا گیا۔ (نعمان بھٹو کا تعلق بھی شکارپور سے تھا) یہ باتیں میں اس لئے صاف صاف لکھ رہا ہوں کہ ہمارے ساتھیوں نے اس کام کو بڑھانے کے لئے خون تک دیا تھا۔

انہی دنوں جب " جیئے سندھ تحریک " قائم ہوئی تو ایک بار پھر ایک سندھی گلزار منگھی کو ناظم بنایا گیا بدقسمتی سے وہ بھی شکارپور سے تعلق رکھتے تھے۔ اس بے چارے نے بھی اچھی ابتدا کی۔ یونیورسٹی میں کام کرنے کی کوشش کی — قوم پرستوں نے پلاننگ کر کے اس کو مارا اور اس کو مرا ہوا سمجھ کر چھوڑ گئے۔ اس بے چارے نے ہسپتال کے بیڈ سے پریس کانفرنس کی اور اسلامی نظام کے نفاذ اور پاکستان کو مستحکم کرنے کا اعادہ کیا۔ اور کام بڑھانے کے لئے کچھ سندھ کے جائز حقوق کی بات بھی کہدی۔ اس کی پاداش میں اسے جمعیت سے نکالا گیا۔ یہ انعام ملا اس نوجوان کو جو ہفتہ بھر تک موت و حیات کی کشمکش میں رہا۔ یہ قوم پرستوں کی تحریک کے

ابتدائی دن تھے۔ جیسے جیسے حکمرانوں کی پالیسیاں بدلتی گئیں، ان کا کام میں مضبوطی آگئی اور وہ منظم پلاننگ کے ساتھ نمایاں ہوگئے۔ قوم پرستوں نے مزدوروں، دانش وروں، طالب علموں اور بچوں میں کام کرنے کے لیے مختلف رسائل نکالے اور منظم ہو کر مختلف ناموں کے ساتھ میدان میں کام کرنے لگے۔

اسی دوران جمعیت سندھ کو بھی اچھی قیادت میسر آگئی۔ جناب انور محمد پٹھان (سندھی) نے صوبہ سندھ کے ایک ایک چپہ پر جہاں کوئی طالب علم تھا، یونٹ قائم کیا۔ شاید ہی کوئی قوم پرست بھی وہاں پہنچا ہو۔ خاص طور پر ضلع تھرپارکر میں۔ اس کے ساتھ ایک بہت اچھی قسم کی ٹیم تھی ساتھیوں کی جن کے نام نہ گنوانا ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ ان میں ڈاکٹر عبدالقادر سومرو، ارشاد بردھی، ارباب عبدالمالک، نعیم انور خاص خیلی، رفیق اور حسن خاص خیلی وغیرہ شامل تھے۔ پہلی مرتبہ اسٹوڈنٹ لیول پر جمعیت نے سندھی رسالہ "شاگرد" کے نام سے نکالا جس کی وجہ سے قوم پرست بھی "سندھی شاگرد" نکالنے پر مجبور ہوگئے۔

بچوں میں قوم پرست ایک تنظیم "گل جھنڑا بارڑا" یعنی "پھولوں جیسے بچوں" کے نام سے کام کر رہے ہیں اور رسالہ بھی اسی نام سے "سندھی ادبی بورڈ" کے ماتحت نکالتے رہے جواب تک "گل پھل" (پھول اور پھلواری) کے نام سے نکلتا ہے۔ ہم نے ان کے انداز سے "معصومن جی مجلس" یعنی "معصوموں کی مجلس" اور "گلڑا" یعنی "پھلواری" کے نام سے رسالہ شائع کیا اور اچھے نتائج نکلے۔ ہمارے رسالے کی مارکیٹ بھی دن بدن بڑھتی گئی اور مخالفت بھی۔ بہرحال نتیجہ یہ نکلا کہ شکارپور، شہدادکوٹ، جیکب آباد، کندھکوٹ، قمبر، لاڑکانہ، چانڈکا میڈیکل کالج نواب شاہ، ٹنڈوآدم، سانگھڑ، مورو اور خیرپور کے کالج میں جمعیت نے انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کی جس پر تمام سیاستدان اور قوم پرست حیران و پریشان ہوئے۔

آج مجھے وہ دن بھی یاد آتا ہے جو ہماری زندگی کا تاریخی دن تھا۔ جب سندھ یونیورسٹی میں اللہ اکبر پاکستان زندہ باد کے نعرے سُنے اور لگائے جا رہے تھے۔

اس کے بعد صوبہ سندھ کے سارے قوم پرست جمع ہوگئے اور انہوں نے بڑی محنت اور پلاننگ سے ہمیں چند ووٹوں سے شکست دی لیکن یہ پندرہ دن پاکستان کی عمر کے سنہری دن تھے۔ کیونکہ یہ واحد ادارہ ہے جہاں پر قومی پرچم جلانے، پاکستان کو توڑنے کی پلاننگ ہوتی ہے، مذہب کے بارے میں طنزیہ لطیفے گھڑے جاتے ہیں۔ ہماری کوششوں پر جئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر قادر بخش کا دھڑ کو کہنا پڑا تھا کہ ہمیں بھٹو کی پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن سے خطرہ نہیں بلکہ اصل خطرہ جمعیت والوں سے ہے۔

پندرہ دن کی سزا جو ہمیں نعرے لگانے پر ملی۔ مجھے آج بھی بھائی عبدالحمید بلوچ کی تصویر یاد آرہی ہے جسے مار مار کر بیہوش کیا گیا اور دانت توڑے گئے۔ اشتیاق صدیقی کی ٹانگ توڑ دی گئی۔ ہمارے دوستوں کی کتابوں تک کو جلایا گیا۔ معاشی اور اخلاقی طور پر لوٹا گیا۔ اگر یہ جلاؤ گھیراؤ اور ظلم جامعہ کراچی یا جامعہ پنجاب میں ہوتا تو ان کے گھر والوں تک کی امداد کی جاتی، جب تک وہ ہسپتال میں رہتے اُن کا خرچ برداشت

جاتا۔ لیکن ہم بے چارے بے وقوف سندھی تھے جن کی عیادت کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔

ہم جنہوں نے اپنے خاندان، دوستوں اور محلے داروں کی نفرت اور دشمنیاں مول لی تھیں ــــ سابق ناظم صوبہ سندھ نور محمد پٹھان اپنی انجینئرنگ کی تعلیم کو پورا نہ کر سکے تعلیم کے لحاظ سے بہت پیچھے رہ گئے۔ آجکل وہی ذہین، بردبار، نڈر نوجوان کس مپرسی کی حالت میں اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر رہا ہے۔ باقی تمام افراد قوم پرست بن چکے ہیں۔

اُن کے بعد بھی اس کام کو بڑھانے کے لیے پلاننگ کی گئی۔ شاید وہی آخری پلاننگ تھی۔ لیکن جمعیت کی مہاجر لابی نے آنکھیں بند کر کے اور تعصب کی آگ میں موقع گنوا دیا۔

صوبائی شوریٰ میں طے کیا گیا اور یہ بندہ گناہگار بھی شامل جُرم تھا کہ ایک پوسٹر اور سندھ کے مسائل پر ایک کتابچہ شائع کیا جائے جن میں جائز مسائل کو اپنے پلیٹ فارم سے پیش کرنا مقصود تھا۔ وہی باتیں تھیں جو آج کل آپ ہی کی زبانوں سے سن رہے ہیں۔ اور آپ نے بھی لکھا ہیں:۔

۱۔ سندھ کی زمینوں پر سندھیوں کا حق تسلیم کیا جائے۔

۲۔ ریٹائرڈ فوجیوں سے زمین واپس لی جائے۔ ۳۔ خواتین یونیورسٹی کا قیام

۴۔ چھوٹے ڈیمی سائل کا خاتمہ ۵۔ سندھی زبان کو صوبائی زبان قرار دینا۔

۶۔ کیڈٹ کالج کا قیام (جو منظور ہو گیا)۔ ۷۔ سکھر میں انٹر بورڈ کا قیام (جو منظور ہو گیا)۔

۸۔ انسٹی ٹیوٹ آف لطیف کا اجراء (جو منظور ہو چکا ہے)

۹۔ کراچی ٹی وی سے بامقصد سندھی پروگرام

اور کچھ دوسرے مسائل بھی۔ بڑی بحث تمحیص ہوئی۔ ہم نے وہاں پر اکثریت سے یہ باتیں منظور کروائیں۔ ان کو دلائل سے قائل کیا۔ پلاننگ کر کے پورے سندھ میں پوسٹر لگانا شروع کیا لیکن مہاجروں نے تعاون نہ کیا، پوسٹر بھی نہیں لگائے۔ سندھی بے وقوف جن میں ہم بھی شامل تھے۔ جامعہ سندھ میں پوسٹر لگا آئے۔

اس پر قوم پرستوں نے بیانات دیئے کہ یہ دُوغلی پالیسی ہے (جیئے سندھ فیڈریشن کا بیان)۔ جمعیت کے مہاجر اور پنجابی آبادکاروں نے تردید کی کہ اس پوسٹر کا جمعیت سے کوئی واسطہ نہیں (حیدرآباد جمعیت کا بیان)۔ تمام پنجابی لڑکے جمعیت سے نکل گئے اور نیو سندھی سٹوڈنٹ آرگنائزیشن میں شامل ہو گئے جس کا سیکریٹری جنرل پرویز اقبال (مورو) میں امیدوارِ رکنیت تھا۔ ان لوگوں نے (حیدرآباد کے مہاجر ارکانِ جمعیت) حیدرآباد شہر حتیٰ کہ صوبہ سندھ کے دفتر تک سے پوسٹر اپنے ہاتھوں سے پھاڑے اور ہم سب پر جیئے سندھ کا حمایتی ہونے کا الزام لگایا۔

ایک بار پھر فوری طور پر سندھ کے ناظم کو جو سندھی تھے تبدیل کر کے ایک مہاجر کو ناظم صوبہ بنایا گیا۔ اس

درج ایک طرف ان کی جمعیت بنج گئی اور دوسری طرف قوم پرستوں نے خوشی کا جشن منایا اور پروپگنڈا کیا کہ مہاجر سندھیوں کو استعمال کر رہے ہیں۔

پھر ہم نے اپنے ہاتھوں سے اُن پوسٹروں کو جلایا اور آنسو بہائے اور ان لوگوں سے ہمیشہ کیلئے ناطہ توڑ لیا۔ پھر ٥. یو. یو. کا نے حیدرآباد جمعیت کے کارکن کو ہلاک کیا اور آئے دن کراچی میں اُن کو تنگ کر رہی ہے۔

آج صورتِ حال یہ ہے کہ صوبہ سندھ میں سندھی زبان بولنے والا اُن کو ناظم صوبہ نہیں مل رہا۔ اگر کوئی سندھی بنایا جاتا ہے تو اس کی زبان قوم پرستوں سے زیادہ مِلتی جُلتی ہے۔ اگر کچھ اُنگلیوں پر گِنے جانے والے لڑکے ہیں تو صرف والدین کی وجہ سے۔ ورنہ اُن کے دل و دماغ بھی سندھی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب! یہ ہے ہماری داستان ـــــ آج تک میرے دل میں ایک طوفان چھپا ہوا تھا۔ وہ آپ کے سامنے بیان کر دیا ہے۔ آپ غور کریں اگر آج صوبائی اجتماع میں آنے والے وہ تین ہزار سندھی نوجوان بھی اِس تحریک کے ساتھ ہوتے تو وہ صورتِ حال نہ ہوتی جو آپ نے بیان کی ہے۔ اگر ان مسائل کو ہم اپنے پلیٹ فارم سے بیان کرتے تو آج ہمیں آنسو نہ بہانے پڑتے۔ آج آپ دن میں بھی چراغ لے کر ان افراد کو ڈھونڈیں گے تو کوئی آپ کو نہ ملے گا۔ کوئی اس ملک کے تحفظ کے لئے تیار نہ ہوگا

آج مجھے ایک بات یاد آئی ہے کہ اسی پوسٹر "گناہ" پر سندھ میں سے ریٹائرڈ فوجیوں سے زمین واپس لینے پر" ان کے بڑے لیڈر سے بڑی گرما گرم ہوئی۔ بات فتوٰی تک جا رہی تھی۔ لیکن چند ماہ پہلے تحریکِ اسلامی پاکستان کے امیر نے مطالبہ کیا کہ غیر سندھی زمینیں خالی کر دیں۔ اس پر ہمارے ایک ساتھی نے کہا کہ ابھی بات کنفیڈریشن تک پہنچی ہے اس میں بھی بھلا ہے۔ خدانخواستہ کل "سندھو دیش" تک مسئلہ پہنچا تو آپ کنفیڈریشن پر آمادہ ہو جائیں گے۔ آج ہی کچھ نہ کچھ پلاننگ کریں لیکن خوش فہمیاں زیادہ ہیں۔ اب تو ہمارے پرانے ساتھی پچھتایا کرتے ہیں کہ نہ دنیا کے رہے نہ آخرت ہی ملی۔

آپ کو تو معلوم ہوگا جب لوگ تعلیم ختم کر کے عملی زندگی میں روزگار کے لئے نکلتے ہیں تو کیا حال ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کو تو یہ سزا اس لئے مل رہی ہے کہ ہم نے اسلام اور پاکستان کے لئے سندھ میں کیوں کام کیا۔ جو لوگ پاکستان کو ختم کرنے کے لئے کام کرتے ہیں ان کو اچھی سی اچھی نوکریاں ملتی ہیں۔ پی پی پی کے لوگوں کو بلا مشکل ملتی ہیں۔ وڈیروں مسلم لیگیوں کے نوجوانوں کو اپنی پسند کی نوکریوں کی پیش کش ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے لئے تو انہوں نے بھی دروازہ بند کر رکھا ہے۔ اگر نوکری کی بات کریں تو غصہ سے لاحول پڑھتے ہیں اور سفارش کی لعنت پر حدیثیں سُناتے ہیں۔

لیکن ڈاکٹر صاحب! ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جماعت اسلامی سندھ کی ایک اہم شخصیت کے داماد جو طالب علمی کے زمانے میں جئے سندھ کے ساتھ تھے اور اخلاقی لحاظ سے بھی پست تھے۔ اُن کو گورنر کے ذریعہ پی آئی اے

پاک سٹیل اور واٹر سیوریج میں نوکریاں دلائی گئیں جو مار کھاتے رہے وہ آج بھی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ جب پانچ سال قبل انہیں بتایا کہ آپ کے فلاں بھتیجے مخالفوں کے کیمپ میں ہیں تو حضرت فرماتے تھے کہ حضرت نوح کی اولاد اور حضرت ابوبکر صدیق کے بیٹوں کی مثال دیکھئے اور پڑھئے

ہم نے بھی اپنے کم عقلی کے دور میں، اپنے دوست، رشتہ دار، سب دشمن بنا ڈالے - اب وہ جہاں بھی دیکھتے ہیں طنزیہ مسکراہٹ سے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں دنیا اور آخرت کی بھلائی کہاں گئی!

عبدالغفار ایڈوکیٹ، راولپنڈی

علماء کرام میدانِ عمل میں آئیں

سہراب گوٹھ کراچی کے آپریشن کا میں بذاتِ خود چشم دید گواہ ہوں۔ اسلحہ اور منشیات کے لاتعداد ٹرک آپریشن سے پیشتر ہی وہاں سے نکال لیے گئے تھے۔ اور تمام ناجائز سامان کراچی کے "ڈالا ایریا" (ڈیفنس) میں منتقل کر دیا گیا اپنے اصل مالکوں کے پاس۔ تھوڑا بہت دکھاوے کا آپریشن ضرور ہوا۔ مگر گورنر سندھ کی کوئٹہ سے واپسی کے بعد آپریشن ایک یا دو عدد پستول وغیرہ تک ہی محدود رہا۔ مقامی اخباروں میں بھی اشارتاً بھی کچھ خبریں آپ نے پڑھی ہوں گی۔

خدارا آپ لوگوں (علماء کرام) کو میدان عمل میں کود جانا چاہیئے۔ اب بھی وقت ہے۔ اور وقت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اس مصیبت کی ماری قوم کو متحدہ Lead دیں۔ اگر اس ملک کو بچانا ہے۔ ورنہ روس، بھارت اور امریکہ بھی اس نعمتِ خداوندی کو ہم سے چھین لینے کے درپے ہیں۔ سلامٌ علیٰ من اتبع الھدیٰ۔ والسلام

دعاگو، محمد علی رضوی ایم بی بی ایس

کراچی کے فسادات - ایک جائزہ ایک تجزیہ

انتظامیہ کی طرف سے یہ باور کرانا کہ ہم بے بس ہیں اس لئے کہ تمام نفری سرحدوں پر ہے لہٰذا دفاع کے لئے انتظامیہ پر زیادہ بھروسہ نہ کیا جائے اور اپنا انتظام خود کریں۔ اس چیز کا عملی مشاہدہ میری آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سُنا اور ہمارے محلہ میں ایک میجر صاحب اپنی جیپ پر آئے۔ اس سے آدھ گھنٹہ پہلے یہاں زبردست فائرنگ وغیرہ ہوئی تھی۔ لہٰذا میجر صاحب نے کہا کہ بھئی ہم تو سڑکوں پر نمٹ لیں گے لیکن تم لوگ گلیوں میں تو خود ہی نمٹ لو۔ لوگوں نے کہا کہ جی ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے تو انہوں نے اپنی مثال دی کہ میرے ذاتی مصرف میں تین پستول ہیں تم لوگ رنگین ٹی وی اور وی سی آر رکھ سکتے ہو لیکن ...
...... اس قسم کے تجربات کے بعد پورے کراچی میں عدم تحفظ کا احساس پوری قوت کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا ہے جس کے گواہ یہاں کے پریس والے بھی ہیں۔ یہاں خون کی ہولی کھیلی گئی جبکہ لوگ اپنے

اپنے کام پر جا چکے تھے لہٰذا ایجنٹوں کی ایما پر بربریت کا بازار اچانک گرم ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے لاتعداد لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ بے نظیر کے مطابق ۵۹۵ اور حقوقی صاحب کے بیان کے مطابق ۷۰۰ سے اوپر اموات ہوئی ہیں

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ فسادی خون ریزی کر رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ اب تمہارے لیے ۴ بجے تک کوئی نہیں آئے گا اور ساتھ میں یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ اب دو گھنٹے رہ گئے ہیں۔ اب ایک گھنٹہ رہ گیا ہے۔ اس چیز کا ذکر یہاں پریس میں آچکا ہے اور سیاسی جماعتوں کے نوٹس میں بھی ہے خود بے نظیر نے اپنے اس علاقے کے دورے کے بعد بیان میں ان واقعات کا ذکر کیا ہے۔

حالات کے اس پس منظر میں اب شدید تصادم کے امکانات کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس کے نتیجے میں صوبہ سرحد میں بے چینی اور شدید ردعمل کے امکانات مزید بڑھ جائیں گے۔ اور اس طرح پورا پاکستان خدانہ کرے خدانہ کرے جذبات کی اس تیز و تند سرخ آندھی کی لپیٹ میں نہ آجائے۔ دشمنانِ پاکستان کے خواب انتہائی معمولی کوشش سے تیزی سے کامیابی کے منازل طے کرتے جائیں گے

سامراجی ٹولہ کی پوری کوشش ہوگی کہ کراچی کے اوپر کاری ضرب لگا کر قومیتوں کو آپس میں ٹکراؤ اور سب سے بڑھ کر ملک کے سب سے بڑے صنعتی اور تجارتی مرکز کو جہاں تقریباً ملک کی ۵۰ ٪ سے ۶۰ ٪ صنعتیں ہیں اور درآمد و برآمد تو ۱۰۰ ٪ یہیں سے ہوتی ہے اس طرح ملک کی معیشت کو تباہ و برباد کر دینا دشمن کا ہدفِ اوّل ہوگا۔

دشمن کون ہے۔ آیا ان سرگرمیوں کے پیچھے سندھو دیش تحریک کا ہاتھ کار فرما ہے یا غفار خان یا ولی خان یا کوئی انتہا پسند مذہبی گروہ؟

موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر پورے پاکستان میں عام طور پر اور کراچی اور سندھ میں خاص کر اب کسی بڑی سازش سے پہلے ضروری ہے کہ اس درمیانی مدت میں بھرپور انداز میں پاکستان کی بقا اور استحکام کے لئے کام کیا جائے۔ لوگ اب زبانی جمع خرچ سے انتہائی متنفر اور بدظن ہو گئے ہیں۔ اس کشمکش کے نتیجے میں مختلف طبقاتی تضادات ابھر کر سامنے آئے ہیں اور سب کی دلیلیں اپنی جگہ درست ہی ہیں۔

ایک طبقہ کہتا ہے کہ مذہب کو تمام سیاسی جماعتیں اور سرکاری مشنری اپنی تقویت اور استحکام کے لیے استعمال کر رہی ہیں اور مسلسل کرتی چلی آرہی ہیں جس میں قرآن اور احادیث کے حوالے سے ہماری حق باتوں کو دبایا جا رہا ہے جب کہ درپردہ یہی اصل قوتیں ہیں جو اپنے ناجائز مفادات کے دوام کے لئے اسلام کو صرف نعرے کے طور پر استعمال کر رہی ہیں جس کا مظاہرہ پچھلے دنوں خود کراچی ٹی وی کے پروگراموں میں ہوا کہ اخوت و بھائی چارے کے لیے قرآن اور حدیث کا حوالہ ایک ایسے شخص نے دیا جو

کہ خود بھی بدنام زمانہ منشیات فروش سیف اللہ خان کے ایجنٹ کے طور پر کراچی میں پہچانے جاتے ہیں۔ جن کے ٹرک سرحد سے کراچی آتے ہوئے منشیات کے الزام میں پکڑے گئے تھے۔ وہ ہیں جناب مروت خان صاحب کراچی سے قومی اسمبلی کے رکن اور جس دن ٹی وی پر موصوف آئے ہیں اس دن تو وہ ایک وفاقی وزیر کی حیثیت سے آئے تھے۔ بعد میں جونیجو صاحب نے انہیں کابینہ کی تشکیل نو کے دوران ڈراپ کر دیا۔

اس طرح سیاسی پارٹیاں جو کہ دینی جماعت کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں ان کے بارے میں بھی اس طبقے کے خیالات اب وسیع پیمانے پر عام ہوتے جا رہے ہیں کہ اسلام کے حوالے سے یہ مذہبی لوگ صرف ہمیں جھوٹی تسلیاں دے رہے ہیں۔ اصل میں ان کے پاس بھی ہمارے مسائل کا کوئی حل موجود نہیں ہے یہ محض اپنی سیاسی دکانیں چمکانے کے لئے سارا کھیل کھیل رہے ہیں اور ہمارے لئے تو صرف مگرمچھ کے آنسو بہا رہے ہیں۔

اگر ان مذہبی جماعتوں کو (خاص کر جماعت اسلامی بہت زیادہ تنقید کی زد میں ہے) ہم سے ہمدردی ہے تو قومی سطح پر افہام و تفہیم (Dialogue) کے لئے آمادہ کیوں نہیں ہوتے اور سرکاری مشینری کو مسائل کے حل کی طرف کیوں متوجہ نہیں کرتی۔ خاص کر اس معاملے میں کہ کراچی اور سندھ کی لوکل انتظامیہ میں بھی عظیم اکثریت ہمارے پنجابی بھائیوں کی ہے۔ تمام اداروں میں چاہے وہ کے ڈی اے ہو، کے ایم سی ہو، پولیس ہو، غالب اکثریت پنجاب کے لوگوں کی ہے جبکہ دوسری طرف ان کے پاس یہ دلیل بہت وزنی ہے کہ خود پنجاب میں تمام اداروں میں اور خاص کر لوکل انتظامیہ میں تو ۱۰۰ پنجابی ہی ہیں۔ دوسرے صوبوں میں بھی اس کے اثرات ہیں۔ ان تمام باتوں کو مزید تقویت یوں ملتی ہے کہ ان ہنگاموں کے دنوں میں کہ جہاں آگ و خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی وہاں پولیس سرے سے ہی غائب تھی۔ جبکہ ضیاء صاحب یا جونیجو صاحب کی کراچی آمد پر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ملک پولیس سٹیٹ ہے۔ عوام الناس سے زیادہ پولیس والے نظر آتے ہیں۔ لہٰذا فطری طور پر لوگوں کے ذہن میں یہ ایک انتہائی چونکا دینے والا سوال ہے اور لوگوں کی زبان تو نہیں روکی جا سکتی۔ لوگ یہاں تک کہتے ہیں کہ پولیس اس لئے غائب ہو گئی تھی کہ بھئی یہ تو پٹھان اور مہاجروں کی لڑائی ہے ہم کیوں بیچ میں پڑیں۔ لہٰذا انتظامیہ نے تو خود اس بات کا ثبوت دے دیا کہ لوگ جو کہتے ہیں صحیح کہتے ہیں کہ یہاں پولیس کے محکمے میں غالب اکثریت یہاں کے ٪۷۵ کی ہونی چاہیئے۔

اہل پنجاب نے اپنے آپ کو اس معاملے سے علیحدہ رکھا لیکن کب تک وہ علیحدہ رہ سکتے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لئے علی گڑھ کالونی میں ملے جلے لوگ رہتے ہیں بلکہ اس علاقے میں بہاری بہت کم ہیں ۲ اس میں پنجابی بھی ہیں تو بلوچی بھی ہیں اور پنجاب کے لوگ بھی اس واردات کا شکار ہوئے ہیں۔

اہلِ پنجاب ۰۰/۷ فیصد میرے اندازے کے مطابق MQM سے متنفر ہیں۔ اور شاید میں بھی لیکن پس منظر میں MQM کے مطالبات اپنی جگہ درست ہیں۔ ان کے ساتھ دلیل کے ذریعے اور کچھ آنکھیں کھول کے مذاکرات کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ طاقت کا مظاہرہ صحیح نہیں ہوگا۔ میں پھر کہوں گا کہ مہاجر طبقہ کے اکثر لوگ MQM سے نظریاتی وابستگی اختیار نہ کریں لیکن حقوق کے لئے جو باتیں کہی جارہی ہیں اور مطالبات کئے جارہے ہیں وہ واقعی درست ہیں۔ MQM کوئی قومیت کی تحریک ہرگز نہیں بن سکتی لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اہلِ پنجاب اس معاملے کو انتہائی سنجیدگی سے طے کریں ورنہ پاکستان کی بگڑتی ہوئی صورتحال میں مخلص مہاجرین کی غالب اکثریت اپنا کردار ادا کرنے سے قاصر بھی ہوسکتی ہے (واللہ اعلم)

حوصلہ افزاء بات اور دوسرا طبقہ

اس شر کے پیچھے ایک چیز بڑی شدت سے محسوس کی گئی کہ پاکستان کے استحکام اور بقا کے لئے صرف اسلام ہی سے مداوا ہوسکتا ہے اور تمام لوگوں نے چاہے وہ باعمل ہوں یا بے عمل۔ اس چیز کا اعتراف کیا کہ پاکستان کی اساس صرف اور صرف اسلام ہے اور اسلام بھی خالی خولی نہیں بلکہ حقیقی اسلام جس میں تمام جملہ مسائل کا حل موجود ہو خاص کر اقتصادی نظام پر لوگ چاہتے ہیں کہ کھل کر بحث ہو اور اسلام کے حوالے سے اقتصادی۔ سیاسی۔ سماجی مسائل کا حل دریافت کیا جائے۔ یہاں تک لوگوں سے سنا گیا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ کاش کوئی خمینی پاکستان میں پیدا ہوجائے۔ ۲۰ علماء سے میری گفتگو ہوئی وہ سو فی صد آپ سے متفق ہیں۔ اسی طرح جماعتِ اسلامی کے ایک نوجوان دوست کا کہنا ہے کہ اب ہم جانتے ہیں کہ اسلام الیکشن سے نہیں آئے گا لیکن ہم نے کیمونزم کا راستہ تو روکا ہوا ہے۔

دینی نقطۂ نظر سے ایسے لوگ بھی دیکھے گئے جو کہ ہمدردیاں تو ضرور کسی نہ کسی فریق سے رکھتے ہیں لیکن ان لوگوں کو اپنی دھینگا مشتیوں سے فرصت نہیں۔ ایک طرف آگ اور خون کی ہولی تھی تو دوسری طرف میں نے دیکھا اور اہلِ کراچی نے بھی دیکھا۔ پریس والوں نے دیکھا کہ جس طرح کرفیو کے وقفے میں لوگ دال دلیا اور اناج کی تلاش میں نکلے تھے اسی طرح وی سی آر اور وڈیو کیسٹ کی تلاش میں بھی نکلے۔ محلے محلے میں تمام وڈیو سنٹرز پر رش تھا۔ کیسٹ بلیک ہورہے تھے۔ تمام سڑکوں پر گلیوں کی اندرونی سڑکیں نوجوانوں کے لئے کرکٹ کا میدان بنے ہوئے تھے۔

ہاں ایک مثبت بات بھی بتاتا چلوں وہ یہ کہ تبلیغی جماعت والے بھائیوں کی طرف سے گشت کا سلسلہ بھی جاری رہا اور چالیس چالیس دنوں کے لئے مساجد میں جاگنے کی دعوت بھی عام رہی۔ مساجد میں خصوصی دعاؤں اور سورۃ یٰسین کے ورد کا اہتمام بھی کیا گیا۔

چند تجاویز

یہ تو طے شدہ حقیقت ہے کہ تمام فساد کی جڑ پیٹ ہے۔ یہ چیز اب عام لوگوں کے سامنے کھل کر آگئی ہے جب اسلام کے حوالے سے باتیں ہو رہی ہیں تو لوگ پوچھتے ہیں کہ ان کے مسائل کے حل کے لئے یا دولت کی مساویانہ تقسیم یا عدل و قسط کے لئے اسلام میں کیا حل ہے؟ مگر اس سلسلے میں علماء کی طرف سے بالکل سرد مہری کی وجہ سے یہ تاثر بھی عام ہو رہا ہے کہ وہاں بھی کوئی حل نہیں ہے۔ اور یہ استحصالی قوتیں اسی طرح سے لوٹتی کھسوٹتی رہیں گی۔ لامحالہ ایسے میں کمیونسٹوں کو تقویت ملے گی اور وہ اپنے لئے یہاں تقریباً سمجھ رہے ہیں کہ میدان ہموار ہو رہا ہے۔ لہٰذا گذارش ہے کہ دینی حلقے اس طرف مثبت پیش قدمی کریں اور اسلام کے عادلانہ معاشی اور سیاسی نظام پہ انقلابی نہج سے بات کی جائے اور بہت سی مشکل باتیں جو کہ مصلحت کے تحت عوام تک نہیں لائی گئی ہیں وہ انتہائی مدبرانہ انداز میں پیش کی جائیں۔

اس لئے کہ خود سیاسی پارٹیاں سمجھ رہی ہیں کہ اب عوام مایوس ہو گئے ہیں جناب جتوئی صاحب کہتے ہیں کہ میں پریشان ہوں کہ پاکستان کا کیا بنے گا لوگ اب مسائل کے حل کے لئے [illegible] بی تبدیلی چاہتے ہیں۔ انہوں نے بھی اعتراف کیا ہے کہ عوام اب مسائل کے حل کے لئے نظام کی [illegible] چاہتے ہیں۔

اسی طرح ایک ہفتہ قبل نواب زادہ نصر اللہ خاں صاحب نے بھی ایک بیان کہا ہے کہ نظام کی تبدیلی ناگزیر ہے۔

اس طرح تمام سیاسی پارٹیاں کسی نہ کسی طرح سمجھ چکی ہیں کہ نظام کی تبدیلی ناگزیر ہے لہٰذا میری گذارش ہے کہ اسلام کے کامل نظام عدل و قسط کو پوری طرح سے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور اس کے بھی معاشی پہلو کو بھرپور انداز میں عیاں کرنے کی جتنی شدید ضرورت آج ہے شاید پہلے کبھی نہ تھی

میرا دل کہتا ہے کہ اب مزید تاخیر کسی مصلحت کی وجہ سے نہ کی جائے ورنہ بقول آپ کے جب ہوش آئے تو معلوم ہوگا کہ بہت سا پانی دریائے سندھ میں بہ گیا یعنی "اب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔"

کہیں یہ نہ ہو کہ ہم حق بات اس لئے نہ کہیں کہ اس کا فائدہ کمیونسٹوں کو ہوگا اور فرض کریں معاشی میدان میں پہل کمیونسٹ کر گئے تو کیا بنے گا؟ شاید کہ اب وقت آگیا ہے جو جتنا محتاط اور ہوشیار ہوگا بازی مار جائیگا۔

(واللہ اعلم)

پنجاب سے متعلق نئے خدشات

جہاں بھارت میں آزاد خالصتان کی تحریک زور پکڑ رہی ہے وہیں ردِ عمل میں ہندوازم کی لہر بھی شدت سے زور پکڑتی جا رہی ہے جس کا اظہار خود آپ نے بھی کر ہی دیا۔ بھارت عظیم ترین اکھنڈ بھارت کے خواب کی تکمیل

کے لیے خدا نہ کرے خدانہ کرے سکھوں کے ساتھ کوئی بھی سودے بازی کر سکتا ہے یعنی پاکستان کی قیمت پر ایسے شاید پنجاب میں اس چیز کو بعید از قیاس سمجھا جائے لیکن دشمن نے تمام نقشے بنائے ہوئے ہیں اور اس کی تکمیل کی طرف پیش قدمی بھی شروع ہو چکی ہے۔ خواہ وہ آزاد پختونستان ہو۔ آزاد بلوچستان ہو یا سندھو دیش ہو لیکن سب سے زیادہ دشمن پنجاب کو نشانہ بنائے گا۔ ۸۰ کروڑ کی آبادی والے ملک کو آبادی کا تبادلہ کرتے دیر نہیں لگتی کیا بھارت نے اکثریتی مسلم صوبوں میں اس طرح نہیں کیا۔ کشمیر میں نہیں کیا۔ خالصتان کے لیے بھارت پاکستانی پنجاب کی طرف بھی اشارہ کر چکا ہے۔ اس لیے کہ سکھوں کے بہت سے مذہبی مقامات پنجاب میں ہیں۔ اللہ نہ کرے ایسا ہو سکے ہماری بچت صرف اس وقت ہوگی جب ہم تمام معاملات کو کھلے دلوں سے قبول کریں گے

دعا ہے کہ اللہ تعالے تمام پاکستانیوں کو خواہ وہ کسی صوبہ سے تعلق رکھتے ہوں مشترکہ طور پر توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ جاگیردار، سرمایہ دار خود ہی اسلام کے نظام کی طرف پیش قدمی شروع کر دیں تو بہتر ہے ورنہ آنے والا نظام ان کے پاس کچھ نہ چھوڑے گا۔ اللہ تعالے تمام طبقات کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین اور مثبت اسلامی انقلاب کی طرف بھرپور پیش قدمی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

——— ٥ تسنیم احمد

حقوق کی جنگ میں اسلام کو بیچ میں نہ لائیں

چند مہینے قبل آپ نے سندھ کی صورت حال پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں خصوصیت کے ساتھ مہاجروں پر کڑی تنقید کی تھی۔ آپ کے تجزیہ کی درستگی یا عدم درستگی سے قطع نظر فی الحال سندھ میں جو صورتحال رونما ہوئی ہے کے متعلق حتی الامکان صحیح اطلاعات ارسال کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ اگر آپ اس سلسلے میں کوئی تجزیہ فرمائیں تو کسی افراط و تفریط کا شکار نہ ہوں۔ اور یوں بھی آپ جس عظیم مقصد کو لے کر چل رہے ہیں، اس کے حصول کے لیے ضروری ہو کہ حق ہی کہا جائے اور حق ہی سنا اور مانا جائے۔ خواہ یہ کسی اکثریت ہی کو برا کیوں نہ لگے۔

میں سندھ کے پیش منظر یا پس منظر یا اس کے بارے میں کسی تعارفی تمہید میں وقت ضائع کئے بغیر اپنی بات شروع کرتا ہوں۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے سندھ میں بسنے والے سندھی اور مہاجروں کی آبادی تقریباً برابر ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پنجابی بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں جو نہ صرف سندھ کی زرعی زمینوں بلکہ صنعت و تجارت اور سرکاری و نیم سرکاری محکموں بلکہ تعلیمی اور نجی کارخانوں و دکانوں میں موجود ہیں اس کے علاوہ پٹھان حضرات اور افغان پناہ گیر بھی خاصی بڑی تعداد میں یہاں آباد ہو چکے ہیں۔ اوّل الذکر کی بڑی تعداد

ٹرانسپورٹ اور تجارت سے منسلک ہے۔ جبکہ آخر الذکر۔ مجاہدین۔ اسلحہ اور منشیات کی انتہائی کامیاب تجارت

کر رہے ہیں۔ جیسا کہ آپ کے علم ہوگا سندھ میں کوٹہ سسٹم رائج ہے جس کے مطابق تعلیم اور نوکریوں میں علاقے

کی بنیادوں پر سیٹوں کی تقسیم ہوتی ہے۔ چنانچہ سندھ میں آباد مہاجرین جن کی آبادی کا نوّے فی صد کراچی،

حیدرآباد اور سکھر میں آباد ہیں کا کوٹہ صرف دو فیصد ہے۔ آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن

کے اجداد نے نہرو کے ۲۳ فیصد کوٹے کو لات ماری تھی۔ چنانچہ دو فیصد کی خیرات کا کرشمہ یہ ہے کہ ایک مہاجر

طالب علم جو ۶۵ فی صد نمبر لاتا ہے داخلے سے محروم رہتا ہے جبکہ دیہی کوٹہ کی بنیاد پر سندھی یا پنجابی طالب علم محض

۵۱ فیصد حاصل کر کے داخلہ حاصل کر لیتا ہے۔ واضح رہے کہ سندھ میں آباد پنجابیوں کا اسّی فی صد سندھ دیہی کا ڈومی سائل رکھتا

ہے۔ چنانچہ پی آئی اے، پاکستان شپنگ کارپوریشن، پاکستان اسٹیل ملز، پاکستان آرمی، کے ای ایس سی

اور واپڈا جیسے عظیم قومی اداروں کے سوا سندھ کا وہ کونسا صوبائی محکمہ ہے جس میں پنجابی عام عہدوں پر ہی

نہیں اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز نہ ہو۔

غرض یہ کہ سندھ دھرتی پر بسنے والے مہاجر شدید ترین استحصال کا شکار ہو رہے ہیں۔ ایسے میں

آج سے نو سال پہلے کراچی یونیورسٹی کے ایک طالب علم الطاف حسین نے مہاجر حقوق کے لئے آواز اٹھائی تو

نام نہاد اسلامی جماعتوں نے غاصب پنجابیوں سے مل کر ہر طرف پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ الطاف حسین روسی

ایجنٹ ہے، اسے کمیونسٹ بلاک سے ایڈ ملتی ہے حتیٰ کہ الطاف کی قائم کردہ آل پاکستان مہاجر اسٹوڈنٹ آرگنائزیشن

پر نام نہاد اسلامی جمعیتِ طلبہ نے جولائی ۱۹۷۸ء سے جون ۱۹۸۱ء تک ایک سو بائیس حملے کئے جس میں مہاجر

اسٹال پر عورتوں تک پر ہاتھ اٹھایا گیا اور پیسے چھینے گئے لیکن مہاجروں نے الطاف کی آواز پر یہی محسوس کیا کہ

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

چنانچہ الطاف کی قیادت میں اس اسٹوڈنٹ آرگنائزیشن نے ایک عوامی تحریک کی شکل اختیار کر لی اور اس

تحریک کا نام مہاجر قومی موومنٹ (MQM) ہو گیا۔ الطاف نے کبھی کسی دوسری قوم کے حقوق غصب کرنے کی

بات نہیں کی۔ البتہ وہ اپنے حقوق طلب کرتا ہے اور یہ بات ان لوگوں کو کہ جن کے یہاں مفادات وابستہ ہیں

کیسے گوارا ہو سکتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے عیاری و سازش کے ذریعے اسے ملک دشمن، اسلام دشمن اور فرقہ پرست

مشہور کر دیا در آنحالیکہ وہ آج تک کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکے ورنہ آخر یہاں کی عدالتیں کس لئے ہیں؟

چند مہینے قبل MQM کا ایک فقید المثال اجتماع نشتر پارک کراچی میں منعقد ہوا جس میں شدید بارش اور انتہائی

ناسازگار موسم کے باوجود بے تحاشا حاضری اور انتہائی نظم و ضبط تھا۔ اس سے مہاجر دشمن استحصالی طاقتیں گھبرا گئیں

اور MQM اور الطاف کے خلاف انتہائی منظم طریقے سے پروپیگنڈے کی مہم کا آغاز ہوا۔ چنانچہ بڑے بڑے اسلامی

دعوے داروں نے جنہیں خدمتِ اسلام کے لمبے لمبے معاوضے ملتے ہیں یہ کہنا شروع کیا کہ الطاف ملحد و دہریہ ہے

کمیونسٹ ہے اسے روس سے امداد ملتی ہے لیکن جب ان بزرگوں کی خدمت میں دست بستہ ثبوت کی فراہمی کی گذارش کی گئی تو کبھی جواب میں محض مسکراہٹ ملی اور کبھی غیض و غضب۔ قصہ مختصر ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو مہاجر آبادی کے دوسرے بڑے شہر حیدر آباد میں MQM کا کنونشن طے ہوا جس کی حکومت سے باقاعدہ اجازت لی گئی۔ جیسا کہ آپ کے علم ہوگا کہ اس جلسے سے تقریباً ایک ہفتہ قبل لانڈھی ریلوے کراسنگ پر ہونے والے حادثے کی وجہ سے مہاجروں اور پٹھانوں میں شدید کشیدگی پائی جاتی تھی اور سہراب گوٹھ (جو کہ منشیات کی بین الاقوامی مارکیٹ اور اسلحہ کے ہول سیلرز کا ڈپو ہے، میں پٹھانوں کی آبادی ہے) سپر ہائی وے پر واقع ہے اور کراچی سے حیدر آباد براستہ سپر ہائی وے جانے کے لئے یہاں سے گذرنا لازمی ہے۔ MQM کے کراچی کے لوگوں کو حیدر آباد کنونشن میں شرکت کے لئے حیدر آباد جانا تھا چنانچہ مہاجر لیڈروں، سہراب گوٹھ کے 'معززین'، اور کمشنر و انتظامیہ کراچی کے درمیان ایک میٹنگ جلسے سے ایک روز پہلے ہوئی جس میں پٹھانوں نے یہ یقین دہانی کروائی کہ جلوس کو پرامن طریقے سے گذرنے دیا جائے گا۔ چنانچہ اخبارات میں اس کی خبروں کے ساتھ ساتھ مہاجر لیڈروں کے بیانات شائع ہوئے جس میں انہوں نے مہاجر عوام سے اپیل کی تھی کہ جلوس جب سہراب گوٹھ سے گذرے تو نعرہ بازی سے گریز کیا جائے۔

چنانچہ ۳۱ اکتوبر ۱۲ بجے دن کے اخباری اطلاعات کے مطابق ۲۵۰ بسوں کا قافلہ کراچی سے حیدر آباد روانہ ہوا۔ کمشنر کراچی کے اخباری بیان کے مطابق تقریباً تمام بسیں پرامن طریقے سے گذر گئیں لیکن آخری تین بسوں پر سہراب گوٹھ سے فائرنگ کی گئی جس سے چھ مہاجر کارکن ہلاک اور کئی شدید زخمی ہو گئے۔ چنانچہ جب یہ پرامن جلوس حیدر آباد پہنچا تو مارکیٹ کے علاقے میں واقع آزاد ہمند ہوٹل سے ایک بس پر کلاشنکوفوں سے فائرنگ کی گئی جس سے چار کارکن موقع پر ہی ہلاک اور کئی زخمی ہو گئے۔ حیدر آباد میں یہ واردات دو بجکر بیس منٹ پر ہوئی۔ یہ ہوٹل جلسہ گاہ سے تقریباً تین کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔

چنانچہ جلسہ بعد از نماز جمعہ تقریباً ۲ بجے شروع ہوا۔ اس جلسے میں پورے سندھ سے 'اخباری اطلاعات' کے مطابق پانچ لاکھ افراد نے شرکت کی جس میں شرکاء کی نوے فی صد تعداد نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ ہزاروں شرکاء جدید ترین اسلحہ سے لیس تھے جس میں اسٹین گنیں، کلاشنکوفیں، کاربائین، ریوالور، پستولیں، بندوقیں، تلواریں، خنجر، چاقو اور قسم قسم کے اسلحہ جات کی کھلے عام نمائش ہو رہی تھی جکومت کے مطابق اسلحہ لائسنس یافتہ تھا جبکہ میری ناچیز رائے کے مطابق بہت بڑی تعداد غیر لائسنس یافتہ اسلحہ کی تھی۔ آپ کے علم میں یقیناً یہ بات ہوگی کہ سندھ کے جلسوں میں خواہ یہ سیاسی جماعتوں کے ہوں یا مذہبی جماعتوں یعنی جماعت اسلامی، جمعیۃ علماء اسلام و پاکستان وغیرہ کے جلسوں کے دوران نہ جانے کیوں فائرنگ ضرور کی جاتی ہے ــــ شاید خوشی کے اظہار یا طاقت کے مظاہرے کے لئے۔ اس قدر تفصیل کا حاصل صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ MQM کو بلا ثبوت 'علاقائیت پرست اور ملک دشمن' کہنے والے اس بات کا کیا جواب دیں گے کہ دن کے بارہ بجے سہراب گوٹھ پر اور دو بجکر بیس منٹ پر جلسہ گاہ سے صرف تین کلو میٹر دور مارکیٹ پر شدید ترین زخم کھانے والے MQM کے نوجوان کارکن جو کہ اسلحہ سے لیس تھے اس قدر

تحمل کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ پورے جلسے میں ایک نعرہ کسی قومیت یا قوم و ملک کے خلاف نہیں لگایا جاتا حتیٰ کہ کسی تقریر میں کوئی جذباتیت اور فتنہ و فساد کی سیاست نظر نہیں آتی (میرے دعوے کا ثبوت اس جلسے کا کیسٹ ہے جو MQM کے کسی بھی دفتر یا کارکن سے حاصل کیا جا سکتا ہے) اور بلا مبالغہ حیدرآباد کا سب سے بڑا مجمع الطاف حسین اور دیگر رہنماؤں کی تقاریر کو انتہائی انہماک سے سنتا رہا۔ اس موقع پر الطاف حسین اور دیگر مہاجر لیڈروں کو داد نہ دینا کس قدر تنگ نظری ہوگی کہ بے نظیر جیسی زیرک سیاست دان ایک بڑے مجمع کو دیکھ کر یہ کہہ دیتی ہے کہ آج اگر ہم چاہیں تو اسمبلی پر قبضہ کر لیں لیکن الطاف حسین یا دیگر رہنماؤں نے تازہ تازہ لگے ہوئے زخموں پر تبصرہ تو کجا تذکرہ تک نہیں کیا۔ الطاف حسین کی تقریر گواہ ہے کہ اس نے مجمع کو کم از کم پانچ دفعہ ہوائی فائرنگ اور نعروں تک سے منع کیا۔ آخر میں صرف ایک جملہ کہا کہ چند شر پسندوں نے ہمارے جلوس پر سہراب گوٹھ میں گڑبڑ پھیلائی اور فائرنگ کی اور الطاف نے اپنے کارکنوں کو ہدایت کی کہ وہ سپر ہائی وے کے بجائے براستہ نیشنل ہائی وے واپس جائیں۔ تاکہ جھگڑے کا امکان ہی نہ رہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ الطاف اور MQM کی امن پسندی کا ثبوت نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا نوجوانوں کے مسلح جلسے میں ایسے غیر جذباتی اور عقلی معاملات ہوتے ہیں! لیکن جب الطاف خود نیشنل ہائی وے سے، اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ گذرے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا حتیٰ کہ انہیں قانونی مشیروں تک سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اور نہ یہ بتایا گیا کہ انہیں کہاں رکھا گیا ہے۔ حالانکہ کمشنر کراچی کے اخباری بیان کے مطابق MQM اس جھگڑے میں ملوث نہیں۔ ایں چہ بوالعجبی ست

اس واقعہ کے فوراً بعد کراچی میں رات دس بجے سے اور حیدرآباد میں رات بارہ بجے سے غیر معینہ مدت تک کے لیے کرفیو لگا دیا گیا اور پٹھانوں کی آبادیوں، ٹالوں وغیرہ پر فوج اور پولیس کے پہرے متعین کر دیئے گئے لیکن اورنگی ٹاؤن جیسے مہاجر علاقوں میں ساری ساری رات اخباری اطلاعات کے مطابق پہاڑی کے اوپر سے حملہ آور پٹھان شب خون مارتے رہے۔ انہوں نے کلاشنکوفیں اور دستی بم استعمال کئے۔ چنانچہ بیس کے قریب افراد سوتے میں ہلاک اور کئی زخمی ہوئے۔ ایک پٹھان گورنر نے اس طرح ایک سال پہلے لگائے گئے زخموں کا بدلہ لے لیا۔ چنانچہ زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے ان واقعات کی مذمت کی۔

ان فسادات میں مجموعی طور پر کم از کم ۵۰ افراد ہلاک ہوئے اور ریکارڈ دیکھا جا سکتا ہے کہ ہلاک شدگان کون تھے۔ سینکڑوں مہاجر بے گھر ہوئے جن کے کچے مکانات اور جھونپڑیوں سے آج انسانی گوشت کے جلنے کی سڑاند آ رہی ہے۔

لیکن جب مہاجروں نے پُرامن احتجاج کیا تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اس سلسلے میں امن و امان کی محض دکھاوے کی کوشش کے لیے جن لوگوں یا جس طبقے کو انتہائی غلط طریقے سے استعمال کیا جا رہا ہے وہ ہیں حضرات علماء کرام۔ چنانچہ آپ ان دنوں کے اخبارات ملاحظہ فرمائیں۔ ہر مکتبہ فکر کے علماء خصوصاً درباری علماء (انتہائی معذرت کے ساتھ) کے لمبے لمبے بیانات شائع ہو رہے ہیں جن میں اخوت، بھائی چارے اور امن و آشتی کا

درس دیا جاتا ہے۔ لیکن الاّ ماشاء اللہ یہ کوئی نہیں کہتا کہ جو مجرم ہے (خواہ مہاجر ہو یا پٹھان یا کوئی اور) کو سزا دی جائے۔ میں آپ سے کلام اللہ کے عالم ہونے کے ناطے سوال کرتا ہوں کہ کیا اسلام کا نظام عدل یہ کہتا ہے کہ ایک مسلمان کسی دوسرے مسلمان کا گلا ہی کیوں نہ کاٹ ڈالے لیکن دوسرا برادر بنائے اخوت و بھائی چارہ خاموش رہے؟ کیا ظالم کی خاموش حمایت کرنا بھی جرم نہیں! کیا اسلام کا حکم یہ نہیں کہ مجرم کا ہاتھ پکڑلو! کیا اپنے حقوق کی بات کرنا قومیتوں کو اجاگر کرنا ہے جو سراسر غیر اسلامی ہے تو مجھے بتایا جائے کہ جب غزوۂ حنین کے بعد مال غنیمت کی تقسیم کے وقت انصار کی طرف سے اعتراض کیا گیا تھا کہ حضورؐ نے سب کچھ قریش اور عرب قبیلوں کو دے دیا (بحوالہ سیرت ابن ہشام الجزا الرابع صہ ۱۴۱) تو آنحضورؐ نے انہیں قومیت پرستی یا علاقائیت پرستی پر محمول کیوں نہ کیا؟

محترم ڈاکٹر صاحب! جیسا کہ آپ نے سندھ کی صورت حال کے تجزیئے میں لکھا ہے کہ سندھی نوجوان اسلام تک سے برگشتہ ہے تو اس کی اصل وجہ یہی ہے جو اب مہاجرین کے ساتھ پیش آرہی ہے کہ ہمارے نام نہاد مولوی اپنے مفادات و نام و نمود کی خاطر حقوق کے حصول کے مطالبے کو غیر اسلامی، دہریت اور اشتراکیت جیسے القاب سے نوازتے ہیں تو عام نوجوان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا اسلام نعوذ باللہ ایک استحصالی مذہب ہے۔ اور حقوق تو صرف مولوی کے بیان کے مطابق اشتراکیت یا دہریت سے ہی مل سکتے ہیں۔ چنانچہ دو وقت روٹی اور تن کے کپڑے کی بھیک دے کر واقعتاً اشتراکی اور دہریہ اسے اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ آج مہاجر نوجوان بلکہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ حضرات تک میں یہ فکر گردش کر رہی ہے کہ مذہب استحصالی قوتوں کا ایک ہتھیار ہے جسے استعمال کر کے وہ اپنے مفادات حاصل کرتے ہیں تو علماء کرام سے یہی عرض کرتا ہوں کہ خدارا قومیت یا حقوق کی جنگ میں اسلام کو بیچ میں نہ لائیں اور اگر اسلام کو لانا ہی ہے تو پھر حق بات کریں کیونکہ ایک ایک لفظ کا حساب دینا ہوگا۔

میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ عدل تو صرف اسلام ہی قائم کرسکتا ہے۔ چنانچہ میری فطری خواہش ہے کہ کم ازکم وہ لوگ جن کے اجداد نے اسلامی پاکستان کیلئے قربانیاں دیں محض حق تلفی کی شدت کی وجہ سے دین سے برگشتہ نہ ہو جائیں۔ بلکہ علماء حق کو میدان میں آکر ڈنکے کی چوٹ یہ کہنا چاہیئے کہ اسلام صرف ان کے حقوق کی بات ہی نہیں کرتا بلکہ ان کا سب سے بڑا محافظ بھی ہے اور صرف ان کا نہیں پوری انسانیت کا حقیقی محافظ و رہنما ہے ——— ؛

خاکپائے علمائے حق، ایک مہاجر مسلمان!

دین کے پردے میں ۔ ۔ ۔ ۔

آپ کا حالیہ تحریر کردہ مقالہ "سندھ کا مسئلہ" کی پانچ اقساط روزنامہ جنگ میں ملاحظہ کی ہیں۔ اس کے بعد آپ کی پوری شخصیت، ارادے اور مفاہیم سب پر عیاں ہو گئے۔ آپ نے خود کو جس طرح دینی لبادے میں لپیٹ

کر عوام کے سامنے پیش کیا ہے اور جس طرح اپنے مفاد کو دین کا اوڑھنا پہنایا ہے وہ ایک نہایت کامیاب ڈرامہ ہے
دراصل آپ ہی کے قبیل کے لوگوں نے دین کو بدنام کیا ہے۔ آپ لوگ اپنے مفاد کو دین کی چادر میں لپیٹ کر حاصل کرتے
ہیں۔ اس عمل سے آپ لوگوں کو تو فائدہ پہنچتا ہے لیکن دین بدنام ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی نئی نسل دین سے بدظن
ہے۔ آپ کی اس کاوش نے ہی مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے ورنہ میں سیاست سے کوسوں دور بھاگنے والا اور دین
سے لگاؤ رکھنے والا انسان ہوں۔ آپ نے پہلے مہاجروں کو ملعون کیا، اس کے بعد سندھیوں کو اور آخر میں ان
دونوں کو ایک دوسرے سے متنفر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ لیکن پنجابیوں کے معاملے کو بالکل گول کر گئے۔ آپ خالص
پنجاب مفاد کے لیے کام کر رہے ہیں اور وہ بھی دین کے پردے میں۔

میں جی ایم سید کے مخالفین میں ہوں لیکن ایک بات کہدوں کہ وہ آپ سے بہتر مسلمان ہے۔ وہ منافق نہیں اور
دین کو اپنے مفاد کے لیے استعمال نہیں کرتا۔

آخر میں آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ آپ کی یہ امید انشاء اللہ کبھی بارآور نہیں ہوگی کہ سندھی مہاجر
آپس میں لڑیں۔ آپ کا خیراندیش، خدابخش امیسر

فائرنگ بھی پنجاب کی سازش ہے

امید ہے آپ بعافیت ہوں گے۔ اس سے قبل بھی ایک خط ارسال کیا تھا۔ امید ہے ملاحظہ فرمایا
ہوگا۔ آج آپ کا ایک اور مضمون سندھ کی صورتِ حال پر پڑھا۔ آپ کی نیّت پر شبہ نہیں ہو سکتا ہے جو کچھ آپ
لکھ رہے ہوں وہ خلوص پر مبنی ہو تاہم آپ ایک مخصوص نظر سے دیکھ کر لکھ رہے ہیں اور آپ نے اس مضمون کے
آخر میں جو منطقی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس کی اصل جنگ اور ہولناک مقابلہ مہاجروں اور سندھیوں میں ہوگا اور اس
کا نتیجہ سندھ کی تقسیم ہوگی جس کو بقول آپ کے ایک سندھی دینی دانشور نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب" بڑا خون بہیگا"
اس سے آپ کا کیا مقصد ہے! کیا آپ مہاجروں کو ڈرانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے لیے کسی ناانصافی پر آواز بھی
نہ اٹھائیں یا اپنا حق نہ مانگیں اور ظلم اور زیادتی کے سامنے سرتسلیم خم کر دیں۔ لیکن شاید آپ یہ بھول گئے کہ اس وقت
یہ علاقے جن پر آج پاکستان مشتمل ہے اقتصادی طور پر ہی نہیں بلکہ ہر لحاظ سے پسماندہ تھے۔ یہ تو پاکستان بننے کے
بعد ہندوستان کے مسلمانوں نے جنہیں عرفِ عام میں مہاجر کہا جاتا ہے جو تعلیمی لحاظ سے بھی آگے تھے اور
ان میں تجارتی برادریاں بھی تھیں) انہوں نے آکر نہ صرف اپنا اقتصادی مسئلہ حل کیا بلکہ آج کراچی میں پنجاب کے
تقریباً ۲۰ لاکھ اور سرحد کے ۱۵ لاکھ پٹھانوں کو بھی روزگار فراہم کیا ہوا ہے۔

افسوس ہے آپ بھی مخصوص پنجابی طرز پر سوچتے اور لکھتے ہیں اور اس کے علاوہ اور کوئی جائز بات بھی
قبول کرنے کو تیار نہیں۔ جو مہاجر حضرات خود میرے رشتہ دار بھی جو پنجاب میں آباد ہیں وہ بھی پنجابی طرز پر سوچتے

یں اور اس کے علاوہ کوئی بات انہیں قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ آپ نے بھی اسی طرز اور سوچ کے تحت بڑی خوبی
سے اپنے مضامین میں پنجاب کی تمام برائیاں اور زیادتیاں بڑی خوبی سے صاف کردیں اور انہیں پاک کر کے
معصوم بنا ڈالا ہے۔

سندھیوں کو مہاجروں سے اتنی پرخاش نہیں جتنی پنجابیوں سے ہے وہ جانتے ہیں کہ مہاجر پاکستان
بنے کی وجہ سے آئے اگر پاکستان نہ بنتا تو مہاجر نہ آتے بلکہ سندھ انہیں اسی طرح رکھتا جس طرح ۱۹۴۷ء سے
ہلے رکھے ہوئے تھا لیکن پنجابی تو صرف اقتصادی فائدے کے لیے آتے ہیں۔ پنجاب نے مرکزی ملازمتوں
ں بھی نہیں بلکہ سندھ کی صوبائی ملازمتوں پر بھی قبضہ جما لیا ہے۔ کوٹہ اس طرح مقرر کرایا گیا ہے کہ پنجاب کا
۵۸٪ سندھ ... ۲۲٪ (دیہی اور شہری) سرحد ۱۴٪ اور بلوچستان ۵٪۔ پنجاب کے لوگ کراچی اور
ندھ کے دوسرے شہروں میں مرکزی ملازمتوں میں آکر ۵۸٪ حصہ لے جاتے ہیں جبکہ مہاجر اور سندھی
نجاب یا کسی اور جگہ اپنا حصہ لینے نہیں جاتا۔ اس طرح پنجاب میں مرکزی ملازمتوں میں ۱۰۰٪ پنجابی ہوتے
یں اور کراچی اور سندھ میں واقع مرکزی ملازمتوں میں۔ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں اور قومیائے ہوئے
صنعتی یونٹوں میں بھی ۵۸٪ حصہ لے جاتے ہیں۔ اس طرح وفاقی مالیات میں بھی پنجاب اپنے حصہ سے کہیں
یادہ لے کر دوسروں کا حق مارتا ہے کیا کبھی آپ نے اس طرف خیال فرمایا۔ اس طرح سندھ کے ۲۳٪ پورے
کستان کا کوٹہ گھٹ کر ۸٪ سے بھی کم رہ جاتا ہے کیونکہ وہ صرف انہی ملازمتوں میں حاصل کر پاتے ہیں جن کے
اتر سندھ اور کراچی میں ہیں۔ پنجاب کے ایک طبقہ نے سازش کر کے ملک کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو
ں کرایا تاکہ اپنا اقتدار قائم کر سکیں۔

پھر دارالحکومت کراچی سے پنجاب منتقل کرایا تاکہ تمام ملازمتیں پنجاب کے قبضہ میں ہی جائیں۔ بنگالی۔
جر اور دوسرے لوگ ملازمتیں چھوڑ چھوڑ کر واپس کراچی آگئے اور تمام ملازمتوں پر پنجاب کا قبضہ ہوگیا۔
الی دارالحکومت کی منتقلی کی وجہ سے اسی دن سے نالاں ہوگیا تھا اور اس کی علیحدگی کی وجوہات میں یہ ایک بڑی
ہ ہے۔ جب تک کراچی میں دارالحکومت تھا۔ بنگالی کراچی آجاتا تھا اور اپنا حصہ لے لیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کراچی
ں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰ء تک لاکھوں بنگالی بھی آباد ہوگئے تھے۔ محبِ وطن بنگالیوں نے کہا تھا کہ ملک کو بچانا
ہے تو دارالحکومت ہوائی جہاز سے واپس لانا ہوگا۔

وفاقی ٹیکس جو ۱۹۷۱ء تک وصولی کے تناسب سے صوبوں کو دیئے جاتے تھے ۱۹۷۱ء کے بعد
بادی کے تناسب سے تقسیم کیے جانے لگے تاکہ پنجاب کی آبادی کیونکہ ۵۸ فیصد ہے اس لیے اسے بڑا لقمہ ملے
الانکہ بنگالی یہ مطالبہ کرتے رہے کہ پیریٹی (برابری) کے حساب سے ہی دو لیکن اس وقت کیونکہ مغربی پاکستان
ایک ہی صوبہ تھا اور صوبہ میں اکثریت پنجاب کی تھی۔ اس لیے بنگالیوں کی بات قبول نہ کی گئی لیکن اب فوراً ہی
بادی کے تحت تقسیم کرنا شروع کر دیا کیونکہ اگر پہلے طریقے سے وفاقی ٹیکس تقسیم ہوتے تو پنجاب کو کیا ملتا کیونکہ ستر

فیصد ٹیکس تو کراچی سے وصول ہوتا ہے۔ اس لئے وصولی کے تناسب کا اصول ناقابلِ قبول بن گیا اور فوراً آبادی
کی بنیاد پر تقسیم کا عمل شروع ہوگیا۔ حد یہ ہے کہ زکوٰۃ تک بھی اسی طرح سے تقسیم ہو رہی ہے یعنی اٹھاون فیصد
پنجاب حالانکہ اس کی بھی بیشتر ادائیگی دوسرے جگہ یعنی کراچی سے ہوتی ہے۔ کراچی پورٹ اور بن قاسم پورٹ
تک میں اٹھاون فیصد پنجاب کا حصہ ہوگیا ہے جبکہ ان کی آمدنی وفاقی مالیات میں ہی جاتی ہے۔

آپ نے فرمایا ہے کہ مہاجر تحریکوں کا نتیجہ سندھ کی تقسیم ہوگا اور بڑا خون بہے گا۔ اگر کسی کے ساتھ ناانصافی
ہوتی ہے تو وہ علیحدہ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ہندوستان میں کل چودہ صوبے تھے جن
میں سے پانچ پاکستان میں آگئے تھے انہوں نے باقی ۹ صوبوں سے چوبیس صوبے بنا ڈالے ہیں۔ صرف مشرقی
پنجاب کو تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ مشرقی پنجاب۔ ہریانہ اور ہماچل پردیش۔ کتنا خون بہا۔ اور اس تقسیم
سے آج یہ فائدہ ہے کہ سکھوں کی شورش صرف مشرقی پنجاب تک محدود ہے۔

سندھ میں ۳۲ فی صد ہندو تھا وہ کوئی علاقہ اپنے ساتھ نہیں لے گیا۔ مہاجر اس کی جگہ آئے اور اسی
جگہ ان کی اکثریت ہے۔ کراچی سے ٹنڈو آدم تک کا علاقہ مہاجر اکثریتی علاقہ ہے۔ باقی سندھ میں قدیم سندھیوں
کی ہی اکثریت ہے اور یہ علاقہ ۳۲ فی صد بھی نہیں۔ یعنی مہاجر سندھ کے ۲۲ فی صد سے بھی کم علاقہ پر اکثریت میں
ہیں گو ان کی آبادی پچاس فی صد سے بھی زیادہ ہوگی۔ اس لئے میرے خیال میں اگر فی الحال دو ریجن بنا دیئے
جائیں ایک کراچی اور دوسرا سندھ جس کا دارالحکومت سکھر ہو اور دونوں ڈپٹی گورنرز کے تحت ہوں تاکہ کسی
کو کسی دوسرے سے شکایت نہ رہے۔ داخلوں اور ملازمتوں کا مسئلہ بھی حل ہو جائے تو بھی کسی حد تک مسئلہ حل ہو سکتا
ہے ورنہ بقول آپ کے منطقی نتیجہ علیحدہ صوبہ ہوگا مگر وہ بھی کوئی جرم نہیں ہے۔ لیکن اس میں آپ "بڑا خون بہے گا"
کا ڈر محسوس کرتے ہیں۔ شاید صحیح بھی ہو۔ کیونکہ ہم معقولیت سے کوئی مسئلہ حل نہیں کر پاتے۔ حالانکہ ہمارے پڑوس میں
ایسے مسائل آسانی سے حل کر لئے گئے ہیں۔

براہِ کرم حق لکھنے اور سمجھنے کا حوصلہ پیدا کیجئے۔ ورنہ لوگ جیسا آپ نے خود تحریر کیا ہے اسلام سے بھی بدظن ہونے
لگے ہیں اور آجکل کے حالات کے تحت اسے پنجابی اسلام کہنے لگے ہیں۔ پنجاب کے ایک گروہ نے صرف اپنے مخصوص
لوگوں کے فائدے کے لئے تمام صوبوں سے ناانصافیاں کر کے تمام صوبوں کے لوگوں کو پنجاب سے متنفر کر دیا ہے۔
اگر وہ ناانصافی کر کے پنجاب کو فلاح پہنچا دیتے تو بھی غنیمت تھا لیکن سب کچھ کرنے کے بعد پنجاب کا عام آدمی
دوسرے صوبوں کے لوگوں سے بدتر ہی ہے۔ تمام سرکاری مرکزی ملازمتیں [illegible] لیکر اور دیگر کوٹہ
کے طریقوں سے کر کے بھی عام آدمی ملازمت کے لئے کراچی ہی آتا ہے۔

بھٹو کی پھانسی کی وجہ سے اور نفرت پیدا کر دی جس کی وجہ آپ نے خود تحریر فرمائی ہے۔ ان تمام وجوہات
کی وجہ سے پنجاب کے خلاف ردِ عمل ہے لوگوں کا خیال ہے اور اس میں کچھ حقیقت بھی ہے کہ مہاجر قومی موومنٹ
کے جلوس پر فائرنگ بھی پنجاب کی ایک سازش ہے۔ ورنہ پٹھانوں کا نہ کراچی میں ملازمتوں میں عمل دخل ہے نہ

داخلوں میں اصل مسئلہ تو پنجاب سے ہے اور انہوں نے رخ بدلنے کے لئے یہ پٹھانوں کی طرف کر دیا ہے۔
برائے کرم ان حقیقتوں پر بھی ذرا غور فرمائیے : خیر اندیش : حسن احمد صدیقی

پاکستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں

آپ کا مضمون بعنوان "سندھ کا مسئلہ" جو ۲۵ ردسمبر کی روزنامہ "جنگ" کی اشاعت میں شائع ہوا۔ دوبار پڑھا۔ آپ نے بڑی احتیاط سے حالیہ ہنگاموں کے اصل اسباب پر جو پردہ ڈال رکھا ہے اس پر بڑا تعجب ہوا۔ آپ جیسے مفکر تو ان اسباب کو بہتر سمجھتے ہیں پھر بھی چند جملے پیش خدمت ہیں۔

مارشل لاء کے دوران چونکہ فوجی افسروں کو مطلق العنانیت حاصل تھی اس لئے جو چاہا کیا۔ بھلا بھی ہو سکتا تھا برا بھی۔ پاکستان بننے کے بعد چند سال تو اچھے گزرے۔ ملک کی خدمت کا جذبہ کار فرما رہا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اپنی خدمت کا جذبہ اجاگر ہونے لگا۔ مغرب زدہ بیویوں کے آئے دن کے تقاضوں نے ان کے اچھے بھلے شوہروں کو حرام کی آمدنی کی طرف راغب کر دیا اور رفتہ رفتہ یہ مطالبے اس حد تک بڑھ گئے کہ معمولی ذرائع ناکافی ہونے لگے۔ اور سہراب گوٹھ آباد ہونے لگے۔

اس کاروبار کا حکومت اور علماء دونوں کو بخوبی علم تھا۔ حکومت اس لئے خاموش رہی کہ ان کو حصہ ملتا تھا۔ اور علماء بھی اور ہم بیٹھے ہوئے رویا کئے تقدیر کو۔

جب زیادہ شور و غوغا پبلک کی طرف سے ہوا تو حکومت نے خود اس خون خرابہ کا انتظام کیا۔ تاکہ شہری زندگی مفلوج ہو جائے اور عوام کو ایک سبق سکھایا جائے کہ خبردار ہم تو دوسرے سہراب گوٹھ بسالیں گے۔ سرحدی علاقوں سے ہماری سپلائی بھی جاری رہے گی۔ کیونکہ ہم کو ان کا تعاون حاصل ہے جو تمہارے محافظ ہیں، لیکن تم کیا کروگے۔ تمہارا گھر کون بنائے گا۔ تمہاری کمائی کہاں سے آئے گی وغیرہ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ باوجودیکہ اس کاروبار میں ملوث افراد کے نام اور پتے حکومت کو معلوم ہیں، ان میں سے ایک بھی گرفتار نہ ہوسکا۔ گرفتار کرے کون؟

یہ سندھی۔ مہاجر۔ پٹھان کا معاملہ نہیں بلکہ اونچے اور نیچے طبقہ کا معاملہ ہے۔ کیا رشوت۔ اسمگلنگ۔ چوری میں مہاجر شریک نہیں ہیں۔ کیا وزارت میں مہاجر شریک نہیں ہیں۔ کیا پٹنے اور مرنے والوں میں پٹھان شریک نہیں ہیں!

ہونا تو یہ چاہئے کہ عوام کی ایک طاقت ابھرے۔ پہلے علماء کو درست کرے۔ کیا یہ المیہ نہیں کہ جہاں کی سرکاری گنتی ۹۸ فی صد مسلمان دکھاتی ہے وہاں نفاذ شریعت کے لئے تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ یہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ اور یہ فی صد اس فی صد سے کم ہے جو ہندوستان میں ہے۔ یہاں لوگوں کو مسلمان بنائے بغیر نفاذ شریعت کی بات کرنا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ اس لئے سیاست کو چھوڑ کر صرف صحیح معنوں میں مسلمان بنانے پر اپنی توانائی صرف کی جائے تو ان تمام بیماریوں کا علاج ایک نہ ایک دن ان شاء اللہ ضرور ہو کر رہے گا۔

سید نصیح الدین احمد

جن کے لیے پاکستان بنایا تھا۔۔۔۔

"اصل اسباب کیا ہیں اور ذمہ دار کون ہے" کے عنوان کے تحت اخبار جنگ میں آپکا مضمون پڑھ کر دکھ ہوا۔
آپ نے بلوچستان کے سرداروں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ مجبوراً پاکستان میں شامل ہوئے۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ
برٹش بلوچستان کے شاہی جرگہ کے ۵۲ ممبروں میں سے صرف سات ممبر بلوچ تھے اور باقی سب پٹھان۔ اور نواب
محمد خاں جوگے زئی برٹش بلوچستان سے واحد ممبر تھے۔ ریاست قلات۔ خاران اور لس بیلہ علیحدہ علیحدہ ریاستیں تھیں۔
انگریزوں کی کوشش یہ تھی کہ بلوچستان کو برما اور سیلون کی طرح ہندوستان سے علیحدہ کر کے اپنے قبضے میں رکھیں۔ اس
لیے ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ریاستوں کے لیے تین راستے رکھے گئے۔ یعنی یا ہندوستان میں شامل ہوں یا پاکستان
میں یا آزاد رہ کر برٹش حکومت کے ساتھ معاہدہ کریں۔ نواب صاحب نے کانگرس کی ۱۸ کروڑ روپیہ کی پیش کش
ٹھکرا دی۔ اگرچہ نواب جوگیزئی نے کانگریس کو شکست دی تھی اور وہ آزاد ممبر تھے مگر جب مسلم لیگ نے بائیکاٹ کیا
تو نواب جوگیزئی نے بحیثیت مسلمان کے اور کاکڑ قوم کے نواب ہونے کی وجہ سے بائیکاٹ کیا۔ ایک پٹھان یہ برداشت نہ
کرسکا کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ بیٹھے۔ دہلی میں نہرو نے بہت کوشش کی کہ نواب صاحب سے ملاقات کرے مگر نواب
صاحب نے انکار کیا۔ بلوچستان میں تو کوئی سیاسی جماعت اتنی مضبوط نہ تھی کہ وہ قبائلی سرداروں پر اثر ڈال سکے۔
اور نہ قبائلیوں کو ہندوستانی لیڈروں کا پورا علم تھا۔ ریفرنڈم تو ۴ جولائی ۱۹۴۷ء کو ہونا تھا مگر چونکہ ۴ جولائی کو
کانگریس کا روپیہ آنا تھا اس لیے نواب صاحب نے خطرے کو بھانپتے ہوئے ۲۹ جون ۱۹۴۷ء کو جب گورنر جنرل کے
ایجنٹ (A.G.G) نے شاہی جرگہ کو کہا کہ آپ سے ۴ جولائی کو پوچھا جائے گا' اجلاس میں کھڑے ہو کر کہا کہ ہم
نے کافی غور کر کے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ بلوچ سرداروں نے کہا کہ ہم نے خان قلات کے ساتھ
ل کیا ہے مگر A.G.G نے کہا کہ یہ پاکستان اور ہندوستان کے متعلق ہے۔ لہٰذا وہ بھی نواب جوگیزئی کے ہم نوا ہو گئے
پ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ بلوچستان میں سب بلوچ نہیں ہیں۔ کوئٹہ۔ پشین۔ ژوب۔ لورالائی۔ سبی۔ پٹھان علاقے ہیں
ر پٹھان قبائل میں سب سے بڑا قبیلہ کاکڑ ہے اور اچک زئی موسیٰ خیل۔ ترین۔ ہوتی وغیرہ بھی پٹھان ہیں کاکڑ اس وقت
لستان میں ۱۸ لاکھ کی تعداد میں ہیں اور ۳۰ لاکھ افغانستان میں ہیں۔ نواب جوگیزئی تمام کاکڑ قوم کے نواب ہیں
ور ہم باحوصلہ ہیں۔ ہم نے انگریزوں کے ساتھ جنگ کی ہے۔ انگریز ۱۸۹۰ میں آئے اور ۱۹۴۷ء میں گئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ پاکستان پٹھانوں نے بنایا ہے۔ برٹش بلوچستان میں ریفرنڈم ہوا تو پٹھان سرداروں
نے ووٹ دیا جبکہ یہاں سیاسی بیداری نہیں تھی۔ عبدالصمد خان کی طاقت کو صرف پٹھان سرداروں نے ختم
یا اور صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں بھی پٹھانوں نے پاکستان کو ووٹ دیا۔ حالانکہ حکومت کانگریس کی تھی اور
لوچستان میں انگریز کی حکومت تھی۔ کشمیر کا جتنا بھی حصہ پاکستان میں ہے۔ وہ بھی پٹھانوں قبائلیوں نے فتح کیا ہے
ور انگریز سے قبائلی پٹھان آزادیٔ ہند تک لڑتے رہے اور آج روس سے بھی پٹھان لڑ رہے ہیں۔ یہ جنگ بھی

پاکستان کو مضبوط کرے گی۔ لہٰذا حقیقت کو نظرانداز کرنا بھی سخت گناہ ہے جو ظلم کرتا ہے اس کو اس کی سزا ملنی چاہیے، چاہے کوئی بھی ہو۔

یہ بھی قابلِ غور ہے کہ جب ہندو مسلم فساد ہوا تو ہر پٹھان کو اس پر غصہ تھا کہ ہندو نے مسلمان عورتوں کو اغوا کیا ہے۔ اس بات پر سب نے اتفاق کیا کہ مسلمان اور ہندو کا سوال ہے ورنہ اگر بلوچستان کے پٹھان قلات کے ساتھ کنفیڈریشن بناتے جو انگریز چاہتے تھے تو پاکستان کیسے بنتا۔ جن کی عزت کے لیے ہم پاکستان میں شامل ہوئے وہی اب پٹھانوں کے دشمن ہو گئے ہیں قابلِ غور بات ہے۔

جہانگیر شاہ جوگیزئی، سینیٹر

اہم اطلاع

امریکہ، کینیڈا، متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب
میں ماہنامہ "میثاق" اور ماہنامہ "حکمت قرآن"
کا سالانہ زرتعاون جمع کروانے اور دیگر معلومات کیلئے درج ذیل حضرات سے رجوع کیا جا سکتا ہے

امریکہ	**Dr. Khurshid A. Malik** 810, 73rd Street Downers Grove, ILL.60516 Ph . 312-969-6755, 312-969-6756
کناڈا	**Anwar-ul-Haq Qureshi** 323 - Rusholme Rd., Apt. 1809 Toronto Ont. M6H 2Z2 Canda.
متحدہ عرب امارات	**Mr. S. M. Nasimuddin** P. O. BOX 294 Abu-Dhabi Ph : 554057, 559181, 325747
سعودی عرب جدّہ	**Mr. M. Asghar Habib** P. O. BOX NO. 167, CC720 Jeddah 21411 Saudi Arabia Ph 6721490
ریاض	**Mr. Azimuddin Ahmed Khan** P. O. BOX NO. 20249, Riyadh - 11455 Ph : 4544496 - 4462865
الواسع	**Mr. Ghulam Mustafa** P. O. Box No. 2464 Al-Wasai Riyadh - 11451 Ph :

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات — ۲۵ سعودی ریال یا -/ ۱۱۵ روپے پاکستانی

ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر۔	۶-امریکی ڈالر یا -/ ۱۰۰ روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ۔	۹-امریکی ڈالر یا -/ ۱۵۰ " "
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۱۲-امریکی ڈالر یا -/ ۲۰۰ " "

...د: ماہنامہ میثاق لاہور یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ ۱۴ (پاکستان) لاہور

بقیہ: عرضِ احوال

علاوہ بہت سی دوسری باتوں کے وزیرِ اعظم کا حالیہ اعلان ہے جس میں انہوں نے مشنری تعلیمی اداروں کی واپسی کا وعدہ کر کے متعدد حلقوں میں کھلبلی مچا دی۔ تازہ واقعہ جس سے ہمارے چودہ طبق روشن ہوئے۔ درج ذیل قرارداد میں بیان ہو گیا ہے جو مسجد دار السلام لاہور کے بہت بڑے اجتماع جمعہ میں ۲۴ ر جنوری کو منظور کی گئی۔ لہٰذا اُسے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ متن ہی کافی ہے :-

"نمازِ جمعہ کا یہ اجتماع جنگ فورم میں اعلان کے باوجود جناب احمد دیدات اور ایک عیسائی پادری کے درمیان انجیل کے کلامِ الٰہی ہونے کے موضوع پر مناظرے کی فلم نہ دکھائے جانے پر انتہائی غم و غصے کا اظہار کرتا ہے۔ نو کروڑ مسلمانوں کے ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان میں عیسائی اقلیت کی دھمکیوں سے مرعوب ہو کر ایک ایسے مناظرے کی فلم کا نہ دکھایا جانا انتہائی افسوس ناک اور خطرناک ہے جو عیسائی دُنیا کے گڑھ میں منعقد ہوا اور جسے پوری عیسائی دنیا میں ٹیلیویژن پر دکھایا جا چکا ہے۔ مقامی انتظامیہ اور پولیس نے جس طرح سے نقضِ امن کے اندیشے کے تحت عیسائیوں کے مطالبے کی حمایت میں ادارہ 'جنگ' پر فلم نہ دکھائے جانے کے لئے دباؤ ڈالا وہ بھی ہماری ملّی غیرت اور دینی عصبیت کے منافی عمل ہے۔ یہ اجتماع مطالبہ کرتا ہے کہ اس واقعے کی تلافی اسی طرح ممکن ہے کہ اس مناظرے کی فلم پاکستان ٹیلیویژن کے تمام اسٹیشنوں سے دکھائی جائے۔ پاکستان کی جُملہ اقلیتوں اور خاص طور پر عیسائی اقلیت کو یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ یہ فلم خالص علمی موضوع پر مبنی ہے اور اسی جذبے کے تحت مغربی دُنیا میں اسے وسعتِ قلبی کے ساتھ قبول کیا گیا ہے۔ پاکستان میں جس طرح جُملہ اقلیتیں امن و سکون اور پوری مذہبی آزادی کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہیں اُس کو دیکھتے ہوئے اس قسم کے علمی مباحثوں اور مناظروں کو مذہبی منافرت کے نام پر روکنا سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ اس جارحانہ انداز سے ان چیزوں کو روکنے کی کوشش ملک کی عظیم مسلمان اکثریت کے مذہبی جذبات کو مجروح اور مشتعل کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔" —٥—

تنظیمِ اسلامی کا سالانہ اجتماع ان شاء اللہ

۴ر اپریل تا ۷ر اپریل ۱۹۸۷ء

منعقد ہو رہا ہے مقام اور پروگراموں کی تفصیل آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

کھانسی، گلے کی خراش، نزلہ زکام کے لیے
زود اثر
سرفی کول
SURFICOL
COUGH SYRUP
آپ کا نبض شناس
نصف صدی سے معیاری
ادویات کا نشان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے اللہ . . . . .

ہم عاجز ہیں ——— تو قوی ہے

ہم ظالم ہیں ——— تو رحیم ہے

ہم گناہ گار ہیں ——— تو بخشنے والا ہے

ہم نے تجھ سے یہ ملک مانگا تھا کہ یہاں تیرے کلمے کو بلند کریں گے
تیری کتاب کے احکامات پر عمل کریں گے
تیرے آخری نبی اور رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سُنّت کی پیروی کریں گے
لیکن ہم نے ——— اُس عہد کو پامال کر دیا
ہم نے اپنی خواہشات اور مال و دولت کو اپنا معبود بنا لیا
ہم تجھے بھول گئے
لیکن تو ہمیں فراموش نہ کر

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کر دے

ہماری غلطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡکُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَکُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

سلسلہ	۳۶
شمارہ	۳
رجب المرجب	۱۴۰۷ھ
مارچ	۱۹۸۷ء
فی شمارہ	-/۵
سالانہ زرتعاون	-/۵۰

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

منیجنگ ایڈیٹر

اقتدار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

مقبول الرحیم مفتی

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوحا، قطر، متحدہ عرب امارات	۲۵ سعودی ریال یا -/۱۱۵ روپے پاکستانی
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر	۶۔ امریکی ڈالر یا -/۱۰۰ روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ	۹۔ امریکی ڈالر یا ۱۵۰
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ	۱۲۔ امریکی ڈالر یا ۲۰۰

ترسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور، یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ ۱۴ (پاکستان) لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: ۸۵۲۶۸۳-۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی فون ۲۱۶۵۸۱

طابع: چوہدری رشید احمد مطبع: مکتبہ جدید پریس شاہراہ فاطمہ جناح، لاہور

مشمولات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے زیر اہتمام

قرآن اکیڈمی کے بعد اب

قرآن کالج اور آڈیٹوریم

انجمن خدام القرآن کے مقاصد اور لائحہ عمل سے آگہی اور اتفاق رکھنے والے مخیر خواتین و حضرات یہ جان کر مسرت محسوس کریں گے کہ نیو گارڈن ٹاؤن لاہور کے اتاترک بلاک میں لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی سے حاصل کردہ پلاٹ نمبر ایس-۱۹۱ پر مجوزہ قرآن کالج اور آڈیٹوریم کی تعمیر کا کام پورے زور و شور اور قرینے سے شروع ہو چکا ہے۔ شاندار اور جدید ترین تصریحات کے مطابق آڈیٹوریم مروجہ آرکیٹیکچر اور ملک کے ایک ممتاز سٹرکچرل ڈیزائنر کی کاوش کا مظہر ہے جو نو سو (۹۰۰) نشستوں پر مشتمل ہوگا اور اس اعتبار سے شاید اپنی نوعیت کا پہلا آڈیٹوریم ہوگا کہ یہ صرف اور صرف قرآن حکیم کے پیغام کی نشر و اشاعت کے لیے مخصوص ہوگا۔

تفصیلی تعارف کی ضرورت محسوس ہو تو بروشر طلب فرمایئے۔

عطیات جو حکومت پاکستان مالیات و ریونیو ڈویژن دفعہ (ط)(۱) ۴۷ کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں، بذریعہ کراس چیک یا بنک ڈرافٹ (لاہور سے پے آرڈر) مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے نام ارسال کیے جائیں۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور
ٹیلیفون ۸۵۲۶۸۳ و ۸۵۲۶۱

داخلہ برائے بی-اے کلاس

قرآن کالج-لاہور

الحمد للہ اس سال سے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام قرآن کالج کے نام سے ایک نئی تعلیمی اسکیم کا باضابطہ آغاز ہو رہا ہے۔ اس اسکیم کے تحت ایف اے ایف ایس سی پاس طلبہ کو داخلہ دیا جائیگا اور تین سال کے عرصہ میں جامعہ پنجاب کے نصاب کے مطابق بی اے کے امتحان کی باقاعدہ تیاری کے ساتھ دینی تعلیم کے ایک بنیادی نصاب کی تعلیم بھی دی جائے گی جس میں عربی زبان کی مضبوط بنیادوں پر تحصیل، پورے قرآن مجید کا ترجمہ اور تعلیم حدیث کے پروگرام خصوصیت کے ساتھ شامل ہونگے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں:

۱- ایف اے ایف ایس سی اور آئی کام پاس طلبہ سے درخواستیں مطلوب ہیں جو طلبہ نتیجہ کے منتظر ہوں وہ بھی درخواست دے سکتے ہیں۔

۲- داخلہ کیلئے درخواستیں وصول کرنے کی آخری تاریخ ۳۱ مارچ ۸۷ رہے ہے

۳- تعلیم کا آغاز ان شاء اللہ ماہ رمضان المبارک کے فوراً بعد یعنی اوائل جون میں ہوگا

۴- بیرون لاہور کے طلبہ کے لئے ہاسٹل کی سہولت موجود ہے۔

نوٹ: کالج پراسپکٹس اور داخلہ فارم حاصل کرنے کیلئے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے نام دس روپے کا پوسٹل آرڈر یا ڈاک ٹکٹ روانہ کریں

المعلن: قمر سعید قریشی، ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن
فون ۸۵۲۶۸۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

سیاست کے باب میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد اور تنظیم اسلامی کا طرزِ عمل قارئین میثاق کے لئے کھلا راز ہے۔ ہم تفصیل میں جاتے بغیر محض چند جملوں میں اپنے موقف کا اعادہ کریں تو بات یوں بنتی ہے کہ ہم نظری سیاست کو تو ہر باشعور شہری پر واجب سمجھتے ہی ہیں، عملی سیاست میں بھی اسوۂ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اتباع میں انقلابی سیاست کو اپنا فرضِ عین جانتے ہیں۔ احتراز ہے تو مروجہ انتخابی سیاست سے جو روز بروز ہر اصول اور قرینے سے عاری ہوتی جارہی ہے۔ یہ احتراز بھی کوئی وجدانی فیصلہ نہیں بلکہ ایک منطقی دلیل پر استوار ہے۔ ہماری تشخیص یہ ہے کہ چونکہ انسانی معاشرہ —— اور ہمارے اولین میدان عمل ہونے کی حیثیت میں بالخصوص ہمارے اپنے ملک کا معاملہ —— ایک باطل اور فاسد نظام کے ظلم کا شکار ہے۔ لہٰذا انسانیت کو دنیوی اور اخروی عافیت اور امن وسکون دینے کے لئے جزوی اور سطحی کتر بیونت کافی نہیں بلکہ ضرورت اس پورے نظام کو بیخ وبن سے اکھاڑ کر ایک نئے ہمہ گیر وہمہ جہت عادلانہ نظامِ زندگی کو برپا کرنے کی ہے جو کائنات کے خالق کی ہدایت ورہنمائی سے بھی فیضیاب ہو۔ اور تخریب وتعمیر کا یہ مرحلہ انقلابی سیاست ہی سے طے ہو سکتا ہے۔ انتخابی سیاست کا ہدف نظام کی تبدیلی ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ تو فی الحقیقت حاضر وموجود نظام کی ہی پیداوار اور اصلاً اسی کی محافظ ہوتی ہے۔ اس کا کام نظام کی بنیادوں کو جوں کا توں رکھتے ہوئے گاہے چند جزوی تبدیلیاں لانا بھی ہو سکتا ہے وگرنہ عموماً اس کا دائرۂ کار بالفعل قائم نظام کو چلانے والے ہاتھ بدلنے کی سعی وجہد ہی ہوتا ہے۔

متحدہ شریعت محاذ میں تنظیم اسلامی کی شمولیت کسی بھی درجے میں روائتی سیاست کا چسکا پورا کرنے یا محض منہ کا ذائقہ بدلنے کی خاطر ہرگز نہ تھی۔ ہم نے شعوری طور پر فیصلہ کیا کہ ملک میں شریعت کے نفاذ کی کسی بھی کوشش میں اپنی بساط سے بھی بڑھ کر حصہ لینا ہمارے لئے عین سعادت ہے اور اس امید نے بھی ہمارے دلوں میں راہ پائی کہ چونکہ حقیقی اور دائمی نفاذِ شریعت صرف منہج نبوت کے ذریعے ہی ممکن ہے لہٰذا اگر اس کے لئے سعی وجہد

کرنے والے خلوصِ نیّت سے ہی نہ ہوئے تو جلد یا بدیر انہیں انقلابی سیاست کے انداز کو ہی
ہوگا۔ تفصیل کا نہ موقع ہے نہ محل لیکن ہمیں اپنی اس اُمّید کے بر آنے کے واضح آثار رونما
بھی آنے لگے ہیں۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

اس پس منظر میں جمعیت علماءِ اسلام (مولانا درخواستی گروپ) کے سیکرٹری جنرل اور
شریعت بل کے محرک، سینیٹر مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہٗ کا ایک بیان جو ۲۸ فروری کو لاہور
اخبارات میں شائع ہوا، نفاذِ شریعت کی مہم کو عامۃ الناس میں مشکوک بنانے کا باعث ہوا۔
محترم مولانا اگرچہ متحدہ شریعت محاذ میں کوئی مرکزی عہدہ نہیں رکھتے لہٰذا اُن کا فرمانا پالیسی
بیان قرار نہیں دیا جا سکتا تاہم اُنکی یہ حیثیت کیا کم ہے کہ محاذ قائم ہی اُن کے پیش کردہ
منظور کروانے کے لئے ہوا ہے۔ مولانا سے اس بیان میں جو بات منسوب کی گئی ہے اسکا
یہ ہے کہ ایم آر ڈی (تحریک بحالیٔ جمہوریت) اگر شریعت بل کی حمایت کرنا منظور کرلے تو
شریعت محاذ کی قیادت "سپردم بتو مایۂ خویش را" کے انداز میں اس کے حوالے کردی جائے"
حُسنِ ظن کا تقاضا ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ مولانا محترم کی بات غلط رپورٹ کی گئی لیکن بدقسمتی
اگر ایسا نہیں تو ہم مولانا سے بصد ادب گذارش کریں گے کہ وہ اپنے ارادے پر نظرِ ثانی فرمائیں
بحالیٔ جمہوریت کی حد تک تنظیمِ اسلامی کا مؤقف محاذ کے قیام سے بھی بہت پہلے سے
چلا آرہا ہے جو ایم آر ڈی کی اساس ہے۔ لیکن متحدہ شریعت محاذ کی مہم کا ہدف اس
کہیں اعلیٰ و ارفع ہے۔ بحالیٔ جمہوریتِ پاکستان کے باسیوں کے مسائل کا جوفی الاصل
ناعاقبت اندیشانہ حکمتِ عملی کے تسلسل کے باعث پیدا شدہ احساسِ محرومی و بیگانگی کا
نتیجہ ہیں، ایک فوری اور وقتی حل ہے جبکہ نفاذِ شریعت کو ہم جسدِ ملّت کے جملہ عوارض
شافی اور مستقل علاج سمجھتے ہیں۔ اس عظیم مقصد کو ایک وقتی تدبیر کا تابع کیسے بنایا جا
ہے۔ پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ ایم آر ڈی کی سٹیج پر بھانت بھانت کی بولیاں بولنے و
جمع ہیں۔ اُن میں سے اکثر کی نظریاتی وجذباتی وابستگیاں اور نظامِ زندگی کی ترجیحا
رجالِ دین کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں۔ ایسے مختلف الخیال گروہ کسی جزو
مقصد کے لئے تو جمع ہو سکتے ہیں لیکن ایک ہمہ گیر و ہمہ جہت تبدیلی کی حمایت میں یہ
ستی کا کوئی کنبہ مثبت کردار ادا کرنے کے قابل بھی نہیں ہو سکتا کجا یہ کہ اُسے منصبِ قیادت
سونپ دیا جائے۔

اسلامی انقلاب کا مفہوم

اور اُس کے قرآنی و دیگر مترادفات

—— ڈاکٹر اسرار احمد ——

اِس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ 'اسلامی انقلاب' ایک جدید اصطلاح ہے۔ اور قرآن حکیم کے بارے میں تو یہ قطعی اور حتمی طور پر معلوم ہے کہ اُس میں یہ اصطلاح کہیں بھی وارد نہیں ہوئی۔ گمانِ غالب یہی ہے کہ حدیث کے پورے ذخیرے میں بھی یہ اصطلاح کہیں موجود نہیں ہے۔ تاہم قرآن مجید میں اِس کے ہم معنی الفاظ اور مترادف اصطلاحات بکثرت موجود ہیں۔ الحمدللہ کہ اِن سطور کا ناچیز راقم قرآن و حدیث کی اصطلاحات کی جگہ جدید اصطلاحات کے استعمال کی مضرتوں سے بخوبی واقف ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ہر دَور میں غور و فکر کے کچھ مخصوص سانچے بن جاتے ہیں جنہیں نظرانداز کرنا ممکن نہیں ہوتا! اور ع

"بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر!"

کے مصداق اُس دَور میں جن اصطلاحات کے حوالے سے عموماً بات سمجھی اور سمجھائی جاتی ہو اُن کے بغیر ابلاغ کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ کسی بات کو ابتداءً ذہنوں تک پہنچانے کے لیے تو جدید اصطلاحات کا ضرور سہارا لیا جائے لیکن اُن کو مستقلاً اختیار نہ کیا جائے بلکہ ذہنوں کو رفتہ رفتہ قرآن و حدیث کی اصل اصطلاحات ہی سے مانوس کیا جائے۔ لہٰذا ـــــ "اسلامی انقلاب: کیا ہے کیوں ہے اور کیسے ہے" کی بحث کے آغاز میں مناسب ہے کہ اسلامی انقلاب کے مفہوم کی تعیین کے ساتھ ساتھ اُس کے قرآنی مترادفات کو بھی سمجھ لیا جائے۔

اسلامی انقلاب کا لغوی مفہوم

نحو کی رُو سے 'اسلامی انقلاب' مرکب توصیفی ہے اور اُردو ترکیب کے مطابق اس کا

جزوِ اوّل صفت ہے اور جزوِ ثانی موصوف۔ عربی اور فارسی میں ترتیب اِس کے برعکس ہوتی ہے چنانچہ فارسی میں اِسے 'انقلابِ اسلامی' کہا جائے گا اور عربی میں 'الانقلابُ الاسلامی'۔ انگریزی میں ترتیب اُردو ہی کی طرح ہے۔ چنانچہ 'اِسلامک ریوولیوشن' (Islamic Revolution) میں صفت مقدّم ہے اور موصوف مؤخر!

اِس کے مفہوم و مطلب کی تعیین کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے دونوں اجزائے ترکیبی کے مفہوم کو معیّن کر لیا جائے۔

انقلاب

اِنقلاب عربی زبان کا لفظ ہے اور 'ق ل ب' کے مادّے سے بابِ انفعال کا مصدر ہے۔

اِس مادّے کا بنیادی مفہوم کسی حالت یا کیفیت میں تبدیلی پیدا ہو جانا ہے۔ اور اغلباً دِل کو قلب اِسی لیے کہتے ہیں کہ اِس کی کیفیت ہر وقت بدلتی رہتی ہے اور اِسے کسی حالت پر قرار حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ ہر دم یا پھیل رہا ہوتا ہے یا سکڑ رہا ہوتا ہے! (اِس خالص مادّی اور عضویاتی حقیقت سے قطع نظر نفسیاتی سطح پر بھی اللہ کے ایسے بندے شاذ ہی ہوتے ہیں جنہیں اطمینانِ قلب واقعۃً حاصل ہو جائے۔ اکثر و بیشتر انسانوں کا حال تو حضرتِ اکبؔر کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

"منتشر رہتا ہے مکروہاتِ دنیا سے بہت اِس دلِ مضطر کو یا اللہ اطمینان دے!"

یہی رہتا ہے کہ دِل کو کسی گل چین نصیب نہیں ہوتا۔ چنانچہ 'دل' کے ساتھ ہمیشہ 'مضطرب' اور 'بیقرار' ایسے الفاظ ہی نتھی کیے جاتے ہیں!)

بابِ انفعال کا خاصّہ غیر پر اثر انداز ہونے کی بجائے خود اثر پذیر ہونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لفظِ 'انفعال' خود بھی شرمندگی اور خجالت کے معنی میں اِستعمال ہوتا ہے۔ (جیسے علاّمہ اقباؔل کے نوعمری کے زمانے کے کہے ہوئے اُس شعر میں ہے جس پر حضرتِ داغؔ نے دل کھول کر داد دی تھی یعنی ؎ "موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے"!)

بنا بریں ـــــ 'انقلاب' کے لفظی معنی ہیں: 'بدل جانا یا ہو جانا'، اور 'لوٹ جانا یا لوٹ آنا'، چنانچہ قرآنِ حکیم میں یہ لفظ بائیس ۲۲ مقامات پر ان ہی میں سے کسی معنی میں اِستعمال ہوا ہے۔

اُردو زبان میں یوں تو لفظِ 'انقلاب' اپنے اصل لغوی معنی کے اعتبار سے خالص نجی حالات

اور انفرادی کیفیات کی تبدیلی سے لے کر نظامِ اجتماعی کی ہمہ گیر تبدیلی تک کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کا اطلاق خالص ذہنی و فکری اور نظریاتی و نفسیاتی تغیّر سے لے کر اخلاق و کردار کے جملہ پہلوؤں حتیٰ کہ ریاست و حکومت تک کی تمام سطحوں کی تبدیلیوں پر کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ذہنی انقلاب، فکری انقلاب، نظریاتی انقلاب، اخلاقی انقلاب، عملی انقلاب، سماجی انقلاب، ثقافتی انقلاب، صنعتی انقلاب، معاشی انقلاب، سیاسی انقلاب حتیٰ کہ فوجی انقلاب تک کے الفاظ عام طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

لیکن اصطلاحاً اِس کا اِطلاق کسی ملک یا معاشرے کے اجتماعی نظام میں کسی اساسی نوعیت اور قابلِ لحاظ مقدار کی حامل تبدیلی پر ہوتا ہے!

چنانچہ فرانس کا انقلاب بجا طور پر 'انقلاب' کہلانے کا مستحق ہے۔ اِس لیے کہ اُس کے ذریعے سیاسی نظام میں بنیادی تبدیلی رُونما ہوئی۔ اِسی طرح روس کا اشتراکی انقلاب بھی واقعتہً 'انقلاب' تھا۔ اِس لیے کہ اُس کے نتیجے میں کم از کم معاشی نظام جڑ بنیاد سے تبدیل ہو گیا۔ وقس علیٰ ذالك!

لیکن واقعہ یہ ہے کہ 'انقلاب' کے لفظ کا بہ تمام و کمال اِطلاق اگر ہوتا ہے تو صرف اور صرف اُس ہمہ گیر اور ہمہ جہتی تبدیلی پر جو اب سے چودہ سو سال قبل جزیرہ نمائے عرب میں محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیس سالہ جدّوجہد کے نتیجے میں رُونما ہوئی تھی!

اِس لیے کہ اُس 'انقلابِ محمدیؐ' کے نتیجے میں خالص انفرادی معاملات حتیٰ کہ عقائد و نظریات سے لے کر "قوم و آئین و حکومت" کی بلند ترین سطح تک ہر شے بدل گئی، یہاں تک کہ وہاں شاید خوردبین کے ذریعے ہی کسی ایسی چیز کا سراغ مل سکے جو اپنی سابقہ حالت پر برقرار رہ گئی ہو۔ چنانچہ 'اپنوں' کی مدح و ستائش سے قطع نظر اس کی گواہی موجودہ صدی کے اوائل میں تو دی تھی ایم این رائے ایسے عظیم انقلابی انسان نے اپنی تالیف ——— "Historical Role of Islam" میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلابی رہنما قرار دے کر اور حال ہی میں یہ گواہی زیادہ موثر اور مدلل انداز میں دی ہے ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے اپنی تالیف "The 100"

میں آنحضورؐ کو نسلِ آدم کا عظیم ترین فرد قرار دے کر اور اس کی دلیل کے طور پر اس حقیقت کو پیش کر کے کہ "وہ (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نسلِ انسانی کے واحد فرد ہیں جو بیک وقت مذہبی اور سیاسی دونوں میدانوں میں انتہائی کامیاب ہیں"! (نوٹ: ڈاکٹر ہارٹ نے "Religious and Secular" کے الفاظ استعمال کیے ہیں لیکن اُن کی مراد وہی ہے جو راقم نے بیان کی!)

'انقلاب' اگرچہ عربی زبان کا لفظ ہے لیکن چونکہ ——— اوّلاً یہ قرآن و حدیث میں استعمال نہیں ہوا تھا ——— ثانیاً جب سے یورپ میں انقلابات کے دَور کا آغاز ہوا عالمِ عرب

ع "جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی"!

کے مصداق شدید جمود کی گرفت میں تھا اور غفلت کی گہری نیند میں مدہوش تھا لہٰذا ماضی قریب کی جدید عربی بھی اِس لفظ سے خالی رہی، بلکہ اِس کے برعکس جب مختلف عرب ممالک میں عوامی بیداری پیدا ہوئی اور یکے بعد دیگرے عرب ملکوں میں 'انقلاب' آنے شروع ہوئے تو اُن کے لیے بھی جو لفظ استعمال ہوا وہ 'انقلاب' کا نہیں بلکہ "ثورة" کا تھا اِس لیے کہ اِس لفظ کے اساسی مفہوم میں ہیجانی اور طوفانی کیفیات جزوِ لاینفک کی حیثیت سے شامل ہیں اور عرب عوام کی بیداری کی کیفیت واقعۃً کسی انسان کے گہری نیند سے چونک جانے اور ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھنے بلکہ بھاگ پڑنے کی کیفیت سے مشابہ تھی! ——— تاہم ایک ہندی نژاد عالم و ادیب مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم و مغفور نے اب سے تیس چالیس سال قبل "اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے؟" کا ترجمہ "منہاج الانقلاب الاسلامی" سے کیا تھا اور اب تدریجاً پورے عالمِ عرب میں 'انقلاب' ہی 'ثورہ' کی جگہ لے رہا ہے!

انگریزی زبان کے لفظ "ریوولیوشن" (Revolution) کا معاملہ بھی بالکل اردو کے 'انقلاب' ہی کے مانند ہے۔ چنانچہ مسٹر کرین برنٹن (Mr. Crane Brinton) نے اپنی مشہور تالیف "دی اناٹومی آف ریوولیوشن" (The Anatomy of Revolution) میں اس لفظ پر کئی صفحات میں بحث کی ہے۔ جس کا حاصل وہی ہے جو لفظِ انقلاب کے ضمن میں اوپر بیان ہو چکا ہے۔ البتہ انگریزی زبان کی کم از کم یہ احتیاط قابلِ ذکر ہے کہ اُس میں کسی ملک میں فوجی حکومت کے قیام کو 'انقلاب' یا 'ریوولیوشن' کے لفظ سے تعبیر نہیں کیا جاتا بلکہ اُس کے لیے ایک جُدا گانہ اصطلاح استعمال کی جاتی ہے یعنی "کو ڈی ٹا" (Coup De Tat)۔ اِس لیے کہ اِس صورت میں ملک

ے نظامِ اجتماعی میں کوئی اساسی تبدیلی واقع نہیں ہوتی بلکہ اوپر کے انتظامی ڈھانچے میں ایک
مر کا 'اضافہ' ہوتا ہے!

اِسلام

عُرفی اعتبار سے 'اِسلام' اللہ کے دین کے لیے 'اِسم عَلَم' کی حیثیت رکھتا ہے۔
لفظاً ——— اِسلام 'س ل م' کے مادّے سے بابِ افعال کا مصدر ہے۔ اِس
ے کا اصل مفہوم امن اور سلامتی ہے۔ فعل کی صورت میں جب یہ ثلاثی مجرّد میں اِستعمال ہوتا ہے یعنی
لِمَ یَسْلَمُ' تو اِس کے معنی ہوتے ہیں 'خود سلامتی میں ہونا' اور اِس سے اِسم فاعل بنتا ہے
الِم' جس کے معنی ہیں صحیح و ثابت اور پورے کا پورا بغیر کمی کے ——— اور جب یہ باب
ال سے آتا ہے یعنی 'اَسْلَمَ یُسْلِمُ اِسْلَامًا' تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی دوسرے کو
لامتی دینا یا اُس کے حق میں سراپا سلامتی بن جانا' اور اس سے اِسم فاعل بنتا ہے 'مسلم'۔ یعنی
ِضر اور غیر متحارب!

لفظِ 'اسلام' کے محاوراتی اِستعمالات میں کچھ ایسا مشترک پس منظر سامنے آتا ہے کہ جیسے
فریقوں کے درمیان مقابلہ اور کشاکش جاری ہو اور دفعتہً اُن میں سے ایک مقابلے سے دستکش
کر دوسرے کی اطاعت قبول کرلے۔ اسی لیے فارسی میں 'اِسلام' کے مفہوم کی تعبیر کے لیے
ردن نہادن" اور "سپر انداختن" کے الفاظ اِستعمال ہوتے ہیں۔ اور انگریزی میں اِس کا مفہوم
"To Surrender" اور "To Submit" کے الفاظ سے ادا ہوسکتا ہے۔

جیسے کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے 'اِسلام اللہ کے دین کے لیے اِسم عَلَم کی حیثیت رکھتا
ہے۔ چنانچہ سورۃ آل عمران کی آیت ۱۹ میں مثبت طور پر ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ
الْاِسْلَامُ" (ترجمہ: "یقیناً اللہ کے نزدیک دینِ (حق) اسلام ہے") اور منفی انداز میں آیت ۸۵
میں فرمایا گیا "وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ" (ترجمہ: جو اسلام کے
علاوہ کسی دین کو اختیار کرے گا وہ (اللہ کے ہاں) اُس سے قبول نہیں کیا جائے گا!) ———

---

* "جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی۔ اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے!"

لہٰذا اِس بحث میں لفظِ 'دین' کے لُغوی اور اصطلاحی معنوں پر غور بھی لازمی ہے۔

عربی لُغت میں 'دین' کا اساسی مفہوم بالکل وہی ہے جس میں یہ لفظ 'اساس القرآن' یعنی سورۃ فاتحہ میں استعمال ہوا ہے یعنی بدلہ یا جزا و سزا (اس لیے کہ بدلہ لامحالہ نیکی کا جزا کی صورت میں ہوتا ہے اور بدی کا سزا کی صورت میں۔) چنانچہ قرآن حکیم کی ابتدائی دَور میں نازل ہونے والی متعدد سورتوں میں یہ لفظ بغیر کسی اضافی یا توصیفی ترکیب کے اپنی سادہ اور مفرد صورت میں بدلے اور جزا سزا ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ (جیسے سورۃ الماعون کی آیت ۱، سورۃ التین کی آیت ۷ اور سورۃ الانفطار کی آیت ۹ میں) اور سورۃ الفاتحہ کے علاوہ بارہ مقامات پر یہ لفظ 'یوم' کی اضافت کے ساتھ یومِ قیامت کے معنی میں آیا ہے جو بدلے یعنی جزا و سزا کے فیصلے کا دن ہے! ——— یہاں چاہیں تو عربی کی کہاوت "کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ" (جیسا کرو گے ویسا بھرو گے!) اور حماسہ کے مشہور مصرعے کے الفاظ "دِنّاھم کما دانوا" (ہم نے اُن کے ساتھ وہی کچھ کیا جو انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا) کے علاوہ اس حقیقت کو بھی ذہن میں مستحضر کرلیں کہ عربی زبان میں قرض کو 'دَین' کہا جاتا ہے، اس لیے کہ ہدیہ یا ہبہ کے برعکس اس کا بھی لوٹایا جانا مطلوب ہوتا ہے جیسے کسی عمل کا بدلہ اس کے فاعل کی جانب لوٹتا ہے

اِس لُغوی اساس سے اُٹھا کر قرآن حکیم نے جب لفظِ 'دین' کو اپنی مخصوص اصطلاح کی صورت دی تو اس میں اولاً اطاعت اور تابعداری کا مفہوم پیدا ہوا، اِس لیے کہ بدلے اور جزا و سزا کا تصوّر لازماً مستلزم ہے کسی قانون اور ضابطے اور اُس کی اطاعت یا مخالفت کے تصوّر کو۔ اور بالآخر اُس نے 'نظامِ اطاعت' کے معنی اختیار کر لیے جس کی اضافتِ حقیقی تو اُس ذات کی جانب ہوتی ہے جسے مُطاعِ مطلق مان کر اُس کی رضا و منشا کے مطابق زندگی کا تفصیلی ڈھانچہ اور ضابطہ تیار کیا جائے۔ البتہ اُس کی مجازی اضافت و نسبت اُن لوگوں کی طرف بھی ہو جاتی ہے جو اُس نظامِ اطاعت کو قبول اور اختیار کرلیں۔ چنانچہ قرآن حکیم میں دس مقامات پر 'دین کو اللہ کے لیے خالص کرلینے' کا ذکر ہے اور یہاں ظاہر ہے کہ دین کے معنی 'اطاعت' کے سوا کوئی لیے ہی نہیں جاسکتے! ——— اِسی طرح دین کی اضافتِ مجازی کی مثالیں 'دِیْنِیْ' اور 'دِیْنُکُمْ' اور 'دِیْنُھُمْ' یعنی میرا دین یا تمہارا دین یا اُن کا دین اور حقیقی اضافت

کی مثالیں ہیں 'دِیْنِ الْمَلِکِ' (سورۃ یوسف: آیت ۷۶) یعنی بادشاہ کا دین یا نظامِ شاہی اور دِیْنِ اللّٰہ (سورۃ نصر: آیت ۲) یعنی اللہ کا دین یا 'نظامِ اطاعتِ خداوندی' یعنی 'اسلام'! اِسی پر قیاس کرتے ہوئے عہدِ حاضر کے مقبول ترین نظامِ حکومت یعنی جمہوریت کو قرآنی اصطلاح میں تعبیر کیا جا سکتا ہے 'دِیْنُ الْجُمْهُوْر' سے![1]

الغرض 'اِسلام' نام ہے اُس مکمل نظامِ زندگی کا جو اللہ کو صرف محدود مذہبی معنوں میں معبودِ حقیقی ہی نہیں بلکہ اِس کے ساتھ ساتھ وسیع تر تمدّنی و سیاسی مفہوم میں حاکمِ حقیقی اور مُطاعِ مطلق مان کر اُس کی مرضی و منشا کے مطابق مرتب و منظم کیا جائے اور جو انسانی زندگی کے جُملہ انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں پر حاوی ہو!

اسلامی انقلاب

بنا بریں ——— اِسلامی انقلاب کا مفہوم و مطلب یہ ہے کہ کسی ملک یا معاشرے ں اللہ کی حاکمیت کے اصُول پر مبنی نظام بالفعل قائم ہو جائے۔ اور پُوری قوم یا پُورا معاشرہ دعی طور پر اللہ کے اِقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے اُس کے نظامِ اطاعت کو عملاً قبول کر لے ر جیسے کہ اِس سے قبل 'انقلاب' کے مفہوم کی وضاحت کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے، اِس املے میں اصل اہمیت اِسلام کے نظامِ اجتماعی کی ہے نہ کہ افراد کے عقائد و اعمال کی۔ اِس یے کہ جہاں اُخروی نجات و فلاح کے حصُول اور افراد کی سیرت و کردار کی تعمیر کے اعتبار ے اہم تر معاملہ عقائد اور عبادات کا ہے، وہاں 'انقلاب' کے نقطۂ نظر سے اصل اہمیت اسلام ے نظامِ عدلِ اجتماعی اور دینِ حق کے نظامِ عدل و قسط کو حاصل ہے ——— یہی وجہ ے کہ انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی تکمیل پر 'نظامِ اسلامی' نے اُن لوگوں کے لیے ہ صرف یہ کہ اپنے اندر گنجائش پیدا کر لی تھی جو اِسلام کے عقائد و عبادات کو قبول نہ کریں یعنی

---

[1] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی تالیف "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت"۔

اِسلام کو بطور ’مذہب‘ اختیار نہ کریں بلکہ کسی دوسرے مذہب پر قائم رہیں اور خواہ یہودی رہیں خواہ نصرانی اور خواہ مجوسی رہیں خواہ کچھ اور‘ بلکہ انہیں ایک آئینی و دستوری حیثیت بھی عطا کر دی تھی اور عقائد و عبادات پر مستزاد ’قانونِ شخصی‘ —————(Personal Law) کی حد تک مکمل آزادی بھی دے دی تھی‘ لیکن اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی اور اُس کے محافظ و امین یعنی ’قانونِ مملکت‘ (Law of the Land) ————— کے ضمن میں کسی قسم کی نرمی یا لچک کو گوارا نہیں کیا تھا۔ چنانچہ شریعتِ اسلامی کے فوجداری اور دیوانی قوانین بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں سب پر نافذ تھے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بیان کردہ یہ بنیادی اصول بھی سب کے حق میں یکساں مؤثر اور رائج تھا کہ ————— ”تم میں سے ہر ضعیف میرے نزدیک قوی ہوگا جب تک کہ میں اُسے اُس کا حق نہ دِلوا دوں‘ اور ہر طاقتور کمزور ہوگا جب تک اُس سے حق وصول نہ کر لوں“!

قرآنی اصطلاحات

اب آیئے کہ ہم یہ دیکھیں کہ ’اسلامی انقلاب‘ کے اس مفہوم یعنی حاکمیتِ الٰہیہ کے بالفعل نفاذ اور قوانینِ الٰہیہ کی مطلق اور غیر مشروط و بلا استثناء بالادستی کو قرآنِ حکیم نے کن الفاظ و اصطلاحات کے ذریعے واضح کیا ہے۔

اس ضمن میں تمہیداً اس حقیقت کی جانب اشارہ مفید ہوگا کہ قرآنِ حکیم کے مخصوص اسلوب پر

ع ”اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں“!

کے مصداق ’تصریف‘ یعنی ایک ہی مضمون کو مختلف الفاظ‘ مختلف پیرایہ ہائے بیان اور مختلف ترتیب سے بیان کرنے کو ایک مستقل وصف کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اپنی اساسی اصطلاحات کے ضمن میں بھی قرآن تعدد اور تکثر کو بروئے کار لایا ہے اور ’اسلامی انقلاب‘ کے مفہوم کو کم از کم پانچ مستقل اصطلاحات کے حوالے سے بیان کیا ہے!

① تکبیرِ ربّ

تکبیر کے لفظی معنی ہیں کسی چیز کو بڑا کرنا یا بڑا بنانا، جیسے تصغیر کے معنی ہیں کسی چیز کو چھوٹا کرنا یا چھوٹا بنانا اور تسہیل کے معنی ہیں آسان کرنا یا آسان بنانا۔ چنانچہ عربی زبان کی عام کہاوت ہے: "کَبَّرَنِیْ مَوْتُ الْکُبَرَاءِ" یعنی "مجھے بڑا بنا دیا بڑوں کی موت نے"! لہٰذا تکبیرِ ربّ کے لفظی معنی ہیں اللہ کو بڑا کرنا یا بڑا بنانا اور اس سے مراد ہے وہ نظام بالفعل قائم کرنا جس میں اُس کی بڑائی کو غیر مشروط طور پر تسلیم کیا جائے اور اُس کے اوامر و نواہی اور قواعد و قوانین کو قطعی اور حتمی طور پر بالادستی حاصل ہو۔ بدقسمتی سے ہمارے دَورِ زوال میں تکبیر کے صرف یہ معنی پیشِ نظر رہ گئے ہیں کہ زبان سے 'اللہ اکبر' کہہ دیا جائے اور اللہ کی بڑائی کا اقرار کر لیا جائے۔ حالانکہ حقیقتہً اس میں درجہ بدرجہ اللہ کی بڑائی کو دل سے تسلیم کرنا، زبان سے اس کا اقرار و اعلان کرنا اور اس کے بالفعل نفاذ کی جدوجہد میں تن من دھن لگا دینا سب شامل ہیں۔ یہی حقیقت تھی جسے علامہ اقبال نے اپنے اُس مشہور قطعہ میں بیان کیا تھا کہ ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن　　مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں　　کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اس لیے کہ کسی مسجد کے مؤذن اور میدانِ جہاد میں جان کی بازی لگانے والے مجاہد، دونوں کی اذان کا آغاز 'اللہ اکبر' ہی کے الفاظ سے ہوتا ہے لیکن عام مؤذن اللہ کی کبریائی کا صرف اعلان و اقرار کر رہا ہوتا ہے جبکہ مجاہد اللہ کی کبریائی کے عملی نفاذ کے لیے جان کی بازی لگا رہا ہوتا ہے لہٰذا ان دونوں کے مرتبہ و مقام کا فرق و تفاوت اظہر من الشمس ہے۔ ؏ "گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی!" —— اس مضمون کو علامہ مرحوم نے مزید شکوہ و جلال کے ساتھ یوں بیان فرمایا کہ ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل　　یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست　　یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات!

'تکبیرِ ربّ' کے مفہوم کی اسی عظمت کی مظہر ہیں سورۃ المدثر کی وہ تین ابتدائی آیات جن کے ذریعے، مفسرین اور محققین کے اجماع کے مطابق، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے

پیغمبرانہ مشن کی تکمیل اور فرائض رسالت کی ادائیگی کے لیے عملی جدوجہد کے آغاز کا اولین حکم دیا گیا یعنی:

"یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝"

ان آیاتِ مبارکہ کے ترجمے کو اگر ذرا وضاحت سے بیان کیا جائے تو یوں ہوگا: "اے کپڑے میں لپٹے ہوئے (یعنی اے حکیمانہ غور و فکر یا عاشقانہ سوز و گداز میں مستغرق پیغمبر) کھڑے ہو جاؤ! (یعنی اپنے پیغمبرانہ مشن کی تکمیل اور فرائض رسالت کی ادائیگی کے لیے کمر کس لو) پس خبردار کر دو (یعنی تمہاری اس جدوجہد کا نقطۂ آغاز ہے لوگوں کو بعث بعد الموت، حشر و نشر، حساب کتاب، جزا و سزا اور جنت و دوزخ کے بارے میں متنبہ کر دینا) اور اپنے رب کی تکبیر کرو! (یعنی تمہاری اس جدوجہد کی منزلِ مقصود ہے اپنے ربّ کی کبریائی کا بالفعل قیام و نفاذ ـــــــ یا بالفاظِ دیگر 'اسلامی انقلاب'!)

'تکبیرِ ربّ' کے مفہوم کی یہ عظمت اِس سے بھی بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ سورۃ بنی اسرائیل کی آخری آیت جو نہایت معجزانہ جامعیت کے ساتھ توحید کے علمی اور عملی تقاضوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے ختم ہوتی ہے اِن پُرجلال الفاظ پر کہ "وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا" یعنی "اُس کی بڑائی کرو جیسے اور جتنا کہ اُس کی بڑائی کا حق ہے!" اور ظاہر ہے کہ اللہ کی کبریائی کا حق صرف یہی نہیں ہے کہ اُس کا اقرار کر لیا جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ اُسے انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر بالفعل قبول کیا جائے!

۲ اقامتِ دین

'اسلامی انقلاب' کے لیے دوسری اور اہم ترین قرآنی اصطلاح 'اقامتِ دین' ہے۔ چنانچہ سورۂ شوریٰ کی آیت ۱۳ میں ارشاد ہوتا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ ـــــ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ

"(اللہ نے) راہ ڈال دی (یعنی مقرر کر دیا) تمہارے لیے دین (کے ضمن) میں وہی جس کی تاکید کی تھی اُس نے نوحؑ کو، اور جس کی وحی کی ہم نے (اے نبیؐ) آپ کی جانب، اور جس کی تاکید کی تھی ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو، کہ قائم کرو (یا قائم رکھو) دین کو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو اُس کے بارے میں"!

اِس آیۂ مبارکہ میں اگرچہ بعض نحوی مشکلات ہیں جن کی بنا پر مترجمین کے مابین اِس کے ترجمے میں قدرے اختلاف واقع ہوا ہے لیکن اِس امر پر جملہ مفسّرین و محقّقین کا اجماع ہے کہ مختلف رسُولوں کو عطا ہونے والی شریعتوں کے مابین تو کسی قدر فرق و تفاوت رہا ہے۔ (بفحوائے الفاظِ قرآنی: "لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا" (سورۃ مائدہ آیت ۴۸) لیکن حضرت آدمؑ سے ایں دم تک دین ایک ہی رہا ہے اور اُسی کو قائم رکھنے یا قائم کرنے کا تاکیدی حکم ہر رسُول اور اُس کی وساطت سے اُس کی اُمّت کو دیا جاتا رہا ہے! ــــــ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی ملک کا آئین یا دستورِ اساسی تو قائم و دائم رہے لیکن اُس کے تحت تفصیلی قوانین میں وقتاً فوقتاً ردّ و بدل ہوتا رہے! گویا 'دین' مشابہ ہے دستور کے اور شریعت مشابہ ہے قانون کے۔

اب ظاہر ہے کہ ہر دَور میں اللہ کا دین متشکّل ہوا اُس دور کی شریعت کی صورت میں، لہٰذا ہر دَور میں اقامتِ دین کی واحد صورت یہی تھی کہ اس دَور کی شریعت کو بالفعل رائج و نافذ کیا جائے اور اب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوّت کے ختم اور دین کے کامل ہو جانے کے بعد اقامتِ دین کی کوئی صورت تنفیذِ شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام کے سوائے موجود نہیں ہے!

اُس اصل 'دین اللہ' کی تعبیر کے ضمن میں جو ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور تا قیامت ایک ہی رہے گا، اگر خود قرآن ہی کی جانب رجوع کیا جائے تو سورۃ آل عمران کی آیت ۱۹ کے ابتدائی الفاظ" اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ " کی رُو سے صحیح ترین لفظ 'اسلام' ہے۔ البتہ اکثر محققین نے اُس اصل دین کی تعبیر کے لیے 'توحید' کا لفظ اختیار کیا ہے ــــــ لیکن ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس سے اصل مراد و مطلوب کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اِس لیے کہ توحید کے دو جزو یا رُخ ہیں، ایک علمی و نظری و اعتقادی' اور دوسرا عملی'

اور توحید عملی کا تقاضا انفرادی سطح پر اس کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا کہ انسان بالفعل اور بالکلیہ 'بندۂ رَبّ' بن جاتے اور اجتماعی سطح پر اس کے تقاضے کی تکمیل کی واحد صورت ہے پورے نظامِ اجتماعی پر اللہ کے دین کی بالفعل اور غیر مشروط و بلا استثنار بالادستی یعنی 'تکبیرِ ربّ' یا 'اقامتِ دین' یا 'اسلامی انقلاب'!

رہی یہ بات کہ 'اسلامی انقلاب' یا 'اقامتِ دین' کے اعتبار سے زیادہ اہمیت اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی اور دینِ حق کے نظامِ عدل و قسط کے قیام کو حاصل ہے تو وہ اس سے ثابت ہوتی ہے کہ سورۃ شوریٰ کی آیت ۱۳ میں 'اقامتِ دین' کے تاکیدی حکم کے فوراً بعد آیت ۱۵ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا گیا کہ "وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ" (ترجمہ: اور مجھے حکم ہوا ہے کہ تمہارے مابین انصاف کروں") اور آیت ۱۷ میں بڑے شاہانہ جلال کے ساتھ فرمایا گیا: "اَللّٰہُ الَّذِیْ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ" (ترجمہ: "اللہ وہ ہے جس نے کتاب بھی نازل فرمائی فیصلہ کن بات کے ساتھ اور میزان بھی نازل فرمائی!) ——— اور یہاں ظاہر ہے کہ میزان سے مراد وہ نظامِ عدل و قسط ہے جس میں ہر ایک کے حقوق و فرائض تولے جائیں! (اس موضوع پر مزید گفتگو ان شاء اللہ چوتھی اصطلاح کے ذیل میں ہو گی۔)

③ غلبۂ دینِ حق

'اسلامی انقلاب' کے لیے تیسری اور واضح ترین قرآنی اصطلاح ہے غلبۂ دینِ حق۔ چنانچہ قرآن حکیم میں تین مقامات پر (سورۂ توبہ آیت ۳۳، سورۂ فتح آیت ۲۸ اور سورۃ الصف آیت ۹) یہ الفاظِ مبارکہ بغیر ایک شوشے کے فرق کے وارد ہوئے کہ:

"هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ"

جس کا ترجمہ کسی قدر وضاحتی اضافوں کے ساتھ یوں ہو گا کہ:

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمدؐ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق (اسلام) کے ساتھ تاکہ وہ غالب کر دے اُس کو پورے کے پورے دین پر!"

اس آیۂ مبارکہ کے حتمی اور قطعی مدلول کے بارے میں بھی بہت کچھ قیل و قال پایا جاتا ہے۔
لیکن بادنیٰ تامل معلوم ہو جاتا ہے (اور یہ بلاشبہ اعجازِ قرآن کا ایک اہم مظہر ہے) کہ جملہ احتمالات
اور اختلافات کے باوجود اس کے مراد و مطلوب میں قطعاً کوئی فرق واقع نہیں ہوتا ——————
اس لیے کہ اس کے ضمن میں کُل قیل و قال 'وہ' کی ضمیرِ فاعلی اور 'اُس' کی ضمیرِ مفعولی کے مراجع کی
تعیین کے گرد گھومتا ہے۔ چنانچہ ضمیرِ فاعلی بھی ممکنہ طور پر دو جانب رجوع کر سکتی ہے یعنی اللہ
کی جانب یا رسولؐ کی جانب، اور ضمیرِ مفعولی کے بھی تین مراجع ممکن ہیں، ایک اللہ، دوسرے
رسولؐ اور تیسرے دینِ حق ——— اور ان کا اِحصار کیا جائے تو چھ تراجم ممکن ہیں۔ ۱۔ اللہ
غالب کر دے خود اپنے آپ کو، ۲۔ اللہ غالب کر دے اپنے رسول کو، ۳۔ اللہ غالب کر دے
دینِ حق کو، ۴۔ رسولؐ غالب کر دے اللہ کو (گویا یہ وہی مفہوم ہوا جو 'تکبیرِ رَبّ' کے ضمن میں بیان
ہو چکا ہے) ۵۔ رسولؐ غالب کر دے دینِ حق کو، اور ۶۔ رسولؐ غالب کر دے خود اپنے
آپ کو ——— اور ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ان جملہ ممکنہ صورتوں کا مدلول و مراد ایک ہی ہے
اس لیے کہ ایک طرف ہمارا ایمان ہے کہ اگرچہ عمل پر مکلّف اور اس کے کاسب انسان ہیں لیکن
مؤثرِ حقیقی اور فاعلِ حقیقی اللہ کے سوا کوئی نہیں، چنانچہ سورۃ الانفال کی آیت ۱۷ میں وارد شدہ
الفاظ "فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ
اللّٰهَ رَمٰى" (ترجمہ: "اے مسلمانو! انہیں تم نے نہیں اللہ نے قتل کیا اور اے نبیؐ وہ مشتِ خاک جو
آپ نے پھینکی تھی آپ نے نہیں اللہ نے پھینکی تھی!") اس پر نصِ قطعی کا درجہ رکھتے ہیں! گویا ع
"ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ!" ——— اور دوسری طرف غلبہ اللہ کا ہو یا اس کے
رسول کا یا اس کے دین کا مضمون واحد ہے! فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

قرآن حکیم میں بغیر ایک شوشے کے فرق کے تین بار وارد ہونے والے اِن الفاظِ مبارکہ
کی اہمیت پر اِس وقت تفصیلی روشنی ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ یہ اجمالی اشارہ ضروری ہے کہ
امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے انہیں پورے قرآنِ مجید کا عمود یعنی مرکز و محور قرار دیا ہے
اور فلسفۂ ولی اللّٰہی کے ایک اہم شارح مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے انہیں بین الاقوامی یا
عالمی اسلامی انقلاب کا عنوان قرار دیا ہے۔ اور یہ بات تو ہر انسان بطورِ خود سمجھ سکتا ہے کہ اِن

الفاظِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی اِتمامی اور تکمیلی شا
بیان فرمائی ہے۔ لہٰذا یہ سیرت النبیؐ کے صحیح فہم کے لیے بمنزلۂ کلید ہیں! ——— اور
بات پہلے عرض کی ہی جا چکی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیس سالہ مساعی کے ذری
جزیرہ نمائے عرب میں فی الواقع تاریخ انسانی کا جامع ترین اور محیر العقول انقلاب برپا کیا جس
نہایت وسیع و عریض علاقے تک توسیع ہوئی دورِ خلافتِ راشدہ میں، اور ہم 'استحکامِ پاکستان' م
حوالوں کے ساتھ وہ حدیثیں درج کر چکے ہیں جن کی رُو سے نبی اکرمؐ نے غیر مبہم الفاظ م
پیشگوئی فرمائی ہے کہ قیامت سے قبل دوبارہ پُورے کرۂ ارضی پر دینِ حق کا غلبہ ہو کر رہے گا
اور بقول شاہ ولی اللہ دہلویؒ اُسی وقت سورۃ توبہ، سورۃ الفتح اور سورۃ الصّف کے اِن الفا
مبارکہ کی حقیقت بتمام و کمال جلوہ گر ہو گی! ——— گویا ایک عالمی اسلامی انقلاب اللہ ک
وہ اٹل اور مُبرم تقدیر ہے جو بہر صورت پوری ہو کر رہے گی خواہ یہ بات مشرکوں کو کتنی ہی ناپس
ہو ("وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ") اور خواہ دنیا بھر کے کفار اور غیر مسلم اُس کا راستہ روک
کی کتنی ہی کوشش کر لیں ("وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ") ——— گویا بقول اقبالؔ ؎

تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن پیرانِ کلیسا کی دعا ہے کہ یہ ٹل جائے!

الغرض مستقبل کے عالمی اِسلامی انقلاب کے لیے قرآنِ حکیم کی تیسری اور واضح تری
اصطلاح ہے 'غلبۂ دینِ حق'۔

۴ نصبِ میزانِ عدل

'اسلامی انقلاب' کی چوتھی اور سب سے زیادہ 'انقلابی' تعبیر سورۃ حدید کی آیت ۲۵
میں وارد ہوئی ہے، جس کے بارے میں بلاخوفِ تردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اتنے مختصر
الفاظ میں اتنی بھرپور اور گمبھیر انقلابی عبارت دنیا کے کسی انقلابی لٹریچر میں نہیں مل سکتی۔ فرمایا:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ
وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ
شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ

بِالْغَيْبِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝

اس آیۂ مبارکہ کا ترجمہ بعض تشریحی اشارات کے ساتھ یوں ہوگا:

"یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو روشن نشانیوں (یعنی معجزات وبراہین) کے ساتھ بھیجا۔ اور اُن کے ساتھ اپنی کتاب بھی نازل فرمائی اور میزان بھی، تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں اور (جو لوگ اِس میزانِ عدل کے نصب کرنے میں رکاوٹ بنیں، اُن کی سرکوبی کیلئے) ہم نے لوہا اتارا جس میں (حرب وضرب کی) شدید قوّت ہے اور (اِس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے لیے (کچھ دوسرے) فائدے بھی ہیں۔ اور (اِس سے اللہ کا اصل مقصد یہ ہے) کہ اللہ (ایمان کا دعوےٰ کرنے والوں کو آزمائے اور یہ) دیکھے کہ (اُن میں سے) کون ہیں جو (لوہے کی حربی قوّت کے استعمال کے ذریعے) مدد کرتے ہیں اُس کی اور اُس کے رسولوں کی غیب میں رہتے ہوئے۔ (ورنہ) یقیناً اللہ (خود) نہایت زورآور اور مختارِ مطلق ہے"!

اِس آیۂ مبارکہ نے نہایت واشگاف الفاظ میں واضح کر دیا ہے کہ:

اوّلاً ـــــــ شریعتِ خداوندی کی اصل حیثیت ایک میزانِ عدل وقسط کی ہے جس میں انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی حقوق و فرائض تولے جانے چاہئیں اور جس کا اصل مقصد مرد اور عورت، فرد اور جماعت، اور سرمایہ اور محنت کے مابین حقوق و فرائض کا 'توازن' پیدا کرنا ہے۔

ثانیاً ـــــــ بعثتِ انبیاء و رُسل اور نزولِ وحی و کُتب سے آخری مطلوب یہ ہے کہ اللہ کی عطا کردہ میزانِ عدل وقسط بالفعل نصب ہو اور جسے کچھ ملے اُس میں تُل کر ملے اور جس سے کچھ لیا جائے اُس میں تول کر لیا جائے اور اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو تو ؎

"گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!"

کے مصداق رسولوں کے ساتھ عشق و محبت کے دعوے باطل اور کتابِ الٰہی کی تلاوت و قرأت کا ذوق و شوق بے مقصد ہو جاتا ہے۔

ثالثاً ـــــــ اِس میزانِ عدل وقسط کو عملاً نصب کرنے کے ضمن میں جہاں اصل کام

دعوت و تبلیغ، وعظ و تلقین، انذار و تبشیر اور ترغیب و ترہیب سے لیا جاتے گا وہاں قوتِ طاقت کا استعمال بھی قطعاً غلط یا مطلقاً ناجائز نہیں، بلکہ حسبِ ضرورت نہ صرف جائز بلکہ بعض صورتوں میں فرض اور واجب ہو جاتا ہے۔

رابعاً ——— جس طرح انسان کی حیاتِ دُنیوی کا اصل مقصد از رُوئے قرآن ابتلاء و آزمائش ہے، ——— ذہن میں لائیے سورۃ الملک کی آیت ۲: "خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا" (ترجمہ: "اللہ نے موت و زندگی کا یہ سلسلہ اسی لیے بنایا ہے کہ تمہیں آزمائے کہ کون ہے تم میں بہترین عمل کرنے والا") اور علامہ اقبال کا یہ نہایت حکیمانہ شعر کہ ؎

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اسی طرح انبیاء و رسل کی بعثت اور کتاب و شریعت کے نزول کا مقصد اُن لوگوں کے خلوص اور صداقت کا امتحان ہے جو اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان کے دعوے دار ہوں کہ آیا وہ اللہ کی عطا کردہ میزانِ عدل کو بالفعل نصب کرنے اور اسلام کے نظامِ عدل و قسط کو عملاً نافذ کرنے میں تن من دھن کھپاتے حتّٰی کہ وقت آنے پر نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آتے ہیں یا نہیں!

خامساً ——— وہ صاحبِ ایمان جو اس امتحان میں پورے اُتریں اللہ کے نزدیک بلند ترین مقام و مرتبہ کے مستحق ہوں گے، یہاں تک کہ اللہ اور اُس کے رسولوں کے 'مددگار' قرار پائیں گے۔

قرآن حکیم کے طالب علم جانتے ہیں کہ اس کتابِ عزیز کا ایک مستقل اصول یہ ہے کہ اس میں اہم مضامین کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ چنانچہ بعینہٖ سورۂ حدید کی اس آیت ۲۵ کی طرح سورۂ شوریٰ کی آیت ۱۷ میں بھی کتاب و میزان کا ذکر یکجا وارد ہوا ہے ——— اسی طرح اللہ اور اُس کے رسول کی نصرت کا ذکر جس انداز میں سورۂ حدید کی اس آیت کے آخر میں آیا ہے، بالکل اسی طرح سورۂ صف کی آخری آیت میں بھی وارد ہوا ہے! اور ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ سورۂ صف کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت بیان

ہوا ہے۔ یعنی (ترجمہ) "وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اُسے پورے کے پورے دین پر"۔۔۔۔۔۔ گویا سورۃ شوریٰ میں وارد شدہ اصطلاح اقامتِ دین، سورۃ صف، سورۃ فتح اور سورۃ توبہ میں وارد شدہ تصورِ غلبۂ دین اور سورۃ حدید میں وارد شدہ تعبیر یعنی نصبِ میزانِ عدل، سب کا مراد و معنیٰ ایک ہی ہے یعنی 'اسلامی انقلاب' اور بات وہی ہے کہ ع "اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں"!

۵ دین کا بالکلیہ اللہ کے لیے ہو جانا

کون نہیں جانتا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیس سالہ انقلابی جدّ و جہد کا ایک اہم اور نمایاں مرحلہ قتال فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں جنگ بھی تھا جو اندرونِ ملکِ عرب بھی سوا چھ برس جاری رہا۔ اس لیے کہ پہلا باضابطہ مسلح تصادم رمضان ۲ھ میں بدر کے میدان میں ہوا تھا۔۔۔۔ اور رمضان ۸ھ میں فتح مکّہ کے بعد بھی ۸ھ کے اواخر تک غزوۂ حنین اور محاصرۂ طائف کی صورت میں جاری رہا۔

یہ مرحلہ کب اور کیسے شروع ہوا اور ان سوا چھ سالوں کے دَوران اس میں کیا کیا نشیب و فراز آئے، اس موضوع پر تو مفصل گفتگو آئندہ 'مراحلِ انقلاب' کے ضمن میں ہوگی، اس وقت صرف اس حقیقت کی جانب اشارہ مقصود ہے کہ قتال فی سبیل اللہ کے منتہائے مقصود کے بیان کے ذیل میں، متذکرہ بالا اصول کے عین مطابق، قرآن حکیم میں دو مقامات پر 'اسلامی انقلاب' کے لیے پانچویں اصطلاح وارد ہوئی ہے یعنی یہ کہ:

"فتنہ فرو ہو جائے اور دین بالکلیہ اللہ ہی کے لیے ہو جائے"!

چنانچہ سورۃ الانفال کی آیت ۳۹ میں ارشاد ہوا:

"وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ"

"اور اُن سے جنگ جاری رکھو حتیٰ کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے ہو جائے"!

اور سورۃ البقرہ کی آیت ۱۹۳ میں بھی یہ الفاظِ مبارکہ صرف ایک لفظ 'کُلُّہٗ' کے سوا جُوں کے تُوں وارد

ہوتے ہیں۔

یہ بات تو اِس سے قبل وضاحت کے ساتھ عرض کی ہی جا چکی ہے کہ 'دین' اِصطلاحِ قرآنی میں 'نظامِ اطاعت' کے ہم معنی ہے اور دین کے بالکلیہ اللہ کے لیے ہو جانے کا مفہوم یہ ہے کہ نظامِ اجتماعی اپنے جملہ پہلوؤں سمیت بالکلیہ و بلا استثناء اطاعتِ خداوندی کا پابند اور احکامِ خداوندی کے تابع ہو جائے۔ جہاں تک احوالِ شخصیہ کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ اِس معاملے میں مسلمان تو لامحالہ اللہ کے دین کے تابع ہی ہوں گے، البتہ غیر مسلم اِس معاملے میں مستثنیٰ رہیں گے، چنانچہ عقائد، عبادات اور دیگر شخصی معاملات میں اُنہیں آزادی حاصل رہے گی۔

'فتنہ' عربی زبان میں کسوٹی کو کہتے ہیں جس پر رگڑنے سے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کیا جا سکتا ہے اور اِصطلاحِ قرآنی میں ہر وہ شے یا امر یا حالت و کیفیت 'فتنہ' ہے جس سے کسی صاحبِ ایمان کا ایمان اِمتحان اور آزمائش سے دوچار ہو جائے! ـــــــ چنانچہ ایک جانب وہ تمام چیزیں فتنہ کے حکم میں ہیں جن کی جانب میلان اور رغبت انسان میں طبعی طور پر موجود ہے، جن میں سرِ فہرست ہیں مال اور اولاد ـــــــ اور دوسری جانب معاشرے پر غیر اسلامی رجحانات کا غلبہ اور ریاست و حکومت پر غیرُ اللہ کا حاکمانہ تسلّط عظیم ترین فتنہ ہیں اور اِسی کو فرو کر کے نظامِ اجتماعی پر احکامِ خداوندی کی بالادستی کا بالفعل قیام ہی قتال فی سبیل اللہ کا آخری ہدف ہے۔

⑥ حدیثِ نبویؐ کی اصطلاح

اعلاءِ کلمۃ اللہ

قتال فی سبیل اللہ ہی کے ضمن میں اِمام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں متعدد ابواب میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت درج کی ہے کہ اِس سوال کے جواب میں کہ کوئی شخص مالِ غنیمت کے حصول کی نیت سے قتال فی سبیل اللہ میں حصّہ لیتا ہے، کوئی کسی قومی یا علاقائی حمیت و عصبیت کی بنا پر جنگ میں شرکت کرتا ہے، کوئی محض اپنی شجاعت کے اظہار اور شہرت کے حصول کے

یے داد شجاعت دیتا ہے تو ان میں سے فی الواقع "اللہ کی راہ" میں کون ہے؟ آنحضور صلی اللہ علیہ
لم نے فرمایا:

"مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِي سَبِيْلِ اللهِ"

"جو جنگ کرے صرف اِس مقصد کی خاطر کہ اللہ کی بات سب سے اُونچی ہو جائے وہی
اللہ کی راہ میں ہے!"

واضح رہے کہ سورۃ توبہ کی آیت ۴۰ میں یہ حقیقت جُملۂ اِسمیہ کی صورت میں ایک امرِ واقعی
ے طور پر بیان ہوئی ہے کہ "وَكَلِمَةُ اللهِ هِيَ الْعُلْيَا" ترجمہ: "اللہ کی بات تو سب سے
ی ہے ہی!" ——— گویا جیسے "تکبیرِ رَبّ" کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اگرچہ آسمانوں
زمین میں کبریائی' استحقاقاً (De Jure) بھی اللہ ہی کے لیے ہے اور بالفعل (De Facto)
ی اللہ ہی کے لیے ہے لیکن انسانی زندگی کے محدُود سے اختیاری دائرے میں بالعموم انفرادی
اجتماعی دونوں سطحوں پر اللہ کی کبریائی کو چیلنج کر دیا جاتا ہے، لہٰذا بندۂ مومن کا فرض ہے کہ اللہ
ے ساتھ اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے اِس چیلنج کا مقابلہ کرے اور کم از کم نظامِ اجتماعی
للہ کی کبریائی کو بالفعل نافذ کر دے' اُسی طرح اگرچہ فی الحقیقت تو اللہ ہی کی بات سب سے
ی ہے لیکن چونکہ بالعموم اِنسان اپنے نفس کی خواہشات و شہوات اور اپنے ذہن کے تراشیدہ
ریات و قوانین کو اللہ کی بات سے بلند تر کر دیتے ہیں لہٰذا جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی غرض و
یت یہ ہے کہ "حق بحقدار رسید" والا معاملہ ہو اور اللہ کی بات سب سے اونچی اور اللہ کا جھنڈا
ب سے بلند ہو جائے اور اِسی کا نام 'اسلامی انقلاب' ہے!

۷ انجیل کی اصطلاح

خدائی بادشاہت

انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ الصّلوٰۃ والسلام کے مواعظ و نصائح میں جا بجا خدا کی بادشاہی
ر آسمانی بادشاہت کا ذکر آتا ہے اور اگرچہ بعض مواقع پر اُس کے مفہوم کے تعین میں کوئی متصوفانہ

یا اِس عالَم سے ماورائی (Other-Worldly) تعبیر اختیار کرنے کی گنجائش ہوتی ہے لیکن متی کی انجیل میں شامل مشہور و معروف "پہاڑی کے وعظ" (Sermon of the Mount) میں وارد شدہ حسب ذیل الفاظ کے بارے میں تو ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش موجود نہیں ہے کہ ان کا مفہوم بالکل وہی ہے جو تکبیر ربّ کا، یا اقامتِ دین کا، یا غلبۂ دینِ حق کا، یا اعلاءِ کلمۃ اللہ کا:

"Thy Kingdome come.
Thy will be done in earth as it is in heaven."

(Mathew 6:10 — King James version)

ترجمہ: "اے ربّ! تیری بادشاہت آئے۔ (اور) تیری مرضی زمین میں بھی (اسی طرح) چلے، جیسے آسمان میں چلتی ہے!"

واضح رہے کہ یہ الفاظ اُس "Lord's Prayer" میں شامل ہیں جس کی حیثیت و اہمیت عیسائیوں کے یہاں بالکل وہی ہے جو ہمارے یہاں سورۃ فاتحہ کی!

راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ اب سے لگ بھگ پچیس سال قبل جب راقم نے نہایت انہماک سے انجیل کا مطالعہ کیا تھا تو حضرت مسیح کے مواعظ میں "Kingdom of Heaven" بلکہ "Kingdom of Heaven on Earth" کے الفاظ بھی پڑھنے میں آتے تھے، لیکن ان سطور کی تحریر کے وقت فوری طور پر ان کا حوالہ نہیں مل سکا — بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ 'اسلامی انقلاب' کے لیے انجیل کی قدیم اصطلاح ہے: "خدائی بادشاہت کا قیام!"

بیسویں صدی عیسوی کی اصطلاحات

راقم الحروف اپنی تحریر "اُمّتِ مسلمہ کا عروج و زوال"[1] میں تفصیلاً اور اپنی تالیف "استحکامِ پاکستان" میں اختصاراً عرض کر چکا ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کو اُمتِ مسلمہ کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس صدی کے اوائل میں (پہلی جنگِ عظیم کے بعد) اُمتِ مسلمہ

---

[1] یہ تحریر اردو میں راقم کی تالیف 'سرافگندیم' میں شامل ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی 'The Rise And Fall of the Muslim Ummah' کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔

اپنی چودہ سو سالہ تاریخ کے دوسرے دورِ زوال کی انتہا تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے بعد کے پچاس ساٹھ سال کا عرصہ ایک عجیب نقشہ پیش کرتا ہے، یعنی یہ کہ ایک جانب زوال کے سائے بھی مزید گہرے ہو رہے ہیں تو دوسری جانب ایک ہمہ جہتی احیائی عمل کا آغاز بھی ہو گیا ہے۔ اور اُمتِ مسلمہ بحیثیتِ مجموعی اپنے تیسرے اور آخری عروج کی جانب پیشقدمی شروع کر چکی ہے۔ اس گمبیر احیائی عمل میں جہاں قومی اور سیاسی تحریکیں بھی برسرِ کار رہیں، اور مذہبی اور اصلاحی تحریکیں بھی پروان چڑھیں وہاں ایسی خالص احیائی و انقلابی تحریکوں کا بھی آغاز ہوا جن کا مطمعِ نظر دینِ حق کی کامل تجدید یا کُلّی اسلامی انقلاب تھا۔ اِن تحریکوں کے داعیوں نے اُسی ضرورت کے پیشِ نظر جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، یعنی یہ کہ ہر دَور میں ابلاغ کا حق ادا کرنے کے لیے اُس دَور کے مخصوص محاورے (Idiom) میں کلام لازم ہوتا ہے 'تکبیرِ رَبّ' یا اقامتِ دین' یا غلبۂ دین' یا اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے مختلف اوقات و مراحل پر مختلف اصطلاحات کو ابلاغِ عام کا ذریعہ بنایا جن میں سے تین درج ذیل ہیں۔ (تاکہ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۹۶ میں وارد شدہ الفاظ "تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ" سے مشابہت پیدا ہو جائے۔)

⑧ حکومتِ الٰہیہ کا قیام

اِن میں سے اہم ترین اصطلاح جسے اِس صدی کے اوائل میں متعدد اصحابِ دعوت و عزیمت نے استعمال کیا، 'حکومتِ الٰہیہ کا قیام' ہے۔

اِس اصطلاح کو سب سے پہلے 'الہلال' اور 'البلاغ' کے مدیر اور 'حزب اللہ' کے مؤسّس و امیر مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم نے استعمال کیا تھا۔ پھر جب وہ بعض علماء کی مخالفت و مزاحمت سے بددل ہو کر بالکلیہ جہادِ حرّیت میں مصروف اور انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو گئے تو اُن کے مشن کو اُن ہی کی ایجاد کردہ اصطلاح کے حوالے سے ازسرِ نو شروع کیا مولانا ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم' مدیرِ 'ترجمان القرآن' اور بانیٔ جماعتِ اسلامی نے' اِسی طرح اِس اصطلاح کو اختیار کیا خاکسار تحریک کے داعی و سربراہ علاّمہ عنایت اللہ مشرقی مرحوم کے علاوہ بعض دوسرے نسبتاً غیر معروف اصحاب مثلاً خیری برادران وغیرہم نے!

اِس اصطلاح کے پس پردہ دو حقائق لائقِ توجہ ہیں:

ایک یہ کہ چونکہ عالمی سطح پر یہ دَور سیاسی تحریکوں کا تھا جن کا ہدف حکومت ہوتی ہے (معاشی تحریکوں کا معاملہ ابھی صرف یورپ تک محدود تھا جہاں 'انقلاب روس' ابھی تازہ تازہ ہی برپا ہوا تھا) لہٰذا 'حکومتِ الٰہیہ' کا لفظ نہایت آسان اور قریب الفہم تھا!

دوسرے یہ کہ اُس دَور میں پورا عالمِ اسلام یورپ کی عیسائی اقوام کے زیرِ تسلّط تھا اور بالخصوص ہندوستان تو انگریزوں کا براہِ راست غلام تھا، جنہوں نے یہاں عیسائیت کی تبلیغ کا سلسلہ بھی پورے زور شور سے جاری کر رکھا تھا ——— لہٰذا اِس پس منظر میں 'حکومتِ الٰہیہ' کا لفظ ہی موزوں ترین تھا، اِس لیے کہ یہ پُورا ہم پلہ اور کامل مدِمقابل تھا 'خدائی بادشاہت' کا!

بہرحال بیسویں صدی عیسوی کے نصفِ اوّل کے دَوران جملہ احیائی وتجدیدی مساعی کے آخری ہدف اور نصب العین کی تعبیر کے لیے سب سے زیادہ استعمال ہونے والی اصطلاح حکومتِ الٰہیہ کا قیام تھی! ——— اگرچہ جماعتِ اسلامی کی حد تک مولانا امین احسن اصلاحی کی شمولیّت کے بعد سے اُن کے زیرِ اثر اِس کی جگہ 'اقامتِ دین' کی ٹھیٹھ قرآنی اصطلاح استعمال ہونے لگی اور تاحال جماعت کے اصحابِ علم و دانش کے حلقے میں اِسی کا سکّہ رواں ہے۔

⑨ قیامِ نظامِ اسلامی

۴۸-۱۹۴۷ء میں جب جماعت اسلامی پاکستان نے پاکستان کی عملی سیاست کے میدان میں اُترنے کا فیصلہ کیا تو فطری طور پر 'حکومتِ الٰہیہ' اور 'اقامتِ دین' کی جگہ کسی ایسی اصطلاح کی ضرورت محسوس ہوئی جو زیادہ آسان اور عوام النّاس کے لیے قابلِ فہم ہو۔ چنانچہ پاکستان میں مولانا مودودی مرحوم کی پہلی عوامی تقریر کا عنوان قرار پایا "مطالبۂ نظامِ اسلامی"۔ اور اِس کے بعد لگ بھگ رُبع صدی تک یہی اصطلاح جماعت کے عوامی مقرّروں کی تقریروں کا عنوان بنی رہی چنانچہ اُس دَور کے لسان طائف، جناب نعیم صدیقی نے اپنی ایک رجزیہ نظم میں فرمایا تھا:

"بول شہرِ نظامِ اسلامی ۔۔۔ کیا ترے سقف و بام کہتے ہیں!
تیرے در پر کھڑے ترے والی ۔۔۔ آج تجھ کو سلام کہتے ہیں!!"

⑩ نفاذِ نظامِ مصطفےٰ

اِس سلسلے کی آخری اِصطلاح 'نفاذِ نظامِ مصطفےٰ' صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو ۱۹۷۷ء میں 'متحدہ قومی محاذ' (P.N.A.) کی تحریک کا عنوان بنی اور جس سے کچھ عرصے کے لیے پاکستان کا کا طول و عرض اُسی طرح گونج اُٹھا جیسے ۴۷-۱۹۴۶ء میں پورا برِعظیم پاک و ہند "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" کے نعرے سے گونج اُٹھا تھا ـــــــ اور اُس موقع پر 'نظامِ اسلامی' کی جگہ 'نظامِ مصطفےٰ' کی اصطلاح کچھ تو اس بنا پر اختیار کی گئی کہ عوامی تحریکوں میں جذبات کا معاملہ بہت اہم ہوتا ہے اور ہر مسلمان کو قطع نظر اس سے کہ وہ باعمل ہو یا بے عمل، اور متقی ہو یا فاسق و فاجر، بہر صورت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات سے جو جذباتی وابستگی ہے اُس کی بنا پر اُس کے جذبات میں جو اہتزاز و ارتعاش نظامِ مصطفےٰ کے الفاظ سے ہوتا ہے وہ نظامِ اسلامی سے نہیں ہوتا ـــــــ اور دوسرا اور اہم تر معاملہ جماعتی اور فرقہ وارانہ مصلحتوں کا تھا۔ اِس لیے کہ نظامِ اسلامی کے الفاظ سے جس جماعت کی طرف ذہن لامحالہ منتقل ہوتا ہے وہ ہے جماعتِ اسلامی جبکہ نظامِ مصطفےٰ کی اِصطلاح ایجاد ہے بریلوی مکتبِ فکر کے علماء و قائدین کی۔

بہر حال ہماری موجودہ بحث کی حد تک اِس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اِس لیے کہ ہمارے پیشِ نظر اِس وقت صرف اِس امر کی وضاحت ہے کہ اگرچہ 'اسلامی انقلاب' بلاشبہ ایک جدید اور حادث اِصطلاح ہے تاہم اِس کا مفہوم قدیم ہے ـــــــ اور وہ وہی ہے جو قرآنی مصطلحات تکبیرِ رب، اقامتِ دین، غلبۂ دینِ حق، نصبِ میزانِ عدل، اور "یَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ" ـــــــ اور حدیث نبوی کی اِصطلاح "لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا" کا ہے۔ ور اس کا مطلوب و مقصود وہی ہے جو انجیل کی اِصطلاح میں 'خدائی بادشاہت'، اور بعض دینی تحریکوں کی اختیار کردہ اِصطلاح کے مطابق 'حکومتِ الٰہیہ' ـــــــ 'نظامِ اسلامی' اور 'نظامِ مصطفےٰ' کے یام کا ہے!

ـــــــ آئندہ باب میں اِن شاء اللہ العزیز، ہم یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ ں نظامِ عدلِ اجتماعی کے بنیادی اصول کیا ہیں جس کا قیام 'اسلامی انقلاب' کا مقصود و مطلوب ہے ور اُس سیاسی، معاشی اور سماجی نظام کے اہم خدوخال کیا ہوں گے جو اُس کے نتیجے میں قائم ہوگا۔ تاکہ 'اسلامی انقلاب: کیا؟' کا جواب مکمل ہو جائے۔

○○○

امیرِ تنظیمِ اسلامی کے ساتھ سندھ میں بارہ دِن

مقبول الرحمٰن مفتی

گزشتہ سال امیرِ تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو پہلی مرتبہ سکھر ڈویژن کے چار مقامات
ندھ کوٹ، مبارکپور، گاڑھی موری اور سکھر کے دورے کے دوران اندرونِ سندھ کے عوام سے
ہ راست رابطے اور تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ جس کے نتیجے میں حالات کی سنگینی اور جذبات کی شدت
سوس کرتے ہوئے انہوں نے ۹ رمئی ۸۶ء کو جامع دارالسلام باغِ جناح میں خطبہ جمعہ کے دوران
س عزم کا اظہار کیا کہ آئندہ انشاءاللہ وہ قیامِ لاہور کے دوران ہر ماہ دس روز اندرون سندھ کے لئے
ف کیا کریں گے۔ لیکن اس اعلان کے بعد پے بہ پے ایسے حالات رونما ہوتے رہے کہ اس وعدے
ے ایفاء کی صورت پیدا نہ ہوسکی۔ اس خطاب کے دو ہی روز بعد رمضان کا آغاز ہوگیا اور یہ پورا
مضان دورہ ترجمۂ قرآن کے پروگرام کے لئے کراچی میں گزرا۔ عیدالفطر کے فوراً بعد جون کے اواخر میں
اکٹر اسرار احمد صاحب اور انجمن خدام القرآن کے ناظم اعلیٰ جناب قمر سعید قریشی سکنڈے نیوین ممالک
ے دورے پر روانہ ہوگئے۔ جولائی اور اگست ۸۶ میں کینیڈا اور شمالی امریکہ کے ۴۲ روزہ دورے
پروگرام تو بہت پہلے سے طے تھا۔ ۲۲ ر اگست کو اس دورے کے اختتام پر عمرے کی ادائیگی کے بعد
محترم اور جناب قمر سعید قریشی واپس لاہور پہنچے۔ ستمبر میں لاہور میں بالخصوص اور پنجاب کے کچھ دوسرے
ہروں میں شیعہ سنی تصادم کے بعد امیرِ محترم کے کراچی داخلے پر پابندی عائد کردی گئی اور سندھ کے
ن دیگر مقامات پر بھی جانے کا پروگرام بنایا گیا وہیں وہیں پابندی عائد ہوتی چلی گئی۔ پھر ۲۷ ستمبر کو امیرِ محترم
ے بھانجے عبداللہ طاہر سیال اور داماد محمد حمید احمد کی اندوہناک حادثاتی اموات کا سانحۂ جانکاہ پیش آگیا۔
یا تھا "درد بر درد دگر زخمے بجائے مرہمے" کی سی کیفیت کا سامنا تھا۔ غم واندوہ کی اسی کیفیت
ے ساتھ ڈاکٹر صاحب نومبر میں عازمِ حجاز ہوئے تاکہ عمرے کی سعادت حاصل کرنے کے بعد
خانۂ خدا" میں بیٹھ کر اس تعلق کے دین کو غالب کرنے کی جدّوجہد یعنی اسلامی انقلاب کے مراحل
ہ نقشہ سپردِ قلم کریں جو آن کی عمر بھر کی سوچ اور جستجو کا حاصل ہے۔ لیکن کراچی کے حالات سے

ان کی طبیعت اس قدر متاثر ہوئی کہ "اسلامی انقلاب کیا۔ کیوں اور کیسے" کی بجائے اُن کا
"استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ" کی تعریف کی طرف چل نکلا۔
روزنامہ "جنگ" کے تمام ایڈیشنوں میں اس کتاب کی بالاقساط اشاعت اور کتابی صو
میں بھی ایک ماہ سے کم مدت میں اس کے پہلے ایڈیشن کی ہاتھوں ہاتھ پذیرائی کے بعد ڈاکٹر ص
نے ضرورت محسوس کی کہ انہوں نے سندھ سے باہر لاہور میں بیٹھ کر جو تجزیہ پیش کیا ہے اُس کے
ردِّعمل کا بچشم خود مشاہدہ کریں۔ یوں مئی ۱۹۸۶ء میں کئے گئے اس وعدے کی تکمیل کی صورت
فروری ۱۹۸۸ء میں پیدا ہوگئی۔
دورۂ سندھ کے اس بارہ روزہ پروگرام کا آغاز ۸ رفروری کو کراچی میں رفقاء کے اجتم
سے ہوا۔ امیر محترم نے اجتماع کے آغاز پر رفقاء کو سوالات اور تبادلۂ خیال کی دعوت دیتے ہوئے
کہا کہ اب تنظیمی اجتماعات میں مَیں نے تقریر یا درس کا سلسلہ بند کر دیا ہے کیونکہ جو فکری اور علمی ر
میں دینا چاہتا ہوں وہ تفصیلی طور پر ریکارڈ شدہ کیسٹوں میں موجود ہے۔ ان اجتماعات کا بنیاد
مقصد عملی مشکلات کو سمجھنا اور ایک دوسرے کے خیالات سے آگاہی حاصل کرنا ہے۔ پھر ا
نے مسئلۂ سندھ اور مہاجر قومی موومنٹ کے بارے میں رفقاء سے اُن کے اپنے اور عوام کے
تاثرات دریافت کئے۔ اگرچہ تقریباً ستر کے لگ بھگ رفقاء کے اجتماع میں کوئی صاحب
صورت حال پر بھرپور روشنی تو نہ ڈال سکے۔ البتہ مختلف حضرات نے مختلف گوشوں اور پہلوؤں پر
روشنی ڈالی۔ کئی رفقاء نے متحدہ شریعت محاذ کی جدوجہد کے بارے میں اور امیر تنظیم کی طرف
ایم آر ڈی کے سیاسی مؤقف کی حمایت کے بارے میں الجھنوں کا اظہار کیا۔ جب ڈاکٹر صاحب
ملک میں سیاسی عمل کی آزادی کی اہمیت اور ملکی سالمیت کے لیے اس کی ضرورت پر روشنی ڈا
دو رفقاء کی طرف سے بالکل مختلف آراء کا اظہار ہوا۔ ایک صاحب کا کہنا تھا کہ اگر ملکی سالمیت
لئے سیاسی آزادیوں کا حصول اتنا ہی لازم اور لابدی ہے تو ہمیں تائید و حمایت سے بڑھ کر اس
عملاً حصہ لینا چاہیئے۔ یعنی ایم آر ڈی کی تحریک میں شامل ہو جانا چاہیئے۔ جبکہ ایک رفیق کی را
تھی کہ ڈاکٹر صاحب کی سیاسی پیش قدمی کی رفتار تنظیم اسلامی کے ڈھانچے اور رفقاء کے سی
شعور سے کہیں آگے ہے۔ امیر محترم نے اس بحث کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مختلف رفقا
کو اظہار خیال کرنے کی دعوت دی۔ آخر میں شیخ جمیل الرحمٰن صاحب اور ڈاکٹر تقی الدین صاح
نے اظہار خیال کیا اس بحث سے یہی عمومی رائے سامنے آئی کہ اس وقت تنظیم کی پالیسی اور رفقا

مجموعی اعتبار سے درست ہے۔ اس وقت اس سے بڑھ کر کوئی قدم اٹھانا مناسب نہیں ہوگا۔ بلکہ سردست ہمیں عملاً اپنی ساری توجہ دعوت و تنظیم اور رفقاء کی ذاتی اصلاح اور تزکیہ پر مرکوز رکھنی چاہیئے۔

۹ فروری کا دن سراج الحق سیّد صاحب کی رہائش گاہ پر کراچی کے ذمّہ دار حضرات کے ساتھ مشورے میں گزرا جس کے دوران مسئلہ سندھ کے حوالے سے آنے والے حضرات کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اگرچہ پروگرام کے مطابق رات کو تاج محل ہوٹل میں "الھدیٰ" کے سلسلہ درس قرآن طے تھا لیکن ہوٹل کی انتظامیہ کی فروگذاشت کی وجہ سے کسی دوسرے پانچ روزہ پروگرام کے لئے ڈبل بکنگ ہوجانے کی وجہ سے درس کے پروگرام کو مدینہ مسجد فیڈرل بی ایریا میں منتقل کرنا پڑا۔ جہاں امیر محترم نے 'غلبۂ دین کیا؟ کیوں اور کیسے؟' کے عنوان سے مراحل انقلاب کی تشریح و تفصیل بیان کی۔ خطاب کے آخر میں اعلان کیا گیا کہ جو حضرات اس درس یا 'مسئلہ سندھ' کے بارے کوئی سوال یا گفتگو کرنا چاہیں وہ اگلے روز تنظیم اسلامی کراچی کے دفتر تشریف لائیں۔ جہاں صبح دس بجے سے ایک بجے تک ڈاکٹر اسرار احمد صاحب انفرادی طور پر آنے والوں سے ملاقاتیں کریں گے۔

دس فروری کو مولانا عبدالقدوس ہاشمی صاحب سے مختصر ملاقات کرتے ہوئے دفتر پہنچے جہاں کچھ لوگ امیر محترم سے ملاقات کیلئے منتظر تھے۔ ایک بجے تک ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ملاقات کے لئے آنے والوں کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ اکثر حضرات کی گفتگو مہاجرین کے حقوق اور قومی تحریک کے محرکات و عوامل کے گرد ہی گھوم رہی تھی۔ اگرچہ ان میں تنظیم کے کچھ رفقاء بھی شامل تھے لیکن سب حضرات کے جذبات اور رائے پر کراچی کے حالات و حادثات اور ماحول کی کشیدگی کے اثرات نمایاں تھے۔ آخر میں ایک دینی دارالعلوم کے دو طالب علم بھی تشریف لائے۔ جنہوں نے تنظیم اسلامی، اقامت دین اور تفسیر بالرائے کے بارے میں بڑی سنجیدہ اور پُرمغز گفتگو کی۔

ملاقاتوں سے فارغ ہو کر نماز ظہر کے وقت واپس پہنچے تو حضرت مولانا عبداللہ درخواستی کے فرزند رشید مولانا فداء الرحمٰن درخواستی صاحب کی طرف سے ٹیلی فون پر شدید تقاضا ہوا کہ آج رات بعد نماز عشاء میر پور خاص میں شریعت محاذ کے جلسہ عام میں ڈاکٹر صاحب ضرور تشریف لائیں جبکہ مغرب کے بعد ڈیفنس سوسائٹی میں فاران کلب کے زیر اہتمام ایک خطاب کا پروگرام پہلے سے طے تھا جس کے لئے دعوت نامے بھی جاری کئے گئے تھے اور اخبار میں اشتہار بھی چھپ چکا تھا

اس عقدے کو سلجھانے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے خود مولانا فدا الرحمٰن درخواستی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا فیصلہ کیا تاکہ بالمشافہ گفتگو کر کے معذرت کی جائے۔ لیکن ملاقات کے دوران کچھ ایسی صورت بنی کہ انکار کرنا بھی ممکن نہ رہا۔ اس لئے یہ طے ہوا کہ فاران کلب میں تقریر سے فارغ ہوتے ہی میرپور خاص کے لئے روانہ ہوں گے۔ فاران کلب کے جلسے میں "وحدتِ ملی اور سیرتِ رسولؐ" کے عنوان پر خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے بیسویں صدی کے اوائل سے لے کر اب تک مغربی استعمار کی اُن سازشوں کا ذکر کیا جن کے نتیجے میں عالم اسلام کی وحدت پارہ پارہ ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ ہمارا موجودہ قومی انتشار بھی اُسی تخریبی عمل کا ایک تسلسل ہے۔ لیکن اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ انحطاط اور تخریب کے ساتھ ساتھ ایک احیائی اور تعمیری عمل بھی غیر محسوس طریقے سے جاری ہے۔ جس کے نتائج انشاء اللہ اپنے وقت پر رونما ہوں گے۔ البتہ فوری طور پر قومیتوں کے تصوّر کا علاج اُن کی کامل نفی کے ذریعے بھی ممکن نہیں ہے۔ ہمیں اسلام اور پاکستان کی حدود میں رہتے ہوئے ملک کے تمام علاقوں کے لوگوں کی شکایات کو سننا چاہیئے اور اُن کے ازالے کے ساتھ ساتھ ان کی زبان ثقافت اور روایات کو بھی مناسب تحفظ دینا چاہیئے۔ اس خطاب کا اختتام پونے آٹھ بجے ہوا۔ مولانا فدا الرحمٰن درخواستی مدظلہ کی بھیجی ہوئی گاڑی پہنچ چکی تھی۔ جلسہ گاہ سے نکلتے نکلتے آٹھ بج گئے۔ اس سفر میں جناب مختار حسین فاروقی بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ ساڑھے تین گھنٹے کی نان سٹاپ ڈرائیونگ اور ڈیڑھ سو میل کا سفر طے کر کے رات ساڑھے گیارہ بجے میرپور خاص کے سبزی منڈی چوک میں پہنچے تو متحدہ شریعت محاذ کا جلسہ جاری تھا۔ محاذ کے سیکرٹری جنرل اور جماعتِ اسلامی پاکستان کے قیم قاضی حسین احمد صاحب کا خطاب آخری مرحلے میں تھا۔ ہم سیدھے سٹیج پر پہنچے۔ تقریباً دس منٹ بعد ڈاکٹر صاحب کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ اور تھکاوٹ کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے نہایت جم کر بھرپور انداز میں ۴۵ منٹ تک خطاب کیا۔ غالباً شریعت محاذ کا یہ پہلا جلسہ تھا جس میں امیر محترم نے شریعت بل اور اس کی منظوری کی جدّ و جہد کے مختلف پہلوؤں پر جامع اور مدلّل تبصرہ کیا۔ متحدہ شریعت محاذ کی تین اہم خصوصیات جن کا اجمالی تذکرہ امیر محترم نے پشاور میں محاذ کے جلسہ عام میں اپنے مختصر ترین خطاب میں پہلی مرتبہ کیا تھا ان کو یہاں قدرے وضاحت سے بیان کیا۔ یعنی ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی رہائی کے بعد اور ان کی سربراہی اور سرپرستی میں منعقد ہونے والے جمعیت علمائے ہند کے کل ہند اجتماعات کے بعد برِ عظیم پاک و ہند کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ تمام مکاتیب فکر کے جید علمائے کرام کسی وقتی اور ہنگامی مقصد یا کسی

ایک مسئلے کی بجائے پوری شریعت کے نفاذ کے لئے متحد ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ سیاسی مسائل سے قطع نظر کرتے ہوئے اس میں صرف دینی جماعتیں شامل ہیں جو واقعتہً دین کے نفاذ کی علمبردار ہیں اور تیسری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ اس محاذ کی قیادت بھی کلیتہً علمارکرام کے ہاتھ میں ہے۔ اگر ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تجویز کے مطابق علمارکرام قیادت کے مسئلے پر متفق ہو جاتے تو نہ صرف برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ بہت مختلف ہوتی بلکہ ہندوستان کی جدّوجہد آزادی کا فیصلہ بھی بہت پہلے ہو جاتا۔ نفاذِ شریعت کا مفہوم واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ ہماری جدّوجہد کا مقصد صرف چند سزاؤں اور اسلامی حدود کا نفاذ نہیں بلکہ ہم اس پورے نظام کو اس کی جڑوں سمیت بدلنا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں زرعی زمینوں کے معاملے اور ان کے بل پر جاگیرداروں کے ملک کی سیاست و حکومت پر قابض ہونے کے مسئلے کو مثال کے طور پر بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتی رائے اور صاحبین یعنی امام ابویوسف اور امام محمد کی آرار پر مبنی فقہ حنفی کے مفتی بہ قول کی روشنی میں مزارعت کے حرام ہونے کی صورت میں یا یہاں کی زمینوں کو خراجی قرار دینے کی صورت میں اس بنیادی مسئلے کے حل کی دو ممکنہ صورتوں پر اجمالاً روشنی ڈالی۔ جلسے کے بعد اگرچہ مولانا فدارالرحمان درخواستی صاحب کا اصرار تھا کہ رات کا آخری حصہ میرپور خاص میں ہی بسر کیا جائے۔ لیکن مشورے کے بعد یہی صورت مناسب نظر آئی کہ فوراً حیدرآباد روانہ ہو جائیں تاکہ اگلے روز کے پروگرام متاثر نہ ہوں۔ رات تین بجے حیدرآباد پہنچے اور عبدالقادر صاحب کو زحمت دی ۔۔ انہوں نے اپنی روایتی مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں خوش آمدید کہا۔

حیدرآباد میں گیارہ فروری کو صبح دس بجے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب بھی تشریف لے آئے تھے۔ حافظ صاحب انتہائی سادہ مزاج اور درویش صفت آدمی ہیں۔ پہلے جماعت اسلامی کے رکن تھے۔ اب جماعت سے علیحدہ ہو کر سندھ میں علمی اور ادبی سطح پر دین کے لئے کام کر رہے ہیں۔ انقلابی جماعت کے ارکان کے لئے بنیادی دینی تربیت، تعلق مع اللہ اور عزیمت کردار کی اہمیت سے کما حقہٗ واقف ہیں۔ سردست سندھ کے مخصوص سیاسی حالات کے پیشِ نظر ہر نوع کی جماعتی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر دین کی خدمت میں ہمہ تن مشغول ہیں سندھ کے حالات پر ان کی کئی تصانیف اردو اور سندھی میں شائع ہو چکی ہیں۔ قیامِ حیدرآباد کے دوران ہمیں بیشتر وقت اُن کی معیت حاصل رہی۔ نمازِ مغرب کے بعد نوجوانوں اور طلبہ کے ایک گروپ سے ملاقات ہوئی جس میں اکثریت کا تعلق تو جئے سندھ کی تنظیم سے تھا۔ ان میں تین نوجوانوں کا تعلق جو نئے سندھی یعنی مہاجر تھے اسلامی جمعیت طلبہ

سے تھا۔ کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے کی نشست میں جئے سندھ کے نوجوانوں نے بڑے بھرپور اور جارحانہ انداز میں اپنا مؤقف پیش کیا۔ امیر تنظیم نے اس میں بہت کم مداخلت کی۔ گفتگو کے اختتام پر اسلامی جمعیت طلبہ کے ایک رفیق نے بھی چند منٹوں میں اپنا مؤقف بڑے مدلل اور دلنشین انداز میں پیش کیا۔ اس نشست کا ایک بنیادی فائدہ یہ ہوا کہ مختلف بلکہ متحارب نقطۂ ہائے نظر رکھنے والوں نے ایک چھت کے نیچے بیٹھ کر ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو خندہ پیشانی سے سنا۔ جو بلاشبہ ایک صحت مند علامت ہے اور اگر اس قسم کی نشستوں اور ملاقاتوں کے اہتمام کا سلسلہ بڑے پیمانے پر جاری ہو سکے تو سندھ کے ماحول میں پائی جانے والی کشیدگی اور نفرت کو بڑی حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے بہرحال کسی تیسرے فریق کی ضرورت ہے جو فی الحال وہاں موجود نہیں۔ گفتگو کے آخر میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جئے سندھ کے نوجوانوں سے سوال کیا کہ جس طرح متحدہ ہندوستان میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے حقوق دینے سے انکار کیا تو پاکستان وجود میں آیا پھر مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کو مغربی پاکستان والوں سے شکایت پیدا ہوئی تو وہ پاکستان سے الگ ہو گئے۔ اب آپ لوگ ملک کے بڑے صوبے پنجاب کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں۔ اسی طرح اب سندھ میں بسنے والے مہاجروں کو آپ سے کچھ شکایات پیدا ہو رہی ہیں۔ اگر کل وہ بھی اپنی قومیت کی بنیاد پر سندھ میں اپنا الگ صوبہ بنانے کا مطالبہ کریں تو آپ کا ردِ عمل کیا ہو گا۔ قومیتوں کی بنیاد پر مطالبہ حقوق اور علیحدگی کے اس منطقی نتیجے پر ان کی اکثریت تو کچھ لاجواب سی ہو گئی لیکن ان کے قائدین نے سندھ کی تقسیم کے کسی بھی امکان کی سختی سے مخالفت کی۔ نوجوانوں کے گروپ کے رخصت ہونے کے بعد حیدر آباد کے رفقاء کے ساتھ گفتگو کا آغاز ہوا۔ امیر محترم نے تنظیم کو فعال بنانے اور سالانہ اجتماع میں شرکت کی تیاری کی طرف رفقاء کو متوجہ کیا۔ چونکہ کچھ رفقاء اطلاع نہ پہنچنے کی وجہ سے تشریف نہیں لا سکے تھے اس لئے ڈاکٹر صاحب نے تمام رفقاء کو کل بعد نمازِ مغرب دوبارہ جمع ہونے کی دعوت دی اور کہا کہ جو حضرات آج نہیں آئے کل انہیں لے کر آئیں۔ اس اثناء میں آٹھ بج چکے تھے۔ نو بجے شریعت محاذ کے جلسے میں بھی شریک ہونا تھا۔ جماعت اسلامی سندھ کے امیر مولانا جان محمد عباسی کی رہائش گاہ پر شریعت محاذ کے قائدین کے اعزاز میں کھانے کی دعوت بھی ڈاکٹر صاحب قبول فرما چکے تھے۔ لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے عین وقت پر ان سے ٹیلیفون پر ہی معذرت کرنا پڑی۔ نمازِ عشاء ادا کرنے کے بعد جلسہ گاہ میں پہنچے۔ چونکہ ہمیں رات ہی واپس کراچی روانہ ہونا تھا اس لئے ڈاکٹر صاحب نے ابتدائی دو تین مقرر حضرات کے بعد نصف گھنٹہ تقریر کی جس میں شریعت کی بالادستی کے انقلابی

طریق کار پر روشنی ڈالی۔ جلسے سے فارغ ہو کر رات ساڑھے گیارہ بجے ہم عبدالقادر صاحب کے گھر واپس پہنچے اور کھانا کھاتے ہی کراچی کے لئے روانہ ہو گئے۔ صبح گیارہ بجے مولانا فداالرحمٰن درخواستی صاحب کے دارالعلوم میں شریعت محاذ کے صوبائی کنونشن میں شرکت کے لئے پہنچے۔ کراچی تنظیم کے نئے امیر ڈاکٹر تقی الدین صاحب نے بھی کنونشن سے خطاب کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کنونشن میں محاذ کے ڈھیلے ڈھالے تنظیمی ڈھانچے کو منظم اور فعّال بنانے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اب ہم نے ۲۷ رمضان المبارک سے عملی اقدام کا جو الٹی میٹم دیا ہے ہمارا موجودہ ڈھانچہ اس قسم کی عملی جدّ و جہد کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ آنے والے وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ہمیں کسی ایک دینی شخصیت کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کر کے اپنے آپ کو منظم اور متحد کرنا چاہئے۔ حدیثِ جبریل کی روشنی میں پانچ ارکانِ اسلام جو ہمارے دین کی بنیاد ہیں ان کے ساتھ ساتھ ہمیں ترمذی شریف کی اس حدیث کی طرف بھی متوجہ ہونا چاہیے جس میں امّت کی اجتماعیّت کو استوار کرنے کے لئے پانچ امور کا حکم دیا گیا ہے۔

اَنَا اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔

"(اے مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ جماعت سے وابستہ ہونے کا، سننے اور اطاعت کرنے کا اور ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کا"

چونکہ ملوکیّت کی آمد کے بعد علماءِ کرام نے عقائد کی حفاظت، علمِ دین کی ترویج و اشاعت اور انفرادی اعمال کی درستگی میں منہمک ہو کر سیاست و حکومت کے معاملات سے ایک طرح کی لاتعلقی کا رویّہ اختیار کر لیا تھا اس لئے اجتماعیّت اور جماعت سازی کے بارے میں دینی ہدایات اور اصولوں پر بھی توجہ اس درجہ مرکوز نہیں رہی جتنی کہ عقائد و اعمال پر رہی ہے۔ آج ہم دینی بنیادوں پر امّت کی اجتماعیت کی اصلاح و تعمیر کے لئے دوبارہ اکٹھے ہوئے ہیں تو ہمیں اپنی جماعت کی تنظیم کے لئے بھی سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہی رجوع کرنا چاہیے۔ چالیس منٹ کے اس مدلّل اور جامع خطاب کے بعد واپس سراج الحق سیّد صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ کیوں کہ ہمیں مغرب سے پہلے پہلے حیدر آباد پہنچنا تھا۔ نمازِ ظہر کے بعد کھانا کھایا اور حیدر آباد کے لئے روانہ ہو گئے۔ نمازِ عصر راستے میں ادا کی۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے حیدر آباد پہنچ گئے۔ رفقاءِ تنظیم حسبِ پروگرام منتظر تھے۔ نمازِ مغرب کے بعد ان سے گفتگو رہی۔ امیرِ تنظیم نے رفقاء کے سوالات

اور الجھنوں کو حل کیا۔ عشائیہ کے بعد فاران ہوٹل میں حیدر آباد کے صحافیوں اور دانشوروں کے
اعزاز میں عشائیے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اصل مقصد اُن کے خیالات سے واقفیت اور آگاہی
حاصل کرنا تھا۔ اس نشست کی سب سے اہم شخصیت سندھی بلوچ پٹھان فرنٹ کے قائد او
جی ایم سیّد کے دست راست حفیظ قریشی ایڈووکیٹ تھے۔ جئے سندھ کی تحریک میں ان کی
فعال اور سرگرم کارکردگی کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عرف عام میں انہیں
سندھ کا ابوالکلام اور شورش کہا جاتا ہے۔ قریشی صاحب نے گفتگو کے دوران بھی اپنی خطا
کے جوہر خوب دکھائے۔ اس نشست میں قریشی صاحب کا پلّہ ہی بھاری رہا۔ ہاتھی کے پاؤں
سب کا پاؤں کے مصداق اُن کی گفتگو کے بعد تمام حضرات نے کہا کہ اُن کی گفتگو کے بعد ہم
کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ قریشی صاحب کا کہنا تھا کہ ہم تو صرف پنجاب سے اپنے حقوق
کرنا چاہتے ہیں۔ اور ہمیں یقین ہے کہ " پاکستان کے جرگے " میں رہ کر مملکت کے موجودہ
کے ساتھ ان کا حصول ناممکن ہے۔ پنجاب اسلام کے نام پر ہمارا استحصال کر رہا ہے۔ حالانکہ
اس سے بڑھ کر اسلام کے ماننے والے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ غلبۂ اسلام
جدوجہد میں خاکسار تحریک کی نذر کیا ہے اور اب بھی تبلیغی جماعت کے ساتھ گشت کرتا ہوں۔
کا مطالبہ تھا کہ " اہلِ سلام " کو ذرا کھل کر اور بلند آہنگ سے ہمارے حقوق کی بات کرنی

اس عشائیے میں اعتدال پسند اور انتہا پسند دونوں طبقات کی باتیں سُن کر حالات کی سنگینی
اور مسائل کی پیچیدگی کا بھرپور احساس ہوا جس سے اہلِ پنجاب قطعاً ناآشنا ہیں۔ اس گفتگو میں شا
تمام حضرات کا تعارف اور آراء پیش کرنا راقم کے پیشِ نظر تھا لیکن دورے کے آخری مرحلے میں شکا
میں اس بریف کیس کی گمشدگی کی وجہ سے یہ خواہش پوری نہیں ہو رہی جس میں اس دورے کے
بیشتر نوٹس اور کئی اہم اشیاء بھی تھیں۔

جمعہ تیرہ فروری کو خطاب جمعہ کا پروگرام بدین میں تھا لیکن راستے میں ماتلی کے قصبے میں
ایک نشست کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اس اجتماع کا اہتمام جماعت اسلامی سے متعلق احباب نے کیا
تھا۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے چند ذمہ دار نوجوانوں کے علاوہ متوسّط طبقے سے تعلق رکھنے والے
شہری بھی شامل تھے۔ البتہ تقریباً پچیس افراد کے اس اجتماع میں قدیم سندھی صرف ایک ہی تھے
شرکاء نے تعارف کے بعد انہی امور کا اظہار کیا جو ہم پہلے سے سنتے چلے آ رہے تھے۔ البتہ یہاں
لہجے کی تلخی میں خاطر خواہ کمی اور اسلام اور پاکستان کے ساتھ وفاداری اور محبت کا اظہار بھی موجود

وقت کی کمی کی وجہ سے یہ محفل بہت جلد برخاست کرنا پڑی ورنہ سننے سنانے کے لیے مہمانوں اور میزبانوں دونوں کے پاس بہت کچھ تھا۔ ایک گھنٹے کا سفر طے کر کے بدین پہنچے تو ایک بج رہا تھا۔ شہر سے باہر مین روڈ پر واقع شیخ سالمین مسجد کے امام و خطیب مولانا غلام علی گو پانگ نے بڑی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ گو پانگ صاحب بالغ نظر اور نوجوان عالم دین ہیں۔ بدین کے نواح سے ہی اُن کا تعلق ہے۔ مولانا جان محمد بھٹو کی زندگی تک جماعت میں شامل رہے اور کچھ عرصہ ضلع بدین کے امیر بھی رہے۔ لیکن مولانا جان محمد بھٹو کی وفات کے بعد وہ جماعت کے ساتھ نہ چل سکے یا جماعت انہیں ساتھ لے کر نہ چل سکی۔ واللہ اعلم! نماز جمعہ میں دو سو کے لگ بھگ حاضری تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے انقلابی تبدیلی کا خاکہ بیان کرنے کے بعد اس کے لیے عملی تیاری کے طریق کار میں انفرادی توبہ یعنی ذاتی اصلاح کی ضرورت و اہمیت پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی اور رجوع الی القرآن کی اہمیت و ضرورت کے ساتھ اپنا خطاب ختم کیا۔ نمازِ جمعہ کے بعد مولانا گو پانگ صاحب نے اعلان کیا کہ بقیہ نماز کے بعد پھر "کچہری" یعنی عام ملاقات ہو گی۔ کم و بیش ساٹھ ستر افراد رک گئے اور یوں تبادلہ خیال اور گفتگو کی ایک غیر رسمی نشست منعقد ہو گئی۔ اس میں سندھی حضرات بھی کافی تھے۔ اس مجمع میں اگرچہ کوئی سیاسی کارکن نہیں تھا، اکثر عام کاروباری اور سرکاری ملازم حضرات تھے۔ لیکن ان کی زبانوں پر بھی وہی شکایتیں تھیں۔ لوگ اپنے مسائل کا حل جاننا چاہتے تھے۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے انتہائی اختصار کے ساتھ اسلامی انقلاب کا تصوّر اور اس کے لیے تنظیمِ اسلامی کی سطح پر اپنی جدّوجہد کا تعارف پیش کیا جس سے لوگ کافی متاثر ہوئے اور دو حضرات نے اعانت کی صورت میں عملی تعاون بھی کیا۔ اگر ہمارے پاس وقت ہوتا تو دعوت کے اعتبار سے اس خطاب کے اثرات کو منظم کیا جا سکتا تھا۔ مسجد کے قریب ہی واپڈا کا گرڈ سٹیشن تھا۔ وہاں کے احباب نے چائے کے لیے شدید اصرار کیا۔ اگرچہ ہمیں عصر سے پہلے پہلے کھوسکی کے لیے روانہ ہونا تھا لیکن ان کے پُرخلوص اصرار کے پیشِ نظر اس دعوت کو قبول کرنا پڑا۔ مولانا غلام علی بھو پانگ کے ساتھ مسجد میں کھانا کھانے کے بعد مختصر سی گفتگو چل ہی رہی تھی کہ گھڑی کی سوئیاں چار بجنے کا اعلان کرنے لگیں۔ اس لیے با دلِ ناخواستہ رختِ سفر باندھنا پڑا۔ چائے کی پُرتکلف دعوت کے بعد بھی گفتگو کی بہت گنجائش تھی لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے فوراً ہی احباب سے رخصت لینا پڑی۔ تقریباً پون گھنٹے کے سفر کے بعد کھوسکی پہنچے۔ ہماری منزل کھوسکی سے باہر فوجی فاؤنڈیشن کی فوجی ویلفیئر شوگر مل تھی۔ نمازِ مغرب کے بعد آفیسرز ریسٹ ہاؤس میں مل کے افسران کے ساتھ غیر رسمی سی تعارفی نشست ہوئی۔

ملز کے اعلیٰ انتظامی عہدوں پر تو جہلم کیمبل پور اور راولپنڈی کے اضلاع سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ سابق فوجی افسران ہی فائز تھے۔ البتہ فنی شعبوں میں نوجوان سویلین انجینئروں کی کافی تعداد موجود تھی جو نسلی اعتبار سے تو بہر حال مہاجر تھے لیکن پیدائشی طور پر سندھی تھے کہ سرزمینِ سندھ میں پیدا ہوئے اور یہیں پروان چڑھے۔ ۲۵، ۳۰ افسروں کے اس اجتماع میں ایک یا دو قدیم سندھی حضرات بھی موجود تھے۔ ریسٹ ہاؤس میں کام کرنے والے خدمت گار ملازمین اور سیکیورٹی سے متعلق ڈیوٹی دینے والے بھی زیادہ تر ضلع جہلم اور ضلع کیمبل پور سے تعلق رکھنے والے سابق فوجی حضرات ہی نظر آئے۔ ایک استفسار پر معلوم ہوا کہ مل میں روزانہ اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں میں ساٹھ فیصد مقامی سندھی ہیں۔ عمومی تعارف کے بعد ڈاکٹر صاحب نے شرکائے مجلس کو دعوت گفتگو دیتے ہوئے کہا کہ میں نے جو کچھ کہنا تھا وہ میں " استحکامِ پاکستان اور مسئلہ سندھ" کی صورت میں کہہ چکا ہوں۔ اس دورے کا مقصد تو بنیادی طور پر سندھ میں رہنے والوں کی باتیں سن کر براہِ راست معلومات حاصل کرنا ہے۔ اوّل اوّل تو ماحول پر کچھ اجنبیت اور تکلف کی فضا طاری رہی لیکن جب بات چل نکلی تو دو حضرات نے حیرت انگیز طور پر بھرپور انداز میں ساری صورتحال کا تجزیہ کیا اور اس میں وڈیروں، فوج، مہاجرین، وفاقی حکومت کے کردار اور زمینوں کی تقسیم اور ملازمتوں میں روا رکھی جانے والی ناانصافیوں اور ان میں بالخصوص پنجاب کی سول اور ملٹری بیوروکریسی کے کردار پر روشنی ڈالی جن میں کئی باتیں ہمارے لئے نئی اور مفید تھیں۔ ایک صاحب نے اس صورت حال کا حل تجویز کرتے ہوئے کہا کہ ہر تین سال بعد مرکزی الیکشن اور ہر سال بعد بلدیاتی الیکشن کرائے جائیں تاکہ حکمران طبقوں میں جواب دہی کا احساس پیدا ہو۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر بقول وزیر خزانہ ہر سال ۳۰ ارب روپیہ بیوروکریسی کی بدعنوانیوں کی نذر ہو جانے کے باوجود ملک چل رہا ہے تو ایک ارب روپیہ سالانہ الیکشن پر خرچ ہونے سے بھی قوم کو کوئی نقصان نہیں ہوگا بلکہ اس کے انتہائی مفید نتائج سامنے آئیں گے۔ نظریاتی پہلو سے ان تمام باتوں کے درست ہونے کے باوجود اصل مسئلہ تو وہیں رہا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ ابھی گفتگو جاری تھی کہ مؤذن نے عشاء کی نماز کے لئے مومنوں کو پکارا۔ نماز کے بعد عشائیہ تیار تھا۔ کھانے کے بعد دوبارہ نشست ہوئی تو مل کے سربراہ ریٹائرڈ بریگیڈیئر محمد خان صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ ہمیں قرآن کے حوالے سے بھی کچھ نصیحت فرمائیے۔ پشاوری قہوے کے آتے آتے امیر محترم نے پندرہ منٹ میں سورہ والعصر کا مختصر درس دیا۔

اور انقلابی تبدیلی کے پہلے قدم کے طور پر ہر شخص کی انفرادی ذمہ داری یعنی اپنی اور اپنے اہلِ خانہ کی اصلاح اور خود اپنے دائرہ اختیار میں اسلام پر عمل کرنے کی دعوت دی۔ یوں تذکیر بالقرآن کی یہ محفل اپنے انجام کو پہنچی۔ رات آفیسرز میس کے مہمان خانے میں گزری۔ شوگر مل اور اس کے ساتھ مل افسران اور ملازمین کی رہائشی کالونی اپنے طرزِ تعمیر اپنے ماحول اپنی سہولتوں اور دیگر کئی اعتبارات سے علاقے کی عام آبادی سے بالکل الگ تھلگ ایک جزیرہ معلوم ہوتی ہے۔ صبح نماز فجر کے فوراً بعد ناشتہ تیار تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ہم حیدرآباد کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ حیدرآباد میں عام ملاقاتوں کا پروگرام تھا۔ بہت سے دانشور صحافی اور دیگر ملاقاتی حضرات تشریف لائے۔ مشہور صحافی جناب مدد علی سندھی جن کے ہفت روزے نے ایک زمانے میں جئے سندھ اور جی ایم سید کی تحریک کیلئے بہت کام کیا تھا ملاقات کے لئے آئے۔ آج کل اُن کے نظریات میں خاصا اعتدال پایا جاتا ہے۔ تفصیلی گفتگو کے علاوہ انہوں نے سندھی اخبار "عبرت" کے لئے ایک مختصر انٹرویو بھی کیا۔ ان کے بعد روزنامہ "سٹار" کے جناب علی محمد اور اخبارِ جہاں کے مبین صاحب تشریف لائے۔ جناب علی محمد صاحب نے تفصیلی ملاقات اور انٹرویو کے لئے لاہور آنے کا وعدہ بھی کیا۔ مہاجر قومی موومنٹ کے مقامی لیڈروں سے بھی ملاقات متوقع تھی لیکن اُن حضرات کو اچانک کراچی جانا پڑ گیا جس وجہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ البتہ اُن کے حلقے کے کئی افراد نے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی۔

عصر کے بعد ٹنڈو الہ یار روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر یوسف صاحب کے مکان پر اجتماع تھا۔ ڈاکٹر یوسف صاحب جماعتِ اسلامی کے رُکن رہ چکے ہیں اور امارت کی ذمہ داریاں بھی نبھا چکے ہیں۔ جماعت کے ٹکٹ پر انہوں نے الیکشن بھی لڑا تھا لیکن اب جماعت سے علیحدگی اختیار کر چکے ہیں اور اپنی انفرادی اصلاح اور تزکیۂ باطن پر تمام تر توجہات مرتکز کئے ہوئے ہیں۔ تقریباً پچاس افراد کے اجتماع میں نصف سے زائد نوجوانوں کا تعلق کسی نہ کسی درجے میں اسلامی جمعیتِ طلبہ سے تھا۔ جمعیت کے مقامی ذمہ دار بھی شریک تھے۔ البتہ یہ سب کے سب نئے سندھیوں کی اولاد تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات تحریک انقلاب اور طریق کار کے حوالے سے نوجوانوں نے بڑے بھرپور انداز سے سوالات کئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ واقعی کچھ سمجھنا چاہتے ہیں۔ نمازِ مغرب کے وقفے کے ساتھ یہ نشست عشاء تک جاری رہی۔ گفتگو کا رُخ کبھی کبھی مسئلۂ سندھ کی طرف بھی مڑ جاتا تھا لیکن بات چیت کا اصل محور اسلامی انقلاب اور اس کا طریق کار ہی رہا۔ آخر میں چار نوجوانوں نے خود کو بغیر کسی ترغیب یا دعوت کے بیعت کے لئے پیش کیا۔ اُن میں سے تین کا تعلق اسلامی جمعیتِ طلبہ سے رہ چکا تھا۔ ایک طالبعلم

کے ذہن میں کچھ اشکالات تھے۔ وہ ہمارے ساتھ گاڑی میں حیدر آباد تک آئے اور راستے میں گفتگو جاری رہی۔ بقیہ تین حضرات بذریعہ بس حیدر آباد پہنچے۔ امیرِ محترم نے انہیں مزید غور کرنے کی دعوت دی۔ صبح نمازِ فجر کے بعد چاروں حضرات نے بیعت کی۔

اتوار ۱۵ فروری کی حیدر آباد میں ہمارے قیام کا آخری دن تھا۔ صبح ۹ بجے ناشتے اور کچھ ملاقاتوں سے فارغ ہو کر شہداد پور روانہ ہوئے۔ شہداد پور میں بعد نمازِ ظہر پاکستان یوتھ لیگ کے زیرِ اہتمام " نفاذِ شریعت اور استحکامِ پاکستان " کے موضوع پر جلسہ عام سے خطاب کا پروگرام تھا۔ جلسے سے پہلے مقامی صحافی حضرات تشریف لے آئے اور ایک غیر رسمی سی پریس کانفرنس منعقد ہو گئی۔ جلسہ عام میں حیدر آباد کی دو علمی شخصیتیں بھی مدعو تھیں۔ یوتھ لیگ کے سرپرست اور گورنمنٹ جامع سکول کے پرنسپل جناب صدیق احمد صدیقی کے خطاب کے بعد ڈاکٹر صاحب کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ نمازِ ظہر تک پون گھنٹے کے خطاب میں امیرِ تنظیم نے موضوع کی مناسبت سے استحکامِ پاکستان کے لئے اسلامی انقلاب یعنی نفاذِ شریعت کی اہمیت کو واضح کیا اور اس مقصد کے لئے نئی نسل کی سرگرمیوں کو حوصلہ افزا علامت قرار دیتے ہوئے کہا کہ گزشتہ چالیس برس میں جو نئی نسل پروان چڑھی ہے۔ اگرچہ وہ ناز و نعم اور مال و دولت کی فراوانی کی وجہ سے بہت خرابیوں میں مبتلا ہے لیکن وہ ہماری پچھلی نسل پر اس اعتبار سے فوقیت رکھتی ہے کہ ان کے ضمیر غلامی کے بوجھ سے آزاد ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بعد 'استادِ شہر' جناب پروفیسر قوی احمد صاحب خطاب کے لئے تشریف لائے۔ آپ کامرس کالج کے پرنسپل ہیں۔ آپ کو دیکھ کر اس طرح کے اساتذہ کا جیتا جاگتا نمونہ نگاہوں کے سامنے آگیا جن کی کہانیاں ہم بزرگوں سے سنا کرتے تھے اگرچہ قوی صاحب کا تعلق حیدر آباد سے ہے لیکن اردگرد کے قصبوں اور شہروں میں بھی اپنے شاگردوں میں آپ اس طرح مقبول ہیں جیسے وہیں کے باشندے ہوں۔ پروفیسر صاحب نے مشفقانہ اور استادانہ انداز میں ایسی ہمہ پہلو گفتگو کی کہ اس میں اسلامی انقلاب کی جدّوجہد سے لے کر صوبائی منافرتوں اور محرومیوں تک بہت سے عنوانات کا احاطہ ہو گیا۔ قوی صاحب کہہ رہے تھے کہ انقلاب کی جدوجہد کے لئے تو ہزاروں ڈاکٹر اسرار احمد ہونے چاہئیں۔ اگر اس وقت ایک آواز دبا دی گئی تو پھر ایک طویل مدت تک دوسری آواز سنائی نہیں دے گی۔ اسلامی انقلاب کے لئے پہلے سائنس و ٹیکنالوجی کی سطح پر بھی ایک علمی انقلاب کے لئے ریاضت اور قربانی کی زندگی بسر کر کے بھرپور محنت کرنا ہو گی۔ قوی صاحب کے پُرمغز خطاب کے بعد ایک مقامی رہنما میجر حنیف راجپوت صاحب

کو اظہارِ خیال کے لئے دعوت دی گئی۔ میجر صاحب علاقے کی ایک سیاسی شخصیت ہیں۔ انہوں نے
قاضی عابد صاحب کے مقابلے میں قومی اسمبلی کا الیکشن بھی لڑا تھا۔ انہوں نے بڑے پرجوش انداز
میں خطاب کیا اور ایران کے انقلاب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہم پاکستان میں اس
قسم کے انقلاب کا راستہ روکنے کی بھرپور جدوجہد کریں گے۔ لیکن خود وہ جس انداز سے مسائل
و معاملات پر گفتگو کر رہے تھے اس سے محسوس ہوتا تھا کہ خود ان کے اندر انقلاب کیلئے
بڑی تڑپ موجود ہے۔ اس اثناء میں سوالات کی بہت سی چٹیں بھی جمع ہو گئی تھیں اور تقاریر
میں بھی بہت سے سوالات سامنے آ گئے تھے اس لئے آخر میں دوبارہ امیرِ محترم کو اختتامی
خطاب کی دعوت دی گئی۔ میجر حنیف راجپوت صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے
کہا کہ میں انشاء اللہ آئندہ کسی موقع پر ان کا نقطۂ نظر سمجھنے کی کوشش کروں گا۔ پروفیسر قوی احمد
صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے امیرِ محترم نے کہا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ضرورت و اہمیت اور
اس کے لئے محنت و کوشش اپنی جگہ بجا لیکن اس کو استعمال کرنے والوں کی سوچ اور فکر کو
ایک صالح سمت عطا کرنا بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ باقی سوالات عموماً ایک ہی نوعیت کے
تھے۔ لوگ سندھ میں اٹھنے والے نئی آوازوں کے حوالے سے پریشان تھے اور ان کا سبب
جاننا چاہتے تھے۔ مختصر الفاظ میں حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مسلم لیگ نے
ایک تحریک کے نتیجے میں پاکستان تو حاصل کر لیا تھا لیکن جماعت کے اعتبار سے اتنی منظم نہ
تھی کہ اقتدار کی ذمہ داریاں سنبھال کر اختیارات کو عوام تک پہنچا سکتی۔ اس لئے جاگیر داروں
بیوروکریسی اور فوج کو جو بہرحال منظم اور طاقت ور گروہ تھے۔ اقتدار اور اس کے ثمرات
پر قبضہ کرنے کا موقع مل گیا اور عوام کے حصے میں محرومیوں کے سوا کچھ نہ آیا۔

شہداد پور کے جلسے سے فارغ ہوتے ہی کھانا کھایا اور نوابشاہ روانہ ہو گئے۔ وہاں پروفیسر
قوی احمد صاحب اور امیرِ محترم دونوں کو یوتھ لیگ کے زیرِ اہتمام الگ الگ جلسوں سے خطاب کرنا
تھا مغرب سے کچھ دیر پہلے ہم نواب شاہ پہنچے۔ شہر کی مشہور سڑک بیگم روڈ پر بیگم شریف منزل میں ہماری
قیام کا بندوبست تھا۔ یہ سادہ سا مشرقی طرز کا گھر نواب شاہ میں تقسیم ملک سے پہلے سے مسلم سیاست
کا مرکز چلا آ رہا ہے۔ اس گھر میں تحریک پاکستان کے بڑے بڑے رہنما قیام کر چکے ہیں جس کمرے میں ہمیں
ٹھہرایا گیا تھا اس کے بارے میں بتایا گیا یہاں بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح بھی قیام کر چکے ہیں۔
مغرب کی نماز کے فوراً بعد صحافی حضرات تشریف لے آئے پریس کانفرنس پہلے سے طے تھی۔ چونکہ

گفتگو کا آغاز ہی شریعت بل سے ہوا تھا۔ اس لئے زیادہ سوالات اسی موضوع پر ہوئے۔ نمازِ عشاء کے بعد ریلوے سٹیشن کے قریب جامع مسجد کبیر میں امیر محترم کا خطاب تھا۔ مسجد کے خطیب مولانا دوست محمد مدنی نے بڑے تپاک اور جوش سے ہمارا استقبال کیا اور انتہائی محبت اور اپنائیت سے پیش آئے۔ امیر محترم کے خطاب سے پہلے رفیق محترم مختار حسین فاروقی صاحب نے سورہ والعصر کی روشنی میں پندرہ منٹ تک مختصر خطاب کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے سورہ بلد کی آخری آیات کی تلاوت سے تقریر کا آغاز کیا۔ پونے دو گھنٹے کے خطاب میں انفرادی توبہ یعنی اصلاحِ ذات سے لے کر نظامِ طاغوت سے مسلح تصادم تک کے تمام مراحل پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اگر ہم پہلے خود اپنی ذات اپنے اہل خانہ اور اپنے ماحول پر اسلام نافذ کرنے اور اللہ کے رنگ میں رنگے جانے پر تیار نہیں ہوتے تو شریعت بل کی منظوری سے بھی مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ نواب شاہ میں یہ ہمارا آخری پروگرام تھا۔

پاکستان یوتھ لیگ کے نوجوانوں نے جس خلوص، محبت اور تڑپ سے ان پروگراموں کا بندوبست کیا اس کی یاد تادیر دلوں میں باقی رہے گی۔ شہداد پور اور نواب شاہ کے پروگراموں میں سب سے بڑی کمی یہی نظر آئی کہ ان میں قدیم سندھیوں کی شمولیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس سے یہ احساس مزید گہرا ہوا کہ سندھ کے چھوٹے شہروں میں بھی نئے اور پرانے سندھیوں کے درمیان ایک حجاب اور دوری بہرحال موجود ہے۔ البتہ کراچی اور حیدر آباد کے مقابلے میں یہاں رہنے والے نئے سندھیوں کی نئی نسل سندھی زبان بڑی روانی سے بولتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں کاروبار اور روزمرہ زندگی میں سندھیوں سے واسطہ پڑتا ہے جبکہ کراچی اور حیدر آباد میں یہ صورت نہیں ہے۔

کراچی سے میرپور خاص تک کے پہلے سفر کو چھوڑ کر کراچی سے نواب شاہ تک کا سفر اس اعتبار سے انتہائی پرسکون اور آرام دہ تھا کہ ہمیں سراج الحق سید صاحب جیسا پرسکون اور مستقل مزاج ڈرائیور میسر تھا۔ امیر محترم اور برادر مختار حسین فاروقی کی تمام تر اکساہٹ کے باوجود ان کے پیر کا دباؤ ایکسیلیٹر پر حدِ اعتدال سے آگے نہ بڑھتا تھا۔ اپنی پیرانہ سالی اور دیگر کئی عوارضات کے باوجود انہوں نے جس استقلالِ مزاج سے اتنی لمبی مسافت میں ہماری قیادت کی وہ واقعتاً قابلِ رشک تھی۔ سید سراج صاحب ۱۶ر فروری کی صبح کو عازم کراچی ہوئے اور ہمارا قافلہ کرائے کی سوزوکی کار میں جو سامان اور افراد دونوں کے اعتبار سے ناکافی تھی سوار ہو کر سوئے سکھر روانہ ہوا۔ تین گھنٹے کی مسلسل

دورے کے بعد گیارہ بجے سکھر پہنچے۔ گلف ہوٹل میں قیام کا بندوبست تھا اور ہمارے پہنچتے ہی پریس کانفرنس بھی تیار تھی۔ اس اعتبار سے یہ بھرپور پریس کانفرنس تھی کہ اس میں مقامی اور قومی اخبارات اور ایجنسیوں کے تقریباً سبھی نمائندے موجود تھے۔ شریعت بل، تحریک بحالی جمہوریت انقلاب ایران اور دیگر کئی مسائل پر کھل کر باتیں ہوئیں۔ بیک وقت ایم آر ڈی کی بھرپور حمایت اور متحدہ شریعت محاذ میں عملی شرکت کی الجھن اور تضاد کو رفع کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں ایم آر ڈی کی طرح موجودہ سول و فوجی حکمرانوں، صدر ضیاء الحق کے ریفرنڈم، اُن کی اسلامائزیشن، دستوری ترامیم اور ۸۵ء کے انتخابات کو قانونی طور پر ناجائز سمجھتا ہوں لیکن جس طرح ایم آر ڈی ان کے فی الواقع تسلط کو تسلیم کرتے ہوئے اُن سے مڈٹرم الیکشن اور حقیقی جمہوریت کا مطالبہ کرنا جائز سمجھتی ہے۔ اسی طرح میں ان سے نفاذ شریعت کے مطالبے کو بھی جائز سمجھتا ہوں۔ البتہ جمہوریت کی بحالی اور انتخابات کا انعقاد ہماری قومی زندگی کے لئے پانی اور ہوا کی سی اہمیت رکھتا۔ اس لئے پنجاب کے عوام کو بھرپور انداز سے ایم آر ڈی کا ساتھ دینا چاہئے تاکہ چھوٹے صوبوں کا احساسِ محرومی ختم ہو اور وہ صورت سامنے نہ آئے جو ۸۳ء کی تحریک کے نتیجے میں سامنے آ چکی ہے۔ پریس کانفرنس کے بعد کافی دیر تک غیر رسمی گفتگو یعنی آف دی ریکارڈ باتیں بھی ہوتی رہیں۔ جن کے لئے بڑے شہروں کے صحافیوں کے پاس جہاں سے اخبارات شائع ہوتے ہیں وقت نہیں ہوتا۔ عصر کے بعد ملاقاتی حضرات آنا شروع ہوئے۔ جن میں متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ ملازمین کی تعداد ہی زیادہ تھی۔ نمازِ مغرب کے وقفے کے ساتھ عشاء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ہر ایک کے پاس کہنے کے لئے بہت سی باتیں موجود تھیں۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی شکایتوں سے لے کر ون یونٹ کی زیادتیوں اور حالیہ مارشل لاء کے مظالم تک مسئلے کے بہت سے پہلو سامنے آئے۔ ایک صاحب نے جو خود بھی سندھی ہیں اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے سندھیوں کو آنے جانے کا خرچ اور کراچی میں درجہ اوّل کے ہوٹل میں رہائش کے انتظام کے ساتھ "تحریک تکمیل پاکستان" کی کانفرنس میں شرکت کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے کیونکہ سندھ میں اب 'استحکام پاکستان اور اسلام' دونوں استحصالی طبقوں کے نعروں کی حیثیت سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔

نمازِ مغرب کے بعد تشریف لانے والے حضرات میں وکلاء کے علاوہ مقامی کالجوں کے اساتذہ بھی شامل تھے۔ اس لئے بحث و گفتگو کا معیار بھی علمی تھا۔ محسوس ہو رہا تھا کہ لوگ کتاب کا مطالعہ کر کے تیاری کے ساتھ گفتگو کرنے آئے ہیں۔ کئی حضرات نے اہم نکات نوٹ کر رکھے تھے۔ گورنمنٹ

کالج آف ایجوکیشن کے پرنسپل پروفیسر حنیف صاحب نے اگلے روز اپنے کالج میں ڈاکٹر صاحب کو "سیرت کا انقلابی پہلو" کے عنوان سے اپنے کالج کے طلبہ کو جو درحقیقت زیرِ تربیت اساتذہ تھے خطاب کرنے کی دعوت دی۔ نمازِ عشاء کے بعد اساتذہ اور دانشور حضرات کے ساتھ عشائیے کا اہتمام تھا۔ عشائیے کے بعد اسلامی جمعیتِ طلبہ کے سابق سندھی ارکان اور عہدیداران کے ایک گروپ سے گفتگو ہوئی جو فروری کے 'میثاق' میں جمعیت کے ایک سابق لیڈر جناب عبدالغفار ابڑو صاحب کا خط پڑھ کر ملاقات کے لئے آئے تھے۔ احیائے اسلام کی تڑپ، جذبہ اور شعور رکھنے والے یہ نوجوان کرب کی ایک عجیب کیفیت سے دوچار تھے۔ حالات کی سنگینی کا احساس اور مقصد کی لگن رکھنے کے باوجود انہیں کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان کی کیفیات کو سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ اس کیفیت کو وہی کچھ جان سکتا ہے جو خود اس مرحلے سے گزرا ہو۔ ان نوجوانوں کی اضطراب آمیز شکائتیں اور حکایتیں سن کر نجیب صدیقی صاحب کے چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹیں پکار پکار کر یہ کہہ رہی تھیں کہ ؎

یہ تمہاری ان دنوں دوستاں مژہ جس کے غم میں ہیں خونچکاں
وہی آفت دلِ عاشقاں کسو وقت ہم سے بھی یار تھا

کیوں کہ ماچھی گوٹھ کے بعد وہ بھی ایک مدّت تک کشمکش و اضطراب کی انہی لذّتوں سے آشنا رہ چکے تھے۔ امیرِ محترم نے ان کی باتیں سننے کے بعد انہیں کچھ مطالعے کا مشورہ دیا اور شکارپور تک ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ انتخابی سیاست کے نتائج بچشم سر دیکھنے کے بعد لوگوں کے ذہن انقلابی جدّ و جہد کی بات قبول کرنے کے لئے آمادہ تو ہیں لیکن مسئلہ سندھ کے خصوصی تناظر میں ان نوجوانوں اور ان جیسے بہت سے دوسرے حضرات کا معاملہ اتنا آسان اور سادہ نہیں۔ یہ بہت توجّہ، سوچ بچار، محنت اور منصوبہ بندی کا طالب ہے۔ بہرحال یہ قائدین و ناقدین سب کے لئے اپنے اندر عبرت کے بہت سے پہلو رکھتا ہے۔

منگل سترہ فروری کو نمازِ فجر کے فوراً بعد سلوک و ارشاد کے دو مراکز ھالیجی شریف اور بھرچونڈی شریف میں حاضری کے لئے روانہ ہوگئے۔ ھالیجی شریف کی خانقاہ اور مدرسے کی بنیاد حضرت حماد اللہ ہالیجوی نے رکھی تھی وہ خود سندھ کے مشہور مرکزِ رشد و ہدایت امروٹ شریف سے بیعت تھے۔ اب اُن کے صاحبزادے حضرت مولانا حافظ محمود اسعد صاحب نسبت بزرگ ہیں۔ اگرچہ ان کا تعلق جمعیت علمائے اسلام سے ہے لیکن اُن کی طبیعت دنیا کے معاملات کی طرف راغب نہیں

ہمہ وقت ذکر و فکر میں مشغول رہتے ہیں۔ انہوں نے چائے سے ہماری تواضع کی۔ پندرہ بیس منٹ کی نشست کے بعد دعائے خیر کے بعد وہاں سے رخصت ہوئے۔ نصف گھنٹے کے مزید سفر کے بعد بائیجی شریف پہنچے۔ یہاں کے گدی نشین میاں عبدالستار سمیجو صاحب نے بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا اور ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔ چائے اور دیگر لوازمات کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ انہوں نے تحریک شہیدین کے قافلے کے قیام سندھ کے دوران کے کچھ واقعات سناتے ہوئے بتایا کہ سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ رانی پور اور پیر جو گوٹھ کے علاوہ سوئی شریف تحصیل ابا ڑو ضلع سکھر میں حضرت بقاء اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت حسن شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی تین ماہ تک مقیم رہے۔ میاں عبدالستار سمیجو صاحب کی محفل سے اُٹھنے کو جی تو نہیں چاہتا تھا لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے امیر محترم نے نصف گھنٹے کی گفتگو کے بعد آئندہ ملاقات کے وعدے کے ساتھ اجازت لی کیونکہ ہمیں نماز عصر شکار پور جا کر ادا کرنی تھی۔ اور اس سے پہلے پروگرام میں سکھر کالج میں امیر محترم کے خطاب کا اضافہ بھی ہو چکا تھا۔ سکھر کے گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن میں امیر محترم نے "سیرت کا انقلابی پہلو" کے عنوان سے اسلامی انقلاب کے مراحل بڑے اختصار اور بلاغت کے ساتھ ایک گھنٹے کے خطاب میں بیان کئے۔ جسے سامعین نے کامل سکون و اطمینان کے ساتھ سنا۔ کالج کا بڑا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جس میں کم از کم ایک تہائی تعداد باپردہ طالبات کی تھی۔

بہت سے حضرات برآمدوں میں بھی کھڑے تھے۔ ڈیڑھ بجے خطاب ختم ہوا۔ ہماری اگلی منزل شکار پور تھی۔ عین نماز عصر کے وقت شکار پور پہنچے۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی پروفیسر اسرار احمد علوی صاحب جو رانی پور کالج میں استاد ہیں کی رہائش پر سوال و جواب کی نشست کا آغاز ہوا۔ یہاں شرکاء کی اکثر و بیشتر تعداد سندھی حضرات پر مشتمل تھی۔ اس لئے گفتگو کا رُخ مسئلہ سندھ کی طرف ہی رہا۔ نماز مغرب کے بعد جب مسئلے کے حل کی بات چلی تو پے بہ پے سوالات کا جواب دینے کے لئے امیر محترم نے آدھ گھنٹے کے مختصر خطاب میں انقلاب کی ضرورت اور طریق کار کی وضاحت کی۔ شکار پور سندھ کا قدیم ترین تعلیمی مرکز ہے۔ اسی اعتبار سے لوگ انتہائی مہذب تعلیم یافتہ اور باشعور ہیں۔ رات کھانے کے بعد بھی دیر تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے سابق رکن نذیر احمد مہر صاحب سے تبادلہ خیال ہوا۔ امیر محترم نے انہیں لاہور آنے اور تنظیم کے سالانہ اجتماع میں شرکت کی دعوت دی۔

اگلے روز یعنی بدھ ۱۸ فروری کو نماز فجر کے فوراً بعد لاڑکانہ روانہ ہوئے۔ ناشتہ کا پروگرام جامعہ اسلامیہ اشاعت القرآن والحدیث میں مولانا ڈاکٹر خالد محمود صاحب کے ساتھ تھا۔ ڈاکٹر

خالد محمود صاحب ۲۷ سال کی عمر میں ایم بی بی ایس ہونے کے ساتھ ساتھ درس نظامی کی تکمیل بھی کر چکے ہیں۔ جمعیت علمائے اسلام مولانا فضل الرحمٰن گروپ کے روحِ رواں ہیں۔ صوبہ سندھ کے ڈپٹی سیکریٹری کی ذمہ داریاں بھی نبھا رہے ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں بحالیٔ جمہوریت کی تحریک میں آپ کو ایم بی بی ایس کا امتحان دیتے ہوئے کمرۂ امتحان سے گرفتار کیا گیا اس لئے بقیہ امتحان جیل سے دینا پڑا۔ اور چار ماہ جیل میں گزارے۔ مولانا ڈاکٹر خالد محمود صاحب کی رہنمائی میں بیر شریف روانہ ہوئے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو مولانا عبدالکریم قریشی بیری کے درخت کے نیچے چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے اپنے شاگردوں کو صحیح مسلم کا درس دے رہے تھے۔ ہم بھی سلام کر کے بیٹھ گئے۔ مولانا نے سندھ کے روایتی انداز میں استقبال کیا۔ فرداً فرداً سب کی خیریت دریافت کی۔ اگرچہ امیر محترم کو واپس لاڑکانہ پہنچ کر دو بجے پریس کانفرنس سے خطاب کرنا تھا لیکن مولانا عبدالکریم صاحب کی کھانے کی دعوت کو رد کرنا بھی ممکن نہ ہوا۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد درس و تدریس سے فارغ ہو کر مولانا اندر تشریف لائے تو کھانے کی آمد تک امیر محترم اور مولانا عبدالکریم صاحب کے درمیان علمی گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا۔ مولانا کے بارے میں جیسا سنتے تھے انہیں اس سے بہت مختلف پایا۔ انتہائی منطقی اور وسیع طبیعت کے مالک ہیں۔ انہوں نے امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی کی صحبت سے بھی فیض پایا ہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر تقریباً ایک بجے بیر شریف سے روانہ ہوئے تو ایک گھنٹہ کا سفر طے کر کے لاڑکانہ پہنچے۔ بولان ہوٹل میں قیام کا بندوبست تھا اور صحافی حضرات بھی پہنچ چکے تھے۔ نمازِ ظہر سے فارغ ہو کر ڈاکٹر صاحب نے صحافیوں سے گفتگو کی۔ عصر کے بعد شہر کے اساتذہ، وکلاء اور دانشوروں سے ملاقات کا سلسلہ شروع ہوا۔ لاڑکانہ کے شہریوں کی صورت و سیرت، آداب و اخلاق، بول چال، تہذیب اور وضع داری کو دیکھ کر علامہ اقبال کے وہ اشعار مجسّم شکل میں نگاہوں کے سامنے آجاتے تھے جو انہوں نے اگرچہ اندلس اسپین اور ہسپانیہ و قرطبہ میں رہنے والوں کو دیکھ کر کہے تھے کہ ؎

جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں "اہلِ سندھ"
خوش دل و گرم اختلاط، سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

اہل لاڑکانہ نے بھی اپنی گفتگوؤں میں سندھ کا مقدمہ بڑے مدلل انداز میں پیش کیا۔ رات آٹھ بجے دو صحافی حضرات تشریف لے آئے جو دن کو شہر سے باہر ایک دوسری تقریب کی وجہ سے نہیں آسکے تھے۔ اس طرح سے ایک بار پھر پریس کانفرنس کی سی گفتگو دوبارہ شروع ہوگئی۔ لاڑکانہ کا یہ پروگرام اس دورے کا آخری اجتماعی پروگرام تھا۔ جمعرات انیس فروری کی صبح کو نمازِ فجر کے بعد سکھر روانہ ہوئے۔ سکھر میں تنظیم کے رفیق سومرو صاحب کی رہائش گاہ پر کچھ دیر آرام کے بعد ناشتہ کیا۔ جمعیت العلمائے اسلام کے نائب امیر اور سندھی ماہنامہ 'شریعت' کے مدیر مولانا عبدالوہاب چاچڑ کی آمد متوقع تھی۔ پروفیسر اسد اللہ بھٹو مولانا چاچڑ کے ہمراہ بروقت پہنچ گئے۔ ایک بار پھر گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ شکارپور سے پروفیسر اسرار احمد علوی اور جناب تجمل حسین صاحب اور سکھر کے چند رفقاء بھی امیر محترم سے الوداعی ملاقات کے لئے پہنچ گئے اور سہ پہر تین بجے تک محفل گرم رہی۔ یہ دورہ سندھ کی آخری غیر رسمی نشست تھی۔ چار بجے کی پرواز سے امیر محترم لاہور روانہ ہوگئے اور آٹھ فروری سے ۱۹ فروری تک کا یہ بھرپور پروگرام اپنے اختتام کو پہنچا۔

بقیہ 'مراحلِ انقلاب'

ع زعشق بصبوری ہزار فرسنگ است — راہ حق میں تو بڑے بڑے فاصلے، بڑے بڑے موانع، بڑے بڑے امتحانات آتے ہیں — پس قیصر کی سلطنت وحکومت اس کے پاؤں کی بیڑی بن گئی، ایمان نہیں لایا اور محروم رہ گیا۔ بہرحال حضورؐ کے نامہائے مبارک کے جواب میں عیسائی بادشاہوں کی جانب سے یہ ایک نمائندہ طرزِ عمل تھا جس کا تفصیلی حال میں نے آپ کے گوش گذار کر دیا۔ اب آگے چلئے! (جاری ہے)

مراسلہ نگار حضرات کی آراء سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

"سندھ کا مسئلہ" اور قارئین

مسئلہ سندھ کے حوالے سے دو اہم خطوط نذر قارئین ہیں۔ پہلا خط جمعیت علمائے اسلام کے ر
سکھر میں تاریخی اہمیت کی حامل مسجد منزل گاہ کے دارالعلوم کے شیخ الحدیث مولانا محمد مراد
کا ہے۔ مولانا محترم علمائے حق کی شاندار روایات کے وارث اور امین ہیں۔ شاید کم ہی لوگوں
معلوم ہوگا مولانا نے قادیانیوں کے جس حملے کا ذکر اجمالاً اپنے خط میں کیا ہے اُس میں ز
یہ کہ مولانا خود شدید زخمی ہوئے تھے بلکہ ان کے دو ساتھیوں نے جام شہادت بھی نوش کر
مولانا محمد مراد صاحب نے اپنے خط میں مسئلہ سندھ کے جن اہم پہلوؤں کی طرف اشارے کئے ہیں
سیاست اور ارباب مذہب دونوں کو ان کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ دوسرا خط بھی سکھر
اسلامی جمعیتِ طلبہ سکھر کے ناظم ڈویژن جناب غازی شہاب الدین جوکھیو کا ہے۔ جو کہ
صاحب نے گذشتہ ماہ 'میثاق' میں شائع ہونے والے اسلامی جمعیتِ طلبہ کے سابق رکن جن
عبدالغفار ابڑو صاحب کے خط کے حوالے سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ہماری دُعا ہے کہ اس
جمعیت طلبہ اور دین کے لئے کام کرنے والی تمام قوتیں مضبوط و مستحکم ہوں تاکہ وطن عزیز
اللہ کا دین سر بلند ہو۔ ابڑو صاحب کے خط کی اشاعت کا مقصد خود احتسابی کے سوا اور کچھ نہ

ے صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم — کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

اُمید ہے اسلامی جمعیت طلبہ اور دیگر اسلامی قوتیں ابڑو صاحب کے خط کی روشنی میں
پالیسیوں کا جائزہ لیں گے۔ (ادارہ)

(۱)

مُکرمی ڈاکٹر اسرار احمد: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اس وقت اُمّت مُسلمہ پُوری دُنیا عموماً پاکستان میں خصوصاً کئی خطرات سے دوچار
ذی شعور آدمی اپنے جذبات و احساسات کے پیش نظر اظہار خیال کرتا رہتا ہے۔ جن خطرات
زبان و قلم کے ذریعہ نشاندہی ہو رہی ہے ان میں اکثر و بیشتر خطرات موجود تو ضرور ہیں۔ لیکن
میں ترتیب اور درجہ بندی ہر ایک اپنے انداز فکر کے مطابق بیان کرتا ہے۔

مَیں چونکہ دین کا اسلام کا ایک ادنیٰ خادم پیروکار علم دین کا طالب علم ہوں اس

تو "خطرہ نمبر اوّل" صرف اور صرف کفر و الحاد میں نظر آ رہا ہے۔ اس کفر و الحاد کے محرکات ہر جگہ مختلف ہیں لیکن "سندھ میں خاص کر" "سندھی نیشنلزم کے دینی تعلیم سے عاری نوجوانوں کو الحاد میں دھکیلنے کا سہرا کافی حد تک ہمارے اسلام کا منافقانہ نعرہ لگانے والوں اور اسلام کی من مانی تشریحات سے اپنے مکروہ سیاسی عزائم کی ہنڈی چکانے والوں کے سر ہے" جو اپنے آقاؤں کے ہر کردہ فعل کو اسلام کا لبادہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے انکے گھناؤنے فعل کو قبول تو کوئی نہیں کرتا۔ الٹا لوگ اسلام سے" برگشتہ "ہو رہے ہیں کہ اگر اسلام یہی ہے تو "ہماری توبہ" میں نے کچھ عرصہ پہلے۔ اپنے دینی رفیقوں سے اس "مسئلہ پر" اختلاف کیا تھا۔ جب میرے قابل قدر اور واجب الاحترام دوستوں اور بزرگوں نے جو کہ "پرانے سندھی" ہیں سندھی نیشلسٹوں کے خلاف شرعی فتویٰ مرتب کرنے کی فرمائش کی تھی" اس وقت میرا موقف یہی تھا کہ "کفر کے فتوے" اس مسئلہ کا حل نہیں ہے۔

مجھے تو اندیشہ ہے یہ "مشتعل نوجوان" فتوے سن کر خدا سے ڈرنے کے بجائے علانیہ الحاد کا اظہار کریں گے۔ آج آپ کی کتاب "استحکام پاکستان" میں اپنے موقف کی تائید پاکر ذہن میں فوراً یہ شعر گردش کرنے لگتا ہے۔

؎ "نہ تنہا من دریں مے خانہ مستم" جو حل آپ نے تجویز فرمایا ہے یعنی "اسلامی نظام عدل" کا عملی نفاذ یہ حل یقیناً اعلیٰ و ارفع ہے۔ اور اس عاجز کی زندگی کی ساری توانائیاں اسی میں صرف ہوئی ہیں۔ اور اب جب کہ قادیانیوں کے بموں سے حملہ کی وجہ سے قویٰ جسمانیہ جواب دے چکے ہیں تب بھی یہی آرزو دل میں لئے ہوتے ہوں۔ لیکن اسلامی نظام عدل کا نافذ ہونا آپ کے اور میرے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ ہم اس سے اب تک عاجز ہیں دوسرا حل دستیاب ...... یہ کہ اسلام کی صحیح تعبیر۔ ان نوجوانوں کے سامنے پیش کریں۔ اور انکو بتائیں کہ صحیح اسلام وہ نہیں ہے جو "چند مفاد پرست کرائے کے کارکن" اپنے ان داتاؤں کو خوش کرنے اور رقم بٹورنے کے لئے یا اپنی کم علمی و کم فہمی کے باعث نادان دوست کا کردار ادا کرکے پیش کر رہے ہیں بلکہ صحیح اور حقیقی اسلام میں ہر فرد و ملت ہر طبقہ و کلاس کے حقوق و فرائض مفادات اور علائق کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اگر سیاسی چالبازیوں سے تنگ اور شہری آزادیوں کے خواہاں ہیں تو اسلام سے بڑھکر اس کا حامی وطرفدار کسی نظریہ کو نہ پائیں گے۔ اگر آپ معاشی ناہمواریوں اور اقتصادی استحصال کا خاتمہ چاہتے ہیں تو اسلام سے بڑھ کر دولت کی منصفانہ

تقسیم کا پروگرام کسی کے پاس نہیں ہے۔

"پنجاب سے نفرت" کے عنوان کے تحت سندھ کی زمینوں پر پنجابی آبادگاروں کے بسانے کے مسئلہ کو غالباً آپ نے طرفین سے معلومات حاصل کئے بغیر اپنے اندازے سے بیان کیا ہے۔ اس مسئلہ کی اصل حقیقت یہ ہے کہ سکھر بیراج کی منصوبہ بندی اور سنگ بنیاد کے وقت سندھ کی تحریک خلافت کے زیر قیادت انگریز سے ترک موالات کی مہم اپنے زوروں پر تھی۔ سندھ میں سید العارفین حضرت مولانا تاج محمود امروٹی (نور اللہ مرقدہ)، رئیس المجاہدین حضرت مولانا محمد صادق صاحب رحمۃ اللہ، شیخ محمد سیلور یانی۔ حضرت حماد اللہ ہالیجوری رحمۃ اللہ و جان محمد جونیجو اور دیگر قائدین کی بدولت اس تحریک کو جو عروج حاصل ہوا تھا۔ اسکی مثال پورے برصغیر میں نہیں مل سکتی۔ ہزاروں خاندان اپنا مال و اسباب وطن و احباب چھوڑ کر افغانستان ہجرت کر گئے تھے۔ جن کے کچھ پس ماندگان اب بھی افغانستان میں موجود ہیں۔ انگریزی فوج تو بڑی بات ہے سندھ کے ہزاروں مسلمان ترک موالات کے دور میں انگریز کی سول ملازمتوں سے مستعفی ہو گئے تھے۔ جن میں سے بہت اب بقید حیات ہیں۔ اور سلف کی جہاد کی یادیں تازہ کر رہے ہیں۔ فوج اور سول ملازمتوں میں سندھیوں کی کمی کا آپ کے بیان کردہ اسباب کے ساتھ ساتھ ایک قوی سبب یہ بھی ہے۔ اس ترک موالات کا ابھی ازالہ ٹھنڈا نہ پڑا تھا کہ اتنے میں دو تحریکیں عین اس وقت شروع ہو گئیں۔ جب سکھر بیراج بن کر تیار ہوا۔ انگریز نے زمینیں تقسیم کرنا شروع کر دیں۔ ایک تحریک نہروں کی کھدائی سے مساجد کے متاثر ہونے سے شروع ہوئی۔ جس کی قیادت سید العارفین حضرت مولانا تاج محمود امروٹی (نور اللہ مرقدہ) فرما رہے تھے اس کا اثر اگرچہ۔ پورے سندھ میں شدت سے ظاہر ہوا۔ لیکن خصوصی طور پر سکھر بیراج کے رائیٹ بنک والے علاقہ میں ایک بغاوت کی کیفیت پیدا ہو گئی اور دوسری تحریک حضرت سورہیہ سائیں پیر صبغت اللہ شاہ پاگارہ کی تحریک حر تحریک تھی۔ جس نے خصوصیت سے لیفٹ بنک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سندھ کے مسلمانوں نے عموماً و حر مجاہدین نے، خصوصاً انگریز کے خلاف سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ اس وقت سندھ کے غیور مسلمان آزادی اور اسلام کی جنگ لڑ رہے تھے۔ عین اس وقت انگریز اپنے اعتماد کے لوگ پنجاب سے درآمد کر کے سندھ کی زمینوں پر قابض کروا رہے تھے، اور قادیانیوں کو عطیات میں سندھ کی زمینیں دے رہے تھے۔ یہ سب بالکل غلط ہے کہ "چونکہ پنجاب کے لوگ

زیادہ بنتی ہیں اس لئے ان کو زمینیں دی گئیں"۔ کیونکہ جن سندھیوں نے تحریک خلافت سے غداری کر کے انگریز سے زمینیں حاصل کی تھیں۔ جیسے نواب شاہ ضلع کے "ڈاھری قبیلہ کے سندھی قادیانی" یادو سب انگریز کے پٹھو تھے۔

ان کی زمینوں کا ریکارڈ جا کر معائنہ فرمائیں "ایک ایکڑ بھی غیر آباد نہیں رہا تھا" اور فی ایکڑ پیداوار میں سب سے آگے تھے۔ ہر ذی شعور آدمی سمجھ سکتا ہے کہ "عدم تعاون کی تحریک میں اگر کوئی فرد فریق مخالف کا معاون بنے تو بھی رنجش پیدا ہونے لازمی امر ہے"۔ چہ جائیکہ مجاہدین آزادی کے حقوق اور املاک پر قابض ہو جائے اس کے بعد جب گدو بیراج تیار ہوئی اور زمینیں تقسیم ہونا شروع ہوئیں تو سب سے بڑا حصہ علی الحساب "فوجی فارم" کے طور پر دیا گیا جو کہ ہزاروں ایکڑ زمین پر مشتمل ہے۔ بقیہ حصہ میں سرکاری ملازمین اور فوجی جنرلوں، کرنلوں نوازا گیا۔ اس کے بعد باقی زمین کو بڑے بڑے بلاکوں کی صورت میں عام نیلام کیا گیا۔ جن میں چھوٹے سے چھوٹا بلاک ۳۲ ایکڑ کا تھا۔ جبکہ اس سے بڑے بلاک ۶۴ ایکڑ ۱۲۸ ایکڑ اراضی کے تھے یہاں کے مقامی باشندے جو "بارش" قدرتی سیلاب" اور عمیق ترین کنوؤں کے پراہٹ کے ذریعہ معمولی سے پیداوار حاصل کرتے تھے۔ اس کا بڑا حصہ لیز منی کے طور پر گورنمنٹ کو ادا کرتے تھے اور چالیس چالیس پچاس پچاس سال سے غیر آباد بنجر زمینوں پر اس قحط سال کے دور میں ہزاروں روپیہ اس امید پر خرچ کر چکے تھے کہ نہری پانی میٹھا ہونے کے بعد ساری یہ زمینیں سرکاری نرخ پر ہمیں مالکانہ حقوق کے ساتھ ملینگی لیکن۔ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" کے مصداق وہ ساری زمینیں مقامی ہاریوں کو سرکاری نرخ پر دینے کے بجائے بڑے بڑے بلاکوں کی صورت میں عام نیلامی کے لئے پیش کی گئی جن پر مقامی لوگوں کے مکانات چھوٹے چھوٹے باغات اور کنوئیں بنے ہوئے تھے۔ جو غریب دو وقت کی سوکھی روٹی سے اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کی سکت بھی نہیں رکھتے تھے وہ پنجاب سے آئے ہوئے سرسبز اور شاداب علاقہ کے چودھریوں سے کھلے نیلام میں کہاں مقابلہ کر سکتے تھے۔ نتیجۃً پنجاب سے لائے ہوئے چودھری صاحبان جو کہ "ون یونٹ کے عزائم کی تکمیل کے لئے منصوبہ اور سازش کے تحت لائے گئے تھے" انہوں نے اپنی "تجوریاں" کھول لیں۔ مقامی باشندے منہ تکتے رہ گئے اور کسی بھی مقامی باشندے کو نیلام سے ایک بلاک خریدنے کی طاقت بھی میسر نہ ہو سکی اور

ساری کی ساری زمین پنجاب سے آئے ہوئے آباد کار لے گئے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جو زمین مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے قومی اور سول افسروں کو دی گئیں تھی، مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی وجہ سے ان کی الاٹمنٹیں منسوخ کر کے وہ بھی ساری کی ساری پنجاب سے آئے لوگوں کو دی گئیں ایک بلاک بھی کسی مقامی سندھی کو نہیں دی گئیں، ان حالات میں آپ ٹھنڈے دل سے غور کر کے فیصلہ فرمائیں کہ باہر سے آئے ہوئے ان لوگوں سے مقامی باشندے محبت کر سکتے ہیں یا نفرت؟ جب تک "ان معاملات میں انقلابی تبدیلی رونما نہیں ہوتی زبانی کلامی درس اخوت چاہے کتنا ہی موثر پیرائے میں ہو ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں کرتا۔ کم از کم میری ہمت تو ان حالات میں جواب دے چکی ہے اگر کوئی بلند حوصلے والے اولوالعزم بزرگ یہ کام سرانجام دے سکیں تو بلا چشم ماروشن دل ماشاد

اس وقت سوال زمینوں کی وصولی کا نہیں بلکہ "وطن کی آزادی" اور دین کی سربلندی" کا تھا۔ والسلام

(مولانا) محمد مراد
شیخ الحدیث، مدرسہ منزل گاہ سکھر

(۲)

محترم ڈاکٹر اسرار احمد۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

گذارش ہے کہ پچھلے سال آپ نے سکھر ڈویژن کے تین چار مقامات کا دورہ اسد اللہ بھٹو صاحب کی معرفت کیا۔ اس دورے میں آپ کا جانا کندھ کوٹ، مبارکپور، سکھر اور گارھی موری ہوا۔ کندھ کوٹ میں آپ کے پروگرام کا سارا انتظام جماعت اسلامی کے لوگوں نے انجام دیا تھا حتیٰ کہ آپ کے پروگرام کی اناؤنسمنٹ کرنے والے بھی جماعت اسلامی کندھ کوٹ کے امیر مولانا واحد بخش خلجی تھے اور شہر میں پبلسٹی کے فرائض اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکنوں نے ادا کئے تھے۔ مبارکپور میں آپ کے سامعین تمام کے تمام جماعت اسلامی سے متعلق افراد تھے۔ سکھر شہر کے غازی رشید پارک میں آپ کے خطاب سننے کا موقعہ مجھے بھی ملا تھا اس میں بھی سامعین کی تعداد نصف سے زائد جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکنوں پر مشتمل تھی۔ اس دورے کے تاثرات جب آپ نے اخبار جنگ میں قلمبند فرمائے تو یہ انکشاف بھی فرمایا کہ سندھ سے اسلامی جمعیت

طلبہ کا وجود نیست و نابود ہو چکا ہے ۔ ہمارے لئے آپ کی یہ بات محض زورِ قلم
کے سوائے کچھ نہ تھی ۔ سندھ میں ایم آر ڈی کی تحریک کے بعد ہمارا کام بلاشبہ
متاثر ہوا تھا لیکن پچھلے دو سالوں میں جمعیت کی افرادی قوت میں کئی گنا اضافہ
بھی ہوا ہے ۔

آپ کے رسالہ میں ایک سابق رکن جمعیت نے ماضی کے جن واقعات کی
نشاندہی کی ہے، اس سے چونکہ میں براہ راست متعلق نہیں رہا ہوں، اس لئے اس
پر کلام کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا ہوں ۔ پاکستان میں قومیتوں کی کشمکش نے
جو شدت اختیار کی ہے، اس سے پاکستان لیول کی کوئی بھی پارٹی غیر متاثر
نہیں رہی ہے ۔ اس کو حالات کی ستم ظریفی کہیئے یا اپنوں اور غیروں کی کارستانیاں،
ایسا ہر پارٹی کے اندر ہو چکا ہے ۔ آپ کی تنظیم میں شاید اسی طرح کی صورت حال
پیش نہ آئی ہو، کیونکہ آپ کو بھی غیر اردو دانوں میں اب تک اثر و نفوذ حاصل
نہیں ہو سکا ہے ۔

برادر عبدالغفار کا یہ کہنا کہ جب تک پاکستان قائم ہے شاید صوبہ سندھ میں کسی
بھی اسلامی تنظیم کا وجود میں آنا ایک معجزہ ہوگا"، محض حالات سے انتہا درجے کی
مایوسی کے سوائے کچھ نہیں ۔ اس وقت بھی مذہبی جماعتیں لادینی عناصر کے خلاف
سب سے بڑی رکاوٹ ہیں ۔ مذہب پر براہ راست حملے کی پالیسی کو کمیونسٹوں
نے ترک کر کے مذہب سے متعلق بے تعلقی کی پالیسی کو اختیار کیا ہے ۔ صوبہ سندھ
میں ہزاروں سندھی نوجوان اب بھی لادینیت سے سخت بیزار ہیں ۔ حالانکہ
کمیونسٹوں نے اپنے کام کی رفتار پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھا دی ہے ۔ برادر
عبدالغفار ابڑو کا یہ کہنا کہ سندھ میں جمعیت کے پاس کچھ انگلیوں پر گنے جانے والے
لڑکے ہیں وہ بھی صرف والدین کی وجہ سے سراسر مبالغہ آمیزی پر مشتمل ہے ۔ اس وقت
صرف سکھر ڈویژن میں ۱۰۰ سے زائد سندھی رفقاء ہمارے سرگرم کار ہیں ان میں سے
تین چار کے والدین کا تعلق جماعت سے ہے باقی تمام رفقاء و کارکنان غیر جماعتی
گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کو اپنے گھروں میں شدید مزاحمتوں کا سامنا کرنا
پڑتا ہے ۔ آپ کی معلومات کے لئے عرض رکھتا ہوں کہ کشمور، کرم پور، کندھ کوٹ

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

سرزمینِ مصر کی عظیم دینی تحریک

الاخوان المسلمون

مصر کی عظیم دینی تحریک اخوان المسلمون کا یہ تعارف ۔۔ اخوان کے رہنما جناب عبدالبدیع صقر کے اُس عربی خط کا ترجمہ ہے جو انہوں نے ایک پاکستانی سائل کے ان دو سوالات کے جواب میں تحریر کیا۔

۱۔ اخوان المسلمین کی دعوت کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں ؟

۲۔ آج تک یہ تحریک کامیابی سے ہمکنار کیوں نہیں ہوئی ؟

قارئین "میثاق" کے لئے اسے اُردو کے قالب میں ڈھالنے کا فریضہ قرآن اکیڈمی کے مدرس مولانا ابوعبدالرحمٰن شبیر احمد نورانی نے ادا کیا ہے۔

(ادارہ)

—— (۱) ——

کسی دعوت کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اُس دعوت کے بانی کی شخصیت، دعوت کے ابتدائی حالات اُس کے پیروکاروں کے کردار اور ان کو میسر وسائل سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اخوان المسلمین کے بانی الاستاذ حسن بن احمد بن عبدالرحمٰن البناء سرزمین مصر کے ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ آپکے والد اپنے وقت کے حدیث کے بڑے عالم تھے۔ علم حدیث پر اُن کی پانچ تالیفات میں سے صرف ایک تالیف تئیس ۲۳ جلدوں پر مشتمل تھی۔ حسن البناء نے اپنی ابتدائی زندگی مصر کے ضلع بحیرہ میں بسر کی علوم دینیہ کی تکمیل کے بعد جدید علوم کی تحصیل کے لئے دارالعلوم کالج میں داخلہ لیا۔ جہاں سے فراغت کے بعد حکومتِ مصر کے شعبہ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن سرکاری ملازمت کی پابندیاں آپ کو راس نہ آئیں اور بالآخر ملازمت سے استعفےٰ دیکر اخوان المسلمین کی بنیاد رکھی۔ عمر بھر اپنی دعوت کی عملی تفسیر بنے رہے۔ فلسطین اور نہر سویز کی بازیابی کے لئے

آپ نے اپنی جماعت سمیت قتال فی سبیل اللہ میں عملاً شرکت کی ۔ اپنی جماعت میں سب
سے پہلے شہادت کا شرف حاصل کرنے کی سعادت بھی آپ کے حصے میں آئی ۔
مختصراً اخوان کا نصب العین درج ذیل الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے ۔

اللّٰہُ غایتُنا — اللہ ہمارا مقصود ہے ۔

الرسول زعیمنا — رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارا قائد ہے

الجهادُ سبیلنا — جہاد ہمارا راستہ ہے ۔

الموت فی سبیل اللہ اسمٰی اَمانینا — اللہ کی راہ میں موت ہماری سب سے بڑی آرزو ہے ۔

امام حسن البنا کی ساری زندگی غربت و فقر میں گزری ۔ آپ کی سب سے بڑی میراث
پ کی دعوت ہے ۔ آپ کی شخصیت اخوان کے دلوں کی دھڑکن تھی ۔ آپ کے ذاتی
لات کی بجائے زیادہ مناسب یہ ہے ہم اُن کی جماعت اور اُس کی جدوجہد کا تعارف
ش کریں ۔

جہاں تک اخوان کی دعوت کا تعلق ہے تو وہ کسی نئی دعوت کے داعی نہیں تھے ۔
ن کی جدوجہد کا مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمانوں کی زندگی انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبا
اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی سُنّت کے تابع ہو جائے ۔ وہ اُسی ابدی پیغام
علمبردار تھے جو حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک سارے پیغامبر
تے رہے ۔

کردار اور عمل کے میدان میں بھی اخوان المسلمین نے اس گئے گزرے زمانے میں
مونے پیش کئے ہیں جن کی مثال ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے ۔ اگرچہ ہم چند
ایاں افراد کے کردار اور قربانیوں سے آگاہ ہیں لیکن ایسے سینکڑوں اور ہزاروں افراد
ردار اور عمل ہم سے پوشیدہ ہے ' اللہ جل شانہٗ کا یہ فرمان بالکل برحق ہے کہ

"وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ" — تیرے ربّ کے لشکروں کو سوا وہی جانتا ہے ۔

مصری معاشرہ میں اخوان اپنے کردار کی وجہ سے سب سے الگ پہچانے جاتے ہیں
ن کے کردار کی صفات کی وجہ سے ان کو ذاتی طور پر جانے بغیر بھی عام آدمی یہ بتا

دیتا ہے کہ یہ شخص اخوانی ہے - اخوان کی تنظیم میں ارکان کے دو درجے ہیں - پہلا درجہ رکن کہلاتا ہے اور دوسرا معاون - کارکن کو کردار کے مخصوص معیار پر جانچا جاتا ہے اور وہ معیار ایسا ہے کہ آج تک پے بہ پے مصائب اور مشکلات کے باوجود کسی کارکن کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی - اخوان کی یہ ہمت اور استقامت دراصل مرشد حسن البناء کی تعلیمات اور تربیت کا نتیجہ ہے - مرشد نے اپنی اکثر و بیشتر تقاریر اور خطبات میں اس راہ کی مشکلات اور آزمائشوں کو کھول کھول کر بیان کیا ہے - ایک جگہ فرماتے ہیں -

"اے میرے بھائیو تم کوئی رفاہی تنظیم نہیں ہو جس کے اغراض و مقاصد بہت محدود ہوتے ہیں - تم تو امت مسلمہ کی روح ہو - تمہیں اس امت کو قرآن کے ذریعہ زندہ کرنا ہے - اللہ کے راستے کی طرف رہنمائی تمہارا فریضہ ہے - تمہاری دعوت کوئی من گھڑت دعوت نہیں - یہ تو اللہ کی بنائی ہوئی وہ فطرت ہے جس پر اس نے انسان کو تخلیق کیا ہے - بس نئی بات صرف یہ ہے تمہیں اس فطرت کے حسین چہرے کو ہر نوع کے گرد و غبار اور آلودگی سے پاک کرنا چاہیے - خواہ یہ آلودگی غلو کرنے والوں کے افکار و نظریات کے سبب سے ہو یا باطل پرستوں کی تاویل و تحریف کی وجہ سے تمہارا مقصد تو یہ ہے کہ یہ فطرت باطل اسی طرح صاف و شفاف اور پاکیزہ ہو کر آشکارا ہو جائے جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے پاس سے لے کر آئے تھے - اگر تمہاری کوشش یہ ہے کہ شریعت اسلامی نافذ ہو جائے تو سب سے پہلے اسے اپنے آپ پر نافذ کرو - تمام لوگ کو اس نظام و شریعت کی دعوت دو خواہ وہ حاکم ہو یا رعایا - اس ساری جدوجہد اور کشمکش کا مقصد صرف ایک ہے کہ اطاعت اور بندگی صرف اللہ کے لئے خالص ہو جائے زمین پر فتنہ و فساد باقی نہ رہے - ایک زمانے میں اسلام کا قانون سیاست، عدالت، حکومت غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں کارفرما تھا لیکن آج کیفیت یہ ہے صرف شریعت کی پسندیدگی کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن عوام اور خواص دونوں کی اکثریت اسے ماننے کو تیار نہیں یا کم از کم انہیں نفاذ شریعت کی برکات اور اس کے فوائد کا شعور و ادراک نہیں دوسری طرف بہت سے لوگ اس دعوت کی حقیقت و ماہیت سے ہی بے خبر ہیں - جس دن لوگ اس دعوت کے اغراض و مقاصد سے آشنا ہو جائیں گے اس دن ان کی مخالفت اور شا

ں بھی اضافہ ہوجائے گا۔ قوم کی دین سے ناواقفیت بھی آڑے آئے گی۔ کم علم مولوی
ں تمہارا راستہ روکیں گے۔ اللہ کی راہ میں تمہارا جہاد اُن کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ مسلمانو
کومتیں بھی تمہارے مقابل صف آرا ہوں گی۔

استعماری طاقتیں تمہاری جدوجہد کو ہر طرح سے غارت کرنے کی کوشش کریں گی۔
بیلی حکومتیں پست اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سے تعاون کریں گی، ماری تعاون
للک رہی تمہارے درپے آزار ہوں گے، اور تمہارے بدخواہ اور دشمن اُن کے آلۂ کار بن کر
نے آئیں گے۔ ابتلاو امتحان کے اس دور سے بہرحال تم گزرو گے۔ تمہیں قیدی بنا کر
خانوں میں ڈالا جائے گا۔ یا ملک بدر کر دیئے جاؤ گے تمہارے ذرائع و وسائل پر
ں ہاتھ ڈالا جائے گا، تمہارے گھروں کی بھی تلاشی لی جا سکتی ہے۔ ایسا بھی ہو
تا ہے کہ عرصہ امتحان لمبا ہوجائے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

الٓمّٓ ۚ أَحَسِبَ النَّاسُ أَن	الٓمّٓ۔ کیا لوگوں کا خیال ہے وہ
يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا	ایمان لانے کے بعد ایسے ہی چھوڑ
وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝	دیئے جائیں گے؟ اور اُن کو آزمائش
	میں نہیں ڈالا جائے گا۔

البتہ ان ساری آزمائشوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ مجاہدین
ضرور مدد کرے گا۔ اور مخلصین و صادقین کو مزدو اجر و ثواب سے نوازے گا۔ یہ تو تھی
شد عام رحمۃ اللہ علیہ کی گفتگو۔

مرشد عام سے ارکان جماعت کا تعلق خالصتاً اللہ کے لئے تھا، اس میں نہ سلاسل
فیا، کی طرح مبالغہ آمیز عقیدت تھی اور نہ ہی سیاسی جماعتوں کی طرح مفاد پرستی تھا،
یہ ایک خوبصورت اور مثالی رشتہ تھا۔ ہم میں سے اکثر ارکان مرشد عام کی رائے
اختلاف بھی کر لیتے تھے، اور خیر خواہانہ مشورہ بھی دے لیتے تھے، آپ ہماری
ے قبول کرتے ہوئے حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے، اور ہمارے حق میں دعا بھی کرتے
ے۔ ہمارے گھروں میں تشریف لاتے بے پناہ تواضع اور خوش دلی سے ہماری
زادی اور نجی مشکلات کا حل تلاش کرتے، ایک موقع پر ایک مخالف پرچے نے
لی اس مشفقانہ تعلق پر اس طرح تبصرہ کیا تھا: ”مرشد عام حسن البناء ایسا

آدمی ہے کہ اگر وہ قاہرہ میں چھینک مارے تو اسوان جیسے بعید شہر میں بھی ہزاروں آدمی اس کی چھینک کا جواب یَرْحَمُكَ اللّٰہ کہہ کر دیتے ہیں،" اس کے ساتھ ساتھ اس پرچے کا کردار یہ بھی ہے کہ "جب مرشد عام نے سردیوں میں مہاجرین فلسطین کے لئے تعاون کی اپیل کی اور کہا کہ کم از کم ایک ٹرک گرم کپڑوں کا بطور تعاون آنا چاہیئے تو اس پرچے نے آپ کو "مرشد عام" لکھنے کی بجائے "مقتول عام" (بڑا دھوکے باز) لکھا تھا۔ یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے نمایاں ہے کہ اس طرح کے پرچے حکام کو ہمارے خلاف برانگیختہ کرتے رہتے ہیں اور ہماری تحریک کے 'خطرناک' ہونے کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔

امام حسن البناء کا انداز تربیت بہت خوب تھا، انہوں نے اخوان کے اندر باہم محبت پیدا کی۔ دعوت حق کی خاطر دلوں کو اس قدر جوڑ دیا جس کی فی زمانہ نظیر نہیں مل سکتی، اور یہ اوصاف ان تمام لوگوں میں محسوس کئے جا سکتے ہیں جو آپ کے ساتھی بن کر آپ کے ساتھ چلے، آپ کے ساتھیوں نے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دل و جان سے پسند کیا، اور اسے معاشرے میں رواج بخشا۔ اخلاق قرآنی اور سیرت مصطفےٰ کو اپنے گھروں اور ذاتی زندگی میں نافذ کر کے دکھایا، اُن کی زندگی کے انداز بدل گئے ذاتی کیفیات بدل گئیں، لیکن دین کے اصول بدل گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے اعتبار سے صحیح اور سچے مومن ہو گئے۔ "خدا کی قسم، تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس وحی الٰہی کی تابع نہ ہو جائے۔"

تمام عرب ممالک اور اکثر اسلامی ملکوں کے لئے فکری رہنمائی کا مرکز مصر میں ہے اخوان المسلمین کی جدوجہد کے نتیجے میں اسلامی کردار کی لہر بھی اکثر ملکوں تک پہنچی، اور ان ملکوں میں بھی اخوان کی طرز پر مختلف جماعتیں پروان چڑھیں۔

اگرچہ تمام حکومتیں اخوان کی مخالف رہیں لیکن عوام قریب آتے گئے اور ایسا اس لئے ہوا کہ اخوان ساتھیوں نے ہر موقع پر بہادری و شجاعت کا مظاہرہ کیا خواہ مقابلہ نہر سویز پر انگریز کے خلاف ہو یا فلسطین میں یہودیوں کے خلاف جہاد ہو۔ یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ زبردست مقابلے کے باوجود صرف نوا فرادگی

ڑلی نے ۱۹۴۸ء میں یہودیوں سے دو مرتبہ مسجد اقصیٰ واگزار کروائی تھی، جسے بیس سال بعد پوری فوجی طاقت کے باوجود یہودیوں نے انقلابیوں (جماعت عبدالناصر کا گروہ) کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ جب عدالتوں میں اخوانیوں کے خلاف فیصلے ہو رہے تھے اس وقت بھی انہوں نے اپنی جرأت واستقلال کا لوہا منوایا، مختلف مواقع پر فوجی عدالتوں کے ججوں اور جرنیلوں کو بھی اپنی جرأت ایمان کے سبب ہراساں یا ششدر کر دیا۔ جیلوں میں ارکان جماعت کی ثابت قدمی ضرب المثل ہے "الطور" کے قید خانے میں انہوں نے مدارس الہجرۃ کے نام سے تعلیم و تربیت کے عقوبت خانے قائم کئے، مدت قید یہاں دو سال تک رہی جبکہ افراد کی تعداد چھ ہزار تھی۔ الواحات کے قید خانوں میں بھی ایسے ہی مراکز قائم تھے، یہاں کی مدت قید سترہ سال تھی، دیگر جیلوں میں بھی نظام تعلیم و تربیت قائم تھا جو تقریباً بیس سال چلتا رہا۔ بعض اخوانیوں نے زمانہ قید میں قرآن حکیم حفظ کیا، کئی ساتھیوں نے بی اے پاس کیا، اس طویل آزمائش کے باوجود کسی ایک ساتھی کو بھی اپنے نظریے میں شک نہیں گزرا اور نہ ہی اپنے قائد یا دیگر رہنماؤں کے بارے میں بدگمانی ہوئی، نہ کسی نے جذبات میں آکر راستہ تبدیل کرنے کا سوچا، حقیقت یہ ہے کہ اس ساری مشقت و آزمائش کے زمانے میں ایک الہامی قسم کی لذت محسوس کرتے رہے۔ اگرچہ اسی ابتلاء و تعذیب کے دوران کئی حضرات شہید بھی ہوئے، اس آخری وقت میں اُن کی زبان اللہ کے ذکر سے تر، اور دماغ دعوت و تحریک کے لئے فکر مند تھا،

مختلف اوقات میں سات مرتبہ جماعت کی تمام شاخوں پر پابندی عائد کر کے کالعدم قرار دیا گیا، ایسی کارروائیوں کا بھی ارکان جماعت پر کوئی اثر نہیں ہوا، اور نہ ہی ان کا جذبۂ اسلام مدھم پڑا، بلکہ ان کی جدوجہد اور غیرتِ دینی اور تیز ہو گئی، اس لئے کہ اُن کو افسوس و حسرت ہوتی تھی۔ ان مفید اداروں کے بند ہونے پر، فنڈز کی ضبطی پر، اسلامی مراکز کے بند ہونے پر، اللہ تعالیٰ کی مشیت کے سہارے وہ اپنا کام دوبارہ شروع کر دیتے ہیں حکومت بھی بذاتِ خود جیلوں اور قید خانوں میں وعظ و نصیحت کے نام سے درس و تقریر کا انتظام کرتی تھی، حالانکہ اس وعظ و نصیحت کا حقیقی مقصد ذہنوں کی صفائی (BRAIN WASHING) تھا، یا کم از کم دعوت کے بارے میں شکوک پیدا کرنا ہوتا

تھا، بنیادی طور پر غلط فہمیاں پیدا کرنا، قائدین کے کردار کے بارے میں دھوکا
بھی اس میں شامل تھا، اکا دکا افراد جماعت کو حکومت اپنا آلہ کار بنانے میں بھی کا
ہو گئی تھی، انہیں دوسرے ساتھیوں کی توہین کرنے یا باہمی اخلاص و محبت کی فضا خرا
کرنے کی خاطر وہاں جیلوں میں روکے رکھا تھا، اپنے ان مقاصد کو حاصل کرنے کیلیٔ
حکمران بہت محنت کرتے، اخراجات برداشت کرتے، اور ایسے کاموں میں مہارت رکھ
والے "فنکاروں" کو دور دور سے دعوت دے کر لاتے تھے۔ اس سب جدوجہد کے با
اخوانیوں پر اس کا ذرا برابر بھی اثر نہ ہوتا تھا وہ کامل یقین اور اخلاص کے مالک
اللہ پر ایمان اور اللہ سے مضبوط تعلق انکے شعور کی بنیاد تھا۔ لوگوں کو آج بھی اس
تعجب ہے کہ اخوانیوں کا اللہ تعالیٰ سے کیا نرالا تعلق ہے۔ کہ آزمائش اور امتحان کی
تدبیر ناکام ہو جاتی ہے اور وہ کامیاب و کامران واپس آتے ہیں۔ حالانکہ اصل
تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں بیان ہوئی ہے۔

وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ	اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو جوڑ
أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ	رکھا ہے اگر آپ ساری زمین پر موجود
جَمِيْعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ	وسائل بھی خرچ کر دیں تب بھی
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ أَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ	ان کے دلوں کو نہیں جوڑ سکتے،
إِنَّهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ - القرآن	حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

ان کے دلوں کو جوڑا ہوا ہے اس کی ذات عزیز و حکیم ہے۔

امام حسن البناء کوئی ایسے بڑے فصیح و بلیغ خطیب بھی نہ تھے جس کے بل بو
پر اخوان المسلمین تشکیل پائی۔ مصر میں امام حسن البناءؒ سے کہیں بڑھ کر خطیب و
آدمی موجود تھے، اصل بات یہ ہے کہ اُن کی سچی نیت اور مخلصانہ ارادے کا یہ کارنامہ
جس کی وجہ سے نہ تو وہ خواہشات نفس کے غلام بنے، نہ کسی لالچ کا شکار ہوتے
اور بڑا بننے کی خواہش پروان چڑھ سکی، بلکہ ہر طرح کی خود پسندی سے بے نیاز
اور اگر آدمی انہیں کمزوریوں کا غلام ہو جائے تو وہ اسے تباہ کر کے رکھ دیتی ہیں
امام حسن البناء تالیف و تصنیف کے بھی کوئی ماہر نہ تھے، اس انداز کی جماعت بنا
کی بنیاد فراہم کر سکتے، ان کی کتابیں چند ایک ہیں، البتہ بہت گہری اور پر تاثیر

موقع پر امام صاحب سے سوال ہوا آخر آپ بڑی بڑی کتابیں کیوں نہیں تالیف کرتے؟ آپ
نے جواب میں فرمایا۔ میں افراد تیار کر رہا ہوں، وہ اگر چاہیں تو کتابیں تیار کر سکتے ہیں
اے میرے بھائی! جماعتوں کی کامیابی یا ناکامی سے متعلق گفتگو کے لئے باریک
بینی اور گہری سوچ کی ضرورت ہے۔ بسا اوقات تو یہ ہوتا ہے کہ دعوت اور تحریک لوگوں
کی نگاہوں میں کامیاب ہوتی ہے۔ لیکن اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہی ہوتی ہے۔ اور
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تحریک سخت آزمائش سے دوچار ہوتی ہے، لیکن اندر سے
مضبوط اور پھلنے پھولنے کے قابل ہوتی ہے۔

اب ہم وسائل جماعت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

جماعت اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے جن محدود وسائل کو بروئے کار
لائی ہے اس کی تفصیل یوں ہے۔

۱۔ اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق ارکان جماعت کی تربیت کی، اور پورے معاشرے
کو انہی عقائد و نظریات کی طرف دعوت دی، اور یہی بات دین حنیف کی اصل
روح ہے۔

۲۔ حکمرانوں کو پوری خیر خواہی کے ساتھ نصیحت کی حسب ضرورت ان کے کردار
پر تنقید بھی کی، تاکہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کو ہی نہ بھول جائیں۔

۳۔ قومی بہبود کے مختلف مراکز قائم کئے۔ رفاہی کاموں میں شمولیت کی، لوگوں
کی مشکلات میں شریک ہو کر ان کی غمگساری کی، اور یہی اللہ کا حکم ہے:

وَافعلوا الخیر لعلکم تُفلحُون ”۔ نیک کام کرو شاید کہ تم فلاح پاسکو۔

۴۔ دُنیا کے گوشے گوشے میں جماعتی فکر کو پھیلایا۔

۵۔ جان و مال کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے، ہر طرح کی
فکری یلغار کو روکا۔ تاکہ دین کے نام سے کوئی غلط نظریہ اور فکر پروان نہ
چڑھ سکے۔

اور نہ ہی کوئی رکاوٹ پیدا ہو جس سے دعوت و تبلیغ کا کام رک جائے۔
بلاشبہ جماعت کی دعوت مصر کے علاوہ بھی بہت سارے ملکوں میں پھیل چکی

ہے۔ جس تاسیس کمیٹی کا رکن ہونے کا شرف مجھے (الشیخ عبدالبدیع صقر حفظہ اللہ) حاصل ہے اس کمیٹی میں اردن، شام، عراق، اور سوڈان کے اخوانی بھی شامل ہیں۔ اکثر ملکوں میں جماعت کو اپنی شاخیں قائم کرنے کی اجازت مل چکی ہے البتہ بعض ملکوں میں علی الاعلان کام کرنے کی فضا سازگار نہیں، چنانچہ وہاں خفیہ تنظیمیں قائم کی گئیں، جو عملاً ازہر والے مرکز سے ہی وابستہ ہیں، علاوہ ازیں مصر کے اندر بھی جماعت کی ہزاروں شاخیں ہیں۔ جو بہت فعال اور نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہیں لیکن خصوصی طور پر جس چیز نے مصر کے حکمرانوں، استعماری طاقتوں، اور بالخصوص یہودیوں کو پریشان کر رکھا ہے وہ جہاد فلسطین کی مہم ہے۔ صدیوں سے استعماری طاقتوں اور ان کی انگلی پر ناچنے والے حکمرانوں کی کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں کے دلوں سے جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ ختم کر کے راگ و رنگ کا دیوانہ بنا دیا جائے۔ مسلمانوں کو مختلف قسم کے کھیلوں اور عالمی شہرت یافتہ ایوارڈز کے حصول کا خوگر بنایا جاتے۔ جن کا جہاد کے مقابلے میں قطعاً کوئی فائدہ نہیں ہے۔

استعماری طاقتیں اپنے ہدف کو حاصل کرنے میں کافی حد تک کامیاب رہی ہیں، انہوں نے اُمتِ مسلمہ کو حقیقت جہاد سے کافی حد تک غافل کر دیا ہے۔

آخر کار اخوان المسلمین کی تحریک اٹھی۔ جنہوں نے لوگوں کو جہاد فی سبیل اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کی دعوت دی، نہر سویز کی بازیابی اور جہاد فلسطین کے موقع پر عملاً اس کا مظاہرہ بھی کر دکھایا، یہی بات استعماری طاقتوں کو سخت پریشان کئے ہوئے ہے۔ چنانچہ انہوں نے جھنجھلا کر ہمارے خلاف پورے منصوبے کے ساتھ سازشوں کا جال پھیلا دیا ہے۔ (جاری ہے)

——— بقیہ (مسئلہ سندھ اور قارئین سے) ———

مٹل، میرپور، مبارکپور، جیکب آباد، دھامراہ، سکھر، لاڑکانہ، شہزادکوٹ، چانڈکا میڈیکل کالج، شکارپور، باگڑجی۔ کندھرا، روہڑی، پنوعاقل، گھوٹکی، خیرپور، سیٹھارجا میں ہمارے کارکنان کی سرگرمیاں اس حد تک ظاہر ہیں کہ کٹر مخالفین بھی ان کا انکار نہیں کر سکتے۔ والسلام

خاکسار: شہاب الدین جوکھیو۔ ناظم سکھر ڈویژن۔

اسلامی انقلاب: مراحل، مدارج اور لوازم

انقلابِ محمدی کا بین الاقوامی مرحلہ

(اس سلسلے کے آخری خطاب کی پہلی قسط)

ڈاکٹر اسرار احمد

(ترتیب و تسوید: شیخ جمیل الرحمٰن)

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم — اما بعد:

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰایھا الذین اٰمنوا ما لکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل اللہ اثاقلتم الی الارض ارضیتم بالحیٰوۃ الدنیا من الاٰخرۃ ج فما متاع الحیٰوۃ الدنیا فی الاٰخرۃ الا قلیل ○ الا تنفروا یعذبکم عذابا الیما ۏ و یستبدل قوما غیرکم ولا تضروہ شیئا ط واللہ علی کل شیء قدیر ○ الا تنصروہ فقد نصرہ اللہ اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذ ھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا ج فانزل اللہ سکینتہ علیہ و ایدہ بجنود لم تروھا وجعل کلمۃ الذین کفروا السفلیٰ ط وکلمۃ اللہ ھی العلیا ط واللہ عزیز حکیم ○ انفروا خفافا وثقالا وجاھدوا باموالکم وانفسکم فی سبیل اللہ ط ذٰلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون ○ (سورۃ توبہ: آیات ۳۸ تا ۴۱)

وقال اللہ تبارک وتعالیٰ:

وما ارسلنٰک الا کافۃ للناس بشیرا ونذیرا ولٰکن اکثر الناس لا یعلمون ○ (سورۃ سبا: آیت ۲۸)

آیات درج بالا کی تلاوت اور ادعیہ مسنونہ وماثورہ کے بعد فرمایا :۔

حضرات! چند ہفتوں سے اجتماعاتِ جمعہ میں جس موضوع پر گفتگو کا سلسلہ چل رہا ہے یعنی: "اسلامی انقلاب : اس کے مراحل، مدارج اور لوازم" توان شاء اللہ آج کی آخری کڑی پر گفتگو ہوگی۔ اس طرح بفضلہ تعالیٰ آج کے اجتماع میں اس موضوع پر گفتگو کی تکمیل ہو جائے گی۔ اس آخری کڑی کا عنوان ہے : انقلابِ محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے بین الاقوامی مرحلہ کا آغاز جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس اپنی حیاتِ طیبہ ہی میں شروع فرما دیا تھا۔ ان شاء اللہ العزیز قرآن کی روشنی اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے ہم آج اُسے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

انقلاب کی خصوصیت

اس ضمن میں پہلی بات تو یہ جان لیجئے جسے میں پہلے بھی تفصیل سے بیان کرتا رہا ہوں کہ ہر انقلاب کی نظری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جغرافیائی یا علاقائی یا ملکی اور قومی حدود کا پابند نہیں ہوا کرتا بلکہ وہ پھیلتا ہے۔ کسی بھی انقلابی نظریہ کو نہ پاسپورٹ کی ضرورت ہوتی ہے نہ ویزے کی بلکہ وہ ان قیود سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کے لئے آج کل ایک اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ "تصدیر الانقلاب"۔ یعنی : انقلاب ایکسپورٹ کرنا، اس کا دائرہ وسیع کرنا۔ جدید عربی میں "تصدیر" کا لفظ Export کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں سے مراد یہ ہے کہ دوسرے ممالک میں بھی وہ انقلاب ظہور پذیر ہو۔ لہٰذا یہ بات سمجھ لیجئے کہ یہ انقلاب کا خاصّہ ہے اور اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ پھیلے اور وسعت پذیر ہو۔ بلکہ میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ کسی انقلاب کے "حقیقتاً" انقلاب ہونے کا حتمی ثبوت یہی ہے کہ وہ کسی ایک جغرافیائی حد میں محدود ہو کر نہ رہ جائے بلکہ پھیلے اور وسعت پذیر ہو۔ اگر وہ کسی جغرافیائی حدود کے اندر محدود ہو کر رہ گیا تو اس کے معنی یہ ہیں ——— کہ اُس میں جان نہیں تھی۔ اس کے بنیادی فلسفہ میں قوّتِ تسخیر نہیں تھی۔ اس میں آفاقیت اور عالمگیریّت نہیں تھی۔ بلکہ اس کے اندر قومی و ملکی عوامل اصل میں فیصلہ کن تھے۔ اس میں کوئی ایسا نظریہ، کوئی پیغام نہیں تھا جو بین الاقوامی اہمیّت کا حامل ہو اور جو قومی اور جغرافیائی حدود سے بالاتر ہو کر نوعِ انسانی کے اذہان و قلوب میں اپنی جگہ بنا سکے، ان کو مسخر کر سکے

——— میرے نزدیک یہ پیمانہ ہے اس بات کو جانچنے کا کہ کس تبدیلی کو انقلاب کا نام دیا جائے گا اور کس پر اس لفظ کا اطلاق کرنا غلط ہوگا۔ اگر اس تبدیلی میں وسعت پذیری کی صلاحیت و رجحان موجود ہے تو اسے ہم انقلاب کہیں گے اور اگر اس میں جغرافیائی حدود کو پھلانگنے کی صلاحیت موجود نہیں ہے تو در حقیقت وہ انقلاب نہیں ہے بلکہ محض ایک تبدیلی ہے۔

چند مثالیں: میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اگرچہ کامل انقلاب کی مثال تو تاریخِ انسانی میں صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام — جس کے نتیجہ میں انسانی زندگی کا ہر گوشہ بدل گیا تھا۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں میں انقلاب آگیا یعنی معاشرتی، سماجی، سیاسی، معاشی، عدالتی، دستوری اور آئینی غرضیکہ تمام وہ شعبے یک سر بدل گئے جو اجتماعیاتِ انسانی سے متعلق ہیں، بلکہ انفرادی زندگی بھی پورے طور پر اسکی لپیٹ میں آگئی تھی، اخلاق بدل گئے، عقائد بدل گئے۔ صبح و شام کے معمولات اور رہن سہن کے طور طریقے سب بدل گئے۔ مختصراً یہ کہ ایسا انقلاب جو پوری انسانی زندگی کو اپنی گرفت اور اپنے احاطہ میں لے لے یعنی جسے ہم کامل انقلاب (Complete Revolution) کہہ سکیں وہ تو صرف ایک انقلاب ہے اور وہ ہے انقلابِ محمدیؐ جو آج سے چودہ سو سال قبل جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرہ نمائے عرب میں برپا کیا تھا۔ لیکن اس سے نیچے اتر کر وہ انقلابات جو کسی نہ کسی درجہ میں "انقلاب" کا عنوان پانے کے مستحق بن سکتے ہیں، ان میں دو انقلابات قابلِ ذکر ہیں۔ ایک ہے انقلابِ فرانس۔ جس کے نتیجہ میں سیاسی ڈھانچہ بدل گیا تھا۔ ملوکیت کا دور ختم ہوا اور جمہوریت کے دور کا آغاز ہوا۔ اسی طرح دوسرا انقلاب جس پر لفظ انقلاب کا کسی درجہ میں اطلاق ہوتا ہے۔ وہ ہے روس کا انقلاب یعنی بالشویک انقلاب (Balsh. Revolution) جس کے نتیجہ میں معیشت کا پورا ڈھانچہ بدل گیا۔ تمام ذرائع پیداوار انفرادی ملکیت سے نکل کر اجتماعی ملکیت میں لے لیے گئے۔ آغاز میں تو وہاں بہت انتہا پسندی تھی کہ انفرادی ملکیت کی کامل نفی تھی لیکن ہوتے ہوتے اب وہ جہاں پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ ذاتی استعمال کی چیزیں انفرادی ملکیت ہو سکتی ہیں۔ جیسے ایک شخص کے پاس

سائیکل ہے جس پر وہ دفتر یا کارخانے جاتا آتا ہے تو یہ اس کی ذاتی ملکیت ہے۔ کسی شخص کے پاس رہنے کے لئے مکان ہے تو وہ اس کی ذاتی ملکیت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اس کے پاس گھریلو استعمال کا جو سامان ہے، وہ بھی اس کی ذاتی ملکیت ہے لیکن ذرائع پیداوار (Means of Production) جن سے انسان مزید پیدا کرتا ہے جو وہ آمدنی کا ذریعہ بناتا ہے، کسی فرد کی ملکیت میں نہیں رہیں گے بلکہ وہ پوری قوم اور ریاست کی ملکیت قرار پائیں گے اور حکومت ان کا انتظام کرے گی اور ان ذرائع پیداوار سے جو یافت ہو گی تو حکومت کوشش کرے گی کہ اس کو پوری قوم میں ایک مقررہ معیار کے مطابق حصہ رسدی کے اصول پر تقسیم کر دیا جائے ——— بہرحال یہ ایک بہت بڑی تبدیلی ہے اور اس تبدیلی کے اعتبار سے بالشویک ریوولوشن بھی یقیناً ایک انقلاب تھا۔ حاصل گفتگو یہ ہے کہ سیاسی سطح پر انقلابِ فرانس اور معاشی سطح پر انقلابِ روس یقیناً "انقلابات" قرار دیئے جانے کے مستحق ہیں۔ اور ان دونوں میں آپ کو یہ قدرِ مشترک نظر آئے گی کہ یہ انقلابات اپنے ملکوں تک محدود نہیں رہے بلکہ وسعت پذیر ہوئے۔ انقلابِ فرانس کے نتیجہ میں جمہوریت کا جو سیاسی نظام آیا وہ صرف فرانس تک محدود نہیں رہا بلکہ دنیا کے بہت سے ممالک میں جمہوریت کے قیام کے لئے تحریکیں چلیں اور کامیاب ہوئیں۔ اگرچہ آپ کو یہ عجیب بات نظر آئے گی کہ یورپ میں بعض ممالک نے بادشاہت کو سنبھال کر رکھا ہوا ہے لیکن اس کی حیثیت محض آرائشی و زیبائشی نوعیت کی ہے۔ ورنہ درحقیقت ملوکیت کا دور ختم ہو چکا ہے اور اب جمہوریت ہی کا دور ہے ——— اسی طریقہ سے روس کا جو انقلاب تھا اس کے بطن سے نہ معلوم کتنے انقلابات برآمد ہوئے۔ کرۂ ارضی پر جو ممالک موجود ہیں میرا گمان ہے کہ ان میں نصف کے لگ بھگ ممالک ایسے ہوں گے جن پر کسی نہ کسی شکل میں اس نظریہ کی حکمرانی ہو چکی ہے جس کے تحت ۱۹۱۷ء میں روس میں پہلا انقلاب آیا تھا۔

انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس کے حوالے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ کسی بھی حقیقی و واقعی انقلاب میں بنیادی طور پر وسعت پذیری کی خصوصیت و صلاحیت موجود ہوتی ہے ——— ایک اور پہلو سے بھی اس بات کو سمجھ لیجئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں تو اس کی اہمیت و ضرورت کئی گنا بڑھ جاتی ہے کہ آپ

لایا ہوا انقلاب محض جزیرہ نمائے عرب کی حد تک محدود نہ ہو جائے بلکہ آگے بڑھے اور
پھیل جائے - اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین بھی ہیں اور آخر المرسلین بھی
اور آپ کی دعوت محض اہل عرب کے لئے نہ تھی بلکہ پوری نوع انسانی کے لئے تھی
لہذا آپ کے مقصد بعثت کا بھی یہ تقاضا تھا کہ آپ نہ صرف یہ کہ عرب کی حد تک انقلاب
کی تکمیل بنفس نفیس فرمائیں بلکہ اپنی حیات طیبہ ہی میں اس کے بین الاقوامی مرحلہ کا
آغاز فرما کر مستقل طور پر امت کی رہنمائی فرما دیں۔

یہ بات بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ انقلاب محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام
کی تکمیل درحقیقت اس وقت ہو گی جب پورے کرۂ ارضی پر دین حق اسی طرح غالب
ہو جائے جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال قبل جزیرہ نمائے عرب پر
غالب فرما دیا تھا۔ یہ کہنا تو صحیح نہ ہو گا کہ معاذ اللہ حضورؐ کا مقصد بعثت ناقص رہ
گیا ہے یا پورا نہیں ہوا ہے۔ الفاظ کے استعمال میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔
البتہ یوں کہا جائے گا کہ آفاقی سطح پر انقلاب محمدیؐ کی تکمیل کا مرحلہ ابھی باقی ہے
اس مفہوم کو علامہ اقبال مرحوم نے اس شعر میں بڑی خوبصورتی سے ظاہر کیا ہے کہ ؎

وقت فرصت ہے کہاں! کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

یعنی نور توحید سے پورا کرۂ ارضی جب تک جگمگا نہیں اٹھتا اس وقت تک امت مرحومہ
چین کا سانس نہیں لے سکتی۔ اس پر تو لازم ہے، واجب ہے، فرض ہے کہ وہ
اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامت دین کی جدوجہد مسلسل جاری رکھے:

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبٰكُمْ ۔ "اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ اس کے لئے جہاد کا حق ہے
(اے امت مسلمہ) اس (اللہ) نے تمہیں چن لیا ہے۔"

اقسام توحید

میں اپنی بعض تقاریر میں یہ بات بیان کر چکا ہوں کہ توحید
کی دو بڑی اقسام ہیں۔ ایک ہے توحید علمی، نظری، فکری
یعنی عقیدہ کی توحید — اللہ کو ذات و صفات کے اعتبارات سے ایک ماننا اور کسی کو
اس کا شریک نہ ٹھہرانا:

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا ؏	اور کہہ دو سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کا سلطنت میں شریک ہے۔ اور نہ کوئی کمزوری کی وجہ سے اس کا مددگار ہے۔ اور اس کی بڑائی بیان کرتے رہو۔

اور ایک ہے عملی توحید۔ صرف اللہ کے ہی بندے بن جانا :

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ	"اے لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے (اُس) ربّ کی جس نے تمہیں پیدا کیا"

اللہ کی اطاعت کو اپنے آپ پر اس طرح لازم و فرض کر لینا کہ اُس کی اطاعت سے آزاد کسی اور کی اطاعت اس میں شامل نہ ہو۔ اس عملی توحید کا اجتماعی سطح پر تقاضا اس وقت پورا ہو گا۔ جب وہ نظام قائم ہو جائے گا جس میں حاکم مطلق (Supreme Authority) صرف اللہ کو مانا جائے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ یعنی نہ صرف یہ کہ تسلیم کیا جائے کہ قانون و شریعت دینے کا اختیار صرف اُسی کے پاس ہے۔ بلکہ بالفعل اللہ کے دین اور اُسکی شریعت کو پورے اجتماعی نظام پر غالب و نافذ کر دیا ہے۔ لِتَکُوْنَ کَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا۔ یہی عملی توحید ہے۔ تو توحید کی تکمیل جب تک عالمی سطح پر عملی اعتبار سے مکمل طور پر قائم و نافذ نہیں ہوتی، اُس وقت تک یوں سمجھئے کہ ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے ۔۔۔ نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

آفاقی رسالت

اس موقع پر میں چاہوں گا کہ قرآن مجید کے فلسفہ و حکمت کے اعتبار سے اس بات کو اچھی طرح جان اور پہچان لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے رسول آئے، بلا استثناء اُن سب میں یہ بات آپ کو مشترک نظر آئے گی کہ ان کی رسالت دو اعتبارات سے محدود تھی۔ ایک مکانی لحاظ سے محدود کہ وہ اپنی اپنی قوموں کی طرف یا کسی مخصوص علاقہ کی طرف مبعوث ہوئے۔ آپ خاص طور سورہ اعراف، سورہ ہود اور سورہ قصص کا مطالعہ کیجئے تا آپ کو مختلف اسالیب سے یہ بات مل جائیگی چنانچہ وہاں رسولوں کا ذکر اسی انداز میں ملتا

۴۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ "تحقیق ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف"
لی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا د۔ "اور قوم ثمود کی طرف (ہم نے بھیجا) اُن کے بھائی صالح
۔ اور۔ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۔ و قس علٰی ھٰذا ۔۔ دوسرے یہ کہ ان
رسالت زمانی اعتبار سے بھی محدود تھی کہ ہر رسول کی رسالت اس وقت تک کے لئے
ں جب تک اگلا رسول نہیں آجاتا چنانچہ جیسے ہی اگلا رسول آتا تھا پہلے کا دورِ رسالت
م ہوجاتا تھا یعنی: اب آنے والے رسول کو جو ہدایت اور شریعت ملے گی اس میں جتنی
بقہ چیزیں برقرار رکھی جائیں وہ آنے والی ہدایت اور شریعت کا جزو بن جائیں
، باقی منسوخ ہوجائیں گی ۔۔ گویا مکانی اور زمانی دونوں اعتبارات سے رسالت کا
ملہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل محدود رہا ہے ۔

یل نبوّت و رسالتؐ نبوّت کی تکمیل کا مظہر یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہدایت کامل کر دی گئی ۔ جو کچھ انبیاء علیہم السّلام کو بذریعہ
ی ملتا رہا ہے اس کا کامل، مکمل اور محفوظ ایڈیشن ہے قرآن مجید ۔

سے
نوعِ انسان را پیامِ آخریں
حاملِ اُو رحمۃ للعالمین

ایت الٰہی کا یہ آخری اور کامل ایڈیشن آگیا تو گویا کہ نبوّت کامل ہوگئی ۔

اب آیئے تکمیل رسالتؐ کی جانب ! رسالت کی تکمیل کے دو مظہر ہیں ۔ ایک یہ کہ حضور
۔ اللہ علیہ وسلم کی رسالت مکانی اور زمانی دونوں اعتبارات سے غیر محدود ہے اس لئے کہ
۔ جانب آپ کی رسالت کرۂ ارضی پر بسنے والی تمام نوعِ انسانی کیلئے ہے اور دوسری
ب آپ کی رسالت کا دور دائمی ہے ۔ یعنی تا قیامت آپؐ ہی کی رسالتؐ کا
رہے ۔ اس ضمن میں قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اشارات موجود ہیں لیکن
ت کی کمی کے باعث میں فی الوقت ان پر گفتگو میرے لئے ممکن نہیں ہوگی ۔

ویسے اس خاص موضوع پر میری تقاریر کے کیسٹ موجود ہیں ۔ البتہ میں چاہونگا
س مضمون سے متعلق قرآن مجید کی اس آیت کا حوالہ ضرور دے دوں :

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ — اور اے نبی! ہم نے نہیں بھیجا ہے آپکو مگر تمام نوعِ انسانی کے لئے بشیر

مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ہ ــــ "بشیر و نذیر بنا کر"

گویا کہ مکانی حدود ختم ہوگئیں۔ پورے کرۂ ارضی کے لئے رسالت ہے۔ جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپؐ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کی طرف ہوئی ہے۔ آپؐ کی مخاطب کوئی ایک قوم نہیں، کوئی ایک قبیلہ نہیں، کوئی ایک علاقہ نہیں، کوئی ایک ملک نہیں، کوئی ایک نسل نہیں اور کسی ایک دور کے انسان نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و رسالت کی شان یہ ہے کہ: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ہ

یہ چیز جہاں مکانی اعتبار سے غیر محدود ہے وہاں زمانی اعتبار سے بھی غیر محدود ہے کہ اب تا قیامِ قیامت کوئی نبی اور رسول آنے والا نہیں۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ رسالت ہے جو قیامت تک دائم و قائم رہے گا۔

تکمیل و ختمِ نبوّت کا منطقی تقاضا

قرآن حکیم سے جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام نوعِ انسانی کے لئے رسول بنا کر مبعوث کئے گئے ہیں اور آپؐ کی رسالت تا قیامِ قیامت دائم اور جاری و ساری ہے۔ تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خاتم الانبیاء و آخر الرسل صلی اللہ علیہ وسلم جو دین الحق دے کر مبعوث فرمائے گئے تھے اور جس دین کو تمام نظامہائے حیات پر غالب کرنا آپؐ کا فرضِ منصبی قرار دیا گیا تھا کہ دعوت و تبلیغ دین اور اقامتِ دین کا کام حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد بھی جاری رہنا لازم ہے"۔ یعنی ایک طرف اللہ کا پیغام تمام بنی نوعِ انسان تک اس درجہ میں پہنچا دینا ہے کہ کہ لوگوں پر حجّت قائم ہوجائے کہ وہ اللہ کے یہاں یہ عذر پیش نہ کرسکیں کہ ہم تک تیرا پیغام نہیں پہنچا اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ پورے کرۂ ارضی پر دینِ حق کو بالفعل غالب و قائم کرنا بھی اس اُمّت کی ذمّہ داری ہے۔ اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اپنے مشن کی ایک حد تک تکمیل فرما کر اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلاب کی تکمیل ہوگئی لیکن آپ کا مشن تو درحقیقت اُس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچے گا جب پورے کرۂ ارضی پر اللہ ہی کا پرچم سب سے بلند ہوگا لہٰذا اسی شعر کا پھر سہارا لے رہا ہوں کہ ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

اس پہلو سے جہاں تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے تو حضورؐ گویا اپنے
فرضِ منصبی کے اعتبار سے اس پر مامور تھے کہ آپؐ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک
انقلاب کی تکمیل بنفسِ نفیس فرما دیں۔ یہ تو گویا آپ کی آفاقی، عالمی و دائمی بعثت
ورسالت کا اوّلین مرحلہ تھا جو پورا ہوا۔ ابھی بین الاقوامی اور عالمی سطح پر دعوت و
تبلیغ کا کام باقی تھا جس کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دنیوی حیاتِ طیبہ کے
دوران بنفسِ نفیس آغاز فرما کر پھر اس مشن کو امت کے حوالے فرما دیا کہ اب اس فریضہ
کی عالمی سطح پر تکمیل تمہارے ذمّہ ہے۔ اب ایک ایک فردِ نوعِ بشر تک دعوت و تبلیغ،
شہادت علی الناس کا فرض تمہیں انجام دینا ہے اور پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کا
بول بالا کرنا، بالفاظِ دیگر "اسلامی انقلاب" برپا کرنا اب تمہاری ذمّہ داری ہے۔

دعوت و تبلیغ کے ضمن میں ایک اہم اصول

اب جبکہ اصولی طور پر یہ بات واضح ہو گئی کہ جنابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کی بعثت ورسالت آفاقی و عالمی ہے اور تا قیامِ قیامت حضورؐ ہی کا دورِ رسالت جاری
ہے تو اب میں چاہتا ہوں کہ سیرتِ مطہرہ کے حوالے اور تاریخی اعتبار سے ایک اصولی
بات بھی بیان کر دوں ــ دیکھئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز ۶۱۰ء عیسوی
عیسوی میں ہوا ہے۔ اس کے بعد سے لے کر مسلسل اٹھارہ انیس برس تک حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کا دائرہ صرف عرب تک محدود رہا۔ بلکہ اس مدّت
کے اندر بھی ایک درجہ بندی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ ابتدائی دس برس تو وہ ہیں کہ
آپؐ نے مکّہ سے باہر قدم نہیں رکھا۔ حضورؐ پورے دس برس تک دعوت و تبلیغ کا
کام مسلسل مکّہ میں انجام دیتے رہے۔ اس میں اگر کوئی استثنیٰ ہے تو صرف یہ ہے
کہ مکّہ کے آس پاس جو میلے لگتے تھے تو ان میں دعوت و تبلیغ کے لئے آپؐ تشریف
لے جایا کرتے تھے ان میں عکاظ کا میلہ یا بازار بہت مشہور ہے۔ یہ ان میلوں میں سب
سے بڑا ہوتا تھا۔ اس میں یہ بھی ہوتا تھا کہ عرب کے کونے کونے سے شعراء اور خطباء
آکر جمع ہوتے تھے۔ وہاں مجلسیں اور محفلیں جمتی تھیں۔ وہاں شعراء کے مابین مقابلے

ہوا کرتے تھے ۔ حضورؐ کا دعوت و تبلیغ کے لئے ان میلوں میں تشریف لے جانا تاریخی طور پر ثابت ہے ۔ یا پھر آپؐ اسی مقصد کے لئے ان قافلوں کی طرف تشریف لے جاتے تھے جو وقتاً فوقتاً مختلف ضروریات کے لئے مکہ آتے تھے اور مکہ سے باہر پڑاؤ ڈالتے تھے ۔ مکہ سے ضروریاتِ زندگی کی چیزیں لیتے اور پھر اپنے اپنے مستقر کی طرف لوٹ جاتے تھے ۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان مستثنیات کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت و تبلیغ کے لئے کامل دس برس تک مکہ سے باہر قدم نہیں نکالا ۔ اور حضورؐ کی ساری دعوت و تبلیغ مکہ تک محدود رہی ۔

سفرِ طائف : ۱۰ نبوی میں آپؐ کے چچا اور بنو ہاشم کے سردار ابو طالب کا انتقال ہو گیا ۔ ابو طالب گو خود دولتِ ایمان سے محروم رہے لیکن انکو حضورؐ سے بے پناہ محبت تھی لہٰذا اس محبت کے باعث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی حمایت حاصل تھی ۔ اس قبائلی نظام میں سردار کی حمایت کے معنی یہ تھے کہ بنو ہاشم کے پورے قبیلے کی پشت پناہی آپؐ کو حاصل تھی ۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ابو لہب کے سوا جو حضورؐ کا کھلم کھلا دشمن اور مخالف تھا ۷ نبوی سے لے کر ۱۰ نبوی تک تقریباً تین سال تک قریش کے ایک معاہدے کی رُو سے بنو ہاشم کے پورے قبیلہ کو ایک گھاٹی میں محصور کر دیا گیا خواہ ان میں سے کوئی ایمان لایا ہو خواہ نہ لایا ہو ۔ شعب بنی ہاشم کی اس محصوری کے دوران پورے قبیلہ کو جن جانگسل مصائب سے سابقہ پیش آیا ہے وہ اپنی جگہ نہایت دردناک باب ہے ۔ لیکن چونکہ موجودہ گفتگو سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں لہٰذا میں اس کا ذکر چھوڑتا ہوں ۔ ابو طالب کی وفات کے چند ہی دن بعد آپؐ کی زوجہ محترمہ صدیقۃ الکبریٰ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں ۔ جو ایک نہایت با اثر قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں ۔ اس طرح حضورؐ کے دو مددگار اور غم گسار یکے بعد دیگرے اٹھ گئے ۔ اس کا سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا کہ خاندانِ بنی ہاشم کی جو پشت پناہی قبیلے کی سطح پر آپ کو حاصل تھی وہ باقی نہ رہی اب گویا قریش مکہ کے ہاتھ کھل گئے چنانچہ دارالندوہ میں مشرکین مکہ کے سرداروں نے مشورہ کیا کہ اب ہمارے لئے کوئی رکاوٹ نہیں رہی لہٰذا اب ہمیں فیصلہ کن اقدام کر دینا چاہیئے یعنی محمد (صلی اللہ علیہ

وسلم، کو قتل کر دینا چاہیئے ۔ یہ فیصلہ ہو گیا اور اہل مکہ سے قطعی نا اُمیدی ہو گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے باہر قدم نکالا آپ ۱۰ نبوی میں دعوت و تبلیغ کے لیے طائف تشریف لے گئے ۔ اس سفر میں آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالٰی عنہ آپ کے ساتھ تھے ۔ سفر طائف بھی سیرت کا ایک عجیب دردناک باب ہے ۔ میں یہ کہا کرتا ہوں کہ ذاتی اعتبار سے مکہ میں حضور پر وہ تشدد نہیں ہوا جو طائف میں ایک دن میں ہو گیا ۔ مکہ میں آلِ یاسر ۔ حضرت بلال، حضرت خباب ابن ارت اور دیگر اصحابِ رسول رضی اللہ تعالٰی عنہم پر جو بہیمانہ مظالم ہوئے اُن کو علیحدہ رکھتے ہوئے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر شخصی اور ذاتی اعتبار سے طائف میں ایک دن میں جو کچھ گزرا اور آپ کو جس ذہنی کوفت، توہین، تذلیل، تضحیک رسوائی کے ساتھ جسمانی اذیت سے سابقہ پیش آیا، دس سالہ دورِ مکہ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ۔ بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ طائف کا وہ ایک دن پورے دس سالہ مکی دور پر بھاری تھا ۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق آپ کی حیاتِ طیبہ کا سخت ترین دن "یوم طائف" تھا ۔ چنانچہ غزوہ اُحد کے بعد جس میں ستر جان نثاروں نے جان کا ہدیہ پیش کیا تھا اور خود حضور بھی مجروح ہوئے تھے اور شکست کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور سے دریافت کیا کہ "اے اللہ کے رسول! یوم اُحد سے بھی زیادہ سخت دن آپ کی حیات طیبہ میں گزرا ہے"۔ تو حضور نے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ "ہاں طائف کا دن میری زندگی کا سخت ترین دن تھا۔"
بہر حال جو اصولی بات مجھے عرض کرنا تھی وہ یہ ہے کہ حضور نے مکہ سے باہر دعوت و تبلیغ کے لیے دوسرے شہر یعنی طائف کا قصد اُس وقت فرمایا جب مکہ میں آپ کے قتل کا فیصلہ ہو گیا اور آپ اہالیانِ مکہ سے قطعی مایوس ہو گئے ۔

یثرب کی خوش بختی : ازل سے یثرب کی قسمت میں مدینۃ النبی بننے کی سعادت مرقوم تھی ۔ چنانچہ جب بظاہر احوال ہر طرف سے راستہ بند نظر آیا تو اللہ تعالٰی نے یثرب کی کھڑکی کھول دی ۔ ۱۱ نبوی میں حج کے موقع پر یثرب کے چھ اشخاص ایمان لے آئے ۔ اگلے سال حج کے موقع پر بارہ ہو گئے انہوں نے بیعت کر لی جو بیعتِ عقبہ اولیٰ کے نام سے موسوم ہے ۔ اس سے اگلے سال بہتر مرد اور تین

خواتین نے حج کے موقع پر آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی جو بیعت عقبہ ثانیہ کہلاتی ہے۔ انہوں نے حضورؐ کو یثرب تشریف لے چلنے کی دعوت دی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے یثرب کی طرف ہجرت کا راستہ کھول دیا ہے۔ اس طرح یثرب کی قسمت جاگ گئی کہ وہ دارالہجرہ اور مدینۃ النبی قرار پایا۔

ہجرت کے بعد چھ برس وہ ہیں کہ جس کے اندر دعوتِ توحید کا دائرہ مکہ اور مدینہ تک محدود نہیں رہا بلکہ پورے جزیرہ نمائے عرب میں اسکی توسیع کے عمل نے تدریج اور آہستہ روی سے ترقی کی۔ ہجرت سے لے کر صلح حدیبیہ تک آپؐ نے جو مہیں بھیجیں جو سرایہ بھیجے اور جو غزوات ہوئے ان کی بدولت جزیرہ نمائے عرب کا بہت بڑا علاقہ حضورؐ کی دعوت سے تفصیلاً متعارف ہو گیا۔ ویسے حج کے موقع پر عرب کے کونے کونے سے لوگ ہر سال مکہ آیا کرتے تھے اور اکثر کے کانوں تک یہ بات پہنچتی رہتی تھی کہ محمد نامی ایک شخص۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ بُت پرستی کی مذمت کرتے ہیں اور اللہ واحد کی عبادت کی دعوت دیتے ہیں۔ لیکن کم لوگ ہوتے تھے جن کو دعوت سے صحیح طور پر واقفیت حاصل ہوتی تھی۔ البتہ ہجرت کے بعد جب دعوت کو مدینہ میں تمکن حاصل ہو گیا اور قریشِ مکہ اور اہل ایمان کے مابین بدر، احد، احزاب جیسے معرکے ہوئے تو ان جنگوں کی بدولت دعوت توحید پورے جزیرہ نما عرب میں تفصیل کے ساتھ متعارف ہو گئی چنانچہ مختلف قبائل سے لوگ انفرادی طور پر مدینہ منورہ آیا کرتے تھے اور اسلام قبول کیا کرتے تھے۔ اس طور پر توسیع دعوت کا عمل مسلسل جاری رہا۔

لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہجرت سے لے کر صلح حدیبیہ تک جو ۶ ھ میں منعقد ہوئی، ان چھ سالوں کے دوران حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ اپنا کوئی داعی یا مبلغ عرب کی حدود سے باہر بھیجا اور نہ ہی اپنے کسی جان نثار کو اپنا نامہ مبارک دے کر کسی بیرونی ملک کے حکمران کے پاس بھیجا۔ البتہ جب صلح حدیبیہ ہو گئی جس کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں کہ قرآن مجید نے اسے فتح مبین قرار دیا — اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا — تب حضورؐ کی دعوتی سرگرمیاں جہاں اندرون عرب بھی عروج پر پہنچیں۔ وہاں حضورؐ نے بیرون عرب بھی دعوت و تبلیغ کا آغاز فرمایا جس کا

تفصیلی ذکر میں آگے کروں گا۔

صلح حدیبیہ کے اثرات کے ضمن میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیئے کہ کعبہ کی تولیت کے باعث عرب میں قریش ایک نوع کی سیادت کے حامل تھے اور عرب میں سب سے بڑی قوت متصور ہوتے تھے۔ وہی درحقیقت مشرکانہ استحصالی نظام کی اصل کلید اور اس کے پشت پناہ اور محافظ تھے۔ گویا دعوتِ توحید کے سب سے بڑے، سب سے نمایاں دشمن اور مخالف قریش ہی تھے۔ چنانچہ ۶ھ میں جب قریش نے حدیبیہ کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح کر لی تو گویا انہوں نے حضورؐ کو ایک درجہ میں ایک قوت کی حیثیت سے تسلیم (Recognize) کر لیا۔ اس لئے کہ صلح اُسی سے ہوتی ہے کہ جس کے مستقل وجود اور حیثیت کو تسلیم کر لیا جائے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ صلح حدیبیہ کی شکل میں ایک حد تک آپؐ کو فتح حاصل ہو گئی تھی چنانچہ اندرون ملک عرب مسلمانوں کی قوت کو تسلیم کرنے کے بعد جہاں ایک جانب تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی توجہات کو اندرونِ عرب دعوت و تبلیغ کے کام کو پورے زور شور سے انجام دینے پر مرتکز فرمایا وہاں دوسری جانب بیرون ملک عرب بھی اس کام کو جاری فرمانے کا فیصلہ فرمایا۔ تاکہ آپؐ کی آفاقی و عالمی بعثت کے کام کا آغاز بھی ہو جائے ۔ صلح حدیبیہ کے بعد دو سال تک قریش اور انکے حلیفوں سے جنگ کا کوئی معاملہ پیش نہیں آیا۔ امن وامان کی کیفیت رہی چنانچہ ان دو سالوں میں دعوتِ اسلامی اتنی تیزی سے عرب میں پھیلی کہ عرب قبائل میں سے اکثر و بیشتر نے اسلام قبول کر لیا۔ اس دوران میں آپؐ نے یہودیوں کا معاملہ بھی نمٹایا۔ چنانچہ ۷ھ کے بالکل اوائل میں خیبر بھی فتح ہو گیا جو عرب میں یہودیوں کا آخری لیکن مضبوط ترین گڑھ تھا اس طرح جزیرہ نمائے عرب کی حد تک یہود کا زور، ان کا دبدبہ اور ان کا تسلط ختم ہو گیا۔

دعوت و تبلیغ کے بین الاقوامی مرحلہ کا آغاز

فتح خیبر کے بعد ۷ھ کے اوائل ہی میں حضورؐ نے اپنے دعوتی و تبلیغی نامہ ہائے مبارک دے کر چند صحابہ کرامؓ کو قیصر روم، کسریٰ ایران، عزیز مصر، بادشاہ حبشہ اور اُن رؤساء عرب کی طرف بھیجا جو جزیرہ نمائے عرب کی سرحدوں پر آباد تھے اور جنہوں نے اُس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ان میں سے

بعض قبائل قیصر روم کے اور بعض کسریٰ ایران کے باج گزار تھے - سیرت کی تما
مستند کتابوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے
نامہ ہائے مبارک کی ترسیل سے قبل مسجد نبویؐ میں تمام صحابہ کرامؓ کو جمع کیا اور خطبہ
ارشاد فرمایا اور اس خطبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کو بیان کیا
میری بعثت پوری نوع انسانی کے لئے ہے - مجھے اللہ تعالیٰ نے تمام جہان والوں
لئے رحمت اور رسول بنا کر بھیجا ہے ، بقولئے آیت قرآنی :- وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِ
رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ - میں نے اب تک دعوت تم تک پیش کی ہے - اب اے
مسلمانو! تمہارے ذمہ ہے کہ تم اس دعوت اور پیغام کو لے کر تمام اطرافِ عالم میں
پھیل جاؤ اور اللہ کی توحید کو عام کرو اور پہنچاؤ - گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
اپنی دعوت کے بین الاقوامی مرحلہ کا افتتاح اس خطبہ کے ذریعہ سے فرمایا
اس خطبہ کا سیرت کی کتابوں میں حوالہ تو ملتا ہے - لیکن انتہائی تلاش کے باوجو
مجھے یہ اہم خطبہ پورے متن کے ساتھ تا حال نہیں مل سکا - میری رائے ہے کہ نبی
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطبہ نہایت اہم خطبہ تھا - کاش اس کا پورا متن
جانا - تاہم مجھے امید ہے کہ صحاح ستہ کے علاوہ احادیث کی جو دوسری معتبر
ہیں ان میں سے کسی میں اس خطبہ کا پورا متن مل جائے گا جیسا کہ مجھے " نہج البلاغہ
میں حضورؐ کا ابتدائی دور کا ایک خطبہ ملا - جس کے متعلق میرا گمان غالب ہے کہ نب
آپؐ نے اس دعوت میں ارشاد فرمایا ہو گا جس کا تذکرہ سیرت کی کتابوں میں ہے
وہ یہ کہ آپؐ نے اپنی دعوت پیش کرنے کے لئے اپنے خاندان بنو ہاشم کے اف
کو کھانے پر مدعو فرمایا - پہلی مرتبہ تو آپؐ کو اپنی بات پیش کرنے کا موقع ہی ن
ملا - شرکاء نے بات تمسخر میں اڑا دی - دوبارہ آپؐ نے پھر دعوتِ طعام کا اہ
فرمایا اور اس موقع پر اپنی دعوت پیش فرمائی اور خطبہ ارشاد فرمایا - جس میں آپؐ
نے توحید ، رسالت اور آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دی اور اسی میں آپؐ نے
جہان والوں کے لئے بھی اپنے رسول ہونے کا تذکرہ فرمایا - جیسا کہ میں نے عرض
کہ معاملہ گمانِ غالب کی حد تک ہے کہ یہ وہی خطبہ ہے جو " النہج البلاغہ " میں
ہے - ؎

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

لیکن "نہج البلاغہ" کے مصنف نے بھی ایسا کوئی حوالہ نہیں دیا کہ جس سے معلوم
کہ یہ وہی خطبہ ہے جو حضورؐ نے اس دعوتِ طعام میں ارشاد فرمایا۔
ضمنی طور پر عرض کرتا ہوں کہ آج صبح میں جب آج کی تقریر کا ذہن میں تانا بانا
رنے کے لئے غور اور مطالعہ کر رہا تھا تو میرا ذہن حضرت مسیح علیہ السلام
ایک خطبہ کی طرف منتقل ہوا جو اناجیل میں اب بھی موجود ہے۔ جب آنجنابؑ
دعوت و تبلیغ کے لئے اپنے حواریّن کو بھیجا اور رخصت کیا تو انہیں چند ہدایات
جو اس خطبہ میں مذکور ہیں۔ بڑا ہی پیارا، بڑا ہی فصیح و بلیغ خطبہ ہے۔ اس
ایسے ایسے پیارے جملے ملتے ہیں کہ "دیکھو، تم نے مفت پایا ہے مفت تقسیم کرو۔
نے تم سے کوئی اجرت نہیں لی ہے، میں نے جو دعوتِ حق تم تک پہنچائی ہے۔
کا کوئی صلہ تم سے نہیں لیا ہے۔ ایسا نہ کرنا کہ اس دعوت و تبلیغ کے عوض لوگو
نذرانے وصول کرنا شروع کر دو، لوگوں کی مہمان نوازیوں کا لطف اٹھانا
ع کر دو۔ تم نے مفت پایا ہے، مفت تقسیم کرو"۔ اسی میں وہ جملہ بھی ہے
رب المثل بن چکا ہے اور جس میں معانی و حکم کے دفتر کے دفتر پنہاں ہیں
یا "سانپ کی مانند ہوشیار رہو لیکن فاختہ کے مانند بے ضرر رہو"۔ یعنی تم
کسی کو گزند اور ضرر نہ پہنچے لیکن ایسے مٹی کے مادھو بھی نہ بن جانا کہ دوسرے
ں نقصان پہنچائیں۔ یہ ہے حکمت و دانائی کی انتہائی اونچی بات موجودہ

اس خطبہ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا وہ حصہ جو حضورؐ کی عالمی بعثت سے متعلق
حسب ذیل ہے:

وَاللّٰهِ الَّذِیْ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ خَاصَّةً وَّاِلَی النَّاسِ کَآفَّةً	"اس اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی اللہ الٰہ نہیں میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف خصوصاً اور پوری نوع انسانی کی طرف عموماً۔"

(یہ پورا خطبہ محترم ڈاکٹر صاحب مدظلہ کے نہایت جامع اور پُر تاثیر خطاب "دعوت الی اللہ" میں مل جائے گا۔ جو مطبوعہ شکل میں دستیاب ہے)

اناجیل میں حضرت مسیحؑ کے جو خطبات ہمیں ملتے ہیں، ان میں میرے نزدیک مواعظ کی پوری انسانی تاریخ میں جو چوٹی کا وعظ ہے وہ ہے، پہاڑی کا وعظ (Sermon of the Mount) متی کی انجیل میں یہ پورا وعظ آپ کو مل جائے گا۔

اسی طرح وہ وعظ جس میں حضرت مسیحؑ نے دعوت و تبلیغ کے لئے اپنے حواریوں کو ہدایات دی تھیں، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے نہایت موثر وعظ ہے۔

نامہ ہائے مبارک : بہرحال جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کے بین الاقوامی مرحلہ کے افتتاح کے لئے خطبہ ارشاد فرمایا اور اس کے بعد آپؐ نے سلاطین کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے خطوط تحریر کرائے اور اپنے مختلف اصحاب کے ہاتھ آس پاس کے علاقوں کے حکمرانوں اور سرداروں کو اپنے نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے۔ ظاہر بات ہے کہ 'الاقرب فالاقرب' کا لحاظ ضروری تھا۔ یوں تو ہندوستان بھی تھا، چین بھی تھا۔ ایشیا اور یورپ کے نہ معلوم کتنے ممالک تھے۔ لیکن پہلا دائرہ تو قریب کے علاقوں کا ہو سکتا تھا۔ ان علاقوں کا جو جزیرہ نمائے عرب کے چاروں طرف تھے۔

قیصرِ روم کے دربار میں حضرت دحیہؓ کلبی نامہ مبارک دے کر بھیجے گئے۔ یہ وہ صحابی ہیں، جن کے بارے میں روایت آتی ہے کہ وہ صورتاً اور شکلاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت مشابہ تھے اور نہایت حسین تھے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام جب بھی انسانی شکل میں تشریف لاتے تھے تو حضرت دحیہؓ کلبی کی شکل میں آتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی کو خسرو پرویز کسریٰ دکجکلاہ ایران کی طرف بھیجا گیا۔

حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ عزیز مصر کی طرف بھیجے گئے۔ مصر اس وقت ایک نیم آزاد ملک تھا جو سلطنت روما کا باج گزار تھا۔ عزیز مصر خود بھی عیسائی تھا اور سلطنت روما کے ماتحت تھا۔ حضرت عمروؓ بن امیہ کو بادشاہ حبش نجاشی کی طرف بھیجا گیا۔ حبشہ بھی مصر کی طرح سلطنت روما کا باج گزار تھا اور وہاں کا بادشاہ بھی مذہباً عیسائی تھا۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ وہ نجاشی جو ایمان لے آئے تھے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کا ایمان اس اعتبار سے بالکل انفرادی نوعیت کا تھا کہ اس موقع پر کوئی MASS CONVERTION نہیں ہوئی تھی یعنی ایسا نہیں ہوا کہ ان کے تمام درباری اور پوری رعایا نے اسلام

ول کر لیا ہو بلکہ نبوت اسلام کا معاملہ ان کی ذات تک محدود تھا جب ان کے انتقال
خبر بذریعہ وحی آنحضورؐ کو ملی تو آپ نے ان کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھائی۔ چنانچہ انکے
بعد جو نجاشی تخت نشین ہوا وہ عیسائی تھا۔

حضرت سلیطؓ بن عمرو بن عبد شمس روسائے یمامہ کی طرف بھیجے گئے۔ یمامہ جزیرہ نما
عرب ہی کا شمال مشرقی علاقہ ہے۔ آج کل یہ علاقہ نجد میں شامل ہے۔ حضرت شجاعؓ
بن وہب الاسدی حدودِ شام میں حارث غسانی کے پاس بھیجے گئے۔ شام بھی اس
وقت سلطنتِ روما کے زیر حکومت تھا اور وہاں قیصر کی طرف سے غسانی خاندان حکمران
تھا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ شام کی وہی پوزیشن تھی جو انگریزی دورِ حکومت میں برصغیر
کی بڑی ریاستوں کو حاصل تھی ـــ یہ تفصیل مکمل نہیں ہے، ان کے علاوہ بھی بعض روسا
سرداران کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نامہ مبارک ارسال فرمائے جن میں سے ایک کا
ذکر بعد میں آئے گا۔

مختلف ردّعمل: ان نامہ ہائے مبارک کے نتیجہ میں سلاطین کی جانب سے مختلف
ردّعمل سامنے آتے ہیں۔ یہ بات نوٹ کیجیے کہ ایک طرف اُن بادشاہوں اور حکمرانوں کا
ردّعمل ہے جو مذہباً عیسائی تھے۔ ان کے مقابلہ میں بالکل برعکس ردّعمل ہے کسریٰ
ایران کا۔ وہ مجوسی تھا، مشرک تھا، وہ وحی، نبوت اور امورِ رسالت سے بالکل نابلد
اور ناواقف تھا۔ عیسائیوں کا معاملہ یہ تھا کہ وہ اہل کتاب تھے، ان کے پاس تورات
اور انجیل موجود تھی۔ وہ حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق، حضرت اسمٰعیل، حضرت موسیٰؑ، حضرت
عیسیٰ علیہم السلام کے ناموں سے واقف تھے۔ اور ان سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ قیصرِ روم
کے بارے میں مستند تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بہت بڑا عالم تھا۔ غزوہ بدر
کے بعد اسے کسریٰ کے مقابلہ میں فتح ہوئی تھی۔ جس سے چند برس قبل ہی اس
نے انتہائی توہین آمیز شکست کھائی تھی۔ اسی شکست کا ذکر ہے مکی سورت،
سورۂ روم میں بایں الفاظ: الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّومُ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ ـــ رومیوں
کی شکست اور ایرانیوں کی فتح پر مشرکین مکہ نے خوشیوں کے شادیانے بجائے
تھے چونکہ ایرانی مجوسی تھے، آتش پرست تھے لہٰذا قریش مجوسیوں کو
اپنا ہم مشرب اور ہم مسلک سمجھتے تھے۔ اور قیصرِ روم چونکہ اہل کتاب میں سے

تھا تو وہ مسلکاً مسلمانوں سے زیادہ قرب رکھتا تھا۔ اسی لئے اس موقع پر مشرکینِ مکہ نے بغلیں بجائیں اور اہلِ ایمان کو طعنے دیئے کہ ہمارے بھائیوں نے تمہارے بھائیوں کو شکستِ فاش دی۔ جس سے مسلمان بڑے غمگین و ملول ہوتے تھے۔

وحیِ الٰہی کی پیشن گوئی : سورہ روم میں اللہ تعالیٰ نے جہاں رومیوں کی ہزیمت کی خبر دی تھی وہاں مسلمانوں کو یہ خوشخبری بھی بطور پیشگوئی سنادی تھی کہ "رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہوگئے ہیں لیکن وہ عنقریب غالب آجائیں گے۔ چند برسوں ہی میں اور اگلے اور پچھلے سب کام اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ رومیوں کے فتح کے دن مسلمان فرحاں ہوں گے"۔ : الۤمّ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ہ لا فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ہ لا فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ط لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ہ لا قرآن مجید کی اسی پیشگوئی کی بنیاد پر حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے ایک مشرک قریشی سے یہ شرط رکھ لی تھی کہ اگر اتنے سال کے اندر اندر رومی غالب نہ آئے تو میں تمہیں سو اونٹ دوں گا ورنہ تم مجھے سو اونٹ دوگے۔ شروع میں حضرت ابوبکر رضؓ نے شرط کی مدت کچھ کم رکھی تھی۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے توجہ دلانے پر "بِضْعِ سِنِیْنَ" کے لغوی مدلول یعنی نو سال پر معاہدہ ٹھہرا۔ خیال رہے کہ اس وقت تک اس نوع کی شرط کی شریعت میں ممانعت نہیں آئی تھی۔ مدنی دور میں اس نوع کی شرطیں ناجائز قرار دی گئیں۔ بہرحال نو سال سے قبل ہی رومیوں نے ایرانیوں کو بڑی عبرتناک شکست دی۔ یہ وہی زمانہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غزوہ بدر میں عظیم الشان فتح عطا فرمائی تھی۔ مسلمانوں کے لئے اس وقت دوہری خوشی کا موقع تھا۔ ایک غزوہ بدر کی فتح کا دوسرے رومیوں کی ایرانیوں پر فتح کا۔ اس طرح یہ وعدۂ الٰہی بھی پورا ہوگیا کہ : وَیَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ہ (یعنی رومی چند سالوں کے اندر اندر ایرانیوں پر غالب آئیں گے اور وہ ایسا موقع ہوگا کہ مسلمان بھی اللہ کی مدد پر فرحاں و شاداں ہوں گے)

قیصر رُوم کی خوشی کا عالم: چند برس پہلے ایرانیوں کے ہاتھوں انتہائی
شرمناک شکست کھانے کے بعد ان پر عظیم فتح پانے پر قیصر کتنا خوش اور
نازاں ہوگا اس کا ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے ۔ اس کی شادمانی اور مسرت کا یہ
عالم تھا کہ وہ اس فتح کا شکرانہ ادا کرنے کے لئے حمص سے (جو شام اور ترکی کی
سرحد پر واقع شام کا شہر ہے) پیدل چل کر بیت المقدس (یروشلم) اس شان سے
آیا تھا کہ راستہ بھر اس کے لئے زمین پر فرشی قالین اور اُس پر پھول بچھائے
جاتے تھے ۔ بیت المقدس عیسائیوں کا قبلہ اور متبرک ترین مقام تھا تو وہ ایشیائے
کوچک کے کنارے سے پیدل چل کر اپنے قبلہ کی زیارت اور فتح پر شکرانہ پیش کرنے
کے لئے وہاں آیا تھا ۔

قیصر کے نام حضورؐ کا نامۂ مبارک: حضرت دحیہؓ کلبی جو قیصر روم
کے نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک لے کر چلے تھے جب دمشق کے قریب بصریٰ
کے مقام پر پہنچے جو غسانیوں کا دارالحکومت تھا تو اُن کو پتہ چلا کہ قیصر ان دنوں یروشلم
میں ہے ۔ اس وقت اس خاندان کا رئیس حارث غسانی تھا حضرت دحیہؓ نے حضورؐ
کا نامہ مبارک اُسے دیا کہ اسے قیصر تک پہنچا دیا جائے ۔ حارث غسانی نے حضرت دحیہؓ
کو قیصر کے پاس بیت المقدس بھیج دیا ۔ چنانچہ وہؓ حضورؐ کا نامہ مبارک لے کر یروشلم
پہنچ گئے ۔ میری خواہش ہے کہ میں وہ خط بھی آج آپ کو پڑھ کر سناؤں ۔ اور اس
پر قیصر کے دربار میں جو معاملہ ہوا اُس پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالوں ۔ تاکہ آپ
حضرات کو معلوم ہو کہ درحقیقت اہل کتاب (خاص طور پر عیسائیوں کے طرزِ عمل میں،
جن کا اس وقت سب سے بڑا اعلامتی نمائندہ قیصر روم تھا) اور مشرکین کے طرزِ عمل میں،
جن کا اس وقت سب سے بڑا اعلامتی نمائندہ کسریٰ شہنشاہ ایران تھا، کیا
نمایاں فرق ہمارے سامنے آتا ہے اور اُس کا سبب کیا ہے ۔!

قیصر رُوم کا طرزِ عمل: جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک
جب قیصر کو پہنچا تو چونکہ وہ خود توراۃ و انجیل کا عالم تھا لہٰذا خط پڑھتے ہی وہ جان گیا کہ یہ
وہی آخری رسول ہیں کہ جن کی بعثت کی ہمارے یہاں پیش گوئیاں موجود ہیں ـــــ
آزردہ بھی شام کا عیسائی راہب ہی تھا جس نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کو یہ خبر دیکر مدینہ کی طرف بھیجا تھا کہ میرا علم بتاتا ہے کہ نبی آخر الزماں کے ظہور کا وقت آگیا ہے اور ان کی بعثت عرب کے ریگستان اور کھجوروں کے جھنڈ میں ہوگی معلوم ہوا کہ یہ بات تو عیسائیوں کے عندالرس رہبان و احبار بھی جانتے تھے کہ آخری نبی کے ظہور کا وقت اب قریب ہے۔ قیصر نے اس خیال کا اظہار کیا کہ میں یہ سمجھتا تھا کہ آخری نبی کا ظہور شام میں ہوگا، مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کی بعثت عرب میں ہو گی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک پڑھ کر اور آپؐ کو پہچان کر قیصر کا جو طرزِ عمل سامنے آتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چاہتا تھا کہ اگر میری پوری مملکت ایمان لے آئے تو گویا ہم اجتماعی طور پر (En Bloc) مسلمان ہو جائیں گے، اور اس طرح میری مملکت بھی قائم رہے گی اور میری حکومت برقرار رہے گی۔ گذشتہ کسی تقریر میں سورۃ توبہ کی آیت کے حوالہ سے میں یہ بات آپ کو بتا چکا ہوں کہ غیر عرب غیر مسلموں کے لئے مسلمانوں کی تین شرطیں ہوتی تھیں۔ ایک یہ اگر تم ایمان لے آؤ تو تم ہمارے بھائی ہو گے، تمہاری تمام املاک، تمہاری عزت و آبرو الغرض تمہاری ہر شے محفوظ اور برقرار (Intact) رہے گی۔ تمہیں وہ تمام حقوق مساوی طور پر حاصل ہونگے جو بحیثیت مسلمان ہم کو حاصل ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ منظور نہیں ہے، ایمان نہیں لاتے تو چھوٹے ماتحت اور ذمّی بن کر رہو اور جزیہ ادا کیا کرو: یُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ ۔ ملکی قانون (Law of the land) بہر صورت اسلام کا ہوگا۔ ہاں کسی کو بزورِ شمشیر اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ تمام غیر مسلموں کو ان کے احوالِ شخصیہ (Personal law) میں پوری آزادی ہوگی حتی کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق پوجا پاٹ کا جو طریقہ اختیار کرنا چاہیں، اس میں اسلامی حکومت کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔ اور تیسرے یہ کہ اگر یہ بھی منظور نہیں ہے تو پھر میدان میں آؤ۔ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔ ان تین کے سوا چوتھی اور کوئی صورت، کوئی اور Alternative نہیں ہے۔

قیصر کی اس خواہش اور کوشش کا بھی ایک تاریخی پس منظر ہے کہ اس کے عمائدینِ سلطنت اور اس کی رعیت مجموعی طور پر ایمان لے آتے اور اسلام کو

سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ جن لوگوں نے یورپ اور خاص طور عیسائیت (Christianity) کی تاریخ پڑھی ہے، ان کے علم میں ہوگا کہ رفعِ حضرت مسیح کے قریباً ساڑھے تین سو برس بعد رومۃ الکبریٰ (موجودہ اٹلی) کے شہنشاہ کنسٹنٹائن (قسطنطین) اور اس کی پوری رعایا نے مجموعی طور پر (En Bloc) عیسائیت قبول کرلی تھی۔ لہٰذا کسی نوع کا اعتقادی یا سیاسی مسئلہ اور تنازعہ پیدا نہیں ہوا اور کنسٹنٹائن (قسطنطین) کی شہنشاہیت جوں کی توں برقرار رہی۔ اسی سبب سے ایک طرف یورپ میں عیسائیت نے فروغ پایا اور دوسری طرف شاہِ روم نے اپنا پایہ تخت روم کو چھوڑ کر استنبول کو قرار دیا اس کے نام پر اس کا قسطنطنیہ نام رکھا گیا اور وہاں سے اس نے ایشیائے کوچک اور شمالی افریقہ پر فوج کشی کی اور عیسائیت کو فروغ دینے کی مہمات شروع کیں جن میں اس کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی ۔۔ اس تاریخی تناظر میں دیکھئے تو قیصر کا طرزِ عمل سمجھ میں آتا ہے۔ چنانچہ نامۂ مبارک کے ذریعے حضورؐ کو پہچان لینے کے بعد اس کی خواہش ہوتی کہ اس کی پوری مملکت اسی طرح عیسائیت کو قبول کرے جیسے قریباً ساڑھے تین سو سال قبل پوری سلطنت روم نے عیسائیت کو بطور مذہب اختیار کرلیا تھا تاکہ اسکی حکومت قائم و باقی رہے۔

لیکن اس کے لئے تدبیر کیا ہو؟ یہ مسئلہ اس کے سامنے تھا۔ بڑے بڑے بہادری عیسائی علماء دربار میں موجود تھے، قسیسین تھے، بطریق تھے، پھر تمام عمائد داعیانِ حکومت تھے، پھر فوج تھی، اب سب کو کس طرح راضی کیا جائے میں کہا کرتا ہوں کہ بادشاہ بھی تمام انسانوں کی طرح کا ایک انسان ہوتا ہے۔ سب انسانوں کی طرح اس کے بھی دو ہاتھ، دو ٹانگیں ہوتی ہیں، وہ ہزار ہاتھ اور ٹانگوں والا تو نہیں ہوتا۔ وہ بھی ایک عام انسان ہی کی طرح کا انسان ہوتا ہے اس کے سوا کوئی اور خصوصیت اس میں نہیں ہوتی کہ وہ بادشاہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کی بادشاہت تو عمائدینِ سلطنت اور دس ہزاری، بیس ہزاری، تیس ہزاری منصب داروں اور امراء (LORDS) کے بل پر قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا جب تک یہ لوگ مطمئن ہو کر ایمان نہ لائیں اسکی حکومت کو خطرہ لاحق رہے گا۔

کچھ دیر توقف کیا، ایک تدبیر اُس کے ذہن میں آئی - اپنے درباریوں سے پوچھا کہ ا
دنوں عربوں کا کوئی تجارتی قافلہ تو یہاں نہیں آیا! بتایا گیا کہ عربوں کا ایک تجارتی
قافلہ اس علاقے میں آیا ہوا ہے اور فی الوقت غزہ میں مقیم ہے - قیصر نے فوراً آدمی
بھیج کر قافلے کے لوگوں کو یروشلم بلا لیا - اس قافلہ کے رئیس ابوسفیان تھے
اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے - انہوں نے شہر
فتح مکہ سے متصلاً قبل والی شب کو اسلام قبول کیا تھا - میں ان کا نام اور اسے ا
لئے لے رہا ہوں کہ ان کا شمار جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے -

قیصر کا دربار : ہرقل قیصر روم نے ایک عالی شان دربار منعقد کیا۔ ا
موقع پر بیت المقدس میں اس کے تمام اعیان و عمائد مملکت اور سپہ سالار موجود تھے
ان کو جمع کیا - پھر بطارقہ، قسیسین اور احبار و رہبان کی صفیں لگوائیں اور دربار
میں ابوسفیان کو ان کے ہمراہیوں سمیت بلایا گیا - پہلے تو دربار میں نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کا نامہ مبارک پڑھ کر سنایا گیا - میں چاہوں گا کہ حضورؐ کا یہ نامہ مبارک
آپ حضرات کو کتاب میں سے پڑھ کر سنا دوں - اس نامہ گرامی کا متن ابن ہشام
اور طبری نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے اور بحمداللہ یہ نامہ مبارک اپنی اصل
حالت میں اب بھی قسطنطنیہ کے "عجائب خانہ" میں موجود ہے

حضورؐ کا نامۂ مبارک : نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر کرایا:

مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
اِلٰی هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ،
سَلَامٌ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ
الْهُدٰی، اَمَّا بَعْدُ فَاِنِّیْ
اَدْعُوْكَ بِدِعَايَةِ الْاِسْلَامِ،
"اَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ
اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ فَاِنْ
تَوَلَّيْتَ فَاِنَّ عَلَيْكَ اِثْمَ
الْاَرِيْسِيِّيْنَ، وَيَا اَهْلَ

ترجمہ :- (یہ خط، محمد (صلی اللہ
علیہ وسلم) کی طرف سے جو اللہ کے
بندے اور اس کے رسول ہیں،
ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیس
اعظم ہے - سلامتی ہے ہر اس شخص
کے لئے جس نے ہدایت (ربانی)
کی پیروی کی - اس کے بعد (اے
رئیس اعظم!) میں تجھے دعوت
اسلام کی طرف بلاتا ہوں اسلام

الکتاب! تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ"

قبول کرے تو تو سلامت رہے گا۔ (بلکہ) اللہ تعالیٰ تجھے دہرا اجر عطا فرمائے گا اور اگر تونے (قبول کرنے سے) اعراض کیا (تو نہ صرف تو اکیلا مجرم ٹھہرے گا بلکہ اہل ملک کا گناہ (بھی) تیرے اوپر ہوگا۔ اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف پیش قدمی کرو جو ہمارے اور تمہارے مابین مساوی ہے (وہ) یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کریں اور نہ ہی ہم اُس ہستی کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہی ہم میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو (اپنا) پروردگار تسلیم کرے پس اگر وہ (اہل کتاب دعوت اسلام کو قبول کرنے سے) اعراض کریں۔ تو (اے مسلمانو! تم انہیں) کہہ دو کہ (اے اہل کتاب ہمارے معاملہ میں) (تم گواہ رہو کہ ہم تو دہر حال میں اس دعوت پر) سر تسلیم خم کر دینے والے ہیں۔"

نامہ مبارک کے چند اہم نکات: نامہ مبارک میں حضور صلی اللہ [علیہ] وسلم نے جو بات رقم کرائی کہ: یُؤْتِكَ اللّٰہُ اَجْرَكَ مَرَّتَیْنِ۔ تو [حد]یث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اہل کتاب میں سے جو مجھ پر ایمان لاتا ہے [اس]ے اللہ دوہرا اجر دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ پہلے نبیوں اور رسولوں کو ماننے [وال]ا بھی تھا اور اب وہ مجھ پر بھی ایمان لے آیا ہے۔ آگے جو حصہ ہے کہ: [فَاِ]نْ تَوَلَّیْتَ فَاِنَّ عَلَیْكَ اِثْمُ الْاَرِیْسِیِّیْنَ۔ تو اس کا مطلب [ی]ہ ہے کہ ایک شخص کی حیثیت ایسی ہوتی ہے، جیسے قیصر روم کی تھی کہ اگر وہ [ایم]ان لے آتا تو چاہے پوری رعیت ایمان نہ لاتی لیکن لاکھوں لوگ تو ایمان [لے] آتے تو اُن کا اجر بھی اُس کے حصہ میں آتا۔ لیکن اُس نے روگردانی کی [جس]کے باعث رومی دولتِ ایمان سے محروم ہو گئے تو ان کا وبال بھی قیصر کے حصہ [میں] آئے گا۔ اس لئے کہ کسی ملک، کسی قوم، کسی قبیلہ کے سربراہ کفر پر اڑے رہیں

تو وہ دعوتِ اسلامی کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوتے ہیں۔ جو بھی نظامِ باطل کسی جگہ قائم ہوتا ہے تو وہ نظامِ حق کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ لہٰذا حضور نے اس بات کو ایک مختصر سے جملہ میں نہایت بلاغت و فصاحت کے ساتھ سمو دیا۔ اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ آلِ عمران کی آیت نمبر ۶۴ اپنے نامہ مبارک میں درج کرائی ہے۔ اکثر اہلِ علم کی رائے ہے کہ قرآن مجید میں اہلِ کتاب کو توحید کی دعوت اور اسلام کا پیغام دینے کے جتنے بھی اسالیب آئے ہیں ان میں اس آیت کا اسلوب نہایت بلیغ اور موثر ترین ہے۔ نجران سے جب عیسائی احبار و رہبان کا ایک وفد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام کی دعوت سمجھنے کے لئے آیا تھا تو اس موقع پر حضورؐ پر جو وحی نازل ہوئی تھی، اسی میں یہ آیتِ مبارکہ بھی شامل ہے۔ اس سے اس کی عظمت، اس کے جلال، اس کی تاثیر اور اسکے محکم ہونے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔ اس وقت میں چاہوں گا کہ اس آیتِ مبارکہ کے اس حصہ: وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللّٰهِ ۔ ہم میں سے کوئی اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا ربّ نہ بنالیں، کے ضمن میں ایک نکتہ عرض کرتا ہوں۔ اللہ کے سوا جن ہستیوں کو ربّ بنایا جاتا ہے ان میں مذہبی رب بھی ہوتے ہیں، جیسے اصنام اور مظاہرِ قدرت کی پرستش، اوتار اور حلول کے اور اسی نوع کے دوسرے عقائد۔ اور سیاسی نوعیت کے ربّ بھی ہوتے ہیں، یعنی جسے بھی اللہ کے سوا مختار و مطاعِ مطلق تسلیم کرلیا جائے، وہی تسلیم کرنے والوں کا ربّ ہے۔ درحقیقت فرعون و نمرود نے خدائی کا دعویٰ اسی اعتبار سے کیا تھا کہ وہ بادشاہ اور حاکمِ مطلق ہیں، اسی لئے وہ اپنی رعیت کے رب اور خدا ہیں۔ یہ دراصل سیاسی شرک ہے۔ آج جو لوگ عوام کی مطلق حاکمیت کے نظریہ کے حامی اور پرچارک ہیں وہ اسی سیاسی شرک میں مبتلا ہیں۔ لیکن عظیم اکثریت کو اس کا شعور حاصل نہیں ہے۔

قیصر اور ابوسفیان مکالمہ: اس کے بعد قیصر اور ابوسفیان کے مابین جو مکالمہ ہوا وہ میں آپ کو بھی علامہ شبلیؒ کی سیرت النبیؐ کی جلد اوّل سے پڑھ کر سناؤں گا۔ اس مکالمہ پر غور کریں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ہرقل نے

ابوسفیان سے بالکل اُسی انداز میں جرح کی جیسے وکلا بحث و جرح کرتے ہوئے حقائق و دلائل کو واضح کرنے کے لئے اُس نوع کے سوالات کرتے ہیں جنہیں SUGGESTIVE QUESTIONS کہا جاتا ہے یعنی ایسے سوالات کرنا کہ جن کے جوابات کے ذریعے از خود جرح کرنے والے کے موقف کی تائید ہوتی چلی جائے اور بات اس انداز میں کھل کر سامنے آجاتے کہ سامعین کے لئے حق کو پہچان لینا بالکل آسان ہو جائے ابوسفیان سے ہرقل نے جس گہرائی کے ساتھ سوالات کئے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس پایہ کا عالم تھا اور یہ کہ وہ حضورؐ کو نبی آخرالزمان کی حیثیت سے پہچان چکا تھا۔ ایک بات اور بتادوں ۔ ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک قول ملتا ہے جو ایمان لانے کے بعد کا ہے کہ " خدا کی قسم، اُس مکالمہ کے دوران کئی بار میرا جی چاہا کہ میں جھوٹ بول دوں "۔ اس لئے کہ قیصر کے سوالات مجھے گھیرتے چلے جا رہے تھے اور میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے پاؤں تلے زمین کھسک رہی ہے ۔۔ لہٰذا میں نے کئی بار سوچا کہ جھوٹ بول دوں ۔ لیکن میں نے سوچا کہ میرے ساتھی کیا کہیں گے کہ قریش کا اتنا بڑا سردار ہو کر جھوٹ بول رہا ہے ۔ چنانچہ بس اس وجہ سے جھوٹ نہیں بول سکا ۔ اس بات سے عربوں کی یہ ایک مزاجی خصوصیت سامنے آتی ہے کہ بے شمار برائیوں کے باوجود ان میں چند اعلیٰ انسانی اوصاف موجود تھے ۔۔ مکالمہ ملاحظہ فرمائیے ۔

قیصر ـــــ مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے ؟

ابوسفیان ـــــ شریف ہے ۔

قیصر ـــــ اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا ؟

ابوسفیان ـــــ نہیں ،

قیصر ـــــ اس خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے ؟

ابوسفیان ـــــ نہیں ۔

قیصر ـــــ جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے ، وہ کمزور لوگ ہیں ـــــ یا صاحب اثر ؟

ابوسفیان ـــــ کمزور لوگ ہیں ۔

قیصر ——— اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں ؟

ابوسفیان ——— بڑھتے جاتے ہیں ۔

قیصر ——— کبھی تم لوگوں کو اسکی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہے ؟

ابوسفیان ——— نہیں ۔

قیصر ——— وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے ؟

ابوسفیان ——— ابھی تک تو نہیں کی، لیکن اب جو نیا معاہدہ صلح ہے اس میں دیکھیں وہ عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں ۔

قیصر ——— تم لوگوں نے اس سے کبھی جنگ بھی کی ؟

ابوسفیان ——— ہاں ۔

قیصر ——— نتیجہ جنگ کیا رہا ؟

ابوسفیان ——— کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ ۔

قیصر ——— وہ کیا سکھاتا ہے ۔

ابوسفیان ——— کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاکدامنی اختیار کرو سچ بولو، صلہ رحمی کرو۔

اس مکالمہ پر قیصر کا تبصرہ :

علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں کہ اس مکالمہ کے بعد قیصر نے مترجم کے ذریعہ سے یہ تبصرہ کیا :

"تم نے اس کو شریف النسب بتایا، پیغمبر اچھے خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں ۔ تم نے کہا کہ اس کے خاندان سے کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے ۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس کے خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے ۔ تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا، وہ خدا پر کیوں کر جھوٹ باندھ سکتا ہے ۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے اس کی پیروی کی ہے (تو) پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں ۔ تم نے تسلیم

کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے، سچے مذہب کا یہی حال
ہے کہ بڑھتا جاتا ہے ۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں کیا،
پیغمبر کبھی فریب نہیں کرتے ۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز اور تقویٰ و عفاف کی
ہدایت کرتا ہے، اگر یہ سچ ہے تو میری قدم گاہ تک اس کا قبضہ ہو جائیگا۔
مجھے یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ
عرب میں پیدا ہوگا ۔ اگر میں وہاں جا سکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا۔"
یہ ہے ہرقل قیصر روم کا تبصرہ جو کتبِ سیر میں محفوظ ہے ۔

قیصر کی بدبختی : اب اصل امتحان آتا ہے، جرأت کا، ہمت
کا، قربانی کا ایثار کا ۔ اور اس بات کا کہ حق کے لئے کیا کچھ چھوڑنے کے لئے انسان
تیار ہوتا ہے ۔ اس مکالمہ کے دوران قیصر نے محسوس کیا کہ جیسے جیسے گفتگو آگے
بڑھ رہی ہے اور درباریوں کو اندازہ ہوتا جا رہا ہے کہ قیصر کا جھکاؤ اسلام کی جانب
ہے ۔ اسی نسبت سے دربار میں موجود بطارقہ، اور احبار و رہبان کے نتھنے اندرونی
غیظ و غضب کے باعث پھول رہے ہیں ، اور برہمی و غصہ سے ان کی آنکھیں
سرخ انگارہ ہو رہی ہیں اور اسی طریقے سے اس نے اپنے عمائد و اعیانِ حکومت
اور اپنے سپہ سالاروں کے تیور بگڑتے ہوئے دیکھے تو اسے اپنے اقتدار کو خطرہ
محسوس ہوا اور اس صورتِ حال سے خوف زدہ ہو کر اس نے عربوں کو دربار
سے اٹھا دیا اور حضورؐ کے سفیر حضرت دحیہؓ کلبی کو کسی جواب کے بغیر واپس جانے کا
حکم سنا دیا ۔ ورنہ قرائن بتاتے ہیں کہ اس کے دل میں نورِ ایمان کی کرن پہنچ چکی
تھی لیکن تاج و تخت ، اقتدار و حکومت اس کے پاؤں کی بیڑیاں بن گئیں اور حق
کی روشنی بجھ گئی ۔ اقتدار، حکومت، غلبہ، قیادت و سیادت اور تکبر وہ چیزیں
ہیں جو حق کو تسلیم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹیں بن جایا کرتی ہیں ۔ قرآن مجید
میں یہود کے علماء کے بارے میں فرمایا گیا : یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ
اَبْنَآءَھُمْ ۔ "وہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے
بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔" لیکن پہچاننا اور ہے، ماننا اور ہے ۔ پھر محض زبانی
ماننا اور ہے، دل سے یقین کرنا اور ہے ۔ یہ تو کئی مراحل ہیں ۔

رفتار کار

تربیت و تزکیہ اور توسیعِ دعوت

قدم بقدم

مرتب : چودھری غلام محمد

تنظیم اسلامی کے فکر و دعوت کی اساس قرآن مجید ہے ۔ جناب امیر تنظیم اسلامی نے
لقہ ہائے درس قرآن ہی سے اس کام کا آغاز کیا ۔ انہی مجالس میں قرآن مجید کی پکار
ور دعوت کا مدلل اور دلنشیں انداز میں بیان ہوا اور لوگوں کے سامنے فرائض دینی
کا ایک جامع تصور آیا ۔ ان فرائض دینی کی بجا آوری کے لئے عملی جدوجہد کی پکار پر کچھ
ندگان خدا امیر تنظیم اسلامی سے ہجرت و جہاد اور ترک و اختیار کی بیعت کر کے ان کے
ین سفر بن گئے ۔ تنظیم اسلامی کے نام سے یہ قافلہ تشکیل پایا اور بفضلہٖ تعالیٰ بتدریج ارتقائی
راحل طے کرتا رو بمنزل رواں دواں رہا ۔ تاآنکہ یہ محسوس ہونے لگا کہ محض تعلیم و تعلم اور
لم و آگہی کی پرسکون کیفیت گرمئ رفتار کے لئے کافی نہیں ۔ حرکت اور کشمکش کی تپش
بھی از بس ضروری ہے ۔ چنانچہ میاں محمد نعیم صاحب قیم تنظیم اسلامی پاکستان
ذشتہ کئی ماہ سے اسی رُخ پر محنت کر رہے ہیں ۔ تاہم امیر تنظیم اسلامی لاہور کی اضافی
مہ داری کی وجہ سے ان کی توجہ کا ارتکاز لاہور اور گردونواح ہی پر ہو سکا ہے گذشتہ
ہ جناب امیر تنظیم اسلامی نے انہیں امیر تنظیم اسلامی لاہور کی اضافی ذمہ داریوں سے
ارغ کر کے بیرونِ لاہور توجہ کرنے کا حکم صادر فرمایا ۔ چنانچہ گذشتہ ماہ کے دوران
ں موصوف پنجاب اور سرحد کے اکثر مقامات (گوجرانوالہ ۔ وزیر آباد ۔ سیالکوٹ
گجرات ۔ اسلام آباد ۔ راولپنڈی ۔ پشاور ۔ فیصل آباد ۔ ملتان ۔ شجاع آباد) پر گئے ۔
فقاء و احباب سے ملاقاتیں ہوئیں ۔ رفقاء کے اجتماعات خصوصی میں باہم مشورے
ے بعد آئندہ کے نقشہ ہائے کار متعین کئے ۔ مختلف مقامات پر دعوتی اور اصلاحی مہم کیلئے
نصوبہ بندی کی اور مناسب مواقع پر خطاب عام اور سوال و جواب کی نشست کا بھی اہتمام
یا ۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان مقامات پر کام کی جو کچھ ابتدا ہو سکی ہے ۔ اس کی
تفصیلات [illegible]

جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کو تفویض کی گئی ہے اور ہمارے دو مستعد رفقاء
محمد اسحاق صاحب اور ڈاکٹر عارف رشید صاحب نائب امرائے تنظیم اسلامی ا
سے ان کے معاون و مددگار ہیں ۔ ان حضرات نے گذشتہ ماہ کے دوران لاہور میں
کی ہے ۔ اُسرہ جاتی نظام کو از سر نو منظم کیا ۔ مختلف سطح پر اجتماعات کے نظام کو د
رفقاء کے مسائل سے آگاہی کی خاطر بھی ملاقاتوں کا خصوصی اہتمام کیا ۔ اگرچہ مختا
پر درس قرآن کی محافل کا اہتمام جاری تھا ۔ تاہم جناب امیر تنظیم اسلامی کی د
نے یہ محسوس کیا کہ قرآن مجید ہمارے فکر و دعوت کی اصل ثابت ہے اس پر مزید تو
ہے ۔ چنانچہ لاہور میں مزید دس مقامات پر ہفتہ وار درس قرآن کا اہتمام کر دیا گ
حلقہ ہائے دروس قرآن کے لئے بھرپور محنت ہو رہی ہے ۔ اللہ تعالےٰ اس کو قبول
اس میں برکت عطا فرمائے ۔

اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے گزشتہ دنوں تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام ف
لاہور میں منعقدہ ہفت روزہ تربیتی اجتماع کے دوران رفقائے تنظیم اسلامی
رابطہ عوام مہم کے تجربے سے گزرے تھے ۔ رفقائے تنظیم گروپس کی شکل میں نکلے اور
مختلف مقامات پر مختلف انداز میں لوگوں سے رابطہ قائم کیا اور انہیں اس مخ
تشویش ناک صورتِ حال کی طرف متوجہ کیا ، جس سے ہم ملکی اور ملی سطح پر دو
صورتِ حال نتیجہ ہے ہماری اُن بداعمالیوں اور بدعہدیوں کا جن کا ارتکاب ہم مسل
اور اجتماعی سطح پر کر رہے ہیں ۔ لوگوں کو توجہ دلائی گئی کہ اس سے نجات کی واحد صو
انابت الی اللہ ہے ۔ انفرادی سطح پر تو یہ ہے کہ انسان معصیت سے رُک جائے
الٰہی پر کاربند ہو جائے ۔ اور اجتماعی توبہ کا مظہر یہ ہوگا کہ اس سرزمین میں شریعت ا
کا وعدہ پورا کیا جائے ۔ اگر خدانخواستہ ہم احکاماتِ الٰہی کو پاؤں تلے روندتے
اسلامی سے انحراف کی روش پر کمربستہ رہے تو اس ملک کے وجود کی وجہ جواز
اور بالآخر عذابِ خداوندی ہمیں تہس نہس کر دے گا ۔ تربیتی اجتماع کے موقعہ پر
اسلامی اس پکار کو لے کر لاہور اور اس کے گرد و نواح میں پھیل گئے ۔ پیش نظر
تھا کہ تنظیم اسلامی کے رفقاء اس رابطہ عوام کی مہم کے آداب اور ضروریات
واقف ہو جائیں ۔ اور اس کی عملی تربیت حاصل کرنے کے بعد اپنے اپنے علاقہ
جا کر قریہ قریہ توبہ کی اس منادی کا اہتمام کریں ۔ شاید کہ یہ بات دلوں میں
اور اہلیانِ وطن بارگاہ الٰہی میں جھک جائیں ۔ اللہ تعالےٰ کی رحمت کو پکاریں ا

پرکربستہ ہوں۔ اور منافقت کی روش چھوڑ کر شریعتِ اسلامی کے حصار میں محفوظ و مامون ہو جائیں۔ الحمد للہ رفقاء تنظیم اسلامی نے اطراف و اکناف ملک میں اس کا حتی الوسع اہتمام کیا ہے اور اس کے لئے مزید کوششیں جاری ہیں۔ اس ضمن میں بعض مقامات سے موصولہ تفصیلات کا اجمالی تذکرہ متعلقہ رپورٹس سے اقتباسات کی شکل میں درجِ ذیل ہے۔

فیصل آباد

یکم جنوری ۸۷ء کو فیصل آباد میں ۲۷ رفقائے تنظیم اسلامی نے ایک دعوتی اور اصلاحی مہم میں شرکت کی۔ رفقاء کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا اور قریباً ۱۱ بجے یہ گروپ میاں محمد یوسف صاحب کے گھر سے روانہ ہوئے۔ ہر گروپ کے پاس دس بورڈ تھے جن پر قرآن و حدیث کے حوالے سے مختلف ترغیبی اور ترہیبی تحریریں درج تھیں۔ ایک دو ورقہ "کراچی میں قیامتِ صغریٰ" کافی تعداد میں بغرض تقسیم موجود تھا۔ ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب اور جناب اقبال حسین صاحب کی قیادت میں یہ گروپ مختلف بازاروں سڑکوں، مارکیٹوں اور دیگر پرہجوم مقامات پہ گشت کرتے رہے۔ دو ورقہ تقسیم کیا۔ حسبِ ضرورت مختصر گفتگو اور وضاحت کی۔ مناسب مقامات پر مختصر خطاب بھی کیا اور یہ سلسلہ نمازِ ظہر اور اسکے بعد تک بھی جاری رہا۔

میاں محمد نعیم صاحب قیمِ تنظیم اسلامی ۹ جنوری کو متحدہ شریعتِ محاذ کے اجلاس میں شرکت کے لئے فیصل آباد تشریف لائے۔ انہوں نے رفقائے تنظیم اسلامی فیصل آباد کے ایک ہنگامی اجتماع میں شرکت کی اور فیصل آباد میں آئندہ دعوتی مہم کی منصوبہ بندی کی۔ چنانچہ رفقائے تنظیم اسلامی فیصل آباد نے ۱۵ جنوری تا ۱۷ جنوری ایک سہ روزہ مہم کا اہتمام کیا۔ اس میں میاں محمد نعیم صاحب کی معیت میں بعض رفقائے تنظیم اسلامی لاہور نے بھی شرکت کی۔ دو روز بعد نمازِ ظہر اور جمعۃ المبارک کو اجتماع جمعہ کے اوقات میں حسبِ معمول دعوتی مہم کے لئے نکلے اور بقیہ اوقات میں کچھ تربیتی پروگرام اور باہمی افہام تفہیم میں بسر ہوئے۔ رفقاء تنظیم اسلامی فیصل آباد نے بعد ازاں بھی دعوت و تبلیغ اور ذاتی تربیت کی غرض سے یہ پروگرام جاری رکھے ہیں۔ چنانچہ ۲۸ جنوری کو فیصل آباد میں اور ۱۱ فروری کو نواحی قصبہ جھمرہ میں یہ پروگرام ہوا جس میں ۱۵ رفقائے فیصل آباد نے حصہ لیا۔

(مرسلہ: غلام اصغر صدیقی)

ملتان

۲۵ دسمبر ۸۶ء سے یکم جنوری ۸۷ء تک قرآن اکیڈمی لاہور میں کل پاکستان سطح پر
یک تربیتی اجتماع منعقد ہوا۔ اس تربیتی اجتماع میں میاں محمد نعیم صاحب نے رفقاء کو
تنظیم کی "رابطہ عوام مہم" کا طریقہ عملی انداز میں کر کے بتلایا اور تمام رفقاء چار دن تک اس
کا مشق کرتے رہے چونکہ رفقاء کا تعلق پورے پاکستان سے تھا تو اب ضرورت محسوس کی
جا رہی تھی کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں رفقاء جا کر لوگوں کو دعوت دیں کہ وہ اپنے اعمال کی
اصلاح کریں اور صحیح معنی میں مسلمان بنیں اور تنظیم کے حلقہ میں شامل ہو کر اقامت دین کی
جدوجہد شروع کریں۔ اسی ضمن میں ۲۹ تا ۳۱ جنوری کو تنظیم اسلامی ملتان نے ملتان میں
"رابطہ عوام" مہم کا پروگرام بنایا اور مرکز سے رہنمائی بھی چاہی۔ چنانچہ ۲۸ جنوری کو مرکز سے ۱۱
افراد پر مشتمل قافلہ قیم تنظیم کی امارت میں لاہور سے روانہ ہوا۔ ایک دن قبل جانے کی وجہ
یہ تھی کہ وہاں جا کر انتظامات بھی دیکھنے تھے۔ الحمد للہ کہ امیر تنظیم اسلامی ملتان جناب
ڈاکٹر کرنل (ریٹائرڈ) حافظ غلام حیدر ترین صاحب نے رفقاء تنظیم اسلامی ملتان کے تعاون
سے اپنے طور پر انتظامات اتنے منظم اور مربوط بنائے تھے کہ اس میں کسی ردّ و بدل کی گنجائش
نہ تھی۔ ضرورت کے مطابق موزوں بورڈ بنوالئے گئے تھے۔ اُن کے لئے عبارتوں کو مرتب
کرنے اور لکھوانے میں جناب سعید بھٹہ اور عبدالغنی صاحب کی محنت و کوشش کا بہت دخل
ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

۲۹ جنوری کو ظہر کی نماز پروگرام کے مطابق تمام رفقاء ملتان، دہاڑی اور شجاع آباد
نے جن کی تعداد تقریباً ۴۰ تھی اہلی والی مسجد میں ادا کی۔ نماز کے بعد دعا کر کے مسجد
سے باہر نکلے۔ سب سے پہلے قیم تنظیم اسلامی ملتان ڈاکٹر محمد طاہر خان خاکوانی تھے پہلے کارڈ
اٹھایا ہوا تھا۔ اور اسکے بعد تیرہ رفقاء نے پلے کارڈ اٹھا رکھے تھے۔ جن پر مختلف دینی
و تربیتی چھوٹے چھوٹے جملے لکھے ہوئے تھے۔ اور تنظیم کی دعوت مختصر جملوں میں تحریر تھی۔
اس کے ساتھ ساتھ تقریباً آٹھ رفقاء تنظیم کا منشور اور کراچی کے افسوسناک واقعات
کے حوالہ سے ایک دو ورقہ لوگوں میں تقسیم کرتے رہے۔ مزید براں تھوڑے تھوڑے
فاصلہ پر رک کر کارنر میٹنگ کی صورت میں جمع ہوتے لوگوں سے خطاب کیا گیا اور انہیں
تنظیم کی دعوت پہنچائی گئی۔

عصر کی نماز پاک گیٹ کی مسجد میں ادا کی گئی۔ امام مسجد صاحب نے بڑی فراخ
ظرفی کا معاملہ فرمایا۔ اور انہوں نے جماعت سے فراغت کے بعد ہمارے رفیق کار کو خطاب

کرنے کی دعوت دی۔ جس پر مولانا شبیر احمد نورانی صاحب نے انتہائی مختصر مگر جامع خطاب فرمایا۔ اور لوگوں کو اصلاحِ احوال کی دعوت دی۔ نماز کے بعد رفقاءِ تنظیم پھر پلے کارڈ اٹھائے مسجد سے روانہ ہوئے اور راملی والی مسجد جہاں سے کہ پروگرام شروع کیا تھا۔ وہیں آکر اختتام کیا۔ ۳۰ جنوری جمعہ کا دن تھا چونکہ ملتان میں بھی جمعہ بازار لگتا ہے۔ لہٰذا پروگرام یہ بنایا گیا کہ صبح آٹھ بجے سے جمعہ بازار میں رابطہ عوام مہم کا آغاز کیا جائے اور طریقہ کار وہی ہو۔ جو کہ کل اختیار کیا گیا تھا۔ اس طرح ملتان ریلوے سٹیشن پر بھی مہم چلائی جائے۔ بحمد اللہ یہ کام ۳۰ : ۱۱ بجے تک تمام رفقاء جوش و خروش سے انجام دیکر وہاں سے دفتر تنظیم اسلامی ملتان پہنچے۔ کھانے کے بعد پھر جمعہ کے لئے مختلف مساجد کا انتخاب کر کے مختلف پارٹیاں ترتیب دی گئیں اور انہوں نے منتخب شدہ جگہوں پر جا کر نمازِ جمعہ کے بعد نمازیوں کو تنظیم اسلامی کی دعوت سے متعارف کروایا۔ اور لٹریچر بھی تقسیم کیا۔ ۳۱ جنوری بروز ہفتہ چونکہ اس دعوتی پروگرام کا آخری دن تھا۔ اس لئے آج بھرپور مہم چلائی گئی۔ صبح ۱۰ بجے کے قریب دفتر تنظیم اسلامی ملتان سے تمام رفقاء پلے کارڈ اٹھائے ہوئے روانہ ہوئے اور یہاں سے گھنٹہ گھر، چوک کچہری، نواں شہر، چوک ڈیرہ اڈہ اور کینٹ کے علاقہ میں گشت کیا۔ اس پورے پروگرام میں رفقاء کا نظم و ضبط اور لگن قابلِ دید تھی۔ اس طرح تمام لوگوں نے بھی ہمارے کام کی تحسین کی اور کئی ایک نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مہم سے کوئی خیر برآمد فرمائے گا! اور لوگوں کی اصلاح ہو سکے گی۔

(مرتب: شیخ رحیم الدین)

شجاع آباد

شجاع آباد اور اس کے نواحی علاقہ میں تنظیم اسلامی کی داغ بیل ابھی حال ہی میں پڑی ہے۔ چند رفقاء شجاع آباد اور اسکی نواحی بستی چک مراد پور میں مقیم ہیں اور باہم تنظیم اسلامی کے ایک اُسرہ کی شکل میں منسلک ہیں۔ گذشتہ ماہ میاں محمد نعیم صاحب ناظم تنظیم اسلامی پاکستان یہاں تشریف لائے اور یہاں کے لئے کچھ لائحہ عمل طے ہوا۔ ہدایت کے مطابق ۱۱، ۱۲ فروری کو شجاع آباد ایک دعوتی پروگرام ترتیب دیا گیا۔ جو الحمد للہ حسبِ ذیل صورت میں بخیر و خوبی انجام پذیر ہوا۔

۴۰ : ۳ بجے بعد دوپہر بروز جمعرات شجاع آباد تشریف لائے ۔ اُسرہ شجاع آباد کے آٹھ رفقاء ا
آٹھ دوسرے ہم خیال شریک ہوئے ۔ پروگرام کا آغاز احاطہ کچہری شجاع آباد سے ہوا ۔ رفقا
نے کتبات اٹھائے ہوئے شہر کا گشت کیا ۔ دورانِ گشت قبل نمازِ عصر مختلف مقامات پر
خطاب ہوئے ۔ بعد نمازِ عصر شاہی مسجد میں چوہدری رحمت اللہ بٹر نے اقامت دین کے با
میں مختصر خطاب فرمایا ۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۲۰۰ کے لگ بھگ تھی ۔ بعد نماز عصر
تنظیم اسلامی دہاڑی سے بھی تین رفقاء شریک پروگرام ہوتے ۔ قبل نماز مغرب تک مختلف
مقامات پر پانچ خطابات ہوتے ۔ نمازِ مغرب مدنی مسجد چوک تھانہ شجاع آباد میں ادا کی ۔
کے بعد مسجد مذکورہ میں بھی چوہدری رحمت اللہ بٹر نے خطاب فرمایا ۔ سامعین کی تعداد تقر
۲۸۰ تھی ۔ یہاں سے فارغ ہوکر رفقاء چک مراد پور کی طرف روانہ ہوتے ۔ اور بعد نماز عشا
رفقاء اور دیگر ہم خیال لوگوں کا آپس میں تعارف کرایا گیا ۔ اگلی صبح بروز جمعہ نمازِ فجر کے
چوہدری رحمت اللہ بٹر صاحب نے درس قرآن دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۹ بجے صبح تا گیارہ بجے
ہی نے اقامتِ دین و اغراض و مقاصدِ تنظیم اسلامی کے موضوع پر خطاب فرمایا ۔ اسی دور
کچھ وقت سوال و جواب کی نشست بھی ہوئی ۔ رفقاء کے علاوہ تقریباً دیگر سامعین ا
تیس تھی ۔ اس خطاب کے بعد حسین بخش صاحب نے جوکہ محکمہ ڈاک میں بطور اسسٹنٹ
ہیں نے تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کی ۔ بوقت ۱۲ بجے دوپہر رفقاء شجاع آباد کے
روانہ ہوتے اور گلستان مسجد شجاع آباد نمازِ جمعہ ادا کی ۔ نماز جمعہ سے قبل سوا ایک
سے دو بجے تک چوہدری رحمت اللہ بٹر صاحب نے اقامتِ دین کے موضوع پر سامعین
سے مدلل خطاب فرمایا ۔ بعد ادائیگی نمازِ جمعہ یہ دعوتی پروگرام اختتام پذیر ہوا ۔ دورانِ گ
اور مساجد کے خطابات میں منشور تنظیم اسلامی اور دو ورقہ کراچی میں قیامت صغریٰ تق
کیا گیا ۔ تمام پروگرام میں کسی قسم کا ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا ۔ بلکہ اس پروگ
تنظیم اسلامی کے بارے میں لوگوں کے تاثرات اچھے معلوم ہوتے تھے ۔ اللہ تعالیٰ ہم س
حامی و ناصر ہو ۔

(مرسلہ : سید عاشق حسین ۔ نقیب اسرہ شجاع آباد)

الحمد للہ بعض دوسرے مقامات پر بھی اسی طرح کے پروگرام منعقد ہوتے ان شاء ا
العزیز وہاں کی تفصیلات آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں گے ۔ اللہ تعالیٰ خدمت و دعوت
کی ان حقیر کوششوں کو قبول فرمائے ۔ ○○○○○○○

- -

کوپن برائے سالانہ خریداری

میں ماہنامہ "میثاق" لاہور کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں / چاہتی ہوں براہِ مہربانی مجھے ماہ ـــــــ کا شمارہ -/۴۴ روپے کی وی پی کی شکل میں درج ذیل پتے پر ارسال کر دیجئے / میری طرف سے سالانہ زرِ تعاون کی رقم بذریعہ منی آرڈر / بنک ڈرافٹ ارسالِ خدمت ہے۔

نام -

پتہ -

نوٹ: رقم ماہنامہ "میثاق" ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور کے پتے پر ارسال کی جائے

۱۰۱

THE ROARING LION OF AGRO-CHEMICAL INDUSTRY

THERE ARE PEOPLE WHO DO THINGS, AND THERE ARE PEOPLE WHO DO THINGS WELL.

AT DAWOOD HERCULES WE DO THINGS WELL ! RIGHT FROM OUR INCEPTION 12 YEARS AGO WE'VE BEEN ENGAGED IN A TREMENDOUS OUTPUT, ENSURING BETTER AND HEALTHIER CROPS AND STRENGTHENING THE NATIONAL ECONOMY DURING THIS TIME WE'VE

a. PRODUCED 4,000,000 TONS OF BUBBER SHER UREA
b SAVED MORE THAN US $ 750,000,000 IN FOREIGN EXCHANGE FOR PAKISTAN.
c. CONTRIBUTED RS. 2000,000,000 TO THE NATIONAL TREASURY IN THE FORM OF DEVELOPMENT SURCHARGE, DUTIES AND TAXES
d SAVED FERTILIZER SUBSIDY WORTH RS. 3000,000,000 IN OUR PRODUCTION WHICH WAS USED BY THE GOVERNMENT TO SUBSIDIZE *FERTILIZER PRICES, GIVING AN ENORMOUS BENEFIT TO THE FARMER*

BROADLY SPEAKING WE ARE COMMITTED TO A BETTER QUALITY OF LIFE FOR OUR PEOPLE AND WE ARE DEVOTING OUR VAST TECHNOLOGICAL RESOURCES AND AGRO-CHEMICAL KNOW-HOW TO PROVIDING A VITAL INPUT FOR DEVELOPING HEALTHIER CROPS.

WE FEEL PROUD OF THESE ACHIEVEMENTS, AND SHALL CONTINUE TO PLAY OUR KEYROLE IN THE DEVELOPMENT OF AGRICULTURE AND ECONOMY OF PAKISTAN

DAWOOD HERCULES CHEMICALS LIMITED
MAKERS OF BUBBER SHER UREA

DAWOOD CORPORATION LIMITED
DISTRIBUTERS OF BUBBER SHER UREA

premier

کھانسی گلے کی خراش نزلہ زکام کے لیے
زود اثر
سرفی کول
SURFICOL
COUGH SYRUP

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے اللہ . . . . .

ہم عاجز ہیں ——— تو قوی ہے

ہم ظالم ہیں ——— تو رحیم ہے

ہم گناہ گار ہیں ——— تو بخشنے والا ہے

ہم نے تجھ سے یہ ملک مانگا تھا کہ یہاں تیرے کلمے کو بلند کریں گے

تیری کتاب کے احکامات پر عمل کریں گے

تیرے آخری نبی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کی پیروی کریں گے

لیکن ہم نے ——— اُس عہد کو پامال کر دیا

ہم نے اپنی خواہشات اور مال و دولت کو اپنا معبود بنالیا

ہم تجھے بھول گئے

لیکن تو ہمیں فراموش نہ کر

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کر دے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دبئی، دوحہ، قطر، متحدہ عرب امارات	۲۵ سعودی ریال یا ۱۵۰ روپے پاکستانی
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، مصر	۱۰ امریکی ڈالر یا ۱۰۰ روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ	۱۲ امریکی ڈالر یا ۱۵۰
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ	۱۶ امریکی ڈالر یا ۲۰۰

ترسیلِ زر: ماہنامہ میثاق [illegible]
۳۶-کے ماڈل ٹاؤن [illegible] پاکستان، لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: ۸۵۲۶۸۳-۸۵۲۶۱۱
سب آفس: ۱۱-داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی فون ۲۱۶۵۸۶

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقتدار احمد

عرضِ احوال

ماہِ رواں کے پہلے ہفتے میں تنظیمِ اسلامی کے رفقاء ملک کے دور و نزدیک گوشوں اور بیرونِ ملک سے بھی اپنے بارہویں (۱۲) سالانہ اجتماع کے لئے لاہور میں جمع ہو رہے ہیں۔ سالانہ اجتماعات عام جماعتوں کے لئے چاہے کچھ بھی مفہوم رکھتے ہوں، نظریاتی جماعتوں بالخصوص تحریکوں کے لئے سنگ ہائے میل ہوتے ہیں۔ ان میں سالِ گذشتہ کی کارکردگی کا تنقیدی جائزہ لینا بھی مقصود ہوتا ہے اور آئندہ سال کے لئے اہداف کا تقرر بھی۔ پھر ساتھیوں کا باہم میل جول اس جذبۂ اخوت، تعلقِ قلبی اور ذہنی ہم آہنگی کے ازدیاد کا باعث بنتا ہے جو انہیں ایک بنیانِ مرصوص بنانے کے لئے ضروری ہے اور انفرادی و اجتماعی ہر دو سطحوں پر اُن مسائل کے علم سے آگہی میں اضافہ بھی ہوتا ہے جو راہِ حق کی اس مسافرت میں افراد اور اجتماعیت کو دورانِ سال پیش آئے جبکہ وہ حل نشاناتِ راہ کو واضح کرتے ہیں جو مقصد کی لگن نے انہیں سجھائے اور کارگر ثابت ہوئے۔

اَلحَمدُ لِلّٰہ، ثُمَّ اَلحَمدُ لِلّٰہ ہماری اجتماعیت کی بنیاد رضائے الٰہی کا حصول اور نجاتِ اخروی ہے، یہی ہمارا انفرادی اور اجتماعی ہدف اوّلین و آخرین بھی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اسی منزل تک پہنچنے کی آرزو لے کر اس قافلے میں شریک ہوا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ ساتھی حصولِ مقصد میں اس کے ممد و معاون ہوں گے۔ اس قافلے کا رُخ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ کی جانب ہے۔ مقدار، تعداد، اسباب اور امکانات کی بھول بھلیّوں، حُبِّ عاجلہ کے سراب اور فریبِ خودنمائی کی کھائیوں سے بچتا بچاتا یہ چھوٹا سا قافلہ نہ صرف قدم بقدم آگے بڑھ رہا ہے بلکہ اس میں شامل ہوتے جانے والے اس نسبت سے بفضلہ زیادہ ہیں جو ہماری شامتِ اعمال سے اس مردہ معاشرے میں زندگی کی واقعی حرارت رکھنے والوں کی پائی جاتی ہے۔ بایں ہمہ صد شکر کہ ہم زعمِ ہمچو ما دیگرے نیست میں مبتلا نہیں۔ ہماری کمزوریاں صرف ربِّ علیم و خبیر پر ہی روشن نہیں خود ہمیں بھی بے چین رکھتی ہیں۔ اور کتنی مبارک ہے یہ بے چینی! اسی سے تو درماندگی کو مہمیز ملتی ہے، یہی کارواں کے ہر شریک کے لئے رختِ سفر ہے۔

اللہ تعالےٰ کی غلامی کا قلادہ گلے میں سجا لینے والوں کی کوئی مجلس، کوئی تقریب، کوئی محفل

چار باتوں سے خالی نہیں ہوتی اور اسی لئے وہ کبھی کسی رسم یا رواج کا مرہونِ منت نہیں بلکہ انسانِ کامل پیغمبرِ خاتم، ہادیٔ اعظم محمد صلی اللہ علیہ وسلم، فداہُ اَبی و اُمّی کی تعلیم کے اتباع میں ہے۔ خلوص و اخلاص سے مزین یہی چار فانوس انشاء اللہ ہمارے سالانہ اجتماع کو منور رکھیں گے۔ حمد و ثنا، شکر و سپاس، ایثار و ہمدردی اور دروں بینی و خود احتسابی۔ ہماری تو عیدیں بھی انہیں سے رونق پاتی ہیں۔ اے اللہ تیری خوشنودی کے طالب یہ عاجز بندے تیری عظمت و کبریائی کے ترانے اُن طیور سے بہتر نہیں الاپ سکتے جو صبحدم فضاؤں میں خیرنی گھولتے ہیں۔ تیری قدرت و اختیار کی ہم کور چشم کیا گواہی دیں گے جس کی لامحدودیت پر کائنات کا ذرہ ذرہ گواہ ہے۔ تیرے جلال و جمال کی کارفرمائی ہمارے تصور و تخیل کی وسعتوں سے ورائُ الوراء ہیں۔ اے ہمارے رب! ہم تیرے انعامات بے حد بے حساب کا تو کیا، اس احسان کے شکر کا حق بھی ادا کرنے کے قابل نہیں کہ تو نے اپنے منتخب و برگزیدہ بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری ہدایت اور تعلیم کتاب و حکمت کے لئے مبعوث فرمایا؛ جس نے جان و دل پر پیہم صدمات سہہ کر بھی اپنا فرض منصبی کما حقہٗ نبھایا۔ نہ صرف قرآن حکیم، حبل اللہ، نور و ہدایت کے سرچشمے کو ابدالآباد تک تیرے بندوں کی رہنمائی کے لئے پوری شرح و بسط کے ساتھ سمجھا کر منتقل کیا اور اپنے اسوۂ حسنہ اور سیرتِ مطہرہ کو طالبانِ آخرت کیلئے چراغ راہ اور مینارۂ نور بنایا بلکہ بنی نوع انسان کی دائمی فوز و فلاح کی جنت کا ایسا نقشہ عین زمین کی سطح پر بنا کر دکھا دیا جس کے نقوش گم گشتہ کی تلاش میں انسانیت ہمیشہ کوشاں و سرگرداں رہے گی۔ اے اللہ! اس رحمۃ للعلمین کے لئے اپنے اور ملائکہ کے درود و سلام میں ہمارا سلام بھی شامل فرما۔ ربّ ذوالجلال والاکرام! ہمیں اپنی اس نعمت خاصہ کا شعور و ادراک بھی عطا کر اور اس پر توفیقِ شکر و سپاس کی بھی ارزانی فرما کہ تو نے ہمیں ہدایت سے سرفراز کر کے اپنے بندوں میں سے دینِ حق کی خدمت کے لئے قبول کیا ہے۔ حقا کہ تیری ذاتِ والا تبار اور تیرا دینِ متین ہماری سعی و جہد کا محتاج نہیں، تیری تکبیر اور تیرے دین کی اقامت اپنی نجات اخروی کے لئے ہماری اپنی ضرورت و احتیاج ہے۔

سالانہ اجتماع کے موقع پر ہمارے وسائل کی کم مائیگی اور بود و باش کی تنگی، رفقا و شرکا کی طرف سے ایثار کی طلب ہو گی اور انشاء اللہ اس جذبۂ ایثار کی فراوانی حسب سابق امسال بھی نظر آئے گی۔ ہمدردی کے مروجہ تصور کا ذکر تحصیل حاصل سمجھتے ہوئے ہم اپنے ساتھیوں کو یاد دلائیں گے کہ جماعتی کے تم ہمدردوں کے مابین رشتۂ ہمدردی کی اصل اور مطلوب شکل یہ ہے کہ ان میں سے جن کو اللہ تعالیٰ نے سنقامت و عزمیت کی نعمتِ عظمی سے نوازا ہے وہ اپنے کمزور ساتھیوں کو سہارا دیں۔ مزا تب ہے

ر گرتوں کو تھام لے ساقی۔ ان کا حوصلہ استوار کریں۔ ان کے ذاتی و جذباتی مسائل میں دلچسپی لیں۔ اور ان کے دامن کھینچ کھینچ کر اسی دلسوزی سے آگ کے گڑھے میں گرنے سے انہیں بچائیں جو سنّت و عادت خیر الانام ہے۔

رہی دردِ دل بھی وخود احتسابی ــــ گریہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں۔ ہمیں نشستند، گفتند، برخاستند کی لامقصدیت سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہئیے۔ اس نادر موقعہ کے قیمتی لمحات میں جو فرصت میسر آئے اسے ہم اپنے من میں ڈوب کر مقصد سے خلوص کا سراغ پانے میں صرف کریں۔ ہمارا طرزِ عمل یہ ہو تو کامیابی ہے کہ اپنے کسی ساتھی کو سموچا اونٹ نگلتے دیکھ کر بھی اپنے لئے مچھر چھاننا بند نہ کریں، اپنے احتساب میں نرمی روا نہ رکھیں، اپنے نفس کو بقدرِ وسعت سونے کا نوالہ کھلا سکیں تب بھی شیر کی نگاہ رکھنا نہ چھوڑیں ــــ اور اس سارے طلسم کی اصل اسم یہ ہے کہ ربّ العزّت سے ہر حال میں اور ہر دم توفیق و استقامت کی درخواست کرتے رہیں۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ــــ آمین یا رب العالمین!

شمارۂ زیرِ نظر میں مسئلہ سندھ پھر گفتگو کا موضوع بنا ہے۔ بلکہ اس کے بعض اہم پہلوؤں کے لئے ایک علیحدہ عنوان قائم کیا گیا ہے جس کے ذیل میں متعدد خیال افروز تحریریں آئی ہیں۔ حاصلِ مطالعہ مؤقر روزنامہ "ڈان" کراچی کا ایک اداریہ اور سندھ کی تاریخ پر ایک پُرمغز مقالہ ہے۔ اداریے کا ترجمہ اور مقالے کا انگریزی متن ہم "ڈان" کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ موخرالذکر تاریخی مقالے کا مطالعہ اس کی اصل شکل میں ہی مزا دے گا تاہم اپنے اردو خواں قارئین کے لئے انشاء اللہ اگلا ماہ ہم اس کا ترجمہ بھی نذر کریں گے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ایک دیرینہ نیازمند کے تاثرات بھی جو ان کے خیال سے غافل نہیں رہے خود اُن کے اجمالی تعارف کے ساتھ اس پرچے کی زینت ہیں۔ ہم اپنے امیرِ محترم کی مستقل اور سوچی سمجھی روش کے اتباع میں زمانہ قریب کے بزرگوں کی شخصیتوں اور اُن کے مشن سے اپنے تعلقِ محبّت و عقیدت کو سعادت و افتخار سمجھتے ہیں۔ امیرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اکثر یہ شعر پڑھا کرتے ہیں ؎

اُحِبُّ الصَّالِحِيْنَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِيْ صَلَاحًا!

میثاق کی جلدیں گواہ ہیں کہ اس مجلّے کا بیشتر مواد دعوت و تاریخِ رجوع الی القرآن، علم

مباحث اور ملک و ملت کے درد میں محض اصولی گفتگو اور حقیقت پسندانہ تجزیوں پر مشتمل رہا۔
وقتی مسائل جو جرائد و مجلات کا عمومی موضوع بنتے ہیں ہمارے صفحات میں شاذ ہی جگہ پا سکے ہ
اب ان شمولات میں "عرضِ احوال" کے زیرِ عنوان بس اسی قدر اضافہ ہوگا کہ احوالِ وطن
امورِ ملت اسلامیہ اور بساطِ عالم پہ بازی گری کا بھی حسبِ ضرورت ذکر کیا جائے گا۔ یہ تبدیلی بھی بے
نہیں۔ بحمداللہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا ماہنامہ 'حکمتِ قرآن'، جو معدودے چند انتظ
امور میں فرق و تفاوت کے سوا 'میثاق' کا ہی مثنیٰ ہے، اب ما قبل سے بہت بہتر شکل و صور
میں وقیع تر علمی مضامین کے ساتھ نسبتاً زیادہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کی اشاعت
بڑھ رہی ہے اور قارئین میثاق سے درخواست ہے کہ اس بڑھوتری کو ایک ہلے میں تیز تر کر
'حکمتِ قرآن' کی توسیعِ اشاعت سے ہم ایک حد تک اس قابل ہوئے ہیں ـــــ اور
مد انشاء اللہ حسبِ توقع بڑھے گی ـــــ کہ متذکرہ معاملات پر بھی بتقاضائے نصح و خیر خو
گاہے گاہے تنظیمِ اسلامی کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے 'میثاق' میں گنجائش نکال سکیں

عالمِ اسلام میں جہاں ایک طرف ہم دین کے احیائی عمل کو "ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے"
صورت جاری دیکھتے ہیں وہیں دوسری طرف موجود محسوس منظر خون کے آنسو بھی رلاتا ہے
اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں کہ وہ مبارک دن کب کرۂ ارضی پر طلوع ہو جب اسی کا کلمہ بلند ہوگا
کی حاکمیتِ اعلیٰ مسلّمہ ہوگی۔ ہمارا ایمان ہے کہ اس کا وعدہ سچا ہے، پورا تو ضرور ہوگا لیکن کیا
ہم بھی اس کیفیت کے کچھ آثار بچشمِ سر دیکھ سکتے۔ اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں۔ لا
اس کی تقویم ہمارے حساب کتاب اور اندازوں سے بہت بالا ہے۔ تا حال تو عالمِ واقعہ میں جو
ہے اس کی ایک جھلک یہ ہے کہ قطعی طور پر غیر مؤثر اسلامی سربراہی کانفرنس کے نام پر مسلمان مما
کے حکمران ہر تین سال بعد ایک طرح کی پکنک کے لئے جمع ہوتے ہیں اور سب مل کر وہ اربوں
ڈالر خورد و نوش، شاہانہ کرّوفر اور اسراف و تبذیر پہ اڑا دیتے ہیں جو ملتِ اسلامیہ کے کئی
چھوٹے بڑے مسئلے حل کرنے کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ اپنے حزن و ملال کے کس کس پہلو
ذکر کریں، اس وقت صرف ایک ستم ظریفی کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔
ان سربراہی کانفرنسوں میں کیسے کیسے 'اسلامی' ممالک کے حکمران تشریف لاتے
مشتے از خروارے ملاحظہ کیجئے۔ آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کے اُس سب سے بڑے ملک ک

بھی اسلامی شمار کیا جاتا ہے جہاں 'دنیا دار پرست ملاؤں' کے لئے دار و گیر اور عیسائی مُبلغین کے
لئے وہ سہولت ہے کہ بجا طور پر اندیشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ وہاں مسلمانوں کے اقلیت میں تبدیل
ہو رہنے کا سانحہ پیش آجانا عین قرین قیاس ہے۔ وہ ملک بھی اسلامی ہے جہاں اخوان المسلمون کے
برسرِ اقتدار آجانے والی پوری پوری بستیاں مکینوں سمیت بارود سے اڑا دی جاتی ہیں۔ قدامت پسند
مسلمانوں کو جو بُرد بچے سمیت کولہو میں پلوا دیا جاتا ہے۔ اور جس پر ایک ضال و مضل اقلیتی فرقے
کے ملحد افراد بزورِ شمشیر حکومت و اقتدار پر قابض چلے آرہے ہیں۔ اور وہ ملک تو اسلامی ہی نہیں ہمارا
ہمدم و دمساز بھی ہے جہاں اس بات پر واقعتاً بھلنے میں رپٹ لکھوائی جاتی ہے کہ عمر اکبر نام لیتا
ہے کہ خدا کا اس زمانے میں۔ کیا وہاں کے باثر قومی اخبارات کے بدبخت مدیروں کی جسارت کا
تصور کیا جا سکتا ہے جو اپنے وطن — ترکی — میں قرآن مجید کے نسخوں کی طباعت پر بھی اظہارِ
تشویش اپنے اداریوں میں برملا کر چکے ہیں جبکہ بدنام زمانہ عریانی کے شاہکار اور بدترین فحاشی
کے مصوّر سنڈے اس 'پلے بوائے' کی برسرِ عام فروخت ہی نہیں خود اپنے ملک سے مقامی زبان میں
باقاعدہ اشاعت اُن کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہے۔ ہم اس 'برادر اسلامی' ملک کا نام نوکِ قلم
پر نہ لاتے اگر خلافت کے ملی ادارے کے آخری امین کی حیثیت سے اسلامیانِ برصغیر کی اس
سے جذباتی وابستگی ہمارے حافظے سے محو ہو چکی ہوتی ؎

'ترکی' کا تو نے ذکر جو چھیڑا تو ہم نشین — اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

طلبہ و طالبات کے ایک ناقابل لحاظ طبقے میں 'مذہب' سے جذباتی وابستگی کے آثار اور مسلمان
لڑکیوں کے ایک مختصر سے گروہ کے اپنے سروں کو 'سکارف' سے ڈھانپ لینے پر صدر کنعان
ایورن کی نیندیں اڑ گئی ہیں اسلام کا ذکر اور معاشرے میں جاری و ساری خباثتوں سے تنفر کا
اظہار تو ہمارا ان کے سیکولرازم کے تقدس کے لئے خطرے کا الارم بن گیا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

عوامی چین جس کی سُرخی اب تک گلابی تو ہو ہی چکی ہے، مائل بہ سفیدی بھی ہے، پاکستان کا دوست
ملک ہے اور اس کا خلوص — اسباب و علل سے قطع نظر — وقت گذرنے کے ساتھ واقعتاً
شکوک و شبہات سے بالاثابت ہوا ہے۔ ہماری ریاست سے اس کے سیاسی، معاشی، ثقافتی
(اور شاید دفاعی بھی) مراسم روز افزوں ہیں اور ایک دوسرے کے نام نہاد ثقافتی طائفے بھی دونوں
ملکوں میں اکثر دیکھے جاتے ہیں۔ ہم اس دوستی کو نیک شگون قرار دیتے ہیں۔ کیوں نہ اسے کسی نیک کام

کے لیے بھی استعمال کیا جائے۔ ہمیں بوجوہ یہ یقین ہے کہ اگر حکومتِ پاکستان چین کے مسلمانوں کی دینی
تعلیم کے لیے وہاں کی دوست حکومت سے سہولت طلب کرے تو درخواست رد نہ کی جائے گی راقم الحروف
کو وہاں کے مسلمان علاقے سنکیانگ کی صورتِ حال سے تو واقفیت نہیں البتہ وسطی علاقے اور بیجنگ
کا ذاتی مشاہدہ حاصل ہے۔ وہاں مساجد واگذار کی جا چکی ہیں جو نہ صرف عمارتی حسن میں دلکش ہیں بلکہ
اُن سے ملحق مدارس، دارالمطالعے اور دفاتر بھی آراستہ و پیراستہ کیے جاسکتے ہیں لیکن افسوس کہ نمازیوں
کو بھی دین کی ابتدائی معلومات تک حاصل نہیں۔ ایک چینی بھائی نے سورۃ فاتحہ پڑھ کر سنائی تو یہ عاجز
سُن ہو کر رہ گیا۔ رہی سہی کسر جہری نماز میں امام صاحب کی قرأت نے پوری کردی ؎

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلّا کارِ طفلاں تمام خواہد شُد

ہماری اپنی حکومت سے مخلصانہ درخواست ہے کہ فی الحال صرف اسی قدر اجازت طلب کرلی
جائے کہ ہمارے ہاں سے کچھ اساتذہ پاکستان کے خرچ پر وہاں جاکر مساجد میں متعین ہوں اور
بچوں بڑوں کو قرآن مجید پڑھنا سکھائیں۔ یہ بے ضرر آغاز بھی انشاء اللہ العزیز مبارک ثابت ہوگا

مارچ کے آخری عشرے میں پنجاب کی تاحال سب سے بڑی تخریبی کارروائی وسطِ لاہور میں
ہوئی۔ اہلحدیث یوتھ فورس کے جلسے میں عین سٹیج پر خوفناک دھماکہ ایک عالمِ دین سمیت آٹھ بے گناہ
مسلمانوں کے جاں بحق ہونے کا باعث بنا۔ اللہ تعالےٰ انہیں مظلومی کی حادثاتی موت کے بدلے
مرتبۂ شہادت پر فائز فرمائے۔ مرحومین کے لئے اس سے بڑی کامیابی کیا ہوسکتی ہے۔ البتہ اُن
کے لواحقین حکومت اور معاشرے کی توجہ کے مستحق ہیں۔ حکومتِ پنجاب نے برائے نام امداد کا اعلان
کیا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ یہ صرف آغاز ہو ــــــ نیک کچھ سومضروبین بالخصوص علامہ احسان الٰہی
ظہیر صاحب کی صحتِ کاملہ و عاجلہ کے لئے ہم سب دست بدعا ہیں۔ صد شکر کہ علامہ موصوف کے
بارے میں ان سطور کے لکھنے تک تشویشناک اطلاعات امید افزا خبروں میں تبدیل ہوچکی ہیں ــــ
بموں کے دھماکے اور دیگر تخریبی وارداتیں باقی تین صوبوں میں تو کچھ عرصے سے معمول کی بات بن
چکی ہے۔ پنجاب ان کی دسترس سے بچا ہوا تھا مگر اس کو بھی تو نے آخر چرکا لگا کے چھوڑا۔
اس مہلک اور افسوسناک حادثے کی تحقیقات ذمہ داران حکومت شروع کرچکے ہیں اور توقع
رکھنی چاہیئے کہ ضابطے کی کارروائی ڈالنے کی بجائے اس کے محرکات کی چھان بین کا حق ادا کیا جائے گا
اور مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں سرخ فیتہ آڑے نہیں آئے گا۔ لیکن اس طرح کی دوسری
وارداتوں سے اس دھماکے کی نوعیت کا اختلاف بہت خوفناک ہے کہ ہیجان خوش میں ہو تو

سے ہماری نوجوان اسے فرقہ واریت کا رنگ بھی دے سکتے ہیں۔ علمائے کرام اور دینی جماعتوں پر
اس سلسلے میں بھاری ذمہ داری کا بوجھ آن پڑا ہے۔ انہیں اس حقیقت کو لوگوں میں عام کرنا چاہیئے
کہ ہزار اختلافات کے باوجود بحمد اللہ ہمارے دینی حلقے ایسی سفاکی کو حاشیہ خیال میں بھی جگہ نہیں دیتے۔

آخر میں ہم اپنی اس تشکی، تشویش اور اضطراب کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتے۔ جس کا باعث
پاکستان کی حدود میں افغانی طیاروں کی حالیہ کارروائیوں سے ہونے والا عظیم جانی و مالی نقصان
ہی نہیں، ملک کا وقار خاک میں مل جانا اور حمیت قومی کا جنازہ نکل جانا بھی ہے۔ کیا ہماری حکومت
پاکستان کے مسلمانوں کو بے حوصلگی، بزدلی اور بے غیرتی کی تربیت دینے کا فیصلہ کر چکی ہے!
یا پھر دشمنوں سے یہ کہلوانا مطلوب ہے کہ جو حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے۔ کچھ عرصہ پہلے
تک ہمارا موقف یہ تھا کہ ہم اشتعال انگیزی کا مقابلہ تحمل سے کر کے دکھا رہے ہیں۔ اور طرز عمل یہ کہ ہر
حملے کے جواب میں ہم افغان ناظم الامور کو اپنے دفتر خارجہ میں طلب کر کے سرزنش کی جھاڑ پلا دیتے تھے
ان تقریباً بلا ناغہ طلبیوں پر مولانا شاہ احمد نورانی نے برمحل طنز کیا کہ افغان ناظم الامور کو دفتر خارجہ ہی میں
ایک کمرہ کیوں نہیں دے دیا جاتا کہ روز روز کی آمد و رفت سے جان چھوٹے۔ تفنن برطرف
وہ ایک حد تک سمجھ میں آنے والا انداز تھا۔ لیکن کچھ ہی دنوں پہلے وزیر اعظم پاکستان کے اس واضح اور
دوٹوک اعلان نے کہ آج کے بعد کوئی دراندازی طیارہ صحیح سلامت واپس نہ جا سکے گا، معاملے کی
نوعیت کو یکسر تبدیل کر دیا۔ وہ دن اور آج کا دن، افغان طیاروں کی ہمارے علاقوں پر پرواز
اور بمباری پہلے سے بھی دو چند ہو گئی ہے۔ اور ہم ہیں کہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔ کی تصویر
بنے بیٹھے ہیں۔ ۲۳ مارچ کو تو حد ہو گئی۔ دن کے سوا بارہ بجے جب ہمارے ہمہ مقتدر صدر مملکت
وزیر اعظم، افواج پاکستان کے چاروں سالار اور جملہ ارباب حل و عقد اپنے معزز مہمانوں اور شائقین
کے جلو میں بمقام ریس کورس گراؤنڈ راولپنڈی ایف ۱۶ کے کرتب دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے عین
اسی وقت تری مینگل پر دس افغان طیاروں سے آگ برس رہی تھی۔ اس روز دو حملوں میں ان
طیاروں نے عددی اعتبار سے جو جانی نقصان کیا اس کی نظیر موجود نہیں۔ ہم بصد ادب پوچھتے ہیں
کہ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟ کاش ہمارا وہ قیمتی میراج لڑاکا بمبار طیارہ اور
اس سے بڑھ کر قیمتی ہوا باز سلامی کی فضول رسم نبھاتے ہوئے ضائع ہونے کی بجائے تری مینگل
میں دشمنوں سے مقابلے میں کام آتا۔ اور کاش کہ ہمارے ایف ۱۶ یہ کرتب، یہ پلٹنا جھپٹنا اور یہ

اگر آپ کسی اجتماعیت کو تباہ کرنا چاہئیں

تو

- اس کے اجتماعات میں شریک ہونے سے گریز کیجیے۔ مختلف مصروفیات کی آڑلے کر شرکت سے بچنے کے بہانے تراشیے۔
- اگر کسی اجتماع میں شرکت کرنی ہی پڑ جائے تو دیر سے پہنچنے کی کوشش کیجیے۔
- اگر آپ کو کسی وجہ سے درس اور اجتماع کی بروقت اطلاع نہ دی جا سکے تو ذمہ دار حضرات کو سخت سُست کہیے، لاپرواہ اور غیر ذمہ دار ٹھہرائیے۔
- اجتماعات کے اندر ذمہ دار افراد پر کھلے عام کڑی تنقید اور نکتہ چینی کیجیے، انتظامات پر ناپسندیدگی کا اظہار کرنا نہ بھولیے۔
- بھول کر بھی کسی قسم کی ذمہ داری قبول نہ کیجیے، کسی قسم کا کوئی کام ہرگز نہ کیجیے۔ ہاں کام کرنے والوں پر تنقید ضرور کیجیے۔
- اگر آپ سے کسی مسئلہ پر رائے لی جائے تو ہمیشہ اپنا نقطہ نظر پیش کرنے سے گریز کیجیے اور بعد میں لوگوں سے یہ ضرور کہیے کہ اس کام کو یوں ہونا چاہیے تھا۔ یوں نہیں۔
- اول تو مالی اعانت کبھی نہ کیجیے اور اگر مجبوراً کرنی ہی پڑ جائے تو کم سے کم دیجیے۔ مگر سہولتیں اور آسانیاں زیادہ سے زیادہ حاصل کیجیے۔
- دُوسرے کی ذات پر تنقید کا سُنہری موقع کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیجیے، ہمیشہ دُوسروں پر کیچڑ اُچھالنے کی تاک میں لگے رہیے۔
- ذاتی مفاد کو ہمیشہ اجتماعی مفاد پر ترجیح دیجیے۔

ان نہایت ہی سادہ اور زرّیں اصُولوں پر عمل کر دیکھئے، انشاءاللہ آپ کم سے کم وقت میں کسی بھی منظم تحریک کے تار و پود نہایت آسانی سے بکھیر کر رکھ دیں گے۔!

اور

اگر آپ کسی اجتماعیت کے ساتھ مخلص ہیں۔ اس کو روز بروز ترقی کرتے اور منظم ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں تو للہ ان اصُولوں میں سے کسی ایک کو بھی اپنے پاس نہ پھٹکنے دیجیے۔

(بشکریہ حبل اللہ کراچی)

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن کا سلسلہ

الہدیٰ

درس نمبر ۱۱

نشست نمبر ۴۰

مباحثِ عملِ صالح

بندۂ مومن کی شخصیت کے خدوخال

(سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں)

(۴)

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ - اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًا ۙ یُّضٰعَفْ لَہُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَیَخْلُدْ فِیْہٖ مُھَانًا ۖ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّہٗ یَتُوْبُ اِلَی اللّٰہِ مَتَابًا ۝ (سورۃ الفرقان ۶۸ تا ۷۱)

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ ۝

"اور وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، اور نہ ہی قتل کرتے ہیں کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے - مگر حق کے ساتھ، اور نہ ہی زنا کرتے ہیں - اور جو کوئی یہ کام کرے گا وہ اس کی سزا پا کر رہے گا۔

بڑھایا جائے گا اس کے لیے عذاب قیامت کے دن اور رہے گا وہ اس
میں ہمیشہ ہمیش ذلیل و خوار ہو کر ۔ سوائے اس کے جو تائب ہوا اور ایمان
لایا اور اس نے اچھے عمل کئے تو یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی برائیوں کو اللہ
بھلائیوں اور نیکیوں سے بدل دے گا اور اللہ تو ہے ہی مغفرت فرمانے
والا، رحم فرمانے والا، اور جو توبہ کرتا ہے اور عمل اچھے کرتا ہے تو وہی
ہے جو توبہ کرتا ہے اللہ کی جناب میں جیسا کہ توبہ کرنے کا حق ہے ۔"

محترم حاضرین اور معزز ناظرین ۔ ابھی آپ نے سورۃ الفرقان کے درمیانی حصے کی
چار آیات کی تلاوت سماعت فرمائی اور ان کا ترجمہ بھی سنا ۔ ان میں سے پہلی دو آیات کے
بارے میں گفتگو ہماری گزشتہ نشست میں ہو چکی ہے ۔ آج بقیہ دو آیات کا بارے میں
ہمیں گفتگو کرنی ہے ۔ لیکن چونکہ یہ دو آیات پہلی دو آیات سے مربوط ہیں، لہذا ان
مضمون بھی ذہن میں تازہ کر لینا ضروری ہے ۔ آپ کو یاد ہو گا کہ پہلی دو آیات میں
عباد الرحمٰن کے اوصاف کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے ہماری رہنمائی فرمائی کہ اکبر الکبائر یعنی
سب سے بڑے کبیرہ گناہ کونسے ہیں ! چنانچہ ایسے تین جرائم کا تعین کیا گیا جو سب سے بڑے ہیں
ان میں اولین شرک ہے ۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا ۔ اللہ کے ساتھ کسی ا
کو بھی پکارنا ۔ اس کے بعد دوسرا کبیرہ گناہ قتل ناحق ہے ۔ بغیر کسی قانونی جواز کے بغیر
کسی سبب کے کسی انسان کی جان لے لینا ۔ اور تیسرا کبیرہ گناہ زنا ہے ۔

میں پچھلی نشست میں عرض کر چکا ہوں کہ اصل میں شرک سے انسان کا نقطہ نظر
بنیادی طور پر کج ہو جاتا ہے ۔ پھر چاہے انفرادی اخلاق کا معاملہ ہو یا اجتماعی نظام کا
معاملہ، جو تعمیر بھی شرک کی بنیاد پر ہو گی وہ کج ہو گی ۔

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج

اور جس معاشرے میں قتلِ ناحق کا رواج ہو جائے، اس میں گویا تمدن کی جڑ کٹ
جاتی ہے ۔ انسان جو ایک متمدن حیوان ہے تو اس تمدن کی بنیاد یہی ہے کہ لوگ ایک
دوسرے کی جان و مال اور آبرو کا احترام کریں ۔ اور زنا جس کا تعلق انسان کی آبرو سے
ہے، یہ وہ فعل ہے جو انسانی معاشرہ کو ایک متعفن سنڈاس بنا کر رکھ دیتا ہے ۔ ا
میں سے خیر بھلائی، باہمی اعتماد اور مودت و الفت، یہ تمام چیزیں ختم ہو کر رہ جاتی ہیں ۔

فرمایا کہ جو کوئی ان جرائم کا مرتکب ہوگا، اسے سزا مل کر رہے گی: یُلْقَ اَثَامًا اور سزا
بھی وہ جو بڑھتی رہے گی، جس میں اضافہ ہوتا رہے گا اور پھر خلود ہے یعنی ہمیشہ ہمیش
کے لئے سزا۔ تو یہ نقشہ بعض اعتبارات سے خاصا مایوس پیدا کرنے والا ہے کہ اگر کسی شخص
سے ان میں سے کسی جرم کا ارتکاب ہوا ہو تو گویا یہ صورتِ حال اس کے لئے بڑی مایوس
کن ہوگی۔ مایوسی کے اس اندھیرے میں اگلی دو آیات اُمید کی ایک کرن بن کر نمودار
ہوتی ہیں۔

فرمایا: اِلَّا مَنْ تَابَ۔ ہاں جو توبہ کرے وہ بچ جائے گا۔ معلوم ہوا کہ گناہ
کے اثرات اشیاء کے مادی اور طبعی اثرات کی طرح نہیں ہیں کہ ان کا ظہور لازماً ہو۔
جیسے اگر آپ نے آگ میں انگلی دی تو وہ لازماً جل کر رہے گی۔ اب اگر آپ توبہ کریں
تو توبہ کرنے سے آگ کا انگلی پر جو اثر ہوا ہے وہ زائل نہیں ہوگا، وہ جل رہے گی۔ اس
لئے کہ یہ ایک طبعی اثر (PHYSICAL EFFECT) ہے۔ لیکن اخلاقی جرائم کا یہ
معاملہ نہیں ہے۔ اگر کوئی گناہ ہوا ہو، کوئی خطا ہوئی ہو تو لازم نہیں ہے کہ اس کا اثر ضرور
ظاہر ہوگا بلکہ اس سے بچاؤ کا ایک راستہ ہے اور وہ درحقیقت توبہ کا راستہ ہے۔ توبہ
کی عظمت اور توبہ کی حقیقت کے بیان میں قرآن کا یہ مقام نہایت اہم ہے۔ بلکہ اس اعتبار
سے اس کو قرآن مجید کی چوٹی قرار دینا غلط نہ ہوگا۔

پہلے اصولی طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ توبہ کی اہمیت کیا ہے! انفرادی اعتبار سے بھی یہ
بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ اگر انسان اس مغالطہ میں مبتلا ہو کہ جو خطائیں
مجھ سے ہو چکی ہے، اس کی سزا تو لازماً مجھے بھگتنی پڑے گی تو آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ
انسان پر مایوسی مسلط ہو جائے گی اور اصلاح کے لئے جو ہمت اور ارادہ درکار ہے وہ
اس میں باقی نہیں رہے گا۔

چنانچہ ایک بہت ہی دلچسپ واقعہ کتبِ احادیث میں ملتا ہے جو جناب نبی اکرم صلی
اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو سنایا۔ اس حدیث کے راوی حضرت سعید خدری رضی اللہ عنہ،
ہیں۔ اور یہ متفق علیہ روایت ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں،
ان میں سے کسی اُمت کے ایک فرد کا یہ واقعہ ہے کہ وہ بڑا سفاک قاتل تھا اس نے
ننانوے انسانوں کو قتل کیا...

ایک بہت بڑے عالم کے پاس گیا - اور اس نے کہا میں ننانوے انسانوں کو قتل کر چکا
ہوں - کیا اب بھی میری مغفرت کا کوئی راستہ کھلا ہے؟ - اُس عالم نے کہا کہ نہیں -
تمہاری مغفرت کی اب کوئی سبیل نہیں - حضورؐ نے فرمایا کہ اس شخص نے اُس عالم
بھی قتل کر دیا کہ میں ننانوے قتل تو پہلے ہی کر چکا ہوں، تو سو کیوں نہ پورے کر لوں اب
اس نے ایک اور بڑے عالم کی طرف رجوع کیا - اس نے بتایا کہ نہیں - اللہ کی مغفرت
و رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا - اگر تم اب بھی صدق دل سے توبہ
تو اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا - پھر اس عالم نے رہنمائی بھی کی کہ فلاں جگہ
چلے جاؤ وہاں تمہیں بہتر ماحول ملے گا - تم اب تک جس ماحول میں رہے ہو اُس میں شاید
تم اپنی اصلاح نہ کر سکو اگر تم اسی میں رہے تو وہ شخص اس ارادہ سے اُس مقام کی طرف
چل پڑا، جس کی رہنمائی اس عالم نے کی تھی کہ درمیان میں اس کی موت آ گئی حضور
صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جن فرشتوں نے اس کی روح قبض کی تھی، ان میں ایک
اختلاف رونما ہوا - وہ یہ کہ اس کی روح کو عذاب والے فرشتے لے کر جائیں یا جنت
والے فرشتے لے کر جائیں! اللہ کی طرف سے حکم آیا کہ راستہ ناپ لو - وہ راستہ جس طرف
وہ اصلاح احوال کی غرض سے قیام کے ارادہ سے چلا تھا - اگر اس راستہ سے کم رہ گیا
ہے جو وہ طے کر چکا ہے تو اس کی روح کو جنت کے فرشتے لے کر جائیں بصورت دیگر
کی روح کو عذاب والے فرشتے لے کر جائیں - راستہ ناپا گیا تو جس مقام کے ارادہ سے
شخص چلا تھا وہ راستہ کم پایا گیا لہٰذا جنت والے فرشتے اس کی روح کو لے کر برزخ کو
روانہ ہوئے" - تو یہ ہے توبہ کا معاملہ انفرادی اصلاح کے ضمن میں کہ جب بھی انسان
جائے، جب بھی ہوش میں آ جائے - اگر سچے دل سے توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ نے مغفرت
کی اُمید دلائی ہے - ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں کہ خواہ اس کے گناہوں کا ڈھیر
کوہ اُحد جتنا بلند ہو تب بھی سچی توبہ کے عوض اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دے گا - معاف
یہ بات تو حدیث میں آئی ہے - توبہ اور مغفرت کے ضمن میں قرآن مجید کی سب سے زیادہ
افزا آیت غالباً سورۃ زمر کی یہ آیت ہے کہ :

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ	اے نبی فرما دیجیے کہ اے میرے وہ بندو
اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ	جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝

"اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، اللہ تمام گناہ بخشنے کا اختیار رکھتا ہے اور وہ ہے ہی غفور و رحیم، بخشنے والا، رحم فرمانے والا۔"

دنیا کے دوسرے مذاہب نے اپنے فلسفۂ اخلاق میں توبہ کے بارے میں بہت ٹھوکریں کھائی ہیں جس کے باعث ان کا نقطۂ نظر بہت کج ہو گیا ہے۔ مثلاً۔ ایک عقیدہ یہ ہے کہ حضرتِ آدمؑ سے جو خطا ہو گئی تھی جب کہ انہیں آزمائشی طور پر جنت میں رکھا گیا تھا اور یک خاص درخت کا پھل کھانے سے منع کر دیا گیا تھا مگر شیطان کے ورغلانے سے انہوں نے اس درخت کے پھل کو کھا لیا تھا، تو یہ گناہ گویا اب نسلِ آدم میں منتقل ہو رہا ہے۔ نوعِ انسانی کا جو بچہ پیدا ہو رہا ہے وہ پیدائشی طور پر گناہ گار ہوتا ہے، وہ اپنے جدِ امجد کے گناہ کی گٹھڑی لے کر اس دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جہاں یہ غلط عقیدہ ہو گا وہاں اس پر مزید غلطیاں ہونگیں۔ چنانچہ پھر "کفارہ" کا عقیدہ ایجاد کیا گیا۔ یہ بنائے فاسد علی الفاسد ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ حضرتِ آدم علیہ السلام سے غلطی ضرور ہوئی تھی۔ لیکن انہوں نے توبہ کی:

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ (سُوْرَۃُ الْاَعْرَاف)

"اے رب! ہمارے، ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اب اگر تو ہم کو معاف نہیں فرمائے گا اور ہم پر رحم نہیں فرمائے گا تو لازماً ہم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔"

سُورۂ بقرہ میں فرمایا:

فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْہِ ؕ (سُورۂ بقرہ)

"آدم نے کچھ کلمات اپنے رب سے تلقی کئے یعنی حاصل کئے اور ان کلمات کے ذریعے اللہ سے جب توبہ کی تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔"

مزید یہ ہے کہ توبہ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی کتب احادیث

میں موجود ہے:

اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ۔ "جو کوئی کسی گناہ سے توبہ کر چکا اس کے لئے کوئی گناہ ہے ہی نہیں"

گویا وہ ایسے ہے جیسے اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ لہٰذا اب اس کا کوئی سوال نہیں ہے کہ نسلِ آدمؑ کا ہر بچہ پیدائشی طور پر گناہ گار ہو۔ معاذ اللہ ـــ قرآن مجید کا تو فیصلہ یہ ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا "اللہ کی وہ فطرت جس پر اُس نے انسان کو پیدا کیا ہے"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کل مولود یولد علی الفطرہ ....الخ

یعنی نسلِ آدم کا ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے وہ تو اس کے والدین ہیں جو اُسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ پس یہ بڑا عظیم فرق و تفاوت ہے قرآن مجید کے فلسفہ میں اور بعض دوسرے مذاہب کے فلسفہ میں۔

اب ہمیں اس بات کو سمجھنا ہے کہ توبہ کی شرائط کیا ہیں! یہ ہے اصل معاملہ صرف زبان سے کہہ دینے سے توبہ نہیں ہو جائے گی۔ توبہ کی چند شرائط ہیں، اس کے کچھ لوازم ہیں۔ اگر وہ شرائط پوری نہ ہوں تو چاہے آدمی توبہ کی تسبیح پر تسبیح پڑھتا رہے اور صرف زبانی طور پر استغفار کا کتنا ہی ورد کرتا رہے اسے توبہ نہیں کہا جائے گا۔ چنانچہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جو بہت بڑے محدث گزرے ہیں، ان کی حدیث کی ایک مشہور کتاب ہے ریاض الصالحین۔ اس میں انہوں نے توبہ کے باب میں علمائے اُمت کا اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ اگر توبہ کسی ایسے گناہ کے ضمن میں ہو کہ جو حقوق اللہ سے متعلق ہے تو اس کے صحیح ہونے کی تین شرطیں ہیں۔ لیکن اگر کوئی گناہ حقوق العباد کے ضمن کا ہے تو ایک اضافی شرط مزید شامل ہو جائے گی پہلی تین شرائط حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں مشترک ہیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کے دل میں سچی اور حقیقی ندامت ہو کہ میں جو کچھ کرتا رہا ہوں، غلط کرتا رہا ہوں۔ اس میں واقعی پشیمان ہو۔ اس حقیقت کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے اقبال نے اپنے نوعمری کے دور کے اس شعر میں جسے داغ دھلوی

نے بہت پسند کیا تھا اور داد دی تھی کہ ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو اللہ کو بندے کی یہ پشیمانی اور ندامت بہت محبوب ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ عزمِ مصمم ہو کہ اب یہ کام دوبارہ نہیں کروں گا۔ تیسری شرط ہے کہ فی الواقع عملاً اُس گناہ کو ترک کر دے اور عملِ صالح کی روش اختیار کرے۔ یہ تین شرطیں وہ ہیں جو حقوق اللہ کے ضمن کے گناہوں سے متعلق ہیں ۔۔ اضافی چوتھی شرط حقوق العباد کے معاملے میں ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی انسان کا حق مارا ہے تو اس کی تلافی کرے۔ کسی کا مال ہڑپ کیا ہے تو وہ مال واپس کرے یا اُس سے معافی طلب کرے۔ کسی کی غیبت کی ہے تو اس کے پاس جا کر معافی چاہے۔ کسی پر ظلم کیا ہے تو اس کے لئے مظلوم سے عفو اور درگزر حاصل کرے۔ اس لئے کہ یہ جو حقوق العباد ہیں انہیں اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا۔ اگر اس دنیا میں ان بندوں سے جن کی حق تلفی کی گئی ہے معافی حاصل نہیں کی جائے گی تو آخرت میں نیکیوں اور گناہوں کا لین دین ہوگا۔ یعنی ظلم اور زیادتی کرنے والے شخص کی نیکیاں اُس شخص کو دے دی جائیں گی، جس کے حق پر اس دنیا میں دست درازی کی گئی تھی یا جس پر ظلم کیا گیا تھا۔ اگر زیادتی کرنے والے کی نیکیوں کا سرمایہ ختم ہو جائے گا تو پھر مظلوم کی بدیاں ظالم کے وزنِ اعمال کے پلڑے میں ڈال دی جائیں گی۔

چنانچہ اس آیت پر غور کیجئے فرمایا: اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا۔ یہاں صرف ایک لفظ تَابَ، نہیں آیا۔ بلکہ اس کے ساتھ ایمان اور عمل صالح کا ذکر بھی ہے ۔۔ توبہ کے معنی ہیں لوٹنا، پلٹنا، رجوع کرنا۔ تو فرمایا: مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ۔ "جو توبہ کرے اور ایمان لائے"۔ اس کے دو مفہوم ہوں گے۔ ایک یہ کہ اگر وہ پہلے کافر تھا، اب ایمان لا رہا ہے تو وہ بھی کفر سے پلٹنے اور ایمان لانے کے اعتبار سے ان الفاظِ مبارکہ کے ذیل میں آ جائے گا ۔۔ دوسرا یہ کہ اگر وہ مسلمان تھا اور مسلمان ہوتے ہوئے بھی گناہ کر رہا تھا تو درحقیقت اس گناہ کی وجہ سے جو قلبی یقین والا ایمان ہے وہ زائل ہو گیا تھا۔ اب جب وہ توبہ کر رہا ہے تو گویا تجدیدِ ایمان کر رہا ہے۔ اس کے دل میں از سرِ نو ایمان داخل ہو رہا ہے۔ جیسا کہ ایک

حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے تو ایما
اس کے دل سے نکل کر اس کے سر پر منڈلاتا ہے پرندے کے مانند۔ اب اگر وہ توبہ
کرتا ہے تو ایمان اُس کے دل میں لوٹ آتا ہے"۔ لہٰذا جب ایمان دل میں ہو تصد
قلبی والا ایمان، یقین والا ایمان۔ تو اس کے اثرات لازماً عمل پر مترتب ہوں گے
اور وہ درست ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ توبہ کے فوراً بعد ایمان اور عمل صال
کا ذکر کیا گیا۔ پھر اس توبہ، تجدید ایمان اور اعمال صالح کے مرتبہ اور مقام کا ذکر
ان الفاظ مبارکہ فرمایا: فَأُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ "پس
ایسے لوگوں کے نامہ اعمال میں سے اللہ ان کی بُرائیوں کو محو فرما کر ان کی جگہ نیکیوں
اندراج فرما دے گا"۔ یہ ہے اللہ کی نگاہ میں توبہ کی عظمت۔ اس آیت کا اختتام
ہوتا ہے ان الفاظ مبارکہ پر: وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ "اور اللہ تو ہے
ہی بخشنے والا، رحم فرمانے والا"۔ اس کی ذات والا صفات میں مغفرت و رحمت ک
شانیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ لہٰذا ایک مومن کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ گنا
کی معافی کے لئے اس کی رحمت و مغفرت کے دروازے لوگوں کے لئے ہر وقت کھ
ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اس کی جناب میں پورے لوازم و شرائط کے ساتھ توبہ کر
اگلی آیت میں اس بات کو پھر دہرایا: وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا۔ عمل صا
توبہ کی شرط لازم ہے۔ انسان توبہ توبہ کہتا رہے اور عمل وہی رہے جو پہلے تھا تو یہ تو
نہیں ہے۔ یہ تو اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ جو شخص توبہ کرے اور عمل درست
کرے تو وہ ہے کہ جو اللہ کی جناب میں توبہ کرتا ہے جیسے کہ توبہ کرنے کا حق ہے۔ ج
فرمایا: وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهٗ يَتُوْبُ إِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۝

تو آج ہم نے قرآن مجید اور دین اسلام کے فلسفہ و حکمت کی ایک اہم بات
پر یعنی توبہ کی عظمت، اس کی اہمیت اور حقیقت پر غور کیا۔ اس ضمن میں اگر کو
سوال ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال وجواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! آپ نے کچھ گناہ کبیرہ ایسے بتائے جن کی معافی تو

ے ممکن ہے۔ کیا کسی انسان سے ایسے گناہ بھی سرزد ہو سکتے ہیں جن کی توبہ سے
معافی ممکن نہ ہو؟

جواب: جی نہیں۔ ایسا کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہاں جو گناہ بیان کئے
گئے تھے، وہ تو سب سے بڑے گناہ ہیں۔ لہٰذا ان سے بڑے کسی اور گناہ کا تصور ہی
نہیں ہو سکتا۔ یعنی شرک اور قتل ناحق اور زنا۔ اگر ان کی بھی معافی ہے بشرطیکہ
انسان حقیقی و واقعی توبہ کرے تو معلوم ہوا کہ دوسرے تمام گناہوں کو بھی اللہ تعالیٰ
توبہ کے نتیجے میں بخش دے گا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ الغفور الرحیم ہے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! ہم جو روزانہ صغیرہ گناہ کرتے ہیں، جیسے جھوٹ بولتے
ہیں، غیبت کرتے ہیں اور بہت سے گناہ کرتے رہتے ہیں تو اُن کی معافی کی صورت
کے متعلق کچھ بتائیے؟

جواب: یہ غلط فہمی نہ ہو کہ جھوٹ اور غیبت صغیرہ گناہ ہیں۔ اس وقت اس
گفتگو کا موقع نہیں ہے کہ میں کبیرہ گناہوں کی فہرست بیان کروں۔ البتہ صغیرہ گناہوں
کے متعلق اصولاً ایک بات جان لیجئے کہ انسان جب نیک اعمال کرتا ہے تو صغائر
خود بخود دُھلتے چلے جاتے ہیں۔ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ:

إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ط — بلاشبہ نیکیاں بُرائیوں کو دُور کر دیتی ہیں"

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ انسان جب وضو کرتا ہے تو وہ صغیرہ گناہ جو ہاتھ
سے سرزد ہوئے ہیں وہ دُھل جاتے ہیں۔ اسی طریقے سے وہ اپنے جسم کے جس عضو
کو بھی وضو میں دھوتا ہے تو جو گناہ بھی اُس عضو سے متعلق ہیں وہ زائل ہو جائیں گے۔
تو معلوم ہوا کہ صغیرہ گناہ انسان کے نیک اعمال کے طفیل بغیر توبہ کے بھی معاف ہو
جاتے ہیں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! ایک شخص اُس وقت کسی گناہ سے توبہ کرتا ہے جب
اس میں گناہ کرنے کی سکت نہیں رہتی یا جب اُسے موت یقینی نظر آنے لگتی ہے تو
ایسے شخص کی توبہ کے بارے میں کچھ فرمائیں؟

جواب: اس ضمن میں جو الفاظ آئے ہیں وہ یہ ہیں: "مَا لَمْ يُغَرْغِرْ" جب

تک موت کے آثار شروع نہیں ہوجاتے اس وقت تک توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ یعنی انسان کو ابھی زندگی کی امید ہو اور وہ گناہوں سے تائب ہو رہا ہو تو اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت ہے اور یہ اسکی شان کریمی وغفاری ہے کہ اس وقت تک بھی انسان کے لیئے توبہ کی قبولیت کا امکان باقی رہتا ہے۔ البتہ آپ نے سکت کے متعلق جو بات پہلے کہی ہے تو اس کے متعلق اصولی طور پر یہ بات جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کس انسان میں اب سکت رہی ہے یا نہیں رہی ہے۔ بہرحال مولانا حالی مرحوم کا ایک بڑا پیارا شعر ہے جو میں آپ کو سنا دیتا ہوں جو اسی مضمون کو ادا کر رہا ہے کہ ؎

رُکا ہاتھ جب پارسا ہوگئے ہم نہیں پارسائی یہ ہے نارسائی

تو یہ نارسائی والی جو پارسائی ہے، اس کا اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی اجر نہیں ہے۔ اگر سکت نہ ہونے کی وجہ سے کوئی انسان گناہوں سے تائب ہوا ہے تو یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ لیکن سکت ہونے نہ ہونے کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے

حضرات! آج توبہ کے مضمون پر ہم نے کافی باتیں سمجھی ہیں۔ قرآن مجید کی آیات کی روشنی میں بھی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کی روشنی میں بھی ہمارا یہ سارا سننا سنانا بیکار ہوگا اگر ہم اسے محض علمی طور پر اپنی معلومات کا ایک ذریعہ بنالیں۔ آج ہمیں یہ عہد کرکے یہاں سے اٹھنا چاہیئے کہ جو جو بھی ہمارے اندر خامیاں ہیں، جس جس پہلو سے بھی ہم اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اوّلین فرصت میں صدق دل کے ساتھ اُس سے توبہ کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخردعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

اسلامی انقلاب: مراحل، مدارج اور لوازم (آخری قسط)

انقلابِ محمدیؐ کا بین الاقوامی مرحلہ

ڈاکٹر اسرار احمد

(ترتیب و تسوید: شیخ جمیل الرحمٰن)

دیگر سلاطین کے نام حضورؐ کے نامہ ہائے مبارک

میں نے اُن سلاطین و سرداران کے ناموں میں سے چند اہم نام آپ حضرات کو سنائے تھے جن کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نامہ ہائے مبارک ارسال کئے تھے، ان میں سے قیصر اور کسریٰ کا ردِّ عمل میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ اب چند دیگر سلاطین کا ردِّ عمل آپ کے گوش گذار کرتا ہوں:

عزیزِ مصر (مقوقس): اُس وقت مصر میں مقوقس نامی شخص کی حکومت تھی جو قیصرِ روم کے زیرِ اثر تھا۔ موجودہ اسکندریہ اس کا دار الحکومت تھا۔ قیصر کی طرح مقوقس بھی عیسائی تھا اور صاحبِ علم شخص تھا۔ وہ ایمان تو نہیں لایا لیکن اُس نے حضورؐ کے قاصد حضرت حاطبؓ کا اعزاز و اکرام کیا۔ اور اُس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ مبارک کے جواب میں عربی میں یہ خط لکھا۔

"لمحمد بن عبد اللہ من المقوقس عظیم القبط سلامٌ علیک اما بعد فقد قرأت کتابک وفہمت ما ذکرت فیہ وما تدعو الیہ وقد علمت ان نبیّا بقی وکنت اظن ان یخرج من الشّام وقد اکرمت رسولک وبعثت الیک بجاریتین لھما مکان من القبط عظیم وکسوۃ واھدیت الیک بغلۃ لترکبھا والسلام علیک۔"

(ترجمہ) "محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام مقوقس رئیس قبط کی طرف سے۔ سلام علیک کے بعد میں نے آپ کا خط پڑھا اور اس کا مضمون اور مطلب سمجھا، مجھ کو اس قدر معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، لیکن میں سمجھتا تھا کہ وہ شام میں ظہور کریں گے۔ میں نے آپؐ کے قاصد کی عزت کی۔ اور دو لڑکیاں بھیجتا ہوں، جن کی قبطیوں میں (مصر کی قوم) بہت عزت کی جاتی ہے،

اور میں آپ کے لیے کپڑا اور سواری کے لیے ایک خچر (بطور ہدیہ) بھیجتا ہوں والسلام"
مقوقش نے جو دو لڑکیاں بھیجی تھیں، وہ کنیزیں یا لونڈیاں نہیں تھیں بلکہ شاہی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ دونوں اثنائے سفر ہی میں حضرت حاطبؓ کی تبلیغ و تعلیم سے ایمان لے آئی تھیں۔ ان میں ایک حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں شامل ہوئی ہیں۔ دوسری جن کا نام سیرینؓ تھا حضرت حسانؓ کے حبالہ عقد میں آئیں۔ یہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں۔ خچر کا نام دُلدل تھا۔ جنگ حنین میں حضورؐ اسی پر سوار تھے۔

نجاشی شاہِ حبشہ: علامہ شبلیؒ نے اپنی تحقیق کے مطابق نجاشی کے متعلق جو لکھا ہے، وہ میں ان کی کتاب کے حوالے سے آپ لوگوں کو سنا دیتا ہوں۔ میں اپنے طور پر اس ضمن میں کوئی تحقیق نہیں کرسکا ہوں۔ علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:

> "نجاشی بادشاہ حبش کو آپؐ نے دعوتِ اسلام کا جو خط بھیجا، اس کے جواب میں اس نے عریضہ بھیجا کہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ خدا کے سچے پیغمبر ہیں"۔ حضرت جعفر طیارؓ جو ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے، یہیں موجود تھے۔ نجاشی نے ان کے ہاتھ پر بیعت اسلام کرلی۔ ابن اسحٰق نے روایت کی ہے کہ نجاشی نے اپنے بیٹے کو ساٹھ مصاحبوں کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں عرض نیاز کے لیے بھیجا، لیکن جہاز ڈوب گیا اور یہ سفارت ہلاک ہوگئی۔"

علامہ شبلیؒ نے یہ روایت طبری کے حوالے سے لکھی ہے۔ آگے علامہؒ لکھتے ہیں:

> "عام ارباب سیر لکھتے ہیں کہ نجاشی نے ۹ھ میں وفات پائی۔ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف رکھتے تھے اور یہ خبر سن کر آپؐ نے غائبانہ اس کے جنازے کی نماز پڑھائی لیکن یہ غلط ہے۔ صحیح مسلم میں تصریح ہے کہ جس نجاشی کی نمازِ جنازہ آپؐ نے پڑھی وہ یہ نہ تھا۔"

ان تین عیسائی بادشاہوں کے طرزِ عمل کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ بات واضح ہوجائے کہ انہوں نے نہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصدوں کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی اور نہ ہی حضورؐ کے نامہ گرامی کی کوئی توہین کی بلکہ ہرقل قیصر روم کے رویّہ سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اس کی پوری مملکت اجتماعی طور پر اسلام کی دعوت قبول کرلے لیکن اس کوشش میں وہ ناکام ہوگیا اور اپنے اقتدار کے تحفظ کی خاطر دولتِ ایمان سے محروم رہ گیا۔

کسریٰ ایران: ایران میں اس وقت خسرو پرویز برسرِ سلطنت تھا اور پچھلے شہنشاہوں کی

درج "کسریٰ" کے لقب سے ملقب تھا۔ اس کا طرزِ عمل اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ مجوسی یعنی آتش پرست تھا اور وحی، نبوت اور رسالت کے بارے میں قطعی لاعلم تھا۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک پڑھ کر نہایت برہم ہوگیا اور اس نے نہایت تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا۔ اس کے ردِ عمل کو قدرے تفصیل سے بیان کرنے سے قبل میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک سن لیں جو علامہ شبلی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے :

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم من محمد رسول اللہ الی کسریٰ عظیم فارس سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ وآمن باللہ ورسولہ واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وانی رسول اللہ الی الناس کافۃ لینذر من کان حیاً اسلم تسلم فان ابیت فعلیک اثم المجوس"

"خدائے رحمٰن و رحیم کے نام سے، محمد پیغمبرِ خدا کی طرف سے کسریٰ رئیس فارس کے نام سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت کا پیرو ہو، اور خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لائے اور گواہی دے کہ خدا صرف ایک خدا ہے اور یہ کہ خدا نے مجھے تمام دنیا کا پیغمبر مقرر کر کے بھیجا ہے تاکہ وہ ہر زندہ شخص کو خدا کا خوف دلائے۔ تو اسلام قبول کر تو سلامت رہے گا ورنہ مجوسیوں کا وبال (بھی) تیری گردن پر ہوگا۔"

خسرو پرویز کا غرور اور گستاخی : بادشاہت کا نشہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ عام طور پر ہر بادشاہ مغرور ہو ہی جاتا ہے لیکن خسرو پرویز بہت زیادہ مغرور تھا۔ اس کے دور میں دربار کو جو عظمت و شوکت اور جلال حاصل ہوا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اس کے نام حضورؐ کا نامہ مبارک لے کر حضرت عبداللہ بن حذافہؓ گئے تھے۔ عجم کا طریقہ یہ تھا کہ سلاطین کو جو خطوط لکھے جاتے تھے ان میں بادشاہ کا نام پہلے ہوتا تھا اور مکتوب نگار کا بعد میں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ مبارک کی ترتیب یہ تھی کہ پہلے بسم اللہ پھر خود حضورؐ کا اسم گرامی تھا اور پھر کسریٰ کا نام تھا۔ یہ دیکھ کر کسریٰ آگ بگولہ ہوگیا۔ اور اس نے غیظ و غضب سے مغلوب ہو کر نہایت گستاخانہ رویہ اختیار کیا۔ نقل کفر کفر نہ باشد۔ اس نے حضرت عبداللہ سے کہا کہ "اگر تم قاصد نہ ہوتے تو میں تمہیں قتل کرا دیتا، تمہارے صاحب کی یہ جرأت کہ میرے غلام ہوتے ہوئے میرے نام سے پہلے اپنا نام لکھا۔ ایسا گستاخ شخص! میں بھی اس کی گرفتاری کا فرمان جاری کرتا ہوں اور اسے بلوا کر اپنے دربار میں اپنے ہاتھ سے اس کی گردن اڑا دوں گا۔" ان گستاخانہ کلمات کے ساتھ اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا

نامہ مبارک چاک کر ڈالا۔

نبی اکرمؐ کی پیشینگوئی: بعد میں جب حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس گستاخی کی خبر پہنچی کہ کسریٰ نے آپؐ کا نامہ مبارک چاک کر دیا تو آپؐ نے بطور پیشین گوئی فرمایا کہ "اس نے میرا خط نہیں پھاڑا، اپنی سلطنت کے پرزے اڑا دیئے"۔ یہ تو ابھی عالم غیب کی بات تھی۔ آئندہ کے واقعات وحالات میں سے جتنا اور جس قدر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اُن سے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مطلع فرما دیتا ہے۔ لیکن اُس وقت عالم واقعہ میں تو کیفیت یہ تھی کہ سلطنت کسریٰ موجود ہے اس کی لاکھوں کی فوج ہے۔ اس کی سلطنت لاکھوں میل پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی سطوت، شان وشوکت اور رعب ودبدبہ ہے۔ اس کے پرزے ہونے تو شروع ہوں گے چند سال بعد خلافت فاروقی کے دور میں اور اس کی تکمیل ہوگی خلافتِ عثمانی کے عہد خلافت کے ابتدائی تین چار سال میں۔ لیکن حضورؐ نے اسی وقت پیش گوئی فرما دی کہ کسریٰ کی سلطنت کے پرخچے اڑ جائیں گے اور اس کا نام تک باقی نہیں رہے گا۔[۲]

———(حاشیہ صفحہ گزشتہ)———

[۱] یمن میں [illegible] ایران کی حکومت تھی اور ایران کے بادشاہ پورے عرب کو آزاد [illegible] علاقہ سمجھتے تھے اور اسے اپنی قلمرو کا حصہ گردانتے تھے۔

[۲] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معیت میں مدینہ کو ہجرت فرما رہے تھے تو سراقہ بن جعشم سو اونٹوں کے لالچ میں جس کا اعلان ابوجہل نے کیا تھا حضورؐ کی تلاش میں نکلا۔ راستہ میں اس نے آپؐ کو دیکھ لیا، اس نے آپؐ کی طرف تین مرتبہ گھوڑا دوڑایا لیکن ہر مرتبہ گھوڑے کے پیر ریت میں دھنس گئے۔ اس کے دل میں آپؐ کی ہیبت طاری ہوگئی اور اس نے حضورؐ سے امان طلب کی۔ حضورؐ کے فرمان پر حضرت ابوبکرؓ نے امان کی تحریر لکھدی۔ حضورؐ نے امان کی دستاویز سراقہ کو دیتے ہوئے فرمایا "اے سراقہ! میں تیرے ہاتھ میں کسریٰ کے کنگن دیکھ رہا ہوں۔" گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی موقع پر ایران پر غلبے کی پیشین گوئی فرما دی تھی۔ خلافتِ فاروقی کے دور میں سراقہ جو اسلام لا چکے تھے شدید بیمار ہوئے۔ لوگ ان کی زندگی سے مایوس ہوگئے۔ حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ وقت ان کی عیادت کے لئے تشریف لائے اور ان کو تسلی دی۔ حضرت سراقہ نے کہا "یا امیر المؤمنین، میں ابھی مرنے والا نہیں ہوں۔ حضورؐ نے میرے ہاتھ میں کسریٰ کے کنگن دیکھے تھے۔ خدا کی قسم جب تک حضورؐ کی یہ پیشین گوئی پوری نہ ہو میں نہیں مروں گا۔" ایران کا دار الحکومت مدائن جب فتح ہوا تو مال غنیمت [illegible]

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خسرو پرویز کا انجام: میں عرض کر رہا تھا کہ عیسائی بادشاہوں کے رویہ کے بالکل برعکس خسرو پرویز نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد اور آپ کے نامہ مبارک کے ساتھ گستاخانہ معاملہ کیا۔ نامہ مبارک کو پھاڑ دیا۔ قاصد کو ڈرا دھمکا کر واپس کر دیا۔ اس نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ چونکہ اس دور میں یمن بھی ایران کی قلمرو میں شامل تھا چنانچہ اس نے اپنے گورنر کو جو ایرانی تھا فرمان بھیجا کہ "یہ مدینہ کا کون گستاخ شخص ہے جس نے میری شان میں ایسی گستاخی کی ہے اور جو نبوت کا مدعی ہے اسے فوراً گرفتار کر کے میرے دربار میں حاضر کرو۔" باذان گورنر یمن نے اپنے دو آدمیوں کو مدینہ بھیجا۔ ان دونوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر کہا کہ ہمارے شہنشاہ نے آپ کو طلب کیا ہے۔ اگر حکم کی تعمیل نہیں کرو گے تو وہ آپ کو اور آپ کے پورے ملک کو تباہ و برباد کر کے رکھ دے گا۔ حضور مسکرائے اور فرمایا کہ رات کو آرام کرو، صبح کو بات ہوگی۔ صبح جب وہ آئے تو حضورؐ نے فرمایا تمہارا خسرو گذشتہ رات کو اپنے بیٹے (شیرویہ) کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔ اب تم واپس جاؤ اور اپنے گورنر سے کہہ دینا کہ جلد ہی اسلام کی حکومت کسریٰ کے پایہ تخت تک پہنچے گی۔ چنانچہ خسرو پرویز کا یہ انجام ہوا کہ اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں مارا گیا۔ جس کی خبر حضورؐ کو اللہ تعالے نے وحی کے ذریعے سے پہنچائی۔

ایک نمایاں فرق: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ سعید ہی سے اس دور کی دونوں عظیم سلطنتوں یعنی قیصر و کسریٰ سے چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی تھی جس نے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالے عنہم کے دورِ خلافت میں باقاعدہ جنگوں کی صورت اختیار کر لی جن کے دو علیحدہ علیحدہ نتائج نکلے۔ وہ یہ کہ جہاں تک قیصر روم کا تعلق ہے تو اگرچہ وہ شام کے پورے علاقوں سے بالکل بے دخل کر دیا گیا تھا۔ ایشیائے کوچک کا تھوڑا سا علاقہ اس کی قلمرو میں باقی رہ گیا۔ اور اگرچہ وہ شمالی افریقہ کے پورے علاقے از مصر تا مراکش سے بے دخل کر دیا لیکن اس کی حکومت بالکل ختم نہیں ہوئی۔ بلقان کی ریاستوں میں اس کا اقتدار قائم رہا۔ قسطنطنیہ جو اس کا پایہ تخت تھا، وہ فتح نہیں ہوا۔ جو بعد میں پندرھویں صدی عیسوی میں خلافتِ عثمانیہ کے ہاتھوں فتح ہوا ہے۔ بہرحال اس کی حکومت خلافتِ راشدہ میں یورپ کے مشرقی علاقوں اور

میں کسریٰ کے طلائی کنگن بھی شامل تھے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت سراقہؓ کو مسجد نبوی میں بلایا اور ان سے کہا کہ وہ تمام حاضرین کو اپنا واقعہ سنائیں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے ان کے ہاتھوں میں کنگن پہنائے۔

ایشیائے کوچک کے کچھ علاقوں میں قائم رہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ برکت تھی اس رویّہ کی جو اس نے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نامۂ مبارک کے بارے میں اختیار کیا تھا۔ اس کے برعکس خلافتِ فاروقی میں کسریٰ کی حکومت قریباً ختم ہو چکی تھی۔ اور خلافتِ عثمانی میں یہ بالکل ختم ہو گئی۔ یزدگرد مارا گیا اور وہ پورا علاقہ جو کسریٰ عظیم فارس کے زیرِ نگیں تھا۔ اسلامی حکومت کا جزو بن گیا۔ یہ انجام تھا اس گستاخانہ رویّہ کا جو خسرو پرویز نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نامہ مبارک کو چاک کرنے کی صورت میں کیا تھا۔ یہ ایک نمایاں فرق ہمیں تاریخ اسلام کے قرنِ اوّل میں نظر آتا ہے۔

غزوہ موتہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ صلح حدیبیہ کے بعد ۷ھ کے بالکل اوائل میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان رؤسائے عرب کے نام بھی اپنے نامۂ مبارک ارسال فرمائے تھے جو عرب اور شام کے سرحدی علاقوں میں آباد تھے۔ ان میں غسّان کا قبیلہ تعداد میں بھی بڑا تھا اور طاقت ور بھی کافی تھا۔ اس قبیلہ کے لوگ اگرچہ عرب تھے، لیکن ایک مدّت سے عیسائی تھے۔ یہ قبیلہ قیصرِ روم کے ماتحت اور اس کا باجگذار تھا۔ اس وقت قبیلہ کا رئیس و حکمران شرجیل بن عمرو نامی شخص تھا۔ اس کے پاس حارثؓ بن عمیر بطور قاصد حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا نامۂ مبارک لے کر گئے تھے۔ اس بدبخت نے حضورؐ کے قاصد کو شہید کر دیا۔ حضورؐ نے اُنؓ کے خون کے قصاص کے لئے تین ہزار کا لشکر تیار کر کے جمادی الاولیٰ ۸ھ میں شام کی طرف بھیجا۔ اس لشکر کا سپہ سالار حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت زیدؓ بن حارثہ کو مقرر فرمایا اور پہلے ہی سے معین کر دیا تھا کہ اگر ان کو دولتِ شہادت نصیب ہو تو پھر سپہ سالار ہوں گے حضرت جعفرؓ ابن ابی طالب، حضرت علیؓ کے حقیقی کے بھائی۔ اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو سپہ سالار ہوں گے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ جو انصار سے تھے اور مشہور شاعر۔

حضرت زیدؓ بن حارثہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اس بنا پر لوگوں کو تعجب ہوا کہ حضرت جعفرؓ ابن ابی طالب اور حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کے ہوتے ہوئے حضرت زید کو لشکر کی سرداری اور سپہ سالاری کس بنا پر سپرد کی گئی ہے۔ لیکن اسلام جس مساواتِ عام کے قائم کرنے کے لئے آیا تھا اس کے لئے یہ عملی نظیر ضروری تھی تاکہ لوگوں میں ایثار کا جذبہ پیدا ہو اور امیر کوئی بھی ہو اس کی اطاعت فی المعروف کی تربیت حاصل ہو ــــ مرضِ وفات کے شروع ہونے سے قبل حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے انہی زیدؓ بن حارثہ کے فرزند حضرت اُسامہؓ کو اس فوج کا افسر و امیر مقرر کیا تھا جو شام کی سرحدوں کی طرف بھیجا جانے والا تھا۔ حضرتِ اسامہؓ کی ماتحتی میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرتِ عمر فاروقؓ جیسے جلیل القدر صحابی بھی شامل تھے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مساواتِ انسانی کے عملی

وعظ ارشاد نہیں فرمائے بلکہ صحابہ کرامؓ کا اس طور پر تزکیہ فرمایا تھا کہ وہ لوگ جو نسلی اور قبائلی تفاخر کو حرزِ جان بنائے رکھتے تھے ایک کنگھی کے دندانوں کی طرح باہم مربوط اور بنیانِ مرصوص بن گئے تھے ــــ سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے اسی نوع کے واقعات کو دیکھ کر ایچ جی ویلز جیسے دشمن اسلام کو یہ لکھنا پڑا کہ "مساواتِ انسانی، اخوت اور حُرّیت پر نہایت بلند پایہ مواعظ تو حضرت مسیحؑ کے یہاں بھی ملتے ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان اصولوں پر دنیا میں سب سے پہلا عملی معاشرہ قائم فرمایا محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے۔

اگرچہ یہ مہم قصاص لینے کے لئے بھیجی گئی تھی، لیکن چونکہ تمام مہمات کا بنیادی و حقیقی مقصد اسلام کی تبلیغ و دعوت تھا چنانچہ لشکر کی روانگی سے قبل اسے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ہدایات دیں اور ارشاد فرمایا کہ راہ میں جو قبائل آباد ہیں ان کو اسلام کی دعوت دی جائے اور شرجیل بن عمر وغسانی کو بھی پہلے اسلام کی دعوت دی جائے۔ اگر وہ قبول کر لے تو جنگ کی ضرورت نہیں۔ حضورؐ فوج کے ساتھ مدینہ سے باہر کچھ دور بنفسِ نفیس تشریف لے گئے۔

شرجیل کی تیاری: ادھر مسلمانوں کا لشکر مدینہ میں ترتیب پا رہا تھا ادھر جاسوسوں نے شرجیل کو خبر کر دی شرجیل نے اس لشکر کے مقابلہ کے لئے تقریباً ایک لاکھ کی فوج تیار کی ــــ چونکہ اسے معلوم تھا کہ قصاص اور انتقام کا معاملہ ہوگا اور جنگ ضرور ہوگی۔ پھر خود قیصرِ روم (ہرقل) ایک بہت بڑی فوج لے کر غسانیوں کے دارالحکومت بصریٰ سے چند میل کے فاصلہ پر آکر بیٹھ گیا تاکہ اگر غسانی شکست کھائیں تو وہ اُن کی مدد کے لئے اپنی فوج لے کر پہنچ جائے ــ اہلِ ایمان کے لشکر کو جب غسانیوں کی تیاری اور اس کی پشت پر ہرقل کی فوج کی موجودگی کا علم ہوا تو مشورہ ہوا کہ ان حالات میں کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ کہاں صرف تین ہزار اور کہاں ایک لاکھ! ایک اور تینتیس[۳۳] کی نسبت بن رہی ہے۔ ایسے حالات میں مقابلہ کا خطرہ (RISK) مول لینا چاہئیے یا مناسب یہ ہوگا کہ حضورؐ کو اطلاع دی جائے اور توقّف کر کے آپؐ کے حکم کا انتظار کیا جائے۔ حضرت زیدؓ بن حارثہ کی رائے یہی تھی کہ ہمیں سردست مقابلہ کرنا نہیں چاہئے اور حضورؐ کے حکم کا انتظار کرنا چاہئیے۔

شوقِ شہادت: لیکن حضرت عبداللہؓ ابن رواحہ کی رائے یہ تھی کہ مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ وہؓ اٹھے اور انہوںؓ نے تقریر کی کہ مسلمانو! ہم دنیا کے طالب ہو کر نہیں نکلے، فتح اور شکست سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ ہم تو شہادت کے متمنّی ہیں، اللہ نے یہ موقع فراہم کیا ہے، ہم تاخیر کیوں کریں"۔ اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ فیصلہ ہو گیا کہ مقابلہ کیا جائے گا ــــ چنانچہ تصادم ہو گیا۔ اب کہاں تین

ہزار کہاں ایک لاکھ ! ۔ لیکن جوشِ ایمانی اور شوقِ شہادت سے سرشار یہ مختصر سا لشکر ایک لاکھ فوج پر حملہ آور ہوا ۔ حضرت زیدؓ بن حارث شہید ہوئے تو ان کے بعد حضرت جعفرؓ بن ابی طالب حضورؐ کے چچا زاد اور حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی نے عَلَم اپنے ہاتھ میں لیا اور وہ بھی شہید ہوئے ۔ متعلق روایات میں آتا ہے کہ جب انہوں نے عَلَم سنبھالا اور لشکر ان کی قیادت میں آیا تو گھوڑے سے اترے اور پہلے خود اپنے گھوڑے کی ٹانگوں پر تلوار ماری کہ اس کی کونچیں کٹ گئیں تاکہ گھوڑے پر بیٹھ کر فرار ہونے کا خیال بھی دل میں نہ آئے ۔ پھر نہایت بے جگری سے دشمنوں کی فوج پر ٹوٹ پڑے ۔ ایک ہاتھ قلم ہوا تو دوسرے ہاتھ میں عَلَم تھام لیا ۔ وہ بھی قلم ہوا تو ٹانگوں میں دبایا تاکہ علم اُن کے جیتے جی زمیں بوس نہ ہو ۔ یہ صورت حال دیکھ کر حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے آگے بڑھ کر عَلَم اپنے ہاتھ میں لیا ۔ حضرت جعفرؓ زخموں سے چور چور ہو کر گر پڑے اور اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی ۔ موت سے قبل دونوں ہاتھ کٹ چکے تھے ۔ حضورؐ نے خواب دیکھا اور صحابہ کرام کو سنایا کہ جعفرؓ کو اللہ تعالےٰ نے دو پر عطا فرمائے ہیں جن سے وہ جنّت میں اڑتے پھر رہے ہیں ۔ اسی وقت سے آپ کا لقب " طیار " قرار پایا اور وہ جعفر طیار کے نام سے موسوم ہوئے ۔ رضی اللہ تعالےٰ عنہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ، جو اس غزوہ میں شریک تھے ، کا بیان ہے کہ میں نے حضرت جعفرؓ کی لاش بعد میں خود دیکھی تھی ، اس پر تلواروں اور برچھیوں کے نوّے زخم تھے لیکن سب سامنے کی طرف سے تھے ، پشت پر کوئی زخم نہیں تھا ۔ یہ تھے جعفر طیّار رضی اللہ تعالےٰ عنہ ۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ بھی دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے ۔ رضوان اللہ علیہ ۔

خالد بن ولید کمان سنبھالتے ہیں : حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین صحابہ کرامؓ کو یکے بعد دیگرے سپہ سالار نامزد کیا تھا آگے کے لئے کوئی ہدایت نہیں تھی ۔ چنانچہ جب وہ تینوں شہید ہو گئے تو اب مسلمانوں کے لشکر میں سے حضرت خالد بن ولیدؓ نے آگے بڑھ کر کمان سنبھالی اور نہایت بہادری سے لڑے ۔ صحیح بخاری میں ہے کہ اس غزوہ میں آٹھ تلواریں ان کے ہاتھ سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑیں ۔ لیکن ایک لاکھ سے تین ہزار کا مقابلہ تھا ۔ خالد بن ولید کی حکمت عملی یہ تھی کہ اپنی فوج کو

---

[1] صحیح بخاری میں " غزوہ موتہ " کے باب میں حدیث ہے کہ جنگ موتہ کی خبر وحی کے ذریعہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مل رہی تھی ۔ آپؐ نے از روئے وحی فرمایا " اب اللہ کی ایک تلوار یعنی خالد بن ولید نے جو سیوف اللہ میں سے ہے ، مسلمانوں کا عَلَم اپنے ہاتھ میں لیا اور اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دشمن کے نرغے سے بچا نکالیں جس میں وہ کامیاب ہوئے اور یہی فتح ہے۔ ——— بھی
روایات موجود ہیں کہ غازیوں کے ہراول دستے نے جب حملہ کیا تو واقعتاً اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں
کو فتح عطا فرمائی تھی۔ یہ ہراول دستہ شکست کھا کر فرار ہو گیا تھا۔ بعد میں دشمن کی پوری فوج نے یکبارگی
حملہ کر کے مسلمانوں کی فوج کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ حضرت خالدؓ بن ولید نے پہاڑ کی جانب سے
دشمنوں کا گھیرا توڑا اور اپنے لشکر کو لے کر پہاڑ کے دامن پر پہنچ گئے اور اس طرح اپنی فوج کو دشمنوں
کے حملوں سے بچا لائے۔

اہل مدینہ کا ردِ عمل: جب یہ فوج مدینہ پہنچی تو بعض روایات میں آتا ہے کہ لوگوں نے یہ سمجھا کہ شاید
بھاگ کر آئے ہیں۔ چند لوگوں نے شہر سے باہر نکل کر ان پر کنکریاں اور ریت پھینکی کہ تم لوگ بھگوڑے
ہو۔ تم لوگ اللہ کی راہ میں قتال کے لیے گئے تھے لیکن اپنی جان بچا کر آ گئے ہو۔

فوج کی تسلی: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر ملی تو آپؐ بنفسِ نفیس مدینہ سے باہر تشریف لائے۔
آپؐ نے بڑے تپاک سے فوج کا استقبال کیا اور یہ ارشاد فرما کر ان کو تسلی دی کہ تم فراری نہیں ہو۔
بلکہ دوبارہ حملہ کرنے کی نیت سے پیچھے پلٹ آنے والے ہو ——— جیسے سورۃ انفال میں آ چکا تھا
کہ پینترا بدلنے اور جنگی چال کے طور پر یا نئی قوت کے ساتھ پھر مقابلے کی نیت کے ساتھ پیچھے ہٹا
جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ غزوہ موتہ سے بچ کر آنے والے اہل ایمان دراصل اسی
زمرے میں آتے تھے۔ یہ جان بچا کر فرار نہیں تھا لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فوج
کو تسلی دی ———

غزوہ تبوک

اب آئیے غزوہ تبوک کی طرف ——— لیکن اس پر گفتگو سے قبل میں چاہوں گا کہ آپ
حضرات تاریخی ترتیب اور اہم واقعات اپنے ذہن میں تازہ کر لیں۔ میں آپ کو بتا چکا
ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بین الاقوامی سطح پر توحید کی انقلابی دعوت کا بنفسِ نفیس آغاز فرما دیا
تھا۔ اس ضمن میں حضورؐ کا پہلا اقدام تھا سلاطین کو اسلام کی دعوت کی ترسیل نامہ ہائے مبارک جو
سنہ ۶ھ کے اواخر یا ۷ھ کے اوائل میں ہوئی ——— ان خطوط پر مختلف سلاطین کا جو مختلف ردِ عمل

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کو اپنے دشمن پر غلبہ دیا! حدیث میں الفاظ آئے ہیں کہ "فتح اللّٰہ علیہم" ——— غلبہ اور فتح کی
تشریح میں اربابِ سیر اور اہل روایت کی مختلف آراء ملتی ہیں۔ مولانا شبلیؒ نے ان کو اپنی تالیف "سیرۃ النبیؐ"
میں "غزوہ موتہ" کے باب کے اختتام پر حاشیہ میں درج کر دیا ہے۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ حضرت
خالد بن ولید کا لقب "سیف اللہ" اسی حدیث کی رو سے مشہور ہوا (مرتب)

ہوا ان میں سے بھی چند اہم واقعات کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ ان میں سے غسانی خاندان جو نسلاً تو ع
تھا لیکن مذہباً عیسائی تھا، شام عرب کے بڑے علاقہ پر رومیوں کے زیر اثر حکومت کر رہا تھا۔ اس کے
رئیس شرجیل بن عمرو نے حضورؐ کے قاصد کو شہید کر دیا تھا۔ ان کے قصاص کے لئے جمادی الاولیٰ
میں حضور نے تین ہزار کا لشکر شام کی طرف روانہ کیا جس کے نتیجہ میں غزوہ موتہ واقع ہوا جس میں تین ہزا
لشکر کا ایک لاکھ فوج سے مقابلہ ہوا۔ اس جنگ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ تینوں سپہ سا
یکے بعد دیگرے شہید ہوئے۔ اس کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید نے نہایت جرأت و شہادت۔
دشمن کی فوج کا مقابلہ کیا اور مسلمانوں کا جو لشکر دشمن کی فوج کے نرغے میں آگیا تھا، اسے نہایت حکمت
کے ساتھ بچا کر مدینہ لے آئے۔ میں ابھی ان واقعات کا قدرے تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں۔

غزوۂ موتہ کے اثرات: مسلمانوں کا تین ہزار کا مختصر لشکر جس جوش و جذبہ اور بے جگری، جرأت و شجا
کے ساتھ شرجیل کی ایک لاکھ فوج سے جا ٹکرایا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے تھا کہ مجاہدین اسلام بالکل
جاتے اور ایک بھی بچ کر نہ جاتا۔ لیکن نہ صرف غسانی بلکہ سارا عرب اور مشرق وسطیٰ یہ دیکھ کر حیران و ش
رہ گیا کہ ایک اور ۳۳ کے اس مقابلہ میں بھی کفار مسلمانوں پر غالب نہ آسکے۔ مسلمانوں کے جتنے لوگ ش
ہوئے اس سے کہیں زیادہ تعداد میں کفار مقتول ہوئے۔ پھر ایک لاکھ کی فوج کے نرغہ سے تین ہزار کی
سی فوج کو بچا لے جانا بھی فوجی اعتبار سے بڑے اچنبھے کی بات تھی۔ یہی چیز تھی جس نے عرب
اور عراق کی سرحدوں پر آباد قبائل اور نجدی قبائل کو اسلام کی دعوتِ توحید سے متاثر کیا اور ہزارو
تعداد میں ان قبائل کے لوگ اس غزوہ کے بعد ایمان لے آئے۔

غسانیوں کا خوف اور تیاریاں: جنگ موتہ کے اس معرکہ نے غسانیوں اور رومیوں کو ہلا کر
ان کو خوف لاحق ہو گیا کہ مسلمان چین سے بیٹھنے والے نہیں ہیں۔ وہ یقیناً دوبارہ حملہ کریں گے۔ چنا
ایک طرف غسانیوں نے فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ دوسری طرف انہوں نے قیصر روم کو لکھا کہ ا
ہوئی طاقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے، امسال پورا عرب قحط میں مبتلا ہے لہٰذا یہ بہترین موقع ہے
ابھرتی ہوئی قوت کو کچل دیا جائے۔ چنانچہ اس بنا پر ہرقل نے بھی چالیس ہزار کی فوج شام بھیج دی اور

---

۱ سورۂ انفال کی آیت ۱۶ میں کفار کے مقابلہ میں جان بچا کر پیٹھ پھیرنے والوں کے لئے اللہ
غضب اور جہنم کی وعید آئی ہے۔ اسی آیت کے درمیان میں یہ استثنائی الفاظ آئے ہیں: اِلَّا
لِقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ ۔ (مرتب)

وج کے ساتھ حمص پہنچ گیا۔ اس طرح غسانیوں اور رومیوں نے ایک لشکرِ جرّار تیار کر لیا۔
فیرِ عام: شام اور عرب کے مابین تجارت کا سلسلہ جاری تھا چنانچہ تاجروں کے ذریعے سے یہ خبر پورے عرب
ں پھیل گئی کہ غسانی رومی فوج کے ساتھ مل کر عنقریب مدینہ پر حملہ کرنے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجانے
ے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی برابر یہ خبریں مل رہی تھیں چنانچہ آپؐ نے بھی فوج کی تیاری کا حکم دیا
ہلا موقع تھا کہ حضورؐ کی طرف سے نفیرِ عام ہوئی۔ یعنی ہر مسلمان جس کو کوئی عذرِ شرعی لاحق نہ ہو اس
زدہ کے لئے لازماً نکلے اور فوج میں شامل ہو۔ اس سے قبل یہ ہوتا تھا کہ جب کبھی کہیں کوئی مہم بھیجنی
ہنی تھی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں صحابہ کرام کو جمع فرماتے اور مہم کے لئے مطلوبہ تعداد
ے مطابق یا خود انتخاب فرماتے یا اُن اصحاب کو شامل فرما لیتے جو خود کو اس مہم کے لئے پیش فرماتے
یکن اس مرتبہ صورتِ حال مختلف تھی۔ اس نفیرِ عام کے نتیجہ میں تیس ہزار کی فوج تیار ہو گئی اور آپ اس
شکر کو لے کر تبوک کی طرف روانہ ہوئے۔

سورۂ توبہ اور غزوۂ تبوک کا تعلق: میں نے شروع میں سورہ توبہ کی چند آیات کی تلاوت کی
ھی۔ وہ آیات غزوۂ تبوک سے متعلق ہیں۔ اس سورہ مبارکہ کا اکثر حصہ غزوۂ تبوک سے متصلاً قبل اور
تصلاً بعد کے واقعات پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ یہی موقع ہے کہ جس میں منافقین کا کردار نمایاں ہو کر
سامنے آتا ہے اور ان کا پردہ چاک ہوتا ہے اور میرا ارادہ تھا کہ میں نے جن آیات کی تلاوت آغاز میں
کی تھی ان کا ترجمہ اور تشریح بیان کروں اور اس تناظر میں اس غزوہ کے اہم واقعات آپ حضرات کو
سناؤں۔ لیکن وقت کی کمی کے باعث میں یہ بات چھوڑ رہا ہوں۔ آپ حضرات سے درخواست
ہے کہ کسی مستند تفسیر کی مدد سے اس سورہ مبارکہ کا مطالعہ ضرور کریں۔

صحابہ کرامؓ کا سخت ترین امتحان: البتہ چند ضروری باتیں عرض کر رہا ہوں۔ میرے حقیر مطالعہ کی
رو سے غزوۂ احزاب کی طرح غزوۂ تبوک بھی صحابہ کے لئے نہایت سخت امتحان کا موقع تھا ——— اب
ٹکراؤ وقت کی دو عظیم ترین طاقتوں میں سے ایک طاقت یعنی سلطنتِ روما سے درپیش تھا۔ اب وہ بات
نہیں تھی کہ عربوں کی باہمی جنگ ہے جہاں ایک اور تین یا چار یا دس یا بیس کی نسبت رہی ہے اب تو سلطنت
روما سے ٹکراؤ کا مسئلہ درپیش تھا کہ جس کے پاس لاکھوں کی تعداد میں ہر وقت باقاعدہ فوجیں تیار رہتی تھیں
جو اُس دور کے اعتبار سے اعلیٰ ترین ہتھیاروں سے لیس تھیں۔ غسانیوں نے لاکھوں کا لشکر تیار
کر رکھا تھا اور اس کی پشت پر خود ہرقل قیصرِ روم اپنی کثیر فوج کے ساتھ شام میں موجود تھا اور وہ کسی
طرح بھی اپنے ان مقبوضات سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک طرف یہ

صورتِ حال ہے، دوسری طرف عالم یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کا اتنا سخت امتحان
لیا کہ ہر مسلمان کے لئے نکلنا لازم فرمایا الّا یہ کہ وہ ضعیف یا بیمار ہو۔ اس سے پہلے کبھی نفیرِ عام نہیں
تھی کہ ہر مسلمان نکلے۔ پھر یہ کہ قحط کا عالم اور شدت کی گرمی کا موسم تھا کہ لوگوں کو ویسے بھی گھر سے نکلنا
شاق گزرتا تھا۔ ان حالات میں طویل سفر گویا خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ یہی
وجہ ہے کہ اس موقع پر منافقین کا پردہ چاک ہو گیا وہ خود بھی جنگ کے لئے نکلنے سے جی چراتے تھے
اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے کہ: لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ۔ "گرمی میں نہ نکلو"۔ اس پر مستزاد
کہ کھجوروں کی فصل تیار تھی اور اب یہ اندیشہ لاحق تھا کہ اگر اب چلے گئے تو یہ کھجوریں کون اتارے گا۔
درختوں ہی پر گل سڑ جائیں گی اور ختم ہو جائیں گی۔ پھر یہ کہ اس وقت کھانے کے لالے ہیں یہ فصل
بھی اگر برباد ہو گئی تو پھر کیا ہو گا۔

انفاق فی سبیل اللہ کی اپیل: پھر یہ کہ طویل ترین سفر اور سلطنتِ روما سے ٹکراؤ کا مرحلہ درپیش
ہے، لہٰذا ساز و سامان بھی کافی درکار ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کو ترغیب دے
رہے ہیں کہ اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ مالی انفاق بھی کرو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ترغیب
کے نتیجہ میں پرستارانِ حق نے سر و سامان کی فراہمی میں اپنی بساط سے بڑھ کر حصّہ لیا۔ جو صحابہ کرامؓ آسودہ
حال تھے انہوں نے بڑی بڑی رقمیں پیش کیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے تو اپنا سارا اثاثہ نذر کر دیا۔ گھر
جھاڑ دیا پھیر دی۔ غریب صحابیوںؓ نے محنت مزدوری کر کے جو کچھ کمایا لا کر حاضر کر دیا۔ ایک صحابی
نے رات بھر ایک باغ میں پانی سینچا اور اس کے معاوضہ میں جو کھجوریں ملیں وہ لا کر خدمتِ اقدس
میں پیش کر دیں۔ عورتوں نے اپنے زیور اتار کر دے دیئے۔ الغرض تمام اہلِ ایمان میں جوشِ جہاد
کی لہر دوڑ گئی۔ یہ نفیرِ عام اور انفاق سبیل فی سبیل اللہ کی ترغیب منافقوں کے لئے کسوٹی بن گئی
اس موقع پر پیچھے رہ جانے اور انفاق میں ہاتھ روکنے کے معنی یہ تھے کہ ایسے شخص کا اسلام کے
ساتھ تعلق کی صداقت کا معاملہ مشتبہ ہو جاتا۔ چنانچہ منافقین کے لئے یہ موقع ان کے نفاق
کے پردہ چاک کرنے کا سبب بن گیا۔ دوسرے طرف وہ اہلِ ایمان بھی تھے جو لوگ سواریوں کی کمی
اور سامان کی قلّت کی وجہ سے تبوک کے سفر پر جانے سے معذور تھے۔ حالانکہ ان کی شدید
خواہش تھی کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلیں۔ وہ حضورؐ کی خدمت میں رو رو کر کہتے کہ
ہمیں بھی آپؐ لے چلیں تو ہماری جانیں قربان ہونے کے لئے حاضر ہیں۔ ان مخلصین کی بے تابی
کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دل بھر آتا تھا۔

چنانچہ سورہ توبہ میں جہاں ضعفاء اور مریضوں کو اس غزوہ میں شرکت سے مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے تسلی دی گئی وہاں ان مخلص اہلِ ایمان صحابہ کی تسلی کے لئے یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی۔

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ۝ (آیت ۹۲)

"اور (اسی طرح) ان لوگوں پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے (اے نبی) آپؐ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ ہم کو سواری دیجئے (تاکہ ہم بھی ساتھ چلیں) تو آپؐ نے کہا کہ میرے پاس سواری کہاں ہے جس پہ تم کو سوار کر سکوں تو وہ واپس چلے گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ افسوس ہم اس جہاد میں حصّہ لینے کی مقدرت نہیں رکھتے۔"

تبوک کی طرف کوچ: الغرض رجب ۹ھ میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ۳۰ ہزار مجاہدین کے ساتھ مدینہ سے شام کی طرف کوچ فرمایا اور تبوک کے مقام پر قیام فرمایا جو شام اور جزیرہ نمائے عرب کا سرحدی مقام ہے۔ اس سفر میں دس ہزار گھڑسوار آپؐ کے ہمراہ تھے۔ اونٹوں کی اتنی کمی تھی کہ ایک ایک اونٹ پر کئی کئی آدمی باری باری سوار ہوتے تھے۔ دورانِ سفر بہت سے عجیب وغریب واقعات پیش آئے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے میں ان کا ذکر چھوڑ رہا ہوں۔

قیصر کا جنگ سے اعراض: غسّانیوں نے لاکھوں کی فوج تیار کر رکھی تھی اور قیصر نے چالیس ہزار رومی سپاہ ان کی مدد کے لئے بھیج رکھی تھی۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی ایک لشکرِ جرّار کے ساتھ غسّانیوں کی مدد کے لئے حمص میں موجود تھا۔ لیکن جب قیصر کو یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا جو لشکر مدینہ سے آ رہا ہے۔ اس کی قیادت خود جناب محمد رسول اللہ علیہ وسلّم فرما رہے ہیں تو اس نے غسّانیوں اور رومی فوجوں کو حکم بھیجا کہ سرحد سے تمام فوجیں واپس چلی آئیں۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے رسول ہیں۔ لہٰذا اسے مقابلہ کا حوصلہ نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ اللہ کے رسولؐ سے مقابلہ کا نتیجہ شرمناک شکست کے علاوہ اور کچھ نہیں نکل سکتا تھا۔ پھر غزوۂ موتہ میں ایک جانب تین ہزار اور دوسری جانب ایک لاکھ فوج کے مقابلہ کی جو کیفیت اس کے علم میں تھی تو اس کے بعد اس کی ہمّت پڑی کہ وہ تیس ہزار فدائین کے اس لشکر سے مقابلہ کرے جس کی کمان خود نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم فرما رہے تھے۔ حالانکہ اس وقت اس کے پاس غسّانیوں اور رومیوں کی دو لاکھ سے بھی زیادہ فوج موجود تھی۔ وہ طرح دے گیا اور اس نے سرحد سے تمام فوجیں واپس ہٹا لیں اور مسلّح تصادم کا ہر

امکان روک دیا۔

نبی اکرمؐ کے اقدامات: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرحلہ پر قیصر کے اعراض اور پسپائی کو کافی سمجھا
اور از خود تبوک سے آگے بڑھ کر شام کی سرحد میں داخل ہونے کے بجائے اس بات کو ترجیح دی کہ
اس طرح لشکرِ اسلام کو جو اخلاقی اور نفسیاتی فتح حاصل ہوئی ہے اس سے زیادہ سے زیادہ سیاسی اور
جنگی فوائد حاصل کئے جائیں۔ حضورؐ وہاں بیس دن تک مقیم رہے تاکہ اگر قیصر مقابلہ میں آنا ہے تو آئے
______ اس عرصہ کے دوران آپؐ نے سرحد کے اردگرد جو قبائل آباد تھے ان
کے رئیسوں اور سرداروں سے معاہدے کئے اور اس طرح اس علاقے میں اپنی پوزیشن مضبوط بنا لی
گویا ہجرت مدینہ کے غزوہ بدر سے قبل حضورؐ نے جو اقدامات قریش کے ضمن میں کئے تھے، جس کو
میں نے اقدام (ACTIVE RESISTANCE) اور قریش کی سیاسی ناکہ بندی (POLITICAL
ISOLATION) قرار دیا تھا، وہی کام حضورؐ نے تبوک کے ۲۰ یوم کے قیام کے دوران انجام
دیا۔ اس کے بعد آپؐ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

بہر حال یہ ہیں سیرت کے وہ اہم واقعات یعنی سلاطین و رؤسا کو نامہ ہائے مبارکہ کی ترسیل
جنگ موتہ اور غزوہ تبوک، جنہیں میں انقلابِ محمدیؐ کی بین الاقوامی تصدیر (EXPORT) کے
کام کا آغاز قرار دیتا ہوں۔ یعنی جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر اب اطراف و اکناف عالم میں حضورؐ
کی انقلابی دعوت پہنچانے اور توحید کا عَلَم کرۂ ارضی پر بلند کرنے کا جو کام امت کے سپرد تھا
اس کا راستہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس کھول دیا۔

حجۃ الوداع: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ ۱۰ھ میں فریضۂ حج ادا فرمایا۔ ہجرت کے بعد
آپؐ کا یہی پہلا اور آخری حج ہے۔ اسی لئے اسے حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس حج کے موقع
پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا مشن امت کے حوالہ فرما دیا۔ سوا لاکھ کا مجمع موجود تھا۔
آپؐ نے پہلے تو مجمع سے گواہی لی کہ میں نے اللہ کا دین تم تک پہنچا دیا کہ نہیں! جب تین مرتبہ
پورے مجمع نے اقرار کیا کہ بے شک آپؐ نے حقِ تبلیغ، حقِ نصح، حقِ امانت ادا فرما دیا تو پھر آپؐ نے
فرمایا:—

فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ

"یعنی (میں نے اللہ کا دین تم تک پہنچا دیا) اب وہ لوگ جو یہاں موجود ہیں
(اُن کی ذمہ داری ہے کہ اس دین کو) پہنچائیں اُن تک جو یہاں موجود نہیں ہیں۔"

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اس ارشاد و فرمانِ گرامی میں گویا یہ بات آپ سے آپ مضمر ہے کہ میں نے جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اسلامی انقلاب کی تکمیل کر دی ہے اور اس عمل کا آغاز کر دیا ہے جس کا تعلق بین الاقوامی مرحلہ سے ہے لہٰذا انقلاب کی عالمی سطح پر تکمیل کی ذمّہ داری اب تمہارے کاندھوں پر ہے —

حضورؐ کا دنیا سے پردہ: اس حجۃ الوداع کے بعد ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ تک حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اس حیاتِ دنیوی کے اسّی دن بنتے ہیں جس کے بعد " اَللّٰھُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی " فرماتے ہوئے آپؐ نے اس دنیا سے پردہ فرمایا اور رفیقِ اعلیٰ کی طرف مراجعت فرمائی۔ اس مراجعت سے چند دن قبل آپؐ نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی سرکردگی میں شام کی سرحد کی طرف پیش قدمی کے لئے ایک جیش تیار فرمادیا تھا۔ جسے بجا طور پر اس بات کا ثبوت قرار دیا جاسکتا ہے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ نے اس انقلاب کی بین الاقوامی سطح پر پیش قدمی کرنے کے لئے امّت اور اپنے جانشینوں کے لئے ایک واضح لائحۂ عمل کی جانب رہنمائی فرمادی تھی اور اس ضمن میں قابلِ تقلید عملی نمونہ بھی پیش فرمادیا تھا۔

خاتمۂ کلام حضرات! یہاں ہمارا یہ سلسلۂ تقاریر ختم ہوتا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ وقت کی کمی کی وجہ سے میں اس موضوع کا پورا حق ادا نہیں کرسکا۔ بہت سے اہم امور باقی رہ گئے جن پر مجھے اظہارِ خیال کرنا تھا۔ بہرحال گذشتہ نو جمعوں میں، میں نے سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے جس نقطۂ نظر سے چند اہم گوشے بیان کئے ہیں، اگر ان تقاریر کے نتیجہ میں آپ حضرات میں اس پہلو سے سیرتِ طیّبہ میں غور و فکر اور اس کے مطالعہ کا ذوق و شوق پیدا ہو جائے تو میرے نزدیک یہ بھی ایک بڑی کامیابی ہوگی۔

مجھے آخر میں ایک بات اور عرض کرنی ہے۔ وہ یہ کہ ان نو ۹ تقاریر میں، میں نے معروضی طور پر سیرتِ مطہرہ کی روشنی میں اسلامی انقلاب کے مراحل، مدارج اور لوازم پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اب ان شاء اللہ العزیز اگلے جمعہ سے مجھے اس موضوع پر گفتگو کرنی ہے کہ موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے کن اُمور میں حضورؐ کا منہجِ عمل ہمیں جوں کا توں اختیار کرنا ہے اور کن کن امور میں کن کن پہلوؤں سے ہمیں اپنے طریقِ انقلاب میں کوئی ترمیم یا تبدیلی کرنی ہوگی۔ ظاہر بات ہے کہ اس معاملے میں ہمارے لئے ضروری ہوگا کہ یہ ترمیم یا تبدیلی بھی دین کے کسی اصول کی روشنی ہی میں کریں اور یہاں ہمیں حالات کے اعتبار سے کوئی اجتہاد کرنا ہوگا۔ یہ موضوع نہایت

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

ادویات کا نشان

SURFICOL
COUGH SYRUP
ادویات کا نشان

مسئلہ سندھ — چند اہم گوشے

سندھ کے مسئلے کو سمجھنے اور حل کرنے کے لیے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی پنجاب سے اٹھنے والی واحد آواز کے ردعمل کے طور پر ملک کے دو قومی اخبارات نے اپنے ادارتی کالموں میں دو طرح کے نمائندہ رویوں کا اظہار کیا۔ کراچی کے انگریزی روزنامہ 'ڈان' نے اپنے مفصل اداریے میں دونوں صوبوں کے درمیان بُعد اور دُوری کو کم کرنے کے لیے ڈاکٹر اسرار احمد کی تجاویز کی حمایت کرتے ہوئے اس دُوری کی وجوہات پر فکر انگیز گفتگو کی ہے۔ جبکہ لاہور کے اُردو روزنامہ" نوائے وقت" نے دورہ سندھ سے واپسی پر امیر محترم کے خطاب جمعہ کو بنیاد بناتے ہوئے اپنے مختصر ادارتی نوٹ میں تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے سوال کیا تھا کہ" پنجاب کیا کرے" جس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب کا مختصر مضمون دو قسطوں میں روزنامہ نوائے وقت میں شائع ہوا۔

قارئینِ میثاق کی سہولت کے لیے" نوائے وقت" کا ادارتی نوٹ اور امیر محترم کا جواب مضمون اور روزنامہ" ڈان" کے اداریے کا انگریزی متن اور اُردو ترجمہ —— محترم جناب اقتدار احمد صاحب کے مختصر تبصرے کے ساتھ شاملِ اشاعت ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ سندھ کے عنوان سے معروف سندھی دانشور اور جئے سندھ تحریک کے اہم ستون جناب غلام مصطفیٰ شاہ کا ایک انگریزی مضمون بھی روزنامہ 'ڈان' کے شکریے کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ مسئلہ سندھ کے حوالے سے چوتھی اہم چیز جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کا مضمون" سندھ کی صورت حال" ہے جو درحقیقت ڈاکٹر اسرار احمد کی فرمائش پر ہی انہوں نے" مسئلہ سندھ" کے خلاصے کے طور پر رقم کیا ہے۔ چونکہ اس دفعہ انجمن کے سالانہ محاضرات کی چار نشستوں میں سے ایک کا عنوان" مسئلہ سندھ" ہے۔ اس مناسبت سے —— یہ اہم تحریریں قارئینِ" میثاق" کے لیے سندھ کے معاملات و مسائل کی تفہیم و تشریح میں معاون ثابت ہوں گی۔" روزنامہ نوائے وقت لاہور اور روزنامہ" ڈان" کراچی میں شائع شدہ تحریریں دونوں معاصرین کے پیشگی شکریے کے ساتھ شائع کی جا رہی ہیں۔

پنجاب کیا کرے؟

ڈاکٹر اسرار احمد

۲۵ جنوری ۱۹۸۷ء کے ادارتی نوٹ میں 'پنجاب کیا کرے؟' کے عنوان سے آپ نے میرے ۲۴ جنوری کے خطابِ جمعہ کے حوالے سے جو سوالات اٹھائے ہیں میں ان کا خیر مقدم کرتا ہوں اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں

نوائے وقت

اتوار ۲۴ جمادی الاوّل ۱۴۰۷ھ ، ۲۵ جنوری ۱۹۸۷ء

"پنجاب" کیا کرے؟

تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد نے خطبہ جمعہ میں کہا ہے کہ پنجاب کو حالات کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے چھوٹے صوبوں کے سیاسی اور معاشی حقوق دینے ہوں گے۔ ڈاکٹر اسرار احمد ایک مذہبی سکالر کی حیثیت سے اپنے خطبہ جمعہ میں باقاعدگی کے ساتھ سیاسی امور پر بھی اظہار خیال کرتے رہتے ہیں لیکن اپنے دورہ سندھ کے دوران انہوں نے حالات کا جو مشاہدہ کیا ہے وہ یکطرفہ ہی نہیں کافی حد تک حقائق کے منافی بھی ہے ہمارے سندھی بھائی اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ ملک کے چاروں صوبوں کے عوام کن مشترکہ مسائل اور مشکلات کا شکار ہیں اور ان کے حل کے لئے مشترکہ جدوجہد کی ضرورت ہے بدقسمتی سے جو لوگ عوام کا استحصال کرتے چلے آ رہے ہیں خواہ وہ سندھ کے وڈیرے ہوں پنجاب کے جاگیردار یا سرحد و بلوچستان کے خوانین اور سردار وہی چھوٹے صوبوں کے حقوق کے علمبردار اور پنجاب کے خلاف نفرت انگیز مہم چلانے میں پیش پیش ہیں لیکن ڈاکٹر اسرار احمد ان لوگوں کے اصل چہروں کو بے نقاب کرنے کے بجائے انہی کے ترجمان بن کر انہی کی زبان میں گفتگو کرنے لگے ہیں اگر انہوں نے اپنے طور پر یہ محسوس کیا ہے کہ سندھی عوام کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے تو انہیں زیادتی کے مرتکب افراد یا گروہ کی نشاندہی بھی کرنی چاہئے اور یہ بھی بتانا چاہئے کہ اس میں پنجاب یا پنجاب کے عوام کا کیا قصور ہے۔ نیز مسائل کا قابل عمل اور منطقی حل بھی پیش کرنا چاہئے محض یہ کہہ دینے سے کہ پنجاب چھوٹے صوبوں کے معاشی اور سیاسی حقوق دے کر حالات کی سنگینی کو کم کرے مسئلہ حل نہیں ہو جاتا انہیں سیاسی مفاہمت کی بنیادی شرائط کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ مسائل کے حل کے لئے اپنی تجاویز کا خاکہ بھی پیش کرنا چاہئے محض پنجاب کو مورد الزام ٹھہرانا دانشوری قرار نہیں دیا جا سکتا نہیں یہ بھی بتانا چاہئے کہ "پنجاب" ہے کیا اور اسے کیا کرنا چاہئے!

کیونکہ آپ نے خواہ میری ذات کے حوالے سے ہی سہی، ملک کے سب سے اہم مسئلے اور سب صوبوں سے بڑے صوبے کی ذمہ داریوں اور رویّے کے بارے میں جس گفتگو کا آغاز کیا ہے وہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس وقت ہمارا سب سے اہم مسئلہ ہی یہ ہے کہ 'پنجاب کیا کرے'؟ جس طرح ماضی میں کہ جب پاکستان دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت تھا ملک کی سالمیت اور یکجہتی کا پنجاب کے طرزِ عمل اور رویے سے گہرا تعلق رہا ہے اسی طرح اب حال اور مستقبل میں بھی ملک کی بقاء و سالمیت اور یکجہتی کا انحصار پہلے سے بڑھ کر پنجاب ہی پر ہے۔

یونکہ پنجاب نہ صرف آبادی اور وسائل کے اعتبار سے ملک کا سب سے بڑا صوبہ ہے بلکہ باقی تینوں صوبے مل کر بھی اس کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے۔ اس لیے اگر پنجاب کا باشعور اور ذی فہم طبقہ اپنی ذمہ داریوں اور طرزِ عمل کے بارے میں غور و فکر شروع کر دے تو اس سے بڑھ کر حوصلہ افزا اور خوش آئند بات کیا ہو سکتی ہے۔

آپ کے ادارتی نوٹ میں اٹھائے گئے نکات پر اظہارِ خیال سے پہلے میں اپنی ذات کے حوالے سے اس عجیب و غریب کیفیت کا اظہار کرنا بھی مناسب سمجھتا ہوں جس سے مجھے ہر 'اپنے' بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش کی صورت میں سابقہ پیش آ رہا ہے 'بیگانے' کا لفظ تو چونکہ مصرعہ میں پہلے سے موجود ہے اس لیے مجبوراً تحریر میں آگیا ورنہ میرے لیے تو پنجابی، سندھی، بلوچ، پشتون اور مہاجر سبھی اپنے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ سچی بات کہنے کی وجہ سے یہ سارے 'اپنے' بیگانے ہوتے جاتے ہیں۔ گذشتہ برس جون میں مہاجرین کے رویے پر جب میرا ایک مضمون شائع ہوا تو جس طرح مہاجرین نے ہی خطوط، ملاقاتوں اور اخباری مراسلوں کے ذریعے مجھے تنقید کا نشانہ بنایا وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اب پھر "استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ" کی اشاعت کے بعد مہاجرین اور قدیم سندھی حضرات دونوں کی طرف سے اسی طرح کے ردِّ عمل کا سامنا ہے۔ ابھی چند روز قبل سندھ سے ایک پمفلٹ موصول ہوا ہے جس کا یہ عنوان ہی اس ردِّ عمل کا آئینہ دار ہے کہ "جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب! ہم مہاجر ... کو معاف رکھیں، اب ہم سندھیوں کے ساتھ نہیں لڑیں گے"۔ لیئق احمد قریشی سیکرٹری انجمن تحفظِ حقوقِ مہاجرین (حقیقی)، سندھ کی طرف سے شائع کیے جانے والے اس پمفلٹ کے ایک پیراگراف کا مطالعہ اہلِ پنجاب کے لیے بھی مفید ثابت ہو گا، جس میں مجھے اہلِ پنجاب کا نمائندہ قرار دے کر خطاب کیا گیا ہے۔

"جناب عزت مآب ڈاکٹر صاحب! اہالیانِ سندھ کی زمین اور نوکریاں لے جائیں اہلِ پنجاب، اور سندھی اگر آہ و فغاں کریں تو آپ انہیں کہیں اخوتِ اسلامی کا منکر! تو وہ مارکسزم کی طرف نہیں جائیں گے تو کیا وہ ڈاکٹر اسرار احمد کی خدمت میں جا کر قرآن مجید سیکھیں گے۔ جب صاحب موصوف نے ان پنجابیوں کو پرائے علاقے میں جا کر وسائل و روزگار پر قبضہ کر کے وہاں کے باشندوں کو بے روزگار بنانے سے منع کرنے والی کوئی آیتِ قرآن یا حدیثِ رسولؐ نہیں سنائی۔ ہاں البتہ سندھیوں کو ان کی محرومی پر شور کرنے پر تو کئی آیاتِ قرآن مجید سنا ڈالیں۔ کیا قرآن مجید کے استعمال سے آپ ان کو غیروں کے ہاتھ خود نہیں دھکیل رہے!!! یا للعجب پھر آپ فرماتے ہیں کہ سندھی نئی نسل ہندوؤں کو اپنا ہم قوم کہہ رہی ہے۔ مہاجرو! اٹھو پاکستان کو

بجا ئو۔ جناب ڈاکٹر صاحب اب تو ہم مہاجروں کی نئی نسل مذہبی جماعتوں، جماعت اسلامی، جمعیت علمائے پاکستان اور جمعیت علمائے اسلام سے مایوس ہو کر الطاف حسین کی مہاجر قومی موومنٹ کی طرف جا چکی ہے۔ الطاف صاحب نے اسلام کے خطرہ میں آجانے کی بات نہیں کی۔ موجودہ بحران کو مذہبی بحران قرار دینے کے عوض اس نے خالص سیاسی اقتصادی مسائل اور حقوق کی بات کی ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ اگر اسلام آباد کے مفتیوں نے اُن کو بھی غیر اسلامی شور کرنے والا قرار دیا تو جواباً یہ لوگ پھر نہیں کیا کریں گے۔"

اس اقتباس میں تو صرف معاشی اور سیاسی حقوق کی بات کی گئی ہے، لیکن اسی پمفلٹ میں مذہبی میدان میں قادیانیت، پرویزیت اور کمیونزم کی اشاعت کے حوالے سے پنجاب پر جو الزام عائد کئے گئے ہیں اور علامہ اقبال کے حوالے سے جن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے، شاید نوائے وقت کے صفحات اس کی تاب نہ لاسکیں لیکن وہ باتیں سندھ میں پھیل رہی ہیں اور پھیلائی جا رہی ہیں۔ کم و بیش اسی قسم کے جذبات کا اظہار قدیم سندھیوں کی طرف سے بھی ہو رہا ہے جس کے کچھ نمونے ماہ فروری کے "میثاق" میں شائع کئے گئے ہیں۔ درحقیقت قدیم اور جدید سندھیوں کے اس رویے کے سامنے آنے کے بعد یہ سوال اور زیادہ سنجیدگی، پیچیدگی اور گمبھیرتا کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ "پنجاب کیا کرے؟"

مجھے آپکی اس رائے سے تو بلا شبہ اتفاق ہے کہ "بدقسمتی سے جو لوگ عوام کا استحصال کرتے چلے آرہے ہیں خواہ وہ سندھی وڈیرے ہوں، پنجاب کے جاگیردار یا سندھ و بلوچستان کے خوانین و سرداروہی چھوٹے صوبوں کے حقوق کے علمبردار اور پنجاب کے خلاف نفرت انگیز مہم چلانے میں پیش پیش ہیں"۔ البتہ میں اس میں اتنا اضافہ ضرور کردوں گا کہ انہی کا ایک گروہ پنجاب اور مرکز میں برسر اقتدار چلا آرہا ہے اور قیام پاکستان سے لے کر آج تک اپنے گروہی مفادات کے بقاء اور تحفظ کے لئے ایسی پالیسیوں پر گامزن رہا ہے کہ جس کے نتیجے کے طور پر مشرقی پاکستان میں پنجاب دشمنی کے جذبات پیدا ہوئے اور پھر آج انہیں کی وجہ سے سندھ میں بدرجۂ اولیٰ اور سرحد و بلوچستان میں کسی حد تک "پنجاب" کا نام سیاسی گالی کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ ہمارے ملک کے تمام مسائل کا حل تو بلا شبہ اس طبقے کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی اقتدار سے چھٹکارا پانے میں مضمر ہے اور وہ بھی ایک اسلامی انقلاب کے ذریعے — لیکن یہ کام تو بہر حال ایک طویل، پُر مشقت اور صبر آزما جدوجہد کا طالب ہے — مگر اس وقت فوری طور پر چھوٹے صوبوں میں پنجاب کے خلاف نف

ے جذبات پیدا ہو جانے سے ملک کے سیاسی ڈھانچے یعنی وفاقِ پاکستان اور نظریے یعنی اسلام کو
جو خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔ اُن کے ازالے کے لئے کچھ فوری اقدامات کی بھی ضرورت ہے۔
مزید برآں یہ کہ چھوٹے صوبوں میں پائی جانے والی مایوسی اور بے چینی کے تمام تر اسباب محض پروپیگنڈے
تمل نہیں۔ اس لئے چھوٹے صوبوں کے مسائل کے حوالے سے پنجاب کو اپنی ذمہ داریاں یاد
انے پر آپ کا مجھے " استحصالی گروہ " کا " ترجمان " قرار دینا بھی کسی طرح مستحسن نہیں۔ مجھے
ن القابات سے نواز کر کہیں آپ بھی اُسی انتہا پسندی کا مظاہرہ تو نہیں کر رہے جس کا اظہار پنجاب
ے خلاف کیا جا رہا ہے۔

" پنجاب ہے کیا " کا سوال کر کے آپ نے جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اپنی جگہ
لکل بجا ہے کہ پنجاب کے عوام کی اکثریت فی الواقع اس استحصال میں حصہ دار نہیں، لیکن اس وقت تو
سئلہ یہ درپیش ہے کہ پنجاب کی نمائندگی کیسے ہو رہی اور کون کر رہا ہے؟ اور وہ جو کوئی بھی ہے اس
ے گناہوں کی پاداش میں بہرحال گالی تو پورے پنجاب کو پڑ رہی ہے۔ اور اس کے اثرات بھی پورے
لک پر مرتب ہو رہے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب " استحکامِ پاکستان اور مسئلہ سندھ " میں پورے
شرح و بسط سے اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ اس کا ایک اقتباس میرے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں کافی
معاون ثابت ہو گا۔

> " قصہ مختصر یہ کہ پنجاب کے حصے میں جو بدنامی آئی وہ اصلاً تو بیوروکریسی کے غلط رویے اور
> مارشل لاء کے تسلسل اور طوالت کی پیداوار ہے، اگرچہ اس سے قطع نظر کہ صحیح حقائق و
> واقعات تو اللہ ہی کے علم میں ہیں، بہرحال نظری طور پر اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا
> کہ پنجابی افسر شاہی اور مارشل لاء حکام کی بدعنوانیوں کے طفیل پنجاب کے کچھ لوگوں یا چند
> خاندانوں نے ناجائز فائدے بھی حاصل کئے ہوں، لیکن پاکستان کے مستقبل کے اعتبار
> سے جو چیز نہایت تشویشناک ہے وہ یہ کہ پاکستان کے اندرونی معاملے اور بین الصوبائی مقدمے
> میں ملک کا سب سے بڑا صوبہ ' مدعا علیہ ' کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں
> پنجاب کی عوامی نفسیات پر ' مدافعانہ ' رنگ غالب آ گیا ہے اور حرکت و اقدام سے گریز
> پنجاب کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی ہے۔ چنانچہ وہاں جو حرکت بالعموم نظر آتی ہے وہ ــــ
>
> چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات!
>
> کے مصداق اکثر و بیشتر صرف " شغل میلہ " کی نوعیت کی ہوتی ہے۔ ورنہ کسی سنجیدہ سماجی

یا سیاسی تحریک میں پنجاب صرف اس وقت شامل ہوتا ہے جب کوئی دوسرے لوگ اُسے شروع کر کے نقطۂ عروج کے قریب تک پہنچا دیں۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۳ء کی ایم آر ڈی کی تحریک پنجاب میں بالکل ناکام ہوگئی تھی نتیجۃً اس نے صرف سندھ اور اس کے بھی دیہی علاقے کی شورش کی صورت اختیار کرلی تھی۔ پھر آنسہ بینظیر بھٹو کی آمد پر پنجاب میں استقبال کا "شغل میلہ" تو بھرپور انداز میں ہوا لیکن ۱۴ اگست ۸۶ء کو مختصر سی ہل چل کے سوا پنجاب میں کوئی عوامی تحریک نہیں چلی اور ایک مرتبہ پھر سندھ کے بعض دیہی علاقے ہی کل ہنگامے کا مرکز بن کر رہ گئے۔ اور اگرچہ اس حالیہ ناکامی کے بعد مس بھٹو نے بہت ٹھنڈے اور حقیقت پسندانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا اور وہ پوری سنجیدگی اور تندہی کے ساتھ خاص طور پر پنجاب میں اپنی تنظیم کی صفوں کو درست اور منظم کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی ہیں۔ تاہم ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مستقبل قریب میں پنجاب کو جمہوریت کی کلی و کامل بحالی کے لئے کسی مؤثر سیاسی تحریک کے لئے آمادہ کیا جا سکے گا یا نہیں!

اور جیسے کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے پنجاب کا یہ سیاسی جمود اور قوم و وطن کے عظیم تر معاملات کے ضمن میں بے حسی اور لاتعلقی (INDIFEERENCE) کی روش پاکستان کے مستقبل کے لئے فی نفسہٖ بھی مضر اور خطرناک ہے۔ اس لئے کہ چھوٹے صوبوں کے عوام میں اس کی بنا پر پنجاب سے عمومی مایوسی اور بدظنی پیدا ہو رہی ہے اور خصوصاً سندھ میں تو اس کا ردِّ عمل بہت شدید ہے — مزید برآں اس کا بھی شدید خطرہ موجود ہے کہ اگر پنجاب کسی طرح حرکت میں نہ آیا تو مس بھٹو اور اُن کی پیپلز پارٹی کا سندھی حصہ بھی قومی سیاست کے میدان سے پسپائی اختیار کرلیں اور صوبائیت کے خول میں بند ہو کر سندھی نیشنلزم کے تیز دھارے میں نہ بہ جائیں۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوگیا تو اس کے نتائج پاکستان کے حق میں بہت خوفناک ہوں گے!"

آپ کا یہ ارشاد اپنی جگہ بالکل بجا ہے کہ "محض یہ کہہ دینے سے کہ پنجاب چھوٹے صوبوں کے معاشی اور سیاسی حقوق دے کر حالات کی سنگینی کو کم کرے، مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ انہیں سیاسی نظم کی بنیادی شرائط کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ مسائل کے حل کے لئے اپنی تجاویز کا خاکہ بھی پیش کرنا چاہئیے"۔ لیکن میرے حوالے سے آپ کا یہ مطالبہ کم از کم میرے حق میں آپ کے تجاہلِ عارفانہ سے

ئی شے نہیں۔ کیونکہ ملک کی انتخابی سیاست کے حوالے سے ایک غیر انتخابی فرد اور ایک غیر انتخابی
اعت کا امیر ہونے کے باوجود میں نے کراچی اور سندھ کے حالیہ واقعات کے دوران ۱۷ دسمبر ۱۹۸۶ء
نب کے اسی شہر لاہور میں پہلی مرتبہ پریس کانفرنس کے ذریعے ملک کے سیاسی مسئلے حل کرنے کے
ے بنیادی شرائط کے تعین کے ساتھ اپنی تجاویز کا خاکہ پیش کیا تھا جو بحمد اللہ ملک کے جملہ اخبارات کے
۱۸ دسمبر ۱۹۸۶ء کے نوائے وقت لاہور میں بھی صفحہ اوّل پر شائع ہوا تھا۔ اس بیان میں پیش کردہ
ے کے بنیادی نکات دوبارہ پیشِ خدمت ہیں۔

"۱۔ سندھ کی صوبائی حکومت کی نا اہلی اور ناکامی کے اس بیّن ثبوت کے بعد اس کا مزید ایک دن بھی برقرار رہنا غلط ہے۔ لہٰذا اُسے فوراً برطرف کر کے گورنر راج قائم کیا جائے اور گورنری کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے صوبہ سندھ ہی سے تعلق رکھنے والی کسی معروف اور باا ثر شخصیت کو آمادہ کیا جائے۔

۲۔ جنرل محمد ضیاء الحق کی نا اہلی اور ناکامی بھی اظہر من الشمس ہو چکی ہے اور اگرچہ اصولاً تو انہیں فوری طور پر پاکستان کی صدارت اور فوج کے چیف آف سٹاف دونوں عہدوں سے سبکدوش ہو جانا چاہیئے ــــــ لیکن اگر اس صورت میں کسی فوری دستوری بحران کا اندیشہ ہو تو انہیں کم از کم ایک عہدے کو تو فوراً چھوڑ دینا چاہیئے ــــــ تاکہ یہ تاثر کسی قدر کم ہو سکے کہ موجودہ حکومت سابقہ مارشل لاء ہی کے تسلسل کی حیثیت رکھتی ہے۔

۳۔ اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ فی الوقت ملکی سطح پر مسلم قومیت کا جذبہ بے حد کمزور پڑ چکا ہے اور فی الواقع اس کی جگہ نسلی اور لسانی قومیتوں نے لے لی ہے۔ لہٰذا اصلاح کے عمل کا آغاز اُن کی نفی سے نہیں بلکہ انہیں مناسب حد تک تسلیم کرتے ہوئے ہی ہی کیا جا سکتا ہے۔ ملکی دستور کے ضمن میں مرکز اور صوبوں کے مابین تقسیم کے علاوہ زبان اور ثقافت کی اساس پر نئے صوبوں کی تشکیل کے مطالبات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے اور اس معاملے میں قومی سطح پر اتفاق رائے (CONSENSUS) کے حصول کو اوّلین ترجیح دی جانی چاہیئے۔ جس کے لئے حسب ذیل دو صورتوں میں سے کوئی سی صورت اختیار کی جا سکتی ہے:۔

(۱) ۱۹۷۳ء کے اصل متفق علیہ آئین کو صرف قادیانیوں کے متعلق ترمیم کے ساتھ فوراً بحال کر دیا جائے اور اس کے تحت جماعتی بنیاد پر جلد از جلد انتخابات کرائے جائیں

جن کے ضمن میں رجسٹرڈ اور غیر رجسٹرڈ کی کوئی تقسیم حائل نہ ہو۔ اس کے بعد آئندہ قومی اسمبلی ہی دستور میں طے شدہ طریق پر دستور میں مطلوبہ ترامیم کرے۔

(ب) فوری طور پر غیر جماعتی بنیاد پر ایک دستور ساز اسمبلی کا انتخاب کرا دیا جائے جو ایک سال کے اندر اندر ایسا دستور تیار کرے جس پر پوری اسمبلی کے ارکان کی کم از کم دو تہائی تعداد متفق ہو جس میں ہر صوبے کے اراکینِ اسمبلی کی بھی کم از کم نصف تعداد ضرور شامل ہو۔ پھر اُس نئے دستور کے مطابق انتقالِ اقتدار کے لئے از سرِ نو انتخاب ہو۔"

میرے یہ خیالات کوئی نئے نہیں۔ میں سال ہا سال سے اپنے خطاباتِ جمعہ میں، ماہنامہ میثاق، کے اداریوں میں اور اس کے علاوہ دوسرے کئی فورموں سے ان کا اظہار کر رہا ہوں۔ آپ کو ان سے اتفاق یا اختلاف کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ البتہ ۴ر جنوری کے خطابِ جمعہ میں اپنی پوری سیاسی فکر کا اظہار نہ کرنے کے جرم کا مجھے بہرحال اعتراف ہے جس کی بنیاد پر آپ نے اپنے اداراتی کالموں میں گرفت فرمائی ہے۔

میرے نزدیک ملک میں جمہوری عمل تب ہی برگ و بار لا سکتا ہے کہ پنجاب اس کا علمبردار بن کر کھڑا ہو۔ اصل اور بنیادی محرومی سیاسی حقوق سے محرومی ہے جس کے نتیجے میں معاشی، ثقافتی اور لسانی محرومیاں بھی جنم لیتی ہیں۔ اگر ملک میں جمہوری عمل بحال ہو جائے تو دوسری محرومیوں کے ازالے کا راستہ بھی کھل جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں سیاسی محرومی کا عمل اتنے خوفناک نتائج پیدا کر چکا ہے کہ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ جیسا "پنجابی" اور "پاکستانی" بھی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ "اب صرف جمہوریت کی بحالی سے مسائل حل نہیں ہوں گے"۔ اگر میں نے بھی وہی بات کہہ دی ہے تو آپ مجھے "پنجاب کو موردِ الزام ٹھہرانے کی دانشوری" کا طعنہ دے رہے ہیں۔ حالانکہ میری تگ و دو کا مقصد ہی یہ ہے کہ اہلِ پنجاب بے حسی، جمود، تعطّل اور بالفاظِ دیگر "دانش وری" کی اس روش کو چھوڑ کر ملک کی سیاست میں فعال حصہ لیں، صحتمندانہ بنیادوں پر افہام و تفہیم کا آغاز ہو اور ہم ایک دوسرے کے گلے شکوے سُن کر اپنی غلط فہمیوں کا ازالہ کریں۔

علامہ اقبال کے اس شعر کے ساتھ اپنی گذارشات ختم کرتا ہوں کہ :

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

(۲)

....گویا یہ بھی اُن کے دِل میں تھا

امیرِ تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ماہِ گذشتہ اندرونِ سندھ کے دورے کے بعد پہلے ہی خطابِ جمعہ میں لاہور کے سامعین کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ دل کے کانوں سے سننے والوں نے بھی ان کا درد اور اضطراب ضرور محسوس کیا ہوگا تاہم ان کے قریب ترین ساتھی ہی خوب جانتے ہیں کہ وہاں سے واپس پر وہ اپنے قلب و دماغ پر کتنا بڑا بوجھ لادکر لائے ہیں۔ بقول ان کے صورت حال کے تجزیہ کی حد تک تو اس دورہ نے ان کی معلومات میں ایسا کوئی اضافہ نہیں کیا جو "استحکامِ پاکستان اور مسئلہ سندھ" نامی کتاب میں بیان کردہ ان کے نقطہ نظر میں کسی بڑی تبدیلی کا متقاضی ہو لیکن نتائج و عواقب کا جو ہولناک نقشہ وہ دیکھ اور سُن کر آئے ہیں اس کی ہولناکی اُن کے اندازوں سے کہیں بڑھ کر نکلی۔ ملکِ خداداد ۱۹۷۱ء میں دولخت ہوا تو بعد از مرگ واویلا کرنے میں یہاں چند بدبختوں کے سوا کوئی بھی کسی سے پیچھے نہ رہا لیکن آج ضرورت پیش از مرگ واویلے کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اہلِ پاکستان کو بالعموم اور پنجاب والوں کو بالخصوص جھنجھوڑنے میں اپنی سی کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن کون سنتا ہے فغانِ درویش کہ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا۔ تاہم ان کے سینے میں ہے 'جذبوں کا تلاطم' اب تک۔ وہ معذرتاً الی اللہ اپنی سعی و جہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کے خطبۂ جمعہ کا یہ حصّہ ظاہر ہے کہ اُسی حد تک اخبارات میں نمایاں ہو سکا جیسی کچھ اہمیت مسئلہ سندھ کو یہاں دی جا رہی ہے۔ بایں ہمہ روزنامہ "ڈان" کراچی نے اسے کما حقہٗ اہمیت دی اور ایک طویل اداریہ سپردِ قلم کیا۔ ہم کسی آبگینے کو ٹھیس لگانے کی خواہش رکھے بغیر عرض کریں گے کہ درد وہیں ہوتا ہے جہاں چوٹ لگی ہو۔ "ڈان" سندھ کے دارالحکومت کراچی سے

شائع ہوتا ہے اور اس کے مالکان نجیب الطرفین سندھی ہونے کے ناطے اپنے
صوبے کی صورتِ حال کا یقیناً بہتر ادراک رکھتے ہیں۔ انہیں ڈاکٹر صاحب
کی "کمزوری آواز" سُن کر محسوس ہوا کہ گویا یہ بھی ان کے دل میں تھا۔ راقم
نے "ڈان" کے شمارہ ۲۳ فروری ۸۷ء کے اداریے کا تقریباً لفظ بلفظ ترجمہ کیا ہے تاکہ
سطور اور بین السطور دونوں ہی کو قارئین از خود سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایک ہی بات
کو اس مؤقر انگریزی روزنامے نے جس انداز میں دہرایا ہے اور ایک ہی مضمون کو
جس طور سو رنگ سے باندھا ہے اس سے ہر دردمند پاکستانی بخوبی محسوس کر لے گا
کہ معاملے کی نوعیت کس درجہ سنگین ہے۔ ورنہ پنجاب میں تو ہمارے مہربان و
مشفق ناصحین ڈاکٹر صاحب موصوف کو ایک یاس و بے یقینی کا شکار داعی شمار کرتے
ہیں جس کے ہاتھ لوگوں کو چونکانے کے لئے ایک موضوع لگ گیا ہے۔ یہاں
تو "سب اچھا" ہے، شادمانی بستی ہے، بسنت کی مستی ہے، گرمیٔ بازار ہے،
جشنِ نوبہار ہے، لاکھوں کی آتش بازی ہے، رقصِ اسپ تازی ہے، کرّ و فر ہے،
کروڑوں کا صرفہ ہے، نمود و نمائش میں دادِ طلبی دو طرفہ ہے، کتوں کے حسن کو
انعام ہے، "فنکاروں" کا اکرام ہے، نشاطِ امروز کو فروغ ہے، فکرِ فردا کیا! دروغ
ہے۔ الغرض ہر روز روزِ عید ہے ہر شب شب برات ————— (اقتدار احمد)

DAWN

Monday, February 23, 1987

Sane advice

DR ISRAR AHMAD'S sug-
·stion to the ulema and in-
llectuals of Punjab to visit
nd to study the political situa-
›n in the province is both
nely and eminently sensible.
ıe well-known religious
ader was giving his impres-
›ns of a 12-day study tour of
nd which appears to have
oved instructive for him. In
·essing wider contacts bet-
ween the two provinces, he lamented the fact that despite considerable progress in media communication, the people of Punjab and Sind were not adequately informed of the conditions and thinking of each other. This is largely attributable to the limited inter-provincial contact at the popular level. Administrators, bureaucrats and policy-makers from Islamabad and Lahore no doubt pay visits to Sind — mainly Karachi — but such contacts are primarily of an official nature. When they do get to meet the people, it is more often at the level of pre-arranged brief meetings with

some representatives of the public, the Press, learned bodies and professions or business institutions. These do not really give them a true picture of how the common man in Sind feels, how he perceives various issues and what his grievances are. As for a people-to-people rapport between the two provinces, it is practically next to nil in the sense that there is very little of intermingling and intercommunication at social and cultural levels, which could promote mutual understanding and a feeling of affinity. Domestic tourism is as good as non-existent and the few non-officials from Punjab who travel to Sind do so for a limited purpose — for meeting friends and relatives or looking for jobs or business prospects. Political platform often brings party leaders and cadres from other provinces together here in Sind as elsewhere. But such contacts by their very nature and purpose take place on a different wavelength altogether. These generally have to do with broader political issues and offer very little scope for studying the people's problems in depth or in getting acquainted with their thinking and feeling in any meaningful sense. Moreover, whatever inter-provincial contacts have been developed are confined to Karachi. The interior of Sind virtually remains an unfamiliar world for the people of Punjab as for those of the rest of the country, including even Karachi. As could be expected, this lack of inter-communication between the two major provinces, Punjab and Sind, has had a stultifying effect on the growth of inter-provincial understanding and ethnic harmony.

One way of overcoming this weakness is to promote closer contacts of Punjab's leaders of opinion with those of Sind. If the scholars, intellectuals, ulema, journalists, writers and social leaders of Punjab pay more frequent visits to the towns, villages and countryside of this province, they would gain a better insight into the thinking, beliefs and perceptions of the people here. True, some of the knowledge thus gained might even be hurtful at first but in due course it would help promote a better understanding between the two regions and remove the bitterness and antipathy that have come to colour their perception of each other. Opinion-makers in Punjab have a crucial role to play in this context. If they decide to gain a first-hand knowledge of Sind and try to understand the problems and grievances of the people here in a sympathetic spirit, they will have made a major contribution towards removing the barriers of misunderstanding between the two provinces. Armed with this knowledge, writers, scholars and ulema can educate the masses in their own province. The point to emphasise is that if Sind or any other of the smaller provinces feels aggrieved on grounds of the predominance of Punjab in all positions of power, including the bureaucracy and the

armed forces, and considers itself politically and economically disadvantaged or discriminated against, it is for the majority province to try to understand this feeling in relation to its causes and implications — and not to turn away from it in a spirit of indignant rejection. Indeed, if a basically sympathetic and constructive approach is adopted, it will be possible for government leaders, administrators and opinion-makers in Punjab to initiate or counsel remedial action where and to the extent necessary. The crucial factor is an assurance of sympathetic understanding of the problems and grievances of the smaller provinces. Given this, a lot of inter-provincial misunderstanding on basic political and economic issues is bound gradually to melt away.

ایک دانشمندانہ مشورہ

ڈاکٹر اسرار احمد کا پنجاب کے علماء اور دانشوروں کو صوبے کی سیاسی صورتِ حال کے مطالعہ کے لئے سندھ کے سفر کا مشورہ بروقت بھی ہے اور حد درجہ دانشمندانہ بھی۔ یہ مشورہ اس معروف دینی رہنما نے اپنے بارہ روزہ دورۂ سندھ کے تاثرات بیان کرتے ہوئے دیا جو اُن کے لئے سبق آموز ثابت ہوا ہے۔ دونوں صوبوں کے درمیان وسیع تر روابط کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے انہوں نے حسرت سے اس حقیقت کا ذکر کیا کہ ذرائع ابلاغ کے قابلِ لحاظ ارتقاء کے باوصف پنجاب اور سندھ کے باسی ایک دوسرے کے احوال اور سوچ کی نہج سے ایک مناسب حد تک آگاہ بھی نہیں ہیں۔ یہ کیفیت عوامی سطح پر بین الصوبائی رابطے کے محدود ہونے کا نتیجہ ہے۔ اسلام آباد اور لاہور سے منتظمینِ سرکار، افسرانِ بالا اور اربابِ حل و عقد یقیناً سندھ کے —— لیکن اکثر اوقات بس کراچی کی حد تک ہی —— دورے فرماتے رہتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ روابط بہ سرکار ہی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ انہیں کبھی عام لوگوں سے واسطہ پڑ جائے تو وہ بھی بالعموم مخصوص عوامی نمائندوں، اخباری وقائع نگاروں اور پیشہ ورانہ تنظیموں یا کاروباری اداروں سے طے شدہ مختصر ملاقاتوں کی سطح پر رہتا ہے۔ یہ سب کچھ انہیں تصویر کا یہ رُخ دیکھنے کا موقع ہرگز فراہم نہیں کرتا کہ سندھ کا عام آدمی کیا محسوس کر رہا ہے۔ متنوع مسائل پر اس کا زاویۂ نگاہ کیا ہے اور یہ کہ اس کی اصل شکایات ہیں کیا! جہاں تک دونوں صوبوں کے عوام میں کسی جذباتی بندھن کا تعلق ہے تو اس پر ان معنوں میں الشاذ کالمعدوم کا حکم لگایا جاسکتا ہے کہ

وہ باہمی اختلاط اور سماجی و ثقافتی مراسم نہ ہونے کے برابر ہیں جو افہام و تفہیم اور قربت کے احساسات پیدا کرنے کا باعث بن سکیں بعض اندرون ملک سیر و سیاحت کا شوق بھی عنقا ر ہے اور پنجاب سے جو معدودے چند غیر سرکاری شخصیتیں سندھ کا سفر اختیار کرتی ہیں ان کے مقاصد بھی متعین ہوتے ہیں۔ اعزا و اقربا سے ملاقات یا پھر ملازمتوں کی تلاش اور کاروباری مواقع کی جستجو۔ سیاسی تقاریب سندھ میں بھی دوسرے صوبوں کی طرح گاہے گاہے کسی سیاسی جماعت کے مختلف صوبوں سے متعلق قائدین اور فعال کارکنوں کو یکجا کر دیتی ہیں لیکن رابطے کی یہ شکل بھی اپنی نوعیت اور مقصد کے اعتبار سے ہی مختلف اساسات پر استوار ہوتی ہے کیونکہ ان میں بالعموم وسیع تر اور ملک گیر سیاسی مسائل تو زیر بحث آتے ہیں لیکن عوام کے مسائل کا کسی قدر گہرائی میں مطالعہ یا ان کے خیالات محسوسات سے واقفیت حاصل کرنے کی کوئی بامقصد کوشش ان کا موضوع نہیں ہوتی۔ ایک تلخ حقیقت یہی ہے کہ جیسے کچھ بین الصوبائی روابط تا حال قائم ہو سکے ہیں ان کا مرکز و محور بھی صرف شہر کراچی ہے۔ اندرون سندھ پنجاب کے لوگوں کے لئے بھی عملاً اتنا ہی نامانوس ہے جتنا ملک کے دوسرے حصوں کے لئے بلکہ خود کراچی کے لئے ہے۔ اس صورت حال کا متوقع نتیجہ یہی ہو سکتا تھا اور ہوا کہ دو بڑے صوبوں ـــ پنجاب اور سندھ ـــ میں باہمی روابط کے فقدان نے بین الصوبائی ہم آہنگی اور نسلی وحدت کے ارتقا کو جمود کا شکار بنا کے چھوڑا ہے۔

اس کمزور پہلو کو تقویت دینے کا ایک نسخہ یہ ہے کہ پنجاب میں فکری رہنمائی دینے والے لوگ سندھ کے ہم پلہ رہنماؤں سے قریبی تعلقات پیدا کریں۔ اگر پنجاب کے اہل علم، دانشور، علمائے دین، صحافی، اہل قلم اور سماجی رہنما سندھ کے چھوٹے بڑے شہروں، دیہات اور اندرونی علاقوں میں نسبتاً زیادہ آمد و رفت رکھیں تو انہیں یہاں کی سوچ، معتقدات اور تصورات کی بہتر آگہی حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ اندیشہ بھی موہوم نہیں کہ اول اول یہ آگہی شاید زیادہ ہی حوصلہ شکن ثابت ہو لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اس کے ذریعے دونوں علاقوں کے درمیان زیادہ بہتر ہم آہنگی پیدا ہوگی اور وہ تلخی اور دوری ختم ہوگی جس نے ایک دوسرے کے خیالات کو مختلف رنگ دے دیئے ہیں۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو پنجاب کے ان لوگوں کے لئے اہم ترین کردار ادا کرنے کا موقعہ موجود ہے جو عوامی سوچ کے زاویے متعین کرتے ہیں۔ اگر وہ لوگ سندھ کے بلاواسطہ مطالعے کے قصد کے ساتھ وہاں کے لوگوں کی مشکلوں اور پریشانیوں کو ہمدردی سے سمجھنے کی کوشش کریں تو فی الحقیقت دونوں صوبوں کے درمیان حائل سوئے ظن کی خلیج پاٹنے میں

اُن کا یہ کام بہت اہم ہوگا۔ اس براہِ راست مطالعہ کی مدد سے اہلِ قلم، صاحبانِ علم اور علمائے دین خود اپنے صوبے، پنجاب میں بھی اپنے عوام کو معاملے کا صحیح ادراک دے سکیں گے۔ جس نکتے پر زور دینا مقصود ہے اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ اگر سندھ یا کوئی دوسرا چھوٹا صوبہ بیوروکریسی اور فوج سمیت اختیار و اقتدار کی ہر سطح پر پنجاب کی بالادستی سے نالاں ہو اور خود کو سیاسی اور معاشی میدان میں محرومی یا معکوس امتیازی سلوک کا شکار سمجھنے لگے تو اکثریتی صوبے پر واجب ہے کہ اس احساسِ محرومی، اس کے اسباب اور اس کے واقعی اثرات کو سمجھنے کی کوشش کرے نہ یہ کہ اغماض اور تنفر کی روش اختیار کئے رکھے۔ واقعہ یہ ہے کہ پنجاب کے اربابِ حکومت، کارپردازانِ سرکار اور اہلِ رائے راہنماؤں کے لئے مناسب حد تک تلافیٔ مافات کے طریقوں کی تلاش اور ان پر عملدرآمد تبھی ممکن ہوگا جب وہ بنیادی طور پر ہمدردانہ اور تعمیری رویّہ اپنانے کا فیصلہ کریں۔ چھوٹے صوبوں کو ان کے مسائل اور احساساتِ محرومی کے بارے میں ہمدردانہ افہام و تفہیم کی یقین دہانی کرانا ہی اب فیصلہ کن عامل ہے یہ ہو تو اساسی سیاسی و معاشی مسائل پر موجود بین الصوبائی کدورت رفتہ رفتہ بڑی حد تک تحلیل ہوجائے گی۔

(۴)

From prehistoric times to 1970

History of Sind at a glance

By Sayid Ghulam Mustafa Shah

Sind takes its name from Sindhu (the name of river Indus). Historically it comprised the whole Indus Valley from Kashmir to the Arabian Sea. Modern Sind, geographically, is bounded by Baluchistan, Khirthar and Halar mountains on the west, Sibi and Bughti areas on the north, Bhawalpur and Rajasthan on the north-east and east and the Arabian Sea on the south. The entire landmass can be divided into three parts. The central part, which has a rich alluvial soil and through which passes the river Indus; the sandy and desert areas in

the east and on the right the mountains extending along the entire border to the Arabian Sea.

Throughout history Sind has more to do with countries on its west than with India (Hind). Hind and Sind were separate territories. Sind had greater contact with Arabia, Iraq, Iran and Afghanistan than with India.

The Indian hold on Sind began from the days of Delhi Sultanate but it remained casual, precarious and uncertain. Greek historians debated whether the Indus was the dividing line between Hind and Sind. The Persian and Arabian travellers and historians and geographers always emphasised that the Indus valley formed the buffer zone between India and western countries. Moen-jo-Daro civilization is a non-Aryan civilization and so different from the civilizations in India.

Sind is an archeological oasis. In the history of Sind there appears to be a vacuum between 2500 to 2000 B.C.; and it is only after that we come to the more reliable and more dependable portion of Sind's history. The history of Sind begins from 520 to 515 B.C. when Darius I sent forces and annexed Sind to the Persian Empire. Two centuries later Sind was visited by Alexander the Great whose marches and solourns through the valley have been recorded by Greek historians. Sehwan is said to have been founded by Alexander the Great, and his return march to Greece took him to Khuzdar and Kharan in Baluchistan.

Sind remained under Greek-Mongolian influence for sometime as is evidenced from the finds of Moen-jo-Daro. For some time the rulers of Sind lived under the suzerainty of Mauryan dynasty. Greek rule was re-established by Bacterian Greek conquest in 195 B.C.

The Greeks were followed by Scythians who were Turks by race. Later, about 100 B.C. Buddhist in luence worked and prevailed as found from material discovered Moen-jo-Daro. Scythians had the centre of activity in Bambhore, ar they advanced along the coast the Arabian Sea. The Scythians ar Kushans were of Turkish desce and this brought Sind under the ir luence of Turkish culture. One the great emperors of Kush dynasty, Kanishka, became t protector of Buddhism which h spread in Sind from 100 B.C to 1 A.C. One of Kanishka's successo ruled Sind and his coins have be found at Moen-jo-Daro.

Turkish influence increased u der the Parthian kings evidence their rule is found in Seista Kandhar and Sind. At this sta Brahmanism had established foothold in Sind among the ruli classes, but the masses of peop continued to follow Buddhism Tu kish influence got some 'cendancy under the Huns and th Buddhism received a setback T Huns dominated Persia and Si Under Naosherwan, Sind was nexed to the Persian empire. T rise of Sassanid empire in the thi century brought Sind under t sway of Persia.

Arabs

In the sixth century Sind beca independent of Persia. Persian i luence waned after the death Khusrow Pervez. With the weak ing of Persia, Chuch the ruler Sind asserted his independen and tried to invade the Makran p vince of Persia. This brought him contact with the Arab forces Makran.

A period of hostility betwe Arabs and Chuch began and t got worsened the reign of Dah the son of Chuch. Arabs tried follow the policy of peace and existence but Dahar made it imp sible, and Hujjaj bin Yusuf, t Umayyad Governor of Iraq.

forced to send Arab forces under Muhammad bin Qassim to chastise Dahar. A police of restraint was followed by pious Caliphate and Ummayads, and only when peaceful efforts failed, had Sind to be conquered and made part of the Ummayad empire in 712.

For about 400 years from now on Sind remained an integral part of Ummayad and Abbasid dynasties. Provincial Governors were appointed by the Arab Central Governments, and history has recorded some 37 names of these governors. By the end of the 9th century the Saffarids administered Sind for Baghdad. After the weakening of the Central Arab authority, local Arab dynastic rule continued for nearly 130 years which included the Fatamid influence from Egypt. Sultan Mahmood and his son Masood came next. The Sumras of Sind came under Fatamid influence, but they subsequently revolted and established their independent rule in Sind.

Arab rule brought Sind within the orbit of Muslim civilization. Sindhi as a language developed further and Nashh was introduced. Sindhi scholars began to play their part in various Arab and Muslim empires. The evidence of Mansura, the Capital of Arabs in Sind, testifies to the greatness of Arab administration.

Sumras (1060-1350) were the native sons of Sind and they fraternized with the Arabs. They accepted Islam and grew strong and established independent rule in Sind. Names of 21 Sumra rulers are recorded in history. They ruled Sind for about 300 years. The great Sindhi romantic stories of Doda Sumra and Alauddin inform us of the invasion of Allauddin and the resistance put up by the Sumras. Tharri, Muhammad Tur and Rupah were centres of their activities. This is considered to be the most romantic period in Sind's history which gave birth to patriotic literature and folk songs. In this period lived Qalandar Lal Shahbaz at Sehwan.

The Sumras were followed by Summas (1350-1520) who had accepted Islam in the 8th Century. They called themselves Jams. They made Thatta their capital. The tomb of Jam Nizamuddin, the 17th ruler, at Makli is a great architectural beauty. It was during this period that Sind came in direct contact with Delhi, and Persian became the official language in place of Arabic. This period marks the beginning of Sufistic thought and teachings in Sind.

Shah Beg Arghun sent his armies and conquered Sibi, a province of Jam Nizamuddin. The Kandhar forces were defeated by a Commander of Jam Nizamuddin (Darya Khan) and Muhammad Beg, the brother of Shah Beg, was killed. Under the impact of Baber's invasion Shah Beg left Kandhar and marched on Sind. Jam Nizamuddin was successed at this time by Jam Feroz, who being a very weak ruler, surrendered; thus Arghun power was established in Sind. The Arghun dynasty (1520-1555) weakened after the death of Mirza Shah Hassan (son of Mirza Shah Beg). It was at this time that Humayun came to Sind and Akbar was born in Umarkote.

At this time lived Shah Abdul Karim of Bhurai, the poet-saint of Sind. He was grand father of Shah Abdul Latif Bhitai. At this time also lived Makhdoom Nooh of Hala. He was the first man to translate the Holy Quran into Persian in the Indo-Pakistan Subcontinent.

On the death of Mirza Shah Hassan, Sind was divided into two parts. The kingdom of Thatta under Mirza Isa Turkhan and kingdom at Bakhar of Sultan Mahmood Khan. The Turkish rulers (1555-1592) never pulled together well and this facilitated the Portuguese incursions in Sind. The Portuguese sacked Thatta in 1557, burning the

city and massacring its population. This invasion increased further hostility among the sons of Mirza Isa in which Mirza Baqi won and he ruled with high handedness and terror. Peace returned to Sind in the reign of Mirza Jani Beg. During his time Mughal Armies marched against Sind and Mirza Jani Beg surrendered to Khan-e-Khanan.

Mughals

Sind was thus conquered for Emperor Akbar but it was still administered as a Jagir by Mirza Jani Beg and his son Mirza Ghazi Beg. After his death, Sind passed under the direct control of Mughal Emperor. Nearly 40 governors were appointed during the Mughal period (1592-1773) who served in Sind.

Sind saw a new real change by the second half of the 16th century when Kalhoras established their authority in territories of Dadu Larkana. The Mughal rule was confined to Thatta and its surrounding areas. Kalhoras conquered Thatta, soon after they had consolidated their authority in the north.

During this period (1700-1780) the Kalhoras designed their administrative system on the lines of Mughals and took great interest in architecture and built a number of mosques and monuments at Rohri, Sukkur, Thatta and Sehwan.

By the end of the 17th Century Kalhora rule was firmly established and had received Mughal Imperial recognition during the reign of Farrukh Sayair.

Mian Noor Mohammad Kalhora was able to carry Kalhora administration to Thatta and his son Ghulam Shah was one of the most illustrious rulers of that dynasty. He founded Hyderabad.

This is when Shah Abdul Latif Bhitai lived and gave us his poetry. This is the period in which Makhdoom Mohammad Hashim Thattavi Shah built the tomb of Shah Abdul Latif Bhitai. After his death the Kalhora power weakened and under the leadership of Mir Fateh Ali Khan Talpur the Baloch tribues revolted against the Kalhoras and defeated Mian Abdul Nabi in the battle of Halani.

The Talpurs of Sind soon captured Karachi, Khairpur and Umerkot. They ruled Sind for about 60 years (1782-1843) and on account of their tribal dissensions and rivalries made it possible for the British to come in. In the year 1843 Sind was conquered by Sir Charles Napier and the Mirs of Sind were defeated in the battles of Miani, Dabo and Kunri. The British began their attack on Sind from their establishments in Bombay and Gujrat and that is why Sind was annexed to the Bombay Presidency.

The Muslims of Sind, in the beginning of the 20th Century started their struggle for the separation of Sind from the Bombay Presidency, and this demand gained concrete shape in the Round Table Conference of 1931-32 when it became a real issue. Moulana Muhammad Ali Johar demanded it and Quaid-i-Azam Muhammad Ali Jinnah included the Separation of Sind in his famous 14 points. The leaders of Sind who played their part for the separation of Sind at the Round Table Conference were H.R.H. the Aga Khan, Sir Ghulam Hussain Hidayatullah and Sir Shah Nawaz Bhutto.

It is worth noting that Sind resisted British domination from the very day it was conquered. Sind was also a headache for the British imperial authority. Sind gave asylum and passage to Syed Ahmed Breilvi and Shah Ismail in their crusade against Sikhs and they passed through Sind and went to the Frontier Pronvince.

The Sikhs never dared to enter Sind in spite of their power and might in the Punjab.

Sind had to face Martial Law more than a dozen times from the year of its conquest 1843 to 1942. The revolt of Hurs was a phenomenon that the British had always to contend with. There are a number of great men in the history of Sind who played their part in refusing to accept British authority in Sind. They were men like Darya Khan Jakharani, Dil Murad Khoso and Sayyid Inayat Shah and later Maulana Obaidullah Sindhi and Shaikh Abdul Majid Sindhi.

Sind was a very small territory in area and in population but in history it had played its part in educational, literary, administrative, political and international spheres out of all proportions to its size. Sindhi scholars, Sufis and administrators have left their mark on history from North Africa to India from the 9th Century to the present day.

The British knew the restiveness and recalcitrance and the spirit of revolt of the Muslims of Sind. They could never count on the absolute loyalty and unquestioned allegiance of the Muslims of Sind to their rule. They tried to exclude them from all their civil and military affairs. They counted for this on the Sindhi Hindus for civil administration and on the Punjab for their police and army needs. The Muslims of Sind could never accept seduction and collaboration witn the British.

As a result of the Round Table Conference and promulgation of the Government of India Act 1935, provincial assembly elections were held and Sind became an autonomous province of India in 1936.

The Muslims of Sind soon organized Muslim League in Sind under the guidance of Quaid-i-Azam Muhammad Ali Jinnah. There took place the famous Muslim League conference in Karachi in 1938 which became a fore-runner for the Muslim League conference at Lahore in 1940 where the Pakistan Resolution was passed. Sind Assembly was the first provincial legislature in India to pass a resolution supporting the idea of Pakistan, and this resolution was moved by Mr G.M. Sayed in the Sind Provincial Assembly as President of the Sind Provincial Muslim League.

At the time of independence Sind was the only province of Pakistan which became part of the country geographically as it was. Bengal was divided, the province of Punjab was divided. The Frontier was under the administrative control of Congress Government and was offering resistance to joining Pakistan, and there was Afghanistan working against Pakistan. Baluchistan remained an uncommitted territory for some time. Kashmir became a disputed territory. Sind was the only province which joined Pakistan and wholeheartedly.

Sind continued to be a separate province of Pakistan till the year 1955 when by administrative orders it was merged into One Unit of West Pakistan. It created any amount of ill-will and bad blood resulting in many tragedies. The artificial scheme of One Unit had to be abandoned and it was undone, and all the old Provinces of Pakistan were re-established in 1970.

(۴)

سندھ کی صورتِ حال

ڈاکٹر عبدالخالق

سندھ پاکستان میں مختلف النوع محرومیوں کے احساس کا سب سے بڑا مظہر بن چکا ہے اور سیاسی و معاشی سماجی و معاشرتی، نسلی ولسانی اور تہذیبی و ثقافتی جملہ اقسام کے تصادموں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس کے مسائل کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے اور حقیقی اور واقعی شکایات کے مستقل ازالے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔

ملک گیر سیاسی محرومی اور معاشی استحصال

اس محرومی کا سب سے گہرا اور بنیادی سبب وہ ظالمانہ اور استحصالی سیاسی و معاشی نظام ہے جو پورے ملک پر مسلط ہے۔ اور جس کے نتیجے میں پاکستانی قوم شدید قسم کی افقی تقسیم اور محاذ آرائی کا شکار ہو گئی ہے۔

آزادی کے ثمرات عوام تک نہیں پہنچے انہیں نوابوں جاگیرداروں، میروں پیروں زمینداروں اور وڈیروں نے اچک لیا۔ پھر ان میں سول بیوروکریسی حصہ دار بنی اور آخر میں فوج نے قبضہ جما لیا۔ فوج، سول سروس اور خداوندانِ زمین نے نو دولتیوں کا نیا طبقہ پروان چڑھایا۔ بیشتر زمیندار کارخانوں کے مالک بن گئے اور بہت سے فوجی جرنیل زمیندار اور صنعت کار۔ یوں اس اتحادِ ثلاثہ نے ملکی وسائل اور عوام کے حقوق کا استحصال کر رکھا ہے۔ قومی آمدنی کا غالب ترین حصہ ان کے مفادات پر صرف ہوتا ہے۔ عوام کے حصے میں محرومیاں آتی ہیں۔ عام آدمی پنجاب، سرحد، بلوچستان سندھ ہر جگہ ظلم کی چکی میں پس رہا ہے۔ پوری پاکستانی قوم کے تحت الشعور میں ایک بے چینی اور احساسِ محرومی سرایت کئے ہوئے ہے البتہ اس کا احساس و شعور سندھ کے باسیوں کو سب سے بڑھ کر ہوا ہے۔ ایک تو مرکزی سول بیوروکریسی میں قدرتی طور پر پنجاب غالب ہے دوسرے مارشل لا کے تسلسل نے فوج کے سب سے مضبوط قومی ادارے کو بھی پنجابی استحصال کی علامت بنا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے عام سندھی نوجوانوں میں پنجاب کے "دیسی سامراج"

اور "نوآبادیاتی نظام" سے شدید نفرت پائی جاتی ہے۔

مہاجرین کی مسلسل آمد اور کراچی میں پنجابیوں اور پٹھانوں کی بھاری تعداد میں بے روک ٹوک منتقلی نے سندھیوں کو اپنے صوبے میں اقلیت میں تبدیل ہونے کے خدشے میں مبتلا کر رکھا ہے۔ قدیم سندھیوں کو اردو بولنے والے مہاجرین سے سندھی تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب کے خاتمے کا خدشہ لاحق ہے۔ دوسری طرف مہاجرین شدید محرومی اور مایوسی کا شکار ہیں۔ کوٹہ سسٹم اور شہری اور دیہاتی کی تقسیم نے اردو بولنے والوں کے نوجوانوں کی اہلیت کی قدر گھٹا دی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں بنگال میں ان پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹے۔ پھر سندھ میں لسانی ہنگاموں نے انہیں اپنے وطن میں ناپسندیدہ شہری بنا دیا۔ پٹھانوں سے تصادم نے انہیں اپنی جائے امان میں سنگین عدم تحفظ کا احساس دلایا۔

اخلاقی بحران

جنرل ضیاء الحق صاحب کی مذہبی ٹیپ ٹاپ کے مظاہر اور نفاذ شریعت کے دعوؤں کے برعکس پیش رفت نے قوم کو انفرادی اور اجتماعی اخلاقی کردار کی پستی کی انتہا و منافقت تک پہنچا دیا۔ مسلم قومیت کا جذبہ جو تحریک پاکستان کی بنیاد تھا آزادی کے بعد سرد پڑتا چلا گیا۔ اب اس کی جگہ نسلی لسانی قومیتوں اور علاقائی اور صوبائی عصبیتوں نے لے لی ہے۔ مذہبی فرقہ واریت بھی اپنی انتہا کی طرف تیزی سے رواں دواں ہے۔ گویا ہم بحیثیت قوم آگ کے ایک گڑھے کے بالکل کنارے پر کھڑے ہیں۔

مستقل علاج اور فوری تدابیر

مستقل علاج

پاکستان کی اساس بھی اسلام کا مذہبی جذبہ تھا اور اس کی بقا اور استحکام کے لئے بھی سوائے اس مذہبی جذبے کے کوئی اور سہارا موجود نہیں۔ اس کے لئے حسب ذیل چیزیں ناگزیر اور لازمی ہیں۔

ا۔ ایک ایسا طاقتور انسانی جذبہ جو جملہ حیوانی جبلتوں پر غالب آجائے اور قوم کے افراد میں کسی مقصد کے لئے تن من دھن لگا دینے حتیٰ کہ جان تک قربان کر دینے کا مضبوط ارادہ اور قوی داعیہ پیدا کر دے۔

۲ - ایک ایسا ہمہ گیر نظریہ جو افرادِ قوم کو ایک ایسے مضبوط ذہنی و فکری رشتے میں منسلک
رکے بنیانِ مرصوص بنا دے جو رنگ، نسل، زبان اور زمین کے تمام رشتوں پر حاوی ہو جائے
ور اس طرح قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کا ضامن بن جائے!

۳ - عام انسانی سطح پر اخلاق کی تعمیرِ نو جو صداقت، امانت، دیانت اور ایفاءِ عہد
ی احساسات کو از سرِ نو مضبوط کر دے اور قومی و ملی زندگی کو رشوت، خیانت، ملاوٹ
ھوٹ، فریب، ناانصافی، جانبداری، ناجائز اقربا پروری اور وعدہ خلافی ایسی تباہ
ن بیماریوں سے پاک کر دے۔

۴ - ایک ایسا نظامِ عدلِ اجتماعی (SYSTEM OF SOCIAL JUSTICE) جو
رد اور عورت، فرد اور ریاست، اور سرمایہ اور محنت کے مابین عدل و اعتدال اور قسط
انصاف اور فی الجملہ حقوق و فرائض کا صحیح و حسین توازن پیدا کر دے!

تحریکِ پاکستان کے تاریخی اور واقعاتی پس منظر، اور پاکستان میں بسنے والوں
ی عظیم اکثریت کی فکری و جذباتی ساخت، دونوں کے اعتبار سے یہ بات بلاخوفِ تردید
ہی جا سکتی ہے کہ اس ملک میں یہ تمام تقاضے صرف اور صرف دین و مذہب کے ذریعے
ور اسلام کے حوالے اور ناطے سے پورے کئے جا سکتے ہیں۔

حاصلِ کلام پاکستان کے استحکام کا واحد ذریعہ اسلامی انقلاب ہے۔

فوری تدابیر

ہمارے مسائل کا مستقل حل تو اسلامی انقلاب میں مضمر ہے لیکن یہ انقلاب جہاد فی سبیل اللہ کے مخلصانہ جذبے
ے سرشار ایک منظم مضبوط اور ملک گیر انقلابی جماعت کے ذریعے ہی برپا کیا جا سکتا ہے
دھر قوم اور ملک کی کشتی ایک خوفناک بھنور میں گری ہے اسے اس بھنور سے نکالنے
کے لئے پوری قوم کی متحدہ جدوجہد درکار ہے۔ ملک سلامت ہے تو اس میں کسی بھی
انقلاب کی داغ بیل ڈالی جا سکتی ہے۔

البتہ فوری طور پر مسائل کی گہرائی اور جذبات کی شدت کو کم کرنے کے لئے!

۱ - عوام کو ان کے سیاسی حقوق فی الفور لوٹا دیئے جائیں۔ اس سے سماجی اور معاشی
سطح پر ظلم و استحصال کا خاتمہ تو نہیں ہوگا کیونکہ موجودہ نظام کے تحت انتخابات سے بھی
مراعات یافتہ اور ہمہ مقتدر طبقات ہی چہرے بدل کر سامنے آئیں گے اور وہ اپنے ناجائز

مفادات کے تحفظ کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے تاہم جمہوری حقوق کی بحالی اور سیاسی عدل و مساوات کا قیام روحِ عصر کا تقاضا ہے اور آج بدترین آمریت بھی بادلِ ناخواستہ ہی سہی اس کی طرف چلنے پر مجبور ہے۔ بار بار کے انتخابات سے سماجی شعور بیدار تر ہوتا جائے گا اور یوں معاشی اور معاشرتی سطح پر بھی عدل و انصاف کی بنیاد پڑے گی۔

ملک میں جلد از جلد عام جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کرائے جائیں اور ان میں حصہ لینے پر کسی پارٹی پر کوئی پابندی نہ ہو۔

۲ - پاکستان کی سالمیت اور وفاقی طرزِ حکومت پر یقین رکھنے والے تمام سیاسی رہنماؤں کے باہمی مشورے اور مذاکرات سے دستوری مسئلے کا حل تلاش کیا جائے۔ یا تو ۱۹۷۳ء کے اصل دستور کے مطابق ایک قومی اسمبلی وجود میں آئے جو متنازعہ دفعات کو معروف روایات کے مطابق تبدیل کرلے۔

یا اگر تمام سیاسی زعماء اور مدبرین اس بات پر اتفاق کریں کہ انتخابات خالصتاً دستور سازی کے لئے ہوں تو آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کے ذریعے متفقہ لائحہ عمل کے مطابق ایک دستور ساز اسمبلی تشکیل دی جائے جو ایک سال میں لسانی اور ثقافتی اکائیوں کے حقائق کو جانچ پرکھ کر ملکی دستور میں ان کے لئے تحفظات فراہم کرے مرکز اور صوبوں میں تقسیم کار اور اختیارات کا تعین کرے۔ دستور سازی کے لئے ایک سال کی مدت مقرر کر دی جائے اگر منتخب اسمبلی اس مدت میں دستور تیار نہ کر سکے تو اسے توڑ کر نئی دستور ساز کے انتخابات کرا دیئے جائیں۔ ●●

بقیہ: مراحلِ انقلاب

اہم ہے چونکہ اس کا تعلق ہماری اپنی عملی زندگی اور ہماری دینی زندگی کی اس ذمہ داری سے متعلق ہے جو فریضہ اقامتِ دین کی جدّ و جہد کی صورت میں ہمیں ادا کرنی ہے [1]

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین!

---

[1] اس اہم موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب نے چار تقاریر میں اپنی گفتگو مکمل کی۔ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو ان چار تقاریر کی اشاعت کا سلسلہ آئندہ ماہ سے شروع ہو جائے گا (ادارہ)

حضرت شیخ الہندؒ

ایک بھولی بسری شخصیت

قاری حمید انصاری

قاری حمید انصاری حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے معتمد علیہ رفیق کار مولانا محمد میاں منصور انصاری مرحوم و مغفور کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ ان کے والد ماجد کے تعارف کے لئے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ نہ صرف یہ کہ کفایت کرتا ہے بلکہ "سند" کا درجہ بھی رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کا عکس ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

(۴) مولانا منصور صاحب انصاری مرحوم ان کا اصلی نام محمد میاں تھا۔ موصوف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند کے نواسے اور حاجی عبداللہ صاحب انصاری مرحوم ناظم دینیات علیگڈھ یونیورسٹی کے بڑے صاحبزادے تھے۔ حضرت شمس العلما مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم ناظم اعلیٰ دارالعلوم دیوبند کے حقیقی بھانجے تھے۔ ان کا اصلی وطن انبہٹہ ضلع سہارنپور تھا۔ دارالعلوم دیوبند میں تکمیل کرنے کے بعد مختلف مقامات میں خدمات تدریسیہ انجام دیتے رہے۔ دارالعلوم معینیہ اجمیر میں بعہدہ صدر مدرسی عرصہ تک کام کیا۔ اس کے بعد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اعانت ترجمہ قرآن کی خدمات انجام دینے کے لئے مقرر کئے گئے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو اپنے مشن کا ممبر بنایا اور اسکیم میں شریک کر لیا۔ جمعیۃ الانصار میں بھی مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کے ساتھ ان کے نائب بن کر عرصہ تک کام کرتے رہے۔ نہایت مستقل مزاج ذکی الطبع راز دار اور قابل اعتماد تھے۔ انھوں نے مشن کے کاموں کو نہایت زیادہ راز داری سے انجام دیا (لوگوں یعنی اعزہ اور احباب نے) ان کو بہت کوشش کے ساتھ توڑنا چاہا مگر یہ نہ ٹوٹے اور ہمیشہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے وابستہ رہے۔ ان کو ڈگمگا دینے والے خطرات سے دوچار ہونا پڑا مگر یہ ثابت قدم رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ سفر حجاز میں رفاقت کی خدمات انجام دیتے رہے۔ مکہ معظمہ میں گورنر حجاز غالب پاشا کی ملاقات ہونے اور ہدایات و تعلیمات مزید یہ حاصل کرنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے ان کو

ہندوستان واپس کیا اور اس پر مامور کیا کہ وہ ہندوستان جا کر حسب تعلیمات غالب پاشا کاروائی متعلقہ انجام دیں اور مشن کے ممبروں کی رہنمائی فرماتے رہیں۔ حسب بیان رولٹ رپورٹ غالب نامہ ان کے پاس تھا موصوف جب حسب ہدایات ہندوستان پہونچے تو ریشمی خط انگریزوں کو مل چکا تھا۔ جگہ جگہ تفتیش اور پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ بدخواہوں نے ان کے گرفتار کرانے کی کوشش کی۔ ان کو پتہ چل گیا اور بھیس بدل کر انھوں نے فرائض ہدایات انجام دئے اور روپوش ہو کر یاغستان روانہ ہو گئے سی آئی ڈی نے بہت کوشش کی مگر یہ ہاتھ نہ آئے اور یاغستان (آزاد علاقہ) میں بال بچوں (اہلیہ محترمہ دو صاحبزادوں وغیرہ) کو وطن میں چھوڑ کر چلے گئے اور بخیر و عافیت وہاں پہونچ گئے۔ وہاں کچھ عرصہ رہ کر پھر افغانستان (کابل) چلے گئے۔ امیر حبیب اللہ خاں صاحب کے اخیر زمانہ میں مولانا سیف الرحمن صاحب کے ساتھ گورنمنٹ ہند کی پرداشت کی بنا پر کابل سے یاغستان کو روانہ کر دئے گئے۔ انھوں نے یاغستان پہونچنے کے پہلے سے جب کہ بھیس بدلا تھا اپنا نام بھی بدل کر محمد منصور انصاری رکھ لیا تھا جس سے سی آئی ڈی کو گرفتاری میں بڑی ناکامی ہوئی۔ امیر امان اللہ خاں صاحب کے زمانہ میں پھر کابل واپس ہوئے اور اپنی علمی استعداد وغیرہ کی وجہ سے بڑے علمی اور سیاسی عہدوں پر فائز ہوئے۔ جو مشن افغانستان سے استنبول امیر امان اللہ صاحب کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد بھیجا گیا تھا اس میں موصوف بھی تھے۔ بعہدہ وزیر مختار سفیر افغانستان کے ساتھ فرائض عہدہ انجام دیتے رہے۔ پھر ماسکو میں افغانی سفارت فوق العادت میں بحیثیت مشیر شریک رہے۔ کابل میں انھوں نے مختلف سیاسی اسلامی رسائل بھی تصنیف کئے جو کہ شائع ہو چکے ہیں[۵۱]۔ ان کی روانگی کے بعد چونکہ ان کے متعلقین معاشی تنگیوں میں مبتلا ہو گئے تھے اس لئے ڈاکٹر انصاری مرحوم ...۵ ماہوار سے تحمل فرماتے رہے انھوں نے یاغستان میں شادی بھی کر لی تھی۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولانا حامد انصاری صاحب ہیں جو عرصہ دراز تک مدینہ بجنور کی ایڈیٹری کی خدمات نہایت لیاقت اور دانائی کے ساتھ انجام دیتے رہے اور پھر بمبئی چلے گئے اور روزنامہ جمہوریت جاری فرمایا۔ چھوٹے صاحبزادے والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد کابل چلے گئے اور ان دنوں وہیں مقیم ہیں منصور صاحب کا انتقال کابل میں ہو گیا رحمہ اللہ تعالیٰ و رضی عنہ و ارضاہ آمین۔

قاری حمید انصاری مولانا محمد میاں منصور انصاری مرحوم و مغفور کے دو چھوٹے بیٹے ہیں۔ جن کا ذکر مندرجہ بالا عبارت کے آخر میں ہوا ہے۔ وہ پچاس سال تک افغانستان میں

---

[۵۱] ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔ (۱) حکومت الٰہی (۲) اساس انقلاب یا مراقبہ نماز (۳) مجمل بیعت تاجیت (۴) دستور امامت امت (۵) انواع الدول وغیرہ

مقیم رہے اور اس عرصے کے دوران امان اللہ خان، بچہ سقہ، نادر شاہ اور پھر ظاہر شاہ کے طویل بادشاہت کا زمانہ دیکھا اور اس کے بعد سردار داؤد اور پھر کمیونسٹوں کے دورِ اقتدار کے بھی سال ڈیڑھ سال کے حالات کا بچشمِ سر مشاہدہ کیا ـــــ اور بالآخر ۱۹۷۹ء میں "مہاجر" ہو کر پاکستان تشریف لے آئے ـــ ساری عمر "مہاجرت" کی کیفیت میں رہنے کے باعث شادی کی نوبت بھی نہیں آئی۔ اس وقت اسی برس کی عمر ہے لیکن صحت بحمد اللہ اچھی ہے ۔ اُن کے پاس اپنے والد ماجد کے چند مخطوطات محفوظ ہیں جنہیں وہ سینے سے لگائے پھر رہے ہیں ۔ اگر اللہ نے توفیق دی تو انہیں "میثاق" کے ذریعے سلسلہ وار ہدیۂ قارئین کیا جائے گا ۔ سرِ دست ان کا ایک مکتوب شائع کیا جا رہا ہے ـــــ پچاس سال افغانستان میں گذارنے کے باعث ان کی اردو بہت کمزور ہو گئی ہے ـــــ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اُن کے جذبات من و عن قارئین کے سامنے آئیں لہٰذا اس میں زیادہ ترمیم یا اصلاح نہیں کی جا رہی ۔ (عاکف سعید) ۔

محترم المقام حضرت مولانا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دامت فیوضکم !

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ' !

ایک عرصے سے آپ حقائق اور دین اسلام کی حقیقت خاصہ پر جو تشریحات اور نکات انقلابی' اسلامی لہجہ اور بے ٹوک اپنے مؤقر ماہنامے کے ذریعے اور اکثر اوقات مختلف مقامات پر خطبات کی صورت بیان فرما رہے ہیں، میں پڑھ رہا ہوں' اس قحط الرجال اور پُر فتن زمانے میں یہ چیز اسلام دوست اور دین پسند مسلمانوں کے لئے ایک آبِ حیات اور امیدوں کی کرن ثابت ہو رہا ہے ۔ خداوند تعالےٰ آپ کو اور آپ کے رفقائے کار اور معاونین کو تا دیر زندہ و سلامت اپنے حفظ و امان میں رکھ کر اپنے پاک دین اور خدا تعالےٰ کی حاکمیت مطلقہ کے لئے اجتہادی اور جہادی خدمت لیتا رہے ۔ آمین ثم آمین ۔ آپ کا مؤقر ماہنامہ ایک ہفتہ ہوا ہے کہ اسلام آباد میں اپنے ماموں زاد بھائی جناب ڈاکٹر محمد مسعود صاحب ریڈر ادارہ تحقیقات اسلامی جامعہ اسلام آباد کے یہاں مجھے ملا یہ پرچہ جلد ۳۳ عـ۱ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ مطابق جنوری ۱۹۸۴ء کا تھا جو کہ آجکل زیر مطالعہ ہے ۔ عرضِ احوال ، الہدیٰ ، اسلام کا جماعتی نظام ، شرک اور اقسام شرک کا بغور مطالعہ کیا ۔ اب پھر اُنکو دوبارہ پڑھ کر اپنے کو ایک نئی دنیا میں محسوس کیا (اگرچہ یہ تمام حقائق اور نکات وہی ہیں جو کہ آج سے چودہ سو سال پہلے حضور اکرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(خلفائے راشدین نے عملی صورت اور علمی حقائق کے طور پر ہمارے لئے لائحہ عمل کے طور پر بتلا اور سمجھا دیئے تھے مگر ہمیں آج وہ نئے اور اجنبی معلوم ہو رہے ہیں) جس کی وجہ ہماری اسلامی علوم اور سیرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات شیخین رضی اللہ عنہم کی اسلامی عملی زندگی سے ناواقفیت ہے مگر "قند مکرر" میں آپ کی جو تحریر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور جمعیۃ علمائے ہند اور مخدومنا و مولانا مجاہد احیائے مجدد اسلام محمود الحسن صاحب (حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) کا مطالعہ میرے لئے بہت ہی خوشی و تعجب کا باعث ہوا۔ میں عرصے سے پاکستان میں ہوں مگر میں نے اس عرصے میں پاکستان کے کسی اخبار یا رسالے، یا ہفتہ وار مجلے میں مجاہد اعظم حضرت شیخ الہند کا نام تک نہیں پڑھا اور نہ کسی مجلس یا کسی شخص کی زبانی ان کی خدمات اور مجاہدات کے بارہ میں کچھ سنا (حالانکہ یہاں کے اخباروں اور رسالوں میں۔ پیروں فقیروں اور بزرگان دین اور بعض گذرے ہوئے لوگوں کے حالات، کرامات، خدمات بڑی بڑی جاذب نظر سرخیوں کے ساتھ دیکھنے میں آتے ہیں) مگر جن مردان حق نے دین مبین کے ارتقاء اور اس کی اصلی روح کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک اسلامی انقلاب کے لئے طوفانوں سے مقابلہ اور شدائد اور قید و بند کی تکالیف برداشت کیں ان کا نام ان کا تذکرہ اور ان کے کارنامے آج ہم بھلا بیٹھے ہیں۔ ان حضرات میں مخدومنا مجاہد اعظم حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔

حضرت شیخ الہند کا جو مشن (پان اسلام ازم) اور جو پروگرام (ہندوستان کے مسلمانوں کی آزادی حاصل کر کے اس کی قوت سے عالم اسلام اور اسلامی حکومتوں کو آزاد کرا کے مسلمان حکومتوں کا متحدہ وفاق بنانا اور تمام بشریت کو اسلامی عدل و انصاف اور مساوات برادری و برابری کے نظام کے تحت لا کر تمام دنیا میں حکومت الٰہیہ کو عام کرنا تھا) مگر ہماری بدبختی تھی کہ حضرت شیخ الہند کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اور حضرت اپنے تمام مشن کے پروگرام انجام تک نہ پہنچا سکے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد نہ ان کے جانشین حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے حضرت کے پروگرام کو اپنا کر آگے چلایا اور نہ حضرت شیخ کے کسی ا مخلص نے یہ جرأت کی کہ حضرت شیخ کے حقیقی پروگرام کو اگر عملی صورت میں ممکن تھا تو کم از کم تحریری صورت میں ہی حضرت کے پروگرام اور مشن کی حقیقت لوگوں تک پہنچا دیتے۔

آج میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب محسوس کر رہا ہوں کہ ایک عرصے کے بعد حضرت شیخ کے حالات اور بعض ان کے فرمائے ہوئے نکات آپ کے مؤقر رسالے میں پڑھ کر خوش

دں کہ اس پرفتن زمانے میں بھی ایسی ہستیاں موجود ہیں جو (گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ
ینہ را) کو قند مکرر کے معنی خیز عنوان سے حضرت شیخ کی یاد اور اونکے کارناموں اور اخلاقی
رانسانی خصائص ایک بہت فصیح اور دردمندانہ طریقے سے یاد فرما رہے ہیں (این کار از تو آید
ردان چنیں کنند) کا مصداق بنے ہیں ۔

اگرچہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات اور حضرت کی آزادئ وطن اور احیائے
بہ دین اسلام کے سلسلہ میں اکثر حضرات نے بہت لکھا ہے ۔ اپنی تحریروں میں حضرت کے مشن
درپروگراموں کا بھی ذکر کیا ہے مگر کسی سوانح نگار یا مضمون نگار نے مشن
پروگراموں کے سلسلے میں حضرت شیخ رح کی کوئی ایسی صریح اور صاف الفاظ میں یہ نہیں لکھا کہ
رت شیخ کا مشن کیا تھا اور اس کی کامیابی کے لئے کیا پروگرام کس وقت اور کہاں کہاں سے
راونیز کتنا علمی اور عملی اقدام کے بعد کامیابی ہوئی یا ناکامی اور اس کے اسباب وعلل کیا تھے ۔
لانا محمد میاں مرحوم دیوبندی نے ایک کتاب تحریک حضرت شیخ الہند رح ۔ کون کیا تھا لکھی ۔ لیکن اس
ب میں چونکہ انگریزوں کی سی آئی ڈی کی گمراہ کن رپورٹوں کو، جو لندن کی لائبریری میں محفوظ ہیں ،
س بنایا گیا ہے لہٰذا اس کے ذریعے شیخ الہند رح کی شخصیت اپنے اصل رنگ میں سامنے نہیں آسکی۔

●●

موسم بہار
صافی
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان

سرزمینِ مصر کی عظیم دینی تحریک

الاخوان المسلمون

مصر کی عظیم دینی تحریک اخوانُ المسلمون کا یہ تعارف — اخوان کے رہنما جناب عبدالبدیع صقر کے اُس عربی خط کا ترجمہ ہے جو انہوں نے ایک پاکستانی سائل کے اِن دو سوالات کے جواب میں تحریر کیا۔

۱۔ اخوان المسلمین کی دعوت کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں ؟

۲۔ آج تک یہ تحریک کامیابی سے ہمکنار کیوں نہیں ہوئی ؟

قارئین "میثاق" کے لئے اسے اُردو کے قالب میں ڈھالنے کا فریضہ قرآن اکیڈمی کے مدرّس مولانا ابو عبدالرحمٰن شبیر احمد نورانی نے ادا کیا ہے۔

(ادارہ)

(آخری قسط)

اب آیئے کہ سوال کے دوسرے رُخ کا جائزہ لیں کہ وہ کونسی وجوہات تھیں جنکی وجہ سے "الاخوانُ المسلمون" کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکے ۔؟

اہل دانش و بصیرت کی ایک رائے تو یہ ہے کہ "الاخوان المسلمون" اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام تو نہیں ہوئے، اس لئے کہ جن وسائل کا ہم تذکرہ کر چکے ہیں اُنہیں بروئے کار لاکر جماعت تا حال لوگوں تک اپنی دعوت پہنچا رہی ہے اور لوگوں کی پُر اُمید نگاہیں ان پر جمی ہوئی ہیں ۔

جماعت دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کی رہنمائی کر رہی ہے اور حکام وقت کی خیر خواہی میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہی ۔

موجودالوقت صورت حال یہ ہے کہ :

مصر کے علاوہ دیگر کئی ممالک میں اس کو ماننے والے اور اس کی پکار پر لبیک

کہنے والے موجود ہیں البتہ کچھ تو برملا اور علی الاعلان اس کا ساتھ دے رہے ہیں اور کچھ اندرون خانہ اس کے معاون و ہمدرد ہیں ۔ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ تحریکوں کی عمریں بہت لمبی ہوا کرتی ہیں، اس کا کسی فرد کی عمر سے تقابل کرنا صحیح نہیں ہے مزید براں آج تک ہمیں جس قدر مصائب و تکالیف اور پریشانیاں رکاوٹیں آئی ہیں وہ اس راہ کی عام چیزیں ہیں، دعوت حق لے کر اٹھنے والوں اور جہاد فی سبیل اللہ کے راہیوں کو ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے (جو دعوت کی حقانیت کا ثبوت اور تربیتی پہلو سے اس راہ کی سنگہائے میل ہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ثابتہ ہے کہ جس کسی نے بھی، جہاں کہیں اس علم کو تھاما تو اُسے ان مراحل سے گذار کر جانچا اور پرکھا گیا گویا یہ وہ قاعدہ و کلیہ ہے جس میں کوئی استثناء نہیں ہے)

فی الحال جماعت حالات کے نشیب و فراز کا مطالعہ و تجزیہ اور سوچ بچار اور انتظار کے دورانیے سے گذر رہی ہے بالآخر از سر نو اُسے عزم جواں کے ساتھ سفر جاری پر رواں دواں ہونا ہے (ان شاء اللہ تعالیٰ)

ہاں! کہنے والوں کو یہ کہنے کا حق بھی پہنچتا ہے کہ نصف صدی گذر جانے کے باوجود بھی الاخوان المسلمون انقلابی جماعتوں کی طرح کوئی نتیجہ خیز کامیابی حاصل نہیں کر سکے جو ہر طرف دیکھی اور محسوس کی جا سکے، اور اخوان کی دعوت اپنی متوقع منزل سے بہت پیچھے رہ گئی ہے ۔

ہمیں اعتراف ہے کہ یہ اعتراض کسی حد تک صحیح ہے، دراصل جماعت کی پسپائی کی مختلف وجوہات ہیں، جو درج ذیل ہیں ۔

ا ۔ جماعت کے اندرونی حالات

ب ۔ ملک (مصر) کے مخصوص اندرونی حالات

ج ۔ اور عالمی سیاسی حالات

ا ۔ جماعت کے اندرونی حالات

جماعت کے اندرونی حالات نے مندرجہ ذیل شکلوں میں جماعت کے مقاصد کو نقصان پہنچایا:

ہمارے بعض اخوانی ساتھی سخت جذباتی واقع ہوئے، جو دعوت جہاد کا نام سنتے ہی مشتعل ہو گئے کیونکہ انہیں بالکل تجربہ نہیں تھا، پھر یہ کہ مرشد عام اوّل و ثانی نے

واضح الفاظ میں ہدایت جاری کی تھی کہ ابھی انتظار کیا جائے اور وقت نظر سے جائزہ لیا جائے مگر مرشد عام اور لیڈرشپ کی اجازت کے بغیر ہی انہوں نے کئی اقدامات کر ڈالے، مثلاً:

ایک مجسٹریٹ کو قتل کر دیا گیا چند پولیس چوکیاں لوٹ لیں، اس طرح کی باتوں سے جماعت کی شہرت و نیک نامی کو سخت دھچکا لگا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حرکات کی وجہ سے جماعت پر دہشت پسندی اور تخریب کاری کا الزام لگایا گیا، حالانکہ ایسی وارداتیں جماعت کی اجازت سے ہوئیں نہ ہی جماعت کی مرضی و میلان کو دخل تھا۔ ایسے مشتعل ساتھیوں نے اپنے امرار کی مخالفت کی، تبھی تو جماعت کو ابتدائی دور ہی میں سخت نقصان برداشت کرنا پڑا بعض ساتھی دشمنوں کی چال سے دھوکا کھا گئے اور انہوں نے جماعتی پالیسی کے علی الرغم ان سے حسن ظن کی بنیاد پر تعاون کیا جس کی وجہ سے آزمائش و مشکلات کا دائرہ وسیع تر ہو گیا اور یہ چیز عظیم خسارہ کا باعث بنی، جیسا کہ جمال عبدالناصر کے زمانے میں ہوا کہ اس نے کئی افراد کو جماعت کو تباہ کرنے کی خاطر اپنا آلۂ کار بنایا، انہیں اپنے قریب کرنے کے بعد بالآخر انتقام کا نشانہ بنایا۔

مصر کے حالات: مصر کے اندرونی حالات نے مندرجہ ذیل شکلوں میں ہمیں نقصان پہنچایا۔

مصری قوم طبعاً اپنی سرزمین کی مانند سلامتی و سہولت پسند واقع ہوئی ہے، اپنی آزاد مرضی کے ساتھ تو وہ جہاد کو لبیک نہیں کہتی اِلّا یہ کہ کوئی جابر حکمران انہیں مجبور کر دے۔ اکثریت کا حال تو یہ ہے کہ وہ کلمہ جہاد سے ہی گھبراتی ہے۔ الا ماشاء اللہ۔

مصری سرزمین جزیرہ نما ہے، دو طرف سے سمندر میں گھری ہوئی ہے اور باقی دو طرف لق و دق صحرا ہے، نہ ادھر سے کوئی داخل ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہاں سے کوئی بھاگ کر جا سکتا ہے اور وہاں کے باشندے بآسانی حاکم کے نرغے میں آجاتے ہیں اور اس سے خلاصی کی کوئی سبیل نہیں پاتے۔

پوری مصری قوم تقریباً غیر مسلح ہے سوائے ان افراد کے جو سرکاری اجازت اور رضامندی سے ہتھیاروں کے حامل ہیں اور حکومت کو قطعاً یہ برداشت نہیں کہ کوئی فرد مسلح ہو کر ان کے لیے خطرے کا موجب بنے۔

تمام حکمران مصری قوم کا نام تو لیتے ہیں لیکن انہیں خوب معلوم ہے کہ یہ کر کچھ نہیں سکتے۔ بس دکھ سہتے ہیں اور صبر کرتے ہیں۔

داخلی مشکلات میں سے ایک بڑی مشکل مصر میں جامع ازہر کا وجود ہے، بلاشبہ جامعہ ازہر بہت بڑا ادبی ادارہ ہے، قدیم زمانے سے مصر کی پہچان ہے اور اس نے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی قابل قدر خدمت کی ہے۔ لیکن جب سے ازہر سرکاری تحویل میں آیا اور حکومت ہی اسکی مالی کفالت کرنے لگی تو یہ سرکاری "کل پرزہ" بن کر رہ گیا ہے، حالانکہ اس سے قبل جب یہی جامع ازہر آزاد تھا اور عوام الناس کے جذبے سے چلتا تھا تو اس نے انگریزی اور فرانسیسی استعمار کا ڈٹ مقابلہ کیا۔ جس کا جذبہ حریت و جہاد عدیم المثال تھا۔

مصری حکومت اور ازہر کی قیادت کی مخالفت کے باوجود بعض مصری علماء نے ہمارا ساتھ دیا باقی علماء اور طلباء نے یا تو دعوت دشمنی کا ثبوت دیا ہے یا پھر غیر جانبداری برتی۔ اب تو حال یہ ہے کہ عدالتی کاروائی سے ہی قبل علماء ازہر معمولی معمولی باتوں پر کفر کے فتوے صادر فرما دیتے ہیں اور یہ وہ ازہری علماء ہیں جنہوں نے کسی موقعہ پر بھی "اخوان" کا ساتھ نہیں دیا خواہ آزمائشوں کے پہاڑ ہی اخوانیوں پر ٹوٹ جائیں۔

ہم جس قدر ازہری علماء کے قریب ہوئے وہ اتنا ہی ہم سے دور ہوتے گئے بلکہ بسا اوقات تو انہوں نے ہمارے مخالفین وحاسدین کا کردار ادا کیا۔

اسی طرح وزارت داخلہ میں پورا ایک محکمہ ایسا بھی ہے جو خطباء مساجد کو ہدایات جاری کرتا رہتا ہے اور یہ محکمہ پورا کا پورا ازہری علماء پر مشتمل ہے، چند ایک کو چھوڑ کر اکثر خطباء مساجد وہی کچھ کہتے ہیں جو حکومت کی مرضی ومنشا ہوتی ہے۔ بس اللہ ہی جس کو ہدایت دے تو وہ ہدایت یافتہ ہو سکتا ہے۔

داخلی مشکلات میں وزارت اطلاعات ونشریات کا بھی بہت بڑا دخل ہے یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ روزنامہ الاہرام، الہلال، المقتطف اور السیاسۃ وغیرہ سب کے سب عیسائیوں کی ملکیت ہیں اور ان کی مکمل اجارہ داری قائم ودائم ہے اسی طرح سینما، سٹیج ڈرامہ اور ذرائع ابلاغ انہی کے کنٹرول میں ہیں، حرام کی ساری تجارت مثلاً شراب، رقص اور سود وغیرہ پر بھی حضرات چھائے ہوئے ہیں،

فحاشی اور بے حیائی پھیلانے والے پرچے بھی ان کے ہی اشاروں پر سرِ بازار فحاشی کر رہے ہیں، ظاہر ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اسلامی حکومت کے قیام سے بجائے خوشی کے رنج والم ہوگا۔

داخلی مشکلات میں سے پولیس اور فوج کے مخصوص حالات بھی ہیں، ان اداروں کو نہ صرف انگریز نے قائم کیا بلکہ خاص رنگ میں ان کی تربیت بھی کی، آزادی کے بعد آج تک بھی یہ ادارے اپنی اُسی روش پر برقرار ہیں، یہ محکمے مقامی و قومی اور اسلامی ثقافت و تہذیب سے بالکل کٹے ہوئے ہیں، عوام اور ان محکموں کے درمیان دوری اور نفرت کی دیواریں حائل ہوچکی ہیں۔ عام پولیس والا تو انتہائی سخت محنت اور ذلت آمیز زندگی بسر کرتا ہے جبکہ بڑے افسران عیاشی میں لت پت رہتے ہیں، عام سپاہی تو اس قدر مفلوک الحال اور حاجتمند ہوتا ہے کہ اس کیلئے معمولی سے مالی مفاد کی خاطر تقویٰ و اخلاق سے عاری ہوتے ہوئے کسی قیدی کو قتل کرنا کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہوتا۔ ایسے ہی افراد کی وجہ سے ہمیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، حالانکہ یہ ہمارے ہم وطن ہیں لیکن معمولی معمولی باتوں پر انہوں نے ہمیں بھی سخت سزائیں دیں۔

اندرونی مشکلات میں عیسائیوں کا ہاتھ بھی ہے، اگرچہ مصر میں ان کی آبادی ۶ فیصد ہے لیکن ان کی سیاست بازی اور سازشی کردار کی وجہ سے ہر حکومت ان کی خوشنودی کی خواہاں رہی، اور انتخابی اغراض و مقاصد کی خاطر ان کے نخاڈ [illegible] رہی۔ اس لئے کہ مصر کے قبطی عیسائیوں کے تعلقات با اثر خارجی ممالک سے بھی ہیں اور یہ ممالک اکثر اوقات مصر کو دھمکاتے وڈراتے رہتے ہیں۔ یہ عیسائی کئی طریقوں سے اخوانی دعوت کے آڑے آئے، مثلاً مخالفانہ پروپیگنڈا، عوامی جذبات کو برانگیختہ کرنا، جاسوسی کرنا وغیرہ وغیرہ چونکہ وہ مختلف اہم سرکاری عہدوں پر متعین ہیں۔ بعض وزراء بھی عیسائی ہیں۔ یہی حال عدلیہ، فوج اور تجارت پیشہ لوگوں کا ہے کہ معقول تعداد میں عیسائی ان میں گھسے ہوئے ہیں، اور یہ اخوان کے سخت دشمن ہیں اور ان کی سرپرستی کے لئے عالمی سطح کے عیسائی مشنری ادارے اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ موجود ہیں۔

عالمی ماسونی تحریک : عالمی حالات کی وضاحت تو صرف لفظوں میں بیان کی جا سکتی ہے۔ سب سے اہم بات تو عالمی ماسونی تحریک ہے۔ معرکہ فلسطین میں جب یہودیوں کو ہم سے واسطہ پڑا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ اخوانی مجاہدین دوسرے فوجیوں سے بہت مختلف اور نمایاں ہیں۔ کیونکہ اخوان زندگی اور فتح سے بھی زیادہ موت کو پسند کرتے تھے۔ ایسا بھی ہوا کہ صرف بیس آدمیوں کے مختصر سے گروپ نے ایک جگہ پوری یہودی آبادی کو شکست سے دوچار کیا، چند دن یہ علاقہ اخوانیوں کے قبضے میں رہتا تھا پھر مجبوراً مصری فوج کے سپرد کرنا پڑتا تھا اور بالآخر فوج کو حکم ملتا تھا کہ یہ علاقہ دوبارہ یہودیوں کو واپس کر دیا جائے۔ متعدد مواقع پر یہودیوں نے برملا کہا کہ جب تک اخوانی مشرق وسطیٰ میں موجود ہیں۔ اسرائیل کے لئے امن وسکون کی کوئی گنجائش نہیں، اسی لئے ماسونی تحریک کے نمائندے ہمیشہ مصری حکومت سے مطالبہ کرتے رہے ہیں کہ وہ اپنی قوت اخوان کے خلاف استعمال کرے اور اسے ختم کر کے دم لے، معاہدے طے کرتے اور امداد لینے کے لئے یہ بات مصری حکومت کی مجبوری بن جاتی تھی۔ خواہ حکومت یہ اقدام برضا ورغبت کرے یا مجبوری کی وجہ سے۔ انہوں نے یہی کردار انگریزی حکومت کے زمانے میں ادا کیا، جمال عبدالناصر کے دور حکومت میں بھی یہی کچھ ہوتا رہا خواہ وہ امریکہ کا پٹھو بن کر رہا یا روس کا ایجنٹ بنا رہا اور آج تک یہی ہو رہا ہے۔ حکمران اس کا برملا اظہار کرتے رہے اور اسے چھپانے کی انہوں نے ضرورت محسوس نہیں کی۔

عالمی صلیبی تحریک : یہ حقیقت بھی کسی سے مخفی اور پوشیدہ نہیں کہ یورپی لشکر مشرق وسطیٰ کو فتح کرنے اور بیت المقدس پر قبضہ کرتے آئے تھے اور یہ صلیبی جنگیں دو سو سال تک جاری رہیں، بالآخر انہیں سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست ہوئی۔ اس فوجی شکست سے ان کا غصہ اور بھڑک اٹھا اور آج تک وہ مسلمانوں سے ہر میدان میں اور ہر آن برسرپیکار ہیں۔ وہ اس حقیقت کو قطعاً نہیں بھولے اور نہ کبھی فراموش کر سکیں گے کہ مسلمانوں کی اصل طاقت ان کی دینی اور روحانی قوت ہے اسی لئے وہ ہر اسلامی جہاد کی حامل تحریک کے معاملے میں سخت حساس ہیں البتہ قوم پرست تحریک سے انہیں

کوئی خطرہ درد سر کار نہیں ہوتا۔ وہ اسلامی جہاد کو بھول بھی کیسے جائیں کیونکہ مسلمانوں نے اسلامی جہاد کے ذریعے ہی ترکی، جنوبی یونان، ہسپانیہ، یوگوسلاویہ اور جنوبی فرانس فتح کر لیا تھا۔ تمام کافرانہ حکومتیں اسلامی جہاد کی حامل تحریکوں کی سخت دشمن ہیں اور خاص طور پر مشرق وسطیٰ سے اٹھنے والی تحریکوں کی۔

مصر میں ان کے مشنری سکول ہیں، ہم نوالہ وہم پیالہ دوست ہیں۔ سفارتی ادارے، کمپنیاں اور تجارتی ادارے ہیں جو ہمہ وقتی دعوت اسلامی کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے اور اسکی راہ میں روڑے اٹکانے کا سوچتے رہتے ہیں۔ بالعموم ان ملکوں کے سفارکانفرنسیں کرتے ہیں اور سفارشات کے رنگ میں حکومت کو احکام جاری کرتے رہتے ہیں کہ "الاخوان المسلمون" کو کالعدم قرار دیا جائے اور ارکان جماعت کو سزائیں سنائی جائیں۔

میرے بھائی!

چند مشکلات تو میں نے آپ کے سامنے کھول کر رکھ دی ہیں جن سے الاخوان المسلمون کی دعوت دوچار ہے۔ ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے صبر اور حوصلے کی ضرورت ہے اور ہر چیز سے پہلے اللہ کی فضل اور توفیق کی ضرورت ہے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کوئی مخلص حکمران اس قوم کو نصیب فرمائے جو فی الواقع مجاہد فی سبیل اللہ ہو۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ آج سے قبل اور موجودہ اخوانیوں کو ان حالات کا علم تھا۔ اور یہ باتیں ان سے پوشیدہ نہ تھیں اور نہ ہی وہ ان حالات سے ڈرنے والے تھے پس یہ تو اللہ کی مشیت و مرضی ہے جب چاہے حالات کو سازگار بنائے اور جب چاہے ناموافق۔ ہماری امیدوں کا واحد مرکز آج بھی اللہ رب العزت کی ذات ہی اور اللہ یقیناً اس کی مدد کرتا ہے جو اس کے دین کے غلبے کے لئے کمر کس لیتے ہیں۔

والحمد للہ رب العالمین

●●●●●●●●●●●●

انقلاب کے اجزائے ترکیبی

محمد یعقوب

امیر محترم نے مکمل وضاحت کے ساتھ ایک اسلامی انقلاب کے لوازم و مراحل بیان فرما دیئے
یں جو آڈیو ٹیپ اور ویڈیو ٹیپس میں محفوظ ہونے کے علاوہ میثاق میں بھی مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔
وازم و مراحل قطعی طور پر انقلاب محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو سامنے رکھ کر ترتیب دیئے گئے ہیں۔ بلکہ
ریوں کہیں کہ "یہ انقلاب ہی سیرت مطہرہ کا مرکزی دھارا (MAIN STREAM) ہے"
و مبالغہ نہ ہوگا۔ آیئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی پر ایک اکائی کی حیثیت سے نظر ڈالیں۔
پ کی بعثت، تبلیغ، لوگوں کا انکار، سرداران قریش کی پر زور مخالفت، تکالیف و مصائب،
ہنی و جسمانی اذیتیں، شعب بنی ہاشم، سفر طائف، ہجرت، بدر، احد، احزاب، حنین، خیبر، آپ
راتوں کو جاگنا، صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم کی تعمیر سیرت، منافقین سے سلوک اور دیگر بے شمار
پہلو جو " ہیں ہزاروں اس کے پہلو رنگ ہر پہلو کا اور " کے مصداق آپ کی شخصیت مبارکہ ایک
ہمہ رنگ اور ہمہ پہلو شخصیت تھی لیکن ان تمام رنگوں کو اگر ذہن کے ڈسک (DISC) پر رکھ کر تیزی
سے گھمایا جائے تو ایک ہی رنگ برآمد ہوگا ——— انقلاب اور الحمد للہ کہ وہ جزیرہ نمائے عرب
میں آپ کی زندگی ہی میں برپا ہو کر رہا اور بعد میں اس کے فیوض و برکات دور دور کے براعظموں
تک پھیل گئے۔ اور کیا یہ اسی انقلاب کا ثمر نہیں کہ عرب سے ہزاروں میل دور اور سینکڑوں سال بعد
ہم بھی کلمہ گو ہیں۔ اور اس مملکت خداداد میں چند لوگ تنظیم اسلامی کی صورت میں اسی انقلاب
کی تجدید کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ثُمَّ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ!

لیکن میرا موضوع دوسرا ہے اور وہ ہے انقلاب کے "اجزائے ترکیبی"۔ احقر کے خیال
میں انقلاب کے لیے ان اجزا کا ہونا ضروری ہے ورنہ انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ اور یہ کہ جہاں
یہ اجزائے ترکیبی کسی حقیقی لیڈر کی قیادت میں جمع ہوں انقلاب اس کا لازمی نتیجہ ہوگا بالکل اسی
طرح جس طرح آپ جہاں کہیں بھی دو حصے آکسیجن اور ایک حصہ ہائیڈروجن ملائیں گے۔ نتیجے
میں آپ کو پانی حاصل ہوگا۔ وہ اجزائے ترکیبی یہ ہیں:-

۱۔ نفرت
۲۔ طاقت
۳۔ یقین
۴۔ لیڈر شپ

لیڈر شپ کو محض بیان کی خاطر چوتھے نمبر پر رکھا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ لیڈر شپ کو اولیت حاصل ہے۔ اس کے بغیر یہ تمام اجزا بیکار محض ہیں کیونکہ ان تمام اجزاء کو ایک رُخ دینا، ان کو باہم جمع کرنا اور ان کو ایک قوت میں بدل دینا تمام لیڈر شپ ہی کی ذمہ داری ہے اور اوپر کے تین اجزاء کو تفصیلاً بیان کرتے ہوئے ساتھ ساتھ لیڈر شپ کا ذکر بھی چلتا رہے گا لیکن بطور خاص انقلاب کے اس جزو پر بالکل آخر میں بات ہوگی۔ اب ان پر علیحدہ علیحدہ کچھ تفصیلی گفتگو!

۱۔ نفرت نفرت اگرچہ ایک منفی جذبہ ہے لیکن ہے بہت زوردار اور کارآمد۔ اور اگر اس کو گہرائی تک دیکھا جائے تو دراصل یہ تمہید ہوتی ہے محبّت کی۔ بالکل اسی طرح جس طرح لَا تمہید ہے اِلّا کی۔

انقلاب میں اس نفرت سے مراد ہے اس نظام سے نفرت جس میں کوئی معاشرہ سانس لے رہا ہے سانس کیا لے رہا ہے سسک رہا ہے۔ انقلاب ہمیشہ ایک غیرعدمل معاشرہ میں آتا ہے کسی ایسے معاشرہ میں جہاں انسانوں کو انسان سمجھا جا رہا ہو اور تمام چیزیں اپنی اپنی جگہ پر ہوں وہاں انقلاب کی نہ ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی لایا جا سکتا ہے۔ انقلاب ایک ایسے معاشرہ میں جڑ پکڑتا ہے جہاں ہر طرف ظلم و زیادتی نے ڈیرے ڈال رکھے ہوں ایک محدود اقلیت خدائی کا دعویٰ نہ کرنے کے باوجود عملاً اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کا ناقوس بجا رہی ہو اور ایک عظیم اکثریت کے خیالات، ضرورتوں اور جذبات کے علی الرغم معاشرے کو اپنے مفادات اور اپنی خدائی کے استحکام کی جانب کھینچے لئے جاتی ہو۔ یہ حقیر اقلیت چونکہ معاشرہ کے تمام وسائل، ذرائع ابلاغ، نظام تعلیم، نظام قانون سازی اور نظام نفاذِ قانون پر قابض یا اثر انداز ہوتی ہے اس لئے معاشرہ کی عظیم اکثریت پر اس کی گرفت حیرت انگیز حد تک مضبوط ہوتی ہے۔ ذرائع ابلاغ اور نظام تعلیم پہ قدرت رکھنے کی وجہ سے یہ معاشرہ میں خصوصاً نوجوان طبقہ میں ذہنی انتشار اور انارکی کو ابھارتی ہے تاکہ نئی نسل ذہنی انتشار میں مبتلا رہے اور ان کے لئے کوئی خطرہ نہ بن سکے۔ یہی حقیر اقلیت اپنی خدائی کو مستحکم رکھنے کے لئے غیر ملکی آقاؤں سے بھی ساز باز رکھتی ہے اور ان کے ہاتھ ملکی عزت و وقار کا سودا کرتی رہتی

تاکہ بوقت ضرورت وہ ان کی خدائی کا تحفظ کر سکیں بعض اوقات ان میں سر پھٹول تک نوبت
تی ہے لیکن یہ صرف بندر بانٹ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ عوام کی عظیم اکثریت کے خلاف یہ
ی طرح متحد اور چوکس ہوتی ہے۔ حکومت ان کی سیاست ان کی، سیادت ان کی، دولت
ی مرضی ان کی، خدائی ان کی غرض معاشرے کے تمام وسائل ان میں مرتکز ہوتے ہیں۔
س کی حیثیت ریل گاڑی کے انجن کی سی ہوتی ہے کہ وہ اور صرف وہ طاقت کا منبع ہوتا ہے۔
ایک لمبی اور طویل گاڑی کو اپنے مفادات کی طرف کھینچے لئے جاتا ہے۔
عوام کی "عظیم اکثریت" "ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم" کے مصداق محض تماشائی ہوتی ہے۔
طاقت کا منبع انہیں جس طرف کھینچے لئے جاتا ہے یہ طوعاً و کرہاً ادھر گھسٹتے چلے جاتے ہیں۔
ن ان کے دلوں میں بعد ایک مدت کے اس نظام سے نفرت اور بیزاری پیدا ہونی شروع
ی ہے۔ انہیں احساس زیاں ہونے لگتا ہے۔ وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہم ادھر نہیں
جاتے جدھر ہمیں گھسیٹا جا رہا ہے۔ وہ اپنے چاروں طرف مچی ہاہاکار، افراتفری اور بدنظمی
دیکھ دیکھ کر کڑھتے لگتے ہیں۔ ایک عجیب طرح کی نفرت اُن کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک
ب سی اٹھتی ہے کہ کاش اس نظام کے کارپردازوں کے لاشے وہ اپنے قدموں تلے روندیں۔
ن یہ "عظیم اکثریت" ہمیشہ غیر منظم ہوتی ہے۔ "منظم اقلیت" نے اپنے ہتھکنڈوں سے
کری انتشار ان میں پیدا کر رکھا ہوتا ہے وہ ان کو منتشر اور الگ الگ رکھتا ہے اور پھر "منظم
یت" آئے دن ایسے سٹنٹ کھڑے کرتی رہتی ہے جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ اب بہتری کی
رت پیدا ہوئی کہ ہوئی لیکن یہ سب اُن کی چالیں ہوتی ہیں ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

لیکن بالآخر "محکوم اکثریت" کو مایوسی ہوتی ہے اور ان کے دلوں میں نفرت کا بیج پھوٹ
نے کو بے قرار ہو جاتا ہے۔ یہیں سے ایک انقلاب کا اکھوا پھوٹتا ہے۔ اس مرحلہ پر اگر
عظیم اکثریت" کو صحیح قیادت اور لیڈر شپ میسر آ جائے تو سمجھو انقلاب کا ڈول ڈالا گیا۔ اس
حلہ پر لیڈر شپ کا کام یہ ہے کہ اولاً اس نفرت کو اور بھڑکائے، ان شعلوں کو ادر ہوا دے۔
ں نفرت کو اُن دلوں تک بھی پہنچائے جو بوجوہ اس سے آشنا نہیں۔ قائم قابل نفرت نظام
ے مختلف بھیانک پہلو اُن کے سامنے لائے۔ "عظیم اکثریت" کے خلاف ڈھکی چھپی

سازش کو طشت از بام کرے ۔ انہیں احساس دلائے کہ انہیں لوٹا جا رہا ہے ۔ انہیں ان کی مرضی کے خلاف ان تاریک راہوں پر گھسیٹا جا رہا ہے جو ذلت اور پستی کی طرف جاتی ہیں انہیں یہ بتائے کہ یہ "حقیر لیکن منظم اقلیت" تمہیں بحیثیت فرد اور بحیثیت قوم کس قدر ذلیل کر رہی ہے ۔ ذلیل کر رہی ہے ؎

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

رفتارِ کار

لاہور میں حلقہ ہائے درسِ قرآن کا اجراء اور — بیرونِ لاہور توسیعِ دعوت کے پروگرام

گذشتہ ماہ لاہور میں دس مقامات پر ہفتہ وار حلقہ ہائے درسِ قرآن حکیم کا اجرا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تمام معاملات پر صورتِ حال بہت حوصلہ افزا ہے۔ رفقائے لاہور نے ان کی کامیابی کے لئے کافی محنت کی ہے۔ انفرادی سطح پر احباب۔ اور عزیز و اقارب کو ان میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ اشتہارات اور ہینڈ بلز کے ذریعہ لوگوں کو ادھر متوجہ کیا گیا۔ بعض مقامات پر رفقاء گروپس کی شکل میں نکلے اور نواحی علاقہ میں گشت کر کے لوگوں کو درسِ قرآن میں شرکت کی ترغیب و تشویق دلائی۔ مدرسین نے بھی محنت کی اور الحمد للہ ان کوششوں کے نتیجہ میں قرآن مجید کے پیغام کو سمجھنے اور سمجھانے کی یہ محفلیں بارونق ہیں اور ان میں شرکاء کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کچھ عرصہ سے لاہور میں بعض وجوہات کی وجہ سے اسرہ جاتی اجتماعات کا نظام تقریباً معطل تھا۔ اس نظام کو با مقصد بنانے کی خاطر پچھلے کچھ عرصہ سے نئے سے نئے پروگرام ترتیب دیئے گئے تھے جن کے نتیجہ میں رفقاء میں ایک نیا جذبہ اور انقلابی مشن پر کام کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی تھی اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے اسرہ جاتی نظام دوبارہ قائم کر دیا گیا ہے۔ نقیب حضرات نے اس کے استحکام کے لئے خصوصی محنت کی ہے۔ تنظیم اسلامی لاہور کے نائب امراء نے رفقاء کے ذاتی مسائل اور معاملات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ان کے گھروں اور کاروبار کی جگہوں پر جا کر بھی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ رفقائے لاہور کا توسیعِ دعوت اور ذاتی تربیت کے لئے بیرون و اندرونِ لاہور مختلف مقامات پر نکلنے کا پروگرام نسبتاً ماند پڑ چکا ہے۔ اس کے لئے از سرِ نو کوشش و محنت درکار ہے۔

فیصل آباد میں رفقاء کی دعوتی سرگرمیاں بفضلہٖ تعالیٰ اہتمام سے جاری رہی ہیں۔ اس دفعہ فیصل آباد کے رفقاء کی ایک معقول تعداد نے اپنے امیر کی قیادت میں چنیوٹ کا دعوتی و تبلیغی سفر کیا۔ شہر کے پُر ہجوم مقامات پر گشت کیا دعوتی لٹریچر تقسیم کیا اور مناسب

مقامات پر مختصر خطابات کے ذریعے لوگوں کو احکاماتِ الٰہی کی بجا آوری کے لئے متوجہ کیا۔
فیصل آباد کے نوجوان طالب علم رفقاء کی ہمت اور محنت قابل داد ہے۔ توفیق الٰہی سے
جناب غلام اصغر صدیقی صاحب اور ان کے ساتھی اپنی تعلیمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ خدمت
و دعوتِ دین کے لئے بھی قابل قدر کام کر رہے ہیں ان کی کوشش سے میثاق کا حلقہ وسیع
ہوا ہے اور دوسری دعوتی کتب و لٹریچر بھی لوگوں تک پہنچی ہیں۔ انہوں نے کالج ہوسٹل
میں ہفتہ وار درس قرآن کی نشست کا اہتمام بھی کیا ہوا ہے جس کے بعد افہام وتفہیم
کے لئے سوال وجواب کا سلسلہ بھی ہوتا ہے۔ الحمدللہ ان مجالس کے شرکاء کی تعداد
حوصلہ افزا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان نوجوانوں کی محنت کو قبول کرے۔

راولپنڈی اور اسلام آباد میں اگرچہ رفقائے تنظیم اسلامی کی ایک معقول تعداد موجود
ہے۔ تاہم بعض وجوہات کی بنا پر وہاں کی تنظیمی کیفیت کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں رہی
ہے۔ مختلف مقامات پر رہائش پذیر رفقاء کو اسرہ جات میں منقسم کر کے ان کے اجتماعات
اور دیگر تنظیمی و دعوتی سرگرمیوں کو باقاعدہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن تاحال اس سے
مطلوبہ نتائج نہیں نکل سکے۔ اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ وہ موانعات کو دور کرے اور دلوں میں
دعوت و اقامتِ دین کی اُمنگ اور اس کے لئے ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کرے۔ اسلام آباد
کمیونٹی سنٹر میں امیر تنظیم اسلامی کا ماہوار درس قرآن ہوتا ہے۔ گذشتہ ماہ رفقائے
راولپنڈی و اسلام آباد نے اس کے حوالہ سے کچھ محنت کی ہے۔ اس سے قبل محدود پیمانہ پر
رابطہ عوام کی ایک کوشش کی۔ اسلام آباد سیکرٹریٹ کے باہر کچھ کتبات اور بینرز سے کرنا ہوا
مظاہرہ کیا۔ دعوتی اور تعارفی پمفلٹ اور ہینڈ بلز تقسیم کئے۔ کمیونٹی سنٹر کے اردگرد
رہائشی علاقوں۔ مارکیٹوں اور بازاروں میں گشت کیا اور لوگوں کو درسِ قرآن میں
شرکت کی دعوت دی۔ اس کے نتیجہ میں اس ماہ نہ درس قرآن کی محفل میں غیر معمولی
حاضری تھی۔

تنظیم اسلامی پشاور نوجوان رفقاء کی تنظیم ہے۔ اللہ تعالےٰ کے فضل وکرم سے یہ لوگ
متحرک رہے ہیں اور اکثر اوقات توسیع دعوت اور ذاتی تربیت کی غرض سے اندرون و
بیرون شہر گروپس کی شکل میں نکلتے رہے ہیں۔ گذشتہ ماہ انہوں نے پشاور میں ایک
سہ روزہ دعوتی و تذکیری مہم کا اہتمام کیا اس مقصد کے لئے پشاور اور دوسرے مقامات
سے تیس رفقاء جمع ہوئے۔ میاں محمد نعیم صاحب قیم تنظیم اسلامی نے بھی اس میں شرکت
کی۔ ایک روز اس دعوتی مہم میں بھرپور کام ہوا۔ مختلف بازاروں سڑکوں پر گشت کیے

ا ہم تعارفی لٹریچر ۔ ہینڈ بلز تقسیم ہوتے اور مناسب مقامات پر مختصر خطابات کے ذریعہ
دت توبہ و اصلاحِ اعمال کا اہتمام کیا گیا ۔ لیکن دوسرے روز بعض تخریب پسند عناصر کی
رُ رمیوں کی وجہ شہر میں امن و امان کی فضا مکدر ہو گئی ۔ ایک مقام پر بم کا دھماکہ ہوا اور
فارب سیاسی گروہ بازاروں میں نکل آئے ۔ اندریں حالات یہی مناسب معلوم ہوا
اس پروگرام کو فی الحال ملتوی کر دیا جائے ۔

تنظیم اسلامی متحدہ شریعت محاذ میں شامل ہے اور اس میں ضمن میں بھی رفقائے
لم اسلامی مختلف مقامات پر اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں ۔ قیم تنظیم اسلامی پاکستان جناب
ں محمد نعیم صاحب کو بھی متحدہ شریعت محاذ کی مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ کے رکن اور متحدہ
یعت محاذ کے سیکرٹری کی حیثیت سے اپنے اوقات کا کافی حصہ ان مقاصد کے لئے صرف کرنا
ہے تاہم لاہور، راولپنڈی، پشاور، فیصل آباد اور دیگر مقامات پر متحدہ شریعت محاذ
اجلاس میں شرکت کے ساتھ آپنے ان مقامات پر بھی رفقاءِ تنظیم اسلامی سے رابطہ اور ان کی تنظیمی
وتی سرگرمیوں میں شرکت و رہنمائی کا سلسلہ جاری رکھا ۔ علاوہ ازیں آپنے گذشتہ ماہ
دوران ہی گجرات ۔ وزیر آباد ۔ سیالکوٹ اور اس کے نواحی علاقہ میں رفقا و احباب
ملاقات اور تنظیمی و دعوتی معاملات میں بر موقع پرمشورہ و ہدایات کی خاطر ایک سہ روزہ
می پروگرام بنایا ۔ موصوف ۱۲ فروری علی الصبح لاہور سے روانہ ہوئے ۔ مُریدکے میں
ں رفقاء کے گھروں پر ملاقات کی کوشش کی لیکن رابطہ نہ ہو سکا ۔ وزیر آباد، جناب
مس الحق اعوان صاحب کی اقامت گاہ پر وزیر آباد کے کچھ رفقاء جمع تھے ۔ ان سے
ورہ کے بعد آئندہ روز کے لئے نواحی قصبہ سوہدرہ میں دعوتی مہم کی تفصیلات طے کی
ں ۔ اس کے بعد چند میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں کا نیا نوالہ گئے ۔ یہاں پر تنظیم اسلامی
نوجوان رفقاء کی ایک معقول تعداد ہے ۔ رفقاء و احباب جمع تھے ۔ ان سے تنظیم اسلامی
دعوت کے موضوع پر مفید گفتگو رہی ۔ اسی روز بعد نماز عصر قریبی قصبہ منڈا نوالی میں
تی و تذکیری مہم کا پروگرام تھا ۔ اس قصبہ میں تنظیم اسلامی کے ۱۳ رفقاء باہم ایک اسرہ
منسلک ہیں ۔ دعوتی مہم کے لئے ٹی بورڈ ۔ بینرز اور تعارفی لٹریچر مہیا تھا ۔ رفقاء
قصبہ کی گلیوں اور بازاروں میں گشت کیا ۔ چھ مقامات پر جناب شمس الحق صاحب نے
ن سے مختصر خطاب کرتے ہوئے انہیں اصلاحِ اعمال کی طرف متوجہ کیا بعد نماز مغرب
ا محمد نعیم صاحب کے خطاب عام کا پروگرام تھا جس کے بعد افہام و تفہیم کے لئے سوال

و جواب کی ایک مفید نشست ہوئی ۔ ۱۳ ر فروری صبح گجرات کے رفقائے تنظیم کا اجتماع
خصوصی ہوا ۔ یہاں پر تنظیم اسلامی کے ۷۹ رر رفقاء ہیں ۔ جن کے روح رواں جناب عبدالرحمن
غوث صاحب ہیں جنھوں نے اپنی ہمہ وقتی خدمات دعوت و اقامت دین کے لئے وقف
کی ہوئی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے ان کی محنت و کوشش سے گجرات اور
اس کے نواحی قصبات اضلاع میں دعوت و تذکیر کا ایک مفید سلسلہ قائم ہوا ہے گزشتہ
ماہ کے دوران ہی انہوں نے گجرات اور آزاد کشمیر کے رفقاء کو ساتھ لے کر کشمیر میں
ایک دعوتی مہم کا اہتمام کیا تھا ۔ گجرات میں تنظیم اسلامی کا باقاعدہ دفتر قائم ہو چکا ہے ۔
اور یہیں پر جناب قیم تنظیم اسلامی نے رفقاء سے ملاقات کی اور مشورہ کے بعد آئندہ کے
لئے کام کی تفصیلات طے فرمائیں اسی روز دوپہر کو جلالپور جٹاں میں رفقاء سے ملاقات
ہوئی ۔ یہاں پر حال ہی میں تنظیم اسلامی کا ایک حلقہ قائم ہوا ہے جناب امیر تنظیم اسلامی ۱۲
جنوری کو یہاں پر ایک دعوت ولیمہ میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے ۔ اہالیان شہر نے
خطاب عام کا اہتمام کر دیا ۔ نواحی علاقہ کے رفقائے تنظیم بھی جمع تھے انہوں نے جناب
شمس الحق اعوان صاحب کی قیادت میں اس قصبہ کے معروف بازاروں میں دعوتی و
تذکیری مہم سرانجام دی ۔ اللہ تعالیٰ نے چند احباب کو تنظیم اسلامی کی دعوت جہاد پر لبیک
کہنے کی توفیق عنایت فرمائی ۔ جناب قیم تنظیم نے ۱۴ فروری کو انہی رفقاء سے ملاقات
اور مشورہ کے بعد وہاں پر تنظیم اسلامی کا ایک باقاعدہ اسرہ قائم کیا اور دفتر کا بھی افتتاح
فرمایا ۔ اسی روز بعد نماز عصر سوہدرہ کے قصبہ میں دعوتی و تذکیری مہم کا پروگرام ہوا ۔ اسی
قصبہ میں جناب شمس الحق اعوان صاحب کا آبائی گھر ہے اور قریبی اعزہ و اقارب یہیں
آباد ہیں ۔ ایک معروف مقتدر زمیندار گھرانے کا یہ چشم و چراغ توفیق خداوندی سے دین کے
کام میں لگ گیا ۔ اللہ تعالیٰ نے محنت کو قبول کیا اور قلیل عرصہ میں وزیر آباد گجرات اور
نواحی علاقہ کے بے شمار بندگان خدا کے دل خدمت و دعوت دین کے جذبہ سے معمور ہو گئے
اللّٰھم زد فزد پورے قصبہ کے بازاروں اور معروف مقامات پر دعوتی کام ہوا ۔ جناب
شمس الحق صاحب نے دس مقامات پر مختصر خطاب کیا ۔ لوگوں کو توبہ اور انابت الی اللہ
کی تلقین کی ۔ اللہ تعالیٰ سے بغاوت اور نافرمانی کے انجام سے آگاہ کیا
بعد میں نماز مغرب جناب قیم تنظیم کا خطاب عام اور افہام و تفہیم کے لئے سوال و

جواب کی نشست کا اہتمام ہوا۔ اس میں نوجوان طلباء اور دوسرے احباب نے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ ملکی سطح پر انتخابی طریق کار یا انقلابی جدوجہد سے اصلاح احوال کی کوششوں کا بھرپور موازنہ ہوا۔ ۱۴ فروری کی صبح جناب نعیم تنظیم نے سیالکوٹ میں رفقاء سے ملاقات کی۔ باہم مشورہ سے سیالکوٹ کے نئے نقیب جناب شمس العارفین صاحب کا تقرر ہوا اور آئندہ کے لئے تنظیم اجتماعات اور تربیتی دعوتی پروگراموں کا نقشہ ترتیب دیا گیا۔

—— قبل از دوپہر ایک مختصر دعوتی و تذکیری مہم بھی ہوئی جس میں ۱۵ رفقاء نے شرکت کی جس کے اختتام پر ایک سوال وجواب کی مختصر نشست کا اہتمام ہوا۔ بعد از دوپہر سیالکوٹ سے واپسی پر اسرہ منڈی لوپوکے رفقاء اور نقیب اسرہ جناب حاجی صالح محمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ تنظیمی و دعوتی امور کا جائزہ لینے کے بعد ضروری مشورہ اور ہدایات دی گئیں۔ بعد از نماز عشاء میاں محمد یعقوب صاحب نقیب اسرہ گوجرانوالہ سے ملاقات اور مشورہ ہوا۔

وہاڑی میں دعوتی و تذکیری مہم

اگرچہ وہاڑی اور اس کے نواحی مقامات پر چند رفقائے تنظیم اسلامی موجود ہیں۔ تاہم بعض موانع کی وجہ سے تاحال وہاں تنظیم اسلامی کی توسیع دعوت کے سلسلہ میں پیش رفت بہت کم ہوئی ہے۔ رفقاء معمول کے اجتماعات کے علاوہ تنظیم اسلامی ملتان کے زیر اہتمام دعوتی مہموں میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ گذشتہ ماہ ملتان اور شجاع آباد کے دعوتی پروگراموں میں بھی یہاں کے رفقاء شریک ہوئے۔ اسی وقت یہ طے ہوا تھا کہ وہاڑی میں بھی ایک دعوتی پروگرام دیا جائے جس میں ملتان، شجاع آباد اور بورے والا کے رفقاء بھی شریک ہوں۔ لوگوں کو مختلف طریقوں سے متوجہ کیا جائے کہ دنیا اور آخرت کی بھلائی اسی میں ہے کہ اللہ تعالےٰ سے بغاوت کی روش کو ترک کر دیا جائے اور زندگی کے جملہ معاملات میں اس کے احکام کی پابندی کی جائے۔ یہ پروگرام الحمدللہ ۵، ۶ مارچ کو ہوا۔ جناب قیم تنظیم اسلامی کے حکم کے مطابق لاہور سے جناب حافظ محمد رفیق صاحب اور راقم الحروف مجوزہ دعوتی مہم میں شرکت کے لئے ایک روز قبل ہی مع ضروری سامان وہاڑی پہنچ گئے

تھے ۔ اس دعوتی مہم کے لئے ایک دو ورقہ بڑی عجلت میں تیار کیا گیا تھا ۔ اس میں اس بات
پر زور دیا گیا ہے کہ ہماری شامتِ اعمال کی وجہ سے ہم پر ایسے طبقات مسلط ہو گئے ہیں
جو عوام کا خون چوس رہے ہیں ۔ لوگ تڑپ رہے ہیں لیکن ان پیرانِ تسمہ پا سے نجات
نظر نہیں آتی ۔ انتخابی طریق ان سے نجات کی راہ پیدا کرنے میں ناکام ثابت ہوا ہے ۔
لہٰذا واحد علاج یہی ہے کہ نفاذِ اسلام کے لئے انقلابی جدوجہد کی جائے جس کی بنیادی
ضرورت انفرادی اور اجتماعی سطح پر توبہ اور اصلاحِ اعمال ہے ۔ باہم مشورہ کے بعد
طے کیا گیا کہ ڈگری کالج وہاڑی کے باہر کپڑے کے بینرز اور دعوتی لٹریچر کی تقسیم کے ذریعہ
دعوتی مہم کا آغاز کیا جائے ۔ چنانچہ ہم نے ڈگری کالج کے مین گیٹ پر دعوتی مہم کا آغاز کیا
کلاسوں سے فارغ طلبا نے ہماری طرف توجہ کی اور معلومات کے حصول کی خاطر ہمارے
پاس آ گئے ۔ ہم تقسیم لٹریچر کے ساتھ ساتھ زبانی کلامی بھی اپنی دعوت کا تعارف کراتے
رہے ۔ ساڑھے نو بجے سے گیارہ بجے تک اس پروگرام کو چلانے کے بعد ہم کلب روڈ سے بینرز
کرتے ہوئے واپس دفتر آئے باقاعدہ مہم کے آغاز کے لئے ہمیں رفقائے تنظیم
اسلامی ملتان کا کافی انتظار کرنا پڑا ۔ کیونکہ ٹی بورڈ اور میگا فون ان کی تحویل میں تھے ۔
بہرحال سب لوگ قبل از نماز ظہر مہم کے آغاز کی جگہ پر پہنچ گئے نماز ظہر کے بعد ہم نے ٹی بورڈز
پر کتبات لگائے اور اس عاجز و ناکارہ راقم الحروف کی قیادت میں ۳۵ رفقاء کا یہ قافلہ
اپنی باقاعدہ دعوتی مہم کے لئے روانہ ہوا ۔ رفقاء کو مناسب ہدایات دی گئیں استغفار
اللہ فی القلب کی تلقین کی ۔ مقررین حضرات کا تعین کیا اور اللہ کے نام سے جنرل بس سٹینڈ
سے مہم کا آغاز کیا ۔ جونہی رفقاء انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ چلنا شروع ہوئے تو ناظرین
سامعین کی ایک خاصی بڑی تعداد متوجہ ہوئی ۔ ایک مناسب مقام پر چوہدری رحمت اللہ
بر صاحب نے تقریر کی ۔ موصوف نے بھرپور انداز میں ملت اسلامیہ پاکستان کی زبوں
حالی اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے واحد حل انقلاب اسلامی
کا تذکرہ کیا اور اس کے لئے اجتماعی جدوجہد کی غرض سے تنظیم اسلامی کے ساتھ بھرپور
عملی تعاون پر زور دیا ۔ تمام روٹ پر کم و بیش پندرہ کارنر میٹنگز کی گئیں اور لوگوں
کی خاصی بڑی تعداد نے ہمارے مقررین کی بات کو پوری توجہ اور انہماک سے سنا اور
ہماری دعوت کے کتبات کو پڑھا اور خوشی خوشی لٹریچر بھی لیا ۔ چوہدری رحمت اللہ
بر صاحب کے علاوہ جناب حافظ محمد رفیق صاحب ڈاکٹر محمد طاہر صاحب نے بھی
بھرپور جامع اور مدلل خطابات کئے ۔ الحمد للہ کہ بغیر کسی قابل ذکر مزاحمت کے ہماری

یہ دعوتی مہم قبل شہر کی معروف شاہراہوں اور پرہجوم مقامات سے گزرتی
ہوئی قبل از نماز مغرب اختتام پذیر ہوئی ۔ اس کے بعد یہ قافلہ وہاڑی کے ایک مضافین
گاؤں کی جانب رواں ہوا جہاں پر نماز عشاء کے بعد جناب چوہدری رحمت اللہ بٹر
صاحب کے خطاب عام کا اہتمام تھا مسجد کا ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا ، مقرر
موصوف نے سورۃ الحج کے آخری رکوع کی روشنی میں فرائض دین کا جامع تصور پیش
کیا اور نہایت مدلل اور سلیس زبان میں کلمۂ توحید کی تشریح فرمائی ۔ تقریباً رات دس
بجے وہاڑی واپسی ہوئی ۔ نماز فجر کے بعد بعض احباب سے ذاتی ملاقات اور افہام وتفہیم کا
پروگرام تھا چنانچہ ہمارے بعض سینیئر رفقاء ڈاکٹر محمد طاہر خاکوانی حافظ محمد رفیق اور
جناب عبدالماجد خاکوانی صاحبان نے یہ فریضہ سرانجام دیا نو بجے جنرل بس سٹینڈ کی
جامع مسجد میں جناب چوہدری رحمت اللہ بٹر صاحب کے خطاب کا پروگرام ہوا ۔
جناب چوہدری صاحب نے بڑی مدلل انداز میں تشبیہات کی مدد سے سامعین پر
اسلام اور پاکستان کے لازم ملزوم ہونے کو واضح فرمایا اور ہماری دینی و قومی مفادات
کے ایک نقطہ پر جمع ہو جانے کو ہماری خوش قسمتی گردانا اور اس ضمن میں انکی ادائیگی
کے لئے فوراً کمر بستہ ہو کر اجتماعی جدوجہد کرنے کی ترغیب وتشویق دلائی ۔ اور
تنظیم اسلامی کی پکار کا بھی تذکرہ کیا ۔ بعد ازاں اجتماعات جمعہ کے وقت منتخب مساجد
کے باہر بھرپور دعوتی لٹریچر کے ساتھ کام کرنے کا پروگرام بنایا گیا چنانچہ جامع
مسجد ضلع کونسل پرانا لاری اڈہ ، لکڑی منڈی کی مساجد کے ساتھ ساتھ وہاڑی
کی مرکزی جامع مسجد باغ والی کے باہر بھرپور دعوتی مہم نہایت کامیابی کے ساتھ
چلائی گئی ۔ نماز جمعہ کے بعد اس دعوتی مہم کا اختتام ہوا اور رفقاء اپنے اپنے
گھروں کو واپس گئے اس دعوتی وتذکیری مہم میں شریک ملتان ، شجاع آباد اور وہاڑی
کے رفقاء کی محنت قابل تحسین ہے بالخصوص شجاع کے رفقاء کا جذبہ اہتمام اور ایثار
وقربانی ہم سب کے لئے مشعل راہ ہے ۔

اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے خاص فضل وکرم سے رفقاء کا انفاق جان
ومال قبول فرماتے ہوئے اس دعوتی مہم کی برکات سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی
توفیق عطا فرمائے ۔ (از قلم : ڈاکٹر منظور حسین)

⁂⁂⁂

تعارف وتبصرۂ کتب

* نام کتاب : استحکامِ پاکستان
نام مصنف : ڈاکٹر اسرار احمد
ملنے کا پتہ : مرکزی انجمن خدام القرآن
۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور

صفحات ۱۶۶ قیمت مجلد : ۳۰ روپیہ

ڈاکٹر اسرار احمد، جنہوں نے جماعت نہم دہم کے ایک طالب علم کی حیثیت سے حصار (مشرقی پنجاب) کے دوران ۱۹۴۶ء اور پسماندہ صحرائی ضلع میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو منظم کیا تھا، پورے جوش وخروش سے تحریکِ پاکستان کو مسلم عوام میں مقبول بنانے کے لیے سرگرم حصہ لیا تھا، اُن کی محبت پاکستان کے ساتھ عین فطری ہے۔ قمری تقویم کے حساب سے ۲۷ رمضان ۱۴۰۵ھ کو پاکستانی قوم کے چالیسویں سال میں قدم رکھنے پر اُنہوں نے اسی فطری لگاؤ اور قلبی جذبے کے تحت تحریکِ پاکستان کے اسباب وعوامل، قیامِ پاکستان کے بعد رُونما ہونے والے حالات اور مستقبل میں پیش آنے والے خطرات اور روشن امکانات کا نہایت مدلل، فکر انگیز اور ذہنوں کے لیے سوچ کی راہیں کھولنے والا تجزیہ کیا ہے۔ اُن کے تجزیے کی تمام تر بنیاد قرآن وحدیثِ صحیحہ کی حکیمانہ تعلیمات، تاریخی حقائق اور مصور پاکستان علامہ اقبال کے ایمان افروز ملی اشعار پر قائم ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس فاضلانہ تجزیے بعنوان استحکام پاکستان میں اُن تمام اہم اور مؤثر عوامل ومحرکات کا ذکر کیا ہے جو موجودہ دَور میں کسی ملک کی ترقی وتعمیر اور بقا واستحکام کا باعث بن سکتے ہیں۔ مثلاً تاریخی پس منظر، فطری جغرافیائی حدود، نسلی قوم پرستی اور لسانی عصبیت وغیرہ مگر پاکستان کی تشکیل کے عوامل یکسر مختلف ہیں۔ اس کے بقا واستحکام کا ضامن صرف اور صرف ایک ہی عامل ہے اور وہ ہے اسلام کا قوت آفریں نظام۔ یہی اس ملک کے باسیوں کو متحد ومتفق بھی رکھ سکتا ہے اور ان میں اپنے ملک کی فلاح وترقی اور تعمیر وتقویت کے لیے بے مثل قوتِ عمل اور بے پناہ جذبۂ ایثار واخلاص بھی پیدا کر سکتا ہے۔

پاکستان جن ہولناک داخلی مسائل سے دوچار ہے اور جس انداز سے اس کے خلاف بیرونی سازشوں کے منصوبے تیار کیے جا رہے ہیں، اُن کے پیشِ نظر اجتماعات اور قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ کا ماہر بآسانی یہ پیش گوئی کر سکتا ہے کہ پاکستان کی وحدت اور اس کا وجود سخت خطرے میں ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس کتاب میں اسلامی تاریخ کے حوالے سے پاکستان کے روشن مستقبل کی بات کہی ہے کہ وہ غلبۂ اسلام کی عالمگیر اور انقلاب آفریں تحریک کا مرکز بن کر رہے گا۔ تجدیدِ ملت واحیائے دین کا جو شجرۂ طیبہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے گیارہویں صدی ہجری میں لگایا تھا جس کی آبیاری بارہویں صدی میں امام الہند شاہ محدث دہلوی نے، تیرہویں صدی میں مجاہدِ اعظم حضرت سید احمد شہید بریلوی اور چودہویں صدی میں شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبال اور مفکرِ اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی اور دیگر علمائے حق نے کی وہ خطۂ پاکستان میں ضرور بار آور ہوگا۔ پوری ملتِ اسلامیہ بلکہ پوری نوعِ انسانی اس کے سہانے اور ٹھنڈے سائے اور اس کے فرحت بخش اور سکون پرور ثمرات سے مستفید ہوگی۔

کتاب شروع سے آخر تک متین اور سنجیدہ مباحث سے پُر ہے لیکن علامہ اقبالؒ کے موزوں اشعار کے استعمال سے اس متانت وسنجیدگی میں سوز وگداز کی ایک ایسی کیفیت بھی شامل ہو گئی ہے جو دلوں کی سختی دُور کرنے کے لیے نہایت مفید ہے۔

کتاب کی کتابت وطباعت کا معیار نہایت بلند ہے۔ اس کی ظاہری حالت باطنی کیفیت سے ہم آہنگ ہے۔

(حافظ افروغ حسن)

مراسلہ نگار حضرات کی آراء سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

افکار و آراء

کیا عورت اسلامی مملکت کی سربراہ ہو سکتی ہے؟

مس بے نظیر بھٹو کا مطالبہ ہے کہ جلد انتخابات کے ذریعہ اقتدار ان کو سونپ دیا جائے۔ اس ضمن میں اہم ترین سوال یہ ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں عورت سربراہ بن بھی سکتی ہے یا نہیں! تنظیم اسلامی پاکستان کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ مارشل لاء کی طرح بامر مجبوری عورت کی سربراہی کو برداشت کیا جاسکتا ہے۔ ادھر ایم آر ڈی کے رہنما ولی خان نے کہا ہے کہ پٹھان ایک غیور قوم ہے اور وہ ایک عورت کی سربراہی قبول نہیں کر سکتے۔ ہم سب مسلمان ہیں اور ہمیں اپنے ہر مسئلے کو شریعت کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کرنی چاہئیے۔

قرآن حکیم نے نہایت ہی بلیغ انداز میں اس مسئلے کا حل پیش کر دیا ہے۔ سورۃ النساء ۳۴ میں ارشادِ ربانی ہے "اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ" مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ یعنی حاکم محافظ، اخلاق و معاملات کے نگران ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ قرآن کی رو سے ایک عورت اپنے خاندان کی سربراہ یا حاکم نہیں بن سکتی تو وہ کسی مملکت کی حاکم یا سربراہ کیسے بن سکتی ہے! اسی آیت میں "صالح بیویوں" کی یہ خصوصیت بتائی کہ وہ "شوہروں کی اطاعت گزار ہوتی ہیں"۔ اسی طرح رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ گرامی ہے "مرد اپنے بیوی بچوں پر حکمران ہے اور اپنی رعیت میں اپنے عمل پر وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہے"۔ (بخاری) قوا انفسکم واھلیکم نارًا " (کتاب النکاح) حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا "عورتوں کے ساتھ انتہائی خیر خوبی کی روش اختیار کرو کیونکہ وہ تمہارے پاس اسیر (زیرِ کنٹرول) ہیں" (ترمذی ابواب الرضاع باب ماجاء فی حق المرأۃ علی زوجہا۔ ابن ماجہ ابواب النکاح باب حق المرأۃ علی الزوج)

نماز تنظیم امت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ اسی لئے نماز کی امامت کو امامتِ صغریٰ کہا گیا ہے مگر شریعت نے یہاں بھی عورت کو مردوں کی نماز کی امامت کا اہل قرار نہیں دیا۔ عورت عورتوں کی نماز نفل تراویح کی امامت کر سکتی ہے۔ (المحلی جلد ۳ صـ ۱۲۷) السنن الکبریٰ جلد ۲ صـ ۱۲۸)

نبی اکرمؐ کی ایک مشہور حدیث ہے۔ مرد ہلاک ہوئے جب وہ عورت کی اطاعت کرنے لگے (مستدرک حاکم جلد ۴ صـ ۲۹۱) آپؐ کا ایک دوسرا فرمان اور بھی زیادہ واضح ہے "وہ قوم

کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جس نے اپنی زمام اقتدار عورت کے حوالے کردی ہو۔" (بخاری، کتاب المغازی باب کتاب النبی الی کسریٰ وقیصر، ترمذی ابواب الفتن باب (بغیر عنوان) نسائی کتاب آداب القضاۃ) اس حدیث کی شرح میں امام شوکانی فرماتے ہیں "اس میں دلیل ہے اس بات کی کہ عورت سرپرستی اور حکومت کی اہل نہیں ہے اور کسی قوم کے لئے اس کو سرپرست مقرر کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ عدم فلاح اور خسران کو لازم کرنے والے فعل سے پرہیز کرنا فروری ہے۔" (نیل الاوطار جلد ۹ صہ ۱۶۸) علامہ ابن حزم لکھتے ہیں "اہل قبلہ (مسلمانوں) کے تمام فرقوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو عورت کی امامت کو جائز سمجھتا ہو۔" (الفصل فی الملل والاہوا والنحل جلد ۴ صہ ۱۱۱)۔

بعض لوگوں کے اس خیال کے بارے میں کہ عورت کو خلیفہ بنائے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ وہ دوسرے قابل افراد کے تعاون سے امور سلطنت انجام دے سکتی ہے "عورت اسلامی معاشرے میں" کے مصنف مولانا سید جلال الدین انصر عمری، صہ ۲۵۴ پر لکھتے ہیں: "لیکن یہ خواہ مخواہ کی توجیہہ ہے کیونکہ کوئی شخص کسی ذمہ داری کا اہل اس وقت ہوتا ہے جب کہ خود اس کے اندر اس ذمہ داری کے اٹھانے کی اہلیت ہو۔ یہ کوئی خاندانی جاگیر نہیں ہے کہ بغیر کسی استحقاق کے از خود حاصل ہو جائے۔ اسی لئے علماء نے اس رائے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا ہے۔" علامہ ابن عابدین اس ضمن میں فرماتے ہیں "لیکن اس کو امام کے منصب جیسے منصب پر متعین کرنا بلاشبہ صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ اس کی اہل نہیں ہے۔ بعض نادانوں کے اس خیال کے برعکس کہ اس کو امام مقرر کرنا درست ہے اور وہ اپنا نائب مقرر کرلے گی چونکہ کسی منصب پر تعین صحیح اس وقت ہوتا ہے جب کہ اہلیت پائی جائے اور نائب مقرر کرنا تو کسی منصب پر تعین کے صحیح ہونے کے بعد کی چیز ہے۔" (رد المحتار علی الدر المختار جلد ۴ صہ ۴۹۴)

ایک نبی پوری ملت اپنے پورے قبیلے یا گروہ کے لئے عظیم ترین رہنما ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمدؐ تک ایک لاکھ سے زیادہ انبیاء کرام اس دنیا میں بھیجے لیکن یہ سب کے سب مرد تھے، ان میں کوئی عورت نہ تھی۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں کوئی عورت جمہوری طریقے سے منتخب ہو کر کسی اسلامی مملکت کی سربراہ نہیں بن سکی ہے۔ رضیہ سلطانہ اور چاند بی بی کی فرمانروائی موروثی بادشاہت تھی۔ محترمہ فاطمہ جناح کو صدر ایوب کے مقابلے میں کھڑا کرنا بی ڈی نظام کو ختم کرنا، آمریت کا خاتمہ کرنا اور نئے آئین کے تحت انتخاب کرانا تھا۔ ان نئے انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کو کھڑا نہیں کرنا تھا۔ بایں ہمہ موصوفہ کے صدارت کے لئے انتخابات میں حصہ لینے پر مذہبی نقطہ نظر سے وسیع پیمانے پر اعتراضات کئے

گئے تھے اور آج تک اسے غلط تصور کیا جاتا ہے۔ جماعت اسلامی نے (جو اس وقت کالعدم قرار دی جا چکی تھی اور مولانا مودودی جیل میں تھے) اس امر کی مشروط حمایت کی تھی کہ نئے آئین کے تحت محترمہ فاطمہ جناح کو سربراہِ مملکت نہیں بنایا جائے گا۔ گویا محترمہ کو صرف ایوب خاں کو اقتدار سے ہٹانے کی خاطر ایک "مہرے" کی طور پر استعمال کیا جانا تھا۔ مولانا مودودی نے یہ بھی کہا تھا کہ صدر ایوب میں سوائے اس کے اور کوئی خوبی نہیں کہ وہ ایک مرد ہے اور محترمہ فاطمہ جناح میں سوائے اس کے اور کوئی کمزوری نہیں کہ وہ ایک عورت ہے!

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ گو شرعاً ایک عورت اسلامی مملکت کی سربراہ نہیں بن سکتی تاہم وہ مشیر بن سکتی ہے اور بہت سی سماجی اور معاشرتی اداروں کی ذمہ داریاں اس کو سونپی جا سکتی ہیں۔ وہ فلاح و بہبود کی انجمنوں کی سربراہ بن سکتی ہے۔ وہ اسلامی معاشرے میں رائے شورہ، تنقید و احتساب، اجتہاد و اظہار، تالیف و تصنیف اور مردوں کے برابر دوسرے حقوق رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی عدالتیں قائم کرنے اور قضا و نفاذ قوانین کا حق بھی رکھتی ہے۔ امت کا یہ اتفاق کہ عورت کسی اسلامی مملکت کی سربراہ نہیں بن سکتی عورت سے کسی بیر یا حقارت و نفرت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس کی فطری کمزوریوں (ڈِس ایبیلیٹیز) کے باعث انہوں نے اس کو اس بارِ گراں کے قابل نہیں سمجھا۔ علماء نے لکھا ہے "منصب امامت کا اہل وہی شخص ہو سکتا ہے جو دین کے اصول و فروع میں مجتہدانہ بصیرت رکھتا ہو تاکہ ہر طرح کی نگر رکھنے والوں کو مطمئن کر سکے، معاملات میں ژرف نگاہ ہو اور صلح و جنگ کی تدابیر سے پوری طرح واقف ہو ورنہ وہ دین و ملت کو پیش آنے والے مسائل حل نہیں کر سکے گا۔ انتہائی جری اور عزم و حوصلہ کا مالک ہو تاکہ کوئی قوت اس کو اپنے فرض کی ادائیگی میں مانع نہ بن سکے، ظاہر ہے قدرت یہ صفات مردوں ہی کے اندر پیدا کرتی ہے اور وہ بھی ہر ایک میں نہیں صرف معدودے چند افراد میں"۔ علامہ سعدالدین تفتازانی شرح مقاصد میں لکھتے ہیں۔ "(عورت کیوں منصب امامت کی اہل نہیں ہے) اس لئے کہ عورتوں کی عقل اور دین (ان کی جسمانی قوت) ناقص ہے اور ان کو فیصلے کے مقامات (عدالتوں) اور جنگ کے محاذوں پر جانے کی اجازت نہیں ہے" (شرح مقاصد جلد ۲، صہ ۲۰۳ شرح مواقف جلد ۸ صہ ۲۴۹)

۱۹۶۲ء میں ہمارے پے کمیشن کے ممبران نے حکومت سے سفارش کی تھی کہ سی ایس پی و دیگر اعلیٰ عہدوں پر خواتین کو فائز نہ کیا جائے طبّی نقطۂ نظر سے ہر عورت بلوغت سے لے کر زمانۂ یاس تک ہر ماہ ایک ہفتہ سے زیادہ عرصہ کے لئے دردِ سر، تکان، اعضاء شکنی، اعصابی کمزوری، اضمحلالِ طبیعت، خرابیٔ ہضم، عضلات میں سستی، ذہانت اور خیالات کو مرکوز کرنے کی قوت میں کمی، طبیعت میں

چڑچڑاپن، سینے میں درد اور ٹمیس اور ذہنی پراگندگی وغیرہ کا شکار رہتی ہے۔ (ڈاکٹر امیل نوواک ڈاکٹر وائس کے سکائی اور ریڈ نیبر کر سکے سکائی، پروفیسر لائینسکی کتاب "دی ڈی ویلپ منٹ آف ہیومن" آن ویمن" زمانہ حمل میں عورت کے قویٰ کسی طرح بھی جسمانی اور دماغی محنت کا بار نہیں اٹھا سکتے جو حمل ماسوا دوسرے ایام میں سنبھال سکتے ہیں۔" (ڈاکٹر ریریف)، ڈاکٹر فسٹر کے مطابق "ایک تندرست بھی حمل کے زمانے میں سخت نفسی اضطراب میں مبتلا رہتی ہے۔ اس میں تلون پیدا ہو جاتا ہے، خیالات پریشان رہتے ہیں، شعور اور غور و فکر اور سمجھ بوجھ کی صلاحیت بہت کم رہ جاتی ہے" ہولاک ایلس البرٹ مول و دیگر ماہرین کی متفقہ رائے یہ ہے کہ زمانہ حمل کا آخری ایک مہینہ تو ہرگز اس قابل نہ ہوتا کہ (؟) میں عورت سے کوئی جسمانی یا دماغی محنت لی جائے۔" ("پردہ" از مولانا مودودی) بچے کی پیدائش کے بعد بھی کم از کم ایک ماہ تک عورت کو ان کیفیات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یہی وہ حقائق ہیں کہ جن کی بنا پر یہ دنیا بھر میں عورتوں کو وضع حمل سے قبل ۲ ماہ کے لئے زچگی رخصت دے دی جاتی ہے، علاوہ ازیں اسلام میں عورت کے لئے شوہر کی وفات یا طلاق کی صورت سوا چار ماہ کی "عدت" کی پابندی ہے۔

اب ایک معمولی عقل کا انسان بھی اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ایک ایسا شخص کہ جس کی زندگی میں ہر ماہ اور ہر سال عدم صلاحیت کارکردگی کے طویل دورے پڑتے ہوں اور کئی کئی ماہ پابند خانہ رہنے پر مجبور ہو، وہ ایک سلطنت کا سربراہ کیسے بن سکتا ہے؟ کیا فوجوں کی کمان اس کے سپرد کی جا سکتی ہے؟ کیا اس کی جسمانی و دماغی قابلیتوں پر ہمہ وقت بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟

عورت کی یہی وہ "ڈس ایبی لیٹیز" (کمزور پہلو) ہیں جن کی بنا پر روسی حکومت نے ۴۰ سے زیادہ ملازمتوں یا شعبوں کے لئے خواتین کو ناموزوں قرار دے دیا ہے۔ چین کے عظیم رہنما ماؤزے تنگ نے "جدید چین" کتاب کے صفحہ نمبر ۳ پر لکھا ہے "تقسیم کار کے وقت اس امر کا خیال رکھا جائے کہ عورتوں کی خصوصی جسمانی مشکلات کیا ہیں۔" امریکہ میں خواتین کو حساس شعبوں سے ہٹایا جا رہا ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دوں کہ مس بے نظیر بھٹو اپنی کم عمری، ذہنی ناپختگی، مغربی تعلیم و تربیت مذہب کو انسان کا ایک پرائیویٹ معاملہ قرار دینے کی پالیسی، اسلام کی جگہ سوشلزم اور بھٹو ازم ملک میں نافذ کرنے کا اعلان و دیگر ایسے لادینی نظریات کے باعث اسلامی جمہوریہ پاکستان کی سربراہ بننے کی بہر حال اہل نہیں ہیں اگرچہ اضطراری حالات میں اسلام کے لئے ایک عورت کی سربراہی کو برداشت یا قبول کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

---

(۲)

کھیلوں کے پردے میں فحاشی

مکرمی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سلامِ مسنون

میں آپ کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اسلام آباد میں بیڈمنٹن کیلئے ایک جمنیزیم بنایا گیا ہے جس میں بین الاقوامی مقابلے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں بیرونِ ملک سے آئی ہوئی لڑکیاں مختصر نیکر میں بیڈمنٹن کھیلتی اور اُچھل کُود کا مظاہرہ کرتی ہیں جو پوری تفصیل اور کلوز اَپ کے ساتھ ٹیلی وژن پر دکھایا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں ہر جمعہ کے روز صبح کے وقت ٹی وی پر بین الاقوامی کھیلوں کی مفصل فلم دکھائی جاتی ہے۔ جس میں مختصر لباس میں لڑکیاں دوڑیں لگاتی ہوئی اور ہرڈلز پھلانگتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ میں پھر عرض کردوں کہ یہ پروگرام عین جمعہ کے مبارک دن نشر ہوتا ہے۔ اور پھر جمعہ کی نماز کے بعد بین الاقوامی کُشتیاں دکھائی جاتی ہیں۔ بے شک کھلاڑی مرد ہی ہوتے ہیں لیکن آخر مرد کا بھی تو ایک ستر ہوتا ہے میرا خیال ہے کہ لوگ اس بات کو بھول چکے ہیں کہ حدیث کے مطابق ناف سے گھٹنے تک مرد کا ستر ہوتا ہے — اور کوئی اس طرف توجہ بھی نہیں دلاتا۔

کوریا میں ابھی پچھلے دنوں بین الاقوامی کھیلیں ہوئی ہیں۔ جو پوری جزئیات کے ساتھ ہمارے ٹی وی نے بھی دکھائی ہیں۔ جس میں مردوں کے علاوہ لڑکیاں مختصر اور ناکافی لباس میں تیراکی تک کرتی دکھائی گئی ہیں۔

اور جو بہت بڑا معاملہ سامنے ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان میں ورلڈ کپ کے مقابلے منعقد کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ چنانچہ وہ سب کچھ جو اب تک ٹی وی پر دیکھا جاتا ہے، عملی طور پر نظروں کے سامنے ہوگا۔ یہ کھیلوں کے پردے میں اس قوم کے اندر عریانی اور فحاشی کو پھیلانے کی ایک منظم سازش ہے۔ کیا شریعت بِل کے لئے تحریک چلانے والے علماء، اس طرف بھی کچھ توجہ فرمائیں گے۔

والسلام

مصباحُ الایمان

خلف الرشید جناب نعیم صدیقی صاحب (مدیر ترجمان القرآن

فہمِ قرآن

اور

خصوصاً قرآن کے منضبط اور مربُوط مطالعہ کے ضمن میں —

ڈاکٹر اسرار احمد

کی نشری (ریڈیو) تقاریر پر مبنی ایک اہم تصنیف

قرآن مجید کی سُورتوں کا اجمالی تجزیّہ

(سورہ الفاتحہ تا سورہ الکہف)

ضرور مطالعہ کیجیے

◎

اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ کتابت ○ دیدہ زیب طباعت

ہدیہ : ۱۰ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے اللہ . . . . .

ہم عاجز ہیں ـــــــ تو قوی ہے
ہم ظالم ہیں ـــــــ تو رحیم ہے
ہم گناہ گار ہیں ـــــــ تو بخشنے والا ہے

ہم نے تجھ سے یہ ملک مانگا تھا کہ یہاں تیرے کلمے کو بلند کریں گے
تیری کتاب کے احکامات پر عمل کریں گے
تیرے آخری نبی اور رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سُنّت کی پیروی کریں گے
لیکن ہم نے ـــــ اُس عہد کو پامال کر دیا
ہم نے اپنی خواہشات اور مال و دولت کو اپنا معبود بنا لیا
ہم تجھے بھول گئے
لیکن تو ہمیں فراموش نہ کر

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کر دے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

الداعی الی الخیر: میاں عبدالواحد
بھگوان سٹریٹ
پرانی انارکلی لاہور

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

سلد ۳۶
ہ ۵
ن المبارک ۱۴۰۷ھ
مئی ۱۹۸۷ء
شمارہ -/۵
الانہ زر تعاون -/۵۰

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

ینجنگ ایڈیٹر
قتدار احمد

ادارہ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
نا محمد سعید الرحمٰن علوی
حافظ عاکف سعید
مقبول الرحیم مفتی

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوحا، قطر، متحدہ عرب امارات — ۲۵ سعودی ریال یا ۱۵۰ روپے پاکستانی

ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر۔	۶ امریکی ڈالر یا -/۱۰۰ روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، اسکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ۔	۹ امریکی ڈالر یا ۱۵۰ 〃
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۱۲ امریکی ڈالر یا ۲۰۰ 〃 〃

ترسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور، یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴ (پاکستان)، لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: ۸۵۲۶۸۳-۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی فون ۲۱۶۵۸۶

طابع: چوہدری رشید احمد مطبع: مکتبہ جدید پریس شاہراہ فاطمہ جناح، لاہور

مشمولات

○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

عرضِ احوال

ملکِ خداداد پاکستان کی موجودہ حکومت اور اس کے اختیار و اقتدار کے...
ں جواز کے بارے میں حسنِ ظن رکھنا اپنے لئے دشوار پاتے ہوئے بھی ہم اسے
ایک امرِ واقعہ کے تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ہیئتِ مقتدرہ تو ریفرینڈم اور انتخابات کی
لیلا اور عوامی نمائندگی کا سوانگ رچا کر ایوان میں پہنچی ہے' بدترین آمریت اور
ں فسطائی جبر کے ذریعے بھی جو تختِ حکومت پر متمکن ہو گیا' یہاں تو اسے بھی
نظر سے دیکھنے کی روایت مستحکم نہ ہو سکی۔ مزید بر آں خالص فقہی زاویۂ نظر تو
ہی یہ کہ زمامِ کار کوئی بھی مسلمان سنبھال لے' کسی بھی طرح اقتدار پر قابض ہو
ے' اس کی قوت کا مدار کچھ بھی ہو' اگر وہ اپنے آپ کو اور اپنے اختیار کو
الملکؐ کی مرضی کا تابع کر دے تو وہ بھی ہمارے لئے "**اولی الامر منکم**" میں
ہو گا جس کی اطاعت فی المعروف کا پابند ہمیں خود احکم الحاکمین نے کیا ہے۔ صدرِ
ت اور ان کے وزیرِ اعظم کی تا حال کارکردگی کا ریکارڈ دیکھتے ہیں تو سوائے مایوسی
، ہمارے پلے کچھ نہیں پڑتا لیکن **نصح** وخیر خواہی کے اس مفہوم کو پیش نظر رکھ
جس کی صراحت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اربابِ حل و عقد کے باب
فرمائی ہے اور آپؐ کے اس قولِ فیصل سے امید کی روشنی حاصل کرتے ہوئے کہ

"اِنَّ قُلُوْبَ بَنِیْ اٰدَمَ	"بنی آدم کے تمام دل رحمٰن کی دو
کُلَّهَا بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ	انگلیوں کے درمیان ایک ہی دل
مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ	کی مانند ہیں، اسے جس طرف چاہتا
کَقَلْبٍ وَّاحِدٍ یُصَرِّفُهٗ	ہے پھیر دیتا ہے ....."
کَیْفَ یَشَاءُ ....."	

جسارت کر رہے ہیں کہ ان کے بعض حالیہ بیانات پر کچھ معروضات پیش کریں۔ ع

اندازِ بیاں گرچہ بہت خوب نہیں ہے!!
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات

وزیر اعظم محمد خاں جونیجو کی ذاتی شرافت و نجابت مسلّمہ ہے اور ہم یہ توقع رکھنے میں بھی حق بجانب ہیں کہ وہ عام معنوں میں سیدھے سادھے مسلمان بھی ہیں۔ انہیں ضرور احساس ہو گا کہ اللہ رب العزت نے انہیں قصرِ حکومت میں پہنچا کر فی الحقیقت ان کے دوشِ ناتواں پر ایک بھاری ذمہ داری کا بوجھ ڈال دیا ہے۔ وہ ایک دن بقدر وسعتِ اختیار اس کی عدالت میں مسئول ہوں گے اور وہ دن دور نہیں۔ بس آیا کہ آیا...... لندن میں بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے شاید وہ بھول گئے تھے کہ اس کی ویڈیو ٹیپ ایک اور جگہ بھی تیار ہو رہی ہے۔ وہاں ان کی بات کے اس مفہوم میں کوئی اگر مگر حائل نہیں تھا کہ ہم مجوزہ شریعت بل کو پاس نہیں ہونے دیں گے کہ اس سے ایک مخصوص فرقے کی بالادستی قائم ہوتی ہے۔ ہم کسی ایک فقہ کو سب لوگوں پر مسلط نہیں کر سکتے۔ وغیرہ...... لیکن وطنِ عزیز کی فضا میں داخل ہوتے ہی کراچی ایئرپورٹ پر انہوں نے اپنی بات کو یہ کہہ کر بزعمِ خویش ایک خوبصورت جامہ پہنانے کی کوشش کی کہ ہم شریعت بل کو شریعتِ محمدیؐ کے مطابق بنائیں گے۔ بل کو متنازعہ نہیں بنا چاہتے"۔ تری آواز مکے اور مدینے ..... اور درویش کی صدا کیا ہے! ۔ ان سطور کے راقم کا یہ منصب نہیں کہ وزیر اعظم سے وضاحت طلب کرے، یہ کام محترم مفتی حسین نعیمی صاحب اس اخباری بیان کے ذریعے بروقت کر چکے ہیں کہ شریعتِ محمدیؐ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تعریف سے بھی رجالِ دین کے علم و فن کو جلا بخشی جائے۔ ہم تو اس موقع پر جناب جونیجو سے محض دو آسان امتحانی سوالات اکتفا کریں گے جن کے جواب سے شریعتِ محمدیؐ کا مفہوم ہم جیسے عامی لوگوں پر بھی آشکار ہو سکتا ہے۔ ایک ذاتی نوعیت کا اور دوسرا ان کے منصب کی مناسبت سے۔ قوی امید رکھتے ہیں کہ شریعت کے نفاذ کا مدعی ہمارا وزیر اعظم پیچیدہ فقہی مسائل

باریکیوں سے نہیں تو دین کے بنیادی حقائق سے ضرور واقف ہو گا۔ بلکہ ایسی باتیں تو مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کی سعادت کے ناتے انہیں گھٹی میں پلائی گئی ہوں گی۔ ہم پورے خلوص واخلاص سے انہیں یہ بھی یقین دلاتے ہیں کہ ہمارا ارادہ کسی بھی طور طنز و استہزا کا نہیں دلوں کے بھید جاننے والا گواہ ہے کہ ہم پوری دردمندی سے انہیں ان کی فلاحِ اُخروی کی طرف متوجہ کر رہے ہیں ورنہ ع

مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

ذاتی نوعیّت کے سوال کی تمہید یہ ہے کہ ستر و حجاب (اور جنرل محمد ضیاءالحق صاحب کے حوالے سے مروّجہ اصطلاح میں چادر اور چار دیواری) کے مسائل واحکام سے قطع نظر پردے کے خالص قرآنی آداب سے تو جناب جونیجو ضرور باخبر ہیں۔ وہ برِّ کوچک میں اسلامی تہذیب و تمدن کے اوّلین گہوارے 'سندھ..... کے بھی دیہی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا اس باب میں شریعتِ محمدیؐ کے خالص غیر فرقہ وارانہ احکامات بھی انہیں یقیناً معلوم ہوں گے۔ ان کے وفد کے بعض معزز اراکین اپنی بیگمات کو جیسے سولہ سنگھار کروا کے محفلوں میں سجاتے رہے چلئے اس کی ذمّہ داری سے بھی انہیں بری کئے دیتے ہیں..... لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا لیکن 'برا ہو ٹی وی کی دست درازیوں کا' آنکھوں دیکھنے کے بعد ان سے بصد ادب سوال ہے کہ وہ دیارِ غیر میں اپنی دخترِ نیک اختر کو کھلے سر اور لہراتے بالوں جس طرح بے حجاب ساتھ لئے پھرے اور اپنوں پرایوں سے جیسے بے تکلف مصافحے کراتے رہے اس کا جواز شریعتِ محمدیؐ کی کس تعبیر سے انہیں حاصل ہوا تھا؟ جنابِ وزیرِ اعظم! اس گستاخی پر ہم درویشوں کو آپ جیسے چاہیں عقوبت کا سزاوار ٹھہرالیں "بڑا بےادب ہوں 'سزا چاہتا ہوں" لیکن یاد رکھیئے داورِ حشر بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ آپ کو بھی اس بات کی جوابدہی کرنی ہو گی کہ عائشہ اور فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی نام لیوا یہ دخترانِ قوم۔ "چشمِ فلک نے آج تک دیکھی نہ تھی جن کی جھلک" ...... کیوں اور

کیسے بے حجاب ہوئیں!!

جونیجو صاحب سے ان کے منصب کی مناسبت سے ہمارا دوسرا سوال خود اپنے اندر یہ جواب رکھتا ہے کہ "ظہر الفساد فی البر و البحر بما کسبت ایدی الناس" جس سے آج انسانیت بالعموم اور اللہ کے دین کی برکات کی یہ موعودہ تجربہ گاہ یعنی پاکستان بالخصوص دوچار ہے، کسی بھی واقعی اور مثبت تبدیلی کے لئے انقلابی جدوجہد کی سکت رکھنے والے مردانِ کار کی راہ تک رہی ہے۔ بایں ہمہ انہیں بتانا ہو گا کہ ملک میں جاری و ساری مالیاتی امور سے متعلق بے شمار خالص غیر اسلامی معاملات پر مستزاد پرائز بونڈز کی امّ الخبائث لعنت پر شریعت محمدیؐ میں کیا تنازعہ ہے جس میں سود اور جوئے کا قرانِ نحس ہی نہیں ملکی معیشت کے اعتبار سے بھی قباحتوں کا ایک سلسلۂ نامسعود مستور ہے۔ 'قومی بچت' کی اس نادر سکیم سے نہ جانے کتنی بدعنوانیاں وابستہ ہیں۔ بہت سے راز تو سربستہ ہیں 'طشت ازبام بات یہ ہے کہ اس سے ایک طرف تو بے زر، راتوں رات 'زردار' ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف 'زردار' اس کو اپنا زرِ سیاہ سفید کرنے کے لئے یوں بطور صابون استعمال کر رہے ہیں کہ فرق صاف ظاہر ہے۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب سے بھی ان کے خطابِ پارلیمنٹ کے سلسلے میں..... "او صیکم و نفسی بتقوی اللہ" کے زیرِ عنوان کچھ عرض کر[illegible] ہے۔ وہ گولف کے تو صرف شائق ہی تھے اب میدانِ سیاست کے بھی مانے ہوئے کھلاڑی ہیں۔ سیاست میں انہیں مات دینا نہ ہمارے مقاصد میں شامل ہے نہ مقدو[ر] میں "یہ تاب 'یہ مجال' یہ طاقت نہیں مجھے"۔ "لیکن لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظ[ر] کیا کیجیے" ان کی ذہانت و فطانت سے پُر ذو معنی باتیں اور کہہ مکرنیاں سن کر حسرت آتی ہے کہ یہ صلاحیت و مہارت اس ملک کی صحیح سمت میں "اسلامائزیشن" میں صرف ہوتی تو تاریخ میں ان کے لئے کیا مقام اور آخرت کے لئے کیسا توشہ فراہم ک[ر]

سکتی تھی جس پر انہوں نے لگ بھگ دس سال مطلق العنان حکمرانی کی ہے۔ لیکن اللہ کی قدرتِ کاملہ سے آج بھی بعید نہیں کہ انہیں توفیق ارزانی فرما ہی دے۔ پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں ان کی تقریر کا ہر موضوع تفیصلی بحث کا طالب ہے اور ہم ان پر بات کرنا چاہیں تو وہی نقشہ ہو گا کہ

جس نے چھینی تھی کل ہماری نیند
ابتدا پھر وہی کہانی کی

لہٰذا یہ کام ہم اراکین پارلیمنٹ اور دانشورانِ قوم کے سپرد کرتے ہوئے صرف ایک نکتے کی داد پر اکتفا کریں گے۔ ہمیں اپنے جریدے کی صحافت کی تنگ دامانی کا پاس بھی رکھنا ہے۔ تاہم اس سے پہلے ایک ضمنی بات پر جو پارلیمنٹ میں بھی ضمناً ہی ہوئی، گفتگو کرتے ہوئے ہم بھی شاید پارلیمانی روایات کا لحاظ نہ رکھ سکیں، پیشگی معذرت طلب کرتے ہیں کہ ؏

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد میرے دل میں رسوا ہوتا ہے

صدرِ بانمکین جب خطاب کے لئے روسٹرم کی طرف تشریف لے جا رہے تھے اس وقت چند معزز اراکینِ پارلیمنٹ (سینٹ اور قومی اسمبلی) نے اٹھ کر کچھ ترتیب سے، کچھ بے ترتیبی سے بہر حال جمہوری مے خانۂ مغرب کے نرالے انداز کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کچھ باتیں کہیں جنہیں ملا جُلا لیا جائے تو خلاصہ یہ بنتا ہے کہ ہم دس سال سے آپ کی تقریریں سن رہے ہیں، ذرا باہر نکل کر خود بھی سنیئے، اپنے وزیر اعظم کے اعلانِ لندن کا نوٹس لیجئے جو شریعت بل کو نامنظور کر کے آئے ہیں ہمارے سوالات کے بھی جوابات عنایت کیجئے...... وغیرہ...... صدر صاحب نے اس پر فرمایا "اگر آپ قوم اور ملک کے لئے روایات برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو پھر آپ اپنی پارلیمانی روایات کے مطابق پہلے مجھے سن لیجئے"

آپ نے یاد دلایا تو ہمیں یاد آیا کہ ہماری خالص اپنی بھی کچھ پارلیمانی روایات

ہیں جو سرورِ کونینؐ کے نائبینؓ نے قائم کیں۔ وہی شاہِ دوجہاںؐ جن کے حضور ہدیۂ نعت (بشرطِ ترنم) سن کر آپ آبدیدہ ہو جاتے ہیں' وہ آقاؐ جس کے کرم سے آپ کی "بات اب تک بنی ہوئی ہے" ان کے یارِ غارؓ نے خلافتِ رسول کا منصب سنبھالتے ہی وقت کے ایوانِ صدر 'یعنی مسجدِ نبویؐ میں قوم سے جو افتتاحی خطاب کیا وہ یقیناً آپ کی نظر سے گزرا ہے۔ ان کے دوسرے ساتھی جو آج بھی روضۂ اطہر میں قرب و رفاقت کے مزے لوٹ رہے ہیں' امیرالمومنین' خلیفۃ المسلمین عمرؓ ابن الخطاب 'جن کی حکومت بحروبر کے اتنے حصے پر قائم تھی کہ اس کا رقبہ موجودہ پاکستان ۔ سے دسیوں گنا بڑا تھا' مجلس شوریٰ کے روسٹرم یعنی مسجدِ نبوی کے منبر سے صدارتی تقریر فرمانے لگے تو ایک رکنِ پارلیمینٹ نے پوائنٹ آف آرڈر اٹھائے بغیر کھڑے ہو کر اعلان کیا تھا کہ "نہ سنیں گے' نہ اطاعت کریں گے' پہلے ہمیں بتایا جائے کہ دراز قامت امیرالمومنینؓ کا کرتا اس ناکافی کپڑے سے کیسے بن گیا جو مالِ غنیمت میں سے سب کو برابر تقسیم ہوا" ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قیمت غالبؔ جو اس کرۂ ارضی پر اسی چرخِ نیلی فام تلے پارلیمانی روایات میں ایک درخشاں اور انمٹ روایت کا اضافہ چھوڑ گیا۔ ایوان کے اس اجلاس کی کارروائی میں وہ رخنہ کیسے پُر کیا گیا تھا۔ اس کی تفصیل سے بھی جنرل صاحب لازماً باخبر ہیں۔ ہم حکیم الامت کی زبانی بس یہ عرض کریں گے کہ ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

صدرِ گرامی قدر نے بہت سے اہم امور کی جانب مجلسِ ملی اور حکومت کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"یہ سارے کام اپنی جگہ بہت اہم ہیں لیکن میرے خیال میں اہم ترین کام جو حکومت انجام دے سکتی ہے' وہ نظامِ اسلام کا عملی نفاذ ہے ہم سے

مارشل لاء کے دور میں جو کچھ ہو سکا ہم نے کیا۔ اب آپ اس طرف توجہ دے رہے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ ہمیں یہ کام بتدریج مگر کسی تامل کے بغیر کرنا ہو گا۔ صدر نے کہا کہ نظامِ اسلام کے نفاذ کی طرف توجہ دیتے وقت نظامِ حکومت کو نظر انداز نہ کریں کیونکہ غیر اسلامی نظامِ حکومت کے تحت اسلامی نظام نافذ نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام انتخابات کی مخالفت نہیں کرتا جمہوریت کو ممنوع قرار نہیں دیتا۔ پارلیمانی نظامِ حکومت کو غیر اسلامی قرار نہیں دیتا۔ یہ تو صرف رہنما اصول مہیا کرتا ہے۔ نظامِ حکومت کے بھی' نظامِ معیشت کے بھی' نظامِ معاشرت کے بھی۔ آپ نظامِ حکومت سمیت ہر شعبۂ زندگی میں ان اصولوں کو اپنایئے انشاء اللہ آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔"

جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں ان جملوں میں بھی معانی کے سمندر بند ہیں' متعدد امور محلِ نظر ہیں لیکن ہمیں محض ایک نکتے کا حق ادا کرنا ہے اور وہ بھی صرف عبارت محولۂ بالا کے سیاق و سباق میں۔ یعنی یہ کہ آپ نظامِ حکومت سمیت ہر شعبۂ زندگی میں ان اصولوں کو اپنایئے۔ انشاء اللہ آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔ بالکل ایسے ہی جیسے انہوں نے خود مارشل لاء کے دور میں نظامِ اسلام کا جتنا کچھ ان سے ہو سکا عملی نفاذ کیا اور ماشاء اللہ انہیں کچھ نہ ہوا بلکہ چشمِ بد دور کسی کو بھی کچھ نہ ہوا۔ خیر القرون میں حدود نافذ ہوئیں تو کہرام مچ گیا تھا۔ باا ثر قبیلے کی ایک خاتون قطعِ ید کی حد کی زد میں آئی اور سفارشی وفد حضورِ رسالتمآبؐ پیشِ خدمت ہوا تو رخِ انور شدتِ غضب سے سرخ ہو گیا تھا ارشاد ہوا

لَوْ اَنَّ فَاطِمَۃَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ یَدَھَا"	"واللہ کی قسم اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا"

بد کاری کی حد قائم ہونا عملاً محالات میں سے ہے۔ کون عقل کا دشمن چار عینی گواہوں کی موجودگی میں یہ فعلِ شنیع کرے گا؟ لیکن تاریخ کے صفحات پر وہ واقعات ابد تک کے لئے ثبت ہیں کہ حدود اللہ کا احترام دلوں میں رکھنے والوں نے اپنی وقتی لغزشوں کا از خود اعتراف کر کے اصرار کیا کہ انہیں اس گناہ سے پاک کر دیا جائے اور نتیجتاً رجم کی وہ سزا قبول کی جو آج کی جدید حیوانیت نواز و انسانیت سوز تہذیب کے نزدیک بہیمانہ اور ناقابلِ تصور ہے ایک روایت کے مطابق امیر المومنین عمرؓ کے صاحبزادے سے شراب نوشی کی خطا سرزد ہو گئی تو شفیق باپ نے دُرّہ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا مبادا کوئی فرستادہ رعائت نہ برت جائے اور ہمارے لئے سرمایۂ صد افتخار وہ "مجرم" کوڑوں کا شمار پورا ہونے سے پہلے ہی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ لیکن وہ پرانی باتیں ہیں' اب تو صورتِ حال یہ ہے کہ اسلامی جمہوریۂ پاکستان میں سالہا سال سے مارشل لاء جیسی قوتِ نافذہ کے تحت حدود آرڈی نینس نافذ ہے اور کروڑوں ابنائے وطن بقائمیِ ہوش و حواسِ خمسہ دیکھ رہے ہیں کہ کسی کے دشمنوں کو بھی کچھ نہ ہوا۔ چوری اور ڈاکے کی چیدہ اور شاہکار وارداتیں جو پولیس کے علم میں لائی جاتی ہیں' سالانہ ہزاروں کی تعداد کو چھوتی ہیں لیکن آج تک کسی کے ہاتھ یا پیر کی چھنگلیا تک نہیں کٹی۔ بد کاری (دعوت و داعیۂ گناہ مذکور نہیں) کھلے بندوں ہو رہی ہے اور کسی زانی یا زانیہ کو ایک کنکری بھی نہ ماری گئی بلکہ العیاذ باللہ اب تو حال شاید کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

شراب کتنی پی جارہی ہے اس کا اندازہ ان ہزاروں بوتلوں اور سینکڑوں پیپوں سے ہی ہو جاتا ہے جو "پکڑے" جاتے ہیں لیکن کم از کم ہمارے علم میں اب تک ایسا کوئی واقعہ نہیں آیا کہ کسی مے نوش کے ہوش کوڑوں سے ٹھکانے کئے گئے۔

ہوں۔ کوڑے برسے ضرور ہیں لیکن دختِ رز سے جی بہلانے والوں پر نہیں۔ کچھ ایسا ہی حشر نظامِ اسلام کی دیگر برکات کے عملی نفاذ کا ہوا ہے۔ تفصیل کے لئے تو دفتر درکار ہیں لیکن یہ راز کس پر آشکار نہیں کہ نظامِ زکوٰۃ و عشر کے ساتھ کیا ماجرا ہوا۔ قصاص و دیت کے قانون کے ساتھ کیا بیتی' سود کے خاتمے نے کیا بہروپ بھرے 'ناظمین صلوٰۃ کی کیسی عزت افزائی ہوئی اور قناعت و سادگی کے وعظ نے عمل کے کیا چھل دکھائے۔ ہمیں ورق سیاہ کرنے سے کیا حاصل! "دیکھتی آنکھوں اور سنتے کانوں" سے کونسی بات پوشیدہ ہے۔ البتہ عبرت پکڑنے والوں کے لئے اللہ کی یہ وعید لرزا دینے والی ہے کہ

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ ٱللَّهِ أَن تَقُولُوا۟ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝	"اے لوگو جو ایمان لائے ہو کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ اللہ کے غضب کو بھڑکانے والی بات ہے کہ تم کہو وہ جو کرتے نہیں"۔

آخر میں اپنا یہ اندیشہ بھی ظاہر کر ہی دیں کہ وزیرِ اعظم بھی شریعت بل کو اسی طرح شریعتِ محمدیؐ کے مطابق بنانے کا ارادہ رکھتے نظر آتے ہیں جیسے ان کے پیش رو اور پشت پناہ جنابِ صدر بحیثیت چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر بتدریج نفاذِ اسلام کر چکے ہیں۔ ہماری آبادی کا مغرب زدہ اباحیت پسند اور ملحد و بے دین طبقہ نجانے کیا کیا کھیل ابھی دکھائے گا۔ خوئے بدرا بہانۂ بسیار۔ اور صد حیف کہ ہمارے متقی اور پرہیز گار صدرِ مملکت اور سیدھے سادے مسلمان وزیرِ اعظم چار و ناچار ان کے ہاتھوں میں کھیلنے پر آمادہ ہیں۔

اعتذار

کاتب حضرات کی انتخابی فہرستوں کی کتابت میں شدید معروفیت کی وجہ سے میثاق کی اشاعت میں تاخیر بھی ہوئی اور ادارے کو کمپیوٹر کے ذریعے کتابت کرانے کے کٹھن تجربے سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ اس تاخیر اور مختلف انداز کی کتابت سے قارئین کو جو زحمت ہوگی ادارہ اُس کے لئے پیشگی معذرت خواہ ہے

یادِ رفتگاں

”خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود“

مقبول الرحیم مفتی

کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ، اس عالم رنگ و بو میں وارد ہونے والے ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے - البتہ موت کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں - ۲۳ مارچ کو قلعہ لچھمن سنگھ میں گلشنِ اہلحدیث کے گلِ سرسبد علامہ احسانِ الٰہی ظہیر ایک دینی جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے بم کے دھماکے سے شدید زخمی ہوئے اور ۳۰ مارچ کو سرزمین حجاز میں انہوں نے جان جانِ آفریں کے سپرد کی - علامہ مرحوم کے علاوہ چھ علمائے کرام اور متعدد حاضرین جلسہ اس تخریب کاری کے نتیجے میں دین کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا - بہت سے زخمی ابھی ہسپتالوں میں زیر علاج ہیں مرنے والوں اور زخمی ہونے والوں کے حصے میں جو سعادتیں آئیں وہ اپنی جگہ لیکن قومی در انفرادی سطح پر اس سانحے نے جو مسائل پیدا کیے ہیں اُن کا فرض اجتماعی، انفرادی حکومتی اور غیر حکومتی ہر سطح پر ہمارے ذمے واجبُ الادا ہے - اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے -

علامہ احسان الٰہی ظہیر کی رحلت پر امیر تنظیم اسلامی کا درج ذیل بیان ۳۱ مارچ کو روزنامہ جنگ لاہور میں صفحہ اوّل پر شائع ہوا -

اس طرح کی موت بلاشبہ اعزاز ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد

لاہور (پ ر) امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ علامہ احسان الٰہی ظہیر ایک جید عالم دین اور بیدار مغز سیاستدان تھے۔ تخریب کاری اور دہشت گردی کے نتیجہ میں ان کی مظلومانہ موت انتہائی اندوہناک سانحہ ہے انہوں نے جس طرح اپنی ساری زندگی خدمت دین کیلئے وقف کئے رکھی اور جس طرح تبلیغ دین کے دوران ہی وہ شدید زخمی ہوئے اس کے نتیجہ میں ہم توقع رکھتے ہیں اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انہیں شہادت کے مرتبہ عظمیٰ سے سرفراز فرمائے گا اور جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے گا ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اگرچہ اس طرح کی موت علامہ احسان الٰہی ظہیر اور ان کے ساتھ شہید ہونے والے دیگر علمائے کرام کیلئے تو بلاشبہ ایک اعزاز ہے لیکن تشدد اور دہشت گردی کا یہ رجحان ملک کے امن و سکون کیلئے انتہائی خطرناک ہے اگر حکومت نے جلد از جلد مجرموں کو کیفر کردار تک نہ پہنچایا تو عوامی سطح پر اس کا شدید ردعمل بھی رونما ہو سکتا ہے انہوں نے علامہ کے پسماندگان اور اہل حدیث مکتبہ فکر سے تعزیت اور ہمدردی کا اظہار بھی کیا۔

یکم اپریل کو جناح ہال لاہور میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر
ہتمام سالانہ محاضراتِ قرآنی کی پہلی نشست میں افتتاحی خطاب کرتے ہوئے امیر
نظیم اسلامی اور انجمن کے صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد نے علامہ مرحوم کو خراج
حسین پیش کرتے ہوئے اس سانحہ کے حوالے سے کہا کہ اس سال ہمارے معاشرا
م و اندوہ اور صدمے کی ایک کیفیت میں شروع ہوئے ہیں جس نے لاہور کو بالخصوص
ور پورے ملک کو بالعموم اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ہمارے ملک میں تخریب کاری
سلسلہ کافی عرصے سے چل رہا ہے۔ پہلے صوبہ سرحد اور کسی حد تک بلوچستان
س کی زد میں تھے۔ لیکن گزشتہ سال کے اواخر میں کراچی میں بڑی شدت سے
زیب کاری کا آغاز ہوا۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۲۳ مارچ کو جمعیت اہلحدیث
ے جلسہ عام میں جو حادثہ رونما ہوا ہے اس کے ساتھ ملک کا سب سے بڑا صوبہ
باب بھی تخریب کاری کی زد میں آ گیا ہے۔ دیگر سیاسی، قومی اور بین الاقوامی
سباب کے ساتھ ساتھ تخریب کاری اور دہشت گردی کے دائرہ کار میں وسعت
نے کا ایک اہم اور بڑا سبب یہ ہے کہ حکومت نے اپنی اندرونی یا بیرونی مصلحتوں
، وجہ سے آج تک کسی مجرم کو عبرتناک سزا نہیں دی۔ پاکستان کے پہلے وزیر
عظم لیاقت علی خاں مرحوم کے قتل سے لے کر اب تک سیاسی قتل کی کسی واردات
، تحقیقات کا نتیجہ عوام کے سامنے نہیں آیا۔ کوئی بہت ہی مضبوط با اثر اور خفیہ
ھ ان چیزوں کو دبا دیتا ہے۔

اسلام نے سورہ مائدہ میں معاشرے کے امن و سکون کو برباد کرنے والوں
کے لئے نہایت عبرتناک سزائیں تجویز کی ہیں۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ	اُن لوگوں کی سزا، جو اللہ اور اُس
يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ	کے رسول سے بغاوت کرتے ہیں
وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ	اور ملک میں فساد برپا کرنے میں
فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ	سرگرم ہیں، بس یہی ہے کہ عبرتناک
يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ	طور پر قتل کئے جائیں یا
وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ	سولی پر لٹکائے جائیں یا اُن کے

اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ (سورۃ مائدہ آیت - ۳۳)

ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا ملک سے باہر نکال دیئے جائیں -

لیکن ہمارا موجودہ نظامِ انصاف جو انگریزی استعمار کا ورثہ ہے عبرت پذیری کے تمام پہلو ختم کر دیتا ہے - عموماً سزائے موت کے مجرم طویل عرصے تک جیلوں میں پھانسی کا انتظار کرتے کرتے متقی اور پرہیزگار بن جاتے ہیں اور اُن کو دیکھ کر دل میں اُن کے لئے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں - مجرموں کے خلاف غم و غصے اور انتقام کے جذبات تو اُسی وقت ہوتے ہیں جب اُن سے جرم سرزد ہوتا ہے اور سزا میں عبرت کا پہلو بھی تب ہی پیدا ہوتا ہے جب انہیں فوری طور پر سزا دی جائے اور برسرِ عام دی جائے -

علامہ مرحوم کی شخصیت پر فارسی کا یہ مصرع خوب راست آتا ہے کہ ؎

خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود

مرحوم بڑی تیزی سے آسمانِ خطابت و تصنیف پر مہرِ عالمتاب کی طرح طلوع ہوئے اور درخشاں ہوئے لیکن افسوس کہ اُن کی شعلہ صفت اور سیماب وش شخصیت کو موت کے بے رحم ہاتھوں نے عین عالمِ شباب میں ہم سے چھین لیا - بقول حالیؔ ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

اُن کی ذات انگریزی زبان کی اصطلاح "انرجی پیک" کا بھرپور مظہر تھی - ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبار سے وہ توانائی اور صلاحیتوں کا عجیب مرقع تھے اگر ایک طرف وہ شعلہ بیان خطیب تھے تو دوسری طرف اعلیٰ پائے کے مصنف بھی تھے اردو اور عربی میں انہوں نے یکساں طور پر خطابت اور تحریر کے جوہر دکھاتے اور اہلِ علم سے خراجِ تحسین وصول کیا - اللہ تعالےٰ نے انہیں جس نوعیت کی موت عطا کی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے شہادت کی موت سے تعبیر فرمایا ہے - مسلک کے اختلاف کے باوجود کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ جس جلسے سے وہ خطاب کر رہے تھے مقصد کے اعتبار سے وہ دینی نہیں تھا - فوجی اصطلاح میں "DIED IN UNIFORM" کی کیفیت فی الواقعہ علامہ احسان الٰہی ظہیر اور اس جلسے کے دیگر مرحومین

پر صادق آتی ہے۔

ہسپتال میں جب میں عیادت کے لئے حاضر ہوا تو ان کی کیفیت کو دیکھ کر اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا کہ کہاں ایک متحرک شخصیت کہ جس کے رونئیں رونئیں میں حرکت اور کہاں یہ حالت۔ اس حال میں بھی اُنکی زبان پر ایک ہی جملہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب دُعا فرمائیں یا پھر کچھ تسبیحات اُن کی زبان پر جاری تھیں۔ بہرحال حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق مومن کا معاملہ عجیب ہے کہ جب اُسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اُس کی خطاؤں کا کفارہ بن جاتی ہے اور جب اسے راحت پہنچتی ہے تو وہ شکر ادا کرتا ہے۔ اور اللہ سے اجر پاتا ہے۔ مَیں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس حادثے کو ہماری قومی کوتاہیوں کے کفارے اور قربانی کی صورت میں قبول فرمائے اور اس شر میں سے خیر برآمد فرمائے۔

اس خطاب کے بعد امیر تنظیم اسلامی نے انجمن خدام القرآن کے ناظم مکتبہ و نشر و اشاعت اور ماہنامہ "میثاق" اور "حکمت قرآن" کے مینجنگ ایڈیٹر جناب اقتدار احمد کو دعوت دی کہ وہ قرار دادِ تعزیت پیش کریں۔

اقتدار احمد صاحب نے قرار داد تعزیت پیش کرنے سے پہلے ابتدائی کلمات میں اس بات پر نہایت کرب اور رنج کا اظہار کیا کہ ہمارے ملک میں انتظامیہ اور پولیس کو مظلوموں کی داد رسی پر آمادہ کرنے کے لئے اب مظاہرہ توڑ پھوڑ اور ہنگامہ بہت ضروری ہو گیا ہے۔ یہ ایک انتہائی خطرناک رجحان ہے۔ ملک و ملت کی بہبود اور حکومت کے ذمہ دار حضرات کو اس بارے میں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے کہ توڑ پھوڑ اور ہنگامہ آرائی کا ہر سلسلہ انتظامیہ اور پولیس کی نا اہلی اور نا فرض شناسی کی وجہ سے کیونکہ شروع ہوتا ہے۔ اگر یہ روش اسی طرح قائم رہی تو یقیناً کسی بڑے قومی نقصان کا پیش خیمہ ثابت ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے ہماری پولیس محض صاحبانِ اقتدار کے کروفر کے اظہار کے لئے رہ گئی ہے اور سچی بات تو یہی ہے اسے چادر اور چار دیواری کے تحفظ کے لئے تو وقت ہی نہیں ملتا۔ ان کلمات کے ساتھ انہوں نے درج ذیل قرار داد پیش کی جسے حاضرین نے بالاتفاق منظور کیا۔

"مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام اہلیان لاہور کا یہ اجتماع تخریب کاری کے نتیجے میں علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی اور دیگر قیمتی جانوں کے ضیاع پر انتہائی غم و غصے کا اظہار کرتا ہے۔ اس المناک سانحے میں دین کی خاطر جانیں نچھاور کرنے والے ملت اسلامیہ کی قیمتی متاع تھے۔ جس طرح انہوں نے اپنی زندگیاں اللہ کے دین کے لئے وقف کر رکھی تھیں اسی طرح اللہ نے انہیں دین کی راہ میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کا موقع بھی عطا فرمایا۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں شہادت کے بلند مرتبے پر سرفراز فرمائے اور جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائے۔

یہ اجتماع حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ دہشت گردی کے اس المناک اور ظالمانہ اقدام کے اصل مجرموں کو جلد از جلد گرفتار کر کے تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے شریعت اسلامی کے مطابق عبرتناک سزائیں دی جائیں تاکہ تخریب کاری کا یہ سلسلہ رک سکے اور ناخوشگوار عوامی ردعمل کے نتیجے میں ملک کے سیاسی ماحول کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ بھی نہ رہے۔ اگر انتظامیہ اور پولیس نے حسب معمول تساہل اور تاخیر سے کام لیا یا مجرموں کو ملک میں موجود اُس سامراجی نظام انصاف کے حوالے کر دیا گیا جو عبرت انگیزی کے تمام پہلوؤں کو ختم کر دیتا ہے، تو اس کے انتہائی سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

دینی حلقوں میں اس سے پہلے مولانا اسلم قریشی کے اغوا اور لاہور میں ہی دو علمائے کرام کے قتل کی تحقیقات کے سلسلے میں پولیس کی مکمل ناکامی کے حوالے سے پہلے ہی کافی بے چینی پائی جاتی ہے۔

یہ اجتماع علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی اور دیگر حضرات کے پس ماندگان سے دلی تعزیت اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اس سانحے میں زخمی ہونیوالوں کی جلد اور مکمل صحت یابی کے لئے دعا گو ہے۔"
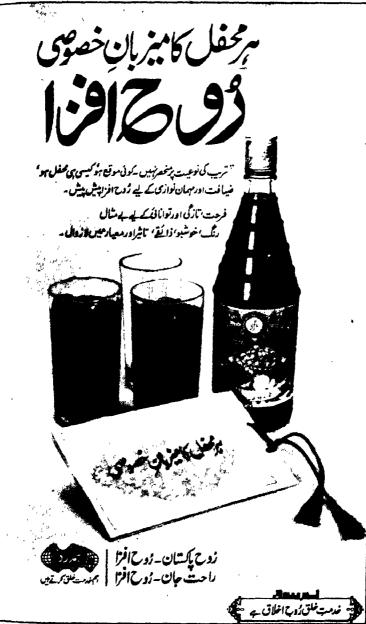
ماہِ صیام

تزکیۂ نفس کا موسمِ بہار

تحریر: مولانا سعید الرحمٰن علوی

اللہ تعالیٰ نے جو احکام و فرائض اور اعمال اصلاحِ باطن، تزکیۂ نفس اور حصولِ تقویٰ کے لیے سابقہ اُمتوں کی طرح اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آخرت کو عطا کئے اُن میں رمضان المبارک کے روزوں اور اس ماہ کے دوسرے مخصوص اعمال کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں صیامِ رمضان کا مقصد متعین کر دیا ہے۔ یعنی لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ تاکہ تم متقی ہو جاؤ (البقرہ - ۸۳)

رمضان کے روزوں کی فرضیت اور اس مہینے کی عظمت کا سبب بھی اللہ جل شانہ، نے اپنی آخری کتاب میں بالصراحت بیان فرما دیا تاکہ اُس کے بندوں کو اس مقدس مہینے برکتوں سے فیض یاب ہونے کا صحیح طریقہ بھی معلوم ہو جائے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۚ

(سورۃ البقرہ آیت ۱۸۵)

رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لئے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا اب جو شخص اس مہینے کو پائے اُس کو لازم ہے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے۔

رمضان اور قرآن کے اس خصوصی تعلق نے ہی رمضان کے مہینے کو یہ عظمت اور فضیلت

عطا کی ہے اور درحقیقت قرآن جیسی عظیم نعمت کا شکر ادا کرنے اور اس کا فہم اور اس میں بصیرت حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کے لئے اس مہینے کو خاص فرما دیا ہے۔ اب شکر گزاری اور بندگی کا تقاضا ہے کہ ہم اس مہینے کو پوری لگن اور محنت کے ساتھ قرآن کے پیغام کو اپنی روح کی گہرائیوں میں اتارنے کے لئے استعمال کریں۔

جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کو ارکانِ اسلام میں شامل کیا ہے اور روزے کی اللہ تعالےٰ کے ہاں جو قدر و قیمت ہے اُس کا اندازہ درج ذیل نکات سے ممکن ہے جو مستند احادیث سے اخذ کئے گئے ہیں۔

- روزہ خاص اللہ تعالےٰ کے لئے ہے اُس کا بدلہ وہ خود خاص انداز سے مرحمت فرمائیں گے۔
- روزہ ڈھال اور سپر ہے۔
- روزہ دار کی منہ کی بُو اللہ تعالےٰ کو مشک سے زیادہ محبوب و پسند ہے۔
- روزدار کو دو خاص خوشیاں میّسر آتی ہیں ایک افطار کے وقت دوسری قیامت کے دن جب وہ اپنے رب سے ملے گا اور اپنے روزہ کا بدلہ دیکھے گا۔
- روزہ دار کو جنّت کے ایک خاص دروازے "باب الریّان" سے بلایا جائے گا۔
- رمضان میں اجر اور ایمان کی خاطر روزہ رکھنے والے کے جملہ گناہ دا گلے بخش دیئے جاتے ہیں۔
- رمضان کی پہلی ہی رات میں جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ دوزخ کے دروازے بند کر دئے جاتے ہیں اور شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے۔

(بخاری مسلم)

ان فضائل و برکات کے باوصف یہ بھی نبوّت کا ہی ارشاد ہے کہ

- جس شخص نے جھوٹ بولنا اور جھوٹی بات پر عمل کرنا نہ چھوڑا، تو اس کے کھانا پانی چھوڑنے کی اللہ تعالےٰ کو کوئی حاجت نہیں۔ (بخاری)
- بہت سے روزہ داروں کو روزے سے محض بھوک پیاس میسر آتی ہے اور بہت سے

شب بیداروں کو شب بیداری سے محض رات کا آنکھوں میں کاٹنا ہی ملتا ہے۔ یعنی کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔

تو سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں؟

ایک شخص دن بھر بھوکا پیاسا رہتا ہے، رات کو گھنٹہ دو گھنٹہ سے زائد سوتا نہیں، تراویح، سحری، تہجد سبھی کا اہتمام کرتا ہے تو پھر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اس عذاب الٰہی کی وعید ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ جملہ اعمال کی روح "تقویٰ" ہے اور روزہ کی اہمیت کے پیش نظر اسکی روح کا معاملہ بھی ایسا ہی اہم ہے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے بقول روزہ کی متعدد حکمتوں میں سے ایک حکمت حصول تقویٰ ہے۔

(بیان القرآن ص۴۳ مختصر)

تقویٰ ہے کیا؟ جس کو روزہ سمیت ہر عمل کی روح بتلایا گیا؟

اس سلسلہ میں ذرا "قرطبی" پر نظر ڈالیں۔

"تقویٰ" اصل میں "قلت کلام" کو کہتے ہیں (ابن فارس) اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی بطور استشہاد نقل کی جاتی ہے — بہر حال مفہوم ہے کہ وہ شخص جو اپنے آپ کو اچھے اعمال کے ذریعہ بچاتا ہے وہ متقی ہے — حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بقول اچھا شخص وہی ہے جو توبہ کرنے والا اور تقویٰ اختیار کرنے والا ہو ...... حضرت ابو یزید بسطامی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ متقی وہ شخص ہے جو جب بولے تو اللہ تعالیٰ کے لئے اور جو کام کرے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے۔

ابو سلیمان الدارانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، متقی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں سے اللہ تعالیٰ نے شہوات کی محبت نکال دی اور یہ بھی قول ہے کہ شرک اور نفاق سے بچنے کا نام تقویٰ ہے۔

(القرطبی ج ۱ ص ۱۶۱)

خوب بات وہ ہے جو حضرت ابی کعب بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے — وہی

ابی بن کعب، جنہیں رسول اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے سب سے بڑا قاری ارشاد فرمایا اور قرآن کے شائقین کو ان کی طرف رجوع کرنے کی تلقین فرمائی۔

وہ ابی بن کعب مجیب ہیں اور سائل ہیں خلیفہ راشد، سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ — جناب عمر نے پوچھا تو جناب ابی بن کعب نے جواب دیا۔

اے فاروق! آپ کو کبھی ایسے راستہ پہ چلنے کا اتفاق ہوا جو کانٹوں بھرا راستہ ہو؟

جناب فاروق نے فرمایا کیوں نہیں!

حضرت ابی بن کعب نے پوچھا! ایسے موقعہ پہ آپ کیا کرتے ہیں؟

حضرت عمر نے کہا کہ میں دامن سمیٹتا اور احتیاط برتتا ہوں

حضرت ابی بن کعب نے فرمایا — یہی تقویٰ ہے۔

(القرطبی ا ص ۱۶۱ - ۱۶۲)

گویا فارسی کا جو مشہور شعر ہے۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ　　بازمی گوئی دامن ترمکن ہوشیار باش

کہ کسی شخص کو ہاتھ پاؤں باندھ کر بیچ دریا پھینک کر اس سے تقاضا کرنا کہ ذرا اپنے دامن کو تر ہونے سے بچانا — اسی کا نام تقویٰ ہے کہ شر و فساد اور لہو و لعب سے رچی بچی اس دنیا میں اس طرح سلامتی کے ساتھ گذر جانا کہ دامن انسانی، گناہ و عصیاں سے محفوظ ہو — یہی تقویٰ ہے، یہی پرہیزگاری اور یہی اصلاح باطن و تزکیہ کی بنیاد!

قرطبی فیصلہ کن انداز میں فرماتے ہیں۔

کہ جملہ خیر و بھلائی کے کاموں، خصائل اور فضائل کو اپنے اندر جمع کر لینے کا نام تقویٰ ہے (ص ۱۶۲)

تو گویا روزہ کے ذریعہ اللہ تعالےٰ اپنی انسانی مخلوق کو ایسا بنانا چاہتے ہیں کہ ان کے قلب و نظر کی ایسی کیفیت ہو جائے کہ

دامن نچوڑ دے تو فرشتے وضو کریں۔

قرطبی روزہ سے متعلقہ آیت میں "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" پر گفتگو فرماتے

ہوئے کہتے ہیں کہ

اس سے انسانی شہوات کا خمار اتر کر رہ جاتا ہے۔ کیوں کہ انسان کم کھاتا ہے اس لئے شہوات کا سلسلہ کمزور ہو جاتا ہے اور شہوات کمزور ہو جائیں تو معاصی اور گناہوں کی قلت و کمی ہو جاتی ہے — یہ گویا مجازی طور پر معنی کیا گیا ہے — اصل یہ ہے کہ رسول محترم نے روزہ کو ڈھال اور بچاؤ کا ذریعہ بتلایا ہے، اور یہی چیز سبب تقدس ہے کہ روزہ شہوات کو جڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔

(ج ۲ ص ۲۷۶ - ۲۷۵)

دُنیا کے گوشت پوست کے انسان کتنے ہیں؟ اس کی کمی نہیں، لیکن حقیقی انسان کتنے ہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے — وہ خوش قسمت افراد جو "اخلاق الٰہی" کا پرتو ہوں اور جنہیں "عباد الرحمن" ہونے کا شرف حاصل ہو، ان کی تعداد انگلیوں پہ گنی جاتی تھی اور یہی انگلیوں پر گنے جانے والے افراد اصل سرمایہ ہیں، کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت ایسے رجال کار کی تیاری کے لئے ہوتی ہے جن کے دل ایسے ہو کہ وہاں تجلیات کا نزول ہو۔

دل کی دنیا سنوارنے اور بدلنے کی غرض سے جو اعمال انتہائی موثر ہیں، ان میں روزہ سرفہرست ہے۔

حضرت الامام الشاہ ولی اللہ الدھلوی کی معرکۃ الاراء کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" کے متعلقہ حصہ کی تلخیص ملاحظہ فرمائیں۔ تاکہ معاملہ زیادہ نکھر کر سامنے آجائے۔

انسان کے اندر بہیمیت اور ملکیت کے عناصر موجود ہیں بہیمیت غالب آجائے تو ملکیت کا راستہ رک جاتا ہے اس لئے اس قوت کو مقہور و مغلوب کرنے کی بے حد ضرورت تھی — اس قوت بہیمیت کا غلبہ خوراک کے سبب ہوتا ہے۔ اس لئے اس قوت کو توڑنے کے لئے متعلقہ اسباب کو کم کرنا از بس ضروری ہے اور یہ کام دُنیا کے ہر مہذب معاشرے اور سوسائٹی میں ہوتا ہے۔

کھانا پینا جو بہیمیت کے اضافہ کا مؤثر سبب ہے اس کے علاج کے دو معروف طریق ہیں - مقدار کو کم کرنا اور عام معتاد اوقات میں وقفہ زیادہ کرنا -

شرائع الٰہیہ نے دوسرے طریق کو اس لئے اختیار کیا کہ یہ گراں بار بھی نہیں اور نفس کی اصلاح کے لئے مفید بھی اس مفید عمل کو شریعت الٰہی نے اجتماعی رنگ دیکر سبھی افراد کے لئے ایک ضابطہ اور قانون مقرر کر دیا - کیونکہ مسلمان جب کسی عمل پر ایک وقت اور ایک زمانہ میں اجتماعی طور پر عمل کرتے ہیں تو اس کے نتیجہ میں ایک دوسرے کے لئے آسانی اور سہولت پیدا ہو جاتی ہے - ایک دوسرے کو دیکھ کر عمل میں قوت حاصل ہوتی ہے اور اجتماعی عمل سے اتفاق و یک جہتی پیدا ہوتی ہے نیز اس سبب سے انوار الٰہی کا نزول ہوتا ہے -

ایسے بھی ممکن تھا کہ نفس روزوں کا حکم دے کر اللہ تعالے ہر کسی کو ایام کے تعین میں آزاد چھوڑ دیتا لیکن اس سے اجتماعی فوائد فنا ہو جاتے اس لئے ایک خاص مہینہ متعین کر دیا گیا اور اس کے لئے نزول قرآن والے مہینے سے بڑھ کر کوئی مہینہ نہ تھا - (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۳۴ تا ۱۲۷ تلخیص)

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ روزے کے درجات میں ایک درجہ تو وہ ہے جو ہر کس کے لئے یکساں ہے اس کو ترک کرنا گویا اصل مشروع امر کو ترک کرتا ہے ایک درجہ وہ ہے جیسے محسنین اور نیکوکاروں کا درجہ تو وہ چاہیئے، پہلا درجہ تو یہ ہے کہ نفس روزہ رکھے دوسرا درجہ جو اصل درجہ ہے یہ ہے کہ نہ صرف انسان کھانے پینے اور تعلقات زن شوق سے احتراز کرے بلکہ جملہ اعضاء و جوارح کو ہر قسم کے منکر سے بچائے -

روزہ کی تکمیل کیسے ممکن ہے ؟ اس سلسلہ میں حضرت الامام الشاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ

روزے کی تکمیل دو چیزوں سے ہوتی ہے ایک تو یہ کہ شہوانی، سبعی اور شیطانی افعال و اقوال سے روزہ دار نہ تو بے ہودہ بات کرے نہ شور و غل مچائے - اگر کوئی اسکو گالی دے یا اس سے لڑائی جھگڑا کرے تو کہہ دے کہ میاں مجھے معاف کرو میر

روزہ ہے -

یا حدیث میں ہے -

جو شخص جھوٹ بولنا ترک نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ خواہ مخواہ بھوکا پیاسا رہے - (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۵۱ — ۱۵۰)

اور سچ پوچھیں تو دوسری بات بڑی اہم ہے اور پہلی سے کہیں بڑھ کر — کیونکہ اس کے تقاضوں کو پورا کرنا بے حد مشکل ہے اور اس مرحلہ کو خیر سے سر کرنا ہی اصل نیکی اور کمال ہے -

انسانی فطرت کی کمزوریوں میں یہ بڑی کمزوری ہے کہ وہ گناہ لیے لذّت سے ایک خاص حظ محسوس کرتا ہے — عملی لڑائی جھگڑے کی نوبت تو کہیں آتی ہے لیکن حسد، چغلی، غیبت اور ایسے افعال شنیعہ اور اخلاق رذیلہ کے ذریعہ انسان اپنی نامرادی کا سامان برابر کرتا رہتا ہے -

اسلام اس رُخ پر لے جانا چاہتا ہے کہ انسان حسن اخلاق کا پیکر بن جائے اور ہر دیکھنے والا واقعی اسے خلیفۃ اللہ سمجھنے لگے -

یہ اسی طرح ممکن ہے کہ انسان رذائل سے اپنے آپ کو بچائے — قرآن عزیز نے اخلاقی ابواب کو بڑی صراحت سے ذکر کیا ہے اور اخلاقی ابواب ایسے ہیں کہ ان کو سمجھے اور برتے بغیر انسان عظمت کا مقام حاصل نہیں کر سکتا -

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "روزدار بے ہودہ بات نہ کرے" اس "جامع الکلم" پر غور فرمائیں تو انسان کے وہ جملہ گناہ اور اخلاقی نقائص جن کا تعلق زبان سے ہے، اس میں آجاتے ہیں — یاد ہوگا کہ اسلام اور مسلم کی تعریف سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمائی کہ :

مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں -

ایک حدیث میں زبان اور شرم گاہ کی حفاظت کی ضمانت دینے والے کو جنت کی ضمانت دی — او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ

بولو تو اچھی بات کہو ورنہ چپ رہو

گویا "زبان" کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے — دوست اور دشمن بناتے میں زبان

ہی کلیدی کردار ادا کرتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ کے نبی بے ہودگی سے روک رہے ہیں اور بچنے کا فرمارہے ہیں تو گویا آپ نے زبان کے ہر گناہ کی جڑ کاٹ دی ۔ زبانی بے ہودگی میں گالی، غیبت، چغلی، شور و ہنگامہ سبھی شامل ہیں اور یہی گناہ کلیدی گناہ ہیں ۔ گالی سے معاملہ اتنا بڑھتا ہے کہ آدمی اپنے والدین حتیٰ کہ دین و دھرم کے لئے وبال جان بن جاتا ہے جیسے کہ حدیث میں ہے کہ آدمی دوسرے کے والدین کو گالی دیتا ہے تو اگلا پلٹ کر اس کے والدین کو گالی دیتا ہے ۔ اس طرح یہ شخص خود ہی اپنے والدین کی گالی کا سبب بنا۔ غیبت کرتا ہے تو انسانی برادری کا گوشت نوچتا ہے اور وہ بھی اس طرح جیسے مردہ کا گوشت نوچا جاتا ہے، اس میں بے اعتدالی مزید بڑھتی ہے تو تہمت والزام ہر بات آجاتی ہے ۔ پھر بہتان کی شکل میں مزید وبال جان بن جاتی ہے ۔

وعلیٰ ہذا القیاس زبان کی ہر حرکت دس مزید حرکات اور مسلسل بگاڑ کا سبب بنتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ روزہ کے ذریعہ ایک تربیت کا رُخ متعین فرمانا چاہتے ہیں تاکہ انسان حلال اشیا کھانے پینے اور اپنی اہلیہ سے ہی احتراز کرنا نہ سیکھے بلکہ حرام کی ہر شکل سے اپنی حفاظت کرے ۔ حرام چاہے اکل و شرب کے لحاظ سے ہو چاہے اخلاق و کردار کے اعتبار سے ۔ برا اور بہت ہی برا ہے اور حرام میں مبتلا شخص کی تو دعا تک قبول نہیں ہوتی بلکہ وہ مسلسل نامرادیوں کا شکار رہتا ہے اور بالآخر بربادی کے گہرے کنوئیں میں وھڑام سے گر کر رہ جاتا ہے ۔

اس لئے لازم ہے کہ جب بخت واتفاق سے زندگی اور حیات مستعار میں ایک بار پھر یہ گھڑیاں میسر آرہی ہیں تو انسان اپنے دن اور رات کو بڑی احتیاط سے گذارے اور اس قدر مجاہدہ اور جدوجہد کرے کہ ہلال عید نظر آتے ہی حق کی بخشش اس کا مقدر بن جائے ۔ حدیث میں ہے کہ عید الفطر کو جانے والوں پر رحمت حق اس طرح برستی ہے کہ فرشتوں سے ارشاد ہوتا ہے مجھے اپنی عزت و کبریائی کی قسم ان مزدوروں کو خوب دونگا اور مغفرت سے انہیں سرفراز کروں گا اس پروانۂ مغفرت کے حصول کے لئے زندگی کی ان ساعتوں کا پورا اہتمام ذاتی اصلاح کی فکر از بس لازم ہے ۔ اللہ توفیق عمل سے نوازے

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے درسِ قرآن کا سلسلہ

الہدیٰ

درس نمبر ۱۱

نشست نمبر ۱۴

مباحثِ عملِ صالح

بندۂ مومن کی شخصیت کے خدوخال

(سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں)

(۵)

السلام علیکم - نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالَّذِیْنَ لَا یَشْہَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا ۝ وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْہَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا ۝ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا ہَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا ۝ اُولٰٓئِکَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَۃَ بِمَا صَبَرُوْا وَیُلَقَّوْنَ فِیْہَا تَحِیَّۃً وَّسَلٰمًا ۝ لا خٰلِدِیْنَ فِیْہَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ (صدق اللہ العظیم)

(سورۃ الفرقان آیت ۷۲ تا ۷۶)

"اور وہ لوگ جو جھوٹ میں شرکت گوارہ نہیں کرتے اور اگر اتفاقاً کسی لغو کام پر ان کا گزر ہو جائے تو وہ وہاں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے گزر جاتے ہیں - اور وہ جنہیں جب اپنے رب کی آیات کے ذریعے سے تذکیر اور نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے ہو کر گر نہیں پڑتے -

اور وہ جو کہتے ہیں - اے ہمارے ربؐ ! ہمیں عطا فرما ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک، اور ہمیں متقی لوگوں کا امام بنا - یہ ہیں وہ لوگ کہ جنہیں بدلے میں دیئے جائیں گے بالا خانے بسبب ان کے صبر کے اور اُن کا استقبال ہوگا ان میں دعا اور سلام کے ساتھ - رہیں گے وہ اس میں ہمیشہ ہمیش - بہت ہی اچھی ہے وہ جگہ مستقل جائے قرار ہونے کے اعتبار سے بھی، اور تھوڑی دیر قیام کے لئے بھی -"

محترم حاضرین اور معزز ناظرین -

سُورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی جن آیات کی ابھی آپ نے تلاوت سماعت فرمائی اور ان کا ترجمہ بھی سنا ان میں پھر وہی مضمون آیا ہے جو اس سے پہلے اس رکوع کی تیسری آیت سے لے کر آٹھویں آیت تک آیا تھا - یعنی اللہ کے محبوب بندوں کے اوصاف - وہ اوصاف جو اللہ کو بہت پسند ہیں - یاد ہوگا کہ اس رکوع کی تیسری سے آٹھویں آیت تک چھ اوصاف کا ذکر ہو چکا ہے - جن میں سے پہلا وصف ہے تواضع - وہ لوگ جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں - ان کی چال سے عجز و انکسار اور تواضع کا اظہار ہوتا ہے - نمبر دو : خواہ مخواہ کی بحث و تمحیص سے دامن بچانا - اللہ کے ان محبوب بندوں سے جب مشتعل مزاج لوگ خواہ مخواہ حجت بازی پر اتر آتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر جدا ہو جاتے ہیں - نمبر تین : شب کی عبادت اللہ کے محبوب بندے اپنی راتیں اللہ کے حضور میں سجدے اور قیام میں گزارتے ہیں (وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا) نمبر چار : جہنم سے پناہ مانگتے رہنا - کہ اے ربؐ ہمارے عذاب جہنم سے ہمیں بچالے - : نمبر پانچ میانہ روی بالخصوص خرچ کے معاملہ میں : وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا - نمبر چھ کبیرہ گناہوں سے بچتے رہنا جس کا ذکر سورہ شوریٰ میں بایں الفاظ مبارکہ آتا ہے : وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ - وہ لوگ جو بڑے سے بڑے گناہوں اور فحش کاموں سے بالفعل مجتنب رہتے ہیں - اور ہم کئی مرتبہ دیکھ چکے ہیں کہ از روئے قرآن مجید کبائر میں سب سے زیادہ اور چوٹی کے گناہ تین ہیں - شرک، قتل ناحق اور زنا -

ان چھ اوصاف کے ذکر کے بعد درمیان میں ایک ضمنی بحث توبہ کی عظمت، توبہ کی حقیقت، توبہ کی اہمیت اور توبہ کی شرائط کے بارے میں آگئی تھی۔ جس میں پچھلی نشست میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ اب مضمون لوٹ رہا ہے اُسی سلسلۂ گفتگو کی طرف یعنی عباد الرحمٰن کے اوصاف کیا کیا ہوتے ہیں۔ جو آیات ابھی آپ نے سماعت فرمائی ہیں ان میں پھر چھ اوصاف آئے ہیں۔

یہاں پہلا وصف بیان ہوا: وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ — زُوْر کہتے ہیں جھوٹ کو۔ اور شَهِدَ يَشْهَدُ کہتے ہیں موجود ہونے کو۔ تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ جھوٹ پر اپنی موجودگی بھی گوارا نہیں کرتے۔ کہیں جھوٹ کا معاملہ ہو رہا ہے، کہیں جھوٹ کی بنیاد پر لین دین ہو رہا ہے، کہیں کوئی سازش ہو رہی ہے۔ کہیں کچھ جھوٹ گھڑے جا رہے ہیں تو ایسی جگہوں پر انہیں اپنی موجودگی تک گوارا نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جھوٹی گواہی اس میں از خود آجائے گی۔ جو جھوٹ میں ادنیٰ درجہ کی شرکت اور شمولیت گوارہ نہیں کرتے، وہ جھوٹی گواہی کب دیں گے!!

دوسرا وصف ہے: وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا — یعنی وہ لوگ کہ جن کا کسی لغو اور بیکار کام کی طرف قصد کر کے ارادہ کر کے جانا تو سرے سے خارج از بحث ہے ہی، اگر کسی لغو کام پر ان کا اتفاقاً گزر ہو جائے راہ چلتے ہوئے جب دیکھیں کہ کوئی مداری تماشہ دکھا رہا ہے تب بھی یہ لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، بلکہ اپنے دامن کو بچاتے ہوئے وہاں سے گزر جاتے ہیں۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ مومنون کی ابتدائی آیات میں آچکا ہے: "وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ" لیکن یہاں جو فرق ہے اُسے نوٹ کر لیجئے کہ ایک ہے لغو کام کا ارادہ کرنا۔ لیکن یہاں نقشہ یہ کھینچا گیا کہ اس کا سوال ہی نہیں کہ اللہ کے یہ محبوب بندے کسی لغو اور بیکار کام کریں۔ اتفاقاً بھی کسی لغو کام پر گزر ہو جاتے تو وہ باعزت طور پر اپنا دامن بچاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اس کا سبب بھی ہم پہلے نوٹ کر چکے ہیں کہ اصل میں مومن کو اپنے وقت کی قدر ہوتی ہے۔ یہ محدود سا وقت اور محدود سی فرصت جو اس دنیا میں حاصل ہے، یہ بڑی قیمتی ہے۔ اس کے نتائج اس دنیا میں نکلیں گے۔ جو لامحدود ہے۔ لہٰذا نتیجہ کے اعتبار سے اس زندگی کا ہر لمحہ امر ہے۔ اس کا ثمرہ اُس زندگی

میں ملے گا جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے پاس کوئی وقت فالتو نہیں ہے کہ اُسے بیکار کاموں میں صرف کریں۔

تیسرا وصف یہ بیان ہُوا کہ جب انہیں ان کے رب کی آیات کے ذریعہ سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اندھے بہرے ہو کر نہیں گر پڑتے: لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ اس میں ایک تعریض ہے کفار کی طرف وہ یہ کہ انہیں جب آیاتِ الٰہی سنائی جاتی ہیں تو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ جیسے وہ ان کی مخالفت میں ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ وہ غور ہی نہیں کرتے، سنتے ہی نہیں، تدبّر ہی نہیں کرتے۔ پہلے ہی سے طے کئے بیٹھے ہیں کہ اعتراضات وارد کریں۔ یہ معاملہ ان عبادالرحمٰن کا نہیں ہوتا ہے اس قدر (VALUE) کو اگر ہم مثبت طور پر معین کریں تو وہ کیا ہوگی! وہ یہ کہ آیاتِ قرآنیہ پر آیاتِ ربّانیہ پر تدبّر ہو، تفکّر ہو، غور کیا جائے۔ انہیں گوشِ حقیقت نیوش سے سنا جائے۔ انسان ان آیاتِ الٰہیہ کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرے۔

چوتھا وصف انسانی فطرت سے وابستہ ہے۔ جو شخص خود نیک ہوگا اور راستہ پر زندگی بسر کر رہا ہوگا، لازماً اس کی تمنا ہوگی کہ اس کے اہل وعیال بھی اس کے راستہ پر چلیں۔ وہ بھی تقویٰ اور احسان کی روش اختیار کریں۔ لہٰذا وہ اپنے رب سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ:

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ۔

اے ہمارے رب، ہمیں اپنی بیویوں سے اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما"۔ ایک مومن کی آنکھوں کی ٹھنڈک اسی میں ہے کہ اُس کی اولاد بھی اسلام، اور تقویٰ واحسان کے راستہ پر گامزن ہو۔ اس کے گھر میں بِرّ و تقویٰ کا ماحول ہو۔ چنانچہ اس معاملے میں ہمارے قریب کے زمانہ میں زیادہ دور کی بات نہیں، شاہ ولی اللہ دھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مثال بڑی عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں چار بیٹے عطا فرمائے۔ شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالغنی، شاہ رفیع الدین رحمہم اللہ علیہم۔ اور یہ چاروں نہایت نیک، نہایت پارسا، ان میں سے دو بیٹے وہ ہیں یعنی شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین، جنہوں نے اُردو میں قرآن کے اوّلین ترجمے کئے اور آج تک مستند ترین ترجمے وہی ہیں۔ تیسرے بیٹے نے دہلی

درس گاہ قائم کی جو مدرسہ شاہ عبدالعزیزؒ کے نام سے مشہور ہے جس سے برصغیر میں بہت علم پھیلا ۔ چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی ۔ کا نوجوانی ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔ لہٰذا کسی علمی میدان میں ان کی صلاحیتیں زیادہ نمایاں نہیں ہوسکیں ۔ اس کی تلافی اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمادی کہ ان کے بیٹے ہیں شاہ اسمٰعیل شہیدرحؒ تو ان کا نام اپنے اس نامور عالم و مجاہد اور شہید بیٹے کی وجہ سے روشن ہوا ۔ تو آپ غور کیجئے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو کتنی آنکھوں کی ٹھنڈک میسر آتی ہوگی اپنی اولاد کو ان کیفیات میں دیکھ کر۔

اس کے بعد فرمایا: وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۔ اور وہ یہ دُعا بھی کرتے ہیں کہ "ہمیں متقیوں کا امام بنا دے"۔ اگرچہ الفاظ سے یہ مضمون میں متبادر ہوسکتا ہے کہ یہ دعا کی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نیک لوگوں کا امام بنائے، نیک لوگوں کا پیشوا بنائے، نیک لوگوں کے آگے چلنے والا بنائے ۔ اگرچہ اس کی خواہش رکھنا بھی کوئی بُری بات نہیں ہے، لیکن جس سیاق و سباق میں یہ الفاظ آرہے ہیں، اس ان ان کا مفہوم ہی کچھ دوسرا ہے ۔ درحقیقت ان الفاظ کے ذریعے پہلی ہی بات کی مزید تاکید ہو رہی ہے اس لئے کہ ہر شخص فطری طور پر اپنے اہل و عیال کا امام ہے ۔ قیامت کے روز جب لوگ اٹھیں گے تو ان کے پیچھے ان کی نسلیں چلی آرہی ہوں گی۔ ان کی اولاد و اخلاف ان کے پیچھے چلے آرہے ہوں گے ۔ تو گویا وہی بات ذرا اسلوب بدل کر کہی گئی ہے کہ ہم جن کے امام ہیں، انہیں اے رب متقی بنادے ۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے پیچھے آنے والے، ہماری آئندہ نسلیں فساق و فجار پر مشتمل ہوں ۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ ۔ یعنی تم میں سے ہر ایک کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے۔ جیسے بھیڑ بکریاں چرانے والا ایک چرواہا ہوتا ہے، اور چند بھیڑ بکریاں اس کے چارج میں ہوتی ہیں تو شام کو اگر کوئی بھیڑ یا بکری لوٹ کر نہ آئی تو اس سے پوچھا جائے گا، وہ مسئول ہے تو تم میں سے ہر شخص کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے۔ اللہ نے اپنی مخلوق میں سے کچھ افراد تمہارے حوالہ کر دیتے ہیں ۔ وہ تمہاری بیویاں ہیں، تمہاری اولاد ہے، وہ تمہارے زیر کفالت ہیں، وہ تمہارے زیر تربیت

ہیں، یہ تمہارا وہ گلہ ہے جس کے بارے میں اللہ تم سے پوچھے گا کہ تم نے ان کی صحیح رُخ پر تعلیم و تربیت کا کتنا اہتمام کیا! انہیں اللہ کے نیک اور متقی بندے بنانے کیلئے کتنی محنت کی! یہ ہے مفہوم اس ارشادِ نبویہ کا کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رَعِیَّتِہٖ ۔ چنانچہ ہر بندہ مومن کی یہ دُعا ہونی چاہیے کہ اے اللہ، جو گلہ تو نے مجھے عطا فرمایا ہے، جس کی ذمہ داری تو نے مجھے سونپی ہے، اس کی تُو توفیق دے کہ وہ تقویٰ و بِرّ کی روش اختیار کرے اور ہم کو ایسے متقیوں کا امام بنا: وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۔

آگے فرمایا: اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں جزا کے طور پر جنت میں بالاخانے ملیں گے بسبب ان کے صبر کے۔ اس آیت میں گویا عباد الرحمٰن کا چھٹا اور نہایت اہم وصف آگیا: بِمَا صَبَرُوْا۔ یعنی یہ درحقیقت بدلہ ہے اس صبر کا جو انہوں نے اللہ کی راہ میں کیا۔ یہ وہ بات ہے جو ہم سورۃ العصر کے ذیل میں بھی پڑھ چکے ہیں اور سورۃ لقمان کے دوسرے رکوع میں بھی کہ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۔ ظاہر بات ہے کہ یہ تمام اوصاف انہی لوگوں میں پیدا ہوسکتے ہیں، جن میں صبر کا مادّہ ہو تبھی وہ دنیوی لذّات و ترغیبات سے کنارہ کشی کرسکیں گے، ہوائے نفس سے اجتناب کرسکیں گے۔ اور شیطان کے اغوا سے بچ سکیں گے۔ یہ سب کام اُسی وقت ممکن ہوں گے۔ جب ان میں صبر کا مادّہ ہوگا۔ پھر دنیا میں نیکی، راست بازی اور صداقت شعاری کا راستہ اختیار کرنے والوں کو آزمائشوں سے سابقہ پیش آکر رہے گا۔ ان آزمائشوں پر صبر کریں گے تب ہی وہ بِرّ و تقویٰ کی راہ پر مستقیم رہ سکیں گے اور انہیں استقامت حاصل ہوسکے گا۔ جیسے سورۃ حٰمٓ السجدہ کی آیات میں ہم نے پڑھا تھا: اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ۔ تو یہ استقامت اور یہ صبر ہی درحقیقت وہ جڑ ہے کہ جس کی بنیاد پر انسان دنیا میں وہ روش اختیار کرسکتا ہے جس کے نتیجے میں اس میں وہ اوصاف پیدا ہوسکتے ہیں جن کا یہاں ذکر ہوا۔ اس کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے کہ: وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۔ "ان لوگوں کا جنت میں استقبال ہوگا۔ دُعاؤں کے ساتھ اور سلام کے ساتھ"۔ اور ظاہر بات

ہے کہ یہ استقبال کرنے والے جنت کے فرشتے ہوں گے ۔

آگے فرمایا: خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ط اس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے ۔ جنت وہ جگہ ہے کہ ایک بار داخلے کے بعد وہاں سے نکلنے کا کوئی سوال نہیں ہے ۔ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ہ "وہ جنت بہت ہی عمدہ جگہ ہے مستقل رہنے کے لئے بھی اور تھوڑی سی دیر کے قیام کے لئے بھی"۔ اس رکوع کے درس کی دوسری نشست میں جہنم کا ذکر آیا تھا۔ اب یہاں جنت کا ذکر آیا ہے تقابل (CONTRAST) کے طور پر چونکہ دنیا میں ہمارا تصور یہ ہے کہ کتنی ہی عمدہ جگہ ہو، وہاں بھی مستقل رہنا پڑے تو اس میں انسان کے لئے کوئی دلچسپی اور رعنائی نہیں رہتی اور اگر بڑی سی بڑی جگہ تھوڑی مدت کے لئے بھی جانا ہو جیسے صحرائے اعظم میں انسان تھوڑے عرصہ کے لئے بھی جائے تو تبدیلی (CHANGE) کی وجہ سے ایک تفریح ہو جاتی ہے، ایک ایڈونچر ہو جاتا ہے ۔ تو جہنم کے بارے میں فرمایا کہ وہ ایسی بری جگہ ہے کہ مستقل جائے قرار کی حیثیت سے تو انتہائی خوفناک ہے ہی ۔ کوئی اگر ایک لمحہ کے لئے بھی اس میں داخل کر دیا جائے تو اس دوزخ کی تمام شدتیں، غلظتیں اور ساری کلفتیں آنِ واحد میں عیاں ہو جاتی ہیں ۔ اس کے برعکس جنت وہ جگہ ہے کہ وہاں تھوڑی دیر ہی نہیں مستقل قیام ہوگا لیکن اس کے حسن میں، اس کی رعنائیوں میں، اسکی دلچسپیوں میں کبھی کوئی کمی نہیں آئے گی اور انسان اس سے کبھی بھی اکتائے گا نہیں ۔

حضرات! ہمارے ان دروس میں مضامین کی جو ترتیب ہم نے اختیار کی ہے، اس میں ہم "اعمال صالح" کے مباحث کا مطالعہ کر رہے ہیں ۔ اس پہلو سے سورۃ فرقان کے آخری رکوع میں اعمالِ صالح کے ضمن میں جن اوصاف کا بیان آیا ہے اُن کا بیان آج کی نشست میں مکمل ہو گیا ہے یعنی حاصل مطالعہ کے طور پر یہ بات ہمارے سامنے واضح طور پر آ گئی کہ اس پوری طرح تعمیر شدہ انسانی شخصیت جسے محبوبیتِ الٰہی کا مقام حاصل ہو جائے، جسے عباد الرحمٰن میں شمار کیا جائے، اس کی اساسات کیا ہیں! اس کے خدّوخال کیا ہیں! اُس کے اوصاف کیا ہیں! اُس کی نمایاں علامات کیا ہیں! اس رکوع کی آخری آیت میں ایک بالکل

دوسرا مضمون ہے جس پر ان شاء اللہ اگلی نشست میں گفتگو ہوگی ۔ آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کے ضمن میں اگر کوئی سوال یا اشکال ہو تو میں حاضر ہوں ۔

سوال وجواب

سوال : ڈاکٹر صاحب ! جو لوگ قرآن مجید کو سمجھ کر نہیں پڑھتے کیا وہ بھی اس آیت کے زمرہ میں آجاتے ہیں کہ : وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ہ اس سلسلہ وضاحت فرمایئے ۔

جواب : یقیناً اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو قرآن مجید پر غور نہیں کرتے ۔ جیسے سورۃ محمد میں فرمایا : اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا "کیا یہ لوگ قرآن پر تدبر نہیں کرتے کیا ان کے قلوب پر تالے پڑ گئے ہیں ؟" البتہ اگر کوئی ساری عمر بالکل ان پڑھ رہا ہے اس نے ساری عمر کچھ نہیں پڑھا اور اب وہ عمر کی اس حد کو پہنچ چکا ہے کہ اس کے لئے پڑھنا پڑھانا ممکن نہیں تو ایسا شخص معذور ہوگا ۔ وہ اگر قرآن مجید ناظرہ پڑھ لے اور اس کا مفہوم کچھ نہ پائے تو اُسے اجر وثواب ملے گا ۔ بلکہ میں تو یہاں تک عرض کرتا ہوں کہ اگر کوئی شخص عمر کی اُس حد کو پہنچ گیا ہے کہ اب ناظرہ قرآن سیکھنا بھی اس کیلئے ممکن نہیں ہے تو وہ شخص باوضو اور قبلہ رو ہو کر بیٹھ جائے اور قرآن مجید کی سطروں پر انگلی پھیرتا رہے تو اس کو بھی اجر وثواب ملتا ہے ۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جو لوگ پڑھ سکتے ہیں ، غور وتدبر کر سکتے ہیں ، جنہوں نے بہت سے دنیوی علوم حاصل کئے ہیں ، فنون سیکھے ہیں اور اب بھی ان میں اتنی استعداد موجود ہے کہ وہ عربی زبان سیکھیں ، قرآن مجید پڑھیں اور اس میں فکر وتدبر کریں ، ایسے لوگ اگر قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے محنت نہیں کرتے تو ایسے لوگ اُس وعید کے مستوجب قرار دیئے جائیں گے جو اس آیت مبارکہ میں آئی ہے ۔ واللہ اعلم

سوال : ڈاکٹر صاحب ! ایک شخص اپنی امکانی حد تک دین پر چلتا ہے اور اپنی بیوی بچوں کو بھی اس کی ترغیب دیتا ہے لیکن وہ بالغ ہونے اور سمجھ رکھنے کے باوجود اس کی بات نہیں مانتے تو قیامت کے دن ایسے شخص پر کوئی بوجھ ہوگا

یا وہ بری الذمہ ہوگا؟

جواب: بہت ہی عملی سوال ہے، جس سے بہت سے لوگوں کو عملاً سابقہ رہتا ہے - اس کا تعلق اصل میں انسان کی نیت سے ہے اور اس بات سے ہے کہ اُس کی کوشش کس درجہ کی ہے! ان امور کے متعلق ہم کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے ان کو اللہ جانتا ہے کہ اس نے واقعی کتنی محنت کی، کتنی کوشش کی آیا صرف سرسری طور پر کہتا ہے اور اس کے اہل وعیال بھی اپنے دلوں میں یہ محسوس کرتے ہیں کہ صرف واجبی سا کہنا سننا ہے ان کا کوئی خاص قلبی ارادہ ہمارے بارے میں یہ نہیں ہے - اگر ایسا ہے تو وہ شخص پکڑا جائے گا - پھر اس کا ایک پیمانہ یہ بھی ہوگا کہ ہم جو دعائے قنوت میں پڑھتے ہیں کہ "وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ" - اے اللہ! جو تیرے نافرمان ہیں ہم ان سے قطع تعلق کرتے تو آیا اپنے اہل وعیال پر دباؤ ڈالنے کے لئے ایسی روش اختیار کی جاتی ہے یا نہیں! ان تمام چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ ہوگا کہ فی الواقع اگر کسی شخص نے محنت وکوشش کی ہے، اس کے باوجود اس کے اہل وعیال نیکی اور تقویٰ کی راہ پر نہیں آرہے تو وہ اللہ کے ہاں بری ہوگا - اس لئے کہ انسان پر اصل ذمہ داری اپنی ہے - دوسروں کو نصیحت کرسکتا ہے، تلقین کرسکتا ہے ترغیب دے سکتا ہے، دوسروں کو راہ ہدایت پر لے آنے کا اختیار اُسے حاصل نہیں ہے - عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ "تم پر اصل ذمہ داری تمہاری اپنی جان کی ہے، تمہارا وہ کچھ نہیں بگاڑتا جو گمراہ ہوا جبکہ تم راہِ ہدایت پر رہو" بہرحال کوشش شرط ہے - جو ہر صاحب ایمان پر واجب ہے -

حضرات! ہم نے سورۃ الفرقان کے اس آخری رکوع میں عباد الرحمٰن کے جو اوصاف کا مطالعہ کیا، ہمیں شعوری کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم ان اوصاف کو اپنی سیرت وکردار میں جذب کریں اور محنت کریں کہ ہم بھی عباد الرحمٰن کے زمرے میں شامل ہو جائیں - اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے - وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ - اور یہ چیز اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں -

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

جوہر جوشاندہ

کھانسی گلے کی خراش زکام کے لیے
SURFICOL
COUGH SYRUP

مسئلۂ سندھ — دو اہم مقالات

وطنِ عزیز کی سلامتی اور استحکام کے حوالے سے مسئلۂ سندھ کے بارے میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی سوچ اور فکر کسی سے مخفی نہیں۔ اس اہم قومی مسئلے پر ایک مستقل کتاب لکھنے اور دس روز تک اندرونِ سندھ جاکر اہلِ سندھ کے خیالات و نظریات سے براہِ راست واقفیت حاصل کرنے کے بعد اگلے عملی قدم کے طور پر اس سال کے محاضراتِ قرآنی کی دو نشستوں میں اسی مسئلے کو مذاکرے کا موضوع بنایا گیا۔ اس سلسلے کی اہم بات یہ ہے کہ اس مذاکرے میں اُن سندھی دانشوروں کو اہلِ پنجاب کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی جو کسی نہ کسی حوالے سے اسلام یا پاکستان کے ساتھ وفاداری اور محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ مذاکرے میں تقاریر اور مقالے پیش کرنے والوں میں نئے اور پرانے سندھی دانشوروں کی بھرپور نمائندگی موجود تھی۔ پنجاب سے تعلق رکھنے والے دانشوروں میں جناب محمود مرزا ایڈووکیٹ اور ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر جناب سراج منیر بھی شامل تھے۔

دُو روزہ مذاکرات میں پیش کئے جانے والے تمام مقالوں اور تقریروں پر مشتمل مجموعی رپورٹ انشاء اللہ "میثاق" میں شائع کی جائے گی۔ اس شمارے میں مولانا عبدالوہاب چاچڑ اور جناب محمود مرزا ایڈووکیٹ کے مقالات پیشِ خدمت ہیں۔

مولانا عبدالوہاب چاچڑ جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمن گروپ) ضلع سکھر کے جنرل سیکرٹری اور سندھی ماہنامہ "شریعت" کے ایڈیٹر ہیں۔ انہوں نے اپنے مقالے میں سندھ کے مسئلے کے اہم پہلوؤں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ قیامِ پاکستان کے حوالے سے جس سوچ اور فکر کا اظہار کیا ہے وہ اُن کے جماعتی پس منظر کا لازمی نتیجہ ہے۔ پاکستان اور بانیٔ پاکستان کے بارے میں اُن کے طرزِ فکر سے واضح اختلاف کے باوجود اُن کا مقالہ من وعن پیش کیا جا رہا ہے تاکہ اہلِ پنجاب کو حالات و واقعات کی سنگینی کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ اگر مولانا موصوف قراردادِ پاکستان اور بانیٔ پاکستان کے حوالے سے اپنے روایتی موقف کو اور انتہا پسندانہ انداز سے مقالے میں شامل نہ کرتے تو سندھ کے مسئلے کے بارے میں انہوں نے جن حقائق کا اظہار کیا ہے وہ زیادہ نمایاں طور پر اہلِ پنجاب کے سامنے آتے اور لوگوں کے لئے اُن پر زیادہ سنجیدگی سے غور کرنے کا موقع باقی رہتا۔

جناب محمود مرزا ایڈووکیٹ وہ پہلی پنجابی شخصیت ہیں جنہوں نے ۸۳ء کی ناکام تحریک کے بعد سندھ جا کر حالات کا جائزہ لیا اور واپس آ کر اہلِ سندھ کے مسائل پر لکھا جو اب کتابی صورت میں "آج کا سندھ" کے عنوان سے دستیاب ہے۔ اس تناظر میں اُن کے مختصر مقالے کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے جس میں انہوں نے معاشی پہلو سے انتہائی اہم نکات کا احاطہ کیا ہے۔

(ادارہ)
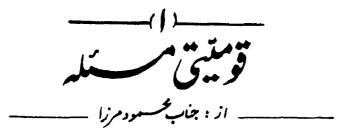
پاکستان کے علماءِ دین کے حلقوں میں ڈاکٹر اسرار احمد اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ انہوں نے سندھ کی صورتِ حال کے حوالے سے قومی یکجہتی کے معاملے پر تقریری

اور تحریری دونوں انداز سے تفصیلی بحث کی ہے۔ ان کی کچھ تحریریں "استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئی ہیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے اس کتاب یا اس کے کسی پہلو پر تبصرہ کرنے کی فرمائش کی جسے بخوشی قبول کرتے ہوئے میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ اس کتاب کا نمایاں ترین پہلو قومیتی مسئلہ ہے میں صرف اسی مسئلہ کو زیر بحث لاؤں گا۔ ہر آدمی کی سوچ اس کے علمی پس منظر سے متاثر ہوتی ہے۔ میں بنیادی طور پر پولیٹیکل اکانومی کا طالب علم ہوں۔ چنانچہ قومیتی مسئلے پر میری رائے اسی سوچ کی مظہر ہے۔

میں ڈاکٹر اسرار احمد کے علاوہ کسی دوسرے نامور مذہبی عالم کو نہیں جانتا، جو تصور پسندی اور واقعیت پسندی کے فرق کو اس طرح محسوس کرے جس طرح ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع پر بحث کی ہے۔ مذہبی عالم کی حیثیت سے آپ نے پاکستان کے استحکام کا واحد ذریعہ "اسلامی انقلاب" قرار دیا ہے۔ جو آپ کے خیال کے مطابق معروف جمہوری سیاست کے ذریعے ممکن نہیں۔ تاہم ڈاکٹر صاحب یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ موجودہ بحرانی کیفیت اور درپیش مسائل معروف جمہوری نظام ہی کا تقاضا کرتے ہیں۔ بطور ایک حقیقت پسند کے آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس وقت پاکستان میں مسلم قومیت کا جذبہ بہت کمزور پڑ چکا ہے، اور اس کی جگہ نسلی، لسانی اور علاقائی عصبیتوں نے لے لی ہے۔ آپ لکھتے ہیں "سردست ہم اگر پاکستان میں قومیتوں کے مجموعے ہی کے لئے کوئی قابل قبول دستور اور لائحہ عمل تیار کر سکیں اور پھر اپنے عمل سے باہمی اعتبار کی فضا کو پروان چڑھائیں اور وحدت ملی کی جانب پیش قدمی کریں تو یہ بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ اس کے برعکس اگر جذباتی انداز میں قومیتوں کی نفی مطلق ہی پر اصرار رہا تو باہمی بے اعتمادی اور تشتت و انتشار ہی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔" فوری تدبیر کے طور پر ملک کی کشتی کو خوفناک بھنور سے نکالنے کے لئے آپ کی تجویز ہے کہ "عوام کو ان کے سیاسی حقوق فی الفور لوٹا دیئے جائیں، اور اس سلسلے میں جو ظاہری خطرات و خدشات نظر آتے ہیں ان سے بالکل خائف نہ ہوا جائے۔ اس لئے کہ بصورت دیگر جو اندیشے ملک و ملت کے مستقبل کو لاحق ہیں وہ ان سے کئی گنا زیادہ خوفناک ہیں" پاکستانی عوام میں ثقافتی فرق کو تسلیم کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں "ایسے ممالک یا معاشرے

جو مختلف لسانی و ثقافتی اکائیوں پر مشتمل ہیں ان کے لئے تو انتخابی و سیاسی عمل کا جاری رہنا بالکل تنفس کے جاری رہنے کے مشابہ ہے - اس کا تعطل خوفناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔"

فوری تدابیر کے طور پر ڈاکٹر صاحب کی مذکورہ بالا تجاویز مدبرانہ ہیں - جہاں تک مستقل حل کا تعلق ہے - ڈاکٹر صاحب نے کوئی تفصیلی بحث نہیں کی - اس لئے اس پر تبصرہ ممکن نہیں -

ڈاکٹر صاحب نے اپنی زیر تبصرہ تصنیف میں قومی استحکام کے مسائل پر واقعیت پسندی کا ایک دانشمندانہ رویہ اختیار کیا ہے - یہ ایک ایسے مذہبی عالم کے لئے جو غیر سندھی ہو ایک بڑی بات ہے - اور جب ایسا عالم لاہور میں رہتا ہو تو بہت بڑی بات ہے - تاہم یہ بات جدید سماجی علوم کے کسی روشن خیال طالب علم کے لئے نہ تو بڑی ہے اور نہ عجیب عمرانیات کے ماہرین، افراد کے ایسے مجموعے کو قومیت تصور کرتے ہیں جن کی زبان اور ثقافت میں یکسانیت پائی جائے اور جو ایک متعین علاقے میں اکثریت میں آباد ہوں - بالخصوص جب ان کی روایات اور تاریخ میں سانجھ پائی جائے - اس مجموعۂ افراد کی سوچ میں بھی ایک طرح کی سانجھ موجود ہوتی ہے اور ان میں مشترکہ مفاد کا ایک احساس بھی پایا جاتا ہے - یہ احساس خصوصیت سے اس وقت ابھرتا ہے - جب کسی وجہ سے کسی دوسری قومیت کے ساتھ مفادات کا ٹکراؤ یا شکایتیں پیدا ہو جائیں - کوئی ملک یا قوم ایک سے زیادہ قومیتوں پر مشتمل ہو سکتی ہے - بے شمار ممالک ایسے ہیں جن میں متعدد قومیتیں آباد ہیں - یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ان قومیتوں میں کوئی ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو - اگر متعدد قومیتوں پر مشتمل ممالک میں تمام قومیتوں کو سیاست، حکومت اور معاشی ترقی میں شرکت کا کم و بیش یکساں موقع میسر ہو تو قومیتی عصبیتیں کوئی منفی رویہ اختیار نہیں کرتیں - بلکہ جوں جوں ان میں تہذیبی اور معاشی مفادات کا اشتراک بڑھتا ہے ان میں اکٹھا رہنے کا قومی جذبہ مستحکم ہوتا جاتا ہے - ہوشمند ممالک میں ترقیاتی منصوبہ بندی کے ذریعے اس بات کا اہتمام کیا جانا چاہیئے کہ ہر علاقے میں ایسے معاشی منصوبے قائم کئے جائیں - کہ ایک علاقے کے رہنے والے عام طور پر دوسرے علاقے میں نقل مکانی کر کے آباد ی

کے تناسب کو اس طرح سے تلپٹ نہ کردیں کہ ان دو قومیتوں کے مابین شکر رنجی
پیدا ہو۔ مگر ہمارے ہاں ترقی کا انتہائی بھونڈا سرمایہ دارانہ طریقہ کار اختیار کیا گیا۔ صنعتی
شعبے میں ترقی کی ذمہ داری سرمایہ داروں کے سپرد ہوئی۔ جنہوں نے محض دولت
کمانے کی غرض سے صنعتیں ایسے علاقے میں نصب کیں جہاں سے انہیں زیادہ
سہولتیں یا منافع حاصل ہوا۔ تفصیل میں جائے بغیر عرض ہے کہ ۱۹۸۱ء تک سندھ
بالخصوص کراچی کے گردونواح میں گیارہ ارب روپے کی سرمایہ کاری ہوئی۔ اتنی ہی
سرمایہ کاری پنجاب میں بھی ہوئی جبکہ سندھ کی آبادی پنجاب کے مقابلے میں تقریباً
ایک تہائی ہے اس کے برعکس دوسرے دو صوبوں میں کوئی قابل ذکر صنعتی سرمایہ کاری
نہیں ہوئی۔

اگلے تین سالوں میں چھ انوسٹ منٹ بنکوں نے صنعتوں کی تنصیب کے لیے
قرضوں کی صورت میں جو سرمایہ فراہم کیا اسکی مجموعی رقم کا ۵۳٫۶۶ فیصد سندھ میں
(زیادہ تر کراچی کے گردونواح میں)، ۲۸٫۶۲ فیصد پنجاب میں، ۱۲٫۳ فیصد صوبہ سرحد
میں اور ۵٫۷ فیصد بلوچستان کے لئے تھا۔ کمرشل بنک کریڈٹ صنعتی اور تجارتی
سرمایہ کاری کا بڑا وسیلہ ہوتا ہے۔ جو روزگار کے مواقع پیدا کرنے کا بڑا ذریعہ بنتا
ہے۔ ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۵ء تک کے چار سالوں کے دوران کراچی میں بنک ایڈوانس
کی رقوم مجموعی ایڈوانس کا ۵۰ فیصد سے ۵۶ فیصد کے درمیان رہیں جبکہ پنجاب بھر
میں یہ شرح ۲۰ فیصد سے ۲۳ فیصد تھی۔ صوبہ سرحد میں یہ شرح صرف ۴ فیصد
تھی۔ اس غلط کریڈٹ اور ترقیاتی حکمت عملی کی وجہ سے پنجاب اور صوبہ سرحد کے لوگ
تلاش روزگار میں سندھ اور بالخصوص کراچی میں نقل مکانی کرنے لگے۔ اس طرح
سندھ کی صنعت و تجارت کی ترقی کے نتیجے میں سندھ کی تہذیبی حیثیت بدل گئی جس
کا سندھی بولنے والی آبادی میں شدید ردعمل ہوا۔ اسی کا اظہار ایک سندھی دانشور
نے اس طرح کیا کہ انہیں سندھ کی ایسی صنعتی ترقی نہیں چاہیے جو ان کے تہذیبی
تشخص کو ختم کردے۔ عام سندھی کو بجا طور پر شکایت ہے کہ نئے بیراجوں کی بہت
سی اراضی مقامی محنت کشوں کی بجائے غیر سندھی افراد میں تقسیم کی گئی ہے۔ یہ
سراسر غلط حکمت عملی ہے۔ میں اس حکومت کو قوم کا حقیقی خدمت گار قرار دوں گا

ہو ایسی تمام الاٹمنٹوں کو بیک جنبشِ قلم بغیر کسی معاوضہ کے منسوخ کرے ۔ جو غیر
محنت کشوں کو الاٹ کی گئی ہیں ۔ یہ مسئلہ مذہبی علما کے طے کرنے کا ہے ۔ کہ ابتدا
الاٹمنٹ کے ذریعے غیر حاضر ملکیتی نظام قائم کرنے کا کیا جواز تھا یہ معاملہ سندھی عوام
کے طے کرنے کا ہے کہ مقامی سندھی ہاری کب تک اپنی محنت سے بڑے بڑے زمینداروں
کو ڈھیروں دولت کما دیتے رہیں گے تاکہ وہ اس کے بل بوتے پر سندھی عوام کو سیاسی
سماجی اور انسانی حقیقی سے محروم کئے رکھیں ۔ خیال رہے کہ یہ سندھ کے مسئلے
کی مکمل تفصیل نہیں صرف معاشی پہلو کے چند نکات کا مختصراً ذکر ہے ۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ جمہوریت کے فقدان، سرکاری افسروں کی لوٹ مار اور
جابرانہ رویے کی بنا پر اور معیشت کی غلط منصوبہ بندی کی وجہ سے قومیتوں کا مسئلہ
اس قدر شدید ہو گیا جتنا آج ہے ۔ اس صورتِ حال کے سلجھانے میں دو ایسے گروہ
ہیں جو امداد نہیں کر رہے اور جو واقعیت پسند ہونے کی بجائے نظریہ پسند بنے رہنے
پر مصر ہیں ۔ ان میں سے ایک دائیں بازو کا نظریاتی گروہ ہے جس میں موثر ترین
طبقے کا تعلق مرکزی پنجاب سے ہے جو ابھی تک معروضی حالات سے آنکھیں بند
کئے ہوئے ہے اور اسی تصور پسندی پر مصر ہے کہ سندھی عوام کی شکائتیں اسلامی
عقائد سے متصادم ہیں اور اس بنا پہ توجہ کے قابل نہیں ۔ اس کا اصرار ہے کہ
اسلام میں تہذیب، رنگ ونسل کی کوئی تفریق نہیں اور ایک مسلمان کسی بھی علاقے
میں نقل مکانی کر سکتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ یہ مذہبی حلقے اسلام کے آئیڈیل کو
اس کے معروضی سیاق وسباق سے منقطع کر دیتے ہیں ۔ شاید وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں
کہ ہمارے ہاں کا مروجہ نظام، اسلامی آئیڈیل کو جذب کرنے کی صلاحیت سے سراسر
عاری ہے ۔ لیکن سندھ کے علماء کا موقف ایسے کسی تضاد کا شکار نہیں ۔ مجھے فی الواقع
حیرت انگیز خوشی ہے کہ مرکزی پنجاب کے کم از کم ایک عالم ڈاکٹر اسرار احمد نے اس
معاملے میں ایک روشن خیال رویہ اپنایا ہے ۔ دوسرا نظریاتی گروہ جو قومی مسئلے کو
سلجھانے میں مدد نہیں کر رہا اس کا تعلق بائیں بازو سے ہے ۔ یہ گروہ کمیونسٹ
سماج کے قومیت کا مفصل تصور من وعن ایک ایسے معاشرے میں نافذ کرنا چاہتا
ہے جو کمیونسٹ سماج نہیں ہے ۔ یہ بڑی خوشی آئند بات ہو گی اگر پاکستان میں

بائیں بازو کے علم بردار واقعیت پسندی کا رویہ اختیار کرکے قومیت کے مسئلے کو فیڈرل نظام کے اندر رہتے ہوئے صوبائی اور لوکل گورنمنٹ کے اختیارات میں توسیع کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کریں۔

لاہور میں کچھ احباب ان دنوں کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے ملک میں مختلف علاقوں اور مختلف افراد کے درمیان جو نظری اختلافات موجود ہیں ان کو سمجھنے کی کوشش کریں اور ان میں مشترک نکات ڈھونڈ کر ملکی استحکام پیدا کرنے کے لئے ایک نقشہ تیار کریں۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بھی اپنے طور پر ملکی استحکام کے لئے لائحہ عمل ڈھونڈنے میں مصروف ہیں۔ میرے احباب کی رائے میں ملکی استحکام اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکے گا جب تک ملک کے نظم و نسق میں ہمارے عوام عملی دلچسپی نہیں لیں گے۔ چنانچہ محض سیاسی نظام ہی نہیں انتظامی ڈھانچہ بھی حتی الامکان جمہوری اصولوں کے مطابق بنانے کی ضرورت ہے۔ اس بات کو میں نے اپنی کتاب "آج کا سندھ" میں مختصراً یوں بیان کیا ہے کہ ریاستی طاقت کو حتی الامکان مرکز سے صوبوں اور صوبوں سے مزید آگے ضلعوں اور اس سے بھی نچلی سطحوں تک پھیلا دیا جائے اور اختیارات کو جس حد تک ممکن ہو سرکاری حکام کی بجائے عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھوں میں منتقل کر دیا جائے۔ مزید برآں معاشی منصوبہ ساز اداروں کے اختیارات کے ارتکاز کو بھی حتی الامکان ختم کیا جائے۔ یکساں وسائل اور مسائل کے حامل اضلاع کی بنیاد پر نئے منصوبہ ساز ادارے قائم کئے جائیں۔ صوبائی اور وفاقی منصوبہ ساز ادارے ان کو فنی مہارت اور مدد مہیا کریں اور ان کو مربوط بنائیں۔ منصوبوں کی تکمیل کی ذمہ داری متعلقہ اضلاع کی منتخب انتظامیہ، مقامی باشندوں کے خوشدلانہ تعاون سے ادا کرے۔ اسی لائحہ عمل کو اختیار کر کے تمام علاقوں کی بیک وقت ترقی ممکن ہے۔ ترقی کے نتیجے میں لوگوں میں جو مشترک مفاد اور باہمی انحصار پیدا ہوگا وہ جمہوری نظام کے ساتھ مل کر یکجہتی کی وہ فضا پیدا کر دے گا جسے کچھ لوگ محض نظریوں کی بحث کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

آخر میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور جلسے کے منتظمین کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے آپ سے خطاب کی دعوت دی

⊖

(۲)

سندھ بنام پنجاب

مولانا عبدالوہاب چاچڑ

آج اس مجلس میں دو تاریخی معاہدوں اور ان معاہدوں کی خلاف ورزیوں کا قدرے تفصیل سے ذکر کروں گا۔ معاہدہ اول قرارداد لاہور یا نظریہ پاکستان۔ دوم تقسیم آب کے متعلق معاہدہ لاء کمیشن ۱۹۴۵ء کا سندھ پنجاب اگریمنٹ۔

تمام ممالک اسلامیہ کا متحدہ اقتدار بنوامیہ کے دور تک قائم رہا بعد میں ممالک اسلامیہ کا وہ اتحاد باقی نہ رہا۔ اس لئے تو حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اسلام کی چکی پینتیس یا فرمایا چھتیس یا فرمایا سینتیس کے بعد بند ہو جائے گی پھر اگر لوگ ہلاک ہو گئے تو ان کا بھی وہی راستہ ہے جو اور ہلاک ہونے والوں کا ہے اور اگر ان کا دین ان کے لئے قائم رہے گا تو ستر برس تک قائم رہے گا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ اے نبی اللہ گذشتہ زمانہ ملا کر ستر برس یا صرف آئندہ کے؟ حضرتؐ نے فرمایا صرف آئندہ کے" حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ازالہ الخفاء مترجم اردو ج اص ۳۰۰ میں اس حدیث کو نقل کر کے فرمایا "اس حدیث کا مضمون خارج میں ظاہر ہوا کیونکہ ۳۵ھ میں حضرت عثمانؓ شہید ہو گئے اور انتظام جہاد بگڑ گیا۔ پھر حضرت معاویہؓ کے زمانے میں جہاد کا انتظام قائم ہوا اور اس تاریخ سے ستر برس بعد بنوامیہ کی سلطنت زائل ہو گئی"۔ مطلب یہ کہ قرن اول تک تمام بلادِ اسلامیہ کے درمیان ڈھیلا ڈھالا اتحاد قائم تھا۔ اسی لئے تو حضرت ابو عبیدہؓ نے شام کے علاقہ حمص کو اتحاد سے آزاد کر دیا اور فرمایا انتم علی امر کم جب اس کی حفاظت سے قاصر رہے (مفتوح الشام للبلاذری ص ۱۴۳) ایسا صرف ڈھیلے ڈھالے اتحاد میں ہو سکتا ہے۔

۱۹۴۰ء میں مسلمانان ہند کی آرا دو قسم کی تھیں۔

جمعیت علمائے ہند کی رائے تھی کہ ہندوستان کے تمام ممالک ایسے ڈھیلے ڈھالے اتحاد میں شامل ہوں جس میں ہندو اکثریت کے غلبے کا مستقل سد باب کیا گیا ہو۔ کانگریسی مسلمانوں کا بھی یہی خیال تھا لیکن مسلم لیگ کی رائے تھی صرف مسلم اکثریت والے ممالک ہند کا آپس میں اس قسم کا اتحاد ہو۔ اگر آپ نزاع لفظی میں نہ الجھیں تو آج کی اصطلاح میں ایسے اتحاد کو کنفیڈریشن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مسلم لیگ نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں جو تاریخی قرارداد پاس کی تھی وہ اسی رائے کا اظہار تھا اور یہی نظریہ پاکستان ہے۔ قرارداد کا متن ہے کہ "وہ علاقے جہاں مسلمان بلحاظ تعداد اکثریت میں ہیں مثلاً شمال مغربی اور مشرقی ہندوستان کے منطقوں میں، ان کی اس طرح گروپ بندی کی جائے کہ وہ آزاد اور خود مختار مملکتوں کی ایسی صورت اختیار کر لیں جس میں ملحقہ یونٹیں خود مختار اور مقتدر ہوں"۔

اس کے بعد اپریل ۱۹۴۱ء کو مدراس میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں بھی تقریباً یہی قرارداد دوبارہ منظور کی گئی اور اسی نظریہ و معاہدہ کے تحت دسمبر ۱۹۴۵ء و جنوری ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ نے مسلمانان ہند کی اکثریت کے ووٹ حاصل کئے جو کہ ایک لحاظ سے ریفرنڈم تھا۔

نظریہ پاکستان سے پہلا انحراف

ارباب نظریہ پاکستان نے ووٹ حاصل کر کے اپنی اصل نیت کا اس طرح اظہار کیا کہ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی کنونشن میں مسلمانان ہند اور نظریہ پاکستان کے ساتھ غداری کرتے ہوئے طے شدہ قرارداد کو مسخ کر کے ایک نئی قرارداد منظور کی۔ دہلی قرارداد کا متن یوں ہے کہ۔

" ہر گاہ مسلمانوں کو اس امر کا یقین و اتفق ہو چکا ہے کہ ہندوؤں کے غلبہ سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لئے یہ لازمی ہے کہ ایک ایک با اختیار اور با اقتدار مملکت کا قیام عمل میں لایا جائے جو شمال مشرقی منطقہ میں آسام' بنگال اور شمال مغربی منطقہ میں سندھ' پنجاب' بلوچستان اور صوبہ سرحد پر مشتمل ہو" ۔ اس سازشی قرارداد میں مملکتوں کو مملکت میں تبدیل کر دیا گیا۔ نظریہ پاکستان میں وحدتوں کو آزاد' خود مختار اور مقتدر قرار دیا گیا تھا مگر اس سازشی قرارداد دہلی میں یہ چیزیں مرکز کے لئے نقص کی گئیں۔

شرعاً' اخلاقاً اور قانوناً قرارداد دہلی کی کوئی حیثیت نہیں۔ معاہدہ یا نظریہ پاکستان قرارداد لاہور ہی ہے۔ جس کے خاتمہ کے معنی پاکستان کا خاتمہ ہو گا کیونکہ نظریہ بمنزلہ روح کے ہوتا ہے۔

دوسرا انحراف

سندھ اسمبلی نے ۱۹۴۶ء میں دو بل پاس کئے۔

۱۔ تین سو ایکڑ سے کم زمین کا مالک اپنی زمین گروی نہیں رکھ سکتا جب تک گورنمنٹ سے اس کی منظوری نہ لے۔

۲۔ آج سے قبل جتنی بھی زمینیں گروی کی وجہ سے فروخت ہوئی ہیں یا ابھی تک گروی رکھی ہوئی ہیں وہ سب اپنے اصل مالکوں کو واپس ہو جائیں گی اور جتنا عرصہ وہ گروی میں رہی ہیں' اس عرصہ کی زرعی پیدائش کا حساب گروی رکھنے والے سے لے کر اصل مالک کو دیا جائے گا' اگر وہ حساب قرض سے زائد بنتا ہو۔ اس قسم کا بل پنجاب اسمبلی نے غالباً ۱۹۰۰ء میں پاس کیا تھا اور عمل میں آیا۔ سرحد اسمبلی نے ایسا بل ۱۹۵۱ء میں پاس کیا اور ۳۰ ستمبر ۱۹۵۲ء تک اس بل کی بنیاد پر صوبہ سرحد میں واپس شدہ زمینوں کا تخمینہ ۱۶۳۵۶ ایکڑ ہے۔

سندھ میں مسلمان غالب اکثریت میں تھے' اس لئے آسانی سے یہ بل پاس ہو گیا۔ یہ امر واقع ہے کہ مسلمان اکثریت کے باوجود تعلیم اور معیشت میں پیچھے تھے۔ علمی اعتبار سے اس لئے کہ انگریزوں نے آزاد ملک سندھ پر قبضہ کر کے اس کو صوبہ تک نہ بنایا بلکہ بمبئی کا ڈویژن بنا دیا۔ کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے بمبئی جانا عام مسلمان کی استطاعت میں نہیں تھا۔ اس کے علاوہ غیور سندھی مسلمان انگریزی کی طرح انگریزی سے بھی متنفر تھے۔ علماء کرام کے فتاویٰ نے بھی اس نفرت و دوری میں اضافہ کیا۔ اس کے باوجود سندھی مسلمانوں نے سندھ میں مسلم' نان مسلم کی بنیاد پر ملازمتوں کے لئے آبادی کے تناسب سے کوٹہ سسٹم منظور کرا لیا۔ اس قسم کا کوٹہ سسٹم پنجاب میں بھی تھا۔ سندھی مسلمان اپنے کوٹہ کی تکمیل کے لئے پنجاب و غیرہ سے بھی مسلمانوں کو لے آتے تھے۔ بعد میں

سندھی مسلمانوں نے اپنے تعلیمی ادارے قائم کئے اور آہستہ آہستہ تعلیم میں خود کفیل ہوتے گئے۔ مسلمانان سندھ کی اکثریت دیہاتی تھی۔ ان کے معاش کا انحصار زراعت پر تھا۔ آبپاشی کا نظام بہتر نہیں تھی۔ اس لئے زراعت سے ضروریات پوری نہیں ہورہی تھیں۔ سندھی مسلمان ضروریات کے لئے ہندو ساہوکاروں، سود خوروں سے قرض لے کر مفلس سے مفلس تر ہوتے گئے۔ زمینیں گروی رکھتے تھے بالاخر قرض اور سود در سود میں فروخت ہوجاتی تھیں۔ مذکورہ بالا دونوں بلوں کو اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ان کی اہمیت سمجھ میں آجائے گی۔

یہ دونوں بل پاس ہو کر منظوری کے لئے گورنر جنرل ہند کے پاس گئے دفتری کارروائی کے دوران ہی پاکستان بن گیا۔ اب یہ دونوں بل گورنر جنرل مسٹر محمد علی جناح کی خدمت میں پیش ہوئے۔ جناح صاحب نے پہلے بل کو تو منظور کیا لیکن دوسرے بل کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ زمینیں پناہ گیروں کو دی جائیں گی۔ حالانکہ ہندوؤں کی متروکہ جائیداد اور زمینوں میں فرق تھا۔ زمینیں ہندوؤں کی اپنی نہیں تھیں ان کے اصل مالک مقامی مسلمان تھے۔ بہرحال جو چیز سندھی مسلمانوں نے ہندوؤں کے دور میں حاصل کی پاکستان کی برکت سے وہ بھی ان سے چھین لی گئی۔ یہ اقدام قرارداد لاہور کے سراسر منافی تھا۔ اس کے باوجود سندھ والوں کو کہا جاتا ہے کہ ہندو تم کو کھاجاتا یا کھاجائے گا اگر پاکستان نہ بنتا یا نہ رہا۔ حالانکہ سندھیوں کو پاکستان نے کھایا ہے اور کھارہا ہے یا کوئی اور آکے کھائے گا یہ بات ظاہر ہے۔

تیسرا انحراف

۱۹۴۸ء کے اوائل میں پاکستان سرکار نے سندھ کے دارالحکومت، بندرگاہ اور عظیم الشان شہر کراچی کو سندھ سے الگ کیا۔ سندھ اسمبلی نے متفقہ قرارداد میں اس کی مخالفت کی اور اس کو قرارداد لاہور سے غداری قرار دیا گیا۔ اس اتفاق میں برطانوی ممبر بھی شامل تھے۔ جناح صاحب اور لیاقت علی خان نے ہر اسمبلی میں برطانوی شہریوں کو رکنیت عنایت کی تھی۔ لیکن بندوق کی نالی سے کراچی زبردستی چھین لیا گیا۔ البتہ یہ وعدہ کیا گیا کہ صوبائی سیکرٹریٹ، عملہ کی رہائش گاہیں تعمیر کرنے وغیرہ کے لئے مرکز سندھ کو معاوضہ ادا کرے گا لیکن اب تک وہ وعدہ وفا نہ ہوا۔

یہ تو واضح ہے کہ پاکستان اسلامی نظام کے لئے نہیں بنا تھا۔ آپ قرارداد لاہور کا مطالعہ کریں ایسی کوئی بات نہیں۔ البتہ جمعیت علمائے اسلام وغیرہ اس کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ اسلامی نظام نافذ ہو۔ خدا ان کو کامیاب کرے۔ بانیان پاکستان کے ذہن میں یہ چیز نہیں تھی۔ پاکستان صرف ہندوؤں کے غلبہ سے آزادی کی بنیاد پر قائم ہوا ہندوؤں کے غلبہ کا خوف بھی کل ہند سطح پر تھا۔ صوبائی سطح پر خوف کارفرما نہیں تھا۔ صوبہ سرحد جہاں ہندو نہ ہونے کے برابر تھے۔ انہوں نے ریفرنڈم میں حصہ لیا (اگرچہ مخالف پارٹی نے بائیکاٹ کیا تھا) تو اس کا محرک بھی کل ہند سطح پر ہندوؤں کا خوف تھا۔ اگر بانیان پاکستان کے دل میں اسلامی نظام کا ادنیٰ خیال بھی ہوتا تو ہرگز مندرجہ ذیل اقدامات نہ کرتے۔

۱۔ پاکستان بننے کے بعد جب پاکستانی جھنڈا لہرایا گیا اور برطانوی پرچم یونین جیک اتارا گیا تو جناح

صاحب نے فرمایا کہ یونین جیک کو دوبارہ بلند کرو اور اس کو ایک دن کے لئے اور لہرانے دو۔
۲۔ ایک غیر مسلم جوگندر ناتھ منڈل کو دس اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا چیئرمین بنایا گیا۔
۳۔ کٹر قادیانی چوہدری ظفر اللہ کو ملک کا پہلا وزیر خارجہ بنایا گیا۔
۴۔ پاکستانی بری افواج کا کمانڈر انچیف ایک انگریز جنرل کو بنایا گیا۔ حد تو یہ ہوئی کہ جناح صاحب نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستانی افواج کو کشمیر میں داخل ہونے کا حکم دیا لیکن ان افواج کے کمانڈر جنرل گریسی نے حکم ماننے سے انکار کر دیا اس انکار کے صلہ میں چار ماہ بعد جنرل گریسی کو جنرل میسروی کی جگہ بری افواج کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا اور ۱۶ جنوری ۱۹۵۱ء تک اس منصب پر فائز رہے۔
۵۔ ہوائی فوج کا سربراہ ایئر مارشل ایل آر ایچرے انگریز کو بنایا گیا۔ ۱۹۵۷ء تک یہ انگریز پاکستان کی فضائیہ کا سربراہ رہا۔
۶۔ بحری فوج کا سربراہ ایڈمرل جیفورڈ انگریز کو مقرر کیا گیا۔
۷۔ صوبہ پنجاب کا گورنر سر فرانسس موڈی انگریز مقرر ہوا اگست ۱۹۴۹ء تک رہا۔
۸۔ مشرقی پاکستان کا گورنر فریڈرک بورن تین سال تک وہاں حکومت کرتا رہا۔
۹۔ صوبہ سرحد میں چار سال تک دو انگریزوں کا راج رہا یعنی کنگھم اور ڈنڈاس۔
۱۰۔ فیڈرل کورٹ کا پہلا چیف جسٹس اور پہلا وزیر قانون آپ کو معلوم ہے۔
مطلب یہ ہے کہ بانیان پاکستان نے ملک کی افواج کا مخصوص ذہن بنوایا اور ملک کے رگ و ریشہ میں برطانوی جراثیم کو داخل ہونے کا موقع فراہم کیا۔ اسلامی نظام کے داعی اس طرح نہیں کرتے۔ یہ وہ خرابیاں ہیں جو بانیانِ نظریہ کے کھاتے میں جاتی ہیں ۔

چوتھا انحراف

کوٹری بیراج مکمل ہوا۔ گدو بیراج مکمل ہونے والا تھا سندھ کی بنجر زمین شاداب آباد ہونے کا وقت قریب آرہا تھا۔ سندھ کے وسائل اور عہدے پنجاب کو لقمہ تر نظر آرہے تھے۔ ان چیزوں کو نگلنے کی راہ میں صوبائی حد بندی مانع تھی۔ اس لئے پنجابی سیاستدانوں نے مشرقی پاکستان کی اکثریت کے توڑ کا بہانہ بنا کر مغربی پاکستان کے صوبوں کی صوبائی حیثیت ختم کر کے سب کو لاہور کے ماتحت کر دیا۔ حالانکہ مشرقی پاکستان کی کثرت آبادی کا بہترین حل سینٹ کے ذریعہ ہو سکتا تھا۔ اب سندھ کی ہر چیز کا فیصلہ لاہور میں ہونے لگا۔ سندھ کی اہم اور کلیدی اسامیاں پنجابیوں سے پُر کی گئیں۔
سندھ کے ہاری جو بیراج کی تکمیل کے منتظر آس لگائے بیٹھے تھے کہ زمینیں ان کو ملیں گی اور زمینداروں کے چنگل سے نکلیں گے اور آزاد اور خوشحال زندگی بسر کریں گے۔ مگر ان کی آرزو آرزو ہی رہی۔ سندھ کی زمینیں فوجیوں اور سول ملازمین میں بانٹی گئیں۔ نیلام عام کے ذریعے بقایا زمینیں پنجابی چودھریوں کو دی گئی۔ غریب سندھی ان چودھریوں کا مقابلہ کیسے کر سکتا تھا۔ جن کی تجوریاں بنک کے پیسے سے بھری ہوئی تھیں۔ ون یونٹ بننے سے سیلاب کی

طرح غیر سندھی حضرات کی یلغار ہوئی۔ جس سے مقامی لوگ نہ صرف بے روزگار ہوئے بلکہ آبادی کا تناسب بھی بگڑ گیا۔ اب سندھ والے ریڈ انڈین کی سی حالت کا خطرہ محسوس کرنے لگے ہیں۔

اگرچہ مندرجہ بالا مقاصد حاصل کر کے اور مفاسد پورے کر کے یحییٰ خان سے ون یونٹ ختم کرا کے صوبوں کے نام تو بحال کرا دیئے گئے لیکن اس عرصہ دراز میں جتنی یہ زیادتیاں کی گئیں ان کا کوئی ازالہ نہ کیا گیا۔ ہر چیز اسی حالت میں رہی نہ زمینوں کے مسائل حل ہوئے نہ وسائل کے استعمال پر کوئی بندش عائد کی گئی اور نہ باہر کے ملازمین اور افسروں کو واپس کیا گیا۔ بلکہ یہ سلسلہ جاری ہے سندھ میں اب بھی حالت ایسی ہے جیسے فاتح قوم مفتوح علاقے میں داخل ہوئی ہو۔ ہمارا حال غلاموں سے بھی بدتر ہے۔ اپنے گھر میں اجنبی ہیں۔ سیکرٹریٹ سے لے کر تھانہ تک باہر کے لوگ مسلط ہیں جو بھی باہر سے آتا ہے اس کا استقبال کرنے والے بندے پہلے سے یہاں موجود ہوتے ہیں۔ ایک دن میں اس کو ڈومیسائل سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے۔ کوٹہ سسٹم جس پر اردو والے ناراض ہیں۔ ڈومیسائل کی سہولت کی بدولت اس سے بھی پنجابی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کوٹہ سسٹم مرکز میں بھی ہے۔ سندھ، پنجاب اور سرحد میں بھی ہے کوٹہ سسٹم کا مقصد یہ ہے کہ پسماندہ لوگوں کو ترقی دی جائے اس میں کوئی شرعی، اخلاقی اور قانونی سقم نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ پنجاب کی اسامیوں کے لئے میرٹ کا حصہ نکال کر باقی کے لئے پنجاب دو زونوں میں منقسم ہے۔

ایک ترقی یافتہ (زون نمبر ۱) اور دوسرا پس ماندہ۔ زون نمبر ۲ میں بہاولپور ڈویژن، ڈی جی خان ڈویژن، فیصل آباد ڈویژن کا ضلع جھنگ، سرگودھا ڈویژن کے میانوالی اور بھکر کے اضلاع اور پنڈی ڈویژن کے اٹک اور جہلم کے اضلاع شامل ہیں باقی پورا پنجاب زون نمبر اول میں شامل ہے۔ ہر ایک زون کا کوٹہ مقرر ہے۔ اسی طرح صوبہ سرحد کو پانچ زونوں میں تقسیم کر کے ملازمت اور داخلہ میں ہر ایک کے لئے کوٹہ مقرر کیا گیا ہے۔ سندھ میں کراچی، حیدر آباد اور سکھر ترقی یافتہ علاقے ہیں اور باقی سندھ پس ماندہ ہے۔ سندھ میں بھی پنجاب اور سرحد کی طرح کوٹہ سسٹم نافذ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پس ماندہ علاقوں کے کوٹہ پر بھی زیادہ تر پنجابی حضرات جعلی ڈومیسائل بنوا کر قابض ہو جاتے ہیں۔

پنجاب کے لوگ پوچھتے ہیں کہ وسائل معاش اور ملازمتوں میں علاقہ کی تخصیص، غیر مقامی پر سکونت کی بندش اور آئے ہوئے لوگوں کے اخراج کا شرعی جواز ہے؟ جبکہ فرمان رسول ہے انما المومنون اخوۃ واقعی سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ لیکن اخوت ایمانی ایک دوسرے کے ضرر کا باعث بنے جائز نہیں۔ جہاں تک حقوق منزلی یا مدنی یا علاقائی کا تعلق ہے اس میں مذہب یا تقویٰ کا کوئی دخل نہیں مذہب کو استحصال کے لئے استعمال کرنا یہودیت کا ایک شعبہ ہے۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قوموں کے علاقائی حقوق کے لئے جو فرامین جاری کئے تھے اس پر ایک کتاب لاہور میں شائع ہوئی ہے طبقات ابن سعد میں ایسے کافی فرامین نبوی کو نقل کیا گیا ہے جن میں ایک علاقہ کے آدمی کو کسی دوسرے علاقہ میں زمین آباد کرنے، خرید کرنے وغیرہ کی بندش ہے علامہ ابن کثیر نے البدایہ والنھایہ طبع لاہور ج ۵ ص ۳۴ میں حضور کریم کا ایک ایسا ہی فرمان نقل کیا ہے۔

بحوالہ احمد وابی داؤد" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم من محمد النبی

رسول اللہ الی المومنین ان عضاۃ وج (ارض طائف) وصیدہ لا یعضد من وجد یفعل شیئا من ذالک فانہ یجلد وتنزع ثیابہ وان تعدی ذالک فانہ یؤخذ فیبلغ بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وان ھذا امر النبی محمد وفی رویۃ ان صید وج وعضاھہ حرم محرم للہ۔"

یعنی تمام مومنین کو محمد رسول اللہ کا فرمان ہے کہ وج علاقے سے (باہر کا آدمی) شکار نہیں کر سکتا اور گھاس تک نہیں کاٹ سکتا۔ جو کوئی ایسا کرے گا اس کو سزا دی جائے گی۔

حضرت فاروق اعظمؓ اسی بنیاد پر باتفاق صحابہ رضوان اللہ اجمعین عراق، شام اور مصر کی زمینیں فاتحین میں تقسیم نہ کیں علامہ شبلی نعمانی نے الفاروق طبع لاہور ص ۱۵۸۔ ۱۵۹ میں فرمایا ہے۔

"حضرت عمرؓ نے ان تمام اراضیات کو جو شاہی جاگیر تھیں یا جن پر رومی افسر قابض تھے، باشندگان ملک کے حوالے کر دیا اور بجائے اس کے وہ مسلمان افسروں یا فوجی سرداروں کو عنایت کی جاتیں قاعدہ بنایا کہ مسلمان کسی حالت میں ان زمینوں پر قابض نہیں ہو سکتے۔ یعنی مالکان اراضی کو قیمت دے کر خریدنا چاہیں تو خرید بھی نہیں سکتے۔ یہ قاعدہ ایک مدت تک جاری رہا۔ چنانچہ لیث بن سعدؓ نے مصر میں کچھ زمین مول لی تھی تو بڑے بڑے پیشوایان مذہب مثلاً امام مالک، نافع بن یزید بن لہیعہ نے ان پر سخت اعتراض کیا مقریزی ص ۲۹۵۔ حضرت عمرؓ نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اہل عرب کو جو ان ممالک میں پھیل گئے تھے، زراعت کی ممانعت کر دی۔ چنانچہ فوجی افسروں کے نام احکام بھیج دیئے کہ لوگوں کے روزینے مقرر کر دیئے جائیں اس لئے کوئی زراعت کرنے نہ پائے۔ یہ حکم اس سختی سے دیا گیا کہ شریک غطفی نے مصر میں کچھ زراعت کر لی تو حضرت عمرؓ نے اس کو بلاکر سخت مواخذہ کیا اور فرمایا کہ میں تجھے ایسی سزا دوں گا کہ اور لوگوں کو عبرت ہو۔ (حسن المحاضرہ ص ۹۳)"۔

علامہ یحییٰ بن آدم نے اپنی کتاب الخراج میں متعدد سندوں سے نقل کیا ہے کہ قال عمر بن الخطاب لا تشتروا من عقار اھل الذمہ ولا من بلادھم شیا

یعنی حضرت عمرؓ نے یہ حکم دیا کہ اہل ذمہ سے جائیدادیں یا زمینیں خرید نہ کرو۔ یہ خطاب عربوں کو ہے۔ اہل ذمہ سے مراد عراقی، شامی اور مصری ہیں۔

امام ابو عبیدؒ نے کتاب الاموال مترجم اردو ج ا ص ۱۹۰ میں لکھا ہے کہ۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے قبل از فتح حضرت جریر بن عبداللہؓ سے وعدہ کیا تھا کہ فتح عراق کے بعد وہاں آپ کو کچھ زمین دوں گا اس طرح ہوا چند سال بعد حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا جریرؓ! میں دیکھ رہا ہوں کہ آبادی بڑھ گئی ہے۔ میری رائے کہ وہ زمین ان کو واپس کر دو۔ حضرت جریرؓ نے ایسا کیا حضرت عمرؓ نے اس پر اس کو ۸۰ دینار دیئے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاسی بنیاد پر یہود کو مدینہ سے نکالا۔ اسی طرح حضرت فاروق اعظمؓ نے یہود کو خیبر سے اور نصاریٰ کو نجران سے سیاسی بنیاد پر نکال دیا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے الفاروق ص ۲۱۵ میں فرمایا ہے "غرض یہ تمام امر تاریخی شہادتوں سے قطعاً ثابت ہے کہ عیسائی اور یہودی پولیٹیکل ضرورتوں کی وجہ سے جلاوطن کر دیئے گئے تھے" ۔ علامہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء ص ۹۰ میں فرمایا کہ قال الزھری کان عمر لا یاذن لصبی احتلم فی دخول المدینہ

یعنی حضرت عمرؓ کسی بھی بالغ (اجنبی) کو مدینہ میں (سکونت کے لئے) داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

ان سب سیاسی مسائل کی بنیاد یہ حدیث نبویؐ ہے۔

لا ضرر و لا ضرار فی الاسلام

یعنی اسلام میں انفرادی یا اجتماعی ضرر رسانی جائز نہیں ہے۔ (نہایہ ابن اثیر ج ۳ ص ۸۱)

لوگ کہتے ہیں کہ سندھی بزدل ہیں' فوج میں نہیں آتے۔ کاہل و کاسل ہیں' زمین آباد نہیں کر سکتے۔ عیاش ہیں' سفر سے ڈرتے ہیں' اس لئے دوسرے علاقے میں نوکری نہیں کرتے۔ اگر پنجاب میں اس کے برعکس صلاحیتیں ہیں تو اس میں پنجاب کا کیا قصور ہے؟۔

عزیزو! ۱۸۴۳ء تک سندھ کے پاس اپنی طاقتور فوج تھی۔ لیکن انگریزوں نے ان کی غیرت کو بھانپ لیا تھا۔ اس لئے منصوبہ بندی سے ان کو فوج سے دور رکھا۔ موجودہ فوج کی ذہنی تربیت بھی انگریز فوج نے کی تھی۔ ۱۹۵۷ء تک پاکستانی فوج ان کے کنٹرول میں تھی۔ اس لئے انگریزوں کے جانشین فوجی جنرلوں نے بھی سندھیوں سے وہی سلوک روا رکھا۔ کسی نہ کسی بہانہ سے سندھی نوجوانوں کو فوج سے دور رکھا بلکہ سوتیلی ماں والا سلوک کیا۔ سندھ میں متعین فوجیوں سے پوچھا جا سکتا ہے کہ سندھی فوجی صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں؟ پہلے سندھ کی زمینوں کو آباد کرنے کے لئے پانی کی سہولت نہیں تھی اور بیراج بنتے ہی زمینیں غصب کر لی گئیں اور اس کے ساتھ یہ طعنہ بھی۔ علاوہ ازیں یہ کون سا شرعی یا اخلاقی اصول ہے کہ سادہ یا کمزور آدمی کا گھر بار یا زمین چھین لی جائے۔ اس قسم کی ایک دلیل تو انگریز بہادر بھی دیا کرتے تھے کہ۔ "ہندوستان کے لوگ جاہل اور نا اہل ہیں اس لئے ہم ان پر حکومت کرنے میں حق بجانب ہیں" ۔ کیا ان کا یہ استدلال درست تھا؟ علاقے کا کم علم آدمی باہر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان سے زیادہ مفید ہے' سوائے کسی خاص فن اور ہنر کے۔

سفر سے گھبرانے کی بات بھی غلط ہے۔ بھٹو دور حکومت میں سندھ کے کافی لوگ اسلام آباد میں چھوٹی موٹی نوکری کر رہے تھے۔ اس زمانہ میں اسلام آباد میں سندھ کا کوٹہ نمایاں نظر آتا تھا جن کی بڑی تعداد کو ۱۹۷۷ء کے بعد نکال دیا گیا۔ سندھی سفر سے نہیں گھبراتے' پنجابی افسروں کے ناروا سلوک سے گھبراتے ہیں۔

پنجاب میں یہ تاثر ہے کہ سندھو دیش کے حامی غدار ہیں' ہندوؤں کے ایجنٹ ہیں' کمیونسٹ ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ نظریہ پاکستان کے غدار کون ہیں؟ قرارداد لاہور کی دھجیاں کس نے اڑائیں؟ قوموں سے کیے گئے عہد سے کون منحرف ہوا؟ اگر سندھ نے قرارداد لاہور کے انحراف میں پہل کی ہے

تو واقعی سندھی غدار ہیں اور اگر کسی اور نے انحراف پر انحراف کیا ہے تو غدار وہ ہوئے یا سندھی؟ سندھ آزاد ملک تھا۔ آزاد رہنے کا اس کا حق ہے۔ ایک معاہدہ کے تحت اکٹھے ہوئے تھے۔ اگر وہ معاہدہ پنجاب والوں کو راس نہیں آتا تو معاہدہ ختم بھی ہو سکتا ہے اور کافی حد تک ختم بھی ہو چکا ہے۔ یہ معاہدہ انسانوں کا آپس میں عہد ہے۔ وحی الٰہی تو نہیں۔ ہندوؤں یا کمیونسٹوں کے ایجنٹ ہونے کا طعنہ بنگالی مسلمانوں کو بھی دیا جاتا تھا۔ بلکہ یہاں تک کہا جاتا تھا کہ بنگال کے ایک کروڑ ہندو مسلمانوں کو استعمال کر کے آخر میں مشرقی پاکستان کو اپنا ہندو اسٹیٹ یا ہندوستان کا صوبہ بنانا چاہتے ہیں۔ مگر جب کسی کے تعاون سے بنگلہ دیش بن گیا تو آج تک انتخابات میں وہ ایک کروڑ ہندو نظر نہ آیا' نہ کابینہ میں' نہ حزب اقتدار میں' نہ حزب اختلاف میں۔ آخر وہ کہاں غائب ہو گئے؟ سندھ میں بھی یہی صورتحال ہے۔ اگر آزادی کا مرحلہ آیا تو حزب اقتدار یا حزب اختلاف میں مسلمان ہی مسلمان ہوں گے۔ نہ بنگلہ دیش کسی کا صوبہ بنا نہ سندھ کسی کا صوبہ بنے گا۔ یہ سب چڑانے کی باتیں ہیں۔ اس سے بڑھ کر ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تم غلام بن جاؤ گے۔ تم بھوکوں مر جاؤ گے' بنگالیوں کی طرح' تمہارا پانی پنجاب کے قبضہ میں ہے' تم کیسے جدا ہو سکتے ہو؟۔

اول تو سندھ کی کل آبادی نے علیحدگی کا باقاعدہ فیصلہ نہیں کیا ابھی تک منتظر ہیں کہ شاید پنجاب قرارداد لاہور کی روشنی میں نیا معاہدہ کر کے جدائی کی راہ تک نہیں جانے دے گا اگر پنجاب نے ایسا نہ کیا اور اس کی زیادہ توقع بھی نہیں ہے اور سندھ نے مجبوراً آزادی کا فیصلہ کیا تو معاملات طے کر کے کسی سے تعاون طلب کریں گے۔ علاوہ ازیں غلام تو ہیں ہی' جدوجہد کے ذریعے شاید غلامی سے نجات مل جائے یا غلامی میں کچھ تخفیف ہو جائے۔ ہم تو دیکھ رہے ہیں کہ بنگلہ دیش اپنے نجات دہندوں کا غلام نہیں ہے۔ جہاں تک بنگلہ دیش کی طرح مفلس ہو جانے کا مسئلہ ہے تو اس کے متعلق کچھ کہنے سے بہتر ہے کہ سندھ کی برآمدی' درآمدی اشیا کی تفصیل مرتب کریں تو مسئلہ واضح ہو جائے گا تیل' گیس' کوئلہ' بجلی' کھاد' سیمنٹ' اسٹیل مل کا سامان' شکر' گندم' روئی' کپڑا اور مچھلی وغیرہ بر آمدات کی ایک لمبی فہرست ہے جبکہ در آمدی اشیا میں کچھ مشینری' کاغذ' دودھ' مکھن اور ذبح کے جانور وغیرہ آ جاتے ہیں بندرگاہ کی آمدن اس کے علاوہ ہے۔ اس سلسلہ میں حنیف رامے صاحب کی کتاب "پنجاب کا مقدمہ" کا ایک فقرہ نقل کرتا ہوں۔

"پنجاب بڑا ہے اس کی ضرورت بھی بڑی ہے۔ پنجاب کی نہروں کو تربیلا اور منگلا ڈیموں سے پانی ملتا ہے جو اس کی حدود سے باہر واقع ہیں' پنجاب کو بجلی سرحد اور سندھ سے پہنچتی ہے سوئی گیس بلوچستان آتی ہے۔ آج تو پنجاب پیاز کو رو رہا ہے۔ اگر سندھ ساتھ نہ رہا تو ہر دوسری چیز کو روئے گا۔ کیونکہ سٹیل پلانٹ سمیت ملک کی پچاسی فیصد صنعت کراچی اور اس کے آس پاس واقع ہے اور کراچی کے راستے تمام درآمدات خصوصاً لوہا اور تیل باہر سے آتا ہے"۔

بہرحال یہ طے شدہ امر ہے کہ اگر جدائی ہوئی تو ۱۹۵۵ء کے بعد جتنے حضرات بھی باہر سے آئے ہیں ان سب کو سندھ سے جانا ہو گا۔ وسائل زیادہ ہوں اور افراد مناسب تعداد میں مفلسی کی بات

ماری سمجھ میں نہیں آتی۔ دریائے سندھ واقعی پنجاب سے گزرتا ہے مگر جدائی کی صورت میں ۱۹۴۵ء کے ایگریمنٹ آسانی سے پوری طرح عمل ہو گا۔ کیونکہ پنجاب کو بھی ہماری ضرورت ہو گی بلکہ ہم سے زیادہ اس کو مصالحت کا اشتیاق ہو گا۔

۱۹۵۵ء کی حدبندی کی وجہ یہ ہے کہ سندھ میں نقل مکانی یا یلغار ۱۹۴۷ء میں بھی ہوئی تھی اور ۱۹۵ء کی نقل مکانی کو ہم مجبوری پر محمول کرتے ہیں اور قدیمی باشندگان سندھ اور نوواردان سندھ نے حقائق تسلیم کئے ہیں اور اپنے حقیقی مسائل سمجھے ہیں۔ پرانے سندھیوں نے کلیم میں ملی ہوئی جائیداد اور مینوں کی بات ترک کر دی ہے۔ نئے سندھیوں نے دوسری نقل مکانی کا خیال ترک کر دیا ہے۔ ونوں نے محسوس کیا ہے کہ ۱۹۵۷ء سے لسانی ہنگاموں تک کسی تیسری قوت نے ہمیں آپس میں ڑایا۔ اس قوت نے سندھ کے وسائل پر قبضہ کرنے کے لئے سندھ سے ہی کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا اور سندھ کے دونوں طبقوں کے بیچ میں خلیج پیدا کی۔ کیونکہ ہم اپنے طور پر لڑتے تو ۱۹۴۷ء میں ہی جھ کرتے۔ جس طرح پنجاب والوں نے کسی بھی مہاجر کو سرزمین پنجاب میں اترنے ہی نہ دیا۔ لیکن ۱۹۵ء میں ون یونٹ کی سازش کر کے جو یلغار سندھ پر ہوئی ہے۔ اس میں قطعاً مجبوری نہیں تھی۔ بالعکس استحصال کی نیت سے لوگ آئے اور آرہے ہیں۔ اس لئے سندھ والوں کا فیصلہ ہے کہ ۱۹۵۶ء سے پہلے جس شخص نے بھی سندھ میں مستقل سکونت اختیار کی ہے وہ مقامی ہے اور سندھی ہے۔ اس کے بعد آنے والے ہر شخص کو سندھ سے جانا پڑے گا۔ وہ پنجابی ہو یا پٹھان، کشمیری ہو یا بہاری۔ گر سندھ کو افراد کی ضرورت ہوئی تو ہم عارضی بنیادوں پر افراد طلب کریں گے جن کو سندھ میں ملکیت خرید کرنے کا اختیار نہ ہو گا مقررہ ایام سے زیادہ ٹھہرنے کی اجازت نہ ہو گی۔ جس طرح ۱۹۴۷ء سے پہلے سندھ کے مسلمان پنجاب وغیرہ سے عارضی طور پر افراد کو لے آتے تھے۔

پانی کا معاہدہ ۱۹۴۵ء

اس معاہدہ اور اس کی خلاف ورزی کے ذکر سے پہلے دریائے سندھ کے شرعی اور قانونی حق ملکیت کا ذکر مناسب ہے۔ شرعی اور دینوی دستور ہے کہ القدیم یترک علیٰ اقدم مطلب ہے کہ قدیم زمانے سے موجود پوزیشن معتبر اور حجت ہوتی ہے دریائے سندھ کی قدیم زمانے سے نسبت سندھ سے رہی ہے۔ صرف نام سے نہیں بلکہ حق ملکیت کے اعتبار سے۔ اس لئے تو مطلق العنان بننے سے پہلے پنجاب نے بار بار دریائے سندھ کے پانی استعمال کرنے کی عرضداشتیں دی ہیں۔ شریعت کا دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ دریاؤں کی ملکیت قہر الناس (قبضہ اور کنٹرول) سے ہوتی ہے جس نے پہلے قبضہ کیا وہی اس کا مالک ہے۔ ہدایہ کی کتاب الشرب میں قہر (غلبہ) کو پانی کی ملک خاص کی علت قرار دیا گیا ہے۔ دریائے سندھ پر سب سے پہلے ۱۹۳۵ء میں سکھر بیراج بنا اور ۱۹۴۱ء میں کوٹری بیراج اور گدو بیراج کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ اگرچہ تکمیل کوٹری بیراج کی ۱۹۵۵ء میں اور گدو بیراج کی ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔ اس سے پہلے سندھ پر نہ کوئی بیراج بنا تھا اور نہ کسی بیراج کا منصوبہ تھا قبضہ کے لحاظ سے بھی دریائے سندھ پر اول حق سندھ کا ہے۔

متحدہ پنجاب کو اس کے پانچ دریا چناب، جہلم، راوی، ستلج، بیاس سیراب کرتے تھے۔ اس

کے باوجود ۱۸۷۱ء میں پنجاب نے تھل (کالاباغ) کے قریب سے دریائے سندھ کا پانی استعمال کرنے کی درخواست دی لیکن وائسرائے نے اجازت نہ دی۔ ستمبر ۱۹۱۹ء میں پنجاب گورنمنٹ نے دوبارہ تھل پراجیکٹ منظور کرنے کی درخواست دی لیکن وائسرائے لارڈ جیمس فورڈ نے یہ استدعا بھی رد کر دی۔ سہ بارہ ۱۹۲۵ء میں لارڈ ریڈنگ نے پنجاب کی عرضداشت کو نہایت اہم دلائل سے رد کیا اور صاف لکھا کہ دریائے سندھ 'سندھ کی ملکیت ہے۔ ۱۹۳۶ء میں سندھ بمبئی سے الگ ہو کر جدا صوبہ بن گیا۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۱ء کو گورنر جنرل نے پانی کے مسئلہ پر کلکتہ ہائیکورٹ کے جج بی این رائے کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا۔ صوبہ سندھ کے چیف انجینئر اور صوبہ پنجاب کے چیف انجینئر اس کمیشن کے ممبر تھے۔

۲۸ ستمبر ۱۹۴۵ء کو کمیشن نے ایک سمجھوتہ طے کیا جس پر چیئرمین کے ساتھ دونوں ممبران نے بھی دستخط کئے۔ اس معاہدہ کو "۱۹۴۵ء سندھ پنجاب ایگریمنٹ" کہا جاتا ہے سمجھوتہ کا خلاصہ یہ ہے کہ۔

" دریائے سندھ کے پانی پر پہلا حق سندھ کا ہے سندھ کے تینوں بیراجوں (اس وقت ایک بیراج مکمل ہو چکا تھا اور دو کا منصوبہ بن چکا تھا) کی ضرورت سے پانی زیادہ ہو تو اس کو پنجاب استعمال کر سکتا ہے لیکن اس کے عوض سندھ کو رقم ادا کرے گا۔ پنجاب اپنے پانچ دریاؤں میں سے کسی پر بھی کوئی بھی آبپاشی کا پروگرام بنائے تو اس کے لئے سندھ گورنمنٹ سے منظوری حاصل کرے۔ کیونکہ ان دریاؤں کے پروگرام سے بھی سندھ متاثر ہوگا"۔

پنجاب کے ایک دانشور صاحب نے لکھا ہے۔ "سندھ کے اہلکار ۱۹۷۲ء کے ہنگامی اور عارضی تصفیہ کے علاوہ ۱۹۴۵ء کے ایک معاہدہ کا بھی اکثر و بیشتر ذکر کرتے ہیں حالانکہ ۱۹۴۵ء میں کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سال مرکزی حکومت نے پانی کی تقسیم کے سلسلے میں ایک مسودہ تیار کیا تھا جو کبھی منظور نہیں ہو پایا تھا۔ کیونکہ حکومت پنجاب نے اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا اس ڈرافٹ کو معاہدہ کہنا سراسر زیادتی ہے۔ اس کی کوئی قانونی یا انتظامی حیثیت نہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ پانی کی تقسیم کا یہ معاہدہ دونوں حکومتوں نے منظور کر لیا تھا۔ اس معاہدے کے دو حصے ہیں۔ (۱) پانی کی تقسیم (۲) پانی کے عوض رقم جو کہ پنجاب پر واجب الادا ہوگی۔

پہلا حصہ طے ہو چکا تھا البتہ دوسرے حصے یعنی ہرجانہ کی رقم کے تعین کا فیصلہ کرنا باقی تھا کہ پاکستان بن گیا اور پنجاب سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا۔ لیکن معاہدہ کے فقرہ ۱۵ اور ۱۸ میں صاف لکھا ہوا ہے کہ "اگر رقم کے معاملہ پر اتفاق نہ ہو سکے تو بھی پانی کی یہ تقسیم قطعی اور ہم دونوں صوبوں کو منظور ہے 'البتہ رقم کے معاملے میں کسی کو ثالث بنایا جائے گا"۔

رائے کمیشن نے پنجاب پر دو کروڑ روپیہ پانی کے عوض مقرر کیا تھا۔ خود پنجاب تین کروڑ دینے کو تیار تھا اور سندھ کا مطالبہ چار کروڑ کا تھا۔

یہ دانشور صاحب فرماتے ہیں کہ "۱۹۴۵ء معاہدہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی" حالانکہ پاکستان بننے کے بعد پنجاب نے اپنے ایک دریا پر سندھ گورنمنٹ سے پوچھے بغیر بی ایس لنک نکالی تو مسٹر محمد ہاشم گزدر نے دستور ساز اسمبلی کو "۱۹۴۵ء سندھ پنجاب ایگریمنٹ" کی طرف متوجہ کرتے ہوئے

سخت اعتراض کیا۔ جواباً سنٹرل گورنمنٹ نے سندھ گورنمنٹ کو (بنام مسٹر فاروقی چیف سیکرٹری) ڈی او لیٹر نمبر ۵۳ (۶۷) ۱۹۔ پی مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۵۳ء لکھ کر معافی طلب کی اور لکھا کہ آئندہ اس ایگریمنٹ کا خیال رکھا جائے گا اور سندھ گورنمنٹ سے منظوری حاصل کی جائے گی۔ اس معاہدہ کے منظور کرنے سے کافی عرصہ بعد پنجاب نے اس معاہدہ سے منحرف ہونا شروع کیا اور سندھ سے پوچھے بغیر دولتانہ صاحب اور سردار شوکت حیات نے پنجاب کے تین دریاؤں پر ہندوستان کا کامل حق تسلیم کیا۔ یہ "معاہدہ ۱۹۴۵ء" کی صریح خلاف ورزی تھی۔ انڈیا کے ساتھ مذاکرات میں سندھ گورنمنٹ حائل ہو رہی تھی۔ اس لئے ون یونٹ بنا کر سندھ گورنمنٹ کا وجود ہی ختم کر دیا گیا۔ (یہ بھی ون یونٹ کے محرکات میں سے ایک ہے) انڈیا کو تین دریا بیچ دینے میں پنجاب کا نقصان نہیں ہوا کیونکہ پنجاب کے انقسام سے پانی بھی انقسام ہو گیا لیکن اس کا اثر سندھ پر پڑا کہ دریائے سندھ کے تین معاون دریا منقطع ہو گئے۔ مزید زیادتی یہ کی گئی کہ سندھ دریا پر تربیلا ڈیم کا منصوبہ اور فروخت شدہ دریاؤں کو سندھ دریا سے بہانے کے لئے دو لنک کینال چشمہ لنک کینال اور تونسہ لنک کینال بھی سندھ تا س معاہدہ میں شامل کر دیئے گئے اور سندھ والوں سے پوچھا تک نہ گیا۔ معاہدہ ۱۹۴۵ء کی صریح خلاف ورزی اور سراسر نا انصافی کے باوجود دانش ور صاحب فرماتے ہیں کہ گدو، سکھر اور کوٹری بیراجوں کو پانی دینے سے راوی، ستلج اور بیاس کو دریائے سندھ سے پانی مہیا کرنا مقدم ہے اور یہ کہ ان لنک کینالوں کے اجرا کا تقسیم آب سے کوئی تعلق نہیں۔ شوق سے اپنے دریا بیچ کر دوسروں سے پانی چھیننے کا فلسفہ کم از کم ہم جیسے کم علم لوگوں کے فہم سے بالا ہے۔

پنجاب کے مولوی حضرات فرماتے ہیں کہ پانی جہاں سے آ رہا ہو پہلے وہاں کا حق بنتا ہے۔ وہ لوگ اپنی حاجت پوری کریں تب نیچے والوں کا حق بنتا ہے۔ اس کے لئے یہ حضرات 'حضرت زبیرؓ اور اعرابی کے نزاع الماء میں حضورؐ کے فیصلے کا حوالہ دیتے ہیں۔ حالانکہ پانی کی تین قسمیں ہیں (۱) پانی اوپر والے کی ملکیت ہو نیچے صرف فاضل پانی کی نکاسی ہوتی ہو حضورؐ نے جس قضیہ میں فیصلہ فرمایا وہ اسی قسم کا تھا۔

(۲) پانی نیچے والے کی ملکیت ہو اوپر سے صرف اس کی گزر گاہ ہو۔ ایسا قضیہ حضرت فاروق اعظمؓ کے سامنے پیش ہوا۔ جلیل القدر صحابی حضرت محمد بن مسلمہؓ کی زمین سے ایک شخص کا برساتی نالہ گزرتا تھا۔ اس پر حضرت محمد بن مسلمہ مانع ہوئے۔ تو حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا لو لم اجد له فمسرا الا علی بطنک لامرته

یعنی اگر اس نالے کا گزر تیرے پیٹ پر سے ہوتا تو وہاں سے بھی اس کے گزرنے کا حکم دیتا
(کتاب الخراج لیحیی ابن آدم ص ۱۳۳)

(۳) مشترک نہر جس پر اوپر اور نیچے والوں کا ایک جیسا استحقاق ہو۔ ایسی نہر کے متعلق حضرت امام عبداللہ بن مسعودؓ کا فتویٰ صحیح سند سے ثابت ہے اور آئمہ کا اس پر اجماع ہے۔ "اهل الاسفل من الشرب امراء علی اعلاه حتی یرووا
(کتاب الخراج لابی یوسف ص ۱۰۲)

) نیچے والے اوپر والوں پر حاکم ہیں جب تک وہ پوری طرح سیراب نہ ہوں اور اوپر والے اس کو
عمال نہ کریں تنقیح فتاویٰ حامدیہ جلد ۲ ص ۲۲۵ میں علامہ شامیؒ نے فرمایا ہے۔

منع اهالی الاعلیٰ من السکر فی باطن النهر المشترك حتی یسقی
الاسفل اراضیهم فانه یبدا بهم حتی یروا كما
ح بذلك جمیع ائمة المذاهب فی الكتب المعتبره لقول
سعود رض اهل اسفل النهر امراء علی اهل الاعلی
تی یروا "

مندرجہ بالا شرعی دلائل سے ثابت ہوا کہ دریائے سندھ ' سندھ کی ملکیت ہے۔ ان سے پوچھے
بر کوئی اس میں دخل نہیں دے سکتا' چاہے پانی ان کی ضرورت سے زائد ہی کیوں نہ ہو۔ اگر بالفرض
شترک نہیں بھی ہوتی تو بھی سندھ والوں کی ضرورت پوری ہونے سے پہلے اوپر والوں میں سے کوئی بھی
ں کو روک نہیں سکتا۔

پنجاب شرعی ' اخلاقی اور قانونی تقاضوں کو پس پشت ڈال کر اب تو کالاباغ ڈیم کی منصوبہ بندی کر
ا ہے۔ اگر اس پر عمل شروع کیا گیا تو سندھ کے معتدل اور متحمل مزاج بھی آسانی سے انتہا پسند ہو
یں گے۔ ڈیم کی یہ منصوبہ بندی سندھی قوم کے متحد کرنے کا موثر ذریعہ بنے گی اور اب پنجاب کی
ں حرکت کو سندھ والے اپنی اجتماعی موت سے تعبیر کر رہے ہیں۔ اور ایسا سمجھنے میں غلط بھی نہیں
ں۔ سندھ والے اپنی اجتماعی موت سے بچنے کے لئے کسی بھی اقدام سے نہیں ہچکچائیں گے۔ لازماً
رق یا شمال سے مدد کے طالب ہوں گے۔ مظالم کے طویل سلسلہ کی وجہ سے ذہن تو پہلے ہی بن چکا
ہے۔ مگر چالیس سالہ رفاقت اور دینی اخوت کی وجہ سے معتدل مزاج حضرات کچھ تذبذب میں ہیں۔
لاباغ ڈیم اور سندھ کی کثیر گنجان آبادیوں میں فوجی چھاؤنیوں کی تعمیر سے تذبذب از خود ختم ہو جائے
۔

پنجاب کے سنجیدہ حضرات فرماتے ہیں۔ پوری پنجابی قوم تو ظالم نہیں۔ پنجاب میں بھی کافی لوگ
ظلوم ہیں آپ پوری پنجابی قوم کو مورد الزام کیوں ٹھہراتے ہیں۔

عزیزو! ظلم دو قسم کا ہے۔ ایک ظلم تو دنیا کے ہر خطہ میں موجود ہے۔ سوائے کمیونسٹ ممالک کے
ی سرمایہ دار اور زمیندار کا ظلم مزدور اور کسان وغیرہ پر اس قسم کا ظلم سندھ میں بھی ہے اور یقیناً
نجاب میں بھی ہو گا۔ دوسرا ظلم صرف ہم پر ہو رہا ہے۔ اس قسم کا ظلم پنجاب میں دیکھا تک نہیں ' یعنی
دسرے علاقے کے لوگ حملہ آور ہو کر زمینوں ' کارخانوں ' تجارت ' ملازمت اور تمام کلیدی
عہدوں پر قابض ہو جائیں " سندھ والے اپنے گھر میں اجنبی اور لاچار ہو جائیں ' ہم اس ظلم کی چکی میں
س رہے ہیں ' جب کسی قوم کا بڑا حصہ سامراج بن جائے۔ ظلم پر ظلم کرتا ہے۔ قوم کے باقی افراد اس
پر خوش یا خاموش ہوں تو الزام پوری قوم پر آئے گا۔ ستر قراء کے قتل کی وجہ سے حضورؐ چالیس دن

تک قاتلوں کی قوم پر بد دعا کرتے رہے۔ پوری قوم نے تو قتل نہیں کیا تھا۔ البتہ اس پر خوش یا خاموش ضرور تھی۔ انگریز قوم کو ظالم کہا جاتا تھا، پوری قوم انگریز سے نفرت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ حالانکہ ہندوستان پر غاصب پوری قوم انگریز تو نہیں تھی۔ پنجاب کے ایک حضرت نے مقدمتہ الاغلوطات میں مندرجہ ذیل عبارت میں آخری فقرہ درست لکھا ہے کہ! پنجاب کے نام پر غیر نمائندہ حکومتوں اور اداروں نے سارے صوبوں کے عوام کا استحصال کیا ہے۔ اس میں پنجاب کے عوام بھی شامل ہیں، پنجاب کے عوام بدنام ہیں۔ اس بدنامی کا اگر کوئی جواز ہے تو یہ کہ بدی کو روکنے کی کوشش نہ کرنا بدی میں شامل ہے"۔

پنجابی عوام نے ون یونٹ کی مخالفت نہیں کی سندھ طاس معاہدہ کے خلاف خاموش رہے۔ سندھ کی شاداب و آباد گنجان آبادی میں فوجی چھاؤنیوں کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ کالاباغ ڈیم کی حرکت پر صدائے احتجاج بلند نہیں کی سندھ کو پنجاب کی کالونی بنادیا گیا ہے۔ اس پر پنجابیوں کی مہر لب نہیں ٹوٹی۔ سندھیوں پر فوجی مظالم کو دیکھ کر بھی پنجاب والوں کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔ ایسی صورت حال میں ہم کیسے پوری پنجابی قوم کو مورد الزام نہ ٹھہرائیں،

اب کیا ہو؟

موجودہ سنگین صورت حال کا مداوا ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ اس کا تدارک صرف پنجاب ہی کر سکتا ہے۔ البتہ ہم اس باب میں ان کو مشورہ دے سکتے ہیں،

۱..... قرارداد پاکستان مکمل طور پر ۱۹۵۶ء میں ختم ہو گئی۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے بڑے یونٹ کے الگ ہو جانے سے باقی یونٹوں کو بھی نکل جانے کا جواز مل گیا تھا مگر بھٹو مرحوم نے باقی صوبوں کو ایک نئے میثاق (آئین ۷۳ء) میں جکڑ لیا۔ ۱۹۷۷ء میں وہ میثاق بھی ختم ہو گیا۔ اب ہم بغیر کسی میثاق کے بندوق کے زور پر یکجا جمع ہیں۔ اب چاہئے کہ چاروں صوبوں کے حقیقی نمائندے اکٹھے بیٹھ کر نیا عہد نامہ تیار کریں اور ملک کی از سر نو تشکیل کریں۔

۲..... سندھ رجمنٹ کے تمام افسر اور جوان خالص سندھی نوجوان بھرتی کئے جائیں

۳. ...۱۹۴۵ء کے سندھ پنجاب ایگریمنٹ پر پوری طرح عمل کیا جائے

۴..... ۱۹۵۵ء کے بعد آئے ہوئے تمام غیر سندھی ملازم اور غیر ملازم واپس کئے جائیں اور اس عرصہ میں غیر سندھیوں کے لئے کی گئی زمینوں وغیرہ کی الاٹمنٹ تمام کی تمام منسوخ کی جائیں

محاضراتِ قرآنی

مقبول الرحیم مفتی

رپورتاژ (۱)

نفاذِ شریعت اور علماءِ کرام

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تاسیس کے ٹھیک ایک برس بعد دسمبر ۱۹۷۳ء میں انجمن کے زیر اہتمام جناح ہال لاہور میں پہلی سالانہ قرآن کانفرنس منعقد ہوئی۔ نومبر' دسمبر ۱۹۷۳ء کے میثاق کے مشترکہ شمارے میں "عرض احوال" کے عنوان کے تحت انجمن کے صدر موسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کرتے ہوئے توقع ظاہر کی تھی کہ۔

"یہ کانفرنس انشاء اللہ اس دعوت رجوع الی القرآن کا ایک اہم سنگ میل ثابت ہو گی جس کا بیڑا انجمن خدام القرآن نے اٹھایا ہے اور پھر خدا نے چاہا تو سالانہ قرآن کانفرنس کا یہ سلسلہ نہ صرف یہ کہ لاہور کی سماجی و ثقافتی زندگی کا ایک مستقل نشان بن جائے گا۔ بلکہ انشاء اللہ العزیز ملک بھر کی جملہ دینی سرگرمیوں کے جامع عنوان کی حیثیت اختیار کر لے گا۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز!

اور پھر "میثاق" جنوری ۷۴ء کے مشترکہ شمارے میں موصوف نے کانفرنس کی کامیابی کا اظہار "تذکرہ و تبصرہ" میں جن الفاظ سے کیا تھا وہ بھی اس قابل ہیں کہ یہاں درج کیے جائیں تاکہ قارئین کو اندازہ ہو کہ وہ ابتداء کیا تھی جس کی یہ انتہا ہے۔

" دسمبر ۱۹۷۳ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام پہلی سالانہ قرآن کانفرنس کا انعقاد بہت سے لوگوں کے لئے ایک نہایت خوش آئند تحیر کا موجب بنا اور اس نے انجمن کا تعارف نہ صرف لاہور کے کونے کونے بلکہ ملک کے دور دراز گوشوں تک پہنچا دیا!

............جن حضرات کو اس کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا وہ گواہی دیں گے کہ بحمد اللہ یہ کانفرنس راقم کی توقعات سے کہیں بڑھ کر کامیاب ہوئی اور اسے حاضرین کی تعداد' شرکاء کے ذوق و شوق' اجتماعات کے نظم و ضبط اور مقالوں اور تقریروں کے معیار کے علاوہ حاضرین کے جوش و خروش' کارکنوں کی مستعدی اور حسن انتظام یہاں تک کہ اجتماع گاہ کی تزئین و آرائش غرض ہر اعتبار سے معیاری ہی نہیں مثالی قرار دیا جا سکتا ہے"۔

۱۹۷۳ء سے اب تک اللہ کے فضل سے انجمن کے زیر اہتمام "قرآن کانفرنس" کے نام سے یہ سالانہ اجلاس جنہیں بعد ازاں "محاضرات قرآنی" کا نام دے دیا گیا باقاعدگی سے منعقد ہو رہے

ہیں۔ ان کے انعقاد کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام اور جدید تعلیم یافتہ اہل علم حضرات کو اکٹھے بیٹھ کر ایک دوسرے کے خیالات سننے اور سمجھنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ تاکہ بعد اور دوری کی وہ دیواریں جو دیندار حلقوں کے درمیان اور پھر دیندار حلقوں اور جدید تعلیم یافتہ اہل علم کے درمیان قائم چلی آرہی ہیں انہیں ہٹانے میں مدد ملے۔ انجمن کے بانی صدر ڈاکٹر اسرار احمد نے کانفرنس کے پہلے سال جن امیدوں' آرزوؤں اور توقعات کا اظہار کیا تھا وہ کس حد تک پوری ہوئیں اس کا فیصلہ تو اہل لاہور خود ہی کر سکتے ہیں البتہ راقم الحروف کے نزدیک اتحاد و اتفاق یا کم از کم ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو برداشت کرنے کے حوالے سے ہی سہی ــــــــــــــــ

سترہ برس کی ان کوششوں کے نتیجے میں صرف یہی ہوا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی دعوت پر مختلف مسالک اور مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے معتدل مزاج علماء کرام سال میں ایک بار ایک سٹیج پر بیٹھ کر ایک دوسرے کو سن لیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایسے مکتبہ فکر کے احباب بھی بہرحال موجود ہیں جو اعتدال پسندی کے تمام تر دعوؤں کے باوجود اور بار بار وعدہ کرنے کے بعد بھی اتفاقاً یا ارادتاً محاضرات میں تشریف نہیں لا سکے۔ درحقیقت ہمارے ہاں گروہ بندی اور جماعتی عصبیت کی بنیادیں اتنی گہری اور مضبوط ہیں کہ سترہ سال تک ایک مثال کے موجود ہوتے ہوئے آج تک کسی صاحب علم اور صاحب دل ہستی کو یہ ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اس نہج پر اتحاد و اتفاق کے حصول کی اس تحریک کو اپنے طور پر آگے بڑھانے کی کوشش کرے۔

راقم الحروف کو گزشتہ برس اور اس سال محاضرات کی روداد بغور سننے کا اتفاق ہوا تو اس کے نتیجے میں یہ تاثر اور گہرا ہو گیا کہ ہمارے جدید اور قدیم تعلیم یافتہ حضرات ایک دوسرے کے قریب آنے اور ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے بارے میں قطعاً سنجیدہ نہیں ہیں۔ مزید یہ کہ جملہ دینی مکاتب فکر کے اکابرین اور جدید تعلیم یافتہ اہل علم حضرات کی عظیم اکثریت اپنے اپنے ماحول' تربیت اور نظریات کے حصار میں بری طرح مقید ہے اور ایک دوسرے کے بارے میں شدید ذہنی تحفظات کا شکار ہے۔ ایسی صورتحال میں زندگی کے کسی بھی شعبے میں قومی سطح پر اتحاد و اتفاق کی خواہش بظاہر ایک نیک تمنا کی حیثیت ہی رکھتی ہے جبکہ جمود و سکون اور بے حسی کی اس کیفیت کو بدلنے کے لئے تو بقول حضرت اقبال کسی تلاطم خیز طوفان کی ضرورت ہے۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے!!
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

اور انجمن کے ان سالانہ محاضرات کے اثرات کی مثال تو بالکل کسی بڑے اور پرسکون تالاب میں پھینکی گئی کنکری کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ان دائروں کی سی ہے جو چند ثانیوں کے بعد غائب ہو جاتے ہیں اور سکون کی مستقل کیفیت برقرار رہتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس سلسلے میں مایوسی میں مبتلا ہونے کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ جمود اور بے حسی کی موجودہ کیفیت صدیوں کے تہذیبی عمل کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس کے خلاف ایک طویل مدت تک نتائج سے بے پرواہ ہو کر صبر اور استقلال سے نبرد آزما ہونے کی ضرورت ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ ابتداً ہمیں ہماری کوششیں نتائج کے اعتبار سے کمتر یا بے سود محسوس ہوں لیکن ایک وقت آنے پر انشاء اللہ ان کے نتائج و اثرات معاشرے پر مرتب

تے ہوئے نظر بھی آئیں گے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

اس سال اگرچہ عملاً محاضرات منعقد کرنے کا فیصلہ انتہائی تاخیر سے یعنی مارچ کے بھی دوسرے ہفتے میں کیا گیا لیکن اللہ کی تائید و نصرت سے اتنی مختصر تیاری کے باوجود تین دن کا پروگرام مقررین و سامعین دونوں کی شرکت کے اعتبار سے کامیاب اور بھرپور رہا۔

یکم اپریل کو محاضرات کے پہلے دن مذاکرے کا عنوان "پاکستان میں نفاذ شریعت اور اس کے مسائل" تھا۔ نشست کی صدارت متحدہ شریعت محاذ کے سینئر نائب صدر، بریلوی مکتب فکر کے معروف عالم دین اور اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن مولانا مفتی محمد حسین نعیمی نے فرمائی۔ مذاکرے کا آغاز ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے سورہ مائدہ کے چھٹے رکوع کی تلاوت سے کیا۔ اور کہا کہ ان مذاکرات میں رسمی انداز سے محض تبرک کے طور پر قرآن حکیم کی تلاوت کی بجائے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہر روز کچھ منتخب آیات کا مفہوم آپ حضرات کے سامنے پیش کروں تاکہ قرآن کے ساتھ ہمارے تعلق میں اضافہ ہو۔ سورہ مائدہ کا چھٹا رکوع جو بلاشبہ نفاذ شریعت کا عنوان ہے اور قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود اس کے احکام کو نافذ نہ کرنے والوں کے لئے ایک زبردست تنبیہ کا مضمون اپنے اندر رکھتا ہے، اس کے تناظر میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے وضاحت کی کہ آج کے مذاکرے کا عنوان "شریعت بل" نہیں ہے بلکہ "حکم بما انزل اللہ" یعنی اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت اور شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا ہماری گفتگو کا موضوع ہے۔ شریعت بل تو نفاذ شریعت کی کوششوں کی ایک ظاہری صورت ہے اور درحقیقت وہی آج کل مختلف مذہبی مسالک کے درمیان وجہ نزاع ہے۔ گزشتہ دنوں "جنگ" فورم میں گفتگو کے دوران بھی یہ بات نکھر کر سامنے آئی تھی کہ شریعت کے نافذ کرنے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ اختلاف صرف اس بل کی دفعات اور کچھ الفاظ کو آگے پیچھے کرنے میں ہے۔ آزادی سے قبل اگرچہ انگریز کا اقتدار بھی ہمارے قومی جرائم کی سزا کے طور پر ہم پر مسلط ہوا تھا لیکن غلامی کا عذر بہرحال ہمارے پاس موجود تھا مگر اب آزادی کے چالیس سال گزرنے کے بعد تو نفاذ شریعت کا کام ہماری قومی ذمہ داری بن چکا ہے۔ جو لوگ حکومت میں ہیں اور جو حکومت سے باہر ہیں بحیثیت مسلمان سب کا فرض ہے کہ وہ دین کو نافذ کرنے کی کوشش کریں۔ اگر ہم اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کریں گے تو "قانونی ایمان" سے قطع نظر خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والوں کے بارے میں قرآن سے تین حکم ثابت ہیں ایک یہ کہ وہ کافر ہیں دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ توحید فی الحکم توحید کا اہم ترین شعبہ ہے۔ حاکمیت مطلقہ صرف اللہ کی ذات کے لئے مختص ہے۔ بقول اقبال

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری!!!!

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی اللہ کے رسول ہونے کی حیثیت سے اللہ کے اذن سے کی

جاتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

(سورہ النساء آیت ۶۴)

ترجمہ: اور ہم نے کبھی کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس واسطے کہ اللہ کے حکم سے اسکی تابعداری کی جائے

نفاذ شریعت کا اور شریعت بل کا بھی یہی مقصد ہے کہ اس ملک میں اللہ کا حکم اور اس کا عطا کیا ہوا قانون بالفعل بالاتر تسلیم کر لیا جائے۔ چونکہ یہ ہماری مجموعی ذمہ داری ہے اس لئے آج کی نشست میں ' میں نے شریعت بل کی حمائت یا مخالفت کو معیار نہیں بنایا اور ان معزز و محترم ہستیوں کو بھی دعوت دی ہے جو شریعت بل سے اختلاف رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا مقالہ جمعیت علمائے اسلام (مولانا فضل الرحمٰن گروپ) کے امیر مولانا حامد میاں مدظلہ العالی کا تھا۔ مولانا حامد میاں چونکہ اپنے اوپر خود عائد کردہ پابندی کی وجہ سے کسی تقریب میں شریک نہیں ہوتے اس لئے ان کا مقالہ ان کے صاحبزادے مولانا رشید میاں نے پڑھ کر سنایا۔ مولانا کا یہ مقالہ انشاءاللہ "میثاق" کی کسی قریبی اشاعت میں من وعن شائع کیا جائے گا۔ سردست اس کا خلاصہ اہم نکات کی صورت میں نذر قارئین ہے۔

(۱)...... جس شخص نے اسلامی نظام کے نام پر حکومت سنبھالی اور اسلام کے نام پر ریفرنڈم کروایا وہ بیک جنبش قلم اسلام کو نافذ کر سکتا تھا۔ اب اس نے عوام کی توجہ اپنی طرف سے ہٹانے کے لئے ساری ذمہ داری اسمبلی پر ڈال دی ہے۔

(۲)...... ہمارے فوجی حکمران اور ان کی قائم کردہ بے اختیار اسمبلیاں اس لئے اسلام نافذ نہیں کر چاہتیں کہ اسلام کا نظام ان کی مطلق العنانی کو قائم نہیں رہنے دے گا۔

(۳)...... اسلام نافذ کرنے کا سیدھا راستہ یہ ہے کہ حکومت اپنے اس مسلک کا اعلان کرے کہ مملکت کا قانون فقہ حنفی پر مبنی ہوگا۔

(۴)...... غیر مقلد اور فقہ جعفریہ کے پیروکاروں کے لئے ان کی اکثریت والی بستیوں میں ان کے مسلک کے قاضی اور مفتی تعینات کر دیئے جائیں۔

(۵)...... فقہ حنفی میں دور جدید کے تمام معاملات و مسائل حل کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے کیونکہ یہ اس صدی کے اوائل تک خلافت عثمانیہ کے طول و عرض میں قانون کے طور پر رائج رہا ہے۔ ابھی حال ہی میں جنرل نمیری نے سوڈان میں شرعی قوانین کے نفاذ کا اعلان کیا تو انہوں نے فقہ حنفی پر قوانین نافذ کئے حالانکہ وہاں اکثریت فقہ مالکی کے ماننے والوں کی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں مالکی علماء و قضاۃ بھی حنفی فقہ کے مطابق فیصلے کرنے کے عادی تھے اس لئے انہوں نے فقہ حنفی ہی کو ترجیح دی۔

(۶)...... ہندوستان کے حنفی علماء جدید دور کے مسائل پر بحث و گفتگو کر کے ہر معاملے پر اپنی رائے قائم کرتے رہتے ہیں اس لئے اختلاف پیدا نہیں ہوتا اور جدید عہد کے مسائل بھی حل ہوتے

آ رہے ہیں۔ یہ بات الگ ہے ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس سے واقف نہیں۔

(۷)...... قدیم دور سے اسلامی حکومتوں میں یہ اصول چلا آ رہا ہے کہ قاضی اپنے مسلک کے مطابق فیصلہ کرے گا وہ فریقین مقدمہ کے مسلک یا مسالک کا پابند نہ ہو گا۔ ہم آج بھی اس اصول کو اختیار کر سکتے ہیں۔

(۸)...... اسلام کا نظام تدریجاً نفذ نہیں ہو سکتا۔ انگریز کے بنائے ہوئے مجموعہ تعزیرات ہند اور قانون شریعت کا ایک ساتھ چلنا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اسلامی شریعت کی روح فوری انصاف فراہم کر کے معاشرے کو جرم سے پاک کرنا ہے جبکہ انگریزی قانون کا مقصد غلام قوم کو آپس کے جھگڑوں میں پھنسائے رکھنا ہے۔

(۹)...... فقہ حنفی کا مدون شدہ قانون ترجمہ کر کے موجودہ عدلیہ کے حوالے کر دیا جائے تو وہ اس پر اسی طرح عمل کر سکتی ہے جیسے انگریزی قانون پر عمل کر رہی ہے۔ کرسیوں اور ملازمتوں کے حوالے سے علماء کرام قطعاً کسی کے حریف نہیں۔

(۱۰)...... ہمارا ملک صوبائی عصبیت کی لپیٹ میں ہے۔ اسلام کا نام لینا اور اس پر عمل نہ کرنا ایک بے کشش فریب ہے۔ صوبوں کے احساس محرومی کا علاج اسلامی اصول اقتصادیات اور دیگر قوانین اسلام پر عمل کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔

(۱۱)...... ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت اسلام سے ناواقفیت کی وجہ سے غیر اسلامی نظریات سے متاثر ہے۔ اگر انہیں سمجھایا جائے تو مخلص لوگ بات سمجھ جاتے ہیں اور اصلاح قبول کرتے ہیں۔

مولانا حامد میاں نے اپنے مقالے میں در حقیقت اپنے اسی جماعتی موقف کا اظہار کیا ہے جس کا اعلان چھ مارچ کو آئین شریعت کانفرنس میں مولانا فضل الرحمٰن کر چکے ہیں۔ اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمتہ اللہ علیہ کی قیادت و رہنمائی میں قائم ہونے والی جمعیت علمائے اسلام کے موجودہ شکل اختیار کرنے تک علمائے دیو بند میں خواہ کتنے ہی اختلافات رہے ہوں اور انکی تنظیموں نے شکست و ریخت اور تقسیم وانتشار کی کتنی ہی اذیتیں برداشت کی ہوں، ان کے کسی گروہ نے آج تک وہ موقف کبھی اختیار نہیں کیا جو سیاسی وجوہ کی بنا پر نفاذ شریعت کے مطالبے کے جواب میں جمعیت علمائے اسلام (مولانا فضل الرحمٰن گروپ) نے اختیار کیا ہے۔

پاکستان میں جب کبھی بھی اللہ کے دین کا نفاذ ہو گا یہاں بسنے والے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کے فقہی مسلک کو نظر انداز کرنا کسی کے بس میں نہیں ہو گا۔ ایک ایسی اٹل حقیقت کو وجہ نزاع بنا کر علماء کے اتحاد کو متاثر کرنا کسی طور بھی مستحسن نظر نہیں آتا۔

اس نشست کے دو مقررین یعنی مولانا شاہ بدیع الدین راشدی اور مولانا عبدالرحمٰن مدنی کا تعلق اہل حدیث مسلک سے تھا اس لئے نتیجتاً گفتگو کا رخ بالکل بدل گیا اور بجائے اس کے کہ نفاذ شریعت کے مسئلے پر بحث ہو خود نفس شریعت پر بحث شروع ہو گئی مولانا عبدالرحمٰن مدنی مدیر ہفت روزہ محدث کی تقریر بھی اسی نقطے پر مرکوز رہی کہ فقہی اختلافات کا حل کیسے ممکن ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ نفاذ شریعت کے مخالف طبقوں کے ہاتھ میں سب سے بڑا ہتھیار ہی ہمارے فقہی اختلافات ہیں۔

اس موقع پر اقلیت و اکثریت کے فقہ کی بات کر کے ہم ان کی سازشوں کو کامیاب کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔ قرآن وسنت ساری امت کی مشترک متاع ہے اور اسی کو بنیاد بنا کر شریعت کو نافذ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن وسنت کے مقابلے میں کسی خاص فقہ کا نام لینے کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ کی فقہ قرآن وسنت سے بالاتر یا اس سے باہر کی کوئی چیز ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تمام فقہیں قرآن وسنت سے ہی ماخوذ ہیں' اور ہمارا مشترک سرمایہ ہیں۔ جب قرآن وسنت کے نفاذ کا مرحلہ آئے گا تو ہم انہی سے رہنمائی حاصل کریں گے۔ ملک کے موجودہ قوانین کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا عبدالرحمٰن مدنی نے یہ دلیل پیش کی کہ چونکہ ہمارے ملک میں کسی فرقے کی بنیاد پر الیکشن میں حصہ لینا ممنوع ہے اور اعلیٰ حکومتی عہدوں یعنی صدر وزیراعظم اور وزراء اعلیٰ کی تقرریوں کے سلسلے میں بھی کبھی یہ نہیں دیکھا گیا کہ ان کا تعلق کس مکتب فکر سے ہے اس لئے نفاذ شریعت میں بھی ہمیں ان اختلافات کو رکاوٹ نہیں بنانا چاہئے۔ انہوں نے شریعت بل کے محرکین کی توجہ ایک نہایت اہم مسئلے کی طرف دلاتے ہوئے کہا کہ ابتداً شریعت محاذ میں یہ متفقہ ترمیم طے کی گئی تھی کہ ملک کا بنیادی قانون قرآن وسنت ہو گا اور اس کی تعبیر کے لئے فقہا کی آراء سے رہنمائی حاصل کی جائے گی۔ لیکن اخباری اطلاعات کے مطابق ان الفاظ کو تبدیل کر کے جو ترمیم داخل کی گئی ہے اس میں کہا گیا ہے "قرآن وسنت کی تعبیر مندرجہ ذیل ماخذ سے حاصل کی جائے گی"۔ الفاظ کے اس معمولی ردوبدل سے فقہی ماخذ کو قرآن وسنت کی جگہ حاصل ہو گئی ہے۔ اس کی بہت سی تاویلیں کی جا سکتی ہیں لیکن بہرحال الفاظ کا یہ ردوبدل مخالفین کے ہاتھ میں خود ایک ہتھیار فراہم کرنے کے مترادف ہے۔ سرکاری بنچوں کی طرف سے شریعت بل میں داخل کی گئی ترامیم پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا مدنی نے کہا کہ ان ترامیم میں اصول اسلام کی جگہ اصول احکام کو بنیاد بنا کر اس فکر کی نمائندگی کی جا رہی ہیں جس کے بانی غلام احمد پرویز ہیں۔ اصول اسلام کی بجائے اصول احکام کی بات بھی امت کو متحد کرنے کی بجائے انتشار کی طرف لے جانے والی چیز ہے۔

مولانا عبدالرحمن مدنی کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مولانا فداء الرحمٰن درخواستی کو دعوت خطاب دیتے ہوئے کہا کہ میری خواہش تو یہ تھی جس طرح اس سے پہلے ان محاضرات میں مولانا شمس الحق افغانی رحمتہ اللہ علیہ' مولانا یوسف بنوری رحمتہ اللہ علیہ اور مولانا حافظ گوندلوی رحمتہ اللہ علیہ جیسی عظیم اور بابرکت شخصیات شرکت فرماتی رہی ہیں اسی طرح اس دفعہ ہم حضرت مولانا عبداللہ درخواستی مدظلہ العالی کو زحمت دیتے لیکن ان کی صحت کی وجہ سے میں نے زیادہ اصرار بھی مناسب نہیں سمجھا۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولانا فداء الرحمٰن درخواستی سے حال ہی میں نفاذ شریعت کی مہم کے دوران تعارف ہوا ہے میں نے آج تک ان جیسا ان تھک کارکن اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔

مولانا درخواستی نے دو اختلافی تقاریر کے تناظر میں بڑے رقت آمیز انداز میں علامہ اقبال کے اس شعر سے اپنے خطاب کا آغاز کیا کہ ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

انہوں نے کہا کہ اس ملک میں نفاذ شریعت کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں کا آپس
اختلاف ہے۔ ہم عموماً شریعت نافذ نہ کرنے کا مجرم حکمرانوں کو ٹھہراتے ہیں لیکن حقیقت میں
خود بھی بہت بڑے مجرم ہیں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر شخص کو اپنے اپنے دائرے میں حاکم اور
ول ٹھہراتے ہوئے خبردار فرمایا ہے کہ ہر شخص سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔
نے اپنے اپنے دائرہ اختیار میں اپنی ذات پر اپنے اہل وعیال پر اپنے ملازمین اور ماتحتوں پر کبھی
ریعت نافذ کرنے کی کوشش کی ہے؟ خود احتسابی کے حوالے سے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے
لانا درخواستی نے ایمان اور اسلام دونوں کو نفاذ شریعت کے لئے لازم وملزوم قرار دیتے ہوئے کہا کہ ہم
اسلام کا ظاہری ڈھانچہ تو کسی حد تک برقرار رکھا ہوا ہے لیکن ایمان کو رخصت کر دیا ہے حالانکہ
آن کا ارشاد ہے کہ'

انتم الاعلون ان کنتم مومنین تم ہی سربلند ہو گے اگر تم ایمان دار ہو۔

نہیں فرمایا کہ اگر تم مسلمان ہو۔ لیکن ہم آج دلوں کو ایمان سے خالی کرنے والی ساری بیماریوں
نی تکبر' بغض' حسد' عناد اور دنیا پرستی میں مبتلا ہیں۔ یہ فقہی مسالک پر اختلاف کی باتیں بھی انہیں
ل کی بیماریوں کا نتیجہ ہیں۔ یہ وقت ان اختلافات کو ابھارنے کا نہیں۔ اگر ہم کامیابی حاصل کرنا
اہتے ہیں تو ایمان اور اتحاد کے ساتھ غور وفکر اور تدبر سے جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔
اس کے بعد اس نشست کے مہمان خصوصی اہلحدیث مکتب فکر کے جید عالم اور سندھ کے ایک
وحانی اور علمی خانوادے کے چشم وچراغ مولانا شاہ بدیع الدین راشدی پیر آف جھنڈا خطاب کے لئے
ریف لائے۔ مولانا راشدی مجاہدانہ کردار اور مجتہدانہ دینی بصیرت کی حامل شخصیت ہیں۔ انہوں
نے اپنے ایک گھنٹے کے انتہائی مدلل اور مرتب خطاب میں قرآن وحدیث کے حوالوں سے دین کی اصل
ر شریعت کی بنیاد کے بارے میں بحث کی۔ قرآنی آیات اور احادیث کے متن اور حوالے ان کی زبان
سے اس طرح ادا ہو رہے تھے جیسے تمام کتب ان کے سامنے کھلی رکھی ہوں اور وہ پڑھ کر سنا رہے
وں۔ مولانا راشدی کی تقریر کا مرکزی خیال یہ تھا کہ اللہ نے حضور پر قرآن نازل کیا اور آپ نے اپنی
یات مبارکہ میں اس پر عمل کر کے دکھایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے ساتھ دین مکمل ہو
یا ہے۔ اس لئے دین کی بنیاد قرآن اور سنت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی ہمارے اسلاف نے اپنے
نے زمانے میں قرآن اور سنت کی جو تعبیریں کیں یعنی جو فقہیں مرتب کیں وہ ہمارا سرمایہ ہیں ہم ان
سے رہنمائی لیں گے لیکن قانون اسلام کی بنیاد قرآن وسنت کے سوا کسی اور شے کو نہیں بنایا جا سکتا۔
شریعت بل کے محرک سینٹر مولانا قاضی عبداللطیف تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو وقت کافی گزر
کا تھا۔ انہوں نے سامعین کے صبر کا زیادہ امتحان نہیں لیا۔ مختصر وقت میں اپنی ساری جدوجہد کی
استان کہہ کر رخصت ہوئے۔ قاضی صاحب کہہ رہے تھے کہ سب لوگ مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ
موجودہ نظام ظالمانہ ہے عوام کے مسائل حل نہیں کر سکتا لیکن کوئی اس نظام کو بدلنے پر آمادہ نہیں۔
حکمران طبقہ تو اسلام کی طرف آنے کا کوئی ارادہ ہی نہیں رکھتا۔ اس مشکل صورت حال کے باوجود ہم اپنا
فرض ادا کرتے رہیں گے کیونکہ یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے کہ ہم اس نظام کو بدلنے کے لئے جدوجہد

کریں تاکہ اللہ کا دین غالب ہو سکے۔ البتہ ہم اس بات کے مکلّف نہیں کہ اسلام کو لا کر ہی چھوڑیں۔ ہمارا کام مزدوری کرنا ہے ہم ٹھیکیدار نہیں ہیں۔ نتائج مرتب کرنا مسبب الاسباب کا کام ہے۔ قاضی صاحب نے یہ حقیقت بالکل واضح کر دی کہ ہمارا مقابلہ دینی جماعتوں سے نہیں بلکہ سیکولر جماعتوں سے ہے۔ ہمیں آپس میں لڑ کر اپنی قوتوں کو ضائع نہیں کرنا۔ قاضی صاحب نے کہا کہ دین میں اجتہاد کی گنجائش ہے لیکن انگوٹھا لگانے والوں کو اجتہاد کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ اجتہاد وہی کریں گے جو اس کے اہل ہوں گے۔

مولانا قاضی عبداللطیف صاحب کے خطاب کے بعد ڈاکٹر اسرار صاحب نے اگلے روز کے پروگرام کے اعلانات کئے اور صدر جلسہ مولانا مفتی محمد حسین نعیمی صاحب کو صدارتی کلمات کہنے کے لئے دعوت دی۔ مفتی نعیمی صاحب متحدہ محاذ کے جلسوں کی صدارت کرتے کرتے دریا کو کوزے میں بند کرنے ماہر ہو گئے ہیں۔ انہوں نے چند فقروں میں ساری بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا کہ شریعت بل پیش کرنے والوں نے یہ بل پیش کر کے علماء کرام حکمرانوں اور عوام الناس تینوں کو امتحان میں ڈال دیا ہے۔ علماء کرام کو چاہئے کہ وہ اپنی ذاتی انا اور مسلک کے تشخص سے بالاتر ہو کر نفاذ دین کے لئے جدوجہد کریں۔ اب اسلام کے ساتھ ہمارے تعلق کا امتحان ہے۔ قربانیوں کا وقت آنے والا ہے ہم قربانیاں دیں گے تو کامیابی ہو گی۔ نفاذ شریعت کا معاملہ پوری امت کا معاملہ ہے۔ اس جدوجہد میں جو ہمارا ساتھ دے گا وہ ہمارا دوست ہے اور جو رکاوٹ ڈالے گا اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں خواہ وہ کوئی بھی ہو اور ہمارا کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہو۔ مولانا مفتی محمد حسین نعیمی صاحب کے خطاب کے ساتھ ہی یہ نشست رات گیارہ بجے کے قریب اپنے اختتام کو پہنچی۔

جمعہ تین اپریل کو باغ جناح میں خطاب جمع کے دوران ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس نشست میں سامنے آنے والے اختلافات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ میں مولانا عبدالستار خان نیازی مدظلہ کا انتہائی احترام کرتا ہوں بیعت کے مسئلے میں اور کئی دیگر علمی معاملات میں انہوں نے جس طرح دلائل کے ساتھ میرا ساتھ دیا تھا اس سب کچھ کے باوجود میں ان کی خدمت میں بصد احترام عرض کروں گا کہ ۷۳ کے دستور کی بحالی کی جدوجہد میں شریک ہونے کے بعد صرف ان کا شریعت بل کے جواب میں فقہ حنفی کے نفاذ کا مطالبہ کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا کیونکہ ۷۳ کے دستور میں بھی قرآن و سنت کو ہی قانون سازی کی بنیاد قرار دیا گیا ہے اس میں کسی فقہ کا ذکر نہیں۔ البتہ نفاذ اسلام سے انحراف کے کئی دروازے کھلے رکھے گئے ہیں جنہیں بند کرنے کے لئے یہ شریعت بل پیش کیا گیا ہے' اگر ہم اپنے اپنے مسلکوں کے اختلاف پر اسی شدت کے ساتھ ڈٹے رہے تو ہمارا اتحاد بھی بے معنی ہو گا۔ قرآن و سنت سے براہ راست استنباط کرتے ہوئے آج کے مسائل کا حل تلاش کرنا بھی اسی طرح درست ہے جس طرح کسی فقہی مسلک کی فقہ کو نافذ کرنا درست ہے۔ کیونکہ تمام فقہی مسالک کی بنیاد بھی قرآن و سنت ہی ہے۔ سیکولرزم یا کسی کافرانہ نظام کے مقابلے میں بہرحال فقہ حنفی یا فقہ مالکی یا کسی بھی فقہ پر مبنی نظام اسلامی ہی ہے۔ اگر مجھے اختیار دیا جائے کہ تم سیکولر نظام یا فقہ حنفی یا مالکی نظام والے ملکوں میں سے کس ملک میں رہنا پسند کرو گے تو میں بلا ادنیٰ تردد فقہ حنفی یا کسی بھی اسلامی فقہ والے ملک میں رہنے کو ترجیح دوں گا۔ ⟵

آیتِ کریمہ کی فضیلت
اور
اُس کا تاریخی پس منظر

مولانا اخلاق حسین قاسمی

حضرت یُونس علیہ السلام کو جب ان کی قوم نے بہت پریشان کیا تو وحی آئی کہ انہیں خدا کے عذاب سے ڈراؤ تاکہ یہ نافرمانی سے باز آئیں ۔ حضرت یونسؑ نے غصہ وجذبات میں آکر اپنی طرف سے چالیس دن کی مدّت بھی مقرر کر دی اور یہ بات مشیّتِ الٰہی کے خلاف تھی ۔ خدا تعالیٰ کی سنّت یہ ہے کہ وہ نافرمان بندوں سے ناراض ہونے میں جلدی نہیں کرتا البتہ نیک بندوں پر مہربانی کرنے میں جلدی کرتا ہے حدیث قدسی ہے ۔

ان رحمتی سبقت — میری رحمت میرے غضب سے آگے
علیٰ غضبی — رہتی ہے ، سبقت لے جاتی ہے ۔

پیغمبر کو اپنے مالک کے ارشارہ کو سمجھنا چاہیئے ، حضرت یُونسؑ کا اتنا غصہ مناسب نہیں تھا ، وحی آئی کہ تم نے اے یونسؑ ! مدّت عذاب مقرر کر کے غلطی کی ،
اب خدا کے پیغمبر کو احساس ہوا کہ مجھے قوم کے سامنے شرمندگی اُٹھانی پڑے گی ، لوگ کہیں گے ، یہ کیسے پیغمبر ہیں ، کہ ان کی بات جھوٹی نکلی ،
اس احساس ندامت میں یہ گھر سے نکل کھڑے ہوتے ، دریا کے کنارے پہنچے ، وہاں ایک کشتی تیار کھڑی تھی ، اس میں بیٹھ گئے قدرت خداوندی کا کرشمہ یہ ہوا کہ وہ کشتی بھنور میں آگئی ، وہ دور آقائی اور غلامی کا دور تھا اور لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اگر کسی کا غلام بھاگ کر کشتی میں آجاتے تو ساری کشتی ڈوب جاتی ہے سوال پیدا ہوا کہ کشتی میں غلام کون ہے ؟ — قرعہ اندازی کی گئی اور اسمیں حضرت یونسؑ کا نام نکل آیا ،

حضرت یونسؑ دستور کے مطابق دریا میں کُود پڑے۔ خدا کی طرف سے ایک مچھلی
حکم ہوا کہ وہ یُونسؑ کو لقمہ بنالے۔

حضرت یونسؑ سے مدّت عذاب کی تعیین میں غلطی ضرور ہوئی تھی لیکن یہ غلطی بھی
نفس کی خاطر نہیں کی گئی تھی، بلکہ خدا کے نافرمان بندوں پر غصّہ تھا، اور خدا کے
غصّہ تھا، اس لئے خدا اپنے پیغمبر کو ہلاک نہیں کرسکتا تھا ——
یہ صحیح ہے کہ اس نے اپنے رسُول کے قول کی لاج رکھنے کے لئے اپنے رحم
کی سُنّت کو نہیں بدلا،

اس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالےٰ کو رحم و کرم اتنا پیارا ہے کہ اپنے مقبول بندو
کی ناخوشی کو گوارا کرلیتا ہے مگر رحم و کرم کی اپنی ادائے خاص کو نہیں چھوڑتا۔ ا
ایک ہی صورت تھی کہ رب کریم اپنی ادائے کرم کو بھی قائم رکھے اور اپنے مقبو
بندہ کو بھی ضائع نہ ہونے دے، —— چنانچہ ایسا ہی ہوا قرآن کریم نے حضرت
کے قصّہ کا آغاز محبت بھرے استعارے سے کیا اس استعارہ میں سارا واقعہ
کردیا —— مچھلی والے —— حضرت یونسؑ کا لقب پڑ گیا، —— اس لقب میں جس
کا اظہار کیا وہ خدا کو بہت پسند تھی —— فرمایا

وَذَاالنُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ	اور مچھلی والا، جب اپنی قوم سے
مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ	ناراض ہو کر چلا اور اس نے یہ خیال
نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي	کیا کہ ہم اسے پکڑ نہیں سکیں گے
الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ	پھر اس نے ہمیں اندھیروں کے
اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ	اندر پکارا۔ لا الٰہ الا الخ
مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝	

(الانبیاء ۸۷)

یہ انتہائی تعلق کا پیرایہ ہے کہ خدا تعالےٰ ایک خاص لقب سے اپنے بندہ کو
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مزمّل اور مدّثر کے القاب سے پکارا اور ان دونوں اسنا
میں حضورؐ کی وہ خاص حالت بیان کی جو خدا کے نزدیک بہت پسندیدہ تھی —— آ
چادر اوڑھ کر غور و فکر کرتے تھے، انسان جب سوچ وچار کرتا ہے تو چادر

لیتا ہے — اس لئے خدا تعالیٰ نے اسی صفت سے پکارا — او میاں چادر اوڑھنے والے

سورۃ الصافات میں حضرت یونسؑ کے قصہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

فَالْتَقَمَهُ الْحُوتُ وَهُوَ مُلِيمٌ	یونسؑ کو مچھلی نے لقمہ بنالیا اور وہ
فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ	شرمندہ تھا۔ پھر اگر وہ تسبیح کرنے
الْمُسَبِّحِينَ لَلَبِثَ فِي بَطْنِهِ	والوں میں سے نہ ہوتا تو قیامت
إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ (۱۴۴)	تک اسی کے پیٹ میں پڑا رہتا
فَنَبَذْنَاهُ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ	پھر ہم نے اسے ایک چٹیل میدان میں
سَقِيمٌ وَأَنْبَتْنَا عَلَيْهِ	ڈالدیا اور وہ اس وقت بہت کمزور
شَجَرَةً مِنْ يَقْطِينٍ	تھا، اور اس پر ایک بیل والا درخت
(۱۴۶)	اُگادیا۔

بیان کا پیرایہ کس قدر محبت بھرا ہے، لقمہ بنانے کی نسبت مچھلی کی طرف کی اور باہر ڈالنے کی نسبت اپنی طرف کی، مچھلی کے لقمہ بنانے تک معاملہ آزمائش کا تھا، اس لئے خود پردہ میں رہے مچھلی کے اندر جب یونسؑ کی عبدیت نے جوش مارا تو اب پیار و محبت کا دور شروع ہوگیا اور رب کریم سامنے آگیا۔

محبت کی راہ میں قدم قدم پر آزمائشیں آتی ہیں اور ہر آزمائش کی بے چینی اور بے قراری سے محبوب لطف اندوز ہوتا ہے —— مگر ایک منزل وہ بھی آتی ہے کہ عاشق کی آہ و پکار سے محبوب کا دل پگھل جاتا ہے اور وہ بے قرار ہو کر یہ دعا کرنے لگتا ہے

فغانِ مجنوں کی سن سن کر دعا کرتی تھی یہ لیلےٰ

بس اب کم یا الٰہی قیس کا دردِ جگر کردے

پھر وہ رب کریم جب اپنے خاص بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے تو اس حالت میں بھی وہ انہیں تنہا نہیں چھوڑتا بلکہ ان کے ساتھ رہتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ سے کہا فرعون کے پاس میرا پیغام لے کر جاؤ، وہ بولے،

قَالَا رَبَّنَا إِنَّنَا نَخَافُ أَنْ يَفْرُطَ	اے ہمارے رب! ہمیں اندیشہ ہے
عَلَيْنَا أَوْ أَنْ يَطْغَىٰ	کہ وہ ہم پر غصہ ہوگا، بھبک پڑیگا
	اور سرکشی اختیار کرے گا۔

قَالَ لَا تَخَافَا اِنَّنِیْ مَعَکُمَا ـــ جواب دیا، خوف نہ کرو، میں تمہارے ساتھ رہوں گا، سب کچھ سنتا رہونگا
اَسْمَعُ وَاَرٰی (طٰہٰ) اور تمام حالات دیکھتا رہوں گا۔

یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ میں ڈالا تو ساتھ تھے، ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا تو ساتھ تھے، موسیٰؑ دریائے نیل میں اُترے تو ساتھ تھے، عیسیٰؑ سولی کے لئے پکڑے گئے تو ساتھ تھے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احد کی جنگ میں زخمی ہو کر غار میں گرے تو ساتھ تھے اگر وہ زندگی کی کٹھن منزلوں میں دم کے ساتھ نہ ہوں تو انسان ـــ ایک ضعیف الخلقت انسان ـــ مصائب و مشکلات کی تاب کیسے لا سکتا ہے ـــ شاعر نے کہا ؎

میں کیوں کہوں کہ غم زندگی گراں گذرا
وہ ساتھ ساتھ رہے، میں جہاں جہاں گذرا

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے خاص بندوں کو آزمائش میں کیوں ڈالتا ہے ـــ جنکی وفاداری میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی، ان کی وفاداری کو امتحان کی بھٹی میں ڈالنے کی مصلحت کیا ہے

بات یہ ہے کہ کبھی محبوب اپنے عاشق کی وفاداری کو حاسدوں پر اور اغیار پر ظاہر کرنے کے لئے اپنے عاشق کو آزمائش کی بھٹی میں ڈالتا ہے، وہ خود اس پر بھروسہ کرتا ہے، لیکن اپنی شان محبوبی کا اظہار عشق کی آزمائش کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے، شاعر نے کہا ہے ؎

عشق نے کچھ کیے گریباں چاک
اس نے گیسو بھی کچھ سنوارے ہیں

عاشق اپنا گریبان چاک کر کے معشوق کے گیسو سنوارتا ہے، اپنی ہستی کو بگاڑ کر حسن کی آب و تاب دوبالا ہے،

ادھر فنا ہے ـــ ادھر بقا ہے، بڑا نازک مسئلہ ہے،
تصوف و معرفت کا ـــ فنا و بقا کے درمیان کیا عجیب رشتہ ہے۔

اب اسی موضوع پر جناب میر تقی میر کا ایک شعر سنو، وہ اپنے رنگ کے بادشاہ ہیں، محبوب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔ ؎

شرمندہ ہو گے رہنے بھی دو امتحان کو
رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

یعنی عاشق صادق کا امتحان نہ لو، یہ بے دھڑک امتحان کی آگ میں کود پڑے گا، کیونکہ اسے اپنی جان سے زیادہ تم عزیز ہو، وہ تمہاری خواہش کا احترام کرے گا، اور تمہارے لئے اپنی جان قربان کر دے گا ـــ

حضرت یونسؑ کی قوم کون تھی ،؟

حضرت یونسؑ ،حضرت عیسیٰؑ سے سات سو سال قبل آشوری قوم کی ہدایت کیلئے بھیجے گئے ۔

آشوری حکومت کا دار الخلافہ نینوا تھا ، یہ عظیم شہر دریائے دجلہ (عراق) کے مشرقی کنارے پر آباد تھا ـــ اس کے مقابل دوسری طرف شہر موصل آباد ہے ۔ یہ قوم دولت و تمدن کی خوش حالی سے عیش پرستیوں میں مبتلا ہو گئی ، شرک و معاصی نے اسے بُری طرح گھیر لیا ، حضرت یونس کے عہد میں تو اسے معاف کر دیا گیا اور مہلت اصلاح دیدی گئی لیکن یہ قوم حضرت یونس کے بعد پھر برائیوں میں آگے بڑھ گئی ـــ اب اس کی اصلاح کے لئے حضرت ناحوم بھیجے گئے ـــ ان کے بعد حضرت صفنیا نبی مبعوث ہوئے تین پیغمبروں کے بعد بھی جب اس قوم کو ہوش نہ آیا تو خدا تعالیٰ نے بابل والوں کو اس قوم پر غالب کر دیا ،

اس حملہ نے عذاب الٰہی کی صورت اختیار کر لی ، دریائے دجلہ میں سیلاب آگیا اور شہر نینوا کی مشہور عالم مضبوط فصیل جگہ جگہ سے پھٹ گئی اور دشمنوں کے لئے حملہ کا راستہ صاف ہو گیا ۔

اہل بابل نے پورے شہر کو جلا کر خاکستر کر دیا ، آشوری بادشاہ نے اپنے محل کو اپنے ہاتھوں سے جلا کر خودکشی کر لی ،

حضرت مسیح سے دو سو برس پہلے اس شہر کا نام و نشان مٹ چکا تھا اور اس کا جائے وقوع بھی لوگوں کو معلوم نہ تھا ،

آثار قدیمہ کی کھدائی میں جگہ جگہ جلے اور جھلسے ہوئے مکانات اور انسانی لاشیں برآمد ہوتی ہیں ،

حضرت یونسؑ کی فضیلت

ایک روز چند صحابہ بیٹھے ہیں حضرات انبیاء کے حالات پر گفتگو فرما رہے تھے اس گفتگو میں ایک صاحب نے حضرت یونسؑ کی آزمائش کا ذکر کیا اور انہیں مچھلی والا نبی کہہ کر یاد کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجرہ کے اندر یہ ساری گفتگو سن رہے تھے، آپ باہر آئے اور فرمایا۔

تم حضرت یونسؑ کی آزمائش پر ان کے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار نہ ہونا، ان کی شان نرالی ہے، خدا تعالیٰ نے معرفت حق کے جو اسرار معراج میں مجھ پر کھولے وہ اسرار و انوار یونس علیہ السلام پر مچھلی کے پیٹ میں نازل فرمائیے،

ایک حدیث میں ہدایت کی گئی۔

لَا تُفَضِّلُوْنِیْ عَلٰی یُوْنُسَ ابْنِ مَتّٰی

آیت کریمہ کا تجزیہ

یہ آیت کریمہ تین حصوں پر مشتمل ہے، — پہلا حصہ لا الٰہ الا انت — توحید حق کا اعلان ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جس پر کائنات عالم کی بنیاد قائم ہے۔

لَوْ کَانَ فِیْہِمَآ اٰلِہَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ	اگر آسمان و زمین میں خدائے واحد
لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللّٰہِ	کے سوا اور بھی خدا ہوتے تو ان میں
رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○	فساد برپا ہوتا۔ پس پاک ہے
(الانبیاء ۲۲)	اللہ تعالیٰ جو عرش عظیم کا رب ہے

ان مشرکین کے خیالات سے،

آیت کا دوسرا حصہ — سبحانک — خدا تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس ہے — جو تمام ملائکہ کی عبادت ہے۔

سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّنَا وَرَبُّ   یہ تسبیح ملائکۃ اللہ ہے۔

الْمَلٰٓئِکَۃِ وَالرُّوْحِ

آیت کے تیسرے حصہ   انی کنت من الظالمین —
میں بندہ کی طرف سے توبہ و استغفار اور اعتراف قصور کا اعلان ہے اور یہ اعتراف وہ اعلان خدا تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی کی واحد ضمانت ہے۔

کارِ معاصرین

جوابِ آں غزل

کیا انتخاب تبدیلی کا واحد راستہ ہے

مقبول رحیم مفتی

معاصر عزیز روزنامہ 'نوائے وقت' نے اپنے ۸ر اپریل کے ادارتی نوٹ میں امیرِ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے ایک اخباری بیان پر گرفت کی تھی۔ جس کا جواب ۱۲ر اپریل کے نوائے وقت میں مقبول الرحیم مفتی کے قلم سے شائع ہوا۔ یہ دونوں تحریریں نوائے وقت کے شکریے کے ساتھ نذرِ قارئین ہیں۔ (ادارہ)

روزنامہ نوائے وقت لاہور (۴) ۸ر اپریل ۱۹۸۷ء

ڈاکٹر اسرار احمد اور تحریک پاکستان!

تنظیم اسلامی کے بارھویں سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے تنظیم اسلامی پاکستان کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ مجھے جماعت اسلامی کی دعوت اور تحریک سے کوئی اختلاف نہیں البتہ میں جماعت کی انتخابی سیاست کے طریق کار سے اتفاق نہیں رکھتا۔ انہوں نے کہا کہ اس صدی میں حکومت الٰہیہ کا تصور سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد نے پیش کیا تھا لیکن بعد ازاں وہ تحریک آزادی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے انتخابی سیاست سے اپنی بیزاری کا اظہار پہلی مرتبہ نہیں کیا وہ اکثر و بیشتر انتخابات سے اپنی الرجی کا اظہار کرتے رہتے ہیں حالانکہ ملکی دستور کے تحت پاکستان میں تبدیلی کا صرف ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ انتخابات کا راستہ ہے۔ اس کے علاوہ کسی انقلابی طریقے سے تبدیلی لانے کا پروگرام آئین کی خلاف ورزی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ڈاکٹر اسرار صاحب جماعت سازی نہ کریں یا سیاست میں حصہ نہ لیں لیکن انہیں خود اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ جو کچھ بھی کریں آئین کی حدود میں رہتے ہوئے کریں۔ جب آئین انتخابی سیاست کو تبدیلی کا واحد راستہ قرار دیتا ہے تو ڈاکٹر صاحب کو انتخابی سیاست کے خلاف بیان بازی کرنے سے احتراز کرنا چاہئے۔ اور محض اتنی سی بات پر انتخابی سیاست کو رد نہیں کر دینا چاہئے کہ یہ جماعت اسلامی کی بھی پالیسی ہے

جہاں تک مولانا ابوالکلام آزاد سے اظہار محبت کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحب اپنی تقریر و تحریر میں اکثر اس بات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ مولانا آزاد کے بہت بڑے مداح ہیں اور اب صرف اتنی سی کسر باقی ہے کہ کسی روز ڈاکٹر صاحب مولانا آزاد کے روحانی اور سیاسی جانشین ہونے کا دعویٰ کر دیں۔ لیکن انہیں حقائق سے چشم پوشی کا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہئے۔ انہیں یہ بات کبھی نہ بھولنی چاہئے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے آزاد اسلامی مملکت کے قیام کی سرتوڑ مخالفت کی تھی۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے بقول مولانا آزاد اگرچہ اس صدی میں حکومت الٰہیہ کے نقیب تھے لیکن بعد میں اسلام کے مستقبل سے مایوس ہو کر وہ متحدہ قومیت کے فلسفے کے پرچارک بن گئے اور اسلام کے نام پر کسی علیحدہ مملکت کے قیام کے حامی نہ رہے۔ ہندو کانگرس نے اسلامی مملکت کے قیام کی مخالفت میں ان کی خدمات سے خوب فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کا ایک محدود طبقہ مولانا آزاد سے عقیدت مندی کی بنا پر تحریک پاکستان کا آخر دم تک مخالف رہا۔ ان تلخ حقائق کو پس پشت ڈالتے ہوئے مولانا آزاد سے ڈاکٹر صاحب کا اظہار عقیدت بہت سی غلط فہمیوں کا دروازہ کھولنے کا موجب بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اگر سیاست کا شوق رکھتے ہیں تو پاکستان اور بانیان پاکستان کے حوالے سے یہ شوق پورا کریں اور ملک کی نظریاتی حدود و قیود کو اسی طرح قبول کریں جس طرح ملک کے باقی سیاست دان، صحافی، دانشور اور ادیب کرتے ہیں

(نوائے وقت لاہور ۱۲ مارچ ۱۹۸۷ء)

۸ر اپریل کے اداریۃ نوٹ بعنوان "ڈاکٹر اسرار احمد اور تحریک پاکستان" میں آپ نے ڈاکٹر اسرار احمد کے حوالے سے دو اہم نکات اٹھائے ہیں اور اپنے نقطہ نظر سے ڈاکٹر اسرار احمد کو ان کا جواب بھی پیش کیا ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ "جب آئین انتخابی سیاست کو تبدیلی کا واحد راستہ قرار دیتا ہے تو ڈاکٹر صاحب کو انتخابی سیاست کے خلاف بیان بازی کرنے سے احتراز کرنا چاہئے"۔ آپ کی بات نظری اعتبار سے ہو سکتا ہے درست ہو، لیکن عمل کی دنیا میں "آزاد اسلامی مملکت" کے لئے جدوجہد کرنے والوں نے اپنی حاصل کی ہوئی مملکت میں آئین اور جمہوریت کے اصولوں اور عوامی امنگوں اور ولولوں کا کتنا احترام کیا اور اس کے کتنے ثمرات عام مسلمانوں تک پہنچے؟ علماء کرام کی قیادت میں زبردست عوامی تحریک اور اسمبلی کے اندر علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں سے "آزاد اسلامی مملکت" کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے والے اصحاب پر مشتمل اسمبلی نے قرارداد مقاصد منظور تو کر لی لیکن اسے دستوری اور قانونی قابل نفاذ قرار دینے کی بجائے رہنما اصولوں کے طاق میں سجا دیا۔

عوام کے سیاسی اور معاشی حقوق غصب کر کے اپنی سیادت و سیاست کو چمکانے والا جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ فوج اور بیوروکریسی کے تعاون سے اور لوٹ کھسوٹ میں انہیں اپنا حصہ دار بنا کر گذشتہ چالیس برس سے یہاں برسراقتدار ہے۔ کبھی اس کا ظاہری چہرہ خالص فوجی ہو جاتا ہے اور کبھی نیم سویلین۔ دستور اور آئین ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ وہ جب اور جس طرح مناسب سمجھتے ہیں اسے اپنے مقاصد کے لئے توڑتے مروڑتے رہتے ہیں۔ آپ کی نظری نصیحت فی الواقع بہت وقیع اور قابل توجہ سمجھی جاتی اگر اس ملک میں انتخابات واقعتاً تبدیلی کا واحد راستہ ہوتے، اگر شیخ مجیب الرحمٰن کو اس ملک کی اکثریت کے ووٹ حاصل کرنے کے بعد اقتدار منتقل کر دیا جاتا، اگر ۸۵ کے انتخابات میں سیاسی جماعتوں کو مثبت نتائج کے حصول کی خاطر میدان انتخاب سے باہر رکھنے کا اہتمام نہ کیا گیا ہوتا اور اگر آئندہ الیکشن میں بھی مختلف حیلوں بہانوں سے ملک کے فعال سیاسی عناصر کو انتخاب میں حصہ لینے سے محروم رکھنے کی منصوبہ بندیاں اور کوششیں نہ ہو رہی ہوتیں۔

نئی نسل کو پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ کا تجربہ تو یہی بتاتا ہے کہ اس مملکت میں آئین، دستور، جمہوریت، سیاست موجودہ استحصالی نظام میں اس کے پیدا کردہ طبقات کے مفادات کے تحفظ اور تسلسل کے ذرائع اور آلات ہیں۔ اور ان کی بحالی اور تحفظ کی علمبردار جماعتیں جو اس استحصالی نظام کو تبدیل کرنے کے بلند بانگ دعووں کے ساتھ ان انتخابات میں اور اس نظام کے سیاسی اداروں میں حصہ لیتی ہیں درحقیقت وہ سب اس نظام کی بقاء اور ترقی کا آلۂ کار بن گئی ہیں۔ کیونکہ نظری اور آئینی اعتبار سے بھی انتخابات محض حکومت کی تبدیلی کا "واحد راستہ" ہیں نظام کی نہیں۔ جبکہ پاکستان میں یہ عملاً حکومت کی جائز تبدیلی کا سبب اور راستہ بھی ثابت نہیں ہوئے۔

دوسری طرف موجودہ انتخابات اور استحصالی نظام کے تحفظ کے علمبردار "جمہوری ادارے" نظام کی تبدیلی کے بارے میں اتنے حساس واقع ہوئے ہیں کہ انہوں نے اپنی بنائی ہوئی اور خود اپنے ہاتھوں سینٹ میں پاس کی ہوئی آئین کی نویں ترمیم کو اسمبلی کے قواعد و ضوابط اور کمیٹیوں کے تاخیری حربوں کے ذریعے فائلوں میں دفن کر دیا ہے کیونکہ اس ترمیم میں کسی حد تک موجودہ نظام کی تبدیلی کی بات کی گئی تھی اور ایک موہوم سا امکان پیدا ہوا تھا کہ شاید اس ترمیم کے منظور ہونے سے ہمارے موجودہ حکومتی ڈھانچے کے سماجی اور معاشی پہلوؤں میں تبدیلی کا آغاز ہو۔ لیکن سب نے دیکھ لیا کہ اس ظالمانہ نظام کے فیض یافتہ طبقات پر مشتمل اسمبلی اس ترمیم کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہے۔ آج تک کا تجربہ اس بات کا گواہ ہے کہ انتخابات کا آئینی راستہ کسی درجے میں بھی تبدیلی کا راستہ ثابت نہیں ہوا۔ اس لئے اگر ڈاکٹر اسرار احمد یا کوئی اور کسی انقلابی طریق کار کی بات کرتا ہے تو وہ عوام کے دل کی بات کرتا ہے کیونکہ نظام کی تبدیلی اب وقت کا تقاضا بن چکی ہے۔

اس ضمن میں ایک اور اہم بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ انقلابی طریق کار کا مطلب لازماً یہ نہیں ہے کہ وہ انقلاب فرانس یا انقلاب روس کی طرح خونی انقلاب ہی ہو۔ اگر اسلام کے اصولوں کے مطابق ایک منظم جماعت عدم تشدد کے اسلامی اصول کے مطابق خدائی فوجدار بن نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کے لئے کھڑی ہو جائے اور جدید تمدن نے حکومتوں کے جبر کے خلاف عوام کی متحدہ جسمانی قوت کے استعمال کے جو پرامن راستے تلاش کئے ہیں ان کو استعمال کرے، تو قربانیوں سے بھرپور جدوجہد کے ذریعے برسراقتدار طبقات کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ یا وہ راہ راست پر آجائیں یا حکومت چھوڑ دیں۔ ان جدید تمدنی ذرائع میں مظاہرہ، جلسہ جلوس، پکٹنگ اور احتجاج کے وہ تمام طریقے شامل ہیں جن میں تشدد اور توڑ پھوڑ یا دہشت گردی کا عنصر نہ پایا جاتا ہو۔ عدم تشدد کے اصول پر سختی سے کاربند رہتے ہوئے حکومت کے مظالم کے سامنے ثابت قدمی سے کھڑے رہنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ملک کی خاموش اکثریت بالآخر ظالمانہ نظام کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور پھر عوام کے سیلاب کے سامنے کھڑے رہنا کسی ظالم، جابر اور استحصالی گروہ کے بس میں نہیں رہتا اور دنیا کا کوئی جمہوری آئین اور قانون پرامن احتجاج اور مظاہرے

پر پابندی عائد نہیں کرتا۔ البتہ فوجی حکمران اور استحصالی طبقات پر مشتمل آمرانہ حکومتیں اپنے تحفظ کے لئے جو ظالمانہ دستور اور قوانین بناتی ہیں وہ اس وقت زیر بحث نہیں۔

اسلام کی دعوت کے حوالے سے بھی وطن عزیز میں گذشتہ چالیس سالہ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ اسلام جو قوم کو متحد کرنے والا قوی عنصر تھا اسے جب الیکشن ایشو بنایا گیا تو یہ قوم کو تقسیم کرنے کا سبب بن گیا۔
کیونکہ الیکشن میں حصہ لینے والے سب مسلمان ہیں اور اسلام کو یکساں طور پر استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لئے جب ایک جماعت کی دیکھا دیکھی دوسری مذہبی جماعتیں بھی اپنے اپنے اسلام کا ایڈیشن لے کر انتخاب کے میدان میں آکودیں تو اسلام کا سیاسی استعمال قوم کو سیاسی طور پر تقسیم کرنے کے علاوہ مذہبی سطح پر بھی منافرت اور فرقہ بندی پھیلانے کا سب سے بڑا سبب بن گیا۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جو مزید دلائل کی محتاج نہیں۔ عقل و فہم رکھنے والا ہر شخص چشم خود اس کے اثرات کو دیکھ رہا ہے۔
آپ نے تقسیم ملک سے قبل کی مسلم سیاست کے حوالے سے مولانا ابو الکلام آزادؒ کے سیاسی کردار کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "ان تلخ حقائق کو پس پشت ڈالتے ہوئے مولانا آزاد سے اظہار عقیدت بہت سی غلط فہمیوں کا دروازہ کھولنے کا موجب بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اگر سیاست کا شوق رکھتے ہیں تو پاکستان اور بانیان پاکستان کے حوالے سے یہ شوق پورا کریں' جس طرح ملک کے باقی سیاستدان' صحافی' دانشور اور ادیب کرتے ہیں"۔ یہ درست ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے ہندوستان کے مسلمان زعماء کے درمیان مسلمانان ہند کے مستقبل اور لائحہ عمل کے بارے میں دو رائیں پائی جاتی تھیں اور ایسا ہونا بالکل فطری امر تھا۔ مسلمانوں کے دونوں گروہوں نے غلام ہندوستان میں انگریز کی دی ہوئی سیاسی آزادی کی وجہ سے کھل کر اپنی اپنی رائے کے مطابق مسلمان کی بقاء اور فلاح کے لئے کام کیا۔ لیکن آزادی حاصل ہونے کے بعد ہم نے ان مسلمان قائدین کو "اچھوت" قرار دے دیا جنہوں نے بوجوہ مسلم لیگ کے پیش کردہ حل سے اختلاف کیا تھا لیکن آزادی کے حصول کے لئے بھرپور جدوجہد کی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ تقسیم ملک کے بعد ان کے پیروکاروں کی وفاداریوں اور حب الوطنی کو بھی سیاسی وجوہ کی بناء پر مشکوک قرار دیا۔ اس تنگ نظری نے آج تک ملک کو لاینحل سیاسی مسائل کے سوا کچھ نہیں دیا۔ یہ بات ریکارڈ سے ثابت ہے کہ قیام پاکستان کے بعد مولانا ابو الکلام آزادؒ اور مولانا حسینؒ احمد مدنی جیسے رہنماؤں نے پاکستان کو مسجد کی مانند مقدس سرزمین تسلیم کیا۔

البتہ "پاکستان اور بانیان پاکستان" کے حوالے سے سیاست کرنے والے سیاست دانوں' صحافیوں' دانشوروں اور ادیبوں نے بالعموم اس ملک میں جس کردار کا مظاہرہ کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے تو بار بار دل میں یہ خیال آتا ہے کہ مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم اور ان کے ہم خیال مسلمان رہنماؤں نے جو موقف اختیار کیا تھا وہ درست تھا۔ البتہ مسلم لیگ میں شامل جاگیرداروں کے حوالے سے انہوں نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ تو عملاً درست ثابت ہو ہی چکے ہیں۔
"پاکستان اور بانیان پاکستان" کے حوالے سے سیاست کرنے والوں نے اس ملک کو اپنے طبقاتی اور گروہی مفادات کے تحفظ کے لئے توڑا اور آج بھی اسی انداز کی سیاست کر رہے ہیں جس سے ملک میں انتشار کی قوتوں کو تقویت مل رہی ہے۔ عوام ظلم اور مہنگائی کی چکی کے دو پاٹوں میں پس رہے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ نئی نسل کو موجودہ استحصالی نظام کے خلاف جدوجہد کرنے کے لئے تیار کیا جائے تاکہ پاکستان ایک ایسی فلاحی مملکت بن سکے جس کا نقشہ دنیا نے آج سے چودہ سو سال قبل خلافت راشدہ کی شکل میں دیکھا تھا۔

---

۱ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور نے ۱۹۳۰ کے بعد ہندوستان کی سیاست میں جو رول ادا کیا امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد اُس سے واضح اختلاف رکھتے ہیں اور بارہا تحریر و تقریر میں اُس کا اظہار کر چکے ہیں۔ لیکن اُن سے اس اختلاف کی وجہ سے اُن کی پیش کردہ احیائے دین کی اُس ولولہ انگیز دعوت سے صرفِ نظر کرنا بھی کسی طرح قرینِ انصاف نہیں جو انہوں نے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء کے دوران الہلال اور البلاغ کے ذریعے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں پیدا کی اور جس کے وسیع اثرات پاک و ہند کے مذہبی و دینی حلقوں اور تحریکوں میں آج تک محسوس کئے جاتے ہیں۔ (ادارہ)

تنظیم اسلامی کا بارہواں
سالانہ اجتماع اور سال گزشتہ کی کارکردگی
ایک نظر میں

مرتب : چوہدری غلام محمد

تنظیم اسلامی کا بارہواں سالانہ اجتماع ۴ تا ۷ اپریل ۸۷ء قرآن اکیڈمی میں منعقد ہوا۔ الحمدللہ
رشتہ سالانہ اجتماع کے فوراً بعد اس سالانہ اجتماع کے لئے جو پروگرام طے کیا گیا تھا اس کے مطابق
ں کا انعقاد ہوا۔ سالانہ اجتماعات جماعتی زندگی میں انتہائی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس میں اولاً تو
مقصود ہوتا ہے کہ تنظیم کے وابستگان اپنے پیش نظر مقاصد' ان کی اہمیت اور ان کے حصول کے
یق کار کا شعور وادراک از سرنو تازہ کریں۔ ثانیاً خود احتسابی اور اجتماعی کارکردگی کے جائزہ کے بعد
ندہ کے لئے نقشہ کار بنائیں اور اس پر عمل در آمد کے لئے ایک عزم نو اور ولولہ تازہ لے کر رخصت
ں ان مقاصد کے حصول کے لئے تنظیم اسلامی کے اس بارہویں سالانہ اجتماع کے موقع پر ملک کے
نف مقامات اور بیرون ملک سے تقریباً پانچ صد رفقا نے شرکت کی۔ اندرون ملک جن ۲۱ شہروں سے
فقاء تشریف لائے ان میں کراچی' حیدر آباد' سکھر' ملتان' شجاع آباد' وہاڑی' فیصل آباد' بوریوالا'
شیخوپورہ' گوجرانوالہ' سیالکوٹ' کانبانوالہ' مترانوالی' وزیر آباد' گجرات' آزاد کشمیر' راولپنڈی'
سلام آباد' پشاور' کوئٹہ اور ننڈی پور شامل ہیں۔ لاہور سے تقریباً ۱۵۰ رفقاء نے ہمہ وقت اجتماع میں
رکت کی۔ بیرون ملک سے خاص طور پر اجتماع میں تشریف لانے والے رفقاء کی تعداد بھی خاصی حوصلہ
زا تھی۔ ابوظہبی' الواسع' ریاض' جدہ اور امریکہ سے ۵۰ سے زائد رفقاء اجتماع میں شریک ہوئے۔

اس اجتماع کی سب سے اہم چیز امیر تنظیم جناب ڈاکٹر اسرار احمد کی تین مفصل اور مدلل تقاریر تھیں
تنظیم اسلامی کی دعوت اور دین کے شعور کے ضمن میں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ پہلی تقریر ہفتہ چار
پریل کو "ایمان اور اسلام کا فرق اور حقیقت ولوازم ایمان" کے موضوع پر نماز مغرب کے بعد
سے لے کر رات گیارہ بجے تک جاری رہی اور اس کا کچھ حصہ امیر محترم نے اگلے روز نماز فجر کے بعد
بھی ارشاد فرمایا۔ "فرائض دینی کا جامع تصور اور حقیقت ومراحل جہاد" کے عنوان سے دوسرا خطاب
۵ اپریل کو نماز مغرب کے بعد سے لے کر رات ساڑھے دس بجے تک جاری رہا۔ تیسرا اور آخری
خطاب سوموار ۶ اپریل کو "اسلامی انقلاب کے مراحل سیرت نبوی کی روشنی میں اور موجودہ حالات
میں ان کا انطباق واجتہاد" نماز مغرب سے لے کر رات گیارہ بجے تک جاری رہا اور اس کا اختتامی
حصہ بھی اگلے روز نماز فجر کے بعد تک موخر کیا گیا۔

پانچ اور چھ اپریل کو دو دن صبح آٹھ بجے سے لے کر نماز ظہر تک رفقاء نے تجاویز اور مشورو
کے ساتھ تنظیم کی گذشتہ سال کی کارکردگی کا تنقیدی جائزہ لیا۔ ان دونوں دنوں میں امیر تنظیم ۔
رفقاء کی تمام گفتگو خود سنی اور پھر اجتماع کے آخری دن یعنی سات اپریل کو تقریباً ڈھائی گھنٹے کی مفصل
تقریر میں گذشتہ سال کی کارکردگی پر اپنا تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ رفقاء کی تجاویز اور مشوروں پر بھ
اپنی رائے ظاہر کی۔

اجتماع کے دوران رحمت اللہ بٹر صاحب اور امیر تنظیم اسلامی کراچی جناب ڈاکٹر تقی الدین ۔
درس حدیث بھی دیئے۔ جن کا موضوع " جماعتی زندگی میں تزکیہ نفس اور اصلاح ذات کی اہمیت
تھا۔ ——————— راقم الحروف نے گذشتہ برس کی کارکردگی کے بار ۔
میں جو رپورٹ اجتماع میں پیش کی اس کا ایک خلاصہ بھی سطور ذیل میں قارئین میثاق کے لئے پیش
خدمت ہے۔ تاکہ انہیں تحریک کی پیش رفت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

سالانہ رپورٹ .... گذشتہ سالانہ اجتماع کے اہم فیصلے اجتماع کے فوراً بعد تمام رفقا
تنظیم کو ایک گشتی مراسلہ کے ذریعہ باقاعدہ پہنچا دیئے تھے۔ ان میں ایک اہم فیصلہ تنظیم اسلامی کی تنظ
نو کا تھا۔ ہم نے کوشش یہ کی کہ مالیاتی نظام کے علاوہ اپنے نظام کو بالکلیہ نظام بیعت سے ہم آہنگ
کریں۔ چنانچہ قرآن و سنت سے ماخوذ الفاظ پر مشتمل نئے بیعت فارم تیار کئے گئے اور تمام رفقا
تنظیم اسلامی کو اپنی رفاقت کے از سر نو جائزہ کی تلقین کی گئی اور تنظیم اسلامی کے مقاصد اور طریق
سے فی الجملہ اتفاق اور آئندہ مراحل کے دوران ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ اور بیعت سمع و طاعت
المعروف پر انشراح صدر کی صورت میں نئے بیعت فارم کے ذریعہ تجدید بیعت کے لئے کہا گیا۔ یہ ۔
کیا گیا کہ آئندہ تنظیم اسلامی کے رفیق وہی شمار ہوں گے جو نئے بیعت فارم کے ذریعہ تجدید بیعت
لیں گے۔ یہ بھی طے کیا گیا تھا کہ موجودہ مقامی تنظیموں اور اسرہ جات کی از سر نو پڑتال کر کے حسب
ضرورت نیا نظام بنایا جائے گا اور مقامی تنظیموں کے قیام میں جلدی نہیں کی جائے گی۔ گذشتہ سالا
اجتماع کے موقع پر اندرون ملک ۲۳ مقامی تنظیمیں اور ۶ مقامی اسرہ جات کام کر رہے تھے۔ لاہور ۔
پانچ مقامی تنظیمیں تھیں انہیں ایک مقامی تنظیم میں مدغم کر دیا گیا۔ کراچی کی تین مقامی تنظیموں
بجائے ایک مقامی تنظیم قائم کر دی گئی۔ اسی طرح حیدر آباد اور لطیف آباد کی مقامی تنظیموں کو یکجا
دیا گیا۔ اسلام آباد اور راولپنڈی کی مقامی تنظیموں کو ختم کر کے اسرہ جات میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایبٹ
آباد، گوجر خان، آزاد کشمیر اور بلتستان کی مقامی تنظیمیں ختم کر دی گئیں اور ان مقامات پر موجود
رفقاء اب منفرد حیثیت میں کام کر رہے ہیں۔ گوجرانوالہ کی مقامی تنظیم ختم کر کے اولاً رفقاء کو منف
حیثیت دی گئی لیکن اب ان رفقاء کو دو اسرہ جات گوجرانوالہ اور نندی پور میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہ
سے قائم چھ مقامی اسرہ جات میں سے حویلی لکھا، کوہاٹ، کوکاری اور واہ کینٹ کے اسرہ جات ختم
چکے ہیں۔ کیونکہ وہاں کے رفقاء کافی عرصہ سے غیر متعلق ہو چکے تھے۔ اسرہ جات سیالکوٹ اور شجا
آباد قائم ہیں اور وہاں کے رفقاء الحمد اللہ اب نئے جوش و جذبہ سے کام کر رہے ہیں۔ اس سال ۔
دوران پانچ نئے مقامی اسرہ جات وزیر آباد، گجرات، کانیانوالہ، مترانوالہ اور جلالپور جٹاں یہ تما

مقامات وزیر آباد اور اس کے نواحی علاقہ میں واقع ہیں۔ اسی سال کے دوران ہمارے بھائی جناب شمس الحق اعوان صاحب لاہور سے یہاں منتقل ہوئے۔ تنظیم اسلامی کی توسیع دعوت کے ضمن میں ان کی شبانہ روز محنت کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح شرف قبولیت بخشا کہ انہیں کئی ایک بے لوث اور انتھک رفقائے کار مل گئے جن کی مساعی سے قرب وجوار کے قصبات اور معروف مقامات پر تنظیم اسلامی کی توسیع دعوت کے لئے بہت مفید کام ہورہا ہے۔ اس کارکردگی کے بارہ میں مختصر اشارات آپ میثاق کے صفحات میں ملاحظہ فرماتے رہے ہیں۔ اس کی تفصیلات بھی انشاءاللہ العزیز وہاں کی مقامی رپورٹ میں آپ کے سامنے آجائیں گی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اس وقت اندرون ملک ۹ مقامی تنظیمیں ہیں۔ یعنی کراچی، کوئٹہ، حیدر آباد، سکھر، ملتان، وہاڑی، فیصل آباد، لاہور اور پشاور۔ اسلام آباد اور راولپنڈی میں مقامی تنظیمیں نہیں ہیں تاہم دونوں مقامات کے رفقاء کی تین تین اسرہ جات میں تقسیم اور نقبا کے تقرر کے بعد باہم رابطہ اور توافق کے لئے ایک ایک نقیب اعلیٰ بھی موجود ہے۔ دیگر مختلف مقامات پر مقامی اسرہ جات کی تعداد ۹ ہے یعنی شجاع آباد، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، منڈی بہاؤالدین، وزیر آباد، گجرات، کانبانوالہ، مترانوالہ اور جلالپور جٹاں اس کے علاوہ رفقا کی ایک معتدبہ تعداد مختلف مقامات پر بکھری ہوئی ہے۔

ان مقامی تنظیموں اور اسرہ جات کی تنظیمی و دعوتی سرگرمیوں کی تفصیلات انشاءاللہ العزیز ان کی رپورٹوں میں آپ کے سامنے آجائیں گی۔ مرکز سے رابطہ کے لئے متعین طریق کار کے مطابق ہر مقامی تنظیم کو اپنی دعوتی وتنظیمی سرگرمیوں اور دیگر ضروری معلومات پر مشتمل ایک ماہوار رپورٹ اور رفقاء کی انفرادی کارکردگی سے متعلق ایک سہ ماہی رپورٹ مرکزی دفتر کو ارسال کرنا ہوتی ہے۔ اس پہلو سے رابطہ کی کیفیت بہت کمزور رہی ہے۔ اس پر ہمیں غور کرنا ہے۔ مقامی تنظیموں کے علاوہ رفقاء سے نجی سطح پر رابطہ کے لئے مرکز سے خطوط کی ترسیل کا ایک باقاعدہ نظام قائم ہو چکا ہے اور الحمد اللہ تمام منفرد رفقاء اور اکثر اسرہ جات کے رفقاء سے خط وکتابت کے ذریعہ رابطہ قائم ہے۔ کئی ایک مقامات پر رابطہ کے لئے مرکز سے نمائندے بھی بھیجے گئے ہیں اور اس کے مفید اثرات محسوس ہوئے۔

گذشتہ سالانہ اجتماع کے موقع پر جناب امیر محترم نے میاں محمد نعیم کو قیم تنظیم اسلامی پاکستان مقرر فرمایا اور یہ حکم دیا کہ موصوف ان کے افکار ونظریات اور ہدایات کے مطابق تنظیم اسلامی کی پیش رفت کے لئے عملی اقدامات کریں چنانچہ سالانہ اجتماع کے موقع پر ہی موصوف نے پیش نظر عملی اقدامات کا ایک اجمالی نقشہ رفقا کے سامنے رکھا تھا۔ رفقاء کو ایک چالیس روزہ پروگرام بھی دیا گیا جو کہ بعد میں باقاعدہ مطبوعہ شکل میں تمام رفقائے تنظیم کو فرداً فرداً پہنچا دیا گیا۔ اس میں رفقاء کی تربیت کے لئے بعض بنیادی ہدایات اور اپنے مقصد کے لئے یکسوئی کی خاطر قرآن مجید کی بعض آیات کے حفظ اور غور وفکر کی تلقین کے علاوہ اپنے گھر والوں اور متعلقین کے سامنے اپنے عزم وارادہ کا اظہار تھا۔ جناب امیر محترم نے سالانہ اجتماع کے بعد مشورہ سے یہ طے فرمایا کہ میاں محمد نعیم صاحب فی الحال چند ماہ کے لئے اپنی توجہات کو پنجاب اور سرحد پر مرکوز رکھیں۔ کراچی اور سندھ کے دعوتی معاملات کو امیر

تنظیم اسلامی کراچی جناب سراج الحق سید صاحب اور نائب امیر کراچی جناب مختار حسین فاروقی صاحب
اپنی صوابدید کے مطابق فروغ دیں۔ بعد میں دونوں جگہ کے تجربات کی روشنی میں مجموعی پروگرام بن سکیں
گے۔ میاں محمد نعیم صاحب کو تنظیم اسلامی لاہور کی امارت بھی سونپ دی گئی چنانچہ انہوں نے لاہور
میں اپنے پروگرام شروع کر کے دوسری جگہوں تک وسعت دینے کا پروگرام بنایا سالانہ اجتماع کے بعد
چالیس روزہ پروگرام کی تکمیل پر آئندہ کے لئے پیش نظر لائحہ عمل کے نمایاں خدوخال متعین کئے
گئے۔ لاہور میں اس کے مطابق کام شروع کر دیا گیا اور اس کی تفصیلات' تجربات اور تاثرات پر
مشتمل ایک مفصل ماہوار رپورٹ تمام مقامی تنظیموں اور اسرہ جات کو اس ہدایت کے ساتھ بھیجنے کا
اہتمام کیا جاتا رہا کہ رفقاء کے مشورہ کے بعد مقامی حالات کی مناسبت سے ضروری رد و بدل کے بعد اس
پروگرام کو اپنے ہاں جاری کریں۔ بعد میں تمام رفقاء اور دیگر احباب و متعلقین کی آگاہی' جوش
جذبہ اور ہمت افزائی کی خاطر ان سرگرمیوں کی مفصل رپورٹنگ کا ایک مستقل سلسلہ میثاق میں شروع کر
دیا گیا جو کہ اب الحمد اللہ لاہور کے علاوہ دوسرے مقامات کی سرگرمیوں پر بھی محیط ہوتا ہے۔ لاہور میں
اس لائحہ عمل پر عمل در آمد کے لئے اولاً رفقاء کے باہم مسلسل رابطہ اور تیز حرکت کے لئے اسرہ جات
نظام کو درست کیا گیا۔ اجتماعات او ر شب بسریوں کے پروگرام اس طرح ترتیب دیئے گئے کہ تعلیم
تربیت اور تزکیہ کا اہتمام رہے۔ تبلیغ و دعوت کی خاطر اندرون و بیرون لاہور کام کرنے کے لئے قافلے
ترتیب دیئے گئے۔ رفقاء سے اس کے لئے جب اوقات فارغ کرنے کو کہا گیا تو ان کی جانب سے جذبہ
و جوش اور پیش قدمی کا اظہار بہت حوصلہ افزا تھا۔ اندرون لاہور کام کرنے کے لئے ۵۱ رفقاء۔
ماہانہ دو دن اور بیرون لاہور کے لئے ۲۱ رفقاء نے ماہانہ تین دن فارغ کئے۔ الحمد اللہ ان اوقات
مناسب استعمال ہوا اور رفقاء توسیع دعوت اور ذاتی تربیت کے لئے مختلف اوقات میں لاہور اور اس
کی نواحی بستیوں اور بعض دوسرے مقامات پر گروپس کی شکل میں نکلتے رہے۔ یہ پروگرام بالعموم
حصوں پر منقسم ہوتے تھے۔ اولاً اصلاح و تربیت کے انفرادی اور اجتماعی پروگرام۔ یعنی نوافل
شکرانہ۔ اللہ تعالیٰ سے تائید و نصرت کی دعائیں' تجدید عہد۔ بعض آیات قرآنی کا مراقبہ یعنی ان
مقتضیات کو ذہن و قلب میں اتارنے کی کوشش۔ لٹریچر کا اجتماعی مطالعہ' سیرت النبیؐ' صحابہ کرام
اور انقلابی شخصیتوں کی زندگی کے واقعات کا مطالعہ۔ ثانیاً توسیع دعوت' اس میں رفقاء دو دو چار چار
تعداد میں علاقہ کی گلیوں' بازاروں اور پرہجوم مقامات پر لوگوں سے ملتے مختصر گفتگو میں اپنی دعوت پیش
کرتے اور اس مقصد کے لئے خصوصی طور پر تیار کردہ لٹریچر تقسیم کرتے۔ دعوتی کام کے اختتام پر
سینئر رفیق کے خطاب عام کا بھی پروگرام ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس عملی حرکت کو ہمارے لئے جن مختلف
پہلوؤں سے موجب خیر و برکت بنایا اس کی تفصیلات آپ تک گشتی مراسلوں اور میثاق کے ذریعے
پہنچتی رہی ہیں۔ اس رپورٹ میں ان کے احاطہ کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔ تاہم یہ عرض کرنا
ضروری ہے کہ مختلف سطح پر ذمہ داریاں سنبھالنے کی عملی تربیت اور تجربات و مشاہدات کی روشنی میں
نت نئے اور خوب سے خوب تر انداز اختیار کرنا ان پروگراموں کے دوران ممکن ہوا۔ ان پروگراموں
کے درمیانی وقفہ میں رفقاء کو اپنے اپنے حلقہ اثر میں انفرادی اور ذاتی رابطہ کے متعین کام بھی دیئے

اور ان کی جانچ پڑتال کا انتظام بنایا گیا۔

۱۴ اگست کو یوم پاکستان کی مناسبت سے لاہور میں رفقائے تنظیم اسلامی کے ایک خاموش مظاہرہ کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔ طے یہ ہوا کہ رفقاء کے چھوٹے چھوٹے گروپ کثیر تعداد اور منظم انداز میں مختلف بینرز اور پلے کارڈ اٹھائے ہوئے لاہور کی معروف شاہراہوں پر گشت کریں۔ رفقاء کی ذاتی تربیت کے علاوہ پیش نظر یہ تھا کہ عوام الناس میں سے ملت کے بہی خواہ او ر دردمند لوگوں کو اس ملک کے استحکام کی اصل اساس کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اس کی تیاری میں ہماری تربیت کے بہت سے مواقع پیدا ہوئے اس پروگرام میں حصہ لینے کے لئے لاہور سے ایک سو بیس اور بیرون لاہور سے پچاس رفقاء مرکز میں جمع ہوئے۔ لیکن سوء اتفاق سے ملک میں بعض متحارب سیاسی گروہوں کی کشاکشی کی وجہ سے یوم پاکستان پر حکومت کی جانب سے کچھ پابندیاں عائد ہو گئیں اور شہر کی فضا میں کشیدگی انتہا کو پہنچ گئی۔ ان حالات میں مشورہ کے بعد یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس پروگرام کے صرف تربیتی حصہ پر اکتفا کیا جائے۔ چنانچہ رفقاء صرف مرکز میں جمع رہے۔ ان کے سامنے تنظیم اسلامی کی موجودہ پیش رفت' پیش آمدہ مسائل اور آئندہ عزائم کی تفصیلات رکھی گئی۔ امیر محترم کی تالیف "استحکام پاکستان" کے چیدہ مقامات کا اجتماعی مطالعہ اور بقیہ مقامات کا خلاصہ بیان کیا گیا۔ اس کے علاوہ دور دراز مقامات کے رفقاء کے باہم ربط وضبط کا عمدہ موقع میسر آیا۔ شہر کے تین اہم مقامات پر مکتبہ لگایا گیا اور جناب امیر محترم کے پیغام پر مشتمل ہینڈ بل اور تنظیم اسلامی کا تعارفی کتابچہ کثیر تعداد میں تقسیم کیا گیا۔

اس سال عاشورہ محرم پر فرقہ وارانہ فضا کچھ کشیدہ ہو گئی۔ جناب امیر محترم کے ایک خطاب جمعہ کو ایک فرقہ نے خوب اچھالا اور افواہیں پھیلا کر ایک غلط تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حالات قریباً دو ماہ مخدوش رہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس سنگین صورت حال کو ہمارے لئے اس طرح مفید بنایا کہ رفقاء و احباب جمع رہے۔ رفقائے لاہور کے لئے مسلسل شب بسریوں کا سلسلہ اور بیرون لاہور کے رفقاء کیلئے ہفت روزہ تربیتی پروگرام جاری رہے۔ سب نے مل جل کر کام کیا۔ چھوٹے چھوٹے گروپوں میں اسلام کے انقلابی فکر اور اس کے عملی تقاضوں پر مفید گفتگو کا سلسلہ بھی قائم رہا۔ اس موقع کا انتہائی اہم اور مفید پروگرام جناب امیر محترم کا رفقاء سے انفرادی ملاقاتوں کا اہتمام تھا۔

اس سال کے دوران کراچی اور فیصل آباد میں دو علاقائی اجتماعات منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ پروگرام کے مطابق اکتوبر کے مہینہ میں کراچی میں اجتماع کے انتظامات مکمل ہو چکے تھے لیکن وہاں کے حالات اچانک خراب ہو جانے کی وجہ سے اس کو منسوخ کرنا پڑا۔ بعد میں یہ فیصلہ ہوا کہ فیصل آباد میں بھی علاقائی اجتماع نہ کیا جائے اور دونوں علاقائی اجتماعات کے قائم مقام کے طور پر کراچی میں ایک کل پاکستان ہفت روزہ تربیتی اجتماع ۲۵ دسمبر تا یکم جنوری منعقد کیا جائے لیکن کراچی میں طبقاتی فسادات کی اندوہناک لہر کی وجہ سے اجتماع کا انعقاد پھر ممکن نہ رہا۔ بالآخر یہ اجتماع انہی دنوں میں قرآن اکیڈمی لاہور میں منعقد ہوا۔ اس کی تفصیلات بھی آپ تک میثاق کے ذریعہ پہنچ چکی ہیں۔ اس کے اہم پروگرام یہ ہوئے کہ جناب امیر محترم نے اپنی تالیف "استحکام پاکستان" کا اجتماعی مطالعہ کروایا اور

اہم مقامات کی تشریح فرمائی اور رفقائے تنظیم چار روز لاہور میں اور ایک روز لاہور کے مضافاتی شہروں اور قصبات میں توبہ اور انابت الی اللہ کے لئے نکلے۔ وسیع پیمانے پر رفقائے تنظیم اسلامی کی یہ پہلی رابطہ عوام مہم تھی۔ الحمد للہ تربیتی نقطہ نظر سے بھی اس سے بہت فوائد حاصل ہوئے۔ رفقاء نے اس تجربہ کی روشنی میں اپنے اپنے مقامات پر واپس جا کر اس قسم کی دعوتی و تذکیری مہمات کا اہتمام کیا اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ الحمد للہ اس سے تنظیم اسلامی کا تعارف بڑھ رہا ہے اور اس کی دعوت وسعت پذیر ہو رہی ہے۔

کل پاکستان تربیتی اجتماع کے بعد جناب امیر تنظیم اسلامی نے میاں محمد نعیم صاحب قیم تنظیم اسلامی پاکستان کو امیر تنظیم اسلامی لاہور کی اضافی ذمہ داری سے فارغ کر کے بیرون لاہور توجہ مرتکز کرنے کا حکم فرمایا۔ موصوف نے پنجاب اور سرحد کے اکثر مقامات (گوجرانوالہ، وزیر آباد، سیالکوٹ، گجرات، اسلام آباد، راولپنڈی، پشاور، فیصل آباد، ملتان، شجاع آباد) کا دورہ کیا۔ رفقاء واحباب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ رفقاء کے اجتماعات خصوصی میں باہم مشورہ کے بعد آئندہ کے نقشہ ہائے کار متعین کئے۔ مختلف مقامات پر دعوتی و اصلاحی مہموں کے لئے منصوبہ بندی کی اور مناسب مواقع پر خطاب عام اور سوال و جواب کی نشست کا بھی اہتمام ہوا۔
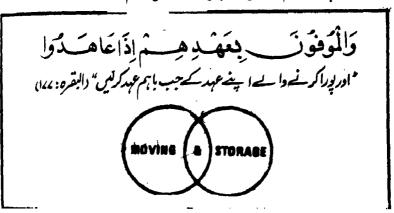
حدیثِ نبوی

عن عبد الله بن عمرو أنّ
رسول الله ﷺ قال الصيام
والقرآن يشفعان للعبد يقول
الصيام أي رب إني منعته
الطعام والشهوات بالنهار
فشفعني فيه ويقول
القرآن منعته النوم
بالليل فشفعني فيه
فيشفعان -

(رواه البيهقي في شعب الإيمان)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے
روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا؛ روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں
گے (یعنی اُس بندے کی جو دن میں روزے رکھے گا
اور رات میں اللہ کے حضور کھڑے ہو اُس کا پاک کلام
قرآن مجید پڑھے گا یا سنے گا) روزہ عرض کریگا: اے میرے
پروردگار! میں نے اس بندے کو کھانے پینے اور نفس
کی خواہش پورا کرنے سے روکے رکھا تھا، آج میری سفارش
اسکے حق میں قبول فرما۔ اور قرآن کہے گا کہ: میں نے اسکو
رات کو سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا، خداوندا
آج اسکے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ چنانچہ روزہ
اور قرآن دونوں کی سفارش اُس بندہ کے حق میں قبول
کی جائیگی (اور اس کیلئے جنت اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائیگا)

کعب بن عمرو سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ منبر کے قریب ہو جاؤ۔ ہم لوگ حاضر
ہو گئے جب حضور ﷺ نے منبر کے پہلے درجہ پر قدم رکھا تو فرمایا آمین۔ جب دوسرے پر
قدم رکھا تو پھر فرمایا آمین۔ جب تیسرے پر قدم رکھا تو پھر فرمایا آمین۔ جب آپ خطبہ سے
فارغ ہو کر نیچے اترے تو ہم نے عرض کیا کہ ہم نے آج آپ سے (منبر پر چڑھتے ہوئے) ایسی
بات سنی جو پہلے کبھی نہیں سنی تھی آپ نے ارشاد فرمایا اس وقت جبریل علیہ السلام میرے
سامنے آئے تھے جب پہلے درجہ پر میں نے قدم رکھا تو انہوں نے فرمایا ہلاک ہو جائے
وہ شخص جس نے رمضان کا مبارک مہینہ پایا پھر بھی اس کی مغفرت نہ ہوئی، میں نے کہا آمین۔
پھر جب دوسرے درجہ پر چڑھا تو انہوں نے کہا ہلاک ہو جائے وہ شخص جس کے سامنے آپ کا ذکر
مبارک ہو اور وہ درود نہ بھیجے۔ میں نے کہا آمین۔ جب میں تیسرے درجے پر چڑھا تو
انہوں نے کہا ہلاک ہو وہ شخص جس کے سامنے اس کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک بڑھاپے کو پہنچے
اور پھر بھی وہ جنت میں اس کو داخل نہ کرائیں میں نے کہا آمین۔

(اس حدیث کو امام حاکم نے روایت کیا ہے اور اسی معنی کی حدیث
ابوہریرہؓ کی روایت سے امام ترمذی نے بھی بیان کی ہے)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رب! ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب! ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کرے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

افکار و آراء

صنم کدۂ ہند سے

"اسلامی انقلاب" کی طلب

مولانائے محترم   السلام علیکم ورحمۃ اللہ

یقیناً اللہ تعالیٰ نے آپ کو حالات کی نبض شناسی اور اس کے تجزیے کا خصوصی ملکہ عطا فرمایا ہے۔ استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ کے بعد فطری طور سے اسلامی انقلاب کیا، کیوں، اور کیسے؟ کے لئے طلب شدید ہو جاتی ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ جلد اس تصنیف کے لئے مہلت اور توفیق میسر فرمائے۔ آمین۔

کتاب کے کچھ صفحات خاص طور سے میں نے بہت دل جمعی کے ساتھ پڑھے، ایک پیراگراف جو بار بار یاد آتا ہے، گرچہ آپ نے اسے ایک PASSIVE قسم کے اسلامی گروپ سے متعلق قرار دیا ہے، ہندوستان کی صورتِ حال میں خود اسلامی تحریکوں کے کارکنوں پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

"لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس طبقہ کی ایک بڑی اکثریت محض حسین تمناؤں اور خوشنما آرزؤں کے سہارے جی رہی ہے، خود کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ ان کی خواہش غالباً یہ ہے کہ یہ سارے کام کوئی اور کردے اور خود اپنی اپنی دلچسپیوں اور پیشہ وارانہ مصروفیتوں میں مگن رہیں، خود انہیں نہ کوئی ایثار کرنا پڑے، نہ قربانی دینی پڑے، نہ کوئی تکلیف برداشت کرنی ہو اور نہ کسی محنت و مشقت کا سامنا ہو۔ وہ بہت زور لگائیں گے تو کسی جماعت کے لیئے (اسلام کے لئے) تائید وتحسین کے چند جملے زبان سے ادا کر دیں گے اور وہ بھی اپنی آمدنیوں کے اعتبار سے آٹے میں نمک کے برابر۔ اللہ اللہ خیر سلا — اس سے آگے بڑھکر نہ ان کی زندگیوں کا رُخ تبدیل ہوگا، نہ دلچسپیوں میں کمی آئیگی

اور نہ ہی شب و روز کے مشاغل میں کوئی فرق واقع ہوگا۔

اور یہی وہ تکلیف دہ صورتِ حال ہے جس نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ صورتِ حال کے تجزیہ اور پھر ایک لائحہ عمل تک پہنچنے کے بارے میں جتنی واضح فکر آپ کی ہے۔ افسوس کہ ہندوستان میں ایسی فکر رکھنے والے لوگ نایابی کی حد تک کمیاب ہیں دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہمارے دماغوں میں روشنی عطا فرمائے اور دین کی انبیائی اقامت کا کام ہم لوگوں سے لے۔

آپ کی کتابیں نوجوانوں کے لئے خاصی دلچسپی کا باعث ہیں، احباب کے حلقے سے مجھ تک پہنچنے میں اسے خاصی دیر لگی دعا ہے یہ انقلابی عمل بارگاہِ ایزدی میں مقبول ہو۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

آپ کے دورۂ ہند کا اگر مستقبل قریب میں کوئی پروگرام ہو تو مطلع فرمائیے گا۔

والسلام

راشد شاذ علی گڑھ بھارت

(۲)

قرآن کا پیغام اور کیسٹ

دیارِ حرم سے ایک اہم خط

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب۔ السلام علیکم

۱۹۸۰ء میں پہلی بار کراچی TV پر آپ کا لیکچر سنا بہت اثر ہوا شاید اسلئے بھی کہ وہ ہمارے مادی وسائل کی آزمائش کا سال تھا اللہ کی رحمت چند دنوں میں ہوئی اور ریاض آ گئے درمیان میں بہت بار کراچی جانا ہوا اور باوجود تلاش کے آپ کا کوئی آڈیو یا ویڈیو کیسٹ نہ مل سکا۔ مجھے خود ایک وقت اسلامک سٹڈیز میں ایم اے کا جنون تھا پہلے سال میں تھی کہ شادی ہوگئی تعلیم جاری رکھنے کی اجازت نہیں ملی آزاد ماحول پر وتعیش

زندگی بھر ۱۲ سال تک اولاد بھی نہیں ہوئی کہ وہ یہ تسکین زندگی میں رکاوٹ تھی -
سی سال جنوری میں شفیق باپ کا انتقال ہوا جنکی صورت بھی نہ دیکھ سکی اور
س حیثیت وہ حادثہ نے دل و دماغ کے پرخچے اڑا دیئے - شدت سے اللہ یاد آرہا تھا
چند ماہ سے آپ کے ویڈیو اور آڈیو کیسٹ بھی مل گئے ہیں جن کے ذریعے تفسیرِ قرآن
سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں اپنے اعمال دیکھتے ہوئے اللہ سے بے حد خوف ہے - اللہ
کرے یہ خوف زندگی بھر قائم رہے اور مرنے سے پہلے ہمارے اعمال درست ہو جائیں
للہ کی راہ میں نکالی ہوئی پہلی رقم کا چیک آپ کے ادارے کو روانہ کر رہی ہوں - اس
خیال سے کہ اس رقم سے آپ ان کیسٹوں کو دوسرے شہروں میں فروغ دیں گے لاہور
میں تو آپ خود موجود ہیں -

کل ہی آپ کا ابوظہبی کا کیسٹ "عظمتِ قرآن" کے نام سے دیکھا - اللہ آپ کو
جزا دے - آپ کا لیکچر یا درس سُن کر ذہن مطمئن ہو جاتا ہے یہ کیسٹ میں اپنے
تمام بہن بھائیوں کے لئے ٹیپ کر رہی ہوں - ان کیسٹ کو سُن کر ریاض میں دو عدد
لیڈی ڈاکٹر جو کراچی سندھ میڈیکل کی پڑھی ہوئی ہیں - انہوں نے ڈاکٹری چھوڑ کر
پردہ شروع کر کے تبلیغ کا کام شروع کیا ہے - تیس چالیس خواتین ہر ہفتہ درس کے
پروگرام میں شریک ہو جاتی ہیں - ایک خاتون نے دو عدد VCR اس کام کے لئے
وقف کر دیئے ہیں کہ عام لوگ بھی آپ کے درس کے کیسٹ ٹیپ کر سکیں - تیسری
لیڈی ڈاکٹر اور اُن کے شوہر دن رات عربی سیکھ رہے ہیں اور آپ کے کیسٹ سُن کر
بہت سی لغویات سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں - یہ تفصیل میں نے اس لئے لکھی ہے
تا آپ کو معلوم ہو جائے کہ آپ کے درس کے کیسٹ کتنا اہم کام انجام دے رہے ہیں !
اللہ نے آپ کے خطاب اور بیان میں وہ بات پیدا کر دی ہے کہ دلوں پہ اثر کرتا ہے -
میرے والد مرحوم بہت شوق سے TV پہ آپ کو سُنتے تھے اور پروگرام بند ہونے پہ
بہت شدید رنجیدہ تھے - اللہ پاکستان کی حکومت کو نیک ہدایت دے کہ وہ عوام کو بہترین
درس سے محروم نہ کریں - اس غریب ملک میں تو TV اور ریڈیو کے ذریعہ گھر گھر اس
قسم کے درس سُنے جا سکتے ہیں - اوّل تو کوئی اس قسم کا پروگرام آتا نہیں ہے اور
اگر آئے تو صرف ۱۵ - ۱۰ منٹ کا - پھر یہ کہ واعظ میں جوش و جذبہ کا فقدان

کم از کم میرے جیسے انسان کو سننے پر راغب نہیں کر پاتا - اسی لئے محترم بزرگ میری دلی خواہش ہے کہ آپ قرآن اکیڈمی میں ان کیسٹ کو خصوصی طور پہ تیار کر وا کر پاکستان میں گھر گھر رائج کرائیں - اللہ تعالیٰ آپ کو صحت زندگی اور طاقت عطا کرے کہ آپ سالہا سال تک مسلمانوں کو درس اور اللہ کے خوف کا احساس دلاتے رہیں آمین عمرے پر بھی انشاء اللہ خصوصی دعا کروں گی -

آپ سے بھی التجا ہے کہ میرے والد محمد حامد اور سسر خلیل اللہ کی مغفرت کی دعائیں کریں - مزید یہ کہ ۱۲ سال بعد اللہ نے بیٹے جیسی نعمت دی جو صرف ۱۴ماہ کا ہے اس کی درازئ عمر کے ساتھ نیک اور صالحین میں شامل ہونے کی دعائیں کریں - اللہ ایسے بندوں کی دعائیں ضرور سنتا ہے جو اسے یاد رکھتے ہیں -

نکہت

ریاض - سعودی عرب

ماہرینِ تعلیم توجہ فرمائیں

قرآن کالج میں پرنسپل کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے ایسے اصحاب سے درخواستیں مطلوب ہیں جو دینی مزاج رکھنے کے ساتھ ساتھ درج ذیل اہلیت کے حامل ہوں :

(i) عربی زبان میں اچھی دسترس رکھتے ہوں -

(ii) اکنامکس، پولیٹیکل سائنس یا ایجوکیشن میں ایم اے یا پی ایچ ڈی کی ڈگری رکھنے والوں کو ترجیح دی جائے گی -

(iii) کسی کالج میں تدریس کا کم وبیش دس سالہ تجربہ رکھتے ہوں جس میں ایڈمنسٹریشن کا کم از کم پانچ سالہ تجربہ شامل ہو -

نوٹ : مناسب تجربہ اور اہلیت رکھنے والے حضرات یکم اگست سے پہلے پہلے رابطہ فرمائیں :

المعلن : قمر سعید قریشی، ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن

فون : ۸۵۲۶۸۳

قرآن کالج میں داخلے کے بارے میں

ایک اہم اعلان

طے شدہ پروگرام کے مطابق قرآن کالج میں تدریس کا آغاز اوائل جون سے ہونا تھا۔ لیکن اس دوران ہمیں کراچی اور پشاور کے طلبہ کی طرف سے متعدد خطوط موصول ہوئے ہیں۔ جن میں یہ درخواست کی گئی ہے کہ چونکہ کراچی اور پشاور میں انٹر کے امتحانات ماہ جولائی میں متوقع ہیں لہٰذا قرآن کالج میں تدریس کے سلسلے کا آغاز ماہِ اکتوبر سے کیا جائے تاکہ ان شہروں کے طلبہ بھی اس کالج میں داخلے سے محروم نہ رہیں۔

اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر اور بعض دیگر وجوہات کی بنا پر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی مجلسِ منتظمہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ قرآن کالج میں تدریسی سلسلے کا آغاز یونیورسٹی کے شیڈول کے مطابق ماہِ اکتوبر سے کیا جائے گا۔

لہٰذا اب داخلہ بھیجنے کی آخری تاریخ ۳۱ مارچ کی بجائے ۳۱ اگست ہوگی۔

نوٹ: کالج پراسپکٹس اور داخلہ فارم حاصل کرنے کیلئے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے نام دس روپے کا پوسٹل آرڈر یا ڈاک ٹکٹ روانہ کریں

المعلن: قمر سعید قریشی، ناظمِ اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن فون ۸۵۲۶۸۳

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

آزاد کشمیر کے دُور افتادہ گاؤں محمد آباد میں شاہین بچوں کو قرآن اور دیگر علوم دینیہ پڑھانے کے لئے اپنی ایک کنال زمین وقف کر کے دار العلوم محمدی خدام القرآن والسنۃ کا آغاز کر دیا ہے۔ مسجد اور مدرسے کی تعمیر کے پہلے مرحلے میں ۲ لاکھ ۲۹ ہزار روپے کے منصوبے پر کام کی تکمیل کے لئے اہلِ خیر سے تعاون کی اپیل ہے۔

تعاون کرنے والے حضرات نقد رقوم کے علاوہ سیمنٹ سریا اور دیگر تعمیراتی لوازم کے علاوہ لائبریری کے لئے کُتب و فرنیچر کی فراہمی کے ذریعے بھی تعاون فرما سکتے ہیں۔

ترسیلِ زر و رابطہ: مہتمم صاحبزادہ سید حسین احمد ہاشمی اکاؤنٹ نمبر ۱۴۲ نیشنل بنک گڑھی دوپٹہ، موضع محمد آباد ڈاک خانہ لنگر پورہ ضلع مظفر آباد آزاد کشمیر۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد ۳۶
شمارہ ۶
شوال المکرم ۱۴۰۷ھ
جون ۱۹۸۷ء
فی شمارہ -/۵
سالانہ زرتعاون -/۵۰

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

مینجنگ ایڈیٹر
اقتدار احمد

ادارہ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی
حافظ عاکف سعید
مقبول الرحیم مفتی

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات — ۲۵ سعودی ریال یا -/۱۱۵ روپے پاکستانی
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر — ۶ امریکی ڈالر یا -/۱۰۰ روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ — ۹ امریکی ڈالر یا ۱۵۰ ″
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ — ۱۲ امریکی ڈالر یا ۲۰۰ ″

ترسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴ (پاکستان)، لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: ۸۵۲۶۸۳-۸۵۲۶۱۱
سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی فون ۲۱۶۵۸۴
طابع: چوہدری رشید احمد مطبع: مکتبہ جدید پریس شاہراہ فاطمہ جناح، لاہور

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقتدار احمد

عرض احوال

پچھلے ماہ عرض احوال کے زیریں حاشیئے میں معذرت کے ساتھ قارئین "میثاق" کو بتایا گیا تھا کہ انتخابی فہرستوں میں کاتب حضرات کی شدید اور پُر از منفعت مصروفیت کے باعث نہ صرف پرچہ دیر سے تیار ہوا بلکہ رنگ برنگی کتابتوں کا مرقع بھی بنا ہے۔ چند مضامین جدید کمپوزنگ سسٹم یعنی نستعلیق بذریعہ کمپیوٹر' میں بھی تیار ہوئے۔ اس مشینی کتابت سے ہمیں پہلی بار واسطہ پڑا تھا لہٰذا ہمارے اناڑی پن نے بھی خاصے گل کھلائے۔ تاہم یہ ضرور ہوا کہ اس جدت کی خوبیاں ہم پر آشکار ہوئیں اور محسوس کیا گیا کہ اگر اسی کو پورے طور پر اختیار کیا جائے تو اولاً پرچے کے حسن صورت میں نمایاں اضافہ ہو گا اور ثانیاً پہلے سے کہیں زیادہ مواد پڑھنے والوں کو ضخامت کم کر کے بھی پہنچایا جا سکے گا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس بار پچھلے شمارے کے مقابلے میں زیادہ مضامین مشینی کتابت میں آئے ہیں اور انشاء اللہ اگلا پرچہ از اول تا آخر اسی انداز میں ہو گا جس کا بشری اندازوں کے مطابق نہایت قابل اعتماد انتظام کر لیا گیا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ یہ وضاحت بھی کر ہی دینی چاہئے کہ "میثاق" کی ضخامت کم کرنے سے جو بچت ہمیں کاغذ اور طباعت وغیرہ کے اخراجات میں ہو گی 'اس سے دوچند اضافی لاگت مشینی کتابت پر آتی ہے۔

رہا تاخیر کا مسئلہ تو اس باب میں ایک بار پھر ہمیں معذرت ہی طلب کرنی پڑ رہی ہے۔ ماہ رمضان المبارک میں زندگی کے معمولات مسلمان معاشرے میں ایک حد تک تو ہر جگہ ہی متاثر ہوتے ہیں لیکن ہمارے ادارے اور اس کے محل وقوع یعنی قرآن اکیڈمی میں یہ اثرات زیادہ ہی محسوس کئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق اور قرآن مجید سے قلبی و عملی تعلق کی بدولت یہاں گذشتہ کئی سال سے اس مبارک مہینے کی راتیں "حبل الله المتين" کے ساتھ بسر کی جاتی ہیں۔ ہمارے قارئین کی اکثریت اس معمول سے اب تک واقف ہو چکی ہو گی جس کی ابتداء کی سعادت برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو حاصل ہوئی۔

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

انہوں نے چار سال پہلے قرآن اکیڈمی کی مسجد میں ہمت کر کے "صوم رمضان" کی طرح "قیام رمضان" کو بھی اس کی حقیقی اور مطلوب شکل دینے کا بیڑا اٹھایا۔ عشاء کی نماز کو دوسری مساجد کے وقت سے تھوڑا سا موخر کیا جاتا اور پھر شب بھر میں بیس تراویح یوں پوری کی جاتی تھیں کہ وہ ہر چہار رکعت سے پہلے ان میں پڑھے جانے والے جزو قرآن کا ترجمہ مع ضروری تشریح بیان کرتے اور ہر سورہ مبارکہ

کے آغاز سے قبل اس کا مجموعی تاثر مضامین کا خلاصہ اور عمود بھی بتاتے تھے۔ حاصل اس کا یہ ہوتا کہ پھر جب بندے رب کے روبرو دست بستہ کھڑے ہو کر خوش الحان حافظ سے قرآن مجید کا وہی حصہ سنتے تو " زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم " والی بات نہ ہوتی بلکہ لطف حضوری حاصل ہوتا تھا۔ جوں جوں رات بھیگتی توں توں حافظ محمد رفیق صاحب کی سریلی آواز میں سوز بڑھتا اور مقتدیوں کو تنزیل کا وہ کیف ملتا جس کی ضرورت علامہ اقبال مرحوم نے یوں بیان فرمائی تھی ۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

اس نماز تراویح سے فارغ ہو کر نمازیوں کو سحری کھانے کے لئے گھروں کی طرف باقاعدہ دوڑ لگانی پڑتی اس لئے کہ وقت بہت ہی تنگ رہ جاتا تھا۔ اندازہ لگایا گیا تھا اور ہر طرف سے اس اندازے کی توثیق ہی ہوئی کہ رمضان المبارک کی راتوں میں اس نہج پر قرآن مجید کا "ختم" کم از کم زمانہ قریب کی معلوم و مشہور تاریخ میں پہلی بار ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے موسم کے شدائد' دور جدید کی آسائشوں ازقسم ایئر کنڈیشننگ وغیرہ سے رضا کارانہ محرومی اور ناقابل اعتماد جسمانی صحت کے باوجود یہ کارنامہ محض اپنے خلوص و اخلاص کے بل پر' پیغام ربانی کو لوگوں کے سینوں میں اتارنے کی دھن میں اور اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم کی بدولت انجام دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دنوں قرآن کے اعجاز' ڈاکٹر صاحب موصوف کے بیان اور اللہ تعالیٰ کے صفت رحمانیہ کا مظاہرہ سینکڑوں مستقل شرکاء نے بہ چشم سر دیکھا۔ کتنا مستند ہے رب کریم کا یہ فرمان

الرحمن ○ علم القرآن ○ خلق الانسان ○ علمه البیان ○

ڈاکٹر صاحب کا یہ لگ بھگ ایک سو گھنٹوں پر مشتمل بیان ریکارڈ ہوا اور اس کے آڈیو ٹیپ دنیا کے کونے کونے میں پہنچے ہیں۔ اگلے سال پھر قرآن اکیڈمی کی مسجد ہی کو یہ شرف دوبارہ حاصل ہوا لیکن بعد ازاں یعنی پچھلے رمضان المبارک ڈاکٹر صاحب کراچی کے احباب کے اصرار کو رد نہ کر سکے اور وہاں ناظم آباد کی ایک بڑی مسجد میں ان کا یہ ماہ مبارک اسی ڈھنگ سے گذرا' البتہ اب کی بار نہ ان کی صحت اس مشقت کی متحمل تھی اور نہ وہ پورے مہینے ملک میں قیام کا ارادہ رکھتے تھے۔ تاہم الحمد للہ کہ اللہ کے اس بندے کا لگایا ہوا یہ شجر طیبہ برگ و بار لا رہا ہے۔ پچھلے سال ان کے قیام کراچی کے دوران لاہور میں ان کے رفقاء اور خوشہ چینوں نے دو جگہ اس رسم کو نبھایا تھا۔ اس بار تین مقامات پر یہ رونق لگی اور ساتھیوں کا عزم ہے کہ اگلے برس انشاء اللہ لاہور کی جس جس مسجد کے نمازی رحمت کی اس بارش میں بھیگنے پر آمادہ ہوئے وہاں وہاں یہ بادل اُمڈیں گے۔

جملہ معترضہ بہت طویل ہو گیا' معذرت تاخیر کی تھی۔ چونکہ افطار اور سحری کے درمیان سونے یا آرام کرنے کا کوئی موقعہ نہیں ہوتا تھا لہٰذا باوجود خواہش اور کوشش کے' ادارہ "میثاق" کے متعلقین صلاحیت کار کو غیر معمولی حد تک کم ہونے سے روک نہ سکے چنانچہ۔

ع ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

انشاءاللہ آئندہ پرچہ بروقت آپ کے ہاتھوں میں ہو گا اور باقاعدگی کے تسلسل کو قائم رکھنے کی بھی امکانی کوشش کی جائے گی' وماتوفیقی الا باللہ

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

تنظیم اسلامی کے امیر محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب' ان کی جماعت اور ان کی دعوت کے اعوان و انصار بہت پہلے سے تائید و توفیق ربانی کے طفیل اس شعوری فیصلے پر قائم اور مطمئن ہیں کہ "اظہار دین الحق علی الدین کلہ" بطور مسلمان ہمارا دینی فریضہ ہی نہیں بلکہ پاکستان کے باسی ہونے کے ناتے حب وطن کا بھی اولین تقاضا ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب اپنے مقالے میں جو کثیر الاشاعت معاصر روزنامہ جنگ میں بالاقساط "میثاق" میں بحساب ابواب اور کتاب کی شکل میں "استحکام پاکستان" کے نام سے علیحدہ بھی شائع ہوا اور جس کا اندرون و بیرون ملک وسیع پیمانے پر ابلاغ ہوا ہے' پوری شرح و بسط کے ساتھ یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ بقاء و استحکام پاکستان کا واحد ذریعہ ملک میں حقیقی اسلام کا واقعی نفاذ ہے۔ پھر لطف یہ کہ قیام پاکستان کے محرکات کے بارے میں جتنے مونہہ جتنی باتیں کرتے ہیں ان میں سے کسی ایک کا بھی ابطال کئے بغیر انہوں نے منطق اور برہان سے اپنے اس دعوے کو شک و شبہ سے بہت بلند کر دکھایا ہے کہ اسباب و محرکات کا ذکر چھڑتا ہے تو بات پہنچتی یہیں تک ہے کہ "پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ"۔ اس حقیقت کو بھی انہوں نے دو اور دو چار کی طرح ثابت کیا ہے کہ بحالات موجودہ پاکستان میں حقیقی اسلام کا واقعی نفاذ کسی اور حیلے بہانے سے ممکن نہیں' اس کا واحد ذریعہ "اسلامی انقلاب" ہے۔ اس انقلاب کی تعریف' ضرورت اور طریق کار پر کتاب و سنت کی روشنی میں بالعموم اور ان مراحل سے بالخصوص جو اس بجلی کے کڑکے اور صوت ہادی' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کی زمین ہلا کر رکھ دینے میں[1] پیش آئے' اپنے مطالعہ کا حاصل بھی وہ گفتگو اور تقاریر میں تو تفصیل سے بیان کر چکے ہیں لیکن تحریر میں منضبط کرنا تاحال باقی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اسی موضوع پر لکھنے کے ارادے کے ساتھ اس وقت "البلد الامین" میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں وہاں کی برکات سے کماحقہ مستفید ہونے کے ساتھ ساتھ اس اہم موضوع کا حق ادا کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائے جو لاریب وطن عزیز کے لئے موت و زیست کا مسئلہ ہے۔ آمین

اس ذکر کی نوبت یوں آئی کہ پرائیویٹ شریعت بل کو پارلیمینٹ سے پاس کرانے کی جو مہم چند ماہ سے ملک میں چل رہی تھی وہ اب آخری مرحلے میں داخل ہوتی نظر آتی ہے۔ ہم اگر یوں کہیں تو بے جا نہ ہو گا کہ "طریق جمہوری" سے نفاذ اسلام کی شاید یہ آخری کوشش ہے۔ اس سے پہلے کیسے کیسے

---

[1] وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی ...... حالی

سنہری مواقع ہم گنوا بیٹھے ہیں۔ شمار کو محدود بھی رکھیں تو وہ دو ساز گار مواقع تو قیل و قال سے ماوراہیں ہی جو قیام پاکستان کے فوراً بعد اور ۱۹۷۷ء کی "تحریک نظام مصطفیٰ" کے نتیجے میں مارشل لاء کی آمد سے میسر آئے۔ ان میں سے موخرالذکر موقع کو اس اعتبار سے ہم زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں کہ رسم دنیا بھی تھی، موقع بھی تھا، دستور بھی تھا۔ احیائے اسلام کے لئے عالمی سطح پر ایسی حرکت دکھائی دیتی تھی جس سے فرنگی بتکدے کے پروہت لرزاں و ترساں تھے۔ برادر ہمسایہ ملک ایران نے لگ بھگ انہی دنوں اور ایسی ہی تحریک کے نتیجے میں اپنے انداز کا اسلامی انقلاب برپا کر کے دکھا بھی دیا۔ ہمارے اپنے ملک میں "پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ" کا آہنگ ہماری اب تک کی تاریخ میں بلند ترین تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اقتدار و اختیار کا سرچشمہ بھی حسن اتفاق سے ایک ایسا اللہ کا بندہ بن گیا تھا جس کے صوم و صلوٰۃ کا چرچا تو اب تک ہے، دین پسندی کا رجحان اس وقت زیادہ ہی عیاں تھا۔ لیکن آئے بھی وہ، گئے بھی وہ، ختم فسانہ ہو گیا۔ ساڑھے آٹھ سال تک کوس لمن الملک بجا کر انہوں نے "پردہ کر لیا"۔ اب نفاذ اسلام کے باقی ماندہ کام کی ذمہ داری جس کو پورا کرنے کی خاطر انہوں نے قوم سے اپنی صدارت میں پانچ سال کی توسیع "وصول" کی تھی، جمہوری حکومت کے سر ہے کیونکہ انہیں آخر کار "سینے پر پتھر رکھ کر" انتخابات کروانے پڑ گئے تھے۔ تاہم ماحول بایں معنیٰ اب بھی ساز گار ہے کہ نفاذ اسلام کی ہر کوشش کو خاص ان کی آشیرواد حاصل ہے۔ نمائندگان جمہور بھی الا ماشاء اللہ سب کے سب اسلام کے نام پر ووٹ لے کر آئے ہیں۔ سوشلزم کے علم برداروں اور لادینیت کے پرچار کوں کو اسمبلی اور سینٹ کے قریب تک نہیں پھٹکنے دیا گیا اور علماء ورجال دین بھی جس تعداد میں پارلیمنٹ میں پہنچ گئے ہیں اس کی نظیر سابقہ ایوانوں میں نہیں ملتی۔ لیکن ان سب عوامل کے باوصف بھی شریعت کی بالادستی تاحال ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ نفاذ شریعت کی امیدیں دم توڑتی نظر آتی ہیں ؎ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ متحدہ شریعت محاذ کی شکل میں اجتماعی جدوجہد کی جو ایک کوشش کی گئی تھی اس کا مآل بھی اب تک تو خوش آئند نہیں۔

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو
اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

اس محاذ میں علاوہ دیگر دینی جماعتوں کے جزوی حصوں اور متفرق و محترم علماء کرام کے، اگرچہ تنظیم اسلامی بھی اپنی حیثیت کے ماوجب شعور کے ساتھ شامل تھی لیکن مجوزہ قوت محرکہ "جماعت اسلامی" ہی کو سمجھا گیا۔ بلکہ نوبت بہ ایں جا رسید کہ حلقہ دیوبند کے جید علمائے کرام کی طرف سے پیش کردہ "شریعت بل" کو کرم فرماؤں نے بطور دشنام "منصورہ برانڈ اسلام" کا نام تک دے ڈالا۔ غالباً حکومت بھی اسی خیال میں ہے۔ اور وزیر اعظم کے مشیر مذہبی امور کا تقرر مع توقیت تقرری ہمارے اس گمان کو تقویت دیتی ہے۔ پیر محمد اشرف صاحب مدظلہ کی نامزدگی تو معلوم ہوتا ہے کہ خاص جماعت اسلامی ہی کو کھدیڑنے کے لئے کی گئی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ہمارے یہ اندیشے درست ثابت ہوئے تو.......... اگرچہ اس میں ہمارے لئے ہرگز کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی .. ہمارا یہ سوچا سمجھا موقف مزید مبرہن ہوگا کہ نفاذ شریعت فی الحقیقت نظام کی تبدیلی ہے اور نظام کی تبدیلی انتخابی سیاست سے نہیں انقلابی عمل سے ہی لائی جا سکتی ہے۔ البتہ جماعت اسلامی اور اس کے حلقہ ہمدرداں کے لئے لمحہ فکریہ ہوگا۔ انہیں فیض کی زبان میں ایک بار پھر یہ کہنا ہوگا۔

یہ فصل امیدوں کی ہمدم — اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت صبحوں شاموں کی — اب کے بھی اکارت جائے گی

رہی "جمہوری حکومت" تو بظاہر نفاذ شریعت اس کے لئے تاحال سانپ کے مونہہ میں چھچھوندر بنی ہوئی ہے کہ نگلے تو اندھا' اگلے تو کوڑھی لیکن میکیاولی سیاست کے پہلوان ڈنڈ پیل رہے ہیں کوئی نہ کوئی داؤ کھیل کر رہیں گے۔ وہ شیخ چلی تو نہیں کہ اسی ٹہنے پر شریعت کی آری چلادیں جس پر وہ اپنے مفادات سمیت براجمان ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

صد حیف کہ بنظر غائر دیکھنے سے نقشہ یہ نظر آتا ہے کہ ؎ میں الزام اس کو دیتا تھا' قصور اپنا نکل آیا نفاذ شریعت کی مہم اور اس کے لئے کدو کاوش مبارک و مسعود لیکن اس سوال سے کیسے پیچھا چھڑایا جائے کہ معاشرے کو نفاذ شریعت کی قبولیت کے لئے تیار کرنے کا کام کس نے اور کتنا کیا ہے؟۔ ملک خداداد پاکستان کی وافر نعمتوں سے مستفید ہونے اور مسلمانوں جیسے نام رکھنے والے کتنے ہی بدبخت تو ایسے بھی یہاں دندناتے پھرتے ہیں جو اسلام ہی نہیں خود اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے (خاکم بدہن) بیزار ہیں اور علی الاعلان اپنی اس ناپاک جسارت کا چرچا بھی کرتے ہیں۔ اس قلیل تعداد سے قطع نظر ابنائے وطن کی عظیم اکثریت اسلام کو صرف "مذہب" کی حیثیت سے جانتی اور مانتی ہے۔ اس کے "دین" ہونے کا کچھ دھندلا سا اندازہ معدودے چند لوگوں کو ہے بھی تو بس عقیدت کی حد تک اور غیروں کے آگے ادعا کے لئے۔ اور یہ بھی ثمرہ ہے زمانہ قریب میں مولانا ابوالکلام آزاد' علامہ اقبال اور مولانا مودودی رحمہم اللہ کے علوم جدیدہ کے تناظر میں وقیع علمی کام کا۔ وگرنہ اس کے شعوری تصور سے ذہن..... الا ماشاءاللہ .... عاری ہیں۔ اپنی نجی' معاشرتی اور کاروباری زندگی پر دین کو حتی الامکان نافذ کرنے والے لوگ اب انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ اپنے اللہ سے وعدے وعید کر کے یہ وطن مانگنے والے اتنی جلد نقض عہد کے مرتکب کیوں کر ہوئے۔ اس کے اسباب و علل اور ذمہ داری کی فرد جرم تیار کرنے کے لئے دفتر ہی درکار نہیں چیتے کا جگر اور شاہین کا تجسس بھی چاہئے۔ البتہ اتنی بات کہے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا کہ ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی تشخیص کے مطابق اپنی شامت اعمال کے باعث ہم "وہن"[1] کا شکار ہو گئے ہیں جس کا علاج

---

[1] یعنی حب الدنیا و کراهیۃ الموت۔ دنیا سے محبت اور موت سے فرار کی خواہش

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور موقع پر موت کو اکثر یاد کرتے رہنا اور قرآن مجید کی بکثرت تلاوت .... سمجھ کر اور عمل کی نیت سے کرنا بتایا تھا۔ [1]

عوام الناس کا مسئلہ اتنا ٹیڑھا نہیں "الناس علی دین ملوکھم"۔ وہ تو خواہی نخواہی ہانک ہی لئے جاتے ہیں لیکن دور ملوکیت کے اختتام پر اور بالخصوص موجودہ پرفتن زمانے میں "ملوکھم" میں حکومت تو شامل ہے ہی۔ ذرائع ابلاغ 'ادب و دانش' فلسفہ و تعلیم' گروہی مفادات اور بین الاقوامی جوڑ توڑ کے پیر بھی ہاتھی کے اسی پاؤں میں آتے ہیں۔ یہ سب مل کر زور لگا رہے ہیں کہ پاکستان کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارہ نہ بننے دیا جائے۔ اسلام یہاں اذن باریابی پائے بھی تو چھوٹا بن کر' "کلمۃ اللہ ھی العلیا" نہ ہو۔ دین حنیف کے دور جدید کی اجتہادی ضروریات سے تطابق کے بہانے موم کی ناک بنانے کی خواہش کس کس روپ میں سامنے آ رہی ہے۔ اس جرات رندانہ کی توفیق بھی کبھی کھل کر اور کبھی الفاظ و معانی کے طلسم کی آڑ میں گاہے گاہے جھلک دکھاتی ہے کہ ع خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں .. یہ تو ہوئی اسلام کا راستہ روکنے کی مثبت کوشش منفی طور پر پوری قوم کو ہر نوع کی دینی اور اخلاقی بے راہ روی کی طوفانی لہروں کے اس طور حوالے کیا جا رہا ہے کہ "دامن تر مکن ہشیار باش" کہنے کے لئے بڑی ہی ہمت کی ضرورت ہے۔ معاشرے کے اس دیمک زدہ ڈھانچے پر شریعت اسلامی کا بار ڈال دیا گیا تو اسے تھام کر رکھنا واقعی "من عزم الامور" ہو گا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

سندھ کی صورت حال پر جتنی تشویش کا اظہار "میثاق" کے صفحات پر ہوا وہ ہمارے قارئین کے علم میں ہے بلکہ ہم نے تو محض اظہار تشویش پر اکتفاء نہ کیا' حالات کے عمیق تجزیئے اور ممکنہ حل بھی پیش کئے ہیں۔ یہ تک ہوا کہ امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پر ملک و ملت کے بعض "بہی خواہوں" نے پھبتیاں بھی کسیں کہ شاید انہیں سندھ فوبیا ہو گیا ہے۔ لیکن ع قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم ..... وہاں اغواء کی وارداتوں اور تاوان کے مطالبوں میں تجربیت کا کوئی پہلو نہیں رہا۔ لیکن حالیہ دو واقعات جن میں معروف اور کلیدی صنعت کار خاندان کے اہم فرد جناب سلیمان ولوؤا اور ایک متوسط تاجر و صنعت کار جناب عبدالعزیز غوری پر ہاتھ ڈالا گیا' بہت سی پر اسرار اور چونکا دینے والی حکایتوں کو الم نشرح کرنے کا باعث بنے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کیر تھر کے پہاڑی سلسلے میں دہشت گردوں کی ایک متوازی حکومت قائم ہے جس کی روح رواں پڑھے لکھے اور عسکری تربیت یافتہ نوجوان ہیں۔ اسلحے کے ذخائر وافر ہیں' تخریب کاری اور گوریلا طرز جنگ کے تربیتی کیمپ کام کر رہے ہیں اور ان کا رسل و رسائل کا نظام بھی اتنا مربوط ہے کہ ان پر ہاتھ ڈالنا خالہ جی کا گھر نہیں۔

---

[1] کثرۃ ذکر الموت و تلاوۃ القرآن

کیرتھر کا پہاڑی سلسلہ عظیم ترین اور حساس صنعتی علاقے نوری آباد اور کراچی کو باقی ماندہ ملک سے ملانے والی اہم شاہراہ پر ایسے سایہ فگن ہے کہ وہاں سے کسی بھی وقت شب خون مار کے حالات کو نازک موڑ پر لایا جاسکتا ہے۔ اس میں مورچہ بند نوجوانوں کا نظریاتی رشتہ ملحقہ آبادی "سن" میں جی۔ ایم۔ سید صاحب سے بھی بتایا جاتا ہے۔ اہل نظر حالات کے تیور خود ہی پہچانیں۔ مگر ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔ برائے خدا حکومت سے درخواست کیجئے کہ وقت کو ہاتھ سے بالکل ہی نکل جانے نہ دے۔ ذاتی وقار اور انا کا سوال مسائل کے سیاسی حل میں یوں ہی آڑے آتا رہا تو ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں .... نعوذ باللہ من ذالک

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اس اخباری اطلاع سے ذہنی اذیت بھی ہوئی اور روحانی کرب بھی محسوس ہوا کہ مشہور محقق مولانا محمد حنیف ندوی علیل اور کسمپرسی کا شکار ہیں۔ اپنے خرچ پر بغرض علاج لندن تک ہو آئے ہیں لیکن شاید اپنے وسائل کی نارسائی کے باعث افاقے کی صورت نہیں بنی۔ ان کے معالج نے حکومت سے اپیل کی ہے کہ۔

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

مولانا کے بعض نظریات سے اختلاف کی گنجائش ہے لیکن اسلام کے لئے ان کا تحقیقی کام اور علم و دانش کے میدان میں ان کی کاوشیں اس "خدمت" سے یقیناً زیادہ وقیع ہیں جو مینا شوری[1] نے "فن" کے لئے انجام دیں۔

ہم بصمیم قلب رب العزت سے دعا کرتے ہیں اور قارئین سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ ہماری اس دعا میں شریک ہوں کہ وہ انہیں صحت کاملہ عاجلہ عطا فرمائے اور کچھ ایسا انتظام کر دے کہ ان کی مشکل آسان بھی ہو جائے اور ان کی خودداری و عزت نفس پر بھی آنچ نہ آنے پائے۔

---

[1] مسلم فلمی اداکارہ جس نے عالم شباب میں جو دھومیں مچائیں ان میں ایک ہندو سے شادی بھی شامل تھی۔ اس کے نام کا لاحقہ "شوری" اسی ہندو شوہر کی باقیات میں سے ہے۔ اب بڑھاپے اور پیچیدہ بیماریوں کا شکار تھی اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ کی عنایت خسروانہ کی بدولت سرکاری خرچہ پر علاج کیلئے لندن میں مقیم ہے۔

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن کا سلسلہ

الھدیٰ

درس نمبر ۱۱

نشست نمبر ۴۲

مباحثِ عملِ صالح

بندۂ مومن کی شخصیّت کے خدّوخال

(سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں)

(۶)

السلام علیکم۔ نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ اما بعد
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْ لَا دُعَآؤُکُمْ ج فَقَدْ کَذَّبْتُمْ
فَسَوْفَ یَکُوْنُ لِزَامًا ۔ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ ط

"اے نبی! فرما دیجئے، میرے رب کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے اگر نہ ہوتا تمہارا پکارنا۔ سو تم جھٹلا چکے ہو اب اس کی سزا جلد ہی تمہیں چمٹ کر رہے گی۔"

محترم ناظرین اور معزز سامعین!

یہ سورۃ الفرقان کی آخری آیت ہے اس سورۃ مبارکہ کے آخری رکوع کا جو درس ان نشستوں میں ہوا ہے، اس کا اصل مضمون تو پچھلی نشست میں ختم ہو گیا ہے یعنی یہ کہ عباد الرحمٰن کے اوصاف کیا ہیں! ۔ اور از روئے قرآن ایک پوری طرح تعمیر شدہ انسانی شخصیت کے خدوخال کیا ہیں! یا علامہ اقبال کے الفاظ میں 'مردِ مومن' کے خصائص کیا ہیں! سورۃ الفرقان کی یہ آخری آیت جو ابھی آپ نے سنی اور اس کا رواں ترجمہ بھی سماعت فرمایا، ۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس آیت میں اور اس سورۃ مبارکہ

کی پہلی آیت میں بڑا گہرا ربط و تعلق ہے۔ پہلی آیت مبارکہ ہے: "تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝" "بڑی بابرکت ہے وہ ہستی جس نے نازل فرمایا الفرقان یعنی قرآن مجید۔ اپنے بندے پر یعنی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لیے خبردار کرنے والے بن جائیں"۔

ایمانیات کے ذیل میں یہ بات ہمارے سامنے آچکی ہے کہ ایمان کے تین بڑے بڑے اجزا ہیں۔ ایمان باللہ یا توحید۔ ایمان بالآخرہ یا معاد۔ ایمان بالرسالت۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی پہلی دو آیات ایمان باللہ سے بحث کرتی ہیں۔ یاد ہوگا کہ فرمایا گیا تھا: "تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۝" میں نے عرض کیا تھا کہ ان سب کا نتیجہ کیا ہے! ایمان باللہ۔ سورہ الفرقان کی پہلی اور آخری آیت، جس کی میں نے ابھی تلاوت کی، ان دونوں کا تعلق ایمان بالرسالت سے ہے۔ اللہ تعالیٰ رسولوں کو کیوں بھیجتا رہا! نبوت و رسالت کی غرض و غایت کیا ہے! سورہ النسآء کی آیت ۱۶۵ میں یہ مضمون بڑی وضاحت سے اور بڑے واضح الفاظ میں آیا ہے فرمایا: "رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝" "ہم اپنے رسولوں کو بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجتے رہے تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے یہاں کوئی عذر، کوئی حجت باقی نہ رہ جائے۔ اور اللہ تو ہے ہی زبردست، غالب، حکمت والا"۔ معلوم ہوکہ رسولوں کو بھیجنے کا ایک اہم مقصد تھا "اتمام حجت اور قطع عذر" تاکہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ اے اللہ ! ہمیں پتہ نہیں تھا کہ تو کیا چاہتا ہے ! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تجھے کون سے اوصاف پسند ہیں! ہم جانتے نہیں تھے کہ تو کن چیزوں سے ناراض ہوتا ہے! — اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں بھیجا تو اُسے سماعت و بصارت اور عقل و شعور اور نیکی و بدی کی تمیز جیسی بہت سی چیزوں سے مسلح کر کے بھیجا۔ یہ ہے بنیادی اور ابتدائی حجت جو ہر انسان پہ

ہے۔ لیکن اتمامِ حجت تب ہوتا ہے جب رسولؐ تشریف لاتے ہیں۔ رسولوں
ن کو پیش کر دیا۔ قولاً بھی پیش کر دیا اور عملاً بھی پیش کر دیا۔ سچ بولنے کی
ب دی ہے تو ساری عمر سچ بول کر دکھایا ہے۔ دیانت اور امانت کی تلقین
ہے تو اپنی زندگیوں میں دیانت و امانت کا نمونہ پیش فرما دیا ہے۔ عدل و قسط
اکید کی تو دوست و دشمن کی تمیز و امتیاز کے بغیر عدل و انصاف کر کے دکھایا ہے۔
اور نصح کی نصیحت کی تو اپنے جان کے دشمنوں اور اپنے اوپر اور اپنے ساتھیوں پر
یا و مظالم ڈھانے والوں کو معاف کر کے دکھایا ہے۔ جو دعوت دی اُس کا نمونہ
لوگوں کے سامنے رکھ دیا۔ تو گویا لوگوں پر قولاً اور عملاً حجت آخری درجہ میں قائم
ی۔ جیسا کہ یہی ہے وہ حقیقت جو سورہ النساء کی اُس آیت میں بیان فرمائی
ہے جو میں ابھی آپ کو سنا چکا ہوں۔

یہی مضمون ہے جو سورۃ الفرقان کی پہلی آیت میں آیا ہے کہ انبیاء و رسل کی
مقدس جماعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک امتیازی شان ہے۔ پہلے بھی رسول
ر و نذیر ہو کر آتے تھے لیکن وہ اپنی اپنی قوموں کی طرف آتے تھے۔ قرآن مجید میں یہ
مون بتکرار آیا ہے: وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ۔ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ؕ
وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ۔ ہودؑ کو بھیجا ہم نے اس کی قوم عاد کی طرف۔
لحؑ کو ہم نے بھیجا اس کی قوم ثمود کی طرف۔ اور شعیبؑ کو بھیجا ہم نے مدین میں بسنے
ل اُس کی قوم کی طرف۔ چنانچہ مطالعہ قرآن کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نبی
م صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل پر نبوت اور رسالتیں علاقائی یا قومی ہوتی
یں۔ لیکن جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ پر جو نبوت کا اختتام
تمام ہوا اور رسالت کی تکمیل ہوئی، اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
لمے جہان والوں کے لئے خبردار کرنے والے بن کر تشریف لائے اور قرآن مجید، فرقان
ید اسی مقصد کے لئے نازل فرمایا گیا: تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی
عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۙ

یہی بات سورۃ الانبیاء میں بایں الفاظ مبارکہ فرمائی گئی: وَمَا اَرْسَلْنٰكَ
اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ اور سورۃ سبا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آفاقی د

عالمی شان کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان فرمایا گیا: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ہ" اور (اے نبی) ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام لوگوں کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر ا" لیکن یہ بات جان لیجئے کہ رسول ہمیشہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے برہان، دلیل اور بیّنہ بن کر تشریف لاتے ہیں لہٰذا جہاں رسولوں کی بعثت رحمت ہے وہاں جو انکار کرنے والے ہیں ان کے لئے دنیا اور آخرت میں یہی چیز موجب عذاب اور موجب سزا بھی ہے۔ رسولوں کی آمد سے پہلے ان کے پاس کوئی عذر تو تھا کہ اے اللہ، ہمیں معلوم نہیں تھا، ہم جانتے نہیں تھے کہ تیری مرضا کیا ہے۔ ارسولوں کے آنے کے بعد عذر ختم ہو گیا۔ اب محاسبہ شدید ہوگا، اب پکڑ سخت آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں بار بار اُن قوموں کا ذکر ہوا ہے جن کی طرف رسولوں کو مبعوث فرمایا گیا اور جب انہوں نے ان رسولوں کا انکار کیا، ان کی تکذیب کی، ان کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے تو اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولوں کو اور اُن چند لوگوں کو جو ان رسولوں پر ایمان لائے تھے بچا لیا، اور اُن قوموں کو ہلاک کر دیا۔ سورۃ الفرقان کی اس آخری آیت میں اہل عرب کو یہی تنبیہہ فرمائی جارہی ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر تمہیں دعوت دے رہے ہیں، تبلیغ کر رہے ہیں، تمہارے پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں ایک ایک گھر پر جا کر پیغام ربانی پہنچا رہے ہیں، ایک ایک انسان کے دل پر دستک دے رہے ہیں تو میرے ربّ کو تمہاری کوئی پرواہ ہے۔ اللہ کو ہرگز تمہاری کوئی پروا نہیں ہے اگر نہ ہوتا تمہیں پکارنا تو ہمارے رسول یہ مشقت نہ جھیلتے۔ چونکہ سنت اللہ یہی ہے کہ کسی قوم پر عذاب بھیجنے سے پہلے اُسے متنبہ کر دیا جائے، اُسے خبردار کر دیا جائے جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ہ "ہم عذاب بھیجنے نہیں رہتے ہیں جب تک رسولوں کو مبعوث نہ فرمادیں"۔ یعنی رسولوں کی آمد کے ذریعے جب تک اتمام حجت نہ ہو جائے۔ اس سے پہلے قومیں ہلاک نہیں کی جاتیں۔ لہٰذا یہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ سے کہلوایا جارہا ہے کہ میں نے تم تک تمہارے رب کا پیغام پہنچا دیا، تمہارے سامنے تمہارے ربّ کی دعوت پیش کر دی۔ مجھ تک جو ہدایت ربانی آئی تھی، اُسے قولاً اور عملاً تمہارے سامنے

پیش کر دیا۔ یہ تمہارے ہی نفع کے لئے کیا گیا ہے ورنہ میرے ربّ کو تمہاری کیا پروا نہیں ہے: مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ۔ یہ تبلیغ دعوت اس لئے ہے کہ تم کو خبردار کر دیا جائے اگر تمہیں پکارنا نہ ہوتا: لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ۔ تو رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری بھی مجھ پر نہ ہوتی۔ لیکن: فَقَدْ كَذَّبْتُمْ تم جھٹلا چکے، تم تکذیب کر چکے ہو۔ عربی زبان میں فعلِ ماضی پر جب "قد" کا اضافہ ہو جاتا ہے تو اس میں کسی کام کے ہو جانے میں قطعیت و حتمیت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں PRESENT PERFECT TENSE کا جو مفہوم ہوتا ہے یعنی کام ہو چکا ہے، بات ہو چکی ہے۔ تو یہی مفہوم ہوتا ہے جب عربی میں فعل ماضی پر "قد" کا اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: فَقَدْ كَذَّبْتُمْ۔ سو لوگو، تم جھٹلا چکے ہو۔ اب عنقریب اس کی پکڑ آ کے رہے گی: فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا۔ لازم و ملزوم کے الفاظ ہم عام بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔ لِزَامًا کے معنی ہوں گے جیسے کوئی چیز چیٹ کر رہ جائے، چپک کر رہ جائے۔ تو فرمایا: فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ۔ سو تم نے دعوتِ ربانی کو جھٹلا دیا پس عنقریب اس کا وبال تم پر لاگو ہو کر رہے گا۔ تمہیں اس تکذیب کی سزا مل کر رہے گی۔

یہ آیتِ مبارکہ نہ صرف اُن لوگوں کے لئے بہت اہم ہے جو قرآن مجید کے اوّلین مخاطب تھے اور جن کے سامنے جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس خلقِ خدا کو دعوت پہنچا رہے تھے بلکہ ہمارے لئے بھی بہت اہم ہے۔ اس لئے کہ جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوّت کا جو اختتام و اتمام ہوا ہے، رسالت کی جو تکمیل ہوئی ہے، اس کا ایک مظہر وہ ہے جو میں عرض کر چکا ہوں کہ حضورؐ کی بعثت ہے پوری نوعِ انسانی کے لئے۔ اور اسی کا دوسرا مظہر یہ ہے کہ آپؐ ہی کا دورِ رسالت تا قیامِ قیامت جاری ہے۔ یہ دور بھی جس میں ہم سانس لے رہے ہیں، یہ بھی دورِ رسالتِ محمدی ہے (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)۔ ہر انسان جو دنیا میں پیدا ہو رہا ہے اور قیامت تک پیدا ہو گا۔ وہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت میں شامل ہے اور ہو گا۔ ہاں اُمتِ اجابت میں وہی شامل ہو گا

و نبی اکرمؐ کی دعوت پر لبیک کہے، حضورؐ کی تصدیق کرے، حضورؐ پر ایمان لائے
لیکن امتِ دعوت سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جن کی طرف کسی رسول کو بھیجا گیا ہو
جیسے قوم عاد تھی، حضرت ہود علیہ السلام کی اُمتِ دعوت۔ جیسے حضرت صالح علیہ
السلام کی اُمتِ دعوت تھی قوم ثمود۔ تو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
امتِ دعوت ہے پوری نوع انسانی۔ اور پیغام ربانی کو جس طرح نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس اُن لوگوں کو پہنچایا جو آپؐ کے مخاطبین اوّلین تھے۔ اسی
طرح یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم روئے ارضی پر بسنے والے ہر شخص تک اسے پہنچائیں۔
حضورؐ نے یہ فریضہ دعوت انجام دیا تکلیفیں جھیل کر، مصیبتیں اٹھا کر۔ آپؐ کا تمسخر
بھی ہوا، استہزا بھی ہوا، آپؐ پر پتھراؤ بھی ہوا۔ آپؐ کے راستہ میں کانٹے بھی
بچھائے گئے، آپؐ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر اس طرح بل دیا گیا کہ چشم ہائے
مبارک اُبل پڑنے کو ہوئیں۔ آپؐ پر کوڑا کرکٹ ڈالا گیا۔ آپؐ کے شانۂ مبارک پر جبکہ
آپؐ سربسجود تھے۔ اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی رکھی گئی۔ طائف کی گلیوں پر
آپؐ پر پتھروں کی اس طور پر بارش ہوئی کہ جسدِ اطہر لہولہان ہو گیا اور جسم سے خون
اقدس بہہ بہہ کر نعلین شریف جم گیا۔ یہ ساری تکلیفیں آپؐ نے جھیلیں لیکن
دین کا پیغام پہنچا کر حجت قائم کر دی۔

اب یہ کام امتِ مسلمہ کے ذمہ ہے، میرے اور آپ کے ذمہ ہے، حضور صلی
اللہ علیہ وسلم کے ہر اُمتی کے ذمہ ہے کہ اللہ کا پیغام ایک ایک فردِ بشر تک
پہنچائیں۔ یہ ہر مسلمان کی دینی ذمہ داری ہے۔ اگر پہنچا دیں تو ہم بری الذمہ ہو جا
گے۔ جن تک بات پہنچا دی جائے اگر وہ دعوت کو رد کر دیں اور اُس کو قبول کر
سے انکار کریں تو پھر وہ ہوں گے ذمہ دار سارا بوجھ ان پر آئے گا۔ لیکن اگر
معاملہ وہ ہو جو فی الواقع ہمارا ہے کہ ہم دوسروں تک کیا پہنچائیں آج خود ہم
اس بات کے محتاج ہو گئے ہیں کہ قرآن ہمیں پہنچایا جائے۔ تو معلوم ہوا کہ ہم
شانوں پر دوہری ذمہ داری آ گئی۔ جن تک پیغام پہنچانا تھا، ان تک پیغ
نہیں پہنچ رہا۔ انذار نہیں ہو رہا، دعوتِ ربانی کا حق ادا نہیں ہو رہا۔ تو ا
لوگوں کی غلط روی اور گمراہی کا وبال بھی ہم پر آئے گا۔ اور خود ہمارا حال

ہے کہ اگرچہ ہم خود قرآن کے ماننے والے ہیں اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا ہیں، لیکن الا ماشاء اللہ ہم عملاً تو تکذیب کر رہے ہیں۔ ایک تکذیب تو یہ ہوتی ہے کہ کسی نبی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ نبوت کا غلط دعویٰ کر رہا ہے، جھوٹ گھڑ رہا ہے۔ جیسے ابوجہل اور ابولہب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی اور ایک تکذیب عملی ہوتی ہے کہ بظاہر زبان سے حضورؐ کو نبی اور رسول مان لیا جائے۔ لیکن آپؐ کے احکام کو تسلیم نہ کیا جائے۔ یہ درحقیقت تکذیب عملی ہے — اس کی ایک مثال قرآن مجید میں سورۃ الجمعہ میں آئی ہے: مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ”مثال ان کی جو حامل تورات بنائے گئے تھے۔ پھر انہوں نے اس کی ذمہ داری کو ادا نہ کیا، اُس گدھے کے مانند ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو اور بہت بُری ہے مثال اُس قوم کی جس نے آیاتِ الٰہیہ کی تکذیب کی“ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ”اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا“

اب آپ اس آیت مبارکہ کے ان الفاظ پر غور فرمائیے: بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ — ہم سب جانتے ہیں کہ یہود نے تورات کی زبان سے کبھی تکذیب نہیں کی۔ تو غور طلب بات یہ ہے کہ یہ تکذیب کون سی ہے! — وہ تکذیب درحقیقت تکذیبِ عملی ہے کہ تورات کے کتابُ اللہ ہونے کا زبانی اقرار تو موجود ہے لیکن اُس پر عمل نہیں ہو رہا۔ اور ظاہر بات ہے کہ تورات پر ایمان کا دعوےٰ کرنے والے اگر اُس کے احکام پر کاربند نہیں ہیں۔ تورات کے نواہی سے اگر اجتناب نہیں کیا جا رہا۔ تورات نے جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں اگر انہیں ادا کرنے سے پہلوتہی کی جا رہی ہے، اُن سے اغماض برتا جا رہا ہے تو چاہے زبان سے یہود اقرار کرتے ہوں کہ وہ تورات کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں لیکن حقیقتاً اور عملاً یہ رویّہ تورات کی تکذیب کے مترادف ہے — آج اگر ہم اپنے گریبانوں میں جھانکیں تو نظر آئے گا کہ بعینہٖ یہی معاملہ ہمارا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں پہلے ہی سے متنبہ فرما دیا تھا۔ بڑی پیاری حدیث ہے، حضورؐ نے ارشاد فرمایا: "یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ

"اے قرآن والو!"۔ جیسے قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ سے خطاب ہوتا ہے یَاَھْلَ الْکِتٰبِ کے الفاظ سے۔ محبوب رب العلمین ہم مسلمانوں سے خطاب فرما رہے ہیں: یَاَھْلَ الْقُرْاٰن کے الفاظ سے ——— ارشاد ہوتا ہے: یَاَھْلَ الْقُرْاٰنِ لَاتَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ "اے قرآن والو! قرآن کو اپنا تکیہ نہ بنا لینا۔ اُسے ایک ذہنی سہارا نہ بنا لینا۔ قرآن کو پس پشت نہ ڈال دینا" تکیہ پیٹھ کے پیچھے ہوتا ہے ایسا نہ ہو کہ تم قرآن کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دو۔ بلکہ تمہارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے: وَاتْلُوْہُ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ مِنْ اٰنَاءِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ "پڑھو اُسے جیسا کہ اُس کے پڑھنے کا حق ہے۔ رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی" وَاَفْشُوْہُ "اسے پھیلاؤ، اُسے عام کرو، اس کی تبلیغ کرو، اس کے نور سے چہار دانگ عالم کو منور کردو" وَتَغَنَّوْہُ۔ "اور اُسے خوش الحانی سے پڑھو۔ کہ اس سے تمہاری رُوح کو غذا میسر آئے" وَتَدَبَّرُوْا فِیْہِ "اور اس میں تدبّر کرو، غور و فکر کرو" وہی بات جو ہم نے اس رکوع میں پڑھی کہ: وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّعُمْیَانًاہ ۔ بلکہ تدبّر ہو، غور و فکر ہو۔ آخر میں ارشاد فرمایا: لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ "تاکہ تم فلاح پاؤ"

پس اگر ہم قرآن مجید کے ساتھ یہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرتے جس کا حکم نبی اکرمؐ کی اس حدیث میں آیا ہے تو چاہے زبان سے مانتے ہوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے لیکن حقیقتاً ہم تکذیب کا ارتکاب کر رہے ہوتے ہیں۔ اور یہی عملی تکذیب ہے۔ اس معنی میں اس آیت مبارکہ کے مخاطبین میں ہم بھی شامل ہیں: قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ ۔ اے نبیؐ! ان لوگوں کے کان کھول دیجئے، انہیں یہ بات سنا دیجئے کہ میرے ربّ کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے بلکہ اس تعالیٰ نے اگر مجھے بھیجا ہے، مجھے اگر مبعوث فرمایا ہے مجھ پر اگر یہ قرآن نازل فرمایا ہے۔ تو صرف اس لئے کہ تم پر اتمام حجت کرنا مقصود ہے ۔ لہٰذا میں نے تو تبلیغ کا حق ادا کر کے تم پر حجت قائم کر دی ہے لیکن، فَقَدْ کَذَّبْتُمْ ۔ تم جھٹلا چکے ہو، تم نے کفر کی روش اختیار کی ہے۔ خواہ یہ جھٹلانا ۔ قولاً ہو یا عملاً ہو ۔ تو ۔ فَسَوْفَ یَکُوْنُ لِزَامًا ۔ پس جان رکھو کہ جلد ہی اس کی سزا تم سے چمٹ کر رہے گی ۔ اس کی پاداش تم کو بھگتنی پڑے

ل۔ اللہ تعالیٰ اس انجامِ بد سے ہمیں بچائے۔

آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے، اس کے بارے میں اگر کوئی سوال یا اشکال ہو تو
س کے لئے میں حاضر ہوں۔

سوال و جواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! ایک شخص خود تو تبلیغ کرتا ہے لیکن اس پر خود عمل
ہیں کرتا۔ اس کے بارے میں آپ کیا رائے ہے؟

واب: بالکل واضح بات ہے کہ ایسا شخص اپنی دعوت کو بھی بدنام کرتا
ہ اور اپنا وقت بھی ضائع کرتا ہے۔ اس لئے کہ جب تک کسی داعی کا اپنا کردار
ی دعوت سے مناسبت رکھنے والا نہیں ہوگا، اُسکی دعوت غیر مؤثر رہے گی۔ اس
پہلے ہم سورۃ حٰمٓ السجدہ کی آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ: وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا
ن دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ جو بھی اللہ
طرف بلائے اس کا عمل بھی درست ہونا چاہیئے تب ہی اس کی دعوت و تبلیغ
ا اثر ہوگا۔

ال: ڈاکٹر صاحب! عذابِ آخرت کے بارے میں قرآن مجید میں اتنی وضاحت
باوجود لوگ گناہوں کی طرف کیوں مائل ہوتے ہیں۔؟

ب: بڑا عملی سوال ہے اور ہماری نشستوں میں اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ
وال ہوا تھا تو میں نے اُس وقت جو بات عرض کی تھی، وہی دوہرا رہا ہوں کہ
ا کمی یقین کی ہے ہمیں ان باتوں پر جیسا یقین ہونا چاہیئے اگر واقعتہً ویسا یقین
ل ہو جائے تو پھر ہمارا عمل بدل جائے گا۔ اس وقت ہماری بالعموم جو صورت
ہے وہ یہ ہے کہ ہم مانتے تو ہیں کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے اور جنابِ محمد صلی
علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور یہ کہ آخرت حق ہے اس میں جزا و سزا کا معاملہ
۔ لیکن ہمارا یہ ماننا بالعموم اقرارٌ باللسان کے درجہ تک ہے۔ لیکن اس پر تصدیق
لب یعنی دلی یقین والی کیفیت بدقسمتی سے ہمیں حاصل نہیں ہے۔ اسی قلبی یقین
ضرورت ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

سوال: ڈاکٹر صاحب! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کافروں کے
دین کو پیش کیا اور انہوں نے آپؐ کی بات کو ردّ کر دیا اور اس دور میں جو
غیر مسلموں کو حق کی دعوت دیتے ہیں، حق کی تبلیغ کرتے ہیں اور وہ اس کو ر
ہیں تو حضورؐ کے دور کے کافروں اور اس زمانہ کے منکروں کی سزا میں کچھ
فرق ہوگا یا دونوں کو ایک سی سزا ملے گی۔؟

جواب: میرا خیال ہے کہ ان دونوں کی سزا کے درمیان لازماً فرق رہے
لئے کہ نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے جس درجہ کا اتمامِ حجت کسی غیر نبی ا
کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ ہم لاکھ کوشش کریں تب بھی ہمارے دامن پر
کوئی نہ کوئی دھبہ رہ ہی جائے گا۔ اور ہم دعوت و تبلیغ کے لئے جن سے مخاطب
وہ ہمارے دامن کے اس داغ کو ہماری دعوت کو ردّ کرنے کے لئے جواز کا ذ
لیں گے۔ تو یہ پہلو کسی نہ کسی درجہ میں موجود رہے گا۔ اسی طرح جو معاملہ اُن
ساتھ ہوتا تھا کہ جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور انہوں نے انکار کیا تو ان کو
کر دیا گیا نیست و نابود کر دیا گیا تو یہ معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت
کے بعد نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ البتہ یہود کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے ان کی
عیسٰی ابن مریم مبعوث ہوئے تھے علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ وہ دوبارہ دُنیا
امتی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے اور پھر ان کے
یہودی اپنے کیفرِ کردار کو پہنچیں گے اور ان کو عذابِ استیصال سے دوچار ہو

حضرات! مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا آج درس نمبر ا مکمل
کا سلسلہ وار مطالعہ ہم ان نشستوں میں کر رہے ہیں۔ اب انشاءاللہ آئ
درس کا آغاز کریں گے اور یہ درس مسلمانوں کی عائلی زندگی کے متعلق ہے
کہ انفرادیت سے جب اگلا قدم اجتماعیت کی طرف اٹھتا ہے تو اجتماعیت
خاندانی اور عائلی زندگی ہے۔ اس کے ضمن میں ان شاءالعزیز ہم اگلے
سے سورۃ التحریم کا سلسلہ وار مطالعہ شروع کریں گے۔ ●●●●●

موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا طریق کار

انقلابِ نبوی ؐ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد کے خطباتِ جمعہ کا سلسلہ

ترتیب و تسوید : شیخ جمیل الرحمٰن

محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ امیر تنظیم اسلامی نے ۳۱ر اگست اور ۲۸ر ستمبر ۸۴ء کے خطابات جمعہ میں "کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے؟" اور "کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟" کے موضوعات پر بالترتیب خطاب فرمایا تھا۔ یہ دونوں خطاب ماہنامہ میثاق میں طبع ہو چکے ہیں۔ آخرالذکر خطاب میں یہ سوالیہ نشان سامنے آیا تھا کہ اب ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ خالص محمدیؐ انقلاب کیا ہے اور اس کا طریق کار کیا ہے؟ چنانچہ اس موضوع پر امیر محترم کے خطاباتِ جمعہ کی تعداد نو بن گئی۔ جنہیں کیسٹ سے منتقل کیا گیا اور "اسلامی انقلاب۔ مراحل' مدارج اور لوازم" کے عنوان سے ان کی اشاعت جون ۸۵ء کے میثاق سے شروع ہو کر اپریل ۸۷ء کے شمارے میں ختم ہوئی۔ آخری خطاب میں امیر محترم کے اختتامیہ کلمات یہ تھے کہ "اب انشاء اللہ العزیز اگلے جمعہ سے مجھے اس موضوع پر گفتگو کرنی ہے کہ موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے کن امور میں حضورؐ کا منہجِ عمل ہمیں جوں کا توں اختیار کرنا ہے اور کن کن امور میں کن کن پہلوؤں سے ہمیں اپنے طریق انقلاب میں کوئی ترمیم یا تبدیلی کرنی ہوگی۔ ظاہر بات ہے کہ اس معاملہ میں ہمارے لئے ضروری ہو گا کہ یہ ترمیم یا تبدیلی دین کے کسی اصول کی روشنی ہی میں کریں اور یہاں ہمیں حالات کے اعتبار سے کوئی اجتہاد کرنا ہو گا۔ یہ موضوع نہایت اہم ہے چونکہ اس کا تعلق ہماری اپنی عملی زندگی کی اس ذمہ داری سے ہے جو فریضہ اقامت دین کی جدوجہد کی صورت میں ہمیں ادا کرنی ہے۔" ..... چنانچہ ۷ر دسمبر ۸۴ء کے خطابِ جمعہ سے امیر محترم نے اس موضوع پر خطابات شروع کئے جن میں سے پہلا خطاب کیسٹ سے نقل کر کے معمولی حک و اضافہ کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔ (ج ر)

حضرات و خواتین !

اس مسجد دار السلام میں جمعہ کی تقاریر کے سلسلہ میں آپ کو یاد ہو گا کہ پہلے تو ہم نے انقلا
ایران کے موضوع پر دو جمعوں میں گفتگو کی تھی۔ پھر ہم نے اسلامی انقلاب کے مراحل، مدار
لوازم کو سمجھنے کے لئے سیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معروضی مطالعہ سے گف
کا آغاز کیا تھا جو اغلباً نو جمعوں تک جاری رہا جس میں ہم نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ انسانی کا جو عظیم ترین اور کامل ترین انقلاب برپا کیا تو اس کے
حضورؐ نے کیا طریقہ اختیار فرمایا! اور حضورؐ کو کن کن مراحل سے گذرنا پڑا! اس لئے کہ یہ ایک ت
شدہ حقیقت ہے کہ جو لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں، جو محبت و عقیدت ر
ہیں، ان کی نگاہ میں حضورؐ کا جو مقام ہے وہ تو ہے ہی۔ لیکن جو لوگ آپؐ پر ایمان نہیں رکھتے،
حضورؐ سے عداوت رکھتے ہیں وہ بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں اور اس کا اظہار بھی کر
ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تاریخِ انسانی کا عظیم و کامل ترین انقلاب وہ تھا جو محمد عربی (صلی
علیہ وسلم) نے برپا کیا۔

میں اپنی سی امکانی کوشش کر چکا ہوں کہ سیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا
مطالعہ اور ایک جائزہ اس انداز میں آپ حضرات کے سامنے رکھ دوں کہ اسلامی انقلاب کے مرا
اور مدارج نکھر کر سامنے آ جائیں۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور اسی بات کا پھر اعادہ کر رہا
کہ میں نے "فلسفہ انقلاب" سمجھا ہی سیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطالعہ
ہے۔ میرا واحد ذریعہ معلومات صرف اور صرف سیرتِ طیّبہ ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہو
پورے یقین اور اعتماد سے کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص مجرد انقلابی عمل کو سمجھنا چاہے کہ وہ کیا ہے،
میرے نزدیک کسی بھی حقیقی اور واقعی انقلاب کے طریق کار کو جاننے کا واحد ذریعہ (URCE
صرف اور صرف سیرت النبی ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ۔

میرا یہ دعویٰ بے بنیاد نہیں ہے بلکہ اسے پایۂ ثبوت تک پہنچانے کے لئے میں متعدد شواہد پ
سکتا ہوں۔ آپ غور کیجئے کہ ایک انسانی زندگی کے وقفہ (LIFE SPAN) میں، اور وہ بھی کُل
برس میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دینا تاریخِ انسانی میں صرف ایک ہی بار ہوا ہے۔ اور یہ ہُوا ہے
صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے، ایک فردِ واحد سے دعوت کا آغاز ہوا اور اسی فرد کے
انقلاب کے تمام مراحل اس طور سے طے پا جائیں کہ لکھوکھا مربع میل کے ایک ملک پر ایک با
نظام بالفعل قائم ہو جائے اس کی کوئی اور مثال پوری انسانی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ حتیٰ
حضرات انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تاریخ میں بھی اس کی کوئی مثال و نظیر نہیں ملتی
لئے میں نے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ خصوصاً آغاز وحی سے لے کر اس،

رحلت فرمانے کا جو قریباً ۲۳ سال کا عرصہ بنتا ہے' اسے قدرے تفصیل سے مرحلہ وار بیان کیا ہے تاکہ اس مختصر عرصہ کی جو ہمہ گیر و ہمہ جہت جدوجہد ہے' اس کی روشنی میں ہم یہ بات اچھی طرح جان سکیں کہ ایک حقیقی اور واقعی اسلامی انقلاب کن کن مراحل اور مدارج سے گذرتا ہے اور اس کے لوازم کیا ہوتے ہیں! نیز یہ کہ ہمیں اگر اسلامی انقلاب لانے کی جدوجہد کرنی ہے تو اس کے لئے ہمیں لازماً اصل رہنمائی سیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام ہی سے حاصل کرنی ہوگی۔

غور کا مقام البتہ آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ دو اعتبارات سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور اور ہمارے دور کے حالات میں ایک اہم اور بنیادی فرق ہے جسے کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں گہرے غور و فکر اور نہایت احتیاط کے ساتھ یہ دیکھنا ہوگا کہ انقلاب محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی انقلابی جدوجہد کے کن کن مراحل اور امور کو ہمیں جوں کا توں لینا ہوگا اور وہ کون سے مراحل ہیں کہ جن کے بارے میں حضورؐ کی سیرت مبارک کو من حیث المجموع سامنے رکھ کر ہمیں موجودہ حالات کے پیش نظر استنباط کرنا ہوگا اور کس حد تک اس معاملے میں ہمیں اجتہاد کرنا ہوگا۔ اس مسئلہ پر گفتگو سے قبل آیئے پہلے اس فرق کو سمجھیں جو دو اعتبارات سے واقع ہوا ہے۔

پہلا فرق : پہلا واضح ترین اور نمایاں ترین فرق تو یہ واقع ہوا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ ہوئی تھی ایک خالص کافرانہ و مشرکانہ معاشرے میں.... جبکہ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہمارا تعلق ایک مسلمان معاشرہ سے ہے اور ہمیں اس میں کام کرنا ہے۔ ہمارے ملک ہی کی طرح دوسرے بہت سے مسلم ممالک ہیں جن میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد اسّی فیصد سے زائد ہے اور ان تمام ممالک کے سربراہ اور حکمران بھی مسلمان ہی ہیں۔ رعایا اور حکمرانوں کے کردار' ان کے اخلاق' ان کی سیرت اور دین سے ان کے عملی تعلق کے معاملات کو ایک طرف رکھتے ہوئے یہ بات تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ یہ سب کے سب قانوناً مسلمان ہیں۔ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ کہیں بھی مکمل اسلامی نظام اپنی آئیڈیل صورت میں عملاً قائم و نافذ نہ ہو بلکہ پورا کا پورا لادینی (SECULAR) نظام رائج ہو تب بھی وہ مسلمان معاشرہ کہلائے گا اور اس کے حکمران مسلمان ہی تسلیم کئے جائیں گے۔ پھر حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان معاشروں میں کردار کے اعتبار سے طرح کے طبقات موجود ہیں۔ شرابی' زانی' قمار باز اور کئی اعتبارات سے صرف اسلامی اخلاق و کردار ہی سے نہیں عام انسانی سیرت و کردار سے تہی دست افراد بھی موجود ہیں۔ اور اسلامی نظام کے عملاً نافذ نہ ہونے کے باوجود انہی معاشروں میں کچھ نہ کچھ ایسے مسلمان بھی لازماً موجود ہوں گے جو نمازی' روزے دار' اسلامی شعائر کے پاس داری کرنے والے اور انفرادی سطح پر صالح اور متقی مسلمان

وں..... بہرحال عملاً یہ تمام لوگ قانوناً مسلمان ہیں اور انہیں قمہ لی ڈھال حاصل ہے۔ للذا ان
الات میں جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی انقلابی دعوت پیش کی اور اِس صورتِ
ال میں جس سے ہمارا سابقہ ہے' ایک نہایت نمایاں فرق موجود ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا
س معاشرے سے مقابلہ تھا' وہ فکری و عملی دونوں اعتبارات سے خالص مشرکانہ اور کافرانہ معاشرہ
ا اور ان کا پورا نظام شرک کی بنیادوں پر استوار اور قائم تھا۔ کچھ سعید روحیں ضرور موجود تھیں جو
ری طور موحد اور عملی طور پر بت پرستی کی نجاست کی آلودگی سے محفوظ تھیں۔ لیکن غالب اکثریت
شرکین ہی کی تھی۔ چنانچہ پہلا اور بنیادی فرق یہ ہے کہ جس کو سامنے رکھ کر ہمیں سوچنا ہوگا کہ آیا
م نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا منہجِ انقلاب جُوں کا توں اور بعینہٖ اختیار کریں گے یا اس میں
ئی فرق و تفاوت ہوگا!

دوسرا فرق : دوسری اہم بات یہ ہے کہ نوعِ انسانی کا جو تمدنی ارتقا ہوا ہے اس کے اعتبار سے
ب کسی بھی ملک میں جو حکومت ہوتی ہے اس کے پاس تمام وسائل ہوتے ہیں' اور تمام قوت ہوتی
ہے' پھر ان دونوں کا نہایت منظم ارتکاز ہوتا ہے۔ جبکہ عوام بالکل نہتے ہوگئے ہیں۔ تو ان دونوں
کے مابین فرق و تفاوت اتنا زیادہ ہوگیا ہے کہ وہ جو مسلح تصادم (ARMED CONFLICT) والا
سئلہ ہے یعنی پہلے سے قائم شدہ باطل نظام سے مسلح تصادم کا جو معاملہ ہے وہ نظری اور عملی دونوں
عتبارات سے قریباً ناممکن کے درجہ تک پہنچ چکا ہے۔

———— یہ دونوں تبدیلیاں ایسی بنیادی ہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر ہمیں
معروضی طور پر غور کرنا ہے کہ اگر ہم اسلامی انقلاب برپا کرنے کا تہیہ اور عزم کرتے ہیں تو ان تمام
راحل میں جن سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد اور سعی کوشش گذری آیا ہمیں بعینہٖ وہی
ریقہ اختیار کرنا ہوگا جو ہمیں سیرت مطہرہ میں ملتا ہے یا یہ کہ ان اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر
رحلہ پر ہم یہ دیکھیں کہ کس کس پہلو سے ہماری APPROACH (لائحہ عمل) مختلف ہوگی۔

ایک اہم گذارش : اس سے قبل کہ میں گفتگو آگے بڑھاؤں آپ سے گذارش کروں گا کہ
ری اس گفتگو کو سنتے ہوئے آپ فی الحال شعوری طور پر اپنے ملک یا اپنے حالات کو ذہن سے نکال
یجئے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ پھر گفتگو بڑی گڈمڈ ہو جائے گی اور قدم قدم پر میری گفتگو اور ملک
کے تناظر میں ٹکراؤ پیدا ہوگا۔ بلکہ ابھی تک میری گفتگو میں ایک عمومیت اور تعمیم ہے کہ ہم فرض کر
ہے ہیں کہ ایک مسلمان ملک ہے جس میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ چاہے ان کا اخلاق'
ن کا اپنا کردار' دین کے ساتھ ان کا اپنا معاملہ اور بحیثیت مجموعی اسلام سے ان کا عملی تعلق حوصلہ
زا نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک مایوس کن اور حوصلہ شکن بھی ہے۔ پھر یہ کہ وہاں کے حکمران بھی

مسلمان ہی ہیں خواہ وہ عمل کے اعتبار سے مسلمان کہلانے کے مستحق نہ ہوں بلکہ ان کے اف
زائد سے فسق وفجور سے ملتے ہوں اور خواہ وہ نمازی اور روزے دار ہوں۔ دونوں حالتوں میر
مسلمان ..... لیکن اس ملک میں اسلامی بالفعل قائم ونافذ نہیں ہے۔ یا اگر ہے تو بہت ہی سرسر
سطحی سا اور محض نمائشی ہے۔ اسلامی نظام کا جو اصل الاصول ہے' اس کی جو حقیقی اقدار ہیں
کے تمام اجتماعی شعبوں پر اس کی جو گرفت ہے ان میں سے کوئی چیز بھی وہاں عملاً موجود نہیں
اس صورت حال کو ایک مفروضہ کی حیثیت سے سامنے رکھئے۔ اور سردست اس بات کو ذہ
نکال دیجئے کہ میں اس وقت پاکستان کی حکومت اور اس کے معاشرہ کو سامنے رکھ کر گفتگو
ہوں۔ بصورت دیگر اس مسئلہ میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ..... ہمیں معاملہ کو
سمجھنا ہے اور پھر اس اصول کا انشاءاللہ ہم اپنے حالات پر بھی انطباق کریں گے۔ لیکن میر
ہوں کہ اس معاملہ میں یہ احتیاط اور یہ تدریج لازمی ہے۔

میں آپ حضرات کو یاد دلاؤں گا کہ ہم نے اس سے قبل نو جمعوں میں خالص مفروضی
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ میں انقلابی مراحل کا مطالعہ کیا۔ اس طویل گفتگو مے
کسی بھی موجودہ مسلمان معاشرہ اور ملک کے معاملات کو سرے سے زیر بحث نہیں لائے۔ حالانکہ
واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ اس وقت دنیا کے نقشہ پر جو آزاد مسلمان ممالک پائے جاتے ہیں' ان میں،
والے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا اسلام پر چند انفرادی عبادات کی حد تک عمل موجود' بلکہ !
ممالک میں اسلامی حدود و تعزیرات بھی نافذ ہیں لیکن یہ بڑی تلخ اور مبرہن حقیقت ہے کہ کسی بھی
مسلم ملک میں اسلامی نظام کامل حیثیت (TOTALITY) میں قائم ونافذ نہیں ہے۔ یہ ہے وہ صور
مسئلہ (PROPOSITION) جسے سامنے رکھ کر ہم یہاں گفتگو کر رہے ہیں۔

انقلابِ نبویؐ کے مراحل کا حالاتِ حاضرہ پر انطباق

میں اس ضمن میں آج صبح سوچ رہا تھا کہ اصلاً تو ترتیب یہ ہونی چاہئے کہ میں نے انقلاب محم
علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے جو چھ مراحل بیان کئے تھے' انطباق کے مسئلہ میں بھی
ترتیب اختیار کروں۔ اسی ترتیب سے اپنی گفتگو کو آگے چلاؤں۔ یعنی پہلے اس مسئلہ پر اظہار خیا
کروں کہ دعوت کے مرحلہ میں کوئی فرق وتفاوت ہو گا' یا نہیں ہو گا..... اگر ہو گا تو وہ کیا ہو گا.....!
پھر تنظیم کے مرحلہ اور اس کے طریق کار میں کوئی فرق وتفاوت ہو گا یا نہیں ہو گا اگر ہو گا تو کیا ہ
گا !! تربیت کے عمل میں کوئی فرق وتفاوت ہو گا یا نہیں ہو گا..... اگر ہو گا تو کیا ہو گا.....!!! اس
کے ساتھ ہے صبر محض (PASSIVE RESISTANCE) کا مرحلہ..... جس کے بعد ہے اقدام

کا مرحلہ ..... گنتی اور ترتیب کے اعتبار سے تو یہ دونوں مرحلے چوتھے اور (ACTIVE RESISTANCE) پانچویں نمبر کے طور پر بیان ہوتے ہیں جبکہ حقیقت کے اعتبار سے صبر محض کا مرحلہ پہلے مرحلہ یعنی دعوت کے ساتھ ساتھ شروع ہو جاتا ہے۔

البتہ آگے چل کر اس کی نوعیت و کیفیت بدل جاتی ہے۔ آخری مرحلہ مسلح تصادم یعنی (ARMED CONFLICT) آیا اس میں بھی کوئی فرق و تفاوت ہے یا نہیں ہے؟ اگر ہے تو وہ کیا ہے؟؟۔

ہماری ترتیب: لیکن مجھے بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے بہت سے احباب اس آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم کے بارے میں اپنے ذہن میں کافی تشویش لئے ہوئے ہیں اور اس کے بارے میں یہ معلوم کرنے میں نہ صرف دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ بیتاب ہیں کہ ایک مسلمان معاشرہ اور ایک مسلمان حکومت میں اس مرحلہ کو کس طور پر طے کیا جائے گا... لہٰذا میں نے سوچا کہ اگر ابتدائی مراحل سے گفتگو کا آغاز کروں گا تو شاید احباب اس کے اندر دلچسپی محسوس نہ کریں اور اپنی پوری توجہ اس طرف مبذول نہ کر سکیں جو مطلوب ہے چونکہ ان کے اذہان پر تو مسلح تصادم والے مرحلہ کا تسلط زیادہ ہے اور وہ اس کے انطباق (Application) کو پہلے جاننے کے متمنی ہیں۔ لہٰذا میں نے بھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں اب اس سلسلہ بیان میں عکسی ترتیب سے بات شروع کروں چونکہ جو آخری مراحل ہیں قانونی اعتبار سے سب سے بڑا فرق انہی میں واقع ہوتا ہے۔ ان کے متعلق ہمیں غور کرنا ہو گا کہ موجودہ حالات میں ان مراحل کو عبور کرنے کی سبیل کیا ہو گی.....؟ صبر محض (Passive Resistance) ہو گا تو کیا ہو گا... !! اقدام (Active Resistance) کی صورت کیا ہو گی؟ آیا کوئی بغاوت ہو گی! حکومت کے خلاف کھلم کھلا اعلان جنگ کیا جائے گا۔ ! پھر یہ مسلح بغاوت کرنی ہو تو دیکھنا ہو گا کہ آیا شریعت میں اس کی اجازت ہے..... !! اگر ہے تو اس کی شرائط کیا ہیں!! اس لئے کہ یہ دین کا مسئلہ ہے ...جب ہم دین کے لئے کام کرنے چلے ہیں تو ہمیں اپنے کام کے لئے اجازت دین ہی سے درکار ہو گی۔ شریعت میں اگر اس کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ یہ دروازہ تو بالکل بند ہے۔ پھر ہمیں یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ اجازت ہونے کی صورت میں بحالات موجودہ وہ ممکن العمل ہے بھی یا نہیں... ؟؟ میرے نزدیک یہ بات دوسرے درجہ کی ہے۔

پہلے درجہ میں تو ہمیں دین کا حکم معلوم کرنا ہو گا کہ آیا مسلح تصادم کے ضمن میں جواز کا کوئی امکان ہے یا نہیں ہے! پھر اگر جواز کی صورت موجود ہو تو یہ سوال پیدا ہو گا کہ اس کے لئے بالفعل بھی کوئی امکان ہے یا نہیں... !!

آج کی گفتگو کا موضوع: میں آج ان دو مسئلوں ہی کو اپنی آج کی گفتگو کا موضوع بنا رہا ہوں۔ اس طرح ایک عکسی ترتیب سے بات شروع ہو گی۔ مجھے آج یہ بتانا ہے کہ اگر مسلح بغاوت کی کوئی

صورت ممکن نہ ہو تو اس کا متبادل طریق یعنی Alternate Procedure کیا ہو سکتا ہے؟
کے تحت کسی قائم شدہ ملک میں قائم شدہ پورے کا پورا نظام بدلا جا سکے اور اس نظام کو چلانے
حکومت کو ہٹایا جا سکے اور اس کی جگہ ایک کامل تبدیلی (Total change) لائی جا سکے۔ یعنی نظام
اعتبار سے بھی اور اس کے چلانے والے ہاتھوں کے اعتبار سے بھی یہ تبدیلی کامل و مکمل ہو۔

موضوع کی نزاکت: ان چند تمہیدی باتوں ہی سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ بڑا نازک
اور بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ لیکن اس دور میں اسلامی انقلاب کے برپا ہونے کی بظاہر احوال کوئی صو
ممکن نہیں ہے جب تک کہ ہم اس مسئلہ کو تمدنی ارتقا کی روشنی میں حل نہ کر سکیں اور اس کے
متبادل طریقہ (Alternate Procedure) کو تلاش نہ کر سکیں۔ چنانچہ اس اعتبار سے بھی یہ
بڑی اہمیت کا حامل ہے چونکہ ہمارا اصل ہدف اسلامی نے انقلاب برپا کرنا ہے۔ میں پورے
قلب سے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہوئے کہ مجھے حق بات ہی کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور حق
کہنے کی بھی ہمت عطا فرمائے، اس موضوع پر اپنے خیالات پیش کروں گا۔ ساتھ ہی میں آپ
بھی استدعا کرتا ہوں کہ آپ بھی میرے لئے مسلسل یہی دعا کیجئے چونکہ اس قسم کے پیچیدہ اور نا
مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے بسا اوقات انسان غیر ارادی طور پر یا بے احتیاطی کے باعث اگر
سخت الفاظ استعمال کر جائے تو بات پیچیدگی اختیار کر سکتی ہے۔ لہٰذا میں آپ حضرات کی دعا
محتاج ہوں کہ میں بات بھی صحیح بیان کر سکوں اور اس کے لئے میری زبان سے الفاظ بھی صحیح نکلیں
میں مناسب ترین پیرایہ بیان میں یہ مسئلہ آپ حضرات کے سامنے رکھ سکوں۔

ان مسائل پر گفتگو کرتے وقت گویا ہم یہ فرض (Suppose) کر رہے ہیں کہ ابتدائی مرا
کسی معاشرہ میں مکمل ہو چکے ہیں یعنی خالص اسلام کی دعوت پر ایک تحریک اٹھی۔ اس کو اس معا
میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسے Response ملا۔ لوگوں نے شعوری طور پر اس دعوت کو ق
کیا۔ پھر وہ منظم ہوئے اور سمع و طاعت والی ایک تنظیم کا نظام قائم ہو گیا۔ پھر یہ کہ ان کی تعدا
اتنی معتد بہ ہو گئی کہ وہ تنظیم اب رائج نظام کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ پھر یہ کہ تنظیم
کارکنوں کی تربیت بھی ایسی ہو چکی ہے کہ ان کے انفرادی کردار و اخلاق اور ان کی سیرت کے ا
سے ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ان کے متعلق یہ حسنِ ظن موجود ہے کہ وہ فی الواقع اپنی انفرادی
میں اپنے امکان بھر اسلام عملاً نافذ کر چکے ہیں اور انہوں نے تزکیہ کے مراحل بھی طے کر لئے ہیں
ان کے دل راہ حق میں قربانیاں دینے کے لئے بیتاب ہیں...... تو یہ ہیں مفروضات (Apositions
جن پر ہم آگے گفتگو کریں گے اس لئے کہ آخری مرحلہ کی بات ہو رہی ہے۔ یہ بات پیش نظر
کہ یہ اس مرحلہ کی بات ہے جو کسی انقلابی عمل کا آخری مرحلہ ہوتا ہے۔ یہ آج کا مسئلہ نہیں۔
فوری طور پر عمل کرنے والی بات نہیں ہے۔ ہم اس آخری مرحلہ کو صرف علمی طور پر سمجھ

ہیں۔

وہ مسئلہ کیا ہے؟ ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ اگر ہمارا سابقہ ایسے حالات سے ہو کہ ایک مسلمان معاشرہ میں جو ایمان اور عمل دونوں کے اعتبارات سے سخت مضمحل ہو چکا ہے نیز جس میں حکومت کرنے والے بھی مسلمان ہیں۔ خواہ وہ بادشاہ ہوں' جیسے سعودی عرب اور دوسرے عرب ممالک میں ہیں' چاہے وہ چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹرز ہوں جیسے ہمارے ملک اور ترکی و انڈونیشیا میں ہیں؟ خواہ وہ جمہور کے منتخب نمائندے ہوں جیسے بہت سے ممالک میں جمہوری حکومتیں قائم ہیں...... بہر حال کچھ بھی ہو مسلمانوں کا معاشرہ ہے اور حکمران بھی مسلمان ہیں۔ ان کی تکفیر نہیں کی گئی ہے۔ اپنی نجی زندگیوں میں وہ کچھ بھی ہوں۔ فاسق و فاجر ہوں' یا نمازی اور روزہ دار ہوں' دونوں صورتوں میں وہ مسلمان ہیں.... لیکن اس معاشرہ میں اسلامی نظام قائم نہیں ہے تو اس نظام کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر صحیح و حقیقی اسلامی نظام کے قیام و نفاذ اور رواج کے لئے آخری اقدام کی صورت کیا ہو گیا یا بالفاظ دیگر کیا ہو سکتی ہے جو مسلح تصادم کا بدل (Alternative) بن سکے!!

ایک اسلامی تحریک کے اوصاف: آگے بڑھنے سے قبل بات کی تفہیم کے لئے میں ایک بار پھر ایسی تحریک کے اوفات گنوا دیتا ہوں جو ٹھیٹھ اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے کسی معاشرہ میں اٹھی ہو۔ وہ تحریک کسی فرقہ واریت کی بنیاد پر نہ اٹھی ہو۔ وہ محض رائج الوقت نظام کی کسی جزوی اصلاح کے لئے نہ اٹھی ہو۔ وہ صرف کسی انتخابی عمل کے ذریعہ اس نظام کو چلانے والے ہاتھوں کو بدلنے کے لئے میدان میں نہ آئی ہو۔ بلکہ اس جماعت کا مقصد خالص اسلامی انقلاب برپا کرنا ہو یعنی معاشرہ میں علمی و عملی دونوں اعتبارات سے توحید کے نفاذ و انعقاد کی جدوجہد ہی اس کا مقصود و مطلوب ہو.... پھر یہ کہ ایک معتدبہ تعداد میں لوگوں نے اسے شعوری طور پر قبول کیا ہو۔ پھر یہ کہ وہ منظم ہو چکے ہوں اور منظم بھی اس درجہ میں کہ "وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا" کی کیفیت پیدا ہو گئی ہو۔ پھر دعوت و تبلیغ کے دوران انہوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا ہو۔ وہ کبھی مشتعل نہ ہوئے ہوں۔ انہوں نے کبھی بھی گالی کا جواب گالی سے نہ دیا ہو..... یعنی وہ ان مراحل سے بڑی حد تک گذر چکے ہوں' جن کا مطالعہ صبر محض کے عنوان کے تحت ہم سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مدنی دور کے حالات کے ضمن میں کر چکے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سختیاں جھیلیں ہیں' استہزا اور تمسخر برداشت کیا ہے۔ ذہنی و جسمانی تشدد جھیلا ہے۔ معاشرہ نے اہل ایمان کا بائیکاٹ کیا ہے۔ شعب بنی ہاشم کی تین سالہ جاں گسل محصوری سے سابقہ پیش آیا ہے۔ ایمان لانے والے سعید و صالح نوجوانوں کو ان کے خاندان والوں نے گھروں سے نکالا ہے۔ ان پر معیشت کا دائرہ تنگ سے تنگ تر کیا گیا ہے۔ لیکن وہ ان

سب کو جھیلتے اور برداشت کرتے ہوئے توحید کا علم ہاتھ میں لئے توحیدی انقلاب اور توحیدی نظام قائم کرنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگا رہے ہیں... کسی ادنیٰ درجہ میں اس جماعت کے وابستگان میں بھی ان باتوں کی کوئی جھلک نظر آ رہی ہو۔

نقطۂ توحید کی تفسیر: زبان پر نظام توحید جس کی ایک تعبیر اسلامی انقلاب ہے بے ساختہ آ گیا۔ لیکن اس وقت موقع نہیں ہے کہ میں توحید کے عملی تقاضوں کو بیان کروں اور یہ بتاؤں کہ توحید انسان کی اجتماعی زندگی کے جملہ شعبوں اور گوشوں کو کس طرح اپنی گرفت میں لیتی ہے۔ اس پر میں تفصیل سے مختلف مواقع پر گفتگو بھی کر چکا ہوں اور "اسلام کا انقلابی منشور" کے عنوان سے تنظیم اسلامی کی جانب سے آٹھ صفحات کا پمفلٹ بھی لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو کر بعض قابل لحاظ وذکر بڑے شہروں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ مختصر طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ توحید کی بنیاد پر جو نظام قائم ہوتا ہے صرف اور صرف وہی نظام عدل و قسط کہلانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ یہ نظام توحید ہی سماجی سطح پر کامل انسانی مساوات قائم کرتا ہے۔ نسل' رنگ' زبان' پیشہ' اور جنس کی بنیاد پر نہ کوئی بلند و اعلیٰ ہوتا ہے نہ کوئی کمتر و پست .. پھر مرد و عورت کے منصفانہ طور پر حقوق اور فرائض کو متعین کرتا ہے۔ ...... معاشی سطح پر یہ نظام ملک کے ہر شہری کی ناگزیر بنیادی ضروریات زندگی کی کفالت کا ذمہ دار ریاست کو قرار دیتا ہے۔ آجر و مستاجر (مزدور و کارخانہ دار) کے درمیان عدل و انصاف اور اخوت کی فضا پیدا کرتا ہے۔ جاگیرداری کی لعنت کا مکمل خاتمہ کرتا ہے۔ ... اس نظام توحید میں سیاسی سطح پر حاکمیتِ مطلقہ صرف اللہ کی ہوتی ہے ... ملک کی پارلیمینٹ یا اسمبلی أمرھم شوریٰ بینھم کے اصول پر شریعت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے دیگر انتظامی و فلاحی امور کے لئے قانون سازی کی مجاز ہوتی ہے۔ لیکن وہ اللہ و رسول یعنی کتاب و سنت میں بیان کردہ حدود و تعزیرات میں ایک شوشہ کے برابر بھی تغیر و تبدل کی مجاز نہیں ہوتی... یہ بات بطور جملہ ہائے معترضہ بیان ہو گئی۔ اب آیئے اصل موضوع کی طرف

اقدام کا مرحلہ: ہم اس مفروضے کو سامنے رکھ کر گفتگو کر رہے تھے کہ ایک اسلامی تحریک مختلف مراحل سے گذر کر اقدام کے مرحلہ تک آ گئی تو بحالات موجودہ اقدام کی صورت کیا ہو گی! ظاہر ہے کہ اقدام کے بغیر نظام نہیں بدلے گا۔ بیٹھے رہیں گے تو وہ نظام خود بخود تبدیل نہیں ہو گا۔ اسی موقع پر یہ بات بھی گرہ میں باندھ لیجئے کہ محض وعظ و نصیحت سے بھی ہرگز ہرگز کوئی نظام تبدیل نہیں ہوتا..... البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ اس فاسد نظام میں چند نیک' صالح باکردار اور متقی لوگوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ نظام کی تبدیلی کے لئے اقدام ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر انقلاب نہیں آتا تو ہمارے دور میں اگر کوئی اسلامی تحریک ابتدائی مراحل سے گذر کر اقدام کے مرحلہ تک پہنچ

جائے تو ایک مسلمان معاشرہ اور مسلمان حکمرانوں کے خلاف اقدام کی نوعیت اور شکل کیا ہو گی!!...... یہ ہے اصل سوال جس پر غور کرنے اور کسی نتیجہ تک پہنچنے کے لئے آج کی گفتگو ہو رہی ہے۔

ایک غلط بات کا ازالہ: اس ضمن میں سب سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بعض حضرات کے ذہنوں میں جو یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ کسی مسلمان حکمران کے خلاف مسلح اقدام کی شریعت میں سرے سے کوئی گنجائش نہیں ہے تو یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے۔ اگرچہ ہمارے یہاں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے لیکن یہ متفق علیہ بات نہیں ہے کہ کسی بھی حالت اور کسی بھی صورت میں کسی مسلمان حکمران کے خلاف خروج نہیں ہو سکتا یا بغاوت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اگر آپ اس کو تسلیم کر لیں گے تو اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ فسّاق و فجّار کی حکومت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ جو فاسق و فاجر ایک بار مسلط ہو گیا تو پھر اس کا یہ تسلط دائمی ہو گا اور سوائے زبانی و کلامی نصیحت کرنے یا خاموش رہنے کے کوئی عملی اقدام کرنے کا حق و اختیار باقی نہیں رہے گا۔ بلکہ اکثر حالات میں تو زبان پر بھی پہرے بٹھا دیئے جائیں گے کہ تنقید تو کجا دل سوزی، ہمدردی اور دمسازی سے نصیحت کرنے پر بھی زبان بندی کر دی جائے گی۔ ایسی صورت میں ظاہر بات ہے کہ وہ تسلط باقی رہے گا اور کبھی ختم نہیں ہو گا۔

حضرت حسین کا اقدام اسی سلسلہ میں، میں یہ بھی عرض کر دوں کہ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو اقدام فرمایا اور صرف حضرت حسین نے نہیں فرمایا بلکہ حضرت عبداللہ بن زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اقدام فرمایا تو ہم ایک لمحہ کے لئے بھی یہ باور نہیں کر سکتے کہ ان حضرات گرامیؓ کا اقدام خلاف شریعت تھا یا وہ کوئی ناجائز کام کر رہے تھے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

اجتہادی خطاء: میں یہ بات بہت پہلے تفصیل سے کہہ چکا ہوں سانحہ کربلا کے نام سے میری تقریر مطبوعہ شکل میں موجود ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے۔ ہم یہ کہیں گے کہ یہ اجتہادی مسئلہ تھا۔ اگر حضرت حسین ابن علی اور حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اقدامات کئے تو یہ ان حضرات کی اجتہادی غلطی تو ہو سکتی ہے۔ اس میں خطاء کا امکان بھی ہو سکتا ہے لیکن اسے ناجائز کام یا ہوس اقتدار ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا شائبہ بھی دل میں آ گیا تو عدالت خداوندی میں لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔ یہی معاملہ حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی رائے کے متعلق کہا جائے گا کہ اگر انہوں نے ان حضراتؓ کو اقدام کرنے سے روکا اور یزید کی بیعت کر لی تو یہ ان کی اجتہادی رائے ہے جس میں خطاء کا امکان ہے۔ لیکن اس کو حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دو انتہاؤں کے درمیان میں ہمارے سلف و خلف کے علمائے ربانی کی رائے یہی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ گنجائش تو موجود ہے۔ اس لئے کہ اگر دین کے اندر

ی کوئی نہ ہو تو کیا حضرت حسین ابن علی اور عبداللہ ابن زبیر اور عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ ابن
ی اللہ عنہم اجمعین کوئی ایسا کام کر سکتے تھے کہ جس کی دین میں قطعی ممانعت ہو!
- - - - - - گنجائش تو ہے جب ہی تو ان دونوں بزرگوں نے اقدامات
البتہ یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس اقدام کے لئے موقع و محل بھی مناسب ہے یا نہیں۔ اس کا تعلق
جتہاد سے ہے جس میں خطاء و صواب دونوں کا برابر امکان موجود رہتا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔
لئے میں عرض کروں گا کہ اس بات کو ذہن سے نکال دیجئے کہ مسلمان حکمران کے خلاف
ور بغاوت سرے سے ہو ہی نہیں سکتی۔

نفی مسلک: میں تو اس سے بھی آگے کی بات عرض کروں گا کہ ہمارے اس ملک میں بسنے
سنی مسلمانوں کی عظیم ترین اکثریت حنفی المسلک ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا موقف یہی
اقدام ہو سکتا ہے اور خروج ہو سکتا ہے۔ البتہ اس کے لئے شرائط بڑی کڑی ہیں، اس میں کوئی
ں۔ امام صاحب رحمہ اللہ کے حالات زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت نفس
حمۃ اللہ علیہ کی تائید بھی کی تھی اور ان کو مالی اعانت بھی فراہم کی تھی جنہوں نے بنو عباس کی
ت کے خلاف خروج کیا تھا۔ البتہ امام صاحب نور اللہ مرقدہ بنفس نفیس میدان میں نہیں آئے
تاریخ کی تمام مستند کتابوں میں ان باتوں کا ثبوت موجود ہے میں جو بات واضح کرنا چاہتا
ہ یہ ہے کہ دینی اور شرعی اعتبار سے ایسا معاملہ نہیں ہے کہ کسی حال میں بھی، کسی صورت میں
ی فاسق و فاجر حکمران کے خلاف خروج یا بغاوت نہ کی جا سکے۔ البتہ فقہائے احناف نے اس
ئے شرطیں بڑی کڑی لگائی ہیں۔

ی شرائط کیا ہیں: ایک شرط تو یہ ہے کہ حکمرانوں کی طرف سے کھلم کھلا اور برملا کسی ایسی بات
ر ہو رہا ہو جو خلافِ اسلام ہے۔ مثلاً اپنے گھر میں بیٹھ کر کوئی شخص شراب پی رہا ہے تو یہ اس کا
معاملہ ہو جائے گا۔ لیکن اگر وہ شراب نوشی کی ترویج کر رہا ہو، لوگوں کو اس کے استعمال کی
ب و تشویش دے رہا ہو تو معاملہ مختلف ہو جائے گا۔ ایسے حکمران کو معزول کرنے کے لئے قوت
کرنا اور خروج کرنا بالکل جائز اقدام ہو گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس نظام کو بدلنے کے لئے جو
ٹھیں ان کی طاقت اور ان کے اثرات اتنے زیادہ ہو چکے ہوں کہ وہ یقین رکھتے ہوں کہ ہم
بر پا کر دیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ تھوڑی سی طاقت کے ساتھ تصادم کا آغاز کر دیں۔ جس کا نتیجہ
ی ہو گی اور وہ لوگ ختم ہو کر رہ جائیں گے۔ بلکہ صورت یہ ہونی چاہئے کہ بحالاتِ ظاہریہ یہ امید
ی ہو کہ ہم نظام کو بدل سکتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ اپنی جانوں کا ہدیہ پیش کر دیں اور نظام
کا توں قائم رہے۔ تو یہ ہے اس مسئلہ کی خالص دینی اور شرعی حیثیت۔

ایک قابلِ لحاظ نکتہ: لیکن اگلی بات ہے جو میرے نزدیک اہم ترین ہے اور وہ یہ ہے کہ بالفعل یہ صورت پیدا ہو چکی ہے کہ اب خروج وبغاوت کا امکان موجود ہے ہی نہیں۔ چونکہ صورت حال یہ بن چکی ہے کہ اس زمانہ میں 'STANDING ARMIES' (باقاعدہ تنخواہ دار فوجیں) نہیں ہوتی تھیں۔ اگر ہوتی بھی تھیں تو بہت کم .... جبکہ آج کل قریباً ہر حکومت کے پاس لاکھوں کی تعداد میں تربیت یافتہ اور منظم فوجیں ہوتی ہیں۔ اس دور میں یہ صورت موجود نہیں تھی۔ ثانیاً اس دور میں جس نوع کا اسلحہ فوجوں کے پاس ہوتا تھا قریباً اسی نوع کا عوام کے پاس بھی ہوتا تھا۔ اس میں مقدار کا فرق تو ہو سکتا ہے۔ لیکن وہی تلواریں' وہی نیزے' وہی تیر' وہی ڈھالیں فوج کے پاس ہیں تو عوام کے پاس بھی ہیں۔ تو اس زمانہ میں نسبت وتناسب کا کوئی نہ کوئی ایک معاملہ موجود تھا۔ لیکن اب جو تمدن کا ارتقا ہوا ہے تو یہ صورت باقی نہیں رہی ہے۔ حکومت کے وسائل' اس کی طاقت' اس کی فوجیں' ان کے اسلحہ کے معاملہ کی نوعیت بالکل بدل چکی ہے۔ اب سرے سے کوئی نسبت وتناسب موجود ہی نہیں ہے۔ حکومت کی افواج نہ معلوم کس کس نوعیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ اسلحہ سے لیس ہیں اور اس طرح حکومت ایک قوی ترین ادارہ بن چکی ہے۔ جبکہ عوام قریباً بالکل نہتے ہیں۔ تو یہ فرق وتفاوت اتنا عظیم ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لہٰذا خروج اور بغاوت بحالاتِ موجودہ تقریباً خارج از بحث ہو چکی ہے۔ شرعی اعتبار سے نہیں' حالات کے اعتبار سے اب اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ایک اہم سوال: ان تمام تنقیحات کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ اس چھٹے مرحلہ کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا! اس کا بدل (ALTERNATE) کیا ہو گا؟ اس سوال کے براہِ راست جواب سے قبل ضروری ہے کہ دو اہم امور کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

تمدنی ارتقاء سے پیدا شدہ دو اہم تبدیلیاں

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ تمدنی ارتقاء نے یہ شکل پیدا کی ہے کہ حکومت کے پاس قوت اور طاقت بے انتہا ہوتی ہے۔ فوج اس کی پشت پناہ ہوتی ہے۔ اسی موقع پر یہ بات بھی پیش نظر رکھئے کہ بات پاکستان کی نہیں ہو رہی بلکہ علمی اور اصولی نقطہ نظر سے ہو رہی ہے۔ آخر یہ مسئلہ شام میں بھی تو درپیش ہے۔ شام میں اخوان المسلمون نے اسلام کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے لیکن مقابلہ کس سے ہے! حافظ الاسد کی حکومت سے' جس کے پاس فوج ہے جو بے انتہا جدید ترین اسلحہ سے لیس ہے۔ جس کے پاس ذرائع و وسائل موجود ہیں۔ اور جس کی پشت پر روس جیسی سپر پاور موجود ہے۔ لہٰذا اخوان المسلمون کچلے جا رہے ہیں اور ان کی مسلح جدوجہد ختم ہو چکی ہے۔ دم توڑ چکی ہے پھر آپ خود سوچئے کہ اسی طرح کا مسئلہ افغانستان میں ہو رہا ہے کہ نہیں!۔ کارمل بظاہر تو مسلمان ہے۔ میں نے آج تک تو نہیں سنا کہ اس کی تکفیر کی گئی ہو۔ اس کے ساتھ جو افغانی فوج ہے' وہ چاہے ٹوٹتے ہوتے سکڑ گئی ہو لیکن وہ سب کے سب بہر حال مسلمان تھے اور ہیں۔ مسلمان ماؤں

کا دودھ پیئے ہوئے ہیں۔ لیکن چونکہ فوج کا جدید تصور یہ ہے کہ جو شخص یا گروہ اقتدار میں ہو یا کسی طرح اقتدار میں آ جائے تو فوج اس کا حکم مانے اس کو تحفظ (Protection) دے۔ میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ مجھے تو دکھ ہوتا ہے جب خبریں آتی ہیں کہ اتنے کارمل فوجی مجاہدین کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے جبکہ میں جانتا ہوں کہ مجاہدین 'اسلام کے لئے' حریت کے لئے اور خدا ناآشنا بلکہ خدا دشمن روسی جارحیت کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی کامیابی پر خوشی ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس میں دکھ کا یہ پہلو موجود ہے کہ وہ ہلاک ہونے والے بھی تو مسلمان ہیں۔ وہ ایک حکومت کے حکم کے تحت جنگ کر رہے ہیں دونوں طرف سے مسلمانوں ہی کا خون بہہ رہا ہے۔ روسی فوج کے لوگ تو کارمل فوج کے مقابلہ میں کم ہی مرے ہوں گے۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے کے ہاتھ مسلمان ہی ہلاک ہو رہے ہیں۔ لہٰذا یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ نہیں 'کہ آیا ایک فاجر و فاسق حکومت سے مادی جنگ کرنے کی اجازت ہے یا نہیں! اگر مسئلہ یہ ہوتا کہ کسی طور پر بھی خروج اور مسلح بغاوت جائز نہیں تو آج ہمارے جو افغانی بھائی کارمل فوجوں سے نبرد آزما ہیں وہ "مجاہدین" کہلانے کے بجائے باغی کہلاتے۔ لہٰذا ہر ملک کے علیحدہ علیحدہ مسائل ہیں اس صورت کے پیش نظر ہمیں پاکستان کے حالات کو ایک طرف رکھ کر اصولی طور پر بات سمجھنی ہوگی لب سابقہ سلسلہ کلام سے تعلق جوڑیئے تو میں عرض کر رہا تھا کہ جہاں تمدنی ارتقاء نے حکومت کے ہاتھ میں بے پناہ قوت فوج کی شکل میں دے دی ہے وہاں اسی تمدنی ارتقاء کی بدولت دو اہم تبدیلیاں اور بھی آئی ہیں۔ دینی مزاج کے ہمارے اکثر لوگ ان تبدیلیوں سے واقف نہیں ہیں چنانچہ جب میں اسلامی انقلاب کے چھٹے مرحلہ کے طور پر مسلح تصادم کی بات کرتا ہوں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں اور میری تنظیم پاکستان میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے کوشاں ہے تو وہ چونک جاتے ہیں کہ ڈاکٹر اسرار تو مسلح بغاوت کی بات کر رہا ہے اور مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑوانا چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔ جب سیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے فلسفہ انقلاب اخذ (Infer) کیا جائے گا اور حضورؐ کی سیرت مبارکہ کے معروضی مطالعہ سے انقلاب محمدیؐ کے مراحل و مدارج کے تعین کی کوشش کی جائے گی تو لامحالہ چھٹے اور آخری مرحلہ کے طور پر مسلح تصادم کا ذکر آئے گا..... میں نے اس موضوع پر جب بھی کہیں تقریر کی ہے تو ان متبادل طریقوں کا بھی ذکر کیا ہے جو تمدن کے موجودہ ارتقاء نے دنیا کو دیئے ہیں 'جن پر میں آج اظہار خیال کر رہا ہوں۔

ریاست اور حکومت کا فرق: انسانی تمدن کے بتدریج ارتقاء کے نتیجہ میں سب سے اہم تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ آج کے دور میں "ریاست" اور "حکومت" دو علیحدہ علیحدہ چیزیں تسلیم کی جاتی ہیں جبکہ آج سے دو سو سال قبل یہ صورت حال موجود نہیں تھی۔ حکومت ہی کو ہم جانتے تھے۔ ریاست "کس چڑیا کا نام ہے! اسے ہم جانتے ہی نہیں تھے۔ ادھر کوئی شخص حکومت کے خلاف کھڑا

ہوا ادھر اسے فوراً باغی گردان کر گردن زدنی قرار دے دیا گیا۔ لیکن یہ صورت حال اس دور میں بدل چکی ہے۔ اب یہ معاملہ ختم ہو چکا ہے۔ انسانی فکر اور انسانی تمدن کا جو ارتقاء ہوا ہے اس کے تحت اب یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ "ریاست" ایک بالکل علیحدہ شے ہے اور حکومت صرف ریاست کے معاملات کو چلانے والا ایک انتظامی ادارہ ہے۔ کسی ملک کے رہنے والے دستوری اور آئینی طور پر درحقیقت "ریاست" کے وفادار ہوتے ہیں حکومت کے نہیں ہوتے۔ حکومت کی اطاعت تو وہ کرتے ہیں لیکن دراصل جس شے کو وفاداری کہا جاتا ہے وہ "ریاست" کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ پاکستان ایک ریاست ہے۔ اس ریاست کو چلانے والی ایک حکومت ہے جو اس ریاست کا ایک انتظامی ادارہ ہے۔ یہ حکومت بدلتی بھی رہتی ہے۔ آج کسی کی ہے تو کل اور کی ہے۔ کبھی سول (CIVIL) کی ہے تو کبھی ملٹری (MILITARY) کی کبھی ایوب صاحب کی تھی کبھی یحییٰ کی۔ پھر بھٹو صاحب آئے۔ ان کے بعد سے قریباً ساڑھے سات سال سے مسند اقتدار پر جنرل ضیاء الحق صاحب متمکن ہیں۔ پس حکومت تو آنی جانی شے ہے۔ جس شے کو دوام ہے' جو چیز تسلسل کی حامل ہے' وہ تو درحقیقت ریاست ہے۔ لہٰذا کسی بھی ملک کے رہنے والوں کی اصل وفاداری ریاست سے ہوتی ہے۔ حکومت سے نہیں ہوتی۔

تمدن کے ارتقا اور فکر انسانی کی وسعت کے نتیجہ میں دوسری اہم تبدیلی یہ آئی ہے کہ آج پوری دنیا میں یہ بات مسلم سمجھی جاتی ہے کہ کسی حکومت کو بدلنے کا حق اس ملک کے رہنے والوں کو حاصل ہے... کوئی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی مستقل قسم کی حکومت ہے۔ جو بھی کہے گا یہی کہے گا کہ یہ وقتی اور عارضی انتظام ہے۔ حالات خراب ہو گئے تھے۔ انتشار ہو گیا تھا۔ خانہ جنگی کا اندیشہ لاحق تھا۔ لہٰذا فساد کو روکنے کے لئے یہ فوری نوع کا اقدام بطور فوری علاج کیا گیا ہے۔ وقتی طور پر حکومت کے انتظام کو فوج نے سنبھالا ہے۔ ہمارا اس کو مستقل قائم رکھنے کا ارادہ نہیں ہے۔ اسی طریقہ سے کوئی بھی ایسا حکمران جو جمہوری طریقہ سے برسر اقتدار آیا ہو یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اب اس کی یا اس کے خاندان کی اس ملک پر مستقل حکومت رہے گی۔ البتہ جہاں ملوکیت اور بادشاہت (MONARCHY) قائم ہے وہاں معاملہ تا حال سابق انداز پر چل رہا ہے کہ وہاں خاندانی حکومتیں قائم ہیں۔ وہاں ریاست و حکومت کا کوئی علیحدہ تصور موجود نہیں ہے۔ وہاں کوئی سیاسی جماعت بنانے کی قطعی اجازت نہیں ہے۔ جہاں جماعت بنی اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ صاحب کو ہٹانے کی کوئی کوشش پیش نظر ہے۔ تو وہ نظام چند ممالک میں تا ہنوز چل رہا ہے اور "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو" کے مصداق فی الحال ان کا معاملہ ایک طرف رکھئے۔ البتہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ یہ زیادہ دیر چلنے والا نظام نہیں ہے اس کے گرد جو دیواریں ہیں وہ بہت بوسیدہ ہو چکی ہیں اور گرا ہی چاہتی ہیں اب کوئی دیر کی بات ہے اس کو ختم ہونا ہی ہونا ہے اور وہ بات ہو کر رہے

گی جو اپنے زوال کے وقت شاہ فاروق نے کہی تھی کہ "دنیا میں صرف پانچ بادشاہ رہ جائیں گے چار تاش کے ہوں گے اور ایک انگلستان کا ہوگا"۔ اس لئے کہ انگریزوں نے بادشاہت کو ایک نمائشی اور آرائشی علامت (Decoration Piece) کی حیثیت سے اپنے یہاں سجا کر رکھا ہوا ہے۔ باقی اس کے سوا اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ چونکہ روایت پرستی اس قوم کے مزاج میں رچی بسی ہے لہٰذا وہ روایتی طور پر اس کو نباہ رہے ہیں ورنہ ساری دنیا جانتی ہے کہ وہاں اصل اقتدار و اختیار پارلیمنٹ کے ہاتھ میں ہے۔

اس نقطہ نظر سے یہ بات جان لیجئے کہ ساری دنیا مانتی ہے کہ ایک ملک کے رہنے والوں کا یہ مسلم حق ہے کہ وہ آئینی و دستوری طور پر حکومت بدل سکتے ہیں۔ مدت سے قبل نئے انتخابات کا مطالبہ لے کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ بالکل استثنائی صورت حال ہے کہ ہنگامی حالات سے فائدہ اٹھا کر کوئی جنرل بحیثیت مارشل لاء چیف ایڈمنسٹریٹر اقتدار پر قبضہ کر لے اور رائے دہندگی کے حق کو معطل (Suspend) کر دے۔ اب میں اس بحث میں نہیں جاؤں گا کہ یہ تعطل (Suspension) جائز ہے کہ ناجائز ہے۔ حالات ایسے ہو سکتے ہیں۔ آپ کو علم ہو گا کہ ہر ملک کے دستور (Constitution) میں یہ گنجائش (Provision) رکھی جاتی ہے کہ اگر کسی وقت ملک کی بقاء اور اس کی سالمیت کو کوئی شدید خطرہ لاحق ہو جائے تو ہنگامی حالات کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔ عوام کے حقوق عارضی طور پر معطل اور ساقط ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس امکان کو خارج از بحث نہیں کیا جا سکتا یہ بالکل علیحدہ مسئلہ ہے کہ آیا واقعی ہنگامی حالات تھے یا نہیں! صورت حال خراب تھی یا نہیں! کیا اب تک وہ صورت حال برقرار ہے یا اصلاح پذیر ہو چکی ہے ؟ یہ جداگانہ بحث ہے۔ البتہ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہنگامی حالات اور مارشل لاء ایک عارضی انتظام کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی کوئی مستقل نوعیت کسی بھی متمدن ملک میں آج تک تسلیم نہیں کی گئی ہے بلکہ ایسے حالات میں حکمرانوں سے یہ توقعات وابستہ کی جاتی ہیں کہ وہ خراب حالات پر جلد از جلد قابو پا کر دستور کے مطابق ملک میں صحت مندانہ انتخابات کرا کے عوام کے نمائندوں کو اقتدار سونپ دیا جائے

یقیناً آپ کو یہ بات معلوم ہو گی کہ دنیا میں اس وقت سب سے زیادہ قابل تسلیم (Accept-able) بات یہی سمجھی جاتی ہے کہ ملک کے رہنے والوں کو سیاسی جماعتیں (Political Parties) بنانے کا حق حاصل ہے اور ہر پارٹی کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ موجودالوقت حکومت کو ہٹانے کے لئے اپنی انتخابی مہم چلائے۔ اس پر دل کھول کر اور تلخ و تند تنقیدیں کرے۔ رائے عامہ کو اپنی پارٹی کے حق میں ہموار کرے تاکہ حکومت اس پارٹی کی قائم ہو سکے۔ زیادہ سے زیادہ پابندی لگائی جاتی ہے کہ سرکاری ملازم کسی سیاسی پارٹی میں شامل اس کی انتخابی جدوجہد میں شرکت نہیں کر

سکتے اور انتخاب میں بھی کھڑے نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ وہ ریاست کے ملازم اور کارکن ہیں۔ ریاست کی طرف سے ان کو کچھ اختیارات ملے ہوئے ہیں اگر وہ کسی سیاسی پارٹی سے عملاً وابستہ ہوں گے تو ان کے ہاتھ میں جو اختیارات ہیں ان کے غلط استعمال کا اندیشہ ہے۔۔۔ باقی رہا ووٹ دینے کا معاملہ! تو یہ حق ان کا برقرار رہے گا۔ اس پر کہیں کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔ عوام کی رائے سے حکومت میں تبدیلی ہوگی اور اس معاملہ میں سرکاری ملازمین ہی نہیں بلکہ فوجیوں کو بھی حق ہو گا کہ اپنی پسندیدہ پارٹی کو ووٹ دیں۔

اس پہلو سے یہ بات جان لیجئے کہ تمدن کا جو ارتقا ہوا ہے' اس نے یہ متبادل طریقے (Alternate Procedure) عطا کئے ہیں جبکہ اس سے پہلے یہ صورت نہیں تھی۔ ریاست اور حکومت کا تصور گڈمڈ تھا۔ اور حکومت کو ہی ریاست کا مقام بھی حاصل تھا۔ نیز حکومت کو بدلنے کی کوشش کو بغاوت سمجھا جاتا تھا جبکہ اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ ریاست اور حکومت دو مختلف تصورات ہیں اور کسی بھی ملک کے باشندوں کو آئینی طور پر یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ حکومت کو بدل دیں۔

خلافت راشدہ کے نظام کی نوعیت میں آج صبح جب اس تقریر کے متعلق سوچ رہا تھا تو خلافت راشدہ کا نظام بھی زیر غور آیا۔ چونکہ وہ نظام حکومت ہمارے نزدیک سب سے زیادہ محترم ہے' اس میں کوئی شک نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو آگے بڑھانے والا نظام حکومت خلافت راشدہ ہی کا تو ہے۔ لیکن اس احترام و توقیر کے علی الرغم ایک بات جان لیجئے کہ اس کے ساتھ دو محدودیتیں (Limitations) موجود تھیں ایک تو یہ اس وقت بنیادی طور پر عرب میں ایک قبائلی (Tribal) سوسائٹی قائم تھی۔ لہٰذا جہاں ایک قبائلی نظام پہلے سے موجود ہے اس کے اندر اگر صرف سرداران قبائل (Chiefs of Tribes) سے مشورہ کر لیا جائے' ان کی آراء کو معلوم کر لیا جائے تو گویا ہر قبیلہ کے فرد سے مشورہ کا حق ادا ہو گیا۔ دوسری یہ کہ سرداران کی حیثیت اپنے قبیلہ کے نمائندہ کی ہوتی تھی۔ لہٰذا وہاں فہرست رائے دہندگان کی تیاری' بیلٹ اور انتخاب کے کھکھیڑ مول لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہاں قبائل کے سردار اور بڑے بڑے خاندانوں کے سربراہ ارباب حل و عقد کہلاتے تھے۔ کسی معاملہ میں ان سے مشورہ ہو گیا تو گویا "امرھم شوریٰ بینھم " کا تقاضہ پورا ہو گیا۔ جبکہ موجودہ دور میں یہ بات نہیں چل سکتی۔ آپ نے دیکھا کہ اس دور کے تقاضہ کے تحت مارشل لاء چیف ایڈمنسٹریٹر جیسے مطلق العنان کو بھی ریفرنڈم ڈرامہ کھیلنا پڑا۔ اس قسم کی کسی صورت حال کا ثبوت آپ کو خلفائے راشدین کے دور میں تو نہیں ملے گا۔ لہٰذا یوں کہنا کہ اس طرز کا سیاسی نظام جو خلافت راشدہ میں قائم تھا' جوں کا توں اس دور میں چل سکتا ہے۔ ایک مغالطہ ہے ... اس میں حالات کی تبدیلی کے پیش نظر ایک ایسا نظام بنانے

غور کرنا ہو گا جس میں اصول تو ختم نہ ہوں، اصول وہی رہیں لیکن ہمیں تمدن کے ارتقا کے ساتھ طریق کار کو ہم آہنگ کرنا ہو گا۔

ایک قابل غور بات: حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف جب ایک تحریک اٹھی اگرچہ میرے نزدیک وہ یہودی سازش تھی۔ شروع ہی سے اس کے عزائم مجرمانہ تھے، اس کے اندر نیک نیتی کا کوئی شائبہ بھی نہیں تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کسی نظام حکومت میں جہاں بدنیتی کے ساتھ یہ معاملہ ہو گیا، وہاں نیک نیتی کے ساتھ بھی تو یہ معاملہ ہو سکتا ہے۔ اس امکان کو آپ خارج از بحث نہیں کر سکتے۔ بالکل نیک نیتی کے ساتھ بھی کسی ملک میں ایسی تحریک اٹھ سکتی ہے کہ موجودہ حکمران ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ انہیں معزول ہونا چاہئے اور ان کی جگہ نئی قیادت کا انتخاب ہونا چاہئے اس وقت تک ہمارے یہاں اس مقصد کے لئے کوئی 'channels' موجود نہیں تھے۔ کوئی راستہ نہیں تھا کہ جن کے ذریعہ سے ایسا اختلاف رائے سامنے آ سکتا۔ درحقیقت تمدنی ارتقا نے جو متبادل راستے دیئے ہیں انہی کے ذریعہ اختلاف رائے بھی سامنے آتا ہے اور صحت مند انداز میں وہ اختلاف حل (Resolve) بھی ہو سکتا ہے... چنانچہ تمدنی اور فطری ارتقاء نے اختلاف کے اظہار اور ان کو حل کرنے کے جو طریقے اور راستے (chan-nels) کھول دیئے ہیں اب ہمیں انہی کو سامنے رکھ کر اسلامی اصولوں کے مطابق اپنے لئے کوئی راہ معین کرنی ہو گی۔

بنیادی انسانی حقوق: تمدنی ارتقاء نے اس بات کو بنیادی انسانی حقوق میں سے ایک حق قرار دیا ہے کہ ایک شخص اپنی جماعت بنائے اور لوگوں کو اپنی بات کا قائل کرے۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنائے۔ اور وہ یہ کام کھلم کھلا اور برملا کرے یہ اس کا آئینی حق ہے۔ ——— زیر زمین جانے کی اسے ضرورت نہیں ہے۔ پرامن طریقہ سے ہر پارٹی کو برسراقتدار پارٹی کے خلاف مہم اور تحریک چلانے کا حق پوری دنیا میں اب تسلیم کیا جاتا ہے۔

ہمارے سوچنے کا کام ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم تمدنی ارتقاء اور اس انقلاب کو سامنے رکھیں جس نے یہ متبادل طریقے (Alternate Procedures) دنیا کو دیئے ہیں کہ آج یہ امکان موجود ہے کہ حزب اختلاف قائم ہو جب تک وہ پارٹی بغاوت نہیں کرتی، اور پرامن طور طریقے اختیار کرتی ہے، کوئی قانون اس کے خلاف نہیں جائے گا۔ وہ پارٹی تبلیغ کا حق رکھتی ہے۔ اپنے خیالات کی نشرواشاعت کا حق رکھتی ہے۔ جو لوگ اس کے خیالات کو قبول کریں، انھیں جمع کرنے اور منظم کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اسے اپنے طریق تنظیم کو اپنی صواب دید کے مطابق اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہ اپنے سربراہ کو صدر کہے، امیر کہے، کوئی اور اصطلاح اختیار کرے اسے

حق ہے۔ جب تک یہ پارٹی بدامنی کی کوئی صورت پیدا نہ کرے' جب تک وہ فساد پیدا نہ کرے' خانہ جنگی کی صورت پیدا نہ کرے اس وقت تک اس کے وہ تمام حقوق مسلمہ ہیں جو میں نے ابھی بیان کئے ہیں۔ ان میں سے کوئی حق بھی سلب نہیں کیا جا سکتا۔ الّایہ کہ ہنگامی صورت حال یا مارشل لاء کا عارضی نظام کچھ عرصہ کے لئے ان کو معطل کر دے عارضی شے عارضی کے درجہ میں ہی رہے گی وہ تو ایک استثنائی حالت ہے میں نارمل حالات کی بات کر رہا ہوں جس میں یہ تمام حقوق مسلم ہیں۔ ان میں سے کسی حکومت کو کوئی حق سلب یا ساقط کرنے کا حق و اختیار حاصل نہیں ہے۔

حالات کا دیانت دارانہ تجزیہ اب اگر کسی ملک میں خالص اسلامی نظام برپا کرنے کے لئے ایک جماعت بنتی ہے۔ اگرچہ معاشرہ میں اسلامی شعائر کی پابندی مثلاً نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج کی اجازت ہے اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ بھٹو صاحب کے دور میں بھی ان شعائر سے روکتا تو کوئی نہیں تھا۔ البتہ یہ فضا بڑی حد تک پیدا ہو گئی تھی کہ بھٹو صاحب کی پارٹی کے اکثر کارکن ان چیزوں کا مذاق اڑانے لگے تھے میں جنرل ضیاء الحق صاحب کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ آج ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے کہ جس میں ترغیب و تشویق کا عنصر کسی نہ کسی حد تک موجود ہے۔ اب وہ بات نہیں رہی ہے کہ کسی نمازی پر فقرے چست کئے جائیں یا کوئی سرکاری افسر اس بات پر شرمائے کہ وہ اگر کسی فنکشن یا مجلس سے نماز کے لئے اٹھ کر جائے تو لوگ کیا کہیں گے! ماحول میں کچھ نہ کچھ تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہی سب کچھ ہے ؟ ایک شخص کی رائے ہو سکتی ہے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے' بلکہ ہم نے اوپر کا غازہ مل دیا ہے' حقیقت کے اعتبار سے یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ محض تصنع ہے اور حقیقت کے عدم وجود اور تصنع کے ہونے کے باعث عوام کے اندر اسلام سے بددلی پیدا ہو رہی ہے کہ ہمارے شب و روز تو وہی ہیں جو پہلے تھے۔ بلکہ بگاڑ میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے وہی سرمایہ دار کی حکومت ہے' جاگیردار اور زمیندار کی حکومت ہے' وہی رشوت کا لین دین ہو رہا ہے' دھڑلے سے ہو رہا ہے۔ بلکہ خود سربراہ مملکت کے بقول اس کے بہت بڑھ گئے ہیں۔ اسمگلنگ کا کاروبار کھلے بندوں ہو رہا ہے سود کا لین دین جاری ہے۔ منشیات کی اندرونی و بیرونی تجارت کھلے عام ہو رہی ہے۔ بلیک مارکیٹنگ کا دھندا مزید زوروں پر ہے۔ ڈاکہ' چوری' لوٹ مار' قتل و غارت کا بازار گرم سے گرم تر ہوتا جا رہا ہے۔ اغوا اور عصمت دری کے واقعات بڑھتے جا رہے ہیں' علاقائی قومیتوں کا احساس مزید ابھر رہا ہے اور ڈر ہے کہ کہیں جلد ہی یہ بہت سے خوفناک عفریتوں کا روپ نہ ڈھال لے۔ استحصالی اور جابرانہ نظام مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔ تو ایک طرف حالات کی صحیح تصویر یہ ہے دوسری طرف اسلام آ رہا ہے۔ اسلام آ رہا ہے' کے فلک شگاف نعرے لگائے جا رہے ہیں' بلند بانگ دعوے کئے جا رہے ہیں۔ حالانکہ آج کے اور دس بارہ سال سے قبل کے معاشرہ کا تقابل کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ سرمہ

کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے بلکہ بحیثیت مجموعی حالات روز بروز بد تر سے بد تر ہوتے چلے جا رہے ہیں بلکہ ہم نے اس معاشرے پر اوپر کا کچھ غازہ مل کر اور کچھ ظاہری ٹیپ ٹاپ کر کے اسے اسلامی معاشرہ' کہہ دیا ہے اور ساری دنیا میں اس کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ تو ان حالات میں ضروری ہے کہ کوئی کھڑا ہو اور وہ برملا یہ حق بات کہے کہ ہمیں اس دھوکے کا پردہ چاک کرنا ہے اور انقلابی طریق کار پر عمل کرتے ہوئے اس نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر اس کی جگہ صحیح و کامل اسلامی نظام قائم و نافذ کرنا ہے۔ ایسے شخص کا دینی فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس کی دعوت دے' اس کے لئے وہ لوگوں کو جمع کرے' انہیں منظم کرے' ان کی تربیت کا انتظام کرے۔ جب تک وہ اس موجود و برقرار 'Law & Order Situation' (امن عامہ کی صورت حال) کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرتا۔ جب تک وہ زبان سے بغاوت کا حکم نہیں نکالتا اسے یہ کام کرنے کا آئینی و قانونی حق ہے۔ بلکہ یہ اس کے اپنے ایمان کے تقاضا ہے کہ ابتدائی مراحل کو طے کرنے کی سعی و جہد کرے اور انقلاب لانے کے لئے اقدام کرے۔ ان مراحل میں اولاً دعوت کا مرحلہ ہے۔ پھر لوگوں کی تنظیم ہے' پھر ان کی تربیت ہے۔ پھر اس دوران اس پر جو تکلیف آئے اسے جھیلنا ہے اس لئے کہ اسے اپنے اوپر اسلام قائم و نافذ کرنا ہے مثلاً ایک شخص کے کاروبار کی کافی وسیع و عریض بساط بچھی ہوئی تھی' لیکن وہ اگر آج سود کی آمیزش اور آوارگی سے پاک کرنے کی فکر کرتا ہے تو اس کے کاروبار کی بساط لپٹنی شروع ہو جاتی ہے۔ اگر کسی شخص کے گھر میں رشوت کے ذریعے سے اللّے تللّے ہو رہے تھے' آج وہ طے کرتا ہے کہ میں اب رشوت نہیں لوں گا تو اس کے خاندان کو دونوں وقت سادہ ترین غذا بھی شاید بمشکل ملے۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اپنے ہی گھر میں صحیح صحیح شرعی پردہ نافذ کر دے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی سوسائٹی میں نکو بن کر رہ جائے گا اور اس کے اپنے اعزا و اقارب اسے دیوانہ اور مجنوں کہنے لگیں گے۔ اس کا مقاطعہ ہو جائے گا۔ عوامی زبان میں اس کا حقہ پانی بند ہو جائے گا ..... یہ سب تکلیفیں وہ جھیلے' انہیں برداشت کرے۔ ان میں سے کسی بھی مصیبت پر جوابی کارروائی کے متعلق نہ سوچے ' Relaliate نہ کرے۔ اس میں کہیں جذبات سے مغلوب نہ ہو' مشتعل نہ ہو' کسی کو گالی نہ دے۔ کوئی ایسا اقدام نہ کرے کہ جس سے امن کا معاملہ درہم برہم ہو۔ یہ ہے اس دور میں ایک سچے مسلمان کی حقیقی تربیت کی کسوٹیاں۔ آج کلمہ توحید و رسالت پڑھنے پر مار نہیں پڑے گی' مقاطعہ نہیں ہو گا' گھروں سے نکالا نہیں جائے گا۔ مجنوں اور دیوانہ نہیں کہا جائے گا۔ تمسخر اور استہزا نہیں ہو گا اور جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں کہ اس دور میں اگر کوئی شخص ہزار دانے کی تسبیح لے کر سڑک پر کہیں بیٹھ جائے اور بلند آواز سے کلمہ ادا کرے "حق ہو' حق ہو" کے نعرے لگائے تو موجودہ معاشرہ ایسے شخص کی بڑی عزت و توقیر کرے گا۔ اسے پہنچا ہوا بزرگ سمجھے گا۔ اس کی خدمت اپنے لئے سعادت سمجھے گا۔ لیکن کوئی شخص کاروبار کو سود سے پاک

رکھے، انکم ٹیکس کی چوری نہ کرے، رشوت لے نہ دے، گھر میں صحیح اسلامی پردہ کو نافذ کرے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ اپنے ہی بیگانے بن جائیں گے۔ اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا وہ اپنے ہی گھر اور اپنی ہی قریبی سوسائٹی میں نکو بن کر رہ جائے گا۔ اس کا وہ مذاق اڑے گا کہ توبہ ہی بھلی

حاصل گفتگو یہ نکلا کہ اگر کسی معاشرہ میں انقلاب محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لئے مرحلہ وار کام ہو رہا ہے۔ دعوت و تبلیغ کا مرحلہ چل رہا ہے، تنظیم کا مرحلہ چل رہا ہے، تربیت کا مرحلہ چل رہا ہے ... اس سلسلہ میں جن تکالیف و مصائب سے سابقہ پیش آ رہا ہے انہیں جھیلا جا رہا ہے اور آئندہ بھی جھیلنے کا عزم ہے تو اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے ایک جماعت بنائی جائے گی (اس جماعت کی حیثیت و تشکیل کی نوعیت کے بارے میں بھی انشاء اللہ مفصل گفتگو ہو گی) اب فرض کیجئے کہ یہ جماعت اتنی منضبط اور موثر ہو گئی ہے کہ اقدام کیا جا سکتا ہے تو اس اقدام اور تصادم کے مراحل کے موقع پر وہ جماعت کیا کرے گی ؟ اس کی نوعیت کیا ہو گی ؟ اسی مسئلہ سے بات شروع ہوئی تھی تو اب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے لئے ہمیں تمدن کی موجودہ ارتقائی صورت حال نے کچھ متبادل طریقے دیئے ہیں وہ کیا ہیں ؟ اب اس مسئلہ پر گفتگو شروع ہوتی ہے ... آپ سے پوری توجہ مرتکز کرنے کی درخواست ہے۔ (جاری ہے)

مسئلہ سندھ کا حل: کیا اور کیسے؟

مسئلہ سندھ کی اہمیت کے پیش نظر اس شمارے میں بھی اس موضوع پر دو اہم مقالات شائع کیے جا رہے ہیں۔ یہ دونوں مقالے اپریل میں منعقد ہونے والے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے سالانہ محاضرات میں پیش کیے گئے تھے۔ پہلا مقالہ بزرگ صحافی اور تجزیہ نگار جناب عبدالکریم عابد کے قلم سے ہے انہوں نے حکمرانوں کی نعلیوں اور سیاست دانوں کی خود غرضیوں سے عبارت پاکستانی سیاست کے اندھیروں کی کوکھ سے جنم لینے والے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے اس مسئلے کا حل بھی تجویز کیا ہے۔ دوسرے مقالے میں سندھ کے اُبھرتے ہوئے دانشور صحافی جناب محمد موسیٰ بھٹو نے اہل سندھ کی سیاسی و معاشی محرومیوں اور ان کی بنیاد پر اُٹھنے والی تحریکوں کے حوالے سے فکر انگیز گفتگو کی ہے۔

تاریخ سندھ سے متعلق "میثاق" اپریل ۸۷ء میں شائع شدہ سید غلام مصطفیٰ شاہ کے انگریزی مضمون کے ترجمے کی پہلی قسط، ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کا وضاحتی خط اور کراچی سے جناب محمد حنیف سلیمی صاحب کا مراسلہ بھی شامل اشاعت ہیں۔
(ادارہ)

پاکستانی سیاست اور مسئلہ سندھ

عبدالکریم عابد

پاکستان کے ہر حکمران نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کے دور میں پاکستان مضبوط اور مستحکم ہو گیا ہے۔ اب پاکستان پر کوئی آنچ نہیں آسکتی کیونکہ ملکی سالمیت اور استحکام کے کِلّے بہت مضبوطی سے گڑے ہوئے ہیں۔ لیکن اس طرح کی ہر یقین دہانی آخر کار غلط ثابت ہوئی اور آج پاکستان اپنی تاریخ کے بدترین عدم استحکام کا شکار ہے۔ اور ہمارا نظریاتی سیاسی معاشی معاشرتی انتشار اور اضمحلال خطرہ

کی تمام حدوں کو پار کر گیا ہے۔

یہ صورت حال اس بنا پر ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے اپنی ذات کے استحکام کو ملک کا استحکام سمجھا اور اس پر خوش ہوتے رہے کہ ہماری انتظامی مشینری مخالفین کو دبانے کچلنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے لیکن انہوں نے نہیں دیکھا کہ اس طرز حکمرانی کے سبب وہ ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں کیونکہ جبر کی حکومت یا تو غلامانہ ذہن کو پروان چڑھاتی ہے یا نفرتوں کی آگ کو جنم دیتی ہے۔ ہمارے عدم استحکام کا بھی اصل سبب یہ ہے کہ وطن عزیز کو یا تو برسہا برس مارشل لا کے ڈنڈے سے چلایا جاتا رہا یا قوم پر ایک جعلی جمہوریت مسلط کر دی گئی آج بھی یہی صورت حال ہے اور ہم ملکی استحکام کی پہلی اینٹ رکھنا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ حکمرانوں اور سیاسی جماعتوں کے درمیان جلد از جلد نئے انتخابات کرانے کے بارے میں سمجھوتہ ہو اور اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جو معروف اور مسلمہ جمہوری طریقوں سے منتخب ہو کر آئیں اور عوام کو بھی یقین ہو کہ اصل فیصلہ کُن طاقت بُلٹ نہیں بیلٹ ہے۔

پس ملک کے عدم استحکام کے لئے یقیناً بڑی حد تک حکمران ذمہ دار ہیں لیکن حزب اختلاف کے رہنماؤں کی سیاست میں بھی کچھ قصور اور فتور ضرور ہے اس سیاست کی بنیاد ہمیشہ منافقت اور بے اُصولی پر رہی ہے یہ مسلسل قلا بازیاں کھاتی رہتی ہے کبھی جمہوریت کا موقف ہے کبھی جلاؤ گھیراؤ کا، کبھی سوشلزم کا نعرہ بلند ہوتا ہے اور کبھی جاگیرداروں کو سینے سے لگایا جاتا ہے کبھی سیاستدان مل کر نظام مصطفےٰ کا سوانگ رچاتے ہیں مگر بھٹو کی پھانسی کے بعد شادیانے بجا کر اپنی راہ ہو لیتے ہیں ایک وقت میں صوبوں پر فوج کشی کی حمایت ہوتی ہے دوسرے وقت میں یہی لوگ صوبائی خود مختاری کے چیمپئن بن کر ظاہر ہوتے ہیں اسی طرح امریکی سامراج کی مخالفت کا علم بلند کیا جاتا ہے اور پھر مصلحت دیکھ کر اس علم کو پھینک دیا جاتا ہے کبھی جمہوریت کے شوق میں ایسے دیوانے ہو جاتے ہیں کہ اپنی کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا اور کبھی چُپ چاپ آمریت سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں غرض اس منافقت اور بے اُصولی کی سیاست نے بھی ملک میں سیاسی عدم استحکام کا زہر گھولا ہے

اور اس کی وجہ سے سیاسی جماعتیں فیصلہ کن طاقت حاصل کر سکی ہیں نہ ان کے عوام میں یقین محکم عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کی انقلاب انگیز خصوصیات اور کیفیات راسخ ہو سکی ہیں اس لئے ہمارے تمام سیاست پسند عناصر کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ جس طرح فوجی آمریت اور جعلی جمہوریت سیاسی استحکام کے لئے زہر ہے ایسے ہی سیاسی موقع پرستی اور بے اصولا پن بھی سیاست میں استحکام ختم کر کے انتشار بڑھائے چلے جا رہا ہے اس بے اصولی اور موقع پرستی نے ہی مسلم لیگ کا خاتمہ کیا تھا اور یہی وہ دیمک ہے جو ہر سیاسی جماعت میں موجود ہے اور اسے چاٹ رہی ہے۔

سیاسی استحکام سے ہماری محرومی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے حکمران اور ہمارے حزب اختلاف کے سیاستدان دونوں ایک ہمہ وقتی محاذ آرائی میں مصروف رہتے ہیں۔ اس طرح کی محاذ آرائی صرف بیرونی سامراج کی ضرورت پورا کرتی ہے کہ قوم تقسیم رہے اس میں خانہ جنگی کے امکانات موجود رہیں اور حکمرانوں کا اپنے عوام اور سیاسی عناصر سے رشتہ دشمنی اور عداوت کا ہو اس لئے سامراج ان میں سے ہر فریق کو تھپکیاں دیتا ہے کہ وہ عداوت میں گہرے اور پختہ ہوں۔ کبھی بھی سیاسی مفاہمت یا مصالحت کو قبول نہ کریں، اور پھر مختلف سیاسی جماعتوں کے درمیان قرون وسطیٰ کے مذہبی فرقوں کی طرح عداوت دیکھ کر بھی سامراج کو اطمینان رہتا ہے کہ یہ قوم کبھی متحد نہیں ہو سکتی اور اس کے زعماء ایک میز پر نہیں بیٹھ سکتے اس طرح حکمران اور دوسرے سب گروہ سامراج کے کھیل کو ہی آگے بڑھاتے ہیں اور سیاست ایسے تفرقے کو پروان چڑھاتی رہتی ہے کہ حکمرانوں سمیت ہر گروہ بیرونی طاقتوں کی جانب دیکھنے اور ان سے آس لگائے رکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور وہ لوگ جو ایک دوسرے سے مصالحت نہیں کرتے بیرونی آقاؤں یا سامراج کے آگے جھک جانا پسند کر لیتے ہیں۔

پاکستان کے سیاسی عدم استحکام کی تاریخ بہت پرانی ہے اور اس المناک تاریخ کے ہر صفحہ پر مرکز اور صوبوں کی کشمکش جلی حرفوں میں نظر آتی ہے اس کشمکش کی وجہ سے ہی پہلے تو دستور نہیں بن سکا اور جب بنا تو مارشل لاء کی

نظر ہو گیا یہ غیر جمہوری اور آمرانہ مرکزیت ہی تھا جس نے ایک طرف مشرقی پاکستان کے بڑے صوبے اور دوسری طرف مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں کی نفسیات کو غلط کیا اور انہیں سیاسی طور پر بدراہ بنایا اس لحاظ سے آج سندھ ایک خطرناک نقطہ پر پہنچ گیا ہے اور ڈاکٹر اسرار احمد نے صحیح فرمایا ہے کہ پاکستان کی قسمت کا فیصلہ سندھ کے ریگزاروں میں ہوگا۔

سندھ کے بارے میں حکمران حلقوں کی سوچ یہ نظر آتی ہے کہ وہ سندھ پر ایک زبردست مار دھاڑ مسلط کر کے حالات کو ٹھیک کرلیں گے اُن کا خیال ہے کہ جو تجربہ مشرقی پاکستان میں ناکام رہا وہ سندھ میں کامیاب ہو سکتا ہے اس مقصد کے لئے سندھ کی تحریک اور شخصیات کو ابھارا بھی جا رہا ہے تاکہ بعد ازاں مار دھاڑ کی کارروائیوں کے لئے جواز اور حالات پیدا ہو سکیں حکمران گروہ میں ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ اگر ہم سندھ کی غیر سندھی آبادی کو رشوت اور لقمہ تر کے طور پر سندھیوں کے حوالے کر دیں تو سندھ پنجاب کی مفاہمت قائم ہو جائیگی کچھ لوگ اس کے برعکس سوچنے والے بھی ہیں اور سمجھتے ہیں کہ تقسیم اور ٹکراؤ کو بڑھا کر اور پھیلا کر حکومت کی جا سکتی ہے لیکن چالاکیوں عیاریوں سے اور تشدد یا فوجی کارروائیوں کے ذریعہ مسئلہ سندھ سلجھنے کی بجائے مزید الجھ جائیگا۔

سندھ کے مسئلہ کا حل صرف جماعتی بنیادوں پر نئے انتخابات ہیں۔ اگر سارے پاکستان میں نہیں تو کم از کم سندھ میں موجودہ اسمبلی کو توڑ کر فوراً جماعتی بنیادوں پر نئے انتخابات کرا دیئے جائیں اس سے سندھ کا مسئلہ صحت مندانہ طریقے سے طے کرنے کی طرف پیش رفت ہو سکے گی ورنہ سندھ جو نظریاتی طور پر ہاتھ سے نکل چکا ہے عملی طور پر بھی موقع ملتے ہی باغی ہو جائے گا اور آپ نے سامراج بن کر اس علاقے کو اپنی گرفت میں رکھنے کی کوشش کی تو یہ کوشش زیادہ دنوں تک کامیاب نہیں رہ سکے گی۔

سندھ کا مسئلہ آج پیدا نہیں ہوا یہ پاکستان کی پیدائش کے ساتھ ہی پیدا ہوا تھا لیکن ہم نے اس سے آنکھیں چار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی آج سے اٹھارہ سال پہلے ۶۸ء میں جئے سندھ تحریک پر میرے مضامین ایک سال تک روزنامہ حریت میں قسط وار شائع ہوتے رہے اور ان مضامین میں جئے سندھ تحریک کی

صورت حال اُس کے سیاسی معاشی ثقافتی نفسیاتی اسباب و علل اس کی ہمارے مستقبل اثر اندازی کے امکانات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا تھا اس کے ساتھ ہی میں نے سال بھر تک سندھی بھائیوں کے وہ سینکڑوں خطوط حُریت میں شائع کئے جن میں اپنی محرُومیوں کا گلہ تھا اور سندھ کی ہر شکایت اور ہر احساس کو بیان کیا گیا تھا لیکن افسوس کہ ہمارے حکمران پالیسی ساز ادارے اپنی الگ دنیا میں رہتے ہیں۔ اور اس دنیا سے باہر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور آنکھ بند کر کے اپنی ڈگر پہ چلتے رہتے ہیں اگر اٹھارہ سال پہلے ان مضامین اور خطوط کا نوٹس لیا جاتا اور مثبت کاروائیاں کی جاتیں تو اس کے اچھے ثمرات آج دیکھے جا سکتے تھے۔

سندھ کے ساتھ عجیب حادثے پیش آئے پہلا ظلم یہ تھا کہ ہماری سول اور فوجی بیوروکریسی نے آمریت کا اقتدار قائم کیا اور اس میں سندھ کسی اعتبار سے بھی شریک نہیں تھا اس کی حیثیت ایک مغلوب اور محکوم کی تھی پھر اچانک یہ ہوا کہ بھٹو صاحب کی وجہ سے سندھ کے لوگوں کے ہاتھوں میں غیر فطری انداز سے اقتدار آگیا اور دیہاتوں کے وڈیرے اپنا لاؤ لشکر لے کر نہ صرف سندھ کے شہروں بلکہ پاکستان کے مرکز اسلام آباد میں بھی داد عیش دیتے نظر آنے لگے اس زمانے میں سندھ کی قدیم محروم آبادی کے متوسط اور غریب طبقہ نے بھی بھٹو اقتدار کے بہتے ہوئے دریا سے اپنی پیاس بجھائی مگر چند جام پی کر بہک گئے اور یہ خیال نہیں کیا کہ بساط الٹ بھی سکتی ہے اس لئے وہ جمہوریت صوبائی خودمختاری شہری حقوق اسلام ہر تحریک سے الگ تھلگ جئے بھٹو کے نعرے لگاتے مست پڑے رہے لیکن جب بساط اُلٹ گئی تو بھٹو پھانسی کے تختے پر پہنچ گئے اور ان کی یہ موت ہر سندھی کے دل کا زخم بن گئی اس زخم کے لئے مرہم کا انتظام بھی کوئی نہیں تھا صرف مارشل لاء کے کوڑے فضا میں لہراتے رہے یا حکومت نے بھٹو پرستی کو دُور کرنے کے لئے سندھ میں دوسری طاقتوں کو اُبھارا جس میں پیر پگارا گروپ کے علاوہ جئے سندھ تحریک اور کنفیڈریشن والے شامل ہیں، اس تدبیر نے ممکن ہے سندھ میں پیپلز پارٹی کا اثر کم کیا ہو لیکن قومی نقطۂ نظر سے اس نے ملکی استحکام کو مزید نقصان پہنچایا اور آج سندھ کی سیاست نہ صرف دیہی علاقوں بلکہ شہروں علاقوں میں بھی پاکستان کے

نظریاتی اور ریاستی استحکام کو غارت کر رہی ہے اور فوری انتخابات کے بغیر اس سیاست کے پٹڑی پر آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

سندھ کے مسئلہ پر تو تفصیلاً کل کے اجلاس میں بحث ہو گی لیکن آج میں اپنے سندھی دوستوں کی خدمت میں یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اہل سندھ پر یہ واضح کریں کہ اگر انہیں جمہوری اساس پر ایک نیا سندھ مطلوب ہے تو اس کے لئے انہیں ایک نئی سیاسی قیادت بھی پیدا کرنی ہوگی قدیم طرز کی وڈیرہ شاہی کی قیادت میں سندھ کا بھلا نہیں ہو سکتا اور نظریاتی انتشار میں مبتلا عقیدہ ایمان، اخلاق، کردار سے محروم متوسط طبقہ بھی سندھ کو کسی منزل پر نہیں پہنچا سکتا۔ اس لئے استحکام پاکستان کے نقطۂ نظر سے سندھ کے حقوق کی پوری پوری حمایت کے ساتھ میں اہل سندھ کو ان کی ذمہ داریاں بھی یاد دلانا چاہتا ہوں اُن ذمہ داریوں کے شعور کے بغیر سندھ ہمیشہ ایک خطرناک عدم استحکام کا شکار رہے گا جو عدم استحکام غیر جمہوری اور آمرانہ مرکز نے پیدا کیا ہے۔ اُس کا علاج یہ نہیں ہے کہ علاقائی عصبیتوں کی بنیاد پر سیاسی افراتفری اور اخلاقی بے راہ روی پھیلائی جائے اس سے پاکستان ممکن ہے ختم ہو جائے لیکن سندھ بھی بچ نہیں سکے گا اور اس کے پرخچے اڑ جائیں گے اس لئے سندھ کا اور پاکستان کا مفاد اسی میں ہے کہ ہم کسی ملی اور قومی سوچ اور کسی رُوحانی اور اخلاقی فلسفہ کو اپنائے رکھیں اور کوشش یہ کریں کہ جلد از جلد نئے انتخابات کے ذریعہ ایک نئی مثبت اور صحت مند سیاست اس علاقے میں شروع ہو۔

ملکی استحکام کے لئے سب سے بڑی ذمہ داری اہل پنجاب پر عائد ہوتی ہے کیونکہ وہ آبادی اور وسائل ہر اعتبار سے غالب حیثیت رکھتے ہیں اُن کے لئے نہ تو یہ صحیح ہے کہ وہ چھوٹے صوبوں کے محسوسات کی طرف سے اپنی آنکھیں کان بند رکھیں اور نہ یہ صحیح ہوگا کہ وہ علاقائی نیشنلزم کے آگے ہتھیار ڈال دیں کیونکہ اصل ضرورت لسانی قومیتوں کے طرز فکر سے سمجھوتے کی نہیں ہے صرف جمہوریت کو عملاً جاری وساری کرنے اور نافذ کرنے کی ہے اگر جمہوریت ہو گی تو قومیتوں کے فلسفے خود بخود بے جان ہو جائیں گے ورنہ ان کے خلاف کاغذی جہاد

کوئی فائدہ نہیں دیں گے اور نہ ان کے ساتھ مداہنت کا طرزِ عمل ملک کو استحکام
عطا کر سکے گا استحکام دینے والی چیز صرف جمہوریت اور عوام کے حقیقی نمائندوں
کو اقتدار کی منتقلی ہے اگر یہ ہو گا تو پاکستان کے مستقبل کو خطرہ نہیں آپ
کے سارے کلِے ایک ایک کر کے ٹوٹتے جائینگے اور آپ کی داستان تاریخ میں ایک
عبرت یا مضحکہ کے طور پر رہ جائیگی۔

(۲)

مسئلہ سندھ ـــ ایک تجزیاتی مطالعہ

محمد موسیٰ بھٹو

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی کتاب "استحکام پاکستان بسلسلہ سندھ" ایک ایسی کتاب ہے جو سندھ
کے موجودہ رجحانات، مسائل اور مزاج کو سمجھنے، سندھ کے مسئلہ کو پیچیدہ بنانے میں حکومت، پنجاب،
سندھی و مہاجر لسانی اکائیوں کے کردار اور سندھ کے حوالہ سے پاکستان کو درپیش خطرات کی
روک تھام اور اس کے لیے تجاویز پر ایک مؤثر، فکر انگیز اور بھرپور کتاب ہے۔ دینی طبقہ میں ڈاکٹر
صاحب پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے روایتی مذہبی دائرے اور خول سے باہر نکل کر علاقائی مسائل
کو اس کے حقیقی تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ اس سلسلے میں ہمارے بیشتر
مذہبی حلقے اب تک جمود کا شکار ہیں۔ وہ مسلم قومیت اور اسلامی قومیت کے مثالی نصب العین سے
ہٹ کر حقائق کا سامنا کرنے اور حالات کے معروضی تجزیہ کرنے سے قاصر ہیں۔ ظاہر ہے حالات
و مسائل کے صحیح تجزیہ کے بغیر اسلام اور پاکستان کو درپیش چیلنج کا مقابلہ تو کیا اسے سمجھا بھی نہیں جا سکتا

کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے لسانی اکائیوں بالخصوص سندھ کے مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں
عادلانہ معاشی نظام اور جمہوریت کے فروغ پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ نقطہ نگاہ
قابلِ تعریف ہے کہ چونکہ ملک میں اقامت دین کی تحریک کمزور ہے اس کے توانا ہونے تک
ذہنوں کے جھگڑوں اور فوجی حکمرانوں کے پیدا کردہ مسائل سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا، اس

لئے آزادانہ انتخابات اور صحیح جمہوریت کی بحالی ہی وہ عمل ہے جس سے ہم سندھ میں قومیت کی تحریک
کو ناقابل تلافی واپسی پر جانے سے روک سکتے ہیں۔ سالمیت پاکستان کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے
پیپلز پارٹی اور مس بے نظیر بھٹو کے کردار پر بھی بات کی ہے اور قومی سیاست سے بے نظیر کی مایوسی
کو ملکی سالمیت کے لئے سخت نقصان دہ اور سندھو دیش تحریک کے لئے تقویت کا باعث قرار دیا
ہے۔ یہ بات بہت سارے لوگوں کے لئے اچنبھے کی بات ہوگی کہ ڈاکٹر اسرار احمد جیسا بالغ نظر
عالم دین ایک ایسی جماعت کی افادیت و اہمیت ثابت کر رہا ہے جو سیاست میں سیکولرازم کی علمبردار
ہے لیکن سندھ میں پاکستان کے حوالے سے سوچ جس طرح انتہاپسندانہ ہو گئی ہے اور منفی طاقتوں
عمل دخل اور دباؤ جس تیزی سے بڑھا ہے اس میں اب تنہا پیپلز پارٹی ہی رہ گئی ہے جو اس دباؤ
کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور عام لوگوں کی اکثریت مس بے نظیر بھٹو سے جذباتی وابستگی
رکھتی ہے۔ اس لئے اگر بے نظیر بھٹو بھی قومی دھارے سے کٹ کر علاقائیت
اور سندھی نیشنلزم کی علمبردار بن گئی تو یہ ملک کے لئے انتہائی خطرناک بات ہوگی۔ جی ایم سید، ممتاز بھٹو
اور عبدالحفیظ پیرزادہ وغیرہ کی کوشش یہی ہے کہ ایسا ہو۔ یہ ایک تشویشناک اور المناک بات ہے کہ حکومت
ایک عرصہ سے پیپلز پارٹی کی قوت توڑنے کیلئے علاقہ پرست تحریکوں کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کر رہی
ہے۔ اس سلسلہ میں فوری نوعیت کا صحیح حل وہی ہے جو ڈاکٹر صاحب نے پیش کیا ہے۔

میں مجموعی طور پر ڈاکٹر صاحب کی کتاب "استحکام پاکستان بسلسلہ سندھ" کو اسلام اور
پاکستان کی خدمت اور علاقائی رجحانات کی تفہیم کے حوالے سے ایک کامیاب اور مستحسن کوشش تصور
کرتا ہوں۔ کتاب کے بارے میں ان تاثرات کے بعد اب میں سندھ میں اسلام و پاکستان
کی سالمیت کے حوالہ سے گفتگو کروں گا۔

سندھ جو برصغیر ہند میں باب الاسلام کی حیثیت رکھتا ہے اور سندھی عوام جو مزاجاً اسلامی
قناعت، مہمان نوازی، سادگی اور توکل جیسی صفات کے حامل رہے ہیں اور اب بھی ایک حد
تک یہ صفات ان کے اندر موجود ہیں، بدقسمتی سے تاریخ میں پہلی بار ایسے موڑ پر کھڑے ہوئے
ہیں، جہاں یہ نظر آتا ہے کہ مزاج میں جھنجھلاہٹ، غصہ، نفرت، تعصب، سیاسی اور اغراض
اسلام سے بیزاری نظر آ رہی ہے اور پنجاب اور اہل پنجاب سے اسلامی حوالہ سے رشتہ و تعلق میں
سے کمزوری آ رہی ہے۔ اور نفرت و کدورت کی صورتحال پیدا ہو رہی ہے۔ پڑھی لکھی سندھی آ

وہ چاہے شہروں میں رہتی ہو یا دیہات میں، اس معاملہ میں اس کے جذبات و احساسات کافی آگے جا چکے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کا ایک قابلِ ذکر طبقہ جو ہزاروں سے متجاوز ہے ایسا بھی پیدا ہو چکا ہے جس کا علمی، شعوری اور ذہنی طور پر اسلام پر اعتماد بری طرح متزلزل ہو چکا ہے۔ وہ جدلیاتی تاریخی مادیت، لادینیت اور سیکولرازم کا قائل ہو چکا ہے اور اسلام کو وہ جدید دور میں رہنمائی کے لئے ناقابلِ عمل سمجھتا ہے۔ سندھی نیشنلزم کی بات تو عام ہے۔ عام طور پر ہر سندھی ذہنًا یا تو نیشنلسٹ بن چکا ہے یا وہ نیشنلسٹ تحریکوں اور حالات کے شدید دباؤ سے متاثر ہو کر نیشنلزم کی بات کرتا ہے۔ بڑے سے بڑا سمجھدار مذہبی فرد بھی پنجاب، پنجابی افسر شاہی کے تسلط اور زیادتیوں کا رونا رو دئے بغیر آپ کو نہیں ملے گا۔

کمیونسٹ اور نیشنلسٹ تنظیموں کی طرف سے چھوٹے بڑے اسٹڈی سرکل، ہفتہ وار اور ماہانہ نشستوں، کانفرنسوں اور نشستوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہے جس میں نظریاتی مباحث، عوام میں نفوذ، آزادی اور انقلاب کے لئے حکمت عملیاں اور انقلاب و آزادی کی تحریکوں پر لیکچر دیئے جاتے ہیں اور مقالے پڑھے جاتے ہیں۔ علمی اور عملی طور پر شاید ہی کوئی شعبہ ہو، جس میں کام شروع نہ ہو چکا ہو۔ پاکستان میں اسلام سے عملی طور پر دوری، مادیت اور دنیا سے محبت کی برائیاں تو ہر صوبہ میں بڑے پیمانے پر پیدا ہو گئی ہیں۔ لیکن سندھ میں اسلام کے بنیادی عقائد و ایمانیات سے انحراف و ارتداد کی جو لہر شروع ہوئی ہے وہ بے حد تشویشناک ہے اور وہ کسی دوسرے صوبہ میں اس انداز سے موجود نہیں ہے۔

یہ وہ صورت حال ہے جو سندھ میں پیدا ہو چکی ہے لیکن انتہائی کرب اور اذیت کی بات ہے کہ پنجاب (جو ہر اعتبار سے بڑے بھائی کی حیثیت رکھتا ہے) میں اب تک سندھ کے حالات کی اس سنگینی کو سمجھنے اور اس کے تدارک کے انتظامات کرنے اور روٹھے ہوئے بھائی کو پرچانے کی فکر اور تشویش پیدا نہیں ہوئی۔ ہماری نوکر شاہی اور سیاسی و مذہبی جماعتوں پر یا تو بے حسی طاری ہے یا وہ "سب ٹھیک ہے" کی عینک لگائے ہوئے ہیں۔ فوجی حکمرانوں کا وقت آنے پر طاقت سے کچل دینے کا نقطۂ نگاہ ہے۔ لیکن ملکوں، قوموں اور لسانی اکائیوں کے علاقوں کو ساتھ لے کر چلنے اور چلانے کے یہ آداب ہرگز نہیں ہوتے۔ اس کے لئے بڑی پرکسی، بیداری، دوربینی اور بردباری کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ پنجاب عددی

اعتبار سے بڑا صوبہ ہونے کے ساتھ ساتھ طاقت کے مرکز کا صوبہ بھی ہے اس لئے اس سلسلہ میں پنجاب پر زیادہ اور بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر سمجھنے سمجھانے اور اپنی ذمہ داری کی ادائیگی کے سلسلہ میں بڑے صوبہ کی حالت یہ ہو جائے تو پھر حالات کی سنگینی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

آئیے اب مختصر طور پر یہ دیکھیں کہ آخر یہ صورتحال کیونکر پیدا ہوئی اور اس کے محرکات کیا ہیں: میرے نزدیک اس کے بنیادی اسباب درج ذیل ہیں :۔

(۱) اسلامی نظام تعلیم سے انحراف: نظریاتی قومیں نظام تعلیم کے ذریعے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ دنیا کی کوئی بھی قوم اپنے نظام تعلیم میں ریاستی نظریئے کو بنیاد بنائے بغیر فکری اور عملی خلفشار سے بچ سکے، یہ ممکن ہی نہیں۔ نظام تعلیم میں اتنی بڑی بنیادی تبدیلی کہ اسے اسلام کے ہم آہنگ بنایا جاتا، اس کے لیے پاکستان میں مضبوط اور طاقتور اسلامی نظریاتی قوت کا ہونا ضروری تھا۔ طاقتور نظریاتی جماعت کے بغیر محض خارجی دباؤ سے اس طرح کے فیصلہ کن اقدامات نہیں ہوتے۔ بدقسمتی سے پاکستان کو طاقتور نظریاتی اسلامی قوت نہ پہلے میسر تھی اور نہ اب ہے۔

علاقوں اور صوبوں کو ساتھ لے کر چلنے کی دوسری صورت یہ تھی کہ ملک میں جمہوریت کو فروغ دیا جاتا اور صوبوں کو اندرونی معاملات میں خودمختاری دی جاتی۔ جدید دور میں بڑے بڑے ترقی یافتہ مغربی ممالک بھی جمہوریت کے بغیر اپنی سلامتی اور یکجہتی کو خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ روس جہاں کلیت پسندانہ نظام ہے اس نے بھی کنٹرولڈ نظام کی خرابیاں محسوس کرکے فرد کی آزادی اور جمہوریت کی طرف سفر کا آغاز کر دیا ہے ورنہ روس جیسے طاقتور ملک کا زیادہ عرصہ تک اپنی پوزیشنوں کو قائم رکھنا دشوار ہوگا۔ جمہوریت کی خرابیاں اپنی جگہ (اگرچہ اس میں مسلسل ارتقاء کا عمل جاری ہے)۔ لیکن آمرانہ طرز حکومت میں عام لوگوں بالخصوص مختلف لسانی اکائیوں کے اندر مایوسی اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل کو روکنا دشوار ہے۔

سندھ میں پنجاب کی عددی اکثریت کے غلبہ کا خوف قیام پاکستان سے پہلے سے سیاسی لیڈروں اور صحافیوں کے ذہنوں میں موجود تھا۔ پیر علی محمد راشدی نے اس سلسلہ میں ۱۹۴۶ء میں آخر میں "فریاد سندھ" کے نام سے سو سے زائد صفحات پر مشتمل پوری کتاب لکھی تھی۔ جس میں ثابت کیا گیا تھا کہ پاکستان میں شمولیت کے بعد سندھ تجارتی، معاشی اور سیاسی اعتبار سے پنجاب کی کالونی بن جائے گا۔ لیکن پیر علی محمد راشدی صاحب کی سیاسی وابستگیاں بدلتی رہتی

ھیں۔ اس لیئے ان کی بات کو اس پس منظر میں دیکھ کر مسترد کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس مسئلہ پر مولانا خیر محمد نظامانی، مولوی عبدالغفور سیتائی اور سید سردار علی شاہ جیسے لوگ جن کی زندگیاں اسلام کے فروغ اور باطل قوتوں سے مقابلہ میں گزری ہیں اور جن کا صحافتی میدان میں اسلام کے لئے کام تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ پنجاب سے اپنے حقوق کے تحفظ میں اور صوبائی خودمختاری کے سلسلے میں ان کے خیالات اور رجحانات بھی وہی رہے ہیں جو عام طور پر اس وقت سندھ میں موجود ہیں۔

میں آپ کی معلومات کے لئے مذکورہ بالا اسلام دوست صحافیوں کے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ مولانا خیر محمد نظامانی روزنامہ باب الاسلام کے ۷ رجون ۱۹۴۷ء کے شمارے میں لکھتے ہیں۔

" ہندوستان سے علیحدہ ہوکر پاکستان کو جو ملٹری ملے گی وہ تقریباً پنجاب کی ہوگی۔ ان حالات میں پنجاب کے دیگر کمزور صوبوں پر غالب ہونے کے امکان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان حالات میں اہل سندھ کو چاہیئے کہ وہ قبل از وقت بیدار ہوں اور پاکستان فیڈریشن میں شامل ہونے کے لئے یہ شرط لگائیں کہ پاکستان میں صوبوں کو یکساں نمائندگی حاصل ہوگی اور فوج میں بھی سندھ کو کافی نمائندگی ملنی چاہیئے۔ پاکستان کو ایک صوبہ کی ملٹری کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑنا چاہیئے اور دریائے سندھ کے پانی کے بارے میں بھی اس وقت ایسی ہی شرائط عائد کرنی چاہیئے نیز جو شعبے صوبے آسانی سے چلاسکتے ہیں ان میں مرکز کی عدم مداخلت کی بات بھی طے ہونی چاہئیں۔ اگر سندھ کے لوگ بیدار نہ ہوئے تو پھر وہ پنجاب کے تسلط سے بچ نہیں سکیں گے"!

یاد رہے کہ یہ تحریر قیام پاکستان سے پہلے کی ہے

' مولانا عبدالغفور سیتائی لکھتے ہیں: " پاکستان کی نئی دستور ساز اسمبلی کے لئے خاکہ تیار کرلیا گیا ہے۔ اس میں ملک صوبوں کا فیڈریشن ہوگا اور ملک کے لئے ایک وفاقی اسمبلی ہوگی جس کے دو ایوان ہوں گے۔ ان دونوں ایوانوں میں ملک کے مغربی حصہ کو یکساں نمائندگی دی گئی اور یہ نمائندگی صوبوں کی آدم شماری کی بنیاد پر دی گئی ہے۔

متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں نے پاکستان کا مطالبہ اس مقصد کے لئے کیا تھا۔ تاکہ وہ ہندو اکثریت کی غلامی سے نجات حاصل کرسکیں اور ہندو اکثریت مسلمان اقلیت پر ووٹ کی برتری کے باعث ان پر حکمران بن کر من مانی نہ کرسکے لیکن بنیادی اصولوں پر مبنی کمیٹی نے پاکستان کے لئے جو دستور بنایا ہے اس میں اکثریت کا اقلیت پر وہی حکمرانی کرنے کا اصول تسلیم کرلیا گیا ہے۔ متحدہ

ہندوستان کی صورت میں ہندو اکثریت مسلم اقلیت پر حکمرانی کرتی ہے ۔ اس طرح وہاں بڑے صوبے چھوٹے صوبوں پر حکمرانی کرتے ۔ یہاں بھی بعینہٖ اقلیت پر اکثریت کے راج کو مسلط کرنے کے انتظامات کئے جا رہے ہیں ہم نے جس مصیبت سے بچنے کے لئے پاکستان کے علیحدہ وطن کے قیام کا مطالبہ کیا تھا وہی مسائل اب ہمارے لئے پاکستان میں پیدا کئے جا رہے ہیں ۔"

(روزنامہ نوائے سندھ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۲ء)

مولانا خیر محمد نظامانی، مولانا عبدالغفور سیتائی اور سید سردار علی شاہ کے اس طرح کے سینکڑوں ادارتی نوٹ ہیں جو قیام پاکستان سے کچھ پہلے اور بعد میں شائع ہوتے رہے ہیں ۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ سندھ میں پنجاب کی بالادستی اور صوبائی خود مختاری کے متعلق جو رجحانات پروان چڑھے ہیں وہ جی ایم سید اور ملک دشمنوں کے ہی پیدا کردہ نہیں ہیں بلکہ اس معاملہ میں مذہبی دانشوروں اور صحافیوں کے خیالات بھی یکساں ہیں ۔ بدقسمتی سے قومی سطح پر سندھ کے ان تیز احساسات کو گہرائیوں میں اتر سمجھنے کی بجائے اسے ملک دشمنی سے موسوم کیا گیا ۔ دوسری طرف عملاً جو صورتحال رہی وہ بھی فوجی آمریت اور مارشل لاء کا تسلط تھا

(۳) سندھ میں پاکستان اور اسلام کے لئے حالات سازگار بنانے میں ایک بڑی رکاوٹ سندھی نوجوانوں کی بڑی پیمانے پر بے روزگاری بھی ہے ۔ سندھی بے روزگار ایسوسی ایشن کے اعداد و شمار کے مطابق سندھ میں اس وقت سندھی زبان بولنے والے بے روزگار گریجوایٹ افراد کی تعداد ستر ہزار سے زائد ہے ۔ جن میں چھ سات ہزار ڈاکٹر ہیں تو سات آٹھ ہزار انجینئر ہیں ۔ میٹرک اور انٹر پاس بے روزگار نوجوانوں کی تعداد اس سے زائد ہے ۔ جو دیہاتی زندگی کے لئے ایک سنگین معاشرتی اور سماجی مسئلہ بن کر رہ گئی ہے ۔ اس لئے کہ یہ لوگ کاشت کاری کرنے سے تو قاصر ہیں ۔ زراعت میں ویسے بھی اب گنجائش کم ہے ٹیکنیکل اور فنی علم ان کو نہیں آتا ۔ اندرون سندھ صنعتی ادارے تو موجود ہی نہیں ۔ شہروں میں پہلے سے مقابلہ سخت ہے ۔ معاشی اعتبار سے تاریک مستقبل کی وجہ سے یہ نوجوان نہ صرف فکری انتشار کا شکار ہیں بلکہ عملی طور پر مختلف تخریبی سرگرمیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں ۔

سندھ میں گذشتہ ۳۰ سال کا عرصہ ایسا رہا ہے جس میں سندھ کا چیف سیکریٹری، ہوم سیکریٹری، آئی جی اور دوسرے اہم کلیدی عہدے زیادہ تر پنجاب سے وابستہ افراد کے سپرد رہے ہیں ۔ اس طرح مرکزی شعبے، واپڈا، ریلوے، انکم ٹیکس، پی آئی اے، کسٹم، کراچی پورٹ ٹرسٹ وغیرہ

ان محکموں میں اب بھی کنٹرول پنجاب سے وابستہ لوگوں کا ہے ۔ ان محکموں میں سندھی آبادی کا تناسب اب بھی دس پندرہ فیصد سے زیادہ نہیں ہے ۔ بالخصوص اہم عہدے تو اب بھی ۸۰ فیصد اہل پنجاب کے ہاتھوں میں ہیں ۔ یہ صورت حال ایسی ہے جسے بے روزگار سندھی نوجوان انتہائی تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے ۔ اس سلسلہ میں اعداد و شمار پر مبنی مضامین اور کتابیں سندھی زبان میں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں

لادینیت اور نیشنلزم کے علمبرداروں کی بنیاد بھی یہی مسائل ہیں ۔ اس لئے عام سندھی نوجوان ان کو اپنے حقوق کا چیمپئن تصوّر کرنے لگتا ہے ۔ اور وہ اخلاص کے ساتھ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ان کے روزگار اور ان کے جملہ مسائل کا حل ان تحریکوں کی کامیابی سے ہی وابستہ ہے ۔ یقیناً اس صورتِ حال میں عام پنجابی کا کوئی قصور نہیں ہے ۔ یہ مرکزی حکومت پر مسلط نوکر شاہی کی اپنے عزیزو اقارب کو نوازنے کی پالیسی کا حصّہ ہے لیکن بہرحال اس کا نتیجہ ردعمل کی صورت میں ظاہر ہوا ہے ۔

اس کے ساتھ ساتھ سندھ میں بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ بھی سنجیدہ اور غیر متعصبانہ فضا قائم کرنے اور اسلام کے لئے سمجھنے سمجھانے کا ماحول برقرار رکھنے کے راستے میں حائل ہے ۔ پنجاب اور سرحد سے کراچی میں آباد ہونے والوں کا سالانہ شرح تین لاکھ ہے ۔ اس کی وجہ سے جہاں سندھی آبادی میں یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ وہ اپنے صوبے میں اقلیت ہوتے جا رہے ہیں وہاں کراچی میں مہاجروں میں بھی یہ احساس شدّت اختیار کر رہا ہے کہ کراچی میں وہ مجموعی طور پر اقلیت ہوتے جا رہے ہیں اور جمہوریت کے اصولوں کے تحت کل سیاست، معیشت اور دوسرے شعبوں میں ان سے اقلیت والا سلوک کیا جائے گا ۔ اس احساس کی وجہ سے مہاجر نیشنلزم کو بھی فروغ حاصل ہو رہا ہے ۔ تاہم مہاجر نیشنلزم سندھی نیشنلزم کی طرح مذہب سے کلّی ارتداد کی صورت اختیار نہ کرے گی ۔ اس لئے کہ اس کی فکری بنیاد زیادہ گہری اور مضبوط نہیں ۔

(۴) بحیثیت مجموعی ہماری ایک بنیادی کمزوری یہ ہے کہ ہم امنگوں کے اعتبار سے مثالیت پسند (   ) واقع ہوئے ہیں اور اپنے ہی بھائیوں کے مادی مسائل اور حقائق کو سمجھنے کے لئے ذہن اور حس سے کام لینے کے روادار کم ہی ہیں ۔ مثلاً سندھ میں زرعی زمینوں کے کلیموں کے مسئلے کو لیجئے ۔ سندھ کی دیہاتی آبادی ایک عرصہ تک مضطرب رہی کہ کلیموں کے سلسلہ میں اس کے نقطہ نگاہ کو سمجھا جائے ۔ لیکن اتنا اہم مسئلہ جس سے ہزاروں سندھی خاندانوں کے روزگار وابستہ تھے

س کی اہمیت کو نہ سمجھا جاسکا۔ اگرچہ اس وقت یہ مسئلہ نہیں ہے تاہم چونکہ یہ ایک بنیادی مسئلہ تھا ور علاقائی قوم پرستی کی تحریک کو اس سے کافی تقویت حاصل ہوئی۔ اس لئے مثال کے طور پہ اس واقعہ کی تفصیلات بیان کر رہا ہوں۔

سندھ میں انگریز کے قبضہ (۱۸۴۳ء) کے وقت اس علاقہ کی ساری زمین مسلمانوں کی ملکیت تھی۔ ہندوؤں کے پاس زرعی زمین ایک ایکڑ بھی نہیں تھی۔ ان پر زمین خریدنے کی قانوناً پابندی عائد تھی۔ انگریز نے انتقال اراضی کے قانون میں تبدیلی کردی۔ تاہم انگریز کے دور حکومت میں زراعت میں بڑے بڑے جاگیردار بھی تھے تو اپنی زمین خود کاشت کرنے والے چھوٹے چھوٹے آبادکار بھی۔ انگریز حکومت کی اپنی رپورٹ کے مطابق ۱۹۲۵ء میں سندھ میں ایک لاکھ ستائیس ہزار چونتیس چھوٹے زمیندار تھے۔ جن کے پاس ایک ایکڑ سے پچیس ایکڑ تک زمین تھی لیکن ۱۹۴۷ء تک آتے آتے یہ صورتحال ہوگئی کہ اس طبقہ کی ۹۰ فی صد سے بھی زائد زمین ہندوؤں بنیا، قرض، سود در سود اور غلط حسابوں کے چکر میں اپنے کھاتے میں تبدیل کر چکا تھا۔

سندھ میں مسلمانوں کی ہندوؤں کی طرف جو زمین ناجائز طور پر منتقل ہو چکی تھی اضلاع کے حساب سے اس کے اعداد و شمار کا گوشوارہ درج ذیل ہے:

ضلع	اراضی ایکڑوں میں
ٹھٹھہ	۲۰۹۴۰
حیدرآباد	۳۷۳۴۲
نوابشاہ	۸۱۸۲۰
تھرپارکر	۱۵۰۰۰۰
دادو	۳۶۳۶۱
لاڑکانہ	۱۱۱۷۱
سکھر	۹۰۹۰
جیکب آباد	۵۱۵۸۲

(مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو روزنامہ توحید کراچی ۳ جولائی ۱۹۵۲ء)

مسلمانوں کے واحد روزنامے الوحید کی دوسری اطلاع کے مطابق ہندوؤں کی

کل متروکہ زمین ۱۹ لاکھ ایکڑ تھی جس میں ۶ لاکھ ایکڑ مہاجروں کو اور پانچ لاکھ ایکڑ زمین ہاریوں کو ملی ۔ باقی پانچ لاکھ ایکڑ یا تو آبادی کے لائق نہیں تھی یا اس سے پیداوار حاصل کرنے کے لئے کافی رقم کی ضرورت تھی ۔ (روزنامہ الوحید ۱۶ مئی ۱۹۵۲ء)

مارچ ۱۹۴۷ء میں سندھ اسمبلی نے انتقال اراضی کا قانون منظور کیا جس کے تحت مسلمانوں کی ہتھیائی گئی ساری زمین انہیں بلا معاوضہ واپس ہونی تھی لیکن اس بل پر گورنر جنرل کو دستخط کرنا تھے اس عرصہ میں پاکستان بن گیا ۔ پاکستان بن جانے کے بعد گورنر جنرل نے پاکستان کے مفاد اور مہاجروں کی آبادی کی وجہ سے اس بل پر دستخط کرنا مناسب نہ سمجھے ۔ بہرحال اس طرح دیہاتی سندھی مسلمان جس کا ذریعہ ہی زراعت تھی وہ انگریز اور ہندوؤں کی سازش سے معاشی طور پر پس کر رہ گیا ۔ اور قیام پاکستان کے بعد انہیں اپنی زرعی اراضی کی واپسی کی جو امید تھی وہ ایک حد تک ہی پوری ہوئی ۔

اسی طرح سندھی زبان اور بیراج کی زرعی زمینوں کے مسائل ہیں ۔ ان جائز مسائل کو سمجھنے سمجھانے اور اٹھانے کے لئے قومی سطح پر پلیٹ فارم ہونا چاہیئے ۔

چونکہ سندھ کے مسئلہ کو پیچیدہ بنانے میں غلط سیاسی اور معاشی پالیسیوں کو بھی عمل دخل حاصل ہے اس لئے صورت حال کی بہتری کے لئے ہمیں سیاسی اور معاشی میدان میں بھرپور اقدامات کرنے ہوں گے ۔ سندھ کی صورت حال کے گہرے تجزیے کے بعد میری یہ دیانت دارانہ رائے ہے کہ سیاسی طور پر ہمیں دو میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا ہوگا ۔ تیسری کوئی راہ نہیں ۔ پہلی صورت یہ ہے کہ وفاق گریز طاقتیں یعنی ممتاز بھٹو کی کنفیڈریشن پارٹی اور جی ایم سید طاقتور ہو جائے ۔ دوم یہ کہ ہم پیپلز پارٹی کو قبول کر لیں اور اس سے دشمنی اور محاذ آرائی کر کے اسے کمزور اور ناکام بنانے کی پالیسی ترک کر دیں ۔ پیپلز پارٹی کے بعد سندھ میں کوئی ایسی پارٹی نہیں ہے جو عوام میں پاکستان اور وفاق کی بات کر سکے ۔ جونیجو صاحب غوث علی شاہ پیر صاحب پگاڑو اور دوسرے وڈیرے سندھ کے نئے خوفناک رجحانات میں بالکل غیر مؤثر ہیں اور وہ زیادہ عرصہ تک صورتحال کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے ۔

اس لئے ضرورت ہے کہ بلا تاخیر ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت انتخابات کرا کر ملک نئی منتخب حکومت کے حوالے کیا جائے ۔ اگر انتخابات کے عمل میں تاخیر کی گئی تو سندھ میں حالات مکمل طور پر کنٹرول سے باہر ہو جائیں گے ۔ پیپلز پارٹی جو سندھ میں وفاق پاکستان کے

علامت ہے۔ اس وقت اس کی بھی صورتحال یہ ہے کہ پڑھی لکھی سندھی آبادی اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ ذوالفقار بھٹو کے نام کی وجہ سے عوام میں اب تک مس بے نظیر کے ساتھ جذباتی وابستگی موجود ہے۔ لیکن وقت کے ضیاع کے ساتھ اس مقبولیت میں تیزی سے کمی آنے کا امکان ہے۔ اس کے بعد علاقائیت کی بنیاد پر تمام چھوٹی بڑی جماعتوں کے متحدہ محاذ کی تشکیل کا عمل شروع ہوگا اور سندھی نیشنلزم کا یہ متحدہ محاذ سندھی آبادی کو سیلاب کی طرح بہالے جائے گا۔

فوجی حکمرانوں کے عزائم یہ نظر آتے ہیں کہ سندھی نیشنلزم کی تحریک کو قوت کے ذریعہ آسانی سے کچلا جاسکے گا لیکن اس طرح سے ملک کو انارکی اور خانہ جنگی سے کسی طور بچایا نہیں جاسکتا۔ عوام کے تعاون اور ان کے احساس شرکت کے بغیر محض قوت سے ملک کی سلامتی دشوار ہی نہیں قریب قریب ناممکن ہے۔

معاشی طور پر ہمیں یہ نکتہ سمجھنا ہوگا کہ مسئلہ محض سرکاری ملازمتوں کا نہیں ہے۔ بلکہ ضرورت ہے کہ ایسی معاشی پالیسیاں اختیار کی جائیں جن سے معیشت کے مختلف شعبوں، صنعت حرفت تجارت اور ملازمت وغیرہ میں سندھیوں کی آبادی کی مناسبت سے شرکت یقینی ہوسکے۔ سندھی مسلمان ہندو اور انگریز کی سازش سے اگر قیام پاکستان سے پہلے معیشت کے تمام شعبا میں پس ماندہ رہا تو اس کی سزا موجودہ نسل کو نہیں ملنی چاہیئے۔ پھر وفاق پاکستان کا استحکام بھی اس بات سے وابستہ ہے کہ پسماندہ علاقوں اور لسانی اکائیوں کو خصوصی پلاننگ کے ذریعے ترقی پذیر علاقوں کی سطح تک لایا جائے۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ سندھی آبادی کی اکثریت کی بستیوں میں صنعتی مراکز قائم کئے جائیں لیکن اس کے لئے پہلے لیبر اور مینجمنٹ کی ٹریننگ کے لئے ٹریننگ مراکز قائم کئے جائیں جہاں مقامی آبادی کو صنعت کاری کی ٹریننگ دی جائے۔ اسی طرح جو انڈسٹریاں سرکاری شعبہ میں لگائی جائیں وہ مستحکم ہونے کے بعد مقامی آبادی کو (جو سرمایہ فراہم کریں) فروخت کردی جائیں۔ ہمارے ہاں پی آئی ڈی سی کا قیام اس مقصد کے لئے ہوا تھا وہ صنعت کاروں کو صنعتوں کے قیام میں ان کی حوصلہ افزائی کریں اور جہاں ممکن ہو، خود انڈسٹریز لگائی جائے جو مستحکم ہونے کے بعد وہ نجی شعبہ کے حوالے کی جائے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ سندھی آبادی مزاجاً انڈسٹری کے لئے مناسبت نہیں رکھتی۔ یقیناً اس سلسلہ میں سندھی وڈیرہ نہایت نااہل ثابت ہوا ہے۔ لیکن متوسط طبقے سے اب ایسے مالدار اف

پیدا ہونے شروع ہو گئے ہیں جنہیں اگر انڈسٹری لگانے کے لئے خصوصی مراعات اور مواقع دیئے دیئے جائیں تو اس معاملہ میں کافی پیش قدمی ہو سکتی ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ سندھی آبادی میں صنعت کار بھی پیدا ہو سکتے ہیں تو بڑھتی ہوئی سندھی آبادی کی معاشی ضروریات بھی پوری ہو سکتی ہیں۔ کمزوریاں مواقع دینے سے ہی دور ہوتی ہیں اور صلاحیتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ مثلاً قیام پاکستان سے پہلے ہندوستان کی کئی سو ملوں اور کارخانوں میں مسلمانوں کی مشکل سے دس بارہ ملیں تھیں۔ انہی مسلمانوں کو ہجرت کے بعد جب پاکستان میں حکومتی سطح پر مواقع فراہم کئے گئے تو صنعت کے سلسلے میں ان کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آگئیں۔

ان سیاسی اور معاشی اقدامات سے سندھ کا مسئلہ ایک حد تک حل ہو جائے گا۔ البتہ نظریاتی اور فکری محاذ پر لادینی قوتوں کی شکست کے لئے بڑے پیمانہ پر کام ہونا ضروری ہے۔ میری رائے ہے کہ اگر سندھ میں آج بھی ایسے چند افراد ہی پیدا ہو جائیں جو صاحب دل اور صاحب نظر ہوں یعنی خدا سے والہانہ عقیدت رکھنے والے بھی ہوں تو جدید دور کی علمی و عملی تحریکوں اور اسلام کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا کامل شعور رکھنے والے بھی تو اب بھی نظریاتی طور پر سندھ میں اسلام کے تحفظ و فروغ کا کام ہو سکتا ہے۔ اور اسلام پر سندھی نوجوانوں کے اعتماد کو بھی بحال کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ تاریخ میں اسلام کے تحفظ کا کام ہمیشہ درویش صفت بوریہ نشین افراد نے ہی کیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز جس سے استحکام پاکستان کے لئے راہ ہموار ہوگی۔ وہ دانشوروں، صحافیوں اور اہل علم کی سطح پر بین الصوبائی رابطہ ہوگا۔ اگر پنجاب سے صحافی، دانشور اور اہل علم حضرات سندھ کے مطالعاتی دورے کے لئے وقت نکال سکیں اور اس پروگرام کو باقاعدہ ایک متحرک شکل دی جائے تو اس کے نہایت مفید اثرات ظاہر ہوں گے۔ جس سے جہاں قومی سطح پہ سندھ کی علاقائی ذہنیت اور مسائل کو سمجھنے میں مدد ملے گی وہاں انتہا پسندانہ رجحانات میں کمی بھی واقع ہوگی۔

آخر میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہونے اور مایوس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ خراب سے خراب حالات میں بھی صحیح راہ کی نشاندہی کرنے اور حالات کو بہتر بنانے کے لئے اخلاص نیت کے ساتھ کوشش جاری رہنی چاہیئے۔ لسانی اکائیوں اور قوموں کی زندگی میں بعض اوقات ایسی لہریں بھی آجاتی ہیں جن میں قوم جذبات کے بہاؤ میں ایک ہی رخ

پر بھی چلی جاتی ہے لیکن اس کی مثال طوفان کے وقتی حملوں اور تند سیلاب کی طرح ہوتی ہے۔ اس کے بعد جلد ہی صورت حال معمول پر آجاتی ہے۔ اگر ہم نے سندھ کے مسائل اور رجحانات کو سمجھنے سمجھانے کا ہی معرکہ طے کر لیا اور یہ آواز شدت کے ساتھ پنجاب سے اٹھنا شروع ہو جائے کہ سندھی بھائیوں کو قومی زندگی کے ہر شعبے میں برابر کی بنیاد پر ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کی جائے۔ اور ان کی سیاسی اور معاشی محرومیوں کا ازالہ کیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سے صورت حال میں کافی تبدیلی واقع ہونا شروع ہوگی

—— (۳) ——

تاریخِ سندھ پر طائرانہ نظر

از سید غلام مصطفیٰ شاہ

گذشتہ سے پیوستہ شمارے میں سندھی دانشور سید غلام مصطفیٰ شاہ کے ایک مضمون کو روزنامہ "ڈان" کراچی سے بزبان انگریزی اخذ کیا گیا تھا اور ارادہ تھا کہ اگلے ماہ اس کا اردو ترجمہ بھی ہدیہ قارئین کر دیا جائے گا۔ لیکن دیگر مضامین کی اہمیت کے باعث یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اس بار بھی اس کے ابتدائی حصے کو ہی شامل کیا جاسکا ہے ..... باقی انشاء اللہ آئندہ .... اقتدار احمد۔ مترجم

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

سندھ کا نام "سندھو" سے ماخوذ ہے جس سے دریائے سندھ موسوم ہے اور تاریخی طور پر اس میں کشمیر سے بحر ہند تک پھیلی ہوئی پوری وادی سندھ شامل تھی۔ موجودہ سندھ کی جغرافیائی حدود مغرب میں بلوچستان، صحرائے کیرتھر اور ہالار کے سلسلہ کوہ سے، شمال میں سبی اور بگٹی سے، شمال مشرق اور مشرق میں بہاولپور اور راجھستان سے اور جنوب میں بحر ہند سے محیط ہیں۔ صوبے کے رقبے کو تین منطقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ منطقہ وسطی جو دریائے سندھ کی گذر گاہ ہے اور اس کی پھیلائی ہوئی زرخیز مٹی سے فیض یافتہ ہے، منطقہ شرقی جو ریتلے اور صحرائی علاقوں پر مشتمل ہے اور منطقہ غربی چھوٹی بڑی پہاڑیوں کے سلسلے کا نام ہے جو اس کی حد کے ساتھ ساتھ بحر ہند تک چلا جاتا ہے۔

ازمنہ قدیم سے ہی سندھ کے روابط ہندوستان کی نسبت مغربی سمت میں واقع ممالک سے زیادہ
ہے۔ فی الحقیقت ہند اور سندھ مختلف علاقوں کے نام تھے۔ سندھ کے مراسم ہندوستان کے مقابلے
ں جزیرہ نمائے عرب ' عراق ' ایران اور افغانستان سے زیادہ گہرے تھے۔ سندھ پر ہندوستان کے
لط کا آغاز سلطنت دہلی کے زمانے میں ہوا لیکن یہ تسلط برائے نام ' مخدوش اور غیر یقینی ہی چلتا رہا۔
ینانی مورخین کے ہاں یہ بات موضوع بحث رہی ہے کہ کیا دریائے سندھ ہی ہندوستان اور سندھو
یش کے مابین خط تقسیم نہیں ہے۔ فارس اور عرب کے سیاح اور جغرافیہ دان ہمیشہ اس خیال میں
اسخ رہے کہ وادی سندھ ہندوستان اور اقلیم مغرب کے درمیان ایک غیر جانبدار پٹی کا کردار ادا کرتی
ہی ہے۔ موہنجوداڑو کا تہذیب و تمدن غیر آریائی اور اس کے ہندوستانی رنگ سے قطعاً مختلف تھا۔
سندھ ایک قدیم نخلستان ہے۔ اس کی تاریخ میں اڑھائی ہزار تا دو ہزار سال قبل مسیح ایک خلاء سا پایا
جاتا ہے اور اس کے بعد ہی ہم تاریخ سندھ کے نسبتاً قابل اعتماد اور معروف حصے میں پہنچتے ہیں۔
فی الحقیقت سندھ کی تاریخ کا آغاز سن پانچ سو بیس تا پانچ سو پندرہ قبل مسیح میں ہوتا ہے جب فارس کے
حکمران دارا اول نے فوج کشی کر کے سندھ کو سلطنت فارس میں شامل کر لیا تھا۔ دو صدی بعد سندھ پر
سکندر اعظم کی یلغار ہوئی جس کے سفر اور عسکری مہمات کا ذکر یونانی مورخین نے محفوظ کیا۔ کہا جاتا
ہے کہ سکندر اعظم نے ہی موجودہ سیہون شریف کو آباد کیا تھا اور وہ اپنے سفر واپسیں میں بلوچستان
کے شہروں خضدار اور خاران سے بھی گذرا......
موہنجوداڑو کے آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ سندھ اس دور میں کچھ عرصہ یونانی منگولیائی اثرات کے
تحت رہا۔ انہی دنوں میں کچھ مدت سندھ کے حکمران ماروی خاندان کے زیر نگین بھی رہے یہاں تک
کہ سن ایک سو پچانوے قبل مسیح میں بلخ کی فتح کے بعد یونانیوں کی حکومت یہاں بحال ہوئی۔
یونانیوں کے بعد یہاں بحیرہ اسود کے شمال مشرق سے آنے والے قبائل چھائے رہے جو ترکی
النسل تھے۔ بعد ازاں لگ بھگ ایک صدی قبل مسیح موہنجوداڑو کے آثار کے مطابق سندھ پر
بدھ مت کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ بحیرہ اسود کے شمال مشرق سے آمدہ قبائل کی نقل و حرکت کا
مرکز بھمبور تھا اور انہوں نے بحر ہند کے ساحل کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کی تھی۔ یہ لوگ اور انہی کی
طرح کشن قبائل ترکی النسل تھے اور اسی باعث سندھ پر ترکی تہذیب کی چھاپ بھی لگی۔ خاندان
کشن کے عظیم بادشاہوں میں سے ایک یعنی شہنشاہ کنشک بدھ مت کا محافظ بن کر اٹھا تھا جس
مذہب نے ایک صدی قبل مسیح سے ایک صدی بعد مسیح تک سندھ میں خوب عروج دیکھا۔ شہنشاہ
کنشک کے وارثین تخت میں سے ایک نے سندھ پر عملاً حکومت کی اور اس کے سکے موہنجوداڑو سے
برآمد ہوئے ہیں۔ یونانی بادشاہوں کے زمانے میں ترک تہذیب کے اثرات کو فروغ حاصل ہوتا رہا
کے شواہد سیستان ' قندھار اور سندھ میں پائے جاتے ہیں۔ اس مرحلے پر برہمنوں نے سندھ

کے حکمران خاندانوں کا قرب حاصل کر لیا اگرچہ عوام بدستور بدھ مت ہی کے پیروکار رہے۔ ہن قبائل کے اقتدار فارس و سندھ کے دور میں ترک تہذیب کی بالادستی رہی اور نتیجۃً بدھ مت کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ شاہ نوشیرواں کے دور حکومت میں سندھ کو باقاعدہ طور پر سلطنت فارس کا حصہ بنا لیا گیا یہ تیسری صدی عیسوی میں ساسانی سلطنت کے عروج کا شاخسانہ تھا۔ (باقی آئندہ)

——(۴)——

ایک وضاحت!

رحیم یار خاں سے ڈاکٹر عبدالخالق کا مراسلہ

برادرِ گرامی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اپریل ۸۷ء کے میثاق میں صفحہ ۵ پر ایک مضمون میرے نام سے شائع ہوا ہے عنوان ہے "سندھ کی صورتِ حال"۔ رات صادق آباد میں ایک محترم دوست نے اس پر تبصرہ کیا تو میں نے ان سے کہا "میں نے سندھ کے حالات پر کوئی مضمون میثاق کو نہیں بھیجا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب فروری میں سندھ کے دورے پر جا رہے تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ سندھ کے مسئلے پر آپ کے مضامین بہت طویل ہیں۔ آپ ان پر سندھ کے باسیوں کا ردِ عمل معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ان کا خلاصہ بنائیے جو چار صفحات سے زائد نہ ہو۔ دورے سے پہلے یہ خلاصہ اہلِ علم کو تقسیم کرا دیجئے تبادلۂ خیال زیادہ مفید رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کام میرے ذمہ لگا دیا اور مہلت بھی ایک رات کی ملی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے مضامین کو سامنے رکھا اور اپنی دانست میں ان کی تلخیص تیار کر کے دوسرے دن صبح کو ائیر سروس سے ڈاکٹر صاحب کو بھجوا دی۔ اتفاق سے یہ تحریر ڈاکٹر صاحب کو وقت پر نہ مل سکی اور مجوزہ منصوبہ بھی ناکام رہا۔

آج صبح میں نے میثاق دیکھا تو چار صفحے کا وہ خلاصہ میرے نام سے موجود تھا۔ ریکارڈ کی درستی کے لئے یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس مضمون کے خیالات تو صد فی صد اور الفاظ و تراکیب بھی بیشتر آپ کے سلسلۂ مضامین سے ماخوذ ہیں۔ میں نے ایک طالب علم کی طرح ان کی تلخیص کی ہے۔

آپ کا مخلص

عبدالخالق

(۵)

پنجاب کی فریاد

محمد حنیف سلیمی (کراچی)

میثاق جنوری ۱۹۸۷ء کے شمارہ میں محترم حسن احمد صدیقی کراچی کا مراسلہ پڑھا۔ میرے محترم بھائی کو شاید کسی نے ورغلایا ہے اور غلط حقائق مہیا کر دیئے۔ اصل حقیقت کچھ یوں ہے کہ آخری مردم شماری کے مطابق پنجاب کی آبادی پاکستان کی کل آبادی کا ۶ - ۹۵ فی صد ہے۔ اس حساب سے مرکزی حکومت میں پنجاب کا کوٹہ ۵۹ فیصد ہونا چاہیئے تھا۔ مگر اسلام آباد کی آبادی کو بھی ملا کر پچاس فی صد کوٹہ مختص کیا گیا ہے یہ سراسر پنجاب کے نوجوانوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ آئیے ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب کے لوگ مختلف محکموں میں کتنے فی صد کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اگر میں غلط بیانی سے کام کر لوں تو آخرت میں ہاتھ آپ کا اور گریبان میرا ہوگا۔

بھائی صدیقی صاحب نے فرمایا ہے کہ پی آئی اے اب پنجاب ائرلائن کہلوانے لگی ہے ہیں پی آئی اے کے سٹیٹکس اور پرسانل ریکارڈ سیکشن کے ریکارڈ کے مطابق۔ پنجاب کے پچاس فی صد کوٹے کے حساب سے ۸۸۱۳ ملازم ہونا چاہیئے تھے۔ مگر ۶۹۵۸ کام کر رہے ہیں۔ یعنی ۵۰ فی صد کے بجائے صرف ۳۹٫۵ فی صد کام کر رہے ہیں۔ ۰۶۵ فی صد کم۔

کوٹہ کے مطابق سندھ شہری کے ۱۳۴۰ ملازم ہونا چاہیئے تھے مگر ۲۲۴۵ افراد کام کر رہے ہیں۔ یعنی اپنے حصے سے ۴۰٫۴۲۶ فی صد زیادہ ہیں۔ یعنی پی آئی اے کی پوری نفری ۶٫۷ فی صد کے بجائے ۸٫۳۰ فی صد ہیں۔ سندھ دیہی کے ۲۰۰۹ کی بجائے ۱۳۹۱ افراد کام کر رہے ہیں۔ یعنی صوبہ سندھ کے دیہی اور شہری کوٹے کو ملا کر ۳۳۴۹ افراد کے بجائے ۶۳۳۵ افراد کام کر رہے ہیں۔ اس طرح سے اپنے کوٹہ سے ۲٫۸۹ فی صد زیادہ ہیں۔ یکم دسمبر ۱۹۸۶ء تک کے اعداد و شمار

کے مطابق صوبہ سرحد کے ۷۷ء۲ ۱ فراد کے کوٹے کے مقابلے میں ۰۷ء۱۱ افراد کام کر رہے ہیں یعنی ۲۰ء۳ کم۔ اسی طرح بلوچستان کے ۶۱ء۷ افراد کے کوٹے کے مقابلے میں ۴ء۵۴ افراد کام کر رہے ہیں یعنی ۴۳ء۲ کم' اور پسماندہ علاقوں کے ۵ء۷۰ افراد کے کوٹے کے مقابلے میں صرف ۲۷ء۲۱ افراد کام کر رہے ہیں یعنی ۸ء۷۵ افراد کم۔ اور ان سب کی کمی کو سندھ (شہری) کے ۴۰ء۳۱۳ افراد کے کوٹے کے مقابلے میں ۵۲۲ء۴ یعنی کوٹے سے ۲۰۸ء۴ افراد زائد بھرتی کر کے پورا کیا گیا ہے۔

ایک وضاحت کر دوں کہ پنجاب کے افراد میں کم و بیش ۲۵/- فی صد بوگس ڈومیسائل والے بھی ہیں۔ کیونکہ پنجاب سے ڈومیسائل حاصل کرنا بہت آسان ہے جبکہ دوسرے صوبوں میں ایسا نہیں ہے۔

ع ہم الزام اُن کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا۔ بھائی صدیقی صاحب ناراض نہ ہوں بقول ڈاکٹر اقبالؒ۔

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

۱۹۷۴ء سے ۳۰ جون ۱۹۸۶ء تک پی آئی اے میں پنجاب سے ۱۱۴۳ کے بجائے ۴۰۶ افراد بھرتی ہوئے۔ یعنی ۶۲ء۱ فی صد کم۔

سندھ شہری سے ۶۲ کے بجائے ۱۷۳ء۱ افراد بھرتی ہوئے یعنی ۱۷۹ فی صد زیادہ۔

اس خط لکھنے کا مطلب صرف اپنے بھائیوں کی غلط فہمی دور کرنا ہے۔ پنجاب کے خلاف صحافت کی یکطرفہ ٹریفک چل رہی ہے۔ اور پنجاب کو بلیک میل کیا جا رہا ہے۔ کراچی کے پریس والے ہمارے خطوط نہیں چھاپتے۔ آپ سے گذارش ہے کہ میرا خط میثاق کے کسی شمارہ میں ضرور شائع کر دیں۔

پاکستان اسٹیل ملز میں اس وقت ۲۲۴۱۶ افراد کام کر رہے ہیں۔ جس میں پنجاب سے تعلق رکھنے والے صرف ۵۲۱۹ افراد ہیں اسی طرح اسٹیٹ بنک، نیشنل بنک، یک اک، نیشنل شپنگ کارپوریشن، کراچی شپ یارڈ، میرین اکیڈمی، غرضیکہ پاکستان میں کسی بھی مرکزی حکومت کے ماتحت ادارے میں پنجابی ۲۵ فی صد سے زیادہ نہیں ہیں۔ پنجاب کو کھایا بھی جا رہا ہے اور بدنام

بھی کیا جا رہا ہے - بقول آپ کے پنجاب والے شکایت بھی کریں تو کس سے کریں - شاید یہ نفسیاتی طور پر ڈرے ہوئے ہیں کیونکہ ان پر قدیم زمانے سے بہت سی طاقتیں حملہ کرتی چلی آ رہی ہیں - اور سب کچھ لوٹ کر لے جاتی رہی ہیں -

مسئلہ کا حل ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب آبادی بڑھنے لگے تو نیا شہر یا بستی آباد کر لیا کرو - کراچی کی آبادی میں اضافے کو روکنے کے لئے دوسرے شہروں میں صنعتیں لگائی جائیں - مثلاً ڈیرہ اسماعیل خان، ڈیرہ غازی خان، جہلم، میانوالی، سکھر، حبیب آباد، دادو وغیرہ اگرچہ اس کام کے لئے زیادہ عرصہ درکار ہوگا لیکن دیرپا حل یہی ہے۔ فوری حل کیلئے گزارش ہے کہ مرکزی حکومت کے تحت جتنے ادارے ہیں اُن کے صدر دفاتر ۱۹۷۳ء کے آئین کے مطابق دارالحکومت میں منتقل کر دینے چاہئیں مثلاً تمام بنک، پی آئی اے، ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن، یک ، نیشنل ڈیولپمنٹ فنانس کارپوریشن وغیرہ - اس سے کافی حد تک کراچی میں آبادی کا دباؤ کم ہو جائے گا -

محمد حنیف سلیمی کراچی

"گھٹتے جاتے ہیں مرے دل کے بڑھانے والے"

ایک بالغ نظر اور نکتہ شناس عالم دین

حضرت مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل

—— مولانا سعید الرحمٰن علوی

پاکستان کی شاہراہ اعظم (جی۔ ٹی روڈ) پر "نوشہرہ" ایک انتہائی اہم شہر ہے جو جغرافیائی اعتبار سے صوبہ سرحد کے ہیڈ کوارٹر ضلع پشاور کی تحصیل ہے' اسی تحصیل کا ایک گاؤں "زیارت کا کاصاحب" ہے۔ جو صوبہ سرحد کے ایک گرامی قدر شیخ طریقت "حضرت رحمکار کاکا" کی آخری آرام گاہ ہے انہی کی اولاد کاکاخیل کہلاتی ہے جس کا مرکزی علاقہ یہی جگہ ہے گو کہ وہ پھیلی ہوئی مختلف شہروں اور دیہات و قصبات میں ہے۔ اس عظیم المرتبت شیخ طریقت کے خاندان میں ایک وہ بزرگ عالم تھے جو ۲۳ ر اپریل ۱۹۸۷ء کو حسن ابدال کے قریب اپنی کار کے حادثہ میں شہید ہو گئے اور ان کے اکلوتے فرزند سید معین الدین' جو کالج کے استاذ تھے اور گاڑی چلا رہے تھے' وہ بھی موقعہ پر ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

معین میاں' میرے بہت ہی محترم بزرگ سید عبدالقدوس قاسمی کے داماد تھے' وہی مولانا عبدالقدوس جنھوں نے دیوبند سے لے کر اورنٹیل کالج لاہور اور اسلامیہ کالج پشاور میں علم کے موتی لٹائے اور آخر میں پاکستان کی شرعی عدالت کے جج بن کر گراں قدر خدمات انجام دے کر ریٹائرڈ ہوئے۔ مولانا قاسمی اور ان کا پورا خاندان علم و فضل میں اپنی روایتی حیثیت کا مالک ہے' دارالعلوم دیوبند اور اس کے گرامی مرتبت استاذ' جانشین شیخ الہند مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ سے کسب فیض کیا۔ مولانا قاسمی کے البتہ ایک بھائی محترم قاضی حسین احمد صاحب ایسے ہیں جو دیوبندی علمی و تحریکی روایات سے الگ تھلگ مولانا سید ابوالاعلیٰ کی جماعت اسلامی سے وابستہ ہیں اور آج کل اس کے جنرل سیکرٹری (قیم) ہیں۔

مفتی سیاح الدین صاحب حرمین شریفین کے سفر کے لئے گھر سے آ رہے تھے اور اسلام آباد ایئر

پورٹ سے چند گھنٹہ بعد انہوں نے جدہ کے لئے فلائی کرنا تھا جہاں انہیں ایک کانفرنس میں شرکت کرنا تھی اور پھر حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہونا تھا لیکن اللہ رب العزت نے انہیں شہادت کی موت سے سرفراز فرما کر اپنے جوار میں بلالیا اور انہیں اپنی رحمت خاص کا مستحق بنالیا۔ مفتی صاحب تحریک آزادی کے مسلمہ رہنما حضرت الامام شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ تعالیٰ (دیوبندی) کے خادم خاص حضرت مولانا عزیر گل سے عزیزداری کا بھی تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کے برادر عزیز مولانا نافع گل رحمہ اللہ تعالیٰ، جو دیوبند کے نامی گرامی اساتذہ میں سے تھے کی سرپرستی و معیت میں دیوبند کے مدرسہ میں گئے، یہ جنوری ۱۹۳۴ء کی بات ہے کتابوں کی تکمیل کر کے ۱۹۳۷ء میں امتیازی حیثیت سے دورہ حدیث کا امتحان دیا اور کلاس میں اعلیٰ مرتبہ حاصل کر کے اپنے استاذ سے سند حدیث اور انعام حاصل کیا۔ ان کی باقی تعلیم اپنے حقیقی نانا سید مظہر حسین صاحب، مولانا قیاس گل صاحب اور مولانا قاضی عبدالسلام صاحب (خلیفہ ارشد حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی) کے یہاں ہوئی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے اٹک اور پشاور و مردان کے بعض مقامات پر تعلیمی خدمات سرانجام دیں، اسی اثناء میں ان کی ملاقات سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے ہوئی ان کے مشورے نے انہیں اٹک کے اُس پار کی پہاڑیوں سے نکل کر اِس پار کے کھلے میدانی علاقے میں آکر خدمت کا میدان فراہم کیا۔ سب سے پہلے شمالی پنجاب کے قدیم تاریخی قصبہ بھیرہ کا رخ کیا، بھیرہ میں بگوی خاندان کے ہونہار فرزند مولانا ظہور احمد نقشبندی نے انہیں اپنے مدرسہ کے لئے دعوت دی یہ مدرسہ جو دارالعلوم عزیزیہ کے نام سے اب تک جاری ہے، اسی خاندان کے بزرگ مولانا عبدالعزیز بگوی کے نام سے منسوب تھا، یہ حضرات حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی رحمہما اللہ تعالیٰ کے براہ راست شاگرد اور فیض یافتہ تھے، اس خاندان کا علمی مقام بہت بلند تھا۔ ۱۹۴۲ء میں مفتی صاحب ان کی دعوت پر بھیرہ پہنچے اور ۱۹۴۰ء تک وہاں رہے۔ درمیان میں چھ ماہ کا عرصہ ۱۹۴۳ء میں مفتی صاحب نے مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ کی دعوت پر دیوبند میں گذارا۔ بھیرہ کے قیام کے زمانہ میں درس و تدریس اور افتاء کا فرض موصوف نے انجام دیا اور ساتھ ہی وہاں کے علمی تبلیغی مجلہ شمس الاسلام کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے، بلکہ شمس الاسلام کی ادارت کا سلسلہ تو بھیرہ سے واپس آنے کے بعد بھی ایک عرصہ جاری رہا۔

بھیرہ سے واپسی پر آپ مدرسہ اشاعت العلوم لائل پور (حال فیصل آباد) کی انتظامیہ کی دعوت پر فیصل آباد آگئے یہ اکتوبر ۱۹۴۶ء کا قصہ ہے اور پھر دم واپسیں تک اس مدرسہ سے آپ کا تعلق قائم رہا۔ ۱۹۸۳ء تک تو باقاعدہ اور اس کے بعد اسلام آباد منتقل ہو جانے کے سبب سرپرستی کا۔ مفتی

صاحب مرحوم بنیادی طور پر علم کی خاموش وادی کے فرد تھے' ان کے اصل جوہر اسی میدان میں کھلتے' تاہم اجتماعی حالات کی بہتری کے لئے انہوں نے اپنے لئے " جماعت اسلامی " کی تنظیم اختیار کی ایسا کیوں کیا؟ اس کا تو مجھے علم نہیں اور نہ میں نے کبھی ان سے اس موضوع پر بات کی تھی' تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ ان کا جماعت سے باقاعدہ تعلق رہا۔ اسی تعلق کے حوالہ سے انہوں نے ۱۹۷۰ء کا ہنگامہ خیز انتخاب فیصل آباد کی سیٹ سے لڑا جس میں ان کے علاوہ مولوی محمد ضیاء القاسمی (جمعیت علماء اسلام) مسٹر رفیق سہگل (جمعیت علماء پاکستان) بھی تھے لیکن کامیابی کا سہرا مسٹر مختار رانا کے سر بندھا جو چیئرمین بھٹو کے جانثار رفیق تھے اور سب سے پہلے وہی بھٹو صاحب کے ستم کا نشانہ بنے کیوں کہ اپنی انقلابی سوچ اور طریق کار کے پیش نظر وہ جاگیردار بھٹو کا ساتھ نہ دے سکے۔ جماعت اسلامی ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے سلسلہ میں بہت ہی پر امید تھی اور اس کو یقین تھا کہ اگر اس کی حکومت نہ بنی تو موثر ترین اپوزیشن وہ ضرور ہوگی۔ مگر انتخابات کے نتائج مایوس کن حد تک حوصلہ شکن نکلے — اور اس کے اکثر امیدوار بہت ہی کم ووٹ لے سکے جن میں مفتی صاحب مرحوم بھی شامل تھے' لیکن اس شکست کا ان پر ایسا کوئی اثر نہ تھا کیونکہ جس دنیا کے وہ فرد تھے' وہ سلامت تھی اور وہ اس میں پوری طرح منہمک تھے بلکہ انہوں نے ۱۹۸۳ء میں جماعت اسلامی سے وابستہ مدارس کی اجتماعی تنظیم " رابطہ المدارس " قائم کی اور اپنے حلقہ کے مدارس کی تعلیم' نصاب تعلیم اور امتحان وغیرہ کو یونیورسٹی اصولوں پر منظم کرنے کی سعی کی۔ اس تنظیم کے وہ بانی صدر تھے اور اپنی موت تک اس کے صدر رہے۔ بلکہ اپنے آخری دنوں میں اس حوالہ سے بہت سی تقریبات میں شرکت کی۔

مسٹر ضیاء الحق جیسے جونیئر فوجی افسر کو مسٹر بھٹو نے عنایت خسروانہ سے فوج کا سربراہ بنایا لیکن انہوں نے بھٹو صاحب کو چلتا کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور اسلام کی خدمت کو اپنا نعرہ قرار دیا ۱۰ برس کی ان کی " اسلامی خدمات " کا جو حال ہے وہ سب کے سامنے ہے؟ ہم نے محسوس کیا کہ جس طرح بھٹو صاحب نے " سوشلزم " کا پٹرا کیا اس طرح اس شریف انسان نے اسلام کے سلسلہ میں حشر کر دیا اور اب ڈر ہے کہ اس کے نتیجہ میں کوئی نئی قیامت نہ سر آ پڑے .. بہر حال مسٹر ضیاء الحق نے بر سر اقتدار آتے ہی اپنے نعرہ اسلام کو پروان چڑھانے کی غرض سے اسلامی نظریاتی کونسل' جس کی داغ بیل صدر ایوب خان مرحوم نے ڈالی تھی' کی از سر نو تشکیل کی۔ اس زمانہ میں قومی اتحاد کی لیڈر شپ سے مسٹر ضیاء کے گہرے تعلقات تھے۔ صدر اتحاد مولانا مفتی محمود رحمہ اللہ تعالیٰ کے تعاون سے انہوں نے کئی اہم حضرات کو اس کونسل میں شامل کیا جن میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری اور مولانا محمد تقی عثمانی شامل ہیں' مفتی سیاح الدین صاحب بھی اس سلسلے میں سامنے آئے مفتی محمود صاحب نے ان کے علمی رسوخ کے پیش نظر ان کے نام کی تائید کی اور جماعت اسلامی' ضیاء تعلقات

بھی کام آئے۔ بہر حال مفتی صاحب کا یہ کریڈٹ ہے کہ انہوں نے خوب جی لگا کر کام کیا۔ ان کی علمی صلاحیتیں اس دور میں بھرپور طریق سے سامنے آئیں' وہ آخری وقت تک اس کونسل کے ممبر رہے اور ایک دنیا اس کی گواہ ہے کہ اس کونسل میں سب سے بڑھ کر ٹھوس کام مولانا سیاح الدین اور مولانا تقی عثمانی کا تھا۔ تقی صاحب کی بے پناہ صلاحیتوں کا مرحوم کی زبان سے اعتراف خود میں نے سنا اور بعد میں جب تقی صاحب منصب عدالت پر فائز ہو گئے تو اب گویا مفتی صاحب تنہا اس قافلہ میں ایسے شخص رہ گئے جو محنت و ہمت سے کام کرتے' نکتہ رس عالم کی حیثیت سے بھرپور انداز سے حصہ لیتے اور خاص طور پر مختلف معاملات کو ٹھوس تحریری شکل دینے میں اپنا اعلیٰ کردار ادا کرتے۔

ہر چند کہ مفتی صاحب جماعت اسلامی سے وابستہ تھے لیکن اپنے مرکز علمی دیو بند سے ان کی وابستگی لازوال تھی۔ اور اپنے اصل حلقہ سے اپنے تعلقات کو انہوں نے ہمیشہ نبھانے کی تدبیر کی جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی کے علمی افکار پر دیو بند کے اکابر کی تنقید مسلمات میں سے ہے بالخصوص شیخ الاسلام مولانا مدنی کے جو احساسات اس سلسلے میں تھے وہ ایک حقیقت ہے اور اسی وجہ سے جماعتی حلقوں کے احساسات بھی علمائے دیوبند کے بارے میں بڑے شدید ہیں لیکن مفتی صاحب مرحوم نے اپنی سلامتی طبع کے باوصف عمر بھر دونوں انتہاؤں میں توازن اور اعتدال پیدا کرنے کی سعی کی۔

میں نے ۱۹۶۰ء میں انہیں پہلی مرتبہ دیکھا جب اپنے برادر بزرگ مولانا عزیز الرحمٰن خورشید سمیت مدرسہ عربی خیر المدارس ملتان میں زیر تعلیم تھا اس سال دیو بندی حلقہ کے مدارس کی وہ تنظیم قائم ہوئی جسے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آج مدارس اسلامیہ کی سند اور فضلاء مدارس اسلامیہ کو جو تھوڑی بہت مراعات حاصل ہیں اس کا کریڈٹ اسی تنظیم کی طویل جدوجہد کو جاتا ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی بعد میں تنظیم المدارس (بریلوی) وفاق المدارس السلفیہ وغیرہ کی تنظیمیں معرض وجود میں آئیں۔ مفتی صاحب اس اجلاس میں مدرسہ اشاعت العلوم فیصل آباد کے مہتمم مولانا حافظ حکیم عبدالمجید (نابینا) سمیت شریک ہوئے۔ وہیں ہم ان سے ملے چونکہ وہ بھیرہ رہ چکے تھے جو ہمارا آبائی وطن ہے اور جس مدرسہ میں مفتی صاحب نے چند برس کام کیا اس میں ۳۱ برس ہمارے دادا مرحوم حضرت الحاج الحافظ غلام یاسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے کام کیا تھا اس لئے دونوں میں برادرانہ اور محبانہ مراسم تھے انہی کے سبب وہ بڑی محبت سے پیش آئے اور ہم اس وقت سے آخر تک برابر یہ سلسلہ قائم رہا۔ یہ درست ہے کہ جماعت اسلامی کی فکر سے ہمیں ہمیشہ اختلاف رہا اور اب بھی ہے' ہم اس معاملہ میں مولانا سید حسین احمد مدنی' مولانا احمد علی لاہوری

اور مولانا غلام غوث ہزاروی جیسے بزرگوں کے نظریات کو درست اور صحیح سمجھتے ہیں لیکن مجلس اور سماجی حوالہ سے تعلقات کی دنیا بالکل مختلف ہے اور اس حوالہ سے ہم نے انہیں ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا اور انہوں نے بزرگانہ شفقت سے کام لیا۔

تواضع 'انکساری' دھیمی گفتگو اور محبت بھرا رویہ ان کی خوبیاں تھیں 'علم ان پر ناز کرتا اور وہ ادق سے ادق مسائل میں بڑی سنجیدگی سے سائل کو مطمئن کرتے 'افسوس کہ وہ اس طرح دنیا سے اٹھ گئے کہ ان کا جواں سال اکلوتا فرزند بھی ان کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی موت " طاب حیاًو طاب میتاً " کی مصداق ہے 'خوب زندگی گذاری 'شہادت کی موت سے سرفراز ہوئے اور وہ بھی ایسے وقت میں جب وہ ایک مقدس سفر پر روانہ ہو رہے تھے 'حادثہ میں موقعہ پر ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہ علامات ایسی ہیں کہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اپنے خصوصی کرم کا معاملہ فرمائے گا دنیا میں آنے والے ہر کسی کو جانا ہے لیکن علم کی وادی میں خاموش زندگی گذار کر اس طرح دنیا سے رخصت ہونا یقیناً بڑی سعادت ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بڑی اچھی توقعات وابستہ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور ان کے فرزند سعید کو اپنی رحمتوں سے نوازے غم زدہ خاندان اور معصوم بچوں کا خود مربی و نگہبان اور ضامن و کفیل ہو۔ سچ ہے

سچ ہے آخر کوئی کتنا ہی ہو صاحب کمال
حیّ و قیوم ہے اک فقط ذات رب ذوالجلال

☆

شیخ القرآن حضرت مولانا محمد طاہر پنج پیری

وارث خاں پشاور

شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خاں مرحوم کے بعد شیخ القرآن مولانا محمد طاہر پنج پیری کی رحلت سے حضرت مولانا حسینؒ علی کے دلبستان توحید کا اک چراغ اور گل ہو گیا۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ط

ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ لیکن بعض حضرات کی موت کافی عرصے

تک یاد رہتی ہے۔ انہی لوگوں میں سے ایک داعی توحید و سُنت شیخ القرآن حضرت مولانا محمد طاہر پنج پیری بھی تھے مرحوم ۱۹۱۳ء میں ضلع مردان کے گاؤں پنج پیر میں ایک معزز اور باا ثر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت مولانا حسین علیؒ (واں بچھراں والے) اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے شاگرد رشید تھے۔ آپ ۱۹۳۴ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں آپ نے مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ سے قرآن پاک کی تفسیر کا فیض پایا۔ وطن واپسی پر چند دینی مدارس میں درس و تدریس کے بعد اپنے گاؤں میں مدرسہ قائم کیا۔ مولانا مرحوم نے اُس وقت توحید و سنت کا علم بلند کیا جب سرحد میں شرک و بدعت اپنے پورے عروج پر تھی اس دوران آپ پر کئی بار قاتلانہ حملے بھی ہوئے۔ آپ کو پتھروں سے زخمی کر کے سُنت طائف زندہ کی گئی۔ کیونکہ علمائے حق انبیائے کرام کے وارث ہوتے ہیں۔ اس لئے تکالیف اور مصیبتوں میں بھی انبیاء کی وراثت ملتی ہے۔ بقول مولانا محمد طیب کے (صاحبزادہ حضرت شیخ القرآن) غسل کے وقت مولانا کے جسم پر وہ پتھروں کے داغ اور زخموں کے نشان اب بھی موجود تھے۔ ان مصیبتوں اور تکالیف کے باوجود مولانا مرحوم نے توحید و سُنت کی اشاعت کا پرچم بلند کئے رکھا۔ اپنے اور پرائے بہت سے لوگ مولانا کے مخالف ہوئے۔ لیکن مولانا نے حق بات کہنے میں کسی کی پرواہ نہ کی۔ مولانا مرحوم بہت بڑے مناظر بھی تھے اور عربی کے بہت اچھے انشاء پرداز بھی تھے۔ مولانا مرحوم کی اکثر تصانیف عربی زبان میں ہیں۔ مولانا مرحوم کو زیادہ تر فکر علمائے کرام کی اصلاح کی ہوتی تھی۔ آپ فرمایا کرتے۔ اگر علماء صحیح ہو جائیں۔ تو عوام الناس بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔

آپ کا اصل ہدف توحید و سُنت کی دعوت و تبلیغ اور شرک و بدعت کا ابطال تھا۔ اس مقصد کے لئے مولانا نے ایک جماعت "جمعیت اشاعت التوحید والسنت" قائم کی۔ جس کے آپ امیر بھی تھے۔ ہر سال شعبان اور رمضان میں آپ کے دورۂ تفسیر میں اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک سے ہزاروں حضرات شرکت کرتے تھے سامعین مولانا کے انفرادی انداز کے شیدائی تھے۔ آپ کے حلقۂ درس میں پانچ

پانچ سو عورتیں بھی شریک ہوتیں - آپ نے لاکھوں شاگرد تیار کیے - جو اندرونِ
ملک اور بیرونِ ملک توحید و سُنت کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں - آپ نے
تقریباً پچاس سال تک توحید و سنت کی خدمت کی مولانا مرحوم کی جب ڈاکٹر صاحب
سے ملاقات ہوئی - تو مولانا نے ڈاکٹر صاحب کو پنج پیر آنے کی دعوت دی - ڈاکٹر
صاحب دسمبر ۱۹۸۳ء میں پنج پیر تشریف لے گئے اور وہاں مولانا مرحوم کے پاس
ٹھہرے - اور درسِ قرآن دیا - جس کو مولانا مرحوم نے بہت ہی پسند کیا - مولانا
نے ڈاکٹر صاحب کو اپنا ذاتی کتب خانہ دکھایا اور اپنی چند کتابیں بھی تحفتہً
عنایت فرمائی - ڈاکٹر صاحب نے مولانا مرحوم کو قرآن اکیڈمی لاہور آنے اور
قرآن پاک کو اپنے انداز میں بیان کرنے کی دعوت دی - جس پر مولانا اپنے چند
ساتھیوں کے ساتھ اپریل ۱۹۸۴ء میں قرآن اکیڈمی تشریف لائے - اور ۲۷
اپریل کو جامع القرآن (مسجد قرآن اکیڈمی) میں خطبۂ جمعہ دیا - اور صلوٰۃ جمعہ
پڑھائی - اور مختصر دورۂ ترجمۂ قرآن اور قرآنی سورتوں کا باہمی ربط و تعلق نہایت
جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا - مولانا مرحوم کا گاؤں جہانگیرہ سے ۲۸ کلومیٹر
دور صوابی ضلع مردان کے قریب ہے - مولانا کچھ عرصہ سے علیل تھے - وہ ان دنوں
اپنے صاحبزادے میجر محمد حامد کے پاس راولپنڈی میں سی - ایم - ایچ ہسپتال میں
زیرِ علاج تھے - کہ ۲۹ مارچ ۱۹۸۷ء کو رات ۱۰ بجے کے قریب دِل کا دورۂ جان
لیوا ثابت ہوا - اور وہ اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے - اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ
مولانا مرحوم کے دوسرے صاحبزادے مولانا محمد طیب اُن کے جانشین ہیں مولانا طیب
صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے والد مرحوم کی طرح علم و عمل کی دولت سے نوازا ہے
اللہ تعالیٰ مولانا محمد طیب اور مولانا مرحوم کے شاگردوں کو مولانا کے مشن کو چلانے
اور غلبۂ دین کی جدوجہد کے لئے میدانِ عمل میں آنے کی توفیق عطا فرمائے - راقم کو
اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کے جنازے میں شرکت اور میت کو اٹھانے کی سعادت
نصیب فرمائی - مولانا کے جنازے میں آنے والے حضرات بسوں، ٹرکوں - کاروں،
ویگنوں - پک اپ گاڑیوں میں اور پیدل آ رہے تھے - جنازے میں لوگوں کی تعداد
ساٹھ پینسٹھ ہزار کے قریب تھی - جن میں پنجاب اور سرحد کے ہزاروں علمائے کرام

بھی شامل تھے - جنکی آنکھیں قانونِ فطرت کے مطابق آنسوؤں سے تر تھی - نمازِ جنازہ مولانا کے صاحبزادے مولانا محمد طیب صاحب نے پڑھائی - مولانا کی میت کو گھر سے جنازہ گاہ تک اور پھر آخری آرامگاہ تک کھلے منہ لایا گیا - جس راستے سے مولانا کی میت کو گزارا گیا - دونوں طرف ہزاروں لوگ مولانا کے آخری دیدار کے لئے کھڑے تھے - مولانا کو سپردِ خاک کرتے ہوئے - یہ شعر ذہن میں گھوم رہا تھا - ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

مولانا مرحوم کی وفات کا یہ خلا پورا ہونا ناممکن ہے - مولانا کی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی -

اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے - اور اُن کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے - آمین -

آخر میں مولانا کے متعلقین سے درخواست ہے کہ مولانا کی تصانیف کے ترجمے کا اہتمام کریں - تاکہ علماء حضرات کے ساتھ ساتھ عوام الناس بھی اُن سے استفادہ کر سکیں - اور مولانا کے لئے مزید صدقۂ جاریہ بنیں -

منصور احمد بٹلا

کی وفات پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا تعزیتی خطاب

بموقع شام الہدیٰ کراچی، منعقدہ ۱۷ مارچ ۸۷ء

مرتب: شیخ جمیل الرحمٰن

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

حضرات و خواتین !

مجھے آج ایک معذرت سے اپنی گفتگو کا آغاز کرنا ہے - جن حضرات کو بھی درس و تدریس یا

لاب وتقریر کا کچھ بھی تجربہ ہے 'وہ یہ بات جانتے ہیں کہ کسی بھی درس یا خطاب سے قبل مدرّس یا
رر یا خطیب کو کچھ نہ کچھ وقت اپنے ذہن کو مرتّب کرنے کے لئے درکار ہوتا ہے۔ لیکن آج عصر
نماز کے بعد مجھے منصور احمد بٹلا مرحوم کے اچانک انتقال کی جو خبر ملی 'اس نے شدید طور پر میرے
صاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ جس کی بناء پر اس وقت تک میری کیفیت یہ رہی ہے کہ میں اپنے
ن کو آج کے درس کے لئے نہ صرف یہ کہ مرتّب نہیں کر پایا بلکہ اس سے پہلے ذہن میں کچھ تانابانا
بھی تو وہ بھی بکھر کر رہ گیا ہے۔ خاص طور پر یہ کیفیت اس لئے بھی ہوئی جب یہ بات سامنے آئی کہ
،"شام " کی پوری نشست میں بٹلا صاحب موجود رہے تھے۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ ہماری یہ
رگی کتنی بے ثبات ہے جس پر ہم تکیہ کئے بیٹھے ہیں۔ کسی کے اچانک انتقال کی خبر پر کچھ دیر کے لئے
صاب پر صدمہ اور ارتعاش محسوس ہوتا ہے۔ لیکن یہ بڑی عارضی سی کیفیت ہوتی ہے اور بہت کم
لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس حقیقت کا ادراک کرتے ہوں کہ ہمیں بھی ایک روز موت کا مزا چکھنا
ہے 'ہمیں بھی ایک دن موت سے ملاقات کرنی ہے اور یہ ملاقات دفعۃً اور اچانک بھی ہو سکتی
ہے۔ اس عدم ادراک اور بے شعوری کا سبب یہ ہے کہ جیسے جیسے مادہ پرستی کا غلبہ بڑھتا جارہا ہے'
یسے ویسے صدمہ کے اثرات واحساسات کے وقفہ میں کمی آتی چلی جارہی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے
ی کے انتقال اور وہ بھی اچانک انتقال پر چند دن ضرور اعصاب پر صدمہ کا تأثر برقرار رہتا تھا۔ ہوتے
تے اب بات چند ساعتوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور میرا خیال ہے کہ عام طور پر اب اس صدمہ
کے اثرات کا معاملہ چند منٹوں تک رہ گیا ہے۔ اس کے بعد انسان اپنی مصروفیات و مشغولات میں
ی طرح مگن ہو جاتا ہے جیسا کہ وہ پہلے تھا۔

مجھے خاص طور پر اس کا بھی صدمہ ہے کہ اگرچہ میں بھاگ دوڑ کر پہنچا کہ میں ان کی نماز جنازہ میں
رکت کر سکوں۔ لیکن محرومی رہی اس لئے کہ ہمیں اطلاع صحیح طور پر نہ پہنچائی جا سکی۔ ہمیں نماز
نازہ کا وقت ساڑھے سات بجے شب کا دیا گیا تھا جبکہ ان کی نماز جنازہ مغرب کی نماز کے فوراً بعد یعنی
ات بجے کے لگ بھگ پڑھی گئی۔ بہر حال اللہ کا شکر ہے کہ میں پہنچا تو جنازہ مسجد سے نکلا ہی تھا للہذا
اندھا دینے کا موقع مل گیا۔

میرا اندازہ ہے کہ آپ میں سے اکثر حضرات مرحوم سے واقف ہوں گے شاید چند لوگ ایسے بھی
وں جو اُن سے شخصی طور پر متعارف نہ ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں تمام شرکاء کی معلومات کے لئے
نصور احمد بٹلا مرحوم کی شخصیت کے قدرے تفصیلی تعارف کے لئے چند کلمات عرض کروں ..
یقیناً بہت سے احباب جانتے ہوں گے کہ پنجابی سوداگران دہلی کے نام سے پاکستان کے چند بڑے
ہروں خاص طور پر کراچی میں بڑی کثیر تعداد میں جو برادری آباد ہے' بٹلا صاحب مرحوم کا اس
رادری سے تعلق تھا۔ ان کے والد مرحوم بھی مذہبی اور دینی مزاج کے انسان تھے لیکن بدقسمتی سے

وہ غلام احمد پرویز کے خیالات سے کافی متاثر ہو گئے تھے۔ اپنی جگہ انہوں نے جو کچھ سمجھا خلوص سے سمجھا اور انہوں نے پرویز صاحب کے ساتھ بھرپور عملی و مالی تعاون بھی کیا۔ بعد میں پرویز صاحب سے بعض نجی و ذاتی معاملات کے باعث ان کا ان سے اختلاف ہوا اور ان کا عملی تعلق پرویز صاحب سے ساتھ منقطع ہو گیا لیکن میری معلومات کے مطابق فکر کے لحاظ سے کوئی تغیر نہیں آیا۔ واللہ اعلم

منصور احمد بٹلا مرحوم کا بچپن ہی سے بہت سی دینی تحریکوں کے ساتھ تعلق رہا ہے۔ ان کے ذہن و فکر پر بھی یا تو اپنے والد ماجد کے زیر اثر یا جس ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت اور نشو و نما ہو رہی تھی اس کے نتیجہ میں کچھ اثر پرویزیت کا تھا۔ لیکن جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی رہی اور ان کی خداداد صلاحیت پروان چڑھتی رہی ساتھ ہی ان کا مطالعہ بھی وسیع ہوتا رہا تو ان کے افکار و نظریات میں بھی اصلاح اور ارتقاء کا عمل جاری رہا اور ان پر پرویزیت کے فکر کی ضلالت و گمراہی منکشف ہوتی چلی گئی۔ اس مجلس میں علی رؤس الاشہاد میں اس بات کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں کہ میں گواہی دینا چاہتا ہوں کہ منصور بٹلا مرحوم پرویز صاحب کے افکار و نظریات سے کلیۃً رجوع کر چکے تھے۔

انہوں نے آٹھ دس سال قبل سے اپنے لئے بڑی گرم جوشی' بڑی محنت اور بڑے زر کثیر کے صرف کے ساتھ جو مشن شروع کیا ہوا تھا وہ یہ تھا کہ علمی و عقلی اور سائنٹفک اسلوب اور انداز سے نئی نسل کے تعلیم یافتہ طبقہ کو ایمان کی اصل حقیقت اور اس کے دنیوی و اُخروی ثمرات سے واقف کرائیں۔ لہٰذا اس مقصد کے لئے انہوں نے بڑی عرق ریزی' بڑی محنت اور بے شمار کتابوں کے مطالعہ کے بعد "مطالعہ فطرت اور ایمان" کے نام سے سالہا سال کی کوششوں کے بعد ایک کتاب مرتب کی۔ [1] اس کتاب کی اشاعت سے قبل انہوں نے کتنے ہی علماء سے اس پر نظر ثانی کرائی اور کتنے ہی ادیبوں سے اس کی زبان کی اصلاح کرائی اور بالآخر طباعت و اشاعت سے قبل انہوں نے اس کتاب کو میرے حوالے کیا تھا کہ اگر تم اس میں کوئی فکری غلطی پاؤ تو اس کی اصلاح کر دو۔ میں نے بالاستعاب اس کتاب کا مطالعہ کیا۔ کتاب کا مضمون اور اسلوب بیان نہایت مدلل و مؤثر تھا۔ البتہ اس میں کہیں کہیں غیر شعوری طور پر پرویز صاحب کے فکر کی کچھ جھلکیاں بھی آ گئی تھیں۔ چنانچہ جہاں جہاں مجھے اس کے آثار نظر آئے' ان کو میں نے وہاں سے نکال دیا۔ منصور احمد بٹلا مرحوم و مغفور نے پوری خندہ پیشانی اور خوش دلی کے ساتھ میری اس اصلاح اور تصحیح کو قبول کیا۔ چنانچہ اس کے بعد وہ کتابچہ میری سند کے ساتھ شائع ہوا۔

پھر منصور احمد بٹلا مرحوم کی بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے اس کتاب کے کسی ایڈیشن پر

---

[1] ان کا نام شیخ حافظ محمد احمد بٹلا تھا اور ان کا دہلی اور پھر کراچی میں سوت گولے کا بڑا وسیع کاروبار تھا۔ (ج ر)

بھی اپنا نام شائع کرانا پسند نہیں کیا بلکہ اسے شائع بھی مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام کرایا۔ یعنی ناشر کی حیثیت سے بھی انہوں نے اس کتاب پر اپنا نام دینا گوارہ نہیں کیا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت پر ان کا تقریباً پانچ چھ لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے۔ لیکن انہوں نے یہ کام خالصتاً لوجہ اللہ انجام دیا۔ نام و نمود والی بات اس میں کسی طرح شامل نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کو قبول فرمائے[1]

اب میں چاہتا ہوں کہ ہم سب خلوص دل سے منصور احمد بٹلا مرحوم کی مغفرت کے لئے دعا کریں۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ نہ میں ان کی نماز جنازہ میں شریک ہو پایا اور نہ آپ حضرات میں سے کوئی شریک ہو سکا ہو گا۔

استدراک

ان ابتدائی کلمات کے بعد محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے نہایت الحاح و زاری اور سوز و گداز کے ساتھ بھائی منصور احمد بٹلا مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرائی۔ ڈاکٹر صاحب کے جذبات کا یہ عالم تھا کہ ان کی آنکھیں نم تھیں اور آواز میں انتہائی درد تھا خاکسار کی بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھائی منصور کی مغفرت فرمائے اور ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

محترم ڈاکٹر صاحب کی اس تعزیتی تقریر میں "مطالعہ فطرت اور ایمان" نامی بھائی منصور بٹلا مرحوم کی جس کتاب کا ذکر ہے، بھائی منصور نے اس میں مزید اضافے کئے اور پھر اس پر مختلف علماء سے نظر ثانی کرائی۔ عالم اسلام کے مشہور عالم دین مولانا سید ابوالحسن علی ندوی المعروف "علی میاں" سے اس پر نظر ثانی کرانے کے لئے لکھنؤ (بھارت) کے دو سفر کئے۔

علی میاں مدظلہ تو اس کتاب پر سرسری نظر ڈال سکے البتہ موصوف نے اپنے معتمد خاص جناب مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی (استاذ تفسیر و حدیث ندوۃ العلماء) سے اس کا بالاستعاب مطالعہ کرایا اور پھر ان کی سند کے ساتھ اس کا نیا ایڈیشن "اللہ کا پیغام انسانوں کے نام ... بذریعہ پیغمبر علیہم السلام" نہایت

---

[1] اردو میں یہ کتاب ۹۰ ہزار کی تعداد میں اور سندھی میں ۱۰ ہزار کی تعداد میں شائع ہو کر ھدیۃً ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص کالج اور یونیورسٹیوں کے طلبہ اور پروفیسر صاحبان تک پہنچ چکی ہے۔ (ج ر)

خوبصورت گیٹ اپ اور ٹائٹل کے ساتھ کئی ہزار کی تعداد میں شائع کرائی ابھی
اس کے دو سو نسخے ہی پریس سے آئے تھے کہ بھائی منصور احمد بٹ اللہ تعالیٰ کو
پیارے ہو گئے۔ ۱۶ مارچ ۸۷ء کی شام میں منصور بھائی نے راقم الحروف سے
طے کیا تھا کہ ۱۹ مارچ ۸۷ء کو وہ مجھ سے ملیں گے اور اس کتاب کو پھیلانے کے
لئے پروگرام بنائیں گے لیکن اجل مسمّٰی اس پروگرام پر خندہ تھی۔ خوشی اس پر ہے
کہ مرحوم کی زندگی میں کتاب کے چند نسخے پریس سے آ گئے تھے جس کو دیکھ کر وہ
بے انتہا خوش تھے۔ اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ

صاحبانِ ذوق اس کتاب کو پوسٹ بکس نمبر ۱۳۵۸۸ کراچی نمبر ۲ سے
ھدیۃً طلب کر سکتے ہیں۔

جمیل الرحمٰن

رفتارِ کار

صوبۂ سرحد میں امیرِ تنظیمِ اسلامی کی دعوتی مصروفیات

شامِ الہدیٰ پشاور

مرتب: ملک وارث خان (پشاور)

درس قرآن کے مشہور پروگرام "الھدیٰ" کی کامیابی اور امیر محترم کے مخصوص جلالی انداز بیان نے عوام الناس میں جو بے پناہ شہرت حاصل کی۔ اس کے نتیجے میں ملک کے مختلف حصوں میں امیر محترم کے دروس قرآنی کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ ان دروس میں لوگوں کی دلچسپی اور ذوق و شوق نے بعض مقامات پر "شام الھدیٰ" کے نام سے مستقل شکل اختیار کر لی جو کہ فکر قرآنی کے ابلاغ کا ذریعہ ثابت ہوئی۔

اس ضمن میں اہالیان پشاور کے پرزور اصرار پر امیر محترم دسمبر ۱۹۸۱ء میں پہلی مرتبہ پشاور تشریف لائے اور قرآن کریم کا درس دیا اور اس کے بعد امیر محترم کا پشاور کے ساتھ رابطہ مسلسل رہا۔

امیر محترم جب بھی پشاور تشریف لاتے رہے اہالیان پشاور نے ہمیشہ ان سے ماہانہ پروگرام کے لئے وقت نکالنے کی درخواست کی۔ جبکہ امیر محترم کی ذاتی رائے اور خواہش بھی یہی رہی ہے۔ لیکن تمام خواہشات اور کوششوں کے باوجود یہ پروگرام ترتیب نہ دیا جا سکا لیکن حال ہی میں جب امیر محترم ۶ر فروری کو متحدہ شریعت محاذ کے جلسے میں شرکت کے لئے پشاور تشریف لائے تو رفقائے پشاور نے اپنی اس دیرینہ خواہش کا پھر اظہار کیا جسے امیر محترم نے قبول فرما کر ماہانہ درس قرآن کا پروگرام "شام الھدیٰ" کے نام سے پشاور میں شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جبکہ اس سلسلے کا پہلا پروگرام ۳ر مارچ ۱۹۸۷ء کو طے پایا لیکن دورہ لیبیا کی وجہ سے یہ پروگرام مقررہ تاریخ پر شروع نہ ہو سکا۔ بعد میں یہ درس قرآن ۳۱ر مارچ ۱۹۸۷ء کو ہونا طے پایا "شام الھدیٰ" کے اس سلسلے کا پروگرام پشاور میں نوتعمیر شدہ عظیم الشان اور جدید ترین کمیونٹی سنٹر میں منعقد کروانے کا فیصلہ کیا گیا۔ جس کی اجازت متعلقہ حکام سے حاصل کی گئی اور پروگرام کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے پشاور کے رفقاء نے تیاریاں شروع کر دیں۔ درس قرآن کی مناسب تشہیر کے لئے بینر اور پوسٹر مختلف مقامات پر لگائے گئے اور مسجدوں میں ہینڈ بل وغیرہ تقسیم کئے گئے۔ جبکہ اس کے علاوہ تین سو دعوت نامے

چھپوائے گئے اور یہ کارڈ پشاور کی ممتاز شخصیتوں، علمائے کرام، یونیورسٹی اور کالجوں کے پروفیسر صاحبان کو دیئے گئے۔

"شام الہدیٰ" کے سلسلے کا پہلا پروگرام "حقیقت جہاد" کے موضوع پر تھا۔ امیر محترم اس پروگرام کے لئے بذریعہ ویگن تشریف لائے۔ راستے میں اکوڑہ خٹک کے مقام پر دارالعلوم حقانیہ تشریف لے گئے۔ جہاں مشہور عالم دین جناب شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب دامت برکاتہم اور مولانا سمیع الحق صاحب سے ملے۔ کچھ وقت وہاں گذارنے کے بعد پشاور کے لئے روانہ ہوئے ۳۰ مارچ کو رات آٹھ بجے امیر تنظیم اسلامی پشاور جناب اشفاق احمد میر صاحب کے گھر پہنچے۔ ۳۱ مارچ کی صبح کو پشاور کے رفقاء سے ملاقات کا وقت طے تھا۔ رفقاء سے ملاقات کے بعد ڈاکٹر صاحب کسی مریض کی عیادت کے لئے ہسپتال گئے۔ چند رفقاء نے ۳۱ مارچ کو پلے کارڈ اٹھا کر شہر میں امیر محترم کے پروگرام کی تشہیر کی۔ اور باقی رفقاء کمیونٹی سنٹر کے انتظامات کے لئے وہاں چلے گئے۔ اسی دن حزب اسلامی افغانستان مجاہدین کے امیر جناب انجینئر گلبدین حکمت یار صاحب سے ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ موصوف افغانستان کے جہاد میں بہت زیادہ سرگرم عمل ہیں۔ عصر کے وقت امیر محترم چند رفقاء کے ساتھ جناب گلبدین حکمت یار کی دعوت پر ورسک کیمپ تشریف لے گئے۔ جو پشاور سے تقریباً ۲۰ کلو میٹر دور ورسک ڈیم کے قریب ہے۔ وہاں پر امیر محترم نے عصر کی نماز کے بعد افغان مجاہدین سے جہاد فی سبیل اللہ کے موضوع پر نصف گھنٹہ خطاب کیا اور افغان مجاہدین کے جذبہ ایمان کو جلا بخشی۔ مجاہدین کی تعداد تقریباً تین ہزار تھی۔ خطاب کے اختتام پر چائے کا اہتمام تھا۔ چائے کے بعد وہاں سے پشاور روانہ ہوئے۔ پشاور میں خطاب کا وقت بعد از نماز عشاء مقرر تھا۔ عشاء کی نماز کے وقت لوگ کمیونٹی سنٹر میں آنا شروع ہو گئے۔ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے امیر محترم بھی وہاں پہنچ گئے۔ ٹھیک نو بجے امیر محترم کا خطاب شروع ہوا۔ جس میں تقریباً سات سو افراد شریک تھے۔ پروگرام میں پشاور کے علمائے کرام نے بھی شرکت کی۔ خطاب پونے دو گھنٹے تک جاری رہا۔ جس میں امیر محترم نے حقیقت جہاد پر کافی جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی۔ باہر کتابوں کا سٹال بھی لگایا گیا تھا۔ جس سے لوگوں نے کافی کتابیں خریدیں۔ کمیونٹی سنٹر میں مردوں کے علاوہ چند خواتین بھی تشریف لائیں۔ جن کے لئے اوپر گیلری میں پردے کا انتظام کیا گیا تھا۔ قرآن اکیڈمی کے مدرس جناب الطاف الرحمٰن بنوی بھی تشریف لائے۔ اور اس دوران میں بنوں، سرائے نورنگ ڈیرہ اسماعیل خان اور پشاور میں دوسرے پروگرام کے لئے تاریخ مقرر کی گئی۔ پشاور کے لئے ۱۰ اپریل، بنوں سرائے نورنگ کے لئے ۱۱ اپریل اور ڈیرہ اسماعیل خان کے لئے ۱۳ اپریل کی تاریخیں مقرر کی گئیں بعد میں امیر محترم اور جناب میاں نعیم صاحب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ لاہور کے لئے روانہ ہوئے۔ اور جدہ سے آئے ہوئے پشاور کے رفیق جناب افتخار الدین صاحب بھی آپ کے ہمراہ ہو گئے۔

اس پروگرام کے پوسٹر اور ہینڈ بل پشاور کے مشہور جالندھر سویٹ ہاؤس والوں نے شائع کئے۔ اس کے علاوہ تین سو (۳۰۰) دعوت نامے سعدیہ پرنٹنگ پریس کے مالک جناب سعید احمد جان نے چھاپے۔ اس پروگرام کے لئے دریاں اور کرسیاں وغیرہ جناب حاجی عبدالسمیع صاحب مالک صابرینہ ٹینٹ سروس نے عنایت فرمائیں۔ ہم ان تمام حضرات کے تہہ دل سے مشکور ہیں اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

چھ دن ، پانچ شہر

امیر تنظیم اسلامی کے دورۂ پشاور، بنوں، ڈیرہ اسماعیل خان، جہلم، میرپور کی رُوداد

مرتب : غازی محمد وقاص

۴، اپریل سے ۷، اپریل تک تنظیم اسلامی کا سالانہ اجتماع لاہور میں منعقد ہوا۔ اُسی موقع پہ امیر محترم کا صوبہ سرحد کے شہروں پشاور۔ بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں کا چار دنوں کا پروگرام طے ہوا اور واپسی پہ ایک دن جہلم اور ایک دن آزاد کشمیر کے شہر میرپور کے پروگرام کا اضافہ بھی کر لیا گیا یوں ایک ہفتے کا بھرپور دعوتی پروگرام ترتیب پا گیا۔ لاہور سے قیم تنظیم اسلامی جناب محمد نعیم صاحب اور اُسرہ مصطفےٰ آباد کے فعال رفیق جناب محمد اسحاق صاحب بھی شریک سفر تھے۔ اس دورے میں جہاں کہیں بھی امیر محترم کا خطاب ہوا۔ وہاں مکتبہ لگانے کی ذمہ داری راقم کے سپرد تھی۔ البتہ دورے کے اختتام پر یعنی واپس لاہور پہنچنے کے بعد میاں نعیم صاحب نے حکم دیا کہ اس سفر کی روداد قلم بند کرنے کا فرض بھی مجھے ہی ادا کرنے پڑے گا۔

راقم چونکہ اس کوچے کا فرد نہیں اس لئے تحریر کا حق تو کیا ادا ہو گا محض ادائے فرض اور تعمیل ارشاد کے طور پر یہ سطور قلم سے نکل رہی ہیں۔ مزید برآں چونکہ دوران سفر ذہن میں دور دور تک اس بات کا گمان بھی نہ تھا کہ اس سفر کی داستان لکھنے کا مرحلہ بھی آئے گا اس لئے نہ تو کوئی تحریری یادداشت مرتب کی اور نہ اس انداز سے واقعات کو ذہن میں مرتب کیا کہ لکھتے وقت معاون ہو۔ ان اسباب کی وجہ

سے اگر قارئین کو تشنگی یا ربط کی کمی کا احساس ہو تو راقم کو معذور سمجھتے ہوئے درگزر فرمائیں ۔

پشاور

جمعہ دس اپریل کو صبح سات بجے تنظیم کی ویگن میں قرآن اکیڈمی سے پشاور کے لیئے سفر کا آغاز کیا کامرہ میں نماز جمعہ کی ادائیگی اور کچھ دیر آرام کرنے بعد سفر جاری رہا ۔ نماز مغرب سے پون گھنٹہ قبل ہم پشاور کی جامع مسجد نمک منڈی پہنچ گئے ۔ جہاں درس قرآن کا پروگرام تھا ۔ امیر محترم باغ جناح لاہور میں جمعہ پڑھانے کے بعد بذریعہ ہوائی جہاز پشاور پہنچ چکے تھے ۔ پشاور کے نوجوان رفقاء انتظام و انصرام میں مصروف تھے ۔

۱۰ اپریل کے پروگرام کے لئے پشاور کی ایک عظیم الشان جامع مسجد مدنی نمک منڈی کے متولی جناب حاجی عبدالجلیل صاحب اور مسجد کے خطیب قاری فیاض الرحمٰن علوی سے بات کی گئی تھی ۔ اس مسجد میں ایک مدرسہ بھی قائم ہے ۔ جس میں درس نظامی کے علاوہ حفظ و تجوید کا بھی انتظام ہے ۔ اس مدرسہ کے مہتمم جناب قاری فیاض الرحمٰن علوی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے کافی خوش الحانی سے نوازا ہے ۔ ہم اس پروگرام کے انعقاد کے سلسلے میں جناب حاجی عبدالجلیل صاحب اور جناب قاری صاحب کے بہت شکر گذار ہیں ۔ نماز جمعہ امیر محترم نے مسجد دارلسلام جناح باغ لاہور میں ادا کی ۔ اور فوراً ایئرپورٹ روانہ ہو گئے اور وہاں سے پشاور کی فلائٹ پر تقریباً ۴ بجے کے قریب پشاور پہنچ گئے ۔ رفقائے پشاور اپنے مکتبے کے ساتھ عصر کے وقت مسجد پہنچ گئے ۔ عصر کی نماز کے بعد چار افراد پر مشتمل قافلہ میاں محمد نعیم صاحب کی سرکردگی میں پشاور پہنچا ۔ مغرب کی نماز کے وقت امیر محترم اور جناب اشفاق احمد میر صاحب جامع مسجد مدنی نمک منڈی پہنچ گئے ۔ جہاں پر سامعین پہلے سے پہنچ چکے تھے ۔ نماز مغرب جناب قاری فیاض الرحمٰن علوی کی اقتداء میں ادا کی گئی ۔ نماز کے بعد قاری عبدالحلیم صاحب نے تلاوت قرآن پاک فرمائی ۔ جناب قاری صاحب کا شمار پاکستان کے چند مشہور قراء حضرات میں ہوتا ہے ۔ آپ اندرون ملک اور بیرون ملک حسن قرات کے مقابلوں میں حصہ لے چکے ہیں ۔ اور کئی بار اول پوزیشن حاصل کر چکے ہیں ۔ تلاوت کے بعد جناب امیر محترم کا خطاب شروع ہوا ۔ اس خطاب کا موضوع "توحید عملی کے تقاضے" تھا ۔ امیر محترم نے اس موضوع پر کافی جامعیت کے ساتھ اظہار خیال کیا ۔ جو تقریباً پونے دو گھنٹے تک جاری رہا ۔ اس میں حاضری

ریباً آٹھ سو حضرات تک تھی۔ اس اجتماع میں کافی تعداد میں کتابیں اور کیسٹ فروخت ہوئے۔
ں اجتماع میں کافی تعداد میں علماء کرام اور خطیب حضرات نے شرکت کی۔ آخر میں قاری صاحب
ے ساتھ چائے پی گئی اور جناب اشفاق احمد میر صاحب کے گھر کے لئے روانہ ہوئے۔

بنوں

ہفتہ گیارہ اپریل کو پشاور سے صبح ساڑھے سات بجے بنوں کیلئے
ر کا آغاز کیا۔ پشاور کے تین نوجوان رفقاء، وارث خاں صاحب، حافظ محمد مقصود
ر شکیل احمد صاحب بھی ہمارے قافلے میں شامل ہو گئے ۔ بنوں کا دو روزہ
وگرام قرآن اکیڈمی کے سابق مدرس جناب الطاف الرحمٰن بنوی صاحب نے ترتیب
ا تھا اور اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے انہوں نے بھرپور کوششیں کیں
لہ تعالےٰ اُن کی مساعی جمیلہ کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور رجوع الی القرآن
ی جس دعوت کا بیڑا انہوں نے اٹھایا ہے وہ نتیجہ خیز ثابت ہو۔ خم کھاتی ہوئی
ہاڑی سڑکوں کے سفر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے گیارہ بجے ہم بنوں پہنچے تو
ولانا الطاف الرحمٰن بنوی اپنے رفقاء کے ہمراہ ہمارے منتظر تھے ان سے وہاں ملاقات کے بعد
نوں شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ کافی پرانا شہر ہے۔ بنوں میں ایک جامع مسجد (شہید بابا مسجد)
یں ہمارے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ تقریباً سوا بارہ بجے ہم وہاں پہنچے۔ کھانا کھایا اور کھانے کے بعد
جامع مسجد حافظ جی (عید گاہ) کے لئے روانہ ہوئے۔ جہاں نماز ظہر کے بعد امیر محترم نے سورہ صف
کا درس دو نشستوں میں مکمل کرنا تھا۔ بعد از نماز ظہر تقریباً دو بجے امیر محترم کا درس شروع ہوا۔ جو
قریباً دو گھنٹے تک جاری رہا۔ یہ مسجد کافی بڑی اور بہت قدیم تھی۔ درس کے اختتام پر لوگوں نے
کتابیں خریدیں۔ اور پھر ہم اپنی قیام گاہ پہنچ گئے۔ وہاں نماز عصر ادا کرنے کے بعد مغرب تک
مختلف حضرات سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس مسجد کے خطیب اور امام جناب لطف الرحمٰن صاحب
نے بعد از نماز فجر ڈاکٹر صاحب کے درس کا اعلان کیا۔ مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد جناب الطاف
الرحمٰن بنوی صاحب کی سربراہی میں سرائے نورنگ کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ جگہ بنوں سے ۲۵ کلو
میٹر دور ہے۔ سرائے نورنگ پہنچے تو وہاں کے علمائے کرام باہر سڑک پر انتظار میں کھڑے تھے۔ ان
سے ملاقات کے بعد وہاں چائے پی گئی جس کا انتظام ایک مڈل سکول میں کیا گیا تھا۔ چائے پینے کے بعد
جامع مسجد اڈہ سرائے نورنگ میں نماز عشاء ادا کی گئی۔ بعد از نماز عشاء امیر محترم کا خطاب سیرت
النبی صلعم کے انقلابی مراحل کے موضوع پر تھا۔ یہ خطاب تقریباً پونے دو گھنٹے تک جاری رہا۔ اس

خطاب کو سننے کے لئے تقریباً ڈھائی سو افراد موجود تھے۔ اس جگہ بھی کافی کتابیں فروخت ہوئیں۔

اتوار ۱۲ ۔ اپریل کو نمازِ فجر کے بعد جامع مسجد شہید بابا میں ڈاکٹر صاحب نے راہ ہدایت کا سہ نکاتی پروگرام کے موضوع پر سورہ آل عمران کی آیات ۱۰۱ تا ۱۰۳ کی روشنی میں آدھا گھنٹے کا درس دیا اختتام درس پر ناشتہ کیا۔ اور پھر آرام کرنے کے بعد ظہر کے کھانے کا انتظام قریب کے ایک صاحب جناب غلام رسول صاحب کے مکان پر تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر جامع مسجد حافظ جی (عید گاہ) کے لئے روانہ ہوئے۔ جہاں پر سورہ صف کے دوسرے حصہ کا درس ہوا۔ یہ تقریباً دو گھنٹے جاری رہا۔ اختتام درس پر وہاں کے خطیب جناب حاجی عبدالقادر صاحب نے چائے کا انتظام کیا تھا۔ چائے کے بعد امیر محترم اپنی قیام گاہ تشریف لے گئے۔ اور چند رفقاء مدرسہ معراج العلوم چلے گئے۔ امیر محترم بھی مغرب کی نماز کے بعد مدرسہ معراج العلوم تشریف لائے۔ اس مدرسہ میں مہتمم جناب صدر الشہید صاحب جمعیت علمائے اسلام کے مشہور رہنما سے امیر محترم نے ملاقات کی۔ اور مختلف سیاسی و دینی موضوعات پر تبادلہ خیال کیا۔ مولانا صاحب نے کھانے کا پر تکلف اہتمام کیا تھا۔ کھانے سے فراغت کے بعد "پاکستان میں اسلامی انقلاب کیا؟ کیوں؟ کیسے" کے موضوع پر تقریباً دو گھنٹے تک خطاب جاری رہا۔ حاضری تقریباً تین سو افراد تک تھی۔ خطاب کے بعد لوگوں نے کیسٹ اور کتابیں خریدیں۔ صبح بعد از نماز فجر سوال و جواب کی نشست جامع مسجد شہید بابا میں تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔ اس نشست کے بعد ناشتہ کیا گیا۔ ساڑھے دس بجے بنوں بار ایسوسی ایشن کی دعوت پر امیر محترم نے استحکام پاکستان کے موضوع پر خطاب کیا۔ بعد میں مختصر سوال و جواب کی نشست ہوئی۔ آخر میں بار کی طرف سے چائے کا اہتمام تھا۔

ڈیرہ اسماعیل خاں

ٹھیک بارہ بج کر تیس منٹ پر ڈیرہ اسماعیل خان کے لئے روانہ ہوئے۔ جناب بنوی صاحب بنوں سے ۴ کلو میٹر دور تاجہ زئی کے مقام تک ہمارے ساتھ آئے اور وہاں ہم سے رخصت ہوئے۔ ہم ٹھیک سوا دو بجے ڈیرہ اسماعیل خان پہنچے۔ ڈیرہ سے پانچ کلو میٹر باہر ہمارے رفیق جناب صادق صاحب ہمارے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان سے ملاقات کے بعد کچھ آگے گئے تو جناب مولانا غلام رسول صاحب (مبلغ تحفظ نبوت اور خطیب جامع مسجد جمعہ شاہ) اور ان کے ساتھی موٹر کار پر ایک بینر لگائے کھڑے تھے۔ جس پر لکھا تھا۔ "ہم معزز مہمان جناب ڈاکٹر اسرار احمد کو خوش آمدید کہتے ہیں۔" ان سے ملاقات کے بعد ہم جناب جہانگیر خان ایڈووکیٹ کے مکان پر پہنچے۔ جہاں ہمارے قیام کا انتظام تھا۔ نماز ظہر ادا کرنے کے بعد کھانا کھایا۔ اور آرام کے لئے اندر چلے گئے۔ جمعہ شاہ کی

جامع مسجد میں نمازِ عصر ادا کی وہیں غلام سبحانی صاحب سے ملاقات ہوگئی ۔ موصوف کا تعلق اسی شہر سے ہے لیکن عرصہ بیس سال سے امریکہ میں مقیم ہیں ۔گذشتہ تین سال سے سعودی عرب میں گذارے ۔ وہاں سٹرکچرل آرکیٹیکٹ کے طور پر کام کر رہے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں سے بے حد متاثر ہیں ۔گذشتہ تین سال سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں ۔ ڈیرہ اسماعیل خان گومل یونیورسٹی کے قریب ۴ کنال کا قطعہ اراضی انجمن خدام القرآن کے مقاصد کے لئے وقف کرنا چاہتے ہیں امیر محترم نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ پہلے خود ابتدائی دینی تعلیم قرآن اکیڈمی حاصل کریں اور پھر اس جگہ پر قرآن اکیڈمی کی طرز کا ادارہ قائم کریں ۔چونکہ امیر محترم کا خطاب بعد نماز عشاء ہونا تھا ۔اس لئے امیر محترم ، میاں محمد نعیم صاحب ، چوہدری محمد اسحاق صاحب سبحانی صاحب کے ہمراہ مذکورہ جگہ دیکھنے چلے گئے ۔

امیر محترم کا خطاب جامع مسجد جمعہ شاہ میں بعد از نماز عشاء مقرر تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد مولانا غلام رسول صاحب نے ڈاکٹر صاحب کا مختصر تعارف فرمایا۔ اور ساتھ ہی ختم نبوت کے متعلق چند باتیں بیان فرمائیں۔ امیر محترم کی تقریر تقریباً ساڑھے نو بجے شروع ہوئی۔ جس میں انہوں نے "ختم نبوت اور اس کے عملی تقاضے" کے موضوع پر مفصل خطاب کیا۔ جو دو گھنٹے تک جاری رہا۔ شرکاء کی تعداد سات سو تک تھی۔ مسجد کے علاوہ باہر گلی میں بھی بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ خطاب ختم ہونے کے بعد کافی تعداد میں تنظیم اسلامی کا منشور تقسیم کیا گیا۔ کافی تعداد میں کتابیں اور کیسٹ فروخت ہوئے۔ واپسی پر جناب جہانگیر خان صاحب کے گھر کھانا کھایا اور امیر محترم نے مختلف علمائے کرام سے تبادلہ خیالات کیا۔ صبح بعد از نماز فجر یہ قافلہ دو حصوں میں پشاور اور جہلم کی طرف روانہ ہوا۔

جہلم

ڈیرہ اسماعیل خان سے جہلم کا فاصلہ تقریباً چار سو کلو میٹر کا ہے۔ اس لئے صبح چھ بجے ڈیرہ اسماعیل خان سے کمر ہمت کسی اور اللہ کا نام لے کر سفر کا آغاز کیا۔ پشاور کے رفقاء نے پشاور کی طرف کوچ کیا۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے روانہ ہوتے ہوئے راستے میں خانقاہ سراجیہ میں مولانا محمد خان صاحب سے شرف ملاقات کا پروگرام بھی طے ہو گیا۔ راستے کی رہنمائی اور مولانا خان محمد سے ملاقات کی غرض سے محمد زاہد صاحب بھی شریک سفر ہو گئے۔ تقریباً ساڑھے دس بجے ہم خانقاہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا صاحب ہری پور کے لئے روانہ ہونے والے ہیں۔ ارادہ سفر کی مصروفیت کے باوجود مولانا خان

محمد صاحب نے کمال مہربانی سے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا وقت نکالا۔ اثنائے گفتگو میں چائے بھی آ گئی۔ تقریباً نصف گھنٹے کی اس روحانی محفل سے لطف اندوز ہونے کے بعد پھر آغاز سفر کیا۔

طویل تھکا دینے والے سفر کے بعد ساڑھے تین بجے جہلم شہر کے قریب قصبہ مغل ٹھٹھیاں میں ابوظبی کے رفیق مشتاق بیگ صاحب کے گھر پہنچے تو یہ جان کر شدید صدمہ ہوا کہ مشتاق بیگ صاحب ریلوے کلب گراؤنڈ کے قریب جلسہ کے سلسلہ میں بجلی کے کھمبے کے اوپر بینر لگاتے ہوئے بجلی کا جھٹکا لگنے سے شدید زخمی ہو گئے اور ہسپتال میں داخل ہیں۔ گجرات کے امیر جناب شمس الحق اعوان صاحب کی متحرک قیادت میں مشتاق بیگ صاحب' محمد اشرف فاروق صاحب اور دیگر نوجوان رفقاء نے جہلم کے جلسے کو کامیاب بنانے کے لئے جس جوش اور جذبے سے محنت کی وہ انہی کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی پر خلوص کوششوں میں برکت عطا فرمائے اور اپنی جناب میں شرف قبولیت سے سرفراز فرمائے۔

امیر محترم مشتاق بیگ صاحب کے گھر آرام کی غرض سے رک گئے۔ میاں محمد نعیم' چودھری محمد اسحاق صاحب اور راقم اسی وقت بیگ صاحب کی تیمارداری کے لئے جہلم ہسپتال پہنچے۔ اس وقت وہ بستر پر نیم بے ہوشی کی حالت میں لیٹے ہوئے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے صحت یاب ہو کر ابوظبی جا چکے ہیں۔ مغل ٹھٹھیاں میں بعد نماز عصر مشتاق بیگ صاحب کے چھوٹے بھائی کی تقریب نکاح اس حادثہ کی وجہ سے ملتوی کر دی گئی۔ مگر چونکہ نماز عصر کے وقت قصبہ کے لوگ اور مہمان کافی تعداد میں موجود تھے اس لئے امیر محترم نے شادی بیاہ کے بارے میں اپنی اصلاحی تحریک کے حوالے سے سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر روشنی ڈالی۔ اس مختصر خطاب کو بہت پسند کیا گیا۔

امیر محترم' میاں محمد نعیم صاحب اور چودھری اسحاق صاحب بعد نماز مغرب مغل ٹھٹھیاں سے جہلم تشریف لے آئے اور سب سے پہلے مشتاق بیگ صاحب کی تیمارداری کے لئے ہسپتال گئے۔ امیر محترم نے معالجین سے مشتاق صاحب کی صحت کے بارے میں تبادلہ خیال بھی کیا۔ پھر ریلوے کلب گراؤنڈ کی قریبی مسجد میں نماز عشاء ادا کر کے جلسہ گاہ میں پہنچے۔ امیر محترم نے پاکستان میں اسلامی انقلاب کیا کیوں اور کیسے؟ کے موضوع پر تقریباً دو گھنٹے خطاب فرمایا آخر میں سامعین کو دعوت دی گئی کہ جن حضرات کے ذہن میں کچھ سوالات ہوں وہ صبح بعد نماز فجر گراؤنڈ کے قریب جامعہ اثریہ اہل حدیث کی مسجد میں تشریف لائیں۔

بدھ ۱۵ / اپریل کو بعد نماز فجر جامعہ اثریہ میں بعد نماز فجر سوال و جواب کی نشست منعقد ہوئی شرکاء کی زیادہ تعداد جامعہ اثریہ کے طلباء پر مشتمل تھی باہر سے بہت کم تعداد میں لوگ تشریف لائے تھے۔ امیر محترم نے لوگوں کے مختلف اشکالات کی وضاحت فرمائی اور سوالوں کے جواب دیئے۔

میرپور (آزاد کشمیر)

آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے ہمارے بزرگ دیرینہ رفیق جناب سید آزاد صاحب مع چند ساتھیوں کے رات کو ہی جہلم کے جلسہ میں پہنچ چکے تھے۔ صبح نو بجے جہلم سے ان کے ساتھ میرپور کے لئے روانہ ہو گئے۔ میرپور میں ہمارے میزبان جناب ڈاکٹر اختر زمان غوری صاحب تھے۔ ساڑھے دس بجے ہم ان کے گھر پہنچ گئے۔ میرپور میں نماز عصر سے لے کر نماز عشاء تک تین مسلسل پروگرام طے تھے۔ نماز عصر کے بعد فیصل ہسپتال کے نزدیک جامع مسجد کے سبزہ زار میں شہر کے صاحبانِ علم و فضل اور دیگر معززین کے ہمراہ گفتگو اور تبادلہ خیال کی نشست تھی۔ تقریباً دو سو افراد کے اس اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا اس وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ہر شعبۂ تعلیم سے تعلق رکھنے والے قابل نوجوان طالب علم عربی زبان اور دینی علوم سے واقفیت حاصل کریں اور پھر دورِ جدید کے باطل نظریات کا ابطال اور عہد جدید کے مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ جب تک یہ کام نہیں ہو گا اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں انجمن خدام القرآن کی کوششوں اور قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج کے منصوبوں کا تعارف کراتے ہوئے امیر محترم نے شرکاء سے اپیل کی کہ اپنی اولاد اور اپنے حلقہ اثر میں سے اہل اور لائق نوجوان طلبہ کو اس کام کے لئے تیار کریں۔ جو تعلیم قرآن کو اپنی زندگیوں کا محور و مقصد بنا لیں۔ نماز مغرب کے بعد جامع مسجد گلزار مدینہ میں ڈاکٹر اختر زمان غوری صاحب کے بھائی کی دو بیٹیوں کے نکاح کی تقریب منعقد ہوئی۔ امیر محترم نے خطبہ نکاح کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ قرآن حکیم رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے والے نئے جوڑے کو جو ہدایت راہنمائی فرماتا ہے اس کی بنیاد تقویٰ ہے۔ ہمارے معاشرہ میں شادی بیاہ کی جو ہندوانہ رسومات رائج ہیں وہ متوسط اور نچلے طبقے کے افراد کے لئے سوہان روح بن گئی ہیں۔ ان کے خاتمہ کے لئے ایک تحریک کی ضرورت ہے ہم سنتِ نبویؐ پر عمل پیرا ہو کر اپنے لئے اور دوسروں کے لئے آسانیاں پیدا کر سکتے ہیں۔ مسجد میں نکاح کی تقریب بھی نبی اکرم کی ایک سنت پر عمل ہے۔

اس تقریب میں میرپور شہر کے معززین' حکام' جج اور وزیر حضرات بھی مہمانوں میں شامل تھے۔ سب نے اصلاح کے اس عملی طریقے کو بے حد پسند کیا۔ میزبان کی زبانی معلوم ہوا کہ میرپور کی تاریخ میں یہ پہلی تقریبِ نکاح ہے جو مسجد میں سنت نبویؐ کے مطابق منعقد ہوئی اور لڑکی والوں کی طرف سے کھانے کا اہتمام بھی نہیں کیا گیا۔

بعد نماز عشاء مولانا عبدالغفور صاحب کے دارالعلوم فرقانیہ کے سالانہ اجلاس کے آخری دن دارالعلوم کی مسجد میں امیر محترم نے پاکستان میں اسلامی انقلاب کیا کیوں اور کیسے موضوع پر خطاب

رمایا۔ میرپور میں یہ امیر محترم کا تیسرا خطاب تھا۔ میرپور کے ان تینوں اجتماعات میں مکتبہ بھی لگایا گیا
ساں میری معاونت آزاد کشمیر کے رفقاء نے کی۔
جمعرات ۱۶ر اپریل کو بعد نماز فجر مسجد میں سوال جواب کی نشست منعقد ہوئی۔ تقریباً ۔۔ کے
ریب افراد نے شرکت کی۔ اسی طرح میرپور کے اس آخری پروگرام کے ساتھ دورہ مکمل ہو گیا صبح نو
بجے لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔ لاہور سے پشاور' پشاور سے بنوں ڈیرہ اسماعیل خان اور پھر جہلم و
میرپور سے لے کر واپس لاہور آنے تک ہمارے ڈرائیور نور محمد نے جس محنت اور جانفشانی سے
مارا ساتھ دیا اس نے سفر کی صعوبتوں کو بہت کم کر دیا۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا
رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ
عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا
مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا
وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى
الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ○

ترجمہ

اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر)
ہماری گرفت نہ فرما۔ اور اے ہمارے رب۔ ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے
اُن لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں اور اے ہمارے رب!
ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں ہے۔ اور
ہماری خطاؤں سے درگذر فرما اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما تو ہی
ہمارا کارساز ہے پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما!

الداعی الی الخیر: میاں عبدالواحد بھگوان سٹریٹ، پرانی انارکلی ○ لاہور

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ
عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ
اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ
بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ اُنْظُرْ كَيْفَ
نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝

ترجمہ

اے نبیؐ کہہ دیجیے کہ اللہ قادر ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے عذاب
نازل کرے یا تمہارے قدموں تلے سے عذاب بھیج دے یا تمہیں
گروہوں میں تقسیم کرکے آپس میں ٹکرا دے اور (اس طرح) تمہیں ایک
دوسرے کی جنگی قوت کا مزا چکھائے۔ دیکھئے کس کس طرح سے ہم بیان
کرتے ہیں آیتوں کو تاکہ وہ سمجھ جائیں (الانعام ۶۵)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو [illegible] سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۳۶

شمارہ ۷

ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ

جولائی ۱۹۸۷ء

فی شمارہ -/۵

سالانہ زرتعاون -/۵۰

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مینجنگ ایڈیٹر

اقتدار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

مقبول الرحیم مفتی

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

ممالک	زرتعاون
سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوحا، قطر، متحدہ عرب امارات	۲۵ سعودی ریال یا -/۱۱۵ روپے پاکستانی
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر	۶ امریکی ڈالر یا -/۱۰۰ روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ	۹ امریکی ڈالر یا -/۱۵۰
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ	۱۲ امریکی ڈالر یا -/۲۰۰

ترسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور، یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ (پاکستان)، لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی فون ۲۱۶۵۸۶

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقتدار احمد

عرضِ احوال

ہمارا ایمان ہے کہ اذنِ ربّی کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا۔ ملکِ خداداد میں آج جو کچھ ہو رہا ہے.... بلکہ صحیح تر الفاظ میں جو کچھ ہوتا ہمیں نظر آتا ہے یقیناً اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، لیکن مسئلۂ جبر وقدر کی فلسفیانہ موشگافیوں میں پڑنے کی بجائے ہمارا اندازِ فکر یہ ہونا چاہئے کہ ہر خیر کو ربِّ کریم کا فضل گردانیں اور ہر شر کو اپنے اعمال کی شامت۔ اور طرزِ عمل یہ کہ خیر کو پہچاننے اور اس کے حصول میں حسبِ استطاعت کوشاں رہیں اور شر کو سمجھنے اور اس سے بچنے کی حتی الامکان کوشش جاری رکھیں۔ کبوتر اگر بلّی کی زد میں آ ہی جائے تو دو راستے اس کے سامنے کھلے ہوتے ہیں، ہمّت مجتمع کر کے بال و پر کو حرکت دے اور بچنے کی سعی کرے یا آنکھیں بند کر کے اس تصوّر کی عافیت میں پناہ لے لے کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ افسوس کہ بحیثیت مجموعی ہمارا انداز کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے کی صورت کا غمّاز ہے اور ظاہر ہے کہ یہ زندہ قوموں کا چلن نہیں۔ ہماری عظیم اکثریت اپنے روزمرّہ کے مسائل و مشاغل میں یوں مست ہے کہ ؏

ہر لحظہ مری جان مجھے میری خبر کر

وہ لوگ نہایت قلیل تعداد میں پائے جاتے ہیں جنہیں ملک و ملت کے مستقبل کی فکر ہے اور ان میں سے بھی ایسے صاحبانِ عقل و دانش تو انگلیوں پر ہی گنے جاسکتے ہیں جو درپیش خدشات و خطرات کا صحیح ادراک رکھتے اور ان کا مداوا سوچ سکتے ہوں، ورنہ اکثر سوچنے سمجھنے والے بھی ان گتھیوں کو سلجھانے میں خود ہی الجھ کر رہ جاتے ہیں۔

کھلی آنکھوں سے دیکھیں تو گردوپیش عجیب بلکہ مہیب مناظر ہیں۔ اربابِ حل و عقد لاکھ لوریاں دیں اور ذرائع ابلاغ نظر بندی کے کتنے ہی شعبدے دکھائیں، کون نہیں جانتا کہ ہم من حیث القوم اخلاقی، دینی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی، القصہ ہمہ جہتی انحطاط کا شکار ہیں۔ ہمارے قومی کردار کے بحران نے ہماری اعلیٰ ہی نہیں ادنیٰ قدروں اور اداروں کو بھی ادھیڑ کر رکھ دیا ہے۔ پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے.... لگتا ہے کہ کج فکری، خود غرضی اور بدعنوانی ہمارے ملک کی فضا پر ایسے محیط ہو گئی

ہے جیسے کرۂ ارض پر ہوا کا غلاف ہو۔ سب سے آسان نسخہ یہ ہے کہ اس ساری خرابی کو حکومت کے سر جڑ دیا جائے کہ ع

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردہ تست

لیکن انصاف کا تقاضا ہے کہ بروں بینی ہی نہیں دروں بینی بھی کی جائے۔ یقیناً عوام الناس کی کمزوری سماج اور حکومت کے مشترک اثرات کی شہ زوری کے رحم و کرم پر ہے بایں معنٰی کہ خواہی نخواہی انہی کے رنگ میں وہ اپنے آپ کو رنگ لیتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے عدل و قسط کی میزان جب میدان حشر میں نصب کی جائے گی اس روز اس مقدمے کی کارروائی کا یہ نقشہ قرآن مجید سے آج بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

وَبَرَزُوا لِلّٰهِ جَمِيعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُونَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ قَالُوا لَوْ هَدٰنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيصٍ ○ "اور یہ لوگ جب اکٹھے اللہ کے سامنے بے نقاب ہوں گے تو اس وقت ان میں سے جو دنیا میں کمزور تھے وہ ان لوگوں سے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کہیں گے " دنیا میں ہم تمہارے تابع تھے، اب کیا تم اللہ کے عذاب سے ہم کو بچانے کے لئے بھی کچھ کر سکتے ہو"؟ وہ جواب دیں گے "اگر اللہ نے ہمیں نجات کی کوئی راہ دکھائی ہوتی تو ہم ضرور تمہیں دکھا دیتے۔ اب تو یکساں ہے خواہ ہم جزع فزع کریں یا صبر، بہرحال ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔" (سورہ ابراہیم آیت ۲۱)

چنانچہ اپنے معاشرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ہمیں خرابیوں کی ذمّہ داری متعلقہ فریقوں پر بحساب حصۂ رسدی ہی ڈالنی ہے۔ حاشا و کلّا ہمیں کسی کی توہین و تذلیل مقصود نہیں، ایک دکھے دل سے اٹھتا نوحے کا دھواں ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

سب سے پہلے فرد کے معاملے کو لیجئے۔ بمصداقِ قرآنی...... "وکلھم آتیہ یوم القیامۃ فردا"...... ہم میں سے ہر شخص کو روزِ حشر اپنا اپنا اعمال نامہ لے کر پیش ہونا ہے۔ اہل پاکستان ماسوا ایک چھوٹی سی اقلیت کے، بحمد اللہ مسلمان ہیں۔ نظری طور پر ہم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کلّی اور غیر مشروط اطاعت کے پابند ہیں لیکن کیا ہمارے معمولاتِ زندگی اس پابندی کا کسی بھی درجے میں مظاہرہ کرتے ہیں؟۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق نماز کا قیام کفر اور اسلام کے مابین حد فاصل ہے۔ لیکن بلا تامل اور بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ہزار سجدوں سے آدمی کو نجات دلانے والا یہ ایک سجدہ ہمیں گراں ہی نہیں گذرتا، الاّ ماشاءاللہ، ہماری دن بھر کی مصروفیات سے تقریباً خارج ہے۔ ہم ایک حقیقی اسلامی حکومت کے نہیں تو کم از کم مسلمانوں کی حکومت کے زیر نگیں زندگی گذار رہے ہیں، ہمیں مساجد کو آباد کرنے اور آباد رکھنے میں حکومت کا کوئی قانون، کوئی فرمان مانع نہیں تو پھر آخر کیوں ایسا ہے۔ کہ ع

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

اقامتِ صلوٰۃ من جملہ دیگر امور کے ہمارے معاشرے کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پاکستانی قوم کو زمین کے ایک ٹکڑے پر اقتدار عطا فرمایا تو سب پر فرداً فرداً لازم آیا کہ۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ○ "یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے، اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ (سورہ الحج آیت ۴۱)

سوال یہ ہے کہ پچھلے چالیس سالوں میں ہم میں سے کتنے لوگوں کو ان تقاضوں کا احساس ہوا۔ اور یہ معاملہ محض مشتے نمونہ از خروارے ہے ورنہ دین کے معاملے میں کسی بھی پہلو سے اپنا جائزہ لے لیں،

معلوم ہوگا کہ آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔

بظاہر احوال "اسلام" کے تقاضوں سے ہمارا یہ مجرمانہ تغافل دلوں کے "ایمان" سے خالی ہو جانے کے باعث ہے۔ ہماری متاعِ ایمان پر دن دہاڑے ڈاکہ ڈالنے والا اس زمانے کا سب سے بڑا شرک "مادہ پرستی" ہے 'یہی اس دور کا دجّال ہے۔ جس نے ہمیں مسبّب الاسباب کی بجائے اسباب پر بھروسہ رکھنے اور تکیہ کرنے کا ایسا عادی بنا دیا ہے کہ ؏

چھٹتی نہیں ہے مونہہ کو یہ کافر لگی ہوئی

علماءِ دین... الاّ ماشاءاللہ قوم کے اصل مرض کی تشخیص سے قاصر ہیں' وہ مذہبی شعائر کی فکر میں دُبلے ہوئے جاتے ہیں اور اس میں بھی انہیں زیادہ چتا ان شعائر کی ہے جو ان کے مخصوص مسلک کا نشان بنتے ہیں۔ ایک بڑی دینی جماعت کا سارا زور اسلامی نظام کی مادّی برکات پر ہے نفاذ اسلام کے لئے وہ ایک ایسا راستہ اختیار کئے ہوئے ہے جس میں حصولِ منزل کے امکانات "النسا د کالعدو م" کے حکم میں آتے ہیں اور جس کے طریقِ کار میں بنیادی طور پر مضمر ہے اک صورت خرابی کی... ایک اور عظیم حرکت "ایمان کی محنت" کے عنوان سے نظر آتی ہے لیکن اس محنت کے ثمرات بھی ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں۔ کاش ان مخلص لیکن سادہ دل لوگوں نے حصول ثواب کے آسان اور سستے نسخے تقسیم کرنے اور کمزور روایات کا سہارا لینے کی بجائے قرآن کو اپنی دعوت کا محور و مدار بنایا ہوتا اور سیرتِ مُطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے اپنی تحریک کے مراحل اور اہداف کا تعین کیا ہوتا تو اب تک نتائج کی اچھی خاصی فصل تیار ہوتی۔

الغرض صورت حال تا ایں دم یہ ہے کہ افرادِ قوم دولتِ ایمان سے محروم 'اعمالِ صالحہ سے تہی دامن اور اپنے دینی فرائض کے شعور سے بھی عاری ہیں اور اس پر قیامت یہ کہ ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اصحابِ ثروت مال مست' رجالِ دین حال مست اور غریب غرباء کھال مست ہیں۔ الاّ ماشاءاللہ کسی کو یہ فکر لاحق نہیں کہ ہم تباہی و بربادی کی کس دلدل میں دھنستے چلے جارہے ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

قوم کی فکر کو صحیح نہج پر ڈالنے اور عملی رہنمائی دینے میں ذرائع ابلاغ کا جو حصہ ہے اس کی اہمیت پر زور
بنا تحصیلِ حاصل ہے۔ دورِ جدید میں ان کی تاثیر کی گہرائی دہ چند ہو گئی۔ ابلاغ کے نئے نئے انداز اور
ن کے سائنسی ارتقاء نے زمین کی طنابیں کھینچ کر رکھ دی ہیں۔ فکر و نظر کے نئے زاویئے اور عملی
سائل کے تازہ بتازہ حل آناً فاناً دنیا کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے نشر ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہم
لن ذرائع ابلاغ کی اس یلغار کے آگے کئی پہلوؤں سے عاجز و بے بس ہیں۔ غیروں کے حملوں کا
اع کرنے کی بات کیسے سوچیں جب اپنوں کی طرف سے بھی کچھ کے ملتے ہیں۔ ے

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

۔طرف اپنے ہاں "نظریۂ پاکستان" یعنی اسلام کے لئے تحقیق و تطبیق کا کام نہ ہونے کے برابر ہے
ں سے فکری سطح پر خلاء کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے اور "جائے خالی را دیوی گیرد" دنیا جہان کے باطل
ریات مغربی پریس کے ذریعے ذہنوں کو مسخر کر رہے ہیں۔ الحاد' اباحیت اور تجدد کا سیلاب ہماری
ان اور نوجوان نسل کو بہائے لئے جا رہا ہے۔ دوسری طرف ملکی سطح پر موثر ترین ذریعہ ابلاغ یعنی ٹیلی
ین لٹیا ڈبونے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے...... انتشارِ خیالی اور فسادِ عملی کا جس پیانے پر ٹیلی ویژن سبب
ہ رہا ہے اسے بیان کرنے کے لئے خاصی ہی مضبوط قدرتِ اظہار درکار ہے۔ نام نہاد مذہبی پروگرام
ں خانہ پری کے لئے ہیں اور اس بات کا اہتمام صاف نظر آتا ہے کہ ع

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

سیقی کے نت نئے اسلوب اور انگریزی فلموں کی بھرمار ہماری رہی سہی اخلاقی قدروں کی دھجیاں بکھیر
ں ہیں اور ڈرامے...... العیاذ باللہ بنیادی اسلامی بلکہ مشرقی معاشرت کا تار و پود بکھیرنے میں بے
ں کامیابی حاصل کر ہی چکے ہیں۔ اختلاطِ مرد و زن' نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا آزادانہ میل
ں' اپنے معاملاتِ عشق و محبت کا بے باک اعلان اور اس پر والدین کی خوشنودی' لباس کی بے
ی' انداز کی بے حجابی اور "چادر و چار دیواری" کی پامالی ان کا صرف ایک پہلو ہیں۔ اسلامی بلکہ
ائی پردے کا کیا ذکر خود دوپٹے کی تحقیر کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ اسے کسی چار جماعت پڑھی
دوپٹے رکھنے والی خاتون کے سر پر دکھایا جانا حرام ہے۔ دوپٹہ یا چادر کا استعمال کسی خاتون کے ان

پڑھ ' جاہل ' قلاش یا معاشرے کے ادنیٰ ترین طبقے سے متعلق ہونے کی علامت کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ٹیلی ویژن کے حکومتی ادارے سے کچھ کہنا صدا بصحرا ہے۔ اسی پر بس ہے کہ ۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ریڈیو کا سمعی ذریعۂ ابلاغ بھی حکومت کے انہی کارپردازوں اور دانشوروں کے رحم و کرم پر ہے جن کی "روشنیٔ طبع" ٹیلی ویژن پر گُل کھلا رہی ہے۔ لہٰذا نتیجے کے اعتبار سے یہ "رام ملائی جوڑی" ہے سوائے اس کے کہ بصری سہولت حاصل نہ ہونے کے باعث اس کی ہلاکت آفرینی کو اہل نظر "قیامت کے فتنے سے کم دیکھتے ہیں" ......

ہمارا اصل شکوہ تیسرے اور نسبتاً مصروف طبقات میں زیادہ موثر ذریعۂ ابلاغ یعنی اخبارات و جرائد سے ہے ان میں سے ..... معدودے چند کے استثناء کے ساتھ ..... سب کے سب نجی اداروں اور شخصیات کے اختیار و تصرف میں ہیں۔ ان میں سے اکثر کے ذریعے ہماری اقدار کی کھال جیسے ادھیڑی جا رہی ہے وہ گفتنی سے زیادہ دیدنی ہے ان سے بہ حد ادب اور بصد خلوص و اخلاص ہماری گذارش ہے کہ خدارا اپنے کاروباری مفادات پر دین و مذہب کے رہے سہے بھرم کو قربان نہ ہونے دیجئے آپ تو آزاد روی اور بے حیائی پھیلانے کے معاملے میں ٹیلی ویژن کے بھی کان کتر رہے ہیں۔ آپ کے صفحات کا اگلا ہوا زہر تو دنوں ' ہفتوں ' مہینوں خورد و کلاں کی رگوں میں سرائت کرتا رہتا ہے۔ غضب خدا کا ' اپنی ایسی ہمہ گیر باخبری کے باوجود آپ کو احساس نہیں ہوتا کہ ملک و قوم کے سر پر خطرات کے کیسے کیسے بادل منڈلا رہے ہیں۔ کیا ان خطرات کے مقابلے کے لئے اہل وطن کو ایسے ہی تیار کیا جاتا ہے؟۔

راقم الحروف کو مشرق بعید سے لے کر مغرب بعید تک متعدد خوشحال و ترقی یافتہ ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ ماہناموں اور ہفت روزوں کا تو ذکر نہیں البتہ روزناموں کے بارے میں وہ پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ایسے رنگ برنگے اور چھیل چھبیلے اخبارات صرف پاکستان میں پائے جاتے ہیں جو روزانہ چار بڑے صفحات پر رنگوں کی قوس و قزح بکھیرتے ہوں اور کوئی دن جاتا ہو

ہ لڑکیوں اور خواتین کی دلکش و چیدہ تصویریں ان صفحات کو مزین نہ کریں مخصوص یادگاری
یشن بزرگانِ دین اور شعائرِ دینی کے بارے میں بھی شائع ہوتے ہیں لیکن "اساطیر الاولین" اور
تبرک" کے طور پر ورنہ قابلِ رشک اور لائقِ اتباع تو ان حضرات و خواتین کی زندگیاں ہیں جن کے
انح معمولات کی تفصیل، پسند و ناپسند کے معیار اور مختلف زاویوں سے جاذبِ نظر رنگین تصاویر کے
تھ شائع کی جاتی ہیں جو فنونِ لطیفہ و شریفہ کے میدان میں نظریۂ پاکستان کے بالمقابل صف آراء
ں.... ہماری نئی نسل کے ناپختہ ذہنوں پر اس طرح جو نقوش ثبت کئے جا رہے ہیں ان کی موجودگی میں
ویش کی یہ صدا کون سنے گا کہ ۔

آ تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

ارتی صفحات پر ہر طرح کے رطب و یابس کو جگہ دی جا رہی ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی
است ہے لیکن ہر کہ و مہ کو اذنِ عام ہے کہ جو جی میں آئے لکھ دے۔ اپنی ڈفلی اپنا راگ
... "دانشوروں" کو اجازت ہے کہ برسرِ عام نظریۂ پاکستان میں نقب لگائیں اور پذیرائی انہی کی
ارشات کی ہوتی ہے۔ دوسری طرف کی بات سامنے لائی ضرور جاتی ہے لیکن نسبت و تناسب کے
بار سے پلڑا اوّل الذکر کی طرف ہی جھکتا ہے..... ہم مالکان و مدیرانِ اخبارات و جرائد سے نصح و خیر
اہی کے عمیق جذبے کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ اپنی روش پر غور فرمائیں۔ وہ اپنے ہم وطنوں کی
رت و کردار کی تعمیر میں بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ انہیں بہت سوچ سمجھ کر اب ایسا طرزِ عمل
تیار کرنا چاہئے کہ رفتہ رفتہ ان کے قارئین کا مذاق بدلے ورنہ اس ذہنی و اخلاقی "تخریب کاری"
کے جو ہولناک نتائج نوشتۂ دیوار ہیں ان کی ذمہ داری میں وہ برابر کے شریک ہوں گے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اس دفعہ بجٹ کے اعلان اور "بجٹ آیا، بجٹ آیا، دوڑنا" کی ہاہا کار کے بعد اس میں ترمیم اور
سلاحی تجاویز و اقدامات سے قومی کردار کا وہ دیوالیہ پن خاصا ہی الم نشرح ہوا جس کا رونا ہم رو رہے
ہیں۔ بجٹ اور ترامیم کے حسن و قبح پر تبصرہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں محض چند جھلکیاں دکھانا
مقصود ہے۔

☆...... بجٹ تجاویز کے حد درجہ اخفاء کے باوجود تقریباً پوری کی پوری بات اخبارات تک میں شائع ہو گئی اور متاثر ہونے والی اشیاءِ صرف بازار سے غائب ہو گئیں۔

☆...... بجٹ کے اعلان کے ساتھ ہی متاثرہ اشیائے صرف کے مونہہ مانگے دام وصول کئے گئے جو اضافی ٹیکسوں سے بھی زیادہ تھے۔

☆...... اضافی ٹیکسوں سے زیر بار آنے والے لوگ بنیانِ مرصوص بن کر سڑکوں پر نکل آئے (کاش اس طرح کا کوئی مظاہرہ ہماری مسلمان قوم نے کبھی کسی منکر کے خلاف بھی کیا ہوتا' کہ نہی عن المنکر جس کے ایمان کے لوازم میں سے ہے)

☆...... حکومتی اخراجات میں کمی اور سادگی کا ڈھنڈورا ایسے پیٹا گیا کہ اچھے اچھوں کے کان پک گئے لیکن اس مہم کا حاصل کیا ہو گا اس کے بارے میں اندازے بہت مخدوش ہیں۔

☆...... عوامی نمائندوں نے بھی اپنے طور پر اخراجات میں کمی اور سادگی کا بھرپور "مظاہرہ" کیا۔ پنجاب اسمبلی میں حزب اقتدار کی ایک نمایاں خاتون رکن کا فوٹو اس حال میں اخبار میں شائع ہوا کہ اجلاس میں شرکت کے لئے رکشا پر سوار ہو رہی ہیں لیکن اگلے ہی روز اسی اخبار نے خبر دی کہ وہی محترم خاتون آج "مرسڈیز" میں سوار ہو کر اسمبلی پہنچی ہیں۔

☆...... بجٹ کے خسارے کو کم کرنے کے لئے ٹیکس گذاروں کی دُم میں مروڑنے کا اعلان کیا گیا اور کہا گیا ہے کہ اس کے لئے رشوت کے دروازے بند کرنے ضروری ہیں کہ اہل غرض اسی ذریعے سے سرکاری واجبات بچاتے ہیں۔ چنانچہ ٹیکس چوروں کے علاوہ محاصل وصول کرنے والے سرکاری کارندوں کے لئے بھی رشوت اور بدعنوانی پر کڑی سزاؤں کی وعید سنائی جارہی ہے اور اس سلسلے میں عنقریب قوانین میں ضروری ترامیم کرنے کی کارروائی کا آغاز کیا جائے گا۔

یہ سب باتیں کس بات کی غمازی کرتی ہیں۔ تاجروں اور دکانداروں کا اخلاقی افلاس' ٹیکس دہندگان کے لئے واجبات کی ادائیگی سے بچنے کے لئے آسان راستوں کا کھلا ہونا' سرکاری کارندوں کی حد سے بڑھی ہوئی ہوسِ جلبِ زر' حکومتی اداروں کی شاہ خرچی اور ریاکاری اور عوام النّاس کا یہ تاثر کہ ان کی جیبوں سے نکلے ہوئے ٹیکس اللّے تلّلوں میں اڑا دیئے جاتے ہیں۔ یہ سب ایک مزمن مرض کی وہ علامات ہیں جو دنوں کے نہیں سالوں کے منفی اثرات کا مظہر ہیں اور عقوبت کو شدید کرنے سے
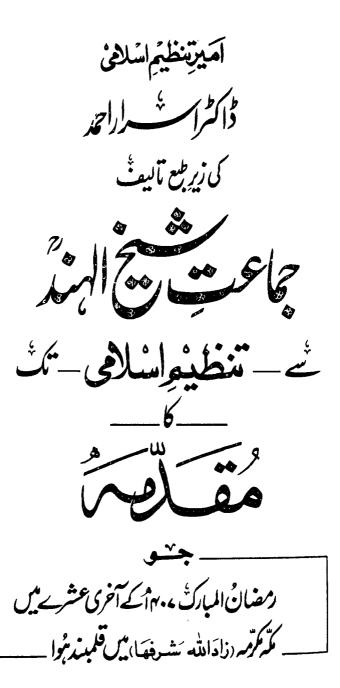
باقی صفحے پر

امیرِ تنظیمِ اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی زیرِ طبع تالیف

جماعتِ شیخ الہند

سے — تنظیمِ اسلامی — تک

کا

مقدمہ

جو

رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ کے آخری عشرے میں

مکہ مکرمہ (زادا اللہ شرفہا) میں قلمبند ہُوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیرِ نظر کتاب راقم الحروف کی چند تحریروں اور تقریروں کا مجموعہ ہے جو ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران اکثر و بیشتر ماہنامہ 'میثاق' اور بعض مجلہ 'حکمت قرآن' میں شائع ہوئیں۔

ان کی وہ قدر مشترک 'جو ان کی کتابی صورت میں تالیف کا سبب بنی' یہ ہے کہ ان میں علماء کرام بالخصوص منتسبین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمتہ اللہ علیہ سے خطاب اور عرض و معروض بھی ہے۔

اور ان میں سے بعض حضرات کے اعتراضات کا جواب اور شکوک و شبہات کا ازالہ بھی۔

.... ○ ....

یہ بحث دو اسباب سے شروع ہوئی:

ایک یہ کہ راقم نے اپنی ایک پرانی تحریر جو "میثاق" کی ستمبر و اکتوبر ۷۵ء کی مشترک اشاعت میں "مولانا ابو الکلام آزاد 'جمعیت علماء ہند' اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی بطور 'قندِ مکرر' جنوری ۸۴ء کے پرچے میں دوبارہ شائع کر دی۔

جس پر طنز و طعن سے بھرے ہوئے دو خطوط کہروڑپکا (ضلع ملتان) کے مولانا اللہ بخش ملکانوی صاحب کے موصول ہوئے جن میں متحدیانہ انداز کے سوالات بھی تھے۔

میں 'اپنی دعوت و تحریک کی مصلحتوں کے پیشِ نظر' طعن و طنز سے صرف نظر کرتے ہوئے ازالہ شبہات کی موزوں اور مناسب صورت کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ان کی ایک تیز و تند تحریر ماہنامہ 'الخیر' ملتان میں بھی شائع ہو گئی۔

جس کے نتیجے میں، مجبوراً راقم کو بھی وضاحتی جواب "میثاق" میں شائع کرنا پڑا۔

.... (اس ضمن میں راقم نے خود بھی "میثاق" میں مولانا ملکانوی کے دونوں خطوط اور "الخیر" میں شائع شدہ تحریر شائع کر کے جوابی گذارشات پیش کی تھیں اور علماء کرام سے متوقع اخلاق عالیہ اور صحافتی و تصنیفی روایات کے پیش نظر معاصر 'الخیر' سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ بھی میری وضاحتی گذارشات کو اپنے موقر مجلے

— میں شائع فرمادیں..... یا کم از کم ہمیں اپنے قارئین کے پتے فراہم کر دیں تاکہ ہم ان کی خدمت میں 'میثاق' کا وہ شمارہ ارسال کر سکیں.. لیکن ع "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!")

............○..... ......

( ) دوسرے و یہ کہ ان ہی دنوں لاہور میں ایک ایسی نوجوان شخصیت ابھر کر سامنے آئی جس نے مولانا امین احسن اصلاحی کو اپنا 'استاذ' قرار دے کر 'حدرجم کے ضمن میں جہاں مولانا اصلاحی کی رائے کی انتہا ہوئی تھی وہاں سے آغاز فرماتے ہوئے شریعت اسلامی کے پورے ڈھانچے کو درہم برہم اور تہہ وبالا کرنے کا بیڑا اٹھالیا۔

( ) اور چونکہ یہ نوجوان زبان و قلم کی استعدادات سے بخوبی مسلح تھا' لہٰذا دیکھتے ہی دیکھتے لاہور کے دین پسند نوجوانوں میں اس کا ایک حلقۂ اثر پیدا ہو گیا۔

جہاں تک مولانا اصلاحی کا تعلق ہے' رجم کے ضمن میں ان کی عظیم غلطی اور بعض دوسرے معاملات میں ان کے شذوذ کے ساتھ ساتھ ان کی دینی و علمی خدمات بھی نہایت شاندار ہیں جن کا انکار ممکن نہیں'

جن میں سرفہرست تو بلاشبہ خدمتِ قرآن کے ضمن میں ان کی عمر بھر کی مساعی ہیں جن کے ذریعے انہوں نے نظمِ قرآن' اسالیبِ قرآن' اور تفسیر القرآن بالقرآن کے ضمن میں اپنے استاذ و امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کے کام کو آگے بڑھایا'

پھر اسی پر بس نہیں'

( ) انہوں نے شریعتِ اسلامی کے بعض اہم مسائل' بالخصوص عائلی قوانین کے ضمن میں مغربی رجحانات کی مذمت و مخالفت اور احکامِ شرعی کی حفاظت و مدافعت کے سلسلے میں جو مؤثر خدمات سرانجام دیں ان کا لوہا ہر شخص مانتا ہے۔

چنانچہ' اس کے باوجود کہ بعض دوسرے حوادث و واقعات کی بنا پر مولانا سے راقم الحروف کا ملنا جلنا ۱۹۶۷ء سے بند تھا'

( ) اور 'حدّ رجم' کے بارے میں ان کی رائے کی بنا پر تو راقم نے ۱۹۸۲ء میں ان کی جملہ تصانیف کا حقِ اشاعت بھی انہیں واپس کر دیا تھا اور ان سے اپنے تعلق کے کامل انقطاع کا اعلان عام بھی کر دیا تھا' (شائع شدہ 'حکمت قرآن' بابت جولائی و اگست ۸۲ء)

( ) تاہم............ راقم کو یہ اندیشہ نہیں تھا کہ مولانا کی اس غلطی کی بنیاد پر کوئی فتنہ کھڑا ہو سکتا ہے۔

—

○ لیکن...... متذکرہ بالا نوجوان کے طرزِ عمل سے راقم کو یہ تنبّہ ہوا کہ ایک عظیم فتنہ شروع ہوا چاہتا ہے جس کی سرکوبی "گربہ کشتن روزِ اول" کے مصداق ابتداء ہی میں لازمی ہے۔
○ چنانچہ راقم نے اپنی بساط کی حد تک اس کی کوشش کی۔
○ اور الحمدللہ کہ اس کے خاطر خواہ نتائج بھی بر آمد ہوئے۔

(اس معاملے میں راقم کے احساسات کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس نوجوان کے ساتھ ربط ضبط بڑھانے اور اس کے ساتھ ایک تنظیمی سلسلے میں منسلک ہو جانے کی بنا پر راقم نے اپنے ایک دیرینہ سرپرست اور تنظیمِ اسلامی کے حلقۂ مستشارین میں شامل شخصیت مولانا سید وصی مظہر ندوی سے بھی قطع تعلق کر لیا۔)

○ اس کے ساتھ ہی راقم کو یہ احساس بھی ہوا کہ ماضی قریب میں قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکوں سے اسی طرح فتنے جنم لیتے رہے ہیں۔
اور غالباً یہی سبب ہے کہ ع "سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا!" ...... کے مصداق علماءِ کرام خدمتِ دین کی نئی تحریکوں اور بالخصوص قرآن کے نام پر اٹھنے والی دعوتوں کے بارے میں "اندیشہ ہائے دور و دراز" میں مبتلا ہو جاتے ہیں!
○ اس ضمن میں یہ عملی مسئلہ بھی راقم کے سامنے آن کھڑا ہوا کہ اس صورتِ حال کا سدّباب کیسے کیا جا سکتا ہے........... اور
خود راقم الحروف اور اس کی دعوت و تحریک کو اس انجام بد سے بچنے کے لئے کیا اقدامات کرنے چاہئیں اور کونسی احتیاطیں ملحوظ رکھنی چاہئیں؟

○ چنانچہ رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ کے جمعۃ الوداع میں راقم نے اس موضوع پر ایک مفصّل تقریر کی جو 'میثاق' بابت ستمبر ۸۴ء میں شائع ہوئی۔
○ اس پر جہاں بعض اکابر کا بحیثیت مجموعی موافق و تائیدی ردّ عمل سامنے آیا' جیسے:
○ .... مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم و مغفور' سابق صدر شعبۂ معارف اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ' و سابق صدر شیخ الہندؒ اکیڈمی' دیوبند'
○ .... مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ' مہتمم و شیخ التفسیر' جامعہ رحیمیہ' دہلی..... اور
○ .... مولانا سید حامد میاں مدظلہ' مہتمم و شیخ الحدیث' جامعہ مدنیہ' لاہور۔
○ وہاں معاصر 'الخیر' ملتان اور 'بیّنات' کراچی نے مخالفانہ مہم بھی شروع کر دی۔

جس پر ردّ و قدح اور قال و اقول کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

○ جو ان حضرات کی جانب سے تو تا حال جاری ہے، البتہ راقم نے ۸۵ ۔ ۱۹۸۴ء میں ضروری وضاحتوں کے بعد اپنی جانب سے بحث منقطع کر دی تھی۔

تاہم .... اب لگ بھگ دو سال بعد اس 'مقدمہ' کا پورا ریکارڈ علماء کرام، بالخصوص منتسبین حضرت شیخ الہند ؒ کی خدمت میں فوری حوالے کے لئے یکجا صورت میں حاضر ہے۔

تاکہ .... وہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فریضہ علیٰ وجہ البصیرت ادا فرما سکیں .....

اور

○ اگرچہ ہمیں شدّت کے ساتھ احساس ہے کہ علماءِ حق اس کے محتاج نہیں،

○ تاہم " کَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ " کے مصداق اس گزارش میں مضائقہ بھی نہیں، کہ وہ ...... تنظیم اسلامی ...... اور اس کے داعی و مؤسّس کے بارے میں رائے قائم فرماتے ہوئے حسبِ ذیل قرآنی ہدایات کو ملحوظِ خاطر رکھیں

○ " وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا "

○ " كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ "

" كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۚ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى "

---(۲)---

○ 'تنظیم اسلامی' کی تاسیس بالفعل تو مارچ ۱۹۷۵ء میں ہوئی تھی۔

○ لیکن اس کے قیام کے فیصلے کا اعلان راقم الحروف نے جولائی ۱۹۷۴ء میں مسلم ہائی اسکول لاہور میں منعقدہ اکیس روزہ قرآنی تربیت گاہ کے آخری دن اپنی اختتامی تقریر میں کیا تھا۔ (یہ تقریر فی الوقت تو 'سرافگندیم' کے نام سے کتابی صورت میں موجود ہے البتہ آئندہ اس کا عنوان 'عزمِ تنظیم' ہو گا)

○ یادش بخیر، اس تربیت گاہ کی افتتاحی تقریب کے مہمان خصوصی شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری ؒ کے فرزند ارجمند و خلف الرشید مولانا عبید اللہ انور ؒ تھے۔

.... (اس تقریب کا یہ واقعہ بھی ریکارڈ پر آ جائے تو اچھا ہے کہ جب راقم نے اپنے استقبالی سپاسنامے میں مولانا موصوف ؒ سے بصد ادب و احترام یہ شکوہ کیا کہ آپ

برادر بزرگ مولانا حبیب اللہؒ کے حجاز ہجرت کر جانے اور برادر خورد مولانا حمید اللہؒ کے انتقال فرما جانے کے بعد سے جامع مسجد شیرانوالہ میں درس قرآن کا سلسلہ بند ہے تو انہوں نے پورے کھلے دل کے ساتھ اور نہایت بر ملا الفاظ میں اعتراف تقصیر فرمایا اور خود راقم الحروف کے بارے میں اقبال کا یہ مصرعہ پڑھتے ہوئے کہ ع "پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے" اس اطمینان کا اظہار فرمایا کہ بحمد اللہ خدمتِ قرآن کا یہ سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔)

- باز آمدم بر سر مطلب......... اس کے بعد 'میثاق' کی اکتوبر، نومبر ۱۹۷۴ء کی مشترک اشاعت میں راقم کی ایک طویل تحریر شائع ہوئی جس کا اصل مقصد یہ تھا کہ 'تنظیم اسلامی' کے عنوان سے دین کی جس خدمت کا بیڑا اٹھانا مقصود ہے امتِ مسلم کی چودہ سو سالہ تاریخ کے پس منظر اور معاصر دینی تحریکوں اور تنظیموں کے تناظر میں اس کا موقف و مقام کیا ہے۔ (یہ تحریر بھی متذکرہ بالا کتاب میں بطور مقدمہ شامل ہے!)
- چنانچہ اپنی اس تحریر میں راقم نے امت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کے دوران عروج اور زوال کے مختلف ادوار کا مختصر جائزہ بھی پیش کیا......
اور "موجودہ ہمہ جہتی احیائی عمل" اور اس میں شامل تحریکوں اور تنظیموں کے بارے میں اپنی رائے بھی پیش کی۔
- راقم کے نزدیک اس "ہمہ جہتی احیائی عمل" کے تین نمایاں منفرد اور ممتاز گوشے ہیں :
- .... ایکؔ، خالص قومی و ملی تحریکیں جن کا اصل موضوع ہے جہاد حرّیت و استخلاص دیار مسلمین، یعنی مسلم ممالک کی سیاسی غلامی کا خاتمہ اور آزادی کا حصول۔
- .... دوسرےؔ؛ علماءِ کرام کی مساعی جن کا اصل ہدف ہے تصحیح عقائد و اعمال، تعلیم کتاب و سنّت، حفاظتِ دین و شریعت...... اور باطل فرقوں کا ابطال اور جدید فتنوں کا استیصال۔
- .... تیسرےؔ؛ مثبت احیائی و تجدیدی مساعی جن کا معیّن مقصود ہے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق، بالفاظ دیگر اللہ کی زمین پر اللہ کی حکومت کا قیام!
- اور یہ تینوں گوشے مل جل کر، اور یہ جملہ مساعی بحیثیتِ مجموعی تسلسل ہیں امّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ کے 'الفِ ثانی' (یعنی دوسرے ہزار

سال) کی تجدیدی مساعی کے سنہری سلسلے کا!

○ راقم کے نزدیک 'برِ عظیم پاک و ہند کی بیسویں صدی عیسوی کی مسلمان تحریکوں میں سے 'تحریک پاکستان' گوشۂ اوّل سے تعلق رکھتی ہے' جبکہ علماءِ کرام کی جملہ جمعیتیں 'اور ادارے اور بالخصوص تبلیغی جماعت کا تعلق دوسرے گوشے سے ہے' جبکہ تیسرے سلسلے کے داعیٔ اوّل کی حیثیت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کو حاصل ہے!

............○............

○ 'الف ثانی' کے تجدیدی کارنامے کا نقطۂ آغاز اور گیارہویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم تو بلاشک و شبہ شیخ احمد سرہندیؒ ہیں... لیکن ان کے ہم عصر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی علمی خدمات بھی یقیناً قابلِ تحسین ہیں۔

○ اسی طرح بارہویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم تو بلاشائبہ ریب و شک امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں لیکن شیخ نجد محمد ابن عبدالوہابؒ کی اصلاحی کوششیں بھی یقیناً قابلِ تعریف ہیں۔

○ اسی طرح تیرہویں صدی ہجری کے اصل مجدّد تو مجاہد کبیر سید احمد بریلویؒ ہیں' تاہم ان کے نائب و معاون شاہ اسماعیل شہیدؒ بھی ان کے ساتھ برابر کے شریک اور سہیم ہیں!

○ چودھویں صدی ہجری کے بارے میں راقم کا یہ گمان رفتہ رفتہ یقین کے درجے تک پہنچ گیا ہے کہ اس کے مجدّدِ وحید حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ ہیں... (اگرچہ بعض دوسرے اصحاب دعوت و عزیمت کے علاوہ ایک ع "برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است" کی سچی تصویر اور ع "اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند" کا مصداقِ اتم اور ڈاڑھی منڈا عاشق احمد مرسلؐ و پروانۂ احمد سرہندیؒ یعنی علامہ اقبال مرحوم و مغفور کی مساعی بھی حد درجہ دُور رس اور ازبس نتیجہ خیز ہیں!)

............○............

○ عجیب بات ہے کہ اپنے انتقال کے قریب حضرت شیخ الہندؒ نے 'خرقۂ خلافت' عطا فرما دیا ایک ایسے شخص کو جو نہ صرف یہ کہ نہ ان کے تلامذہ میں سے تھا' نہ حلقۂ دیوبند سے تعلق رکھتا تھا' بلکہ عُلماء کے دیگر معروف حلقوں اور سلسلوں میں سے بھی کسی سے منسلک نہ تھا۔

- حتیٰ کہ علماء کی سی وضع قطع بھی نہ رکھتا تھا بلکہ بقول خود "گلیم زہد اور ردائے رندی" دونوں کو بیک وقت زیب تن کرنے کے "جرم" کا مرتکب تھا......
اور عجیب اتفاق ہے کہ اس کا نام بھی احمد ہی تھا' اگرچہ وہ مشہور یا اپنی کنیت سے ہوا یا تخلص سے یعنی "ابوالکلام آزاد"

- **یہ ہمارے ماضیٔ قریب کی تاریخ کا نہایت اہم واقعہ ہے جس پر معاصرانہ چشمک نے انتہائی دبیز پردہ ڈال دیا ہے!**

- لیکن ۔ "ہزار خدا کہ عارف و سالک بہ کس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید!"
کے مصداق اس 'راز' کی بھنک پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کی زبانی راقم الحروف کے کان میں پڑ گئی۔

- اگرچہ ان کی بیان کردہ روایت میں زمانی و مکانی ہر نوع کے سقم تھے۔
تاہم یہی سقم تحقیق و تفتیش کا سبب بن گئے۔

- اور اس طرح مسلم انڈیا کی ماضیٔ قریب کی تاریخ کا ایک اہم لیکن گم شدہ باب روشنی میں آ گیا۔

- اور اس تحقیق و تفتیش کے اضافی ثمرے کے طور پر' راقم الحروف پر حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت بہ تمام و کمال منکشف ہو گئی۔

- فَلِلّٰہِ الحمد!

- بہر حال اب اس بات کے سامنے آ جانے کے بعد ہر اس شخص پر جو حضرت شیخ الہندؒ سے کسی بھی درجہ میں قلبی تعلق یا نسبتِ عقیدت رکھتا ہو لازم ہے کہ وہ:
.... اولاً اس واقعہ کی اپنے طور پر مزید تحقیق کرے اور اگر اسے درست پائے تو

- .... پھر غور کرے کہ اس کے کیا نتائج بر آمد ہوتے ہیں؟ انشاء اللہ العزیز' اس سے اس کے فکر و نظر کو جلا اور قلب و ذہن کو وسعت حاصل ہو گی اور امتِ مسلمہ بالخصوص مسلمانان برِ عظیم پاک و ہند کے موجودہ ظروف و احوال اور ان کے تاریخی پس منظر کے بارے میں گہری بصیرت حاصل ہو جائے گی۔

.... ○ ....

- مولانا ابوالکلام آزاد کا سن پیدائش ۱۸۸۸ء ہے۔
- ۱۹۱۲ء میں چوبیس برس کی عمر میں انہوں نے 'الہلال' جاری کیا۔
- 'الہلال' کے مضامین کا نقطہ ماسکہ' جسے اس کی علامت و عنوان قرار دیا جاسکتا ہے
- 'دعوت رجوع الی القرآن' تھا!
- اس کی دعوت کا دوسرا اہم نکتہ تھا جہاد و قتال فی سبیل اللہ...... اور اس کی تمہید کے طور پر 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر'!
- ابوالکلام کی اس دعوت کی توثیق و تصویب اور تعریف و تحسین حضرت شیخ الہندؒ نے ان الفاظ کے ذریعے فرمائی کہ "اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے!" (راقم الحروف کو حضرت شیخ الہندؒ کے اس مشہور قول کی سند مولانا محمد یوسف بنوریؒ سے بالمشافہ حاصل ہو گئی تھی!)
- ۱۹۱۳ء میں مولانا آزاد نے ایکٹ جانب قرآن کے مبلّغ و معلّم تیار کرنے کے لئے کلکتہ میں 'دارالارشاد' قائم کیا' اور دوسری جانب اقامتِ دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے
- لئے 'حزب اللہ' قائم کی جس کی اساس 'بیعت' پر استوار کی!
- ۱۹۱۵ء میں انہوں نے خود (گویا اپنے جملہ مبایعین سمیت) حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت کر لی!
- اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم کے قول کے مطابق اسی سال حضرت شیخ الہندؒ نے ان کے بارے میں اپنے جذبات اس شعر کے ذریعے ظاہر فرمائے کہ ؎

کامل اس طبقۂ زہّاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے!

- مولانا موصوف پیدائشی طور پر حد درجہ ذہین و فطین بلکہ نابغۂ عصر تو تھے ہی۔
- اس پر مستزاد' انہیں متعدد مسلمان ممالک کے حالات کا بچشم سر مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تھا۔
- مزید برآں' انہوں نے مغربی فکر و فلسفہ...... اور خاص طور پر سیاسیات و عمرانیات جدیدہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔
- چنانچہ انہیں خوب معلوم تھا کہ:
- .... فی الوقت برِ عظیم پاک و ہند میں کسی عسکری تحریک کا کوئی امکان نہیں!
- .... کسی دوسرے مسلمان ملک سے مدد کا بھی کوئی سوال نہیں' گویا اب کوئی احمد شاہ ابدالی مسلمانانِ ہند کی مدد کے لئے نہیں آسکتا!

- ....بلکہ اب ''استخلاصِ وطن'' کی جدوجہد ہو یا غلبۂ اسلام اور اقامتِ دین کی سعی، تمام کام خالص مقامی لیکن عوامی تحریکوں کے ذریعے ہی ہو سکیں گے!
- لہٰذا' ان کا مشورہ یہ تھا کہ حضرت شیخ الہند'' ہندوستان ہی میں رہ کر عوامی تحریک برپا کریں۔
- لیکن افسوس کہ اس وقت حضرت شیخ الہند'' نے اپنے ان مشیروں کی رائے پر عمل کیا جو دینی علم میں تو بہت دسترس رکھتے تھے لیکن ان کا ہاتھ حالاتِ جدیدہ کی نبض پر نہ تھا!
- اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ:
- اُدھر بیرون ہند نام نہاد مسلمان امراء و سلاطین نے غدّاری کی اور ایک طرف شریف حسین والیٔ مکّہ نے حضرت شیخ الہند'' کو گرفتار کر کے گویا چاندی کی طشتری میں سجا کر انگریزوں کے سامنے پیش کر دیا جنہوں نے انہیں ہندوستان کی کسی جیل میں نہیں بلکہ مالٹا میں نظر بند کیا!

....(راقم کے نزدیک علامہ اقبال مرحوم کا یہ شعر بہ تمام و کمال صادق آتا ہے حضرت شیخ الہند'' کی مالٹا کی اسیری پر کہ

ع ''اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو!''

- یہی سلوک افغانستان میں امیر کابل کے ہاتھوں حضرت شیخ الہند'' کے سفیر اور معتمد خصوصی مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے ساتھ ہونے والا تھا کہ انہیں بروقت اطلاع مل گئی اور وہ روس کی جانب فرار ہو گئے!
- ادھر اندرون ملک ریشمی رومالوں کے راز کے افشاء پر علماءِ کرام اور خادمانِ دینِ متین نے تو ع ''من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را!'' کے مصداق پکڑ دھکڑ' قید و بند اور تعذیب و ابتلا کے نئے باب رقم کئے لیکن چونکہ ملک میں کوئی عوامی تحریک موجود نہ تھی لہٰذا نہ زمین پر کوئی ہل چل برپا ہوئی نہ فضاء میں کوئی ارتعاش پیدا ہوا!
- ۱۹۲۰ء میں حضرتِ شیخ الہندؒ اسیری سے رہائی پا کر وارد ہند ہوئے تو انہوں نے کمالِ ضعف و نقاہت اور شدّتِ مرض و علالت کے باوجود چھ ماہ کے مختصر سے عرصے میں تین اہم کام سرانجام دیئے:
- .... ایکؔ: اپنے تلامذہ اور مسترشدین کو ہدایت کہ اپنی تمام تر توجّہات کو خدمتِ قرآن پر مرکوز کر دیں۔ جس کا مظہر اتم آپ'' کا خطبۂ دیوبند ہے! (بروایت حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ)

○ .... دوسرے، قدیم اور جدید تعلیم..... اور قومی و ملی اور دینی و مذہبی تحریکوں کے مابین فصل و بعد کو کم کرنے کی کوشش..... جس کا سب سے بڑا مظہر آپ" کا سفر علی گڑھ اور تاسیس جامعہ ملیہ ہے!

○ تیسرے، علمِ جہاد بلند کرنے کے لئے ایک عوامی تحریک کے آغاز کے لئے کسی صاحبِ دعوت و عزیمت اور حامل فہم و بصیرت بالخصوص موجودہ زمانے کے سیاسی و عمرانی ظروف و احوال سے کماحقہٗ واقف شخص کے ہاتھ پر بیعت کی تجویز اور اس کے لئے مولانا ابو الکلام آزاد کی تعیین!..... جس کے ضمن میں حضرت شیخ الہند" کے اضطرار و اصرار کا مظہر ان کا یہ قول ہے کہ "میری چارپائی سٹیج پر لے جائی جائے تاکہ میں خود بیعت کر لوں، اس لئے کہ میں دنیا سے بغیر بیعت کیے رخصت ہونا نہیں چاہتا" (روایت بالمعنیٰ)

○ تو......... اگرچہ اصلاً مشیت خداوندی اور ظاہراً بعض علماء کی جانب سے فوری طور پر اختلاف اور بعد ازاں باقاعدہ مخالفت کی بناء پر شیخ الہند" کی یہ تجویز ناکام ہو گئی۔

○ تاہم.......... یہ ثابت ہو گیا کہ جہاں علم و فضل اور تقویٰ و تدین کے میدان میں حضرت شیخ الہند کی جانشینی کا شرف حاصل ہے مولانا حسین احمد مدنی"، مولانا انور شاہ کاشمیری" اور مولانا شبیر احمد عثمانی" وغیرہم کو.......... وہاں دعوت و تحریک کے میدان میں حضرت شیخ الہند" کے اصل خلیفۂ مجاز تھے مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم و مغفور!

............○............

○ جہاں تک مولانا آزاد کی ۲۱۔ ۱۹۲۰ء کے بعد کی زندگی کا تعلق ہے تو اگرچہ وہ اصلاً راقم کا موضوع نہیں ہے۔

○ تاہم دلائل و شواہد سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ:

○ علماءِ کرام کی عمومی مخالفت..... جس کا آغاز تو بعض غیر دیوبندی علماء کی جانب سے ہوا تھا لیکن بعد ازاں اس میں بہت سے دیوبندی علماء حتیٰ کہ حضرت شیخ الہند" کے بعض تلامذہ بھی شامل ہو گئے تھے۔ .... سے بددل ہو کر انہوں نے 'بیعت' کی ٹھیٹھ شرعی اساس پر ایک خالص دینی تحریک کا خیال دل سے نکال دیا۔

○ اور اگرچہ اپنی روایتی وضعداری کے تحت انہوں نے جمعیت علماء کے جلسوں میں اکثر و بیشتر خاموش سامع و ناظر کی حیثیت سے شرکت جاری رکھی تاہم اپنے اصل میدان عمل کے اعتبار سے انہوں نے:

○ اولاً............ تحریکِ خلافت کے ذریعے ایک ملّی جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔
اور اس کے بعد مستقل طور پر جہادِ حریّت و استخلاصِ وطن کو اپنا اصل موضوع بنا کر
انڈین نیشنل کانگرس کے پلیٹ فارم کو اختیار کر لیا۔

○ جس پر وہ ع "وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے!" کی سی شان کے ساتھ
آخر دم تک قائم رہے!

. . (اس ضمن میں بطور تحدیث نعمت ایک واقعہ کا ذکر مناسب ہے۔ آج
سے لگ بھگ چار سال قبل زندگی میں پہلی بار حیدر آباد دکن جانا ہوا تو وہاں درسِ قرآن
اور خطاباتِ عام کی بیسیوں مجالس کے علاوہ ایک خطاب "مولانا ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ"
میں منعقدہ جلسے میں بھی ہوا جس میں وہاں کے احباب کے بقول حیدر آباد کے تمام
مسلمان اربابِ فکر و نظر اور اصحابِ علم و دانش جمع تھے۔ اس موقع پر جب راقم نے یہ نکتہ
بیان کیا کہ "مولانا آزاد مرحوم کی زندگی کے دو دور بالکل مختلف اور متمائز تھے ایک
۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۰ء تک کا دور جو اصلاً تسلسل تھا تحریکِ شہیدین" کا اور دوسرا
۱۹۲۱ء کے بعد کا دور جو حقیقتاً تعلق رکھتا تھا ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے!" تو ایک
جانب تو صدرِ جلسہ نے جو پرانے کانگرسی رہنما اور تحریکِ آزادی کے صفِ اوّل کے
کارکنوں میں سے تھے۔ اور آزادی کے بعد بھارت کے متعدد صوبوں کے گورنر رہ چکے
تھے اور اب ضعیف و نحیف ہی نہیں علیل و صاحبِ فراش بھی ہیں، بڑے رقّت آمیز
انداز اور بھرّائی ہوئی آواز میں فرمایا۔ "مولانا! آپ نے تو بہت سی پرانی یادیں تازہ کر
دیں اور پرانے زخموں کو ہرا کر دیا!" . . .اور دوسری جانب ایک صاحب نے جو عثمانیہ
یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات کی صدارت سے ریٹائر ہوئے تھے، فرمایا کہ "میں نے
درجنوں طلبہ کو تحریکِ آزادیٔ ہند کے مختلف گوشوں اور بالخصوص مولانا ابوالکلام آزاد
کی شخصیت و سیاست کے موضوع پر پی ایچ ڈی کرا دی لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود مجھے مولانا
مرحوم کی سیرت و شخصیت کا جو فہم آج حاصل ہوا ہے، وہ اس سے قبل نہ تھا!")

............○............

○ جس طرح بارہویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی عظمت و جلالت
اور خصوصاً جامعیتِ کبریٰ کا مظہر ان کی تصانیف ہیں۔

○ اس طرح چودھویں صدی کے مجدّد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی عظمت و جامعیت کے
مظہرِ کامل ان کے عظیم تلامذہ ہیں۔

○ اگر شیخ الہندؒ کی تجویز کامیاب ہو جاتی تو کم از کم اس " جماعتِ شیخ الہندؒ " کا
شیرازہ قائم رہتا اور اب اس کا اندازہ بصد حسرت و یاس ہی کیا جا سکتا ہے کہ اس

صورت میں اس جماعت کی قوت و شوکت کس قدر ہوتی!

○ لیکن افسوس کہ حضرت شیخ الہندؒ کی تجویز کی ناکامی کے باعث ان کے انتقال کے بعد رفتہ رفتہ یہ شیرازہ بکھرتا چلا گیا۔

○ تاہم.......... جس طرح امام الہندؒ کو یہ کشف ہوا تھا کہ "میں قائم بالزماں ہوں اور اللہ تعالیٰ جس خیر کا ارادہ فرماتا ہے اس کے لئے مجھے بطور آلہ استعمال فرماتا ہے"

○ بالکل اسی طرح.......... واقعہ یہ ہے کہ شیخ الہندؒ کے بعد کم از کم برِّعظیم پاک و ہند کی حد تک جو خیر بھی ظاہر ہوا، اس میں ان کے تلامذہ کا حصہ نمایاں نظر آتا ہے۔

○ چنانچہ:

○ .... خالص جہادِ حریت و استخلاصِ وطن کے میدان میں انڈین نیشنل کانگرس کے پلیٹ فارم سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور جمعیت علماء ہند کے پلیٹ فارم سے مولانا حسین احمد مدنیؒ اور بے شمار علماءِ کرام نے جو کردار ادا کیا وہ نہایت تابناک ہے۔

(اگرچہ بعد میں کانگرس اور مسلم لیگ کے سیاسی تصادم اور مسلم انڈیا کے مستقبل کے بارے میں اختلاف رائے اور اس کے ضمن میں پیدا ہونے والی تلخی نے ان حضرات کے کردار کی عظمت کو مسلمانانِ ہند کی عظیم اکثریت کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور وہ متنازعہ شخصیتوں کی حیثیت اختیار کرتے چلے گئے)

○ اسی طرح مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک اور اس کے نتیجے میں پاکستان کے قیام کے ضمن میں نہایت عظیم اور فیصلہ کن خدمات سرانجام دیں حضرت شیخ الہندؒ کے دوسرے معتمد علیہ رفیق اور شاگرد علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے رفقاء نے، جن کے ذریعے جماعت شیخ الہندؒ کا پیوند تحریک پاکستان میں لگ گیا۔

...... (اس ضمن میں اس حقیقتِ واقعی کا استحضار بہت اہم ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی زندگی ہی میں اپنی ملی مساعی کے سلسلے میں اپنا دستِ راست مولانا عثمانیؒ کو بنا دیا تھا۔ چنانچہ شیخ الہندؒ کا خطبہ علی گڑھ بھی ان کے حسب منشا مولانا عثمانیؒ ہی نے تحریر کیا تھا، اور جمعیت علماء ہند کے اجلاس دہلی، منعقدہ نومبر ۱۹۲۰ء کا خطبۂ صدارت بھی ان کے زیرِ ہدایت انہی نے لکھا بھی تھا اور ان کے نمائندے کی حیثیت سے پڑھ کر سنایا بھی تھا!)

.... اسی طرح خالص علمی خدمات کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے بیہقیٔ وقت مولانا سید انور شاہ کاشمیریؒ اور ان کے تلامذہ نے جن کی ایک

تابناک مثال مولانا سید محمد یوسف بنوری ؒ تھے!

○ .... رہے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم تو وہ خود تو ریشمی رومالوں کی تحریک کی ناکامی کے بعد طویل عرصے تک جلاوطن رہے 'تاہم ان کے دو شاگردوں یعنی مولانا عبدالحئی فاروقی ؒ اور مولانا احمد علی لاہوری ؒ نے ارض لاہور میں قرآن کی انقلابی دعوت' کے شجرۂ طیبہ کی تخم ریزی اور آبیاری کے ضمن میں نمایاں کردار ادا کیا۔

(چنانچہ لاہور میں راقم کی دعوت قرآنی کو جو پذیرائی حاصل ہوئی اس کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ یہاں کی فضا میں خواجہ عبدالحئی فاروقی ؒ اور مولانا احمد علی لاہوری ؒ کے دروس قرآن کے اثرات موجود تھے ۔ اور اگرچہ راقم نے خواجہ صاحب ؒ کو تو دیکھا تک نہیں ' حضرت لاہوری ؒ کی زیارت بھی صرف ایک بار ہوئی اور کسی قریبی رابطے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی 'تاہم راقم کا گمان غالب ہے کہ اگر اسے نہیں تو اس کی قرآنی تحریک کو بلا شائبہ ریب و شک ان دونوں بزرگوں سے نسبت اویسی ؒ حاصل ہے..... اس کے دو مظاہر بھی قابل ذکر ہیں۔

ایک یہ کہ جامع مسجد خضراء سمن آباد' جس میں راقم کی دعوتِ قرآنی کا پودا ابتداءً پروان چڑھا اور جہاں لگ بھگ دس سال تک اس دعوت کا غلغلہ پوری شدت کے ساتھ بلند ہوتا رہا اور ذرائع آمدورفت کی شدید دشواریوں کے باوجود لاہور کے کونے کونے سے لوگ وہاں پہنچتے رہے...... اس کے بارے میں ایک عرصے کے بعد راقم کو معلوم ہوا کہ اس کا سنگ بنیاد مولانا احمد علی لاہوری ؒ کے دستِ مبارک کا رکھا ہوا تھا! دوسرے یہ کہ جب لگ بھگ ستر برس کی عمر کے ایک بزرگ نے میرے تین چار دروس ہی میں شرکت کے بعد ایک روز اچانک میرا ہاتھ کھینچ کر اور اس پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے یہ الفاظ کہے کہ "میں اقامتِ دین اور اعلاءِ کلمتہ اللہ کی جدوجہد کے لئے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں!" تو فوری طور پر تو میں حیران و ششدر رہ گیا' اس لئے کہ اس وقت تک میں نے تنظیم اسلامی کے قیام کا فیصلہ بھی نہیں کیا تھا' کجا یہ کہ بیعت کا خیال دل میں آتا...... لیکن بعد میں جب یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنی نوجوانی میں خواجہ عبدالحئی فاروقی ؒ کے دروس سنے تھے 'بعد ازاں حضرت لاہوری ؒ سے نہ صرف دورۂ تفسیر قرآن بلکہ سلوک کی بھی تکمیل کی تھی 'تو حیرت ختم ہو گئی اور یہ احساس ہوا کہ ع "پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا!" ...... حاجی صاحب ؒ کے انتقال پر جو نوٹ "میثاق" میں شائع ہوا تھا وہ بھی اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔)

............○............

○ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی مثبت دعوت...... اور دینِ حق کے غلبہ و اقامت کی راست تحریک کے میدان میں جو خلا مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی بددلی اور پسپائی کے باعث

پیدا ہوا تھا اسے قدرت نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کے ذریعے پر کرایا۔

○ جنہوں نے مولانا آزاد مرحوم کے انتقالِ موقف کے لگ بھگ نو دس سال بعد ہی اپنی دعوت و تحریک کے لئے ابتدائی اور تمہیدی کام شروع کر دیا۔ اور "حزب اللہ" کے خاتمے کے تقریباً بیس سال بعد ' جماعت اسلامی ' کے نام سے ایک نیا قافلہ تشکیل دیا!

○ وہ اگرچہ........ نہ براہ راست حضرت شیخ الہندؒ کے تلمیذ یا مسترشد تھے' نہ باضابطہ طور پر کبھی مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے منسلک رہے تھے۔

○ تاہم حقیقت وہی ہے جو مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ نے بیان فرمائی کہ وہ تھے علماءِ دیوبند ہی کے تربیت یافتہ اس لئے ان کی صحافتی زندگی کی ابتداء اور تصنیف و تالیف کے شغل کا آغاز جمعیت علماءِ ہند کے آرگن روزنامہ 'الجمعیۃ' ہی کی ادارت سے وابستگی کی صورت میں ہوا تھا۔

○ اس کے ساتھ ساتھ وہ "الہلال" اور "البلاغ" والے ابوالکلام کی دعوت سے بے حد متاثر تھے' اور انہوں نے ان کے قرآنی فکر اور جہاد فی سبیل اللہ سے متعلق نظریات سے بھرپور استفادہ کیا تھا۔

(اس سلسلے میں اگرچہ یہ بات تو نہایت افسوس ناک ہے کہ خود انہوں نے کبھی اس حقیقت کا برملا اعتراف نہیں کیا۔ تاہم دو مواقع پر غالباً کسی کیف کے عالم میں جو الفاظ ان کے قلم سے ٹپک گئے ان سے یہ حقیقت پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے یعنی۔ ایک ... وہ الفاظ جن کے ذریعے انہوں نے یہ اعتراف کیا کہ اس دور میں جس شخص سے اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی سب سے زیادہ امیدیں وابستہ تھیں وہ مولانا آزاد تھے' اور دوسرے اس سے کہ انہوں نے مولانا آزاد کو ان کی زندگی ہی میں 'مرحوم' قرار دیا جس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولانا آزاد کی ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کی دعوت اور تحریک کے ساتھ ان کی فکری اور جذباتی وابستگی کس درجہ کی تھی اور اس سے ان کی پسپائی کا انہیں کس قدر صدمہ ہوا تھا!)

راقم کے نزدیک مولانا مودودی مرحوم کی سب سے بڑی کمزوری ان کی 'انتہاپسندی' تھی۔ جس نے ایک مختصر سے دور کے سوا' ان کی پوری زندگی کو 'تضادات' کا مرقع اور رجعتوں کی داستان بنا کر رکھ دیا..... اور بالآخر یہی انتہاپسندی ان کی ناکامی کا اصل سبب بنی!

○ اگرچہ فوری نتائج کے اعتبار سے یہی ان کی سب سے بڑی 'خوبی' اور ابتدائی کامیابیوں کا 'راز' بن گئی..... اس لئے کہ جو کوئی ایک بار ان کا گرویدہ ہوا وہ قطعی اور مستقل طور پر بقیہ تمام اکابر امّت سے ذھنًا و قلبًا منقطع اور دوسری تمام دینی تحریکوں اور تنظیموں سے کُلیتہً بیزار ہو کر رہ گیا.....

○ اور اس طرح 'جماعت بندی' کا کٹھن مرحلہ آسان ہو گیا!

○ ان کی اس 'انتہاپسندی' کا اوّلین مظہر یہ تھا کہ انہوں نے 'متحدہ قومیت' کو نہایت شدّ و مد کے ساتھ 'کفر' قرار دیا..... اور کانگرسی مسلمانوں اور جمعیت علماء ہند اور اس کی قیادت پر نہایت جارحانہ ہی نہیں حد درجہ دل آزار تنقیدیں کیں۔

○ اس سے یہ تو ضرور ہوا کہ..... ایک جانب' مسلمانان ہند کی قومی تحریک کو تقویت حاصل ہوئی اور..... دوسری جانب' خود انہیں نہایت وسیع حلقے میں پذیرائی نصیب ہوئی۔

○ لیکن جمعیت علماء ہند سے وابستہ علماء کرام اور خاص طور پر مولانا حسین احمد مدنیؒ کے

○ عقیدت مندوں کا اکثر و بیشتر حلقہ ان سے شدید بیزار ہو گیا۔

اور دور رس نتائج اور دیرپا عواقب کے اعتبار سے یہی چیز ان کے قدموں کی زنجیر اور ان کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب بن گئی!

○ اس کے کچھ ہی عرصے بعد..... انہوں نے 'مسلم قومیت' کو بھی 'کفر بواح' کا ہم پلّہ قرار دے دیا اور اس کے ساتھ کسی مفاہمت یا تعاون کو 'گناہ کبیرہ' قرار دیتے ہوئے' مسلمانان ہند کی قومی تحریک کی منجدھار سے کٹ کر 'جماعت اسلامی' کے نام سے اپنا ایک علیحدہ قافلہ تشکیل دے لیا' اور ایک خالص اصولی 'اسلامی انقلابی دعوت و تحریک کی بنیاد رکھ دی۔ اور ان سطور کا عاجز و ناچیز راقم مولانا مرحوم کی......... ذاتی و شخصی کوتاہیوں' .... علمی و فکری لغزشوں' اور پالیسی اور طریق کار کے ضمن میں متعدد فاش غلطیوں سے واقف و مطلع اور ان کا قائل و معترف ہونے کے باوجود..... اور اس کے باوصف کہ 'جماعتِ اسلامی' سے اس کی علیحدگی کو تیس سال سے زائد گذر چکے ہیں۔ آج بھی اس رائے کا حامل ہے کہ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک ان کی تحریکِ اسلامی خالص اصولی اور انقلابی طریق کار پر عمل پیرا اور گویا منہاجِ نبوت و رسالت پر قائم اور گامزن رہی!

اور اس طرح اس نے اس دعوت و تحریک کے تسلسل کو جاری رکھا جس کے بیسویں صدی عیسوی کے داعیٔ اول تھے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور!

○ یہی وجہ ہے کہ متعدد اہم اشخاص جو پہلے مولانا آزاد سے بیعت اور 'حزب اللہ' میں شریک تھے' جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے جیسے مستری محمد صدیق" اور ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم!

○ لیکن افسوس کہ اپنے پیش رو کے مانند اس تحریک کا یہ دَورِ ثانی بھی ع "خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود!" کا مصداقِ کامل ثابت ہوا..... اور

○ تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے موقع پر حالات کی ایک ظاہری اور سطحی تبدیلی سے متأثر ہو کر مولانا مودودی نے اپنی مساعی اور جدوجہد کا رخ ایک قومی و سیاسی تحریک اور انتخابی طریقہ کار کی جانب موڑ دیا۔

○ اس موضوع پر راقم کو اس وقت زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت اس لئے نہیں ہے کہ:

○ .... اولاً اس کی اصل دلچسپی اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور غلبۂ دین حق کی اس اصل اصولی و انقلابی تحریک سے ہے جس کے دو منفصل ادوار کا ذکر اوپر ہوا ہے..... نہ کہ مولانا مودودی کے اس سے ماقبل یا مابعد کے افکار و نظریات یا پالیسی اور حکمت عملی سے!

○ .... ثانیاً اس اصولی اسلامی انقلابی موقف سے مولانا مودودی کے انحراف یا انقلابِ حال کے موضوع پر راقم کی ایک مفصّل تالیف "تحریکِ جماعتِ اسلامی، ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے موجود ہے۔

○ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی مرحوم کی علمی و فکری قلابازیوں..... اور جماعت اسلامی کی پالیسیوں کے مضحکہ خیز تضادات کی داستان بہت طویل ہے۔

○ لیکن جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' راقم کی اصل دلچسپی ان موضوعات سے نہیں ہے۔ بلکہ اسے افسوس اور تشویش صرف اس پر ہے کہ

○ اسلام کی اصولی انقلابی دعوت اور غلبۂ دینِ حق کی منہاجِ نبوت و رسالت والی تحریک

○ ع "اک دلکشا چراغ تھا' نہ رہا!" کی مصداق بن گئی

○ فَوَاحَسْرَتَاهُ وَ یَا اَسَفًا!

○ اور اسی خلا کو پر کرنے
○ اور براہ راست "اسلام کی نشأۃ ثانیہ" کی دعوت و تحریک اور "غلبہ و اقامتِ دین" کی جدوجہد کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی کوشش کا مظہر ہے 'تنظیم اسلامی'
○ جو راقم کی نسبت سے تو یقیناً نہایت حقیر بھی ہے اور بے وقعت بھی
○ لیکن اپنے ہدف و مقصود اور اپنے تاریخی پس منظر کے اعتبار سے نہایت اہم بھی ہے اور عظیم بھی!
○ چنانچہ راقم سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے
○ کہ راقم کی دعوت و تحریک کے بھی دو حصے اور شعبے ہیں
○ .... ایک "دعوت رجوع الی القرآن" ...... جس کیلئے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' قائم ہوئی 'قرآن اکیڈمی' تعمیر ہوئی۔
○ .... دوسرے دین حق کے غلبہ و اقامت یا بالفاظ دیگر 'اسلامی انقلاب' کیلئے حرکت و جہاد' جس کے لئے 'تنظیم اسلامی' قائم ہوئی اور اس کی تنظیمی اساس 'بیعت جہاد و سمع و طاعت فی المعروف' پر استوار ہوئی'
○ جہاں تک راقم کی دعوت قرآنی کا تعلق ہے' اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے۔
○ اس لئے کہ' اگرچہ اس کے ضمن میں تصنیف و تالیف کی مقدار کم رہی' لیکن درس و خطاب اور آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں کے ذریعے اس کا چرچا دنیا کے کونے کونے میں ہے۔
○ مزید برآں' بیس اکیس سالہ مساعی کے نتیجے میں قرآن کے نوجوان داعیوں اور مبلغوں کی ایک ٹیم بھی تیار ہو چکی ہے۔
اور الحمد للہ کہ ان دروس و خطابات کے ذریعے قرآن کے جس فہم و فکر کی اشاعت ہو رہی ہے' وہ کسی ایک لکیر کے فقیر یا کنویں کے مینڈک کے مانند نہیں ہے۔
○ بلکہ اس میں کم از کم تین بڑے منبعوں سے پھوٹنے والے سوتوں کا "قِران السّعداء" موجود ہے یعنی:
○ .... ایک حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا 'رسوخ فی العلم'۔
○ .... دوسرے ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم اور ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی جدید فلسفہ و سائنس اور جدید سیاسیات و اقتصادیات کے ضمن میں تنقیدی بصیرت!

○ .... تیسرے: مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کا جذبہ حرکت و عمل اور تصور جہاد فی سبیل اللہ! اور

○ .... چوتھے: مولانا حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی کا تعمق و تدبر قرآن کا اسلوب و منہاج!

(الحمد للہ کہ راقم اس "دعوت رجوع الی القرآن" اور اس کے "منظر و پس منظر" کے بارے میں تفصیلاً لکھ چکا ہے جس کی اشاعت 'میثاق' اور 'حکمت قرآن' میں تو ہو چکی ہے اب انشاء اللہ بہت جلد کتابی صورت میں بھی ہو جائے گی۔)

○ اور الحمد للہ کہ ع "شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم!" کے مصداق

○ راقم کو پورا اطمینان حاصل ہے کہ اس نے اپنی حیات دنیوی کے بائیس سال "دعوت الی القرآن" اور 'تحریک تعلیم و تعلم قرآن' کی جس جدوجہد میں صرف کئے اس سے اعلیٰ اور ارفع کام اور کوئی نہیں!

○ اور راقم کو خوف ہے تو صرف اس کا کہ کہیں اس میں نفس اور شیطان کی وسوسہ اندازیوں کے باعث ریا اور سمعہ کا دخل نہ ہو گیا ہو۔

○ ورنہ رجا اور استبشار کے لئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دو ارشادات کفایت کرتے ہیں کہ

○ .... "خیر کم من تعلم القرآن و علمہ" ......اور

○ .... "و من دعا الیہ فقد ھدی الی صراطٍ مستقیم"

............○............

○ البتہ جہاں تک تحریک و تنظیم کا تعلق ہے راقم کو برملا اعتراف ہے کہ اس کی بارہ سالہ مساعی کا حاصل کم از کم بظاہر احوال بہت کم ہے!

○ اور الحمد للہ کہ اس کے سبب کے بارے میں بھی راقم کو نہ کوئی مغالطہ لاحق ہے' نہ ہی وہ اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مرض میں مبتلا ہے۔

○ چنانچہ اسے خوب معلوم ہے کہ اس کا اصل سبب یہی ہے کہ اقامتِ دین کے بلند و بالا نصب العین اور "اظہار دین الحق علی الدین کلہ" یا بالفاظ دیگر 'اسلامی انقلاب' کی جاں گسل جدوجہد' بالخصوص اس کی قیادت و رہنمائی کے لئے جو کم از کم استعدادات اور صلاحیتیں درکار ہیں وہ ان سے بھی تہی دست ہے!

○ گویا معاملہ وہی ہے جو مولانا حسرت موہانی کے اس شعر میں بیان ہوا کہ

ے ' غم زندگی کا حسرت سبب اور کیا بتائیں
مری ہمتوں کی پستی' مرے شوق کی بلندی! '

○ صرف اس فرق کے ساتھ کہ جہاں تک راقم کا تعلق ہے معاملہ 'شوق' کا نہیں' خالص 'احساس فرض' کا ہے!

○ چنانچہ............یہی احساس فرض تھا جس کے تحت راقم نے عمر عزیز کے پورے دس سال ''تحریک جماعت اسلامی' کی نذر کیے اور اس عرصے کے دوران ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے لیکن نہایت فعّال انداز میں کام کیا۔

○ پھر جب اس سے مایوس ہو کر علیحدگی اختیار کی تو آٹھ برس اس انتظار میں بسر کیے کہ جماعت سے علیحدہ ہونے والے بزرگ علماء میں سے کوئی صاحب عزیمت وہمت نیا قافلہ تشکیل دے تو راقم اس میں ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے شامل ہو کر اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے!

○ اور جب اس جانب سے بھی مایوسی کا سامنا ہوا تو مجبوراً خود اس کانٹوں بھری وادی میں قدم رکھنے کے فیصلے کے ساتھ دوبارہ وارد لاہور ہوا!

○ اور پورے دس برس صرف 'قرآن کی انقلابی دعوت' کی نشرواشاعت کا کام کیا' (سات سال خالص انفرادی حیثیت میں اور تین سال 'مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' کے زیر عنوان)

○ اور بالآخر جب ۱۹۷۴ء میں 'عزم تنظیم' کا اعلان کیا اور مارچ ۱۹۷۵ء میں ع "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا!" کے مصداق 'تنظیم اسلامی' کے نام سے ایک نیا قافلہ ترتیب دیا..... تب بھی ہیئت تنظیمی' کے ضمن میں آخری فیصلہ نہیں کیا' بلکہ اسے اس خیال سے مؤخر رکھا کہ کوئی بزرگ شخصیت بھی شامل ہو تو اس کی صوابدید کے مطابق اقدام کیا جائے!
اور دو ڈھائی سال کے لاحاصل انتظار کے بعد تنظیمی ڈھانچے کی اساس کے طور پر 'بیعتِ سمع وطاعت فی المعروف' کے اس اصول کو اختیار کرنے کا اعلان کر دیا جو راقم کے نزدیک اسلامی اجتماعیت کی واحد منصوص و مسنون بنیاد ہے!

○ اس طرح 'الحمدللہ کہ " استدار الزمان کھیتہ یوم خلق اللہ السموات والارض " کے مانند غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد کے تنظیمی ڈھانچے کی ہیئت جو ٹھیٹھ اسلامی مدار سے ہٹ گئی تھی دوبارہ اپنے صحیح نہج پر استوار ہو گئی۔

............○............

ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کو اپنی جملہ کوتاہیوں اور کمزوریوں اور تمام تر بے بضاعتی اور تہی دامنی کے ساتھ ساتھ 'الحمد للہ کہ یہ اطمینان حاصل ہے کہ ،

○ اولاً اسے اپنی بے بضاعتی اور تہی دامنی کا پورا شعور و ادراک حاصل ہے۔

○ ثانیاً وہ سلف صالحین اور علماء ربانیین کے حلقے سے ذہناً و قلباً منسلک ہے 'منفصل' اور 'مستبعد' نہیں!

○ ثالثاً اس کے فکر و نظر میں نہ تنگی ہے 'نہ افراط و تفریط...... چنانچہ اس کے باوجود کہ اس کے دینی فکر کا تانا بانا اصلاً علامہ اقبال اور تبعاً مولانا آزاد اور مولانا مودودی کے فکر پر مبنی ہے 'اس کی قلبی محبت و عقیدت کا رشتہ اصلاً حضرت شیخ الہند" اور تبعاً مولانا مدنی" اور علامہ عثمانی" کے ساتھ ہے...... اور ان دونوں مؤخر الذکر بزرگوں کے ضمن میں بھی راقم اپنے باطن میں ایک عجیب توازن کی لذت و حلاوت محسوس کرتا ہے 'کہ اگر اصابت فکر و نظر کے ضمن میں راقم زیادہ قائل ہے علامہ عثمانی" کا...... تو تقویٰ و تواضع اور عزیمت و استقامت کے ضمن میں زیادہ معترف ہے مولانا مدنی" کا!

○ مزید بر آں '.......... اس کے نزدیک مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ کسی متحدہ قومیت میں شامل ہونا اصلاً تو غلط ہے 'تاہم کسی وقتی اور فوری دفاعی تدبیر کے طور پر اس کا استعمال ہرگز حرام نہیں ہے ' رہی مسلمانوں کی دنیوی فلاح و بہبود کیلئے کی جانے والی 'قومی' مساعی تو وہ تو راقم کے نزدیک احیائے ملت کے وسیع پروگرام کا ایک جزو لاینفک ہیں..... اگرچہ خالص غلبہ اسلام اور اقامت دین کے لئے اٹھنے والی ٹھیٹھ تجدیدی مساعی کو ان دونوں سے بالاتر ہو کر خالص اصولی 'انقلابی خطوط پر استوار ہونا چاہیئے!

○ رابعاً اسے نہ کوئی غرور لاحق ہے نہ زعم..... بلکہ وہ شدید احتیاج محسوس کرتا ہے علماء ربانیین بالخصوص منتسبین حضرت شیخ الہند" کی سرپرستی اور تعاون کی!

○ چنانچہ اسی کے حصول کی کوشش کی مظہر ہے اس کتاب کی تالیف و اشاعت!!

○ "گر قبول افتد 'زہے عز و شرف!"

(واضح رہے کہ یہ تحریر سرزمین حرم پر یہیں تک سپرد قلم ہو سکی تھی اور اس کے آخری الفاظ ۲۷ر رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۴ر مئی ۱۹۸۷ء کو مکہ مکرمہ زادہا اللہ شرفہا' میں ضبط تحریر میں آئے تھے۔ اس کا باقی حصہ واپسی پر لکھا گیا ہے۔)

(۳)

- اس وقت پوری دنیا میں اسلام اور مسلمان جس حال میں ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔
- یعنی یہ کہ..... اگرچہ بظاہر مسلمان ممالک کی عظیم اکثریت مغربی سامراج کی غلامی سے نجات حاصل کر چکی ہے (چنانچہ اس وقت یو این او کے کل ۱۵۹ ممبر ممالک میں سے ۴۴ کی تعداد مسلمان ممالک پر مشتمل ہے!)
- لیکن ایک جانب..... یہ تمام مسلمان ملک جدید ٹیکنالوجی اور خاص طور پر اسلحہ کے لئے بالکلیہ دوسروں کے دست نگر اور کسی نہ کسی سپر پاور کے فتراک کے نخچیر ہونے کے علاوہ اکثر و بیشتر باہم دست و گریباں ہیں۔
- تو دوسری جانب......... 'اسلام' فرمان نبویؐ "بَدَءَ الاسلامُ غریبًا و سَیَعُودُ کَمَا بَدَأَ" کی کامل تصویر ہے۔
- اور اس کے بارے میں لگ بھگ ایک صدی قبل کے یہ اشعار آج بھی صد فی صد درست ہیں کہ ؎

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے!
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جذر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

- اور ؎

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

- اس لئے کہ ان نام نہاد مسلمان ممالک میں قیادت و سیادت کی باگ ڈور اور حکومت و سیاست کی زمام کار گورے یوروپین لوگوں کے جانے کے بعد ان لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی ہے جو صرف چمڑی کی رنگت کے سوا ذہن و فکر اور تہذیب و تمدن ہر اعتبار سے خالص 'یوروپین' ہیں!
- اہل تشیع تو پھر بھی فخر کے ساتھ سر اونچا کر سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے واحد اکثریتی ملک میں اپنے نظریات کے مطابق 'اسلامی انقلاب' برپا کر دیا اور اس سے قطع نظر کہ یہ انقلاب عارضی ثابت ہوتا ہے یا پائیدار، کم از کم فی الوقت ایک وسیع و عریض ملک

اپنے عقائد اور اپنی فقہ کی غیر مشروط بالادستی بالفعل قائم کر دی۔

( ) پوری سنی دنیا کے لئے تو ؎

"یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا

ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے!"

( ) کے مصداق واقعتاً ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ ان کے درجنوں اکثریتی ممالک میں سے 'سوائے ایک سعودی عرب کے' کسی ایک جگہ بھی شریعت اسلامی کی فیصلہ کن بالادستی قائم نہیں!

( ) اور خود سعودی عرب میں بھی اگرچہ داخلی طور پر نظام عبادات کے سرکاری سطح پر قیام و اہتمام 'اور شریعت اسلامی کی جزوی تنفیذ و ترویج کی برکات نظر آتی ہیں......

( ) تاہم ایک مستبد بادشاہت اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم نے اسے پوری بیرونی دنیا کے لئے نفرت و حقارت کا ہدف اور تمسخر و استہزاء کا موضوع بنا کر رکھ دیا ہے۔

گویا آج پوری سنی دنیا کم از کم قومی و اجتماعی اور ملی و ملکی سطح پر شہادت حق کی بجائے شہادت زُور پر عمل پیرا ہے...... اور نوع انسانی کو اسلام کی دعوت دینے اور اس پر حجت قائم کرنے کی بجائے عملی اعتبار سے خود اسلام سے نفرت اور بیزاری کا اظہار کر رہی ہے!

( ) ادھر برعظیم ہند کی تقسیم سے ۱۹۴۷ء میں وقت کی جو عظیم ترین مسلمان مملکت وجود میں آئی تھی وہ پندرہ سولہ سال قبل ایک عظیم حادثے سے دوچار ہو گئی' جس نے نہ صرف یہ کہ اسے دولخت کر دیا بلکہ ایک نہایت شرمناک شکست اور ذلت آمیز ہزیمت کا کلنک کا ٹیکہ پوری امت مسلمہ کی پیشانی پر لگا دیا۔

نتیجۃً آج وہ اندیشہ واقعہ کی صورت اختیار کر کے سامنے آ گیا ہے' جس کا اظہار اب سے لگ بھگ نصف صدی قبل کچھ مخلصان ملت نے کیا تھا...... یعنی یہ کہ مسلمانان برعظیم تین حصوں میں تقسیم ہو کر ضعیف و غیر مؤثر ہو گئے ہیں!

○ اور نوبت بایں جا رسید' کہ آئے دن بھارت کا کوئی نہ کوئی علاقہ ؏

"ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو!"

کا نقشہ پیش کرتا رہتا ہے' لیکن بنگلہ دیش کے دس کروڑ اور بچے کھچے پاکستان کے نو کروڑ مسلمان چند ایک اخباری مضامین و بیانات...... اور ایک آدھ چھوٹے موٹے مظاہرے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے!

( ) رہا یہ بچا کھچا پاکستان!............ تو دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ یہ رفتہ رفتہ خوفناک

ترین تباہی کی جانب بڑھ رہا ہے........... اور "كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ"
کا کامل مصداق بن چکا ہے۔

○ اور اگر جلد ہی مشیت وقدرت خداوندی کا کوئی خصوصی اور معجزانہ ظہور نہ ہوا..... اور
یہاں اسلامی انقلاب نہ آیا

○ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے چار ٹکڑے ہوں گے یا پانچ!

○ بہر صورت

○ بھارت میں مسلم دشمنی ہی نہیں باضابطہ مسلم کشی کی تیز و تند لہر..... اور پاکستان میں
نسلی، لسانی اور علاقائی عصبیتوں کے بڑھتے ہوئے طوفان کے پیش نظر یہ اندیشہ اور
خطرہ موہوم نہیں، واقعی اور حقیقی ہے کہ برعظیم پاک و ہند میں ع

"ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات!"

کا وہ اٹل قانونِ قدرت نافذ نہ ہو جائے جو آج سے ٹھیک پانچ سو برس قبل سپین میں ہوا
تھا!

ع "حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!"

(اس موضوع پر الحمد للہ کہ راقم کی دو کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی
ہیں یعنی "استحکام پاکستان" اور "استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ" لہٰذا اس مقام پر
کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے!)

(۴)

ان حالات میں ضرورت تو اس امر کی ہے کہ طبقہ علماء میں سے کوئی عظیم شخصیت ایسی
ابھر کر سامنے آئے جو مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ، امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور
مجاہد کبیر سید احمد بریلویؒ کی سی عظمت و جلالت نہ سہی کم از کم شیخ الہند محمود حسن
دیوبندیؒ کی سی جامعیت و وسعت کی تو حامل ہو........ جو

اولاً..... ع

"کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو!"

کے مصداق 'جماعت شیخ الہندؒ' کے باقیات الصالحات کو جمع کرے اور اس کی
منتشر لڑیوں کو از سر نو ایک مضبوط رسی کی صورت میں بٹ دے!

ثانیاً........... ان جملہ دینی عناصر کو جمع کرنے کی کوشش کرے جو جمعیت علماء ہند کے

(واضح رہے کہ اس وقت مسلمانان ہند کے اس مشترک دینی وسیاسی اتحاد سے صرف مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے فرزند ہی باہر رہ گئے تھے' باقی جملہ قابل ذکر حنفی اور اہل حدیث علماء اس اتحاد میں شامل تھے)

○ اس لئے کہ اس کے بغیر پاکستان میں کسی اسلامی انقلاب کے خواب دیکھنا جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے!
تاہم جب تک کوئی ایسی صاحب ہمت و عزیمت شخصیت سامنے نہیں آتی'

○ ان سطور کا عاجز و ناچیز راقم اپنی بساط بھر کوشش کرتا رہے گا کہ غلبۂ اسلام اور اقامت دین کی اس راست تحریک کے تسلسل کو قائم رکھے جس کے اس صدی کے داعیٔ اول تھے مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم اور داعیٔ ثانی تھے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم اور...... بحمد اللہ...... وہ اس پر پوری طرح مطمئن ہے کہ خواہ اسے تنظیم کی وسعت کے اعتبار سے تاحال نمایاں اور محسوس کامیابی حاصل نہیں ہوئی' تاہم اسے اللہ نے توفیق عطا فرمائی کہ اس نے :
دروس قرآن اور خطابات عام' اور ان کی آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں کے ذریعے وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کے ذریعے' نہ صرف یہ کہ دین اور فرائض دینی کا جامع اور ہمہ گیر تصور بہت بڑے حلقے میں عام کیا' بلکہ مطالعہ قرآن کے ایک منتخب نصاب کے ذریعے اس کا نہایت مضبوط و مستحکم تعلق قرآن حکیم کے ساتھ استوار کر دیا ہے۔

○ مزید بر آں' انقلاب اسلامی کے اساسی لوازم اور تدریجی مراحل کو وضاحت کے ساتھ معین کیا...... اور اس کا گہرا رشتہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس طرح قائم کر دیا کہ "لا یصلح اخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا" کی حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔

○ اور...... ثم الحمد للہ...... کہ وہ اس پر پوری طرح راضی ہے کہ اگر اسے معاشرے اور قوم کے اکابر و اصاغر سے تائید و تعاون حاصل نہ ہو تو وہ یہی دو کام کرتا ہوا دنیا سے رخصت ہو جائے!

○ تاہم...... پاکستان کے علماء حقانی اور صلحاء ربانی کی خدمت میں یہ کتاب "مَنْ انصاری الی اللہ!" کی صدا کے ساتھ پیش ہے' مبادا وہ یہ کہیں کہ تم نے ہمیں کبھی پکارا ہی نہیں!

○ ورنہ "وَما النصر الا من عند اللہ" کے مطابق نصرت تو بالکلیہ اللہ ہی کی جانب سے ہے۔

(۵)

○ اس کتاب میں اس مقدمے کے بعد

○ باب اول ایک تمہید کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں ایک خط قاری حمید انصاری صاحب کا شامل ہے اور ایک تحریر ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری کی۔

○ باب دوم کی حیثیت اس پوری کتاب کے مبنیٰ و اساس اور بنیاد کی ہے۔

○ اس میں اولاً راقم کی وہ تحریر شامل ہے جس میں ۲۱۔ ۱۹۲۰ء کے امامت الہند کے مسئلے سے متعلق واقعات کی پوری تحقیق بھی آ گئی ہے، اور حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت کے بارے میں راقم کے تاثرات بھی بیان ہو گئے ہیں۔

○ پھر دو تائیدی خطوط مراد آباد (بھارت) کے مولانا افتخار احمد فریدی صاحب کے ہیں۔

○ پھر راقم کی تحریر پر مولانا اللہ بخش ملکانوی کے اعتراضات اور ان کے ضمن میں راقم کی وضاحت ہے۔

○ اور آخر میں محترم حکیم محمود احمد برکاتی کی تحریر ہے جس میں بعض واقعات اور اقوال کی روایت پر تنقیدی گرفت کی گئی ہے۔ جس کے ضمن میں ضروری وضاحت ان کے مقالے پر "میثاق" کے ادارتی نوٹ میں موجود ہے۔

○ تیسرا باب "فرائض دینی کا جامع تصور" کے موضوع پر قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن، لاہور میں منعقدہ چھ روزہ محاضرات کی روداد پر مشتمل ہے۔ جس سے دین کا جامع تصور بھی سامنے آ جاتا ہے اور فرائض دینی کا انقلابی تصور بھی۔

چوتھا باب راقم کی دو تقریروں پر مشتمل ہے، جو اواخر مارچ ۸۴ء میں جناح ہال، لاہور، میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے چھٹے سالانہ محاضرات قرآنی میں کی گئیں۔ جن میں اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے دو لازمی اجزاء تفصیلاً زیر بحث آئے ہیں یعنی ایک جہاد بالقرآن اور دوسرے التزام جماعت و لزوم بیعت!

○ واضح رہے کہ ۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۰ء مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی دعوت و تحریک کے بھی یہی دو اساسی اجزاء تھے!

○ پانچویں باب کا اصل موضوع مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم و مغفور اور ان کی بعض آراء ہیں۔

○ چنانچہ اس میں اولاً مولانا اکبر آبادی مرحوم کا ایک مختصر سوانحی خاکہ درج ہے جو موصوف کے خویش پروفیسر محمد اسلم صاحب نے تحریر کیا۔ اور متذکرہ بالا محاضرات قرآنی میں پڑھ کر سنایا۔

○ پھر مولانا اکبر آبادی کی ایک طویل تقریر ہے جو انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت اور سیرت کے موضوع پر ان ہی محاضرات میں کی۔ یہ تقریر اولاً ماہنامہ "حکمت قرآن" میں شائع ہوئی تھی۔ اب اسے نہایت آب و تاب کے ساتھ کتابی صورت میں ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں یہ تقریر ان کی کتاب سے عکس لے کر شائع کی جا رہی ہے، اس کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں

○ پھر مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے دو انٹرویو ہیں۔ جن میں انہوں نے راقم الحروف کے بارے میں اپنی رائے وضاحت کے ساتھ پیش کی ہے۔ جس کے لئے راقم ان کا شکر گذار بھی ہے اور ان کے لئے دعا گو بھی۔ البتہ اس گفتگو میں بعض دوسری تحریکوں اور شخصیتوں کے ضمن میں جو ریمارکس آ گئے ہیں ان کے ضمن میں مولانا اخلاق حسین قاسمی (دہلی) اور مولانا محمد منظور نعمانی (لکھنؤ) کے جو تردیدی یا وضاحتی خطوط موصول ہوئے وہ بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔

○ واضح رہے کہ اس کتاب کے باب چہارم میں شامل راقم کی دونوں تقریروں کے دوران مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم بھی موجود تھے۔ پہلی میں بحیثیت صدر مجلس اور دوسری میں بحیثیت شریک و سامع!

○ باب ششم سے اس کتاب کی دوسری اہم بحث کا آغاز ہوتا ہے۔

○ اس میں اولاً "قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات اور ان کے بارے میں علماء کرام کے خدشات" کے موضوع پر راقم کی ایک مفصل تقریر شامل ہے جو رمضان ۱۴۰۴ھ کے جمعۃ الوداع کو مسجد دارالسلام' باغ جناح' لاہور میں کی گئی تھی۔

○ چونکہ "میثاق" کا وہ شمارہ (ستمبر ۸۴ء) بہت سے معروف علماء کرام اور بعض دینی جرائد کو تبصرے اور اظہار رائے کے لئے بھیجا گیا تھا' لہٰذا اس باب میں اس کے بعد چار جید علماء کرام اور دو ہفت روزہ جرائد کے تبصرے شامل ہیں جو "میثاق" کی نومبر اور دسمبر ۸۴ء کی اشاعتوں میں شائع ہوئے۔

○ اور آخر میں ان تبصروں کے ضمن میں راقم کی وضاحتیں ہیں جو دسمبر ۸۴ء اور جنوری ۸۵ء کے "میثاق" میں شائع ہوئی تھیں۔

○ باب ہفتم مولانا اخلاق حسین قاسمی (دہلی) کی ایک تحریر سے شروع ہوتا ہے جس میں انہوں نے "جماعت شیخ الہند" کی اصطلاح استعمال فرمائی اور ایک جانب راقم کو کچھ نصیحتیں کیں اور دوسری جانب علماء دیوبند کو راقم کی تائید اور سرپرستی کا مشورہ دیا۔

○ اس کے بعد راقم کی ایک طویل تحریر ہے جو "میثاق" فروری ۸۵ء میں شائع ہوئی تھی اور جس میں راقم نے "جماعت شیخ الہندؒ" کے ضمن میں اپنے تاثرات و احساسات کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔

○ آخر میں مولانا محمد منظور نعمانی (لکھنؤ) کی تالیف کا ایک طویل اقتباس ہے جس میں مسلم انڈیا کی ۲۰ویں صدی عیسوی کے ابتدائی چالیس سال کی تاریخ کے بعض اہم واقعات اور اس دور کے بعض اعاظم رجال کا ذکر ہے۔

○ باب ہشتم میں یہی سلسلہ مضمون آگے بڑھتا ہے لیکن اس میں گفتگو اصلاً مولانا محمد یوسف لدھیانوی مد "بینات" کراچی کے اعتراضات کے حوالے سے ہے۔

○ اس میں "میثاق" مارچ ۸۵ء کا "تذکرہ و تبصرہ" من وعن اور ستمبر ۸۵ء کے "تذکرہ و تبصرہ" کے چید چیدہ حصے شامل ہیں۔ اس باب کے آخر میں ہفت روزہ "حرمت" اسلام آباد میں شائع شدہ ایک مضمون بھ شامل ہے۔

○ باب نہم اصلاً راقم کے ۲۴ر اگست ۸۴ء کے خطاب جمعہ پر مشتمل ہے جو "میثاق" نومبر ۸۴ء میں شائع ہوا تھا۔

○ اس کے علاوہ اس میں "قتل خطاء میں عورت کی نصف دیت کا مسئلہ" کے موضوع پر راقم کی ایک تحریر شامل ہے جو اولاً روزنامہ "نوائے وقت" اور پھر "میثاق" دسمبر ۸۴ء میں شائع ہوئی تھی۔

○ اس کتاب میں ان دونوں کی اشاعت سے مقصود یہ ہے کہ فقہی مسائل کے ضمن میں راقم کا نقطہ نظر وضاحت سے سامنے آجائے۔

○ باب دہم کچھ "متفرقات" پر مشتمل ہے جن کی حیثیت اس کتاب میں "ضمیموں" کی سی ہے۔ اس میں حسب ذیل چیزیں شامل ہیں

○ (ا) آیہ اظہار دین کے ضمن میں امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی وضاحت (ماخوذ از "ازالۃ الخفا" ترجمہ مولانا عبدالشکور لکھنوی)

○ (ب) "لا یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا" کے ضمن میں دو نہایت اہم تحقیقی خطوط
(ج) "علماء کب اٹھیں گے؟" کے عنوان سے مولانا محمد ذکریا' سربراہ پاکستان سنی اتحاد' کی ایک جھنجھوڑ دے

والی تحریر۔

( ) (د) حاجی عبدالواحد مرحوم و مغفور کا سوانحی خاکہ' جو اپنی ذات میں اس دور کی جملہ دینی تحریکوں کی چلتی پھرتی تاریخ تھے اور میرے ہاتھ پر زبردستی بیعت کرنے والے پہلے شخص!

( ) (ہ) مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری مدظلہ کی ایک تقریر جس میں موصوف نے راقم الحروف کے بارے میں اظہار خیال فرمایا ہے۔

راقم ان تمام حضرات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے جن کی تحریریں مضمون کی مناسبت سے کتاب میں شامل کی گئی ہیں۔

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

لاہور......۱۶ر جون ۱۹۸۷ء

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے درسِ قرآن کا سلسلہ

الھدیٰ

درس نمبر ۱۱

نشست نمبر ۴۳

مباحثِ عمل صالح

عائلی زندگی کے بنیادی اصول

(سورۃ التحریم کی روشنی میں)

(۱)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○ ——— صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ ○

"اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کیوں حرام کرتے ہیں وہ چیز جو اللہ نے آپ کے لئے حلال ٹھہرائی ہے اپنی بیویوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ۔ اور اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔ اللہ نے تمہاری قسموں کو کھولنے کے لئے طریقہ معین کر دیا ہے اور اللہ ہی تمہارا پشت پناہ اور مدد گار ہے اور وہ سب کچھ جاننے والا اور کمال حکمت والا ہے۔"

محترم حاضرین اور معزز ناظرین۔

سورۃ تحریم کی ابتدائی دو آیات اور ان کا ترجمہ ابھی آپ نے سماعت فرمایا...... سورۃ تحریم اٹھائیسویں پارے کی آخری سورۃ ہے۔ اور مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا درس ان مجالس میں سلسلہ وار ہو رہا ہے

اس کا بحیثیت مجموعی بیسواں درس ہے اور تیسرے حصے یعنی مباحث عمل کا تیسرا درس ہے۔ اس منتخب نصاب کے جن دروس کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں ان کے درمیان جو معنوی ربط و تعلق اور منطقی ترتیب ہے اس کو اپنے ذہن میں تازہ کر لیجئے۔

اس منتخب نصاب کا پہلا حصہ چار جامع اسباق پر مشتمل تھا۔ جس میں انسان کی کامیابی اور فوز و فلاح کے چاروں لوازم یعنی ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا بیان تھا...... دوسرے حصہ میں چند ایسے مقامات شامل تھے جو خاص طور پر ایمان کے مباحث سے متعلق ہیں۔ تیسرے حصہ میں اعمال صالحہ کی بحث ہے جو جاری ہے۔

ظاہر بات ہے کہ انسانی اعمال میں سب سے پہلے انفرادی سیرت و کردار کا معاملہ زیر بحث آنا چاہئے۔ چنانچہ پہلے دو اسباق میں انفرادی سیرت و کردار ہی سے متعلق چند اہم پہلو سامنے آئے ہیں اولین درس میں جو سورہ مومنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور سورہ معارج کی درمیانی سترہ ہم مضمون آیات پر مشتمل تھا اس میں قرآن نے تعمیر و سیرت کیلئے جو بنیادیں فراہم کی ہیں اور تعمیر خودی کا جو پروگرام دیا ہے، اس کا بیان ہے اور سورہ فرقان کے آخری رکوع پر مشتمل دوسرا سبق جو ہم نے پچھلی نشست میں ختم کیا تھا۔ اس میں یہ بات ہمارے سامنے آئی تھی کہ ایک مکمل طور پر تعمیر شدہ بندہ مومن کی شخصیت کے کیا خدو خال ہونے چاہئیں! یعنی قرآن مجید کا انسان مطلوب کیا ہے! جسے علامہ اقبال مرد مومن سے تعبیر کرتے ہیں۔ اب ہم انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اجتماعیت کی پہلی منزل خاندان اور عائلی نظام ہے۔ اس سے آگے معاشرہ ہے اور اس سے آگے ریاست ہے۔ یہ سارے اس اجتماعیت کے مدارج ہیں جس کا نقطۂ آغاز خاندان ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ خاندان کی بنیاد رشتۂ ازدواج سے پڑتی ہے۔ یعنی ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان شوہر اور بیوی کا تعلق ایک خاندان کا سنگ بنیاد بنتا ہے۔

چونکہ اجتماعیت کا اولین قدم یہی ہے۔ اس لئے قرآن مجید میں نہایت شرح و بسط اور نہایت تفصیل کے ساتھ عائلی نظام سے متعلق مباحث آئے ہیں۔ شوہر بیوی کے رشتے کے متعلق معاملات اور نکاح اور طلاق کے احکام و مسائل کے بارے میں تفصیلی ہدایات بیان ہوئی ہیں۔ سورہ بقرہ میں کئی رکوع اسی بحث پر مشتمل ہیں۔ پھر سورہ النساء میں، سورہ مائدہ میں سورہ نور میں، سورہ احزاب میں سورہ مجادلہ، میں سورہ طلاق اور سورہ تحریم میں اس موضوع پر گفتگو آئی ہے۔

فارسی کے اس مشہور شعر کے مصداق کہ۔

خشت اول چوں نہد معمار کج   تا ثریا می رود دیوار کج

چونکہ خاندان انسانی معاشرے کا اور انسانی تہذیب و تمدن کا بنیادی پتھر ہے اسی پر ریاست، ملت اور اجتماعیت کے تمام تصورات کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس لئے اگر خاندان کے ادارے کی تعمیر میں کوئی کجی یا ٹیڑھ رہ جائے تو ظاہر بات ہے کہ پھر وہ کجی آخر تک جائے گی۔ جڑ اور بنیاد میں ضعف رہ جائے تو یہ ضعف معاشرے کی تمام سطحوں پر ظہور کرے گا لہذا قرآن مجید خاندان کے اس ادارے کو نہایت مستحکم کرنا چاہتا ہے اور اسے نہایت صحیح بنیادوں پر استوار کرنا چاہتا ہے تاکہ اس میں نہ کوئی عدم توازن رہے اور نہ ہی کوئی اونچ نیچ ہو، نہ ظلم و تعدی ہو اور نہ ہی ضعف و اضمحلال۔

قرآن کریم کے اٹھائیسویں پارے کے آخر میں اس موضوع پر سورہ تحریم اور سورہ طلاق کی صورت میں دو نہایت حسین وجمیل سورتوں کا جوڑا ہمارے سامنے آتا ہے۔ ظاہر بات ہے جتنی سورتوں یعنی سورہ بقرہ' سورہ نساء وغیرہ جن میں عائلی زندگی کے معاملات پر بحث کی گئی ہے پر اس محدود وقت میں گفتگو نہیں ہو سکتی۔ البتہ سورہ تحریم جس کا مطالعہ آج کی اس نشست سے شروع ہو رہا ہے کی ہر آیت پر قدرے تفصیل سے غور اور گفتگو کریں گے لیکن اس مطالعہ اور غور سے قبل میں ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جس سے انشاءاللہ آپ کو فہم قرآن کے لئے رہنمائی ملے گی اور قرآن مجید کی آیات اور سورتوں میں جو باہمی ربط اور نظم ہے اس کے بارے میں آپکو ایک بصیرت باطنی حاصل ہو گی۔ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ اب جوڑے ہونے کی نسبت کا تقاضا ہے کہ موضوع زیر بحث کے دو پہلو ہونے چاہئیں۔ ایک یہ کہ مشابہت بھی ہو اور دوسرے یہ کہ ان میں ایک تقسیم بھی ہو۔ یعنی تصویر کا ایک رخ یا ایک پہلو اگر ایک سورت میں آیا ہے تو اس کا دوسرا رخ اور دوسرا پہلو دوسری سورت میں آئے۔ جیسے قرآن مجید کی آخری دو سورتیں معوذتین ہیں۔ ان دونوں کا مضمون ایک ہی ہے تعوذ کا ایک پہلو سورۃ الفلق میں آ گیا ہے۔ یعنی ان وبالوں اور بلاؤں سے پناہ کے لئے اللہ سے دعا کرنا جو انسان پر خارج سے حملہ آور ہوتی ہیں۔ اور تعوذ کا دوسرا رخ سورۃ الناس میں آ گیا ہے یعنی ان وسوسوں اور بہکاووں سے پناہ کے لئے اللہ سے دعا کرنا جو شیطان اور اس کی صلبی و معنوی اولاد انسان کے دل و دماغ اور باطن میں پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح عائلی زندگی کے بھی دو پہلو ہیں یا تصویر کے دو رخ ہیں یا معاملات کے دو اجزاء ہیں' جو سورہ طلاق اور سورہ تحریم میں سامنے آتے ہیں۔

اس کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ان سورتوں کا بنیادی اور مرکزی مضمون کیا ہے!۔ خاندان کے جذبات کا لحاظ رکھنا اور ایک دوسرے کے احساسات کا پاس کرنا بنیادی قدر ہے۔ جس گھر میں شوہر اور بیوی کے مابین یہ کیفیت نہیں ہے تو یوں سمجھئے کہ زبردستی اور مارے باندھے کا ایک رشتہ ہے جو قائم ہے۔ اس رشتہ میں جو چاشنی اور باہمی محبت و الفت در کار ہے وہ موجود نہیں ہے تو ایسا گھر اس دنیا میں جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔ الغرض عائلی زندگی میں دو رویئے ہیں جن میں انسان انتہا تک چلا جاتا ہے۔ ایک رویہ یہ ہے کہ شوہر اور بیوی کے درمیان عدم موافقت ہے۔ دونوں کے مزاجوں میں کوئی ایسا بعد ہے کہ باہم موافقت نہیں ہو پا رہی۔ اس کی انتہا طلاق ہے۔ یہ مضمون سورہ طلاق میں آتا ہے سورۃ تحریم اور سورہ طلاق میں مشابہت دیکھئے کہ دونوں کے آغاز میں براہ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کیا گیا ہے البتہ سورہ طلاق کے شروع میں طلاق کا ذکر ہے۔ مگر چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں طلاق کا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں لہٰذا شروع میں تو خطاب حضورؐ سے ہے لیکن فوراً بعد ہی إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ سے آخر آیت تک جمع کا صیغہ آ گیا۔ یعنی دراصل یہ بات حضورؐ کو مخاطب کر کے آپؐ کی وساطت سے مسلمانوں سے کہی جا رہی ہے کہ اے مسلمانو! اگر تمہارے یہاں کوئی اس قسم کی صورت حال پیش آ جائے کہ طلاق ناگزیر ہو جائے تو یہ روش اختیار کرو' یہ اس کے قواعد و ضوابط ہیں' یہ اس کی شرائط و آداب ہیں۔

یہ بات تمدنی اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ بعض معاشروں اور بعض مذاہب نے طلاق کو عائلی زندگی سے خارج کر دیا ہے۔ جبکہ اسلام کا نظام بڑا متوازن اور معتدل ہے۔ اسلام کے عائلی نظام میں ایک طرف تو طلاق کو حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور مبغوض چیز کہا گیا ہے اور ساتھ ہی بیوی کی ناپسندیدہ عادتوں سے صرف نظر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک حدیث شریف جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہؓ سے

روایت کیا ہے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور انتباہ فرمایا

عن ابی هريرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: "لَا يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً إِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقاً رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ"

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "کوئی مومن اپنی بیوی سے اس کی کسی ناپسندہ عادت کی وجہ سے نفرت نہیں کرتا بلکہ اُس کی دوسری اچھی عادتوں کی وجہ سے اُس سے راضی رہتا ہے۔

اس ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں انسان کو یہ کوشش کرنی چاہئے کہ جانبین ایک دوسرے کی خوبیوں اور بھلائیوں پر نگاہ رکھیں تاکہ حتی الامکان کوشش ہو سکے کہ ان کے درمیان موافقت پیدا ہو جائے لیکن اگر کوشش کے باوجود کسی وجہ سے موافقت پیدا نہیں ہو رہی تو پھر اسلام ان دونوں کو زبردستی باندھ کر رکھنا نہیں چاہتا۔ اس زبردستی کے بندھن سے معاشرے میں خیر پیدا نہیں ہوتا شر پیدا ہوتا ہے لہٰذا طلاق کا راستہ کھول دیا گیا ہے البتہ اس کے جو ضوابط و قواعد اور آداب و شرائط ہیں انہیں بھی قرآن میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ان آداب و شرائط کو ہمارے معاشرے میں عام طور پر ملحوظ نہیں رکھا جاتا اور کوئی شوہر غصہ میں آ کر ایک ہی وقت میں آخری قدم اٹھا بیٹھتا ہے اور ایک دفعہ ہی تین طلاقیں دے بیٹھتا ہے اور بعد میں پچھتاتا ہے۔

دوسری طرف عائلی زندگی میں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرے کی دلجوئی اور خوشنودی حاصل کرنے کا معاملہ حد اعتدال سے بڑھ جائے۔ شوہر اپنی بیوی کی رضاجوئی میں اس حد تک چلا جائے کہ شریعت کے احکام ٹوٹنے لگیں۔ مثلاً کوئی شخص اپنی بیوی کو خوش اور راضی کرنے کے لئے یا اس کی کوئی فرمائش پوری کرنے کے لئے اللہ کی حرام کی ہوئی کسی چیز کو حلال ٹھہرا لے۔ ظاہر بات ہے کہ اس بات کا تو سرے سے کوئی امکان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہیں تھا معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ البتہ حضورؐ کی حیات طیبہ میں ایک واقعہ ایسا پیش آ گیا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعض ازواج مطہراتؓ کی دلجوئی ملحوظ رکھی۔ اگرچہ یہ اپنی جگہ پسندیدہ اور مطلوب ہے حضورؐ نے اسکی ترغیب دی۔ رسالت مآب کا ارشاد ہے کہ خیر کم خیر کم لا هلی و انا خیر کم لا هلی "تم سے بہترین وہ لوگ ہیں جو اپنے گھر والوں کے حق میں بہترین طرز عمل اختیار کرنے والے ہیں اور جان لو کہ میں تم میں سے اپنے گھر والوں کے لئے بہترین روش اختیار کرنے والا ہوں" اگرچہ یہ ایک پسندیدہ طرز عمل ہے مگر جیسے حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معاملہ میں ہو چکا تھا کہ انہوں نے اونٹ کے گوشت کا استعمال ترک کر دیا تھا اور یہ ان کے ذاتی ذوق کا معاملہ تھا۔ لیکن یہود نے یہ سمجھ لیا کہ اونٹ کا گوشت حرام ہے گویا ایک نبی کے ذاتی ذوق کے معاملہ کو شریعت کا جزو بنا لیا گیا اور اونٹ کے گوشت کی حرمت بنی اسرائیل کی شریعت میں مستقل ہو گئی۔

میں نے جس خاص واقعہ کا حوالہ دیا ہے اس واقعہ کا احادیث میں تفصیل سے بیان ہے۔ یہاں اس واقعہ کی طرف

محض اشارہ ہے۔ احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ آپؐ عصر کی نماز کے بعد تھوڑی دیر کے لئے سب ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے یہاں تشریف لے جاتے۔ ازواج مطہراتؓ کو آپؐ کے ساتھ جو محبت اور جو تعلق خاطر تھا اس کے پیش نظر ہر زوجہ محترمہؓ کی یہی تمنا اور کوشش ہوتی تھی کہ حضورؐ کی توجہات کا مرکز بنے اور زیادہ سے زیادہ وقت اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکت صحبت میں رہنے کا موقع نصیب ہو۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملے میں کامل عدل سے کام لیتے تھے اور ہر زوجہ محترمہؓ کے یہاں مساوی وقت دیتے تھے۔ ایک روز حضورؐ کو حضرت زینب بنت جحش کے یہاں معمول سے زیادہ دیر لگی۔ ہوا یہ کہ انؓ کے یہاں کہیں سے ھدیۃً شہد آیا ہوا تھا اور حضورؐ کو چونکہ شہد بہت مرغوب تھا اس لئے ام المومنین حضرت زینبؓ نے آپؐ کو شہد پیش کیا جس کے نوش فرمانے کے باعث آپؐ انؓ کے یہاں زیادہ دیر تک ٹھہرے۔ پھر کئی روز تک یہی معمول ہوا۔ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے مل کر تدبیر کی کہ آپؐ حضرت زینبؓ کے یہاں شہد پینا چھوڑ دیں تاکہ آپؐ انؓ کے ہاں معمول سے زیادہ وقت نہ دے سکیں۔ وہ شہد خاص قسم کے پھولوں مغافیر کا تھا جس میں کچھ بساند اولیٰ ٹھینک ہوتی ہے۔ چنانچہ حضورؐ شہد کے استعمال کے بعد جب انؓ کے حجرے میں تشریف لے جاتے تو وہؓ حضورؐ سے کہتیں کہ آپؐ کے منہ سے مغافیر کی بساند آتی ہے انؓ دونوں نے چند دیگر ازواج مطہرات کو بھی اس بیں شریک کر لیا آپؐ چونکہ خود بھی نہایت نفاست پسند تھے اور جب آپؐ کی متعدد ازواج مطہرات نے یہ بات کہی تو آپؐ نے عہد کر لیا اور قسم کھالی کہ آئندہ آپؐ یہ شہد استعمال نہیں فرمائیں گے

چونکہ ہمارے دین میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مقام حاصل ہے کہ اگر آپ سے کوئی معمولی بات بھی ظہور میں آجائے تو وہ قانون کی حیثیت سے اختیار کر جاتی ہے۔ اب آپؐ نے چونکہ اپنی ازواج مطہرات کی خوشنودی کے لئے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ ایک شے اپنے اوپر حرام کی تھی اس لئے یہ خطرہ پیدا ہو سکتا تھا کہ امت اس شے کو ہمیشہ کے لئے حرام یا کم از کم حد درجہ مکروہ سمجھنے لگے یا امت کے لوگ یہ خیال کرنے لگیں کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز اپنے اوپر حرام کر لینے کی دین میں اجازت ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ مبارکہ نازل فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام پر ٹوک دیا۔

اس ٹوکنے سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حدود مقرر کرنے کے مطلق اور قطعی اختیارات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ نبی بھی اگر کسی شے کو حلال یا حرام قرار دیتا ہے تو صرف اس صورت میں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اشارہ ہو۔ خواہ وہ اشارہ قرآن مجید میں ہوا ہو چاہے وہ اشارہ وحی خفی کے طور پر کیا گیا ہو۔

اس سورہ مبارکہ پر تدبّر کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جب ایک ذرا سی بات پر حضورؐ کو نہ صرف ٹوک دیا گیا اور نہ صرف اس کی اصلاح کی گئی بلکہ اس کا ایک سورۃ میں ذکر کر کے اس کو ابدالاباد تک کے لئے قرآن مجید میں محفوظ کر دیا گیا تو اس سے قطعی طور پر یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جن اعمال، افعال احکام اور ہدایات پر قرآن مجید میں کوئی گرفت یا اصلاح موجود نہیں ہے وہ سراسر حق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی منشاو مرضی کے مطابق ہیں

ان کا اتباع ہم پر لازم ہے۔ اس بات سے سنت کی حجیّت و فرضیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

ان تمہیدی باتوں کے بعد اب آیئے ان ابتدائی دو آیات کی طرف 'فرمایا۔ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَکَ۔ "اے نبی' آپؐ اس چیز کو کیوں حرام ٹھہراتے ہیں جسے اللہ نے آپؐ کے لئے حلال کیا ہے"۔ انداز استفہامیہ لیکن مقصود حضورؐ کو ٹوکنا اور متنبہ کرنا ہے۔ تبتغی مرضات ازواجک کیا آپؐ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں!"۔ آیت کے اس حصہ سے معلوم ہوا کہ حضورؐ نے تحریم کا یہ فعل اپنی ذاتی پسند ناپسند کی بنا پر نہیں کیا تھا بلکہ بیویوں کی خوشنودی کی وجہ سے کیا تھا جنھوں نے یہ صرف اس لئے چاہا تھا کہ آپؐ شہد پینے کی خاطر حضرت زینبؓ کے یہاں زیادہ قیام نہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سبب کو یہاں بیان فرما کر ازواج مطہراتؓ کو متنبہ فرما دیا کہ وہ نبی کی ازواج ہونے کی نازک ذمہ داریوں کا لحاظ رکھیں۔ آگے فرمایا وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ "اور اللہ معاف کرنے والا' رحم کرنے والا ہے"

آیت کے اس حصہ میں حضورؐ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپؐ نے اپنی بیویوں کی خوشنودی کی خاطر ایک حلال یز کو حرام قرار دینے کا جو کام کیا ہے وہ کوئی گناہ نہ تھا لیکن آپؐ کے منصب کی اہم ترین ذمہ داریوں کے اعتبار سے مناسب نہ تھا لہٰذا اللہ نے صرف ٹوک کر اصلاح کی طرف متوجہ کرنے پر اکتفا فرمایا ... اس مقام پر ٹھہر کر ذرا س بات پر غور فرمایئے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ازواج کی خوشنودی کی خاطر ایک حلال چیز کو اپنے لئے حرام قرار دینے پر اس شدومد کے ساتھ ٹوک دیا گیا ہے تو ان لوگوں کا آخرت میں کتنا سخت اور شدید مواخذہ و گا جو اپنی بیویوں کو خوش رکھنے کے لئے حرام کو حلال کر لیتے ہیں اور پھر اس کا مسلسل و مستقل ارتکاب کرتے ہتے ہیں

اب آیئے دوسری آیت کی طرف 'فرمایا ——————— "اللہ ایسی قسموں کو کھولنے کا ایک استہ مقرر کر چکا ہے"۔ اس میں سورہ مائدہ کی آیت ۸۹ کی طرف اشارہ ہے۔ جس میں واضح کیا گیا ہے کہ اگر سی شخص نے کوئی قسم کھالی ہے اور اب اس کو کھولنا ہے تو اس کے لئے کفارہ مقرر ہے۔ اور وہ یہ کہ دس ساکین کو کھانا کھلائے۔ وہ کھانا ایسا ہو جو انسان اپنے اہل و عیال کو کھلاتا ہے'۔ یا دس مساکین کو لباس مہیا رے۔ یا کسی ایک غلام یا لونڈی کو آزاد کرائے۔ اور اگر کسی کو ان میں سے کسی کی بھی استطاعت نہ ہو تو اس کا رل یہ مقرر کیا گیا کہ ایسا شخص تین دن کے روزے رکھے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ قسم کو کھولنے اور عہد کی ابندی سے نکلنے کا اللہ تعالیٰ طریقہ معین فرما چکا ہے۔ اس لئے جب بھی کوئی ایسی صورت پیش آجائے تو کفارہ ادا رکے قسم کھول دو۔ آگے فرمایا۔ وَ اللّٰهُ مَوْلٰىکُمْ "اور یہ بات جان لیجئے کہ آپؐ کا اور سب مسلمانوں کا رد گار' حامی اور پشت پناہ صرف اللہ ہی ہے"۔ لہٰذا اسی کی رضا اور خوشنودی کو ہمیشہ مقدم رکھنا چاہئے۔ وَ هُوَ لْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ "اور وہی ہے سب کچھ جاننے والا' کمال حکمت والا"۔ یعنی وہ جو بھی حکم دیتا ہے اپنے علم کامل کی بیاد پر دیتا ہے اور اس کی حکمت بالغہ اس حکم میں شامل ہوتی ہے۔

سورہ تحریم کی ابتدائی دو آیات میں ہماری سامنے خاندانی و عائلی زندگی کے بارے میں ایک بڑی بنیادی بات آ ئی کہ بیویوں کی رضاجوئی اور ان کی خوشنودی حاصل کرنا' ان کے ساتھ نرمی' محبت' مودت' الفت اور ان کے بذبات کا پاس اور لحاظ رکھنا یہ تمام چیزیں اصلاً مطلوب ہیں' پسندیدہ ہیں۔ لیکن ایک خاص حد تک۔ ایسا نہ ہو کہ ہیں یہ جذبہ حد اعتدال سے تجاوز کر جائے اور شریعت کے احکام ٹوٹنے شروع ہو جائیں۔ لہٰذا ایک بندہ مومن کو یشہ اور ہر وقت اعتدال کی روش اختیار کرنی چاہئے اور اس معاملہ میں ہوشیار اور چوکس رہنا چاہئے۔ اب آج جو

کچھ عرض کیا گیا ہے اس سلسلہ میں کوئی سوال ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال و جواب

سوال۔ ڈاکٹر صاحب! عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ والدین کے گھر سے لے کر شوہروں کے گھروں تک عورتوں کے حقوق ادا نہیں کئے جاتے۔ اس صورت حال کو کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے؟

جواب۔ بہت مناسب سوال ہے اور صحیح مشاہدہ پر مبنی ہے۔ ہمارے معاشرے میں واقعتاً عورت بہت مظلوم ہے۔ اس کو ہمارے دین نے جو قانونی تشخص عطا کیا ہے اور اسے جو حقوق دیئے ہیں۔ اکثر و بیشتر ہم اس معاملے میں کوتاہی کرتے ہیں۔ اب صورت حال کی اصلاح کے لئے اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارا اپنا قلبی' ذہنی اور عملی تعلق دین کے ساتھ مضبوط ہو۔ ہمارا اللہ پر' اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حقیقی ایمان ہو اور ہم اس بات پر کامل یقین رکھتے ہوں کہ جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے بتایا ہے وہی صحیح ہے اور اس پر عمل کرنا ہم پر واجب ہے' فرض ہے۔ اگر نہیں کریں گے تو ہمارا آخرت میں کڑا محاسبہ ہو گا۔ اگر دل میں یہ یقین موجود ہے اور ذہن میں بھی یہ انشراح اور اطمینان موجود ہے کہ جو نظام زندگی اپنی تمام جزئیات کے ساتھ ہمیں اللہ کی طرف سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے ملا ہے وہی مبنی بر حق اور مبنی بر عدل نظام ہے۔ اسی میں ہمارے لئے خیر ہے' بھلائی ہے اور اسی میں ہمارے لئے برکات ہیں۔ جب فکر و نظر اور قلب و ذہن میں یہ باتیں راسخ ہو جائیں گی تو اللہ تعالیٰ نے جس جس کے حقوق و فرائض کا تعین فرما دیا ہے ان کو ہر شخص اپنے آپ ادا کرنے کی فکر کرے گا اور پھر ہر ایک کے ان حقوق کو ادا کرنے کے لئے دل سے آمادہ رہے گا اور اپنے ان حقوق پر قانع رہے گا جو شریعت اسلامی نے معین کر رکھے ہیں۔

آج ہم نے خاندانی زندگی میں افراط و تفریط کی جو دو انتہائیں پیدا ہو سکتی ہیں ان کو کچھ سورہ طلاق کے حوالے اور کچھ سورہ تحریم کی ابتدائی دو آیات کے حوالے سے سمجھا۔ اصل چیز توازن اور اعتدال ہے۔ اگر خاندانی زندگی میں توازن و اعتدال نہ ہو تو اس میں کجی پیدا ہو جائے گی۔ عدم توازن پیدا ہو جائے گا۔ پھر یہ ٹیڑھ اور عدم توازن پورے معاشرے کو متاثر کرے گا اور بگاڑ کا سبب بن جائے گا لہٰذا خاندانی نظام کے متعلق ہمارے دین کی جو بنیادی تعلیمات ہیں ہمیں ان کو اچھی طرح سمجھ کر اپنے اپنے گھروں میں اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

ہر محفل کا میزبانِ خصوصی
رُوح افزا
تقریب کی نوعیت پر منحصر نہیں۔ کوئی موقع ہو کیسی ہی محفل ہو
ضیافت اور مہمان نوازی کے لیے رُوح افزا پیش پیش۔
فرحت، تازگی اور توانائی کے لیے بے مثال
رنگ، خوشبو، ذائقے، تاثیر اور
رُوح پاکستان۔ رُوح افزا
راحت جان۔ رُوح افزا
خدمت خلق رُوح اخلاق ہے
ADARTS
HMD-6/87

(دوسری قسط)

موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا طریق کار

انقلابِ نبویؐ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد کے خطباتِ جمعہ کا سلسلہ

—— ترتیب و تسوید: شیخ جمیل الرحمٰن ——
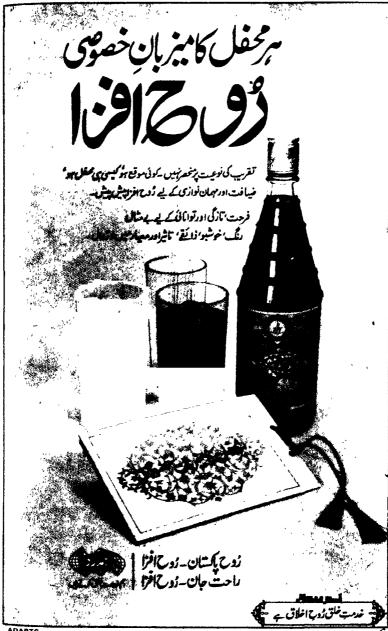
اقدام اور مسلح تصادم کا متبادل

آج کی متمدن دنیا میں باشندگان ملک کا یہ حق تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی رائے سے حکومت کو بدل سکتے ہیں ہر ملک کے آئین و دستور میں ایک واضح شق موجود ہوتی ہے۔ جس کے مطابق حکومت کی تبدیلی کے لئے ایک مقررہ مدت کے بعد ملک میں انتخابات ہوتے ہیں جن کے نتیجے میں عوام کی اکثریت کی حمایت حاصل کرنے والی جماعت بر سر اقتدار آ جاتی ہے اور عوام کا اعتماد کھونے والی جماعت اقتدار چھوڑ دیتی ہے۔ اور اگر عوام کی اکثریت کے نزدیک بر سر اقتدار حکومت ناقابل قبول ہو تو کسی سیاسی پارٹی کے زیر قیادت وہ انتخابی مدت سے قبل ملک میں از سر نو انتخابات کا مطالبہ کر سکتے ہیں اس مطالبہ کو حکومت وقت سے منوانے کے لئے وہ ملک بھر میں احتجاجی مظاہرے کرتے ہیں ان مظاہروں کا مقصد اپنی ناپسندیدگی کا اظہار اور حکومت کی برطرفی کا مطالبہ ہوتا ہے...... گویا عوام ان مظاہروں کے ذریعہ سے اپنی رائے اور اپنی طاقت کا اظہار کرتے ہیں احتجاجی مظاہروں کا یہ طریق کار جو عام طور پر ناپسندیدہ حکومت کی تبدیلی کے لئے استعمال ہوتا ہے ہم اسے اسلامی انقلاب کے لئے مسلح تصادم کے متبادل اقدام کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔

تقریباً چھتیس سال سے یہ میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ پاکستان میں حقیقی اسلامی نظام انتخابات کے راستے سے کبھی نہیں آ سکتا۔ انتخاب کا طریقہ یا نئے انتخابات کا مطالبہ حکومت بدلنے کے لئے تو کار آمد ہے۔ اس طریقے سے صرف ہاتھ بدلے جا سکتے ہیں 'کوئی نئی پارٹی بر سر اقتدار آ سکتی ہے۔ وہ پارٹی حکومت کے انتظامی ڈھانچہ میں مفید اصلاحات بھی کر سکتی ہے لیکن اس راستے سے نظام کی تبدیلی ناممکن ہے۔ نظام کی تبدیلی کا واحد راستہ صرف انقلاب ہے پاکستان میں توحید کی بنیاد و اساس پر کامل اسلامی نظام اگر قائم ہو سکتا ہے تو انقلابی طریق کار پر عمل کرنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ انتخابات

کا راستہ اس کام کے لئے غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر بھی ہے۔ چھتیس برس قبل جماعت اسلامی نے جو دراصل انقلابی طریق کار کے مطابق جدوجہد کرنے کے لئے بنائی گئی تھی' انتخابی راستے کو اختیار کر لیا تھا اس وقت میں نے کوشش کی کہ جماعت اس فیصلے پر نظر ثانی کرے اور انتخابات میں حصہ لینے کے طریقہ کو چھوڑ کر اپنے سابقہ طریقے کی طرف رجوع کرے...... میں نے جماعت میں رہتے ہوئے ایک مفصل بیان تحریر کر کے جماعت کے ارباب حل و عقد کے سامنے پیش کیا۔ لیکن میں جماعت کے ذمہ دار حضرات اور اس کی عظیم ترین اکثریت کو اپنے دلائل سے مطمئن نہ کر سکا۔ اس لئے مجھے اور میرے کچھ ہم خیال احباب کو بادل ناخواستہ جماعت سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی...... جماعت سے وابستگی کے دوران ہی میں بفضلہٖ تعالیٰ اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ اسلام کی بنیاد ایمان پر ہے اور ایمان کا منبع و سرچشمہ قرآن مجید فرقان حمید ہے لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک زبردست تحریک ایسی اٹھے جو ایک طرف جدید سوسائٹی کے اعلیٰ طبقات کے ذہین عناصر کے فکر و نظر میں ایسا انقلاب برپا کرے جو انہیں مادیّت و الحاد کے اندھیروں سے نکال کر توحید خالص کی روشنی میں لے آئے' ان کے دلوں میں ایمان و یقین راسخ کرے اور ان کو خدا پرستی کی دولت سے مالا مال کرے...... دوسری طرف یہ تحریک عوامی سطح پر دروس قرآن کے ذریعہ سے عوام الناس میں ایمان کی شمع کو فروزاں کرے تاکہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا کام انجام پا سکے...... الحمد للہ میں جب اس نتیجہ تک پہنچا تو میں نے خالصتاً اللہ پر توکل کرتے ہوئے بیک وقت دونوں سطحوں پر کام کا آغاز کر دیا...... اس کام کی بدولت اللہ تعالیٰ مجھ پر غور و فکر کی نئی راہیں کھولتا رہا اور موجودہ دور میں اسلامی انقلاب کے طریق کار کے دھندلے سے خاکے ذہن و شعور میں ابھرتے رہے۔ اسی دوران مجھے سیرت مطہرہ کے بالاستعاب مطالعہ کا موقع ملا جس کے نتیجے میں نہ صرف میں نے فلسفۂ انقلاب کو سمجھا بلکہ اللہ کے فضل سے مجھے یہ رہنمائی اور یہ فیضان بھی ملا کہ سیرت مطہرہ میں اسلامی انقلاب کے آخری دو مراحل یعنی اقدام اور مسلح تصادم کی تطبیق موجودہ دور میں کس طرح ہو گی۔ میرے نزدیک اب اسلامی انقلاب کا راستہ صرف یہ ہے کہ اگر ایک ایسی تنظیم وجود میں آئے جو پہلے چار مراحل ـــــــ دعوت تنظیم، تربیت اور صبر محض سے گذر چکی ہو تو وہ رائج الوقت نظام اور اس کو چلانے والے انتظامی ادارے (یعنی حکومت) کے مقابلہ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے کمر کس لے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر کھڑی ہو جائے صرف زبانی و کلامی بات کرنے کے بجائے علی الاعلان یہ کہے کہ اب فلاں فلاں منکر کام ہم ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔ یہ کام اب ہماری لاشوں پر ہو گا۔ پھر اس پر ڈٹ جائے اور ہر نوع کی مالی و جانی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہ کرے...... البتہ اس اقدام میں اس بات کا التزام و لحاظ ضروری ہو گا کہ انہی منکرات کو

چیلنج کیا جائے جو تمام مسالک کے ماننے والوں کے نزدیک مسلّم ہوں کسی مسئلہ میں اگر کسی کی شاذ رائے ہو کہ وہ منکر ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس پر تو تمام مسالک کے لوگوں کو جمع نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس پر کوئی تحریک ہی برپا کی جا سکتی ہے۔ ہدف اس کام کو بنانا ہو گا جو سب مسلمانوں کے نزدیک منکر ہو' جو سب کے نزدیک حرام ہو مثال کے طور پر بے حیائی' عریانی تبرج جاہلیہ 'مرد و عورت کے مخلوط اجتماعات کے سارے طور طریقے عورت کی بطور اشتہار تشہیر اور یوم پاکستان اور یوم استقلال کے مواقع پر فوج کے ساتھ اللہ کے آخری نبی حضرت محمدؐ کی معنوی نوجوان بیٹیوں کی سڑکوں پر مردوں کے سامنے سینہ تان کر پریڈ...... یہ سب وہ خلاف شریعت امور ہیں جن کے منکر ہونے کے بارے میں تمام مذہبی مکاتب فکر کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

موجودہ حالات میں اقدام کی صورت

...... جس معاشرہ میں نبی اکرمؐ کی بعثت ہوئی تھی' وہ جملہ اعتبارات سے خالص کافرانہ و مشرکانہ معاشرہ تھا جبکہ اب ہمیں جس معاشرہ سے سابقہ درپیش ہے وہ قانوناً مسلمانوں کا معاشرہ ہے اور ہمارے حکمران بھی قانوناً مسلمان ہیں لہٰذا انقلاب محمدیؐ کے مراحل میں سے آخری مرحلے یعنی مسلح تصادم کے بارے میں ہمیں اجتہاد و استنباط سے کام لینا ہو گا اور اس مرحلہ کو اقدام کے مرحلہ سے جوڑنا ہو گا اس کی عملی صورت کے بارے میں میری پختہ رائے یہ ہے کہ موجودہ دور میں اسلامی انقلابی جماعت منکرات یعنی خلاف شریعت کاموں کے خلاف مظاہروں کے ذریعے اقدام کا آغاز کرے گی۔ تمدنی ارتقاء نے ان مظاہروں کی بہت سی صورتوں سے دنیا کو روشناس کرایا ہے جن میں پکٹنگ یعنی دھرنا مار کر بیٹھنا' احتجاجی طور پر حکومت کو یا عوام کو کسی کام سے روکنے کے لئے گھیراؤ وغیرہ کرنا بھی شامل ہے۔ بالفاظ دیگر پر امن ذرائع سے کاروبار حکومت اور شہری زندگی کے معمولات میں خلل ڈالنا مظاہرے کا مقصد ہے۔

اقدام کی لازمی شرائط

البتہ اس موقع پر ان شرائط کا اعادہ ضروری ہے جن کو اس اقدام مظاہروں اور دیگر احتجاجی طور طریقوں کو اختیار کرنے کی صورت میں ملحوظ رکھنا لازم ہے...... یعنی طرف سے ہاتھ بالکل نہیں اٹھانا ہے۔ کسی قسم کی توڑ پھوڑ نہیں کرنی ہے۔ میں بڑی تفصیل سے دور کی مثالیں پیش کر چکا ہوں۔ تقریباً بارہ تیرہ برس تک مکہ مکرمہ میں صبر محض (PASSIVE RESISTANCE) کا جو معاملہ رہا ہے کہ ہر قسم کے جور و ستم اور ظلم و تشدد کو صحابہ کرام رضوا

علیہم اجمعین نے جس پامردی سے برداشت کیا ہے اپنی طرف سے جوابی کارروائی تو درکنار مدافعت تک نہیں کی۔ وہی طرزِ عمل اس اقدام یعنی مظاہروں ' گھیراؤ وغیرہ کے معاملہ میں اس انقلابی جماعت کو اختیار کرنا ہو گا۔ یہ نہیں کہ احتجاجی جلوس تو ہم نے نکالا تھا لیکن توڑ پھوڑ کوئی اور کر گیا...... یہ بات غلط ہے۔ اگر ایسی انقلابی جماعت کے اثرات اتنے نہیں ہیں کہ وہ عوام کو پرامن رکھ سکے اور نہ اس کے پاس ایسے کارکن ہیں جو عوام کو کنٹرول کر سکیں اور ہر نوع کی بدامنی کو قابو میں رکھ سکیں تو ایسی صورت میں مظاہروں کا اس تنظیم کو حق نہیں ہے۔ اس اقدام کا مرحلہ اسی وقت آئے گا کہ جب اس انقلابی جماعت کو اپنی امکانی حد تک یہ اندازہ اور معلومات حاصل ہوں کہ ہمارے اپنے زیر اثر اور ہمارے تربیت یافتہ لوگ اتنے ہیں کہ وہ پرامن طریق پر سڑکوں پر آ سکتے ہیں اور مظاہرے کر سکتے ہیں اور ان کی اخلاقی ساکھ اتنی مضبوط ہے کہ ان کے مظاہروں کے دوران بدامنی کا کوئی حادثہ نہیں ہو گا۔ ان کو اس بات کی قطعی ضرورت نہیں ہے کہ وہ شرپسندوں کا ایک ہجوم (MOB) بنا کر میدان میں آئیں۔ اور اگر چند شرپسند لوگ بدامنی پر اتر ہی آئیں تو ان کی تنظیمی طاقت اتنی مضبوط ہو کہ ان اشرار کی گردنیں وہ دبوچیں اس کے بجائے کہ حکومت کی انتظامیہ کو ان کی گردنیں دبوچنے کی ضرورت پیش آئے ' وہ خود ان پر قابو پا کر انہیں حکومت کے حوالے کریں کہ یہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ یہ تخریب کار عناصر ہیں جو اس پرامن اور عدم تشدد کی اسلامی تحریک کو سبوتاژ اور درہم برہم کرنے کے لئے آ گئے ہیں...... اس انقلابی تنظیم کے تربیت یافتہ جلوس نہ بسوں کو چلائیں گے نہ نیون سائنوں اور ٹریفک سگنلوں کو توڑیں گے نہ ہی وہ کسی نجی یا سرکاری املاک کو نقصان پہنچائیں گے...... ان جلوسوں اور مظاہروں کا مطالبہ یہ ہو گا کہ فلاں فلاں کام شریعت کی رو سے منکر ہیں ' حرام ہیں ' ہم ان کو کسی حال میں نہیں ہونے دیں گے۔ حکومت گرفتار کرے تو مظاہرین کوئی مزاحمت نہیں کریں گے۔ لاٹھی چارج کریں تو اسے جھیلیں گے۔ آنسو گیس کے شیل برسائے تو برداشت کریں گے۔ حتیٰ کہ گولیاں برسائے تو خوشی خوشی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کریں گے۔ لیکن نہ پیچھے ہٹیں گے اور نہ اپنے موقف کو چھوڑیں گے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

...... میں جب انقلابی طریق کار کی بات کرتا ہوں تو بعض حضرات کو یہ غلط فہمی لاحق ہو جاتی ہے کہ میں حکومت وقت کے خلاف بغاوت اور مسلح تصادم کی بات کرتا ہوں بعض حضرات دانستہ یہ غلط فہمی پیدا کرتے ہیں حالانکہ میں اپنی متعدد تقریروں میں یہ بات واضح کر چکا ہوں کہ انقلابی طریق کار کا مطلب لازماً یہ نہیں ہے کہ مسلح بغاوت اور تصادم ہو...... موجودہ دور میں یہ بات قریباً خارج از بحث ہے چونکہ اولاً تو سابقہ ایک ایسے معاشرے اور ایک ایسی حکومت سے ہے جو قانوناً مسلمانوں پر مشتمل ہے ثانیاً یہ کہ حکومت کے پاس باقاعدہ تربیت یافتہ اور جدید اسلحہ سے لیس

فوج موجود ہے جبکہ عوام الناس نہتے ہیں لہٰذا ان دونوں اعتبارات سے فی زمانہ مسلح تصادم اور بغاوت کے راستے ــــ معدوم کے درجے میں آتے ہیں چنانچہ اب ہمیں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں وہ طریقہ اختیار کرنا ہوگا جس سے دور جدید کے تمدنی ارتقاء نے لوگوں کو واقف کرایا ہے آج عوام عدم تشدد کے اصول پر پرامن اور منظم مظاہروں کے ذریعے اپنے عزم اور اپنی قوت کا اظہار کرتے ہیں اس کے لئے ہمیں قرآن و حدیث سے جو رہنمائی ملتی ہے اسے میں "جہاد عن المنکر بالید" سے تعبیر کرتا ہوں۔

قرآن سے رہنمائی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ اس قرآن حکیم کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے'...... یعنی ہر دور میں اس سے انسان کو ہدایت ملتی رہے گی۔ زندگی کے مختلف ادوار میں' جیسے جیسے انسانی ذہن اور تمدن کا ارتقاء ہو گا' یہی قرآن انسان کی انگلی پکڑ کر لے چلے گا اور ہر ہر مرحلہ پر یہ ہدایت دے گا...... مطالعہ قرآن کے دوران ایک مرتبہ اچانک میرا ذہن اس طرف متوجہ ہوا کہ قرآن مجید میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے۔ ایک روز میں نے بیٹھ کر قرآن مجید کی ان آیات کی ایک فہرست مرتب کی جن میں اس پر انتہائی زور ہے۔ دعوت کا حکم اتنے زور شور کے ساتھ آپ کو قرآن مجید میں نہیں ملے گا۔ آپ کو ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ...... الخ یا ومن احسن قولا ممن دعا الی اللّٰہ والی آیات مل جائیں گی۔ تبلیغ کا قرآن مجید میں عام مسلمانوں کے لئے حکم ملے گا ہی نہیں۔ وہاں تو تبلیغ کا حکم آیا ہے صرف حضورؐ کے لئے یایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک۔ وہ تو نبی اکرمؐ نے اسے تمام اہل ایمان کے لئے عام کیا ہے کہ بلغوا عنی ولو آیۃ "پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت"۔ البتہ قرآن مجید میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر بہت سی آیات ہیں

اس کام کی خود اللہ کی طرف نسبت

سورۃ النحل کی وہ آیت جو آپ حضرات اکثر خطبات جمعہ کے آخر میں سنتے ہیں۔ اس میں اس کام کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی ہے کہ وہ خود یہ کام کرتا ہے ان اللہ یامر بالعدل و الاحسان و ایتای ذی القربی و ینھی عن الفحشاء و المنکر و البغی "اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔" (سورہ نحل۔ آیت۔ ۹۰)

یہاں پر معروف کے تین شعبے بیان ہوئے عدل' احسان اور صلہ رحمی یہ معروف کے تین شعبے ہیں۔ پھر فواحش کی' نامعقول کاموں کی اور سرکشی کی ممانعت بیان ہوئی۔ یہ منکرات کے تین شعبے ہوئے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ اس کام کی اپنی طرف نسبت فرمارہا ہے کہ وہ خود معروف کا حکم دیتا اور بدی سے روکتا ہے۔

قرآن مجید کے دوسرے مقامات

اب آیئے دوسری آیات کی طرف...... حضرت لقمان کی نصیحتوں میں اس کا بڑے شدومد سے بیان آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان کی نصائح کا قرآن مجید میں ذکر فرما کران کو دوام عطا فرمادیا ہے۔ ان نصائح میں یہ بھی ہے

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَ اْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اصْبِرْ عَلٰى مَا اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ

"اے میرے پیارے بچے' نماز قائم رکھ اور نیکی کا حکم دے اور بدی سے روک۔ اور اس کام کی انجام دہی میں جو بھی تکلیف و مصیبت آئے اسے جھیل' برداشت کر' صبر کر' اس لئے یہ کام بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے"۔

سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۵۷ میں نبی اکرمؐ کی جہاں بہت سی شانیں بیان ہوئی ہیں وہاں یہ بھی ہے يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ خود حضورؐ کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہؐ معروف کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں۔

بنی اسرائیل پر تنقیدیں

بنی اسرائیل پر ایک فرد قرارداد جرم تو وہ ہے جو سورہ بقرہ کے رکوع پانچ سے چل کر رکوع دس پر ختم ہوتی ہے۔ مزید بر آں مختلف مقامات پر ان پر جو تنقیدیں ہوئی ہیں ان میں بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق اس لئے بھی بنے کہ انہوں نے یہ کام چھوڑ دیا...... ان آیات میں یہ بات نوٹ کیجئے گا کہ پورا زور نہی عن المنکر پر ہے۔ یعنی بدی کو نہ روکنا اور اس فریضہ کو ترک کر دینا زیادہ بڑا جرم ہے امر بالمعروف کو چھوڑ دینے کے مقابلہ میں...... اس لئے کہ منکرات ہی وہ شے ہے جس سے معاشرے میں گندگی پھیلتی ہے۔ جس سے معاشرہ میں فساد متعدی ہو جاتا ہے۔ اور پھیلتا چلا جاتا ہے اور ماحول اتنا خراب ہو جاتا ہے کہ اس میں امر بالمعروف بے اثر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سورہ مائدہ آیت ۶۳ میں فرمایا

لَو لَا يَنْهٰهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۝

"کیوں نہیں منع کرتے ان کے درویش (صوفیا) اور علماء ان کو گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے۔ بہت ہی برے عمل ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔"

اسی سورہ کی آیت ۷۹ میں فرمایا۔

كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝

"یہ احبان واحبار وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے یہاں منکر پر عمل ہو رہا تھا تو وہ اس سے منع نہیں کرتے تھے کیا ہی بری روش تھی جس پر وہ چل رہے تھے لہٰذا یہ بھی برابر کے مجرم ہیں اور پاداش میں بھی برابر کے شریک ہوں گے۔"

اصحاب سبت کا واقعہ

سورہ اعراف میں (آیت نمبر ۱۶۳ سے لے کر ۱۶۶ تک) یہود کے اس قبیلہ کا ذکر ہے جس کا پیشہ ماہی گیری تھا۔ سبت (ہفتہ) کا دن ان کے ہاں صرف اللہ کی عبادت کے لئے مختص تھا اور اس دن ان پر مچھلی کا شکار کرنا حرام تھا۔ ان لوگوں کو حکم عدولی اور نافرمانی کی عادت تھی لہٰذا اللہ کی طرف سے یہ آزمائش آئی کہ ہفتہ کے دن مچھلیاں کنارے پر آ کر سطح آب پر خوب اٹھکیلیاں کرتی تھیں اور باقی دنوں میں غائب رہتی تھیں۔ ان لوگوں سے صبر نہ ہو سکا۔ صریح حکم الٰہی کے خلاف حیلے کرنے لگے۔ ہفتہ سے ایک دن پہلے (جمعہ کے دن) کناروں پر دریا کا پانی کاٹ کر حوض بنا لیتے اور جب مچھلیاں ہفتہ کے دن ان کے بنائے ہوئے حوضوں میں آ جاتیں تو نکاسی کا راستہ بند کر دیتے اور اگلے دن اتوار کو جا کر پکڑ لاتے۔ تاکہ اس حیلہ کی بنا پر ہفتہ کو شکار کرنے کا الزام ان پر نہ آئے۔ اس حیلہ سازی اور مکاری کے ضمن میں اس قبیلہ کے لوگ تین حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک تو یہی حیلہ ساز لوگ تھے جو دھڑلے کے ساتھ اس گناہ میں ملوث تھے۔ دوسرے لوگ وہ تھے جو اگرچہ اس حیلہ سازی اور نافرمانی میں شریک نہیں تھے لیکن ان کو اس سے روکتے بھی نہیں تھے۔ تیسرے وہ لوگ تھے جو ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑنے سے اور اس حیلہ سازی سے منع کرتے تھے۔ یعنی نہی عن المنکر کا فریضہ مسلسل ادا کرتے رہتے تھے۔ اور درمیانی قسم کے لوگ اس موخر الذکر گروہ سے کہتے کہ تم ان لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ چاہتا ہے کہ ہلاک کرے یا ان کو عذاب دے تو وہ جواب میں کہتے۔ قالوا معذرۃ الیٰ ربکم و لعلھم یتقون...... "وہ کہتے کہ (ہم اس لئے نصیحت کرتے ہیں کہ) تمہارے رب کے حضور میں معذرت پیش کر سکیں اور اس لئے بھی کہ شاید وہ لوگ تقویٰ کی روش پر آ جائیں، نافرمانی اور سرکشی سے باز آ جائیں"...... ان تینوں گروہوں کا ذکر

کر کے فرمایا کہ اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ یَنْھَوْنَ عَنِ السُّوْءِ۔ "ہم نے عذاب سے بچایا ان کو جو روکتے تھے اس برے کام سے" ...... یعنی درحقیقت وہ لوگ نجات کے مستحق بنتے ہیں جو لوگوں کو بدی سے روکنے کا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں۔ بدی سے صرف خود رکے رہنا نجات کے لئے کفایت نہیں کرے گا۔ جو لوگوں کو بدی سے روکتے نہیں ہیں وہ بھی ان لوگوں کے مانند گردانے جاتے ہیں جو بدی میں ملوث ہیں۔ چونکہ گندم کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ اس لئے جو روکتے نہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ برابر کے مجرم ہیں جو بدی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اصل میں بچنے والے وہ ہیں جو بدی سے روکنے والے ہیں۔ اس بات کو نبی اکرمؐ نے ایک انتہائی بلیغ تمثیل سے سمجھایا ہے۔ کہ "ایک جہاز میں کچھ لوگ عرشہ پر سوار ہیں، کچھ لوگ نیچے ہیں یعنی نچلی منزل میں ہیں۔ پانی عرشہ پر اسٹور کیا گیا ہے۔ نیچے والوں کو جب پانی لینا ہوتا ہے تب وہ اوپر آتے ہیں۔ اب جو لوگ عرشہ پر مقیم ہیں ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ پانی برتنوں سے چھلک بھی جاتا ہو گا۔ عرشہ والے ان لوگوں کے اوپر آنے جانے پر ناک بھوں چڑھاتے ہوں گے...... نیچے والوں نے سوچا کہ اوپر سے پانی لانے کے کام کو چھوڑو ہم ان کو کیوں ناراض کریں۔ ہم تو نیچے جہاز کے پیندے میں سوراخ کر لیتے ہیں، یہیں سے پانی لے لیا کریں گے، اب اگر اوپر والے ان نیچے والوں کا ہاتھ نہیں پکڑ لیتے تو جہاز ڈوبے گا اور صرف نیچے والے ہی نہیں ڈوبیں گے بلکہ اوپر والے بھی ڈوبیں گے"۔ گویا جو لوگ غلط کام اور بدی سے روکتے نہیں ہیں انجام کار کے اعتبار سے وہ ان لوگوں کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں جو بدی میں خود ملوث ہیں...... اس مثال سے بھی واضح ہوا کہ امر بالمعروف کے ساتھ اصل میں نہی عن المنکر ہی وہ شے ہے جو انسان کو نجات کا حق دار بناتی ہے۔

امت مسلمہ کیلئے احکام و ہدایات

اب آیئے قرآن مجید میں دیکھیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ضمن میں امت مسلمہ کو کیا ہدایات اور احکام ملے ہیں! سورہ آل عمران میں ارشاد ربانی ہے

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ	"تم وہ بہترین امت ہو جسے ہم نے نکالا ہے پوری نوع انسانی کیلئے۔ بین الاقوامی سطح پر تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دو اور بدی سے روکو اور تم اللہ پر اپنا ایمان پختہ رکھو۔"

بحیثیت امت یہ ہی تمہاری اجتماعی ڈیوٹی ہے۔ دوسری آیت وہ ہے کہ جس میں اس صورت حال

کی طرف رہنمائی فرمائی گئی ہے کہ جب امت خود مریض ہو گئی ہو۔ جب خود اسے اصلاح کی ضرورت ہو تو ایسی صورت حال میں کیا کیا جائے۔ !! اس کا حل سورہ ال عمران کی آیت نمبر ۱۰۴ میں پیش کیا گیا ہے۔

وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

"اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کاموں کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کریں برائی سے اور وہی پہنچے اپنی مراد کو" (ترجمہ از شیخ الہندؒ)

اس آیت مبارکہ سے ہمیں یہ رہنمائی ملی کہ کچھ لوگ تو ایسے ہوں جو جاگیں، ہوش میں آ جائیں۔ وہ مل جل کر ایک امت بنیں۔ یا امت کے اندر ایک امت بنائیں، جماعت کے اندر جماعت کی شکل اختیار کریں۔ ...... بڑی پارٹی تو وہی ہے یعنی امت مسلمہ۔ چاہے اس کی عظیم ترین اکثریت بے عمل یا فاسق و فاجر ہو۔ جو بھی کلمہ گو ہے وہ قانوناً امت محمدؐ میں شامل ہے۔ لیکن یہاں ہدایت اور رہنمائی کی جارہی ہے کہ اس بڑی امت میں سے ایک چھوٹی امت تشکیل پائے جو ان لوگوں پر مشتمل ہو جو خود حق پر چلیں اور معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنے کے لئے حق کی دعوت دیں۔ اس آیت کے آخری حصے میں تاکید کا اسلوب اختیار کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ کامیابی صرف ان لوگوں کے لئے ہے اور فلاح صرف وہی لوگ پائیں گے جو اس سہ نکاتی پروگرام یعنی دعوت الی الخیر۔ امر بالمعروف۔ نہی عن المنکر پر عمل کے فرض کی انجام دہی میں تن، من دھن کی بازی لگا دیں گے۔ اگر ہر شخص کلمہ گو ہونے کے ناطے فلاح کا امیدوار بنا بیٹھا ہے تو اس کی قرآن مجید میں بہرحال ضمانت موجود نہیں ہے۔ یہ ضمانت صرف ان کیلئے ہے جو اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ ان فرائض کی انجام دہی کے لئے کمر کس لیں اور تکلیفیں جھیلنے کے لئے تیار ہوں..... یہاں فلاح اور کامیابی سے دنیوی و آخروی فلاح و کامیابی دونوں مراد لینے کا قرینہ بھی موجود ہے۔

سورۃ توبہ کی آیات سے استدلال

سورہ توبہ کی آیت نمبر ۱۱۲ اس سلسلے کی بڑی عظیم، اور بڑی دلکش آیت ہے۔ اس آیت مبارکہ میں ظاہری و باطنی اوصاف بیان کئے گئے ہیں جو ایک بندۂ مومن کی سیرت و کردار میں درکار ہیں۔ ان میں تین تین اوصاف کے تین سیٹ (SETS) ہیں ایک طرف ان چھ اوصاف کا بیان ہے جو

ہونے کے اعتبار سے ایک بندہ مومن پر جو اجتماعی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کی ادائیگی کے لئے جو اوصاف چاہئیں وہ بیان ہو گئے۔ وہ بھی تین ہی بیان ہوئے۔ ایک آیت میں نو اوصاف جمع کر دیئے گئے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ

" (یہ مومنین جنھوں نے جنت کے عوض اپنی جان اور اپنا مال اللہ کے ہاتھ بیچ دیا ہے) اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے ہیں عبادت گذار ہیں اس کا شکر ادا کرنے والے 'اس کی ثنا کرنے والے ہیں اس (کے دین) کی خاطر زمین میں گردش کرنیوالے ہیں 'اس کے حضور میں رکوع کرنے والے ہیں۔ سجدہ کرنے والے ہیں۔ "

یہ چھ اوصاف وہ ہیں جو انفرادی ہیں ایک بندہ مومن کے اپنے لئے۔ یہ گویا تربیت و تزکیہ کے مراحل ہیں۔ یہ وہ اوصاف ہیں جنہیں میں علامہ اقبال کے اس مصرع کے حوالے سے بیان کرتا ہوں کہ

ع..... بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن

یہ نشہ درویشی کیا ہے اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ ...... یہ چھ اوصاف اگر حاصل ہو گئے تو علامہ اقبال کے بقول اب تم پختہ ہو گئے۔ اب کیا کرنا ہے!!

ع.....چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

اور اس آیت مبارکہ کی رو سے اگلا قدم کیا ہو گا! وہ ہو گا

اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

" نیکی کا حکم دینے والے ہیں۔ بدی سے روکنے والے ہیں اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ پس (اے نبیؐ ان) مومنین کو بشارت سنا دیجئے۔ "

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے ڈٹ کر کھڑے ہو جانے والے کہ اللہ کی حدود کو توڑنے نہیں دیں گے۔ منکرات کو ہم کسی طور پر برداشت نہیں کریں گے۔ ان تین آخری اوصاف میں کلید ہے اس مسئلہ کی کہ ایک مسلمان حکومت میں اسلامی نظام کے قیام اور نفاذ کے لئے جو انقلابی جماعت میدان میں آئے گی وہ اسی بنیاد پر آئے گی کہ صرف امر بالمعروف 'نہی عن المنکر اور تحفظ حدود اللہ کے لئے پرامن اور عدم تشدد پر مبنی مظاہرے کرے گی 'گھیراؤ کرے گی۔ دھرنا مار کر بیٹھے گی اور ترک موالات کے تمام طور طریقے اختیار کرے گی۔

...ِ نفاق اور اہلِ ایمان کی روش کا تقابل

اسی سورہ توبہ کی آیت نمبر ۶۷ اور آیت نمبر ۷۱ میں اہل نفاق اور اہل ایمان کی روش اور طرز عمل تقابل پیش کیا گیا ہے۔ منافقین کے رویہ کے متعلق فرمایا۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ○ یَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ یَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ (الخ)	"منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے سے ہی ہیں، سب کی ایک ہی روش ہے۔ یہ معاشرہ میں بری باتوں اور برے کاموں کو ترویج دیتے ہیں ان کی ترغیب دیتے ہیں اور خیر اور نیکی کے کاموں کے فروغ کو روکتے ہیں"

آگے آیت نمبر ۷۱ میں اہل ایمان کے طرز عمل کے لئے فرمایا کہ

وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ......	"اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق اور مدد گار ہوتے ہیں بھلے اور نیک کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔"

اب ذرا اس بات پر غور کیجئے اس وقت تمام مسلم معاشروں میں جو لوگ مسند اقتدار پر برا جمان ...ں اور جن کے قبضے میں ملک کا نظام تعلیم ذرائع اعلام و ابلاغ اور مملکت کے سارے وسائل ہیں وہ ...ن خصوصیات کے حامل ہیں۔ وہ فحاشی کے علمبردار ہیں، بے پردگی اور بے حیائی کے مبلغ ہیں۔ ہر ...ع کی اباحیت کو ماننے والے اور اس کے پرچارک ہیں۔ یہی طبقہ ہے جو شریعت کی حدود اور پابندیوں ...توڑنے پھوڑنے کے لئے نہایت منظم طور پر مسلم معاشروں میں مصروف عمل ہے۔ اجتماعی زندگی ...ے تمام شعبے ان کی ترک تازیوں کی جولان گاہ بنے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کون ہیں! قانوناً مسلمان...... ...ن سورہ توبہ کی آیت نمبر ۶۷ میں انہیں منافقین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک مسلم معاشرہ کیلئے کھلے ...فروں، منکروں اور غیر مسلموں سے کہیں زیادہ خطرناک عنصر ان منافقین کا ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ ...ستیں کے سانپ کا رول ادا کرتے ہیں۔

سورہ حج کی آیت نمبر ۴۱ میں تمکن فی الارض یعنی اللہ کی طرف سے حکومت ملنے کے بعد اہل ...مان کے بنیادی فرائض بیان فرمائے گئے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا	"وہ لوگ جنہیں ہم زمین میں تمکن واقتدار عطا فرمائیں تو وہ نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا

بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ...... کرنے کا نظام قائم کریں گے اور نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے"

یہ آیت مبارکہ ایک اسلامی حکومت کے بنیادی و اساسی فرائض کے تعین کے لئے نص قطعی کے مقام کی حامل آیت ہے۔

منکر ہی اصل فساد ہوتا ہے

نہی عن المنکر کے بارے میں سورہ ہود کی آیت نمبر ۱۱۶ پر بھی غور کر لیجئے

"پھر کیوں نہ اُن قوموں میں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں ایسے اہل خیر موجود رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت کم، جن کو ہم نے ان قوموں میں سے بچا لیا، ورنہ ظالم لوگ تو انہی مزوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان انہیں فراوانی کے ساتھ دیئے گئے تھے اور وہ مجرم بن کر رہے۔ تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ناحق تباہ کر دے حالانکہ ان کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں۔"

اس آیت میں سابقہ رسولوں کی امتوں کا بیان ہے کہ جب رسولوں کی امتیں بگڑتی ہیں اور دین کی تعلیمات کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہیں تو ایسی امتوں کو ہلاک کیا جاتا ہے اور صرف ان تھوڑے سے لوگوں کو بچا لیا جاتا ہے جو نہی عن الفساد کا فریضہ انجام دیتے رہتے تھے۔

اللہ کی طرف سے رہنمائی

میں نے قرآن حکیم کے مختلف مقامات سے جو متعدد آیات آپ کو سنائی ہیں اس سے یہ بات اظہر من الشمس کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" ہمارے دین کے اندر کس قدر اور کتنی عظیم اہمیت کی حامل شے ہے۔ ان آیات پر غور و فکر اور استحضار کے نتیجہ میں مجھے یہ رہنمائی ملی کہ جب امت محمدؐ میں دین کے احیاء اور دین کو بتمام و کمال قائم و نافذ کرنے کا مسئلہ آئے گا اور پورے فاسد و استحصالی نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر توحید کی بنیادوں پر پورے نظام کو استوار کرنے کا مرحلہ آئے گا تو درحقیقت اقدام کا یہی راستہ ہو گا کہ ایک منظم اور تربیت یافتہ اسلامی انقلاب امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور تحفظ حدود اللہ کے لئے پرامن مظاہروں اور ان تمام طریقوں سے حکومت وقت کو مجبور کر دے کہ وہ معروفات کی ترویج کرے۔ منکرات کو روکے اور ان کا قلع قمع کرے اور حدود اللہ کو نافذ کرے۔ بغاوت کا کوئی راستہ نہیں۔ کسی حکومت کے خلاف

کھڑے ہو کر اعلان بغاوت کرنے اور قوم کو خانہ جنگی میں مبتلا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ حکومت کی طالب وہ انقلابی جماعت ہو گی نہیں۔ حقیقی اسلامی جماعت کبھی بھی اقتدار کی طالب بن کر میدان میں نہیں آتی۔ اس کا تو صرف یہ مطالبہ ہو گا کہ جب مسلمانوں کا معاشرہ ہے اور مسلمان ہی حکمران ہیں تو دین کو صحیح شکل میں قائم و نافذ کرو اور اس کے خلاف جو کچھ ہے اسے ختم کرو۔ نہیں کرتے تو پھر ہم میدان میں موجود ہیں۔ پھر ہمارے سینے حاضر ہیں 'گولیاں چلاؤ۔ پھر ہمارے سر حاضر ہیں 'لاٹھیاں برساؤ۔ پھر ہم حاضر ہیں کہ دار و رسن کے حربے ہم پر آزماؤ اس ابتلا اور امتحان میں ڈٹے رہنا ہے 'پیچھے نہیں ہٹنا ہے 'کھڑے رہنا ہے۔ یہ حکم کیا تھا کہ تمہیں دہکتے انگاروں پر لٹایا جا رہا ہو تو لیٹ جاؤ '۔ مکہ کی گرم اور سنگلاخ زمین پر تمہیں جانور کی طرح گلے میں رسی ڈال کر پیٹھ بل گھسیٹا جا رہا ہو تو اف نہ کرو۔ ہاتھ مت اٹھاؤ۔ تمہیں جوابی کارروائی کی اجازت نہیں ہے...... یہی میرے نزدیک موجودہ دور میں اسلامی انقلاب کا صحیح راستہ ہے۔ اسی کو میں "صبر محض" اور "پر تحمل مزاحمت" سے تعبیر کرتا ہوں۔

احادیث شریفہ اور فریضۂ نہی عن المنکر

قرآن کی طرح احادیث رسول ؐ میں بھی اس مسئلے پر رہنمائی کا وافر سامان موجود ہے۔ صحیح مسلم ...دو حدیثیں پیش خدمت ہیں۔ ان پر جب آپ غور کریں گے تو آپ پر منکشف ہو گا کہ رسول اللہ ...لی اللہ علیہ وسلم ہمیں کامل رہنمائی دے گئے ہیں ہمیں اندھیروں میں ٹھوکریں کھانے کے لئے ...یں چھوڑ گئے...... مکان و زمان کے فرق کو ملحوظ رکھ کر حضورؐ کے ان ارشادات سے مختلف مراحل ...لئے ہدایت و رہنمائی مستنبط اور اخذ کی جا سکتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہماری نیتیں خراب ...ر' عافیت مطلوب ہو' صرف کھانا کمانا پیش نظر ہو' بچوں کی پرورش اور ان کو اعلیٰ تعلیم دلانا ہی ...کی کا مقصود بن گیا ہو تو یہ ہماری محرومی ہے...... لیکن اگر وفاداری ہے اللہ کے ساتھ۔ اگر ...اری ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جیسے علامہ اقبال مرحوم نے کہا۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں\
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

...ن واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی وفاداری اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفاداری آسان کام ...ہے۔ اس کے لئے ارادہ پیدا ہو جائے تو جمود و تعطل توڑ کر میدان میں آنا پڑے گا۔

...پہلی حدیث کے راوی ہیں حضرت ابو سعید الخدری ؓ اس روایت میں اختصار و ایجاز ہے۔ وہ ...ت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَن رأیٰ منکم منکراً فلیُغیّرہ بیدہٖ و ان لّم یستطع فبلسانہٖ و ان لّم یستطع فبقلبہٖ و ذٰلک اضعف الایمان

"جو کوئی تم میں سے برائی کو دیکھے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ یعنی طاقت سے بدل دے۔ اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے اسے برا کہے اور اسے بدلنے کی کوشش کرے۔ اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے دل سے برا جانے اس پر دلی کرب محسوس کرے۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے......"

اسی حدیث کی دوسری روایت کے آخری ٹکڑے میں یہ الفاظ آئے ہیں۔

وَ لَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّۃُ خَرْدَلٍ

"ان تین حالتوں میں سے اگر کوئی بھی نہیں ہے تو ایسا شخص جان لے کہ اس شخص کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان موجود نہیں ہے۔"

یہ آخری ٹکڑا آپ کو دوسری حدیث میں بھی ملے گا جس کی توضیح و تشریح میں آگے کروں گا۔

اب خاص طور پر دیکھئے کہ اس حدیث میں امر بالمعروف کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا گیا۔ حکم نہیں دیا گیا...... وہ حکم اپنی جگہ قرآن مجید میں ہے' اس کی نفی مقصود نہیں ہے۔ البتہ اس حدیث میں سارا ذکر نہی عن المنکر کا ہے۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کا اسلوب دیکھئے فرمایا کہ...... من رای منکم منکراً فلیغیّرہ بیدہ جو شخص بھی تم میں سے منکر کو دیکھے اس لازم ہے' واجب ہے' فرض ہے کہ اسے ہاتھ سے روکے' اسے طاقت سے روکے' یہاں " یغیر کے فعل امر کے ساتھ کلمہ فا اور کلمہ لام آیا ہے۔ یہاں لام' لام امر ہے' جو وجوب' تاکید اور لزو کے لئے آتا ہے۔ پھر اس سے قبل کلمہ 'فا' سے اس میں مزید زور پیدا ہو گیا...... آگے بھی ا فلیغیرہ کا عمل جاری رہے گا۔ فرمایا و ان لم یستطع فبلسانہ اگر طاقت سے روکنے کی استطاع نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے۔ کہے تو سہی کہ اللہ کے بندو! باز آجاؤ' اس راستہ پر مت جاؤ۔ یہ حر کا راستہ ہے' یہ اللہ کی نافرمانی کا راستہ ہے۔ یہ شیطان کا راستہ ہے' یہ طاغوت کا راستہ ہے۔ زبا سے کہے۔ و ان لم یستطع۔ اگر یہ بھی نہیں کر سکتا۔ اتنا بھی دم نہیں' اتنی بھی استطاعت نہ ہے۔ یا زبانوں پر تالے ڈال دیئے گئے ہیں تو فبقلبہ۔ دل میں بدی کے خلاف شدید نفرت تو رکھے اس پر دل میں گھٹن تو رکھے...... "و ذٰلک اضعف الایمان" اور یہ یعنی دل سے برا جاننا' دل میں برائیوں پر کرب محسوس کرنا ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ عربی زبان میں اضعف ' SUPPERLATIVE DEGREE ' ہے۔ اس سے آگے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اگر ا میں نفرت بھی نہ رہے تو ایمان ہی گیا۔ پھر وہی بات ہو گی جو علامہ اقبال نے کہی ہے کہ ۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جب یہ احساس بھی ختم ہو گیا تو جان لیجئے کہ دل والا حقیقی ایمان بھی رخصت ہوا۔

اس حدیث کے مفہوم کے ضمن میں البتہ ایک احتیاط پیش نظر رکھنی اشد ضروری ہے۔ لوگ عام طور پر غور نہیں کرتے۔ اس حدیث میں جو تین مدارج بیان کئے گئے ہیں وہ اس اعتبار سے نہیں ہیں کہ جو شخص نیچے کھڑا ہے وہ نیچے ہی کھڑا رہے۔ جو شخص درمیانی درجہ میں ہے وہ وہیں رہے۔ بلکہ ایسے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ مسلسل کوشش کرے کہ اگر آج طاقت حاصل نہیں ہے کہ منکر کو طاقت سے روک سکے تو طاقت حاصل کرے۔ وہ جو علامہ نے کہا ہے ؎

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

اگر آپ نہی عن المنکر اعلیٰ اور بلند ترین سطح پر کرنا چاہتے ہیں تو وہ طاقت کے ساتھ ہے۔ اگر طاقت نہیں ہے تو طاقت فراہم کیجئے۔ اس طاقت و قوت کو فراہم کرنے کی سعی و جہد کرنا بھی فرض کے درجہ میں ہو گا۔ لیکن اگر کوشش کے باوجود اتنی جمعیت فراہم نہیں ہو پا رہی کہ منکرات کے خلاف منظم اور پرامن طور پر طاقت کا مظاہرہ کیا جا سکے تو بہر حال اس وقت تک زبان سے منکر کو منکر کہنا اور اس کے خلاف زبان سے جہاد کرنا لازم ہے۔ اگر اس کا بھی امکان نہیں ہے تو دل سے نفرت کرنا لازم ہے۔ لیکن یہ نہیں ہونا چاہئے کہ انسان نچلی منزل پر قانع ہو کر بیٹھ جائے چونکہ یہ وہ نازک ترین مقام ہے کہ اگر ذرا سی بھی چوک ہو گئی اور کسی منکر کے خلاف دل میں نفرت، کراہیت اور کرب کے جذبات پیدا نہیں ہوئے تو ایمان کے لالے پڑ جائیں گے۔ یہ تو وہ آخری حد ہے کہ جس سے باہر قدم نکلتے ہی انسان ایمان کے دائرہ سے خارج ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اگر کوئی شخص ایمان کی کمزور ترین حد کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا ہوا ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس حد سے نکل جانے میں آنکھ جھپکنے سے زیادہ کا وقفہ درمیان میں نہیں آئے گا۔

لازمی تقاضہ

اس حدیث مبارکہ کے اسلوب پر غور و تدبر سے یہ لازمی تقاضا سامنے آتا ہے کہ منکر کو مٹانا اسے برا کہنا اور اسے برا سمجھ کر اس سے نفرت کرنا ہر مسلمان پر واجب اور فرض ہے۔ سب سے نچلے درجے پر ہرگز قانع نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ لازم ہے کہ وہ طاقت حاصل کرنے اور جمعیت فراہم کرنے کے لئے دل و جان سے کوشش کی جائے۔ لوگوں کو تیار کیا جائے کہ منکرات کو مٹانے اور بدلنے کے لئے اپنی جانیں تک دینے کے لئے آمادہ ہوں۔ جب تک طاقت حاصل نہ ہو زبان سے بھی منکر کو

منکر کہنے کا عمل جاری رہے۔ صاحبان اقتدار کو نرم و گرم طور پر اس طرف متوجہ کیا جاتا رہے۔ اس دوران دل میں منکرات کے خلاف نفرت پروان چڑھتی رہے تاکہ جب ان کو طاقت و قوت کے ساتھ بدلنے کا مرحلہ آئے تو جذبات میں منکرات کے خلاف جوش و خروش کا طوفان موجزن ہو ۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی مسلمان ماحول کے رنگ میں رنگا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ دل کی نفرت کم ہو اور پھر ماحول اس پر چھا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کل وہ جس کام کو برا کہہ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا آج وہ خود اس میں ملوث ہو جائے۔

علماء بنی اسرائیل کی اسی روش کا تذکرہ حدیث میں ملتا ہے۔ ارشاد رسالت مآب کا مفہوم یہ ہے کہ یہود کے عالموں کا سب سے بڑا جرم ہی یہ تھا کہ جب ان کے امراء نے غلط کام کرنے شروع کئے تو ابتداء میں تو علماء نے ان کو ٹوکا کہ شریعت کی رو سے یہ برا اور غلط کام ہے لیکن ان کے ساتھ مجلسی تعلق بھی قائم رکھا۔ ان کے ساتھ کھانا پینا ترک نہیں کیا۔ ان امراء کے دسترخوان کی لذتیں ان کو کھینچ کھینچ کر بلاتی رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ بھی اسی رنگ میں رنگے گئے' درحقیقت جب تک انسان ایسے لوگوں کے ساتھ مقاطعہ کی روش اختیار نہ کرے۔ جس کا اقرار دعائے قنوت میں ہم روزانہ کرتے ہیں "نخلع و نترک من یفجرک" اے اللہ جو بھی تیرا نافرمان ہو گا اور فاجر و فاسق ہو گا ہم اس سے قطع تعلق کریں گے' اسے ہم چھوڑ دیں گے' اس کے ساتھ ہم دلی محبت کا کوئی رشتہ استوار نہیں کریں گے'۔ اس وقت تک نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہیں پا سکے گا ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر کوئی شخص کسی فاسق کے ساتھ چلتا ہے تاکہ اسے تقویت پہنچائے تو اللہ کے غضب کی وجہ سے عرش کانپنے لگتا ہے۔"

صحیح مسلم کی دوسری حدیث کے راوی حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ہیں ان کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ وہ فقہ جسے آج ہم فقہ حنفی کے نام سے جانتے ہیں سلف میں فقہ ابن مسعود کہلاتی تھی۔ اس لئے کہ اس کے اصل بانی حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ تھے جس کا شمار کبار صحابہؓ میں ہوتا تھا۔ وہ کوفہ میں آباد ہو گئے تھے۔ انؓ کے شاگرد کے شاگرد امام ابو حنیفہؒ ہیں۔ اس حدیث میں نہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی کے مسئلہ کو نہایت تشریح اور وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

اَنَّ رَسُولُ اللّٰهِ صلّى اللّٰه عليه وسلم قال: مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِي أُمَّةٍ قبلي اِلَّا كان له من امّته حواريّون واصحابٌ يأخذون بِسُنَّتِهِ و يقتدون بِامرهِم ثُمَّ انّها تخلف مِن بَعدهِم خُلُوفٌ يقولون مالا يَفعلون ' و يفعلون مالا يؤمرون فمن جاهدهم بيدهٖ فهو مؤمنٌ ' و من جاهدهم بلسانه فهو

مومنٌ ' وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ ' لَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْإِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ

" رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کے بعد اس کی امت میں اس کے حواریوں اور اصحاب نے اسکی سنت کو قائم نہ کیا ہو اور اس کے احکام کی پیروی نہ کی ہو۔ پھر ان کے جانشین ایسے لوگ بن جاتے ہیں جن کے قول اور فعل میں تضاد ہوتا ہے اور وہ ایسے کام کرتے ہیں جن کا انہیں حکم نہیں دیا گیا بس جو ان کے خلاف ہاتھ (قوت) سے جہاد کرے وہ مومن ہے ' جو ان کے خلاف زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان کے خلاف دل سے جہاد کرے (یعنی دل میں انہیں برا سمجھے) وہ مومن ہے مگر اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔

گویا ایسا ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ نبی اور اس کے حواریوں اور اصحاب کے انتقال کے بعد رفتہ رفتہ انحطاط ' اضمحلال اور زوال شروع ہو جاتا ہے۔ ہمارے یہاں تین ادوار ہیں جن کو حضور ؐ نے خیر قرون سے تعبیر فرمایا ہے یعنی نبی اکرم اور آپ کے صحابہ کا زمانہ۔ تابعین کا زمانہ اور پھر تبع تابعین کا زمانہ ایسے ادوار کے گذرنے کے بعد انحطاط و اضمحلال اور زوال کی صورت شروع ہوتی ہے۔ بعد میں آنے والوں کے قول و عمل میں تضاد ہوتا تھا۔ کہہ کچھ رہے ہیں کر کچھ رہے ہیں۔ زبان پر اسلام کا اقرار ہے ' اس کی مداح سرائی ہے ' عمل میں اسلام اور اس کے شعائر سے بغاوت ہے سرکشی ہے ' اعراض ہے ' روگردانی ہے۔ پھر ان کے افعال و اعمال ایسے ہوتے تھے جن کا کوئی حکم ' جن کی کوئی سند ان کے دین میں موجود نہیں ہوتی تھی۔

حدیث کے آخر میں ایمان کے جو درجات بیان کئے گئے ہیں ان سے اس ناخلف طبقہ کے خلاف اقدام سے جو عموماً مسند اقتدار پر متمکن ہوتا ہے نہایت گہرا تعلق ہے اس حصہ سے ہمیں اقدام کے لئے ہدایت و رہنمائی ملتی ہے۔ دل سے جہاد کا مفہوم یہ ہے کہ منکرات اور ان کے فروغ کو دیکھ کر ایک بندہ مومن دل کی بے کلی میں مبتلا ہو جائے ' وہ ہر وقت کڑھے ' اس کی نیندیں حرام ہو جائیں۔ وہ اپنی بے بسی پر بے قرار اور مضطرب رہے۔ اس کے دل میں نفرت پروان چڑھتی رہے اور اس کا دل اس وقت کی جلد آمد کے لئے بے چین رہے کہ جس وقت وہ ایک منظم اسلامی انقلابی جماعت کے ساتھ مل کر نہی عن المنکر کے لئے میدان میں آسکے اور اپنے جسم و جان اور مال و منال کی قربانی کا نذرانہ پیش کر سکے۔ یا اگر اس میں صلاحیت و اہلیت ہے تو وہ خود کھڑا ہو اور ایسی انقلابی جماعت قائم کرنے کی سعی و جہد کرے۔

اس حدیث کا آخری حصہ جس کا حوالہ میں حضرت سعید الخدری رضؓ والی حدیث میں بھی دے چکا ہوں، نہایت لرزا دینے والا ہے۔ اس کو سن کر دن کا چین اور رات کا آرام حرام ہو جانا چاہئے۔ اس لئے کہ ایسے شخص کے ایمان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نفی فرما رہے ہیں جس کا دل بھی منکرات اور ان کے فروغ کو دیکھ کر بے قرار، مضطر اور بیکل نہیں ہوتا۔
ایسے شخص کے بارے میں کونین کے مفتی اعظم حضرت محمدؐ کا فتویٰ یہ ہے کہ اس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں۔

وَلَیْسَ وَرَآءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّۃُ خَرْدَلٍ
"اور جان لو کہ اس کے بعد ایمان رائی کے دانہ کے برابر بھی موجود نہیں ہے۔"

اب ذرا غور فرمائیے کہ آخرت میں وہ لوگ کس مقام پر کھڑے ہوں گے جو اس دنیا میں قانوناً مسلمان اور مدعیٔ ایمان تھے اور مسند اقتدار پر بیٹھے منکرات کو فروغ دے رہے تھے۔ ان مدعیان ایمان کا کیا حال ہو گا جو ذرائع ابلاغ پر قابض تھے اور ان کو منکرات کی نشر و اشاعت کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ وہ لوگ کس حالت اور عالم میں ہوں گے جو حکمرانی کے بل بوتے پر منکرات کی سرپرستی کر رہے تھے اور ایسا ماحول اور ایسی فضا پیدا کرنے کے باعث بن رہے تھے جس میں معروفات سسک رہے تھے اور منکرات کے فروغ کے باعث معاشرہ سنڈاس بن رہا تھا......

اسلامی انقلاب کے لئے اقدام کے ضمن میں رہنمائی

میں نے مسلم شریف کی جو دو روایتیں آپ کے سامنے تشریح و توضیح کے ساتھ بیان کی ہیں، انہیں سامنے رکھئے۔ میرے نزدیک ان دونوں احادیث کو ہمارے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کلید کی حیثیت حاصل ہے اب راستہ یہ ہے کہ کسی مسلمان ملک میں دین کو اس کی کامل شکل میں قائم و نافذ کرنے کے لئے کوئی تحریک اٹھے۔ اس تحریک کے وابستگان خود اپنی انفرادی زندگیوں پر دین کو نافذ کر چکے ہوں۔ تربیت اور تزکیہ کے مراحل طے کر چکے ہوں۔ انہوں نے حرام کو بالفعل ترک کیا ہو اور سنت کو انہوں نے عملاً اختیار کیا ہو۔ پھر یہ لوگ منظم ہوئے ہوں۔ بنیان مرصوص بن چکے ہوں، یہ کسی تنظیم کے ساتھ منسلک ہو کر اس کے امیر کمانڈر اور قائد کے حکم پر ڈسپلن کے ساتھ حرکت کرنے کی صلاحیت پیدا کر چکے ہوں، سمع و طاعت کے عادی ہو چکے ہوں..... تو اب یہ لوگ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام طاقت کے ساتھ کریں گے! کھڑے ہو جائیں گے اور اعلان کریں گے کہ ہم منکرات کے کام نہیں ہونے دیں گے۔ یہ بات جان لیجئے کہ اپنے مطالبات منوانے کے

لئے پرامن طور پر قوت کا مظاہرہ کرنا اب دنیا میں ہر ملک کے رہنے والوں کا تسلیم شدہ حق ہے اگر سیاسی حقوق کے حصول اور بحالی کیلئے، مہنگائی کے خلاف یا کچھ دیگر قومی مسائل کے حل کے لئے مظاہرے کئے جاسکتے ہیں، پکٹنگ اور گھیراؤ کیا جاسکتا ہے تو دین نے جن کاموں کو منکرات قرار دیا ہے ان کے خلاف مظاہرے کیوں نہیں کئے جاسکتے! ان کو چیلنج کیوں نہیں کیا جاسکتا! لیکن یہ مظاہرے پر امن ہوں گے۔ کہیں فساد نہیں ہو گا کسی کو تکلیف نہیں ہوگی۔ قومی دولت کا کوئی ضیاع نہیں ہو گا۔ اس تنظیم کے وابستگان ساری تکلیفیں اپنے اوپر جھیلنے کے لئے تیار ہوں گے۔ ساری مصیبتیں خود برداشت کریں گے اپنی جان ہتھیلی پر لے کر میدان میں نکلیں گے اگر حکومت وقت گولیاں چلائے گی تو اپنے سینے پیش کریں گے۔

اگر یہ معاملہ ہو جائے اور یہ مرحلہ آجائے تو یہ بات جان لیجئے کہ آخر تا کجے۔ اس مسلمان ملک کی مسلمان پولیس کب تک لاٹھیاں برسائے گی اور مسلمان فوج کب تک گولیاں چلا کر ان نہتوں مظاہرین کو مارے گی جو صرف اللہ کے لئے منکرات کے خلاف نکلے ہوں۔ پھر یہ فوج کتنوں کو مارے گی ....!! یہ بات بھی اچھی طرح جان لیجئے کہ کوئی جابر سے جابر حکمران بھی ایک حد سے آگے نہیں جا سکتا۔

ایران کی مثال

اس کا سب سے بڑا نمونہ ہمارے سامنے شہنشاہ ایران کا انجام ہے۔ وہ شاہ ایران جس کے پاس ایشیاء میں سب سے بڑا اسلحہ خانہ تھا۔ جس کے پاس ساوک جیسی سفاک پولیس تھی۔ جس کے مقابلہ کی سفاک پولیس کسی کمیونسٹ ملک میں تو شاید موجود ہو' باقی دنیا میں اس کے مقابلے کی کوئی پولیس موجود نہیں...... جس طرح کے مظالم اس ایرانی پولیس نے ڈھائے ہیں اور جس خوفناک قسم کے اذیتیں (TORTURES) اس نے دی ہیں' اس کی مثال موجودہ دور کے کسی ملک میں مشکل ہی سے ملے گی۔ لیکن شہنشاہ ایران' جو خود کو "آریہ مہر" کہلواتا تھا جو سائرس ثانی بننے کا خواب دیکھ رہا تھا' اس کی ساری طاقت' اس کا سارا دبدبہ ان سرفروشوں کی قربانیوں کے آگے خس و خاشاک کی طرح بکھر کر رہ گیا جو اس کے خلاف مظاہروں کی صورت میں جان دینے کے لئے سڑکوں پر آگئے تھے اس کی پولیس عاجز آگئی اور فوج نے ان مظاہرین پر گولیاں چلانے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کو اپنا ملک چھوڑ کر فرار ہونا پڑا' حد تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد اسے اپنے وطن میں دفن ہونے کی جگہ بھی نہ مل سکی۔ اس کے دوست ملک نے اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جو کسی مہلک متعدی مرض میں مبتلا کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

حاصل کلام

اس ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ جب ایک منظم انقلابی جماعت راہ حق میں جان دینے کے لئے آمادہ ہو جائے' تو اسے ملک کے عوام کی اتنی اخلاقی اور عملی حمایت حاصل ہو جاتی ہے کہ پھر اسے کچلنا اور ختم کر دینا آسان نہیں رہتا۔ ایسی جماعت کو بغاوت کا اعلان کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی نہ ہتھیار اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ ع

"جب وقت شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں"

کوئی طاقت ایسے جانبازوں اور سرفروشوں کا راستہ نہیں روک سکتی۔

ممکنہ دوسرے نتائج

اس طریق کار کے تین ممکنہ نتائج نکل سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ حکومت اگر ان مظاہروں کے نتیجہ میں پسپائی اختیار کرے۔ یعنی منکرات کو ختم کرنا شروع کر دے تو ہمیں اور کیا چاہئے' ایک منکر کے بعد دوسرا منکر' دوسرے کے بعد تیسرا منکر۔ اگر ہم ایک ایک کر کے منکرات کو ختم کراتے چلے جائیں تو اسلامی انقلاب آ جائے گا۔ تبدیلی برپا ہو جائے گی۔ پورے کا پورا نظام صحیح ہو جائے گا۔ لیکن جب تک نظام مکمل طور پر اسلامی نہیں ہو گا یہ جدوجہد جاری رہے گی۔

دوسرا یہ کہ حکومت وقت اسے اپنی بقاء' اپنی انا اور اپنے مفادات کے تحفظ کا مسئلہ بنا لے اور طاقت سے اس اسلامی تحریک کو کچلنے کی کوشش کرے۔... اس موقع پر ذرا ٹھہر کر حکومت وقت' کی ماہیت و ہیئت کو سمجھ لیجئے کہ وہ کیا ہوتی ہے..... ! ہر حکومت کسی نہ کسی طبقہ کی نمائندگی کر رہی ہوتی ہے۔ وہ معاشرے کے کسی طاقتور طبقہ کے مفادات کی محافظ بن کر بیٹھی ہوتی ہے' اسلام کا نظام عدل و قسط ان طبقات کے لئے پیغام موت لے کر آتا ہے۔ لہٰذا حکومت وقت کسی ایسی تحریک کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرتی جس کے کامیاب ہونے کے نتیجہ میں سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ استحصالی نظام ختم ہو جائے اور اسلام کا عادلانہ و منصفانہ نظام قائم و نافذ ہو جائے۔.. لہٰذا وہ ریاست کی پولیس اور فوج کو اس تحریک کو کچلنے کے لئے بے دریغ استعمال کرے گی۔ لاٹھیاں برسیں گی' آنسو گیس کے شیل پھینکے جائیں گے۔ گولیوں کی بوچھاڑ آئے گی۔ گرفتاریاں ہوں گی۔ دار و رسن کے مراحل آئیں گے۔ لیکن اگر لوگ اللہ کی راہ میں قربانیاں حتیٰ کہ جان تک دینے پر تیار ہوں اور ثابت قدمی سے میدان میں ڈٹے رہیں تو پولیس کتنوں کو گرفتار کرے گی! جیلوں میں کتنی گنجائش ہو گی! کتنوں کو پھانسیاں دے گی! کتنوں پر لاٹھی چارج کرے گی! فوج کتنوں کو اپنی گولیوں سے بھونے گی! اگر تحریک کے کارکنوں نے صبر و ثابت قدمی کا ثبوت دیا تو میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ

بالآخر پولیس اور فوج جواب دے دے گی کہ یہ مظاہرین ہمارے ہی ہم مذہب اور ہم وطن ہیں۔ ہمارے ہی اعزا و اقربا ہیں۔ یہ لوگ اپنی کسی ذاتی غرض کے لئے میدان میں نہیں آئے ہیں بلکہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کے نفاذ کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے نکلے ہیں تو آخر ہم کب تک ان کو اپنی گولیوں سے بھونتے چلے جائیں!! نتیجہ یہ نکلے گا کہ حکومت کا تختہ الٹ جائے گا اور تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوگی[ل] جیسا کہ میں ایران کی مثال بیان کر چکا ہوں کہ شہنشاہ ایران جیسے آمر مطلق کو بھی ایسی صورت حال میں بہ حسرت و یاس ملک کو چھوڑ کر فرار ہونا پڑا...... تو یہ دو ممکنہ صورتیں تو تحریک کی کامیابی کی ہیں۔ ایک تیسرا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ حکومت وقت اس تحریک کو کچلنے میں کامیاب ہو جائے۔ تو جن لوگوں نے اس راہ میں جانیں دی ہوں گیں۔ ان کی قربانیاں ہرگز ضائع نہیں ہوں گی' وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر عظیم اور فوز کبیر سے نوازے جائیں گے انشاء اللہ العزیز۔ ہم نظام کو بالفعل بدلنے کے مکلف یعنی ذمہ دار نہیں ہیں البتہ اس کو بدلنے کی جدوجہد ہم پر فرض ہے مزید براں انہی جان نثاروں اور سرفروشوں کے خون اور ہڈیوں کی کھاد سے انشاء اللہ جلد یا بدیر کوئی نئی انقلابی اسلامی تحریک ابھرے گی جو طاغوتی استحصالی اور جابرانہ نظام کو للکارے گی اور اس طرح وہ وقت آ کر رہے گا جس کی خبر الصادق المصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے کہ پورے کرہ ارض پر اللہ کا دین اسی طرح غالب ہو کر رہے گا جس طرح آپؐ کی حیات طیبہ میں جزیرہ نمائے عرب پر غالب ہوا تھا۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات۔

[ل] ۱۹۷۷ء کی "نفاذ نظام مصطفیٰ تحریک" کے دوران جب بھٹو کی حکومت نے جزوی طور پر لاہور اور کراچی میں مارشل لاء لگایا تو اس کے دوران یہ صورت حال پیش آئی کہ دونوں شہروں میں مقرر کردہ مارشل لاء حکام نے فوج کو عوام پر گولیاں چلانے کا حکم دینے سے انکار کر دیا اور اپنے عہدوں سے استعفیٰ دیدیا۔ حکومت اور پی این اے کے نمائندگان میں مصالحتی گفتگو کے آغاز کی ایک وجہ یہ صورت حال بھی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ نتیجہ ایران کے برعکس نکلا۔ (مرتب)

بقیہ: عرضِ احوال

اس کا علاج صرف اس وقت شافی ثابت ہو سکتا ہے جب لوگوں کی اقدارِ خیر و شر کو بدلا جائے' کسی مصنوعی عمل اور محض زورِ بیان سے نہیں بلکہ رجوع الی اللہ کی ایک عمومی تحریک چلا کر اور عملی مثالیں قائم کر کے جو لازماً اوپر سے نیچے کی طرف آنی چاہئیں۔ ورنہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ رشوت اور بدعنوانی پر پہلے بھی تو سزائیں ہی مقرر تھیں' انعامات کا اعلان تو کبھی بھی نہیں کیا گیا۔ سزاؤں کی شدت بڑھنے سے اب تک کے تجربات کی روشنی میں جو نتیجہ متوقع ہے وہ صرف یہ ہو گا کہ خطرات میں اضافے کے ساتھ رشوت کو "نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز" کا نہایت ہی "مناسب" عذر میسر آ جائے گا۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

یہ سطور درد کی وہ چند ٹیسیں ہیں جو ماحول کی ابتری دیکھنے والے ہر صاحبِ دل پاکستانی کو لہو رلاتی ہیں ورنہ اگر قرار واقعی تجزیہ کیا جائے تو جگر لخت لخت کو جمع کرنا ممکن ہی نہ رہے۔ رہے وہ لوگ جنہیں دین کے حوالے سے اس ملکِ خداداد کی فکر لاحق ہے سو ان کی سوا مشکل ہے۔ "لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ" اور "وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ" کی خدائی تسلیاں اگر امید کی کرنیں نہ بنیں تو وہ مایوسی کے اتھاہ اندھیاروں میں ڈوب کر گم ہو جائیں..... ساتھیو! مشعلوں کو تیز کرو۔ تمہیں رجوع الی القرآن کے ذریعے تجدیدِ عہد' توبہ اور تجدیدِ ایمان کی تحریک برپا کرنی ہے۔

یہی تمہارے اپنے لئے اور تمہارے بھائی بہنوں کے لئے راہِ فلاح و نجات اور تمہارے وطن کی بقاء و سلامتی کا واحد جواز ہے۔ خیریتِ جاں' راحتِ تن اور صحتِ داماں اس جدوجہد میں لگا دو۔ اللہ کی نصرت کا وعدہ تمہارے ساتھ ہے تاہم ؏

گر جیت گئے تو کیا کہنا' ہارے بھی تو بازی مات نہیں

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

محاضراتِ قرآنی

مقبول الرحیم مفتی

مسئلہ سندھ اور استحکامِ پاکستان

گذشتہ برس امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تالیف "استحکام پاکستان" منظر عام پر آئی تو اسے پڑھ کر بہت سے لوگوں کو احساس ہوا کہ اس کتاب میں "استحکام پاکستان" کے طویل المعیاد منصوبے یعنی "اسلامی انقلاب" کی ضرورت تو ثابت کی گئی ہے لیکن وہ فوری علاج جسے ڈاکٹر صاحب اپنی تقریروں، خطبوں، بیانات اور انٹرویوز میں بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں، کا باب کسی وجہ سے لکھنے سے رہ گیا ہے۔ اور چونکہ گذشتہ برس کے محاضرات قرآنی کا عنوان بھی یہی کتاب تھی اس لئے اکثر مقررین اور مقالہ نگار حضرات نے اپنے اپنے انداز میں اس کمی کی نشاندہی بھی کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کمی کے ازالے کی صورت یوں پیدا کر دی کہ محاضرات کے فوراً بعد ڈاکٹر صاحب کو اندرون سندھ کا دورہ کرنے کا موقع ملا۔ دورے سے واپس آ کر ۹ مئی ۸۶ء کو مسئلہ سندھ کے موضوع پر خطبہ جمعہ میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ تحریری شکل میں روزنامہ جنگ کے جملہ ایڈیشنوں اور میثاق میں شائع ہوئے اور یوں کسی حد تک اس کمی کا ازالہ ہو گیا جو "استحکام پاکستان" میں محسوس کی جا رہی تھی۔ اور پھر اس سے بڑھ کر ازالے کی صورت تب پیدا ہوئی جب پچھلے سال نومبر میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب حرم مکی میں بیٹھ کر "پاکستان میں اسلامی انقلاب کیا؟ کیوں اور کیسے؟" کی تالیف کا ارادہ لے کر سعودی عرب تشریف لے گئے مگر کراچی کے فسادات اور سندھ کے مخدوش حالات نے ان کے ذہن و قلم کو اس درجہ متاثر کیا کہ جب واپس آئے تو "مسئلہ سندھ اور استحکام پاکستان" کی تالیف مکمل ہو چکی تھی۔

اس سال محاضرات قرآنی کے آخری دو دنوں کا موضوع اسی تازہ کتاب کے حوالے سے "مسئلہ سندھ اور استحکام پاکستان" تھا...... دو اپریل کی نشست کی صدارت اگرچہ مدیر "تکبیر" جناب صلاح الدین کو کرنا تھی لیکن جب وہ اپنے میزبان جناب عاصم الحداد کے ہمراہ جناح ہال میں پہنچے تو ڈاکٹر اسرار صاحب نے جناب عاصم الحداد کی غیر متوقع آمد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں کرسی صدارت پر بٹھا کر جناب صلاح الدین کو مقررین کی صف میں بھی شامل کر دیا۔ جناب عاصم الحداد

چونکہ عربی زبان وادب کے بھی ماہر ہیں اس لئے پروفیسر حافظ احمد یار صاحب نے "خدمت قرآن کے میدان" کے موضوع پر اپنا مقالہ ان کی صدارت میں پیش کیا۔ "رسم قرآنی" حافظ احمد یار صاحب کی خصوصی دلچسپی کا میدان ہے اس لئے انہوں نے اپنے مقالے میں مختلف بلاد اسلامیہ میں "رسم عثمانی" کے ترک والتزام کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ حافظ صاحب نے اس ضمن میں حکومت پاکستان کے تساہل اور غفلت کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ ہماری حکومت نے قرآن کے اشاعتی اداروں کے نام اس مضمون کا سرکلر تو جاری کر دیا ہے کہ اشاعت قرآن میں رسم عثمانی کی پابندی کی جائے۔ لیکن یہ بتانے کا کوئی اہتمام وانتظام نہیں کیا گیا کہ "رسم عثمانی" یا "خط عثمانی" کیا ہے۔

پروفیسر حافظ احمد یار صاحب کے مقالے کے بعد ڈاکٹر اسرار صاحب نے محاضرات میں رسمی تلاوت قرآن کے بجائے موضوع کی مناسبت سے سورہ توبہ کی درج ذیل آیات کی تلاوت کے ساتھ ان کا ترجمہ اور مختصر تشریح بیان کی۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝

ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اُس نے اپنے فضل سے ہم کو نوازا تو ہم خیرات کریں گے اور صالح بن کر رہیں گے۔ مگر جب اللہ نے اپنے فضل سے اُن کو دولت مند کر دیا تو وہ بخل پر اُتر آئے اور اپنے عہد سے ایسے پھرے کہ اُنہیں اس کی پرواہ تک نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اس بدعہدی کی وجہ سے جو اُنہوں نے اللہ کے ساتھ کی، اور اُس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بولتے رہے، اللہ نے اُن کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا جو اُس کے حضور اُن کی پیشی کے دن تک ان کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔

(سورۃ توبہ آیت ۷۵ تا ۷۷)

اہل پاکستان کی موجودہ اخلاقی اور دینی کیفیات کے حوالے سے ان آیات کی روشنی میں گفتگو

رتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ صورت حال کے تجزیئے کا ایک عمومی انداز یہ ہے کہ ظاہری حالات اور اسباب کو دیکھتے ہوئے خرابی کی نشاندہی کر کے اس کی مناسبت سے اصلاح و علاج کی تجاویز مرتب کی جائیں اور ایک انداز یہ ہے کہ اسباب و علل کے پس منظر میں مسبب الاسباب کی طرف سے کار فرما حکمت کی روشنی میں حالات کا تجزیہ کر کے اصلاح کا راستہ تجویز کیا جائے۔ میں اس وقت اسی دوسرے پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کیوں کہ ظاہری اسباب و نتائج کے حوالے سے تو مختلف پیرایوں میں گفتگو آپ کے سامنے آئے گی۔ میرے نزدیک سورہ توبہ کی ان آیات کی روشنی میں ہم اس وقت قومی سطح پر عذاب الٰہی کی گرفت میں ہیں۔ کیونکہ ہم چالیس برس سے اس عہد کی خلاف ورزی کرتے چلے آرہے ہیں جو بحیثیت قوم ہم نے تحریک پاکستان کے دوران اپنے اللہ سے کیا تھا۔ قوموں کے بارے اللہ کی سنت یہی نظر آتی ہے کہ ان کے اجتماعی اعمال کی جزا و سزا کا حساب اسی دنیا میں چکا دیا جاتا ہے البتہ افراد کے انفرادی اعمال کی جواب دہی اور جزا و سزا مرنے کے بعد خالص انفرادی سطح پر ہو گی۔

اللہ کی پکڑ اور گرفت کے نتیجے میں ہمارے قومی کردار کو نفاق کی دیمک چاٹ کر چکی ہے تو میتوں کے نعرے، معاشرے میں تقسیم در تقسیم کا عمل شدید اخلاقی بحران، امانت و دیانت اور ایفائے عہد کا تشویشناک فقدان سب دراصل اسی ایک سبب حقیقی کے مظاہر ہیں۔ اور ان سب کا علاج یہی ہے کہ ہم اللہ کے حضور انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر توبہ کریں اور اس کے ساتھ کئے گئے عہد کو استوار کریں نیز اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اسلامی انقلاب کی جدوجہد کریں۔ اجتماعی توبہ کی قبولیت کی شرط اسلامی نظام کا عملاً اس ملک میں قائم ہونا ہے۔ اپنی ان گذارشات کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مدیر تکبیر جناب محمد صلاح الدین کو "استحکام پاکستان" کے موضوع پر مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی۔

جناب صلاح الدین نے صدر مملکت کی زیر صدارت منعقد ہونے والے انجمن صحافیاں کے مختلف اجلاسوں اور انتخابات اور دیگر بہت سی تقریبات میں شرکت کے عذرہائے معقول کے ساتھ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے لکھا ہوا مقالہ پیش نہ کر سکنے پر معذرت کی۔ مدیر "تکبیر" "بنیادی حقوق" نامی ایک کتاب کے مصنف ہیں پیپلز پارٹی کے عہد اقتدار میں جماعت اسلامی کے ترجمان روزنامہ "جسارت" کی ادارت کے دوران قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کر چکے ہیں۔ البتہ بوجوہ جولائی ۱۹۷۷ء سے ابتک موجودہ مارشل لاء اور اس کے سولین مہروں کی حمایت کرتے چلے آرہے ہیں۔ بیسویں صدی کے ربع آخر

میں جمہوریت کے فروغ کے لئے وطن عزیز میں ہر نوع کے جلوسوں پر مکمل پابندی لگانے کی تجویز اپنے ادارتی کالموں میں پیش کر چکے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کو پیپلز پارٹی اور سندھ کی دوسری بہت سی تنظیموں کا مقابلہ سیاسی میدان میں کرنے کا مشورہ دینے کی بجائے وقتاً فوقتاً صدر ضیاء الحق اور ان کے مارشل لاء کو اپنی دانست میں ان مخالفِ پاکستان تنظیموں اور جماعتوں کو "قانونی ذرائع" سے نیست و نابود کرنے کا مشورہ دیتے رہتے ہیں۔ صدر ضیاء الحق اور جناب صلاح الدین کے سیاسی خیالات میں بالعموم حیرت انگیز "توارد" پایا جاتا ہے

"استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ" کے اس دو روزہ سیمینار میں جناب صلاح الدین نے تین تقریریں کیں اور موضوع زیر بحث کے اکثر پہلوؤں پر نہ صرف کھل کر اظہار خیال کیا بلکہ دیگر مقررین کے پیش کئے ہوئے نکات کا جواب بھی دینے کی کوشش کی۔ ۱۶ اپریل کے "تکبیر" میں انہوں نے اپنے خصوصی کالم تجزیہ میں ان محاضرات کی تفصیلی روداد بھی شامل کی جس میں ان کی تقریروں کا خلاصہ بھی شامل ہے۔

محاضرات میں پہلے خطاب کے دوران ان کا سارا زور سیاسی جماعتوں کے اندر جمہوریت کے فقدان اور پارلیمانی طریقِ انتخاب کی اصلاح پر رہا۔ ان کی نظر غالباً اس حقیقت پر نہیں گئی کہ جب ملک میں عمومی جمہوری فضا موجود نہیں ہے، جماعتیں اپنے وجود و بقاء کی جنگ لڑ رہی ہیں، ان کی ممدوح قوت ملک سے ہر منظم ادارے کو ملیامیٹ کرنے کے درپے ہے، ظالمانہ قوانین، سازشوں، دھونس دھاندلی اور لالچ و ترغیب غرض ہر ذریعے سے سیاسی جماعتوں میں انتشار برپا کرنے کی منظم کوششیں ہو رہی ہیں ایسی صورت حال میں اگر سیاسی جماعتوں کا وجود شخصیتوں اور قائدین کے بل پر ہی قائم ہے اور وہ پوری سخت جانی سے کنٹرولڈ ڈیماکریسی، بنیادی جمہوریت، "اسلامی شورائیت" غیر جماعتی نظام اور نہ جانے کیسے کیسے آمرانہ ہتھکنڈوں کا مقابلہ کرتی چلی آ رہی ہیں تو کیا ان کا یہ کردار غنیمت نہیں! سیاسی جماعتوں کے اندر جمہوریت اور پارلیمانی نظام کی اصلاح کے بارے میں ان کی باتوں سے اصولی طور پر اتفاق کیا جا سکتا ہے لیکن ملک کے معروضی سیاسی حالات اور ان میں فوج کے مسلسل اور فعال کردار کے تناظر میں معاملات کو دیکھنے سے صورت حال خاصی مختلف نظر آئے گی۔

ملک کے بہت سے سیاسی و غیر سیاسی عناصر کی طرح جناب صلاح الدین کیلئے بھی پیپلز پارٹی سیاسی سے زیادہ نفسیاتی مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ اس لئے وہ کسی طرح بھی اسے اس ملک کی سیاست میں وہ مثبت کردار ادا کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتے جس کی صلاحیت بہر حال وہ رکھتی ہے۔ اگرچہ پیپلز پارٹی اور

مسلم لیگ میں جوہری طور پر کوئی فرق نہیں لیکن شاید ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی پر کشش شخصیت ان کے عوامی نعروں اور سیاسی انداز نے پیپلز پارٹی کی سیاست میں جو عوامی رنگ بھر دیا ہے ہمارے مہربان اس سے خائف ہیں۔ محاضرات میں خطاب کرنے والے سندھی اور پنجابی دانشوروں نے بالعموم پیپلز پارٹی کی حب الوطنی اور وفاق پاکستان کے حوالے سے اس کی سیاست کے مثبت پہلو کی نشاندہی کی لیکن جناب صلاح الدین بوجوہ اس سے اتفاق نہ کر سکے۔ اسی اجلاس میں ملک کے مایہ ناز صحافی اور بزرگ دانشور جناب عبدالکریم عابد نے مسئلہ سندھ کے عنوان سے اپنا مختصر اور پر مغز مقالہ پیش کیا جو گذشتہ اشاعت میں شامل تھا۔ عابد صاحب کے مقالے کے بعد جناب صلاح الدین نے دوبارہ بطور صدر مجلس امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی تازہ تالیف "مسئلہ سندھ اور استحکام پاکستان" کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ انہوں نے اس کاوش اور کوشش پر ڈاکٹر صاحب کو مبارک باد دیتے ہوئے اس کتاب کو سندھ کی موجودہ صورت حال کے بارے میں گائیڈ بک قرار دیا۔ البتہ کتاب کے ٹائیٹل اسپین اور سندھ کی مشابہت کے حوالے پر مشتمل انتساب اور اس کے بعض مندرجات سے پیدا ہونے والے مایوس کن تاثرات سے انہیں اتفاق نہیں تھا۔ بقول ان کے "اہل قلم کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بدترین صورت حال اور سنگین ترین بحران میں بھی قوتِ عمل کو معطل اور مستقبل پر اعتماد کو متزلزل نہ ہونے دیں ہمارے اسلاف کا طریق کار یہی رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب تو پختگی ایمان کے اس درجے پر فائز ہیں کہ وہ یہ کہہ کر بھی اپنا اعتماد بحال رکھ سکتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ مردے میں بھی جان ڈال دینے پر قادر ہے۔" مگر عام مسلمان اور کتاب کا ہر قاری اس کیفیت ایمان سے ہمکنار نہیں ہے۔ اس نے پاکستان کو ایک بار "مردہ" سمجھ لیا تو پھر اس کے دوبارہ جی اٹھنے پر اس کا اعتماد قائم نہ رہ سکے گا......" (بحوالہ تکبیر ۱۶ اپریل ۱۹۸۷ء)

جمعہ ۳ اپریل کو محاضرات کی تیسری اور آخری بھرپور نشست کی صدارت تحریک پاکستان کے ممتاز کارکن اور بزرگ صحافی' روزنامہ پاسبان ڈھاکہ کے ایڈیٹر میاں ظفیر احمد نے کی۔ اس نشست میں محمود مرزا ایڈووکیٹ' مولانا عبدالوہاب چاچڑ اور جناب محمد موسیٰ بھٹو نے مقالے پیش کئے جبکہ جناب صلاح الدین' جناب نور محمد پٹھان اور جناب سراج منیر نے تقاریر کیں۔ جناب محمود مرزا ایڈووکیٹ اور مولانا چاچڑ کے مقالات تو ماہ مئی کے "میثاق" میں شائع ہو چکے ہیں اور جناب موسیٰ بھٹو کا مقالہ گذشتہ ماہ شامل اشاعت تھا۔ جناب موسیٰ بھٹو اگرچہ محفل میں موجود تھے لیکن انداز بیان پر پوری طرح قادر نہ ہونے کی وجہ سے ان کا مقالہ تنظیم کے رفیق جناب مختار احمد فاروقی نے اپنی گرجدار آواز میں پڑھ کر سنایا۔ جناب موسیٰ بھٹو جیسے محب وطن اور محب اسلام سندھی کی زبان سے بھی سندھیوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ان کے پس منظر کا ذکر سننے کے بعد جب جناب

صلاح الدین خطاب کرنے تشریف لائے تو انہیں زمینوں کے معاملے اور متروکہ جائیدادوں کے بارے میں سندھیوں کی شکایات کو حقیقی تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ کار نظر نہ آیا لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس کا ذکر کرنے والے دانشوروں کو خاموش رہنے کا مشورہ دیا کیونکہ ان کے نزدیک احساس محرومی کی لے بڑھانے سے یہ مسئلہ حل ہونے کی بجائے ہاتھ سے نکل جانے کا زیادہ امکان ہے۔ جبکہ دوسری طرف وہ خود حقوق کے معاملے کو بالکل نظر انداز کر کے محض اسلام اور پاکستان اور وحدت ملی کے نعرے لگا لگا کر موجودہ استحصالی نظام کے مفاد یافتہ طبقوں کے ہم زبان بلکہ ترجمان بن چکے ہیں۔ جو اپنے اقتدار اور مفادات کے تحفظ کے لئے موقع بے موقع اسلام اور پاکستان کی دہائی دیتا رہتا ہے۔ جناب صلاح الدین نے گزشتہ چالیس برس میں سندھی مسلمانوں کو ملنے والی مراعات' فائدوں اور محرومیوں اور شکایتوں کا بیلنس شیٹ پیش کرتے ہوئے نتیجہ یہ نکالا کہ اس وقت محرومیوں اور شکووں سے زیادہ اظہار تشکر کی ضرورت ہے اور کفران نعمت کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ جناب محمود مرزا ایڈووکیٹ کے مقالے کے حوالے سے کراچی میں ارتکاز دولت و صنعت کو بھی فطری اور جائز قرار دیتے ہوئے وہ صنعتوں اور سرمائے کو ملک کے تمام صوبوں میں پھیلانے کی تجویز اور مناسب منصوبہ بندی کی ضرورت سے بھی اتفاق نہ کر سکے بلکہ انہوں نے تجزیہ نگاروں کو باہر سے آ کر بسنے والوں کی دیگر خدمات کو پیش نظر رکھنے کا مشورہ دیا۔ انکا کہنا تھا کہ مشرقی پاکستان کی طرح سندھ میں بھی ہندو اقلیت اور بھارت احساس محرومی کی لہر کو ابھار رہے ہیں ورنہ در حقیقت تو راوی چین ہی لکھتا ہے۔ مدیر تکبیر نے پوری دلسوزی اور دردمندی سے اہل سندھ کو بنگلہ دیش کے حشر سے سبق سیکھنے کا مشورہ دیا اور بتایا کہ اب بنگالی مسلمان مسجد نبوی کے ستونوں سے لپٹ لپٹ کر اپنی "خودکشی" پر اظہار ندامت کرتے اور بہتر مستقبل کے لئے دعائیں مانگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

صلاح الدین صاحب کے اس خطاب کے بعد مولانا عبدالوہاب چاچڑ نے اپنا مقالہ پیش کیا جس میں ان کے بہت سے نکات کا جواب اور سندھ کی عمومی سوچ کا اظہار پہلے سے موجود تھا۔ مولانا عبدالوہاب چاچڑ جمعیت العلمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) ضلع سکھر کے سیکرٹری جنرل ہیں۔ انہوں نے اپنے مقالے میں بانی پاکستان اور وفاق پاکستان کے حوالے سے جو گفتگو کی وہ مرکزی حکومت سے اہل سندھ کی عمومی مایوسی کا بہترین مظہر تھی۔ اگرچہ ان کے انداز بیان کی تلخی کا سبب ان کا جماعتی پس منظر بھی تھا لیکن اس پس منظر کو پیش منظر میں آنے کا حوصلہ ان حالات اور محرومیوں نے دیا جن کا ازالہ مقصود ہے۔ راقم کے ساتھ ایک گفتگو میں مولانا چاچڑ نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ ان کے موقف اور کنفیڈریشن والوں کے موقف میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ ابھی اس کا امکان باقی ہے کہ جمہوریت کی مکمل بحالی سے تلافی مافات اور اصلاح احوال کی صورت

نکل سکتی ہے۔ گویا ان کے نزدیک ابھی وہ مرحلہ نہیں آیا جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ جمعیت علمائے اسلام (فضل الرحمٰن گروپ) کی مرکزی قیادت نے کسی قومی پلیٹ فارم سے کبھی ایسے موقف کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن اس کے نتیجے میں سندھ کی جمعیت العلمائے اسلام جو بہرحال پنجاب کی نسبت زیادہ موثر اور منظم ہے اندرونی توڑ پھوڑ کا شکار نظر آتی ہے۔ جمعیت علمائے سندھ اور سندھ ساگر پارٹی کے نام سے اس کے دو انتہاپسند دھڑے الگ ہو کر سرگرم عمل ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ قومی پریس میں ان کی سرگرمیوں کا ذکر نہ آنے کی وجہ سے دیگر اہل ملک اور بالخصوص اہل پنجاب ان سے واقف نہیں۔ لیکن محض ان دھڑوں کا وجود ہی حالات کے جس رخ کی نشاندہی کر رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ کچھ کم خطرناک نہیں ۔

ناخدا مستِ طرب اہل سفینہ مدہوش

سر پہ امڈا ہوا طوفاں ہے خدا خیر کرے!

مولانا چاچڑ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اسلامی جمعیت طلبہ صوبہ سندھ کے سابق ناظم جناب نور محمد پٹھان کو دعوتِ خطاب دی۔ نور محمد پٹھان سندھ کے تاریخی قصبے شکارپور کے رہنے والے ہیں۔ ۶۸ء سے ۸۰ تک اپنے تعلیمی کیریئر کے دوران اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ رہے۔ ۷۶ سے ۷۸ تک دو برس صوبہ سندھ کی نظامت کی ذمہ داریاں بھی آپ کے حوالے رہیں۔ سندھی طلبہ میں اسلام کے لئے کام کرنے والوں میں آپ کا مقام نمایاں ہے۔ آج کل سندھ فرینڈز فورم کراچی کے کنوینئر اور سندھ لطیف ادبی مجلس کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ دور طالب علمی میں اسلامی جمعیت طلبہ کے سندھی رسالے "شاگرد" کے ایڈیٹر رہے اور آج کل کراچی سے نکلنے والے انگریزی ماہنامے "یونیورسل میسیج" کے نائب مدیر ہیں۔ اسلامی جمعیت طلبہ سے بھرپور اور فعال وابستگی اور جیئے سندھ کے ساتھ ٹکراؤ کی وجہ سے انہیں اپنے تعلیمی کیریئر اور پھر عملی زندگی میں خاصا نقصان بھی برداشت کرنا پڑا۔ مگر یہ محرومیاں اور نقصان تو بہرحال اس راہ کے لوازم میں سے ہیں اسلامی جمعیت طلبہ سے ان کی وابستگی کے متعلق ان کے اس تعارف کے بعد جناب نور محمد پٹھان نے اپنے خطاب کا آغاز ان الفاظ سے کیا کہ اگرچہ میں ایک سندھی ہوں لیکن میرا جو تعارف آپ نے سنا اس کے حوالے سے مجھے سندھ میں سرزمین سندھ کا غدار سمجھا جاتا ہے اور جب میں آپ کے سامنے اہل سندھ کے مسائل و معاملات کو پیش کروں گا تو آپ مجھے پاکستان کا غدار کہیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم رومانیت پسندی کو ترک کر کے معاملات و حقائق کو ان کے اصل روپ میں دیکھنے کے عادی نہیں رہے۔ جب مشرقی پاکستان میں حقوق کی تحریک اپنے عروج پر تھی تو پنجاب کے بہت بڑے صحافی اپنی روایتی رومان پسندی کے حوالے سے محبت کا زمزم بہا رہے تھے اور آپ لوگ

انہیں داد دے رہے تھے جیسے ابھی آپ نے جناب صلاح الدین کو داد سے نوازا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ سندھ کا مسئلہ زبانی جمع خرچ اور جبر دونوں ذرائع سے حل نہیں ہو سکتا۔ اس کے حل کے لئے اہل پنجاب کو تلافی مافات کے لئے تیار ہونا چاہئے۔ مارشل لاء کے عہد میں فوجی حکومت نے پنجابی آباد کاروں کی تنظیموں کو منظم کروایا اور انہیں اسلحہ بھی فراہم کیا۔ جس کے نتیجے میں سندھیوں میں شدید ردعمل پیدا ہوا ہے جناب جتوئی کی جماعت نیشنل پیپلز پارٹی کے لیڈر جناب حنیف رامے کی کتاب سامعین کو دکھاتے ہوئے نور محمد پٹھان نے کہا کہ جی ایم سید کے خلاف تو اہل پنجاب اور اہل دین طبقوں کے بیانات اور فتوے شائع ہوتے رہتے ہیں اور ان کی کتابوں کے اقتباسات بھی چھاپ چھاپ کر تقسیم کئے جاتے ہیں لیکن پنجاب کے جی ایم سید یعنی جناب حنیف رامے نے اپنی کتاب "پنجاب کا مقدمہ" میں جس طرح راجہ پورس اور رنجیت سنگھ کو پنجاب کا ہیرو قرار دیا ہے اس کا نوٹس کسی نے نہیں لیا۔ نور محمد پٹھان نے قومی معاملات و مسائل کے بارے میں قومی پریس کی بے حسی اور رومانیت پسندی کا شکوہ بھی کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے اخبارات میں لندن اور امریکہ کے مسائل پر تو بہت کچھ چھپتا ہے لیکن کندھ کوٹ 'گھوٹکی' کشمور اور شکار پور کے مسائل نظر نہیں آتے۔ اسلامی جمعیت طلبہ صوبہ سندھ کا سابق ناظم کہہ رہا تھا کہ پاکستان اور اسلام کو آپس میں خلط ملط نہیں کرنا چاہئے۔ جب پاکستان نہیں تھا تب بھی اہل سندھ مسلمان تھے اور اگر کل خدانخواستہ پاکستان باقی نہ رہا تب بھی ہم مسلمان رہیں گے۔ اس لئے سندھ کے مسئلے کو کفر کے فتوؤں اور ملی یکجہتی کے درس اور وعظ دے کر حل کرنے کی بجائے اس کے مسائل کا حقیقی حل تلاش کر کے سلجھانے کی کوشش کی جائے۔ تاکہ پاکستان سندھیوں کے لئے ایک قابل قبول حقیقت بن جائے۔

نور محمد پٹھان کا کہنا تھا کہ سندھ صدیوں سے پیار اور محبت کی سرزمین ہے لیکن آج وہاں سے درد' دکھ اور تکلیف کی لہریں اٹھ رہی ہیں ہم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہمارے درد کو سمجھا اور محسوس کیا اور اسے آپ تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اپنی ایک گھنٹے کی تقریر میں جناب نور محمد پٹھان نے بڑے جذباتی انداز میں جناب صلاح الدین کی رومان پسندی پر تنقید کی ان کے بہت سے نکات کا جواب دیا اور یوں محاضرات کی یہ نشست بڑی حد تک مناظرے کی شکل اختیار کر گئی۔

جناب نور محمد پٹھان کا کہنا تھا کہ پیپلز پارٹی' جئے سندھ' پیر پگاڑا اور کنفیڈریشن والوں سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی روش ترک کر دینی چاہئے۔ اس ملک میں صدر ضیاء الحق اور جناب صلاح الدین کے علاوہ اور لوگ بھی پاکستان اور اسلام سے محبت رکھتے ہیں۔ اب وقت کی ضرورت ہے کہ ملک کے سیاسی مسئلے کو حل کرنے کے لئے سیاسی راہ اختیار کی جائے تاکہ اسلامی انقلاب کے آنے تک یہ ملک باقی رہے جناب نور محمد پٹھان کے خطاب کے بعد مدیر تکبیر جناب صلاح الدین دوبارہ مائیک کے

سامنے تشریف لائے اور چند فقروں میں اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میرا اختلاف صرف ان لوگوں سے ہے جو پاکستان توڑ دو کی بات کرتے ہیں خواہ وہ سندھی ہوں بلوچی ہوں پٹھان ہوں یا پنجابی۔ میرا تعصب صرف پاکستان کا تعصب ہے۔

رات اگرچہ کافی بیت چکی تھی لیکن سامعین جناب سراج منیر کی تقریر دل پذیر کے منتظر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی بغیر کسی تعارفی جملے کے انہیں مائیک کے سامنے آنے کی دعوت دی۔ یوں بھی ان کی شخصیت اہل لاہور کے لئے بالعموم اور محاضرات قرآنی کے سامعین کے لئے بالخصوص تعارف کی محتاج نہیں سراج منیر نے اپنے مرصع خطاب میں پاکستان کی بنیاد اور اللہ کی تقدیر میں اس ملک کے مقام و مرتبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح مدینہ پانچ ہزار بھائیوں کا نہیں ایک قوم کا ملک تھا اسی طرح پاکستان چار بھائیوں کا نہیں ایک قوم کا ملک ہے۔ عالمی سیاست میں پاکستان اسی وراثت کا امین ہے جو مدینۃ الرسول کی ریاست کو اس وقت کی سیاسیات عالم میں حاصل ہوئی تھی۔ مدینۃ الرسول میں قائم ہونے والی پہلی اسلامی ریاست اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے درمیان چھ باتیں ایسی مشترک ہیں جو دنیا کی کسی بھی دو ریاستوں میں کبھی مشترک نہیں پائی گئیں۔ پہلی بات یہ کہ مملکت مدینہ کے قیام سے پہلے کفار مکہ نے مملکت مدینہ کے قیام کی بھرپور مخالفت کی جبکہ قیام پاکستان سے پہلے کفار ہند نے اس کے قیام کی بھرپور مخالفت کی۔ دوسری بات یہ کہ جب مدینہ کی مملکت قائم ہوئی تو کچھ مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں آ گئے اور کچھ مکہ میں ہی رہ گئے اسی طرح قیام پاکستان کے وقت کچھ مسلمان ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور کچھ ہندوستان میں رہ گئے تیسری بات یہ کہ قیام مملکت کے بعد جس طرح مملکت مدینہ کو ختم کرنے کے لئے باہر سے جارحیت کی گئی اسی طرح مملکت پاکستان کو نیست و نابود کرنے کے لئے بھی باہر سے جارحیت کی گئی۔ چوتھی بات یہ کہ جس طرح مملکت مدینہ کو نقصان پہنچانے کے لئے مخالفین نے اندرونی اختلافات کو ہوا دی اسی طرح پاکستان کے اندر بھی فتنے پیدا کرنے کی کوششیں جاری ہیں پانچویں بات یہ کہ مطالبۂ حقوق کا یہی مسئلہ مہاجرین و انصار مدینہ کے درمیان کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی جو آج پاکستان میں مسئلہ بن کر کھڑا ہے چھٹی اور آخری بات یہ کہ مملکت مدینہ کے قیام کے وقت بھی دنیا کا امن اس وقت کی دو بڑی طاقتوں ایران و روم کی باہمی آویزشوں کے نتیجے میں سخت خطرے میں تھا اور ریاست مدینہ کو ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ ان دونوں کے اثرات سے بچتے ہوئے بین الاقوامی امن کے استحکام کے لئے ایک ایسی دنیا کا قیام عمل میں لائے جو عالم انسانیت کو امن سلامتی اخوت اور بھائی چارے سے ہمکنار کر دے۔ اور آج پاکستان بھی اسلام کی مصلحت کلی کے حوالے سے اسی مقام و مرتبے کا حامل ہے۔ جناب سراج منیر کا کہنا تھا کہ آج ہم نے سندھ سے آنے والوں کی باتیں اس لئے نہیں

سنی کہ وہ سندھی ہیں اور ہم پنجابی ہیں بلکہ اس لئے سنی ہیں کہ وہ بھی اسی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار ہیں جس کے ہم ہیں اور وہ بھی اسی خدائے ذوالجلال کا کلمہ پڑھتے ہیں جو ہمارے ایمان کی بنیاد ہے۔ اگر یہ بنیاد قائم رکھی جائے تو مسائل کے حل کے لئے مکالمے کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آج سارے عالم اسلام میں علاقائیت کی لہریں اس لئے پیدا کی جارہی ہیں کہ مغرب یہ سمجھتا ہے کہ اگر مسلمان ایک ہو گئے تو اکیسویں صدی اسلام کی صدی ہوگی۔ کیونکہ سرمایہ داری اور کمیونزم کی ناکامی کے بعد اسلام ہی ایک نظام زندگی کی صورت میں دنیا کی فلاح و بہبود کا ضامن بن سکتا ہے

جناب سراج منیر کے خطاب کے بعد صدر مجلس میاں ظفیر احمد نے بھی اپنے طویل صدارتی خطاب سے سامعین کے صبر کا امتحان لیا جس میں وہ بہرحال کامیاب و سرخرو ہوئے صدر مجلس نے تحریک پاکستان اور تحریک بنگلہ دیش میں اپنے تجربات کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ ہماری بقاء صرف پاکستانی بن کر رہنے میں ہے ہم پنجابی بلوچ پٹھان اور سندھی بن کر زندہ نہیں رہ سکتے

اگرچہ مذاکرے اور مباحثے سے بھرپور اس طویل اجلاس کے ساتھ جناح ہال میں تین روزہ محاضرات قرآنی کا پروگرام اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ لیکن قرآن اکیڈمی میں تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع میں سندھ سے تشریف لائے ہوئے سندھی دانشور پروفیسر اسرار احمد علوی صاحب کے خطاب کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ روداد نامکمل رہے گی۔ پروفیسر اسرار احمد علوی صاحب سندھ کے علمی قصبے شکار پور کے رہنے والے ہیں اور گورنمنٹ کالج رانی پور میں سندھی زبان و ادب کے استاد ہیں۔ فروری میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دورہ سندھ کے دوران شکار پور میں ڈاکٹر صاحب کا قیام اور سوال جواب کی نشست کا اہتمام بھی انہیں کی رہائش گاہ پر تھا۔ پروفیسر صاحب کا نام تو اگرچہ تیسرے روز کے مقررین کی فہرست میں شامل تھا لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے ان کے خطاب کے پروگرام کو محاضرات سے متصل قرآن اکیڈمی میں منعقد ہونے والے تنظیم اسلامی کے اجتماع میں منتقل کر دیا گیا۔ پروفیسر صاحب کا شمار اگرچہ پرانے سندھیوں میں کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کے نام کے ساتھ علوی کا لاحقہ اکثر حضرات کے لئے پریشان کن بن جاتا ہے۔ اس کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ ان کے جد امجد شاہ فقیر اللہ علوی رحمت اللہ علیہ ۱۱۵۰ ہجری میں افغانستان کے شہر جلال آباد سے ہجرت کر کے سندھ تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو رہے سندھ کی آبادی میں آج کل جن لوگوں کو پرانا سندھی تسلیم کیا جاتا ہے ان میں اکثر حضرات کے ناموں کے لاحقے اور قبیلوں کے نام اس بات کا اعلان کر رہے ہوتے ہیں کہ ان کے آباؤ اجداد گزشتہ ہزار سال کی تاریخ میں کسی وقت آکر سندھ میں آباد ہوئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ سندھ کی زمین اور سندھ کے باسیوں نے انہیں اتنا پیار دیا کہ انہیں اپنا وطن یاد

بھی نہ آیا اس تناظر میں اکثر پرانے سندھی اور نئے سندھی یعنی ۴۷ کے مہاجر یہ سوال کرتے نظر آتے ہیں کہ اب حالات میں کیا تبدیلی واقع ہو گئی ہے کہ چالیس برس گزرنے کے بعد بھی نئے آنے والوں اور قدیم باشندوں کے درمیان بھائی چارے اور محبت کی وہ فضا پروان نہیں چڑھ سکی جو سرزمین سندھ کا خاصا تھی۔ چالیس برس قبل آکر بسنے والوں کی بات تو الگ رہی سو برس قبل پنجاب اور برصغیر کے مختلف حصوں سے آکر بسنے والے آباد کاروں کے خلاف بھی نفرت کے جذبات جاگ اٹھے ہیں۔ یہ تو ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حل حکمرانوں' سیاسی قائدین اور قوم کو علمی و فکری قیادت فراہم کرنے والے علماء و فضلاء اور دانشور حضرات سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ ذکر چل رہا تھا سندھی دانشور پروفیسر اسرار احمد علوی کے خطاب کا جنہیں ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر دعوت خطاب دی کہ وہ مسئلہ سندھ پر محاضرات کے دوران ہونے والی گفتگو پر تبصرہ کریں۔ علوی صاحب نے کہا کہ ان محاضرات میں کچھ لوگوں نے ہمارے حق کی بات کی اور کچھ لوگوں نے حسب روایت ہمارے زخموں پر نمک چھڑکا۔ انہوں نے کہا کہ سندھ نہ جی ایم سید یا جیے سندھ والوں کے نعروں کی وجہ سے پاکستان سے الگ ہو گا اور نہ ہی اسلام اور پاکستان کے نام پر نعرے بازی سے پاکستان کے ساتھ جڑا رہے گا۔ سندھ کی ناراضگی اور علیحدگی پسندی کا رحجان ٹھوس سیاسی اور معاشی اسباب و عوامل کی مسلسل کار فرمائی کا نتیجہ ہے۔ مذاکرے میں شامل سندھی مقررین میں سے کوئی بھی کمیونسٹ لادین یا علیحدگی پسند نہیں تھا اس کے باوجود آپ نے ان کی گفتگو کے تیور دیکھ لئے ہیں۔ یہ سب لوگ تو ہندو کے ایجنٹ نہیں تھے صرف حالات کی سنگینی نے ان کے لہجوں میں تلخی کا زہر گھول دیا ہے۔ مشرقی پاکستان کے بارے میں بھی ہم نے حالات کو بہتر بنانے کے بجائے ہندو پر الزام تراشی کے ذریعے کام نکالنے کی کوشش کی اور نتیجہ دیکھ لیا۔ اب پھر وہی دلیلیں دہرائی جا رہی ہیں۔ پروفیسر علوی نے ۷۰ء کے انتخابی نتائج کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ۹۵ ٪ سندھی آبادی والے علاقوں سے جی ایم سید اور پیر علی محمد راشدی جیسے لوگوں کی ضمانتیں ضبط ہو گئی تھیں۔ اہل وطن کو سوچنا چاہئے کہ آج حالات میں کیا تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ کہ لوگ جی ایم سید کی طرف دیکھنے لگے ہیں۔ مسئلہ سندھ بلکہ مسئلہ پاکستان کا حل بتاتے ہوئے علوی صاحب نے کہا کہ آئینی حقوق اور سیاسی عمل کی بحالی کے ساتھ ساتھ پانی کی تقسیم اور پڑھے لکھے نوجوانوں کی بیروزگاری جیسے مسائل ترجیحی بنیادوں پر حل کرنے کی ضرورت ہے۔ نیک نیتی اور اخلاص عمل کے ساتھ آئینی سیاسی معاشی اور معاشرتی محاذوں پر ہمہ گیر اور ہمہ جہتی اصلاح اور حقوق کی عملی تکمیل کے کام کا آغاز کر دیا جائے تو اس مسئلے کا حل کچھ مشکل نہیں۔ انتہا پسند نوجوانوں کی سرگرمیاں خود بخود دم توڑ جائیں گی۔ کیونکہ سندھی مسلمانوں کو اپنے مذہب اور عقائد سے بے پناہ لگاؤ ہے۔
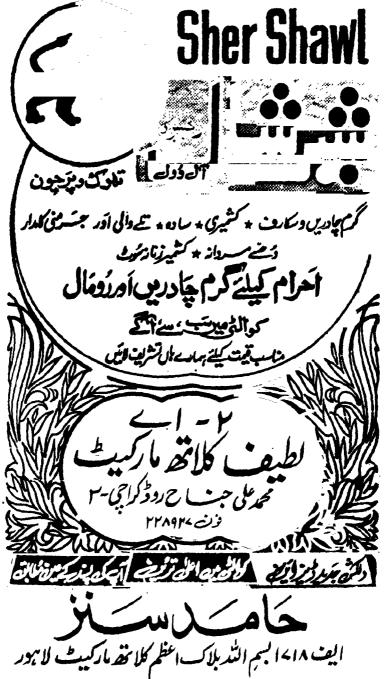
تنظیم اسلامی کے مرکزی دفتر کی سرگرمیاں اور ماہِ صیام کے خصوصی پروگرام

تنظیم اسلامی کے مرکزی دفتر میں باقاعدہ طور پر شعبہ رابطہ قائم کیا گیا ہے جس کے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ...رفقاء کا مرکز سے مضبوط رابطہ۔

۲۔ ...رفقاء کی سوچ، تجاویز، مشوروں اور شکایات سے آگاہ رہنا۔

۳۔ ...رفقاء کو فکر و نظر کی توانائی بہم پہنچانے کا کام۔

۴۔ ...رفقاء کو ان کے عہد کی مسلسل یاد دہانی کرانا (صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایک دوسرے کو سورہ والعصر کے ذریعے یاد دہانی کراتے رہتے تھے۔)

۵۔ ...رفقاء کی کیفیات اور دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں کا مسلسل جائزہ لینا۔

۶۔ ...رفقاء کو عملی میدان میں پیش آمدہ مشکلات کو حل کرنا اور ہدایات کے ذریعے حرکت میں رکھنا۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مندرجہ بالا مقاصد کا حصول اگر کماحقہ نہیں تو کسی حد تک ضرور ہوا ہے۔ منفرد رفقاء سے خصوصی طور پر رابطہ کا خلاء محسوس کیا جا رہا تھا جس کو اللہ کے فضل سے پر کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ اکثر رفقاء نے اس مرکزی رابطہ کو اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل قرار دیا۔ رفیق سے اس کی ذاتی سطح پر رابطہ کی اس کوشش نے دلوں کے تار ہلائے ہیں اور جمود ٹوٹا ہے۔ تقریباً ۳۰٪ رفقاء نے خطوط کے فوری جوابات دیئے جبکہ ۴۰٪ نے دو یا تین خطوط کے بعد جواب دیا اور ساتھ ہی تاخیر پر ندامت کا اظہار کیا ہے۔ یہ احساس ندامت بھی اس راہ کا قیمتی سرمایہ ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے امید کا پودا مرجھانے نہیں پاتا۔ تیس فیصد رفقاء ایسے بھی ہیں کہ جنہوں نے بالکل جواب نہیں دیا اور اکثریت ان میں ایسے رفقاء کی ہے جن کا اپنی مقامی تنظیم اور اسرہ سے بھی کوئی رابطہ نہیں ہے۔ رفقاء اور خصوصاً منفرد رفقاء کے خطوط سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ ان کے ساتھ

متحریک رہنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ احتسابی رپورٹ کے ذریعے انہیں متحرک اور فعال رہنے کا ایک راستہ دکھایا گیا ہے۔

چالیس فیصد رفقاء نے باقاعدگی سے اس سلسلے کا آغاز کر دیا ہے اور اس کے بہت مثبت اور مفید نتائج بر آمد ہوئے ہیں نیز یہ کہ رفقاء کی نمازوں میں بہتری پیدا ہوئی ہے۔ متعدد رفقاء کی اسی فیصد نمازیں تکبیر اولیٰ کے ساتھ ادا ہونی شروع ہو گئی ہیں۔ اکثر رفقاء تلاوت قرآن سے محروم تھے لیکن مسلسل التماس سے اب تلاوت قرآن ان کے معمولات کا جزو لا ینفک بن چکا ہے۔ مطالعہ حدیث اور مطالعہ دینی لیٹریچر سے اکثر رفقاء لاتعلق اور نابلد تھے۔ الحمد للہ کہ اس رابطہ کے ذریعے ان کے اندر مسلسل تحریک و پیاس پیدا کی گئی اور اب میں خوشی کے احساس سے معمور ہو کر کہہ سکتا ہوں کہ احتسابی رپورٹ بھیجنے والے ستر فیصد رفقاء مطالعہ حدیث کا اہتمام کرتے ہیں اور دینی لٹریچر باقاعدگی سے پڑھتے ہیں قرآن کا کچھ حصہ حفظ کرنے پر بطور خاص زور دیا گیا اور یہ حقیقت دل میں اتارنے کی کوشش کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو نور قرار دیا ہے۔ اس درخواست کی پذیرائی ابھی تک حوصلہ افزاء نہیں ہے اندازاً صرف ۳۵ فیصد رفقاء نے ہی اس کا اہتمام فرمایا۔ بہرحال کوشش جاری ہے۔

احتسابی رپورٹ کا بالائی نصف حصہ ایمان و یقین کی افزائش کا ذریعہ ہے جس کا لازمی نتیجہ عمل صالح ہے جو تواصی بالحق و تواصی بالصبر پر منتج ہوتا ہے اور یہی مطلوب ہے الحمد للہ کہ یہ نتائج بر آمد ہوئے ہیں کئی رفقاء نے اس کو اپنے لئے مژدہ جانفزا قرار دیا کہ اس کے ذریعے وہ سستی و تساہل کے عمیق غار میں گرنے سے بچ گئے۔ اس کا ثبوت سالانہ اجتماع میں منفرد رفقاء اور ان کے ہمراہ مبصرین کی کثیر تعداد کی شرکت سے ملتا ہے۔

منفرد رفقاء میں جو حضرات اپنے حالات اور مسائل کی وجہ سے تنظیم سے لاتعلق ہو چکے تھے اس یاددہانی سے انہیں بھولا ہوا سبق یاد آیا اور بہت سے حضرات نے تنظیمی وابستگی اور مقاصد سے ہم آہنگی کا یقین دلاتے ہوئے نیا بیعت فارم باصرار طلب فرمایا اور تجدید بیعت کی ہے۔ اب ان حضرات کا مرکز سے مضبوط رابطہ ہے۔

ماہ صیام سے قبل امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مرکزی دفتر گڑھی شاہو میں لاہور کے رفقاء کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ماہ صیام جشن نزول قرآن کا مبارک مہینہ ہے۔ لہٰذا اس میں صیام رمضان، قیام اللیل اور صرف نفلی عبادات کے اضافہ پر ہی اکتفا نہیں کر لینا چاہئے بلکہ فریضہ اقامت دین کی راہ ہموار کرنے کے لئے دعوت رجوع الی القرآن کا مناسب اہتمام ضروری ہے۔ اس مہم کا آغاز ہمیں خود اپنی ذات سے کرنا ہو گا۔ ماہ صیام سے قبل میرے کتابچہ "مسلمانوں پر قرآن کے حقوق" کا اسرہ کی سطح پر اجتماعی مطالعہ و مذاکرہ کا اہتمام کیا جائے امیر

محترم کے اس پیغام کا کیسٹ مقامی تنظیموں اور اسرہ جات کو فوراً ارسال کر دیا گیا ساتھ ہی ساتھ مرکز کی جانب سے بذریعہ خطوط اس کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلایا جاتا رہا اور اس کی ترغیب و تشویق اور تلقین و تاکید کا خاطر خواہ اہتمام کیا گیا۔ رفقائے تنظیم میں خطوط کے ذریعے ان خیالات کی یاد دہانی اور ترغیب و تشویق بار آور اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ منفرد رفقاء نے اپنے اپنے مقامات پر حسب استطاعت توسیع دعوت کی مہم چلائی اور افطار پارٹیوں کو عوامی رابطہ کا ذریعہ بنایا۔ مقامی اسرہ جات اور تنظیموں نے اس ماہ مبارک کو اپنی سرگرمیوں کا خصوصی ہدف بنا کر رجوع الی القرآن اور نظام بندگی رب کی خصوصی مہم چلائی۔ ان مقاصد کے پیش نظر افطار پارٹیاں رفقاء کی اقامت گاہوں میں منعقد کی گئیں اور حاضرین کو تقاریر، دروس قرآن اور لٹریچر کے ذریعے رجوع الی القرآن، بندگی رب، شہادت علی الناس اور اقامت دین کی دعوت پیش کی گئی۔ جہاں ممکن ہو سکا تنظیم اسلامی اور اس کے منشور کو بھی متعارف کرایا گیا۔

اسرہ شجاع آباد ان ہدایات پر عمل در آمد میں پیش پیش رہا جس کے نقیب جناب سید عاشق حسین شاہ بخاری صاحب کو اللہ تعالیٰ نے تنظیم و تحریک کی خصوصی صلاحیتوں سے نوازا ہوا ہے۔ ان کی جسمانی معذوری اور ان کی انتھک کوشش کو دیکھ کر ہم جیسے صحت مند و توانا کے سر ندامت سے جھک جانے چاہئیں اور ہمیں اپنی ترجیحات کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے۔

رفقاء نے انفرادی طور پر بھی اس کا اہتمام فرمایا۔ ایک دو مقامات پر اجتماعی شب بیداری کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اس سلسلے میں پشاور کے رفقاء نے افطار پارٹیاں رفقاء کے گھروں میں منعقد کیں اور دین کی دعوت پیش کرنے کے علاوہ قرآن مجید کے حقوق نامی کتابچہ بڑی تعداد میں تقسیم کیا۔ اسی طرح راولپنڈی اور اسلام آباد کے رفقاء نے اپنے نقباء کی قیادت میں افطار پارٹیوں کا اہتمام کیا۔ دینی و تنظیمی دعوت گفتگو، تقریر، لٹریچر اور کیسٹوں کے ذریعے پیش کی۔ ڈسکہ اور اس کے گرد و نواح کے رفقاء نے بھی متعدد افطار پارٹیوں کے ذریعے توسیع دعوت کا کام کیا۔ رفیق محترم محمد اشرف صاحب اس سلسلے میں کافی کام کر رہے ہیں انہوں نے گاؤں کی مسجدوں میں افطار پارٹیاں منعقد کیں اور تقاریر کے ذریعے دین کی دعوت پیش کی۔

فیصل آباد میں ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کی قیادت میں اس ماہ کافی موثر مہم چلائی گئی۔ اور افطار پارٹیوں کو رفقاء نے ذوق و شوق سے اپنے گھروں میں منعقد کیا اور درس قرآن، تقریر، لٹریچر کے ذریعے لوگوں کو فرائض دینی سے آگاہ کیا۔ رفقاء نے مساجد میں بھی جہاں ممکن ہو سکا افطار پارٹیاں منعقد کیں اور خصوصی طور پر صبح یا نماز عصر کے بعد کتابچہ "قرآن مجید کے مسلمانوں پر حقوق" پڑھا گیا۔ اور دروس قرآن کے سلسلے بھی شروع کئے گئے۔ رفقاء نے اکثر مقامات پر چار کتابچوں کا

خصوصی سیٹ بھی مفت لوگوں میں تقسیم کیا۔

گجرات اور وزیر آباد کے رفقاء نے بھی بڑی تعداد میں افطار پارٹیاں منعقد کیں اور شمس الحق اعوان و عبدالرحمٰن غوث صاحبان کی قیادت میں کافی بھرپور مہم چلائی اور چار کتابوں کے سیٹ تقسیم کئے۔ سیالکوٹ میں شمس العارفین صاحب اور ان کے رفقاء نے مل کر افطار پارٹیوں کو ترتیب دیا اور کتابچے بھی مفت تقسیم کئے۔

گوجرانوالہ کے رفقاء نے بھی اس دعوتی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور محمد یعقوب صاحب کی قیادت میں توسیع دعوت کی کوشش کی۔

ننڈی پور کے اسرے میں جناب محمد صالح صاحب نے رفقاء کے ساتھ مل کر اس دینی فکر کو آگے بڑھایا۔

کانبانوالہ اور مترانوالی کے رفقاء نے بھی عباس علی چیمہ اور محمد علی چیمہ صاحبان کی قیادت میں تنظیمی مقاصد کو اسی نہج پر آگے بڑھایا۔ اور کافی لوگوں میں لٹریچر تقسیم کیا۔

لاہور کے رفقاء نے اپنے نقباء کی زیر قیادت اپنے اپنے علاقوں اسی نہج اور ان ہی خطوط پر خاصا موثر کام کیا۔ چار کتابوں کے سیٹ سینکڑوں کی تعداد میں مفت تقسیم کئے گئے۔ رفقاء کے گھروں کے علاوہ مسجدوں میں بھی افطار پارٹیوں کا اہتمام کر کے دعوت دین پیش کی گئی۔ مرکز گڑھی شاہو قرآن اکیڈمی اور شاہدرہ کے علاقوں میں (تین جگہ) ترجمتہ القرآن کا پروگرام پوری رات پر مشتمل تراویح میں پیش کیا گیا جو کہ اپنی نوعیت کا انوکھا اور بے نظیر پروگرام ہے۔ نقباء اور باصلاحیت رفقاء نے اپنے محلوں کی مساجد میں دروس قرآن کے سلسلے قائم کئے۔

لاہور میں مرکز کی ہدایات کے مطابق بھرپور دعوت افطار کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں قریباً ۱۵۰ افراد شریک ہوئے جن میں رفقاء تنظیم اسلامی ملتان بھی شامل تھے۔ رفیق محترم جناب ڈاکٹر محمد طاہر خاکوانی صاحب نے حاضرین سے مفصل و مدلل خطاب ففرمایا۔ جو کہ بہت پسند کیا گیا۔ قبل ازیں امیر محترم بھی ۱۲ر مئی کو شجاع آباد مین خطاب عام فرما چکے تھے۔ للذا مقامی رفقاء نے اس کے اثرات کو جمع کرنے کے لئے مزید محنت کی۔ جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تنظیم اسلامی کے حلقہ کو وسعت نصیب ہوئی۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تنظیم اسلامی ملتان میں بھی نقیم تنظیم اسلامی ملتان جناب ڈاکٹر محمد طاہر خاکوانی صاحب اور ان کے دست راست جناب محمد سعید بھٹہ صاحب کی مساعی سے کچھ حرکت عود کر آئی ہے۔ وہاں بھی متعدد افطار پارٹیوں کا اہتمام کیا گیا اور دعوت دین پیش کی گئی۔

تنظیم اسلامی سکھر بھی بفضل تعالیٰ متحرک ہوئی ہے۔ اور مقامی امیر جناب نجیب صدیقی صاحب

نے ماہ صیام میں صیام رمضان اور قیام اللیل کے ساتھ ساتھ ہفتہ وار شب بیداری جیسے مفید پروگرام ترتیب دیئے۔ جن میں امیر محترم کے مجوزہ تنظیمی لٹریچر کا اجتماعی مطالعہ ہوا اور اس پر بغرض تفہیم اظہار خیال اور مذاکرہ بھی ہوتا رہا۔ تنظیم اسلامی سکھر کے بزرگ رفیق جناب محمد دین صاحب کے تین صاحبزادگان نے جو کہ کتاب اللہ کے حافظ ہیں تین مختلف مساجد میں قرآن مجید بلا معاوضہ سنایا۔ اللہ تعالیٰ شرف قبول سے نوازے۔

تنظیم اسلامی وہاڑی نے بھی ماہ صیام میں مفید پروگرام ترتیب دیئے وڈیو کیسٹ کے ذریعہ اپنی دعوت پیش کی گئی۔ نئے رفقاء کی شمولیت کے بعد اجتماعات عمومی میں شرکاء کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے اور لوگ مقامی لائبریری سے بذریعہ کیسٹ و کتب استفادہ کر رہے ہیں۔ جمعتہ الوداع ۲۷ رمضان المبارک کو مرکز کی ہدایات کے مطابق مختلف شہروں میں یوم نفاذ شریعت منایا گیا جلسے کئے گئے اور جلوس نکال کر اپنے جذبات کا اظہار کیا گیا۔

(مرتبین: ڈاکٹر منظور حسین ، محمد غوری صدیقی)

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا ۝

(الفرقان : ۷۴)

اے ہمارے رب

ہمیں ہماری اولاد اور بیویوں (کی طرف) سے

آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما

اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا دے

□ □ □ □

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ
ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي
اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ
شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا
عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ (الاعراف :)

" اور اے نبیؐ لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جبکہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے۔ "

☆ ☆ ☆ ☆

اے مسلمانو! غور تو کرو۔ کیا تم نے آج زمانہ کے چلن کو اپنا رب تو نہیں بنا لیا؟

اگر ایسا ہے تو پھر کیا تم مسلمان ہو؟

کیا اپنے تئیں مسلمان کہلوانے سے ربّ کائنات بھی تسلیم کرے گا۔ کہ تم اسی کے مسلم تھے۔

اے مسلمانو! اس کے لیے ثبوت فراہم کرو۔

اہم اطلاع

امریکہ، کینیڈا، متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب میں ماہنامہ "میثاق" اور ماہنامہ "حکمت قرآن" کا سالانہ زرتعاون جمع کروانے اور دیگر معلومات کیلئے درج ذیل حضرات سے رجوع کیا جاسکتا ہے

امریکہ

Dr. Khurshid A. Malik
810, 73rd Street Downers Grove, ILL.60516
Ph · 312-969-6755, 312-969-6756

کناڈا

Anwar-ul-Haq Qureshi
323 - Rusholme Rd., Apt. 1809
Toronto Ont. M6H 2Z2
Canda.

متحدہ عرب امارات

Mr. S. M. Nasimuddin
P. O. BOX 294 Abu-Dhabi
Ph : 554057, 559181, 325747

سعودی عرب
جدّہ

Mr. M. Asghar Habib
P. O. BOX NO. 167, CC720
Jeddah 21411 Saudi Arabia
Ph . 6721490

ریاض

Mr. Azimuddin Ahmed Khan
P. O. BOX NO. 20249, Riyadh - 11455
Ph : 4544496 - 4462865

الواسع

Mr. Ghulam Mustafa
P. O. Box No. 2464 Al-Wasai Riyadh - 11451
Ph :

کراچی میں میثاق کا سالانہ زرتعاون ملا داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت میں بھی جمع کرایا جاسکتا ہے

□ □ □

خالص اجزا — بہتر شربت
جامِ شیریں
خالص، پُرتاثیر، فرحت بخش
قرشی کے مشروبات
جامِ شیریں، صندل، الائچی، بزوری، اورنج ڈرنک
آپ کا نبض شناس
قرشی
شربت
جامِ شیریں

میثاق کے سالانہ خریدار حضرات

توجہ فرمائیں

میثاق کے اندرون پاکستان کے تمام سالانہ خریداروں کے، خریداری نمبر تبدیل ہو گئے ہیں۔ براہ کرم اپنا نیا خریداری نمبر میثاق کے لفافے سے نوٹ کر لیجئے

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ـلد ٣٦
ارہ ٩
والحجہ ١٤٠٧ھ
ست ١٩٨٧ء
شمارہ ٥/-
الانہ زرتعاون ٥٠/-

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جنگ ایڈیٹر
قتدار احمد

ادارۂ تحریر
خ جمیل الرحمٰن
ا محمد سعید الرحمٰن علوی
افظ عاکف سعید
بول الرحیم مفتی

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوحہ، قطر، متحدہ عرب امارات ـ ٢٥ سعودی ریال یا/ ١١٥ روپے پاکستانی
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر ـ ٦ امریکی ڈالر یا/ ١٠٠ روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ ـ ٩ امریکی ڈالر یا/ ١٥٠
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ ـ ١٢ امریکی ڈالر یا/ ٢٠٠

ترسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور، یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ، ماڈل ٹاؤن برانچ
٣٦ ـ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور ـ ١٤ (پاکستان) لاہور

مکتبہ
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
٣٦ ـ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

سب آفس: ١١ ـ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی فون ٢١٦٥٨٢

طابع: چوہدری رشید احمد مطبع مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح، لاہور

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقتدار احمد

عرض احوال

اس شمارے کو پیش کرتے ہوئے اطمینان سا محسوس ہوتا ہے کہ ماہ رمضان المبارک کے معمولات نے "میثاق" کی اشاعت میں جو بے قاعدگی پیدا کر دی تھی وہ اب ختم ہو گئی۔ فالحمد للّٰہ علیٰ ذالک۔

ہمارے آس پاس حالات جس طرح روز بروز بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں اس پر جتنی بھی تشویش ظاہر کی جائے کم ہے۔ یوں کہا جائے تو ہرگز مبالغہ نہ ہو گا کہ ہم بتیس دانتوں میں زباں کی طرح گھر گئے ہیں۔ صورت حال کی اس سنگینی میں عالمی سطح کے ان عوامل کی موجودگی سے انکار ممکن نہیں جن پر ہمارا کوئی اختیار نہ تھا۔ تاہم خود کردہ غلطیوں کی فہرست بھی بہت طویل ہے اور سرفہرست و بد عہدی ہے جو ہم نے اپنے اللہ سے کی اور پوری ڈھٹائی سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس موضوع پر مزید کچھ کہنا اس وقت غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ہماری سوچ پوری شرح و بسط کے ساتھ بار قارئین کے سامنے آ چکی ہے۔ ان سطور کے ذریعے تو ہم اہل وطن کے اس کرب میں شریک ہونا چا رہے ہیں جو کراچی میں حالیہ خوف اور حد درجہ مہلک دھماکوں سے ایک لہر کی طرح ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل گیا ہے۔ ان اندوہناک تخریبی کارروائیوں کی تفاصیل' اور انسداد تدابیر پر اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ اگرچہ کہنے والی زبانیں تکان کا شکار نہیں ہوئیں' سننے والوں کے کان پک گئے ہیں۔ لیکن ناانصافی ہو گی اگر جناب صدر مملکت کے ارشادات کو داد نہ دی جائے۔ وہ کو غیر متعلق شخصیت نہیں ہیں' عوامی' جمہوری' مسلم لیگی حکومت یقین دلاتی نہیں تھکتی کہ ملک کی عنا اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے اصرار کو تسلیم کیے ہی بنتی ہے کہ ۔

خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھائیے قسمیں
ہمیں یقین ہوا' ہم کو اعتبار آیا

لیکن اہل نظر دیکھ رہے ہیں کہ جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب اقتدار کی چلمن سے ایسے لگے بیٹھے ہیں

کہ !

ع صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

انہوں نے کراچی میں دھماکوں کے ایک آدھ دن بعد ہی وہیں یہ صراحت فرمائی کہ لوگ چار دھماکوں کو روتے ہیں، یہاں تو ابھی ایک سو چون (۱۵۴) دھماکے ہوں گے اور یہ کہ میرے پاس کوئی الہ دین کا چراغ نہیں ہے کہ ان تخریبی کارروائیوں کا تدارک کیا جاسکے..... لیجئے قصہ کوتاہ ہوا۔ ہم نے سوچا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد لیکن وہ تو خود الہ دین کے چراغ کی تلاش میں ہے۔ یہ الف لیلائی چراغ دس سال میں ان کے ہاتھ نہ آسکا تو اب کیا خاک آئے گا۔ گویا اب شہر شہر مرگ انبوہ کے جشن ہوں گے۔ موت کا ویسے بھی ایک دن معین ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ ستم گر میرے مرنے پہ ہی راضی تو ہوا۔

صدر مملکت کی تو حیثیت ہی اور ہے، حکومت کے کسی بھی ذمہ دار فرد کی طرف سے ایسی کیسی بات کا اس سیاق و سباق میں کہا جانا شقاوت قلبی کی انتہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ "موتمر عالم اسلامی" سے "خادم اسلام" کا خطاب پانے کے بعد جنرل صاحب دھوئے گئے ہیں ایسے کہ بس پاک ہو گئے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہی کے احساس سے بھی ہاتھ دھو لئے ہیں۔ پاکستان کے شہری جو حکومتی محصولات کے ہل من مزید سے جاں بلب ہیں اور جن کی نسلیں بھی "کوچہ سود خوراں" میں گروی رکھی جا چکی ہیں، اپنے جان و مال اور عزت و آبرو کی سلامتی کی صرف دعائیں ہی مانگ سکتے ہیں کیونکہ یہاں تو اب ایسا کوئی ادارہ باقی نہیں رہا جس سے آس لگائی جاسکے ۔

کس طرف دیکھوں، کہاں جاؤں، کسے آواز دوں
اے ہجومِ نامرادی دل بہت گھبرائے ہے

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

حالات جس سمت سفر کر رہے ہیں وہ یقیناً فلاح و بہبود کی نہیں خزی فی الدنیا والآخرۃ کی ہے۔ اسلام سے ناطہ توڑ کر ہم اپنے منتشر اجزاء کو جوڑنے کا کوئی مصالحہ ایجاد نہ کر پائیں گے۔ ہم گذشتہ چالیس سال سے اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دے رہے ہیں۔ یہ تو اس کا کرم، اس کی کسی خاص مصلحت کا ظہور اور اس کی تقویم کا حساب ہے کہ ہمیں اب تک بھی توبہ اور

رجوع الی اللہ کا موقع میسر ہے لیکن آثار کچھ ایسے ہی ہیں کہ شاید یہ ہماری قسمت میں نہیں۔ ہم اللہ کی اطاعتِ کلّی کے "دار السلام" میں داخل نہ ہوئے تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ یہاں ہسپانیہ کی تاریخ دہرائی جائے یا سمرقند و بخارا کی یا اس خطے کے نقشے میں ایک اور لبنان ابھر آئے۔ اخبارات ایسی سرخیوں سے بھرے رہتے ہیں کہ کراچی کو بیروت اور پاکستان کو لبنان بنایا جا رہا ہے اور یہ سرخیاں ان بیانات سے لی جاتی ہیں جو سیاسی اور مذہبی جماعتوں (باستثناء حکومتی مسلم لیگ) کے زعماء سے منسوب ہوتے ہیں..... اندیشے کی یہ گرمی کراچی میں تو آگ لگا ہی چکی ہے۔ کوئی دن جاتا ہے کہ اس کی تپش دوسرے علاقوں کو بھی لپیٹ میں لے لے گی۔ عوام الناس "بیروت بننے" کی اصطلاح کے مضمرات سے شاید پوری طرح آگاہ نہیں۔ وہ مہم جوئی کا کوئی بازیچہ اطفال نہیں' آتش و آہن کی بارش سے دلدل بن چکا ہے۔ کہ جو اترا دھنستا چلا گیا۔ اس خاکسار نے دس سال پہلے بیروت پر صرف سال ڈیڑھ سال کی خانہ جنگی کے اثرات دیکھے تھے۔ شہر کے وہ "پوش" علاقے جنہیں آئینہ خانے کہا جاتا تو بجا تھا اور وہ کاروباری مراکز جہاں کروڑوں کا لین دین ہوتا اور کھوے سے کھوا چھلتا تھا' ایسے عبرت نگاہ کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے تھے کہ ان سڑکوں پر سے گذرتے بھی ہول آتا' جنہیں اس علاقے سے گزرنے کے لئے عرب امن فوج نے صاف کر کے جگہ جگہ چوکیاں بنا کر محفوظ کر رکھا تھا۔ خاکسار چونکہ "آباد" بیروت کو بھی چند سال پہلے دیکھ چکا تھا لہٰذا خانہ ویرانی کا کچھ اندازہ کر سکا ورنہ وہاں تو عالم یہ تھا کہ عمارت کی عظمت پر کھنڈر کی گواہی بھی کافی نہ تھی۔ گذشتہ دس سالوں میں اس شہر اور ملک پر اور کیا کچھ نہ گزر گیا ہو گا۔ ہماری شامت اعمال ایسا روز بد نہ دکھائے کیونکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ہم ایسے تن آسان ان سختیوں کو جھیلنے کی تاب نہیں رکھتے..... اللّٰھمّ انّا نعوذ بک من الفتن ما ظھر منھا وما بطن..... آمین۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

ہمارے قارئین کی اکثریت ڈاکٹر شیر بہادر پنّی صاحب مدظلہ سے غائبانہ تعارف رکھتی ہے۔ ان کے عنایت نامے جن میں "میثاق" کے مشمولات پر تائیدی' وضاحتی اور (کبھی کبھار) تنقیدی بھی' تبصرے ہوتے ہیں۔ بڑے احترام و اکرام سے شائع کئے جاتے رہے ہیں۔ وہ پاکستان میں رہنے والے ان معدودے چند بزرگوں میں سے ایک ہیں جو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے آج بھی رشتۂ محبت و

عقیدت میں منسلک ہیں اور ان سے حسن ظن کی نسبت رکھنے پر نادم نہیں۔ آج کل ضعف پیری کے باعث ایبٹ آباد سے اپنی میڈیکل پریکٹس چھوڑ کر پشاور میں دختر نیک اختر کے پاس مقیم ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت، سلامتی اور طویل زندگی عطا فرمائے تاکہ ہم ان کے ذخیرۂ معلومات اور صائب مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں۔ اس ماہ یکے بعد دیگرے ان کے دو گرامی نامے موصول ہوئے۔ اس التفات خصوصی کی تقریب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تازہ تالیف کا وہ مقدمہ ہے جو پچھلے شمارے میں شائع ہوا۔ اور جس میں مولانا آزاد کے ذکر کی مضراب نے **اُن کی یادوں** کا تار چھیڑ دیا تھا۔ پہلے خط میں انہوں نے اس خاکسار کو مخاطب کر کے اس کے انداز تحریر کی ستائش کی تھی۔ اس کی رسید میں تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ان کی یہ نوازش شکریئے کے ساتھ حوصلہ افزائی کے حساب میں وصول کر لی گئی ہے البتہ دوسرا خط سطور ذیل میں من وعن شائع کیا جا رہا ہے۔ اس پر اگر کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہوئی تو ظاہر ہے کہ اس خط کے مکتوب الیہ ہی کے ذمے ہوگی۔ جن سے ڈاکٹر غنی صاحب خاص قلبی لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان کی کرم فرمائیوں میں سے اس عنایت کو برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب خصوصی وقعت دیتے ہیں کہ اپنی قیمتی اور نایاب کتب بشمول "البلاغ" اور "الہلال" کے فائلوں کا "مایہ خویش" انہوں نے ان کے سپرد کر دیا ہے۔

محترمی زاد عنایتہ

السلام علیکم

ماہ جولائی کا "میثاق" ملا جس کے مطالعہ سے دل بے حد خوشنود ہوا۔ کتاب۔ "جماعت شیخ الہندؒ سے تنظیم اسلامی تک"۔ کا مقدمہ پڑھا۔ جو آپ کی تحریرات کا شاہکار ہے، اور حرم کی خوشبو سے معطر۔

آپ نے میرے محبوب، عبقری صفات کی عظمت کی تصدیق فرما دی۔ وہ حقیقتاً برصغیر پاک و ہند میں بیسویں صدی کے داعی اول قرآن و جہاد تھے۔ ان کے اس مقام کو آپ نے مان کر، حق بہ حق دار رسید کا کام سرانجام دے دیا۔ جزاک اللہ۔

۱۹۲۱ء سے بعد ان کی آزادی وطن کی تحریک میں شمولیت، پس پائی یا بد دلی کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ ان کی مومنانہ فراست کی وجہ سے محاذ جنگ کی تبدیلی کے مترادف تھی، اور عین جنگ میں بھی محاذ کی تبدیلی کی اجازت تو قرآن نے بھی دی۔ اور اس تبدیلی کے لئے انہوں نے معاصر علماء سے گفتگو بھی کی۔ لیکن کسی نے ان کی بات پر کان نہ دھرا سوائے حضرت شیخ الہندؒ کے۔ اس کا ذکر مولانا نے ترجمان القرآن جلد دوم صفحہ ۹۵ کے حاشیہ میں ان الفاظ میں

کیا۔ "...... ۱۹۱۴ء کی بات ہے۔ کہ مجھے خیال ہوا کہ ہندوستان کے علماء و مشائخ کو عزائم و مقاصد پر توجہ دلاؤں۔ ممکن ہے چند اصحاب رشد و عمل نکل آئیں۔ چنانچہ میں نے اس کی کوشش کی۔ لیکن ایک تنہا شخصیت کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد 'سب کا متفقہ جواب تھا کہ یہ دعوت ایک فتنہ ہے۔ "اِئذَنْ لِی وَلَا تَفْتِنِّی" یہ مستثنیٰ شخصیت مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کی تھی جواب رحمت الٰہی کے جوار میں پہنچ چکی ہے'

گو وہ تحریک آزادی وطن کی جماعت...... کانگرس...... میں شامل ہو گئے۔ لیکن اپنے عزم و بنیادی مقصد 'دعوت قرآن و جہاد' سے غافل نہیں ہوئے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ ان کا مطمع نظر محض آزادی ہندوستان ہی نہ تھا' بلکہ ان کے پیش نظر اسلامی ممالک کی آزادی تھی۔ اور یہ معلوم رہے کہ ہندوستان کی آزادی کے فوراً بعد سب اسلامی ممالک آزاد ہو گئے۔

بات ہو رہی تھی ان کی دعوت قرآن کی۔ وہ کانگرس کی سیاسی تحریک کی گہما گہمی میں رہے مگر بنیادی مقصد سے ذرہ بھر بھی غافل نہیں رہے۔ جیل کے اندر یا باہر' ترجمہ و تفسیر قرآن میں مشغول رہے۔ حالانکہ سیاسی شورشوں میں علمی کام کرنے کے لئے مناسب جمعیت خاطر میسر نہیں آ سکتی۔ لیکن وہ اس کام میں برابر (۱۹۲۰ء سے بعد وہ مرحوم نہیں ہوئے) لگے رہے۔ جب انہوں نے ترجمان القرآن کی دوسری جلد ختم کر لی۔ تو اسی وقت کانگرس کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اس گہما گہمی میں انہوں نے اس جلد کی تقدیم لکھی۔ جو ان الفاظ پر ختم ہوئی۔

ابوالکلام

"موتی نگر۔ کانگرس کیمپ"

لکھنؤ ۱۴ر اپریل ۱۹۳۶ء

اور یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے۔ کہ انہوں نے اس کے بعد ترجمان القرآن جلد سوم اور تفسیر "ام البیان" اور مقدمہ تفسیر لکھا۔ جس پر ان کی زندگی کا اختتام ہوا۔ گویا انجام زندگی تک وہ اپنے مقصد زندگی .. دعوت قرآن و جہاد میں لگے رہے۔

آپ نے تحریر فرمایا۔ کہ آپ کو دعوت قرآن کے لئے لاہور کی فضاء مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے دو شاگردوں۔ مولانا عبدالحئی فاروقی اور مولانا احمد علی لاہوری مرحوم کی تیار کردہ ملی۔ واقعی یہ دونوں اصحاب اس سلسلے میں عزت و احترام کے مستحق ہیں۔ لیکن اس ضمن میں مولانا آزادؒ کے دو عزیز شاگردوں۔ پسران مولانا عبدالقادرؒ قصوری کا ذکر آپ نہیں کر سکے۔ مولانا عبدالقادرؒ قصوری کی علمی وجاہت اور سیاسی مرتبت تاریخ کے صفحات پر منضبط ہے اور جو تعلق مولانا آزاد کو اس خاندان سے تھا۔ اس کا ذکر انہوں نے اپنی مشہور تصنیف۔ تذکرہ۔ میں بھی کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں "ڈاک ملی اور اخبارات سے معلوم ہوا کہ عزیزی مولوی محی الدین احمد۔ بی۔ اے۔ کو قصور

میں تلاشی کے بعد گرفتار کیا گیا۔ شاید نظر بندی کا معاملہ پیش آئے۔ ان تمام ایام جلاوطنی میں (رانچی ۱۹۱۶ء) یہ پہلا دن ہے کہ اس واقعہ کے سننے سے دل کو مضطر اور دماغ کو پراگندہ پاتا ہوں۔ عزیزی موصوف بلکہ ان کا پورا خاندان اپنے خصائص ایمانی و جوش اسلامی وایثار للہ وفی اللہ کے اعتبار سے عہد سلف کے واقعات کو زندہ کرنے والا ہے اور علی الخصوص اس عزیز کے طلب صادق اور استعداد کامل سے تو اپنی چند در چند امیدیں وابستہ تھیں۔ افسوس فتنہ حوادث نے اس کو بھی نہ چھوڑا۔ مجھے اس سے کب انکار تھا۔ کہ میرے پاؤں میں ایک کے بدلے دس زنجیریں ڈال دی جائیں۔ لیکن دوسروں کو اس میں کیوں شریک کیا جاتا ہے۔ بظاہر عزیز موصوف کا اس کے سوا کوئی جرم نہیں کہ مجھ خانماں خراب سے رسم وراہ رکھتے ہیں۔ سبحان اللہ! اپنی آشناپروری اور دوست نوازی بھی قابل تماشا ہے۔ جب تک کوئی اپنا دشمن نہ بن جائے ہمارا دوست ہی نہیں ہو سکتا"

اسی خاندان (مولانا عبدالقادر قصوری کے دو فرزندان) کے دو افراد، مولوی محمد علی مرحوم ایم۔ اے۔ کنٹب اور مولوی محی الدین احمد بی۔ اے۔ نے فضاء لاہور کو درس قرآن کی آواز سے معمور رکھا۔

مولوی محمد علی نے ۱۹۵۰ء میں باغ جناح میں ہر اتوار بعد نماز عصر درس قرآن شروع کیا۔ ان دنوں حسین و جمیل مسجد (مسجد دارالسلام) کی جگہ ایک چھوٹا سا چبوترہ تھا۔ نیچے فرش نہ اوپر سایہ۔ نہ سردی، گرمی، دھوپ وبارش میں سر چھپانے کی کوئی جگہ تھی۔ لیکن مولوی محمد علی صاحب کے عالمانہ انداز کی کشش تھی۔ کہ شہر کے ہر کونے سے فہمیدہ و سنجیدہ اصحاب، درس میں کھچے چلے آتے۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں مولانا قصوری اللہ کو پیارے ہوگئے۔ آپ کے بعد آپ کے برادر اکبر مولوی محی الدین احمد قصوری نے درس کی خدمات اپنے ذمے لے لیں اور چھوٹے بھائی کی طرح پوری پابندی اور باقاعدگی سے اس خدمت کو پورا کیا۔ لیکن صحت کی خرابی پھر اختلاج قلب کی شدید تکلیف نے کام معطل کر دیا۔ آپ کی وفات آخر ۱۹۷۰ء میں ہوئی۔ (ماخوذ از سیارہ ڈائجسٹ قرآن نمبر) لہٰذا لاہور کی فضاء میں ان دو بھائیوں کے انفاس درس قرآنی بھی شامل ہیں جہاں سے اب آپ خطبات جمعہ دے رہے ہیں۔

آپ نے اس مضمون میں مولانا آزاد کی ایک تحریر کا ادھورا سا حوالہ دیا۔ جس سے قارئین پورا لطف نہیں اٹھا سکتے۔ چونکہ یہ گفتار محبوب ہے اس کی بلاغت و معنویت کے اظہار کے لئے اسے مکمل تحریر کئے دیتا ہوں۔ بحوالہ موج کوثر "ہر شخص کی زندگی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک دوسرے سے کسی قدر متضاد اور مختلف ہوں۔ خود میں گلیم زہد اور قبائے رندی کو ایک ہی وقت اوڑھنے، پہننے کا مجرم ہوں۔ پس اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہو سکتی ہے۔ کہ ہم اپنے ایک دوست سے جو سلوک مے خانہ کی چھت پر کریں۔ اس کا مستحق اسے سجادہ و خانقاہ پر بھی سمجھیں"

اس درازسخنی کی معافی چاہتا ہوں۔ ع ک

لذیذبود حکایت 'دراز تر گفتم

میری دعا ہے کہ خدا آپ کو اس مشن (جو میرے محبوب کا مشن تھا) دعوت قرآن اور تحریک جہاد میں کامیاب کرے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا ... دعا کا طلب

والسلام

شیر بہادر خاں پنی

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اس شمارے میں محترم مولانا حامد میاں کا وہ مقالہ شائع کیا جارہا ہے جو ان کے صاحبزادے نے حالیہ محاضرات قرآنی میں پڑھ کر سنایا تھا بعد میں مولانا نے ایک تحریر اور ارسال فرمائی جسے اس مقالے کا تکملہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ موخر الذکر تحریر میں محترم مولانا نے بعض نکات پر امیر تنظیم اسلامی' ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے موقف پر اعتراض بھی کیا ہے۔ ارادہ ہے کہ اس تحریر کو محترم ڈاکٹر صاحب کی وضاحت کے ساتھ ہی شائع کیا جائے جو اگر ممکن ہوا تو انشاء اللہ اگلے شمارے میں ہی شامل کر دی جائے گی۔ ۔

بیسویں صدی عیسوی

میں صنم کدۂ ہند میں "احیائے اسلام" کی کوششوں پر ایک اہم تاریخی دستاویز

جماعت شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی

- ابوالکلامؒ امام الہند کیوں نہ بن سکے ؟
- "حزب اللہ" اور "دارالارشاد" قائم کرنے کے منصوبے بنانے والا "عبقری" وقت "کانگرس کی نذر کیوں ہو گیا!
- احیائے دین اور احیائے علم کی تحریکوں سے علماء کی بدظنی کیوں ؟
- کیا "اقامت دین" کی جدوجہد ہمارے دینی فرائض میں شامل ہے !
- حضرت شیخ الہندؒ کیا کیا حسرتیں لے کر اس دنیا سے رخصت ہوئے ؟
- علماء کرام اب بھی "متحد" ہو جائیں تو

"اسلامی انقلاب" کی منزل دور نہیں !

❖ فرائض دینی کا جامع تصور ❖ رجم ❖ عورت کی دیت ، اور دیگر مسائل پر ڈاکٹر اسرار احمد کی معرکۃ الآرا تحریروں اور خطبات کے علاوہ مورخ اسلام مولانا سعید احمد اکبرآبادی ، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری ، مولانا افتخار احمد فریدی ، مہاجر کابل قاری حمید انصاری ، پروفیسر محمد اسلم ، مولانا محمد منظور نعمانی ، مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی ، مولانا محمد زکریا ، مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری اور دیگر نامور علماء کرام اور اہل علم حضرات کی تحریروں پر مشتمل تاریخی مرقع

علمی و اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے مبسوط مقدمے کے ساتھ

● ضخامت ۴۵۶ صفحات (نیوز پرنٹ) ● قیمت -/۴۰ روپے

- "میثاق" اور "حکمت قرآن" کے مستقل خریداروں کو یہ کتاب ۲۵ فیصد رعایت پر مبلغ -/۳۰ روپے بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک پیش کی جائے گی ۔ ڈاک خرچ ادارے کے ذمے ہوگا ۔

نوٹ : کتاب محدود تعداد میں شائع کی گئی ہے ۔ اپنی کاپی جلد حاصل کر لیجیے ۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کو دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے !

ملنے کا پتہ :

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن کا سلسلہ

الھدیٰ

درس نمبر ۱۱

نشست نمبر ۴۴

مباحثِ عملِ صالح

عائلی زندگی کے بنیادی اصول

(سورۃ التحریم کی روشنی میں)

(۲)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَ اِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِہٖ وَ اَظْہَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ عَرَّفَ بَعْضَہٗ وَ اَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ

فَلَمَّا نَبَّاَہَا بِہٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَکَ ہٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ ○ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَی اللّٰہِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا ۚ وَ اِنْ تَظٰہَرَا عَلَیْہِ فَاِنَّ اللّٰہَ ہُوَ مَوْلٰىہُ وَ جِبْرِیْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَ الْمَلٰٓئِکَۃُ بَعْدَ ذٰلِکَ ظَہِیْرٌ ○ عَسٰی رَبُّہٗۤ اِنْ طَلَّقَکُنَّ اَنْ یُّبْدِلَہٗۤ اَزْوَاجًا

خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا ○ سورہ تحریم آیات.....۳ تا ۵)

"اور جب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک بات اپنی ایک بیوی سے راز میں کہی تھی۔ پھر جب اس بیوی نے (کسی اور پر) وہ راز ظاہر کر دیا' اور اللہ نے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس (افشائے راز) کی اطلاع دے دی' تو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس پر کسی حد تک (اس بیوی کو) خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے درگذر کیا۔ پھر جب نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے (افشائے راز کی) یہ بات بتائی تو اس نے پوچھا۔ آپ کو اس کی خبر کس نے دی؟ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا "مجھے اس نے خبر دی جو سب کچھ جانتا ہے اور خوب باخبر ہے"۔ اگر تم دونوں اللہ کی طرف رجوع کرو تو یہی تمہارے لئے زیبا ہے' تمہارے دل تو خدا کی طرف مائل ہی ہیں اور اگر تم اس کے خلاف ایکا کرو گی تو اس کا حامی اللہ ہے اور جبریل اور تمام نیکو کار مسلمان اور مزید بر آں فرشتے بھی اس کے مددگار ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ تمہیں طلاق دے چھوڑے تو اس کا پروردگار تمہارے بدلے میں تم سے بہتر بیویاں اس کو دے دے۔ اطاعت شعار' مومنہ' فرمانبردار' توبہ کرنے والیاں' عبادت گذار' ریاض کرنے والیاں' شوہر آشنا اور کنواریاں۔"

ان آیات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عائلی زندگی کے ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ واقعہ کی تفصیلات میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں' کیونکہ یہ آیات اپنے مفہوم ومدعا کو خود واضح کر رہی ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی راز کی بات اپنی ازواج مطہراتؓ میں سے کسی ایک سے کہی۔ اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی فرما دی کہ یہ بات کسی اور کو نہ بتائی جائے۔ ان زوجہؓ محترمہ سے یہ غلطی ہوئی کہ انہوںؓ نے کسی دوسری زوجہؓ کے سامنے اس کا ذکر کر دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس افشائے راز کی خبر دے دی۔ اس

پر حضورؐ نے نہایت ملائمت شفقت اور نرمی سے ان زوجہؓ محترمہ کو اشارتاً جتادیا۔ کہ یہ بات آپؐ کے علم میں آگئی ہے...... عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ کے الفاظ میں آپؐ کے حسن معاشرت کی اعلیٰ مثال کا ذکر ہے کہ آپ نے پوری بات جتلانا اور پورا کا پورا الزام دینا پسند نہ فرمایا۔ آپؐ نے شکوہ وشکایت میں بھی التفات و ملائمت کے پہلو کو پیش نظر رکھا تاکہ ان زوجہؓ محترمہ کو انتباہ ہو جائے...... اس پر ان زوجہ محترمہ نے پلٹ کر سوال کیا کہ

"آپؐ کو یہ کس نے بتایا۔ !'' ہوسکتا ہے کہ انہیںؓ یہ گمان ہوا ہو کہ میں نے جن کو یہ بات بتائی تھی شاید انہوں نے حضورؐ کو بتادی۔ اس لئے اپنے شک اور سوئے ظن کو رفع کرنے کے لئے انہوں نے حضورؐ سے یہ وضاحت چاہی کہ آپ کو کس نے بتایا!...... اس کے جواب میں حضورؐ کے جو الفاظ آئے ہیں' ان میں تھوڑا سا اظہار ناراضگی کا پہلو بھی ہے کیونکہ یہ معاملہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ یہ مجھے کس نے بتایا!...... اصل بات تو یہ ہے کہ ایک راز کی بات تھی' اسے راز ہی رہنا چاہئے تھا۔ لہٰذا حضورؐ نے جواب میں فرمایا...... مجھے تو اس خدا نے بتایا ہے جو "العلیم" ہے' اور "الخبیر" ہے اس واقعے کے اجمالی ذکر کے بعد اب اللہ تعالیٰ کی جانب سے خطاب ہو رہا ہے۔ ......

یہاں اس بات کو بھی جان لیجئے کہ عائلی زندگی میں مرد کا اپنی بیوی کے حق میں نرم ہونا' شفیق ہونا' شوہر اور بیوی کے درمیان محبت و الفت' رحمت و شفقت اور مودت کا پایا جانا مطلوب ہے۔ لیکن اس میں اگر شوہر کی طرف سے نرمی زیادہ ہو جائے اور خاندان کے ادارہ کو مستحکم رکھنے کا بنیادی اصول یعنی " اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ " کا اہتمام و التزام پوری طرح باقی نہ رہے۔ تو خاندانی زندگی کے بنیادی ڈھانچے کو ضعف پہنچے گا۔ پھر جب معاملہ خاص طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو تو اس کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے کیونکہ آپ کا ہر عمل امت کے لئے نمونہ ہے۔ سورہ حجرات میں بہت زور دے کر فرمایا گیا ہے کہ "وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ "...... "خوب جان لو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسولؐ موجود ہے" اس میں ایک بڑا لطیف نکتہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے

ساتھ ہمارے تعلق کا ایک ہی پہلو ہے، کہ آپؐ اللہ کے نبی اور رسول ہیں اور ہم امتی ہیں، آپؐ ہمارے آقا ہیں، ہم آپؐ کے غلام ہیں، اور تو کوئی رشتہ اور نسبت نہیں ہے۔ لیکن صحابہ کرامؓ اور صحابیاتؓ کا معاملہ بہت مختلف تھا۔ صحابہؓ میں سے کوئی حضورؐ کا چچا بھی ہے۔ اب چچا ہونے کے اعتبار سے وہ بڑا ہے، حضورؐ بھتیجے ہیں۔ بھتیجے کا رشتہ بہرحال چھوٹا ہے۔ اب اگر کہیں حضرت حمزہؓ اور حضرت عباسؓ اپنی اس حیثیت کو سامنے رکھتے ہوئے حضورؐ کے ساتھ کوئی ایسا طرز عمل اختیار کر لیتے جو بڑا اپنے چھوٹے کے ساتھ اختیار کرتا ہے تو حضورؐ کی حیثیت رسالت مجروح ہو سکتی تھی۔ لہٰذا آگاہ کر دیا گیا، متنبہ کر دیا گیا کہ "وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہ "..... اچھی طرح جان رکھو کہ تمہارے مابین صرف محمدؐ نہیں ہیں بلکہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ لہٰذا آپؐ کی اس حیثیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھو۔ اسی بات کا اطلاق ازواج مطہراتؓ پر بھی ہو گا کہ بیوی ہونے کی حیثیت سے ان کی طرف سے ناز کا بھی اظہار ہو جائے گا۔ لہٰذا ان کو بھی متنبہ کر دیا گیا کہ ٹھیک ہے اے عائشہؓ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے شوہر ہیں۔ اے حفصہ رضؓ! ٹھیک ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے شوہر ہیں لیکن ہر دم یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ اللہ کے رسول بھی ہیں۔

یہ بہت نازک مقام ہے حضورؐ کے احترام اور ادب کو کسی درجہ میں بھی ضعف پہنچنے کا امکان ہو تو اس کے بارے میں ہمیشہ سخت ترین تنبیہ نظر آئے گی۔ جیسے سورہ حجرات میں ہے کہ "اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ" "کہیں تمہارے اعمال اکارت نہ ہو جائیں اور تم کو خبر تک نہ ہو....." اگر معاملے کی یہ خاص صورت پیش نظر نہ ہو تو پھر ازواج مطہراتؓ سے کچھ سوئے ظن کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ حقائق جو میں نے بیان کئے ہیں اگر مد نظر رہیں تو پھر کوئی ایسی صورت پیدا نہیں ہوگی۔

زیر بحث معاملہ دو ازواج مطہراتؓ کے درمیان پیش آیا۔ ایک نے نبیؐ کا بتایا ہوا راز دوسری پر ظاہر کر دیا۔ اب دونوں کے لئے اللہ کا حکم ہے کہ "اگر تم دونوں اللہ کی جناب میں

توبہ کرو' اظہار ندامت کرو اور اللہ سے استغفار کرو تو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ کیونکہ "فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْ بُكُمَا" تمہارے دل تو مائل ہو ہی گئے ہیں۔ یعنی دلوں میں تو یہ کیفیت ہے ہی' پشیمانی اور ندامت کے جذبات تو ہیں ہی" ...... لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو کوئی مان ہوتا ہے۔ وہی بات جسے میں نے ناز سے تعبیر کیا ہے۔ اس ناز کی وجہ سے ندامت اور پشیمانی کے الفاظ زبان پر نہیں آ رہے' طبعیت ہچکچا رہی ہے تو گویا ترغیب کا یہ نہایت بلیغ انداز ہے کہ فرمایا گیا "فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْ بُكُمَا" جیسے ہم کسی سے کہتے ہیں کہ ذرا ہمت کرو' اصل میدان تو تم سر کر ہی چکے ہو۔ کٹھن منزل تو تم نے طے کر لی ہے۔ اب تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے ہمت نہ ہارو۔ حوصلہ سے کام لے کر اس مرحلہ سے بھی گذر جاؤ......

اس مقام پر بعض مفسرین کو سخت مغالطہ ہوا ہے۔ انہوں نے "صَغَتْ" کا مفہوم کسی شے سے انحراف سمجھا ہے حالانکہ یہ لفظ کسی شے کی طرف جھکنے اور مائل ہونے کا مفہوم رکھتا ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے بھی یہاں "صَغَتْ" کا ترجمہ "جھک جانا" کیا ہے۔ آیت کا اسلوب بھی یہی بتا رہا ہے کہ "اگر تم اللہ کی جناب میں توبہ کرو تو تمہارے دل تو مائل ہو ہی چکے ہیں' جھک ہی چکے ہیں...... ذرا سی یہ ہچکچاہٹ جو شوہر اور بیوی کے نفسیاتی تعلق کی وجہ سے حائل ہے اس جھجک کو دور کرو اور اپنی خطا کا اعتراف کرو۔ اللہ سے بھی اس کے لئے استغفار کرو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی معذرت کرو کہ ہم سے خطا ہوئی ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ قرآن مجید کے الفاظ میں اگر بظاہر درشتی کا پہلو ہو' سختی کا اسلوب ہو تو دیکھنا یہ ہو گا کہ خطاب کن سے ہے! بسا اوقات شفقت اور محبت ہی ہوتی ہے کہ جس کے اظہار کے لئے بظاہر انداز سختی کا اختیار کیا جاتا ہے۔ ایک شفیق والد اپنے بچے کی تربیت کے لئے بعض اوقات سختی اور درشتی کا انداز اختیار کرتا ہے لیکن کیا یہ گمان ہو سکتا ہے کہ باپ کا دل اپنے بچے کی محبت سے خالی ہے۔ البتہ یہاں ایک بات یہ جان لیجئے کہ ع

جن کے رتبے ہیں سوا' ان کی سوا مشکل ہے"

جن کے مقامات بلند ہوتے ہیں' ان کی چھوٹی سی بات پر بھی جب گرفت ہوتی ہے تو بظاہر اندازا

بڑا سخت ہوتا ہے۔ عربی کا ایک مقولہ ہے کہ "حَسَنَاتُ الابرارِ سَيِّئَاتُ المقرَّبِينَ" عام لوگوں کے لئے جو کام بڑی نیکی کا سمجھا جائے گا ہو سکتا ہے کہ وہی کام اللہ تعالیٰ کے مقربین اولیاء اور محبوب بندوں کے لئے تقصیر قرار پائے۔ ان کے مرتبہ کے اعتبار سے قابل گرفت شمار ہو جائے۔ لہٰذا یہ معاملہ مراتب اور درجات کے اعتبار سے ہوتا ہے یہی اسلوب ہم قرآن مجید کے بعض مقامات پر دیکھتے ہیں کہ حضورؐ کے ساتھ خطاب میں بھی بظاہر کچھ سختی کا اظہار ہو رہا ہے۔ جیسے

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ۙ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ؕ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓی ۙ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی ؕ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ۙ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ؕ

"ترش رو ہوا اور بے رخی برتی اس بات پر
کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ تمہیں کیا خبر، شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر
دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لئے نافع ہو۔ ؟ جو شخص بے پروائی برتتا
ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو"

بظاہر اس اسلوب میں کچھ سختی ہے۔ لیکن درحقیقت اس انداز میں محبت، شفقت اور عنایت پنہاں ہے۔ حضورؐ کے مقام اور مرتبہ کے اعتبار سے گرفت کا انداز نظر آتا ہے۔ جبکہ بڑی معمولی بات ہے اور عام لوگوں کے لئے غلطی بھی نہیں ہے لیکن رسول اور نبی ہونے کے اعتبار سے اس پر بھی روک ٹوک ہو رہی ہے اور بظاہر انداز سخت نظر آ رہا ہے...... اسی اصول کا ہم یہاں بھی اطلاق کریں گے کہ ازواج مطہراتؓ سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم اپنا مقام اور مرتبہ پہچانو۔ تم امہات المومنین ہو...... پوری امت کی خواتین کے لئے قیامت تک تمہارا طرز عمل نمونے کا طرز عمل ہو گا۔ لہٰذا تمہارا طرز عمل بڑا اعلیٰ، معیاری اور آئیڈیل ہونا چاہئے۔ اس میں ذرا سی کمی کسی پہلو سے بھی ہو تو ہو سکتا ہے کہ وہ پہلو امت کی خواتین کے لئے بڑی بڑی لغزشوں کا سبب بن جائے اس لئے یہاں الفاظ میں بظاہر کچھ سختی ہے لیکن اس سے ازواج مطہراتؓ کے

بارے میں کوئی معمولی سا سوئے ظن بھی دل میں ہر گز پیدا نہیں ہونا چاہئے۔

آیت مبارکہ کی طرف پھر رجوع کیجئے فرمایا "اِنْ تَتُوْبَا اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا " "اگر تم اللہ کی جناب میں توبہ کرو تو تمہارے دل اس کی طرف مائل ہو ہی چکے ہیں"...... "وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ " "اور اگر تم ہمارے نبی کے خلاف ایکا کرو گی...... تو جان رکھو کہ "فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ " "تو اللہ خود اپنے رسول کا رفیق ہے' پشت پناہ ہے ساتھ ہی جبریل ہیں (جو ملائکہ کے سردار ہیں)"...... "وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ " "اور تمام مومنین صالحین یعنی آپ کے اصحاب آپ کے پشت پناہ ہیں......

"وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ○ " "اور تمام ملائکہ بھی ہمارے نبیؐ کے ساتھی اور مدد گار ہیں"۔ ...... یہاں اہل ایمان کا ذکر تو صالحیت کی صفت کے ساتھ کیا گیا ہے لیکن ملائکہ کے لئے فرمایا کہ کل کے کل ملائکہ کیونکہ وہ تو سب کے سب ہی صالح ہیں۔ ان کے بارے میں تو کوئی دوسری رائے ہو ہی نہیں سکتی۔ ان کا معاملہ تو یہ ہے کہ "يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ" "وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے"۔

آگے پھر وہی تہدید کا انداز چل رہا ہے جس میں ازواج مطہراتؓ کی سیرت و کردار کی ایک جھلک بھی سامنے آتی ہے کہ تمہارے اندر جو یہ اوصاف ہیں کہ تم اطاعت شعار ہو' ایماندار ہو' فرمانبردار ہو' توبہ کرنے والیاں ہو' زہد و قناعت اختیار کرنے والیاں ہو' ان پر تمہیں ناز نہیں ہونا چاہئے...... تم یہ نہ سمجھو کہ اللہ تم جیسی یا تم سے بہتر خواتین اپنے نبیؐ کے لئے ازواج کے طور پر فراہم نہیں کر سکتا۔ اگر کہیں تمہیں بالفرض زعم ہو گیا ہے اپنے اسلام و ایمان پر' اپنے تقویٰ اور احسان پر' اپنی نیکیوں اور عبادات گذاریوں پر...... اگر اس کا کچھ بھی امکان ہے تو جان لو کہ اگر نبیؐ تم سب کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیں تو اللہ ان کو تم جیسی بلکہ تم سے بھی بہتر بیویاں عطا کر سکتا ہے...... یہ مفہوم ہے آیت کے ان الفاظ مبارکہ کا کہ "عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ "اس آیت کا آخری حصہ ہے ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا○ "۔

"ثیبات" ان خواتین کو کہا جائے گا جو جن کی ایک دفعہ شادی ہو چکی ہو۔ یعنی بیوہ یا مطلقہ

ہوں اور ابکار سے کنواری خواتین مراد ہیں۔ حضورؐ کے حبالہ عقد میں اکثر خواتین شوہر آشنا تھیں لہٰذا ان کا ذکر بھی یہاں کر دیا گیا چونکہ ایک خاتون کو جسے متاہل زندگی کا تجربہ پہلے ہو چکا ہو بعض پہلوؤں سے اس کی رفاقت شوہر کے لئے آسانی کا موجب بن جاتی ہے...... رہا ابکار یعنی کنواریوں کا معاملہ تو ہر شخص کے لئے کسی خاتون کا بیوی کی حیثیت سے یہ نہایت پسندیدہ وصف ہے ہی۔

ان تین آیات میں ایک خاص واقعہ کے حوالہ سے ازواج مطہراتؓ سے خطاب کیا گیا ہے جس سے یہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے ازدواجی زندگی میں اگرچہ باہمی محبت والفت' شفقت و مودت' ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا لحاظ حسن معاشرت اور نرمی کا سلوک مطلوب ہے لیکن ایسا نہ ہو کہ اس کے نتیجہ میں بیویوں میں شوخی کا انداز حد اعتدال سے تجاوز کر جائے۔ اور "اَلرِّجَالُ قَوَّا مُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ" کا اصول مجروح ہو جائے جو ہماری خاندانی زندگی کی بنیاد ہے۔ کیونکہ اگر خاندان کا ادارہ کمزور ہو جائے تو اس کے اثرات سارے معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں اس لئے اس اصول کو ایک واقعے کے حوالے سے ذہن نشین کروایا گیا ہے۔

عائلی زندگی کو صحیح بنیادوں پر استوار رکھنے اور "گھر" کو امن و سکون کا گہوارہ بنانے کے لئے ان آیات میں مسلمان عورتوں کو ایک اہم سبق یہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے رازوں کی امانت دار اور محافظ بنیں۔ قرآن میں ان کی صفت "حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ" یعنی رازوں کی حفاظت کرنے والیاں بتائی گئی ہے بیوی فطری طور پر بھی گھر کے رازوں کی امین ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ ہی اس امانت کی حفاظت نہ کر سکے تو عائلی زندگی جن الجھنوں کا شکار ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اب آپ کے ذہن میں کوئی سوال ہو تو فرمایئے۔

سوال و جواب

سوال...... ڈاکٹر صاحب! اللہ تعالیٰ جس کا پشت پناہ اور مددگار ہو جائے اس کو مزید سہاروں کی کیا ضرورت ہے؟

جواب.. بہت عمدہ سوال ہے۔ اصل میں اس بات کو سمجھنے کے لئے اس حقیقت کو پیش

نظر رکھئے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ ذرائع اور وسائل کا محتاج نہیں ہے لیکن اس نے اس تخلیق کائنات کے لئے اپنی جو سنت اور اپنا جو قانون رکھا ہے وہ یہی ہے کہ بعض چیزوں کو بعض چیزوں کے لئے سبب اور ذریعہ بنا دیا ہے۔ جیسے قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے لیکن اس کے لئے ذریعہ حفاظ کو بنایا۔ وہ اس کو یاد کرتے ہیں۔ قرآن ان کے سینوں میں محفوظ ہوتا ہے اس طرح یہ سلسلہ قرآن کی حفاظت کا ایک ذریعہ بن گیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ بغیر کسی ذریعہ کو استعمال کئے اپنے کسی بندے کی پشت پناہی از خود فرمائے۔ لیکن ہم قرآن مجید میں دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے مومن بندوں کو مدد اپنے فرشتوں کے ذریعہ سے پہنچاتا ہے۔ غزوہ بدر میں فرشتوں کا نزول ہوا۔ اس ضمن میں بڑا عمدہ شعر ہے ۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

تو اگرچہ اللہ تعالیٰ کو اپنی نصرت پہنچانے کے لئے فرشتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ یہ طریقہ اختیار فرماتا ہے تو اس میں ہم کوئی کلام نہیں کر سکتے۔ یہ اس کا اپنا فیصلہ ہے وہ "القدیر" بھی ہے "اَحکمُ الحاکِمِینَ" بھی ہے اور "فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیدُ" بھی..... پس حضرت جبریلؑ کی مدد، تمام ملائکہ کی مدد اور مومنین صالحین کی مدد یہ گویا اللہ تعالیٰ ہی کی مدد و نصرت اور پشت پناہی کے ذرائع ہیں۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا
قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ٥

(الفرقان : ۷۴)

اے ہمارے رب
ہمیں ہماری اولاد اور بیویوں (کی طرف) سے
آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما
اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنادے

□ □ □ □

مثیلِ عیسیٰؑ ـ حضرتِ علیؓ

خطاب جمعہ: ڈاکٹر اسرار احمد ○ ترتیب و تسوید: شیخ جمیل الرحمٰن

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی عرصہ دراز سے خواہش تھی کہ چوتھے خلیفہ راشد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ ' کی سیرت مبارکہ پر گفتگو کریں۔ تیرہ چودہ برس قبل لاہور کی ایک انجمن کے زیر اہتمام موصوف کو حضرات ابوبکر ' عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی سیرتوں پر خطاب کرنے کا موقع ملا تو آپ نے منتظمین انجمن کو برملا کہہ دیا کہ اگر انہوں نے چوتھے خلیفہ راشد کا یوم منانے کا اہتمام نہ کیا تو آئندہ وہ ان کے جلسے میں نہیں آئیں گے۔ لیکن بعد ازاں وقتی انجمنوں کی طرح وہ انجمن بھی غیر فعال ہو گئی ' اور غالباً آئندہ کسی جلسے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اسی طرح چار پانچ سال قبل ربیع الاول کے مہینے میں خالق دینا ہال کراچی میں سنی کونسل کے زیر اہتمام طے ہوا کہ ڈاکٹر صاحب سیر صحابہؓ کے جلسوں کے سلسلے کی ایک شام میں حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب پر گفتگو کریں گے لیکن ڈاکٹر صاحب کی اچانک علالت کی وجہ سے یہ پروگرام بھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

گیارہ جون کو انجمن فکر اسلامی جھنگ کے زیر اہتمام سیرت فاروق اعظمؓ پر ڈاکٹر صاحب کے خطاب نے ان کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لئے مہمیز کا کام کیا۔ جامع دار السلام باغ جناح میں ۱۲؍ اور ۱۹؍ جون کے دو خطبات جمعہ میں مقام صدّیقیّت اور مقام شہادت کا مفصل بیان ہوا۔ اور جمعہ ۲۶؍ جون کو اس سلسلے کے تیسرے خطاب جمعہ میں بات خلیفہ چہارم سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی سیرت تک پہنچی۔ "میثاق" کے ادارہ تحریر کے بزرگ رکن جناب شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود شدید مشقت اور محنت سے ان تینوں خطابات اور دیگر تاریخی کتب کی مدد سے حضرت علیؓ کی سیرت کا ایک نہایت دلکش مرقع تیار کیا ہے۔ جس میں صدّیقیّت اور شہادت کی بحث کے ساتھ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی شہادت کا سبب بننے والے "فتنہ کبریٰ" کے اسباب و علل بھی سمٹ آئے ہیں۔ محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کی کاوشوں کا ثمر بالاقساط نذر قارئین کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

خطبہ مسنونہ کے بعد

حضرات ---- ہم ہر روز ہر نماز میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے ساتھ یہ دعا مانگتے ہیں کہ اِهْدِ الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ○ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵ "(اے اللہ) ہمیں سیدھا راستہ

دکھا' ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔' سوال یہ ہے کہ وہ لوگ کون ہیں جن پر اللہ کا انعام ہوا۔ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لئے ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ قرآن نے خود اس کا جواب دیا ہے۔ سورۂ نساء میں ارشادِ رب العٰلمین ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝

جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہدا اور صالحین۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں۔ (سورہ نساء آیت۔ ٦٩)

اس آیہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام یافتہ بندوں کو چار گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ سب سے بلند مقام انبیاء کرام کا ہے۔ اس میں کسی کی کوشش کا کوئی دخل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت جسے چاہا اس مقام پر سرفراز فرما دیا۔ اس کے بعد اہل ایمان کے تین درجے متعین کئے گئے ہیں۔ جن کے نام قرآن نے صدیقین' شہداء اور صالحین بیان کئے ہیں۔ انسان اللہ اور رسولؐ کی اطاعت میں ترقی کرتے کرتے ان مقامات کو حاصل کر سکتا ہے۔

مقامِ صدیقیت اور مرتبۂ شہادت

آج اگرچہ میری گفتگو کا اصل موضوع تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت مبارکہ ہے' لیکن ان کے مقام اور مرتبے کو سمجھنے کے لئے صدیقیت اور شہادت کے مفہوم کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ ازروئے قرآن انبیاء کے بعد انسانوں میں بلند ترین مراتب صدیقین اور شہداء کے ہیں اور ان میں بھی مقام صدیقیت مرتبۂ شہادت سے بلند تر ہے۔ ان دونوں مراتب کے مابین جو فرق ہے اس کا تعلق درحقیقت ایک مزاجی فرق سے ہے علم نفسیات کی اصطلاح میں مزاجی ساخت کے اعتبار سے انسانوں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ "EXTROVERT" ہوتے ہیں یعنی وہ لوگ جن کی توجہ خارج کی طرف زیادہ ہوتی ہے۔ اردو میں اس کے لئے بروں بین کی اصطلاح وضع کی گئی ہے' اور کچھ لوگ "INTROVERT" ہوتے ہیں یعنی وہ لوگ جن کی توجہ باطن کی طرف زیادہ ہوتی ہے انہیں ہم

دروں بین کہہ سکتے ہیں۔ کچھ انسانوں کے مزاجوں میں یہ فرق و تفاوت بہت نمایاں نظر آئے گا اور کہیں یہ فرق بہت معمولی نوعیت کا ہوتا ہے۔

مزاج اور افتادِ طبع کا فرق

پہلی بنیادی بات یہ جان لیجئے کہ انسانیت کا اعلیٰ جوہر دونوں مزاجوں کے افراد میں موجود ہوتا ہے لیکن مزاج اور افتادِ طبع کے اس فرق کی وجہ سے ان کی صلاحیتیں دو مختلف سمتوں میں ظہور کرتی ہیں۔ یہ دو رخ کیا ہیں ان کو سمجھئے۔ ذہین و فطین دونوں ہوں گے۔ لیکن ایک کی ذہانت و فطانت خارج کی طرف زیادہ متوجہ ہوگی اور دوسرے کی ذہانت و فطانت اپنے باطن کی طرف زیادہ متوجہ ہوگی۔ اس فرق کی وجہ سے ایسا محسوس ہو گا کہ ایک کو حقائق سے کوئی مناسبت نہیں' وہ خارج اور مظاہر کی دنیا ہی میں مگن ہے۔ جبکہ دوسرا باطنی حقائق پر توجہات کو مرتکز کئے بیٹھا ہے۔ دوسرا بنیادی فرق یہ ہو گا کہ حسّاس تو دونوں ہوں گے' لیکن ایک حسّاس ہو گا اپنی عزت نفس کے بارے میں کہ کوئی میری توہین تو نہیں کر گیا! کسی نے مجھے تحقیر کی نگاہ سے تو نہیں دیکھ لیا! کسی نے میری عزت نفس کو ٹھیس تو نہیں پہنچا دی جبکہ اسی حسّاسیت کا ظہور دوسرے میں اس طرح ہو گا کہ مجھ سے کسی کو تکلیف تو نہیں پہنچ رہی! میں نے کسی کا دل تو نہیں دکھا دیا! کسی کو تکلیف میں دیکھ کر کر وہ تڑپ اٹھے گا۔ بقول امیر مینائی۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

دوسرے کو اپنے درد کا احساس تو خوب ہو رہا ہے' لیکن دوسروں کے درد کا احساس نہیں ہو رہا۔ اپنی ذات کی طرف اس کی توجہ زیادہ ہے گویا ع

"اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں میں"

اس کی نگاہ دوسروں کے احساسات کی بہ نسبت اپنی ذات کی طرف زیادہ ہے۔ حساس دونوں ہوں گے ..... نتیجہ کیا نکلے گا کہ ایک کے مزاج میں خلق خدا کے لئے شفقت' رحمت' رافت ہوگی جبکہ دوسرے کے مزاج میں شدت سختی اور غصہ ہو گا۔ دوسری بات یہ جان لیجئے کہ ایک کے غور و فکر کا انداز حکیمانہ اور فلسفیانہ ہو گا اس کے قوائے ذہنی زیادہ چاق و چوبند ہوں گے۔ للذا اس کی سوچ مرتب ہوگی اور کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچے گی۔ دوسرے کے قوائے عملیہ زیادہ چاق و چوبند ہوں گے' وہ متحرک و فعال

[illegible]

آخری بات یہ ہے کہ شجاعت دونوں میں ہوگی کیونکہ یہ بنیادی انسانی اوصاف میں سے ایک اعلیٰ وصف ہے اور میں عرض کر چکا ہوں کہ انسانی بنیادی جوہر دونوں میں مشترکہ طور پر ہوتے ہیں۔ یہ نہ ہوں تو انسان نچلی سطح پر رہے گا۔ اوپر نہ اٹھ سکے گا...... یعنی صالحیت سے درجۂ شہادت اور صدّیقیّت کی طرف ترقی نہ کر سکے گا...... البتہ ایک کی شجاعت ظاہر و باہر ہوگی' نمایاں نظر آئے گی۔ ایک کی شجاعت چھپی رہے گی' کبھی وقت آ گیا تو ظاہر ہو جائے گی۔

اِدھر کے سارے اوصاف جمع کر لیجئے اور اُدھر کے سارے اوصاف جمع کر لیجئے ایک مزاج صدّیقین کا ہے' ایک مزاج شہداء کا ہے۔ مختصر طور پر صحابہ کرامؓ میں سے ایک طرف رکھئے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کو۔ یہ میں مردوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا معاملہ یہ ہے کہ ایک تو وہؓ خاتون ہیں دوسرے یہ کہ ہم مسلمانوں کی یہ بڑی کوتاہی ہے کہ انؓ کی سیرت کے بارے میں بہت کم معلومات بیان کی جاتی ہیں۔ میرے نزدیک مردوں میں جس مقام پر حضرت ابو بکرؓ ہیں یعنی الصدّیق ہیں' اسی طرح خواتین میں سے حضرت خدیجہؓ کا مقام یہ ہے کہ وہ الصدّیقۃ الکبریٰ ہیں۔ صحابہؓ کرام اور صحابیاتؓ میں یہ دونوںؓ بالکل متوازی شخصیتیں ہیں۔

صحابہ کو ذہن میں رکھئے۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عثمان ذوالنورینؓ درجہ صدّیقین کے نمایاں ترین افراد میں سے ہیں اور اِدھر لے لیجئے حضرت حمزہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو۔ درجۂ شہداء میں یہ دونوں حضراتؓ نمایاں ترین ہیں...... بنیادی انسانی جوہر ان چاروں اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں موجود ہے' لیکن فرق ملاحظہ کیجئے۔ حضرات حمزہؓ و عمرؓ کی اس طرف توجہ ہی نہیں ہوئی کہ غور کریں کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کہہ رہے ہیں!...... مکہ کی چھوٹی سی بستی ہے' وہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دے رہے ہیں۔ دن رات آپؐ اسی دھن میں ہیں گھر گھر میں کشمکش ہو رہی ہے لیکن ان دونوں کی کوئی توجہ ہی اس جانب نہیں ہے۔ پھر یہ کہ دونوںؓ نہایت شجاع ہیں فنون حرب میں انؓ کا نمایاں مقام ہے۔ ایک کا مشغلہ ہے سیر و شکار۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی شخصیت کی کوئی جھلک اگر آپ نے صحابہ کرامؓ میں دیکھنی ہو تو وہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ اور ایک کے مزاج میں پہلوانی ہے۔ حضرت عمرؓ بڑے پہلوان تھے۔ باقاعدہ پہلوان۔ میں یہ لفظ صرف استعارہ کے طور پر استعمال نہیں کر رہا۔ عکاظ کے میلے جب ہوتے تھے تو ان میں حضرت عمرؓ باقاعدہ اپنی پہلوانی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے' چیلنج دے کر کشتیاں لڑتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کی اگر کوئی جھلک آپ نے صحابہ کرامؓ میں دیکھنی ہو تو وہ آپ کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں نظر آئے گی

—

حضرت موسیٰؑ نے قبطی کے ایک گھونسا رسید کیا تھا کہ وہ دنیا سے کوچ کر گیا۔ دونوں کی دلچسپی اپنی چیزوں کی طرف ہے اپنے مشاغل میں مگن ہیں۔ کبھی سوچا ہی نہیں کہ مکہ میں جو کشمکش ہو رہی ہے تو یہ معاملہ کیا ہے! یہ دعوت کیا ہے! اس کے دلائل کیا ہیں! اسے قبول کریں یا رد کریں! یہ دونوں کا مزاج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں حضرات جذباتی طور پر متاثر ہوئے اور جذباتی انداز میں اسلام قبول کیا۔ ان دونوں کے ایمان لانے کے واقعات اتنے مشہور ہیں کہ یہاں اعادے کی حاجت نہیں۔ جبکہ حضرت ابو بکر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما، دونوں نہایت سلیم الفطرت 'نہایت نرم طبیعت 'لوگوں کے حق میں نہایت رحیم و شفیق 'لوگوں کے کام آنے والے اور شرک سے پہلے ہی سے اجتناب کرنے والے۔ نہ سیئات انؓ کی زندگی میں 'نہ منکرات انؓ کی زندگی میں 'نہ شرک ان کی زندگی میں 'نہ بت پرستی ان کی زندگی میں 'نہ ان کی طبیعتوں میں سختی اور نہ غصہ 'گویا دونوں بزرگوں میں نورِ فطرت پہلے سے موجود تھا نورِ وحی کی بدولت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر نورٌ علیٰ نور کا معاملہ ہو گیا۔ سونا تو پہلے سے تھا' لیکن خام تھا اب وہ کٹھالی میں پڑ کر زرِ خالص بن گیا۔ یہ ہیں صدیقین کی دو اعلیٰ ترین مثالیں۔

مزاجوں کے فرق کا جو تقابل میں نے اختصار کے ساتھ ابھی آپ کے سامنے بیان کیا ہے 'اس سے مجھے امید ہے کہ آپکو صحابہ کرام کے مزاجوں اور سیرت و کردار کے بارے میں ایک باطنی بصیرت حاصل ہوئی ہوگی۔

حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ میں کیا فعّالیت تھی! جب یہ دونوں حضرات ۶ نبویؐ میں ایمان لائے تو اس وقت مسلمان دبے ہوئے تھے 'چھپ چھپ کر عبادت کر رہے تھے۔ کہیں حضورؐ کا نام نہیں لے سکتے 'کہیں اپنے ایمان کا اظہار نہیں کر سکتے 'لیکن ان دونوںؓ کے ایمان لانے سے صورت حال بدل گئی۔ مسلمانوں کے اندر اعتماد پیدا ہو گیا ان کا حوصلہ بڑھ گیا اب مکہ کی گلیوں میں نعرے بھی لگ رہے ہیں۔ بیت اللہ کے صحن میں آ کر برملا نماز بھی ادا کی جا رہی ہے۔ یہ ساری صورت حال جو بدلی ہے تو اس میں ان دونوںؓ کے ایمان لانے کو فیصلہ کن دخل حاصل تھا۔

'شہادت' اور کارِ رسالت

اصل موضوع کی طرف آنے سے پہلے تین بنیادی امور کو سمجھ لیجئے۔ پہلی بات یہ کہ شہید 'شاہد' شہادت اور شہداء کے الفاظ قرآن مجید میں بکثرت استعمال ہوئے ہیں اور کار رسالت کے ساتھ ان کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اگرچہ ہم عام طور پر یہ سمجھتے ہیں جو اللہ کی راہ میں قتل ہو گیا وہ شہید ہے۔ لیکن قرآن مجید میں

اس مفہوم میں یہ لفظ کہیں استعمال نہیں ہوا۔ صرف ایک مقام پر یہ مفہوم لینے کی گنجائش ہے۔ قرآن میں جب بھی شہید' شاہد یا شہادت کے الفاظ آتے ہیں تو اکثران کا استعمال کارِ رسالت کی ادائیگی کے معنی میں ہوتا ہے۔ یعنی حق کی گواہی دینا' لوگوں پر حق کو اس طرح کھول کر بیان کر دینا کہ ان کے پاس کوئی عذر نہ رہے' اتمام حجت کر دینا۔ اسی معنی میں اس امت کو 'شہداء علی الناس' قرار دیا گیا۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ "اور ہم نے اس طرح تمہیں ایک بہترین اور درمیانی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ اور اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تم پر گواہ بن جائیں"۔ یہی مضمون سورۂ حج کے آخر میں عکسی ترتیب سے آیا۔ لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ اسی معنی میں یہ لفظ سورۂ احزاب میں آیا۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ○ اور اسی معنی میں یہ لفظ سورہ مزمل کی اس آیت میں آیا ہے۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ○

دوسری بات یہ کہ اللہ کی راہ میں قتل ہو کر مرتبۂ شہادت حاصل کرنا ایک الگ معاملہ ہے۔ جو شخص مزاجاً شہید ہو اور اللہ کی راہ میں قتل بھی ہو جائے تو وہ نورٌ علیٰ نور ہے' لیکن ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مزاجاً شہید ہے' لیکن اسے طبعی موت نصیب ہو۔ ایک ایسا شخص جو کارِ رسالت کی ادائیگی میں نہایت چاق و چوبند ہے۔ تبلیغ دین میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دست و بازو بنا ہوا ہے۔ بڑی جرأت و ہمت کے ساتھ دین کے کام میں لگا ہوا ہے۔ اس کی شجاعت کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ پوری قوت کے ساتھ اس نے دین کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ گویا یہ مزاجاً تو شہداء میں سے ہے۔ چاہے اسے اللہ کی راہ میں قتل ہو جانا نصیب ہو یا نہ ہو۔ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ حضرت خالد ابن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کتنی جنگیں لڑیں! کتنے زخم کھائے! لیکن اللہ کی راہ میں قتل ہونا ان کے نصیب میں نہیں تھا۔ رہا حضرت عثمانؓ کا معاملہ! اس کے بارے میں میں عرض کر چکا ہوں کہ ان کا مزاج صدیقین کا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں شہادت کی موت بھی عطا فرمائی تو اس طرح بھی ان میں دو نور جمع ہو گئے۔ انؓ کو ذوالنورین اصلاً اس لئے کہا جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ کی دو لخت جگر یکے بعد دیگرے انؓ کے حبالہ عقد میں آئیں' لیکن آپؓ کا ذوالنورین ہونا دیگر بہت سے پہلوؤں کے باعث بھی تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مزاجاً صدیق

تھے 'ان' کو طبعی موت آئی۔ حاصل کلام کے طور پر یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ کارِ رسالت اور تبلیغ دین کے ساتھ لفظ شہادت کو گہری مناسبت ہے۔

ایک منفرد مگر متوازن مزاج

تیسری بات یہ کہ شاذ ہستیاں ایسی بھی ہیں جن میں دروں بینی اور بروں بینی کی صلاحیتیں کمال توازن کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ جدید علم نفسیات کی اصطلاح میں ایسی ہستیوں کو 'AMBI - VERT' کہا جاتا ہے ان کے اندر حساسیت بھی دونوں طرح کی ہوتی ہے اپنی عزت نفس کا بھی پورا احساس ہوتا ہے اور دوسروں کے دکھ درد کا احساس بھی کامل ہوتا ہے۔ ان کے اندر شجاعت بھی دونوں طرح کی جمع ہو جاتی ہے وہ شجاعت بھی جو قوت ارادی کی شکل میں اندر ہوتی ہے جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لیس الشدید بالصرعتہ انما الشدید الذی یملک نفسہ عندالغضب (متفق علیہ) "پہلوانی کسی کو پچھاڑ لینے کا نام نہیں ہے۔ اصل پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھ سکے" اور وہ شجاعت بھی جو ظاہر و باہر ہو۔ جس کا مشاہدہ لوگ سر کی آنکھوں سے کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کی توجہ خارج کی طرف بھی ہوتی ہے اور باطن کی طرف بھی۔ اور مظاہر میں بھی انکی دلچسپی یکساں ہوتی ہے اور حقائق میں بھی۔ یہ مزاج آپ کو بہت شاذ اور بہت مشکل سے ملے گا۔

نبی اکرمؐ کا امتیازی مقام

میرے نزدیک جماعت انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام میں اکمل اور متوازن شخصیت جس میں یہ دونوں مزاج کمالِ توازن کے ساتھ اپنی اعلیٰ ترین شکل میں موجود تھے صرف اور صرف جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ پوری نسل انسانی میں اس طرح کی جامع ہستی اور کوئی نہیں ملے گی۔ اس طرح کا جامع الصفات فرد کہیں نظر نہیں آئے گا۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہی ہے وہ بنیاد جو ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے بیان کی ہے۔ وہ نسل انسانی کے عظیم ترین سو افراد کی فہرست میں پہلے نمبر پر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو لایا ہے۔ اس کی دلیل وہ ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

"He is the only person supremely successful in both the religious and secular fields."

وہ کہتا ہے کہ تاریخ انسانی میں صرف اور صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) انسانی زندگی کے دونوں میدانوں میں کامیاب ترین شخصیت ہیں۔ ایک میدان مذہب کا ہے' اخلاق کا ہے' حسن معاملات کا ہے۔ عبادت وتقویٰ کا ہے۔ خیر کا ہے۔ روحانیت کا ہے۔ اور دوسرا میدان سیاست کا ہے' تمدن کا ہے' حکومت کا ہے' ریاست کا ہے' جنگ و صلح کا ہے' عدل وانصاف کا ہے' تعزیرات و حدود کا ہے۔ آج کے دور میں انسانی زندگی کے دو علیحدہ علیحدہ میدان سمجھے جاتے ہیں ایک انفرادی زندگی جس کا تعلق مذہب سے ہے اور ایک اجتماعی زندگی جس کا تعلق ریاست اور اس کے جملہ شعبوں سے ہے۔ ڈاکٹر ہارٹ کے اس ایک جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس شخص کا مطالعہ کتنا وسیع ہے اور اس میں اظہار حقیقت کی کتنی جرات ہے کہ عیسائی ہونے کے باوجود دنیا کے عظیم ترین اشخاص میں سرفہرست لا رہا ہے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو۔ میں اس کی ذہانت اور دیانت کو خراج تحسین پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس نے نہ صرف حضورؐ کی شان کاملیت کا ٹھیک ٹھیک ادراک حاصل کیا بلکہ اس کا اظہار کرنے میں بھی کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

"صِدِّیقًا نَّبِیًّا" اور "رَسُولًا نَّبِیًّا"

میں نے ابھی عرض کیا کہ انبیاء ورسل علیہم السلام کی مقدس جماعت میں آپ دیکھیں گے بعض کا مزاج شہداء کا ہے۔ ذہن میں رکھئے کہ شہید سے یہاں میری مراد مقتول فی سبیل اللہ نہیں ہے۔ میری پوری گفتگو انسانی مزاج کے حوالے سے ہو رہی ہے۔ بعض کے مزاج میں وہ کیفیات ہوں گی جو مثلاً صحابہ کرامؓ میں سے آپ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عثمانؓ میں پا رہے ہیں۔ بعض انبیاء ورسلؑ کے مزاج میں آپ کو وہ کیفیات نظر آئیں گی جو مثلاً آپ حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ میں دیکھ رہے ہیں..... قرآن مجید میں کئی مقامات پر نبیوں کے ناموں کے گلدستے آپ کو ملیں گے۔ سورہ مریم میں بھی ایک ایسا ہی گلدستہ ہے۔ وہاں دو نبیوں کی تعریف ان الفاظ میں آئی "صِدِّیقًا نَّبِیًّا" یہ ہیں حضرت ابراہیم اور حضرت ادریس علیہما السلام ان دونوں پر صدیقیت کا رنگ غالب ہے۔ دو کے متعلق فرمایا" رَسُولًا نَّبِیًّا" یہ ہیں حضرت موسیٰ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام۔ وہی جن کا ذکر میں کر چکا ہوں کہ اگر حضرت اسمٰعیل کا نقشہ صحابہؓ میں دیکھنا ہو تو حضرت حمزہؓ ہیں۔ اور اگر حضرت موسیٰؑ کا نقشہ دیکھنا ہو تو حضرت عمر فاروقؓ ہیں..... حضرت اسمٰعیلؑ کے متعلق آپ نے پڑھا ہو گا کہ کنعان (فلسطین) سے چل کر کئی

بار حضرت ابراہیمؑ بیٹے سے ملنے مکہ مکرمہ تشریف لائے ہیں لیکن بیٹا نکلا ہوا ہے شکار کے لئے...... کئی دن
منتظر رہے مگر بیٹا آیا ہی نہیں۔ کچھ پیغام چھوڑ کر بغیر ملے واپس چلے گئے ہیں۔ ایسے ہی حضرت حمزہؓ کے
بارے میں آتا ہے کہ تیر و کمان اور تلوار لے کر نکل گئے اور صحرا کے اندر کئی کئی دن شکار میں مشغول
ہیں۔ یہ ان کا ذوق تھا۔ یہ بات میں عرض کر چکا ہوں کہ مفہوم کے اعتبار سے کارِ رسالت کی مناسبت
لفظِ شہادت کے ساتھ ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت اسماعیلؑ اپنے مزاج کے اعتبار سے شہداء
کی صف میں آتے ہیں للذا ان کا ذکر "رَسُوْلًا نَّبِیًّا" کے الفاظ سے ہوا۔

یہیں یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ نبوت و رسالت جو منعم علیہم کے مراتب کا بلند ترین رتبہ اور درجہ ہے،
وہ خواتین کے لئے نہیں ہے۔ یہ ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے صرف مردوں کے لئے رکھی ہے۔ خواتین کے
لئے اعلیٰ ترین درجہ صدیقیت ہے چنانچہ حضرت مریم کے لئے قرآن میں یہی لفظ آیا ہے کہ وَ اُمُّہٗ
صِدِّیْقَۃٌ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ صدیقہ تھیں۔

مثیلِ عیسیٰؑ، علی مرتضیٰؓ

اب آیئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذاتِ گرامی کی طرف۔ انؓ کے مزاج کی ساخت، انؓ
کی طبیعت، اور ان کی سیرت کے عناصرِ ترکیبی کو سمجھئے اور انؓ کی عظمت کو پہچانئے۔ آج کی اس تقریر کے
لئے اخبار میں جو اشتہار شائع کرایا گیا ہے اس کو دیکھ کر بہت سے لوگ چونکے ہوں گے۔ میں نے
اخباری اطلاع کا عنوان "مثیلِ عیسیٰؑ علی مرتضیٰؓ" کیوں بنایا! یہ لفظ تو حضرت علیؓ
کے غالی عقیدت مندوں نے بھی کبھی استعمال نہیں کیا۔ یہ تم کہاں سے لے آئے! حضرات! یہ لفظ میں
نے اس حدیث سے لیا ہے جس کے راوی خود حضرت علیؓ ہیں۔ اس حدیث کو امام احمد ابن حنبلؒ اپنی
مسند میں لائے ہیں اس کے علاوہ مستدرک حاکم، کامل ابن عدی اور مشکوٰۃ میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔
خود اہل تشیع کی مستند کتاب نہج البلاغہ میں بھی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول قریباً انہی الفاظ
کے ساتھ موجود ہے۔ گویا اس کی صحت پر اہل سنت اور اہل تشیع دونوں متفق ہیں۔ میں وہ بات بیان کر
رہا ہوں جس میں کوئی اختلاف و افتراق نہیں ہے۔

وَعَنْ عَلِیٍّ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْکَ
مَثَلٌ مِّنْ عِیْسٰی اَبْغَضَتْہُ الْیَہُوْدُ حَتّٰی بَہَتُوْا اُمَّہٗ وَ اَحَبَّتْہُ

النَّصارٰى حَتّٰی اَنْزَلُوْهُ بِالْمَنْزِلَةِ الَّتِیْ لَیْسَتْ لَهٗ ثُمَّ قَالَ یَهْلِکُ فِیَّ رَجُلَانِ مُحِبٌّ مُفْرِطٌ یُقَرِّظُنِیْ بِمَا لَیْسَ فِیَّ وَ مُبْغِضٌ یَحْمِلُهٗ شَنَاٰنِیْ عَلٰی اَنْ یَبْهَتَنِیْ (رواہ احمد)

"حضرت علی کہتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک مشابہت پائی جاتی ہے کہ ان سے یہود نے بغض رکھا حتّٰی کہ ان کی والدہ پر (بدکاری کی) تہمت لگائی اور نصاریٰ نے ان سے انتہائی محبت کی حتٰی کہ انہیں اس مقام پر پہنچا دیا جو ان کا مقام نہیں۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ میرے بارے میں بھی دو افراد ہلاک ہوئے ایک میری محبت میں افراط کرنے والا کہ مجھ میں وہ اوصاف گنوائے جو مجھ میں نہیں اور ایک مجھ سے بغض رکھنے والا کہ وہ میری دشمنی میں یہاں تک بڑھ جائے کہ مجھ پر بہتان لگائے۔"

وہ کیا مثال ہے! وہ کیا مشابہت ہے! کس پہلو سے حضرت علیؓ مثیل عیسیٰ ہیں حضورؐ فرماتے ہیں کہ جس طرح یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے انتہائی بغض رکھا یہاں تک کہ انہوں نے ان کی والدہ پر (بدکاری کی) تہمت لگائی [1] اسی طرح کچھ لوگ حضرت علی سے بغض رکھیں گے

دوسری انتہا کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نصاریٰ نے ان سے انتہائی محبت کی اور انہیں اس منزل اور مرتبہ تک پہنچا دیا جو ان کا مقام نہیں ہے" مراد یہ ہے کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا صلبی بیٹا بنا دیا۔ وہ انہیں استعارہ کے طور پر اللہ کا بیٹا نہیں کہتے۔ اسی لئے وہ ابن کے بجائے ولد کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اقانیم ثلاثہ میں سے ہیں۔ خدائی میں

---

[1] آج کل یہودی عموماً بہت محتاط ہیں اس بہتان کا برملا اور علی الاعلان اظہار نہیں کرتے کیونکہ اس وقت دنیا میں امریکہ اور برطانیہ نیز دوسری عیسائی حکومتوں کے سہارے ہی سے تو ان کا وجود باقی ہے۔ لیکن اپنی فطرت سے مجبور ہو کر وہ اپنے بغض کے اظہار سے باز بھی نہیں رہ سکتے۔ چند سال پہلے انہوں نے امریکہ میں حضرت عیسیٰؑ کے حالات پر ایک فلم بنائی تھی اور وہ وہاں چلی... انہوں نے اس کا نام ہی 'SON OF MAN' "انسان کا بیٹا" رکھا۔ اب انسان کا بیٹا کہنے کا مطلب کیا ہوا! حضرت مریم کی شادی تو ہوئی نہیں۔ عیسائی ان کو کنواری مانتے ہیں۔ اب "انسان کا بیٹا" کہنے کے معنی تو یہ ہوئے کہ حضرت عیسیٰؑ کسی انسان کے نطفہ سے ہیں..... نتیجہ کیا نکلا! اس کو وہ فلم دیکھنے والے پر چھوڑ دیتے ہیں۔

شریک ہیں۔ ذات باری تعالیٰ کے ساتھ کسی کو اس طرح شریک ٹھہرالینا شرک کی عریاں ترین اور بدترین شکل ہے۔ عیسائی اس گھناؤنے جرم کے مرتکب ہوئے۔۔۔

حضورؐ کے اس ارشاد کی وضاحت میں خود حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ میرے بارے میں بھی دو اشخاص ہلاک ہوں گے...... یعنی ہلاکت' بربادی تباہی اور ضلالت کی انتہا کو پہنچ جائیں گے۔ ایک وہ ہلاک و برباد ہو گا جو میری محبت میں افراط کو پہنچ جائے گا۔ اور میرے اندر وہ اوصاف گنوائے گا جو میرے اندر نہیں ہیں"۔ دوسرا وہ شخص ہلاک ہو گا۔! جو مجھ سے عداوت' دشمنی' عناد رکھے گا اور میری دشمنی اسے یہاں تک پہنچائے گی کہ وہ مجھ پر بہتان لگائے گا۔ مجھ سے وہ جرائم منسوب کرے گا جن سے اللہ نے مجھے پاک صاف رکھا ہے۔۔۔ یہ ہے وہ حدیث جس کے حوالہ سے میں نے اپنی آج کی گفتگو کا عنوان "مثیل عیسیٰؑ علی مرتضیٰؓ۔۔۔ اخذ کیا ہے۔

حدیث کا پس منظر

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک کی شرح اور اس کی وہ توضیح جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمائی دونوں کو تاریخ کے تناظر میں رکھ کر دیکھ لیجئے۔

سبائی فتنہ

ایک انتہا وہ ہے جس کا بانی عبداللہ ابن سبا ہے یہ شخص علاقہ یمن کا رہنے والا ایک یہودی عالم تھا۔ جس نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بالکل ابتدائی دور خلافت میں اسلام قبول کیا تھا...... بعد کے واقعات سے ثابت ہو گیا کہ اس کا قبول اسلام ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تھا۔ وہ اسلام میں داخل ہو کر اندر ہی اندر ایک طرف توحید و رسالت کی بنیادوں کو منہدم کرنا چاہتا تھا' دوسری طرف اس کی اسکیم یہ تھی کہ مسلمانوں میں اختلاف و افتراق پیدا کر کے ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دے اور ع

تھمتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا

کی جو کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس کے آگے بند باندھے۔ اسلام کو جو قوت و شوکت حاصل ہو رہی ہے اسے پاش پاش کر دے۔ خلافت فاروقی کے قریباً دس سالوں میں اسلامی دعوت اور عسکری فتوحات کا دائرہ

اتنی تیزی سے وسیع ہوا کہ دو بڑی مملکتوں روم و فارس کے بیشتر علاقے اسلام کے زیر اقتدار آ گئے۔ مجوسیوں کی سازش کے نتیجہ میں فاروق اعظم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید کر دیئے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں داخلی انتشار پیدا ہو گا۔ ان کے اتحاد میں نقب لگ جائے گی۔ ان کے حوصلے پست ہو جائیں گے اور اسلام کی فتوحات کی یلغار رک جائے گی۔ لیکن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے زمام خلافت سنبھال کر حالات پر پوری طرح قابو پالیا۔ داخلی استحکام میں نہ کوئی رخنہ آیا نہ کوئی خلل واقع ہوا۔ مفتوحہ علاقوں میں چند شورشیں اور بغاوتیں اٹھیں ان کو حضرت عثمانؓ نے نہ صرف فرو کر دیا بلکہ فتوحات کا دائرہ وسیع تر ہونے لگا۔ حتیٰ کہ فارس (ایران) کا جو علاقہ عہدِ فاروقی میں فتح ہونے سے باقی رہ گیا تھا وہ بھی اسلام کے زیر نگیں آ گیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق خلافت عثمانی میں کسریٰ کی سطوت اور سلطنت کے پرخچے اڑنے کا کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اس دوران مفتوحہ ممالک کے بے شمار لوگ اسلام کو دین حق اور وسیلۂ نجات جان کر اور سمجھ کر اسلام میں داخل ہوئے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے منافقانہ طور پر اسلام قبول کیا تھا۔ ان کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بغض و عداوت کا لاوا پک رہا تھا اور وہ اسی ارادے اور منصوبے کے ساتھ مسلمانوں میں شامل ہوئے تھے کہ موقع ملتے ہی کوئی شورش اور فتنہ کھڑا کر کے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں گے۔

ابن سبا اور پولوس : ایک عجیب مماثلت

اس تناظر میں عبداللہ ابن سبا آگے بڑھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جتنا سازشی ذہن یہودی قوم کا ہے اور اس کام میں جو بے پناہ مہارت اس قوم کو حاصل ہے اس کا کوئی دوسری قوم مقابلہ نہیں کر سکتی۔ سازشی منصوبہ بندی میں اس قوم کو کمال حاصل ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ حضرت عیسےٰؑ جو دینِ حق لے کر تشریف لائے تھے وہ خالص دین توحید تھا۔ انہوں نے یہود کے ان فاسد عقائد، بدعات اور اعمال بد پر شدید تنقیدیں فرمائیں جو ان کے دنیا پرست علماء نے دینِ خالص کے چشمۂ صافی میں دین ہی کے نام سے داخل کر دی تھیں۔ یہود اس کو برداشت نہ کر سکے۔ ان کے عالموں، پیشواؤں اور عوام نے حضرت عیسےٰؑ کو جھوٹا مدعیٔ نبوّت، جادوگر، شعبدہ باز قرار دیا اور یہودی شریعت کے مطابق مرتد اور واجب القتل ٹھہرا کر اپنی عدالت میں مقدمہ چلا کر انہیں صلیب کے ذریعہ

سے سزائے موت دینے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ پھر اس وقت کی برسرِ اقتدار رومی حکومت کے گورنر سے فیصلہ کے نفاذ کی منظوری بھی حاصل کر لی اور اپنے نزدیک حضرت مسیحؑ کو صلیب پر چڑھوا کر دم لیا جبکہ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو جسمانی طور پر آسمان پر اٹھالیا گیا اور قیامت کے قریب دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے۔ اور ان ہی کے ہاتھوں یہودیوں کا قتل عام ہو گا۔ وہ اس کلی خاتمے کے عذاب کا مزہ چکھیں گے جو رسولوں کا انکار کرنے والی قوموں کے لئے اللہ تعالیٰ نے مقدر کر رکھا ہے...... یہود اپنی دانست میں حضرت مسیحؑ کو صلیب پر چڑھوا کر بے فکر ہو گئے تھے کہ انہوں نے علمی و عملی توحید خالص کے چشمہ صافی کو نیست و نابود کر دیا ہے۔ لیکن حضرت مسیحؑ کے مخلص اور صادق العہد حواریوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی آں جنابؑ کی لائی ہوئی ہدایت کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا اور انؓ کی مخلصانہ جدوجہد برگ و بار لانے لگی اور دعوت حق کے غلبہ کے آثار ہویدا ہونے لگے تو یہودیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ دینِ خالص کی مقبولیت اور اس کی توسیع کا راستہ روکنے کے لئے ساؤل نام کا ایک مشہور یہودی عالم جو دین عیسوی کا انتہائی دشمن تھا اور وہ اس کی شدید ترین مخالفت میں پیش پیش رہتا تھا، یہی عیسائیت قبول کرنے والوں پر خود بھی مظالم کرتا اور دوسروں سے بھی کراتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ شدید مخالفت اور مظالم کے باوجود دین عیسوی پھیل رہا ہے تو اس نے پینترا بدلا اور اپنے ایک من گھڑت مکاشفہ یا مشاہدہ[1] کا اعلان کر کے عیسائیت قبول کر لی۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ حضرت عیسیٰؑ نے اس مکاشفہ میں مجھے نام بدلنے کی بھی ہدایت کی ہے

---

[1] ساؤل (پولوس) نے ایک مجمع عام میں ڈرامائی انداز میں اعلان کیا کہ "میں عیسائیت اور عیسائیوں کے خلاف اپنی جدوجہد کے لئے دمشق جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک منزل میں آسمان سے زمین تک ایک نور ظاہر ہوا اور آسمان ہی سے یسوع مسیح کی آواز مجھے سنائی دی کہ "اے ساؤل تو مجھے کیوں ستاتا ہے"۔ اور انہوں نے مجھے ایمان لانے اور اپنے دین کی خدمت اور منادی کرنے کی ہدایت دی اور وصیت فرمائی۔ میں یہ معجزہ دیکھ کر ان پر ایمان لے آیا ہوں اور اب میں نے اپنی زندگی کو یسوع مسیح کے دین کی خدمت اور منادی کے لئے وقف کر دیا ہے...... حضرت عیسیٰؑ کے صحیح الفکر اور صادق الایمان حواریوں نے پال کے اس مکاشفہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ان عقائد کی بھی تکذیب کی جو اس نے گھڑ لئے تھے۔ انہی حواریوں کے باقیاتِ صالحات تھے وہ راہب جن کی صحبت سے حضرت سلیمان فارسی رحمۃ اللہ علیہ فیض یاب ہوئے تھے۔ چند حواریوں نے پال کی باتیں قبول کر لیں جس کے باعث دین مسیح مسخ ہو کر رہ گیا (مرتب)۔

چنانچہ اب میرا نام پولوس ہو گا۔ یہی مکار شخص اب عیسائی دنیا میں سینٹ (ولی) پولوس یا سینٹ پال کے نام سے مشہور ہے۔ جبکہ میرے نقطہ نظر سے اسے شیطان پال کہنا مناسب ہے۔

اس یہود زادے نے دین عیسوی میں تحریفات پر ہی بس نہیں کیا بلکہ خالص دین توحید کو مسخ کر کے اس میں عریاں ترین اور بد ترین شرک شامل کر دیا۔ یہ پال ہی ہے جس نے حضرت مسیحؑ کو خدا کا باقاعدہ صلبی بیٹا قرار دیا' انؑ کو الوہیت میں شریک ٹھہرایا اور روح القدس کو جس سے بعض فرقے حضرت مریم اور بعض حضرت جبرئیلؑ مراد لیتے ہیں' اقالیم ثلاثہ میں شامل کر کے تثلیث کا عقیدہ گھڑا ... اسی پال نے شریعت موسوی کو منسوخ قرار دیا جبکہ حضرت عیسیٰؑ کا یہ قول موجودہ اناجیل میں اب بھی موجود ہے کہ "یہ نہ سمجھنا کہ میں شریعت کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔" اسی پال نے کفارہ کا عقیدہ ایجاد کیا۔ یہ بھی اسی کی خرافات ہے کہ جو بھی حضرتِ مسیحؑ پر اس کے عقیدے کے مطابق ایمان لائے گا۔ اس کے گناہ آخرت میں اسے کوئی گزند نہیں پہنچائیں گے کیونکہ اپنے بندوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے خدا نے اپنا بیٹا صلیب پر چڑھوا دیا۔ منصف مزاج عیسائی محققین برملا اعتراف کرتے ہیں کہ موجودہ عیسائیت کا کوئی تعلق حضرتِ عیسیٰؑ کے لائے ہوئے دین سے نہیں ہے یہ خالص پال کی گھڑی ہوئی ضلالت ہے۔

عبداللہ ابن سبا کی سازش پال (پولوس) کی سازش سے کم نہیں تھی۔ پال نے سچے دین عیسوی میں جو تحریف و تخریب کی تھی اس سے عبداللہ ابن سبا کے سازشی ذہن نے یہ سبق لیا کہ توحیدِ خالص کی حامل امت کو گمراہ کرنے' راہ حق سے ہٹانے اور غیر ضروری مسائل میں الجھانے کا آسان راستہ یہ ہے کہ امت کی نظر میں جو مقدّس اور محبوب ترین شخصیتیں ہوں ان کے متعلق محبت و عقیدت میں غلو اور افراط کے جذبات کو ابھارا جائے۔ ان میں سے بعض کو بعض پر غیر ضروری فضیلت دینے کا حربہ استعمال کر کے اختلاف و افتراق پیدا کیا جائے... خلافت عثمانیؓ کے ابتدائی دور میں جبکہ وہ منافقانہ طور پر اسلام لا چکا تھا اس نے مدینہ ہی میں اس کام کی ابتدا کر دی لیکن اس نے اپنی ذہانت سے اُسی وقت اندازہ لگا لیا کہ یہاں ہی نہیں بلکہ پورے حجاز میں اس کی دال گلنے والی نہیں ہے۔ اس علاقہ میں دینی شعور نہایت گہرا ہے اور دین کے ایسے پاسبان موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے اس کے مذموم مقاصد میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا اس نے مفتوحہ علاقوں کے اہم شہروں کا دورہ شروع کیا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ ان علاقوں میں جہاں بہت سے لوگ اسلام کی حقانیت اور صحابۂ کرام کی سیرت و کردار سے مسخّر اور مطمئن ہو کر صدق دل سے ایمان لائے تھے' وہاں اچھی خاصی تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو اسلامی

انقلاب کی طوفانی یلغار اور توسیع سے مرعوب ہو کر مسلمان ہوئے تھے اور ایمان ان کے دلوں میں اُترا نہ تھا' وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ ابن سبا نے ایسے ہی لوگوں میں سے اپنے ڈھب کے افراد کو چن کر خفیہ طور پر اپنے ساتھ ملانا شروع کر دیا۔ پہلے اس نے شام میں کوشش کی لیکن وہاں کوئی شخص اس کے جھانسے میں نہیں آیا۔ پھر اس نے مصر' بصرہ اور خاص طور پر کوفہ کو اپنی توجہات کا مرکز بنایا۔ ان مقامات پر اسے اپنے ڈھنگ کے کچھ منافق اور کچھ جاہل اور ناتربیت یافتہ لوگ مل گئے۔ ایسے سیدھے سادھے لوگ بھی خاصی تعداد میں اس کی باتوں سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ شامل ہو گئے جن کے خمیر میں شخصیت پرستی رچی بسی تھی۔ اس طرح اس نے ایسے لوگوں کا ایک گروہ تیار کر لیا جو اس کی مفسدانہ مہم میں اس کے مددگار بن گئے۔

ابنِ سبا کی تکنیک

یہ ساری ریشہ دوانیاں یہ یہود زادہ بڑی رازداری' ہوشیاری' اخفا اور مکرو فریب سے اس طرح انجام دے رہا تھا جس طرح ہمارے دور میں زیر زمین سبوتاژ کی خفیہ تحریکیں چلتی ہیں۔ وہ خود اور اس کے قریبی ساتھی خفیہ طور پر مختلف شہروں میں جاتے آتے رہتے۔ کوفہ کے عمّال کی مصر میں اور مصر کے عمّال کی کوفہ میں برائیاں کرتے اور لوگوں کو باور کراتے کہ یہ عمّال اپنے اختیارات سے ناجائز فائدے اٹھا رہے ہیں' پُرتعیش زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ پھر یہ خرابیاں خلیفۂ وقت حضرت عثمانؓ کے کھاتے میں ڈالی جاتی تھیں۔ چودہ سو برس پہلے کے زمانے کا تصور کیجئے۔ نہ اخبارات' نہ ریڈیو' نہ ٹیلی ویژن' نہ ڈاک کا معقول انتظام۔ لوگوں کے پاس دوسرے شہروں کے حالات معلوم کرنے کے ذرائع مفقود تھے۔ آج اس ترقی یافتہ دور میں جبکہ ذرائع ابلاغ' وسائل معلومات وسیع تر ہو چکے ہیں' اکثر و بیشتر لاہور جیسے شہر میں ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں صحیح خبر نہیں پہنچتی۔ اس میں دسیوں افسانے شامل ہو جاتے ہیں۔

پھر اس عیار یہودی نے مذہبی اور سیاسی محاذ ایک ساتھ کھول رکھے تھے۔ کہیں وہ یہ شوشہ چھوڑتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت عیسیٰؑ تو دنیا میں واپس آئیں اور حضورؐ نہ آئیں۔ وہ قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کرتا کہ اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ۔ اس آیت کا شیخ الہندؒ نے ترجمہ کیا ہے۔ "(اے نبی) جس (اللہ) نے حکم بھیجا تجھ کو قرآن کا وہ پھیر لانے والا ہے تجھ کو پہلی جگہ۔" تمام متقدمین و متاخرین

مفسروں نے یہاںؒ رَادُّكَ اِلٰی مَعَادٍ سے ہجرت کے بعد حضورؐ کا بطور فاتح مکہ واپس لوٹنا مراد لیا ہے۔ اس میں وفات کے بعد حضورؐ کے اس دنیا میں دوبارہ واپس آنے کا ادنیٰ سا اشارہ بھی موجود نہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے زیر اثر نادانوں اور ناتربیت یافتہ لوگوں نے قرآنی تعلیم کے یکسر خلاف اس کی بات مان لی ہے تو اس نے محبت و عقیدت کا رخ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف پھیرنے کے لئے اپنے حالی موالیوں کو یہ پٹی پڑھائی کہ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے جو نبی کا خصوصی قرابت دار اور تربیت یافتہ ہوتا ہے۔ جس کو نبی خاص وصیتیں اور اہم و خفیہ ہدایات دیتا ہے لہٰذا علی رضی اللہ عنہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں...... پھر یہ کہ جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں، علی رضی اللہ عنہ بھی اسی طرح خاتم الاوصیاء ہیں۔ خلافت کے حقیقی حقدار علیؓ ہیں پہلے دو خلفاء بھی غاصب تھے۔

پھر اس نے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف زبانِ طعن دراز کرنی شروع کی اور اس نے اہم شہروں میں اپنے داعی اور ایجنٹ پھیلا دیئے جو یہ پراپیگنڈہ کرتے تھے کہ حضرت عثمانؓ کو معزول کر کے حضرت علیؓ کو خلیفہ بنایا جائے قریباً دس سال کی یہ مذموم سازش اور شر و فساد کی یہ خفیہ تحریک رنگ لائی اور ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو سبائیوں کے ہاتھوں حضرت عثمان غنی ذوالنورینؓ انتہائی مظلومانہ طریق پر شہید کر دیئے گئے۔ انہوںؓ نے باغیوں کی سرکوبی کے لئے جملہ وسائل رکھنے کے باوجود اپنی جان کے تحفظ کے لئے ان باغیوں اور منافقوں کے خلاف طاقت استعمال کرنے اور تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دی اس لئے کہ ان سبائیوں کے پاس کلمۂ طیبہ کی ڈھال موجود تھی۔

حضرت عثمانؓ کو شہید کرنے کے بعد ان سبائیوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گھیر لیا کہ آپؓ اُن سے اور عامۃُ المسلمین سے خلافت کی بیعت لے لیں لیکن حضرت علیؓ نے انکار کر دیا۔ تین دن تک مسند خلافت خالی رہی جس پر یہ سبائی انؓ کے ساتھ بھی گستاخی کرنے لگے...... ادھر اہل مدینہ نے بھی حضرت علیؓ کی خدمت میں عرض کیا کہ امت بغیر خلیفہ کے رہ گئی ہے۔ اب آپؓ کے سوا امت مسلمہ میں کوئی دوسری ایسی شخصیت نہیں ہے جو اس عظیم منصب کے لئے قابلِ ترجیح ہو...... چنانچہ اہل مدینہ کے اصرار پر جن میں اصحابؓ رسولؐ کی بھی اچھی خاصی تعداد شامل تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت خلافت لے لی۔

محبّت میں غلو : سبائی سازش کا شاخسانہ

اب تک میں نے اس یہودزادے عبداللہ ابن سبا کی اُن سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ذکر کیا ہے جو اللہ کے دین کے اس دشمن نے مسلمانوں میں اختلاف و افتراق پیدا کرنے کے لئے کی تھیں اس نے عراق کے لوگوں میں جو طویل عرصہ تک کسریٰ کے ماتحت رہے تھے اور ایران کے اصل باشندوں میں سے جو لوگ اسلام لے آئے تھے' ان کے اندر خاص طور پر کام کر کے ان کی محبت و عقیدت کا رخ بڑی عیاری اور ہوشیاری سے حضرت علیؓ کی طرف پھیر دیا۔ ان لوگوں میں چونکہ صدیوں سے شخصیت پرستی رچی بسی تھی اور یہ خاندانی بادشاہت و حکومت کے خوگر تھے لہٰذا عبداللہ ابن سبا کو اس کام میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اس نے صاف الفاظ میں کہا کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خدا ہیں ان کے قالب میں روح خداوندی ہے۔ حضرت علیؓ نے جب مدینۃ النبیؐ کو چھوڑ کر کوفہ کو دارالخلافہ بنالیا تو یہ علاقہ اس گروہ کی سرگرمیوں کے لئے زیادہ موزوں ثابت ہوا۔

حضرتِ علیؓ کا اقدام

اہل سنت اور اہل تشیع کی اکثر مستند کتابوں میں مذکور ہے کہ جب عبداللہ ابن سبا کی ان گمراہ کن جسارتوں کی خبر حضرت علیؓ تک پہنچی تو انہوں نے اسے بلوایا اور اس سے دریافت کیا کہ کیا تو یہ باتیں کہتا ہے! اس نے اقرار کیا اور حضرت علیؓ کے سامنے کھڑے ہو کر برملا کہا کہ میرے دل میں القا ہوا ہے کہ اِنَّکَ اَنْتَ اللّٰہ "بے شک آپ اللہ ہیں" ..... حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اس کفر سے توبہ نہیں کرو گے تو زندہ آگ میں جلوادوں گا...... اس نے کہا کہ آپ ہمارے خدا ہیں' خدا امتحان لیتا ہی ہے' آپ بھی ہمارا امتحان لے رہے ہیں۔ ہم اس امتحان میں ثابت قدم رہیں گے۔ اہل سنت اور اہل تشیع کی مستند کتابوں میں مذکور ہے کہ اس لعین نے سادہ لوح لوگوں پر اس طرح یہ نشہ چڑھادیا تھا کہ ستر آدمی اس موقع پر اس کے ساتھ تھے اور اس عقیدہ باطل میں اس کے ہم نوا تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کو توبہ کے لئے تین دن کی مہلت دی اور قید کرادیا۔ لیکن ابن سبا اور اس کے ساتھی باز نہ آئے اور انہوں نے توبہ کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار حضرت علیؓ نے ایک خندق کھدوائی' اس میں آگ جلوائی اور ان سب کو آگ اور اس کے دھوئیں سے مار دیا[1] ...... حضرت علی رضی اللہ

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

تعالیٰ عنہ نے امیر المومنین کی حیثیت سے اس بد ترین شرک کی جو بد ترین سزا ہونی چاہیئے تھی وہ نافذ کی۔ یہ شرک ہی نہیں بلکہ کھلم کھلا ارتداد تھا کیونکہ وہ سب مسلمان ہونے کے مدعی تھے۔ خود کو مسلمان کہتے ہوئے کسی انسان کو خدا مان لینے سے بڑا ارتداد اور کون سا ہو گا۔ بعض روایات کے مطابق ان جلائے جانے والوں میں عبداللہ ابن سبا شامل نہیں تھا۔

ابنِ سبا کی شخصیت!

اب تک کی میری گفتگو سے یہ بات آپ حضرات پر واضح ہو گئی ہو گی کہ عبداللہ ابن سبا نہایت غالی اور کٹر یہودی تھا اور اس نے اسلام کو اسی طرح نقصان پہنچانے کے لئے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا تھا جیسے پولوس نے۔ اس نے حضرت علیؓ کو "خدا" بنا دیا۔ آج بھی چند فرقے حضرت علیؓ کی الوہیت کا عقیدہ رکھتے ہیں ہمارے ملک کے آغاخانیوں کے علاوہ شام اور لبنان میں "نصیری" نام کا ایک فرقہ حضرت علیؓ کو آج بھی خدا مانتا ہے۔

عبداللہ ابن سبا کے بارے میں آج کل ایک گروہ کے بعض حضرات نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ تاریخ میں اس نام کی کوئی حقیقی شخصیت موجود نہیں تھی۔ یہ تو افسانوی اور مفروضہ شخصیت ہے۔ حالانکہ اس شخص کے تذکرے پہلی صدی ہجری کی بے شمار مستند کتابوں میں کثرت کے ساتھ ملتے ہیں۔ جس طرح اہل سنت کے نزدیک احادیث کی معتبر ترین کتاب صحیح بخاری ہے اسی طرح اثنا عشری امامیہ اہل تشیع کے نزدیک ان کی کتب حدیث میں سب سے زیادہ مستند و معتبر کتاب ابو جعفر یعقوب کلینی رازی کی کتاب "الجامع الکافی" ہے۔ اور اہل تشیع کے ہاں احادیث کے راویوں کے بارے میں "اسماء الرجال" کی سب سے زیادہ قابل اعتماد کتاب "رجال کشی" ہے۔ ابو عمر الکشی کی اس کتاب کا پورا نام "معرفت اخبار الرجال" ہے اس کتاب میں حضرت زین العابدین، حضرت باقر[1] اور حضرت جعفر

---

[1] اہل تشیع کی مستند کتاب "رجال کشی" میں پوری سند کے ساتھ حضرت محمد باقر رحمہ اللہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ اِنَّ عبداللّٰہ بن سبا یَدَّعِی النُّبُوَّۃَ وَ یَزْعَمُ اَنَّ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ علیہ السَّلام ھُوَ اللّٰہ (مرتب)

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اہل تشیع کی مستند کتاب "رجال کشی" میں ایک روایت حضرت باقرؒ سے ہے کہ حضرت علیؓ نے آخری وقت بھی ان کو توبہ تلقین کی پھر ان کے انکار پر ان کو آگ میں ڈلوا دیا۔ الفاظ ہیں قَالَ عَلِیٌّ تُوْبُوْا قَالُوْا لَا نَرْجِعُ ثُمَّ قَذَفَھُمْ فِی النَّار (مرتب)

صادق رحمھم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے متعدد اقوال موجود ہیں جس میں اس شخص عبداللہ ابن سبا کاذکر ہے..... رجال کشی میں حضرت جعفر صادقؒ کا یہ قول اسناد کے ساتھ موجود ہے کہ "خدا ابن سبا پر لعنت کرے۔ اس نے حضرت علی کے متعلق ربوبیت کا دعویٰ کیا' خدا کی قسم امیرالمومنین اللہ کے بندے تھے۔ ہلاکت ہو اس پر جو ہم پر جھوٹ باندھتا ہے اور لوگ ہمارے بارے میں وہ کچھ کہتے ہیں جو ہم اپنے بارے میں نہیں کہتے۔ ہم بارگاہ الٰہی میں ان لوگوں سے اپنی برات کا اعلان کرتے ہیں۔" اسی رجال کشی میں حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے۔ "جس نے حضرت علی پر افترا کیا اس پر اللہ لعنت کرے میں جب عبداللہ ابن سبا کو یاد کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ اس نے ایک بہت بڑا دعویٰ کیا۔ اللہ اس پر لعنت کرے۔" خود اپنی مستند و معتبر کتاب کی روایات کے باوجود عبداللہ ابن سبا کی شخصیت کو قریباً تیرہ چودہ صدیوں کے بعد افسانوی اور فرضی شخصیت قرار دینے کی جو لوگ جسارت کر رہے ہیں' سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے متعلق میں کیا کہوں! رجال کشی کی روایات کو کیسے جھٹلا سکتے ہیں! اس طرح تو وہ اپنے مذہب کی بنیاد کو منہدم کر رہے ہیں۔

عبداللہ ابن سبا اور اس کے پیرو کاروں نے جس فتنے کی بنیاد رکھی' حضرت علیؓ اور ان کے اہل بیت کی تردید اور پرزور تردید کے بعد بھی اس فتنہ کا دروازہ بند نہیں ہوا اور اس کے مضر نتائج اور گمراہ کن عقائد تاحال موجود ہیں جن کا خمیازہ امت صدیوں سے بھگتتی چلی آ رہی ہے۔

دوسری انتہا: خوارج

جنگ صفین میں تحکیم قبول کر لینے کا ایک شدید ردعمل یہ ہوا کہ حضرت علیؓ کے لشکر کی ایک معتدبہ اور قابل لحاظ تعداد اس مسئلہ پر آپؓ کی مخالفت کے اعتبار سے دوسری انتہا تک پہنچی اور خوارج' کہلائی جب حکم بنانے کا مطالبہ ہوا تو دونوں لشکروں میں سے کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ لیکن اس کے ناکام ہو جانے اور صفین سے کوفہ واپس آنے کے بعد ان خوارج نے حضرت علیؓ پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ..... نقل کفر کفر نہ باشد انہیں کافر قرار دیا۔ کافر ہو گئے تو مرتد ہو گئے۔ اب توبہ کریں' تجدید ایمان کریں۔ ورنہ ارتداد کے باعث واجب القتل ہیں..... ان کا موقف کیا تھا یہ کہ آپؓ نے تحکیم کیوں قبول کی! اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اللہ کے سوا کوئی حکم نہیں' کوئی حاکم نہیں۔ کوئی حکم دینے کا مجاز نہیں۔ آپؓ نے کیسے حکم مان لیا گویا آپؓ کو اس پر یقین نہیں ہے کہ آپ خلیفہ برحق ہیں۔ آپ نے اس صریح واضح اور بیّن بات کو متنازع تسلیم کر لیا کہ آپ کی خلافت نزاعی ہے۔ خوارج ان

اعتراضات کی بنیاد پر حضرت علیؓ پر ارتداد کا بہتان لگا کر آپؓ سے توبہ اور تجدید ایمان کا مطالبہ کرتے تھے۔ حضرت علیؓ بڑے حلیم الطبع صلح جو اور نرم مزاج کے مالک تھے آپؓ کو خون ریزی قطعی پسند نہیں تھی۔ آپؓ نے آخری حد تک کوشش کی کہ خوارج اپنی ضلالت اور گمراہ سے توبہ کرلیں اور باز آ جائیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے ساتھ گفت و شنید اور افہام و تفہیم کی انتہائی کوشش کی۔ بہت سے سربر آوردہ لوگوں کو بار بار ان کے پاس بھیجا۔ ان کے قائدین کو بلا کر خود بھی انہیں خوب سمجھایا۔ جب وہ اپنے موقف سے ہٹنے کے لئے بالکل تیار نہیں ہوئے تو یہاں تک فرمایا کہ اگر تم اس عقیدے پر قائم رہو یہ باطل نظریہ اپنے تک رکھو تب بھی میں تمہارے خلاف کوئی اقدام نہیں کروں گا۔ تم سے کوئی تعرض نہیں کروں گا بشرطیکہ تم بدامنی اور غارت گری کا ارتکاب نہ کرو۔ اگر فتنہ و فساد پھیلاؤ گے تو پھر مجھے تمہارے خلاف اقدام کرنا پڑے گا ... لیکن یہ لوگ اتنے بپھرے ہوئے تھے اور اپنے نظریات میں اتنے پختہ تھے کہ انہوں نے حضرت علیؓ کے خلاف اقدامات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ابتداً یہ چھاپے اور شب خوں مارتے اور فرار ہو جاتے۔ دوبدو باقاعدہ جنگ سے گریز کرتے۔ لیکن بالآخر نہروان کے مقام پر دونوں لشکر باقاعدہ مقابلے کے لئے آمنے سامنے آ گئے۔ اس وقت بھی حضرت علیؓ نے بڑی کوشش کی کہ جنگ کی نوبت نہ آئے ' ان کے ساتھ مصالحت ہو جائے۔ انہیں سمجھا دیا جائے۔ آپؓ نے آخری تدبیر یہ اختیار کی کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو سفید جھنڈا دے کر ایک طرف کھڑا کر دیا اور اعلان کر دیا کہ جو بھی اس جھنڈے تلے آ جائے گا اس کے لئے امان ہے۔ وہ گویا غیر جانب دار ہو گیا ' نہ ادھر رہا نہ ادھر رہا۔ آپؓ کی اس تدبیر سے کافی لوگ خوارج کے لشکر سے نکل کر ادھر چلے گئے۔ پھر بھی خوارج کے لشکر میں قریباً ساڑھے چار ہزار افراد باقی رہ گئے۔ پھر جب دوبدو جنگ ہوئی ہے تو نو افراد کے سوا سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ اس بہادری سے لڑے ہیں کہ ان کی شجاعت کے تذکرے تاریخ کے اوراق میں ثبت ہو گئے۔ مغالطہ ہوتا ہے تو اتنا شدید ہوتا ہے۔ تھا تو مغالطہ ' لیکن کتنا شدید کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم حق پر ہیں اور حضرت علیؓ اور ان کے ساتھی ناحق پر ہیں۔ انہوں نے اپنے اس باطل نظریہ اور عقیدہ کی خاطر اپنی جانیں دے دیں جو ان کے اذہان و قلوب میں بیٹھ گیا تھا.... یہ بات جان لیجئے کہ نظریئے اور عقیدے کی محبت خواہ وہ باطل ہی کیوں نہ ہو انسان کو جان کی بازی لگانے اور قربان کرنے پر آمادہ کر لیتی ہے۔ .. بہر حال دور علوی ہی میں خوارج نے ایک باقاعدہ فرقہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ان کے علیحدہ عقائد تھے۔ ان کے بارے میں یہ بڑے شدید تھے۔ بنو عباس کی خلافت کے آغاز تک ان کی ترک تازیاں ' سورشیں بغاوتیں جاری رہیں۔ اغلباً

عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے ان کا پورا قلع قمع کیا۔

خوارج کے ہاتھوں حضرت علیؓ کی شہادت

درحقیقت جنگ صفین کے فوراً بعد ہی تین خارجیوں نے خفیہ طور پر طے کیا کہ جب تک تین اشخاص حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ، اور حضرت عمرو ابن العاصؓ صفحہ ہستی پر موجود ہیں دنیائے اسلام کو خانہ جنگی سے نجات نہیں مل سکتی۔ چنانچہ یہ تینوں بیک وقت ان تینوں کو قتل کرنے پر تیار ہو گئے۔ تاریخ اور وقت طے ہو گیا۔ ابن ملجم کے ہاتھوں کوفہ میں حضرت علیؓ نے جام شہادت نوش کیا۔ اس شقی اور بدبخت سے ایک خوبصورت خارجی عورت نے مہم کی کامیابی کے بعد شادی کا وعدہ کیا تھا..... اسی روز دمشق میں نماز فجر ہی کے دوران حضرت معاویہؓ پر وار اوچھا پڑا وہؓ بچ گئے۔ حملہ آور گرفتار ہو کر قتل کیا گیا۔ عمرو ابن العاصؓ اس صبح کو خود امامت کے لئے نہیں آئے تھے۔ ان کے دھوکہ میں وہ صاحب شہید ہوئے جو انؓ کی جگہ امامت کر رہے تھے۔ عبدالرحمٰن ابن ملجم نے زہر آلود خنجر سے حضرت علیؓ پر اس وقت وار کیا جب آپؓ فجر کی نماز پڑھا رہے تھے سر سجدہ میں تھا اور دل راز و نیاز الٰہی میں مصروف تھا۔ سر پر کاری زخم آیا۔ زندگی کی امید نہ رہی۔ حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو نہایت مفید نصائح کیں اور اسی روز یعنی ۲۰ر رمضان المبارک ۴۰ھ جمعہ کی شب کو فضل و کمال، رشد و ہدایت اور تقویٰ و طہارت کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ ..انا للہ و انا الیہ راجعون..... ابن ملجم گرفتار ہو گیا تھا آپؓ نے وصیت کی کہ اگر میں بچ گیا تو خود ہی اس سے نمٹ لوں گا۔ اگر میری موت واقع ہو جائے تو قصاص میں اسے قتل کر دیا جائے اور اس کی نعش کی کوئی بے حرمتی نہ کی جائے۔

ایک تقابل

اب آپ حضرات دیکھئے کہ ایک انتہا یہ ہے کہ خوارج نے خلیفہ راشد، امیرالمومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مرتد قرار دے کر واجب القتل ٹھہرایا اور ان کے ایک شقی نے آخر کار اس بطل جلیل کو شہید کر ڈالا گویا اپنی دانست میں انؓ کو قتل کی سزا دے دی۔ اور دوسری انتہا پر عبداللہ ابن سبا اور اس کی معنوی ذریت پہنچی جس نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خدا قرار دیا اور اس کفر، شرک اور باطل عقیدے کی خاطر اپنی جانیں دے دیں۔ اب آپ سوچئے کہ کسی اور صحابیؓ کے بارے میں ان دو انتہاؤں کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آئے گا۔

موجودہ دور میں غلو کے مظاہر

میں نے یہ جو انتہائیں بیان کیں' ان کے بانی مبانی وہ ہیں جو دائرہ اسلام سے باہر ہیں۔ اب ان انتہاؤں کے شاخسانوں اور باطل اثرات کا دائرہ اسلام کے اندر جائزہ لیجئے۔

محبت میں غلو

میں اہل تشیع کا ذکر کرنا نہیں چاہتا' امامت معصومہ ان کا بنیادی عقیدہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سنیو ں کا جو حال ہے اس پر غور کیجئے۔ کیا ہمارے عوام الناس بلکہ خواص کے بھی قابل اعتنا حصہ کی زبانوں پر "علی مشکل کشا" اور "یا علی مدد" چڑھا ہوا ہے کہ نہیں! یہ کیا ہے؟ یہ سب ایک اعتبار سے سبائیت کے عقیدے کا ظہور ہے کہ نہیں! یہ اسی کے اثرات ہیں کہ نہیں! آپ غور کیجئے کہ کوئی "یا محمدؐ مدد" نہیں کہتا۔ "محمدؐ مشکل کشا" کسی سنی کی زبان پر نہیں آتا۔ کوئی سنی سوچے کہ کیا حضرت علیؓ جناب محمدؐ سے بھی اونچے ہیں۔ ایک گروہ اپنے امتیاز کے اظہار کے لئے اپنی مساجد پر "یا محمدؐ" لکھوالے گا۔ اس کے طغرے گھروں میں لگالے گا۔ مگر کیا آج تک "یا محمدؐ مدد" اور "محمدؐ مشکل کشا" کبھی سنا ہے! نہیں یہ گستاخی جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نہیں ہوئی یہ اللہ کی خصوصی حفاظت ہے کہ اس طرح شرک اس کے آخری نبیؐ کے نام کے ساتھ منسوب نہیں ہوا۔

بغض و عداوت میں غلو

اسی طریقہ سے اگر آپ دوسری انتہا کو دیکھنا چاہیں گے یعنی حضرت علیؓ کی عداوت اور دشمنی کو جس کا خوارج نے ارتکاب کیا تھا تو ہم سنیوّں میں بھی ایک طبقہ موجود ہے اور یہ اچھے خاصے پڑھے لکھوں پر مشتمل ہے جو ایک رد عمل کا شکار ہو کر حضرت علیؓ کے بارے میں کہتا ہے کہ وہؓ خلافت کے امیدوار تھے یا کسی وجہ سے حضرت عثمانؓ کی شہادت میں انؓ کا بھی ہاتھ تھا۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ بدقسمتی سے ہماری صفوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔ یہ لوگ ناصبی کہلاتے ہیں۔ یہ طبقہ خلافت بنی امیہ سے چلا آرہا ہے یہ بھی ایک خاص رد عمل سے متاثر ہو کر وہی کام کر رہے ہیں جو خوارج اور عبداللہ ابن سبا نے کیا تھا۔ نتیجہ تو ایک ہی نکلتا ہے۔ صحابہؓ اور وہ بھی کبار صحابہؓ میں سے کسی کو متہم کر دیا جائے' انؓ کی سیرت کو کسی طرح داغ دار کر دیا جائے تو اصل داغ کہاں لگے گا! جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی ذات اقدس پر...... یہ صحابہؓ کون ہیں! یہ تو جناب محمدؐ کی تربیت کا شاہکار ہیں۔ حضورؐ کی دعوت' تعلیم 'تلقین' تربیت اور تزکیہ کے اعلیٰ ترین نمونے کون ہیں! یہ صحابہ کرام ہیں رضوان اللہ ...... درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ تو انہی صحابہؓ ہی سے تو پہچانے جائیں گے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اگر آپ کسی سکول کی ایک عام کلاس میں جاتے ہیں اور اگر کلاس کا نتیجہ اچھا ہے تو آپ اس کا کریڈٹ کس کو دیں گے! کامیابی کا سہرا کس کے سر پر باندھیں گے! استاد کے سر پر...... لیکن اگر کلاس کا رزلٹ بحیثیت مجموعی خراب آ رہا ہے تو آپ کس کو مورد الزام ٹھہرائیں گے! استاد کو...... تو معاملہ درحقیقت یہ ہے کہ ؎

"ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں"

کوئی چاہے حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ کی سیرت کو داغدار کرے چاہے علیؓ کی سیرت کو داغدار کرے' بات تو ایک ہی ہے۔ چاروں اسی درخت کے پھل ہیں۔ چاہے ادھر سے تیر چلا دو چاہے ادھر سے تیر چلا دو۔ وہ تیر پہنچے گا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر۔ ہاں یہ مکر و فریب ہے' یہ ہوشیاری اور چالاکی ہے' یہ ذہانت و فطانت ہے کہ اگر براہ راست حضورؐ کی ذات کو ہدف بنائیں گے تو یقیناً خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ یہ بڑی اچھی ترکیب عبداللہ ابن سبا اور اس کے ساتھیوں نے سوچی کہ ذرا نیچے اتر کر صحابہؓ کی سیرتوں کو مشکوک بنا دو زد کہاں پڑے گی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر۔ لہٰذا جو شخص بھی یہ کام کرتا ہے کہ چاہے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی سیرت پر حملہ کرے چاہے وہ عثمانؓ اور علیؓ کی سیرت کو داغدار کرے' چاہے حضرات حسنین اور حضرت معاویہؓ کی سیرت کو داغدار کرے۔ بات تو حضورؐ کی ذات تک پہنچے گی۔ لہٰذا خود کو سنی کہنے والا جو شخص بھی ان حضرات کرامؓ میں سے کسی کی ذات پر حملہ کرے گا۔ ان کی نیتوں پر کسی شک کا اظہار کرے گا۔ ان کے بارے میں وہ الزام تراشی کرے گا میرے نزدیک اسے سنی کہلانے کا قطعی حق نہیں ہے۔ چونکہ جو بھی یہ کام کرتا ہے وہ گویا آلہ کار بن رہا ہے حضورؐ اور صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین کے دشمنوں کا۔ مسئلہ کے اس پہلو کی اہمیت کی وضاحت کے لئے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مشہور حدیث کا ایک حصہ سنا کر آگے بڑھوں گا۔ یہ وہ حدیث ہے جو عموماً خطبات جمعہ میں بھی پڑھی جاتی ہے حضورؐ نے فرمایا۔

اللّٰہ اللّٰہ فی اصحابی لا تتخذوھم غرضا من بعدی فمن احبھم فبحبی احبھم و من ابغضھم فببغضی ابغضھم و من اذاھم فقد اذانی ومن اذانی فقد اذی اللّٰہ ومن اذی اللّٰہ فیوشک ان یاخذہ۔

"میرے صحابہؓ کے بارے میں اللہ سے ڈرو' ان کو میرے بعد نشانہ نہ بناؤ۔ بس جس شخص نے ان کو محبوب جانا تو میری محبت کی وجہ سے محبوب جانا اور جس شخص نے ان کے ساتھ بغض رکھا تو میرے ساتھ بغض کی وجہ سے ان کے ساتھ بغض رکھا۔ اور جس نے ان کو تکلیف دی اس نے مجھے تکلیف دی اور جس نے مجھے تکلیف دی اس نے اللہ کو تکلیف دی اور جس نے اللہ کو تکلیف دی تو عنقریب وہ (اس جرم میں) پکڑا جائے گا۔"

حضرتِ علیؓ کا مزاج اور مقام

اب آیئے اس طویل بحث کی طرف جو میں نے "مزاج" کے بارے میں ابتدا میں کی ہے۔ آپ بھی جاننا چاہتے ہوں گے کہ میں نے جو "مزاج" بیان کئے ہیں۔ میں انہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کس مقام پر سمجھتا ہوں۔ اب آپ توجہ سے میری بات سنیئے انشاءاللہ پوری بحث کا سرا آپ کے ہاتھ میں آجائے گا۔ میرے نزدیک صحابہ کرامؓ میں "AMBIVERT" شخصیت حضرت علیؓ کی ہے۔ جامع الصفات شخصیت جن کے اندر وہ دونوں رنگ موجود ہیں صدّیقیّت کا بھی شہادت کا بھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا ایک عکس جامعیّت کے ساتھ آپ کو حضرت علیؓ میں نظر آئے گا۔

شیرِ خداؓ کی شجاعت

حضرت علیؓ میں کمال درجہ کی شجاعت اور بہادری ہے اور صرف چھپی ہوئی نہیں ہے بلکہ ظاہر و باہر ہے۔ حضرت ابو بکرؓ یقیناً بہت شجاع تھے۔ اس خطبہ کے الفاظ کو یاد کیجئے جو حضرت علیؓ نے صدیق اکبرؓ کے انتقال پر دیا تھا۔ کہ "اے ابا بکرؓ! ہم میں سب سے زیادہ شجاع اور بہادر تم تھے۔ وہ تم تھے جو بدر کی شب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آرام گاہ پر پہرا دے رہے تھے اور اللہ نے اپنے پیارے رسول کی غارِ ثور اور اثنائے سفر ہجرت کی رفاقت کے لئے تمہیں منتخب فرمایا تھا۔" اگرچہ حضرت ابو بکرؓ کی شجاعت کا ظہور نہیں ہوا۔ آں جنابؓ کا کسی پہلوان سے مقابلہ کا کوئی ذکر سیرت کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ ارادہ اور عزم کی بات اور ہے کہ جب آپؓ کے بیٹے عبدالرحمٰن نے جو غزوہ بدر تک ایمان نہیں لائے تھے بعد میں ایمان لائے ہیں' صحابی ہیں' آپؓ سے کہا تھا کہ اباجان' بدر میں آپؓ میری تلوار کی زد

میں آ گئے تھے لیکن میں نے آپؓ کا لحاظ کیا اور اپنا ہاتھ روک لیا۔ جواب میں ابو بکرؓ فرماتے ہیں۔
" بیٹے، تم نے یہ اس لئے کیا کہ تم باطل کے لئے لڑ رہے تھے۔ خدا کی قسم اگر تم میری زد میں آ جاتے تو
میں تمہیں کبھی نہ چھوڑتا"۔ اسی عزیمت، اسی قوت ارادی اسی استقامت اور اسی شجاعت کے جوہر کا
اظہار اس وقت ہوا جب حضرت عمر فاروقؓ اور دوسرے اکابر صحابہؓ نے آپؓ سے مسند خلافت پر بیٹھنے
کے بعد کہا تھا کہ مانعین زکواۃ کے خلاف فی الوقت محاذ نہ کھولئے چونکہ مسلمانوں کی بیشتر افواج فتنۂ
ارتداد کی سرکوبی میں مصروف تھیں جو بڑے پیمانے پر عرب کے بعض علاقوں میں پھیل گیا تھا تو اس پیکرِ
عزیمت نے کہا تھا کہ خدا کی قسم اگر مجھے یہ یقین ہو کہ کتے میری لاش کو نوچ کھسوٹ ڈالیں گے تب بھی
میں ان مانعین زکواۃ کے خلاف اقدام سے باز نہیں آؤں گا اور ان کو جب تک نہیں چھوڑوں گا
کہ اگر وہ حضورؐ کے زمانے میں زکواۃ میں اونٹ کے ساتھ رسی بھی دیتے تھے تو اب بھی رسی نہ
دیں۔ کسی نے میرا ساتھ نہ دیا تو میں اکیلا جہاد کروں گا۔ لیکن اسے چھپی ہوئی شجاعت کہا جائے گا۔ یہ
اس طرح ظاہر نہیں ہوئی جیسے میدان جنگ میں حضرت حمزہؓ کی شجاعت اور حضرت عمرؓ کی بہادری کا
ظہور ہوا۔ حضرت عمرؓ کی وہ بات یاد کیجئے جو مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کے وقت کہی۔ آپؓ
نے پہلے کعبہ کا طواف کیا اور پھر اعلان کیا کہ میں مدینہ ہجرت کر رہا ہوں، جس کی خواہش ہو کہ اس کی
ماں اس کو روئے، آئے اور میرا راستہ روک لے۔ سب کے سب مشرک دم بخود رہ گئے۔ یہ بات
حضرت ابو بکرؓ میں آپ کو نظر نہیں آئے گی۔ میں یہاں ایک بات اور بھی عرض کر دوں۔ لیکن خدارا
میری بات کو غلط مفہوم میں نہ لیجئے گا۔ یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی آپ کو کہیں
نہیں ملے گی۔ حضورؐ نے کسی سے دو بدو مقابلہ کیا اور جنگ کی! کہیں ہے اس کا ریکارڈ! لیکن بلا ریب و
شبہ ساری نوعِ انسانی میں اشجع سب سے زیادہ بہادر ہیں جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اگر شجاعت کوئی
اعلیٰ وصف ہے اور یقیناً ہے تو کیا وہ سب سے بڑھ کر حضورؐ میں نہیں ہوگی! ہے یقیناً ہے اور اس کا ظہور
ایک موقع پر ہوا بھی ہے۔ وہ موقع ہے غزوۂ حنین کا جب ایک عام بھگدڑ مچ گئی لوگ منتشر ہو گئے۔ حضورؐ
اس وقت اپنی سواری سے اترے علم اپنے دست مبارک میں لیا اور یہ رجز پڑھا اور زندگی میں شاید پہلی بار
پڑھا

انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب

میرا گمان ہے کہ یہ رجز حضورؐ نے فی البدیہ پڑھا ہے اور گویا یہ واحد شعر ہے جو حضور صلی اللہ علیہ
وسلم نے اپنی پوری زندگی میں کہا ہے۔ بہرحال اس وقت شجاعت سامنے آئی ہے۔ تو ایک شجاعت چھپی

ہوئی ہوتی ہے۔ ایک ہوتی ہے ظاہر و باہر شجاعت۔ تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شجاعت صرف چھپی ہوئی نہیں ظاہر و باہر شجاعت ہے۔ نمایاں شجاعت ہے۔ وہ شجاعت جو بدر میں ظاہر ہو رہی ہے جب کہ شیبہ ابن ربیعہ اور ولید ابن عتبہ ابن ربیعہ یہ دونوں حضرت علیؓ کے ہاتھوں واصل جہنم ہوئے۔ پھر آپؓ کی تلوار نے بجلی کی طرح چمک چمک کر اعدائے اسلام کے خرمنِ ہستی کو جلا دیا۔ غزوۂ احد ہے کہ جس میں حضرت مصعب ابن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شہید ہونے کے بعد حضرت علیؓ نے بڑھ کر انؓ کے ہاتھ سے علم سنبھالا اور بے جگری کے ساتھ لڑے اور چند صحابیوں کے ساتھ مل کر مشرکین کا رخ پھیر دیا جو حضورؐ کی طرف یلغار کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر اسی شجاعت کا ظہور ہوا ہے ۵ھ میں غزوہ احزاب کے موقع پر.......... چند کفار کبھی کبھی گھوڑوں پر سوار خندق میں گھس کر حملہ کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ حملہ آوروں میں عمرو بن عبدود بھی شامل تھا پورے عرب میں مانا ہوا بہت بڑا پہلوان۔ اس وقت اس کی عمر نوے برس کی تھی لیکن پورے عرب میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کوئی اس کے مقابلہ کی جرأت کر سکتا ہے! اس نے مبارزت طلب کی اور نعرہ لگایا کہ ہے کوئی جو میرا دو بدو مقابلہ کرے! اس وقت حضرت علیؓ مقابلہ کے لئے آگے بڑھے۔ وہ ہنسا اور بولا تم میرا مقابلہ کرنے آئے ہو! نام کیا ہے! اس نے بڑا استہزائی انداز اختیار کیا اور کہا کہ میری عادت رہی ہے جب میرا کسی سے مقابلہ ہوتا ہے تو اس کی تین خواہشوں میں سے ایک ضرور پوری کرتا ہوں۔ بولو تمہاری کیا خواہش ہے! حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میری اولین خواہش ہے کہ تم ایمان لے آؤ۔ اس نے کہا کہ اس کا کوئی سوال نہیں۔ حضرت علیؓ بولے کہ میری دوسری خواہش یہ ہے کہ تم میدانِ جنگ سے واپس چلے جاؤ۔ وہ ہنسا اور بولا' یہ بزدلی کا کام میں کروں! یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ حضرت علی نے فرمایا تو پھر تیسری خواہش ہے کہ آؤ مقابلہ کرو تاکہ میں تمہیں قتل کر دوں۔ یہ حضرت علیؓ کی ذہانت و فطانت کا بھی مظہر ہے کہ آں جنابؓ نے پہلے اس کو حکمت کے ساتھ دعوت حق دی پھر دعوتِ مقابلہ۔ لیکن اس بدبخت کے نصیب میں ایمان کی سعادت نہیں تھی۔ وہ بھونچکارہ گیا یہ پہلی بار ہوا ہے کہ میرے منہ پر کوئی مجھے قتل کرنے کی دھمکی دے۔ پھر وہ برہم ہو کر گھوڑے سے کود پڑا۔ تھوڑی دیر تک شجاعانہ مقابلہ کے بعد حضرت علیؓ کی تلوار نے اس کو واصل جہنم کر دیا۔ غزوۂ خیبر کے موقع پر حضرت علیؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے۔ یہاں یہودیوں کے سات قلعے تھے۔ چھ تو فتح ہو گئے آخری قلعہ قموص زیادہ سخت ثابت ہوا۔ پہلے حضرت ابو بکرؓ اور ان کے بعد حضرت عمرؓ اس کی تسخیر کے لئے مامور ہوئے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ حضورؐ نے

فرمایا کہ کل ایک ایسے بہادر کو علم دوں گا جو خدا کا اور رسول کا محبوب ہے۔ اور اس قلعہ کی فتح اسی کے لئے مقدر ہے۔ صبح ہوئی تو ہر جان نثار متمنی تھا کہ کاش اس فخر و شرف کا تاج اس کے سر کی زینت بنے۔ حضورؐ نے دفعتاً حضرت علیؓ کو پکارا۔ وہ آشوب چشم میں مبتلا تھے۔ حضورؐ نے ان کی آنکھوں پر لعاب دہن لگایا جس سے ان کی تکلیف جاتی رہی۔ پھر علم مرحمت فرمایا۔ اس قلعہ کا سردار مرحب نامی یہودی تھا جو فنون حرب میں یکتا و یگانہ شمار ہوتا تھا۔ جثہ کے لحاظ سے بھی بڑا لحیم و شحیم تھا۔ حضرت علیؓ نے پوچھا حضورؐ کیا میں قلعہ والوں کو قتل کر دوں! حضورؐ نے اس موقع پر وہ تاریخی جملے فرمائے کہ نہیں علیؓ پہلے اسلام پیش کرو، ان کو سمجھاؤ کیونکہ تمہاری کوششوں سے اگر ایک شخص بھی مسلمان ہو گیا تو وہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بھری ہوئی وادی سے بہتر ہے۔ اس حدیث شریف کے آخری حصہ کے الفاظ یہ ہیں۔ "لِاَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ عَلٰى يَدَيْكَ رَجُلاً وَّاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ"

حضرت علی نے جب قلعہ قموص کا محاصرہ کیا تو مرحب آہن پوش ہو کر ہتھیار سجا کر بڑے جوش و خروش کے ساتھ یہ متکبرانہ رجز پڑھتا ہوا مبارزت کے لئے نکلا۔

قد علمت خیبر انی مرحب
شاکی السلاح بطل مجرب
اذا الحروب اقبلت تلهب

خیبر مجھے جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں جب میرے سامنے جنگ کی آگ بھڑکتی ہے
مسلح پوش" بہادر اور تجربہ کار ہوں

فاتح خیبر نے جواب میں یہ رجز پڑھا۔

انا الذی سمتنی امی حیدرا
کلیث غابات کریهۃ المنظرا
او فیهم بالصاع کیل السندرا

میں وہ ہوں جس کا نام میری ماں نے حیدر رکھا ہے جھاڑی کے شیر کی طرح مہیب اور ڈراونا
میں دشمنوں کو نہایت سرعت سے قتل کرتا ہوں

اور جھپٹ کر ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کے بعد آپؓ نے قلعہ پر حملہ کیا اور حیرت انگیز شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو فتح کر لیا۔ غزوہ حنین میں ثابت قدم رہنے والوں میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے۔

شعر و ادب اور فصاحت و بلاغت

اب جبکہ حضرت علیؓ کے ایک رجز کا ذکر آ گیا تو عرض کرتا چلوں کہ جہاں آپؓ میں ظاہر و باہر شجاعت کا جوہر موجود ہے اور قوائے عملیہ انتہائی چاق و چوبند ہیں۔ جن کے ظہور کے چند واقعات میں نے آپ کو سنائے وہاں حضرت علیؓ شعر و ادب میں اونچا مقام رکھتے ہیں آپؓ فصاحت و بلاغت کی معراج پر ہیں۔ عام طور پر جو لوگ شجاع اور مرد میدان ہوتے ہیں' ان میں شعر و ادب اور فصاحت و بلاغت کا ذوق بہت کم ہوتا ہے۔ لیکن اس بحر کے بھی شناور ہیں حضرت علیؓ .... یقیناً افصح العرب ہیں جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضورؐ کا اپنا قول ہے انا افصح العرب۔ لیکن حضورؐ کے بعد خطابت' فصاحت و بلاغت اور شاعری میں میرے مطالعہ کے مطابق صحابہ کرامؓ میں حضرت علیؓ کے آس پاس آنے والا کوئی اور نہیں ہے۔ حضرت علیؓ گنتی کے چند ان صحابہؓ میں سے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے پھر عربی گرائمر کے موجد حضرت علیؓ ہیں۔ علم نحو کے ابتدائی اصول آپؓ کی طرف منسوب ہیں۔ حضرت علیؓ کے اشعار پڑھیے۔ آج بھی انسان وجد میں آتا ہے کتنے حکیمانہ اشعار ہیں۔ ان میں کتنی بے ساختگی ہے۔

یَغُوْصُ البحرمَنْ طَلَبَ اللآلیٔ

وَ مَنْ طَلَبَ الْعُلیٰ سَہِرَ اللیالی

وَ مَنْ طَلَبَ العُلیٰ مِنْ غَیْرِ کَدٍّ

اَضَاعَ الْعُمْرَ فِیْ طَلَبِ المُحَالی

جو کوئی بھی موتی چاہتا ہے اسے تو سمندر میں غوطہ لگانا ہی پڑتا ہے۔ جو شخص زندگی میں کوئی اونچا مقام حاصل کرنا چاہتا ہے اسے راتوں کو جاگنا ہی پڑتا ہے۔ جو کوئی بلندی بھی چاہے اور محنت نہ کرے وہ شخص اپنی عمر کو ضائع کر بیٹھتا ہے ایک محال شے کی طلب میں"

تقریر و خطابت

شاعری کے علاوہ تقریر و خطابت میں بھی حضرت علیؓ کو خداداد ملکہ حاصل تھا۔ مشکل سے مشکل مسائل اور موضوعات پر فی البدیہہ تقاریر فرماتے تھے جو نہایت خطیبانہ' مدلل اور موثر ہوتی تھیں۔ آپؓ کے خطبات' اشعار اور حکیمانہ اقوال نہج البلاغہ کے نام سے چار جلدوں میں آج بھی موجود ہیں۔ ان

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا طریق کار

انقلابِ نبوی ﷺ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد کے خطباتِ جمعہ کا سلسلہ

ترتیب و تسوید : شیخ جمیل الرحمٰن

(تیسری قسط)

قرآن و سنّت کی روشنی میں انقلابی تربیت و تزکیہ

حضرات گذشتہ خطاب میں ہم کتاب اللہ اور سنت و سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں انقلاب کے آخری مرحلے یعنی مسلّح تصادم اور دورِ جدید میں اس کے متبادل اقدام کے بارے میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں اور موجودہ دور میں مسلمانوں کی حکومتوں کے خلاف اقدام کی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ ایک اسلامی انقلابی جماعت تربیت و تنظیم کے مرحلوں سے گذرنے اور مناسب عوامی حمایت حاصل ہونے کے بعد اقتدار کی حریف یا حریص بنے بغیر، مسلّح تصادم کے بجائے "نہی عن المنکر بالید" کے اسلامی فریضے کو ادا کرنے کے لئے حکومت کے خلاف مظاہرے اور احتجاج کے ان تمام مروج و معروف طریقوں کو استعمال کرے گی جنہیں متمدن دنیا کے عوام اپنے سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ مظاہرے اور احتجاج انتہائی منظم اور پرامن ہوں گے۔ ان میں تمام اسلامی اصولوں اور اخلاقیات کی پابندی کی جائے گی۔ مظاہرین اپنی جانیں تو دے دیں گے لیکن کسی کے جان و مال کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

اب ہم ان بنیادی شرائط اور لازمی خصوصیات و صفات پر بحث کریں گے جو ایک جماعت کو انقلابی جماعت بناتی ہیں اور اسے اقدام کے مرحلے تک پہنچنے کے قابل بناتی ہیں۔

حزب اللہ اور اسکی صفات

دورِ جدید کی اصطلاح میں جس جماعت کو ہم اسلامی انقلابی جماعت کے نام سے پکارتے ہیں قرآن اسے حزب اللہ یعنی اللہ کی پارٹی یا اللہ کی جماعت کا خطاب دیتا ہے قرآن مجید میں "حزب اللہ" کی اصطلاح دو مقامات پر استعمال ہوئی ہے۔ ایک سورہ مائدہ میں اور دوسرے سورۂ مجادلہ میں۔ سورہ مائدہ میں حزب اللہ کی صفات بیان کی گئی ہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ ○ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہو گا' جو مومنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے' جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے' جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔

تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنا لے اسے معلوم ہو کہ "اللہ کی

جماعت "ہی غالب رہنے والی ہے۔ (سورہ مائدہ۔ آیت ۵۴ تا ۵۶)

اصل مسئلہ ان صفات کی حامل جماعت کی تیاری ہے۔ کیونکہ ایسی جماعت وجود میں آئے گی تب اقدام کا مرحلہ آئے گا۔ اگر انقلابی جماعت ان خصوصیات کی حامل نہ ہوئی اور اس نے اقدام کر دیا تو اس کے اقدام کے نتیجے میں ایک ہنگامہ ہو گا ایک وقتی سی شورش بپا ہو گی' کوئی مثبت اور پائیدار تبدیلی وجود میں نہیں آئے گی۔

انقلابی جماعت کی تربیّت اور تزکیّہ

اللہ کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں ایک انقلابی جماعت تیار کی اور اس کے ذریعے ایک کامل و اکمل انقلاب برپا کر کے دکھایا' اس لئے جماعت کی تیاری و تشکیل کے ضمن میں بھی رہنمائی کا اصل اور بنیادی منبع قرآن و سنتِ رسول اور سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے۔ ہر دور میں ایک اسلامی انقلابی جماعت اور تحریک کو اس سرچشمہ فیض سے رہنمائی حاصل کرنا پڑے گی۔ اگرچہ جماعت کی تیاری کا پہلا مرحلہ انقلابی دعوت کی تبلیغ و اشاعت دوسرا مرحلہ دعوت پر لبیک کہنے والوں کی تنظیم اور تیسرا مرحلہ ان کی تربیت اور تزکیہ ہے لیکن چونکہ ہماری گفتگو کا آغاز ہی انقلاب کے آخری مرحلے یعنی تصادم اقدام سے ہوا ہے اس لئے یہاں بھی گفتگو الٹی تربیت سے ہی چلے گی یعنی پہلے ہم جماعت کی تربیت اور تزکیے کے موضوع پر گفتگو کریں گے۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ آ اس وقت ہمارے معاشرے میں دینی تزکیہ اور تربیت کے جو تصورات اور طریقے رائج ہیں' ا‌ن سے کام چل جائے گا یا من و عن تزکیہ اور تربیت کا وہی نظام اختیار کرنا ہو گا جو محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا۔ ایک جملہ میں تو یہ سمجھ لیجئے کہ میری فکر اور میری سوچ حاصل یہ ہے کہ اس معاملہ میں سرِ مو فرق نہیں ہو گا۔ ہمیں بالکل وہی نظام اختیار کرنا ہو گا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا تھا۔ لیکن اس اجمال سے کام نہیں چلے گا بلکہ مجھے بتانا ہو گا کہ ہمارے ہاں تزکیہ و تربیت کا جو خانقاہی نظام رائج ہے وہ انقلابی کا کے لئے مفید ہے یا مضر در اصل وہ بالکل ایک مخالف سمت میں لے جانے والا نظام ہے۔

انقلابی راہ پر پیش قدمی کے لئے لوگوں کو تیار ہی نہیں کرتا۔ اگرچہ میں نے نہایت سخت بات کہہ دی ہے۔ لیکن خدارا اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے کہ میں خانقاہی نظام کو خیر سے خالی سمجھتا ہوں۔ اس میں خیر ہے' بھلائی ہے لیکن یہ خیر اور بھلائی انقلاب کی طرف لے جانے والی نہیں ہے۔ اسلامی انقلاب لانے اور اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے جو صفات مطلوب ہیں' خانقاہی نظام وہ صفات پیدا نہیں کرتا۔ اس نظام کے ذریعہ سے للّٰہیت پیدا ہوتی ہے' روحانیت پیدا ہوتی ہے' انسان کو کشف بھی ہونے لگتا ہے۔ لیکن اسلامی انقلاب کے لئے جو جوشِ جہاد' ذوقِ شہادت اور انقلابی جذبہ درکار ہے' وہ کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

تحریکِ شہیدین کی مثال

ماضی قریب کی تاریخ میں سید احمد بریلوی" شہید اور شاہ اسماعیل" شہید نے اپنی تحریک میں تربیت و تزکیہ کے اس نظام کو از سرِ نو اختیار کیا جو جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا تھا۔ میں اپنا یہ تاثر بارہا بیان کر چکا ہوں کہ جماعتی شکل میں تقویٰ' تدین' خلوص و اخلاص اور جوشِ جہاد و ذوقِ شہادت کا اتنا عظیم سرمایہ مجھے دورِ صحابہ کے بعد اسلامی تاریخ میں کہیں اور نظر نہیں آتا۔

انقلابی اور خانقاہی تربیت کا فرق

دیکھئے ایک انقلابی دعوت و تبلیغ اور خانقاہی یا مذہبی دعوت و تبلیغ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مذہبی تبلیغ کی نمایاں ترین مثال عیسائیوں کی تبلیغ ہے۔ یہ نمایاں ترین مثال اس لئے ہے کہ موجودہ عیسائیت میں قانون ہے ہی نہیں۔ اس میں کوئی شریعت ہے ہی نہیں۔ لہٰذا اس میں نظام والی بات کہاں سے آئے گی! یہ صرف ایک عقیدہ ہے یا اس میں کچھ اخلاقی تعلیمات ہیں۔ چنانچہ عیسائیت کی تبلیغ کا مطلب ہے ایک عقیدہ کی تبلیغ...... اس کے لئے عیسائیت کے مبشرین' مبلّغین اور پادریوں نے بڑی بڑی مشقتیں اور محنتیں کی ہیں۔ وہ صحراؤں میں پہنچے ہیں' افریقہ اور جنوبی افریقہ کے گھنے جنگلات میں گئے ہیں۔ آدم خور قبائل تک رسائی حاصل

کی ہے۔ عیسائی مبلغ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر ایسی ایسی جگہوں تک پہنچے ہیں کہ جہاں کسی مہذب انسان کا قدم اس سے پہلے نہیں پہنچا تھا۔ سرد ممالک سے آئے ہوئے مبلغین نے خود ہمارے ملک میں تھر اور سندھ کے ریگزاروں میں بیٹھ کر سخت ترین گرمی کو برداشت کیا ہے۔ لیکن چونکہ ان کے سامنے کوئی نظام قائم کرنا نہیں تھا۔ اس لئے وہ صرف اپنے عقیدے کی تبلیغ کر کے رہ گئے کوئی تحریک برپا نہیں کر سکے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک بیل ہوتی ہے' جو زمین پر پھیلتی چلی جاتی ہے۔ خربوزے کی بیل ہو' کدو کی بیل ہو وہ زمین پر ہی پھیلے گی اسے درخت کی طرح اوپر اٹھنا ہی نہیں ہے۔

اس کے مقابلے میں انقلابی تبلیغ کی مثال کمیونزم کی تبلیغ ہے۔ یہ نئے نظریات کی نشرو اشاعت ہے نئے خیالات کا پرچار ہے۔ اس میں لوگوں کو ہم خیال بنانا ہے' مارکسزم کو ان کے ذہن و فکر میں اتارنا ہے' انہیں نئے نظریئے کا علمبردار اور پرچارک بنانا ہے۔ اس تبلیغ کا مقصود و ہدف انقلاب ہے۔ پرانے نظام کو توڑ کر نئے نظام کو قائم کرنا ہے۔ ان دونوں تبلیغوں کے فرق اور نوعیت کو ذہن میں رکھئے انقلابی تبلیغ درخت کی طرح اوپر اٹھتی ہے۔ اور مذہبی تبلیغ بیل کی طرح زمین پر پھیلتی ہے۔ انقلابی تربیت و تزکیہ اور خانقاہی تربیت و تزکیہ میں اسی نوع کا فرق ہے۔ اسے زمین و آسمان کا فرق کہہ لیں تو اس میں مبالغہ نہیں ہو گا۔ لیکن ان کے اجزائے ترکیبی باہم بہت کچھ مل گئے ہیں۔

انقلابی تربیت کے تین اہم اجزاء

اسلامی انقلاب کی جدوجہد سے قطع نظر کسی بھی انقلابی جدوجہد کے لئے انقلابی جماعت کو تیار کرتے ہوئے اس کی تربیت میں تین امور بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہم یہاں ان تینوں اجزاء کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

نظریہ کا شعور اور محبت

انقلابی تربیت میں اہم ترین شے انقلابی نظریہ کو ذہنوں میں اتارنا اور اسے ہر دم تازہ رکھنا ہے جتنی اس نظریہ کے ساتھ محبت' وابستگی اور ہم آہنگی گہری ہوتی چلی جائے گی اتنا ہی جذبہ زیادہ بڑھے گا۔ کسی وجہ سے وہ محبت' وابستگی اور ہم آہنگی کم ہو گئی یا ذہن میں اس پر کوئی گرد وغبار آگیا' تو اسی نسبت سے انقلابی جذبہ بھی سرد پڑ جائے گا۔ للذا انقلابی تربیت میں مقدم ترین شے یہ ہے کہ شعور کی سطح پر انقلابی نظریہ کو تازہ اور مضبوط رکھا جائے تاکہ شعور پر اس کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے پائے۔ کیونکہ اگر انقلابی نظریہ سے ذہنی اور شعوری محبت میں کمی آگئی یا رشتہ کمزور پڑ گیا تو گویا ساری انقلابی تربیت اور انقلابی عمل کی بنیاد ڈھ جائے گی۔ پس مقدم کام یہ ہے کہ انقلابی نظریہ ذہن و شعور کی سطح پر مضبوطی کے ساتھ برقرار رہے اور فکر و نظر میں اس کی گہرائی اور گیرائی بڑھتی چلی جائے جس قدر بصیرت کے ساتھ انقلابی نظریہ پر یقین بڑھتا چلا جائے گا اسی قدر اس نظریہ کے لئے قربانی کا جذبہ بڑھتا چلا جائے گا۔ یہی بات سورہ یوسف میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوائی گئی ہے کہ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اے نبی کہہ دیجئے کہ "میرا راستہ تو یہ ہے کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی اور اللہ پاک ہے اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی رابطہ نہیں۔

صبر و استقامت اور قربانی

انقلابی تزکیہ اور تربیت کا دوسرا اہم جزو صبر و ثبات اور استقامت ہے۔ انقلابی نظریہ کی نشر و اشاعت اور دعوت و تبلیغ میں ابتلاء و شدائد' مصائب و مشکلات اور تکالیف اور مظالم سے ضرور نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ جان دینے کے مرحلے بھی آتے ہیں فقر و فاقہ کی نوبت بھی آتی ہے۔ خود قرآن کا فرمان ہے کہ تمہیں آزمائش میں ڈالے بغیر کامیابی سے ہمکنار نہیں کیا جائے گا۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ ٥ "ہم ضرور تمہیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان ومال، کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دو" (سورہ بقرہ آیت۔ ۱۵۵) وہ مرحلہ بھی آسکتا ہے کہ اپنی محنتوں کے ثمرات کو انسان اپنی نگاہوں کے سامنے اجڑتا دیکھے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر یہ مرحلہ پوری شان کے ساتھ آیا۔ محنت سے سینچی ہوئی کھیتیاں تیار تھیں۔ کھجوریں درختوں پر پک چکی تھیں کھیتیاں کاٹنے اور کھجوریں اتارنے میں کچھ ہی دن باقی تھے کہ حکم آیا۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ "نکلو خواہ ہلکے ہو یا بوجھل اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ" (سورہ توبہ آیت۔ ۴۱) اور جانا بھی کہاں ہے! سلطنت روما سے ٹکراؤ ہے۔ !نفیر عام ہے، ہر تندرست مسلمان کو نکلنا ہے۔ عورتیں، بچے "ضعیف و مریض کھجور کی فصل نہیں اتار سکتے، صاف نظر آرہا ہے فصل درختوں پر ہی تباہ ہو جائے گی۔ لیکن حزب اللہ کو مزید قربانی وایثار کے لئے تیار کیا جارہا ہے۔

اس بات کو ذہن نشین کر لیجئے کہ انسان کے حیوانی داعیات ہی اس کی کمزوری کا سبب بنتے ہیں۔ اگر آپ بھوک برداشت نہیں کر سکتے تو کسی اعلیٰ مقصد کے لئے سرفروشی کیسے کریں گے! اگر آپ راتوں کو جاگ نہیں سکتے تو اپنے اعلیٰ مقصد کے لئے جدوجہد میں اپنی نیندیں کیسے حرام کریں گے۔ اگر آپ مال ودولت کی محبت بلکہ ہوس اپنے دل سے نہیں نکال پھینکتے تو کسی وقت کوئی لالچ آپ کے قدم ڈگمگا دے گا۔ جب کسی نظریہ کا کسی نظریہ سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ کشاکش اور کشمکش ہوتی ہے تو صرف تشدد نہیں ہوتا بلکہ ترغیبات (TEMPTATIONS) کے جال بھی پھینکے جاتے ہیں۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرداران قریش کی طرف سے پیشکش کی گئی تھی کہ:

"آپ بادشاہ بننا چاہیں تو گو ہم بادشاہت کے عادی نہیں ہیں لیکن

ہم آپ کو بادشاہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں اگر آپ کو مال و دولت درکار ہے تو اشارہ کر دیجئے ہم آپ کے قدموں میں سیم و زر کے ڈھیر لگا دیں گے۔ اگر آپ کو دوسری شادی کرنی ہے تو اشارہ کیجئے جس گھرانے میں آپ شادی پسند کریں اس میں آپ کی شادی کرا دیں گے لیکن اس دعوت سے باز آجایئے جو لے کر آپ کھڑے ہو گئے ہیں"

یہ معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا آپؐ اللہ کے رسول تھے اور اللہ کی طرف سے نوع انسانی کی ہدایت کے لئے مامور تھے حضور کے بارے میں قریش کی ان ترغیبات سے کوئی اثر لینے کا سان و گمان بھی ہمارے لئے حبطِ ایمان و اعمال کا سبب بن سکتا ہے۔ لیکن ان ترغیبات سے دین کی دعوت پیش کرنے والے ہر شخص کو سابقہ پیش آئے گا کیونکہ جب حق و باطل کے درمیان کشاکش و کشمکش کارن پڑتا ہے تو باطل کی طرف سے کوشش ہوتی ہے کہ ایک ایک کو توڑ لیا جائے۔ یہ نہ ہو سکے تو کسی نہ کسی طریقہ سے غیر جانبدار کر لیا جائے تاکہ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا نہ ہو اور حق کی اعانت اور تقویت کا باعث نہ بنے اس لئے حق کا ساتھ دینے والوں کے لئے یہ ترغیبات بھی ہوں گی ان کو طرح طرح کے لالچ بھی دیئے جائیں گے۔ اگر اہل حق کے دلوں سے مال و دولت اور لذات دنیوی کی محبت کھرچ کھرچ کر نہ نکالی گئی ہوئی ہو تو یہ خطرہ کا وہ مقام ثابت ہو سکتی ہے جہاں سے باطل حق کی جدوجہد پر شب خون مار سکتا ہے جب تک انقلابی پارٹی کے ہر رکن میں یہ وصف نہیں ہو گا کہ نفس کے سارے تقاضوں کے مقابلے میں انقلاب کی آرزو، تمنا اور خواہش بالاتر ہو جائے۔ نفس کا کوئی تقاضا اس کے راستہ میں آکر رکاوٹ نہ بن سکے۔ اس وقت تک وہ صحیح انقلابی کارکن نہیں بن سکتا۔ بقول حضرت اقبال ۔

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا ایک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

یہ شکل اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ انسان نفس کے تقاضوں پر کنٹرول حاصل کرے۔

تاکہ انقلابی جدوجہد کے راستہ میں نفس کی کوئی خواہش آڑے نہ آسکے۔

مضبُوط قوتِ ارادی

انقلابی تزکیہ و تربیت کا تیسرا اہم جز عزم اور ارادے کی مضبوطی ہے۔ جب کشاکش اور کشمکش کے دوران تکلیفیں اور مصیبتیں آتی ہیں تو اس وقت مضبوط قوت ارادی کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں ایک یہ کہ اپنے نفس کے تقاضوں کے مقابلے میں انسان قوی ہو جائے اور دوسرا یہ کہ کسی بڑی سے بڑی مصیبت اور ابتلا میں اس کی ہمت جواب نہ دے مصائب کے مقابلہ میں انسان آہنی دیوار بن جائے اور کوہ ہمالیہ کی طرح قائم رہے۔

انقلابی تربیت و تزکیہ اور سنّت نبویؐ

اب دیکھئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انقلابی جماعت کا جو تزکیہ اور تربیت فرمائی اس میں یہ چیزیں کس طرح سموئی ہوئی ہیں۔ !

قرآن سے تعلق

سب سے پہلی چیز قرآن مجید کے ساتھ کامل شعوری تعلق ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں کامل شعوری تعلق کی جگہ تلاوت قرآن نے لے لی ہے بلاشبہ تلاوت قرآن ثواب کا کام ہے اور یقیناً اس سے ایک طرح کی روحانیت بھی پیدا ہو جائے گی، لیکن جو چیز انقلاب کے لئے ضروری ہے وہ قرآن کے فکر، حکمت اور فلسفہ کے ساتھ شعوری ہم آہنگی ہے۔ اگر قرآن کے فطری استدلال اور بدیہی محاکمہ نے آپ کے ذہن و شعور پر کامل تسلط حاصل نہیں کر لیا تو انقلابی تزکیہ اور تربیت کی طرف آپ کا پہلا قدم بھی نہیں اٹھے گا۔ کیونکہ اسلامی انقلاب کا اصل نظریہ توحید ہے اور اس نظریہ کا بنیادی لٹریچر قرآن ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ انقلابی جماعتوں میں انقلابی نظریہ پر مشتمل لٹریچر کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ہفتہ وار اجتماعی مطالعہ اور مذاکروں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ انقلابی لٹریچر کے مطالعہ سے

عزم وارادے اور انقلابی داعیے کو تازہ کیا جاتا ہے۔ روس کے انقلاب پر غور کیجئے۔ یہ کیسے آیا! یہ اس صورت میں آیا کہ جو لوگ اس کو لانے والے تھے یعنی کمیونسٹ انقلابی پارٹی کی جو اعلیٰ لیڈر شپ تھی اور فعال کارکن تھے ان کے اذہان وقلوب پر مارکسٹ فلاسفی کی پوری گرفت تھی اور کارل مارکس کی کتاب "داس کیپٹل" کو ان کے نزدیک ایک مقدس کتاب کی حیثیت حاصل تھی اور وہ اس کتاب کو انقلابی نظریئے کے بنیادی واساسی لٹریچر کے طور پر حرز جان بنائے ہوئے تھے۔

اس فرق کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ محض تلاوت قرآن سے جو برکات حاصل ہوں گی وہ انقلابی برکات نہیں ہوں گی۔ ان کی بدولت ایک خانقاہی نظام کی طرف پیش قدمی شروع ہو جائے گی۔ انقلابی اسلامی تربیت کے لئے قرآن مجید کے فکروفلسفہ کے ساتھ شعور کی سطح پر زیادہ سے زیادہ ربط و تعلق بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اور لازم ہے کہ یہ ربط و تعلق بڑھتا چلا جائے۔ اس کی گہرائی اور گیرائی میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ بصیرت کی کیفیت پیدا ہوتی چلی جائے۔ انسان کو اپنے اندر قرآن کے ذریعے زیادہ سے زیادہ انشراح صدر پیدا ہوتا ہوا محسوس ہونے لگے۔ اسے محسوس ہو کہ میرے ذہن کی ساری گرہیں کھل رہی ہیں۔ میرے سارے عقدے یہاں حل ہو رہے ہیں۔ جیسے جیسے وہ انقلابی جدوجہد آگے بڑھے معلوم ہو کہ مجھے ہر مرحلہ کے لئے ہدایت اور رہنمائی یہاں سے مل رہی ہے۔ اگر قرآن مجید کے ساتھ اس نوع اور اس درجہ کا تعلق نہیں ہو گا تو سمجھ لیجئے کہ اسلامی انقلابی تربیت کی اولین لازمی ضرورت کا حق ادا نہیں ہوا۔

نماز تہجد اور قرآن

انقلابی تربیت کے لئے سب سے پہلے اور سب سے کڑی مشقت اللہ تعالیٰ نے خود جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرائی۔ کیا نزول وحی سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے اندر معاذ اللہ ثم معاذ اللہ اخلاقی اعتبار سے کوئی کمی تھی؟ آپ وحی آنے سے پہلے بھی انسانیت کی معراج پر تھے۔ اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار کا جو تصور کیا جا سکتا ہے اس پر تو

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے فائز تھے۔ معاذ اللہ کیا آپؐ کے دل کے اندر کوئی غبار تھا! کوئی میل تھا! نیت میں کوئی کجی تھی! جس کے لئے یہ مشقت آپ پر فرض کی گئی تھی۔ ہم زیادہ سے زیادہ نیک ' پارسا' سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان کا جو تصور کر سکتے ہیں آپؐ اس سے بھی لاکھوں درجے بلند تھے۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھئے اور سوچئے کہ کیا وجہ ہے کہ جب انقلابی عمل کا آغاز ہو رہا ہے تو حضورؐ سے ایسی سخت مشقت کرائی جا رہی ہے جس کا حکم سورہ مزمل کی ابتدائی آیات میں ملتا ہے فرمایا!

يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ○ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ○ نِّصْفَهٗ اَوِانْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ○ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ○

اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے' رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم' آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو' یا اس سے کچھ بڑھا دو' اور قرآن خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو۔

آگے فرمایا۔ اِنَّا سَنُلْقِىْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ○ ..... اے نبی! اس میں کوئی شک نہیں کہ آپؐ انسانیت کی معراج پر فائز ہیں لیکن "ہم عنقریب آپؐ پر ایک بھاری بات کی ذمہ داری ڈالنے والے ہیں" ...... وہ بھاری ذمہ داری کیا تھی! اس کا ذکر سورہ مدثر میں آتا ہے۔

يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ ○ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ○

"اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے! کھڑے ہو جاؤ' اور لوگوں کو اس انجام سے خبردار کرو جس سے ان کو آخرت میں دوچار ہونا ہے اور اپنے رب کی کبریائی بیان کرو" تکبیر کے معنی صرف اللہ اکبر کہنا نہیں ہے بلکہ اللہ کی کبریائی کو اس زمین پر بالفعل قائم کرنا ہے...... تکبیر رب کی اسی ابتدائی اصطلاح کی توضیحات ' اقامت دین ' اظہار دین الحق ' اعلائے کلمتہ اللہ وغیرہ ہیں اور اسی تکبیر رب کی عملی جدوجہد کو قول ثقیل یعنی بھاری بوجھ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قیام اللیل کی عملی شرح

اللہ نے خود سورہ مزمل کی آخری آیت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام

رضوان اللہ علیہم اجمعین کی راتوں کی عبادت کی کیفیت و کمیت کا ذکر فرما کر اسے قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ یہ آیت قرآن مجید کی طویل ترین آیات میں سے ایک ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

اِنَّ رَبَّکَ یَعْلَمُ اَنَّکَ تَقُوْمُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَکَ ط

"اے نبی! آپؐ کے رب کو خوب معلوم ہے کہ آپؐ بھی اور آپؐ کے ساتھ جو لوگ ہیں وہ بھی دو تہائی رات اور آدھی رات اور تہائی رات کے قریب ہماری جناب میں کھڑے رہتے ہیں" .....

یہاں پوری رات کے قیام کا ذکر نہیں ہے، لیکن بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہؓ کی پوری پوری رات قیام میں گزر جاتی تھی۔ پھر حضورؐ کا معاملہ یہاں تک پہنچا ہے کہ آخری دور میں بھی آپؐ راتوں کو اللہ کے حضور کھڑے رہتے اور بسا اوقات یہ قیام اتنا طویل ہوتا تھا کہ آپ کے پاؤں سوج جاتے تھے۔ جب آپؐ سے عرض کیا جاتا کہ آپؐ اتنی مشقت کیوں جھیل رہے ہیں! آپؐ کی مغفرت کی تو اللہ تعالیٰ ضمانت دے چکا ہے، تو آپؐ جواب میں فرماتے تھے کہ کیا میں اپنے رب کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک رات انہیں شوق ہوا اور وہؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ اس شب حضورؐ نے ایک رکعت میں سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورہ نساء کی تلاوت فرمائی......... جسے قرآن مجید کی ایک منزل کہا جاتا ہے اور جو سوا چھ پاروں کے لگ بھگ ہے۔ .... حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ یہ صورتِ حال دیکھ کر کئی مرتبہ میرا جی چاہا کہ میں نیت توڑ کر چلا جاؤں۔

قیام اللیل میں تلاوت قرآن کی حکمت

غور کیجئے کہ اگر طویل تلاوت قرآن دن کے اوقات میں ہوتی تب بھی بہت مبارک ہوتی لیکن قرآن مجید نے رات کو کھڑے ہونے کی دو حکمتیں بیان کی ہیں۔ ایک حکمت کے لئے

کہا۔ اِنَّ لَکَ فِی النَّہَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا ۝ "دن کے اوقات میں تو آپ کی طویل مشغولیت اور بھاگ دوڑ رہتی ہے...... " دعوت و تبلیغ کا کام آپ کو دن ہی میں تو کرنا ہوتا ہے لہذا دن میں طویل قیام اور تلاوت سے یہ کام متاثر ہو گا۔ دوسری حکمت یہ کہ اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیۡلِ ہِیَ اَشَدُّ وَطۡاً وَّ اَقۡوَمُ قِیۡلًا ۝ "درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لئے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لئے زیادہ موزوں ہے"۔ نفس کو کچلنے میں سب سے زیادہ موثر رات کا جاگنا ہے اور پھر رات کی تنہائی اور سکون میں قرآن کو اپنی شخصیت کے اندر جذب کرنے کا کام بھی بڑی خوش اسلوبی سے ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے حکم آیا وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِیۡلًا کہ رات کے قیام میں قرآن کی ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کیجئے۔

لیکن صحابہ کرامؓ اور ہمارے درمیان اس معاملہ میں اس اعتبار سے فرق واقع ہو جاتا ہے کہ قرآن انؓ کی اپنی زبان میں نازل ہو رہا تھا لہذا بغیر سمجھے تلاوت کرنے کا اس دور میں تصور تھا ہی نہیں۔ بغیر سمجھے تلاوت کرنے کا تصور اس وقت پیدا ہوا جب اسلام عرب سے باہر نکلا۔ اس لئے اب شعور کی سطح پر قرآن کو جذب کرنے کے لئے عربی زبان کو سیکھنا بھی بنیادی اہمیت کا کام بن گیا ہے۔ چونکہ قرآن صحابہ کرامؓ کی مادری زبان میں نازل ہو رہا تھا اس لئے یہ حکم قرآن کو ان کے شعور، ان کے فہم، ان کے پورے وجود کے اندر اور ان کے اعصاب کے ریشہ ریشہ میں رچانے اور بسانے کا پہلا حکم تھا۔ اگرچہ سورہ مزمل کی ابتدائی آیات میں واحد کا صیغہ استعمال ہوا ہے لیکن اسی سورہ مبارکہ کی آخری آیت کے پہلے حصے وَطَآئِفَۃٌ مِّنَ الَّذِیۡنَ مَعَکَ ؕ سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے ساتھیؓ بھی اسی مشقت میں لگے ہوئے تھے کیونکہ یہ اسلامی انقلابی تربیت کا پہلا قدم تھا اور ہے۔

فرض نماز اور قرآن

تربیت کے اگلے قدم کے طور پر سورہ عنکبوت میں تلاوت قرآن کے ساتھ اقامت صلوٰۃ کا حکم دیا گیا۔

اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ ط اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ط وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ وَ اللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ o

"اے نبیؐ تلاوت کرو اس کتاب کی جو آپؐ کی طرف وحی کے ذریعے بھیجی گئی ہے اور نماز قائم کرو۔ بے شک نماز فحش اور برے کاموں سے روکنے والی ہے اور یقیناً اللہ کا ذکر اس سے بھی بڑی شے ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو تم لوگ کرتے ہو"

اب یہاں دیکھئے کہ جس طرح قران مجید کا ذکر سورہ مزمل میں ہے اسی طرح اس آیت میں بھی ہو رہا ہے لیکن اس کے ساتھ نماز کو قائم کرنے کا حکم بھی آ گیا۔ نبوت کے ابتدائی دور میں صرف رات کی نماز تھی اب پورے دن و رات کی نماز کا نظام شروع کیا جا رہا ہے۔ نماز بذات خود ذکر کی ایک نہایت جامع اور نہایت مؤثر شکل ہے۔ نماز میں قران کا پڑھنا لازم ہے سورہ فاتحہ جو نماز کا لب لباب ہے.......... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ام القران' اساس القران اور بہت سے ناموں سے موسوم فرمایا ہے'.......... ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے اس سے نظریہ ہمارے وجود کے ساتھ ہم آہنگ ہونا شروع ہو جاتا ہے ہم اللہ کے سامنے دست بستہ کھڑے ہیں۔ ہم اللہ کے سامنے جھک رہے ہیں ہم اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو رہے ہیں۔ اللہ کی تعظیم اور اپنے تذلل اور عجز کے اظہار کی یہ ایک عملی شکل ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ جہاں ہمارے اعضاء سے خضوع و خشوع بندگی اور عجز و تذلل کا اظہار ہو رہا ہے وہاں ہماری زبان سے بھی اس کی الوہیت' اس کی عظمت' اس کے جلال' اس کی بڑائی اور کبریائی کا اقرار ہو رہا ہے اس نظام نے ہمارے دن کے اوقات کو اپنی گرفت کے اندر لے لیا ہے۔ جو شخص نماز با جماعت کا پابند ہو جائے گا اس کا پورا نظام الاوقات نماز کے ساتھ بندھ جائے گا وہ جب کسی کو وقت دے گا تو کہے گا فلاں نماز کے بعد ملوں گا کسی سے ملاقات کا وعدہ کرے گا تو نماز کے اوقات ذہن میں رکھ کر کرے گا۔ الغرض انسان شعوری طور پر نماز با جماعت کی اہمیت سمجھتا ہو تو اس کے معمولات کا نظام نماز کے ساتھ جکڑا جاتا ہے۔

یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ اس آیت میں قران اور نماز کو جمع کیا گیا ہے اور یہ دونوں ذکر کی اہم ترین اور جامع ترین شکلیں ہیں۔ قران نے سورہ حجـــر کی نویں آیت میں خود اپنے آپ کو "الذکر" قرار دیا ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ "اس ذکر کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں" عربی زبان میں ال کا بالکل وہی مفہوم ہوتا ہے جو انگریزی زبان میں دی۔ THE ۔ کا ہے' ایک ہے 'A MAN' اور ایک ہے " 'THE MAN' ____________

" THE " دی کے اضافہ سے معنی و مفہوم میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو گیا۔ یعنی ذکر کی خاص اور بلند ترین صورت اور مکمل ترین صورت قرآن مجید ہے۔

اب آپ دیکھیں جوں جوں مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے نماز پنجگانہ پر زور بھی بڑھ رہا ہے کیونکہ ابتدائی مشقت کو جھیلنا سب کے بس کی بات نہیں۔ کسی انقلابی جماعت کا جو ابتدائی 'NUCLEUS' ____________ یعنی مرکز و محور تیار کیا جاتا ہے جو جماعت کا مغز اور عطر ہوتا ہے اور حد درجہ وفادار افراد پر مشتمل ہوتا ہے اس کے لئے جو شدید مشقت در کار ہے وہ بعد میں عام شامل ہونے والے حضرات کے لئے جاری نہیں رہ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اب ترتیب بدل رہی ہے معراج کے واقعہ کے بعد ۱۱ نبوی میں سورہ اسراء نازل ہوئی ہے گویا اس وقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دیتے ہوئے گیارہ برس بیت گئے ہیں اور آپ کی انقلابی جماعت کا ایک 'HARD INNER CORE' تیار ہو چکا ہے اس لئے اب ترتیب بدل گئی۔ سورہ اسراء میں ارشاد ربانی ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا ۝

"نماز قائم کرو زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے قران کا بھی التزام کرو۔ کیونکہ فجر کا قرآن مشہود ہوتا ہے"۔

ظہر، عصر، مغرب، عشاء، میں قرآن کی قرات طویل نہیں ہوتی۔ ان میں سے دو نمازیں

یعنی ظہر و عصر تو مکمل طور پر سری ہیں۔ امام خاموشی سے قرآن کی تلاوت کرتا ہے۔ مغرب کی اور عشاء کی پہلی دو رکعتوں میں امام قرآن کی جہری قرأت کرتا ہے اور عام طور پر یہ قرات طویل نہیں ہوتی۔ طویل قرات کو فجر کی نماز کے ساتھ وابستہ کر دیا اور اس کو نام دیا۔ وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۔ فجر کی نماز میں قران کی طویل قرات مطلوب ہے۔ آیت کے اختتام پر فرمایا۔ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا یقیناً فجر کے وقت قرآن کا پڑھا جانا مشہود ہے" ۔ اس کی حدیث میں یہ تشریح کی گئی ہے کہ رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے............ جن کی رات اور دن کے لئے علیحدہ شفٹیں ہوتی ہیں............ دونوں فجر کی نماز کے وقت اکٹھے موجود ہوتے ہیں اور وہ نماز میں قرآن پڑھنے اور سننے والوں کے عمل کی گواہی دیتے ہیں اس امر کو مشہود سے تعبیر کیا گیا ہے۔ !

تہجد کی نوعیت کا فرق

اگلی آیت میں قیام لیل کی طویل اور کڑی مشقت کو نفل کے درجہ میں لے آیا گیا یعنی وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ "اور رات میں بطور نفل نماز تہجد کا اہتمام کیا کرو اس قرآن کے ساتھ " ہمارے ہاں عربی سے ناواقفیت اور کچھ دیگر اسباب کی وجہ سے تہجد میں بھی ایک فرق واقع ہو گیا ہے در حقیقت یہ ' SHIFT OF EMPHASIS ' یعنی انتقالِ اہمیت کا مسئلہ ہے۔ فَتَهَجَّدْ بِهٖ کی طرف سے ہماری توجہ ہٹ گئی ہے۔ اس کا حق ادا کرنے میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ تہجد کی آٹھ رکعتیں ہم ان چھوٹی چھوٹی سورتوں کے ساتھ جو ہمیں یاد ہیں پڑھ کر سمجھتے ہیں کہ تہجد کا حق ادا ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے طویل اوراد و وظائف کو اپنے معمولات میں شامل کر رکھا ہے۔ اس طرح فتہجد بہٖ کا حق ادا نہیں ہوا۔ اس میں " بہٖ " کی ضمیر قرآن کی طرف ہے۔ لہٰذا جب تک تہجد کے دوران حالت قیام میں قرآن مجید کی طویل قرات نہ ہو رہی ہو، اس وقت تک یہ وہ تہجد نہیں ہے جو جناب محمدؐ رسول اللہ کا تہجد ہے اور نہ یہ وہ تہجد ہے جو اسلامی انقلاب کے لئے تیار کرے گا۔ یہ تہجد انسان کے اندر ایک روحانیت اور نورانیت تو پیدا کر دے گا لیکن وہ انقلابیت وجود میں نہیں لا سکے گا' وہ جوش و جذبہ

دان میں چڑھا سکے گا جو انقلاب کی کٹھن وادیوں کو عبور کرنے کے لئے درکار ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھئے کہ لفظ تہجد جہد سے بنا ہے جس سے جہاد و مجاہدہ جیسی اہم دینی اصطلاحات وضع ہوئی ہیں۔

نماز جمعہ

اب تک ہم نے سورہ مزمل' سورہ عنکبوت اور سورہ اسراء کی چند آیات کے حوالہ سے دو باتیں سمجھیں۔ ایک یہ کہ قرآن مجید کو شعوری طور پر ذہنوں میں اتارنے کے لئے ابتداء میں رات کے قیام کی مشقت کا اہتمام کروایا گیا اور پھر اقامتِ صلوٰۃ کا مستقل نظام عطا کیا گیا۔ اس کے بعد بڑے پیمانے پر تذکیر بالقرآن کے لئے نماز جمعہ کا محتشم بالشان نظام قائم کیا گیا۔ یہ درحقیقت اسلامی انقلابی جماعت کا ہفتہ وار اجتماع ہے۔ یہ تو ہماری کوتاہی ہے کہ ہم نے اسے ایک رسم کی شکل دے دی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

خطبہ جمعہ کیا ہے! جمعہ کے خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے! مسلم شریف کی روایت ہے کہ كَانَ صَلَّى اللّٰه عليه وسلم يقرء القرآن ويذكّر الناس "حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی تلاوت فرماتے تھے اور اس کی آیات سے لوگوں کو تذکیر فرماتے تھے' یاددہانی کراتے تھے" - - - گویا خطبہ جمعہ کی اصل غایت یہ ہے کہ اگر ہم اپنے انقلابی نظریہ سے غافل ہو رہے ہیں' مصروفیات کی وجہ سے اپنا مقصد یاد نہیں رہا ہے یا اپنے مقصد سے قلبی و روحانی وابستگی کچھ کمزور پڑ رہی ہے تو اس کی تذکیر' اس کی تجدید' اس کی یاددہانی کا بندوبست کیا جائے۔ کوئی نائب رسولؐ' ممبر رسولؐ پر کھڑا ہو کر وہی کام کرے جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے تاکہ انقلابی فکر کے ساتھ اس جماعت کا بحیثیت مجموعی ذہنی و شعوری رابطہ کمزور نہ پڑے بلکہ تازہ ہوتا رہے اور اس میں زیادہ سے زیادہ گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی چلی جائے۔

انقلابی تربیت میں روزے کا مقام

صوم یعنی روزے کی عبادت عرب میں سرے سے تھی ہی نہیں۔ صلوٰۃ کی بگڑی ہوئی شکلیں ان کے ہاں تھیں، حج بھی تھا، وقوف عرفات بھی تھا صفا اور مروہ کے درمیان سعی بھی تھی، طواف بھی تھا۔ صدقہ خیرات اور جانوروں کی قربانی کا رواج بھی تھا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن صوم بالکل نہیں تھا۔ صوم کا لفظ وہ ایک خاص کام اور مفہوم و معنی کے لئے استعمال کرتے تھے۔ عرب جن گھوڑوں کو جنگوں میں استعمال کیا کرتے تھے تربیت کے لئے ان گھوڑوں سے مشقت کراتے تھے ان کو بھوکا پیاسا رکھتے تھے۔ ان کے منہ پر ایک توبڑا چڑھا دیا کرتے تھے۔ اس عمل کو وہ صوم کہتے تھے اور جس گھوڑے پر یہ عمل کیا جائے اسے صائم کہتے تھے کہ یہ روزے سے ہے۔ یہ عمل وہ اس لئے کرتے تھے کہ اگر گھوڑا بھوک اور پیاس کو جھیل نہیں سکے گا تو ہمارا ساتھ کیسے دے گا! اگر یہ بھوک پیاس کی وجہ سے جی چھوڑ گیا تو اس پر جو سوار ہے اس کی جان تو شدید خطرہ میں پڑ گئی۔ مزید یہ کہ گرم ہوا اور لو کے موسم میں عرب اپنے گھوڑوں کو لے کر میدان میں کھڑے ہوتے تھے، وہ اپنی حفاظت کے لئے اپنے سروں پر ڈھاٹے باندھ کر اور کپڑے وغیرہ لپیٹ کر کھڑے ہوتے تھے لیکن گھوڑوں کا منہ سیدھا ان تھپیڑوں کی طرف رکھتے تھے تاکہ ان کے اندر لو اور باد صرصر کے تھپیڑوں کو برداشت کرنے کی عادت پڑ سکے اور ایسا نہ ہو کہ کبھی گرم لو کے تھپیڑے ان کا رخ پھیر دیں۔ جانا لو کی سمت تھا لیکن گھوڑا ان تھپیڑوں کی وجہ سے کوئی اور رخ اختیار کر گیا یا مطلوبہ رخ پر بڑھنے سے انکار کر گیا۔ عرب اپنے گھوڑوں کو جو یہ ساری مشقت، ورزش، ٹریننگ کراتے تھے اسے وہ صوم کہتے تھے۔ ہمارے دین نے صوم کو ایک قاعدہ اور ضابطہ کے تحت لا کر اسے عبادت کے طور پر ہم پر فرض کر دیا کہ بھوک پیاس کی سختی برداشت کرنے اور نفس کے شہوانی جذبے کو ایک خاص وقت سے لے کر ایک خاص وقت تک قابو میں رکھنے کی مشق ہو جائے۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ مکی دور میں ہر مہینہ میں تین دن کے روزے فرض تھے۔ مدنی دور میں رمضان کے پورے مہینہ کے روزے فرض کئے گئے۔

(جاری ہے)

نفاذ شریعت کا سیدھا راستہ

شریعت بل یا فقہ حنفی؟

تحریر: مولانا سید حامد میاں
امیر جمعیت علمائے اسلام (مولانا فضل الرحمٰن گروپ)

(زیر نظر مقالہ اپریل ۸۷ء کے "محاضرات قرآنی" کی پہلی نشست میں پڑھا گیا)

آجکل نظام شریعت کے نفاذ کا مطالبہ مختلف عنوانات سے ہو رہا ہے۔ اور اسکی کوئی صورت نظر نہیں آرہی۔ کیونکہ آسان اور واضح طریقہ چھوڑ کر ایسا مطالبہ کرنے والوں کو لمبے راستہ پر ڈالا گیا ہے۔ سیدھا سادہ راستہ تو یہ تھا کہ جس نے اسلامی نظام کے نام پر حکومت سنبھالی پھر ایک عرصہ کے بعد ریفرنڈم اسلام ہی کے نام پر کرایا جسے سلطان وقت کے اختیارات حاصل رہے اور آج بھی ہیں وہی بیک جنبش قلم آرڈر نافذ کر سکتا تھا کہ عدلیہ شریعت کے مطابق فیصلے دیا کرے۔ لیکن اس شخصیت نے پینترا بدلکر یہ ذمہ داری قومی اسمبلی پر ڈالدی، اور اب لوگوں کا رخ اپنی طرف سے ہٹا کر اسمبلی کی طرف کر دیا۔ یُخَادِعُونَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ۔

اسی دور میں دینی مسائل پر بے معنی بحثیں چھیڑی گئیں ایسے مسائل جن پر ہمیشہ سے اتفاق امت چلا آرہا تھا۔ موضوع سخن آرائی بنے حتٰی کہ اسی دور میں یہ بحث بھی چلی کہ "پاکستان" کس لئے معرض وجود میں آیا۔ کیا اقتصادی عوامل اس کا سبب تھے یا مذہبی جذبات۔ غرض طرح طرح کی بولیاں بولی گئیں۔ اور غلط صحیح اور حق و باطل کی تمیز ہی ختم کر دی گئی۔

اصل وجہ اسکی اصل وجہ ایک تو انگریز کی ذہنی غلامی ہے کہ اپنی عقل ان پر تنقید کے حق میں استعمال کرنے سے قاصر ہیں اور ایک وجہ یہ ہے کہ اسلامی قوانین و نظام کے نفاذ کے بعد انکی مطلق العنانی متاثر ہوگی لہذا اسلام کا صرف نام ہی لیا جائے اور اسکی عطا کردہ راحت و رحمت کو پس پردہ چھپائے

رکھا جائے ، ورنہ اسلامی قوانین تو حکمرانوں پر حاوی ہوں گے - جبکہ حکمران یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ان پر بھی کوئی اور حاوی ہو -

اسمبلی

یہی حال ہماری مقننہ اسمبلی کا ہے وہ چاہتی ہے کہ ہم ہی قانون ساز ادارہ رہیں - ہم جو مناسب سمجھیں قانون بنادیں - اسلامی قانون کا وجود ہمیں حسب دلخواہ قانون بنانے سے روکے گا لہٰذا اسے نہ آنے دو ،

یہ ہمارے ملک کے ان حالات کا خلاصہ ہے جو مانع نظام اسلام ہیں، حکمران اعلیٰ اور ان کی ترتیب دادہ بے اختیار شوریٰ اور پھر بے طاقت اسمبلیاں کچھ اپنی خواہش اور کچھ منبع قوت جو فوج کے انقلابی افراد پر مشتمل ہے کا آج تک چلا آرہا ہے۔

سیدھا راستہ

آپ کہیں گے کہ اچھا! پھر سیدھا راستہ جن کے ذریعہ اسلام کا نظام عدل نفاذ پذیر ہو سکے کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اپنے یہاں حکومت کے مسلک کا اعلان کرنا ہوگا کہ مملکت کا قانون فقہ حنفی پر مبنی ہوگا - جیسے کہ سعودی عرب میں حکومت کا اعلان یہ ہے کہ وہ فقہ حنبلی پر چلتی ہے اور حکومت ایران کا اعلان یہ ہے کہ اس کا مسلک فقہ جعفری ہے -

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ شیعہ حضرات کا مسلک کیا ہوگا کیونکہ وہ پیچھے فقہ جعفری کا مطالبہ کر رہے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کہیں شیعہ بستی ہے تو وہاں ان کے لئے ان کے شیعہ مجتہد کو ان کے مسلک کے مطابق فیصلہ دینے کا مجاز حکومت قرار دیدے گی -

پھر سوال ہوگا کہ اہل حدیث کا کیا ہوگا کیونکہ وہ کسی امام کے پیروکار نہیں ہیں وہ غیر مقلد ہیں - تو اس کا بھی وہی جواب ہے کہ جہاں ان کی آبادی ہوگی وہاں ان کے کسی پسند کردہ عالم کو ان کے فیصلوں کا حکومت اختیار دیدے گی - یہ ایسے اشکالات نہیں ہیں جو حل نہ ہو سکتے ہوں -

مجھے ایک عزیز دوست نے بتلایا کہ جنرل نمیری نے اپنے یہاں جب شرعی قوانین کے نفاذ کا اعلان کیا تو انہوں نے فقہ حنفی پر مبنی قوانین نافذ کئے وہاں کے حکام سے انہوں نے دریافت کیا کہ یہاں کی اکثریت مالکی حضرات پر مشتمل ہے ، مالکی علماء حنفی مسلک پر کیسے فیصلے دیتے ہیں اور اسے کیوں ترجیح دیتے ہیں انہوں نے کہا کہ یہاں کے علماء مسلک حنفی پر فیصلوں کے عادی ہیں اور اسے اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ

اس میں موجودہ (عیسوی) صدی کے اوائل تک تمام نئے پیش آنے والے مسائل کا حل موجود ہے۔ کیونکہ یہ قوانین ۱۳۴۳ھ تک جب تک خلافتِ عثمانیہ ترکیہ رہی ہے جاری رہے ہیں۔

یہ ان کی گفتگو کا خلاصہ ہے۔ پھر یہ کہا ہے کہ اسکے بعد سے ابتک تمام نئے پیش آنے والے مسائل پر ہمیشہ ہند و پاک کے علماء فتوے مرتب کرتے رہے ہیں۔ مشینی ذبیحہ درست ہے یا نہیں؟ اس پر گفتگو ہوئی۔ مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم نے بیان دیا کہ درست مفتی محمود صاحب مرحوم نے بیان دیا کہ درست نہیں اور دلیل واضح کی اس پر مفتی محمد شفیع صاحب نے اپنے فتوے سے رجوع کا اعلان فرمادیا۔

حتیٰ کہ غیر سیاسی علماء نے بھی بعض سیاسی امور پر بحث کی اور فتوے دئیے پارلیمانی نظام جائز ہے یا ناجائز؟ پارلیمانی نظام میں عورت وزیر اعظم ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اس پر حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بحث فرمائی جو ان کے فتاویٰ کی جلد پنجم میں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگرچہ عوام واقف نہ ہوں اور قانون داں حضرات نے توجہ نہ دی ہو لیکن علماء کرام جدید دور کے حالات و مسائل پر برابر نظر رکھے ہوئے ہیں اور ان مسائل کو حل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر آج یہ قانون جاری کیا جائے۔ تو ہمارے پاس آج تک کے مسائل کا حل موجود ہے۔ برصغیر کے علماء کا طریقہ یہ رہا ہے بجائے اس کے کہ ہر ایک مجتہد ہونے کا دعویٰ کرتا اور اختلاف پیدا ہوتا ان حنفی علماء نے یہ طریقہ اپنا لیا کہ پیش آمدہ مسئلہ پر گفتگو کر کے ایک رائے قائم کر لی جائے۔

میرے اسی قابل قدر دوست نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا ایک ریاست میں دو مسلک چل سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی جج یا قاضی شافعی مسلک کا پیروکار ہے تو وہ ہٹا دیا جائے گا یا قاضی رہے گا اور اگر قاضی رہے گا تو اپنے مسلک کے مطابق فیصلہ دے گا یا مدعی کے مسلک کے مطابق؟ میں نے کہا کہ قدیم دور سے یہ دستور چلا آرہا ہے کہ ایک حکومت میں کہ قاضی شافعی بھی رہے ہیں مالکی بھی رہے ہیں اور یہ طے ہے کہ وہ مدعی یا مدعیٰ علیہ کے مسلک کے پابند نہ ہوں گے بلکہ اپنے مسلک کی رُو سے فیصلہ دیں گے۔ انہیں مثال کے طور پر میں نے یہ مسئلہ بتلایا کہ اگر کسی حنفی مرد نے عورت کو کنایۃً ایک طلاق دیدی یعنی بجائے لفظ طلاق کے اس نے کوئی ایسا لفظ استعمال کیا

جس کے دونوں معنے ہوسکتے ہوں، لیکن اس کی مراد طلاق ہی تھی - تو ایسی صورت میں ایک طلاق ہو جائے گی وہ آپس میں اگر راضی ہوں تو نکاح دوبارہ کریں - لیکن اگر کسی طرح یہ قضیہ ایسے قاضی (جج) کے سامنے پیش کر دیا گیا جو شافعی مسلک کا تھا اور اس نے اپنے مسلک کے مطابق یہ فیصلہ دیدیا کہ دوبارہ نکاح کی ضرورت نہیں اور شوہر سے کہا کہ تم رجوع کر لو - شوہر نے رجوع کر لیا - تو حنفی مسلک میں یہ فیصلہ واجب التسلیم ہوگا۔ جدید نکاح کی ضرورت نہیں - اس کے برعکس اگر مدعی، مدعا علیہ دونوں شافعی ہوں تو قاضی حنفی ان کے مسلک کے مطابق فیصلہ نہیں دے گا - وہ حنفی قانون سے فیصلہ دیگا اور قاضی اور (جج) کے مسلک کو بالاتفاق مدعی و مدعا علیہ کے مسلک پر فوقیت حاصل رہے گی - اس اصول کے تحت ہر دور میں ہر مسلک کے جج بلا اختلاف و نزاع کام کرتے آئے ہیں گویا اصل مدار فقہ پر رہا ہے وہ حنفی ہو یا مالکی، شافعی ہو یا حنبلی،

پاکستان میں ضرورۃً ان چاروں آئمہ کرام کے ماننے والوں کے علاوہ بھی فقہ جعفریہ ماننے والوں کو اور کسی بھی فقہ کے نہ ماننے والے طبقہ کو ان کے آپس کے پیش آمدہ مسائل حل کرنے کے لئے ان کا قاضی دیا جا سکتا ہے یہ معروف پرسنل لاء تو نہ ہوگا - یہ پرائیویٹ لاء ایک طبقہ یا گروہ کا قانون ہوگا -

بعض حضرات جن میں سادہ لوح علماء بھی شامل ہیں یہ کہتے ہیں کہ نظام شریعت تدریجاً تھوڑا تھوڑا کر کے لایا جائے - حالانکہ یہ بات بالکل ہی غلط ہے - اسلامی نظام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جب وہ آئے گا تو ہر شعبۂ زندگی پر اثر انداز ہوگا۔ اگر آدھا تہائی لایا گیا تو وہ ان قوانین کی موجودگی میں نہیں چلے گا آدھی مشین کسی سائز کی ہو اور آدھی کسی اور سائز کی تو کیا انہیں جوڑ کر چلایا جا سکتا ہے؟ جس طرح یہ ممکن نہیں اسی طرح قانون شرع قانون انگریز بلکہ تعزیرات ہند کا جمع ہونا ممکن نہیں یہ وہ قوانین ہیں جو انگریزوں نے اپنی غلام قوم کے لئے اس غرض سے بنائے تھے کہ ان میں جھگڑے چلتے ہی رہیں بیس بیس سال مقدمہ بازی میں صرف کریں نسلاً بعد نسل عداوتیں چلتی رہیں، انصاف اور دادرسی میں عدل و انصاف ہی کے نام پر زیادہ سے زیادہ تاخیر ہو - ہر ممکن کوشش ہو کہ قانون ہی کے نام پر شکوک پیدا کئے جا سکیں، فوراً ہی فیصلہ ہرگز نہ ہونے پائے جبکہ اسلام کے قوانین میں

فوری دادرسی اور انصاف دلانا عدلیہ کی ذمہ داری ہے۔ اسی سے امن ہوتا ہے جرائم ختم ہوجاتے ہیں۔

اسی ماہ (مارچ) جناب حکیم امیر علی قریشی صاحب سے ملاقات ہوئی انہوں نے سعودی حکومت میں اسلامی قوانین کی رو سے فوری دادرسی کی ایک تازہ مثال دی کہ رات چار بجے ایک قتل ہوا، اور صبح دس بجے قاتل کو قصاص میں حکومت نے قتل کردیا گویا اس مجرم کو جرم کے بعد صرف چھ گھنٹے زندہ رہنا تھا۔

انگریزی دور کی یادگار تعزیرات پر ہمارے قانون دانوں نے تنقیدی نظر نہیں ڈالی ورنہ اسمیں انہیں خامیاں ہی خامیاں نظر آئیں۔ ہمارے یہاں یہ روایت چل پڑی ہے کہ ہر انگریزی چیز کو تنقید سے بالا سمجھا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل تک تھانوں میں اسٹیشنری کے لئے ماہوار الاؤنس اور جیلوں میں قیدیوں کے لئے یومیہ الاؤنس کے طور پر اتنی ہی رقم مخصوص تھی جتنی انگریز نے اپنے دور میں مختص کی تھی۔

کوئی ملزم تھانہ میں چلا جائے تو اسے مارنا پیٹنا گالیاں دینا برا نہیں سمجھا جاتا۔ کیونکہ انگریز کے قانون کی رو سے اس کی رعایا کا ہر فرد غلام تھا اور بے عزت۔ وہی روش آج تک جاری ہے۔ لیکن اسلام میں وہ اصولاً اس کے برعکس اس وقت تک باعزت ہے جبتک اس پر جرم ثابت نہ ہوجائے۔ اور جرم ثابت ہوجانے کے بعد وہ فقط اس جرم کی سزا کا مستحق ہے نہ کہ گالی گلوچ یا کسی بھی بیحرمتی کا تو جب اصولاً اسلام کے قوانین اور موجودہ قوانین میں بعد المشرقین ہوگیا تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ موجودہ انگریزی قوانین کو اسلامی قوانین کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔

اسلامی نظام میں بہت سے مصارف بیت المال کے ذمہ ہوتے ہیں، معذور افراد کے وظائف حتیٰ کہ بے روزگار ہونے کے افراد کا انتظام بھی اس کے ذمہ ہوتے ہیں۔ اسلامی نظام میں غریب رشتہ دار کے مصارف امیر رشتہ دار کے ذمہ ڈالدیئے جاتے ہیں۔ نیز مسلمانوں میں ہمیشہ انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ رہا ہے۔ اور ان میں ہندوؤں کی بہ نسبت خرچ کرنے کی بہت عادت ہے یہ عادت لاشعوری طور پر موروثی ہے۔ عرصہ سے اس کا صحیح استعمال متروک ہے اس لئے لوگ اپنے ہی او پہ عیش و عشرت میں اضافہ پر خرچ کرنے لگے پھر بھی ملک بھر میں دینی ادارے

بے شمار مساجد اسی انفاق پر گئی گزری حالت میں بھی چل رہے ہیں۔ دور اسلام میں ہر آدمی جو متمول ہوتا تھا ہر وقت دوسروں پر خرچ کرتا رہتا تھا حتیٰ کہ خود اس کے پاس اپنے لئے کچھ نہ بچتا تھا یہ حال مسلمان نوابوں کا انیسویں صدی تک رہا ہے اسی طرح نوابوں سے نیچے درجہ بدرجہ اپنے سے نیچے والوں پر خرچ کرتے تھے اسی لئے کمیونزم ان علاقوں میں پھیلا ہے جہاں عیسائی یہودی یا بت پرست آباد تھے اس کی زد میں مسلمانوں کے وہ علاقے بھی آگئے جو جغرافیائی محل وقوع کے ذیل میں اس کی زد میں آتے تھے جیسے بخارا وغیرہ لیکن وہ اپنے پڑوس کے غریب ترین مسلمان ملک افغانستان کو متاثر نہیں کر سکا۔ جس کی وجہ اسلام کی عطا کردہ سخاوت فیاضی مہمان نوازی اور اوپر سے نیچے تک سب میں کسی نہ کسی درجہ میں جذبۂ ایثار کا پایا جانا تھا مزید یہ کہ اقتصادی اور معاشرتی قانون جو اسلام میں موجود ہیں ان پر بھی عمل ہوتا رہا ہے اس لئے اسلامی ممالک میں کمیونزم کا فلسفہ ہی پہنچا ہے کمیونزم میں اقتصادی اور معاشرتی قوانین اور کسی مذہب میں ہیں ہی نہیں؟

افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس فطری موروثی صلاحیت سے اگرچہ پاکستان میں بالکل کام نہیں لیا گیا حتیٰ کہ اب معاشرہ کی حالت اور انداز فکر ہی بدل گیا ہے اکثریت صرف اپنی ذات کی پجاری بن کر رہ گئی ہے انگریز کے بنا کردہ انکم ٹیکس وغیرہ سے جو فائدہ حکومت کو پہنچتا ہے اور پھر حکومت سے عوام تک آتا ہے اس سے کہیں زیادہ فائدہ اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کی فطری صلاحیت کو اجاگر کر لیا جاتا۔ اسلام میں انکم ٹیکس نہیں ہے لیکن دفاع کے لئے ٹیکس لگایا جا سکتا ہے۔ بیت المال کے ذرائع آمدنی اور بہت ہیں۔ جن پر اسلامی حکومتیں چلتی رہی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اگر آج بھی اسلام کا مکمل نظام نافذ العمل ہو جائے تو ہمارا ملک مثالی ترقی کرے گا۔ مکمل نظام سے میری مراد یہ ہے کہ انگریزی قانون کے بجائے اسلامی قانون کی کتابوں کے تراجم ان ہی مجسٹریٹوں اور ججوں کو مہیا کر دیئے جائیں کہ فیصلے اس کے مطابق ہوں اسی طرح فوج کے متعلق جو فوج میں رائج قانون ہے اسے بھی اسلامی دور کے قوانین کے مطابق بنا دیا جائے انگریز کے

ترتیب دادہ قوانین کے بجائے اسلامی قوانین کے مطابق جو تراجم کے ذریعہ فوج کو
مہیا کئے جائیں کورٹ مارشل کیا جایا کرے اور اقتصادیات بھی ان ہی قوانین
کے تابع ہوں۔

ہمارے ملک میں جو صوبائی عصبیت کی ہواؤں کے لپیٹ میں ہے۔ محض اسلام
کا نام لینا اور عمل نہ کرنا قوانین جاری نہ کرنا اب ایک بے کشش فریب ہوگا جس
سے یہ بادِ سموم نہ تھم سکے گی۔ البتہ اسلامی اصول اقتصادیات اور قوانین پر
عمل اسے روک سکتا ہے۔ اس کی رو سے کوئی صوبہ احساس محرومی میں مبتلا نہ
رہے گا۔ ملاحظہ ہو "اسلامی منشور"۔ بات اب بھی لمبی ہوگئی ہے اور آپ پوچھیں گے
کہ کیوں اور کیونکر۔ تو مختصر جواب یہ ہے کہ آپ کے سامنے اسلام کا تیرہ سو سالہ دور
ہے۔ اس طویل ترین عرصہ میں مختلف آب و ہوا، مختلف معاشرت اور مختلف بولیوں
والے صوبے تو کیا ملک کے ملک یکجا رہے اور مسلمان عیسائیوں سے بڑی سپر پاور رہے
ہیں حتیٰ کہ اسلام کے فرض کردہ احکام سے غفلت میں مبتلا ہو کر مستحق سزا ہوئے۔
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاِذَا
اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ۔ انہوں نے فریضہ جہاد "اَلْجِهَادُ
مَاضٍ" کے باوجود کوتاہی کی اور اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ میں
حد درجہ تقصیر کی تو کمزور ہو گئے۔ اور کمزوری فطرت کی نظر میں قابل سزا جرم ہے

مجھے ایک ذمہ دار ریٹائرڈ افسر نے اپنے ایک سائنسدان عزیز کا واقعہ بتلایا
کہ انہوں نے سہروردی کے سامنے گائیڈیڈ میزائل کا فارمولا پیش کیا مگر وہ غفلت
کی نذر ہو گیا اگر ہم غیر ملکی طاقتوں پر ناجائز حد تک اعتماد نہ رکھتے تو ہم بھی ایجادات
حربیہ میں آج ان کے ہم پلہ ہو سکتے تھے۔

زوال کا باعث اسلام پر عمل نہ کرنا ہے نہ کہ اسلام۔ میں نے سنا ہے کہ فوج
میں آج بھی وہ دستہ جس نے سلطان ٹیپو رحمۃ اللہ علیہ کو شہید کیا تھا۔ اسی طرح
اپنے اسلاف کی اس مذموم حرکت کو اپنے لئے باعث فخر قرار دیتا ہے مرحوم کے
لباس اور تلوار کو مفتوح و مغلوب سے چھینا ہوا سامان جانتا ہے اور اس کی نمائش
اس طرح کرتا ہے جیسے وہ آج بھی یونین جیک کے سایہ تلے کھڑا ہے۔ حالانکہ

اسے مرحوم کی اس تلوار کو چومنا چاہیئے تھا اور اسے اپنا نشان خاص بنانا چاہیئے تھا اگر یہ بات صحیح ہے تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ انہیں اپنی تاریخ سے باخبر کرے اور انگریز کی ذہنی غلامی سے نجات دلائے۔ یہ بات ہماری قوم کے لئے باعث ذلت ہے کہ وہ چالیس سال بعد بھی اپنی تاریخ سے جاہل رہیں۔

مستشرقین جن کا کام ہی اسلام سے نفرت دلانا ہے طرح طرح کے اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ مجھ سے اسلام میں باندیوں کے رواج کے بارے میں بہت لوگوں نے پوچھا لیکن اس کی حقیقت سمجھ لینی چاہیئے کہ دراصل یہ قانون کفار کی جوابی کارروائی کی صورت میں عمل پذیر ہوتا ہے۔ ورنہ نہیں۔ یعنی اگر وہ ہمارے جنگی قیدیوں کو باندی اور غلام بنائیں تو ہم بھی بنائیں گے اور اگر وہ انہیں صرف قیدی بنا کر رکھیں تو ہمیں حق نہیں کہ ہم ان کے قیدیوں کو غلام بنائیں۔ ہم بھی انہیں قیدی ہی بنا کر رکھیں گے۔

پہلے زمانہ میں یہ دستور تھا کہ جنگی قیدیوں کا بار بجائے اس کے کہ صرف حکومت برداشت کرے اور وہ بھی قید میں وقت گذاریں انہیں پبلک میں تقسیم کر دیا جاتا تھا لوگ ان سے منفعت کام لیتے رہتے تھے گھروں میں رہنے کو جگہ دیتے تھے کھانا لباس سب مالک کے ذمہ ہوتا تھا اس طرح شاہی خزانہ پر ان کا بار نہ پڑتا تھا دنیا کے ہر ملک میں یہی طریقہ تھا۔ لیکن اسلام نے جب پھیلنا شروع کیا تو یورپ تک کے علاقے زیر نگیں آگئے اور قیدی اور باندی غلام غیر مسلم ہی بنتے رہے اس لئے اب آکر یورپ والوں نے یہ شہرت دینی شروع کی ہے کہ اسلام میں باندی اور غلام بنانے کا قاعدہ ساری دنیا سے ہٹ کر ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا بھر کا دستور تھا۔ یورپ میں بھی قیدیوں کو غلام بنایا جاتا تھا۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ جو رومی کہلاتے تھے اسی طرح رومیوں نے انہیں غلام بنایا تھا۔

اسلامی افواج کو جہاد میں اور خصوصاً عہد شکنی کی صورتوں میں نقصان بھی اٹھانا پڑا ہے اور انہیں فَکَّاکُ الْاَسِیْر۔ قیدیوں کو آزاد کرانے کے جو احکام بتلائے گئے تھے ان پر عمل کرتے ہوئے غلام بنانے کے بجائے قیدی ہی رکھا گیا اور اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لئے تبادلے میں دیا گیا۔

مستشرقین کے اٹھائے ہوئے اور بھی بہت سے اعتراضات ہیں لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو وہ سب اسی قسم کے ہیں کہ حقائق کو مسخ کرکے صرف ایک نکتہ کو اٹھایا گیا اور اسے بری شکل دیکر ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔

گذشتہ چھ سالہ عرصہ میں کمیونسٹ نظام کے داعی اور سوشلسٹ قسم کے لوگوں سے ملاقاتیں رہیں۔ لیکن میں نے انہیں اسلامی نظام سے ناواقف پایا۔ جواباً وہ اسلامی نظام کو پسند کرکے ہی جاتے رہے ہیں ہمارے حکمرانوں کی قسمت ہی کی بات ہے ورنہ وہ اسے عملی جامہ پہنا سکتے ہیں، اور اس میں عقلاً بھی کمیونزم و سوشلزم سے زیادہ خوبیاں ہیں، اور ملک کی بدقسمتی کا یہ منظر بھی آپ کے سامنے ہے کہ پبلک اسلام چاہتی ہے اور عنان اقتدار پر مسلط طبقہ اس کے نفاذ کے خلاف ہے۔ اور مطلب کے لئے اسلام کا نام لیوا۔ نہ معلوم انجام کیا ہو۔

اسی دوران میرے پاس ایک وکیل آئے انہوں نے کہا کہ اسلام میں ٹریفک کے قوانین کہاں ہیں؟

اس کا جواب اگر وہ عقل کا مثبت استعمال کرتے تو شاید خود ہی دے سکتے تھے کہ سلامتی اور امن کے لئے جس قانون کی ضرورت ہو وہ مقننہ پاس کرسکتی ہے۔ ایسے قوانین سب اسلام کے مطابق ہوں گے اور ان پر عمل باعث اجر بھی ہوگا۔

اسلام کا نام لیتے ہی اس کے خلاف باتیں کر ڈالنا جائز نہیں ہے ایسے اشخاص کا یہ فرض ہے کہ وہ اسے کسی عالم سے ملکر حل کرے اور اپنے ایمان کا تحفظ کرے۔

اسی دوران ایک عالی دماغ لیڈر سے ملاقات ہوئی ان کا خیال یہ تھا کہ اسلام میں حکومت نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام میں مقننہ نہیں ہوتی۔

غرض بہت سی باتیں اپنے ذہن سے ناتمام مطالعہ اور اہل علم سے رجوع نہ کرنے کے باعث پیدا ہوجاتی ہیں۔ یہ قابل علاج ہیں۔ جو مخلص ہیں وہ اصلاح قبول کرتے ہیں۔ مکمل جواب سے ان کی تشفی ہوجاتی ہے۔

میری ان گذارشات کا خلاصہ یہ ہوا کہ اسلامی نظام قانون تبدیل ہوگا تو آئین کا اور یہاں موجودہ قانون کی جگہ فقہ حنفی پر مرتب قانون بذریعۂ تراجم فوراً لایا جائے۔

• اس کے اثرات امن وسکون کے علاوہ اقتصادیات ومعاشیات واخلاقیات

نورا مرتب ہوں گے۔

- ہر شخص موجودہ انگریزی غلامانہ قانون کی رُو سے اپنے آپکو باعزت ثابت کرے گا وہ باعزت تسلیم کیا جائے گا۔ جبکہ اسلام کی نظر میں اسکے قانون کی رو سے باعزت ہے۔
- یہ قانون صوبوں سے بڑھکر علاقوں تک کو ان کے حقوق دلاتا ہے۔ اس کا فوری نفاذ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔
- یہ قانون مکمل ترین حالت میں موجود ہے یہ موجودہ انگریزی قانون سے بہت زیادہ مکمل ہے۔
- یہ قانون انگریزوں کے جاری کردہ قوانین کی موجودگی میں آنا ممکن نہیں ہے۔ نہ ہی اسے اس سے جوڑا جا سکتا ہے۔ نہ وہ تھوڑا تھوڑا آسکتا ہے۔ وہ جب آئیگا تو مکمل آئے گا۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر نہیں۔
- اس قانون کی رُو سے حکمرانوں کے ذمہ رعایا کو ہر طرح کی سہولت پہنچانا فرض ہوتا ہے جبکہ انگریز کے متروکہ نظریہ حکومت کی رُو سے جو اس نے برصغیر میں اختیار کئے رکھا حکومت عوام کو لوٹتی ہے اور اس کے پیش نظر صرف اپنا خزانہ بھرے رکھنا ہوتا ہے وہ اسی قسم کے قانون بناتی رہتی ہے۔
- اسمبلی منتخب رہتی ہے لیکن وہ ایسے قوانین وضع کرے گی جس سے اسلامی اصولوں کو تقویت ہو۔
- اس قانون کے نفاذ سے مذہبی تنازعات ختم ہو جائیں گے۔ فرقہ واریت بڑھنے کے خدشات توہمات باطلہ ہیں۔

واللہ المستعان وھو ولی التوفیق ہ

بقیہ مثیل علیہ السلام علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ

میں کتنے صحیح ہیں اور کتنے موضوع بلکہ باطل نظریات سے مملو ہیں اس سوال کو نظرانداز کر دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے جن کو فراست مومنانہ دی ہے وہ سونے اور پیتل کی اس آمیزش میں سے زر خالص نکال لاتے ہیں۔ البتہ کسی نے یہ بات صحیح کہی ہے کہ ان خطبات نے ہزاروں اور لاکھوں اہل تشیع کو ذاکر، واعظ اور خطیب بنا دیا ہے۔

(جاری ہے)

رفتارِ کار

متحدہ عرب امارات میں دس دن

جون ۱۹۸۷ء میں تنظیم اسلامی کے قیم برائے بیرونی ممالک جناب قمر سعید قریشی صاحب کی معیت میں "میثاق" کے ادارہ تحریر کے فعال رکن عزیزم حافظ عاکف سعید نے متحدہ عرب امارات کا ایک مختصر دورہ کیا۔ اس کی روداد ہدیہ قارئین ہے۔ واقعاتی ترتیب اور تاثرات جناب قمر سعید قریشی صاحب کے ہیں جنہیں خاکسار نے محض الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ زیب داستاں کے لئے شاید کچھ تھوڑی بہت حاشیہ آرائی بھی ہو گئی ہو لیکن مبالغے اور افراط و تفریط سے حتی الامکان اجتناب کیا گیا ہے اقتدار احمد

امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا پہلا دعوتی دورہ کرۂ ارضی کی دوسری جانب ..... یعنی امریکہ ..... کا تھا۔ اس کو سال ہا سال بیت گئے ہیں، اور اس کے بعد وہ شمالی امریکہ، یورپ، شمالی افریقہ اور مشرق وسطی کے ان گنت سفر کر چکے ہیں لیکن شاید ہمارے تازہ قارئین کو ان بیرونی دوروں کی تقریب آغاز کا علم نہ ہو۔ امیر محترم پاکستان میں درس اور دعوت رجوع الی القرآن میں ہمہ وقت مصروف رہے اور انہیں اندازہ نہ ہو سکا کہ ان کے دروس و خطابات کے آڈیو کیسٹ نجانے کن کن رابطوں اور واسطوں کے ذریعے اردو بولنے یا سمجھنے والے لوگوں کے پاس دنیا کے کیسے کیسے دور دراز گوشوں میں پہنچ رہے ہیں۔ ان کے سفر امریکہ سے بہت پہلے ان کی آواز وہاں پہنچی اور قلوب سلیمہ کو مسخر کر چکی تھی۔ اور ان کا پہلا سفر امریکہ ایسے ہی لوگوں کے اصرار، اہتمام اور صرفے پر ہوا تھا جو اس قائل کی بات سامنے بیٹھ کر سننے اور سمجھنے سمجھانے کے مشتاق تھے۔

اس سے بھی دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ پڑوسی ملک بھارت سے جو محض چالیس برس پہلے ہمارا اپنا وطن تھا، امیر محترم کو پہلی دعوت "براستہ امریکہ" موصول ہوئی تھی۔ یعنی عظمت رفتہ کے نشان، حیدر آباد دکن کے جو عبقری اب امریکہ و کینیڈا میں جا بسے ہیں انہوں نے اس "آواز دوست" کے کیسٹ اپنے "پسماندہ" اعزہ و اقربا کو بھجوائے تو وہاں بھی اشتیاق پیدا ہوا اور یوں امیر محترم کو باوجود ہزار رکاوٹوں کے اب تک متعدد بار بھارت بھی جانا پڑا ہے۔ یہ تمہید بیان کر کے بتانا یہ مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے

فضل سے امیر محترم کی قرآنی دعوت بلا مبالغہ دنیا بھر میں اردو بولنے یا سمجھنے والے گھروں میں پہنچ چکی ہے۔ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ جہاں بیرونی ممالک میں مقیم ہمارے کچھ بھائی "گواچے لونگ" کی تلاش کے لئے یہاں سے فنکاروں کو بلاتے اور ان کی پذیرائی کرتے ہیں' وہاں بہت سے فکر مند لوگ اپنے قلوب کے صیقل کی غرض سے تجدید عہد۔ توبہ اور تجدید ایمان کے اس نسخے کو بھی استعمال کر رہے ہیں جو امیر تنظیم اسلامی کا کوئی "صدری نسخہ" تو نہیں البتہ عطائیوں نے جس کے پرچۂ ترکیبِ استعمال کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔

شمالی امریکہ میں مِن جُملہ دیگر رجالِ دین کے کام کے 'امیر محترم کی اب تک کی محنت کا حاصل یہ تو ضرور رہا ہے کہ برِّ کوچک پاک و ہند سے گئے ہوئے لاکھوں مسلمان جو گرے پڑے طبقات سے بھی متعلق نہیں بلکہ اعلیٰ صلاحیتوں اور بہترین تعلیم کے زیور سے آراستہ ہیں ان میں سے بہت سوں کو اپنی اور اپنی اگلی نسلوں کی فلاحِ اُخروی کا بھی خیال ستانے لگا ہے۔ تاہم ان کی مشکلات بہت متنوع اور پیچیدہ ہیں اور اللہ ہی جانے وہ اس فکر میں کب تک گھلتے رہیں گے۔ عجب نہیں کہ ؎

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے!

کے فلسفے کی طرف انہیں مراجعت کرنی پڑے۔ تاہم ہم سے جو کچھ بن پڑا ان کے لئے کرتے رہیں گے (ان سطور کی تحریر کے وقت امیر محترم امریکہ میں ہی اپنی سی کر رہے ہیں) اور ہماری دعائیں تو بہر حال ان کے ساتھ ہیں۔ وہ ایک طرح سے اُس معاشرے کا حصہ بن چکے ہیں اور اُن میں سے جس کسی نے اپنے ایمان اور روایات کی پونجی سنبھال کر وطن مالوف میں آ کر پناہ لینے کی کوشش کی 'اس کی کوشش کا مآل باخبر لوگوں سے پوشیدہ نہیں 'ایسے لوگوں کی عظیم اکثریت کو واپس جاتے ہی بنی۔

البتہ مشرق وسطیٰ میں مقیم پاکستانی اور بھارتی مسلمانوں کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ وہ نہ وہاں مستقل قیام کر سکتے ہیں نہ اُس معاشرے میں ان کا انجذاب ممکن ہے۔ انہیں دیر سویر بہر حال واپس آنا ہے اور سیّال سونے کے سوتے جوں جوں خشک ہو رہے ہیں یا علاقے کے سیاسی حالات جیسے جیسے مخدوش ہوتے جا رہے ہیں توں توں ان کی واپسی کی رفتار بھی روز افزوں ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کے مخصوص حالات کے باعث چند اور امور ہماری دعوت کی پذیرائی اور اثر انگیزی میں ممد و معاون ہو رہے ہیں جن میں کاروں کے ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر سے "مسلّح" ہونے اور فاصلوں کو طے کرتے ہوئے ٹیپ سن سکنے کی

سہولت جیسی چھوٹی باتیں بھی شامل ہیں۔ اور اس طرح کے اہم عوامل بھی کہ وطن سے دوری انہیں وہاں کے حالات کے بارے میں جستجو اور عالمی ذرائع ابلاغ پر انحصار کی بدولت زیادہ باخبر اور بہت فکرمند رکھتی ہے۔ یا یہ کہ ان ممالک میں فرقہ واریت اور مذہبی گروہ بندیوں کا عدم وجود' اور مسجدوں کی پیشانیوں کا بغیر کسی "لیبل" کے ہونا ان کے فکر کو بہت سی پابندیوں سے آزاد کر دیتا ہے۔ یا یہ کہ وہاں شرک کے جملہ جلی ظواہر کی غیر موجودگی پاکستان اور بھارت کے "کافرِ ہندی" کے ذہن کو قرآنی دعوت کے لئے زیادہ کھول دیتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

تھی کچھ ایسی ہی بات کہ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں مقیم پڑھے لکھے اور نیم تعلیم یافتہ لیکن دردمند پاکستانی اور بھارتی مسلمانوں میں امیر محترم کی دعوت کو توقع سے بڑھ کر پذیرائی ملی۔ ضرورت تھی کہ وہاں اثرات کو سمیٹنے اور انہیں صحیح رخ پر ڈالنے کی شعوری کوشش کی جائے اور ہمیں بِلا تأمل یہ اعتراف کرنا ہے کہ اس کوشش میں تنظیم اسلامی کے مرکز سے بڑی ہی کوتاہی ہوئی۔ تا آنکہ لگ بھگ سوا سال پہلے قمر سعید قریشی صاحب کو قیّم برائے بیرون ملک بنا کر یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ ہماری دعوت سے متاثر اور متحرک ہو جانے والے ساتھیوں سے شخصی رابطہ استوار کریں۔ اس لئے کہ انہیں بہرصورت اپنے ملکوں کی طرف واپس ہونا ہے۔ چنانچہ پاکستان پہنچنے والے ساتھی یہاں آ کر ہماری صفوں کو مضبوط کریں گے اور اس سے بھی پہلے ان کے ذریعے ہماری کام کو پاکستان میں موجود ان کے اعزہ و اقربا میں تعارف حاصل ہو گا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے سب سے پہلے خطوط کا ذریعہ استعمال کیا اور یہاں مرکز میں رفقاء نے ان کا یہ نقشہ بچشم خود دیکھا ہے کہ ؏

"ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے"

الحمد للہ کہ ان کی محنت رنگ لائی اور بہت جلد وہ اپنی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو تلاش کرنے اور انہیں ایک گلّے کی شکل دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اس عمل کا سب سے عمدہ نمونہ متحدہ عرب امارات میں دیکھنے کو ملا وہاں کام کا آغاز ہمارے محترم رفیق نسیم الدین صاحب کی ذاتی کوششوں سے ہوا جن تک ہمارا پیغام کیسٹوں کے ذریعے پہنچا تھا۔

وہ پچھلے سال گھیر گھار کر امیر محترم کو دس بارہ روز کے لئے متحدہ عرب امارات لے گئے اور وہاں مقامی رفقاء کے مثالی تعاون سے جنہیں وہ یہی کیسٹ سُنا کر "شیشے میں اتار" چکے تھے۔ دروس قرآن کی مکمل تسلسل اور باقاعدگی سے ایسی بھرپور محفلیں منعقد کیں جن کی حاضری بلا مبالغہ دن دونی رات چوگنی ہوتی گئی اور جن کی مثال وہاں کی ثقافتی تقاریب بھی پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے

امیر محترم کی اس جان توڑ مشقت کو شرف قبولیت بخشا اور ابو ظہبی میں تنظیم کے رفقاء کا ایک جاندار حلقہ بنیان مرصوص بن گیا۔ اس اہم سنگ میل کے بارے میں تفصیلات قارئین "میثاق" بہت پہلے پڑھ چکے ہیں۔ قمر سعید قریشی صاحب نے بعد ازاں بھی وہاں کے رفقاء سے رابطے میں کمی نہ آنے دی۔ ظاہر ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی ممکن ہوا جس کی ان کے لئے ہم سب کو دعا کرنی چاہئے۔ ان کی محنت کا ایک مظہر سال رواں کے سالانہ اجتماع منعقدہ لاہور میں بھی دیکھنے کو ملا کہ متعدد رفقاء متحدہ عرب امارات (دوسرے ممالک کا یہاں ذکر نہیں) سے خاص اس میں شمولیت کی غرض سے چھٹی لے کر زر کثیر صرف کر کے آئے تھے۔ آنے والے اپنے پیچھے رہ جانے والوں کا یہ تقاضا بھی ساتھ لائے تھے کہ "یاران تیز گام" ہمیں "محوِ نالۂ جرسِ کارواں" نہ رہنے دیں۔ کچھ ایسا انتظام کر کے آئیں کہ مرکز سے ہمیں کمک پہنچے اور امیر محترم کا تربیت یافتہ کوئی معلم و مدرس آ کے ہمارے سبق کی دہرائی کرا جائے۔ چنانچہ اولین میسر موقع پر قمر سعید قریشی صاحب عزیزم حافظ عاکف سعید کو ساتھ لے کر عازم بوظہبی ہوئے۔

ہمارے محترم رفیق قمر سعید قریشی صاحب ہرگز محتاج تعارف نہیں ہیں' کچھ کسر تھی تو سطور بالا میں خاکسار نے غیر ارادی طور پر پوری کر دی ہے۔ وہ اپنی ہمہ جہت صلاحیتوں کے باوصف اللہ کی جناب سے زور بیان کے عطیے سے محروم ہیں۔ ہماری دعوت' طریق کار اور اہداف کا شعور انہیں کماحقہٗ حاصل ہے۔ امیر محترم کے فکر سے ہم آہنگی کے معاملے میں بھی ان کی حیثیت منفرد ہے۔ لیکن گفتگو اور بالخصوص کسی اجتماع سے خطاب کے دوران ان کی روانی ضرورت سے زیادہ ہو جاتی ہے کہ الفاظ پھسل پھسل جاتے ہیں۔ رب کریم کی اس میں یقیناً کوئی مصلحت ہو گی۔ اور یہ مصلحت تو معلوم ہو ہی گئی کہ انہیں ایک ساتھی کو ہمراہ لے جانا پڑا۔ ایک اور ایک گیارہ عزیزم عاکف سعید کو قسام ازل جلہ و تعالیٰ نے اپنے والد یعنی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی میراث میں سے وافر حصہ عطا فرمایا ہے۔ الحمد للہ کہ وہ جدید و قدیم دونوں علوم میں ضرورت کی حد تک دسترس رکھتے ہیں۔ اپنے کان کی ایک مزمن بیماری کی وجہ سے جس کے باعث انہیں خود اپنی آواز کانوں میں گونجتی اور بدحواس کرتی محسوس ہوتی ہے' وہ متفکر تھے کہ گفتگوؤں اور خطابات سے انصاف کر بھی سکیں گے یا نہیں۔ لیکن اللہ کی توفیق اس کے دین کا کام کرنے والوں کے لئے ...... کا انتظام کر ہی دیتی ہے۔ قمر سعید قریشی صاحب نے گہرے تاثر کے ساتھ بتایا کہ عزیزی موصوف نے مفوضہ کام کا حق ادا کر دیا۔ ع

اللہ کرے زورِ بیاں' اور زیادہ

انہیں اطمینان ہے کہ وہ امارات کے رفقاء کی ضرورت کو بھرپور انداز میں پورا کر کے آئے ہیں۔ اور انشاءاللہ ان کے اس دورے سے مطلوبہ نتائج بر آمد ہو کر رہیں گے۔

اللہ کے دین کے لئے گھر سے نکلا ہوا دو افراد پر مشتمل یہ وفد کراچی ہوتا ہوا دس جون کی سہ پہر ابوظہبی کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترا تو وہاں متعدد رفقاء استقبال کے لئے موجود تھے۔ جن دوستوں کے نام حافظے میں محفوظ رہ سکے ان میں نسیم الدین' سرفراز چیمہ' عمران بٹ' خالد' شاہد' آصف رضوی' محمد حسن انجم' اشرف فاروق اور حافظ حنیف ڈار صاحبان شامل ہیں۔ نماز عصر ایئرپورٹ پر ہی دوستوں کے ساتھ ادا کر کے یہ قافلہ جمعیت کے دفتر پہنچا' مغرب کا وقت ہو گیا تھا للذا اس نماز کی جماعت دفتر میں ہی ہوئی۔ (خلیج کے ممالک میں جماعت سازی پر قدغن ہے للذا ہمارے ساتھی جو یقیناً کوئی سیاسی کام کرنے کے لئے اکٹھے نہیں ہوئے' "جمعیت خدام القرآن" کے نام سے اپنی تنظیم چلا رہے ہیں جس پر انسدادی قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا) نماز سے فراغت کے بعد ٹیلی فون پر راس الخیمہ کے رفیق جناب اقبال ملک صاحب سے بات ہو گئی۔ دوبئی کے رفقاء سے بھی اس وقت صرف ٹیلی فونی رابطہ کافی ہو جاتا لیکن ہر دو طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ چنانچہ وہ حضرات عشاء کے بعد ہی آن ملے۔ عشاء سے پہلے اور بعد بھی حکایات لذیذ نے وقت گزرنے کا احساس نہ ہونے دیا۔ ہم مقصدیت کا رشتہ شاید دوسرے سب رشتوں سے مضبوط اور کام کی دھن غالباً دوسری سب دلچسپیوں سے زیادہ پرلطف ہوتی ہے۔ سونے کے لے لیٹتے لیٹتے رات کے ساڑھے گیارہ بج گئے (ظاہر ہے کہ ہمارے لئے تو اس روز یہ ڈیڑھ بجے شب کا وقت تھا)۔

۱۱ر جون: گزشتہ شب نیند کی کمی کے باعث کسل باقی تھی للذا فجر کے بعد کچھ مزید آرام کا موقع نکال لیا گیا۔ پھر احباب تشریف لاتے رہے۔ قمر حسن صاحب سے بھی نشست رہی۔ ویسے دن کی مصروفیات...... جو اکثر صورتوں میں نظم و ضبط کی پابند ملازمتوں پر مشتمل ہیں۔ .... سے وقت نکال کر ساتھیوں کی آمد متوقع نہ تھی دوپہر بارہ بجے لندن سے بھائی افسر صدیقی کا فون آ گیا انہوں نے شاید یہ محسوس کیا ہو کہ ان کے یہ پاکستانی ساتھی ان سے قریب تر آ گئے ہیں للذا تبادلۂ خیال نسبتاً آسان ہو گا۔ تنظیم اسلامی کی دعوت قرآنی امیر محترم کی زبانی اللہ کی زمین پر بیج کی طرح گر رہی ہے۔ جہاں جہاں دلوں کی مٹی زرخیز ہوئی اور ایمان کی نمی بھی میسر آ گئی وہاں وہاں انشاءاللہ ضرور برگ و بار لائے گی۔ یہ فصل بہار لوٹنے کو ہم میں سے کون موجود ہو گا اس کی خبر اسی ایک علیم و خبیر ذات کو ہے جس کی رضا کے

حصول کے لئے یہ تخم ریزی کی جارہی ہے............ ظہر کی نماز سے پہلے ایک ساتھی مشتاق بیگ کی عیادت کے لئے وقت نکل آیا جو چند روز قبل ہی چھٹی گزار کر پاکستان سے واپس ہوئے تھے ان کی علالت کا سبب بھی یہی دیوانگی تھی کہ اپنے آبائی شہر گجرات میں چھٹیوں کے دوران "فرزانوں" کی طرح کار دنیا سنوارنے اور گلی محلے والوں پر اپنی امارت کا رعب گانٹھنے کی بجائے وہ امیر تنظیم کے دورے کے سلسلے میں پوسٹر لگاتے رہے اور اسی کام میں بجلی کے ایک کھمبے سے چار سو چالیس وولٹ بجلی کا شاک لے بیٹھے۔ وہاں بھی کئی دن صاحب فراش رہے تھے۔

بعد ظہر عزیزم عاکف سعید تو شام کے پروگراموں کے لئے اپنی تیاری میں مشغول ہو گئے اور قمر سعید قریشی صاحب کو موقع مل گیا کہ رفقاء کے ساتھ ملاقاتوں میں کام کا جائزہ لے سکیں اور رفتار کار کو بڑھانے کی تجاویز پر غور کریں۔ مغرب سے عشاء تک عزیزم عاکف سعید نے ساٹھ سامعین کے سامنے سورہ حج کے آخری رکوع کے نصف اول پر گفتگو کی۔ از دل ریزد بر دل خیزد کا نقشہ جما دیا۔ عشاء کے بعد محترم ساتھی نسیم الدین صاحب کے مکان پر اٹھائیس رفقائے تنظیم جمع ہوئے اور تنظیم کی قرار داد تاسیس کا مطالعہ کیا۔ مشکل مقامات اور اہم تر نکات کی تشریح یہ مہمان رفقاء کرتے رہے۔ تاکہ تذکیر کے مقاصد اچھی طرح پورے ہوں۔

۱۲ر جون: ناشتے کے بعد مہمانوں اور میزبانوں میں مختلف علمی، تنظیمی اور سیاسی موضوعات پر گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ ملک اقبال صاحب کو "حاضر ناظر" کے مسئلے پر کچھ الجھن تھی۔ الحمدللہ کہ تبادلہ خیال کے بعد انہیں اعتدال کی راہ پر انشراح صدر حاصل ہو گیا۔ وہ جمعہ کا دن تھا لہٰذا رفیق محترم نسیم الدین صاحب ساڑھے گیارہ بجے قبل دوپہر ہی تیار ہو کر آ گئے۔ نماز جمعہ کی ادائیگی کے لئے پاکستان مرکزی مسجد کو منتخب کیا گیا۔ اس مسجد میں حافظ حنیف ڈار صاحب امیر محترم کے دروس و خطابات کے کیسٹوں کی مدد سے بہت خوب درس اور خطبات جمعہ دے رہے ہیں۔ اللّٰھم زد فزد۔ دوپہر کے کھانے کے لئے محمد حسن انجم صاحب کے ہاں مدعو تھے چنانچہ نماز جمعہ کے بعد ان کے ہاں "بنی یاس" پہنچنے کے لئے کوئی چالیس کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنا پڑا۔ دعوت طعام میں خلوص کی خوشبو کے ساتھ تکلف کا مصالحہ بھی خاصا تھا۔ واپسی کے لئے بر آمد ہوئے تو معلوم ہوا کہ کار کے ٹائروں کی ہوا قید سے رہا ہو چکی ہے۔ چنانچہ قیام گاہ...... یعنی ابوظہبی میں جمعیت کے دفتر...... پہنچتے عصر کا وقت ہو گیا۔

گزشتہ شام کے پروگرام سے اندازہ ہو گیا تھا کہ عزیزم عاکف سعید ایک "لیکچرار" کے سے انداز

میں اپنی بات سامعین کے دل و دماغ میں اتارنے میں بفضلہ بہت کامیاب رہے تھے چنانچہ معمول یہی قرار دیا گیا کہ مغرب سے عشاء تک عمومی نشست رہے اور عشاء کے بعد کا وقت رفقائے تنظیم کے لئے وقف ہو........ آج بعد نماز مغرب انہوں نے سورہ حج کے آخری رکوع کا نصف آخر مکمل کیا۔ حاضری میں دس پانچ کا اضافہ ہی تھا۔ عشاء کے بعد سورہ فتح کی آخری آیات کی روشنی میں ساتھیوں کو اسلامی جماعت کے رفقاء کے اوصاف سے روشناس کرایا گیا۔ آج کی اس خصوصی نشست میں بھی رفقاء کی حاضری پہلے سے پانچ زیادہ تھی۔ اسی میں قمر سعید قریشی صاحب کی طرف سے اذن عام کا اعلان ہوا کہ رفقاء ان محفلوں سے بچ رہنے والے وقت میں بھی جب چاہیں انفرادی طور پر یا گروپ بنا کر مہمانوں کو ملاقات کا شرف بخش سکتے ہیں۔ موضوع گفتگو پر بھی تخصیص کی کوئی پابندی عائد نہ کی گئی۔

۱۳ر جون: ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ امیر محترم سے بھی لاہور میں بذریعہ ٹیلی فون بات ہو گئی اور انہیں یہاں کے معمولات سے آگاہ کر دیا گیا۔ حیدر آباد (دکن) کے رہنے والے ہمارے رفیق مہدی علی خان صاحب اسی روز وطن سے واپس ڈیوٹی کے لئے پہنچے تھے' ان سے بھی ملاقات ہو گئی۔ عصر کے بعد نسیم الدین صاحب سے خصوصی نشست رہی۔ وہ متحدہ عرب امارات میں تنظیم کے امیر ہیں۔ ان سے تنظیمی امور اور رفقاء کی تعلیم و تربیت اور نظم کی لڑی میں پرونے کی تدابیر پر سیر حاصل گفتگو ہوئی اور محسوس کیا گیا کہ جس نوع کے ذاتی رابطے کے لئے مرکز سے یہ دو حضرات تشریف لائے ہیں اس کی افادیت زیادہ سے زیادہ واضح ہوتی جا رہی ہے۔ بعد مغرب عمومی محفل میں "فرائض دینی کا جامع تصور" کے موضوع پر امیر محترم کے درس کا پہلا ویڈیو دیکھنے پر چالیس منٹ صرف کئے گئے اور باقی سارا وقت سوال و جواب میں گزرا۔ عزیزم عاکف سعید کے جوابات سے ان کی فکری پختگی پوری طرح مترشح تھی۔ موسم ساتھ نہ دینے پر ادھار کھائے بیٹھا تھا لیکن گھٹن اور حبس کے باوجود حاضری بڑھ کر ۸۵/۸۰ تک پہنچ گئی۔ خصوصی مجلس میں رفقاء کو سورۃ مائدہ کی آیات ۵۴ تا ۵۶ کا درس دیا گیا۔ حاضرین کی تعداد میں اگر بیشی نہیں تو کمی بھی نہیں پائی گئی۔

۱۴ر جون: رفقاء سے انفرادی ملاقاتوں میں وقت کا بہترین مصرف بدستور ہوتا رہا۔ دوپہر کے کھانے پر سرفراز چیمہ صاحب نے مدعو کر رکھا تھا.......... بعد نماز مغرب عمومی نشست میں "فرائض دینی کا جامع تصور" کے دوسرے حصے کی ویڈیو دیکھی گئی اور حسب سابق سوال و جواب کا سلسلہ رہا۔ رفقاء کی خصوصی نشست میں عزیزم عاکف سعید نے سورہ نور کے آخری رکوع کی روشنی میں نظم کی اہمیت کا سبق

پڑھایا۔ الحمدللہ کہ رفقاء پر یہ حقیقت پہلے سے زیادہ واضح ہو گئی کہ وہ محض ایک جماعت میں "شامل" نہیں ہوئے بلکہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھ چکے ہیں اور اب انہیں اس کے تقاضوں کا صرف لحاظ نہیں رکھنا ہو گا بلکہ انہیں اپنی زندگی پر طاری کرنا ہے۔

۱۵ر جون: - نو بجے صبح کار کی ایئر کنڈیشنگ کی آغوش عافیت میں یہ دونوں مہمان ایک میزبان ساتھی قمر حسن کے ہمراہ دوبئی کے لئے روانہ ہوئے اور گیارہ بجے دوپہر منزل کو جالیا۔ عزیزم عاکف سعید کو تو قمر حسن صاحب دبئی شہر کی ایک جھلک دکھانے لے گئے اور قمر سعید صاحب نے یوسف صاحب کے ساتھ یہ وقت بہت مفید گفتگو میں گزارا۔ انہیں قوی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ یوسف صاحب کو دوبئی میں دین کے کام کے لئے قبول فرمالیں گے قریباً چھ بجے شام ابوظہبی واپسی ہوئی۔ شام کی عمومی نشست میں ۸۰/۸۵ ناظرین کو فرائض دینی کا جامع تصور کے ضمن میں حقیقت جہاد کے موضوع پر امیر محترم کے لیکچر کا ویڈیو دکھا کر حسب سابق گفتگو کا موقع فراہم کیا گیا۔ اور بعد نماز عشاء رفقاء کو جن کی حاضری معمول کے مطابق بھرپور چل رہی تھی عزیزم عاکف سعید نے دوسرے (تنظیمی) منتخب نصاب سے قرآن مجید کے ان مقامات کا درس دیا جن میں "نجویٰ" کی ہلاکت آفرینی اور دینی اجتماعات میں آداب مجلس کا بیان ہے۔

۱۶ر جون: جوں جوں دن گزرے رفقاء سے ملاقاتوں میں زیادہ سے زیادہ وقت لگنے لگا اور وہاں وقت کا اس سے بہتر مصرف ہو بھی کیا سکتا تھا۔ مغرب کے بعد کے پروگرام میں گزشتہ شام کے موضوع یعنی حقیقت جہاد کا دوسرا اور آخری حصہ بصری کیسٹ کے ذریعے مکمل کیا گیا اور اس کے پس منظر میں مختلف دینی جماعتوں کے کام پر .... بلا تنقیص اور بغیر "تنابز بالالقاب" تجزیاتی گفتگو کی گئی۔ مقصد چونکہ سچا اور انداز بے لاگ تھا لہٰذا اللہ کے فضل سے نہ کوئی کج بحثی ہوئی نہ تلخی نے موضوع کی روح کو بے مزا کیا حالانکہ حاضری پہلے معمول سے بھی زیادہ تھی۔ دوسرے اجتماع میں رفقاء کو سورۃ شعراء کی متعلقہ آیات کی روشنی میں امیر کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا گیا۔ اسلامی جماعت میں امیر کی حیثیت عام جماعتوں کے روایتی صدور سے بہت مختلف ہوتی ہے اور لازم ہے کہ دینی اجتماعیت میں امیر اور مامورین دونوں کو اس کا واضح شعور حاصل ہو۔

۱۷ر جون: شام کرنا صبح کا تو حسب معمول دوستوں کی رفاقت سے ہی ممکن ہوا۔ مغرب کے بعد عمومی نشست میں عزیزم عاکف سعید کا خطاب عام تھا جسے لیکچر کا نام دینا زیادہ موزوں ہے۔ موضوع دین اور مذہب کا فرق اور توسیع و اشاعت اسلام میں تلوار کا حصہ تھا۔ رفقاء کے لئے خصوصی نشست میں سورہ

اعراف کی آیات ۱۶۳ تا ۱۶۶ کی رہنمائی میں نہی عن المنکر کی اہمیت اور سورہ توبہ کی آیت نمبر ۲۴ ۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

"اے نبی' کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ' اور تمہارے بیٹے' اور تمہارے بھائی' اور تمہاری بیویاں' اور تمہارے عزیز و اقارب' اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں' اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے' اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں' تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے' اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا" ۔

سے اخذ کر کے ایک ترازو نصب کر دی گئی جس میں ایک طرف دنیا و مافیہا کی آٹھ آلائشوں اور دوسری طرف تین وفاداریوں (بشرط استواری) کو ڈال کر ہر شخص کو اپنے دل کے قاضی سے سوال کرنا ہے کہ کون سا پلڑا جھکتا ہے۔ علامہ اقبال کے شعر ۔

یہ مال و دولت دنیا' یہ رشتہ و پیوند
بتان وہم و گماں' لا الہ الا اللہ

سے بھی خوب مدد لی گئی.......... ابوظہبی میں ایئر فورس کے پاکستانی عملے نے ان دونوں حضرات کے اعزاز میں ایک عشائیہ ترتیب دیا تھا۔ مدعوئین کی فہرست خاصی طویل تھی لیکن امارات کی ایک ریاست شارقہ میں ہنگامی حالات کا اعلان ہو گیا تھا اور سب افواج کو تیار رہنے کا حکم مل چکا تھا' لہٰذا عشائیہ میں رونق حسب توقع نہ ہو سکی۔

۱۸ر جون: عمومی نشست میں عزیزم عاکف سعید نے فکر مغرب کے سیل کے آگے بند باندھنے کے لئے کام کی ضرورت پر ایک لیکچر دیا اور ضمناً انجمن خدّام القرآن اور تنظیم اسلامی کے طریقہ کار کی بھی وضاحت کی جو جہاد بالقرآن پر مبنی ہے۔ عشاء کے بعد کے خصوصی اجتماعات کا سلسلہ اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ اس فراغت میں قمر حسن صاحب کے ہاں دعوت طعام زیادہ پُر لطف رہی۔

۱۹ر جون: نماز جمعہ پاکستان مرکز کی مسجد میں ادا کی گئی۔ دوپہر کا کھانا حافظ حنیف ڈار صاحب کے ہاں تھا جن کے دروس و خطبات جمعہ کا ذکر اس مسجد کے حوالے سے پہلے آ چکا ہے۔ کھانے میں محبت کے ساتھ تکلّف کی بھی خاصی آمیزش تھی...... عصر کے بعد امارات میں موجود رفقائے تنظیم اسلامی کا اجتماع عمومی تھا۔ حاضری اور ذوق و شوق کے سابقہ ریکارڈ کے پیش نظر توقع تھی کہ کوئی ساتھی پیچھے رہ جانے والوں میں نہ ہو گا لیکن چونکہ ہنگامی حالات کا اعلان ہو چکا تھا لہٰذا ملازمتوں کی مجبوریوں کے باعث بہت کم رفقاء اس میں پہنچ سکے۔ مغرب تا عشاء مشاورت کی مجلس تھی جس میں رفقاء کی طرف سے بہت مفید تجاویز سامنے آئیں۔ آئندہ لائحہ عمل طے کرتے ہوئے انشاء اللہ ان تجاویز سے استفادہ کیا جائے گا۔
عشاء کے بعد ہمارے رفیق یٰسین صاحب نے اپنے ہاں تمام مہمان و میزبان ساتھیوں کو کھانے پر جمع کیا تھا۔ روایتی تکلف و اہتمام کے ساتھ کھانے کے علاوہ رفقاء کو بے تکلف گفتگو کا بھی موقع ملا۔
۲۰ر جون: ان حضرات کے قیام متحدہ عرب امارات کا آخری دن تھا۔ لہٰذا کچھ گھومنے پھرنے کا پروگرام بنا لیا گیا۔ صبح "العین" جانے کا ارادہ ہوا۔ نسیم الدین، سرفراز، ریاض، حسن انجم اور حافظ حنیف صاحبان ہمراہ تھے۔ بلکہ "بنی یاس" تک تو اشرف فاروق صاحب بھی ساتھ رہے جہاں سب لوگوں کو آصف رضوی صاحب کے ہاں ناشتہ کرنا تھا۔ وہاں سے اشرف فاروق صاحب تو واپس ہو گئے لیکن ان کی کمی پوری کرنے کے لئے خود آصف رضوی صاحب ساتھ ہو لئے...... "عین الفائضہ" سمیت متعدد مقامات کی سیر کی جنہیں اس قابل بنانے کے لئے روپیہ بلا مبالغہ پانی کی طرح بہایا گیا ہے۔ بقول حضرت اقبال فطرت کے مقاصد کی نگہبانی مرد کہستانی کے علاوہ بندہ صحرائی کے بھی ذمہ ہے لیکن یہاں بندہ صحرائی نے صحراہی کو چمنستان میں تبدیل کر لیا ہے........... دوپہر کا کھانا اسی علاقے میں ڈاکٹر طارق صاحب کے ہاں کھا کر بھاگ دوڑ کے سوا چار بجے سہ پہر ابوظہبی واپسی ہوئی۔ عصر کی نماز "چیک ان" ہونے کے بعد ایئرپورٹ کے لاؤنج میں ہی ادا کی اور پھر یہ ایک اور ایک گیارہ کا قافلہ رات کے نو بجے کراچی ایئرپورٹ پر تھا۔

وفد کے "سینئر ممبر" قمر سعید قریشی صاحب اپنے اس دورے کو اس اعتبار سے بہت مفید پاتے ہیں کہ خط و کتابت کے ذریعے وہ اپنے جن ساتھیوں سے "نصف ملاقات" کرتے رہے تھے، ان سے اس دوبدو میل جول کے بغیر وہ گرم جوشی کا تعلق اور ذاتی تعارف ممکن نہ تھا جو ایک ہی منزل کی طرف رواں ساتھیوں کی مختلف ٹولیوں میں باہم دگر موجود ہونا ضروری ہے..... اللہ تعالیٰ ان کی اور میزبان رفقاء کی محنت کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین۔

مستقل خریدار حضرات توجہ فرمائیں

- خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور تحریر فرمائیں۔
- سالانہ زرِ تعاون روانہ کرتے وقت بھی خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔
- زرِ تعاون کسی ذاتی نام کی بجائے ماہنامہ "میثاق" یا مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" کے نام روانہ کیجیے۔
- انجمن یا تنظیم اسلامی کی امانتیں علیحدہ ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں روانہ کریں۔ ان رقوم کو مکتبہ کی رقوم میں شامل نہ کیا جائے۔

اہم اطلاع

امریکہ، کینیڈا، متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب
میں ماہنامہ "میثاق" اور ماہنامہ "حکمت قرآن"
کا سالانہ زرِ تعاون جمع کروانے اور دیگر معلومات کیلئے درج ذیل حضرات سے رجوع کیا جا سکتا ہے

امریکہ

Dr. Khurshid A. Malik
810, 73rd Street Downers Grove, ILL.60516
Ph : 312-969-6755, 312-969-6756

کناڈا

Anwar-ul-Haq Qureshi
323 - Rusholme Rd., Apt. 1809
Toronto Ont. M6H 2Z2
Canda.

متحدہ عرب امارات

Mr. S. M. Nasimuddin
P. O. BOX 294 Abu-Dhabi
Ph : 554057, 559181, 325747

سعودی عرب

جدہ

Mr. M. Asghar Habib
P. O. BOX NO. 167, CC720
Jeddah 21411 Saudi Arabia
Ph . 6721490

ریاض

Mr. Azimuddin Ahmed Khan
P. O. BOX NO. 20249, Riyadh - 11455
Ph : 4544496 - 4462865

الواسع

Mr. Ghulam Mustafa
P. O. Box No. 2464 Al-Wasai Riyadh - 11451
Ph :

کراچی میں میثاق کا سالانہ زرِ تعاون مولانا داؤد منزل
نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت میں بھی جمع کرایا جا سکتا ہے

ADARTS

HMD-6/87

تصانیف ڈاکٹر اسرار احمد

	اعلیٰ	اشاعتِ عام
مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق	6.00	2.00
راہِ نجات (سورۃ العصر کی روشنی میں)	5.00	2.00
قرآن حکیم کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ	10.00	
مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب	12.00	
قرآن اور امن عالم	2.00	
دعوت الی اللہ	2.00	
رسولِ کامل ﷺ	6.00	
نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت	5.00	3.00
نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں	4.00	
معراج النبی ﷺ	3.00	
شہیدِ مظلوم (حضرت عثمان ذو النورین رضؓ)	5.00	2.00
سانحۂ کربلا (شہادت حسینؓ کا اصل پس منظر)	4 00	2.00
اسلام کی نشاۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام	2.00	
اسلام میں عورت کا مقام	8.00	5.00
عظمتِ صوم	2.00	
عید الاضحےٰ اور فلسفۂ قربانی	4.00	
اسلام اور پاکستان	5.00	
استحکام پاکستان	30.00 20.00	
علامہ اقبال اور ہم	3.00	
شادی بیاہ کے ضمن میں ایک اصلاحی تحریک	4.00	
اسلام کا معاشی نظام	6.00	
دعوتِ رجوع الی القرآن		

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس عہد کو یاد کرو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد ۳۶

شمارہ ۹

محرم الحرام ۱۴۰۸ھ

ستمبر ۱۹۸۷ء

فی شمارہ -/۵

سالانہ زرتعاون -/۵۰

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مینجنگ ایڈیٹر

اقتدار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوحہ، قطر، متحدہ عرب امارات — ۲۵ سعودی ریال یا -/۱۵۰ روپے پاکستانی

ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر — ۶ امریکی ڈالر یا -/۱۰۰ روپے پاکستانی

یورپ، افریقہ، اسکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ — ۹ امریکی ڈالر یا -/۱۵۰ 〃

شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ — ۱۲ امریکی ڈالر یا -/۲۰۰ 〃 〃

ترسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴ (پاکستان) لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون: ۸۵۲۶۸۳

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی فون ۲۱۶۵۸۱

طابع: چوہدری رشید احمد مطبع: مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح، لاہور

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقتدار احمد

عرض احوال

۱۴ر اگست کو پاکستان شمسی کیلنڈر کے حساب سے بھی چالیس سال کی عمر پوری کر کے اکتالیسویں سال میں داخل ہو گیا۔ "عید آزادی" کے دھوم دھڑکے 'ڈھول تاشے' "ملی نغموں" کے شور اور روشنیوں کی چکا چوند میں عام لوگوں کو تو اس طرف دھیان دینے کا موقع نہیں دیا گیا تاہم ملک کے سوچنے سمجھنے والے طبقات کے سامنے شیخ سعدی کا یہ شعر بار بار ایک سوالیہ نشان کی شکل میں ابھرتا رہا کہ ۔

چہل سال عمر عزیزت گذشت
مزاج تو از حال طفلی نگشت

چالیس سال کی عمر کا انسان کی شعوری زندگی سے ایک خاص تعلق ہے اور قرآن کریم کے فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں قوموں کی داستانِ عروج و زوال میں بھی سن و سال کے اس پیمانے کو ایک خصوصی مقام حاصل ہوا۔ بہت سی دوسری اقوام بھی جن کا ذکر ہماری کتاب ہدایت میں ملتا ہے شاید اس موقع پر خاص مرحلوں سے گذری ہوں لیکن بنی اسرائیل کے بارے میں ہمیں تعین سے بتایا گیا ہے کہ اپنے نبی حضرت موسیٰ (علی نبینا و علیہ السلام) کو ٹکا سا جواب دینے کے بعد اور نتیجے کے طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے چالیس سال کی دشت نوردی کی خدائی تعزیر بھگت کر اس کے ہوش ٹھکانے آئے اور صحرائے سینا کی سختیاں جھیل کر ہی اس کی نئی نسل میں ارضِ موعود حاصل کرنے کی جدوجہد کا حوصلہ پیدا ہوا تھا۔

آج سے لگ بھگ ڈیڑھ برس پہلے جب ملک خداداد قمری تقویم کے حساب سے اپنی عمر کے چالیس سال پورے کرنے کو تھا' امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے خطاباتِ عام میں پہلی بار قرآنی فلسفۂ تاریخ سے استفادہ کرتے ہوئے مسلمانان پاکستان کو ادھر متوجہ کیا۔ ان کے نزدیک اسلامی سال قمری تقویم سے ہی شمار ہوتے ہیں نیز بتوفیق ایزدی انہیں یہ سعادت بھی حاصل ہے کہ اپنے رہوار فکر کو کھلے میدانوں میں جو گان کے لئے نہیں چھوڑ دیتے' ان کی سوچ کا منبع اور فکر کا مدار قرآن کریم اور بحث و استدلال کا تانا بانا حبل اللہ المتین ہے جس پر وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا شکر ادا کرتے نہیں جھکتے۔ انہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صراحت بھی نہیں بھولتی کہ امت مسلمہ پر وہی کچھ بیتے گا جو بنی اسرائیل پر گذرا' اس لئے کہ اسی کو اللہ کے دین کے علم برداری کے منصب سے معزول کر کے ہمیں یہ ذمہ داری

سَونپی گئی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اللہ کی کتاب میں حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کا ذکر جس تفصیل اور تکرار سے وارد ہوا اس کا موازنہ کسی اور قوم یا گروہ کے احوال سے نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں اس پوری بحث کا اعادہ ممکن نہیں جو ڈاکٹر صاحب موصوف نے اولاً روزنامہ "جنگ" کے تمام ایڈیشنوں کے ذریعے بالاقساط وسیع تر اخبار بین حلقے تک پہنچائی' پھر کتابی شکل میں عمدہ کتابت وطباعت کے ساتھ "استحکام پاکستان" کے عنوان سے خاصی بڑی تعداد میں اسے شائع اور تقسیم کیا اور اسی پر بس نہ کی' کتاب کے نسخے ملک کے پڑھے لکھے اور سوچنے سمجھنے والے دردمندوں تک بالالتزام پہنچائے اور اس پر مستزاد بڑے شہروں میں اس کے بارے میں عام بحث اور اتفاق واختلاف کے اظہار کا موقع دینے کے لئے مذاکروں کا اہتمام بھی کیا...... مقصود اس ساری تگ ودو سے یہ تھا کہ اہل وطن خوابِ غفلت سے بیدار ہوں اور اللہ تعالیٰ سے جس نقض عہد اور روگردانی کے مرتکب ہو چکے ہیں اس کا کفارا توبہ' تجدیدِ عہد اور اصلاح احوال کے عملی آغاز سے کریں تو اس کی رحمت سے بعید نہیں کہ بے مقصدیت کے صحرائے تیہہ میں ہماری یہ چالیس سالہ دشت نوردی اسی طرح نتیجہ خیز ثابت ہو جیسے ایک بار پہلے ہو چکی ہے۔ لیکن یہ فغانِ درویش سنی ان سنی کر دی گئی..... یہاں تک کہ مغربی پیمانوں کے عادی ہمارے دانشورانِ قوم کے چالیس سال بھی اس ماہ پورے ہو گئے۔

اخبارات وجرائد نے اس موقع پر بہت سے مرثیے اور نوحے شائع کئے جن میں لکھنے والوں نے وطن کے حالِ زار پر آنسو بہا کر دل کی بھڑاس نکالنے کی سعی کی ہے لیکن اس ضمن میں موقر روزنامہ "نوائے وقت" نے اشاعت ۱۶ر اگست میں اپنے مستقل لکھنے والے ایک صاحب کی جو تحریر "پاکستان کے دورِ ابتلا کا خاتمہ اور دورِ عروج کا آغاز" کے عنوان سے شائع کی ہے اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ فاضل مقالہ نگار نے ابتداء میں اسی بحث کا گویا خلاصہ پیش کیا ہے جو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے تاریخ بنی اسرائیل کے مذکورہ بالا اہم ترین باب کے سلسلے میں شرح وبسط کے ساتھ ڈیڑھ سال قبل کی تھی' (یہ اگر استفادۂ نامشکور ہے تب بھی گلہ نہیں۔ توارد ہے تو مبارک ومسعود) لیکن پھر جو نتیجہ نکالا اس پر منطق کی سٹی گم ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ تیور استدلال کا یہ ہے کہ غلامی کے اثرات سے گلو خلاصی کرانے میں بنی اسرائیل کو چالیس سال لگے اور اس کے بعد ان کا دورِ عروج شروع ہو گیا تھا۔ اور چونکہ ہمیں بھی غلامی کے جوئے سے گردن چھڑائے چالیس سال ہو گئے ہیں لہٰذا آج سے ہمارا بھی دورِ عروج شروع ہوتا ہے۔ سبحان اللہ و الحمد للہ علی ذالک کون بدبخت اس آرزو کو دل میں

پروان نہیں چڑھا رہا ہے کہ ہماری ہچکولے لیتی کشتی ساحلِ مراد سے جا لگے۔ ملک و قوم کا کوئی دشمن ہی ہو گا جو دورِ عروج کے آغاز اور اس کی بہار کھلی آنکھوں دیکھنے کا خواہش مند نہ ہو لیکن کاش ہمارے حالات اور بنی اسرائیل کے سنبھلنے کے انداز میں کوئی مماثلت پائی جاتی۔ کاش ہم نے خوش فہمیوں کے نشے میں مست رہنے کی بجائے حقیقت پسندی کا ہوش مندانہ رویہ اپنایا ہوتا۔

کیا اس تلخ اور حد درجہ ناگوار موازنے پر بات کرنے کی ضرورت ہے کہ بنی اسرائیل کی نئی نسل نے تو اپنے آباء کی کوتاہیوں اور غلط کاریوں سے رجوع کر کے اصلاحِ احوال کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ ہماری نئی نسل نے کیا کیا۔ یہاں تو صورت حال بالکل برعکس ہے۔ اخلاقی' دینی اور سیاسی انحطاط کا جو عمل آزادی کے متصلاً بعد شروع ہوا تھا اس کی گھمبیرتا ہر نئے دن کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ کردار کا بحران گہرائی اور گیرائی میں روز بروز وسعت اختیار کر رہا ہے۔ مرض کی علامات شدید ہیں اور سب سے بڑی بیماری یہ کہ ؎

مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

محترم مولانا حامد میاں مدظلہٗ کا مقالہ پچھلے شمارے میں شامل تھا اور شمارہ زیرِ نظر میں اس کا تکملہ بھی بے کم و کاست شائع کیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے بارے میں مولانا نے جو بظاہر تلخ و تند استعارے استعمال کئے ان میں بھی کوئی ردوبدل نہیں کیا گیا کیونکہ ہم پر مولانا کا خصوصی اکرام بوجوہ لازم آتا ہے۔ اس قحط الرجال میں ان کا دم ہمارے لئے اس اعتبار سے بھی غنیمت ہے کہ وہ نہ صرف تنظیم اسلامی کے حلقۂ مستشارین میں شامل ہیں بلکہ عندالطلب تعاون بھی فرماتے ہیں۔ ہمارے لئے ان کی سرزنش بھی نصح و خیر خواہی میں محسوب ہو گی لیکن گذارش احوال واقعی کے طور پر عرض ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے قرآن و سنت سے براہ راست استنباط کرتے ہوئے تمام مسائل کا نہیں صرف "آج کے مسائل" کا حل تلاش کرنے کو درست قرار دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اور ان کی تنظیم کے رفقاء فلسفہ و فکرِ دین اور معاملاتِ دینی میں علمائے سلف کے "عروۃ الوثقیٰ" سے چپکے استمساک کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں اور ہر کہ و مہ کی پھبتیاں اور بول سہتے ہوئے بھی جس انشراحِ صدر کے ساتھ سلف کے ہی نہیں معاصر علمائے دین اور مفتیان شرع متین کے ساتھ بھی تعلق

استوار رکھتے ہیں وہ واقفان حال اور خود مولانا سے بھی پوشیدہ نہیں۔ لیکن حسرت آتی ہے کہ مآل اُس کا یہ ہے کہ ۔

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

مولانا حامد میاں مدظلہ کا یہ فرمانا سر آنکھوں پر کہ دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ قاسم العلوم ملتان میں درجنوں کی تعداد میں ایسے رجسٹر موجود ہیں جن میں مسائل کو حل کر کے دکھایا گیا ہے۔ وہ یقیناً علم و آگہی کا بیش قیمت ذخیرہ ہیں اور ان سے استفادے کو ہم لازماً "اوّل" پر فوقیت دیتے ہیں لیکن دو باتیں قابل غور ہیں۔ پہلی یہ کہ کیا اس امکان کو یکسر رد کیا جاسکتا ہے کہ محولہ بالا رجسٹروں میں کوئی مسئلہ شامل ہونے سے رہ گیا ہو اور دوسری یہ کہ اس واقعاتی حقیقت کی موجودگی میں کہ صدیوں پر محیط ہمارے اس زمانے میں (جو بدقسمتی سے ختم ہونے کا نام نہیں لیتا) شریعت اسلامیہ عملی سے زیادہ نظری مباحث کا موضوع رہی ہے تو کیسے ممکن ہے کہ پاکستان میں اس کے عملی نفاذ پر (کاش وہ دن ہمیں دیکھنا نصیب ہو) کچھ نہ کچھ تازہ مسائل پیدا نہ ہوں جبکہ زمانہ قیامت کی چال چل رہا ہے۔ ان مسائل کو دیگر "جدید" ذرائع سے (جن کے پرجوش و سرگرم وکلاء سے ہمارے دانشوروں کی صفیں اٹی پڑی ہیں) حل کرنے کی بجائے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اگر قرآن و سنت سے براہ راست استنباط کا ذکر کرتے ہیں تو ان پر ضلالت و ربر خود غلط ہونے کا الزام جڑنا مولانا حامد میاں جیسے ثقہ بزرگوں کے مرتبے سے فروتر ہے جن کی طرف ہم ہمیشہ رہنمائی اور تعاون کی توقع کے ساتھ ہی دیکھتے رہے ہیں۔

رہی یہ بات کہ ڈاکٹر صاحب کا مقصد خدانخواستہ یہ نہ ہو کہ فقہ حنفی کے نفاذ کا نام نہ لیا جائے تو اگرچہ س "خدانخواستہ" نے ع

اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

ہم یہ وضاحت ہم پر واجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کی تنظیم کا مقصود اسلام ہے۔ خالص اسلام اور سلاف سے ہمارا رشتہ جوڑنے والا اسلام۔ یہ کسی بھی راستے آئے، ہمیں منظور ہے اور حنفی فقہ کے ریعے آئے تو اہلاً و سہلاً۔ اخبارات کی فائلیں گواہ ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے بہت پہلے یہ کہا تھا کہ ملک راداد پاکستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر صحیح تر طرز عمل یہ ہو گا کہ فقہ حنفی کو "پبلک لاء" کا جہ دیا جائے اور دوسرے مسالک کو "پرسنل لاء" سے زیادہ حیثیت حاصل نہ ہو اور یہ بھی کہ ہمارے

سلمان بھائی اپنے شناختی کارڈ پر چنیدہ فقہی مسلک کا اندراج کرائیں تاکہ پرسنل لاء کے مختلف معاملات
ں انہیں من پسند فیصلے لینے کی ناروا سہولت میسر نہ رہے۔ اخبارات ہی کی فائلیں اس ستم ظریفی کی بھی
داہ ہیں کہ اس رائے پر اہل تشیع اور اہل حدیث حضرات نے تو واویلا کیا لیکن حنفی حلقوں سے حمایت میں
ئی آواز نہ اٹھی۔ اور نفاذ شریعت کے مطالبے کے ردعمل میں آج بر سرزمین صورت واقعہ یہ ہے کہ ہر
نہ والا چوکس و ہوشیار بیٹھا ہے۔ اس بات کو تو شاید گوارا کر لے کہ یہاں سیکولر راج آ جائے لیکن یہ
نظور نہیں کہ اس کے اپنے مسلک کو ذرا بھی نظر انداز کیا جائے۔ اس کیفیت میں نفاذ شریعت کی مصلحت
کے تحت تھوڑی سی رواداری دکھانے پر خود فقہ حنفی والوں کی طرف سے ڈاکٹر صاحب گردن زدنی قرار
یئے جائیں تو "لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے" کا سا نقشہ جمتا ہے۔ مولانا سے ہم بصد ادب
رض کریں گے کہ فقہ حنفی کے عظیم ذخیرہ علم و تحقیق پر انہیں اعتماد ہے اور بجا طور پر ہے تو یہ انہیں یہ
لمینان بھی ہونا چاہیئے کہ اپنے تسلسل و تواتر اور اہل وطن کی بڑی اکثریت کے اتباع کے باعث فقہ حنفی
ی یہاں شریعت حقہ قرار دی جائے گی۔

اس ضمن میں معاملے کا ایک اور پہلو البتہ دامن کش ہوش و دانش ہے۔ ایک چھوٹے موںہہ کی اس
ی بات پر مولانا حامد میاں مدظلہ جیسے بزرگ اور زیرک علمائے دین کو ضرور غور فرمانا چاہیئے۔ ایسا کیوں
ہے کہ ہمارے بعض قابل احترام بزرگان دین اپنی سوچ میں تو اتنے حساس ہیں کہ دین و شریعت کا کوئی
سو ایک مخصوص فقہ کے مکمل نفوذ نے بغیر ان کے لئے قابل قبول نہیں لیکن عمل میں رواداری کا یہ عالم
ہے کہ سیاسی سفر ان لوگوں کی رفاقت میں طے ہو رہا ہے جنہیں فقہ تو کیا' دین و مذہب سے ہی کوئی علاقہ و
رو کار نہیں۔ خود مولانا کی جمعیت ایم آر ڈی میں کیا ان لوگوں کی ھمنوا ہلکہ سرخیل نہیں جن کی قابل
ظ تعداد نے عملی زندگی میں "قشقہ کھینچا' دیر میں بیٹھا' کب کا ترک اسلام کیا" سے معنون طرز اختیار
رکھا ہے۔ ملک کے سیاسی استحکام اور داخلی امن و سلامتی کے لئے ۷۳ء کے آئین کی بحالی کے
طالبے کے ہم بھی ھمنوا ہیں لیکن سب جانتے ہیں کہ وہ دستور قانون سازی کے باب میں فقہ حنفی کے
ذ کی ضمانت تو نہیں دیتا' صرف قرآن و سنت کو معیار قرار دیتا ہے...... پھر کیا مولانا آسانی کے ساتھ یہ
وئی کر سکتے ہیں کہ ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت انتخابات کے ذریعے بھان متی کا جو کنبہ مقننہ میں جوڑا
ئے گا وہ مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ اور مولانا مفتی محمودؒ کے مرتب کردہ رجسٹروں پر مہر تصدیق ثبت
نے پر رضا و رغبت آمادہ ہو جائے گا؟

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

"میثاق" میں پچھلے ماہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں ڈاکٹر شیر بہادر پنی صاحب کے تاثرات پر مشتمل گرامی نامہ عرض احوال میں ہی شامل ہوا تھا۔ اس پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مندرجہ ذیل سطور سپرد قلم کیں جو اس کتاب کا بھی تتمہ بنائی جا رہی ہیں جس کا مقدمہ ہمارے جریدے میں شائع ہو کر اس قیل و قال کا باعث ہوا۔ "اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں، بیگانے بھی ناخوش" کے تحت "مولانا آزاد کے بارے میں افراط و تفریط" کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں۔

" کتاب کی کاپیاں پریس میں جا ہی رہی تھیں کہ اس کا جو مقدمہ "میثاق" میں شائع ہو گیا تھا اس کے بارے میں محترم و مکرم ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی کا مکتوب موصول ہوا۔

ڈاکٹر صاحب موصوف مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے عاشق صادق اور انتہائی عقیدت مند ہیں۔

انہوں نے جہاں مولانا آزاد کی زندگی کے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے دور کے ضمن میں راقم کے موقف کی صدفی صد تائید کی ہے۔ وہاں ان کی بعد کی زندگی کے بارے میں ان ہی خیالات کا اظہار فرمایا ہے جو مولانا آزاد کے دوسرے مفرط عقیدت مند مثلاً ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری کرتے ہیں۔

اتفاق سے چند ہی ماہ پیشتر روزنامہ نوائے وقت لاہور نے اپنے ادارتی کالموں میں راقم پر مولانا آزاد سے "اظہار محبت" اور "اظہار عقیدت" پر شدید تنقید کی تھی۔

قارئین کی دلچسپی کے لئے اس کتاب کے "حرف آخر" کے طور پر یہ دونوں تحریریں شائع کی جا رہی ہیں۔ تاکہ مولانا آزاد مرحوم کے بارے میں دو انتہائی متضاد نقطہ ہائے نظر کا فوری تقابل سامنے آ جائے۔ اس لئے کہ یہ ایک نہایت عمدہ مثال ہے اس حقیقت کی کہ محبت اور عقیدت کی نگاہ کو خوبی ہی خوبی نظر آتی ہے جبکہ نفرت و عداوت کی آنکھ کے لئے کسی خوبی کا مشاہدہ ممکن نہیں ہوتا۔

دعا ہے کہ اب جبکہ مولانا مرحوم کے انتقال کو بھی تیس برس ہونے کو آئے مسلمانان پاکستان ان کے بارے میں نصف صدی قبل کے سیاسی اختلافات کو نظرانداز کرتے ہوئے متوازن اور عادلانہ رائے قائم کر سکیں!

اس ضمن میں مولانا مرحوم کے عقیدت مندوں سے صرف اتنی گذارش ہے کہ راقم نے یہ

کبھی نہیں کہا کہ ۱۹۲۰ء کے بعد مولانا کا قرآن حکیم سے شغف ختم ہو گیا تھا۔ یا یہ کہ ان کا سیاسی موقف کسی بد دیانتی پر مبنی تھا...... راقم کا موقف صرف یہ ہے کہ مولانا نے ۱۳۔۱۹۱۲ء میں "حزب اللہ" کے عنوان سے جس ہمہ گیر اسلامی تحریک کا آغاز کیا تھا ۱۹۲۰ء کے بعد وہ اس سے دستکش ہو گئے۔ رہے باقی امور تو وہ راقم کا موضوع ہیں ہی نہیں!

ڈاکٹر بی صاحب کے خط کا ایک نہایت مفید پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعے ارض لاہور میں دعوت قرآنی کے ایک اہم لیکن بھولے بسرے سلسلے کا ذکر ضبط تحریر...... اور اس کتاب کے ذریعے زیر اشاعت آ گیا۔ ارض لاہور میں راقم کی دعوت قرآنی کا مرکز اگر پہلے دس سالوں کے دوران مسجد خضراء سمن آباد میں رہا جس کا سنگ بنیاد مولانا احمد علی لاہوریؒ نے رکھا تھا تو اس کے بعد سے اب پورے دس سال ہو گئے ہیں کہ اس کا خطاب جمعہ مسجد دار السلام باغ جناح لاہور میں ہو رہا ہے جہاں مولانا عبد القادر قصوریؒ کے جلیل القدر صاحبزادگان درس قرآن دیتے رہے۔"

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

قارئین کے لئے یہ اطلاع یقیناً باعث رنج ہوگی کہ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب آجکل شدید علالت کے باعث صاحب فراش ہیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب ۲۳؍ اگست کو تین روز کے لئے کراچی تشریف لے گئے تھے جہاں انہیں شام الہدیٰ کے اجتماع سے خطاب کرنا تھا۔ لیکن وہاں اچانک ان کی کمر اور داہنی ٹانگ میں شدید درد اٹھا۔ درد اس درجے شدید تھا کہ اس نے چلنے پھرنے، اٹھنے حتیٰ کہ بیٹھنے تک سے معذور کر دیا۔ چنانچہ کراچی کے کئی طے شدہ پروگرام منسوخ کرنے پڑے۔ جمعہ ۲۸؍ اگست کو محترم ڈاکٹر صاحب کو خصوصی انتظامات کے ذریعے کراچی سے لاہور منتقل کر دیا گیا ہے۔ مرض کی شدت کا وہی عالم ہے۔ ایکس رے رپورٹ سے معلوم ہوا کہ ریڑھ کی ہڈی کا ایک مہرہ تشویشناک حد تک اپنی جگہ سے سرک گیا ہے۔ ڈاکٹر قاضی عبد الرزاق (آرتھوپیڈسٹ) پوری تندہی کے ساتھ اور ذاتی دلچسپی لے کر امیر تنظیم کا علاج کر رہے ہیں۔ قارئین سے دعا کی درخواست ہے۔ (ادارہ)

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروس قرآن کا سلسلہ

الھدیٰ

درس نمبر ١١

نشست نمبر ٢٥

مباحثِ عملِ صالح

تربیت اولاد اور والدین کی ذمہ داریاں

(سورۃ التحریم کی روشنی میں)

(٣)

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۔ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ صَدَقَ اللَّهُ الْعَظِيمُ

'اے لوگو جو ایمان لائے ہو' بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے جس کا یندھن انسان اور پتھر ہوں گے' جس پر نہایت تند خو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی للہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں۔ (اس قت کہا جائے گا کہ) اے کافرو' آج معذرتیں پیش نہ کرو' تمہیں تو ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے عمل تم نے کئے ہیں۔"

ترم سامعین اور معزز ناظرین

ورہ تحریم کی چھٹی اور ساتویں آیت کی تلاوت اور ترجمہ ابھی آپ نے سنا...... ان میں سے پہلی میں ایک مسلمان خاندان کے سربراہ کی ذمہ داری مثبت انداز میں امر کے صیغے میں بیان کی جا رہی

ہے۔ یہ مضمون دو مواقع پر پہلے بھی بیاں ہو چکا ہے۔ سورہ تغابن میں وہاں اہل ایمان کو خبردار کیا گیا تھا "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَ اَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ" "اے اہل ایمان! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولادوں میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں، ان سے ہوشیار رہو" ...... اگرچہ ہماری اجتماعی زندگی کا جو نقشہ ہے اس کی بنیاد میں مال و اولاد کی طبعی محبت ہی کارفرما ہے۔ یہ محبت اپنی جگہ صحیح ہے، درست ہے لیکن بسا اوقات یہ طبعی و فطری محبت حدِّ اعتدال سے تجاوز کر کے اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ انسان اپنے اہل و عیال کی محبت کی وجہ سے اللہ کے حلال کو حرام یا حرام کو حلال کر بیٹھتا ہے۔ بیویوں کی فرمائشیں پوری کرنے کے لئے، اولاد کو اچھے سے اچھا کھلانے اور پلانے کے لئے، ان کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لئے انسان حرام میں منہ مارنے لگتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ محبت نتیجہ کے اعتبار سے اس کے لئے محبت نہیں رہی بلکہ عداوت بن گئی اور اس کی عاقبت کی بربادی اور تباہی کا سبب بن گئی..... اس آیت میں اسی حقیقت کی نشان دہی کی گئی ہے۔ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں اسی فطری محبت کا ذکر ایک مثبت انداز سے ہوا ہے۔ ایک بندۂ مومن کے دل میں یہ فطری تمنا ہوتی ہے کہ اس کے اہل و عیال بھی ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کی روش اختیار کریں۔ یہ تمنا اور آرزو اس قرآنی دعا کی صورت میں ہمارے سامنے آئی ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا○

"جو دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب، ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔" (سورۃ فرقان آیت۔ ۷۴)

اب یہی مضمون اس آیت میں اپنی منطقی انتہا کو پہنچ رہا ہے یعنی ایک مسلمان کی ذمہ داری صرف اتنی نہیں ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کے نان نفقہ کا اہتمام کرے، انہیں کھلائے پلائے، ان کے رہن سہن کی ضرورتیں پوری کرے۔ یہ تو جبلی طور پر ہر انسان کرتا ہے ایک خاندان کے سربراہ کے مومن ہونے کا نتیجہ یہ نکلنا چاہئے کہ وہ محسوس کرے کہ اللہ نے اپنی مخلوق میں سے جن کو بطورِ امانت اس کے حوالے کیا ہے ان کے صحیح حقوق کی ادائیگی کی فکر کرے..... اس امانت کا حق اس طرح ادا ہو گا کہ ان کی بہتر سے بہتر دینی تربیت کی کوشش کرے تاکہ وہ صحیح رخ پر پروان چڑھیں۔ مومن و مسلم اور متقی و محسن ہو کر انھیں اس ذمہ داری کا احساس اگر نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ ایک مسلمان خاندان کا سربراہ اپنی ذمہ داری

کو بحیثیت ایک مسلمان ادا نہیں کر رہا۔

اس طرف متوجہ کرنے کے لئے قرآن مجید کا انداز بڑا فطری ہے۔ تنبیہ کا آغاز یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَکُمْ "اے اہل ایمان بچاؤ اپنے آپ کو"..... سے کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں قیامت کا ایسا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اس روز ہر ایک کو اپنی فکر پڑی ہو گی اس وقت ہر شخص بھول جائے گا کہ کون میرا بیٹا ہے اور کون میری بیوی ہے اور کون میرا باپ ہے! سورہ عبس میں آتا ہے فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّۃُ ۝ یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْہِ ۝ وَاُمِّہٖ وَاَبِیْہِ ۝ وَ صَاحِبَتِہٖ وَ بَنِیْہِ ۝ "آخر کار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز بلند ہو گی...... اس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔"

اور سورہ معارج میں فرمایا گیا کہ

وَلَا یَسْئَلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا ۝ یُّبَصَّرُوْنَھُمْ یَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ یَفْتَدِیْ مِنْ عَذَابِ یَوْمِئِذٍ بِبَنِیْہِ ۝ وَصَاحِبَتِہٖ وَاَخِیْہِ ۝ وَ فَصِیْلَتِہِ الَّتِیْ تُؤْوِیْہِ ۝ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ یُنْجِیْہِ ۝

"اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لئے اپنی اولاد کو اپنی بیوی کو اپنے بھائی کو اور اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اسے نجات دلا دے۔" سورہ معارج (آیات ۱۰۔۱۴)

اسی لئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ بچاؤ اپنے آپ کو اور اس کے بعد اپنے قریب ترین افراد یعنی اہل خانہ، جن سے انسان کو بہت محبت ہوتی ہے، کو اس آگ سے بچانے کی ہدایت کی جا رہی جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔

اس سورہ مبارکہ کا جو خاص اسلوب ہے، اس سے اس آیت کا جو ربط و تعلق ہے اسے اس مقام پر نوٹ کر لیجئے۔ ہر سورہ مبارکہ کا ایک عمود یعنی ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے جس کے ساتھ سورت کی ہر آیت منسلک اور مربوط ہوتی ہے...... یہاں بھی دیکھئے کہ اولاد کی تربیت میں بسا اوقات لاڈ پیار حائل ہو جاتا ہے اور اولاد کے بگاڑ کا سبب بن جاتا ہے۔ آپ بچے کی صبح کی میٹھی اور ٹھنڈی نیند میں خلل ڈالنا نہیں

چاہتے اس لئے اسے فجر کی نماز وقت پر ادا کرنے کا عادی نہیں بنارہے۔ آپ کا دل چاہتا ہے کہ وہ سوتا رہے۔ اب اگر آپ کی اس بے جا شفقت و محبت کے نتیجے میں وہ بچہ بعد میں نماز کا پابند نہ ہو سکا تو آپ خود سوچئے کہ آپ نے اس کے حق میں کتنے کانٹے بو دیئے ہیں۔ اس کی تربیت اس طرح کس تباہی کے رخ پر ہو رہی ہے اور اس کی زندگی عاقبت کے اعتبار سے کس خسارے کی راہ پر گامزن ہو رہی ہے۔ اسی طرح اگر اپنی بیویوں کے ساتھ لاڈ پیار اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ اللہ کے احکام میں خلل پیدا ہو رہا ہے' حدود اللہ ٹوٹ رہی ہیں' اللہ کا تقویٰ نگاہوں سے اوجھل ہو رہا ہے اس سے دل غافل ہو رہا ہے تو اچھی طرح یہ بات جان لیجئے کہ آپ کی طرف سے آپ کی یہ محبت نہ آپ کے حق میں نافع ہے نہ ان کے حق میں بلکہ یہ دونوں کے لئے عداوت ہے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہایت جامع قاعدہ کلیہ ارشاد فرمادیا ہے۔ کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ تم میں سے ہر شخص کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے..... جس طرح ایک چرواہا اور گلہ بان ان مویشیوں کی حفاظت کا ذمہ دار اور مسئول ہوتا ہے جو اس کے چارج میں دیئے گئے ہیں اور اس میں سے اگر کوئی جانور گم ہو گیا یا حادثہ کا شکار ہو گیا تو اس چرواہے کا محاسبہ ہو گا کہ اس جانور کی گم شدگی میں اس کی غفلت کا کتنا حصہ اور دخل ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں ہر انسان کے حوالے اپنی مخلوق میں سے کچھ افراد کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی کسی دفتر میں افسر ہے تو جو اس کے ماتحت ہیں' گویا وہ ایک گلہ ہے جس کا نگہبان وہ ہے۔ اس کو اپنی حیثیت کے تناسب سے اپنے ماتحتوں کے دین و ایمان ان کی سیرت و کردار کے بارے میں فکر مند رہنا چاہئے کہ یہ چیزیں صحیح رخ پر رہیں چونکہ وہ ذمہ دار ہے' مسئول ہے..... اور جو خاندان کا سربراہ ہے اس پر تو یہ صد فیصد راست آتا ہے کہ وہ بیوی اور بچوں کے لئے ذمہ دار اور مسئول ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اپنے گھرانے کی قریب ترین خواتین کو لے کر بیٹھتے تھے اور ایک ایک کا نام لے کر آپؐ نصیحت فرماتے تھے۔ مثلاً اپنی لخت جگر نور عین حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا۔

"اے فاطمہ! محمدؐ کی لخت جگر' محمد کی نور چشم! اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو۔ اس لئے کہ اللہ کے یہاں تمہارے بارے میں مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔"

حضرت صفیہؓ سے فرمایا۔

"اے صفیہؓ! اللہ کے رسول کی پھوپھی' اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو اس لئے کہ اللہ کے یہاں تمہارے بارے میں مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے"

تو یہ ہے حضورؐ کا انداز متوجہ کرنے کا' انذار/خبردار کرنے کا' ترغیب کا' ترہیب کا۔ یہ ہے مثبت رول ہر مسلمان گھرانے کے سربراہ کا جسے اسے اپنے اہل و عیال کے ضمن میں ادا کرنے کے لئے فکرمند رہنا چاہئے۔

اب دیکھئے کہ بڑا لطیف اور بلیغ انداز اختیار فرمایا کہ اس آگ سے بچانے کی فکر کرو کہ جس کی شدت کا ایک عالم تو یہ ہے کہ اس کا ایندھن ہوں گے انسان اور پتھر۔ پتھروں کا ذکر قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ انسان جب جہنم میں جھونکے جائیں گے تو گویا وہ اس کا ایندھن ہوں گے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ پتھروں کے ذکر میں کیا حکمت ہے! غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذکر اس اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے کہ اس آگ کی شدت و حرارت کو ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ایک آگ وہ ہے جو لکڑیوں سے جلائی جاتی ہے اور ایک آگ وہ ہے جو پتھروں سے جلے گی..... پتھر کے کوئلوں سے کسی زمانہ میں جو آگ جلا کرتی تھی' اس کی حرارت کا ذرا تصور کیجئے اور اس سے بھی آگے جائیے کہ اصل پتھر جس آگ کا ایندھن بن رہے ہوں' اس کی تندی اور تیزی اور شدت کا کیا عالم ہو گا!..... اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ بت عموماً پتھروں سے تراشے جاتے ہیں اور انہیں معبود سمجھا جاتا ہے۔ ان پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔ ان کے آگے ماتھا ٹیکا جاتا ہے۔ ان سے حاجت روائی کے لئے دعائیں کی جاتی ہیں اس لئے مشرکوں کے ساتھ پتھروں کے یہ بت بھی جھونک دیئے جائیں گے۔ تاکہ ان کی حسرت میں مزید اضافہ ہو کہ جنہیں ہم معبود سمجھے بیٹھے تھے وہ بھی ہمارے ساتھ اس آگ میں جل رہے ہیں۔

آگے فرمایا..... "اس جہنم پر وہ فرشتے مامور ہیں جو بڑے سخت دل ہیں تندخو ہیں" ..... غور کیجئے کہ یہ الفاظ کیوں آئے! بہت ہی لطیف انداز ہے کہ آج تم بڑی محبت' شفقت اور لاڈ پیار کی وجہ سے اپنی اولاد کو بگاڑ رہے ہو لیکن نتیجہ کے طور پر وہ کن کے حوالے ہوں گے! ان کے حوالہ ہوں گے جو جہنم کے کارندے اور داروغے ہیں۔ اور ان کے دلوں میں کوئی نرمی اور محبت نہیں ہے۔ تمہاری یہ چہیتی اولاد کتنی ہی فریاد کرے ان فرشتوں کے دل پسیجیں گے نہیں۔ ان کے دل میں رحم اور رأفت کا جذبہ رکھا ہی نہیں گیا۔ وہ بڑے سخت دل اور تندخو ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ "وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے جو ان کو ملے۔ اور وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ملتا ہے۔"

ان آیات سے فرشتوں پر ایمان کے بارے میں بھی رہنمائی ملتی ہے آپ جانتے ہیں کہ فرشتوں پر ایمان ہمارے ایمانیات کا لازمی حصہ ہے۔ دنیا میں دیویوں اور دیوتاؤں کے تصوّرات درحقیقت "فرشتوں پر ایمان" کی بگڑی ہوئی شکل میں ہے۔ اس میں غلطی یہ ہوئی کہ فرشتوں کو بااختیار سمجھ لیا گیا۔ قرآن مجید واضح کرتا ہے کہ اگرچہ ملائکہ ایک نوری مخلوق ہیں اور ان کا رتبہ بہت بلند ہے لیکن وہ بااختیار مخلوق نہیں۔ اسی بات کو یہاں ان الفاظ مبارکہ سے واضح کیا گیا کہ لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ○ جب یہ حقیقت سامنے ہوگی تو اب ان کو پکارنا بیکار، ان سے دعا کرنا لاحاصل، ان کو پوجنا بے فائدہ ... لہٰذا اللہ کو پکارو اللہ سے دعا کرو، اللہ سے مدد مانگو۔ اللہ تعالیٰ جن کے ذریعہ سے چاہے آپ کی ضرورت پوری کر دے۔ کسی انسان کے دل میں ڈال دے، کسی فرشتہ کو مامور کر دے، یہ اس کا اختیار مطلق ہے۔ فرشتے اس اعتبار سے ایک مجبور اور ناچار مخلوق ہیں کہ وہ اپنے ارادہ اور اختیار سے کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ اس کی بڑی پیاری وضاحت سورہ مریم میں آئی ہے۔ متعلقہ آیت کے بین السطور معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریلؑ سے شکوہ کیا کہ اے جبریل! آپ وقفہ وقفہ سے آتے ہیں ہمیں انتظار رہتا ہے۔ حضورؐ کو قرآن مجید کا اشتیاق رہتا تھا اور آپؐ کی خواہش تھی کہ وحی جلدی جلدی آئے۔ اس شکوہ کا حضرت جبریلؑ سے اللہ تعالیٰ نے جواب دلوایا کہ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا○ یعنی نزولِ وحی میں وقفہ کسی بھول کے باعث نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی حکمتِ بالغہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اگلی آیت میں نقشہ کھینچا گیا کہ جب لاڈ پیار سے بگڑے ہوئے یہ لاڈلے اور پیارے جہنم میں جھونکے جائیں گے اس وقت وہ معذرتیں کریں گے، دہائیاں دیں گے، چیخ و پکار کریں گے تو ان کو جواب دیا جائے گا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ "اے ناشکرو! آج بہانے مت بناؤ، معذرتیں نہ تراشو" اب اس کا کچھ حاصل نہیں۔ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ○ تمہیں بدلے میں وہی کچھ دیا جارہا ہے جو تم کرتے تھے، یہ تمہارے اپنے اعمال ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ دنیا میں ان میں لذت تھی، سرور تھا۔ وہاں تمہاری بداعمالیاں 'SUGAR COATED PILLS' کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جس کے باعث ان کی تلخی تم پر نمایاں نہیں ہوئی تھی اور جس انجام سے تمہیں دوچار ہونا تھا وہ تم پر واضح نہیں ہوتا تھا۔ تم نے اپنی خواہشاتِ

نفس کی اپنے افعال پر COATING کر رکھی تھی' اب وہ اتر گئی ہے لہٰذا اس کی حقیقی وواقعی تلخی کا مزا ہے جو تم یہاں چکھ رہے ہو۔ یہ تمہارے وہی اعمال ہیں جو آج تمہارے سامنے آ گئے ہیں۔ یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی اور تمہارے اپنے کرتوت ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس انجام بد سے ہم سب کو بچائے۔ آمین

اب آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کے ضمن میں کوئی سوال یا اشکال ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال و جواب

سوال...... ڈاکٹر صاحب! نیک اور صالح اولاد قیامت کے روز کس حد تک اپنے والدین کی شفاعت کر سکے گی۔ ؟

جواب...... یقیناً نیک اور صالح اولاد اس دنیا کی زندگی کے دوران بھی اپنے والدین کے حق میں بہترین صدقہ جاریہ ہے کہ ان کے اعمال کا جو اجر و ثواب ہے اس میں سے ان کے والدین کو بھی حصہ ملتا رہے گا اور آخرت میں بھی یقیناً وہ اپنے والدین کے حق میں شفاعت کر سکیں گے۔ شفاعت کے باب میں دو چیزیں ہیں۔ جو قرآن مجید بار بار کہتا ہے۔ ایک تو یہ کہ جس کو اجازت ملے گی وہ شفاعت کر سکے گا' از خود اپنے اختیار سے نہیں۔ دوسرے یہ کہ جس کے حق میں اجازت ملے گی اسی کے حق میں شفاعت کر سکے گا۔ یہ دونوں شرطیں اپنے ذہن میں رکھئے' ان دونوں شرطوں کے ساتھ شفاعت ہو گی۔ اب رہا یہ سوال کہ اس شفاعت سے کسی کو کس حد تک فائدہ پہنچے گا تو یہ اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے۔ مزید بر آں نیک اور صالح اولاد کی اپنے والدین کے حق میں شفاعت کے متعلق یہ اصولی بات بھی پیش نظر رہے کہ اسی صالح اولاد کو شفاعت کا حق حاصل ہو سکے گا جس کی صحیح تعلیم و تربیت میں والدین کا حصہ بھی شامل ہو۔

سوال...... ڈاکٹر صاحب! بعض والدین خود گمراہ ہوتے ہیں جس کا اثر اولاد پر بھی پڑتا ہے تو اولاد کیا سزا میں برابر کی شریک ہو گی؟

جواب...... اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک آزاد مرضی' آزاد شعور اور آزاد اختیار بھی دیا ہے جو ماحول اور وراثت کے جتنے اثرات ہیں ان سے بالاتر ہے اس لئے ہر فرد اپنی جگہ جواب دہ ہو گا لیکن غلط ماحول اور غلط تربیت کے اثرات کا اللہ تعالیٰ کی شان غفاری کے طفیل کچھ نہ کچھ الاؤنس ضرور ملے گا۔

سوال...... ڈاکٹر صاحب! اگر اولاد گمراہ ہے اور والدین کی تلقین و نصیحت کے باوجود دین کی پیروی نہیں کرتی تو کیا ماں باپ کو بھی اس کی سزا ملے گی؟

جواب...... بہت عمدہ سوال ہے۔ دیکھئے اگر والدین نے اولاد کی صحیح تربیت کی اپنی امکانی حد تک سعی کی ہے لیکن اس کے باوجود اولاد غلط رخ پر چلی گئی۔ تو اس صورت میں والدین بری الذمہ ہوں گے۔ اور چونکہ کسی انسان کو ہدایت پر لانے کا اختیار کسی دوسرے انسان کو حاصل نہیں ہے اس لئے کوئی انسان بھی آخری درجہ میں کسی کے بارے میں ذمہ دار نہیں ہو گا۔ البتہ کسی اولاد کے بگڑنے میں اگر والدین کی کوتاہی کو بھی دخل ہے اور انہوں نے اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو صحیح طور پر ادا نہیں کیا تو یقیناً والدین ذمہ دار ہیں اور ان کو اپنی اولاد کے غلط اعمال کی سزا کا کوئی حصہ بھگتنا پڑے گا۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

مثیلِ عیسیٰؑ۔ حضرت علیؓ

خطاب جمعہ: ڈاکٹر اسرار احمد ○ ترتیب و تسوید: شیخ جمیل الرحمٰن

(گذشتہ سے پیوستہ)

سیرت و کردار

زہد و قناعت

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ حضرت علی مرتضیٰ کی ذات پر وہ زہد ختم ہو گیا جس کا پیکر کامل جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ بچپن سے پچیس چھبیس برس کی عمر تک حضرت علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ حضورؐ کا پرتو اور عکس آپؓ کی شخصیت میں پیدا ہونا لازمی تھا۔ لہٰذا آپؓ کی زندگی میں دنیوی عیش و آرام کا کیا سوال! حضرت فاطمہ الزہرہؓ کے ساتھ رشتہ ازدواج قائم ہوا تو الگ مکان میں رہنے لگے اس گھریلو زندگی کی آسائشوں کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضورؐ نے آپؓ کی زرہ فروخت کر کے گھر گرہستی کے لئے جو سامان خرید کر دیا تھا عمر بھر اس میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ حضرت فاطمہؓ کے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے گٹے پڑ گئے تھے بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہؐ کی لخت جگرؓ اور آپؓ نے مل کر حضورؐ سے ایک کنیز یا غلام دینے کی درخواست کی۔ سرور عالمؐ نے فرمایا کہ کیا میں تم کو اس سے بہتر چیز نہ بتا دوں! پھر آپؐ نے تلقین فرمائی کہ تم دونوں ہر نماز کے بعد دس بار سبحان اللہ، دس بار الحمد للہ اور دس بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو اور جب رات کو سوؤ تو ۳۳ بار تسبیح، ۳۳ بار تحمید اور ۳۴ بار تکبیر کہہ لیا کرو۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس وقت سے میں نے اس تسبیح کو کبھی ترک نہیں کیا کسی نے پوچھا صفین کی شب میں بھی نہیں! فرمایا کہ "ہاں صفین میں بھی نہیں"

معاش کی یہ حالت تھی کہ ہفتوں گھر میں دھواں نہیں اٹھتا تھا بھوک کی شدت ستاتی تو پیٹ پر پتھر

باندھ لیتے مسند احمد ابن حنبلؒ میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ بھوک کی شدت میں گھر سے نکلے ایک ضعیفہ کنوئیں سے پانی بھر رہی تھی "اس کے متعلق خیال آیا کہ اپنا باغ سنیچنا چاہتی ہے اس کے پاس جا کر اجرت طے کی پھر پانی کھینچے اور باغ تک پہنچاتے رہے یہاں تک کہ ہاتھوں میں آبلے پڑ گئے اجرت میں مٹھی بھر کھجوریں ملیں۔ حضرت فاطمہؓ کو ساتھ لے کر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے حضورؐ نے تمام کیفیت سن کر خوشنودی کا اظہار فرمایا اور کھانے میں ساتھ دیا۔ عہد فاروقی میں جب آپؓ کا وظیفہ مقرر ہوا تو آپ اپنی ضروریات کے بقدر رکھ کر باقی سارا مال اللہ کی راہ میں دے دیتے تھے ایام خلافت میں بھی زہد میں کوئی فرق نہیں آیا موٹا چھوٹا لباس اور روکھا پھیکا کھانا آپؓ کے لئے دنیا کی بڑی نعمت تھی۔ مسند احمدؒ ہی کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک مہمان شریک طعام تھے انہوں نے معمولی اور سادہ کھانا دیکھ کر کہا امیر المومنین بیت المال میں اللہ کے فضل سے مال و اسباب کی کافی بہتات ہے۔ آپؓ نے جواب میں فرمایا " خلیفہ وقت کو مسلمانوں کے مال میں صرف اتنا حق ہے کہ سادگی کے ساتھ خود کھائے اور اپنے اہل و عیال کو کھلائے بقیہ سارا مال خلق خدا کے لئے ہے۔ " دور خلافت میں جب تک مدینہ میں قیام رہا آپؓ کی رہائش اپنے سابقہ مٹی اور گارے سے بنے ہوئے حجرے میں رہی۔ جب دار الخلافہ کوفہ منتقل کیا تو دار الامارت میں قیام کی بجائے ایک میدان میں سادہ خیمہ لگوا کر اس میں قیام کیا اور فرمایا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ محلات کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا ہے مجھے بھی اس کی حاجت نہیں میرے لئے میدان میں خیمہ کافی ہے " پھر خیمہ پر نہ کوئی دربان تھا نہ کوئی حاجب۔ خلیفہ وقت ایک معمولی غریب کی طرح زندگی بسر کرتے تھے فیاضی اور داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ دور خلافت میں آپؓ عموماً بیت المال کا سارا مال تقسیم کر کے جھاڑو پھیر دیا کرتے اور پھر دو رکعت نماز شکرانے کے ادا فرماتے تاکہ وہ قیامت میں ان کے زہد قناعت 'امانت و دیانت کی شاہد بن جائے۔ ازالۃ الخفا میں شاہ ولی اللہؒ نے ابو عمر ابن عبد البرؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے دور خلافت میں ایک دفعہ منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا " میری تلوار کون خریدتا ہے! واللہ اگر میرے پاس تہمد کی قیمت ہوتی (جس کی مجھے اشد ضرورت ہے) تو اس کو فروخت نہ کرتا " ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا " امیر المومنین میں آپؓ کو تہمد کی قیمت بطور قرض دیتا ہوں "

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ سورۃ الدہر کی یہ آیت وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ○ حضرت علیؓ کے زہد 'انفاق و ایثار کی ستائش کے طور پر نازل

ہوئی ایک دفعہ آپؓ نے رات بھر ایک باغ کو سینچ کر مزدوری میں تھوڑے سے جو حاصل کئے۔ صبح ان کا ایک تہائی حصہ پسوا کر حریرہ پکوانے کا انتظام کیا ابھی تیار ہی ہوا تھا کہ ایک مسکین نے صدا لگائی، آپؓ نے سب حریرہ اٹھا کر اسے دے دیا پھر بقیہ ثلث کے پکوانے کا انتظام کیا لیکن جیسے ہی تیار ہوا ایک مسکین یتیم نے دست سوال بڑھایا آپؓ نے یہ اس کی نذر کر دیا۔ اب جو تیسرا حصہ بچا تھا وہ پکنے کے بعد ایک مشرک قیدی کے سوال پر اس کو دے دیا گیا اور یہ اللہ کا بندہ رات بھر کی مشقت سے کمائی ہوئی پونجی اللہ کی راہ میں دے کر خود بھی اور اسؓ کے اہل عیال بھی دن بھر فاقہ سے رہے۔ آپؓ کے پاس دنیوی دولت نہ تھی لیکن دل اتنا غنی تھا کہ کوئی سائل کبھی آپؓ کے در سے خالی ہاتھ نہیں گیا

سادگی اور تواضع

حضرت علیؓ کے تمام سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ سادگی اور تواضع آپؓ کی دستار فضیلت کا خوش نما طرہ تھا۔ آپؓ اپنے ہاتھ سے محنت و مزدوری کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ لوگ مسائل پوچھنے آتے تو آپ کو کبھی جوتے ٹانکتے کبھی اونٹ چراتے اور کبھی زمین کھودتے پاتے۔ مزاج میں سادگی کا یہ عالم تھا کہ فرشِ خاک پر بے تکلف سو جاتے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپؓ کو ڈھونڈتے ہوئے مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ آپؓ زمین پر بے تکلفی سے سو رہے ہیں چادر جسم سے سرک گئی ہے اور جسم غبار آلود ہو گیا ہے سرور عالمؐ نے اپنے دست مبارک سے آپؓ کا بدن صاف کیا اور نہایت محبت بھرے لہجہ میں فرمایا" اِجْلِسْ یَا اَبَا تُرَابِ " (اے مٹی والے اب اٹھ بیٹھو) حضور کی عطاء کردہ یہ کنیت آپؓ کو اتنی عزیز تھی کہ جب کوئی آپؓ کو " یا ابا تراب " کہہ کر مخاطب کرتا تو خوشی کے مارے چہرہ دمک اٹھتا اور ہونٹوں پر تبسم کی لہر آ جاتی۔ عہد خلافت میں بھی یہ سادگی قائم رہی۔ معمولی کپڑوں میں بازار کا گشت کرتے۔ اگر کوئی شخص پیچھے پیچھے چلتا تو آپؓ کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا تو منع فرماتے کہ اس میں والی کے لئے فتنہ اور مومن کے لئے ذلت ہے۔

احساسِ بندگی اور تقویٰ

حضرت جنیدؒ کا قول ہے کہ عبادت و ریاضت اور آزمائش و امتحان میں ہمارے شیخ والشیوخ علی مرتضیٰ ہیں شاہ ولی اللہؒ نے ازالۃ الخفا میں لکھا ہے کہ چونکہ حضرت علیؓ کو حضورؐ کی صحبت میں رہنے کا

طویل ترین موقع ملا تھا اس لئے خلافت سے پہلے ریاضت اور نفلی عبادات سے بڑا انہماک تھا آپؓ کی نماز میں خشوع و خضوع کی یہ حالت ہوتی تھی کہ دوران نماز بید کی طرح لرزتے تھے سیرت کی مستند کتابوں میں یہ عجیب واقعہ ملتا ہے کہ ایک جنگ میں آپؓ کے جسم میں ایک تیر پیوست ہو گیا آپؓ کا جسم مبارک پتھر کی طرح ٹھوس تھا۔ لوگوں نے تیر کھینچنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں نکل سکا۔ آپؓ نے فرمایا کہ میں نفل نماز شروع کرتا ہوں اس حالت میں نکالنے کی کوشش کرو روایت میں آتا ہے کہ نماز میں آپ کا جسم اتنا نرم پڑ گیا کہ تیر آسانی سے نکل آیا اور آپؓ کو تکلیف کا احساس تک نہ ہوا۔

علم و فضل اور حکمت

آپؓ کے متعلق جامع ترمذی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ملتا ہے کہ " اَنَا مدینۃُ العلمِ و عَلیٌّ بَابُہَا " اگرچہ امام ترمذیؒ اور چند دیگر محدثین نے اس کی اسناد کو ضعیف بتایا ہے لیکن موضوع کسی نے قرار نہیں دیا۔ اسلام کے علوم و معارف کا سرچشمہ قرآن مجید ہے آپؓ نے اس سرچشمہ سے پوری طرح سیرابی حاصل کی۔ آپؓ نہ صرف حافظ و قاریٔ قرآن تھے۔ بلکہ علوم قرآنی سے آپ کو خصوصی شغف تھا۔ بالخصوص آیات کے شان نزول کے علم میں آپ گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ آپؓ کا شمار مفسرین کے اعلیٰ طبقہ میں ہوتا ہے۔ صحابہؓ میں اس کمال میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے سوا اور کوئی شریک نہیں۔ قرآن مجید کے مسائل کے استنباط اور اجتہاد میں آپؓ کو ید طولیٰ حاصل تھا خوارج نے جب تحکیم کے مسئلہ میں فتنہ اٹھایا جس کا ذکر کر چکا ہوں تو آپ نے بہت سے قرآن کے حفاظ اور علماء کو جمع کر کے خوارج کے چند سربر آوردہ افراد کی موجودگی میں ان سے دریافت فرمایا کہ اگر میاں بیوی میں اختلاف ہو تو اللہ نے حکم بنانے کی اجازت دی ہے کہ نہیں لہٰذا جب امت کے دو گروہوں میں اختلاف ہو جائے تو حکم بنانا جائز ہو گا یا نہیں! حفاظ و علماء نے آپؓ کی تائید کی۔ لیکن خوارج اپنے موقف پر اڑے رہے۔ خوارج اِنِ الحُکمُ اِلاَّ لِلّٰہِ سے تحکیم کے خلاف جو استدلال کرتے تھے اس کے متعلق آپؓ فرماتے کہ کلمہ حق ہے یعنی اگرچہ بات اپنی جگہ درست ہے لیکن خوارج کا استدلال و استنباط باطل و ضلالت ہے۔

حضرت علیؓ نے بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کی تعلیم حاصل کر لی تھی چنانچہ مشہور ہے کہ آپ نے قرآن مجید کو نزولی ترتیب سے بھی مرتب کیا تھا۔ واللہ اعلم۔ بعض دوسرے اصحابہؓ کی طرح آپؓ کا نام

بھی کاتبان وحی میں شامل ہے۔ مزید یہ کہ حضورؐ کے جو مکاتب و فرامین لکھے جاتے تھے ان میں بعض آپؓ کے دست مبارک سے بھی لکھے ہوئے ہوتے تھے حدیبیہ کا صلح نامہ آپؓ ہی نے تحریر کیا تھا۔

ایک غلط بات کی تردید

آپؓ کے متعلق آپؓ کے دور خلافت ہی میں کچھ لوگوں کا خیال تھا اور ایک گروہ نے تو اسے اپنے عقائد کا مستقل جزو بنا رکھا ہے کہ حضورؐ نے آپؓ کو ظاہری علوم کے علاوہ چند باطنی علوم کی تعلیم بھی دی تھی۔ یہ علوم سینہ بہ سینہ حضرت حسنؓ سے لے کر حضرت حسن عسکریؒ تک پہنچے۔ اب یہ علوم امام مہدی کے پاس ہیں، جو اس گروہ کے عقیدے کے مطابق زندہ ہیں مگر کسی غار میں پوشیدہ ہیں قیامت کے قریب وہ اپنے پوشیدہ مسکن سے نکلیں گے اور ان علوم باطنیہ سے لوگوں کو آگاہ کریں گے۔ حالانکہ صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ "حضرت علیؓ کے شاگردوں نے آپؓ سے پوچھا کہ قرآن کے سوا کچھ اور بھی آپ کے پاس ہے؟ فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جو دانہ کو پھاڑ کر درخت سے اگاتا ہے، جو جان کو (جسم کے اندر) پیدا کرتا ہے میرے پاس قرآن کے سوا کچھ اور نہیں۔ لیکن قرآن سمجھنے کی قوت (فہم) کی دولت خدا جس کو چاہے دے (اس کے علاوہ چند حدیثیں بھی میرے پاس ہیں جو میں بیان کرتا رہتا ہوں) چنانچہ اس غلط بات کی تردید خود حضرت علیؓ سے ثابت ہے۔

عدل وانصاف اور تَفقُّہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے متعدد صحابہ کرامؓ کے خصوصی مناقب بیان ہوئے ہیں آپ حضرات نے جمعہ کے خطبہ ثانی میں سنا ہو گا ہمارے خطیب خلفائے راشدینؓ کے متعلق حضورؐ کے فرمائے ہوئے ان مناقب کو بیان کرتے ہیں کہ اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُوْبَکر میری امت میں میری امت کے حق میں سب سے زیادہ رحیم وشفیق ابو بکر ہیں۔ وَاَشَدُّ ھُمْ فِیْ اَمرِ اللّٰہِ عُمَر "امت میں اللہ کے احکام کے بارے میں سب سے زیادہ سخت، سب سے زیادہ شدید عمر ہیں۔" وَاَکْثَرُھُمْ حَیَاءً عُثْمَانُ امت میں سب سے حیادار عثمان ہیں" وَ اَقْضَاھُمْ عَلِیّ "اور امت میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے علی ہیں" رضی اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین چنانچہ حضورؐ مدینہ میں بعض اوقات قضا کی خدمت حضرت علیؓ کے سپرد فرماتے تھے۔

یمن میں عہدۂ قضا

چنانچہ جب اہل یمن نے اسلام قبول کیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کے عہدہ قضا کے لئے آپؓ کو مقرر فرمایا۔ حضرت علیؓ نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ وہاں نئے نئے مقدمات پیش ہوں گے اور مجھے قضا کا تجربہ اور علم نہیں۔ لیکن رسولؐ کی نگاہ جوہر شناس آپؓ کی خفیہ صلاحیتوں کو جانتی تھی لہٰذا حضورؐ نے ان کو تسلی دی کہ "اللہ تعالیٰ تمہارے دل کو ثبات و استقلال بخشے گا' تمہاری زبان کو حق بات کہنے کی سعادت عطا فرمائے گا اور صحیح فیصلے کرنے میں تمہاری نصرت فرمائے گا۔" اس تسلی کے علاوہ حضورؐ نے آپؓ کو قضا و فصل و مقدمات کے لئے ہدایات بھی دیں۔ مثلاً حضورؐ نے فرمایا۔ علیؓ جب تم دو آدمیوں کا جھگڑا چکانے لگو تو اپنے فیصلہ کو اس وقت تک روکے رکھو جب تک دونوں فریقوں کے بیان کو اور ضروری شہادتوں کو نہ سن لو۔ اور حقیقت معلوم کرنے کے لئے ان سے خوب جرح نہ کر لو۔ 'حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرمؐ کی تسلی اور تعلیمات کے بعد پھر مجھے مقدمات کے فیصلوں میں کبھی تذبذب نہیں ہوا۔ یمن کے قیام کے دوران آپؓ نے بعض عجیب و غریب مقدمات کا فیصلہ اپنی فراست سے فرمایا۔ ان فیصلوں میں سے بعض کو حجۃ الوداع کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطور اپیل پیش کیا گیا۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ کے فیصلے کو سن کر تبسم فرمایا اور ان کو برقرار رکھا۔ حضرت علیؓ کے فیصلے چونکہ قانون شریعت میں نظائر کی حیثیت رکھتے تھے' اس لئے اہل علم نے ان کو تحریری صورت میں مدون بھی کر لیا تھا۔ لیکن سبائیوں نے ان میں بھی تحریف کر دی تھی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے اس کے ایک حصہ کو اسی دور میں جعلی قرار دے دیا تھا البتہ آن جنابؓ کے بعض صحیح فیصلوں سے امام ابو حنیفہؒ نے اپنے فقہ میں استنباط کیا ہے۔

تمام اصحابہ کرامؓ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؓ کو مقدمات' مناقشات 'تنازعات اور خصومات کے فیصلوں اور قضاء کی خصوصی صلاحیت عطا فرمائی ہے حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے "ہم میں مقدمات کے فیصلے کے لئے سب سے زیادہ موزوں علیؓ ہیں اور قرآن کے سب سے بڑے قاری ابی ابن ابی کعبؓ ہیں اسی طرح فقیہہ الامت حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ تمام صحابہ کہا کرتے تھے مدینہ والوں میں سب سے زیادہ صحیح فیصلہ کرنے والے حضرت علیؓ ہیں۔ بڑے بڑے صحابہؓ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کو بھی بعض اوقات حضرت علیؓ کی طرف

رجوع کرنا پڑتا تھا۔ مسند احمدؒ کی روایت ہے کہ دور فاروقی میں ایک مجنون زانیہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کی گئی۔ آپؓ نے اس پر حد جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہ ممکن نہیں چونکہ مجنون حدود شرعی سے مستثنیٰ ہیں حضرت عمرؓ نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اسی مسند ابن حنبلؒ میں ہے کہ کسی نے حضرت عائشہ سے دریافت کیا کہ وضو کے بعد کتنے دن تک موزوں پر مسح کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ علیؓ سے معلوم کرو۔ کیونکہ وہ سفر میں حضورؐ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ مسافر تین دن رات اور مقیم ایک دن ایک رات تک مسح کر سکتا ہے۔

جس زمانہ میں آپؓ کا حضرت معاویہؓ سے اختلاف چل رہا تھا اس زمانے میں بھی ایک دفعہ حضرت معاویہؓ نے خط لکھ کر ایک مسئلہ دریافت کیا آپؓ نے مسکرا کر فرمایا کہ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے مخالفین بھی' تفقہ فی الدین میں ہماری طرف رجوع کرتے ہیں اور مسئلہ کا جواب بھجوا دیا۔ جس کے مطابق حضرت معاویہؓ نے عمل کیا۔

تحمل اور خوفِ خدا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ متفق علیہ حدیث ہے لیس الشدید بالصرعة انما الشدید الذی یملک نفسه عند الغضب "قوی (پہلوان) وہ نہیں ہے جو مقابل کو بچھاڑ لے بلکہ (حقیقی) قوی اور پہلوان وہ ہے جو غصہ اور غیض کی حالت میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کی کامل تعمیل سیرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں نظر آتی ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ کسی شخص کی ذاتی توہین و تذلیل کی جو مذموم حرکتیں دنیا میں رائج ہیں' ان میں دو نہایت گھناؤنی ہیں ایک یہ کہ کسی کو ماں بہن کی گالی دی جائے اور ایک یہ کہ اس کے منہ پر تھوک دیا جائے ان حرکتوں پر کمزور سے کمزور شخص بھی غصہ سے مغلوب ہو کر کانپنے لگتا ہے اس کے جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر آجاتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس کا بس چلے تو تذلیل کرنے والے کی تکا بوٹی کر دے گا اس سے اندازہ ہو گا کہ کسی قوی شخص کے جذبات کا کیا عالم ہو گا! آخر الذکر صورت کا ایک واقعہ حضرت علیؓ کے ساتھ بھی پیش آیا ہوا یہ کہ ایک غزوہ میں آں جنابؓ نے ایک کافر دشمن کو پچھاڑ لیا اور آپؓ چاہتے ہی تھے کہ تلوار سے اس کا سر قلم کر دیں کہ اس نے نیچے لیٹے لیٹے آپ کے منہ پر تھوک دیا۔ آپؓ اس توہین و تذلیل پر برافروختہ ہونے کی بجائے اس کو چھوڑ کر الگ کھڑے

ہو گئے وہ مغلوب بھی حیران و پریشان اٹھ کھڑا ہوا اس نے آپؓ سے دریافت کیا کہ میں نے تو یہ سمجھ کر کہ مجھے تو قتل ہونا ہی ہونا ہے یہ انتہائی مذموم حرکت کی تھی لیکن آپؓ نے مجھے چھوڑ دیا۔ آپؓ نے اسے جواب دیا کہ میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی میں فی سبیل اللہ تم سے لڑ رہا تھا اور اسی لئے تمہیں قتل کرنا چاہتا تھا لیکن جب تم نے میرے منہ پر تھوکا تو اس کے ردعمل میں تمہارے خلاف میرے دل میں شدید غیض و غضب پیدا ہوا۔ ساتھ ہی مجھے اللہ کا خوف آیا کہ اگر اس موقع پر تمہیں قتل کروں گا تو ہو سکتا ہے کہ تمہارا یہ قتل اللہ کے نزدیک اس کی راہ میں قتل شمار نہ ہو بلکہ میرے ذاتی غصہ کے انتقام میں شمار ہو اس لئے میں نے تم کو قتل کرنے سے ہاتھ روک لیا۔ یہ سن کر وہ کافر مشرک آپؓ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ یہ ہے تحمل خشیت الٰہی اور حقیقی شجاعت کا عملی نمونہ جو ہمیں حضرت علیؓ کی شخصیت میں نظر آتا ہے۔

شاہکارِ رسالت

غلام احمد پرویز صاحب نے حضرت عمرؓ کی سیرت کا عنوان "شاہکار رسالت" رکھا ہے۔ لیکن میری رائے میں یہ لفظ حضرت علیؓ کی شخصیت کے لئے زیادہ موزوں ہے کیونکہ بالکل ابتدائی عمر سے ہی آپؓ کو حضورؐ کی تربیت میں پرورش پانے کا موقع ملا پھر ایمان لانے کے بعد سے ہجرت تک اور ہجرت کے بعد حضرت فاطمہؓ سے نکاح تک آپؓ حضورؐ کے گھر میں ان کے ساتھ رہے۔

مکی دور میں حضرت علیؓ سے متعلق صرف چند واقعات روایات میں آتے ہیں کیونکہ اس وقت آپؓ کی عمر بہت چھوٹی تھی لیکن نوعیت کے اعتبار سے یہ واقعات کافی اہم ہیں۔ پہلا واقعہ تیرہ برس کی عمر میں پیش آیا جب حضورؐ نے حکم خداوندی کی تعمیل میں بنوہاشم کے لئے کھانے کا اہتمام کیا تاکہ انہیں اسلام کی دعوت دیں۔ اس کے جواب میں بنوہاشم میں سے کھڑا ہوا تو کون! ایک تیرہ سالہ بچہ علی ابن ابی طالبؓ اس موقع پر ان کی زبان سے جو جملے نکلے وہ تاریخی جملے ہیں۔ ذرا چشم تصور سے دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان کو اللہ کی طرف بلا رہے ہیں اور کسی متنفس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ کھڑا ہوتا ہے تو تیرہ برس کا ایک بچہ اور کہتا ہے کہ "اگرچہ میں عمر میں سب سے چھوٹا ہوں۔ اگرچہ میری آنکھیں دکھتی ہیں۔ اگرچہ میری ٹانگیں پتلی ہیں لیکن میں آپؐ کا ساتھ دوں گا" اور تمام لوگ قہقہہ لگا کر دلوں میں شاید یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ یہؐ ہیں جو دنیا کی تاریخ کا رخ بدلنے کے لئے

کھڑے ہوئے ہیں اور یہ تیرہ سالہ بچہ ہے جوان کی مدد اور اعانت کے لئے خود کو پیش کر رہا ہے۔

دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کی رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی وہ امانتیں جو آپؐ کے پاس تھیں حضرت علیؓ کے سپرد کیں اور انؓ کو اپنے بستر پر لیٹنے کے لئے ہدایت فرمائی اس وقت حضرت علیؓ کی عمر بائیس تئیس برس کی ہوگی۔ رات بھر باہر دشمنانِ خدا اور رسولؐ کا محاصرہ رہا۔ اس خطرہ کی حالت میں بھی یہ نوجوان نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ محو خواب رہا۔ یہ بھی آپؓ کی خفیہ شجاعت کا ایک مظہر ہے۔ حضرت علیؓ کی شخصیت کے جوہر مدنی دور میں ظاہر ہوئے جن کا ایک اجمالی نقشہ میں آپ حضرات کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ مکی اور مدنی دور میں آپؓ کی عمر کے معاملہ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

مکی دور میں جو حضرات حضورؐ کے ہم عمر تھے وہ اول روز سے آپؐ کے دست و بازو بنے ہوئے تھے حضرت ابو بکرؓ ایمان لاتے ہی دعوت تبلیغ میں لگ گئے عشرہ و مبشرہ میں سے چھ حضرات، حضرت ابو بکرؓ کی دعوت و تبلیغ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے آکر وابستہ ہوئے۔ انہی میں عثمان غنی، طلحہ، زبیر، عبدالرحمان ابن عوف، ابو عبیدہ ابن الجراح، اور سعید ابن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین شامل ہیں یہ سب لوگ کون ہیں۔ یہ قریش کے چوٹی کے گھرانوں کے موتی اور ہیرے ہیں یہ مکی دور کی وہ سعید روحیں ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے عقل سلیم اور نور فطرت عطا فرمایا تھا جو نور وحی سے جگمگا گیا اور انہوں نے دعوت ایمان پر لبیک کہا اور راہ حق میں نہایت مہیب مظالم برداشت کئے۔

صحابہؓ کی ایک درجہ بندی

اس موقع پر ایک ضمنی بات اور بھی سمجھ لیجئے۔ عام طور پر عمر کے لحاظ سے صحابہ کرام کو صغار صحابہ اور کبار صحابہ، دو درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ لیکن انؓ میں در حقیقت ایک درمیانی نسل بھی تھی۔ کبار صحابہؓ تو وہ ہیں جو حضورؐ کے ہم عمر تھے۔ ان میں حضرات ابو بکرؓ عمرؓ عثمانؓ، حمزہؓ، طلحہ رضہ، زبیرؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوف، یاسرؓ اور سعید ابن زید وغیرہ شامل ہیں۔ یہ مکی دور میں حضورؐ کے دست بازو بنے اس سے اگلی نسل وہ ہے جو آں حضورؐ سے عمر میں تیس چالیس برس کا فرق رکھتی ہے۔ حضرت علیؓ کا تعلق اس نسل سے ہے۔ حضرت علیؓ نبی اکرمؐ سے تیس سال چھوٹے ہیں۔ ان کے علاوہ اس نسل میں اور کون صحابہ ہیں! حضرت مصعب بن عمیرؓ ہیں حضرت سعد ابن وقاصؓ

ہیں۔ حضرت خباب ابن ارت ہیں حضرت صہیب رومی ہیں حضرت بلال ہیں حضرت عمار ہیں وغیرہ ھم۔ صحابیات میں بڑی عمر میں حضرت خدیجہ الکبریٰ ہیں۔ ممکن ہے چند اور صحابیات بھی ہوں۔ اگلی نسل میں حضورؐ کی چار صاحبزادیاں حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ ہیں۔ حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہؓ ہیں یہ وہ نسل ہے جو آغازِ وحی کے وقت لڑکپن میں تھی یا حدودِ جوانی کو چھو رہی تھی۔ آپ کو ان کا کوئی کارنامہ مکی دور میں نظر نہیں آئے گا۔ اس دور میں شجاعت کا مظاہرہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کا مل جائے گا۔

تیسری نسل میں وہ صحابہ کرامؓ شمار ہوں گے جنہوں نے ہجرت کے بعد مدینہ النبی میں ہوش سنبھالا۔ ان میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت اسامہ ابن زیدؓ، حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ، حضرت حسن اور حضرت حسینؓ وغیرھم شامل ہیں۔

صحابہ کرامؓ کے باہمی تعلقات

جس طرح ہر انسانی معاشرے میں اختلافات ہمیشہ موجود رہے ہیں اور رہتی دنیا تک رہیں گے۔ اسی طرح صحابہ کرام کے درمیان اختلافات ایک تاریخی حقیقت ہیں۔ ان کا انکار ممکن نہیں۔ لیکن ان کے درمیان اس بغض و عداوت اور دشمنی کا کوئی وجود نہیں تھا جس کو بنیاد بنا کر ابنِ سبا نے امت مسلمہ کو تفرقہ اور انتشار سے دوچار کر دیا۔ تاریخ کی کتابیں اور تذکرے ان واقعات سے بھرے پڑے ہیں جو ان تعلقات کی فطری نوعیت یعنی ان کے درمیان الفت و مودّت اور اختلاف دونوں کی نوعیتوں کو واضح کرتے ہیں۔

غزوہ تبوک کے موقع پر حضورؐ نے حضرت علیؓ کو اپنے نائب کی حیثیت سے مدینہ میں رہنے کا حکم دیا۔ مگر یہ بات حضرت علیؓ کے مزاج سے بعید تھی کہ وہ شرکتِ جہاد سے محرومی کو گوارا کر لیں۔ پھر کچھ منافقین نے طعنہ زنی بھی کی۔ چنانچہ آپؓ نے رنجیدہ ہو کر شکوہ کے انداز میں حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلیں، دادِ شجاعت دیں۔ اور میں عورتوں، بوڑھوں اور مریضوں کی دیکھ بھال کے لئے مدینہ میں رہ جاؤں! حضرت سعدؓ ابن وقاص روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی اس شکوہ آمیز التجا پر حضورؐ نے فرمایا کہ "اے علی! میرے ساتھ تمہارا وہی مقام، مرتبہ اور تعلق

ہے جو ہارونؑ کا موسیٰؑ کے ساتھ تھا سوائے اس کے کہ ہارونؑ نبی تھے لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے"۔ یعنی جس طرح حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں ان کی نیابت ہارونؑ کرتے تھے 'اسی طرح میرے نائب کی حیثیت سے تم مدینہ میں رہو..... البتہ چونکہ حضرت ہارونؑ نبی بھی تھے للذا حضورؐ نے ساتھ ساتھ اس کی وضاحت بھی فرمادی کے نبوت کا دروازہ تو اب ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔

نیابتِ عمر

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت عمرؓ جب بیت المقدس کی فتح کے موقع پر یروشلم تشریف لے گئے تو مدینہ میں اپنا نائب حضرت علیؓ ہی کو بنا کر گئے۔ ذرا سوچئے تو سہی۔ کوئی حکمران ایک طویل سفر پر جاتے ہوئے اپنی جگہ کسی ایسے شخص کو بٹھائے گا جس پر اسے اعتماد نہ ہو۔ مدینہ سے بیت المقدس کے فاصلے اور اُس دور میں اونٹ کے سفر کی رفتار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت عمر کی مدینہ سے غیر حاضری کوئی چند روز کی بات نہ تھی۔ اور پھر سفر کی صورت بھی یہ تھی کہ ایک منزل تک حضرت عمرؓ اونٹ پر سوار ہوتے تو غلام پیدل چلتا اور ایک منزل میں غلام سوار ہوتا تو خلیفتہ المسلمین عمرؓ ابن الخطاب اونٹ کی نکیل تھام کر پیدل چلتے تھے۔ گویا عملاً پیدل چلنے کی رفتار سے سفر طے ہو رہا تھا۔ دوسری مرتبہ حضرت عمرؓ نے اس وقت حضرت علیؓ کو اپنا نائب بنایا جب وہ امیر المومنین کی حیثیت سے حج کے لئے تشریف لے گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت عمرؓ نے اسوۂ رسول پر عمل کرتے ہوئے حضرت علیؓ کو اپنا نائب مقرر فرمایا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں جس تیزی کے ساتھ فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا ہے ذرا اس کا اندازہ تو کیجئے۔ ملک کے ملک اقلیم اسلامی میں آ رہے ہیں۔ ان میں بڑی بڑی آبادیاں ہیں۔ بڑے وسائل و ذرائع ہیں۔ یہ تمام علاقے نہایت زرخیز ہیں۔ اگر ان کا صحیح انتظام اور بندوبست نہ ہوتا تو بہت بڑی ہلاکت اور تباہی رونما ہو جاتی۔ میں نے لفظ ہلاکت یہاں جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کے یہ الفاظ تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں کہ لَو لَا عَلِیٌّ لَھَلَکَ عُمَر "اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا"۔ فاروق اعظمؓ نے یہ کیوں کہا! اس لئے کہ آپؓ پر امیر المومنین خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے اور بہت سی دوسری ذمہ داریاں تھیں۔ جن میں خاص طور پر فوجوں کا انتظام و انصرام 'محاذوں سے آنے والی اطلاعات 'ان کی روشنی میں مزید فوجوں کی کمک اور سامان رسد کی فراہمی

اور ترسیل کے انتظامات، پھر ' CRISIS ' اور تشویش ناک صورت حال پر قابو پانے کی تدابیر پر غور وفکر اور ان کو روبعمل لانے کے انتظامات۔ ان امور کی انجام دہی میں آپؓ غلطاں وپیچاں رہتے تھے۔ لہٰذا استحکام، نظم اور داخلی انتظام کی طرف توجہ دینے کا آپؓ کو نہ وقت ملتا تھا نہ موقع...... آپؓ نے یہ سارا کام حضرت علیؓ کے ذمّہ کر رکھا تھا گویا حضرت علیؓ چیف سیکرٹری تھے حضرت عمرؓ کے۔ خلافت فاروقی میں جتنے بھی حکومت کے انتظامی محکمے قائم ہوئے ان میں سے اکثر حضرت علیؓ کی فہم وفراست کے رہین منت ہیں۔

عرب میں الگ الگ محکموں کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ اکثر محکمے حضرت علیؓ نے قائم کیے ہیں۔ تمام مفتوحہ ممالک کی پیداوار اور ذرائع نقل وحمل کے کوائف جمع کرائے۔ الغرض انتظامی امور حضرت علیؓ کے زیر ہدایت اور زیر نگرانی انجام پائے تھے۔

حضرت علیؓ کی نظر میں حضرت عمرؓ کا مقام

سرزمین عراق پر پیش قدمی کا آغاز اگرچہ دور صدیقی میں ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے مسند خلافت پر رونق افروز ہونے کے بعد عراق کی مہم کی تکمیل کو اوّلین کاموں کی فہرست میں شامل کیا اور اس محاذ پر تازہ فوج روانہ کی۔ لیکن ایک موقع پر مسلمانوں کے لشکر کو سخت ہزیمت ہوئی اور نو ہزار فوج میں سے چھ ہزار مجاہد اس معرکہ میں شہید ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کو جب اس شکست کی خبر ملی تو ان کو بڑا صدمہ اور رنج ہوا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ تازہ کمک لے کر میں خود محاذ جنگ پر جاؤں لیکن حضرت علیؓ نے انؓ کو روکا اور یہ فرمایا کہ چکی اس وقت تک پستی ہے۔ جب تک اس کا دھرا (کِلی) اپنی جگہ مضبوطی سے قائم رہے۔ اس وقت آپؓ کا مقام چکی کے دھرے کا ہے۔ امت مسلمہ کی چکی اس وقت تک چلے گی جب تک آپؓ اپنے مقام پر قائم رہیں گے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے مشورے کو قبول کیا اور خود محاذ جنگ پر جانے کی بجائے حضرت علیؓ ودیگر اصحاب شوریٰ کے مشورے سے حضرت سعدؓ ابن وقاص (یکے از عشرۂ مبشرہؓ) کو افواج کا سپہ سالار بنا کر نئی فوجوں کے ساتھ ایران کی سرحدوں پر بھیجا۔ اس واقعہ سے بھی اندازہ لگائیے کہ ان حضرات میں کتنا قلبی تعلق تھا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگاہ دور رس میں حضرت عمرؓ کا کیا مقام تھا۔

بنتِ علیؓ سے نکاح

اسی مقام پر ایک اہم واقعہ اور نوٹ کیجئے کہ حضرت علیؓ کی صاحبزادی 'رسول اللہؐ کی نواسی اور حضرت فاطمہ الزہرہؓ کی نورِ چشم ام کلثوم حضرت عمرؓ کے نکاح میں آئیں۔ جب حضرت عمرؓ نے پیغام بھیجا تو حضرت علیؓ نے یہ عذر پیش کیا کہ ابھی اس کی عمر کم ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ میری تمنا ہے کہ خاندان نبوت سے رشتہ استوار کروں۔ لہٰذا حضرت علیؓ نے ان کی خواہش کے احترام میں ۱۲ھ میں ام کلثوم کا نکاح حضرت عمرؓ سے کر دیا۔ غور کا مقام ہے کہ اگر ان حضرات میں باہمی محبت نہ ہوتی تو یہ ہونے والی بات تھی۔ اس نکاح کا ذکر تو خود اہل تشیع کی کتابوں میں بھی موجود ہے 'اس لئے وہ اس کا انکار تو نہیں کر سکتے لیکن ایسی توجیہ پیش کرتے ہیں جو حضرت علیؓ کی شجاعت غیرت اور حمیت کے منافی ہے کہ انہوں نے معاذ اللہ حضرت علیؓ کی طرف سے قتل کی دھمکی سے خوفزدہ ہو کر یہ نکاح منظور کیا تھا۔

حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ معاملہ

البتہ ہم یہ مانتے ہیں حضرت علیؓ کو بالکل ابتدائی دور میں حضرت ابو بکرؓ سے کچھ شکایت رہی ہے اور یہ شکایت بے بنیاد نہ تھی۔ ایک شکایت یہ تھی کہ خلافت کا فیصلہ کرنے میں انہیں شریک نہیں کیا گیا۔ لیکن اس فیصلہ میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے پہلے سے کسی سوچے ہوئے منصوبہ کا دخل نہیں تھا۔ امر واقع یہ ہے کہ حضورؐ کی وفات کی خبر مشہور ہوتے ہی انصارؓ کی کافی بڑی تعداد نے ثقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو کر خلافت کی بحث چھیڑ دی اور حضرت سعد ابن عبادہؓ کو خلیفہ بنانے کی تجویز پیش کر دی۔ چند مہاجرین بھی وہاں پہنچ گئے تھے اور بحث و تمحیص شروع ہو گئی تھی۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس موقع پر اگر ایک مرتبہ غلط فیصلہ ہو جاتا تو اس کو صحیح کرانے کے لئے خون کی ندیاں بھی بہہ جاتیں مگر اس کو صحیح کرنا ممکن نہ ہوتا۔ اس نازک مرحلے پر جیسے ہی یہ خبر ملی 'یہ دونوں حضراتؓ وہاں پہنچ گئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مبارک سنایا کہ "اَلْاَئِمَّۃُ مِنَ الْقُرَیْش" تو سارا مجمع دم بخود رہ گیا پھر حضرت ابو بکرؓ نے خلافت کے لئے حضرت عمرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ ابن الجراح کا نام تجویز کیا کہ ان دونوں میں سے کسی کو خلیفہ بنا لو لیکن حضرت عمرؓ زبان سے کچھ کہے بغیر آگے بڑھے ابو بکرؓ کا ہاتھ کھینچ کر ان سے خلافت کی بیعت کر لی۔ حضرت عمرؓ کی بیعت کے بعد انصار اور مہاجرین جو وہاں موجود

تھے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کے لئے ٹوٹ پڑے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی مومنانہ فراست کو کام میں لا کر امت کو بڑے فتنے سے بچالیا۔ مگر حضرت علیؓ کے سامنے معاملے کی پوری تفصیلات نہیں تھیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد جب ان دونوں حضرات کی تنہائی میں گفتگو ہوئی اور حضرت ابو بکرؓ نے پوری صورتِ حال حضرت علیؓ کے سامنے رکھی تو ان کا دل صاف ہو گیا۔ طبقات ابن سعد نے لکھا ہے کہ اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے ایک دن ظہر کی نماز کے بعد حضرت علیؓ کی طرف سے عذر خواہی کی اور حضرت علیؓ نے شاندار الفاظ میں حضرت ابو بکرؓ کے فضل و شرف کا اعتراف کیا اور انؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ پھر حضرت علیؓ پورے دور صدیقی میں ابو بکرؓ کے دست و بازو بنے رہے۔

حضرت ابو بکرؓ اور حضرت فاطمہؓ میں بھی شکر رنجی ہو گئی۔ حضرت فاطمہؓ اس بات کی قائل تھیں کہ وراثت میں مجھے باغ فدک ملنا چاہئے۔ حضرت ابو بکرؓ کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول تھا کہ " انا معشر الانبیاء لا نورث ماترکنا فهو صدقة لہٰذا انہوںؓ نے دخترِ رسول کی یہ خواہش پوری کرنے سے معذرت کر لی جس پر حضرت فاطمہؓ رنجیدہ خاطر ہو گئیں۔ طبقات ابن سعد میں ہے حضرت فاطمہؓ کی وفات سے قبل حضرت ابو بکرؓ نے انہیں بھی راضی کر لیا تھا۔ یہ حقائق ہیں انسانوں میں اس قسم کی باہمی رنجش کا پیدا ہو جانا کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ سورہ حجر میں ارشاد ربانی ہے کہ "ہم جب اہل ایمان کو جنت میں داخل کریں گے۔ تو ان کے دلوں میں جو رنجشیں ہوں گیں ہم انہیں نکال دیں گے۔ وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔ " حضرت علیؓ کا یہ قول ہماری تفاسیر میں موجود ہے کہ یہ آیت میرے اور معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں نازل ہوئی ہے ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے میل آ گیا ہے جنّت میں داخل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اس میل اور رنجش انؓ کی طبیعت اور ان کی سیرت و کردار کا نقشہ جو ہمارے سامنے آتا ہے وقتی رنجش یا کسی غلط فہمی کے پیدا ہونے کو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن کوئی مستقل بغض، کوئی کدورت، ایک دوسرے سے کوئی مستقل دشمنی و عداوت کا معاذ اللہ ہم کوئی تصور تک نہیں کر سکتے۔

حضرت معاویہؓ کا ایک تاثر

مولانا معین الدین ندوی مرحوم نے اپنی کتاب "خلفائے راشدینؓ" میں حضرت معاویہؓ کے دربار خلافت کا ایک عجیب واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ دربار میں حضرت معاویہؓ نے ضرار

اسدی سے کہا جو حضرت علیؓ کے حامیوں میں رہے تھے کہ حضرت علیؓ کے اوصاف بیان کرو۔ پہلے تو ضرار نے معذرت کی لیکن حضرت معاویہ کے اصرار پر وہ بولے کہ اگر اصرار ہے تو سنئے۔

"وہ (حضرت علیؓ) بلند حوصلہ اور قوی تھے' فیصلہ کن بات کہتے تھے' عادلانہ فیصلے کرتے تھے۔ انؓ کے ہر جانب علم کا چشمہ پھوٹتا تھا۔ ان کے تمام اطراف سے حکمت ٹپکتی تھی....دُنیا کی دلفریبی اور شادابی سے وحشت کرتے اور رات اور رات کی وحشت ناکی سے انس رکھتے تھے۔ بڑے رونے والے اور بہت زیادہ غور وفکر کرنے والے تھے۔ چھوٹا لباس اور موٹا جھوٹا کھانا پسند تھا۔ ہم میں بالکل ہماری طرح رہتے تھے..... جب ہم ان سے سوال کرتے تھے تو وہ ہمارا جواب دیتے تھے۔ اور جب ہم ان سے انتظار کی درخواست کرتے تھے تو وہ ہمارا انتظار کرتے تھے۔ باوجود یہ کہ اپنی خوش خلقی سے ہم کو وہ اپنے قریب کر لیتے تھے۔ وہ اور خود ہم سے قریب ہو جاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود خدا کی قسم ان کی ہیبت سے ہم ان سے گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اہل دین کی عزت کرتے تھے۔ غریبوں کو مقرب بناتے تھے۔ قوی کو اس کے باطل میں حرص و طمع کا موقع نہیں دیتے تھے۔ ان کے انصاف سے ضعیف ناامید نہیں ہوتا تھا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے ان کو بعض معرکوں میں دیکھا کہ رات گذر چکی ہے۔ ستارے ڈوب چکے ہیں اور وہ اپنی ڈاڑھی پکڑے ہوئے ایسے مضطرب ہیں جیسے مار گزیدہ مضطرب ہوتا ہے اور اس حالت میں وہ غمزدہ آدمی کی طرح رو رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے دنیا مجھ کو فریب نہ دے دوسرے کو دے۔ تو مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہے یا میری مشتاق ہوتی ہے۔ افسوس افسوس میں نے تجھ کو تین طلاقیں دے دی ہیں جس سے رجعت نہیں ہو سکتی۔ تیری عمر کم' اور تیرا مقصد حقیر ہے' آہ زاد راہ کم اور سفر دور دراز کا ہے۔ راستہ وحشت خیز ہے۔"

یہ سن کر امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رو پڑے اور فرمایا "اللہ تعالیٰ ابوالحسن (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پر رحم کرے۔ خدا کی قسم وہ ایسے ہی تھے۔"

اصحابِ رسولؐ میں حضرت علیؓ کا مقام

ہمارا عقیدہ ہے کہ صحابہ کرامؓ جنہیں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپؐ کی

تعلیم اور تزکیہ و تربیت سے براہ راست فیض یاب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی انبیاء و رسل کے بعد پوری نسل انسانی میں من حیث الجماعت افضلیت مطلقہ کے حامل ہیں۔ ان ؓ کی محبت جزو ایمان ہے 'ان ؓ کی تعظیم و توقیر دراصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر ہے اور ان سے بغض و عداوت اور ان کی تحقیر و توہین درحقیقت حضور ؐ سے بغض و عداوت اور حضور ؐ کی تحقیر و توہین ہے۔ ان کے مابین جزوی فضیلت کے بہت سے پہلو ہو سکتے ہیں لیکن متعین طور پر فضیلت کی ترتیب یہ ہے کہ تمام صحابہ ؓ میں ایک اضافی درجہ فضیلت حاصل ہے حضرات اصحاب ؓ بیعت رضوان کو۔ پھر ان ؓ پر ایک مزید درجہ فضیلت حاصل ہے حضرات اصحاب ؓ بدر کو...... پھر ان ؓ پر ایک اور درجہ فضیلت کے حامل ہیں حضرات عشرہ مبشرہ ؓ کو۔ اور ان میں فضیلت مطلقہ حاصل ہے حضرات خلفاء ؓ اربعہ کو...... پھر ان میں فضیلت ترتیب خلافت کے مطابق ہے یعنی رسول اللہ ؐ کے بعد سب سے افضل ہیں حضرت ابو بکر صدیق ؓ ' پھر درجہ ہے حضرت عمر ؓ فاروق کا۔ پھر مقام ہے حضرت عثمان ؓ غنی کا۔ اور پھر مرتبہ ہے حضرت علی ؓ مرتضیٰ کا۔

اب اگر کوئی حضرت علی پر زبان طعن دراز کرتا ہے تو سوچئے کہ اس کی زد کہاں کہاں پڑے گی۔ کیا حضرت علی ؓ کے بعد صحابہ کرام کی جماعت اس دریدہ دہنی سے محفوظ رہ سکے گی!!!

حرف آخر

یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت میں اگرچہ 'AMBIVERT' کی تمام خصوصیات موجود تھیں اور آپ ؓ اپنی ذاتی حیثیت میں خلیفہ راشد تھے لیکن آپ کے عہد خلافت میں باہمی اختلاف رہا۔ امت آپ ؓ کی خلافت پر مجتمع نہیں ہو سکی۔ باہمی خانہ جنگی رہی۔ جنگ جمل' جنگ صفین اور جنگ نہراوان جیسے خونیں معرکے ہوئے۔ اس اعتبار سے یہ تمام جماعتیں اپنے طور پر خود کو حق پر سمجھتی تھیں۔ بڑے بڑے فتنے اس دور میں کھڑے ہو گئے تھے۔ حضرت علی ؓ نے ان فتنوں پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کی لیکن سبائی فتنہ کے شجر خبیثہ کی جڑیں زمین میں اتنی گہری اتر چکی تھیں کہ انتہائی کوشش کے باوجود حضرت علی ؓ کے لئے ان پر تنہا قابو پانا ممکن نہ ہو سکا۔ اگر اس وقت مخلص با اثر اور صائب الرائے حضرات ایک بنیان مرصوص بن جاتے اور حضرت علی ؓ کی پشت پناہی کرتے تو حالات سدھر سکتے تھے۔ لیکن سبائی سازش نے غلط فہمیوں کا اتنا گھنا جنگل کھڑا کر دیا تھا کہ اس کا صاف ہونا ممکن نہ ہوا۔ اس کے نتیجے میں امت کے اندر فرقہ آرائی اور گروہ بندی کی ایک

گرہ لگ گئی ہے جونہ اس وقت کھل سکی اور نہ شاید قیامت تک کسی کے ناخن تدبیر سے کھل سکے۔ لیکن اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ اس کا کوئی الزام حضرت علیؓ کی ذات پر نہیں ہے۔ اگر کسی کا یہ خیال ہے کہ یہ انؓ کی کوتاہی تھی یا انؓ کی عدم صلاحیت تھی۔ یا اہلیت کی کمی تھی تو دراصل وہ تاریخ کو نہیں جانتا، وہ حقائق کو نہیں جانتا۔

اقول قولی ھذا و استغفر اللہ لی ولکم السائر المسلمین و المسلمات

تکملۂ بحث

مولانا سید حامد میاں مدظلہ

نفاذ شریعت کا سیدھا راستہ

شریعت بل یا فقہ حنفی ؟

موجودہ شریعت بل کی شق نمبر ۴ یہ ہے۔ "مسلمہ فقہاء اسلام کی تشریحات"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمہ فقہاء اسلام تو بہت ہیں جیسے ترمذی شریف میں جابجا سفیان ثوری 'سفیان بن عیینہ 'شعبہ ابن مبارک 'اسحاق وغیرہ کا ذکر ہے۔ ترمذی کے علاوہ اور کتابوں میں شام کے مکحول اور اوزاعی 'مصر کے لیث اور ان جیسے بیسوں اکابر امت کے اقوال و تحقیقات کا ذکر ہے ان کے علاوہ تابعین اور تبع تابعین میں ایسے حضرات کی تعداد تو بہت ہی زیادہ ہے۔ حاکم نیسا بوری نے اپنی مایہ ناز کتاب "معرفت علوم الحدیث" میں یکجا ذکر کرنے کی کوشش کی ہے حاکم (۳۲۱ پیدائش ۴۰۵ وفات) نے یہ کہہ کر کہ ان کی حدیثیں لکھی جاتی ہیں 'ان کا ذکر باعث برکت ہے اور یہ شرقاً غرباً معروف ہیں اپنی اس کتاب میں ص ۲۴۰ سے فہرست دی ہے۔ اسماء علماء مدینہ میں چودہ سطریں۔ اہل مکہ میں چھ سطریں اہل مصر پانچ سطریں اہل شام بیس سطریں اہل یمن نو سطریں اہل یمامہ دو سطریں اہل کوفہ بہتر سطریں اہل جزیرہ دس سطریں اہل بصرہ بائیس سطریں اہل واسط چار سطریں اہل خراسان انیس سطریں لکھی ہیں۔ ہر سطر میں اگر تین نام اوسطاً رکھے جائیں تو یہ ساڑھے پانچ سو کے قریب علماء بنتے ہیں۔

یہاں ذیل میں میں ایک بات کی طرف توجہ دلاتا چلوں کہ صرف کوفہ کے علماء کی ۷۲ سطریں بنتی ہیں اور پوری دنیا کے علماء کی ۱۱۱ سطریں۔ اس طرح صرف کوفہ کے علماء کی تعداد ۳۳۳ بنتی ہے یہی چیز علم حدیث 'فقہ 'اصول حدیث وفقہ اور علم قرآت کے اعتبار سے پوری دنیا میں مذہب اہل کوفہ کے غلبہ کا سبب رہی ہے۔ امام بخاری نے فرمایا ہے 'لا احصی ما دخلت الکوفہ یعنی کوفہ جتنی دفعہ گیا ہوں اس کا شمار نہیں۔ قرات راویت حفص آج تک پوری دنیا میں رائج ہے یہ کوفہ ہی کی ہے اور امام اعظم ابو حنیفہ النعمان کی بھی۔ قرات سبعہ متواترہ میں سے تین قاری صرف کوفہ کے ہیں اور قرات عشرہ متواترہ کے قاریوں میں چار صرف کوفہ کے ہیں۔ علماء کوفہ کی اسی کثرت سے ان

کا علم حدیث علم تفسیر اور علم فقہ میں تفوق و بلند رتبہ ہونا ظاہر ہو رہا ہے نیز علاوہ حدیث و فقہ کے لغت اور صرف و نحو میں علماء کوفہ اور علماء بصرہ کے مذاکرات اور آراء الگ مسلم چلی آرہی ہیں۔ اسی لئے قاموس وغیرہ کتب لغت میں بھی کوفہ کو قبتہ الاسلام لکھتے ہیں کوفہ کا اس لقب سے کتب لغت تک میں ذکر کیا جانا بڑی اہم بات ہے۔ اور صاحب قاموس تو مسلکاً بھی شافعی ہیں بس اس ذیلی بات کو نہیں ختم کرتا ہوں......اور............اب میں آپ کے سامنے یہ بات رکھنی چاہتا ہوں کہ شریعت بل کو مذکورہ شق نمبر ۴ کی رو سے جب کوئی قانون ساز کونسل ایک سرے سے تمام قوانین کا جائزہ لینا شروع کرے گی یا ترتیب و تدوین یا قانون سازی کرے گی تو وہ ان مذکورہ الصدر علماء میں سے کس کی تحقیق پر چلے گا؟ اس کونسل میں شریک ہر فرد کو اختیار ہو گا کہ وہ ان میں سے کسی بھی ایک کی مرجوح و متروک تحقیق لے لے تو متفقہ قانون کیسے بنے گا؟ ہر ایک اپنی پسند کی رائے یا دلیل کو ترجیح دے گا اور ایک مسئلہ بھی حل نہ ہو سکے گا خصوصاً اس دور میں جبکہ تقوے سے لوگ خالی ہیں اور عُجب (خود پسندی) عام ہے۔ غرض اس طرز پر کام کرنا بے سود بلکہ مضر ہو گا کیونکہ مدتوں پہلے ابتداء دور تابعین و تبع تابعین میں یہ ہو چکا ہے اور ہر مسئلہ پر بحث و تمحیص اور علمی مذاکرے ہو چکے ہیں اس کو میں حاکم کی اس کتاب میں درج ایک مثال پیش کر کے واضح کرنا چاہتا ہوں۔

عبدالوارث بن سعید مکہ مکرمہ پہنچے تو انہیں خرید و فروخت کے معاملات میں ایک مسئلہ پیش آگیا وہاں ابو حنیفہؒ، ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہؒ آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے پہلے تو ابو حنیفہؒ سے رجوع کیا کہ ایک شخص نے کوئی چیز فروخت کی اور ساتھ ہی شرط بھی لگا دی (مثلاً کسی نے قلم بیچا لیکن بیع کے منافی یہ شرط لگا دی کہ جب مجھے ضرورت ہو گی تو میں استعمال کروں گا) امام ابو حنیفہؒ نے جواب دیا کہ بیع بھی باطل ہے اور شرط بھی باطل ہے۔

عبدالوارث کہتے ہیں کہ پھر میں ابن ابی لیلیٰؒ کے پاس گیا ان سے یہی مسئلہ پوچھا انہوں نے جواب دیا کہ بیع (سودا) جائز ہے اور شرط باطل ہے، پھر میں ابن شبرمہؒ کے پاس گیا ان سے یہی مسئلہ دریافت کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے۔ میں نے کہا کہ سبحان اللہ آپ عراق کے تین فقیہہ ہیں اور ایک ہی مسئلہ میں آپس میں اتنا اختلاف! تو میں ابو حنیفہؒ کے پاس گیا انہیں یہ بات سنائی۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ ان دونوں نے کیا جواب دیا لیکن۔

حدثنی عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن بیع و شرط۔

مجھے عمرو بن شعیب نے اپنے والد سے انہوں نے اپنے دادا سے یہ روایت بیان کی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع اور شرط سے منع فرمایا ہے۔

لہٰذا بیع بھی باطل اور شرط بھی باطل۔

پھر میں ابن ابی لیلیٰؒ کے پاس گیا انہیں میں نے یہ بتلایا تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھے نہیں پتہ کہ دونوں نے کیا کہا لیکن :

حدثنی ھشام بن عروۃ عن ابیہ عن عائشہ قالت امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اشتری بریرۃ فاعتقھا۔	مجھے ہشام بن عروہ نے اپنے والد سے اور انہوں نے حضرت عائشہؓ سے یہ روایت سنائی ہے کہ مجھے جناب رسول اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ میں بریرہؓ کو خرید کر آزاد

کر دوں (باوجودیکہ ان کے مالک نے بیع کے منافی ایک شرط لگائی تھی)

لہٰذا بیع تو جائز ہے اور شرط باطل ہے۔

پھر میں ابن شبرمہؒ کے پاس گیا انہیں ساری بات سنائی انہوں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ ان دونوں نے کیا کہا ہے لیکن :

حدثنی مسعر بن کدام عن محارب بن دثار عن جابر قال بعت من النبی صلی اللہ علیہ وسلم ناقۃ و شرط لی حملانھا الی المدینہ۔	مجھے مسعر بن کدام نے محارب بن دثار سے انہوں نے حضرت جابرؓ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ میں نے (سفر میں) جناب رسول اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اونٹنی فروخت

کی تھی اور آپ نے اس پر مدینہ منورہ تک سفر کی شرط منظور فرمائی تھی۔

لہٰذا بیع بھی جائز اور شرط بھی جائز ہے۔ معرفۃ علوم الحدیث ص۔ ۱۲۸

اسی طرح ایک اور مثال بھی ملاحظہ فرمالیں۔ جو بخاری شریف سے نقل کر رہا ہوں۔ یہی ابن شبرمہؒ (قاضی کوفہ) فرماتے ہیں کہ مجھ سے ابو الزنادؒ (قاضی مدینہ منورہ و استاد امام مالکؒ) نے اس مسئلہ میں گفتگو کی کہ مدعی کے پاس ایک ہی گواہ ہو تو اس سے دوسرے گواہ کے نہ ملنے کی صورت میں بجائے گواہ کے قسم کھلوالی جائے (اور یہی ان کا اور اہل مدینہ کا مسلک تھا) میں نے انہیں جواب دیا کہ قرآن پاک میں مدعی کے پاس دو گواہ نہ ہونے کی صورت میں یہ حکم ہے کہ پھر دو عورتیں ہوں۔ اور طویل عبارت اختیار فرمائی گئی

فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى

(سورہ بقرہ آیت ۲۸۲)

(اگر ایک گواہ اور مدعی کی قسم کافی ہو سکتے تو قرآن پاک میں مختصر کلمات میں ارشاد ہوتا فَرَجُلٌ وَيَمِينٌ)

(بخاری ص۳۶۶ ج۱)

غرض اس طرح علماء بلاد تک میں بھی سب مسائل پر گفتگو ہو چکی ہے اب اگر کوئی کمیٹی یا بورڈ یہی کام شروع کرے گا تو تیرہ سو سال پیچھے لوٹنے کے مترادف ہو گا اور کم علمی اور تقویٰ کے فقدان کی وجہ سے دین کا کھیل بنانا ہو گا خیر القرون میں مذکورہ بالا طریق پر نہایت بے نفسی کے ساتھ قرآن پاک اور احادیث کی روشنی میں علماء میں بہت بحث و تمحیص ہوتی رہی ہے۔ بہت سے مسائل ایسے تھے کہ جن میں ایک شہر کے علماء کا ایک موقف تھا اور دوسرے شہر کے علماء کا دوسرا موقف تھا۔ مثلاً وہ مسائل کہ جن میں علماء مدینہ اور علماء کوفہ کا اختلاف تھا (کیونکہ رفتہ رفتہ ایک ایک شہر کے علماء آپس میں گفتگو کر کے ایک ایک موقف پر متفق ہوتے چلے گئے تھے امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں اس قسم کا ایک مستقل باب رکھا ہے جس کا عنوان ہے ما اجمع علیہ الحرمان) چنانچہ ایسے مسائل پر اہم بحثیں کتابوں کی شکل میں آئیں آئمہ حدیث و فقہ نے یہ کتابیں لکھیں امام محمدؒ نے " کتاب الحجۃ علی اھل المدینہ " لکھی پھر امام شافعیؒ نے "کتاب الام " لکھی پھر بعد کے دور میں امام بیہقیؒ نے امام شافعیؒ کی تائید میں " سنن کبریٰ" لکھی تو اس پر امام ابن الترکمانی نے " الجو ھر النقی " لکھی۔ " الجو ھر النقی " ۔ بیہقی پر ایسی چسپاں ہوئی کہ آج تک اس کے ساتھ مستقلاً لگی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ اب اس سمیت طبع ہوتی ہے۔ امام ابو یوسف نے " اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰؒ " اپنے دونوں استادوں کے اختلاف پر لکھی (۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمد تبع تابعین میں ہیں) ۔ امام ابو یوسفؒ کی یہ تصنیف اس قسم کے انداز کی پہلی معروف تصنیف ہے پھر امام طحاویؒ نے صحابہ کرام تابعین اور مجتہدین کے اختلاف پر مفصل کتاب لکھی۔ ابن ندیم نے لکھا ہے کہ میں نے ان کی اس تصنیف کے اسی اجزاء دیکھے ہیں۔ ان کے بعد اس موضوع پر ابن منذر اور ابن نصر نے کتابیں لکھیں پھر امام ابن جریرؒ طبری نے ایک ضخیم کتاب لکھی۔ یہ کام دوسری اور تیسری صدی میں ہوا۔ پھر اس کے بعد ابن عبد البرؒ مالکی نے اس موضوع پر لکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری دنیا صرف چار مسلکوں پر قائم رہ گئی بلکہ صرف تین پر آ گئی پھر چوتھی صدی میں حنبلی مسلک بھی نمایاں ہونا شروع ہوا۔ یہ اختلاف اہل تقویٰ کا تھا اس لئے چیدہ چیدہ سینکڑوں علماء کی ایک ایک بات پر گفتگو نتیجہ خیز رہی اور دنیائے اسلام سینکڑوں مسالک سے ہٹ کر صرف چار پر آ گئی۔ اس وقت سے لے کر ایک ہزار سے زیادہ سال تک اسلامی حکومتیں ان ہی قوانین پر چلتی رہیں۔ اور چونکہ اس طویل ترین دور میں علم اور قانونی فیصلے اور فتوے سب شرعی ہوتے رہے اور علم ہی علم دین کو کہا جاتا تھا اس لئے بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فقط حنفی مسلک ہی کی ایک ایک بات کی تائید آج تک ایک کروڑ علماء

ورنہ لاکھوں علماء کرتے آئے ہیں کروڑوں علماء واولیاء اور اربوں مسلمان اس پر عمل پیرا رہے ہیں اور حکومتیں چلتی رہی ہیں لہٰذا آج فقہ حنفی اور اس پر مبنی قانون وہ ہے جسے امت مسلمہ کی اتنی بڑی تعداد کی تائید حاصل ہے۔ آپ حضرات کی یعنی شریعت بل کی مذکورہ شق لانے والوں کی خواہش یہ ہے کہ وہ ذخیرہ تو ایک طرف لپیٹ کر رکھ دیا جائے اور یہ بورڈ جو آج کی نفس پرست حکومت اپنے دل پسند علماء پر مشتمل کر کے بنا دے دین کے تمام معاملات میں سیاہ وسفید کی مالک بن بیٹھے اور از سر نو ابو حنیفہ ' ابن ابی لیلیٰ ' ابن شبرمہ ' ابن ابی الزناد ' رحمہم اللہ کے دور کی طرح ہر مسئلہ کو ادھیڑ کر بساط سخن دراز کی جائے اور سرکاری علماء کے بورڈ کو مختار کل اور شرعی مقدس امور کا منبع قرار دیا جائے۔ یہ کہاں کی دیانت و عقل مندی ہوگی اور کوئی مسلمان جس کا آخرت پر ایمان ہو گا اسے کیسے تسلیم کرے گا۔ دین میں یہ ڈرامہ اور مسخرہ پن نہ چل سکے گا۔ رجم زناء کی حد ہے یا نہیں عورت کی شہادت ' عورت کی دیت پر ہر خود پسند ہمہ دانی کا دعویٰ کر کے قلم کی جولانی دکھائی شرعی مسائل پر اسی طرح کا تماشا پھر لگے گا عجب رقص شتر کا منظر سامنے آئے گا اتنا شور مچے گا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے گی۔

● ممکن ہے شریعت بل والوں کے ذہن میں یہ ہو کہ ہم چاروں اماموں میں سے جس کے بھی مسلک میں آسانی نظر آئے گی اختیار کر لیں گے۔ چاروں کی فقہوں کو سامنے رکھ کر ان میں سے آسان چیزیں لے کر جدید فقہ تیار کر لیں گے۔ لیکن ایسا کرنا سب آئمہ کے متبعین کے نزدیک جائز نہیں ہے علماء نے اس کا نام تلفیق رکھا ہے۔ یہ ممنوع ہے۔ اگر آپ لوگوں کی خواہش یہ ہے تو اسے اتباع حق نہیں کہا جائے گا اسے اتباع ہوا کہا جائے گا اہل اہواء بدعتی شمار کئے گئے ہیں۔ آپ اس باطل اور غلط بنیاد پر جو عمارت بنائیں گے وہ غلط ہوگی۔ اسے وہی علماء صحیح کہہ سکیں گے جو دین کو دنیا کے عوض بیچنے پر راضی ہوں۔

● اگر مسلمانوں کو یہ سبز باغ دکھایا جائے کہ اس طرح کی شریعت آج کے تقاضوں پر پوری اتر سکے گی تو یہ بھی خام خیالی سے زیادہ کچھ نہیں کیونکہ مسالک تو چاروں ہی پرانے ہیں۔ اگر نئے دور تک کوئی مسلک حاوی ہو سکتا ہے تو وہ حنفی ہی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب دین سے بھاگنے کی صورتیں ہیں نہ کہ دین پر عمل کی۔ اس طرح کی تدابیر سے جو معرض وجود میں آئے گا وہ چھوٹا دین اکبری ہو گا سود اور جوا جائز قرار دیا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

● آج کل حامیان شریعت بل یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ علماء کے بائیس نکات دین کے نفاذ کے لئے کافی ہیں (اور بعض لوگ تو حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا انگریز کافر کے دور کا ۱۹۳۵ء کا فتویٰ بھی اس اپنے ناقص شریعت بل کے لئے مسلمان ملک میں دلیل کے طور پر اٹھا کر لے آئے ہیں

لا حول و لا قوۃ الا باللہ) اور ابھی میں یہ مضمون لکھ ہی رہا تھا کہ مئی کا میثاق موصول ہوا اس میں بھی عجیب باتیں لکھی ہیں۔

اس میں مقبول الرحیم مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ الہندؒ سے لے کر اب تک ہماری جمعیت نے نفاذ فقہ حنفی کو اپنا موقف نہیں بنایا علامہ عثمانیؒ نے بائیس نکات کو موقف ٹھرایا تھا انہوں نے فقہ حنفی کو موقف نہیں بنایا تو آپ لوگ کیوں اسے اپنا موقف بنا رہے ہیں۔ لیکن یہ دلیل بے وزن ہے اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ علامہ عثمانیؒ نے بائیس نکات کو کیوں موقف بنایا تھا جبکہ ان کے اسلاف نے بائیس نکات کی کبھی بات نہیں کی تھی اصل بات تو یہ ہے کہ علامہ عثمانیؒ نے یہ تمہید کی تھی یہ نکات شریعت کے نفاذ کے لئے ہی تجویز کئے تھے اور نفاذ قانون شریعت اس کے سوا کسی صورت نہیں ہو سکتا کہ عدلیہ مرتب کو شرعی احکام کے تراجم مہیا کر دیئے جائیں اور مرتب شدہ احکام فقہ کے سوا اور ہیں ہی کہاں اس لئے آج کی صورت حال میں فقہ حنفی کے نفاذ کا انکار شریعت کے نفاذ کے مترادف ہے۔

نیز یہ بھی غور کریں کہ علامہ عثمانیؒ جن کی ساری زندگی قرآن و حدیث کی خدمت میں گذری پاکستان بننے کے بعد اپنے دینی جذبات بروئے کار نہیں لاسکے اس عظیم صدمہ پر ان کے آنسو بہتے دیکھنے والے تو آج تک زندہ ہیں۔ اگرچہ مولانا عرض محمدؒ مولانا عبدالواحد صاحبؒ ' خطیب گوجرانوالہ کی وفات ہو گئی جو ان کے براہ راست شاگرد تھے مگر مولانا عبدالواحد صاحب مدظلہٗ کی طرح ان حضرات کے ساتھ والے علماء بفضلہٖ تعالیٰ موجود ہیں۔ غرض علماء کی خواہش و امنگ اور اجڑ کر آنے والے تباہ حال مسلمان عوام کی دلی تمنا تو یہ تھی کہ پاکستان میں اسلامی قوانین ہوں گے لیکن خواص کے افکار اور ہی تھے مذہب سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا چنانچہ آزادی کے بعد جو حکومتی ڈھانچہ معرض وجود میں آیا وہ سیکولر یا لامذہب حکومت کا تھا چیف جسٹس کارنیلیس (عیسائی) وزیر قانون جوگندر ناتھ منڈل (ہندو) وزیر خارجہ ظفر اللہ خاں (قادیانی) افواج کے سب سربراہ انگریز (عیسائی یا لامذہب) جنرل میسروی ' جنرل گریسی ' فضائیہ کے آرا یچرے۔ بحریہ کے ریئر ایڈمرل جیفورڈ (سب انگریز) پنجاب کا گورنر انگریز سر فرانس موڈی مشرقی پاکستان کا انگریز گورنر فریڈ راک بورن صوبہ سرحد میں کنگھم اور ڈنڈاس (انگریز اور عیسائی) گورنر رہے۔ علامہ کا تو یہ حال ہوا کہ ع

بس خون ٹپک پڑا نگہ انتظار سے

بالآخر کچھ تبدیلی آئی لیاقت علی خاں کے دور میں مولانا کا کچھ بس چلا تو شیرازہ جمع کیا اور علماء کو ۲۲ نکات پر متفق کیا۔ اسکے کچھ ہی عرصہ بعد ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو علامہ صاحب وفات پا گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ اگر وہ زندہ رہتے تو قانون اسلامی کے نفاذ کے لئے اس کے سوا وہ اور کیا کرتے کہ قانون کے لئے حنفی

کتب کا ترجمہ کرانے اور عدلیہ کو اس پر چلانے کی کوشش کرتے قابل عمل شکل ہی یہ ہے بس جو ان کا اگلا قدم ہو تا وہ ہم اٹھا رہے ہیں۔ نیز ان ۲۲ نکات میں اور نفاذ فقہ حنفی و فقہ جعفری اور غیر مقلدوں کے لئے ان کے عالم کو ان کا جج مان لینے میں تعارض کیا ہے بلکہ آپ کا اس اگلے قدم سے روکنا نفاذ اسلام کو روکنا ہے بلکہ بالفاظ دیگر ۲۲ نکات سے انحراف بھی۔ مینار پاکستان پر یہ اعلان تو اب ہوا ہے میں تو ذاتی طور پر اس کے لئے ۷۷ء سے کوشاں ہوں۔ حضرت مفتی محمود صاحبؒ سے عرض کرتا رہا ہوں۔

میثاق کے اسی پرچہ میں مقبول الرحیم صاحب مفتی نے ڈاکٹر اسرار صاحب کے ۳ر اپریل کے جمعہ کے خطاب کے یہ جملے نقل کئے ہیں۔

> "قرآن و سنت سے براہ راست استنباط کرتے ہوئے آج کے مسائل کا حل تلاش کرنا بھی اسی طرح درست ہے، جس طرح کسی فقہی مسلک کی فقہ کو نافذ کرنا درست ہے"۔

اگر ڈاکٹر صاحب کے سامنے آج کے حالات میں ایسے حل طلب مسائل ہیں کو جن کا حل فقہ میں موجود نہیں تو وہ ان کی نشاندہی کریں جا بجا مدارس میں علماء اور مفتی حضرات موجود ہیں ان سے رجوع فرمائیں مجھے بھی بتلائیں اور اگر خدانخواستہ ڈاکٹر صاحب کا مقصد یہ ہے کہ فقہ حنفی کے نفاذ کا نام نہ لیا جائے اور ہر مسئلہ میں چاہے وہ پہلے سے حل شدہ موجود ہو۔ اب بلاوجہ بھی اجتہاد کی اجازت کو عام کیا جائے تو یہ غلط ہے اور ضلالت ہے میں اس کا شدید مخالف ہوں یہ دین کے لئے سم قاتل ہے۔ یہ انداز فکر اور سوچ بر خود غلط لوگوں ہی کی ہو سکتی ہے۔

دار العلوم دیوبند میں مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ ہی کے حل کردہ ۳۶ ہزار فتوے ہیں۔ یہ دار العلوم کے پہلے مفتی تھے ان کے بعد سے اب تک کی تعداد معلوم نہیں مولانا مفتی محمود صاحب کے حل کردہ مسائل کے تیس کے قریب رجسٹر قاسم العلوم ملتان میں موجود ہیں۔ ان سب کارناموں پر انگریزی قانون نے پردہ ڈال رکھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جو بات کی ہے وہ اپنے اردگرد لوگوں سے متاثر ہو کر کی ہوگی۔ بہرحال اس سے انہیں رجوع کرنا لازم ہے۔ اگرچہ وہ غیر مسدد غیر مقلد ہیں مگر میری مذکورہ بالا تشریح پر غور کرنا چاہئے۔ وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ

XXXXXXXX

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝

(الفرقان : ۷۴)

اے ہمارے رب

ہمیں ہماری اولاد اور بیویوں (کی طرف) سے

آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما

اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا دے

□ □ □ □

میاں عبدالواحد

بھگوان سٹریٹ، پرانی انارکلی لاہور

یادِ رفتگاں

"اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے"

مولانا محمد حنیف ندوی

_____ مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

احقر ۱۹۷۴ء میں لاہور منتقل ہوا، وہ دن اور آج کا دن، اس شہر نے کمبل کی طرح مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لاہور آنے کا بنیادی سبب تو میرے مخدوم و محترم مولانا عبیداللہ انورؒ بنے جن کی خواہش کے احترام نے مجھے اس شہر کا باسی بننے پر مجبور کیا اور میں اپنے والد بزرگوار سے اجازت لے کر یہاں چلا آیا۔ مولانا کی خدمت میں دس برس کی کامل حاضری رہی، انہوں نے محبت و پیار اور شفقت و مروت کے وہ جام پلائے کہ آج ان کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد بھی ان کا کیف میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ فیاحسرتا کہ بعض بونے لوگوں نے آخری دنوں ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ میں ظاہری طور پر ان سے جدا ہو گیا گو کہ میری روح اور میرے قلب کا رشتہ عقیدت الحمدللہ ان سے برابر قائم رہا۔

ان کے بعد اس شہر کی جن علمی، دینی اور روحانی شخصیتوں نے مجھے بے حد متاثر کیا ان میں ایک مولانا محمد حنیف ندوی مرحوم تھے جو جولائی ۱۹۸۷ء کی ایک ایسی تاریخ کو دنیا سے رخصت ہو گئے کہ میں لاہور سے بہت دور اس حرماں نصیب شہر میں تھا، جس کا نام کراچی ہے اور جو ایک عرصہ سے بربادی کے جہنم میں جل رہا ہے۔

اپنے مرحوم دوست نعمت اللہ قادری شہید کے دولت کدے پر وحید آباد میں صبح کی نماز کے بعد ایک اخبار کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایک مختصر سی خبر نظر سے گزری، جو مولانا کی وفات کے متعلق تھی۔ دل پکڑ کر بیٹھ گیا، میرے وسائل ایسے نہ تھے کہ جہاز کا مہنگا سفر اختیار کر کے لاہور پہنچتا اور اپنے مخدوم و محترم بزرگ کا آخری دیدار کر سکتا۔ مزید دکھ اس بات کا ہوا کہ ایک ایسا شخص جس نے لاہور جیسے قطب البلاد اور علمی و ادبی شہر میں نصف صدی سے زائد عرصہ بھرپور زندگی گزار کر اس جہان سے منہ موڑا وہ دو معذور بچوں کو چھوڑ کر رخصت ہوا، اس کا جنازہ کرایہ کے مکان سے اٹھا اور وہ کوئی ایسا اثاثہ چھوڑ کر نہیں مرا کہ اس کے ستم رسیدہ اہل خانہ اس سے کچھ استفادہ کر سکیں۔ قومی اخبارات نے اس کی موت

کی خبر کے لئے اپنے اخبار کی ایک آدھ سطر وقف کرنا گوارا کرلی ...... یہ بھی احسان ہے ورنہ تو مادام نور جہاں صاحبہ کے لئے جلی سرخیاں لگائی گئیں کہ وہ بم کے دھماکہ والے دن بوہری بازار میں ہی تھیں ...... بڑا کرم ہوا کہ وہ بچ گئیں ورنہ اس قوم کو یتیمی کا داغ برداشت کرنا پڑتا کہ ان کی "ملکہ" رخصت ہوجاتی۔

میں اپنے دو عزیزوں حافظ محمد معاویہ اور قمرالحق سمیت تھوڑی دیر قبل صدر کراچی کے علاقہ سے نکل کر پرانی نمائش پرواقع ہفت روزہ "ختم نبوت" کے دفتر سے ہوتا، گورو مندر کی مسجد میں پہنچا۔

______ محب گرامی مولانا محمد طیب

کاشمیری کے یہاں نماز عصر ادا کی، چائے کی پیالیاں ہاتھ میں تھیں کہ دھماکے کی آواز آئی، زیادہ توجہ نہ ہوئی۔ وہاں سے نکل کر حضرت الشیخ مولانا محمد یوسف بنوری کے مزار پر حاضری دے کر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتابوں کے پاکستانی ناشر برادر گرامی مولانا فضل ربی کے پاس پہنچے۔ ان کی معیّت میں پھر مغرب و عشا کی نمازیں یوسفی مسجد چورنگی ناظم آباد کے پیش امام محترم سعید بخاری صاحب کے پاس پڑھیں جو درویش منش انسان ہیں۔ ان کے ساتھ پھر صدر کے علاقہ میں جاکر اس قیامت کے سماں کو دیکھا۔ پریشانی کا ایک عالم تھا، چار سو شورِ محشر، ہم سوچ رہے تھے کہ انسانیت کے علمبردار دنیا سے کہاں رخصت ہوگئے، ایسی درندگی ایسی وحشت و بربریت ... ستم یہ ہے کہ تڑپتی لاشوں کی موجودگی میں بھی بعض بدبخت دکانوں اور مکانوں سے سامان لوٹنے میں مصروف تھے ... اگلے دنوں میں صوبے اور مرکز کے حاکموں کے لمبے چوڑے بیانات آئے جو ایک رسم ہے، پچھلے المناک حادثات کی طرح یہ حادثہ بھی گزر گیا کسی حاکم کے کان پر جوں تک نہ رینگی کہ شرم تو اہل شرم کے لئے ہے۔ اسی ماحول اور کشمکش میں کراچی کے دو محترم بزرگوں مولانا محمد طاسین اور ڈاکٹر ابو سلمان صاحب سے مولانا ندوی کے تذکرے ہوتے رہے اور ہم بادیدہ نم واپس آگئے۔

مولانا کی زندگی پر لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا بعض دوستوں نے خواہش بھی ظاہر کی، سوچا میرے جیسا کم علم کیا لکھے گا۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا علم و معرفت کی دنیا کے عظیم انسان تھے، قدرت نے انہیں بے پناہ صلاحیتوں اور خوبیوں سے مزین کرکے اس دنیا میں بھیجا، وہ انسانیت کی اعلیٰ ترین اقدار کے حامل تھے، ان کا آئینۂ قلب صاف تھا، وہ مومنوں والی زندگی جئے اور اس انداز سے دنیا سے رخصت ہوگئے کہ رہے نام سدا اللہ کا۔

لیکن مجھے یقین ہے کہ اس مادیّت گزیدہ دنیا کے شریف لوگ حنیف ندوی کو خوب یاد رکھیں گے اور ان کے علمی کارناموں سے برابر استفادہ کرتے رہیں گے۔

......

کلب روڈ پر واقع ادارہ ثقافت اسلامیہ اور مولانا کے گھر کے علاوہ بھی بہت سے مقامات پر ان کی مجالس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ کئی مرتبہ میری مسجد میں بھی تشریف لائے ایک آدھ مرتبہ میری اقتدا میں جمعہ کی نماز بھی ادا کی اور اپنی عظمت و محبت کے پیش نظر تقریر کی تعریف فرمائی۔ اس کے علاوہ چند مرتبہ لاہور کے معروف طبیب محترم حکیم محمد شریف گجرانوی کے دولت کدہ پر مجلسیں رہیں، جہاں بطور خاص ڈاکٹر رشید احمد جالندھری جیسے درویش منش عالم باعمل بھی موجود ہوتے ... ان مجالس میں علم و دانش کے کتنے موتی ہمارے دامن نے سمیٹے، کیسے کیسے لطائف ان بزرگوں کی زبان سے سنے اخلاص و مروّت کے کتنے سبق ملے.... آہ کہ یہ باتیں یاد آتی ہیں تو دل سی پارہ ہو کر رہ جاتا ہے کہ ایسے پراگندہ طبع لوگ اب دنیا میں لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

.....

اپنے محترم دوست محمد اسحٰق بھٹی صاحب کی رفاقت میں تو مولانا مرحوم سے لاتعداد ملاقاتیں ہوئیں جن کی داستان لکھنا میرے بس میں نہیں شاید بھٹی صاحب ہمت کر سکیں۔

ایک موقعہ پر بھٹی صاحب نے مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیا اور کہا کہ مولانا کی تعلیمی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کی غرض سے ایک محفل کا انعقاد ہونے والا ہے جس کا مہمان خصوصی اس وقت کے وزیر تعلیم ڈاکٹر محمد افضل کو ہونا تھا۔ میرے لئے حکم یہ تھا کہ مولانا کی "تفسیرِ قرآن" پر مضمون لکھوں۔ جس میں ضمناً دوسری کتابوں کا تذکرہ بھی آ جائے۔ احقر نے مولانا کی تفسیر کا سنا تو تعجب ہوا، پوچھا وہ کہاں ہے؟ تو کہا کہ میرے پاس تو نہیں، وہیں قریب بیٹھے مولانا سے پوچھا تو فرمایا میرے پاس نہیں، اب شہر بھر کی لائبریریوں کی خاک چھانی، بعض افراد سے پوچھا، ہر جگہ جواب نفی میں، آخر پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے چند پارے میسر آئے، وہاں سے معلوم ہوا کہ لاہور کی قدیم فرم ملک سراج الدین نے اسے چھاپا تھا ملک صاحب کے فرزند ملک عبدالرؤف صاحب سے رابطہ ہوا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ملک صاحب اسی تفسیر کے پانچ لے کر ان کی اصلاح اور بار دگر اشاعت کے نظم میں مشغول تھے..... انہوں نے معلومات فراہم کیں بعض پارے مستعار دیئے

جن کی کوشش سے میں نے وہ مضمون مکمل کیا جو بعض دانشوروں کی عادت "ضیاع وقت" کے سبب اس مجلس میں پڑھا نہ جا سکا۔ تاہم اب ادارہ کے پرچہ "المعارف" میں طویل انتظار کے بعد اس عرض چھپا ہے کہ بس چھپ گیا ہے وہ مضمون تو المعارف میں آپ پڑھ لیں، مختصراً اتنا سمجھ لیں کہ مولانا کی وہ تفسیر یا تفسیری نوٹس ایسے ہیں، جن سے ان کے علم کی گہرائی، ذوقِ قرآن فہمی اور قلم پر گرفت کا اندازہ ہوتا ہے...... وہ لوگ جو مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کے نامکمل رہنے کا ماتم کرتے ہیں ان کے لئے یہ نسخۂ شفا ہے اور قرآن کے الفاظ میں فَاِنْ لَّمْ یُصِبْھَا وَابِلٌ فَطَلٌّ کا مصداق!

ملک عبدالرؤف صاحب جلد سے جلد اس کو شائع کرنے کا عزم رکھتے تھے، انہوں نے احقر سے فرمائش کر کے ایک مقدمہ نما تحریر بھی لکھوائی، لیکن افسوس کہ بعض حوادث کے سبب مولانا کی زندگی میں یہ کام ممکن نہ ہو سکا ابھی سفرِ کراچی سے واپسی پر میں نے انہیں فون کیا تو بہت افسوس کرنے لگے اور اس عزم کا اظہار کیا کہ اب تاخیر نہ ہوگی تاکہ جلد سے جلد مولانا کی روح کی خوشی کا سامان فراہم ہو سکے۔

اس تفسیر میں مولانا نے جتنے جامع نوٹ لکھے ہیں، وہ انہیں کا حصہ تھا، دراصل وہ قرآن کے بہت عظیم طالبِ علم تھے، لاہور کے بھرپور علمی دور میں اسلامیہ کالج کی مسجد میں ان کے خطبۂ جمعہ درس قرآن کے عینی گواہ آج بھی موجود ہیں، جو مزے لے لے کر ان کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔

درس قرآن کے حوالہ سے میں نے اب تک لاہور کے گلی کوچوں میں پرانے بزرگوں کے حوالے سے تین حضرات کا نام ہر جگہ سنا اور بڑے احترام سے، ایک مولانا احمد علی لاہوری، دوسرے مولانا غلام مرشد تیسرے مولانا ندوی کا!

قرآن کے ساتھ حدیث کے ذخیرے پر بھی ان کی نظر گہری تھی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی عقیدت میں ان کی روح ڈوبی ہوئی تھی۔

فلسفہ و کلام جیسے مشکل اور پیچیدہ موضوعات ان کے سامنے ہاتھ باندھے نظر آتے تو فقہ و تصوّف کے متضاد دھاروں کو جوڑنے کا انہیں خوب فن آتا تھا۔ اپنے وقت کے بہترین اساتذہ کے ہاتھوں میں اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ جیسے مثالی مدرسے میں ان کی تعلیم و تربیت مکمل ہوئی۔

پھر انہوں نے جدید فلسفے کو سمجھا اور اس کو پی گئے مگر ڈکار نہ لی۔ جدید ذہن کی الجھنوں کو سمجھا نفسیات کو جانا اور ان سب چیزوں کے بعد وہ اس مقام پر نظر آئے کہ قدیم و جدید دنیا کے شہسوار ان

کو سلام کرنے لگے اور ان سے کسبِ فیض کرنے میں فخر محسوس کرتے۔

مولانا نے جمعیت اہل حدیث کے مثالی و معیاری دور میں ہفت روزہ "الاعتصام" کی ادارت کا فرض سرانجام دیا۔ اس زمانہ میں ان کے قلم سے جہاں وقتی مسائل پر عظیم نوٹ نکلتے وہاں بعض ایسے مضامین بالاقساط انہوں نے لکھے کہ انہیں پڑھ کر روح کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے۔ ایسے مقالات میں دو مقالے میرے علم میں ہیں۔ ایک تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر ہے جس کا عنوان ہے "چہرہ نبوت قرآن کے آئینہ میں" مولانا ابوالکلام آزاد کی خواہش تھی کہ قرآن کی روشنی میں سیرتِ رسولؐ لکھی جائے ..... کچھ کام ہوا بھی جسے مولانا غلام رسول مہر نے مکمل کر کے "رسولِ رحمت" کے نام سے چھاپا' مولانا آزاد کے سیکرٹری اجمل صاحب کی اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب احقر کے ہی توجہ دلانے سے ایک عزیز چھاپ رہے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی اس موضوع پر تقاریر کا ایک سلسلہ چھپا ہے' مولانا ندوی نے ۵۰ سے زائد اقساط اس پر لکھیں' اللہ کرے کہ وہ جلد کتابی شکل میں چھپ جائیں تو ان لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں گی جو اپنی روایتی بدمستیو ں سے مولانا جیسے لوگوں کا ایمان تولنے کی جسارت کرتے اور ان کے جذبہ حب رسول کی نفی کرتے ہیں۔

ایک دوسرا مقالہ حضور اقدس ہی کی ختم نبوت پر تھا..... یعنی "ختم نبوت نئے زاویوں سے" سبحان اللہ' کیا مقالہ ہے اس کا ایک ایک نقطہ سچائی کا مظہر ہے اور اس سے جہاں اس کلیدی مسئلہ پر بھرپور روشنی پڑتی ہے وہاں جدید فلسفے کا مارا ہوا انسان ایک لذت و خوشی محسوس کرتا ہے۔ مولانا کی زندگی میں یہ مقالہ ایک مرتبہ کتابی شکل میں چھپا' جو اب بازار میں نہیں ہے۔ مولانا نے اپنا ذاتی نسخہ خصوصی عنایت سے اس احقر کو عنایت فرمایا لیکن میں نے مناسب یہ سمجھا کہ اس کی فوٹو کاپی لے کر اصل مولانا کو واپس کر دوں چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا وہ کاپی میرے پاس محفوظ ہے۔

مولانا کی تصنیفی اور تالیفی زندگی کی داستان بہت طویل ہے' انہیں قرآن و حدیث سے جو دلچسپی تھی وہ روز روشن کی طرح واضح ہے ان کے بعد ان کی دلچسپیوں کا مرکز حجتہ الاسلام امام غزالی کی ذات گرامی تھی' غزالی" کے حوالہ سے ان کی کتابیں اہل علم میں جتنی مقبول ہیں اس کا اندازہ اس سے ممکن ہے کہ چند سال قبل شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی ۔ اللہ تعالیٰ کے فرزند گرامی مولانا سید اسعد لاہور تشریف لائے تو انہوں نے مولانا کی کتابوں سے متعلق گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور اس خواہش کا شدت

سے ذکر کیا کہ وہ کتابیں مجھے فراہم کی جائیں۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ ان دنوں وہ کتابیں ساری کی ساری یا اکثر خود اس ادارہ میں موجود نہ تھیں جو انہیں شائع کرنے والا تھا۔ مولانا کے میزبانوں نے جیسے کیسے وہ کتابیں فراہم کیں تو مولانا اسعد کی خوشی دیدنی تھی' انہوں نے ان کی بہت تعریف کی۔ غالباً اس سے قبل وہ ان کا مطالعہ کر چکے تھے۔

ایک عرصہ کے بعد مولانا ندوی کی مجلس میں اس واقعہ کا کسی نسبت سے ذکر آیا تو انہوں نے کسی قسم کے بے جا فخر و تعلی کا اظہار کرنے کے بجائے اپنے خالق و مالک کا شکریہ ادا کیا جس نے اپنے صالح بندوں میں ان کتابوں کو مقبول بنایا۔ ہاں اتنا ضروری فرمایا کہ مولانا کی اس خواہش کو مجھ تک پہنچایا جاتا تو میں بصد خوشی اپنے نسخے انہیں پیش کر دیتا کہ دور کے مہمان' اتنے بڑے باپ کے بیٹے اور خود بھی صاحب علم و فضل انسان کا ہم پر بڑا حق ہے۔

امام غزالی کے علاوہ شیخ ابن تیمیہ' فیلسوفِ ہند شاہ ولی اللہ' امام ابوالحسن اشعری جیسے اکابر امت ان کی عقیدتوں کا مرکز تھے اور انہیں کی نسبت سے مولانا نے نہایت بیش قیمت علمی جواہر پارے مرتب کر کے اس امت کی بہتری کا سامان فراہم کیا۔

شرق پور ضلع شیخوپورہ کا ایک معروف قصبہ ہے وہاں کے قابل احترام بزرگ حضرت میاں شیر محمد صاحب نقشبندی مجدّدی کی زیارت و ملاقات کو مولانا سید انور شاہ کاشمیری مولانا احمد علی لاہوری اور علامہ اقبال جیسے لوگ جاتے۔ میاں صاحب نے مولانا انور شاہ کو دیوبند کے چار نوری وجودوں میں سے ایک وجود قرار دیا.......... میاں صاحب کے ایک مداح اور ان کے شہر کے صاحب نظر اور مجاہد اہل قلم ملک حسن علی جامعی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی نامکمل تفسیر مولانا سے مکمل کرنے کی خواہش کی تھی اور پیغام بھجوایا تھا کہ آپ ہر طرح سے اس کے اہل ہیں.......... میں نے اس پیغام کے حوالے مولانا سے عرض کیا تو مولانا نے وہی جواب دیا جو ایک صحیح الفطرت عالم کا ہوتا ہے کہ کجا مولانا آزاد اور کجا میں' لیکن مجھ جیسے لوگوں کے بار بار اصرار کے سبب وہ کسی درجہ میں آمادہ ہو گئے پر افسوس کہ اب عملاً ایسا ہو نہ سکا۔ بہر طور ان کی اپنی تفسیری کاوش جیسا کہ میں نے عرض کیا بلانوشان محبت کے لئے عظیم سرمایہ ہے اور جلد ہی وہ چھپ کر آئے گی تو اہل نظر میرے قول کی تصدیق کریں گے۔ اس کے علاوہ مولانا نے قرآن کے حوالہ سے "مطالعۂ قرآن" اور "لسان القرآن" لکھیں "مطالعۂ قرآن" ایک صاحبِ قلم کے بقول ایسی کتاب ہے کہ اس میں

'مولانا نے قرآن کے متعلق ان تمام مباحث و مسائل پر محققانہ اظہار خیال کیا ہے جن سے نہ صرف قرآن فہمی میں خصوصیت سے مدد ملتی ہے بلکہ اس کتابِ ہدیٰ کی عظمت بھر نکھر کر فکر و نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ مزید بر آں اس سے قرآن کے علوم و معارف اور دعوت و اسلوب کی معجزہ طرازیوں پر بھی تفصیل سے روشنی پڑتی ہے اس کتاب میں مولانا نے "زرکشی کی البرہان" اور "سیوطی" کی "الاتقان" کے ان تمام جواہر ریزوں کو اپنے مخصوص شگفتہ اور حکیمانہ انداز میں جمع کر دیا ہے۔ اور مستشرقین کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کا تسلی بخش جواب بھی دیا ہے جو قلب و ذہن میں شکوک و شبہات ابھارنے کا موجب ہو سکتے ہیں۔ غرض اسے قرآنی فکر و تصوّر کے بارے میں انسائیکلو پیڈیا کہنا چاہئے جس میں وہ ساری بحثیں اور مضامین سمٹ آئے ہیں جن کی دور حاضر کو ضرورت ہے۔'

"لسان القرآن" کی دو جلدیں آچکی ہیں تیسری مولانا مرتّب کر رہے تھے کہ انہیں قرآن نازل کرنے والے کی طرف سے بلاوا آگیا۔ اور وہ اس دنیا سے منہ موڑ کر چل بسے ...... اغلبًا اس کی کل پانچ جلدیں ہوتیں۔ یہ کتاب در حقیقت قرآن کی ایسا لغت ہے جسے مولانا حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کر رہے تھے ایسی لغت جس سے منشاء ربانی واضح ہو کر سامنے آئے۔ احقر نے خدام الدین اشاعت ۱۶ مارچ ۱۹۸۴ء میں اس کی پہلی جلد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

'مولانا چونکہ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ عصر نبوت کے استحضار 'عربی زبان پر کامل عبور اور قرآن سے بدرجہ غایت محبت کے بغیر قرآن فہمی ممکن نہیں اس لئے وہ دل و دماغ کی تمام وسعتوں کے ساتھ اس میدان میں اترے ہیں 'انہوں نے حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو کھنگالا اور پوری طرح عربی پر عبور حاصل کیا اور بالآخر قرآن سے اپنی محبت کا ثبوت اس طرح دیا کہ بس اب اسی کے ہو کر رہ گئے وہ اس بات کو قطعی تسلیم نہیں کرتے کہ ایک شخص چند تراجم کو سامنے رکھ کر یا مستشرقین کی تصریحات پڑھ کر فاضلِ قرآن ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن سے پہلے غیر قرآنی صنم خانوں کو یکسر مٹائیں اور اس کلام الٰہی کے اتھاہ سمندر میں اس طرح غوطہ زنی کریں کہ آپ کی روح میں وہ رچ بس جائے تب قرآن اپنے خزانے آپ پر وا کرے گا۔'

اس کتاب کی ہنوز دو جلدیں ہی سامنے آسکی ہیں 'جیسا کہ عرض کیا تیسری جلد مولانا مرتّب کر رہے

کہ انہیں بلاوا آگیا اور یوں یہ جلد نامکمل رہ گئی............ ادارہ ثقافت اسلامیہ جس کے آخری وقت میں مولانا ڈپٹی ڈائریکٹر تھے اور جس میں انہوں نے اپنی عمرِ عزیز کا بڑا حصہ گزار کر ٹھوس علمی کام کیا اس پر وہاں مولانا کے اہل خانہ کی دیکھ بھال کا اخلاقی فرض عائد ہوتا ہے' وہاں اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ مولانا کے ان ادھورے علمی کاموں کی تکمیل کا اہتمام کرے............ یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ مولوی مدن والی بات شاید نہ ہوسکے لیکن ایک بنیاد سامنے موجود ہے اس کی روشنی میں کسی درجہ میں کام ضرور ممکن ہے اس طرح یہ علمی کام مکمل ہوجائے گا اور ادارہ کی نیک نامی کا باعث بنے گا۔

مولانا کی تصانیف میں ایک کتاب "مطالعۂ حدیث" ہے۔ درحقیقت مطالعۂ قرآن کی طرح' حدیث کے متعلق بنیادی اور اہم مسائل اس کتاب کا موضوع ہیں۔ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بہت کچھ نکلا حضرات صحابہ کرام نے اسے محفوظ کر کے آئندہ نسلوں تک پہنچایا............ تاہم مختلف طبقات نے رسول محترم سے اُمت کی عقیدت و محبت کا سہارا لے کر جھوٹی اور غلط احادیث کا ایک بڑا ذخیرہ اصل ذخیرہ میں شامل کر کے اپنے باطل اور غلط نظریات کو اُمت کے حلق سے اتارنا چاہا............ حضرات محدثین کرام نے صحیح اور غلط کی تمیز کر کے مجموعوں کو الگ الگ مرتب کیا انہوں نے جہاں صحیح مجموعے قوم کو ورثہ میں دیئے اسی طرح انہوں نے جعلی روایات کو مجموعوں میں جمع کر دیا تاکہ ایک جویائے حق کے سامنے سارا ذخیرہ رہے............ آئندہ چل کر دین دشمن افراد بالخصوص مستشرقین نے انہی حوالوں کا سہارا لے کر حدیث کے متعلق غلط فہمیاں پھیلانا شروع کیں اور ان کے "مشرقی شاگردوں" نے ان کے اگلے ہوئے نوالے نگلنے کی سعی کر کے اپنے ہی گھر کو پھونکنے کا تماشا شروع کر دیا............ ان حالات میں ایک صائب الفکر انسان کے لئے قلم اٹھانا جتنا مشکل ہے اس سے ہر ذی شعور واقف ہے۔ حدود کا لحاظ کر کے ہر چیز کی اصلیت لوگوں تک پہنچانا پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے............ مولانا المحترم نے اس کتاب میں کامیابی کے ساتھ حدیث کی اصلیت سے متعارف کرایا تو حدیث کے نام پر دھوکے کی وارداتوں کی نشاندہی کی۔

"اساسیات اسلام" مولانا کے ذخیرہ کتب کی اہم کتاب ہے' اس کا موضوع نام سے ظاہر ہے اسلام عقائد واعمال کے مجموعے کا نام ہے اس میں عقائد کا حصہ بہت ہی نازک اور مشکل ہے اللہ تعالیٰ کے وجود باوجود اور ان کے اختیارات کاملہ اور وحدانیت کا مسئلہ ہو' یا انبیاء ورسل کی ضرورت' ان کی عصمت' باری تعالیٰ سے ان کے خصوصی تعلق اور ان پر وحی کے نزول کا مسئلہ............ اسی طرح

ملائکہ، کتب، بعث بعد الموت اور تقدیر وغیرہ کے مسائل، یہی بات یہ ہے کہ ان مسائل پر اس انداز سے گفتگو کرنا کہ ان کا ٹھیک ٹھیک تعارف ہو جائے اور انسانی ذہن میں ان کی حقیقت اتر جائے............ بڑا ہی کٹھن کام ہے.......... علم الکلام کے نام سے ایک پورا فن اس کے لئے مدون ہوا اور خیر القرون کے دور سے اب تک اس پر خامہ فرسائی کی گئی۔ آج کا دور جدید فلسفے اور انکشافات کا دور ہے لوگ اس صدی کو علم کی صدی کہتے ہیں کہ حضرت انسان چاند پر پہنچنے کے دعوے کر رہا ہے اور آسمان سے ستارے توڑ لانے کی فکر میں ہے لیکن اس کے فکر و نظر کے پیمانوں کا جو حال ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ چین اور روس جیسی مملکتوں کے تاجداروں کو رب العزت کے وجود کا انکار ہے تو ہندوستان جیسے بھاری بھر کم ملک کے تاجدار گائے کے پیشاب کو ہی نسخہ شفا قرار دیتے ہیں.......... امریکی صدر ان تمام ترقیوں کے باوجود اب بھی "ایک میں تین اور تین میں ایک" کے چکر کا شکار ہے، اس سے ہی اندازا ہو سکتا ہے کہ آسمان پر کمندیں ڈالنے والے انسان کی ذہنی سطح کتنی پست ہے اور وہ کتنی بے چارگی کا شکار ہے ان حالات میں جدید ذہن کی الجھنوں کو سامنے رکھ کر ان اعتقادی مسائل پر قلم اٹھانا ہر کسی کا کام نہیں قدرت مخصوص کاموں کے لئے مخصوص سطح کے لوگ پیدا کرتی ہے.......... مولانا ندوی ان ہی نابغہ افراد میں سے ہیں جنہوں نے اس کتاب میں ان نازک اور پیچیدہ گتھیوں کو اس طرح سلجھایا ہے کہ کسی کے قلب و سمع پر تالے اور مہریں نہ ہوں تو ان حقائق کا ادراک مشکل نہیں۔

"مسئلہ اجتہاد" ان کی ایک اہم کتاب ہے دیکھنے میں چھوٹی سی لیکن معنیٰ کی وسعت کے اعتبار سے بہت بڑی... گویا فارسی محاورہ کے مطابق "بقامت کہتر بقیمت بہتر" کا مصداق! اجتہاد کا سلسلہ دورِ رسالت سے جاری ہے اور اسے اصولاً صبح قیامت تک جاری رہنا ہے کیونکہ اس کا مقصد جدید الجھنوں کے حل کی سعی و تدبیر ہے۔ انسانیت اس وقت دوشِ ہوا پر واقعی سوار ہے اور اس نسبت سے اُمّت مسلمہ کو بڑے چیلنج درپیش ہیں مجتہدانہ بصیرت کے حامل لوگ ان گھاٹیوں کو سر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے لئے راستہ کی مشکلات آسان فرما دیتے ہیں کہ ان کا وعدہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

اجتہاد کے مسئلہ میں افراط و تفریط کی گرم بازاری ہے۔ ایک طبقہ قدیم ذخیروں کو ہی ہر درد کی دوا سمجھتا ہے اور یہ خیال نہیں کرتا کہ قدیم ذخیرے بلاشبہ بڑے مقدس ہیں اور ان کے مدوّن کرنے والے فی الواقع ہمارے محسن تھے لیکن جو حالات ان کے دور میں نہ تھے ان کا حل ان کے ذخیروں میں کہاں ہو گا؟

ایک طبقہ ہر بوالہوس کے لئے حسن پرستی کو شعار بنانے کی اجازت دے کر واجبی سی عربی پڑھے ہوئے پروفیسر کو مجتہد کا مقام دے دیتا ہے........... اس کی بھونڈی ترین مثال ہمارے ایک دانشور کے وہ مضمون ہیں جو بعض قومی اخبارات میں طمطراق سے شائع ہو رہے ہیں۔ جن میں مرحوم علامہ اقبال کو اجتہاد سے بھی آگے تجدید کے مقام پر فائز کیا جا رہا ہے۔

مرحوم اقبال کی شاعرانہ عظمت مسلّم، لیکن اجتہاد و تجدید کی دنیا ایسی نہیں جس پر ہر کسی کو فائز کیا جا سکے اس معاملہ میں امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالک، امام احمد، ابن تیمیہ، غزالی، شاہ ولی اللہ اور شیخ الہند محمود حسن (رحمہم اللہ تعالیٰ) جیسے لوگوں کا ہی نام لیا جا سکتا ہے۔ مولانا ندوی کا احسان ہے کہ انہوں نے افراط تفریط سے اپنے دامن کو بچا کر اس معاملہ میں صحیح صحیح رہنمائی کی۔ ہر دور میں اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا، اس کی حدود متعین کیں، یہ کام جو کر سکتے ہیں ان کا تعارف کرایا۔

ان اصولی اور بنیادی کتابوں کے علاوہ شخصیات کے حوالہ سے انہوں نے جو لکھا اس کی ایک الگ داستان ہے۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ان کی سب سے زیادہ توجہ غزالی کی طرف ہے جس کی داستان عبرت کو موصوف نے اردو کا جامہ پہنا کر " سرگزشت غزالی " کا نام دیا اور اپنے ایک طویل مقدمہ سے اسے مزین کر کے راہ حق کے مسافروں کے لئے ایک " گائیڈ بک " فراہم کی۔ غزالی اپنے دور کے بڑے آدمی تھے ایک عظیم درس گاہ کے وائس چانسلر تھے فلسفہ و منطق اور کلام و بیان کی بحثیں ان کا مقصدِ زندگی تھیں۔ لیکن ان کی روح میں ایسے کانٹے پیوست تھے جو کسی پل چین نہ لینے دیتے' آخر انہوں نے مادیت کے تمام طور طریقوں کو خیرباد کہا۔ شاہوں اور وزراء کی ہم نشینی ترک کی' پلازا نما بلڈنگوں کو خیرباد کہہ کر سنت نبوی کے مطابق سادگی و قناعت کی زندگی اختیار کی۔ معاشرے کے اونچے طبقوں کی بجائے ستم رسیدہ طبقات کو اپنی دعوت و تبلیغ کا مرکز بنایا فقہ کی درشتگی اور تصوّف کی آزاد دنیا کو حدود میں لا کر ان کے باہمی ملاپ کی تدبیر کی پھر غزالی "حجتہ الاسلام" قرار پائے اور ان کا نفع اتنا عام ہوا کہ آج صدیوں بعد ان کا سرمایہ علمی امّت کے لئے سرمایہ ہے۔

مولانا نے تعلیماتِ غزالی' افکارِ غزالی وغیرہ میں ایسے انداز سے غزالی کی تعلیم و افکار کا نچوڑ پیش کیا ہے، کہ جس کے مطالعہ سے روحانی سکون و بالیدگی میسر آتی ہے اور انسان نخوت و غرور کی دنیا سے نکل کر شریعت اسلامیہ کا پابند ہو جاتا ہے۔

آج کی مسلم دنیا کے کلامی اعتبار سے دو بڑے محسن ہیں امام ماتریدی اور امام اشعری۔ اشعری کامل

چالیس برس اعتزال اور جہمیّت کے اندھیروں کا شکار رہ کر صراطِ مستقیم پر آئے تو اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اس کی بخشی ہوئی بصیرت و فراست نیز ماضی کے تلخ تجربات کو سامنے رکھ کر کلامی مسائل میں امت کی رہنمائی کا فرض "مقالات الاسلامیین" کی شکل میں انجام دیا۔ مولانا المحترم نے اس وقیع علمی کتاب کو آسان اردو کا جامہ پہنا کر آج کے دور کی ضرورتوں کے مطابق بنا دیا۔ مولانا نے ترجمہ میں گھسا پٹا انداز بالکل اختیار نہیں کیا بلکہ ترجمانی و تفہیم کی وہ راہ اختیار کی ہے جو آج کے دور میں مفید ثابت ہو سکے۔

بعض کم ظرفوں کی طرح وہ چاہتے تو اس کتاب کو تصنیفی طور پر اپنی طرف منسوب کر سکتے تھے اور اچھا بھلا پڑھا لکھا قاری بھی اصل تک نہ پہنچ سکتا لیکن مرحوم نے جس چشمہ فیض سے اکتساب فیض کیا اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا ان کے احسان کو تسلیم کیا اور اشعری کو سامنے رکھ کر ایک علمی ارمغان تیار کر دیا جس سے قدیم و جدید فتنہ سامانیوں کی جڑیں کھوکھلی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ ہمارے قدیم علمی محسنوں میں امام ابن 'تیمیہ' ابن رشد اور شاہ ولی اللہ کی شخصیتیں بڑی محترم ہیں ان بزرگوں نے اپنے اپنے انداز سے بڑا وقیع کام کیا ہے۔ ابن تیمیہ علم کا بے کراں سمندر ہیں ایسا سمندر جس کی گہرائی نہیں۔ انہوں نے جوش جنوں میں عزیمت کی کٹھن راہ اختیار کی 'اپنے دور کے فتنہ پرور لوگوں کی تنقید کا تو شکار رہے ہیں 'اب تک بعض ناہنجار ان کے متعلق گز بھر لمبی زبان استعمال کرتے ہیں۔ اپنی سوچ کے حوالہ سے ابن تیمیہ کو جیل یاترا کا موقعہ ملا اور اس طرح کہ انہوں نے جیل کی تاریک وادی میں علمی خزینے مرتب کئے اور کتنے ہی طلبہ کو اس عرصہ میں ان سے استفادہ کا موقع ملا۔ حتیٰ کہ ابن تیمیمہ کا جنازہ جیل سے اٹھا' لیکن وہ ایسا جنازہ تھا جس پر بادشاہ اور امرا رشک کرتے تھے ابن رشد فلسفہ کے آدمی تھے 'مقصد ان کا یہ تھا کہ اہل باطل کے خلاف اس حوالہ سے دفاعی مورچہ قائم کیا جائے۔ مقصد اور نیت نیک ہو تو آدمی کو احترام نصیب ہو جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ ' دور زوال میں پیدا ہوئے لیکن شبلی کے بقول سب پچھلوں کو مات دے گئے انہوں نے قرآن ' سنت ' فقہ ' کلام ' تاریخ اور سبھی موضوعات پر قلم اٹھایا تین سو سال کے بعد بھی عرب و عجم کی یونیورسٹیوں میں ان کے نام اور کام کی گونج ہے۔ برعظیم ہند و پاک تو گویا علمی طور پر شاہ صاحب کا مفتوحہ علاقہ ہے .... اس پورے خطہ کے سلیم الفطرت ارباب علم و بصیرت تو دل کی گہرائیوں سے شاہ صاحب کو اپنا جد امجد سمجھتے ہیں جبکہ کج فطرت بھی ان کی وجاہت علمی کے سامنے گنگ اور ان کا نام

ترام سے لینے پر مجبور ہیں۔ مولانا نے ان تینوں بزرگوں کے حوالے سے لکھا اور بہت خوب لکھا۔ شاہ
ی اللہ کے معاملہ میں میری درخواست پر انہوں نے فرمایا کہ بہت کچھ لکھنے کا عزم ہے کہ اس دور کے
تحدہ ہیں اور انہی کی تعلیمات اپنا کر آج کے سیاسی اور معاشی مسائل کا حل ممکن ہے۔ پروگرام یہ تھا کہ
"لسان القرآن" کی تکمیل کے بعد اس طرف توجہ ہوگی لیکن افسوس ع

آں قدح و آں ساقی نماند

دور حاضر کے عبقری دماغ انسانوں میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد سے سب سے زیادہ متاثر اور ان کے
راح تھے۔ ان کے علم و فضل ہی کے نہیں ان کی سیاسی سوچ اور فکر کے بھی' محدود دنیا میں ایک عرصہ رہ
ر خدمت کرنے والے ابوالکلام سے زیادہ انہیں اس ابوالکلام سے عقیدت تھی جو انسانیت کا نجات
ہندہ بن کر افق پر ابھرا۔ اس کے ساتھ اس کی قوم نے وہی بد سلوکیاں کیں جو ابتدا ہی سے ایسے عظیم
وگوں کا مقدر رہیں لیکن مولانا کے بقول...... ابوالکلام کی عظمت کا راز اسی میں ہے کہ اس نے ہر تلخی
برداشت کر کے بھی اپنے مقصد سے منہ نہ موڑا۔ ابوالکلام کے افکار پر جی جان سے نثار ہمارے کرم فرما
ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری...... جن کا وقیع علمی ذخیرہ سال گذشتہ کے کراچی کے ہنگاموں میں
نذر آتش ہو گیا' نے گذشتہ سال اس موقعہ پر مولانا سے ان کے کرایہ کے مکان میں احقر سمیت ملاقات
کی جب مولانا اپنی علالت شدیدہ کے سبب دفتر نہ آرہے تھے اور ان کی سعادت مند بچی انہیں برطانیہ
لے جانے کی فکر میں تھی...... ڈاکٹر صاحب نے مولانا سے درخواست کی کہ ابوالکلام کے افکار میں آج
کے دور کے مسائل کا حل ہے؟

یہ ایک سوچ ہے اور اس سوچ کو عملی جامہ آپ ہی کا قلم پہنا سکتا ہے...... مرحوم نے کہا کہ اس
میں کوئی شک نہیں کہ ابوالکلام کی تدبیر کار ہی ہمارے دکھوں کا مداوا ہے آپ دعا کریں کہ صحت کی
نعمت میسر آجائے تو میں اس کام کو فرض سمجھ کر ادا کروں گا۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے بقول انسانی
آرزوؤں کا یہ حال ہے کہ وہ بہت زیادہ اور طویل ہیں لیکن عمر اتنی ہی مختصر...... نتیجہ سامنے ہے کہ ع

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

مولانا المرحوم غیرت و خودداری اور استغنا و توکل کا مجسمہ تھے' انہوں نے خودی کے جھوٹے واعظوں
کی طرح کبھی کسی آستانہ پر ہاتھ نہ پھیلایا۔ شدید علالت کے دور میں بھی ان سے ملاقات ہوتی تو ان کے
چہرے پر سکون کی پرچھائیاں ہوتیں اور گفتگو میں وقار اور غیرت۔

اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کی بچی انہیں برطانیہ لے گئی۔ تشخیص ہوئی لیکن حالات ایسے نہ تھے کہ وہاں کے اخراجات کا تحمل ہو سکتا وہ واپس آ گئے اور ان دنوں یہاں بستر علالت نہیں بلکہ بستر مرگ پر رہے جب ہمارے صوبہ کے شریف وزیر اعلیٰ نہ معلوم کس کس فلم اسٹار اور گلوکارہ کے لئے ابر رحمت بن کر انہیں باہر علاج کو بھجوا رہے تھے لیکن ان کی نظر نہ پڑی تو اس درویش پر جو کوچہ علم کا مسافر ہی نہیں اس راستہ کا شہید تھا۔

انہی دنوں اس ادارہ کی "سیرت کیسٹ" کے حوالہ سے ایک تقریب ہوئی' جس کی لائبریری کو مولانا نے اپنے خون جگر سے سینچا' اس تقریب میں لاہور بھر کی اعلیٰ ترین شخصیات تھیں' بھڑکیلے لباس میں لاتعداد مستورات "سیرت رسول" کا عملی مظاہرہ کر رہی تھیں' ملک کا حاکم مہمان خصوصی تھا لیکن کسی نے خبر نہ لی کہ ادارہ کا ڈپٹی ڈائریکٹر کہاں ہے؟ اور اس مجلس سے غیر حاضر کیوں؟

اے کاش مولانا کا کوئی رفیق ادارہ ہی اس وقت حاکم ملک کے کان میں ڈالتا کہ سال دو سال قبل آپ نے اپنے وزیر تعلیم کے ذریعہ جس کو خراج تحسین پیش کیا تھا وہ بستر علالت پر ہے لیکن ایسا بھی نہ ہوا .... ہو جاتا تو مولانا کو باہر بھجوانے کا شاید نظم ہو جاتا' اس سے موت کی گھڑی نہ ٹلتی لیکن مولانا کے عزیز اور عقیدت مند ایک حسرت کا شکار تو نہ ہوتے۔

مولانا ایک زمانہ میں "اسلامی نظریاتی کونسل" کے رکن بھی رہے لیکن انہوں نے حاکموں کی خواہش کا نہیں اسلام کی روایات کا ہمیشہ لحاظ رکھا اور جب ملک میں شرعی عدالتوں کا شور گونجا تو مولانا محمد تقی اور پیر کرم شاہ کے ساتھ مولانا کا نام تھا۔ جس مذہبی جماعت سے مولانا کی واجبی سی نسبت تھی اس کے ایک نوجوان لیکن ابھرتے ہوئے لیڈر نے ضیاء الحق صاحب کو اپنی دوستی کے حوالہ سے باور کرایا کہ مولانا کا تو اسلام و ایمان بھی محل نظر ہے اور یہ کہ ہماری جماعت سے ان کا کیا تعلق؟

پھر وہی عزیز دفتر میں مولانا سے ملا دو گھنٹہ تک اپنی صفائیاں دیتا رہا کہ میں نے کوئی بات نہیں کی مولانا کا اس پر جو تبصرہ تھا وہ یہ تھا کہ "اسے کہتے ہیں دروغ بر روئے تو" اور فرمایا کہ مجھے اس کا قطعا صدمہ نہیں بلکہ ایک طرح کی خوشی ہے کہ اس ماحول میں پھنسنے سے بچ گیا ورنہ خدمت علم کا مقدس فرض معرض خطر میں پڑ جاتا' چونکہ آپ کی وجہ سے میری دلچسپی کا سامان قائم رہا ہے اس لئے آپ تو میرے محسن ہیں۔ اور میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

ایسے دیدہ بینا رکھنے والے بے غرض بے لوث اور خادم انسانیت و علم افراد اب کہاں پیدا ہوں

گے میرے قلب پر ان کی دنیا سے رخصتی کا اتنا اثر ہے کہ اس کا اظہار میرے لئے ممکن نہیں، میں کس سے اظہار تعزیت کروں، کہ میں خود مستحق تعزیت ہوں............ آج رونا اس بات کا ہے کہ پروانگان علم کی رخصتی کی لائن لگی ہوئی ہے دنیا سے عبقری دماغ اٹھ رہے ہیں، چھوٹے قد کاٹھ کے لوگ اس دنیا پر چھا رہے ہیں۔ یقیناً قیامت و محشر کی گھڑی قریب ہے کہ رسول محترم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد یہی ہے کہ قیامت اچھوں پر نہیں بروں پر قائم ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ہمارے مولانا کی روح کو تسکین نصیب فرمائے..... ان کی خطاؤں سے درگذر فرمائے ان کے اہل خانہ و متعلقین اور اہل عقیدت کو صبر و سکون کی دولت نصیب ہو......... آمین ثم آمین۔

بقیہ: رفتار کار

دن بھی فلائٹ کے انتظار میں گذرا اور ہم بجائے ۲۱ر جولائی کی شب کے ۲۳ر جولائی کو صبح ساڑھے سات بجے (قریباً ۳ گھنٹے کی تاخیر سے) روانہ ہوئے۔ واپسی پر چونکہ دبئی میں سٹاپ نہیں تھا لہٰذا دو گھنٹے کی بچت ہو گئی بارہ بجے دوپہر کراچی آمد ہوئی۔ محترم سید سراج الحق اور پی آئی اے کے دوست علوی صاحب ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ جمعہ کی شام اور رات گئے تک مختلف حضرات سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ اگلے روز یعنی ۲۵ر جولائی کو صبح ساڑھے آٹھ بجے کی فلائٹ سے لاہور پہنچ گئے ... اور پھر وہی سلسلہ روز و شب.. مبارک ہیں بندوں کی زندگی کے وہ لحات جو اللہ کی توفیق سے اس کے دین کی خدمت میں صرف ہوں۔

☆☆☆

حُسنِ انتخاب

طالب ہاشمی

معلّمِ قرآن، حضرت مُصعبؓ بن عمیر

(۱)

عمیر بن ہاشم کے فرزند مصعبؓ صرف بنو عبد الدار کے جوانانِ رعنا ہی کی آبرو[۱] نہیں تھے بلکہ فی الحقیقت سارے مکہ میں ان جیسا خوبرو، سجیلا اور خوش پوش نوجوان کوئی نہیں تھا۔ والدین کو اللہ تعالیٰ نے تموّل اور آسودہ حالی کی نعمتوں سے نوازا تھا۔ انھوں نے اپنے فرزند کو بڑے ناز و نعم سے پالا تھا۔ مصعبؓ کی جوانی حسنِ صورت اور نظافت پسندی کا نہایت حسین امتزاج تھی۔ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ ریشمی کپڑے پہنتے اور عمدہ سے عمدہ خوشبویات استعمال کرتے تھے۔ جس گلی سے گزرتے وہ گلی مہک جاتی تھی۔ ان کے ایک جوڑے کی قیمت دو دو سو درہم تک ہوتی تھی جو اس زمانے میں ایک خطیر رقم متصوّر ہوتی تھی۔ پاؤں میں زرّیں حضرمی جوتا ہوتا تھا۔ میانہ قد کے یہ نرم و نازک نوجوان اپنے وقت کا بیشتر حصہ اپنی تزئین و آرائش اور خوبصورت زلفوں کو بنانے اور سنوارنے پر صرف کرتے تھے۔ لیکن اپنی خوبروئی اور خوش پوشی کے باوصف وہ نہایت پاکیزہ سیرت اور اخلاق کے حامل تھے۔ جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ حق کا آغاز فرمایا تو مصعبؓ کے پاک اور صاف دل و دماغ نے اسے فوراً قبول کر لیا۔ پرستارانِ حق ان دنوں بڑے پُرصعوبت دور سے گزر رہے تھے۔ مشرکین نے اپنے ظلم و ستم سے توحید کے شیدائیوں کا جینا دوبھر کر رکھا تھا اور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چند جاں نثاروں کے ہمراہ حضرت ارقمؓ بن ابی الارقم

---

[۱] حضرت مصعبؓ کا شجرۂ نسب یہ ہے۔

مصعبؓ بن عمیر بن ہاشم بن عبد مناف بن عبد الدار بن قصیٰ گویا پانچویں پشت میں ان کا

کے مکان میں پناہ گزین تھے۔

اسی پُر آشوب زمانے میں نوجوان مصعبؓ ایک دن رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بادۂ ایمان سے مخمور ہو کر حضورؐ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی۔ اب وہ اکثر دربارِ رسالت میں حاضر ہوتے اور فیضانِ نبویؐ سے مقدور بھر بہرہ ور ہوتے تھے۔

(۲)

شروع شروع میں حضرت مصعبؓ نے اپنا اسلام گھر والوں سے پوشیدہ رکھا اس میں دو مصلحتیں تھیں ایک تو یہ کہ وہ اپنی مشفق ماں کو جو ان سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی آزردہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ دوسری یہ کہ وہ اپنی ماں سے اتنی مالی مدد حاصل کر لیتے تھے جس سے وہ مظلوم دینی بھائیوں کی دست گیری کر سکتے تھے۔ لیکن عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ ایک دن کلید بردارِ کعبہ عثمان بن طلحہ نے (جو ابھی مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے) انہیں کہیں ربِ واحد کی عبادت کرتے دیکھ لیا۔ انہوں نے فوراً ان کی والدہ اور دوسرے اہلِ خاندان سے جا کر کہا کہ:

"تم تو مصعب پر جان چھڑکتے ہو اور وہ محمدؐ کے دین کا آویزۂ گوش بنا بیٹھا ہے۔"

حضرت مصعبؓ کی ماں خناس بنتِ مالک اور دوسرے اہلِ خاندان پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ مصعبؓ سے ان کی والہانہ محبت، بے پناہ نفرت میں تبدیل ہو گئی۔ انہوں نے پہلے تو انہیں خوب زدوکوب کیا اور پھر رسیوں سے جکڑ کر قیدِ تنہائی میں ڈال دیا۔ مصعبؓ دینِ حق سے منہ موڑ کر پھر والدہ اور دوسرے عزیزوں کی محبت اور شفقت کا مرجع بن سکتے تھے لیکن بادۂ توحید نے انہیں کچھ ایسا مست کر دیا تھا کہ عیش و راحت سے محرومی اور قید و بند کی مصیبتیں خندہ پیشانی سے قبول کر لیں لیکن دینِ حق سے منہ موڑنا گوارا نہ کیا۔

کچھ عرصہ اسی طرح سے گزر گیا۔ ادھر کفار کا معاملہ مسلمانوں سے شدید تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ستم رسیدہ مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ بارہ مردوں اور چار خواتین کا مختصر سا قافلہ فی الفور ہجرت

کے لیے آمادہ ہوگیا۔ راہِ حق میں سب سے پہلے غریب الوطنی اختیار کرنے والے ان بلاکشانِ اسلام میں حضرت مصعبؓ بن عمیر بھی شامل تھے جو موقع پاکر اپنے زندانِ بلا سے بھاگ نکلے اور اس قافلہ کے ساتھ حبش جا پہنچے۔ ابھی ان مہاجرین الی اللہ کو حبش میں تین ہی مہینے گزرے تھے کہ انہوں نے قریشِ مکہ کے مسلمان ہو جانے (یا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ترک کر دینے) کی خبر سنی۔ علامہ ابنِ سعدؒ اور بلاذریؒ کا بیان ہے کہ یہ خبر سُن کر سب مہاجرین مکہ کی طرف واپس ہو گئے۔ البتہ ابنِ اسحاقؒ نے لکھا ہے کہ بعض مہاجرین وہیں ٹھہرے رہے۔ بہرصورت حضرت مصعبؓ ان اصحاب میں شامل تھے جنہوں نے مکہ کو مراجعت کی۔ شہر کے قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ خبر بالکل بے بنیاد تھی۔ تاہم انہوں نے حبش کی طرف پلٹنا مناسب نہ سمجھا اور ان میں سے ہر ایک عائدِ قریش میں سے کسی نہ کسی کی امان حاصل کر کے شہر میں داخل ہو گیا۔ حضرت مصعبؓ نے باختلافِ روایت نضرؔ بن الحارث بن کلدہ یا ابوعزیز بن عمیر کی پناہ حاصل کی۔ حبشہ سے ان اصحاب کے مراجعت فرمانے کے بعد قریش کی ستم آرائیوں میں اور شدت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ حضورؐ نے پھر ہدایت فرمائی کہ جس مظلوم مسلمان سے بن پڑے وہ حبش ہی کی طرف ہجرت کر جائے۔ اب کی بار ۸۰ سے زیادہ مردوں اور ۱۹ یا ۲۰ خواتین نے حبش کی راہ لی۔ حضرت مصعبؓ اس قافلۂ حق میں بھی شامل تھے۔ اس مرتبہ ان کے بھائی ابوالرومؓ بن عمیر نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ مشرکینِ قریش نے ان کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالیں لیکن یہ سب کسی نہ کسی طرح حبش پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ حضرت مصعبؓ ایک مدت تک حبش میں غریب الوطنی کی زندگی بسر کرتے رہے اور پھر مکہ واپس تشریف لے آئے۔ اربابِ سیر نے ان کے سالِ مراجعت کی تصریح نہیں کی لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہجرتِ مدینہ سے تین چار سال پہلے حبش سے مکہ واپس آئے اور اپنے وقت کا بیشتر حصہ اپنے آقا و مولاؐ کی خدمتِ اقدس میں گزارنے لگے۔[1]

---

[1] بعض اربابِ سیر نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کی دوسری ہجرتِ حبشہ کا ذکر نہیں کیا لیکن ابنِ ہشامؒ نے ابنِ اسحاقؒ کے حوالہ سے دوسری ہجرتِ حبشہ کے مہاجرین کی فہرست میں حضرت مصعبؓ بن عمیر کا نام واضح طور پر درج کیا ہے۔

(۴)

حضرت مصعبؓ حبش سے اس حال میں مکہ واپس آئے کہ غریب الوطنی نے ان کی رعنائی اور خوش پوشی کو خواب و خیال بنا دیا تھا اب بوسیدہ اور موٹے جھوٹے کپڑے جن میں کئی پیوند لگے ہوتے تھے، ان کے زیب بدن ہوتے تھے۔ جسم کی نرم و نازک کھال موٹی اور کھردری ہو گئی تھی۔ چہرہ ستُ گیا تھا اور رنگ برگِ خزاں رسیدہ کی طرح پیلا پڑ گیا تھا لیکن اس مردِ حق آگاہ کی شانِ استقامت و عزمیت میں ذرّہ برابر فرق نہ آیا تھا۔ وہ اپنے آقا و مولاؐ کی خدمت اور زہد و فقر کی زندگی کو عیش و تنعّم کی ہزار زندگیوں پر ترجیح دیتے تھے۔ حضرت مصعبؓ ایک دن دربارِ نبوت میں اس شان سے حاضر ہوئے کہ ان کے جسم پر کوئی کپڑا ایسا نہ تھا جس میں پیوند نہ لگے ہوں اور پھر یہ کپڑے بھی سخت موٹے اور کھردرے تھے۔ سرورِ عالمؐ انہیں اس حالت میں دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے۔ ایک اور موقع پر وہ مجلسِ نبویؐ میں اس طرح حاضر ہوئے کہ ستر پوشی کے لیے معمولی کپڑا بھی میسّر نہ تھا جسم کو ایک کھال کے ٹکڑے سے باندھ رکھا تھا اور اس کھال میں بھی جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے۔ یہ ایک کپکپا دینے والا منظر تھا کہ جو جسم کبھی ریشم کے سوا کسی لباس سے آشنا نہ تھا آج وہ ایک بوسیدہ کھال میں ملبوس تھا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ راہِ حق کے اس نرالے مسافر کو اس "عجیب لباس" میں دیکھ کر تڑپ اٹھے۔ حضورؐ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا:-

"چند سال پہلے میں نے اس نوجوان کو دیکھا تھا کہ سارے مکہ میں اس سے بڑھ کر ناز و نعمت کا پروردہ، خوش رُو، خوش پوشاک، اور آسودہ حال کوئی نہیں تھا لیکن آج اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی محبت پر اس نے اپنے تمام عیش و آرام کو قربان کر دیا ہے اور حسنات سے شغف نے اس کو دنیوی لذات اور اسبابِ راحت سے بے نیاز کر دیا ہے۔"

حضرت مصعبؓ کے اسی جذبۂ ایثار اور اخلاص فی الدین نے انہیں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مرجعِ شفقت بنا دیا تھا اور دربارِ رسالتؐ میں انہیں درجۂ اختصاص حاصل ہو گیا تھا

انہوں نے حضورؐ کی صحبتِ اطہر سے خوب فیض اٹھایا وہ بڑے ذوق و شوق سے ہادیٔ اکرمؐ سے دین کی تعلیم حاصل کرتے اور قرآن کی جو سورۃ نازل ہوتی اسے فوراً حفظ کر لیتے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ عرصہ بعد وہ ایک عالمِ دین اور فقیہ سمجھے جانے لگے۔ حضورؐ نے تبلیغ و دعوت کے لیے جن صحابہ کرامؓ کو بطورِ خاص تربیت دی حضرت مصعبؓ بھی ان میں سے ایک تھے۔

(۴)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا برسوں سے معمول تھا کہ ایامِ حج میں زائرینِ حرم کے مختلف قبائل کے پاس جا کر انہیں دعوتِ توحید دیتے تھے لیکن مشرکینِ قریش اپنے مخالفانہ ہتھکنڈوں سے ان لوگوں کو حق کی طرف مائل نہ ہونے دیتے تھے۔ ۱۱ نبوت کے موسمِ حج میں اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب صورت پیدا کی۔ حضورؐ تبلیغ کرتے کرتے چند ایسے خیموں کے پاس پہنچ گئے جن میں یثرب سے آئے ہوئے کچھ سعید الفطرت لوگ قیام پذیر تھے۔ یہ قبیلہ خزرج کے چھ آدمی تھے۔ یہ لوگ یہود کے قرب اور بعض دوسرے عوامل کی بدولت "نبی آخرالزمان" اور "دینِ ابراہیم" کے نام سے کلیتہً ناآشنا نہیں تھے۔ حضورؐ نے جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور عظمت بیان کی تو وہ بہت متاثر ہوئے اس کے بعد جب آپؐ نے قرآنِ کریم کی چند آیات کی تلاوت فرمائی تو ان کے دل بالکل ہی پگھل گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا، "واللہ یہ تو وہی نبی ہیں جن کا تذکرہ ہر وقت یہود کی زبان پر ہے، دیکھنا یہود کہیں ہم سے قبولِ حق میں سبقت نہ لے جائیں۔" یہ کہہ کر سب اسی وقت کلمۂ شہادت پڑھ کر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ خزرج کی ان خوش بخت ہستیوں کا قبولِ اسلام گویا انصار میں صبحِ سعادت کا طلوع تھا۔ اللہ کے یہ مقدس بندے جب دولتِ ایمان سے مالا مال ہو کر یثرب واپس گئے تو انہوں نے وہاں تندہی سے دینِ حق کی تبلیغ شروع کر دی اور چراغ سے چراغ جلنے لگا۔ چنانچہ اگلے سال ۱۲ نبوت میں بارہ مسلمان (دس خزرجی اور دو اوسی) سرورِ کونینؐ کی زیارت کے لیے مکہ پہنچے۔ حضورؐ کو ان کے آنے کا حال معلوم ہوا تو آپ ایک رات ان کے پاس تشریف لے گئے۔ انہوں نے بڑھ کر حضورؐ کے قدم لیے اور آپؐ کی بیعت سے مشرف

ہوئے۔ واپسی کے وقت ان اصحاب نے حضورؐ سے التجا کی کہ انہیں قرآن پڑھانے اور دین کی باتیں سکھانے کے لیے ایک معلّم عطا کریں۔ حضورؐ نے اس اہم کام کے لیے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو منتخب فرمایا اور انہیں حکم دیا کہ وہ تبلیغ حق اور مسلمانوں کی تنظیم وتعلیم کے لیے یثرب چلے جائیں۔ ایثار وخلوص کا یہ پیکرِ جمیل اپنے آقا ومولا کا حکم پاتے ہی کسی عذر اور تامل کے بغیر اسلام کا پہلا داعی بن کر فوراً یثرب روانہ ہوگیا۔

(۵)

حضرت مصعبؓ بن عمیر نے یثرب میں اپنی ذمہ داریوں کو نہایت احسن طریقہ سے نباہا۔ ان کی سادگی، پاکبازی، انکسار، شیریں مقالی اور بلند اخلاقی نے چپکے چپکے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا شروع کر دیا۔ ان کا معمول تھا کہ اپنی قیام گاہ (حضرت اسعدؓ بن زرارہ کے مکان) پر لوگوں کو بلاتے اور انہیں دین کی باتوں کی تعلیم دیتے۔ اس کے علاوہ وہ اکثر اوس اور خزرج کے مختلف محلوں اور گھروں کا چکر لگاتے اور لوگوں کو ایسے بلیغ اور احسن انداز میں اسلام کی دعوت دیتے کہ وہ لامحالہ اس سے متاثر ہو جاتے تھے۔ ان کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ ادھر اُدھر جاتے وقت کندھے پر کمبل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لٹکا لیتے تھے جو اگلی طرف سے ببول کے کانٹوں سے اٹکا ہوتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ لوگوں کی توجہ اور التفات کا مرکز بن گئے اور ان کی تبلیغی مساعی سے اہلِ یثرب جوق در جوق دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ ان میں اوس اور خزرج کے بڑے بڑے رؤسا بھی شامل تھے، اوس میں سے حضرت سعدؓ بن معاذ اور اسیدؓ بن حضیر الکتائبؓ اور خزرج میں سے حضرت سعدؓ بن عبادہ، ابوایوبؓ انصاری، اور سعدؓ بن ربیع جیسے ذی اثر اصحاب کے قبولِ اسلام سے یثرب میں اسلام کو بڑی وسعت حاصل ہوئی۔ دعوت وتبلیغ کے ساتھ ساتھ حضرت مصعبؓ مسلمانانِ یثرب کی تنظیم اور تعلیم سے بھی غافل نہ رہے۔ ایک طرف تو انہوں نے سرورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے (حضرت سعدؓ بن خثیمہ کے مکان پر) باجماعت نماز جمعہ کی بناء ڈالی اور دوسری طرف نومسلم انصار کو بڑی محنت سے دینی تعلیم دی اس طرح چند ماہ کے اندر اندر یثرب کی گلی گلی اور کوچے کوچے میں

خدائے واحد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ خیر ہونے لگا۔

اگلے سال ۱۳؁ نبوت میں دینِ حق کا یہ کامیاب داعی تہتر مردوں اور دو عورتوں کو ساتھ لے کر حج کے لیے مکہ پہنچا۔ حضرت مصعبؓ کو نہ اپنا گھر یاد آیا اور نہ والدین، سیدھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنے قیامِ مدینہ کے تمام حالات و واقعات کی تفصیل سنائی۔ حضورؐ سن کر بہت مسرور ہوئے اور انہیں دعائے خیر دی۔ حضرت مصعبؓ کے پاک نفس ہمراہی ان کی تبلیغ سے اتنے متاثر تھے کہ وہ جلد از جلد حضورؐ کے شربتِ دیدار سے اپنی پیاس بجھانا چاہتے تھے لیکن سارا مکہ علمبرداران حق کا جانی دشمن بنا ہوا تھا اس لیے احتیاط لازم تھی۔ چنانچہ رات کی تاریکی میں حضورؐ ان کے پاس تشریف لے گئے اور سب کو اپنی بیعت سے مشرف فرمایا۔

حضرت مصعبؓ کی ماں کو جب بیٹے کے آنے کی خبر ہوئی تو اس نے انہیں بلا بھیجا۔ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو اس نے انہیں بے حد لعنت ملامت کی اور رو رو کر ان سے کہا کہ بیٹے اس نئے دین کو چھوڑ دو تاکہ تمہارے لیے میری آغوشِ محبت پھر وا ہو جائے حضرت مصعبؓ نے جواب دیا۔ "ماں میں نے اللہ کے پسندیدہ دین کو برضا و رغبت قبول کیا ہے، اسے ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔" اب ماں دھمکیوں پر اتر آئی اور کہا کہ تمہارا علاج وہی ہے جو تمہارے حبش جانے سے پہلے کیا گیا تھا۔

حضرت مصعبؓ نے بھی جرأت کے ساتھ جواب دیا:۔

"ماں! کیا تو مجھے زبردستی میرے دین سے پھیر سکتی ہے، یاد رکھ اگر اب کسی نے مجھے ایذا دینے کا ارادہ کیا تو میں اسے قتل کر دوں گا۔"

اب اُن کی ماں بے بس ہو کر بے تحاشا رونے لگی۔ حضرت مصعبؓ نے اسے نہایت نرمی سے سمجھایا۔ "ماں ازراہِ خیر خواہی تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لے آؤ، تمہاری بھلائی اسی میں ہے۔"

لیکن کفر و شرک ماں کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا:۔

"کواکبِ درخشندہ کی قسم میں ہرگز تیرا دین قبول نہیں کروں گی۔ بجا میری آنکھوں

سے دور ہو جا۔"

حضرت مصعبؓ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں واپس آگئے اور ان کے بہتر ساتھیوں نے یثرب کو معاودت کی۔ ان نفوسِ قدسی نے بیعت کے وقت یہ عہد کیا تھا کہ اگر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے شہر کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے نوازیں تو وہ حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کی اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ مدد اور حفاظت کریں گے۔ چنانچہ ان کے واپس جانے کے بعد حضورؐ نے صحابہؓ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ اپنے آقا و مولاؐ کا ایما پا کر ستم رسیدہ مسلمانوں نے اس نئے دارالامن کی طرف ہجرت کا آغاز کر دیا اور دو تین ماہ کے اندر اندر ان کی ایک معقول تعداد مدینہ پہنچ گئی۔ ان میں حضرت مصعبؓ بن عمیر بھی شامل تھے۔ انھوں نے سرورِ عالمؐ کی ہجرت سے صرف بارہ دن پہلے ارضِ مکہ کو الوداع کہا اور مدینہ پہنچ کر سید الاوس حضرت سعدؓ بن معاذ کے ہاں قیام کیا۔ چند دن بعد سرورِ کونینؐ بھی ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے آئے اور مسلمانوں کی مدنی زندگی کا آغاز ہو گیا۔

(۶)

ہجرت کے بعد ابتدائی پانچ مہینوں میں انصار کے گھر مہاجرین کے لیے مہمان خانۂ عام تھے لیکن یہ زندگی اور صورتِ حال منظم نہ تھی اس لیے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کی پرورش اور کفالت کے لیے ایک سہل مگر مستقل اور منظم طریقِ کار کی ضرورت محسوس فرمائی چنانچہ ہجرت کے پانچ ماہ بعد آپؐ نے حضرت انسؓ بن مالک کے وسیع مکان میں انصار و مہاجرین کو جمع کیا اور ان کے مابین عقدِ مواخاۃ قائم فرمایا۔ آپؐ ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری کو بلاتے اور ان سے مخاطب ہو کر فرماتے۔ "آج سے تم دونوں بھائی بھائی ہو۔" اس مبارک مجلس میں حضرت مصعبؓ بن عمیر کا رشتۂ مواخاۃ میزبانِ رسول حضرت ابو ایوب انصاریؓ رئیس بنو نجار سے قائم کیا گیا۔

ہجرت کے بعد بھی حضرت مصعبؓ برابر دعوت و تبلیغ اور وعظ و تذکیر میں مشغول رہے ــــــ سنہ ۲ ہجری میں غزوۂ بدر کے موقع پر وہ ان تین سو تیرہ نفوسِ قدسی

میں سے ایک تھے جنھوں نے اپنی استقامت و عزیمت اور اخلاص و ایثار کے انمٹ نقوش صفحۂ تاریخ پر ثبت کیے اور جنھیں "اصحاب بدر" کا عظیم الشان لقب مرحمت ہوا۔ حق و باطل کے اس معرکۂ اول میں انھیں یہ خصوصی شرف بھی حاصل ہوا کہ سرورِ عالمؐ نے انھیں مہاجرین کا سب سے بڑا عَلَم عنایت فرمایا۔

۳ھ ہجری میں جنگ اُحد پیش آئی تو اس میں بھی حضورؐ نے علمبرداری کا شرف حضرت مصعبؓ کو عطا فرمایا۔ جب ایک اتفاقی غلطی سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر مشہور ہوگئی تو اس وقت مسلمانوں کے تین گروہ ہوگئے۔ ایک گروہ نے کہا۔ "رسول اللہؐ کے بعد لڑنے سے کیا حاصل؟" اور یہ کہہ کر مدینہ کی طرف چل دیا۔

دوسرے گروہ نے کہا۔ "حضورؐ کے بعد جینے سے کیا حاصل؟" اور یہ کہہ کر حصولِ شہادت کی خاطر مردانہ وار لشکرِ کفار میں گھس گیا۔

تیسرا گروہ وہ تھا جو حضورؐ کے گرد حصار بنا کر حفاظت کر رہا تھا۔ یہ صرف چودہ جانبازوں پر مشتمل تھا۔

حضرت مصعبؓ بن عمیر شہادت کے جویا ثابت قدم مجاہدین کے دوسرے گروہ میں شامل تھے۔ ان کا سینہ علمِ دین کا مخزن تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر سُنی تو زبان پر بے اختیار یہ آیت جاری ہوگئی:۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (سورہ آلِ عمران)	اور محمدؐ تو ایک رسول ہیں ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں [1]

اس کے ساتھ ہی انھوں نے بلند آواز سے نعرہ لگایا:۔

"میں رسول اللہؐ کا عَلَم سرنگوں نہیں ہونے دوں گا۔"

---

[1] علامہ شبلیؒ نے سیرۃ النبیؐ میں لکھا ہے کہ "مصعبؓ صورت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم

یہ کہکر ایک ہاتھ میں شمشیر برہنہ اور دوسرے میں علم لیے کفار پر ٹوٹ پڑے۔ مشرکین کے مشہور شہسوار ابنِ قمیئہ نے بڑھ کر تلوار کا وار کیا اور ان کا داہنا ہاتھ شہید کر ڈالا حضرت مصعبؓ نے فوراً بائیں ہاتھ میں علم تھام لیا۔ ابنِ قمیہ نے دوسرا ہاتھ بھی شہید کر دیا۔ انھوں نے کٹے ہوئے بازوؤں کا حلقہ بنا کر علم کو سینے سے چمٹا لیا۔ گویا تہیہ کر رکھا تھا کہ جب تک سانس میں سانس ہے پرچم اسلام کو سرنگوں نہ ہونے دیں گے۔ بدبخت ابنِ قمیئہ نے اب جھنجلا کر ان پر نیزے کا ایک ایسا بھرپور وار کیا کہ اس کی انی ٹوٹ کر حضرت مصعبؓ کے علم و عشق سے معمور مقدس سینے میں رہ گئی اور وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ جونہی وہ گرے ان کے بھائی ابوالرومؓ بن عمیر نے آگے بڑھ کر علم سنبھال لیا اور لڑائی ختم ہونے تک اس کو تھامے ہوئے حقِ شجاعت ادا کرتے رہے۔ جنگ کے بعد اس علم کو سرنگوں کیے بغیر مدینہ لائے۔

جب قریش میدانِ جنگ سے واپس چلے گئے اور مسلمان اپنے شہداء کی تجہیز و تکفین کی طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ مکہ کے جوانِ رعنا مصعبؓ چہرہ کے بل گرے ہوئے خاک و خون میں غلطاں ہیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی شہادت سے سخت صدمہ پہنچا۔ آپؐ اس پیکرِ علم و عمل کی لاش کے قریب کھڑے ہو گئے اور یہ آیت تلاوت فرمائی:-

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا

"مومنین میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے اللہ سے جو عہد کیا اسے سچ کر دکھایا۔ بعض ان میں اپنی مدت پوری کر چکے ہیں اور بعض ابھی انتظار کر رہے ہیں اور اپنے ارادہ میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا۔"[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سے مشابہ تھے وہ شہید ہوئے تو یہ خبر مشہور ہو گئی کہ حضورؐ شہید ہو گئے۔ ہم نے جو متذکرہ واقعہ بیان کی ہے وہ طبقات ابنِ سعد سے ماخوذ ہے۔ [1] صحیح بخاری میں حضرت انسؓ بن مالک سے

اس کے بعد آپؐ نے آبدیدہ ہوکر فرمایا :-

"میں نے مکہ میں تمہارے جیسا حسین اور خوش لباس اور کوئی نہ دیکھا تھا لیکن آج دیکھتا ہوں کہ تمہارے بال گرد آلود اور الجھے ہوئے ہیں اور تمہارے جسم پر صرف ایک چادر ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تم لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر رہو گے۔"

پھر آپؐ نے حضرت مصعبؓ کی تکفین کا حکم دیا۔ اس شہیدِ راہِ حق کی چادر اتنی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) روایت ہے کہ یہ آیت ان کے چچا حضرت انسؓ بن نضر کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ حضرت انسؓ بن نضر کا شمار بڑے جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے۔ وہ خاندان بنو نجار کے رُؤسا میں سے تھے اور رشتہ میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پردادی سلمیٰ کے بھتیجے ہوتے تھے۔ بیعت عقبۂ ثانیہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ غزوۂ بدر میں کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ اس کا دلی صدمہ تھا۔ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی "یا رسول اللہ افسوس کہ میں غزوۂ بدر میں شریک ہونے سے رہ گیا اگر اللہ نے مجھے مہلت دی تو دنیا دیکھے گی کہ آئندہ میں کیا کرتا ہوں۔"

غزوۂ احد میں بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔ حضورؐ کی شہادت کی خبر سن کر مسلمانوں میں سراسیمگی پھیلی تو حضرت انسؓ آگے بڑھے۔ راستے میں حضرت سعدؓ بن معاذ سے ملاقات ہوئی تو کہا۔ "سعد کہاں جاتے ہو۔ خدا کی قسم مجھے احد کی طرف سے جنت کی خوشبو آرہی ہے۔" یہ کہہ کر شمشیر بدست کفار کے مجمع میں گھس گئے اور زخم پر زخم کھاتے اس وقت تک لڑتے رہے جب تک زندگی نے ساتھ دیا۔ سارا جسم زخموں سے چھلنی ہو گیا تھا اور لاش پہچانی نہ جاتی تھی ان کی بہن ربیعؓ بنت نضر نے ہاتھ کی انگلی سے پہچانا۔ جسم پر تیر، نیزے اور تلوار کے اسّی زخم تھے۔

حضرت انسؓ بن مالک فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میری پھوپھی۔ ربیع بنت نضر کے ہاتھ سے ایک انصاری لڑکی کا دانت ٹوٹ گیا۔ اس کے لواحقین نے قصاص کا دعویٰ کیا اور حضورؐ نے قصاص کا حکم صادر فرما دیا۔ انسؓ بن نضر کو خبر ملی تو تڑپ اٹھے اور حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی "یا رسول اللہ خدا کی قسم ربیع کا دانت نہ توڑا جائے گا۔" حضورؐ نے فرمایا "اللہ کا یہی حکم ہے۔" خدا کا کرنا لڑکی کے ورثا

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ)

چھوٹی تھی کہ اس سے سر ڈھانپا جاتا تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں مستور کیے جاتے تو سر برہنہ ہو جاتا۔ بالآخر حضورؐ نے فرمایا کہ سر چادر سے ڈھانپ دو اور پاؤں کو "اذخر" گھاس سے چھپا کر اس شہیدِ حق کو سپردِ خاک کر دو۔ صحابہؓ نے حکم کی تعمیل کی اور یوں وہ پیکرِ صدق و صفا دنیائے ظاہر بین کی نگاہوں سے ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گیا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را
بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

حضرت مصعبؓ کی شادی مشہور صحابیہ حضرت حمنہؓ بنتِ جحش (سرورِ عالمؐ کی پھوپھی زاد بہن) سے ہوئی تھی، ان سے ایک خوردسال بچی زینب اپنی یادگار چھوڑی۔

(۷)

حضرت مصعبؓ بن عمیر کا شمار اجل صحابہ میں ہوتا ہے۔ انھوں نے عین جوانی کے عالم میں عیش و تنعم کی زندگی یکایک محض اللہ کے لیے ترک کر دی اور راہِ حق میں ایسے ایسے مصائب جھیلے کہ ان کا حال پڑھ کر جھرجھری آ جاتی ہے۔ حضرت مصعبؓ کی عسرت و مصیبت کو دیکھ کر نہ صرف اصحاب کرامؓ بلکہ فخرِ موجودات حضورؐ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بھی آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ لیکن خود حضرت مصعبؓ کے صبر و شکر اور استغنا کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت ہشاش بشاش رہتے تھے اور لذاتِ دنیوی کو یکسر فراموش کر دیا تھا۔

حضرت مصعبؓ سابقون اولون کے اس مقدس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں راہِ حق میں تین ہجرتوں کا شرف حاصل ہوا۔ مدینہ منورہ میں ان کی تبلیغی مساعی کے جو نتائج برآمد ہوئے وہ تاریخ اسلام کا ایک روشن باب ہیں۔ علم و فضل کے اعتبار سے ان کا پایہ اتنا بلند تھا کہ بعض صحابہ کو ان پر رشک آتا تھا۔ میدانِ احد میں ان کی تکفین جس طریقے سے ہوئی وہ بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کے لیے مدت العمر مایۂ عبرت بنی رہی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) دیت لینے پر راضی ہو گئے اور ربیع کا دانت بچ گیا۔ اس موقع پر حضورؐ نے فرمایا کہ خدا کے بعض بندے ایسے بھی ہیں کہ جب قسم کھاتے ہیں تو خدا ان کی قسم پوری کر دیتا ہے۔

عبدالرحمنؓ بن عوف کے سامنے (پرتکلف) کھانا آیا تو ان کو ابتدائے اسلام کا زمانہ یاد آگیا۔ بولے۔ "مصعبؓ بن عمیر مجھ سے بہتر تھے وہ شہید ہوئے اور ایک چادر کے سوا ان کو کفن میسر نہ ہوا..... ہمیں شاید دنیا ہی میں سب نعمتیں دے دی گئیں۔" یہ کہہ کر رونے لگے اور کھانا چھوڑ دیا گئی اور روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے درمیان جب کبھی حضرت مصعبؓ کا ذکر آجاتا تھا تو وہ چشم پرآب ہوجاتے تھے اور ان کی زبان سے اس مرد حق کے لیے سلام اور مغفرت کی دعا نکلتی تھی۔

رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ

رفتارِ کار

رُودادِ سفر

امیر تنظیم کا حالیہ دورۂ امریکہ

جولائی ۸۷ء کا بیشتر حصہ امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے قیم تنظیم برائے بیرونی ممالک' جناب قمر سعید قریشی صاحب کے ساتھ امریکہ میں گذارا۔ اس دورے کی مختصر روداد قمر سعید صاحب کی زبانی نذر قارئین ہے...... (ادارہ)

انکل سام کا وطن اور ہماری نئی نسل کے خوابوں کی جنت...... امریکہ...... سات آٹھ سال پہلے تک امیر تنظیم اسلامی کے لئے بھی ایسا ہی اجنبی دیس تھا جیسا ہم میں سے اکثر کے لئے آج تک ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی تاریخ پرانی نہیں' چند ہی صدیاں گذری ہیں کہ کرہ ارض پر اس کی موجودگی دریافت ہوئی اور پھر یورپ سے بھگوڑوں کے قافلے جن میں دیوالیہ کاروباری' مفرور ملزم' معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے لوگ اور جرائم پیشہ خاندان زیادہ اور مہم جو کم تھے' اس وسیع و عریض براعظم کا رخ کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان نووارد لوگوں نے جن میں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے اور یورپ کے کونے کونے کی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرنے والے شامل تھے "ریڈ انڈینز" کی مختصر مقامی آبادی کو ٹھکانے لگا کر اپنے دوسرے ہم وطنوں کے لئے راستہ صاف کر دیا اور یوں دنیا کے نقشے پر ایک نئی قوم کا ایک نیا وطن وجود میں آیا۔ پھر یہ بات بھی پرانی نہیں کہ حقوق انسانی اور حریت و مساوات کی یہ سب سے بڑی علمبردار قوم غلامی کی بدترین شکل کی موجد بنی۔ افریقہ سے انسانوں نے انسانوں کے ریوڑ ہانک کر عظیم دخانی جہازوں میں پابہ زنجیر کئے اور اپنے نئے وطن کی نوک پلک سنوارنے کے لئے افرادی قوت کا یہ ظالمانہ انتظام سالہاسال وہاں رائج رہا۔ اب لوہے کی وہ زنجیریں تو متروک ہو گئی ہیں لیکن وہاں کی خوش حالی اور متاع دنیا کی افراط کا سنہرا جال آج بھی دنیا بھر سے ذہین و فطین اور امنگ و ولولے سے سرشار لوگوں کو مسلسل زیر دام لا رہا ہے۔ برصغیر پاک و ہند بھی اس سے بیگانہ رہ

سکا۔ یہاں سے جوہر قابل کچے دھاگے سے بندھا اس طرف کو کھنچتا چلا گیا۔ پچھلے چالیس سالوں سے یہ عمل جاری و ساری ہے لیکن ایک مرحلے پر اسے ایسی مہمیز لگی کہ باید و شاید۔ سقوط حیدر آباد دکن کے بعد ہند کے مثالی گہوارہ علم و فن یعنی عثمانیہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں نے بالخصوص اور بھارت کی جامعات سے قابل قدر فنی ڈگریاں حاصل کرنے والے مسلمانوں نے بالعموم جب اپنے لئے ترقی اور کسب معاش کے دروازے یکے بعد دیگرے بند ہوتے دیکھے تو...... "ملک خدا تنگ نیست۔ پائے گدا لنگ نیست" ...... کہتے ہوئے نکل کھڑے ہوئے۔ ان میں سے اکثر تو براہ راست اس نئی دنیا میں آنکلے اور کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے قسمت آزمانے اور ملک خداداد کو اپنی صلاحیتوں سے نوازنے کے لئے پہلے پاکستان کا رخ کیا لیکن یہاں بھی حالات ساز گار نہ پائے تو جادہ پیمائی پھر ان کا بھی مقدر ٹھہری۔

یوں ایک ایک کر کے لاکھوں ہندوستانی اور پاکستانی مسلمان امریکہ جا پہنچے اور وہیں کے ہو رہے۔ بہت سے تو اپنا تشخص کھو کر خواہی نخواہی اسی تہذیب و تمدن کا حصہ بن چکے ہیں لیکن ہمارے ایسے بھائیوں کی بھی وہاں کمی نہیں جنہیں اپنی ذات سے زیادہ اگلی نسل کی فکر ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ مادہ پرستی کی اس چکاچوند میں ان کی اولادیں گم ہو کر رہ جائیں۔ حیلوں بہانوں سے وہ اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو یاد دلانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ ؎

جگہ دل لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کی نظر کو خوگر محسوسات بنا کر ہی تو امتحان میں ڈالا ہے۔ طالب آخرت مسلمانوں کے لئے وہاں کا ماحول روز بروز مسموم تر ہوتا جا رہا ہے تاہم آزادی و خوشحالی کے اسیر اللہ کے ان بندوں کی بے بسی دیدنی ہے کہ جائے ماندن تو بہت دلکش و دلفریب ہے لیکن پائے رفتن میں سونے کی بھاری زنجیر پڑ چکی ہے۔ مشکل یہ بھی تو ہے کہ ڈالر آج تک کھرا ہے۔ "زر کم عیار" نہیں ہوا۔ دور کی بات نہیں کہ سوا چار روپے کا ہوتا تھا اب ساڑھے سترہ کا ہے......

امریکہ میں آباد یا مقیم پاکستانی اور بھارتی مسلمانوں کی عظیم اکثریت اپنے اپنے میدان میں اعلیٰ ترین تعلیمی قابلیت یا فنی مہارت کے حامل لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں دین کے نام پر برطانیہ کی طرح فرقہ وارانہ مذہبیت نے رواج نہیں پایا بلکہ سنجیدہ فکر اور عمدہ مزاج نے فروغ پایا ہے۔ مقامی طور پر

بھی وقتاً فوقتاً مختلف تنظیمیں علمی اور سماجی سطح پر دین کا کام کرتی رہی ہیں اور باہر سے بھی ایسے ہی لوگوں کی سوچ کو قبول عام حاصل ہوا جو اسلام کے پیغام کو دور جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھنے کی صلاحیت سے نوازے گئے ہیں۔ امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے بھی پچھلے سات آٹھ سالوں میں تقریباً ہر سال ایک بار (بلکہ ایک دفعہ تو سال میں دو چکر ہو گئے تھے) امریکہ اور کینیڈا کا دورہ کیا ہے۔ ان دوروں کے آغاز کی تقریب ہمارے قارئین بارہا پڑھ چکے ہیں لہٰذا تکرار کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس سال کی قابل ذکر بات یہ تھی کہ امیر محترم اپنے طور پر بھی اور تنظیم کے بزرگ رفقاء کے مشورے کے تحت بھی، یہ فیصلہ کئے بیٹھے تھے کہ وہاں وقت لگانا نتائج کے اعتبار سے چنداں سود مند نہیں رہا۔ ان کے انقلابی فکر کی تخم ریزی تو وہاں ہو چکی ہے۔ اب وہ لوگ خود دوسروں کو جگانے کا کام کریں جو اس اذان کو سن کر خود فراموشی کے خواب سے بیدار ہو چکے ہیں۔ امیر محترم کی محنت نے متعدد ساتھیوں کے دلوں میں ایمان کی جوت جگائی ہے اور ان میں سے بعض نے دین کے لئے ایثار و قربانی کی منفرد مثالیں بھی قائم کیں۔ چند ایک تو "دور درشن" سے غیر مطمئن ہو کر بوریا بستر لپیٹ واپس پاکستان آ گئے کہ قافلے میں شریک ہو کر اس کی انقلابی جدوجہد میں عملاً شریک ہوں۔ لیکن یہاں آئے تو دنیا ہی بدلی ہوئی پائی۔ پندرہ بیس سال یا زائد امریکہ یا کینیڈا میں رہنے کے بعد وہ یہ بھول چکے تھے کہ معمول کے کام کرانے کے لئے بھی خوشامد، سفارش اور رشوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں یاد نہ رہا تھا کہ دروغ گوئی، دھوکے اور سوانگ کے بغیر اپنا حق حاصل کرنا تو کجا اسے محفوظ رکھنا بھی ناممکن ہے، وہ فراموش کر بیٹھے تھے کہ اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت یہاں خود کی جاتی ہے، حکومت پر تکیہ کرنا فاش غلطی ہے۔ انہیں یہ وہم بھی لاحق ہو گیا تھا کہ شرف انسانیت مشرق کے مسکینوں کا بھی حق ہے اور یہ مغالطہ بھی کہ غذا اور ادویہ میں ملاوٹ، باتوں میں بناوٹ، گلی کوچوں کی نجاست اور قلوب کی قساوت کو آزادی کی نعمت نے اب تک نیست و نابود کر دیا ہو گا۔ چنانچہ بے کسی اور لاچاری کی دیواروں سے سر ٹکرا کر انہیں واپس جاتے ہی بنی ... عادتیں خراب جو ہو چکی تھیں ... ایسے دوستوں کے جذبے اور خلوص نے امیر محترم کے لئے تو یقیناً توشہ آخرت فراہم کر دیا ہے لیکن تنظیم کی دعوت کو اس سے خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا جس کا اولین ہدف پاکستان اور اہل پاکستان ہیں۔ امریکہ میں ہمارے ساتھیوں کو یہ ساری بات معلوم تھی لہٰذا وہ تو صبر کئے بیٹھے تھے لیکن ایک اور سمت سے تقاضا آنا شروع ہوا اور باوجود کئی بار عذر پیش کرنے کے انہوں نے ایسا انداز اختیار کیا کہ ع

اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

آگے بڑھنے سے پہلے عرض کر دوں کہ قیم برائے بیرونی ممالک کے طور پر تقرری کے بعد پچھلے سال میں بھی دورہ امریکہ میں امیر محترم کے ہمرکاب تھا اور اس کے بعد سے میرا شمالی امریکہ میں رفقائے تنظیم اسلامی سے بذریعہ خط و کتابت بھی خاصا ہی جاندار رابطہ موجود تھا اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' اسی پر اکتفا کا ارادہ تھا۔ اس رابطے سے پہلے کی صورت حال ہمارے کام کے اعتبار سے غیر تسلی بخش تھی بایں معنی کہ ہمارے اور ان ساتھیوں کے درمیان تعارف کا واحد ذریعہ امیر محترم کی ذات اور ان کی یادداشت تھی۔ امریکہ میں مختلف مقامات پر متعدد مجالس میں جہاں ہزاروں سامعین سے ان کا واسطہ پڑتا وہیں سینکڑوں ایسے ساتھیوں سے بھی تعارف ہو جاتا تھا جو آگے بڑھ کر قدم سے قدم ملانے کے خواہاں ہوتے۔ امریکہ کے قیام کے دوران تو امیر محترم کے ذہن میں ان کے نقوش تازہ رہتے لیکن پاکستان واپسی کے بعد انہیں یہاں کی دنیا ان کی یاد سے بیگانہ کر دیتی تھی۔ پھر حال یہ ہوتا کہ کسی کی صورت آنکھوں میں پھرتی ہے تو اس کا نام اور مقام نامعلوم اور کوئی نام یاد آتا ہے تو ذہن کی سکرین سے اس کی شکل معدوم۔ اس عمومی حالت سے استثنا معدودے چند رفقاء کو حاصل تھا جنہیں ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کا مقام میسر ہے...... الحمدللہ کہ یہ خدمت ناچیز کے سپرد ہوئی کہ تعلق برقرار رہے اور بار بار تجدید کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ اسی باعث اس بار بھی مجھے امیر محترم کی معیت نصیب ہوئی۔

اس دورہ کی دعوت کئی ماہ قبل برادرم عمر احمد کی طرف سے موصول ہوئی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ "اسنا" یعنی اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کے سالانہ کنونشن جو سانتا کلارا کیلی فورنیا میں منعقد ہو رہا تھا' ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ضرور شرکت فرمائیں۔ ان سے معذرت کی گئی لیکن ادھر سے اصرار بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ رمضان المبارک میں ان کی طرف سے جو ذاتی نوعیت کا خط موصول ہوا اس میں حسن طلب کا وہ جادو تھا جسے بجا طور پر یہ حق پہنچتا تھا کہ سر چڑھ کے بولے۔ انہی دنوں ٹورنٹو (کینیڈا) میں تنظیم اسلامی کے امیر برادرم ڈاکٹر عبدالفتاح کی طرف سے کمک کی طلب بھی آ گئی۔ ان کی مقامی تنظیم نے امریکہ کے عظیم صنعتی شہر "ڈیٹرائٹ" میں ہماری دعوت کو پھیلانے کا اتنا کام کر لیا تھا کہ اب وہ ضروری سمجھتے تھے کہ امیر محترم کو زحمت دیں تاکہ ان کے کام کے اثرات کو محکم بنایا جا سکے۔ سو طوعاً

کرہاپروگرام بنایا گیا کہ معمول سے بہت کم وقت کا ایک مختصر دورہ ترتیب دے لیا جائے۔

آگے بڑھنے سے پہلے برادرم عمر احمد کا تعارف کرانا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگرچہ پچھلے سفر امریکہ کی روداد میں ان کا ذکر آچکا ہے لیکن تجدید ملاقات کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ ہمارے یہ بھائی بلحوطن فلسطینی ہیں اور اب اردن میں آباد ہیں۔ بنیادی طور پر ان کا تعلق اخوان المسلمون سے ہے لیکن دین کے لئے تحریکی کام کسی طرف سے ہو رہا ہو' وہ بلا کسی تعصب کے ہراول دستے میں شامل ہوتے ہیں۔ ان دنوں کیلیفورنیا کی ایک مقامی یونیورسٹی میں الیکٹریکل انجینئرنگ میں ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔ نہایت ہی اعلیٰ کردار کے صالح اور سلجھے ہوئے نوجوان ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایمان و عمل میں مزید ترقی دے۔ آمین۔

"اسنا" مقامی طور پر ہی نہیں بلکہ پورے شمالی امریکہ میں مصروف عمل ہے۔ امریکہ اور کینیڈا میں جہاں جہاں پاکستان کی جماعت اسلامی اور دیار عرب کی اخوان المسلمون سے وابستہ لوگ موجود ہیں وہاں وہاں انہوں نے اس نام سے اپنے آپ کو منظم اور متحرک رکھا ہوا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک اس کا نام ایم۔ ایس۔ اے یعنی مسلم سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن تھا جس کی روح رواں اسلامی جمعیت طلباء اور اخوان کے طلباء تھے۔ بعد میں اسے وسعت دے کر "اسنا" کا نام دیا گیا۔ اس کا صدر دفتر ریاست انڈیانا پولس میں وسیع رقبے پر قائم اور سرگرم عمل ہے۔

۲۸ جون کو امیر محترم اور راقم الحروف ساڑھے گیارہ بجے دن کی فلائٹ سے کراچی روانہ ہوئے برادرم واحد علی رضوی بھی مشاورت کے اجلاس سے فارغ ہو کر ساتھ ہو لئے تھے۔ کراچی ایئرپورٹ پر سراج الحق سید صاحب استقبال کے لئے موجود تھے' قیام بھی انہی کے مکان پر رہا جو ہوٹلوں کی اشتہاری زبان میں لاہور سے باہر امیر محترم کا دوسرا گھر ہے (آگے آگے اور کئی گھروں کا ذکر آئے گا) قریبی مسجد میں نماز عصر کے لئے گئے تو رفیق گرامی قاضی عبدالقادر صاحب بھی وہیں پہنچے ہوئے تھے۔ نماز مغرب کے بعد تاج محل ہوٹل کے آڈیٹوریم میں "شام الہدیٰ" کا پروگرام تھا جہاں امیر محترم نے "سیرت نبویؐ آئینہ قرآنی میں" کے عنوان کے تحت خطاب کیا۔ ہال بھرا ہوا تھا اگرچہ ہجوم کی وہ سابقہ کیفیت دیکھنے میں نہ آئی جو اس پروگرام کا مستقل فیچر رہی ہے کہ سیڑھیاں تک بھر جاتی تھیں اور بلا مبالغہ تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی تھی۔ ظاہری وجوہات دو تھیں' پروگرام کے انعقاد میں پچھلے کئی ماہ کی بے قاعدگی اور ملک کے غیر یقینی سے حالات کا اثر۔ واللہ اعلم بالصواب۔ حیدر آباد سے جناب سرفراز احمد خان صاحب تشریف لائے ہوئے تھے اور برادرم عبدالقادر (امیر تنظیم اسلامی حیدر آباد) بھی۔

پروگرام پونے نو بجے سے گیارہ بجے شب تک چلتا رہا۔ نماز عشاء سے فارغ ہو کر گھر پہنچتے تک بارہ بج چکے تھے۔ اگلے روز (۲۹ر جون) دن بھر کراچی کے رفقاء کا تانتا بندھا رہا۔ بھائی عبدالواحد عاصم' قاضی عبدالقادر' عبدالخالق' طارق جمیل اور طارق امین رونق بزم رہے۔ رات کو ساڑھے گیارہ بجے طارق امین صاحب ہی ایئرپورٹ پہنچانے آئے جہاں پہنچتے تک تاریخ بدل چکی تھی۔ "چیک ان" اور چیکنگ کے مراحل سے گزر کر لاؤنج تک رسائی ہوئی۔ پی آئی اے کی پرواز پی کے ۷۰۳ نے ٹھیک وقت پر ۳۰ر جون کی صبح دو بج کر بیس منٹ پر اپنے پر کھولے اور دوبئی' قاہرہ اور پیرس رکتے ہوئے ہمیں اسی سہ پہر سوا چار بجے جے۔ ایف۔ کے ایئرپورٹ نیویارک جا اتارا۔ (یہ علیحدہ بات ہے کہ پاکستان میں اس وقت یکم جولائی کی صبح کاذب کا وقت تھا)۔ امیگریشن پر معمول سے زیادہ رش تھا۔ موسم گرما کی تعطیلات لوگوں کو دور و نزدیک سے کھینچ کر یہاں لے آتی ہیں لیکن بہرحال بشمول کسٹم متعلقہ امریکی عملے کی روایتی شائستگی اور مستعدی نے گرانی کا احساس نہ ہونے دیا۔ پھر بھی باہر نکلتے نکلتے ساڑھے پانچ بج گئے جبکہ ہمیں پانچ بجے اگلی فلائٹ پکڑنی تھی جو ظاہر ہے کہ "مس" ہو گئی۔ باہر برادرم الطاف احمد' رفیق تنظیم اسلامی موجود تھے جنہوں نے ہماری اگلی منزل کے میزبان برادرم ڈاکٹر خورشید ملک کو ایئرپورٹ سے ہی شکاگو فون پر ہماری "نارسائی" کی اطلاع دے دی تاکہ انہیں وہاں پریشانی نہ ہو اور ہمیں اپنے گھر (نہیں۔ نیویارک میں امیر محترم کے تیسرے گھر) لے گئے۔ دن کی غیر معمولی طوالت نے امیر محترم کے جسمانی نظام الاوقات کو درہم برہم کر دیا تھا جو اس گھر کے آرام و سکون نے بحال کیا۔ نماز مغرب کے بعد ڈاکٹر خورشید ملک صاحب کا فون موصول ہو گیا کہ شکاگو کے لئے ۹۵۵ء کی پرواز پکڑ لیں چنانچہ ہم پھر بھائی الطاف احمد کی گاڑی میں تھے جس نے گھنٹہ بھر کی مسافت طے کر کے ہمیں نیوارک ایئرپورٹ پہنچایا۔ ذرا سی تاخیر ہو جاتی تو ہم اس فلائٹ کو بھی نہ پکڑ سکتے۔ شکاگو ایئرپورٹ پر ڈاکٹر خورشید ملک اور سید پیر محمد نے ہاتھوں ہاتھ لیا لیکن ڈاکٹر صاحب کے مخصوص امریکی انداز کے وسیع و عریض دولت خانے (شکاگو میں امیر محترم کے چوتھے گھر اور امریکہ میں ان کے اکلوتے "حجرے") تک پہنچنا لگ بھگ چالیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی ممکن تھا۔ حجرے میں وارد ہوئے تو رات کا ایک بج رہا تھا۔

یکم جولائی کی صبح ناشتے میں ڈاکٹر طور بھی شریک تھے۔ ناشتے سے فراغت کے بعد ہم نے ظہر تک آرام کیا جس سے تکان بڑی حد تک دور ہوئی اور ہم خود کو چاق چوبند محسوس کرنے لگے۔ ظہر کے بعد ڈاکٹر

عرفان ملاقات کے لئے تشریف لائے جو تحریک اسلامی کے مقامی حلقے سے وابستہ ہیں۔ کچھ دیر بعد عتیق صاحب بھی آ گئے اور پھر تنظیم اسلامی کے مقامی رفقاء جمع ہوتے گئے۔ نماز مغرب ڈاکٹر طور کے ہاں ادا کی۔ انہوں نے رات کے کھانے کا اہتمام بھی کیا تھا۔ پر تکلف ضیافت اور ان کی محبت پر اظہار سپاس کے بعد حجرے کو واپسی ہوئی۔ اگلے روز دن کا اول وقت یہیں آرام کیا اور دوپہر پونے دو بجے نارتھ ویسٹ ایئرلائنز کے ذریعے سان فرانسسکو کے لئے روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر طور بھی ہمراہ تھے۔ وہاں ایئرپورٹ پر برادرم سرودی نے استقبال کیا ان کے ساتھ جا کر سانٹا کلارا کی مسجد نور میں مغرب کی نماز ادا کی جہاں سال گزشتہ بھی امیر محترم نے درس قرآن دیا تھا۔ مسجد ہی میں مقامی احباب عمر احمد ' پرویز چودھری اور حیاء اللہ صاحبان سے ملاقات بھی ہو گئی اور آئندہ پروگرام کی تفصیلات بھی طے پا گئیں۔ پچھلے سال کی طرح اس دفعہ بھی قیام سرودی صاحب کے ہاں ہی رہا۔ پروگرام کے مطابق امیر محترم کو پہلے تین دن "اسنا" کے کنونشن میں شرکت کرنا تھی۔

"اسنا" کی یہ تقریب اس سوسائٹی کی جنوبی ساحلی زون کی پانچویں گرمائی (سمر) کانفرنس تھی اور ڈسٹرکٹ سانٹا کلارا میں کیمپبل کمیونٹی سنٹر میں منعقد ہوئی۔ ایک وسیع قطعہ زمین پر واقع عمارات کو آراستہ کیا گیا تھا اور انتظامات ہر اعتبار سے مثالی تھے۔ پروگرام پورے "ویک اینڈ" یعنی جمعہ کی نماز سے اتوار کی شام تک پھیلے ہوئے تھے اور ہفتے اور اتوار کے روز صبح نو بجے سے عشاء تک (سوائے دوپہر کے کھانے اور نمازوں کے وقفے کے) مسلسل جاری رہے۔ کھانا شرکاء کے لئے واجبی قیمت پر اور مہمانوں کے لئے دعوت شیراز۔ خواتین کے علیحدہ اجلاس ہوئے' وقت کی کمی کے باعث محض ایک آدھ نشست مشترک رکھی گئی۔

کنونشن کا باقاعدہ آغاز جمعہ ۳؍ جولائی کے خطبہ جمعہ سے ہی ہونا تھا جو امیر محترم کی ذمہ داری تھی۔ نماز جمعہ اجتماع گاہ کے ایک ہال میں ادا کی گئی جو حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ امیر محترم نے خطبہ جمعہ میں "حکمت واحکام جمعہ" کو بزبان انگریزی موضوع بنایا اور لگ بھگ ۳۵ منٹ خطاب کیا۔ سامعین بالخصوص عرب نوجوان ہمہ تن گوش رہے۔ ان کے لئے اس خطبہ میں بہت سی باتیں نئی تھیں۔ بہت سوں نے پہلی بار سنیں اور دل میں اترتی محسوس کیں۔ خواتین کے لئے علیحدہ باپردہ انتظام تھا۔ اسی روز امیر محترم کے حقیقی بھتیجے فاروق عامر ملنے کے لئے آ گئے جو ایک مقامی یونیورسٹی میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ۴؍ جولائی کو نماز فجر مسجد نور ہی میں ادا کی بعد میں تقریباً ایک گھنٹہ ڈاکٹر ادریس صاحب

سے سوال وجواب کی نشست رہی ناشتہ سے قبل "اسنا" کے ایک مقامی عہدہ دار برادرم امتیاز احمد صاحب بھی ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ آج کے سیشن میں ڈاکٹر صاحب کا پروگرام سہ پہر ساڑھے تین بجے تھا جس میں ڈاکٹر صاحب کے ذمہ ان کا معروف موضوع "قرآن مجید کے مسلمانوں پر حقوق" تھا۔ یہ خطاب بھی انگریزی زبان میں تھا۔ خطاب تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہا۔ شرکاء نے نہایت توجہ سے سنا اور ان کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ مقرر کی سحر بیانی اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ حاضری دو اڑھائی سو تھی۔ یہیں پر "اسنا" کے موجودہ صدر ڈاکٹر احمد ذکی اور "نیٹ" یعنی نارتھ امریکن اسلامک ٹرسٹ کے جنرل سیکرٹری سے بھی ملاقات ہوئی۔ ۵ر جولائی کو امیر محترم کا ڈاکٹر شیخ ادریس سوڈانی کے ہمراہ ایک پینل مذاکرے کا پروگرام تھا۔ مذاکرہ کا موضوع "حالاتِ حاضرہ قرآن مجید کی روشنی میں" تھا۔ اس پروگرام کا افتتاح امیر محترم کی مختصر مگر جامع تقریر سے ہوا۔ بعد میں ڈاکٹر ادریس صاحب نے اس تبصرہ کے ساتھ تقریر سے اجتناب کیا کہ ڈاکٹر اسرار صاحب کے اتنے پر مغز اور جامع خطاب کے بعد ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا۔ اس پروگرام میں خواتین بھی شامل تھیں اور ان کی طرف سے دلچسپ سوالات آئے بیشتر سوالات امریکہ کے غیر مسلم ماحول میں رہائش سے متعلق تھے۔ زیادہ تر سوالات امیر محترم سے ہی کئے گئے تھے جن کے انہوں نے نہایت مدلل اور تسلی بخش جوابات دیئے۔ گفتگو میں تھوڑی سی نوک جھونک بھی ہوئی وہ اس طرح کہ ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر ادریس صاحب نے بڑی سخت بلکہ فتوے کی زبان استعمال کرتے ہوئے فرمایا کہ اس طرح کے معاشرہ میں دعوت کا کام کئے بغیر معاشرت حرام ہے تو امیر محترم نے یہ وضاحت ضروری سمجھی کہ کسی اسلامی ملک میں بھی اگر زندگی اقامت دین کی جدوجہد سے خالی ہے تو وہاں بھی زندگی اتنی ہی حرام ہے...... نماز مغرب کے ساتھ ہی کانفرنس اختتام کو پہنچی۔ لیکن کئی مقامی دوست ہماری رہائش گاہ پر تشریف لائے اور سوال وجواب کی نشست چلتی رہی۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اس دورہ کے محرک یہاں کے ایک مقامی دوست برادر عمر احمد بنے تھے جو "اسنا" کے علاوہ مقامی مسلم کمیونٹی سنٹر (ایم سی سی) کے بھی صدر ہیں اور ان کا پہلے ہی سے شدید تقاضا تھا کہ ہم کانفرنس میں شرکت کے بعد وہاں مزید ایک ہفتہ مسجد نور میں درس قرآن کے لئے رکیں۔ چنانچہ ۶ر جولائی کی شام سے ہی اس پروگرام کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ پہلے درس کا موضوع "سورۃ الحدید" کی اولین نو آیات تھیں۔ یہ خطاب ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہا۔ چونکہ "ویک اینڈ" نہ

تھا لہٰذا خواتین کو شامل کر کے حاضری ایک سو کے لگ بھگ تھی۔ حاضرین بہت انہماک سے درس سن رہے تھے۔ خصوصاً عرب طلبہ جو باوجود اردو نہ سمجھنے کے گوش بر آواز تھے اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب کے درس میں قرآن کریم کے مختلف مقامات سے آیات اور حوالہ جات کے لئے احادیث تو عربی زبان میں ہی تھیں جن سے وہ از خود مطلب پا رہے تھے۔ مزید بر آں امیر محترم کی گفتگو میں انگریزی اصطلاحات کا استعمال بھی بکثرت ہوتا ہے۔ ۷ر جولائی کے پہلے پہر شمیم عثمانی صاحب کے ہمراہ سان فرانسسکو چلے گئے۔ موصوف کافی عرصہ سے وہاں مقیم اور اب سنجیدگی سے واپسی کے خواہش مند ہیں...... شام کا درس سورۃ الحدید کی آیات (۱۰ تا ۱۹) پر مشتمل تھا۔ درس نہایت پر مغز اور داعیانہ تھا۔ سامعین کی دلچسپی دیدنی تھی اگرچہ درس کچھ تاخیر سے اختتام کو پہنچا لیکن لوگ انہماک سے سنتے رہے اور تاخیر ہی کے سبب سے سوال و جواب کی نشست بھی ملتوی کرنی پڑی۔ ۸ر جولائی پورا دن گھر پر ہی گذرا۔ ان دنوں اتفاق سے "ایران کونٹرا" میں ملوث کرنل نارتھ کا بیان سینٹ کی ایک کمیٹی کے روبرو قلم بند ہو رہا تھا اور جس طرح کے کھلے ماحول میں وہاں ریاست کے انتہائی خفیہ راز ٹیلی ویژن پر براہ راست عوام کے سامنے آ رہے تھے وہ کم از کم یہاں تو ناقابل تصور ہے۔ یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے کہ ع

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

اس روز سے باقی دروس بزبان انگریزی تھے۔ یہی سبب تھا کہ عرب شرکاء کی حاضری واضح طور پر بڑھی ہوئی تھی۔ درس کا موضوع " آیہ بر " تھا۔ شرکاء کے چہروں سے یہ تاثر واضح طور پر ابھر رہا تھا کہ نیکی کے اس جامع تصور سے وہ پہلی مرتبہ آشنا ہوئے ہیں۔ ۹ر جولائی کے درس کے دوران لاہور کے ایک نوجوان فہیم اکرم قاضی سے تعارف ہوا جو کہ میرے پرانے شناسا ریٹائرڈ ریلوے ٹیلی کیمونیکیشن انجینئر جناب محمد اکرم قاضی کے فرزند اور "میثاق" کے پرانے خریدار ہیں۔ فہیم قاضی صاحب یہاں سان فرانسسکو بے ایریا میں واقع سٹیفورڈ یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں جہاں وہ ٹیلی مواصلات میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ ان کے اصرار پر ہم پہلے پہر یونیورسٹی گئے جہاں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے قریب چودہ پندرہ افراد سے سوال و جواب کی نشست رہی۔ یہیں پر ایک پاکستانی دوست کرنل گل فراز صاحب سے بھی تعارف ہوا۔ موصوف یہاں پٹرولیم انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ اور پاکستان آرمی میں نہایت شاندار مستقبل کے حامل تھے۔ سٹاف کالج میں ڈین کے عہدے پر متعین رہ چکے ہیں ہم ان کی سیاسی بصیرت اور معلومات عامہ سے بہت متاثر ہوئے۔ اس نشست کے بعد ایک سعودی بھائی فیصل کے ہاں دوپہر کا

کھانا طے تھا۔ چنانچہ ان کے ہاں پہنچے۔ اس دعوت میں برادر فیصل کی روایتی سعودی مہمان نوازی اور اخلاص و محبت کے علاوہ ایک منفرد بات یہ تھی کہ ہمارے علاوہ جو سات مدعوئین تھے وہ سات مختلف ممالک سے تعلق رکھتے تھے۔ شام کے درس کا موضوع "سورۃ الحج" کی آخری دو آیات تھیں۔ حاضرین کی تعداد حسب سابق رہی۔

۱۰ر جولائی کو خطبہ جمعہ کا موضوع "سورۃ العصر" تھی خطاب بزبان انگریزی کیا گیا۔ یہ تقریر بحمداللہ بہت کامیاب رہی۔ دوسرے ڈسٹرکٹ سے بھی کافی لوگ آئے تھے اور مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ لوگوں کے سامنے ایمان، عمل صالح تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے تقاضے بڑے جامع انداز میں واضح ہوئے شام کے درس کا موضوع "امت مسلمہ کا ماضی حال اور مستقبل" تھا۔ یہ خطاب بھی انگریزی میں تھا۔ موضوع پر سیر حاصل گفتگو کے بعد ان لوگوں کو جو واقعی کچھ کرنے کی نیت رکھتے لیکن کچھ تحفظات ذہنی کے اسیر ہوں، قیام گاہ پر آنے کی کھلی دعوت دی گئی جہاں ہماری امید سے زیادہ لوگ تشریف لائے۔ یہ محفل تقریباً ڈیڑھ بجے شب تک جمی رہی ۱۱ر جولائی کو صبح صبح کرنل گل فراز صاحب تشریف لے آئے۔ دراصل انہوں نے جمعرات کو ہی باصرار وعدہ لے لیا تھا کہ ناشتہ ان کے ہاں کیا جائے۔ میں نے چونکہ کچھ دوستوں کو ملاقات کا وقت دے رکھا تھا للذا میں تو شرکت نہ کر سکا البتہ امیر محترم ان کے ہاں ناشتے پر تشریف لے گئے...... دوپہر بارہ بجے دورہ کا آخری پروگرام تھا جس کا موضوع تھا "اسلام کا معاشی نظام" اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب نے کھل کر گفتگو کی۔ مادر پدر آزاد سرمایہ دارانہ نظام کی لعنت اور بنیادی انسانی قدروں تک کو پامال کر دینے والے سوشلزم کے درمیان اسلام کے عدل و قسط پر مبنی معاشی نظام کی خوبیاں واضح طور پر لوگوں کے سامنے آئیں۔

سانٹا کلارا میں قیام کا یہ ہمارا آخری دن تھا۔ نماز ظہر اول وقت ادا کر کے ایئرپورٹ کا رخ کیا۔ شکاگو کا ارادہ تھا۔ وہاں سے چلتے ہوئے ہم کرہ ارض کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے اپنے بھائیوں کی محبت کے نشے سے سرشار تھے جن میں کسی سے بھی ہمارا خون کا رشتہ نہیں، لسانی یگانگت بھی معدودے چند سے تھی ورنہ نسلی، علاقائی اور سیاسی فاصلے بظاہر ہمیں تقسیم ہی کرتے تھے۔ ہاں ایک درد کا رشتہ تھا۔ درد مشترک۔ دین حنیف کی "غربت" کا درد...... ایک آرزو کا ساجھا تھا۔ اللہ کے کلمے کو" ھی العلیا" دیکھنے کی آرزو...... ایک دھن میں حصہ داری تھی۔ فلاح اخروی اور رضائے الٰہی کے حصول کی دھن۔ انہوں نے

ہمیں سر آنکھوں پر بٹھایا تو اس لئے نہیں کہ ہم دنیوی وجاہت رکھتے یا کسی ہیئت مقتدرہ کے نمائندے تھے' ہم درویشوں سے انہیں کیا ملا۔ کونسا فائدہ حاصل ہوا۔ ہم نے انہیں رسیلے نغموں کی لوریاں نہیں اللہ تعالیٰ کی سخت وعیدیں سنائی تھیں۔ انذار کے کوڑے برسائے تھے۔ لذائذ دنیا سے کنارہ کر کے دین کے لئے ترک واختیار کی دعوت دی تھی..... اس کے باوجود انہوں نے دلوں کے دروازے ہمارے لئے وا کئے تو اسی بات سے مایوسی کے بیاباں میں کبھی کبھی امید کی کلیاں چٹکتی ہیں۔ یہاں کے قیام کے دوران مہمانی کے جو مزے ہم نے برادرم محمد علی سرودی کے ہاں لوٹے ان کا ذکر کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ انہوں نے ہمارے لئے پاکستان جانے کا اپنا پروگرام موخر کیا اور پھر جاتے ہوئے اپنا گھر ہمارے حوالے کر گئے۔ صرف گھر نہیں بلکہ میزبانی کے لئے اپنے بھانجے عزیزم رشید کو بھی۔ اس معذور نوجوان نے مہمانوں کی خدمت کا حق ادا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے سننے کی صلاحیت سے تو محروم رکھا لیکن ذہانت میں کسر پوری کر دی ہے۔ باوجود اس معذوری کے عزیزی رشید نے گریجویشن کر لی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اور دوسرے سب دوستوں کو دین اور دنیا کی حسنات سے نوازے۔

شکاگو ایئرپورٹ پر ڈاکٹر خورشید ملک پاکیزہ مسکراہٹ لبوں پر سجائے حسب معمول ہمارے لئے بازو پھیلائے ہوئے تھے۔ خلوص ومحبت کا یہ پیکر روز اول سے امیر محترم اور ان کے رفقاء کا مستقل میزبان ہے۔ یورولوجی کا ماہر اور معروف سرجن ہے لیکن اس کی پیشہ ورانہ مشغولیت امیر محترم کے قیام کے دوران ثانوی ہو جاتی ہے۔ لگ بھگ بیس سال امریکہ میں گذارنے کے باوجود ڈاکٹر صاحب اپنی شناخت سے ہاتھ دھونے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ امریکی شہریت حاصل کرنا ان کے لئے قطعاً کوئی مسئلہ نہیں لیکن وہ تاحال بہار سے تعلق کے ناتے بھارتی شہری ہیں۔ کبھی سوچا تو پاکستانی شہریت حاصل کرنے کا ضرور سوچا ہے اگرچہ یہاں کا حال دیکھ کر وہ ع

ارادہ باندھتا ہوں' سوچتا ہوں' توڑ دیتا ہوں

کی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ شکاگو کے نواح میں ان کا وسیع' خوبصورت اور آراستہ وپیراستہ گھر امیر محترم اور ان کے متعلقین کو ہمیشہ اپنی آغوش راحت میں لینے کے لئے بے چین رہتا ہے..... اور شمالی امریکہ میں اسی گھر کو ہماری دعوت کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ اس گھر کو شاد و آباد رکھے اور ڈاکٹر ملک کو جنت میں ہزار گنا بہتر ٹھکانہ عطا فرمائے۔

شکاگو میں ہماری مصروفیت کی نوعیت دعوتی سے زیادہ تنظیمی تھی۔ کام کا جائزہ لینا اور آئندہ کے لئے تدابیر اختیار کرنا وغیرہ ۱۲ر جولائی کو نماز فجر میں مقامی تنظیمی رفقاء اور دوسرے دوست تشریف لے آئے۔ مقامی تنظیمی اور انجمن خدام القرآن شکاگو کے معاملات پر گفتگو ہوتی رہی۔ شام کو مسلم کمیونٹی سنٹر شکاگو میں ڈاکٹر صاحب کا پروگرام بھی طے تھا۔ موضوع تھا "پاکستان کے موجودہ مسائل اور ان کا حل"۔ لوگوں نے اس پروگرام میں بھرپور شرکت کی اور گہری دلچسپی ظاہر کی۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب معروف معنوں میں سیاست دان نہیں ہیں لہٰذا ان کے بے لاگ تجزیہ نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ پروگرام میں حاضری سوا دو سو کے لگ بھگ تھی ۱۳ر جولائی کا دن تقریری مصروفیت سے خالی تھا جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف لوگ ملاقات کے لئے تشریف لاتے رہے۔ ۱۴ر جولائی کا سارا دن گھر پر ہی گزارا اور وہیں سہ پہر کی خبروں میں کراچی میں المناک دھماکوں کی خبر سننے میں آئی۔ شام کو بعد از نماز مغرب رفقائے تنظیم اسلامی شکاگو کا اجتماع بھی طے تھا جو رات گئے تک جاری رہا اس میں مختلف امور زیر بحث آئے ۱۵ر جولائی کی صبح ایک مقامی دوست عباس پرمانی کے ہمراہ ڈاون ٹاون یعنی قلب شہر گئے اور کھانا بھی انہی کے ہاں تناول کیا۔ بعد دوپہر مراجعت ہوئی۔ شام کو ہی انجمن خدام القرآن شکاگو کا سالانہ ڈنر بھی ایم سی سی میں طے تھا۔ حاضری مناسب تھی موقع کے لحاظ سے امیر محترم نے "حکمت قرآن" کے موضوع پر کوئی پچاس منٹ خطاب فرمایا اور انجمن کے اراکین کو ایک عزم نو کے تحت اس دعوت قرآنی کو شمالی امریکہ کی سطح پر منظم کرنے کی دعوت دی۔

۱۶ر جولائی سے گذشتہ شب ڈاکٹر عبدالفتاح صاحب سے فون پر گفتگو ہو گئی تھی اور وہ حسب پروگرام بدھ کی رات کو ہی ڈیٹرائٹ پہنچ چکے تھے۔ ہم بھی صبح ۹٫۴۰ کی فلائٹ سے ڈیٹرائٹ روانہ ہو گئے۔ ڈیٹرائٹ ایئرپورٹ پر حیدر آباد دکن سے تعلق رکھنے والے دو مقامی حضرات سید محمد تقی اور جامعہ عثمانیہ (دکن) کے ایک ریٹائرڈ پروفیسر نصراللہ صاحب تشریف لائے ہوئے تھے۔ غالباً ڈاکٹر عبدالفتاح صاحب بھی تشریف لائے تھے لیکن کسی اور ٹرمنل پر چلے جانے کے سبب ملاقات نہ ہو سکی۔ چنانچہ ہم سید محمد تقی صاحب کے ہمراہ ڈیٹرائٹ میں اپنے میزبان ڈاکٹر رفیع اللہ انصاری صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ دوپہر کو این آربر یونیورسٹی میں ڈاکٹر مستنصر میر سے بھی رابطہ ہو گیا اور وہ عصر کے وقت تشریف لے آئے۔ موصوف کا تعلق لاہور سے ہے۔ نہایت ذہین وفطین نوجوان ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ ہونے کے بعد سی ایس پی کاڈر میں بھی منتخب ہو گئے تھے لیکن انہوں نے تعلیم و تعلم

ہی کو ترجیح دی۔ اسی دوران قرآن کریم سے بھی رب العزت سے رغبت عطا فرمادی۔ مولانا اصلاحی صاحب سے موصوف نے کچھ عرصہ استفادہ کیا۔ بعد میں علوم اسلامیہ کی تحصیل کے سلسلہ میں این آربر یونیورسٹی سے اسلامک سٹڈیز میں پی ایچ ڈی کیا۔ ان کے مقالے کا عنوان "مولانا فراہی کا نظم قرآن" تھا۔ حال ہی میں ان کی ایک کتاب 'Coherence in Quran' منصۂ شہود پر آئی ہے اور یہی دراصل ملاقات کا ذریعہ بنی۔ شام کا کھانا ایک مقامی دوست جناب رشید لودھی صاحب کے ہاں طے تھا۔ چنانچہ ہم ڈاکٹر مستنصر صاحب کو بھی ہمراہ لے گئے۔ محفل خوب رہی ۱۷ر جولائی کو سہ روزہ پروگرام کا آغاز 'گریٹ ڈیٹرائٹ کے اسلامک سنٹر میں طے تھا۔ یہاں بھی پہل خطبہ جمعہ سے ہوئی۔ یہاں بھی امیر محترم نے سورہ العصر کو موضوع بنایا۔ خطاب بزبان انگریزی تھا۔ تمام شرکاء نہایت توجہ اور دلچسپی سے سنتے رہے۔ خواتین کو شامل کر کے حاضری قریباً سوا دو سو کے لگ بھگ تھی۔ واضح رہے کہ اس پروگرام میں ٹورنٹو کی تنظیم کے بیشتر رفقاء مع اہل خانہ تشریف لائے تھے۔ مقامی خواتین کی بھی بھرپور شرکت تھی خورد و نوش کا اہتمام مرکز ہی میں کیا گیا تھا۔ ٹورنٹو کے رفقاء نے ڈاکٹر صاحب کی کتابوں اور آڈیو اور وڈیو کیسٹ کے مختلف عنوانات کے تحت سٹال بھی لگا رکھے تھے۔ یہ تین دن مرکز میں اتنی گہما گہمی رہی کہ میلے کا سماں بندھا ہوا تھا مغرب تا عشاء کی نشست کا موضوع "عظمت قرآن" تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے قرآن اور حدیث کے حوالہ جات سے قرآن کی عظمت اجاگر کی۔ حاضرین کے دلوں کو گرمایا اور انہیں ایک ولولہ تازہ دیا۔ اس نشست میں حاضری اڑھائی سو کے لگ بھگ تھی۔ ۱۸ر جولائی کو بہت ہی بھرپور پروگرام تھا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کو قریباً چھ گھنٹے خطاب کرنا پڑا۔ وقت کی تقسیم کچھ اس طرح کی گئی کہ نماز ظہر کے بعد ڈیڑھ گھنٹے کے خطاب کے بعد سوال و جواب کی نشست ہوئی۔ بعد ازاں نماز عصر سے ڈیڑھ گھنٹہ قبل ایک نشست ہوئی۔ عصر تا مغرب وقفہ رہا۔ مغرب تا عشاء پھر ڈیڑھ گھنٹہ کی ایک نشست رہی۔ ان تمام نشستوں کا بنیادی موضوع "اقامت دین" تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے قرآن و حدیث کی روشنی میں اپنا نقطہ نظر نہایت مدلل انداز میں پیش کیا۔ نماز مغرب سے قبل طائف سے ڈاکٹر شجاعت علی برنی صاحب بھی تشریف لے آئے۔ ۱۹ر جولائی کو نماز فجر اجتماع گاہ ہی میں ادا کی گئی۔ بعد میں رفقائے تنظیم اسلامی ٹورنٹو سے تنظیمی امور پر گفتگو کا سلسلہ ناشتہ تک جاری رہا۔ دس بجے ان مقامی حضرات سے سوال و جواب کی نشست طے تھی جو اقامت دین کے کام میں ساتھ دینے کو تو تیار ہوں لیکن کچھ اشکالات رکھتے ہوں۔ یہ نشست قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہی۔ جس کے نتیجہ میں نو (۹)

حضرات نے تنظیم میں شمولیت کے لئے امیر محترم کے ہاتھ پر بیعت کی اور اتنے ہی حضرات نے انجمن خدام القرآن کی سطح پر کام کرنے کا عزم کیا...... نماز ظہر کے بعد تقریر کا موضوع "جہاد" تھا۔ بعد میں عمومی سوال و جواب کی نشست ہوئی جو قریباً عصر تک جاری رہی۔ نماز کے فوراً بعد بذریعہ کار ہم ڈاکٹر شجاعت برنی اور ڈاکٹر خورشید ملک صاحب کی معیت میں شکاگو روانہ ہوئے یہاں ہم اپنے معزز میزبان ڈاکٹر رفیع اللہ انصاری کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا نہ کریں تو کفران نعمت ہوگا۔ موصوف نے ہمارا ہر طرح سے خیال رکھا۔ پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر اور ایک بہت ہی معروف جنرل سرجن ہیں۔ اس کے باوجود نہایت حلیم الطبع اور منکسر المزاج شخص ہیں۔ حیدر آباد دکن کی روایتی وضعداری کا ایک نایاب نمونہ اور ع

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

کی عملی تفسیر۔ باوجود پر تکلف خاطر تواضع سے ہمیں زیر بار کئے جانے کے تحمل اور تشکر کے جذبات کے تحت بوکھلائے سے پھرتے رہے۔

۲۰ر جولائی کا دن بھی مختلف حضرات سے ملاقات میں گذرا۔ اسی دوران میں تو کچھ دیر کے لئے سید پیر محمد کے ہمراہ ڈاؤن ٹاؤن چلا گیا جبکہ امیر محترم کی نشست سید عرفان احمد صاحب کے ساتھ رہی۔ ڈیٹرائٹ اور کیلیفورنیا کے درمیان سفر میں احساس ہوا کہ بحمد اللہ تنظیم کا تعارف خاصا ہو چکا ہے ایک ڈاکٹر ملے جن کے تھیلے میں تنظیم کی کتابیں تھیں جو وہ دوسرے لوگوں کو پڑھنے کے لئے پیش کر رہے تھے۔ بہت سے ٹیلی فون موصول ہوئے جن میں ڈاکٹر صاحب کو ان کے علاقے میں آنے کی پرزور دعوت تھی۔ اس موقع پر شدت سے احساس ہوا کہ ہمارے پاس افرادی قوت کا اثاثہ بڑا قلیل ہے جبکہ دولت ایمان کے متلاشی بے شمار۔ ۲۱ر جولائی کی صبح کو کئی دوست "خدا حافظ" کہنے کے لئے تشریف لاتے رہے۔ ان سے گفتگو کے دوران ہی نماز ظہر اور روانگی کا وقت آ پہنچا۔ لہٰذا ہم ۲۴۵ کی فلائٹ سے نیو یارک کے لئے روانہ ہو گئے۔ اور چھ بجے نیو یارک کے جے ایف کے (جان ایف۔ کینیڈی) ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ یہاں سے رات دس بج کر ۴۵ منٹ پر پی آئی اے کی فلائٹ پی کے ۷۰۴ سے ہماری واپسی طے تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ متذکرہ بالا فلائٹ ابھی پیرس ہی میں رکی ہوئی ہے کچھ عرصہ اسی غیر یقینی کیفیت میں گذرا۔ بعد ازاں پی آئی اے کے مقامی منتظمین نے ہمیں چیک ان کر کے بورڈنگ کارڈ اس ہدایت کے ساتھ عطا فرما دیئے کہ وہ جہاز کی آمد پر ہمیں مطلع کر دیں گے۔ نیو یارک میں برادرم الطاف احمد بھی ہمارے ساتھ منسلک رہے تھے چنانچہ ہم ان کے ہمراہ ان کی قیام گاہ پر چلے گئے۔ اگلا

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

افکار و آراء

مراد آباد (بھارت) سے ایک مکتوب

حضرت محترم ڈاکٹر صاحب دام مجدہم

ماشاء اللہ، جماعت شیخ الہندؒ، مرتب فرما کر شائع فرمادی۔ جزاکم اللہ۔

اس ہزارے[1] میں اسلامی زندگی کے نظام کو چلانے کے لئے حضرت مجددؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ، صاحبزادگان، شہیدینؒ، حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت میاںجیؒ، اور حضرت حاجی صاحبؒ کے ذریعے حق تعالیٰ نے حضرت شیخ الہندؒ کو عطا فرمایا۔ ان کے ذریعے جو کام لیا تھا اس میں مولانا ابوالکلامؒ کا بڑا حصہ ہے۔ بعض علماء کرام کے اختلاف کی بنا پر حضرت شیخ الہندؒ نے، جو مولانا ابوالکلامؒ کو امام الہند کے منصب پر لگانا چاہتے تھے، خاموشی اختیار فرمائی۔ مالٹا کی تنہائیوں سے دو ہی باتیں لاتے تھے۔ افتراقِ ملّت کو دُور کرنا اور درسِ قرآن کا سلسلہ بڑوں اور بچوں میں چلانا۔ مولانا آزادؒ نے اس کام کو زندگی بھر کیا۔ افتراق کے سلسلے میں مسلم لیگ کی گالیاں، علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء کے پتھر، جناح صاحب کی طرف سے شو بوائے کا خطاب، سب کو جھیلتے رہے۔ تقسیم کے بعد جب شیخ عبداللہ دلّی حاضر ہوئے تو مولانا نے اُن سے فرمایا تھا کہ تمہیں تو جناح صاحب کے پاس جانا چاہیئے تھا۔ جب عرب ملکوں کے دورے سے واپسی پر کراچی ٹھہرے تو جناح صاحب کی قبر پر بھی حاضری دی۔ تقسیم کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی جسے اغیار تہس نہس کرنا چاہتے تھے اُسے بچایا۔ جامعہ ملیہ کے ہیرو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا رُخ اس پر لگایا جہاں سے انہیں بیسویں صدی کے مردِ مومن محمد علی جوہرؒ کے ساتھ نکلنا پڑا تھا۔ وزارت کے دور میں جب طلباء علی گڑھ نے اپنے فقروں کی چوٹ ماری تو اُسے جھیلا اور معاف کیا۔ تقسیم کے بعد امام الہند کے فرائض کو انجام دیتے رہے۔ دلّی کی جامع مسجد میں محبوس بیس ہزار بچوں اور عورتوں کے لئے چوہدری عبدالستار سالارِ احرار کے ساتھ سرکاری گودام سے دال چاول ڈھو

---

[1] مراد ہے اُمتِ مسلمہ کی تاریخ کا دوسرا ہزار سالہ دور (الف ثانی)!

کر لائے اور انہیں فاقوں کی موت سے بچایا۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ، مہاجر مدینہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، شیخ طریقت حضرت اقدس رائے پوری، حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ حضرت مجاہد اسلام مولانا حفظ الرحمٰنؒ، مولانا احمد سعیدؒ، مولانا محمد میاںؒ۔ شیخ الاسلام مولانا محمد یوسفؒ، نواب محمود علی خان ایسے حضرات گئے قافلے کو لے کر ملت ہند کی بقا و سلامتی کی راہ نکالتے رہے۔

مولانا آزاد نے ۱۹۲۰ء میں مرادآباد خلافت کانفرنس میں ملکی زندگی کا عدم تشدد کا فارمولا گاندھی جی کو عطا فرمایا۔ تقسیم کے وقت گروپنگ کا فارمولا برطانوی وفد کو عطا فرمایا۔ قرآن پاک کی خدمت کی کہانی مشہور خطاط منشی عبدالقیوم مرادآبادی سنایا کرتے تھے۔ کتابت و طباعت کا کام انہوں نے ہی انجام دیا تھا۔ پہلا ایڈیشن مدینہ پریس بجنور اور دوسرا لاہور میں طبع ہوا۔ زندگی بھر کی رفیق اہلیہ محترمہ کے آخری سانسوں میں احمد نگر قلعے کی قید سے چھٹی لے کر انگریزوں سے نکلنا برداشت نہیں کیا۔ وہ غم اُن کی زندگی کا ایک زخم بن گیا تھا۔

"انڈیا ونز فریڈم" لکھنے میں بھی اُسی منصب کو انجام دیا۔ پٹیل، پرشوتم داس ہی نہیں، گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کو بھی نہیں بخشا۔ مجلس احرار کی تشکیل کی اور کشمیر کے بکاؤ مال کو قادیانیت سے بچانے میں احرار کا بڑا حصّہ ہے۔ جب شیخ عبداللہ نے ڈیوٹی لے لی تو احرار نے اپنا کوئی حق نہیں مانگا۔ یہ سب امام الہند کی ڈیوٹی اور منصب ہی کو انجام دیتے رہے۔ اور وہ خفیہ تحریر جواب تیس سال ہونے پر شائع ہوگی شیخ الہندؒ کے امام الہندؒ کو چار چاند لگائے گی۔ ان شاءاللہ۔

حضرت شیخ الہندؒ کی ہڈیاں جس غم میں گھلیں، جس کا اظہار جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھنے والے خطبے میں فرمایا تھا، اُس میں اپنے درد کا علاج اسکولوں، کالجوں سے پانے کی زیادہ اُمید کا اظہار فرمایا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جس ڈیوٹی کو انجام دے رہے ہیں اُس میں شیخ الہندؒ کی گھلنے والی ہڈیاں کارفرما ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی "حجۃ اللہ البالغہ" کا ایک ارشاد ارسالِ خدمت ہے اگر مناسب سمجھیں تو میثاق یا حکمتِ قرآن میں دے دیجئے گا۔ خدا کرے وجاہت

شیخ الہندؒ کی زیارت مجھے نصیب ہو جائے - اگر ہو سکے تو منصور احمد مرحوم کی کتاب "انسانوں کے نام اسلام کا پیغام" مجھے ارسال فرمادیں - اسکی تلخیص کرکے ہندی میں شائع کراؤں تاکہ ظالموں کے لئے حجت بن سکے -

اس وقت ضرورت ہے کہ عالم اسلام کا ہر فرد اپنے گناہوں سے توبہ کرکے خدا سے رحم کی درخواست کرے - طالب دعا ،

افتخار احمد فریدی (مراد آباد - بھارت)

عدل و انصاف کا مطالبہ

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ:

خود غرض انسانوں کی اغراض پرستی جب اجتماعی شکل اختیار کرکے ملک کے امن وامان، باشندگانِ ملک کے اطمینان، آزاد کاروبار، خوشحالی، آزادی رائے وغیرہ حقوقِ انسانیت اور حقوقِ شہریت پر ڈاکہ ڈالنے لگے تو چیرہ دست، ظالم و جابر طاقت کا ختم کر دینا حق وصداقت کا تقاضہ اور عدل و انصاف کا مطالبہ ہوگا - کیونکہ یہ چیرہ دست، ظالم و جابر طاقت سارے انسانوں (نوع انسان) کے لئے بالخصوص اس ملک کے نظام کے لئے جو ایک جسم کی حیثیت رکھتا ہے سرطان جیسا مرض ہے ایسی دردِ سر میں ایک ہمدردِ انسانیت کا فیصلہ یہی ہوگا کہ اس کا اپریشن کر دیا جائے، ورنہ سارا ملک موت کے گھاٹ اُتر جائے گا - لہٰذا ہر ایک حق پرست کا اخلاقی اور مذہبی فرض ہوگا کہ اس سرطان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے جان کی بازی لگادے -

(حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۵۷ ج ۲)

"عمل، وعظ کا ثمر ہوتا ہے"

جہیز توڑ ایسوسی ایشن پاکستان
HELP FIGHT DOWRY
DOWRY STOP ASSOCIATION PAKISTAN
Chief Organizer
ZAHID SAEED GULL
Secretary: M. MANZOOR AHMAD
Jordan
Moazzam Colony Sialkot Road
GUJRANWALA - (Pakistan).
Phone No

Ref. No 003/dsa/MM/J

Dated 31st July 1987

واجب الاحترام ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امید کرتا ہوں بفضل تعالیٰ بخیریت ہوں گے۔ آپ نے اپنے گھر میں شادیاں جس اسلامی طریقے سے کیں، اولاد کو اور عوام کو جس سادہ طریقے پر گامزن کیا۔ ایسوسی ایشن کو اس پر فخر ہے۔ یقیناً آپ ایک باعمل عالم ہیں جس کی نظیر نہیں ملتی۔ باتوں کے محل تو ہر کوئی بنالیتا ہے عمل وعظ کا ثمر ہوتا ہے۔ جہیز توڑ ایسوسی ایشن اپنی اولاد کی سادہ اور اسلامی طریقے پر شادیاں کرنے پر آپ کو خراج تحسین پیش کرتی ہے۔

آپ کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ عوام کو بھولے نہیں کہ "کچھ لوگ کمر ہمت کس لیں اور اللہ کی تائید و توفیق کی امید کے سہارے شادی بیاہ کی تقریبات اور رسومات و لوازمات کے طور مار کے "اصر" اور "اغلال" کے خلاف جہاد کے لئے اٹھ کھڑے ہوں"۔ ہم اٹھ کھڑے ہیں۔ ہمیں وقت کے ساتھ ساتھ دینی و دیگر امور پر رہنمائی کی ضرورت ہے۔ ہمیں آپ اور آپ جیسے دیگر علماء کے تعاون کی ضرورت ہے۔ آپ سے ہر ممکن تعاون کی امید کرتے ہیں۔ مع تحیات واقبلوا الاحترام

آپ کا خیر اندیش

انجینئر ایم۔ منظور احمد سیکرٹری جہیز توڑ ایسوسی ایشن

کارمینا
Carmina
بہترین انسان وہ ہے جس کا وجود انسانوں کے لیے مفید ترین ہو۔
Adarts CAR-2/84

THE ORIGINAL

داخلہ برائے بی۔اے کلاس
قرآن کالج۔لاہور

الحمد للہ اس سال سے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام قرآن کالج کے نام سے ایک نئی تعلیمی سکیم کا باضابطہ آغاز ہو رہا ہے۔ اس اسکیم کے تحت ایف اے ایف ایس سی پاس طلبہ کو داخلہ دیا جائیگا و تین سال کے عرصہ میں جامعہ پنجاب کے نصاب کے مطابق بی اے کے امتحان کی باقاعدہ تیاری کے ساتھ دینی تعلیم کے ایک بنیادی نصاب کی تعلیم بھی دیجائے گی جس میں عربی زبان کی مضبوط بنیادوں پر تحصیل پورے قرآن مجید کا ترجمہ اور تعلیم حدیث کے پروگرام خصوصیت کے ساتھ شامل ہونگے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں:

- ایف اے ایف ایس سی اور آئی کام پاس طلبہ سے درخواستیں مطلوب ہیں جو طلبہ نتیجہ کے منتظر ہوں وہ بھی درخواست دے سکتے ہیں۔
- داخلہ کیلئے درخواستیں وصول کرنے کی آخری تاریخ ۱۵ ستمبر ۸۷ء ہے
- تعلیم کا آغاز انشاء اللہ ماہ رمضان المبارک کے فوراً بعد یعنی اوائل جون میں ہوگا
- بیرون لاہور کے طلبہ کے لئے ہاسٹل کی سہولت موجود ہے۔

نوٹ: کالج پراسپکٹس اور داخلہ فارم حاصل کرنے کیلئے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے نام دس روپے کا پوسٹل آرڈر یا ڈاک ٹکٹ روانہ کریں

المعلن: قمر سعید قریشی، ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن
فون ۸۵۲۶۸۳

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد ۳۶
شمارہ ۱۰
صفر المظفر ۰۸ھ
اکتوبر ۸۷ء
فی شمارہ ۵/-
سالانہ زرِ تعاون ۵۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

منیجنگ ایڈیٹر
اقتدار احمد

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات — ۲۵ سعودی ریال یا ۱۱۵ روپے پاکستانی
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر — ۶ امریکی ڈالر یا ۱۰۰ روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ — ۹ امریکی ڈالر یا ۱۵۰
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ — ۱۲ امریکی ڈالر یا ۲۰۰

ترسیلِ زر: ماہنامہ میثاق لاہور، یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ (پاکستان)، لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: ۸۵۲۶۹۳
سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی فون ۲۱۶۵۸۶
طابع: چوہدری رشید احمد مطبع: مکتبہ جدید پریس شاہراہ فاطمہ جناح، لاہور

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقتدار احمد

عرض احوال

وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین کی نعمت سے نوازا ہے اس بات پر متفق ہیں اور غیروں بلکہ دشمنوں تک کی گواہی اس پر مستزاد کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین اور ہمہ گیر انقلاب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا کر کے دکھایا تھا۔ اس مثالی انقلاب نبویؐ نے تکمیل تک جو مراحل طے کئے انہیں اہل علم اپنے مذاق کے مطابق عنوانات دینے میں آزاد ہیں لیکن تاریخ گواہ ہے کہ آغاز کار ایک نظریہ کی طرف دعوت اور اس کی اشاعت سے ہوا۔ اس نظریئے کو قبول کرنے والوں کو منظم کر کے تعلیم، تزکیہ اور تربیت کے ذریعے کردار کی پختگی سے مزین کیا گیا۔ پھر انہی لوگوں کو ناموافق معاشرے کی عریاں جارحیت کے سامنے اس "آرڈر آف دی ڈے" کے ساتھ لا کھڑا کیا گیا کہ ہاتھ بندھے رہیں گے۔ طنز و استہزا، ترغیب و ترہیب اور ظلم و ستم کے وار صبر محض کی ڈھال پر روکے جائیں گے تاکہ تعلیم و تربیت میں اگر کوئی کسر رہ گئی ہو تو یہ کٹھالی سارا کھوٹ نکال باہر کرے۔ یہیں سے زر خالص کی صورت میں وہ افرادی قوت دستیاب ہوئی جس نے وقت کے جابر و قاہر نظام سے کشمکش کا آغاز کیا اور اس حال میں کیا کہ علماء خدام اور قائدین[1] کی تخصیص روانہ رکھی گئی تھی۔ ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز

سارا زور سمع و طاعت پر مبنی اس فولادی نظم و ضبط پر تھا جو ان افراد کو بنیان مرصوص بنانے کا باعث ہوئی۔ اسی کشمکش کے دوران اس جماعت میں درجہ بندی ہوئی، "کاڈر" از خود متعین ہو گئے اور ان سخت مقامات سے گذر کر ہی اس گروہِ حق شناس کو نظام باطل پر آخری ھلّہ بولنے کا اذن ملا۔ دشمن کے پائے چوبیں میدان میں نہ ٹھہر سکے اور انقلاب مکمل ہو گیا۔ جاء الحق وزھق الباطل۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی منہج انقلاب کو تاقیام قیامت سنّت ثابتہ اور حجت بالغہ کی حیثیت حاصل رہے گی......

---

[1] اس امتیاز کی طرف اشارہ ہے جو ان سطور کا محرک بننے والے کالم میں انقلابی گروہ کی تشکیل میں مذکور ہے۔

انقلاب نبویؐ کے یہ مراحل کسی خاص "دبستان" کے صاحب علم کی ذہنی اختراع نہیں۔ سیرتِ مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا بہ نظرِ عمیق مطالعہ کرنے والا کوئی بھی طالب علم اسی نتیجے پر پہنچے گا، شرط صرف خلوصِ نیت اور تائید و توفیقِ الٰہی کی ہے۔

آج بھی انسانوں کے کسی گروہ کو کم تر درجے تک کے انقلاب برپا کرنے کے لئے کچھ ایسے ہی مراحل سے گذرنا پڑتا ہے لیکن پاکستان میں دین کے کچھ نادان دوست اسلامی انقلاب کے لئے مسلمانوں کو اس محنت شاقہ میں ڈالنے کے روادار نہیں۔ "میڈ ایزی" نسخے عام کئے جا رہے ہیں اور ایسے "اہل علم" ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں جو اللہ کے دین کے لئے جدوجہد کا جذبہ بیدار رکھنے والوں کو "دست ہرنا اہل بیمار کند۔ سوئے مادر آکہ تیمار کند" کی مشفقانہ اور ممتا بھری لوری دے کر سلا دینا چاہتے ہیں۔ براہو دانائی و بینائی کے اس سوءِ استعمال کا ؎

عقل عیّار ہے سَو بھیس بدل لیتی ہے

اردو کے ایک مقامی روزنامے میں "دبستان شبلی" سے وابستگی کے مدعی "بعض اہلِ علم" کے بزعم خویش اکلوتے ترجمان نے ۹ر ستمبر کو اپنے کالم میں اس بات سے تو اتفاق کیا ہے کہ اسلام کا غلبہ ملک عزیز میں کسی انقلاب سے ہو سکتا ہے (اگرچہ "ہی" یا "بھی" کے تکلف میں وہ پڑے ہی نہیں) لیکن اس کا لائحہ عمل انہوں نے اتنا آسان کر دیا ہے کہ بریں مژدہ گر جان فشانم رواست[1]۔ جی چاہتا ہے ہدیۂ دل پیش کیجئے۔ ان کے سہ نکاتی لائحہ عمل کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ:

"دیوبند اور ندوہ کی طرح یہاں ایک ایسی درسگاہ قائم ہو جس کی بنیاد علم و تحقیق کے ان اصولوں پر رکھی جائے جو اسلام کی پہلی صدی میں ہمارے اکابر ائمہ کے پیش نظر رہے اور جنہیں اس زمانے میں دبستان شبلی' کے بعض اہل علم نے ایک مرتبہ پھر زندہ کیا ہے پھر اس درسگاہ سے علماء کی ایک ایسی جماعت وجود میں آئے جو دین میں بصیرت کی حامل ہو"

ان سطور کے خاکسار راقم کو وہ تبحرِ علمی تو میسر نہیں کہ اس فاضلانہ مشورے کا ماوجب تجزیہ کر سکے لیکن رجالِ دین کی توجہ کے لئے اس میں مخفی چند رموز کی طرف اشارہ کئے بغیر چارہ نہیں۔ دیوبند اور ندوہ

---

[1] اس پُر از مسرت خبر پر جان بھی نثار کر دی جائے تو روا ہے۔

ایک ہی طرح کی دو درسگاہیں تھیں یا ان میں بایں معنی کچھ فرق وتفاوت تھا کہ اول الذکر سلف کی روایات کی امانت اور فلسفہ وحکمتِ دینی کے مستند اور سکّہ بند سرمائے کو سینے سے لگائے بیٹھی رہی اور ثانی الذکر نے علی گڑھ کی اعتدال سے متجاوز "روشنیٔ طبع" کو ایک حد تک لگام دینے کی کوشش کے علاوہ محض عربی زبان وادب اور تدوین وترتیبِ تاریخ کے میدان میں ترک تازی دکھانے پر تقریباً اکتفا کیا۔[۳] اس پس منظر میں ان کی علم وتحقیق کی بنیاد یکساں کیسے قرار دی جاسکتی ہے۔ اور یہ کہ "اس زمانے کے دبستان شبلی کے بعض اہل علم" ہوں یا کسی اور مدرسہ فکر کے خوشہ چیں علماء 'مابعد کے کل سرمایۂ علمی سے صرف نظر کرتے ہوئے اسلام کی صرف پہلی صدی کے ہمارے اکابر ائمہ سے استفادہ کر کے دین کی جو مجتہدانہ بصیرت وہ حاصل فرمائیں گے' وہ اجتہادی بصیرت نئے شگوفے چھوڑے گی 'گل ہی کھلائے گی یا اسلامی انقلاب برپا کرنے کے عمل میں علمائے حق کا تعاون بھی حاصل کرنے میں کامیاب رہے گی جو ہمارے نزدیک اس راہ میں نشان منزل پانے کے لئے شرطِ لازم ہے۔

دوسرے نکتے میں فاضل مضمون نگار "خدام" کا ایک اور کالم کھڑا کرتے ہیں جو اہل علم کو قیل و قال میں مصروف چھوڑ کر الگ سے خدمت دین کا کام کرے گا۔ انقلابی عمل تو جدوجہد کے دور میں خاص وعام سب قوتوں کو یکجا کرنے کا متقاضی ہے۔ انہیں تقسیم کرنے میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے؟ شاید یہ کہ دین کے خدام کے لئے محترم کالم نویس کو تیسرے نکتے میں جو "بالغ نظر اور مخلص" قیادت درکار ہے وہ اہل علم کی دخل در معقولات سے محفوظ و مامون رہے اور یک سوئی سے قرآن وسنت کی ایک ایسی بنیاد پر قصر انقلاب کی تعمیر کرے جس میں "نقل" کی ضرورت کم ہو اور "عقل" کا استعمال زیادہ۔ جو ان ائمہ دین کی مسلسل ومتواتر کاوش وتحقیق کی کم محتاج ہو جنہوں نے قرآن کریم پر غور وفکر اور سنت کو متعین شکل دینے میں زندگیاں کھپائی ہیں اور دور جاہلیت کے شعراء کے اس کلام کی موشگافیوں سے زیادہ استفادہ کرے جس سے "بعض اہل علم" پر اعجاز قرآنی کے عقدے بہتر طور پر کھلتے ہیں۔ رہی "اپنے ترتیب دیئے ہوئے نصابات" سے ان کی بیزاری تو وہ یقیناً جائز وروا ہوگی اگر ایسے نصابات رسول اللہؐ کے لائے ہوئے پیغام ربانی کو سمجھانے اور اسی کے کلام مبین کو اوڑھنا بچھونا بنانے کی ترغیب وتشویق کی غرض سے صرف اور صرف قرآن مجید کے متن ہی سے اخذ نہ کئے گئے ہوں۔ ورنہ مختلف مواقع و

---

[۳] تفصیلی مطالعے کے لئے دیکھئے "حکمت قرآن" شمارہ ماہ ستمبر ۸۷ء میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دو وقیع مقالات۔

مصالح کی مناسبت سے قرآن کریم کی آیتوں اور سورتوں کا انتخاب تو ہادی اعظمؐ اور ان کے جلیل القدر صحابہؓ سے بھی ثابت ہے۔

تیسرے نکتے اور خاتمہ کلام کے بین السطور ہی وہ اصل ہنگامے مستور ہیں جنہوں نے فاضل کالم نگار اور ان کے قبیلے کا خواب و خور حرام کیا ہوا ہے۔ پہلے نزلہ سمع و طاعت کی بیعت پر گرتا ہے حالانکہ اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کی جدوجہد میں سمع و طاعت کی بیعت وہ مبارک لیکن متروک سنت ہے جس کے اجراء کی ہمت کرنے والا اجر عظیم پائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی بشارت کے مطابق کسی ایک بھی مردہ سنت کا احیاء کرنے والے سے مرتبہ شہادت کا وعدہ ہے۔

بیعت کے نظام کا جواز و صواب اور اسلام کی تاریخِ دعوت و عزیمت میں اس کا تسلسل ایک علیحدہ مقالے کا موضوع ہے۔ یہاں تو صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ انانیت ' خود پرستی اور نفسانفسی کے اس عالم میں جب ہر شخص " خود کوزہ و خود کوزہ گر و خودِ گلِ کوزہ " بنا پھرتا ہے' بیعت سمع و طاعت طلب کرنے کے لئے چیتے کا جگر چاہئے شاہیں کا تجسس۔ اس زمانے میں یہ بھاری پتھر اٹھانا بلاشبہ " من عزم الامور " ہے۔ اور اگر اللہ کے کسی بندے کو کچھ لوگوں نے دیکھتی آنکھوں اور سنتے کانوں اس بیعت کا اہل سمجھا ہے تو یہ وہ مقام ہے جو حسد کے نہیں رشک کے لائق سمجھا جانا چاہئے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اور ہاں! اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے لئے شوریٰ کی پابندیوں سے بالاتر " مامور من اللہ داعی " کی کوئی ایسی تنظیم بھی جو اپنے آپ کو " فوجی نظم و ضبط " میں باندھنے کی کوشش کر رہی ہو' " بعض اہل علم " کے لئے ایسی کڑوی گولی ہے جو کسی طور نگلی نہیں جا سکتی اگرچہ اس دوران پلوں کے نیچے سے کتنا ہی پانی بہہ گیا ہے۔ اعتراض برائے اعتراض کی بات الگ ہے۔ جو لوگ سمجھنے کے خواہش مند ہوں ان کے لئے اس وضاحت میں کوئی الجھاؤ نہ ہو گا کہ اگرچہ نبوت و رسالت کا دروازہ بند ہو جانے کے بعد ہر کلمہ گو کو اسلام کا داعی ہونا چاہئے تاہم جسے اللہ تعالیٰ اپنی دینی ذمہ داریوں کا کماحقہ' شعور عطا فرما دے اس کی سوا مشکل ہے۔ وہ تو پابند ہو جاتا ہے کہ دین کی دعوت دینے والے اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے کوشاں کسی نہ کسی گروہ سے عملاً وابستہ ہو کر رہے اور اگر اس راہ میں کوئی مقام اسے چاہی نہ ہو تو خود داعی بن کر

اٹھ کھڑا ہو اور " من انصاری الی اللہ " کی پکار لگائے۔ جس داعی کو بھی توفیق کی یہ ارزانی ہو جائے اس کا یہ عمل اللہ کے حکم کی بجا آوری میں ہی تو ہو گا۔ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا امر ہی تو ہے جس کی تعمیل پر وہ کمربستہ ہوا ہے۔ اس معنی میں ہر داعی " مامور من اللہ " ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی مفہوم کسی داعی کے حاشیہ خیال میں بھی اپنے بارے میں پایا جاتا ہو تو اس بدبخت کا شمار اور حشر مرزا غلام احمد علیہ ماعلیہ کے بھائی بندوں کے ساتھ ہو گا۔

داعی کو شوریٰ کی پابندیوں کے تحت لانے کا شوق جمہوری تماشے کے اس دور میں بہت عام ہے۔ اچھے بھلے دانا و بینا لوگ چھوت کی اس بیماری سے محفوظ نہ رہ سکے۔ حالانکہ سیدھی سی بات یہ ہے کہ ایک داعی کی پکار پر لبیک کہنے والے لوگ پہلے سے اور از خود اس کے ادارے یا تنظیم کے بانیوں بلکہ وابستگان میں سے بھی نہیں ہوتے۔ وہ دعوت الی اللہ کے کام میں جس داعی کو اپنا تعاون پیش کرتے ہیں ان کا اعتماد کسی رسمی اظہار کا حاجت مند نہیں رہتا۔ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دینا ہی بالفعل اس حقیقت کی علامت بن جاتا ہے کہ اس کے خلوص و اخلاص اور فہم و فراست پر انہیں شعوری طور پر انشراح صدر حاصل ہے۔ پھر سمع و طاعت فی المعروف کی بیعت کے اضافی عہد و پیمان کے بعد شوریٰ کا ڈھونگ رچانا دکھاوے کے لئے تو ہو سکتا ہے' موثر نہیں ہوتا۔ کون نہیں جانتا کہ داعیوں کی اٹھائی ہوئی دینی تحریکوں میں اگر شورائیت اور انتخاب امیر وغیرہ کے قواعد و ضوابط پائے بھی جاتے ہیں تو عملاً وہ ہاتھی کے دانتوں کی حیثیت ہی کے حامل ہیں۔ کھانے کے نہیں' دکھانے کے۔ برعکس اس کے اگر کوئی جماعت' ادارہ یا انجمن کچھ لوگوں کی مشترک اجتماعی کوششوں سے وجود میں آئی ہو یا اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل سے اس ملک خداداد میں یا کسی اور خطۂ ارضی میں دین کو اقتدار حاصل ہو جائے جو ظاہر ہے کہ کسی کے باپ کی جاگیر نہیں' سب اہل وطن کا مشترک ورثہ ہو گا تو ایسی صورت میں شورائیت ایک دستوری اور عملی ضرورت ہی نہیں' نص قرآنی ہے۔ انقلابی تحریکوں کا اصولی طرز عمل تو وہی ہوتا ہے جو اوپر بیان ہو چکا تاہم ایک ناقابل تردید حقیقت یہ بھی ہے کہ ان میں شورائیت کا عدم وجود کم از کم اس دور پر آشوب میں تو آمریت کا روپ ہرگز نہیں دھار سکتا۔ کسی اجتماعیت کو' جو جدوجہد کے مرحلے سے گزر رہی ہو اور جس میں " فتوحات " اور کسی بھی طرح کی " یافت " کا دور دور نشان نہ ملتا ہو' کوئی داعی یا امیر بغیر حقیقی وواقعی (بمقابلہ رسمی و قانونی) شورائیت کے دو گام بھی چل کر تو دکھائے۔

رہا کسی تنظیم کا فوجی نظم و ضبط میں بندھا ہونا...... تو کون عقلمند بقائمی ہوش و حواس یہ دعویٰ کرے گا کہ

کوئی سیاسی جماعت بھی نظم و ضبط کے بغیر اپنے مقاصد کی منزل تک رسائی حاصل کر سکتی ہے ...
(حکومتی مسلم لیگ کو فی الحال ذہن سے نکال دیجئے کہ وہ سرے سے جماعت ہے ہی نہیں) ۔ اسلامی انقلابی تحریک کے تقاضے تو سمع و طاعت سے کم کسی ڈسپلن سے پورے نہیں ہو سکتے۔ اسے اگر فوجی نظم و ضبط کا نام دیا جائے تو بھی حق ادا نہیں ہوتا۔ اپنی ڈفلی بجانے اور اپنے راگ الاپنے والے لوگوں کا مجمع ایک میلے کا سماں تو پیدا کر سکتا ہے، کسی انقلابی تحریک کے خدوخال سے ذرا بھی مشابہت نہیں رکھتا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

پچھلے ماہ ہم نے برادرِ محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد کی علالت کی خبر دے کر قارئینِ "میثاق" کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ الحمدللہ کہ اب وہ معذوری کی قید سے آزاد ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی طرف سے ادارہ اُن سب محترم دوستوں اور بزرگوں کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے خصوصی دعاؤں میں انہیں یاد رکھا۔ اور ان کرم فرماؤں کا بالخصوص سپاس گزار ہے جنہوں نے تشریف لا کر اصالتاً اور خطوط کے ذریعے وکالتاً مزاج پرسی کا حق ادا کیا۔ خطوط میں سے چند کو اس بنا پر شاملِ اشاعت کیا گیا ہے کہ اُن میں افادۂ عام کے پہلو بھی ہیں۔ باقی مکتوب نگاروں سے گذارش ہے کہ انہی الفاظ کو از راہِ کرم رسید سمجھیں۔ لاہور کے معالجینِ خصوصی اور ہڈیوں کے امراض کے ماہر ڈاکٹروں نے جس محنت اور التفات سے ڈاکٹر صاحب کا علاج کیا اس کا ذکر نہ کرنا بھی ناشکری ہوگی۔ ہم ان سب کے احسان مند ہیں۔ بالخصوص سرجن قاضی عبدالرزاق صاحب اور نیورو فزیشن ڈاکٹر منور حیات کے جن کی عنایات بے حد و حساب رہیں۔

ڈاکٹر صاحب محترم کی صحت ابھی پورے طور پر بحال نہیں ہوئی ہے اور بیماری کے اثرات ابھی باقی ہیں لہٰذا احتیاجِ دعا برقرار ہے۔ بایں ہمہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی توفیق سے انہوں نے اپنی صلاحیت اور میسّر موقع سے فائدہ اٹھانے کا ایک بھرپور پروگرام بنا لیا ہے۔ جس کی تفصیل اس مراسلے سے عیاں ہے جو انہوں نے صحت یابی کے آثار دیکھتے ہی اپنے ساتھیوں کو لکھا اور ہمیں بھی اشاعت کے لئے دیا کہ اُن سے تعلق خاطر رکھنے والا ہر شخص اس کا مخاطب ہے۔ اُس مراسلہ کا عکس ادارے کی طرف سے دعاؤں کی تاکیدِ مزید کے ساتھ صفحہ ۹۶ پر شائع کیا جا رہا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

شریعت بل کا المیہ
اور اس کی ذمہ داری

ڈاکٹر اسرار احمد

قلب اور ذہن اس تصور سے لرزہ بر اندام ہیں' اور زبان و قلم اس اندیشے کے اظہار میں شدید رنج و غم اور صدمہ محسوس کر رہے ہیں کہ پاکستان میں شریعت بل کا جو حشر ہوا اور تا حال ہو رہا ہے وہ کہیں کسی عمومی عذاب سے قبل اللہ تعالیٰ کی جانب سے آخری تنبیہ بلکہ اتمامِ حجّت کی حیثیت اختیار نہ کر لے...... اس لئے کہ کسی مسلمان قوم کے سامنے شریعتِ خداوندی کی غیر مشروط بالا دستی کو عملاً قبول کر لینے کی اس قدر صاف اور سادہ' اور خالص اور بے لاگ دعوت سے اعراض وانکار عام مادہ پرست انسانوں کے نزدیک تو شاید کوئی اہم اور غیر معمولی واقعہ نہ ہو' لیکن وہ حقیقت بین لوگ جن کی آنکھوں کا سرمہ خاکِ بطحا و یثرب ہے خوب جانتے ہیں کہ "اِنَّھَا لَاِ حْدَی الْکُبَرِ" (سورہ مدثر) کے مصداق ایک عظیم حادثۂ فاجعہ سے کسی طرح کم نہیں ہے! (ترجمہ...... یہ بہت بڑی باتوں میں سے ایک ہے!)

☆☆☆

ہر باشعور مسلمان جانتا ہے کہ اللہ کی اطاعت و بندگی کی دعوت تاریخ انسانی کے آغاز سے لے کر اب سے چودہ سو برس قبل تک اولوالعزم نبیوں اور رسولوں اور ان کے جلیل القدر صحابہؓ اور حواریوں کا کام رہا ہے...... اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت اور رسالت کے اختتام پذیر ہو جانے کے بعد سے یہ ذمہ داری تمام مسلمانوں پر بالعموم اور علماء دین پر بالخصوص عائد ہوتی ہے جنہیں آنحضورؐ نے انبیاء کے وارث

ان میں سے پہلے جوڑے کا فریق اول موجودہ نیشنل اسمبلی'' سینیٹ' اور مرکزی حکومت پر مشتمل ہے جبکہ دوسرا فریق صرف ایک شخصیت یعنی صدر مملکت پر مشتمل ہے جو کہنے کو تو فرد واحد ہیں لیکن واقعہ میں 'اس خاص قوم کے مانند جس کا ایک فرد سوا لاکھ کے برابر ہوتا ہے 'تن تنہا مقدم الذکر پورے فریق پر بھاری ہیں!

ان میں سے 'ظاہریات ہے کہ 'شریعت بل کے ضمن میں تا حال جو لیت ولعل ہوا اور تاخیر و تعویق کے حربے آزمائے گئے ان کی ذمہ داری کُلِّیَۃً فریق اول پر عائد ہوتی ہے...... اور آئندہ بھی اگر یہ بل صریحاً رد ہو کر ردی کی ٹوکری کے حوالے ہو گیا یا اسے مُثلہ کر کے بالکل غیر مؤثر صورت میں منظور کیا گیا تو اس کی ذمہ داری بھی اسی فریق پر آئے گی...... اس لئے کہ اصلاً اور عملاً ان ہی کے سامنے اس بل کی صورت میں سورہ مائدہ کے ساتویں رکوع کی آخری آیت میں وارد شدہ سوال ایک ننگی تلوار کے مانند کھڑا ہے کہ:

"اَفَحُکْمَ الْجَاھِلِیَّۃِ یَبْغُوْنَ؟" (ترجمہ) "تو کیا یہ لوگ جاہلیت کے حکم اور فیصلے کے طالب ہیں؟" ...... اور انہی کے سروں ہی پر سورہ مائدہ کے متذکرہ بالا رکوع میں وارد شدہ تہدیدی اور غیظ و غضب سے بھرپور آیات کی تلواریں لٹک رہی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ "جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے (قانون اور شریعت) کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی تو کافر ہیں...... وہی تو فاسق ہیں...... وہی تو ظالم ہیں!"

بقول علامہ اقبال ؎

بتوں سے تجھ کو امیدیں' خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس جوڑے میں سے اس المیے کی اصل ذمہ داری سورہ نور میں وارد شدہ الفاظ مبارکہ "اَلَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ" ترجمہ "وہ شخص جس نے اس کا سب سے بڑا وبال اپنے سر لیا!" کے مصداق اس شخصیت کے سر ہے جس نے مارشل لاء کی صورت میں ابتداءً محاسبہ اور تطہیر کے نام پر اور بعد ازاں کُلِّیَۃً

اسلام کے نام پر اپنے اقتدار کو طول دیا اور پورے ساڑھے آٹھ برس تو خود اپنے ہی الفاظ کے مطابق "مقتدرِ مطلق" کی حیثیت سے کوسِ لِمَنِ الملک بجایا۔ اور اس کے بعد جمہوریت کی نیم دلانہ اور جزوی بحالی کے موقع پر خود تو پھر اسلام ہی کے نام پر ریفرنڈم کا ڈھونگ رچا کر پانچ سال تک کے لئے صدارت پر بھی قابض ہو گیا اور "بحالیٔ جمہوریت' کی قیمت کے طور پر ملکی دستور میں من مانی ترمیمات بھی تسلیم کرا لیں اور ان کے ذریعے صدارت کے علاوہ اقتدارِ اعلیٰ کی بعض دوسری اہم ڈوریں بھی اپنے ہاتھ میں لے لیں' اور اپنے ساڑھے آٹھ سالہ دور "اقتدار مطلق" کے جملہ اقدامات کے لئے تحفظ بھی حاصل کر لیا...... لیکن اسلام کی بالادستی کے لئے نہ تو اپنے خالص دور اقتدار میں' سوائے چند ظاہری ٹیپ ٹاپ (COSMETIC TREATMENT) کی نوعیت کے الٹے سیدھے اقدامات کے' کوئی فیصلہ کن قدم اٹھایا نہ ہی جمہوریت کی نیم بحالی کے موقع پر وصول شدہ قیمت میں سے کوئی حصہ دین اسلام یا شریعت اسلامی کو دلوایا......!!

بلکہ ستم بالائے ستم یہ کہ عوام کو نفاذِ شریعت کے لئے ارکان اسمبلی کا گھیراؤ کرنے کی تلقین فرما کر ان لوگوں کی راہ میں مزید کانٹے بچھا دیئے جو موجودہ نیم جمہوری نظام ہی کے ذریعے نفاذِ شریعت کے لئے کوشاں ہیں...... اس لئے کہ اس سے عوام کے ایک بہت بڑے طبقے کی نگاہوں میں ان کا کردار مشکوک ہو گیا اور اُس کے نزدیک ان کی بات "ہز ماسٹرز وائس' کی حیثیت اختیار کر گئی!

☆☆☆

اس المیئے کے ذمہ داروں کا دوسرا اہم جوڑا مذہبی تنظیموں اور نیم دینی و نیم سیاسی جماعتوں پر مشتمل ہے۔ اس جوڑے کے فریق اول کی حیثیت ان جماعتوں اور جمعیتوں کو حاصل ہے جنہوں نے شریعت بل کی براہ راست اور کھلم کھلا مخالفت کی اور فریق ثانی ان جماعتوں اور جمعیتوں اور تنظیموں اور اداروں پر مشتمل ہے جنہوں نے دو سینیٹر حضرات کے پیش کردہ نجی بل کو نہ صرف یہ کہ "اختیار'

(۳)...... پھر اس کو منظور کرانے کی جدوجہد کے لئے جو متحدہ شریعت محاذ وجود میں آیا وہ بھی خالص غیر سیاسی اور غیر فرقہ وارانہ تھا۔ اور اس میں ملک میں غالب اور فیصلہ کن اکثریت رکھنے والے اہل سنت کے جملہ مکاتب فکر کی بھرپور نمائندگی موجود تھی۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ کسی قطعاً غیر سیاسی اور خالص دینی پلیٹ فارم پر اتنی دینی قوتوں کا اجتماع ایک بہت طویل عرصے کے بعد دیکھنے میں آیا تھا۔

لیکن اس سب کے باوصف اس بل کا جو حشر ہوا وہ یہ کہ:

(۱)... دو سال سے زائد عرصے سے وہ اس سینٹ کے حلق میں ہڈی بن کر پھنسا ہوا ہے جس کے اراکین کی اکثریت کی رکنیت صرف اس امر کی مرہون منت ہے کہ وہ اس شخصیت کے منظور نظر تھے جس نے کچھ ہی عرصہ قبل اسلام اور دین و شریعت کے نام پر ریفرنڈم کا ڈھونگ رچایا تھا!

(۲)..... حکومتِ وقت کے ذمہ دار ترین حضرات کی جانب سے بار بار یہ فیصلہ کن اعلان ہو چکا ہے کہ بل ہرگز منظور نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ برسر اقتدار لوگوں نے شریعت اسلامی کی ایسی فیصلہ کن صورت میں تنفیذ کی تحریک سے خائف ہو کر اپنے اس جزوی قدم کو بھی راستے ہی میں روک لیا ہے جو دستور کے نویں ترمیمی بل کی صورت میں 'غلطی' سے اٹھ گیا تھا!

○ مزید بر آں... سیکولر ذہن اور نظریات کی حامل جماعتوں اور زعماء کا تو کہنا ہی کیا' بہت سے نام نہاد 'اسلام پسند' طبقوں اور رہنماؤں' حتیٰ کہ بعض خالص مذہبی جماعتوں اور تنظیموں تک نے اس کی شدید مخالفت کی۔

ان حالات میں واقعہ یہ ہے ناطقہ سر بگریباں ہے کہ کیا کہیے اور خامہ انگشت بدنداں ہے کہ کیا لکھے کہ معاذ اللہ ۔

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!

☆☆☆

اب آیئے اس سوال کی جانب کہ اس المیے کا ذمہ دار کون ہے؟

اس ضمن میں بھی اس حقیقت کے ادراک و شعور اور اس کے اظہار و اعتراف پر لرزہ طاری ہوتا ہے کہ اگر اس کی ذمہ داری چند افراد یا قوم کے کسی ایک مخصوص طبقے پر عائد ہوتی تو معاملہ اتنا خوفناک نہ ہوتا اس لئے کہ ؎

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے!

لیکن افسوس کہ یہاں معاملہ یہ ہے کہ یہ ذمہ داری کم و بیش پوری کی پوری قوم اور اس کے جملہ طبقات پر عائد ہوتی ہے... اور یہی معاملہ زیادہ پریشان کن اور قابلِ حذر ہے' اس لئے کہ بقول اقبال قدرت خداوندی ؎

نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!

ذمہ داری کی اس بحث میں قوم کے ان طبقات کا ذکر تو تضییع وقت اور قلم و قرطاس کے زیاں کے مترادف ہو گا جو کھلم کھلا سیکولر سیاست کے علمبردار ہیں' اور اپنی ناسمجھی میں پاکستان کو بھی دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح ایک عام ملک سمجھتے ہیں اور ان کا زیادہ سے زیادہ مبلغِ فکر دنیا کی دوسری فلاحی ریاستوں کی طرح کی فلاحی ریاست کا قیام ہے' یا محض سیاست کے میدان کے کھلاڑی ہیں' اور جنگِ اقتدار سے زائد نہ انہیں دین و مذہب کے تقاضوں سے کوئی سرور کار ہے' نہ ملک و قوم کی فلاح و بہبود سے کوئی تعلق...... ایسی جماعتوں اور تنظیموں اور اس قسم کے رہنماؤں اور رعیموں کی جانب سے اگر شریعت بل کی مخالفت ہوئی تو انہیں دوش یا الزام دینا عبث ہے' اس لئے کہ ؎ "اقتضائے طبعس این ست!"

ہمارے نزدیک اس المیے کی اصل ذمہ داری چار طبقات پر عائد ہوتی ہے جو دو دو کے دو جوڑوں پر مشتمل ہیں۔ اور عجیب بات ہے کہ ان دونوں جوڑوں میں سے بظاہر احوال زیادہ ذمہ داری ایک ایک فریق پر عائد ہوتی ہے' جبکہ فی الحقیقت ذمہ داری کا زیادہ بوجھ ہر جوڑے کے دوسرے فریق پر ہے۔

قرار دیا ہے...... پھر قرآن کا پڑھنے والا کون مسلمان ہو گا جو اس حقیقت سے واقف نہ ہو کہ اسی دعوتِ حق سے اعراض اور روگردانی کی پاداش میں پوری پوری قومیں اور بڑی بڑی آبادیاں نیست و نابود کر دی گئیں۔ اس لئے کہ قومِ نوحؑ سے لے کر آلِ فرعون تک متعدد قوموں کی عبرتناک داستانیں قرآن مجید میں بار بار دہرائی گئی ہیں۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نبوت کے بعد 'اب قانونِ قرآنی "وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُولًا" (سورہ بنی اسرائیل) ترجمہ..... اور ہم عذاب نہیں بھیجتے رہے جب تک کسی رسول کو مبعوث نہ فرمادیں" کے مطابق 'قوم نوح یا عاد و ثمود وغیرہ کی قسم کا عذاب استیصال جس سے پوری کی پوری قوم اور تمام امت کو نیست و نابود اور نسیاً منسیّاً کر دیا جائے کسی قوم پر نہیں آئے گا (سوائے یہود کے کہ وہ مستحق سزا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے ہی میں ہو گئے تھے لیکن ان کی سزا کی تنفیذ آنجنابؑ کی دوبارہ آمد تک کے لئے مؤخر کر دی گئی ہے!) نام نہاد مسلمان قوموں اور امتوں کے لئے تو وہ سنت الٰہی اب بھی جاری ہے جس کے تحت بنی اسرائیل پر دو بار شدید ترین عذاب آیا (ایک بار کلدانیوں کے ہاتھوں اور ایک بار رومیوں کے ہاتھوں!) اور خود مسلمانوں پر بھی عالمگیر پیمانے پر یہ عذاب دو ہی مرتبہ آیا (پہلی مرتبہ تاتاری وحشیوں کے ہاتھوں اور دوسری مرتبہ یورپی مسیحیوں کے ہاتھوں!)..... اور خامہ پھر لرزہ بر اندام ہے اس اندیشے کے اظہار سے کہ ایک محدود پیمانے پر ملت اسلامیہ پاکستان پر بھی ایک مرتبہ تو یہ عذاب ۱۹۷۱ء میں سقوط مشرقی پاکستان کے موقع پر آچکا ہے اور دوسری بار کے آثار شدت کے ساتھ ظاہر ہو رہے ہیں اور صاف محسوس ہو رہا ہے کہ ۔

آگ ہے' اولادِ ابراہیم ہے' نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ شاعر کے اس خیال کے مصداق کہ ۔

عصیاں سے کبھی ہم نے کنارا نہ کیا
پر تو نے دل آزردہ ہمارا نہ کیا
ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر
لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا!

اس عذاب کے لئے مسلمانان پاکستان نے تو پورے چالیس سال سے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہوا تھا اور تحریک پاکستان کے دوران اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے وعدوں کی خلاف ورزی عذاب الٰہی کو مسلسل دعوت دے رہی تھی لیکن رحمتِ خداوندی ڈھیل دیئے جا رہی تھی لیکن اب..... خاکم بدہن ... یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے "اَجَلٌ مُّسَمًّی" یعنی وقت معیّن سر پر آن پہنچا ہے اور اس کے ضمن میں آخری اتمامِ حجّت اور قطعِ عذر شریعت بل کے المیے کے ذریعے ہو رہا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ یہ اندازہ غلط ثابت ہو اور قدرت ہمیں کچھ مزید مہلت دے دے' وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْز!!

☆☆☆

غور کا مقام ہے کہ.....

(۱) ..... یہ بل دو ایسے حضرات نے پیش کیا جو ایک جانب مسلّمہ حیثیت اور مرتبے کے عالم دین ہیں. اور دوسری جانب ایک مقتدر قومی و دستوری ادارے یعنی سینٹ کے رکن ہیں۔

(۲) پھر اس میں صرف کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر مشروط اور بلا استثناء بالادستی کا مطالبہ تھا' صرف اس صراحت کے ساتھ کتاب وسُنّت کی تاویل من مانے اور مادر پدر آزاد انداز میں نہیں ہوگی' بلکہ بحیثیت مجموعی صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدین اور اہل بیت عظام و ائمۂ مجتہدین کی تاویل و توضیح اور اجتہاد و استنباط کے دائرے کے اندر اندر ہوگی۔ اس کے علاوہ نہ اس کے ساتھ کوئی سیاسی مسئلہ منسلک تھا نہ کسی بھی نوع کی فرقہ واریت!

(ADOPT) کر لیا بلکہ اس کو منظور کرانے کی جدوجہد کے لئے اپنے آپ کو "متحدہ شریعت محاذ" کی صورت میں منظم بھی کر لیا۔

ان میں سے بھی بچشم سر تو یہی نظر آتا ہے کہ شریعت بل کے کھٹائی میں پڑنے کی ذمہ داری کا اصل بوجھ فریق اول یعنی بل کے مخالفین کے کندھوں پر ہے...... لیکن چشم حقیقت بین کچھ اور دیکھتی ہے اور اسے معاملہ ؏

میں الزام ان کو دیتا تھا' قصور اپنا نکل آیا!

والا نظر آتا ہے... تاہم اس مسئلہ پر تو گفتگو بعد میں ہوگی' آیئے کہ پہلے فریق مخالف کا جائزہ لے لیں!

ان میں سے بھی اہل تشیّع کے بارے میں ہمیں کچھ عرض نہیں کرنا ہے' اولاً اس لئے کہ ان کا معاملہ حساس اور فرقہ وارانہ نوعیت کا ہے' ثانیاً اس لئے کہ ان کے مسئلے کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے' جس کا مظہر اتم یہ ہے کہ خود انہوں نے زکوٰۃ کے معاملے میں اپنے آپ کو اہل سنت سے بالکل علیحدہ کر لیا... اور ثالثاً اس لئے کہ اگرچہ وہ متحدہ شریعت محاذ میں شامل نہیں ہوئے تاہم انہوں نے شریعت بل کی مخالفت میں بھی زیادہ سرگرمی نہیں دکھائی... اور یہ غالباً اس لئے کہ مجوزہ شریعت بل میں کتاب و سنت کی تعبیر و تاویل کے ضمن میں جہاں صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کا عمومی ذکر ہے (جن میں لازماً جملہ اہل بیت اطہارؓ اور حضرت علیؓ بھی شامل ہیں) وہاں اہل بیت عظام کا ذکر خصوصی طور پر اور جداگانہ انداز میں بھی موجود ہے۔ رضی اللہ عنہم وارضاہم اجمعین!

☆☆☆

اہل سنت کی جن تنظیموں نے شریعت بل کی مخالفت میں فعال کردار ادا کیا وہ تین ہیں۔ جمعیت علماء اسلام کا مولانا فضل الرحمٰن گروپ' جمعیت اہل حدیث کا علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم و مغفور کے نام سے معنون گروپ' اور جمعیت علماء پاکستان بحیثیت مجموعی۔

جہاں تک راقم الحروف سمجھ سکا ہے اور اس میں خطا کا امکان بہرحال موجود ہے' ان تمام جمعیتوں کی جانب سے شریعت بل کی مخالفت اصلاً اور ابتداءً خالص سیاسی بنیادوں پر تھی...... اگرچہ بعد میں ان میں سے بعض نے اپنے اختلاف کے لئے ایک مذہبی بنیاد بھی خالصتہً دفعِ حجت کے لئے بطور ڈھال اختیار کر لی۔ واللہ اعلم!!

ان حضرات کے سیاسی موقف کے بارے میں راقم الحروف کی رائے کیا ہے۔ اس سوال کے جواب میں اگر اس وقت کچھ عرض کیا جائے تو شاید اسے سخن سازی قرار دیا جائے۔ لہٰذا راقم یہاں اپنے اس بیان کا متعلقہ حصہ درج کر رہا ہے جو اُس نے تنظیم اسلامی کی متحدہ شریعت محاذ میں شمولیت کے موقع پر جاری کیا تھا اور جو ماہنامہ "میثاق" کی اشاعت بابت نومبر ۱۹۸۶ء میں بھی شائع ہوا تھا اور روزنامہ "جنگ" نے بھی اسے از راہ کرم من و عن بطور مضمون شائع کر دیا تھا۔ وَھُوَ ھٰذا

" اِس متحدہ شریعت محاذ میں وہ تمام اہم مذہبی عناصر جمع ہیں جنہوں نے صدر ضیاء الحق کی سابقہ خالص مارشل لائی حکومت کے دوران حکومت اور ایم آر ڈی کے بین بین روش اختیار کی تھی اور پھر صدر صاحب کے ترمیم کردہ دستور کے تحت منعقد ہونے والے غیر جماعتی انتخابات میں حصہ بھی لیا تھا' جیسے جماعت اسلامی بحیثیت مجموعی' جمعیت علماء اسلام کا مولانا درخواستی گروپ' جمعیت اہل حدیث کا میاں فضل حق گروپ اور بریلوی مکتب فکر کے بعض مقتدر اور مسلمہ حیثیت کے حامل علماء کرام ان اہم جماعتوں کے ساتھ ساتھ بعض دوسری چھوٹی دینی تنظیمیں اور انجمنیں بھی اس متحدہ محاذ میں شامل ہو گئی ہیں جن میں سے ایک تنظیم اسلامی بھی ہے!

اس کے بالمقابل بعض دوسرے دینی حلقے اس شریعت بل اور متحدہ شریعت محاذ کی مخالفت ڈنکے کی چوٹ کر رہے ہیں۔ ان میں سے جمعیت علماء اسلام کا مولانا فضل الرحمٰن گروپ تو ایم آر ڈی کا فعال اور مؤثر جزو ہے' جمعیت اہل حدیث کے علامہ احسان الٰہی ظہیر گروپ کو بھی ایک نسبت ایم آر ڈی سے حاصل رہی ہے اس لئے کہ علامہ صاحب موصوف تحریک استقلال کے ناطے ایم آر ڈی میں

.... اور اہل حدیث بزرگوں اور دوستوں کی جانب سے شدید ردعمل کے اندیشے کے باوجود راقم الحروف یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ اس معاملے میں کم از کم ان کا رویّہ تو بعینہٖ وہی ہے جس پر قرآن مجید نے ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا تھا کہ "وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ" (سورہ بقرہ رکوع ۵) ترجمہ "اور مانو اس چیز کو جو میں نے اس چیز کی تصدیق کرتے ہوئے نازل فرمائی ہے جو تمہارے پاس موجود ہے.... اور تم ہی اس کے سب سے پہلے انکار کرنے والے نہ بن جاؤ!"

لیکن افسوس کہ جہاں سچے عشق کا معاملہ تو یہ ہوتا ہے کہ ع

میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا!

وہاں شخصی، گروہی اور سیاسی تعصب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ع

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا!

جہاں تک فقہِ حنفی کا تعلق ہے، خود راقم الحروف اس رائے کا اظہار جولائی ۸۶ء میں (مولانا فضل الرحمٰن کے اعلان سے آٹھ ماہ قبل) ڈنکے کی چوٹ کر چکا تھا کہ جس نہج اور طریق سے شریعت بل کے مجوزین پاکستان میں شریعت اسلامی کے نفاذ کے لئے کوشاں ہیں اس کا تقاضا ہے کہ یہ دو اعلان دوٹوک انداز میں کئے جائیں کہ اولاً ...... پاکستان ایک سنی اسلامی ریاست ہے اور ثانیاً.... یہاں کا قانون ملکی (LAW OF THE LAND) فقہ حنفی کے مطابق ہو گا، البتہ دوسرے مسالک کے لوگوں کو احوالِ شخصیّہ (PERSONAL LAW) کی حد تک اپنی اپنی فقہ پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہو گی.....!

راقم کا یہ بیان اخبارات میں بھی نمایاں انداز میں رپورٹ ہوا تھا اور اس موضوع پر ایک مفصل خطاب بھی "میثاق" کی اشاعت بابت اگست ۸۶ء میں شائع ہو گیا تھا..... لیکن ظاہر ہے کہ اولاً..... انسان کو کسی وسیع تر اتحاد کی خاطر ذاتی رائے میں کسرو انکسار قبول کرنا پڑتا ہے، اور ثانیاً..... یہ بھی ظاہر ہے کہ نہ فقہ حنفی کتاب و سنت کے

ائرے سے باہر ہے نہ ہی ، معاذ اللہ ، کتاب و سنت اور فقہ حنفی میں کوئی تباین یا تضاد
ا نسبت ہے!

اس ضمن میں یہ بات ہر ایسے شخص کے اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے جو اسلام کے
ساتھ خلوص و اخلاص کا رشتہ رکھتا ہو اور پاکستان میں اسلام کے بالفعل قیام کے لئے
وشاں ہو کہ اگر یہاں مختلف مسالک کے لوگ یہ روش اختیار کئے رہیں کہ اسلام
آئے تو ہمارے مسلک کی صورت میں آئے ورنہ ہمیں سیکولر نظام ہی بسر و چشم قبول ہے
تو اس ملک میں اسلام کبھی قائم نہ ہو سکے گا۔ اس کے برعکس ہر حنفی کی سوچ یہ ہونی
چاہئے کہ اسلامی نظام بہر صورت آنا چاہئے ' خواہ فقہِ حنفی کی صورت میں ' خواہ
شافعی ' مالکی یا حنبلی فقہ کی صورت میں ' خواہ کتاب و سنت سے غیر مقلّدانہ استخراج و
ستنباط کی صورت میں ' اور ہر اہل حدیث کی سوچ یہ ہونی چاہئے کہ شریعت اسلامی کا
ول بہر صورت بالا ہونا چاہئے خواہ ان کے اپنے مسلک کے مطابق ' خواہ کسی معین
فقہ کے التزام کی صورت میں! اے کاش کہ ایسا ہو جائے!!

☆☆☆

اور اب آیئے اس داستان کے المناک ترین باب کی طرف۔

جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے شریعت بل کے المیے کی اصل ذمہ داری
بل کے مخالفوں پر نہیں بلکہ خود متحدہ شریعت محاذ اور اس میں شامل جماعتوں اور
نظیموں پر ہے۔ اس لئے کہ یہ اصلاً ان ہی کی کم کوشی اور کم ہمتی کا نتیجہ ہے کہ ایک
جانب حکومت شریعت بل کو پورے اطمینان کے ساتھ طاق نسیان پر دھرے نچنت
بیٹھی ہے اور دوسری جانب بل کے مجوزین و موید ین اس حال میں ہیں کہ ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی!

یادش بخیر ' جگرؔ کے درج ذیل شعر کے مصداق ' متحدہ شریعت محاذ کا اٹھان
نہایت شاندار اور پر جلال و پر ہیبت تھا کہ ؎

کوشش پر' بہرحال ہوا یہ کہ ان تینوں فعال اور وقیع مذہبی قوتوں میں سے کسی کو بھی شریعت بل کی حمایت پر آمادہ نہ کیا جاسکا!

اس ضمن میں راقم الحروف نے اپنی بے بضاعتی کے باوجود ڈو ملاقاتیں مولانا سید حامد میاں مدظلہ ' سے کیں ' اور وہ کسی حد تک نرم اور آمادہ بھی ہو گئے تھے لیکن اس کے بعد جب مولانا فضل الرحمٰن سے ملاقات ہوئی تو اندازہ ہوا کہ یہ جواں سال و گرم خون شخصیت اپنی رائے میں بہت پختہ اور مؤقف میں بہت سخت ہے ' لہٰذا مایوسی کا سامنا ہوا۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم سے بھی صرف فون پر دو بار گفتگو ہو سکی ' انہوں نے راقم کے محولہ بالا بیان کو نہایت متوازن قرار دیا اور مبارکباد دی اور راقم کو گمان تھا کہ انہیں مؤقف بدلنے پر آمادہ کیا جاسکتا ہے لیکن افسوس کہ کبھی ان کے اور کبھی میرے بیرونی سفر ملاقات اور تفصیلی گفتگو کی راہ میں سد آہن بنے رہے۔۔ مولانا نورانی میاں بالقابہ سے ملاقات اور گفتگو کی ہمت راقم اپنی بے بضاعتی اور ' ناکسی ' کے پیش نظر نہ کر سکا...... بہرحال اس ضمن میں ہماری آخری پناہ گاہ تو یہی الفاظ مبارکہ ہیں کہ "ماشاءَاللّٰہ کان و مالم یشأ لم یکُن" یعنی جو اللہ نے چاہا وہ ہو گیا اور جو اس نے نہ چاہا وہ ہو ہی نہ سکتا تھا! ۔ تاہم اپنی تمام تر بے بضاعتی اور ان حضرات کی تمام تر جلالت قدر کے باوصف یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ شریعت بل کے خالص دینی مسئلے پر اپنے سیاسی مؤقف کو فوقیت دے کر ان حضرات نے ایک بڑی اخروی جوابدہی کا بوجھ اپنے سر لے لیا ہے...... واللہ اعلم!!

☆☆☆

جہاں تک مذہبی اختلافات کی بنیاد پر شریعت بل کی مخالفت کا تعلق ہے تو اس کی اول تو کوئی اساس تھی ہی نہیں...... اس لئے کہ اولاً خود بل کے مجوزین نے اس کو حرف آخر قرار نہیں دیا تھا بلکہ باہمی مشورے سے ترمیم اور حک و اضافے کا دروازہ کھلا رکھا تھا' چنانچہ متحدہ شریعت محاذ نے بھی جب اسے اپنایا تو اس میں اسلامی نظریاتی کونسل اور بعض دیگر علماء کرام کے مشوروں کی روشنی میں متعدد ترامیم کر دی

تھیں..... اور اس کے بعد بھی محاذ کی جانب سے مسلسل اعلان ہوتا رہا کہ جن دینی حلقوں کو اس کی کسی شق پر کوئی اعتراض ہو وہ بیان فرمائیں' ہم غور کرنے کے لئے تیار ہیں..... چنانچہ خود راقم کے محولہ بالا بیان کا اختتام بھی ان الفاظ پر ہوا تھا کہ:

" دوسرے یہ کہ یہ شریعت بل اپنی موجودہ ترمیم شدہ صورت میں بھی "حرف آخر" نہیں ہے۔ اس میں باہمی مشورے سے مزید ترامیم بھی کی جا سکتی ہیں۔ خود راقم کی ذاتی رائے بعض معاملات میں کسی قدر مختلف ہے (جو میثاق کی اشاعت بابت اگست ۸۶ء میں تفصیلاً بیان ہو چکی ہے) لیکن جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے دین کے تقاضے اور ملت کے مصالح انفرادی آراء سے بالاتر ہیں۔ بقول اقبال ؎

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم
کہ ہو نام اسلامیوں کا بلند!

ضرورت اس امر کی ہے کہ کھلے دل کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں۔ اور باہمی افہام و تفہیم کی فضا میں کسر انکسار کے اصول پر متفقہ مؤقف اختیار کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو خیر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!! "

مزید بر آں اس ضمن میں "مقلدین" یعنی حنفی المسلک حضرات کے لئے پھر بھی کچھ قیل و قال کی گنجائش تھی اس لئے کہ اس بل میں حنفی فقہ کا ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ ۶ر مارچ ۸۷ء کے جلسہ لاہور میں بالآخر مولانا فضل الرحمٰن کو یہی نعرہ لگاتے بنی' اور مولانا نورانی میاں کے دست راست محترم مولانا عبدالستار خاں نیازی نے بھی بعض مواقع پر (مثلاً جنگ فورم میں) یہی موقف اختیار کیا (اگرچہ مولانا نورانی میاں بالقابہٖ کی جانب سے کم از کم میری یادداشت کی حد تک یہ بات سامنے نہیں آئی!)

لیکن غیر مقلدین یعنی اہل حدیث حضرات کے لئے تو واقعہ یہ ہے کہ اختلاف کے لئے سرے سے کوئی گنجائش ہی موجود نہیں تھی۔ سوائے ایک دو الفاظ کے جن کو ان کے مسلّمہ حیثیت اور علمی وجاہت کے حامل علماء کے مشورے سے بدل دیا گیا تھا

شامل رہے ہیں، رہی جمعیت علماء پاکستان جس کے قائد اعلیٰ مولانا نورانی میاں ہیں
تو وہ اگرچہ ایم آر ڈی میں تو کبھی شامل نہیں ہوئی، تاہم اس کا سیاسی موقف وہی ہے
جو ایم آر ڈی کا ہے۔

اس معاملے میں راقم الحروف اور تنظیم اسلامی کا مؤقف بعض حضرات کے
لئے حیرانی کا باعث ہوا ہے لہٰذا اس کی قدرے وضاحت لازمی ہے۔

سیاسی معاملات میں راقم کا موقف بالکل وہی ہے جو ایم آر ڈی کا یا مولانا نورانی
میاں کا یا علامہ احسان الٰہی ظہیر صاحب کا ہے۔ چنانچہ راقم کے نزدیک اولاً وہ
ریفرنڈم جس کی اساس پر ضیاء الحق صاحب صدر بنے ہوئے ہیں، پاکستان کی
چالیس سالہ دستوری تاریخ کا سب سے بڑا فراڈ تھا، ثانیاً ضیاء الحق صاحب کو
کوئی حق حاصل نہ تھا کہ ۷۳ء کے متفق علیہ دستور میں من مانی ترامیم کر دیں،
ثالثاً اس ترمیم شدہ دستور کے تحت منعقد ہونے والے غیر جماعتی انتخابات اور
ان کے نتیجے میں قائم ہونے والی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو کوئی دستوری اور
اخلاقی جواز حاصل نہیں ہے اور رابعاً ملک کی سلامتی اور سالمیت کا تقاضا یہی ہے
کہ جلد از جلد ایسے عام انتخابات جماعتی بنیادوں پر منعقد کیے جائیں جن میں کسی
پارٹی کے حصہ لینے پر کوئی پابندی نہ ہو۔

لیکن دوسری جانب راقم الحروف اور تنظیم اسلامی کے نزدیک شریعت کی بالا
دستی کا مسئلہ ہر شے سے بالاتر ہے اور اس معاملے میں عمل کلیتہً اس اصول پر
ہونا چاہئے کہ "لا تنظروا الی من قال ولکن انظروا الی
ما قال" یعنی "یہی نہ دیکھو کہ کہنے والا کون ہے بلکہ یہ دیکھو کہ وہ کہہ کیا رہا
ہے!" لہٰذا شریعت اسلامی کی بالادستی کے مسئلے پر جملہ مسلمانان پاکستان کو بلا لحاظ
مسلک و مشرب سیاسی مسائل کے ضمن میں اپنے اختلاف رائے کو برقرار رکھتے
ہوئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جانا چاہئے.... بالکل ایسے جیسے ایم آر ڈی میں شامل
جماعتیں اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود چند نکات پر مجتمع ہو گئی تھیں!.....
چنانچہ خود راقم الحروف نے اب سے لگ بھگ چھ ماہ قبل ایک "متحدہ مذہبی محاذ"
یا "تحفظ شریعت محاذ" کے قیام کی تجویز پیش کی تھی جس کی تفصیلی وضاحت اپریل
۸۶ء کے "میثاق" میں شائع ہوئی تھی۔ موجودہ "متحدہ شریعت محاذ" چونکہ اس

کے قبیل ہی کی نہیں بلکہ اس سے بھی آگے کی بات ہے۔ لہٰذا راقم اپنے جمیع رفقاء کار سمیت اس میں شرکت کو اپنے حق میں موجب سعادت سمجھتا ہے۔ اور ان بزرگ علماء و زعماء کا شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے راقم الحروف اور تنظیم اسلامی کو اس مبارک کام میں شرکت کا اہل سمجھا اور اس کی دعوت دی۔

ساتھ ہی ہم مولانا سید حامد میاں مدظلہ' اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب' مولانا نورانی میاں بالقابہ اور مولانا عبدالستار خان نیازی' اور علامہ احسان الٰہی ظہیر اور ان کے رفقاء و احبابٰ سے بھی پرزور استدعا کرتے ہیں کہ وہ بھی اپنے سیاسی مؤقف کو برقرار رکھتے ہوئے شریعت اسلامی کی بالادستی کی اس اجتماعی جدوجہد میں شریک ہوں اور یہ ثابت کر دیں کہ جملہ اسلامیان پاکستان دین حق کی اقامت اور شریعت اسلامی کے نفاذ کے معاملے میں متفق و متحد ہیں انشاءاللہ العزیز وہ اس ایثار اور قربانی پر اللہ کی جانب سے اجر عظیم کے مستحق ہوں گے!

زیر بحث شریعت بل اور شریعت محاذ کے بارے میں بہت سے سیاسی معاملات کی سوجھ بوجھ رکھنے والے حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ سب صدر ضیاء الحق صاحب کا سیاسی کھیل ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بعض آثار و قرائن سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے لیکن راقم کے نزدیک اولاً تو ایسی تمام باتیں ظن و تخمین کے درجے میں آتی ہیں جبکہ نفاذ شریعت کا معاملہ حتمی اور یقینی طور پر ہم سب کا فرض ہے..... ثانیاً افراد' خواہ کسی وقت وہ کتنے ہی بڑے نظر آتے ہوں' حقیقت میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے..... اصل اہمیت کا حامل مسئلہ ملک و ملت کا ہے۔ اشخاص کا معاملہ تو یہ ہے کہ ؏

جو تھا نہیں ہے' جو ہے نہ ہو گا' یہی ہے اک حرف محرمانہ!

البتہ دین اور شریعت کی جانب اٹھا ہوا' ہر قدم..... اور اس کے ضمن میں کی جانے والی ہر کوشش امر ہو جائے گی! چنانچہ نفاذ شریعت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ضمن میں تو اگر ہمیں آنکھوں دیکھتے مکھی نگلنی پڑے تو ہمیں اس کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے!"

لیکن اب اس پر سوائے کفِ افسوس ملنے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے کہ' خواہ اسے ان جماعتوں کے قائدین کی ضد پر محمول کر لیا جائے' خواہ محاذ میں شامل زعماء کی کم

یہی انجام کا مارا ہوا دل
ہلاکِ عشرتِ آغاز بھی ہے!

اس لئے کہ...

○ اولاً ... یہ ایک نہایت وسیع القاعدہ (BROAD BASED) اتحاد تھا اور اس میں ملک کی فیصلہ کن حد تک غالب اکثریت یعنی اہلِ تسنّن کے جملہ مکاتب فکر کی بھرپور نمائندگی موجود تھی۔ چنانچہ دیوبندی مسلک کے حامل لوگوں میں سے تھانوی حلقہ تو پورے کا پورا اس میں شامل تھا جو قلباً و ذہناً خالص مسلم لیگی ہے' پھر جمعیت علماء اسلام کے مولانا درخواستی گروپ کی صورت میں مدنی حلقے کی بھی تقریباً تمام کی تمام بزرگ شخصیات اس میں شریک تھیں' جن میں پنجاب سے مولانا عبداللہ درخواستی مدظلہ اور سرحد سے مولانا عبدالحق مدظلہ کے اسماء گرامی نمایاں ہیں' پھر جمعیت اہل حدیث کا جو گروپ اس میں شامل تھا اس میں اہل حدیث کی قدیمی اور بزرگ قیادت تقریباً کل کی کل شامل تھی مزید برآں مولانا عبدالقادر روپڑی کی قیادت میں جماعت اہل حدیث اور مولانا عبدالرحمٰن سلفی کی قیادت میں جماعت غربائے اہل حدیث بھی کل کی کل شامل تھیں۔ پھر کم از کم پنجاب کی حد تک بریلوی مکتب فکر کی اعلیٰ ترین شخصیتیں جیسے مولانا مفتی محمد حسین نعیمی' مفتی عبدالقیوم خان' مولانا عبدالقیوم ہزاروی' مفتی عبداللطیف خاں اور مفتی غلام سرور قادری راولپنڈی کے قاضی اسرارالحق سمیت اس میں شریک تھے .... پھر جماعت اسلامی اپنے پورے لاؤ لشکر اور جملہ ذرائع و وسائل کے ساتھ اس کی روحِ رواں تھی راقم خود اپنی ذات اور تنظیم اسلامی کو کسی شمار قطار میں نہیں گردانتا' تاہم اپنی بساط کے مطابق ملک گیر سطح پر تنظیم بھی محاذ میں شامل رہی اور محاذ کے مرکزی دفتر سمیت دوسرے متعدد مقامات پر محاذ کے دفاتر تنظیم ہی کے دفتروں میں قائم رہے۔ مزید برآں مجلس احرار اسلام اور سوادِ اعظم اہل سنت کے علاوہ خاکساروں کا بھی سب سے زیادہ نمایاں اور فعال گروپ اس میں شامل تھا!

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ متحدہ شریعت محاذ کی صورت میں بہت عرصے کے بعد انتہائی بھرپور نمائندگی کا حامل خالص دینی اتحاد وجود میں آیا تھا اور الگ بھگ پینسٹھ چھیاسٹھ برس بعد وہ فضا دوبارہ پیدا ہوئی تھی جو ۲۰۔ ۱۹۱۹ء میں جمعیت علماء ہند کے پلیٹ فارم کی صورت میں ظہور میں آئی تھی۔

○ ثانیاً اس محاذ نے دیکھتے ہی دیکھتے عوامی سطح پر بھی مثالی جوش و خروش پیدا کر دیا تھا اور حکومت اور اس کے کارپردازوں کو بھی سراسیمہ کر دیا تھا۔

چنانچہ اسلام آباد میں اسمبلی کی عمارت کے سامنے دو نہایت شاندار اور تاریخی نوعیت کے حامل مظاہرے ہوئے۔

محاذ کے قائدین اور زعماء نے ملک گیر دورے کئے اور جلسے منعقد ہوئے '

پشاور میں تاریخی جلسہ ہوا اور پورے صوبہ سرحد میں جوش و خروش کی تیز و تند لہر دوڑ گئی۔ اور کوھستان کے علاقے میں ایک بڑا مظاہرہ ہوا۔

اسی طرح کوئٹہ میں بھی کامیاب جلسہ ہوا جو بارش کے باوجود جاری رہا!

فیصل آباد ' ملتان اور سرگودھا میں بھی بڑے جلسے ہوئے اور پاکستانی پنجاب کے مغربی حصے میں بھی جوش و خروش کی وہی کیفیت پیدا ہو گئی جو سرحد میں تھی!

مزید بر آں اندرون سندھ سکھر ' نواب شاہ ' حیدر آباد اور میرپور خاص وغیرہ میں بھی کامیاب جلسے ہوئے۔

لاہور اور کراچی میں علماء کرام کے نہایت شاندار کنونشن منعقد ہوئے۔

الغرض...... اکبرالہ آبادی کے اس مصرع کے مطابق کہ ؎

"اسباب کرے جمع ' خدا ہی کا ہے یہ کام"

اللہ کے فضل و کرم اور تائید و نصرت سے ایک بھرپور عوامی تحریک کے تمام اسباب جمع ہو گئے۔

○ یہی وجہ ہے کہ حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا اور کھلبلی مچ گئی۔ چنانچہ متعدد وزراء نے محاذ کے زعماء و قائدین سے رابطہ قائم کیا اور مصالحت کی

کوشش کی... یہاں تک کہ ۳ر مئی ۱۹۸۷ء کو اسلام آباد میں وزارت امور مذہبی کے دفتر میں جو مذاکرات ہوئے ان کے نتیجے میں نئے نئے بپتسمہ شدہ وزیر حاجی سیف اللہ خاں صاحب اس حد تک آمادہ ہو گئے کہ اگر کسی طرح ملک کے جمہوری وفاقی ڈھانچے کو تحفظ دے دیا جائے تو پورے کا پورا شریعت بل قابل قبول ہو گا۔

لیکن پھر کیا ہوا؟

کیا کسی کی نظر بد لگ گئی؟

یا کوئی درون خانۂ خویش سازش ہو گئی اور ؎ "اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے" والا معاملہ ہو گیا؟

یا پس پردہ کوئی بیرونی تار ہلا دیئے گئے؟

واللہ اعلم کہ سب کیا ہوا لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ:

علامہ اقبال کے ان الہامی اشعار کے مصداق کہ ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلکِ مردان خود آگاہ خداست
یہ مذہبِ ملّا و جمادات و نباتات

یا تو ۲۷ر رمضان المبارک کا حتمی الٹی میٹم تھا۔

جہاد و قتال کی باتیں تھیں اور جانیں دے دینے کا عزم مصمم اور شہادت کی موت کی آرزوئیں اور دعائیں تھیں۔

اسمبلیوں اور دوسرے سرکاری اداروں سے استعفوں کی دھمکیاں تھیں۔

اسمبلی اور سکریٹریٹ کے گھیراؤ کے عزائم تھے۔

سرکاری واجبات کی ادائیگی بند کرنے کی دھمکی تھی' اور بین الاقوامی سطح پر علماء کرام اور مفتیان عظام سے جہاد کے فتوے حاصل کرنے کی باتیں تھیں!

یا رمضان المبارک کی آمد سے قبل ہی حکومت کو سبز جھنڈی دکھادی گئی کہ ہمارا

اسمبلیوں وغیرہ سے مستعفی ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے! گویا جو کچھ اب تک کیا یا آئندہ کریں گے وہ محض

؎ "لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ!"

؎ "بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا!"

اب یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے کہ پس پردہ ہوا کیا ہے؟ اور ؎ "کون معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں؟" لیکن نتیجہ بہر حال یہ نکلا ہے کہ ایک طرف حکومت پختہ ہو گئی اور اس کے بعض کارپردازوں نے محاذ پر پھبتیاں چست کرنی بھی شروع کر دیں اور کجا تو وہ حال تھا کہ وزراء محاذ کے قائدین کے گرد منڈلاتے رہتے تھے، کجا یہ کہ ؎ "کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی؟" اور دوسری طرف عوامی جذبہ سرد پڑ گیا ہے، کارکنوں کے حوصلے پست ہو گئے ہیں اور وہ اقبال کے اس شعر کے مصداق کامل بن گئے ہیں کہ ؎

آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

محاذ کے قائدین و زعما اور اس میں شامل رفقاء و احباب برا نہ مانیں تو یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں ہم سب سورۂ اعراف کے ان الفاظ مبارکہ میں وارد مثال پر صد فیصد پورے اترتے ہیں کہ

"الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا ۔۔۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰکِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ" یعنی "جسے ہم نے اپنی نشانیاں عطا فرمائی تھیں ۔۔۔ اور اگر ہم چاہتے تو ان نشانیوں کی بدولت اسے مقام رفیع عطا فرما دیتے، لیکن وہ (بدبخت اور کم ہمت) تو زمین ہی کا ہو رہا!"

قصہ مختصر یہ کہ اس وقت شریعت بل اور متحدہ شریعت محاذ دونوں ؏ "میں ہوں اپنی شکست کی آواز!" کی مجسّم تصویر ہیں اور شریعت بل بزبانِ حال اپنے مجوّزوں اور مؤیدوں کے لئے نوحہ خواں ہے کہ ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد!

اور بل کے سیکولر مزاج مخالفین اور علماء کرام سے بیزاری رکھنے والے لوگوں کو اقبال کے ان الفاظ میں پھبتی چست کرنے کا موقع مل گیا ہے کہ ۔

اُس معرکے کا انجام معلوم
جس معرکے کا ملّا ہو غازی!

الغرض ' المیۂ شریعت بل کی ذمہ داری کے معاملے میں ایک فرد کی حیثیت سے "الَّذِی تَوَلّٰی کِبْرَہٗ" کے مصداق کامل ہیں جناب صدر پاکستان بالقابہ اور "وَلٰکِنَّہٗ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ" کے مصداق کامل ہیں ہم سب شرکاء و زعماء متحدہ شریعت محاذ اور ان دنوں راقم کے کانوں میں بے شمار مرتبہ گونجے ہیں علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم و مغفور کے "جنگ فورم" میں کہے ہوئے آخری الہامی کلمات کہ "اگر کبھی یہ متحدہ شریعت محاذ و اقعتہً ایجی ٹیشن کے لئے سڑکوں پر آیا تو سب سے آگے احسان الٰہی ظہیر ہو گا" گویا انہیں یقین تھا کہ یہ ساری شورا شوری صرف نورا کشتی کی نوعیت کی ہے!

☆☆☆

جہاں تک راقم الحروف اور تنظیم اسلامی کا تعلق ہے ' ہماری متحدہ شریعت محاذ میں شرکت بھی اس تصریح کے ساتھ ہوئی تھی کہ:-

ہمارے نزدیک اصل اہمیت قانون کی نہیں ' نظام کی ہے اور صرف قانون اسلامی کے نفاذ سے جملہ مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکیں گے بلکہ ان کے حصول کے لئے اسلام کا کامل نظام عدل و قسط رائج کرنا ہو گا اور اجتماعی زندگی کے معاشرتی ' معاشی اور سیاسی گوشوں میں شریعت حقہ کے اصل مقاصد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہو گا اور یہ صرف ایک کامل اسلامی انقلاب ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ چنانچہ ہم اپنی اصل توانائیاں تو اسی کے مقدمات و لوازم کی تکمیل یا بالفاظ دیگر انقلاب

> اسلامی کی "تمہید" کی کوشش میں صرف کر رہے ہیں ..... تاہم اس دوران میں قرآنی اصول "تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى" کے مطابق نفاذِ شریعت کی ہر کوشش میں بھرپور تعاون کریں گے۔ اس لئے کہ ہمارے پیش نظر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مبارک بھی ہے کہ "اقامۃ حدٍّ من حدود اللہ خیرٌ من مَطَرِ اربعین لیلۃ" یعنی "اللہ کی حدود میں سے ایک حد کا اجراء بھی چالیس روز کی بارش سے زیادہ بابرکت ہے!"

مزید بر آں محاذ کا وجود میں آنا اور مظاہروں اور گھیراؤ وغیرہ کی راہ اختیار کرنا بجائے خود اس امر کی غمازی کر رہا تھا کہ اس میں شریک جماعتیں اور تنظیمیں موجودہ انتخابی اداروں کے ذریعے شریعت اسلامی کے نفاذ سے مایوس ہو چکی ہیں اور اب انقلابی طریق کار کی جانب رخ کر رہی ہیں۔ .. یہی وجہ ہے کہ جب محاذ کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقدہ ۷، ۸ جون ۸۷ء میں راقم نے یہ دیکھا کہ استعفوں کے معاملے کو کھٹائی میں ڈالا جا رہا ہے اور محاذ میں شامل اہم جماعتوں کی نسبت و تناسب کے فہم و شعور (SENSE OF PROPORTION) کا حال یہ ہے کہ بل کو منظور کرانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے مقابلے میں نیشنل اسمبلی اور سینٹ کی ایک آدھ یا تین چار یا دس پندرہ سیٹوں کو زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے تو راقم نے اپنا یہ اختلافی نوٹ درج کرا دیا تھا کہ:

> "میری سوچی سمجھی رائے جو میں اس سے قبل بھی وضاحت سے بیان کر چکا ہوں یہ ہے کہ محاذ میں شریک جملہ جماعتوں کے نمائندوں کو فی الفور استعفاء دے دینا چاہئے۔ یہ محاذ کے زعماء کے اب تک کے بیانات کا منطقی اور اخلاقی تقاضا بھی ہے اور اس کے بغیر شریعت بل کے ضمن میں کسی مؤثر عوامی تحریک کے آغاز کا بالفعل کوئی امکان نہیں ہے اور میرے نزدیک استعفوں کے بالفعل پیش کرنے میں جتنی تاخیر ہو گی اتنا ہی عوامی تحریک اور محاذ سے باہر دینی جماعتوں کی اس میں شمولیت کا امکان معدوم ہوتا چلا جائے گا۔"

اس کے بعد تنظیم اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس مشاورت منعقدہ ۲۵، جون

۸۷ء میں حسب ذیل قرار داد پاس کی گئی جو محاذ کے چوٹی کے ذمہ داروں کو پہنچا دی گئی۔

"تنظیم اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس مشاورت کا یہ اجلاس اس اختلافی نوٹ کی توثیق کرتے ہوئے جو امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے متحدہ شریعت محاذ پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقدہ ۷، ۸ / جون ۸۷ء کی کارروائی کے ضمن میں نوٹ کرایا ہے، مزید یہ فیصلہ کرتا ہے کہ:-

۱۔ جب تک متحدہ محاذ میں شامل جماعتوں کے سینیٹر اور قومی و صوبائی اسمبلیوں کے ارکان بالفعل استعفاء نہ دیں، تنظیم اسلامی محاذ کے کسی پروگرام میں عملاً شریک نہ ہو۔ بلکہ اپنے پلیٹ فارم سے پرائیویٹ شریعت بل اور متحدہ شریعت محاذ کی تائید پر اکتفا کرے۔ البتہ جب یہ مرحلہ بالفعل آجائے تو جملہ پروگراموں میں بھرپور حصہ لیا جائے۔

۲۔ اگر کسی مرحلے پر یہ محسوس ہو کہ متحدہ شریعت محاذ کو انتخابی اتحاد کی صورت دی جا رہی ہے تو تنظیم اسلامی اس سے فوری طور اور علی الاعلان علیحدگی اختیار کر لے۔"

اب دیکھنا یہ ہے کہ مندرجہ بالا قرار داد میں مذکور دو مرحلوں میں سے پہلے کون سا سامنے آتا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ مقدم الذکر مرحلہ ہی پہلے آجائے اور محاذ ؎ "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا!" کے انداز میں دوبارہ سرگرم عمل ہو جائے۔ اور محاذ میں شامل جملہ جماعتیں اور تنظیمیں انتخابی راستے کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر انقلابی لائحہ عمل اختیار کرتے ہوئے اسلام کے نظام عدل و قسط کے قیام اور شریعت اسلامی کی غیر مشروط اور بلا استثناء ترویج و تنفیذ کے لئے ایک پریشر گروپ کی حیثیت سے کام کرنے کے لئے بنیان مرصوص کی صورت اختیار کر لیں۔

اگر ایسا ہو جائے تو کیا عجب کہ محاذ کا یہ اقدام اللہ کی جناب میں "معذرۃ الی ربکم" اور "توبۃ نصوحا" کی صورت اختیار کر لے اور اس کے طفیل پاکستان کے گرد و پیش سے اٹھنے والے عمومی عذاب کے بادل چھٹ جائیں، اس لئے

کہ ابھی درِ توبہ بند نہیں ہوا.... اور تا حال صورت وہی ہے کہ ؎

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آ سکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

اور... ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

اللّٰھمّ اغفر لنا ذنوبنا و اسرافنا فی امرنا و ثبت اقدامنا و انصرنا علی القوم الکفرین و الفاسقین و الظالمین برحمتک یا ارحم الرحمین!

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝

(الفرقان : ۷۴)

اے ہمارے ربّ
ہمیں ہماری اولاد اور بیویوں (کی طرف) سے
آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما
اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا دے

□ □ □ □

میاں عبدالواحد

بھگوان سٹریٹ، پرانی انارکلی لاہور

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن کا سلسلہ

الہدیٰ

درس نمبر ۱۱

نشست نمبر ۴۶

مباحثِ عملِ صالح

توبۂ نصوحًا کا ہمارے دین میں مقام

سورۃ التحریم کی روشنی میں

(۴)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَیُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْلَنَا اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ ط وَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ ط وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝

صدق اللہ العظیم

"اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی جناب میں خالص توبہ۔ امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم سے تمہاری برائیوں کو دور فرمادے گا اور تمہیں ان باغات میں داخل

کرے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ اس دن اللہ ہرگز رُسوا نہ کرے گا نہ اپنے نبی کو اور نہ ان کے ساتھی اہل ایمان کو... ان کا نور دوڑتا ہوا ہوگا ان کے سامنے بھی ان کے داہنی جانب بھی... اور وہ یہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے لئے ہمارے اس نور کو پورا فرما دے اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرما۔ یقیناً تجھے ہر شے پر قدرت اور ہر کام پر اختیار حاصل ہے .....اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی بڑا ٹھکانا ہے"

محترم حاضرین اور معزز ناظرین!

یہ سورۃ التحریم کی آیات نمبر آٹھ اور نو ہیں، جن کی ابھی آپ نے تلاوت سماعت فرمائی اور ترجمہ بھی سنا۔ ان میں سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ تمام اہل ایمان کو توبہ کا حکم دے رہے ہیں۔ یا یوں کہہ لیا جائے کہ توبہ کی ترغیب دے رہے ہیں۔ لیکن توبہ وہ ہو جو خالص توبہ ہو جو خلوص دل سے کی گئی ہو۔ جو صحیح معنی میں توبہ ہو۔ حسن اتفاق سے ہمارے اس سلسلۂ درس میں سورہ تحریم سے پہلے جو درس نمبر ۱۱ تھا وہ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع پر مشتمل تھا۔ اس میں توبہ کے موضوع پر بڑی مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔ توبہ کا فلسفہ کیا ہے! توبہ کی عظمت کیا ہے! ہمارے دین کی حکمت میں اس کا مقام کیا ہے! پھر یہ کہ توبہ کے صحیح ہونے کے لئے شرائط کیا ہیں! یہ تمام امور زیرِ گفتگو آ چکے ہیں۔

اُس موقع پر آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہؐ دونوں کے حوالوں سے توبہ کی عظمت اور اس کے مقام اور اس کے مرتبہ کے بارے میں چند بنیادی باتیں عرض کی جا چکی ہیں۔ اِس موقع کی مناسبت سے میں ایک حدیث کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حدیث حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس کی ایک تو متفق علیہ روایت ہے یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے۔ ایک ذرا تفصیلی روایت ہے جو صرف مسلم شریف میں ہے۔ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو واضح فرمانے کے لئے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے کسی بندے کی توبہ سے کتنی خوشی ہوتی ہے، ایک تشبیہ سے کام لیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ذرا تصور کرو ایک ایسے شخص کا جو کسی لق و دق صحرا میں تنہا سفر کر رہا ہے۔ ایک اونٹنی ہے، اسی پر اس کا زادِ راہ ہے،

راشن ہے' پانی ہے۔ وہ تھوڑی دیر ستانے کے لئے کسی درخت کے سایہ تلے بیٹھتا ہے۔ اونٹنی بھی پاس ہی کھڑی ہے اس کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ اسی اثناء میں اونٹنی غائب ہو جاتی ہے۔ پھر جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ دیوانہ وار اونٹنی کی تلاش میں ادھر دوڑتا ادھر بھاگتا ہے۔ اس کے اضطراب اور بیتابی کا آپ خود تصور کر سکتے ہیں اس لئے کہ وہ انٹنی ہی در حقیقت اس کے لئے وسیلۂ حیات ہے' ذریعۂ زندگی ہے۔ وہی اس کی سواری ہے' اسی پر اس کا کھانا اور پانی ہے۔ وہ ہر چہار طرف بھاگ دوڑ کرنے کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے گویا موت کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ اس حالت میں اچانک وہ دیکھتا ہے کہ اونٹنی تو پاس ہی موجود ہے۔ سامنے کھڑی ہے۔ س پر وہ اپنی خوشی کی شدت کے باعث ایسا بوکھلا اٹھتا ہے کہ کہنا تو یہ چاہتا ہے کہ "اے اللہ تو میرا رب ہے میں تیرا بندہ ہوں"۔ لیکن فرطِ جذبات سے اس کی زبان لڑکھڑاتی ہے اور اس سے الفاظ نکلتے ہیں "اے پروردگار! میں تیرا رب ہوں تو میرا بندہ ہے"۔ تصور کیجئے کہ اونٹنی دوبارہ پالینے پر اس شخص کی فرطِ مسرت کا کیا عالم ہے! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ تشبیہ بیان کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے اللہ کو اپنے کسی گنہگار بندے کی توبہ سے'۔ احادیث میں توبہ کی جو عظمت بیان ہوئی اور ان میں جس شدومد کے ساتھ ترغیب کا پہلو آیا اسے سامنے رکھئے اور پھر اس آیت کو دیکھئے کہ تمام مسلمانوں سے خواہ وہ کسی زمان و مکان سے تعلق رکھتے ہوں خطاب فرمایا جارہا ہے۔ یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا "اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی جناب میں خالص توبہ۔"

میں توبہ کے ضمن میں دو مزید احادیث بھی آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ ایک میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میں خود روزانہ ستر ستر اور سو سو بار اللہ کی جناب میں توبہ اور استغفار کرتا ہوں۔ یہ روایت صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں وَاللّٰهِ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ فِی الْیَوْمِ اَكْثَرَ مِنْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً "اللہ کی قسم! میں روزانہ ستر مرتبہ سے زیادہ اللہ کی جناب میں استغفار بھی کرتا ہوں' توبہ بھی کرتا ہوں" ...... دوسری روایت صحیح مسلم میں ہے جس کی رو سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں یَاَیُّهَا النَّاسُ تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ

وَاسْتَغْفِرُوْا "اے لوگو! اللہ کی جناب میں توبہ کرو اور استغفار کرو" وَاِنِّی اَتُوْبُ فِی یَوْمٍ مِائَۃَ مَرَّۃٍ "اس لئے کہ میں خود روزانہ سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں"...... سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ کی توبہ کے کیا معنی ہیں؟ حضورؐ سے کسی گناہ کے ارتکاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا اچھی طرح جان لیجئے کہ توبہ کے معنی ہیں رجوع کرنا' پلٹنا' لوٹنا۔ اس کے کم سے کم چار درجے اگر آپ ذہن میں رکھیں گے تو بات واضح ہو جائے گی۔ ایک شخص وہ ہے جو کفر سے توبہ کرتا ہے اور اسلام میں آتا ہے۔ ایمان لانا بھی ایک نوع کی توبہ ہے۔ جیسے ہم سورہ فرقان کے آخری رکوع میں پڑھ آئے ہیں اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا دوسری توبہ ہے کسی مسلمان شخص کی جو معصیت سے توبہ کرتا ہے' گناہ کو چھوڑ رہا ہے۔ گناہ سے رجوع کر رہا ہے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اطاعت کی طرف۔ تیسری ہوگی ابرار کی' نیکوکاروں کی۔ یعنی ایک صالح اور نیک شخص کی کسی وقت قلبی کیفیت ایسی ہوگی کہ معرفتِ الٰہی کے معاملے میں اس کے دل پر کچھ دیر کے لئے غفلت کا پردہ سا پڑ گیا۔ وہ محض غفلت ہے' کسی معصیت کا ارتکاب نہیں ہوا۔ محض یہ احساس ہوا کہ کچھ دیر کے لئے میرے قلب پر غفلت کا حجاب طاری رہا ہے۔ اب وہ غفلت سے رجوع کر رہا ہے استحضار اللہ فی القلب کی جانب۔ اللہ کے ذکر کی طرف' دل میں اللہ کی یاد کو مستحضر کرنے کے لئے۔ یہ بھی توبہ ہے۔ اور ایک آخری توبہ اور ہے اور وہ توبہ ہے مقربین بارگاہ الٰہی کی توبہ۔ یعنی ان کے تعلق مع اللہ میں جو شدت رہتی ہے۔ ان کے قلب کا جو مضبوط تعلق اور رابطہ اللہ کے ساتھ استوار رہتا ہے۔ اس کی شدت میں اگر کبھی کوئی کمی محسوس ہوئی تو اس حساسیت کے باعث وہ اس سے بھی توبہ کرتے ہیں اور رجوع کرتے ہیں اپنے تعلق مع اللہ کی اسی سابقہ شدت کی طرف۔ یہ ہے وہ کیفیت جس کو مقربین یعنی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی توبہ میں شمار کیا جا سکتا ہے کہ جب ان نفوسِ قدسیہ کو یہ محسوس ہو کہ کسی مصروفیت کے باعث ان کے تعلق مع اللہ کی شدت میں ذرا سی بھی کمی ہو گئی ہے تو وہ اس سے بھی توبہ کر رہے ہیں' رجوع فرما رہے ہیں

اس تناظر میں آپ سمجھئے کہ کوئی صاحب ایمان ایسا نہیں ہے جو اس حکم یا اس ترغیب کا مخاطب نہ ہو کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا

خالص توبہ کون سی ہوگی؟ اس کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں کہ کم از کم تین شرطیں پوری ہوں تو وہ خالص توبہ ہوگی۔ اگر حقوق اللہ کے ضمن میں کوتاہی ہوئی ہے تو شدید پشیمانی ہو مصمم ارادہ ہو کر میں آئندہ اس کا ارتکاب نہیں کروں گا اور اس گناہ کے کام کو فی الواقع انسان چھوڑ دے۔ اور اگر حقوق العباد کا معاملہ ہے تو مزید ایک شرط ہوگی کہ یا تو اس شخص سے جس کی حق تلفی کی ہے' معافی حاصل کرے یا اپنے کسی عمل سے اس کے نقصان کی تلافی کرے۔

اس خالص توبہ کا مقام اور مرتبہ کیا ہے! اسے اسی آیت میں آگے بیان فرمایا عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ عربی زبان میں عَسٰی اور لَعَلَّ کے الفاظ عام طور پر تو "شاید" کے معنی میں آتے ہیں۔ لیکن کلام اللہ یعنی قرآن مجید میں جب یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو کر وارد ہوتے ہیں تو شاہانہ انداز کلام کی رو سے اس کے معنی ہوتے ہیں "تاکہ" اور امید ہے کہ اس میں بشارت کا پہلو ہوتا ہے۔ لہٰذا ترجمہ ہو گا کہ "امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری برائیوں کو دور فرما دے گا"۔ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ "اور تمہیں ان باغات میں داخل فرمائے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی"۔ آگے فرمایا کہ اس دن یعنی قیامت کے روز کہ جس دن سب کے لئے رسوائی ہوگی۔ اس رسوائی سے بچے ہوئے ہوں گے صرف اللہ کے انبیاءؑ ان کے پیروکار اور سب سے بڑھ کر النبی الخاتم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی اہل ایمان: يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۔ آگے فرمایا نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ ۔ "ان کا نور ان کے سامنے اور ان کی داہنی طرف دوڑتا ہو گا"... یہ بات جان لیجئے کہ انسان کے ایمان کا محل و مقام اس کا قلب ہے۔ ایمان حقیقت میں ایک روشنی ہے' ایک نور ہے۔ یہ بات ہم سورہ نور کی آیت نور کے حوالے سے پہلے اچھی طرح سمجھ بھی چکے ہیں۔ اس قلب میں جو نورِ ایمان ہے' میدانِ حشر میں وہ ظاہر ہو جائے گا اور اس کی روشنی انسان کے سامنے پڑے گی..... اسی طرح انسان کے جو نیک اعمال ہیں ان میں بھی ایک نورانیت ہے۔ جیسے ہر بدی اور ہر برے فعل میں ایک ظالمانیت کا پہلو ہوتا ہے' اس میں تاریکی ہوتی ہے۔ البتہ اس دنیا میں ان کا ظہور نہیں ہوتا۔ میدانِ حشر میں ان کا ظہور ہو گا۔ اسی طرح نیک کاموں کو کمانے والا عام طور پر انسان کا داہنا ہاتھ ہوتا ہے لہٰذا میدان حشر میں

انسان کے نیک اعمال کا نور اس کے داہنی جانب نمایاں ہو گا نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ "دوڑتا ہو گا ان کا نور ان کے آگے اور ان کی داہنی طرف... اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! (اگر ہمارے نور میں کچھ کمی رہ گئی ہے تو) ہمارے لئے تو ہمارے نور کو پورا کر دے اور ہم کو معاف فرمادے۔" يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْلَنَا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ہر شخص کو اس کے مقام اور مرتبہ کے اعتبار سے میدانِ حشر میں یہ نور ملے گا۔ ایمان کے بھی مدارج و مراتب ہیں۔ ایک ایمان حضرت ابو بکر صدیق کا ہے۔ یا پھر حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی کا ایمان ہے رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ اور ہما شما کا ایمان ہے۔ اگر ہمیں ایمان کی ذرا سی رمق بھی میسر ہو تو وہ بھی ہمارے لئے بہت بڑی کامیابی ہے۔ کہاں صاحبہ کرامؓ کا نور ایمان! اور کہاں ہمارا ایمان!... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس روز میدان حشر میں لوگوں کو جو نور ملے گا تو کسی کا نور اتنا ہو گا کہ جیسے مدینہ میں ہو اور اس کی روشنی صنعا (یمن کے دارالحکومت) تک پہنچ جائے اور کسی کا نور بس اس قدر ہو گا کہ اس کے قدموں کے سامنے روشنی ہو جائے۔ جن کو اس روز اتنا نور بھی مل جائے وہ بڑے نصیب والے اور کامیاب و کامران لوگ شمار ہوں گے چونکہ وہ اس کٹھن اور سخت مرحلہ سے گذر جائیں گے جس سے آگے ان کی منزل مراد یعنی جنت ہے۔ اگر میں تشبیہ دوں تو اس کم نور کی حیثیت گویا اس ٹارچ کی روشنی کی سی ہو گی جس کو لے کر انسان کسی پگڈنڈی پر چل تو لیتا ہے۔ پس اس کٹھن مرحلہ کے لئے فرمایا کہ وہ لوگ دعا کر رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! ہمارے نور میں ہماری کوتاہیوں کے باعث جو کمی رہ گئی ہے تو تو ہمارے اس نور کا اتمام فرمادے۔ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْلَنَا اور ہماری کوتائیوں سے در گذر فرما۔ ہمیں بخش دے۔ یہ ہمارے گناہ ہیں جن کی وجہ سے ہماری نورانیت میں کمی رہ گئی ہے۔ تو اپنے خالص خزانہ فضل، تو اپنے خصوصی اختیار سے اس کمی اور تقصیر کی تلافی فرمادے۔ اس لئے کہ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ "یقیناً تجھے ہر شے کا اختیار حاصل ہے۔"

اس کے بعد اگلی آیت میں خطاب ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اور بظاہر یہ آیت اس سورت کے مضامین سے غیر متعلق سی معلوم ہوتی ہے۔ ابھی تک ساری باتیں حضورؐ کے

گھر والوں سے متعلق تھیں۔ اہل ایمان سے متعلق تھیں۔ مسلمانوں کے عائلی نظام سے متعلق تھیں۔ لیکن یہاں یہ بات فرمائی گئی کہ اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپؐ کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے۔ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ ط وہ آپؐ کی نرمی سے' آپؐ کی مروت سے' آپؐ کی شفقت سے اور آپؐ کی رحمتِ عمومی سے غلط فائدہ اٹھانے نہ پائیں۔ وہ تو غفلت اور سختی کے مستوجب ہو چکے ہیں۔ ان کا ٹھکانا جھنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ یہ آیت بعینہٖ انہی الفاظ کے ساتھ بغیر ایک شوشہ کے فرق کے سورہ توبہ میں بھی وارد ہوئی ہے۔ سورۃ توبہ کی یہ ۷۳ویں آیت ہے۔ اس سورۃ کے مضامین سے اس آیت کا ربط سمجھ لیجئے' بڑا لطیف ربط ہے۔ اس سے پہلے سابقہ نشستوں میں جیسے ہم دیکھ چکے ہیں کہ دراصل اس سورہ مبارکہ کا جو مرکزی مضمون (AXIS) ہے' وہ یہ ہے کہ نرمی' شفقت' دلجوئی' کسی کے جذبات کا لحاظ اور پاس کرنا یہ فی نفسہٖ تو بہت اچھی باتیں ہیں' بہت مطلوب اور پسندیدہ باتیں ہیں لیکن اگر ان میں حد اعتدال سے تجاوز ہو جائے تو یہ چیز مختلف پہلوؤں سے خرابیاں پیدا ہونے کا سبب بن سکتی ہے۔ اولاد کے ساتھ بے جا لاڈ پیار ہو۔ بے جا نرمی کا معاملہ ہو تو اس کے بے راہ اور آوارہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ وہاں بھی نرمی مطلوب تو ہے لیکن ایک حد تک۔ اسی طرح جب انسان اپنے نفس کے معاملہ میں نرمی کرتا ہے تو خرابی کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ چونکہ ہمارا دین' دین فطرت ہے لہٰذا اس میں ہمارے اوپر اپنے نفس کے حقوق بھی معین کئے گئے ہیں۔ حضورؐ کا ارشاد ہے وَاِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا۔ "اور بے شک تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے"۔ اس پر بے جا سختی پسندیدہ نہیں ہے۔ ہمارے دین میں رہبانیت جائز نہیں ہے۔ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ۔ ہمارے دین میں نفس کشی کی اجازت نہیں ہے بلکہ ضبطِ نفس کی ھدایت ہے کہ اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھو۔ لیکن نفس کو بالکل کچل ڈالنا پسندیدہ نہیں ہے۔ اس کے تقاضوں کو صحت مند اور جائز و حلال سے پورا کرنے کی اجازت ہے۔ اس نفس کے اندر جو تقاضے ہیں وہ تمدن کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے ضروری ہیں۔ لہٰذا اس پر بھی نرمی کرو لیکن اگر یہ نرمی کہیں حد اعتدال سے تجاوز کر جائے گی تو معصیت کی طرف لے جائے گی۔ اس کی باگیں تھام کر اور کھینچ کر بھی رکھو۔ اسی طرح کا معاملہ ہے کفار اور منافقین کا۔ ان

کےبارے میں کوئی نرمی تمہارے دل میں نہ ہو۔ اہل ایمان کی جو شان قرآن مجید میں ایک سے زائد مقام پر آئی ہےوہ ہے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ "وہ کفار کے حق میں نہایت سخت ہوتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے لئے نہایت رحیم و شفیق ہوتے ہیں۔" کفار کے لئے سختی کی ضرورت اس لئے ہے کہ وہ کہیں مسلمانوں کے جسد ملی میں انگلی نہ دھنسا سکیں۔ وہ مسلمانوں کو نرم چارانہ سمجھ بیٹھیں۔ اس تناظر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ دیکھئے کہ آپؐ سراپا رحمت و شفقت ہیں۔ آپؐ کی یہ شان خود اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ آپؐ رؤف ورحیم ہیں آپؐ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ہیں۔ آپؐ میں نرمی' رقت قلب اور خلق خدا کے حق میں رافت و رحمت کا معاملہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ لہٰذا بسا اوقات اس سے کفار' مشرکین اور منافقین ناجائز فائدہ اٹھا جاتے تھے۔ چنانچہ روکا گیا۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۔ معلوم ہوا ہے کہ اس سورہ مبارکہ کا جو مرکزی خیال ہے اس کے ساتھ یہ آیت بھی مربوط ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس سورت کے سیاق و سباق سے اس کا کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔

آج ان دو آیات کے بارے میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اب اگر اس ضمن میں کوئی اشکال یا سوال ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال و جواب

سوال ڈاکٹر صاحب! کیا کفار کے ساتھ نرمی برتنے سے ان کو اسلام کی طرف راغب کرنے میں زیادہ مدد نہیں مل سکتی؟

جواب یہ بہت عمدہ سوال ہے اصل میں ہر چیز کا ایک محل اور مقام ہوتا ہے۔ ہم جس سورت کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ مدنی سورت ہے اور اس کے بھی آخری دور کی ہے۔ یعنی جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے لگ بھگ بیس برس بیت چکے ہیں۔ اس وقت تک درحقیقت معین طور پر یہ بات سامنے آچکی تھی کہ جن لوگوں میں حق کو قبول کرنے کی استعداد تھی وہ قبول کر چکے۔ اب وہی لوگ رہ گئے تھے کہ جن کے دل بالکل

پتھر ہو چکے تھے اور جن کے بارے میں حق کو قبول کرنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ جیسا کہ آپ سورہ بقرہ کے پہلے رکوع میں آیت میں پڑھتے ہیں کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰی سَمْعِهِمْ وَ عَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ۔ یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے کہ جب خیر کی کوئی امید باقی نہیں رہ جاتی للذا سختی کی ضرورت ہوتی ہے۔

سوال ۔ ڈاکٹر صاحب! منافق کی پہچان کیا ہے؟

جواب ۔ یہ بات جان لیجئے کہ منافق کا کوئی علیحدہ قانونی تشخص نہیں ہوتا۔ قانونی اعتبار سے کسی انسان کے بارے میں دو ہی فیصلے ہو سکتے ہیں یا وہ کافر ہے یا وہ مسلم ہے۔ جو شخص قانونی مسلمان ہے ہو سکتا ہے کہ اپنی دلی کیفیات 'اپنی نیت اور ارادہ کے اعتبارات سے وہ اصلاً منافق ہو۔ لیکن کسی کے نفاق کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے۔ البتہ نبی اکرمؐ کے زمانہ کے منافقین کا علم اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو دے دیا تھا اور حضورؐ نے بھی اس بات کو عام نہیں کیا تھا۔ صرف رازداری کی تاکید کے ساتھ چند منافقین کے نام ایک صحابیؓ کو بتادیئے تھے۔ لیکن ہم کسی معین شخص کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ منافق ہے۔ البتہ نبی اکرمؐ نے نفاق کی پہچان بتادی ہے۔ نفاق ایک مرض ہے ہو سکتا ہے کہ وہ مختلف درجوں میں مسلمانوں میں بھی پیدا ہو جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس میں اس مرض کی کوئی علامت ظاہر ہو۔ اسے لازمی منافق قرار دیا جائے۔ ہاں جس کسی کو ان میں سے کوئی علامت اپنے اندر محسوس ہو اسے شعوری طور پر دور کرنے کی فکر کرنی چاہئے۔ اس مرض کی ابتدائی علامات کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ ایۃ المنافق ثلاث۔ منافق کی تین نشانیاں ہیں یہ کہ جب بولتا ہے جھوٹ بولتا ہے' جب وعدہ کرتا ہے خلاف ورزی کرتا ہے اور جب اس کے پاس امانت رکھوائی جاتی ہے اس میں خیانت کرتا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ان تین نشانیوں کے علاوہ ایک چوتھی نشانی یہ بیان فرمائی کہ جب کسی سے تنازعہ اور اختلاف ہوتا ہے۔ تو پھٹ پڑتا ہے۔ اور گالی گلوچ پر اتر آتا ہے۔ یہ نفاق کی علامات ہیں لیکن پھر اچھی طرح جان لیجئے کہ ہم حضورؐ کے دور کے بعد کسی شخص کو معین طور پر منافق نہیں کہہ سکتے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ حضورؐ کے دور کے منافقین کا علم اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے آپؐ کو دے دیا تھا لیکن آپؐ نے اس کو راز رکھا اور اس کا اعلان نہیں فرمایا کہ فلاں فلاں منافق ہیں۔

حضرات! آج ہم نے سورہ تحریم کی جو دو آیات پڑھیں اور ساتھ ہی ہم نے سابقہ آیات کا ان دو آیات سے جو معنوی ربط ہے اس پر بھی ایک نگاہ بازگشت ڈال لی تو اس طرح ہمارے سامنے یہ اصول آیا کہ گھریلو زندگی میں ایک مسلمان کو خود اپنے نفس کے ساتھ اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ کیا صحیح طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس طرز عمل کو اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

تذکرہ و تبصرہ

یومِ استقلال پاکستان

تجدید عہد اور اجتماعی توبہ کا دن
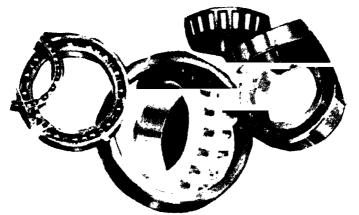
امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جمعہ ۱۴ر اگست ۸۷ء کو مسجد دارالسلام لاہور میں "یوم استقلال پاکستان" کو اپنے خطاب جمعہ کا موضوع بناتے ہوئے اندرونِ ملک امن و امان کی ناگفتہ بہ صورتِ حال اور ملک کو درپیش مختلف النوع خطرات کا ایک بھرپور جائزہ پیش کیا تھا۔ اور یوم استقلال کو یوم تجدید عہد قرار دیتے ہوئے بڑے مؤثر انداز میں حاضرین کے جذبۂ عمل کو للکارا تھا۔ اس اہم خطاب کو محترم شیخ جمیل الرحمٰن نے قارئین میثاق کے لیے ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ (ادارہ)

آج ۱۴ر اگست ہے ہمارا پہلا یومِ استقلال ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء تھا للذا شمسی و عیسوی تقویم کے اعتبار سے کل ۱۳ر اگست کو ہماری آزادی کے چالیس سال پورے ہو گئے۔ گویا اس یومِ استقلال کے موقع پر ہم ایک آزاد و خود مختار مملکت و ریاست کی حیثیت سے اکتالیسویں برس میں قدم رکھ چکے ہیں۔

چالیس برس کے معاملہ کا تذکرہ اس سے قبل کئی بار میری بعض تقریروں اور تحریروں میں آچکا ہے اور آج سے تقریباً سوا سال قبل قمری حساب سے جب ۲۷ر رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ میں پاکستان کی آزادی کے چالیس سال پورے ہو گئے تھے اور پاکستان نے اکتالیسویں سال میں قدم رکھ دیا تھا تو اس موقع پر بھی میں نے پاکستان کے چالیس سالہ حالات و واقعات کا تجزیہ پیش کیا تھا۔

چالیسویں برس کی اہمیت

میں اپنی کتاب "استحکام پاکستان" میں چالیسویں سال کی اہمیت پر ایک مستقل باب لکھ چکا ہوں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ از روئے قرآن انسانی زندگی میں چالیس سال کی عمر کی ایک

خصوصی اہمیت ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ جب تک نبوت کا سلسلہ جاری تھا تو اکثر و بیشتر انبیاء علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں شرف نبوت سے سرفراز فرمایا گیا ہے۔ چند مستثنیات ہیں مثلاً حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو چالیس برس سے پہلے نبوت کا تاج پہنایا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے چند اور ہستیاں بھی ہوں لیکن یہ ایک معروف بات ہے کہ استثنیٰ سے قاعدۂ کلیہ ٹوٹتا نہیں بلکہ اور مؤکد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں بھی آغازِ وحی کے باب میں چالیس برس ہی کا ذکر آیا ہے۔ فَلَمَّا بَلَغَ اربعین سنة حبب الیه الخلا و کان یخلو بغار حرا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم چالیس برس کی عمر کو پہنچے تو آپؐ کو خلوت گزینی محبوب ہو گئی اور آپؐ غار حرا میں جا کر عبادت کیا کرتے تھے۔ یَتَحَنَّثُ فِیْهِ۔ غار حرا میں کئی کئی دن کئی کئی رات آپؐ کا قیام رہتا تھا اور وہیں پہلی وحی نازل ہوئی یعنی سورۃ العلق کی پانچ ابتدائی آیات۔

انفرادی سطح پر نفسیاتی پختگی

پھر قرآن مجید میں سورۃ الاحقاف میں یہ بھی مذکور ہے کہ عام انسانوں کے اعتبار سے بھی چالیس سال کی عمر ان کی نفسیاتی پختگی کی عمر ہے فرمایا حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً "جب انسان پہنچا اپنی پختگی کو اور پہنچا چالیس برس کو" یہاں اَشُدَّ کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی پوری پختگی...... اب ظاہر بات ہے کہ اس سے مراد جسمانی پختگی کو پہنچنا نہیں ہے۔ جسمانی طور پر تو انسان سولہ سال سے انیس سال کی عمر کے دوران پورا بالغ اور جوان ہوتا ہے۔ پھر انسان کی بھرپور بلوغت اور جوانی کا دور بیس سال کی عمر سے چالیس سال کی عمر کا دور ہوتا ہے۔ جس میں قوت و توانائی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ چالیس برس کی عمر کے بعد تو جسمانی اعتبار سے ڈھلوان شروع ہو جاتی ہے۔ انسان کے قوائے جسمانی کی جو قوتیں ہوتی ہیں، ان میں اضمحلال شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن نفسیاتی اعتبار سے انسان کی شخصیت اور اس کے شعور کی پختگی چالیس برس کے آس پاس ہوتی ہے۔ مستثنیات (EXEPTIONS) پھر بھی ہوں گے ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ستر اسی برس کے ہو گئے ہیں لیکن مزاج میں ابھی تک بچپنا ہے۔

چہل سال عمرِ عزیزت گذشت   مزاج تو از حالِ طفلی نگشت

اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ لوگ چالیس برس کی عمر سے بہت پہلے نفسیاتی اور شعوری اعتبار سے پختگی اور بلوغت کو پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن "حکمُ الا کثرِ حکمُ الکلِّ" کے قاعدے کے تحت اکثریت کے معاملہ کو کلیہ کی شکل دی جاتی ہے اور وہ یہی ہے کہ چالیس برس کی عمر میں انسان نفسیاتی اور شعوری اعتبار سے پختگی کی عمر کو پہنچ جاتا ہے۔

قوموں کے باب میں چالیس برس کی اہمیت

قرآن مجید میں قوموں کی زندگی کے اعتبار سے بنی اسرائیل کی تاریخ میں چالیس برس کے معاملہ کا ذکر آیا ہے کہ مصر سے بحفاظت نکل آنے اور صحرا سینا میں داخل ہونے کے بعد ارضِ مقدس کو جہاد و قتال کے ذریعہ فتح کرنے کے حکم پر جب بنی اسرائیل نے بزدلی دکھائی اور حضرت موسیٰ کو کورا جواب دے دیا کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّکَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ "اے موسیٰ! پس تم جاؤ اور تمہارا رب جائے اور تم دونوں لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔" تو ان کو چالیس برس کی صحرانوردی کی سزا دی گئی۔ اس کا ذکر آگے کروں گا۔ یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ بنی اسرائیل کی یہ کیفیت مصر میں دو ڈھائی سو برس کی غلامی کی زندگی بسر کرنے کے باعث ان پر طاری ہو گئی تھی حالانکہ وہ مصر میں متعدد معجزات کا بچشم سر مشاہدہ کر چکے تھے۔ آپ ذرا اندازہ کیجئے کہ حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے نو معجزات (تسع آیات) کے ساتھ فرعون کی طرف بھیجا تھا جو بنی اسرائیل دیکھ چکے تھے۔ مثلاً عصاء کا معجزہ، یدِ بیضا کا معجزہ پھر تھوڑے تھوڑے وقفے سے اہل مصر پر جو عذاب آئے اور وہ حضرت موسیٰ کی دعاؤں سے ٹلتے رہے۔ تو بنی اسرائیل ان آیاتِ الٰہی کو مصر ہی میں دیکھ چکے تھے۔ اس سے آگے بڑھ کر معجزوں کا وہ نیا سلسلہ ہے جو مصر سے نکلتے وقت سے شروع ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے عصا کی ایک ضرب سے سمندر پھٹ رہا ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ ان کے نکلنے کا سامان فراہم کر رہا ہے۔ اور جب وہ دوسرے کنارے پر بحفاظت پہنچ جاتے ہیں تو ان کا دشمن فرعون معہ اپنے لشکر کے ابھی بیچ سمندر میں ہے کہ اللہ کے حکم سے سمندر کا پانی جو دو چٹانوں کی مانند کھڑا تھا مل جاتا ہے اور ان کا دشمن ان کی آنکھوں کے سامنے غرق ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کہ اسی عصا کی ضرب

سے ایک چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ پھر یہ کہ صحرا میں ان کو بادلوں اور ابر کا سایہ د
جارہا ہے۔ ان کے لئے لق ودق صحرا میں من وسلویٰ کی غذا پہنچائی جارہی ہے۔ پہاڑ ان کے
سروں پر معلق کیا گیا ہے۔ یہ سارے معجزات انہوں نے مصر سے نکلنے کے بعد دیکھے ہیں۔ اس
کے باوجود کم ہمتی اور بزدلی ان پر مسلط ہو چکی تھی۔ ان کی باطنی شخصیت میں صدیوں کی غلامی
کے باعث ضعف آگیا تھا۔ جیسے انسان اندر سے بودا اور کھوکھلا ہو جائے اعصاب ڈھیلے پڑ
جائیں اور ہمت جواب دے جائے یہی وجہ ہے کہ جب وقت آیا کہ اب آؤ اور اللہ کی راہ میں نکلو
اپنی جانوں کا ہدیہ پیش کرو' قربانیاں دینے کے لئے تیار ہو جاؤ' سرفروشی کا مظاہرہ کرو' اللہ کی
راہ میں جنگ کرو تو میں بیان کر چکا ہوں کہ انہوں نے کورا جواب دے دیا اور حضرت موسیٰ سے
کہہ دیا فَاذْهَبْ أَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُونَ وہ معجزات کے
اتنے خوگر ہو گئے تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ ارض مقدس بھی ان کے جہاد و قتال کے بغیر مفتوح ہو
جائے اور وہ ٹھنڈے ٹھنڈے فلسطین میں حاکمانہ طور پر داخل ہو جائیں۔
ان کی اس کم ہمتی' بزدلی پر اللہ تعالیٰ نے انہیں جو سزا دی وہ سزا بھی تھی اور علاج بھی تھا۔
سزا ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اس موقع پر بودے پن کا مظاہرہ کیا کہ ارضِ مقدس جسے ان
کو دیئے جانے کا اللہ کی طرف سے فیصلہ ہو چکا تھا ان پر چالیس سال کے لئے حرام کر دی گئی اور
فرما دیا گیا کہ اب یہ چالیس برس اسی صحرا میں بھٹکتے اور اسی زمین میں سرمارتے پھریں گے۔
فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ یہ تو سزا ہوئی لیکن اسی
میں علاج مضمر تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعض اوقات قوموں کو جو سزائیں دی جاتی ہیں وہ
سزائیں بھی ان کے لئے خیر کا پہلو رکھتی ہیں۔ میں نے اس کے متعلق بعض آیات آپ کو بار
بار سنائی ہیں۔ سورہ السجدہ میں فرمایا۔ وَ لَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنٰى دُونَ
الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ "اور البتہ ہم انہیں اس بڑے عذاب سے
پہلے چھوٹے چھوٹے عذابوں کا مزا چکھائیں گے شاید کہ یہ لوٹ آئیں۔" تو درحقیقت
جھنجھوڑنے کے لئے' بیدار کرنے کے لئے' نیند کے ماتوں کو جگانے کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کبھی
چھوٹے چھوٹے عذاب بھیجتا ہے۔ کہ اگر جاگ گئے' اگر ہوش میں آگئے' اگر اپنی اصلاح پر
کمربستہ ہو گئے' تو وہ چھوٹا عذاب نتیجہ کے اعتبار سے ان کے لئے خیر کا ذریعہ بن جائے گا۔ یہ

اوقات یہ چھوٹے عذاب چونکہ قوموں کو جگانے اور ہوشیار کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں تو مشابہ ہو جاتے ہیں آپریشن کے کہ جو ایک جراح یا سرجن مریض کی بھلائی کے لئے کرتا ہے۔ لہذا وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ کے بموجب وہ لوگ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھے اور جنہوں نے قتال سے انکار کیا تھا' ان کے لئے تو یہ صحرانوردی عذاب کی ایک صورت تھی۔ لیکن اسی سزا میں اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے لئے شاندار مستقبل رکھ دیا تھا اور وہ یہ کہ ان کی جو آئندہ نسل پروان چڑھی' اس نے صحرا کی وہ صعوبتیں جھیلیں جو صحرا کی زندگی کا لازمہ ہوتی ہیں۔ شہری اور تمدنی زندگی میں چاہے انسان سیاسی طور پر غلام ہو' چاہے غریب ہو' پھر بھی اسے تمدنی زندگی کی کچھ نہ کچھ آسائشیں حاصل ہوتی ہیں۔ برصغیر میں انگریز کی سیاسی غلامی کے دور میں تمدنی سہولتوں سے سب ہی مستفید ہوتے تھے۔ پھر آپ اپنے یہاں شہری زندگی میں دیکھیں گے کہ غریب سے غریب آدمی کے گھر میں بجلی کا قمقمہ روشن ہے۔ اب جو اس کا عادی ہو گیا ہو تو وہ رات کے گھپ اندھیرے میں کسی جنگل میں جانے کی ہمت نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ وہ اس کا عادی ہی نہیں۔ لہٰذا بنی اسرائیل کو مصر میں جو تمدنی سہولتیں حاصل تھیں چاہے ذلت کے ساتھ تھیں۔ ان سے جب وہ محروم کر دیئے گئے اور انہوں نے صحرا کی سختیاں جھیلیں تو جو اگلی نسل وہاں پروان چڑھی تو وہ جفاکش اور باہمت ہو کر اٹھی۔ وہی چالیس برس کا معاملہ ہے جہاں یہ دونوں باتیں یعنی انفرادی اور اجتماعی یخنگیاں جڑ جاتی ہیں چنانچہ بنی اسرائیل کی قسمت چالیس برس کے بعد بدلی ہے تو وہ اسی اعتبار سے کہ جو نسل صحرا میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی جب وہ چالیس برس میں اپنی پوری قوت و شدت کو پہنچ گئی تو اس نسل میں جوش و ولولہ تھا لہٰذا وہ آمادۂ جہاد و قتال تھی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو خلیفہ اور جانشین تھے' جن کا نام حضرت یوشع ابن نون تھا۔ بعض حضرات کے نزدیک وہ نبی تھے البتہ ان کی نبوت کا کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں ہے۔ سورہ کہف میں حضرت موسیٰؑ کے واقعے میں جس نوجوان کا ذکر ہے یہ وہی ہیں کہ جو اس سفر میں ایک رفیق و خادم کی حیثیت سے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تھے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو حضرت خضر کے پاس بھیجا تھا۔ بہر حال تو یہ حضرت یوشع ابن نون ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے بعد انؑ کے جانشین بنے ہیں' ان کی زیر قیادت بنی اسرائیل کی

صحرا میں چالیس سال پروان چڑھنے والی نسل نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا' قتال کیا اور فلسطین کو فتح کر لیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے عہدِ زریں کا آغاز فرما دیا۔

اپنے قومی و ملی حالات کا ایک حقیقت پسندانہ جائزہ

آج شمسی حساب سے ہمارا ملک خداداد پاکستان آزادی و خود مختاری کے چالیس سال پورے کر کے اکتالیسویں سال میں قدم رکھ چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج ہم اپنا احتساب کریں اور ان گزرے ہوئے چالیس سالوں پر ایک منصفانہ اور حقیقت پسندانہ نگاہ بازگشت ڈالیں اور آج ہمارے ملک کو جو خطرات درپیش ہیں ان کو صحیح تناظر میں سمجھنے کی کوشش کریں اور جائزہ لیں کہ آج ہم کس حال میں ہیں! نہ جذبات میں آنے کی ضرورت ہے نہ سنسنی خیزی مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے۔ لیکن معروضی (OBJECTIVE) جائزہ کہ ہم دیکھیں کہ ہم قومی و ملی اعتبار سے کہاں کھڑے ہیں! حالات اطمینان بخش ہیں یا تشویش انگیز! تشویش انگیز ہیں تو کس کس پہلو سے ہیں۔ ان کا علاج کیا ہے! حالات کی اصلاح کے لئے کون سے اقدامات فوری توجہ چاہتے ہیں اور کون سے ایک جامع منصوبہ بندی کے متقاضی ہیں!

مہیب خطرات کا سیلاب

ہم میں سے کون نہیں جانتا کہ داخلی طور پر بھی ہمارے ملک کے حالات بڑی تیزی سے بگڑ رہے ہیں اور خارج میں بھی ہماری سرحدوں پر مہیب خطرات منڈلا رہے ہیں۔ گویا ہم گوناگوں اطراف سے مہیب و تباہ کن خطرات کے سیلاب کی زد میں ہیں۔ میرے نزدیک بیرونی صورتِ حال پاکستان کے لئے جس قدر ناموافق اور تشویش ناک آج ہو چکی ہے پاکستان کی تاریخ کے چالیس سالہ دور میں کبھی اتنی ناموافق اور مخدوش نہ تھی۔ ہمارے اردگرد حالات بڑی تیزی کے ساتھ بگڑتے چلے جا رہے ہیں۔ میں موجودہ تشویش ناک صورتِ حال کے تین اہم پہلو آگے آپ کے سامنے رکھوں گا۔

آج صبح جب میں آج کی تقریر کے نکات پر سوچ رہا تھا تو میرے سامنے قرآن حکیم کی دو

آیات آئیں۔ ایک سورۃ الرعد کی اور ایک سورۃ الانبیاء کی۔ یہ دونوں سورتیں مکی ہیں اور مکی دور کے آخری حصہ میں ان کا نزول ہوا ہے۔ اور ان میں اصلاً قریش مکہ کو خطاب کیا گیا ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے چیلنج کیا تھا کہ تم ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہو اور اس بلد امین اور اس سرزمین حرم کے اندر تم نے اہل ایمان کے ساتھ ظلم و تعدی کا جو معاملہ کیا ہے اور کر رہے ہو وہ ہمارے علم میں ہے۔ ہم نے تمہاری رسی دراز کی ہوئی ہے۔ لیکن ایک بات تم نہیں دیکھ رہے، تم کو اس کا شعور حاصل نہیں ہو رہا کہ تمہارے گرد گھیرا بتدریج تنگ ہو رہا ہے۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا یہ الفاظ سورہ رعد میں آئے ہیں اور اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا یہ الفاظ سورۂ انبیاء کے ہیں۔ مضمون ایک ہی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "کیا یہ (مشرکین) دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو تنگ کرتے چلے آ رہے ہیں ان کے گرد چاروں طرف سے۔ ابھی مکہ کے اندر تو یہ بڑی خرمستیاں کر رہے ہیں، غرور کی انتہاء کو پہنچے نظر آ رہے ہیں۔ اللہ کی پکڑ سے بے فکر اور نچنت دکھائی دے رہے ہیں لیکن ان کو پتہ ہی نہیں کہ ان کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ چونکہ توحید اور اسلام کی دعوت رفتہ رفتہ آس پاس کے قبائل میں نفوذ کر رہی تھی۔ اور ظاہر بات ہے کہ مکہ کے اطراف میں جو قبائل آباد تھے، ان میں اگر اسلام کی دعوت نفوذ کر رہی ہے تو گویا مشرکین و کفارِ قریش کے گرد اسلام کا گھیرا تنگ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ یہ کیفیت چند سالوں کے بعد فتح مکہ کے موقع پر بتمام و کمال ظاہر ہوئی ہے۔ میں پہلے کسی تقریر میں عرض کر چکا ہوں کہ ہجرت کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ و مدینہ کے مابین آباد قبائل کے ساتھ باقاعدہ معاہدے کئے اور ان معاہدوں کے نتیجے میں یا تو انہیں اپنا حلیف (ساتھی) بنا لیا یا کم از کم غیر جانب دار ضرور کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ قریش جن کی سیادت، جن کی قوت کا پورے عرب پر رعب تھا، بتاشے کی طرح بیٹھ گئے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار قدوسیوں کے جلو میں رمضان ۸ھ میں فتح مکہ کے لئے تشریف لائے تو قریش میں مزاحمت کا یارانہ تھا اور وہ بے بسی کے عالم میں دم بخود اہل ایمان کو فاتحانہ طور پر مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے اور حرم شریف کو بتوں کی نجاست سے پاک و صاف ہوتے دیکھتے رہے۔

حالات کی سنگینی

سورۂ رعد اور سورۂ انبیاء کی آیات کا جو حصہ میں نے آپ کو سنایا ہے' وہ جب میرے سامنے آئیں تو گو وہ کفار قریش سے متعلق تھیں لیکن مجھے ایسے محسوس ہوا کہ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ ہمارے ارد گرد بھی گھیرا تنگ ہوتا جارہا ہے۔ قرآن مجید کے یہ الفاظ مبارکہ ہمارے موجودہ سنگین حالات پر پورے طور پر منطبق معلوم ہوتے ہیں..... ذرا حقیقت پسندانہ انداز میں جائزہ لیجئے کہ ہمارے ارد گرد کون سے خطرات منڈلا رہے ہیں! پاکستان اور اسلام دشمن قوتیں جس طریقہ سے ہمیں چاروں طرف سے حصار میں لے رہی ہیں اس کا اگر ہم تجزیہ نہیں کریں گے' اس کا جائزہ نہیں لیں گے' اس کو اگر ہم نظر انداز کریں گے تو یہ بالکل وہی مثال ہوگی جو میں نے بارہا عرض کی ہے کہ جیسے بلی کو دیکھ کر کبوتر اپنی آنکھیں بند کر لے۔ اس طرح گو چند لمحے اس کے سکون سے گذر جائیں گے کہ بلی اس کی نگاہوں کے سامنے نہیں ہو گی لیکن ظاہر بات ہے کہ وہ چند لمحے ہی ہوں گے۔ آنکھیں بند کرنے سے بلی معدوم تو نہیں ہو جاتی وہ موجود رہتی ہے۔ اسی طریقہ سے ہمارے ارد گرد خطرات کا جو گھیرا روز بہ روز تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا جارہا ہے اس کو نظر انداز کرنے سے خطرات ٹل نہیں جائیں گے بلکہ ہم کو اچانک آ دبوچیں گے۔

بیرونی خطرات

میں آج چند چیزیں نوٹ کر کے لایا ہوں تاکہ کم وقت میں ایک ترتیب کے ساتھ میں زیادہ باتیں آپ کے سامنے رکھ سکوں۔ سب سے پہلا معاملہ بھارت کا ہے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ وہ ہمارا پیدائشی دشمن ہے۔ پاکستان وہ ملک ہے جسے اپنے سے کئی گنا بڑے پڑوسی ملک کی عداوت' دشمنی اور بغض پیدائشی طور پر ملا ہے۔ پاکستان قائم ہی ہوا ہے بھارت کی دشمنی کے ساتھ۔ بھارت اگرچہ پاکستان سے رقبہ' آبادی' وسائل' تعلیم' فنون کے اعتبار سے کئی گنا بڑا ہے۔ اس کی فوجی قوت اور صلاحیت شروع ہی سے پاکستان سے مجموعی طور پر دس گنا سے بھی زیادہ رہی ہے۔ لیکن مسلمانوں کی جرأت' ان کی ہمت' ان کے جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت سے بھارت اولِ روز سے خائف رہا ہے حالانکہ پاکستان نہایت بے سرو سامانی کی حالت میں قائم ہوا تھا۔ تاہم قیام کے وقت ہی سے پاکستان

بھارت کے اعصاب پر سوار رہا ہے۔ پھر رَن کچھ اور ۶۵ء کی جنگ سے بھارت کو اندازہ ہو گیا کہ وہ محض طاقت کے ذریعہ سے پاکستان کو نقصان اور ضعف نہیں پہنچا سکتا۔ یہود کی طرح ہنود بھی بڑا سازشی ذہن رکھتے ہیں۔ چنانچہ بھارت نے سازشوں کا محاذ کھول دیا۔ جس کے نتیجہ میں دسمبر ۱۹۷۱ء میں حادثہ سقوط مشرقی پاکستان رونما ہوا۔ قومی و ملی اعتبار سے یہ ہمارے لئے بڑا ہی جانکاہ سانحہ تھا۔ اس حادثہ سے جہاں دو قومی نظریہ کو سخت دھچکا لگا جس کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی تھی، وہاں مشرقی پاکستان جو آبادی کے لحاظ سے مغربی پاکستان سے بڑا تھا ہم سے الگ ہو گیا۔ بھارت نے اس حادثہ پر خوشی سے خوب بغلیں بجائیں۔ اندرا گاندھی نے صاف صاف کہہ بھی دیا کہ ہم نے دو قومیتوں کے نظریہ کو خلیج بنگال میں غرق کر دیا.....
بھارت کو خوشی تھی کہ ایک طرف اس کی سازش کامیاب ہوئی پاکستان دولخت ہو گیا اور دوسری طرف یہ ہوا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی صورت میں دو اطراف سے اس کا جو گھیراؤ تھا جس کے باعث اس پر جو ایک نفسیاتی اور اعصابی خوف سوار رہتا تھا، وہ ختم ہو گیا۔ اس اعتبار سے وہ یکسو ہو گیا۔ یہ پہلو اس کی قوت اور اس کی جرأت میں، اضافہ کا سبب بن گیا اور اب اس کا حوصلہ (MORALE) بہت بلند ہو چکا ہے۔

پھر یہ بات بارہا ہمارے سامنے آتی رہی ہے، پاک و ہند کے اخبارات میں بھی اس پر تجزیئے آتے رہتے ہیں کہ بھارت میں جو بھی حکومتیں آئی ہیں انہوں نے اپنے ملک کو نہایت مفلس اور اپنے عوام کو بہت ہی پستی میں رکھ کر اپنے مالی وسائل کو ایک نہایت مضبوط فوجی قوت بنانے پر لگایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت اور پاکستان کے عوام کے معاشی خوشحالی اور معیار زندگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ صرف بھارت کے مسلمان ہی نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی بھارت کے عوام کے حالات معاشی خوش حالی کے اعتبار سے بڑے ابتر ہیں۔ وہاں سے پاکستان آنے والے چاہے وہ مسلمان ہوں چاہے ہندو اور سکھ ہوں، برملا اعتراف کرتے ہیں کہ پاکستان ایک خوش حال ملک ہے اور اس کے مقابلہ میں بھارت ایک مفلس ملک ہے۔ ان کے یہ تاثرات اخبارات میں آتے رہے ہیں کہ واہگہ کا بارڈر کراس کرنے کے بعد انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک مفلوک الحال ملک سے ایک مرفہ الحال ملک میں آ گئے ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ ہر بھارتی حکومت اپنے ملک کے عوام کو غریب رکھ کر اپنی فوجی اور اسلحہ کی طاقت کو

بڑھانے پر کمربستہ رہی ہے۔ جس کے نتیجے میں پہلے تو بھارت علاقہ کی چھوٹی (MINI)
سپرپاور شمار ہوتا تھا لیکن میرے نزدیک اب وہ علاقہ کی سپرپاور بن چکا ہے اب آپ عالمی صحافت
میں ' MINI ' کا لفظ اس کے ساتھ نہیں دیکھیں گے۔ بلکہ بھارت کے لئے اب علاقائی
(RIGIONAL) سپرپاور کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ الفاظ کی تبدیلی درحقیقت یونہی
نہیں ہو جاتی۔ اس کی پشت پر حقائق ہوتے ہیں۔

سپرپاورز کا رویہ

پھر یہ بات بھی دنیا کے سامنے ہے کہ دنیا کی دو مشہور ترین سپرپاورز بھارت کی طرف دوستی
کا ہاتھ بڑھانے اور اس کی مدد کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بازی لے جانے کی فکر میں
رہتی ہیں۔ یہ معاملات تو قریباً برصغیر پاک و ہند کی آزادی کے وقت سے چلے آرہے ہیں۔
گاہے ایک طرف سے اور گاہے دوسری طرف ناز و نخرے ہوتے ہیں۔ گلے شکوے ہوتے
ہیں۔ پھر من جاتے ہیں اور منا لئے جاتے ہیں۔ لیکن حالیہ جو اہم تبدیلیاں آئی ہیں ان کو نوٹ
کیجئے۔ جو کچھ کشمیر' حیدر آباد' جونا گڑھ' نیپال' بھوٹان اور گوا میں بھارتی جارحیت نے گل
کھلائے ہیں وہ داستان تو بہت پرانی ہو گئی۔ مشرقی پاکستان پر اس کی جارحیت اور یلغار کا حادثہ
بھی خاصا پرانا ہو گیا۔ اس پر سولہ سال بیت چکے۔ لیکن حال ہی میں سری لنکا میں جو کچھ ہوا ہے
اس پر پوری دنیا کی آنکھیں کھل جانی چاہئے تھیں۔ یہ اس ملک کا اندرونی معاملہ تھا کہ اس میں
ایک اقلیت یعنی تامل قوم ایسی بھی آباد ہے جس کے ہم نسل لوگ بھارت کے صوبہ تامل ناڈو میں
اکثریت میں آباد ہیں۔ عرصہ سے وہ سری لنکا میں اپنی ایک الگ آزاد و خود مختار مملکت قائم
کرنے کے لئے زور لگا رہے ہیں یہ کشمکش کافی عرصہ قبل سے مسلح تصادم کی صورت اختیار کئے
ہوئے تھی ان باغیانہ سرگرمیوں کو بھارت کی پوری مدد حاصل تھی۔ سری لنکا کی حکومت کافی
دیر سے بڑی ہمت و جرات کے ساتھ اس کی مزاحمت کر رہی تھی۔ بلکہ چند ماہ قبل سری لنکا کے
وزیر خارجہ' جو اتفاقاً مسلمان بھی ہیں' کے بیانات پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی تھی۔ انہوں نے
صاف صاف کہا تھا کہ بھارت اگر ہمارے اندرونی معاملات میں دخل جاری رکھنا چاہتا ہے اور
ہمارے یہاں کی تامل آبادی کی مبینہ تکالیف کی وجہ سے بے چینی اور ان کے ساتھ ہمدردی کا
اظہار کرتا ہے تو اپنے یہاں کی اقلیتوں یعنی سکھوں اور مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے پہلے

ان کو تحفظ دینے کی فکر کرے۔ ان کی مشکلات اور مصیبتوں کا مداوا کرے۔

لیکن اس وقت صرف اپنے مفادات کو دیکھتی ہیں اس کا یہ بہت ہی نمایاں واقعہ سامنے آیا ہے کہ بھارت نے سری لنکا کی حکومت پر معلوم نہیں کتنا دباؤ ڈالا ہے اور دھمکیاں دی ہیں اور سپر پاورز نے خفیہ طریق پر سری لنکا کو کتنا مجبور کیا ہے کہ وہ داخلی امن کے لئے بھارتی فوج کو اپنے ملک میں آنے کی اجازت دے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اب سری لنکا کے آزاد و خود مختار ملک میں بھارت کی فوجیں پہنچ چکی ہیں اور وہاں داخلی طور پر امن قائم کرنے کے لئے بھارتی فوج نے چارج لے لیا ہے۔ سری لنکا کی فوج بیرکوں میں بھیج دی گئی ہے۔ اگرچہ سری لنکا میں غالب اکثریت رکھنے والی سنہالی قوم اس صورت حال پر برہم ہے اور وہ اس پر احتجاج کر رہی ہے جو فسادات کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ لیکن اب جو ہو چکا سو ہو چکا۔ پہلے بھارتی حکومت ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے تامل باغیوں کو خوراک کے پیکٹ پہنچا تی رہی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اسی بہانے ان کو ہتھیار بھی پہنچ رہے ہوں گے۔ سری لنکا اپنے وسائل سے بھارت کی اس کارروائی کو نہیں روک سکا اور واویلا کرتا رہا لیکن پوری دنیا میں سے کسی نے بھارت کی اس بے جا مداخلت پر آواز نہیں اٹھائی کہ یہ کیا ہو رہا ہے! یہ درحقیقت راجیو گاندھی کی حکومت کی طرف سے ایک 'FEELER' تھا جو پوری دنیا کے لئے چھوڑا گیا تھا۔ اس پر پوری دنیا خاموش رہی تو سری لنکا کی حکومت کے لئے اس کے سوا کیا چارہ کار رہ گیا تھا کہ وہ "امن سمجھوتہ" کے نام سے بھارت کے دباؤ کو چار و ناچار تسلیم کر لے اور اس کی فوجوں کو سری لنکا کی حدود میں "قیام امن" کے نام سے داخل ہونے کی "اجازت" دے دے۔ یہ اس لئے ہوا کہ سری لنکا اور بھارت کے مابین فوجی طاقت اور وسائل کے اعتبار سے کوئی نسبت و تناسب ہے ہی نہیں۔ کہاں سری لنکا اور کہاں بھارت!! یوں سمجھئے کہ "ہاتھی کے سامنے ایک چوزا" کی مثال ہے چنانچہ اب سری لنکا میں انڈین آرمی جس طرح پہنچ چکی ہے تو آپ اس سے اندازہ کیجئے کہ اس علاقہ کے حالات میں یک دم کتنی دور رس اور خطرناک تبدیلی آگئی ہے .....

بھارت کے عزائم

ڈھاکہ کے ایک مشہور و معروف اخبار نے لکھا ہے کہ بھارت کی طرف سے یہی حکمتِ عملی بنگلہ دیش (سابقہ مشرقی پاکستان) کے لئے اختیار کی جا رہی ہے۔ بھارت نے چکما قبائل کی

طرف سے بنگلہ دیش میں جو بے چینی اور گڑبڑ پیدا کی ہوئی ہے تو ایسا نظر آ رہا ہے کہ اسی بہانے بھارت بنگلہ دیش میں بھی فوجی مداخلت کے لئے راہ ہموار کر رہا ہے اور بھارتی اخبار حکومت کو شہ دے رہے ہیں کہ سری لنکا کے انداز پر ہی چکما قبائل کی مشکلات کا حل ہو سکے گا...... گو بھارت کی جارحیت کا دوسرا نشانہ کسی وقت اور کسی بہانے بنگلہ دیش بن سکتا ہے۔

اس پورے تناظر میں دیکھئے کہ بھارت کا تیسرا متوقع شکار صاف نظر آ جاتا ہے۔ اس کے لئے اس نے اربوں روپے خرچ کر کے جو EXERCISE کی ہے۔ پاکستانی سرحدوں کے ساتھ بڑے پیمانے پر فوجی مشقیں کی ہیں وہ کسی منصوبہ کے بغیر تو نہیں کی ہوں گیں! مختلف اطلاعات کے مطابق بھارت ضلع تھرپارکر' حیدر آباد اور سکھر ڈویژن کو سامنے رکھ کر اپنی پوری جنگی حکمت عملی (STRATEGY) باریک سے باریک اور چھوٹی سے چھوٹی جزئیات و تفصیلات (MINUTUS DETAILS) کے ساتھ بنا چکا ہے۔ بنئے نے اتنی بڑی رقم جو خرچ کی ہے وہ ایسے ہی نہیں کی ہے۔ اس نے اپنی فوجی مشقیں مکمل کر کے اپنی فوجوں کو فی الوقت ہٹا لیا ہے۔ لیکن اگر اندرون سندھ خاص طور پر تھرپارکر کے اندر فسادات ہوں اور بدامنی کی صورت پیدا ہو جائے جہاں ہندوؤں کی ایک خاصی بڑی تعداد آباد ہے تو وہی معاملہ وہاں ہو گا جو تقریباً سولہ سترہ سال قبل مشرقی پاکستان میں ہو چکا ہے اور جس کے آثار سری لنکا میں دکھائی دے رہے ہیں۔ اگر سندھ کی سرحدوں پر بھارت نے جارحیت کا اقدام کیا جیسا کہ قرائن سے نظر آ رہا ہے تو دنیا کی کوئی سپر پاور بھارت کی ننگی جارحیت پر انگلی نہیں اٹھائے گی۔

امریکہ کی پالیسی

امریکہ نے اس دور میں بھی جبکہ بظاہر ہماری اس کے ساتھ بڑی دوستی ہے' بڑی گاڑھی چھن رہی ہے' اس نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے لیکن ساتھ ہی وقفہ وقفہ سے بارہا اس کی طرف سے یہ اعلان ہوتا رہا ہے کہ اگر پاکستان اور بھارت کے مابین کوئی تصادم ہوا تو ہرگز امریکہ پاکستان کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔ یعنی اگر تصادم کا مرحلہ آ ہی جائے تو اس وقت ہم امریکہ کو کوئی الزام اور کوئی دوش بھی نہیں دے سکیں گے اس لئے کہ اس نے اپنی اس پالیسی کو بارہا کھل کر بیان کیا ہے۔

--

بھارت کی جارحیت کے ہدف

ایک طرف تو یہ صورت حال ہے۔ دوسری طرف بھارت کے عزائم کو جان لیجئے کہ اب اس کا ہدف (TARGET) پاکستان کا انتہائی شمالی علاقہ اور جنوبی علاقہ ہو گا۔ درمیان کے حصہ کو وہ اس مرتبہ چھوڑ رہا ہے۔ اس لئے کہ پہلی جو دو جنگیں ہوئی ہیں وہ پنجاب کے میدانوں میں لڑی گئی ہیں۔ لیکن بھارتی پنجاب کا معاملہ بھارت کے نقطہ نظر سے اس وقت مخدوش ہے لہٰذا وہ ان اطراف سے جارحیت کی کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔ وہ سکھوں کو ایسا موقع نہیں دے گا کہ وہ اس کی پیٹھ کے اندر خنجر گھونپ سکیں۔ جیسے کہ مشرقی پاکستان میں بھارت کی طرف سے بھیجے ہوئے ایجنٹوں اور بنگلہ قومیت کے انتہا پسند عناصر نے پاکستانی فوج کی پیٹھ میں خنجر گھونپا تھا۔ اگر پنجاب کے علاقے سے بھارت کوئی جارحیت کرتا ہے تو اسے اس صورت حال کے پیدا ہونے کا شدید اندیشہ ہے۔ وہاں وہ صرف اپنی دفاعی پوزیشن کو مضبوط رکھے گا اور اس نے جو فوجی مشقیں کی تھیں اس سے اس کی یہ حکمت عملی ظاہر ہو گئی تھی کہ اب اس کے جو اصل ہدف (TARGET) ہیں وہ یا انتہائی شمال ہے یا جنوب ہے۔ شمال میں اس نے ہماری غفلت سے فائدہ اٹھایا اور سیاچین کے ایک بہت بڑے رقبہ پر قبضہ کر لیا۔

سیاچین کی اہمیت

سیاچین کی جنگی نقطہ نظر سے جو حیثیت اور اہمیت ہے وہ یقیناً آپ حضرات کے علم میں ہو گی۔ میں صرف آپ کو ایک اہم بات کی طرف اور توجہ دلا دوں کہ اس کا جوڑ ملایئے واخان کے ساتھ۔ واخان کا علاقہ افغانستان باقاعدہ بہت پہلے روس کو دے چکا ہے۔ اس نے اپنی فوجوں کو افغانستان میں داخل ہونے کے بعد فوری طور پر جو قیمت وصول کی تھی وہ واخان کا مستقل قبضہ لے لینا تھا اور یہ واخان ایک خنجر کے مانند پاکستان کے شمالی علاقے چترال اور گلگت وغیرہ کے علاقے کے سر پر ایک باریک سی پٹی ہے۔ بہت اونچا علاقہ ہے۔ وہاں روس کے نہایت مضبوط مورچے بن چکے ہیں۔ لہٰذا اس جانب سے روس اور ادھر سیاچین کی جانب سے بھارت کے لئے شاہراہ ریشم نرغہ میں آ گئی ہے اور دونوں کے لئے اس کو 'PINCER MOVEMENT' کے ذریعہ سے ناقابل عبور بنانا زیادہ مشکل نہیں رہے گا تو ظاہر بات ہے کہ کسی کڑے وقت میں اگر وہ سڑک ہی قابل استعمال نہیں ہو گی تو ہمارے چین کے

ساتھ کتنی ہی دوستی اور گہرے تعلقات و روابط ہوں وہ اس شاہراہ کے کٹ جانے کے بعد ہماری کوئی موثر مدد نہیں کر سکے گا۔ یہ تو میں نے ان سنگین خطرات کی نشان دہی کی ہے جو بھارت کی جانب سے ہمارے شمال اور جنوب سے ہمارے سروں پر معلق ہیں۔ اب آیئے ایک دوسرے اہم خطرہ کی طرف۔

مغربی سرحد کے مخدوش حالات

دوسرا اہم خطرہ ہمیں اپنی مغربی سرحد یعنی روس اور افغانستان کی جانب سے ہے۔ میں اپنی گفتگو میں روس اور کابل دونوں کو یکجا (BRACKET) کر رہا ہوں۔ کابل میں جو بھی کٹھ پتلی حکومت رہی ہے۔ وہ شروع سے ہمیں دھمکیاں دیتی چلی آ رہی ہے کہ افغان مہاجرین کے ساتھ جو تعاون اور اعانت ہے اس سے دست کش ہو جاؤ ورنہ اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ کابل حکومت نے روس کی مدد سے اپنے منصوبے پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔ افغانستان کی طرف سے اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ اب صرف سبوتاژ (SABOTAGE) ہی نہیں ہے بلکہ ایک طرف ان کی افغانستان میں مجاہدین کے ساتھ جو جنگ ہے اسے اس نے پاکستان کی سرحدوں کے اندر دھکیل دیا ہے۔ آزاد قبائلی علاقوں میں افغانستان کا پیسہ اور روسی اسلحہ بے تحاشہ انداز میں آ چکا ہے۔ چنانچہ آپ کو یاد ہو گا کہ خیبر ایجنسی میں صرف ایک سڑک بنانے کے مسئلہ پر وہاں شدید قسم کا ہنگامہ اور خون ریزی ہو چکی ہے۔ اس کے بعد پاراچنار کے اندر زبردست ہنگامہ ہو چکا ہے۔ پاراچنار کا معاملہ چونکہ خاص اہمیت والا ہے تو اس کے متعلق میں بعد میں بھی کچھ عرض کروں گا۔ پھر میں کچھ دن قبل آپ کو بتا چکا ہوں کہ جنوبی وزیرستان میں بھی بہت سے لوگ کابل سے بہت سا پیسہ اور اسلحہ لے کر آئے ہیں لیکن وہاں کے علماء نے وہاں جرگہ بلایا ہے اور وہاں کوشش کر رہے ہیں کہ ان کو روکیں۔ اگر وہ باز نہ آئیں تو ان کا مقاطعہ کریں۔ لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ علماء اور جرگہ کی کوششوں کا کوئی پائیدار نتیجہ نکلے گا یا نہیں! یا یہ محض عارضی سا معاملہ ہو گا چونکہ جب ایک طرف مالی مفادات کا معاملہ ہو اور دوسری طرف نفرتوں کے بیج کی خوب آبیاری ہو چکی ہو تو علماء کی کوششیں بھی غیر مؤثر ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ افغانستان کی جنگ کابل اور روسی حکومت نے بالفعل پاکستان کی سرحدوں کے اندر دھکیل دی ہے۔ یہ تو تھے بیرونی خطرات۔ اب معاملہ ہے

اندرون سبوتاژ کا۔ اس کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے۔

اندرونی تخریب کاری

سال دو سال سے پاکستان کے متعدد و قابل لحاظ شہروں میں اندرونی تخریب کاری اور سبوتاژ کا جو خوفناک سلسلہ چل رہا ہے وہ بالواسطہ بھی ہے اور بلاواسطہ بھی۔ عام طور پر ہم بلا واسطہ تخریب کاری کو سمجھتے اور جانتے ہیں۔ جیسے لاہور میں ریلوے اسٹیشن اور بس اسٹینڈ پر دھماکہ ہو گیا۔ کراچی کا بہت خوفناک اور تباہ کن دھماکہ اس سبوتاژ کی بڑی نمایاں مثال ہے۔ اس سے پہلے صوبہ سرحد میں جو دھماکے ہو رہے تھے 'پل اڑائے جا رہے تھے' پشاور اور مردان کے راستے میں ریلوے پل کئی بار بال بال بچے ہیں اسی طرح کئی بار ریلوے ٹرین بھی اس تخریب کاری کی زد میں آنے سے بال بال بچی ہیں۔ پھر پنڈی کا دھماکہ ہے جس سے بڑی تباہی مچی۔ ۔ یہ تخریبی سرگرمیاں ہیں جو افغانی اور روسی بلاواسطہ اور براہ راست کر رہے ہیں۔ چند لوکل ایجنٹس ہوں گے بلکہ ان کی بھی خاص ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ افغانستان کے لوگ افغان مہاجرین کے بھیس میں بھی آسکتے ہیں۔ پھر ان کے اور ہمارے سرحدی بھائیوں کا لباس اور زبان ایک ہے لہٰذا یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ کون سرحد کا باشندہ ہے اور کون افغان مہاجر ہے اور کون اس بھیس میں افغانستان کا تخریب کار ہے۔ لہٰذا ان کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں ہے وہ جیسے چاہیں بہ آسانی ملک کے مختلف حصوں میں آ اور جاسکتے ہیں۔

اس بلاواسطہ تخریب کاری کے ہولناک نتائج پوری قوم کے سامنے ہیں اخبارات میں شہ سُرخیوں اور تباہ کاری کی تصویروں کے ذریعہ سے خبریں آئے دن چھپتی رہتی ہیں ریڈیو اور ٹی وی پر بھی یہ خبریں نشر ہوتی ہیں۔ ہمارے سیاست دانوں اور دوسرے زعما کے ہمدردانہ بیانات کے ساتھ ساتھ تلخی آمیز تنقیدی بیانات بھی آتے رہتے ہیں۔ اور تو اور خود ہمارے صدر مملکت بالقابہ نے حال ہی میں ایک اخباری بیان میں ان دھماکوں اور تخریبی سرگرمیوں کے متعلق فرمادیا ہے کہ قوم کو ایک سوچون (۱۵۴) دھماکوں کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ ابھی معاملہ بہت آگے بڑھے گا گویا ۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

اگرچہ یہ بات صدر صاحب کو زیب نہیں دیتی۔ کسی حکومت کے سربراہ کو اس طرح کی بات کہنی نہیں چاہئے۔ چند اشخاص کی حفاظت پر خزانہ عامہ کا کروڑہا روپیہ سالانہ خرچ ہو جاتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے عام آدمی کی جان کی کوئی قدر و قیمت ملک کے برسر اقتدار طبقے کی نگاہوں میں نہیں ہے۔ اس کے ساتھ جو بھی خاک و خون کا کھیل کھیلا جا رہا ہے' اس کے روک تھام اور سدباب کی کوئی ضمانت دینے کے لئے حکومت تیار نہیں ہے۔ نام ہم حضرت عمر فاروقؓ کا لیتے ہیں جن کا فرمان تو یہ ہے کہ اگر دجلہ و فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک اور پیاس سے مر جائے تو قیامت کے دن عمرؓ اس کا ذمہ دار ہو گا۔ یہاں انسان مر رہے ہیں سینکڑوں کی تعداد میں انسانی جانوں کا ضیاع ہو رہا ہے۔

اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ زخمی ہو رہے ہیں' وہ بھی ہیں جو پوری زندگی کے لئے معذور ہو گئے ہیں کروڑہا کروڑ کا مالی نقصان ہو چکا ہے لیکن اس کی ذمہ داری قبول کرنے اور آئندہ امن کی ضمانت دینے کے لئے کوئی تیار نہیں۔

مجھے اس وقت صدر جمال ناصر یاد آ رہے ہیں۔ ۶۷ء کی عرب اور اسرائیل کی جنگ میں جو کچھ ہوا سو ہوا۔ لیکن صدر ناصر نے پوری جرأت کے ساتھ شکست کی ذمہ داری کو قبول کیا اور استعفیٰ دینے کے لئے بالکل تیار ہو گئے۔ بہرحال کسی بھی سربراہ مملکت کو اس طرح کی بات کہنا درست نہیں ہے جس نوع کی بات ہمارے صدر صاحب نے کی۔ بلکہ اگر وہ اس انداز میں بات کرتے تو زیادہ مناسب ہوتا کہ ہمیں اپنی آزادی اور خود مختاری کو برقرار رکھنے کے لئے ہر نوع کی قربانی دینی پڑے تو ہم اس کے لئے تیار ہیں اور ہم اپنے افغان مہاجر بھائیوں کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے چاہے ہمیں اس کے لئے کتنی ہی قیمت دینی پڑے۔

بہرحال اب تک تو میں نے بلاواسطہ سبوتاژ اور تخریب کاریوں کے ضمن میں چند اصولی باتیں عرض کی ہیں لیکن پاکستان میں بالواسطہ کھلم کھلا بھی اور زیر زمین بھی پورے نظم اور منصوبوں کے ساتھ جو تخریبی کام ہو رہا ہے وہ اس بلاواسطہ تخریب کاری سے کہیں زیادہ خوفناک ہے۔

پاراچنار کا مسئلہ۔

اس میں سب سے پہلے میں پاراچنار کی مثال دیتا ہوں ' وہاں معاملہ کیا تھا؟ وہاں جو بھی تصادم ہوا اس میں پہلی سطح تھی قبائلی۔ اور قبائلی زندگیوں میں ایسا ہوجایا کرتا ہے۔ بلوچستان اور سندھ کے مختلف قبائل کے درمیان بھی کبھی کبھی تصادم ہوتے رہے ہیں۔ یوں سمجھیئے کہ یہ تو قبائلی زندگی کے لوازم میں سے ہے۔ چنانچہ وہاں بھی دو قبیلوں کے مابین تصادم کا معاملہ تھا۔ پھر اس پر دوسری تہہ یہ چڑھ گئی کہ اس میں اتفاق سے ایک قبیلہ شیعہ ہے اور ایک سنی۔ اب مسئلہ نے شیعہ سنی چپقلش کا روپ دھار لیا۔ تیسری تہہ اس پر یہ چڑھی کہ ایک قبیلہ جو طوری قبیلہ کہلاتا ہے وہ پاکستان اور افغانستان دونوں ملکوں میں بھی آباد ہے۔ اب یہ طوری قبیلہ افغانستان کی طرف سے پاکستان میں تخریبی کاروائیوں کا سبب بنا ہے اور اس نے تصادم کو خوب ہوا دی ہے۔ پاراچنار کی علاقائی پوزیشن کے بارے میں ایک صاحب نے بڑی اچھی مثال ایک مضمون میں دی ہے کہ جیسے بند مٹھی ہوتی ہے تو انگوٹھا علاوہ نمایاں نظر آتا ہے۔ پاراچنار کا علاقہ اسی طریقہ سے کھلے انگوٹھے کے مانند افغانستان کے اندر گھسا ہوا ہے۔ بلکہ اس کی تین اطراف شمال جنوب اور مغرب افغانستان کے اندر واقع ہیں اور اس کا حصہ ہیں۔ اسی طوری قبیلہ کے افغانی علاقہ سے ملحق وہاں کئی صوبے ایسے ہیں ' جہاں افغان مجاہدین افغان اور روسی مشترکہ فوجوں سے برسرپیکار ہیں۔ اور ان مجاہدین کی جو سپلائی کی لائن ہے وہ اسی طوری قبیلہ کے سرحدی علاقوں سے ہو کر گزرتی ہے۔ لہٰذا افغانستان نے اس علاقہ کو چنا اور وہاں قبائلی مخاصمت کو ہوا دے کر دو قبیلوں کو باہم لڑوا دیا۔ ہمارے یہاں بعض لوگوں نے بڑی غلطی کی ہے اور گویا وہ بھی دشمنوں کے ہاتھوں شعوری و غیر شعوری طور پر کھیل گئے ہیں کہ انہوں نے فرقہ وارانہ فساد کا رنگ دے دیا حالانکہ حقیقت کے اعتبار سے یہ فرقہ وارانہ مسئلہ نہیں ہے۔ یہ مسئلہ بنیاد کے اعتبار سے تو قبائلی مخاصمت کا شاخسانہ ہے البتہ افغانستان نے اس کا رخ تخریب کاری کی طرف بڑی ہوشیاری سے موڑ دیا ہے۔ یہ اسی کا مظہر ہے اور اسی پہلو کو نمایاں کیا جانا چاہئے تھا۔ اس کو ایک فرقہ وارانہ تصادم قرار دینا در حقیقت واقعاتی اعتبار سے بھی درست نہیں ہے اور پاکستان کے موجودہ داخلی حالات کے اعتبار سے بھی ایک خوفناک غلطی ہے۔

کراچی کی صورت حال۔

کراچی کی موجودہ داخلی بدامنی کا معاملہ بہت خوفناک صورت اختیار کر چکا ہے۔ ویسے تو پورے صوبہ سندھ کا مسئلہ بڑا پیچیدہ اور تشویش ناک ہے۔ اس کے متعلق میں بعد میں تھوڑا سا کچھ عرض کروں گا۔ کراچی کا مسئلہ یہ ہے کہ وہاں عام آبادی میں اکثریت مہاجرین اور اردو بولنے والوں کی ہے۔ پھر کراچی میں آبادی کا جو پھیلاؤ ہوا ہے تو نواحی بستیاں کراچی کا جزو بن گئی ہیں۔ ان مضافاتی بستیوں میں اکثر و بیشتر ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجر آباد ہیں اور پنجاب سے نقل مکانی والے لوگوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ان بستیوں میں آباد ہے چند مخصوص بستیاں سرحد سے آنے والوں پر مشتمل ہیں۔ کراچی میں صورت واقعہ یہ ہے کہ زیادہ تر ٹرانسپورٹ پٹھانوں کے ہاتھ میں ہے۔ خاص طور پر منی بسیں تو نوے چھیانوے فیصد انہی کے ہاتھ میں ہیں۔ فیکٹریوں' ملوں میں کام کرنے والوں میں بھی پٹھانوں کی اکثریت ہو گئی ہے۔ پٹھانوں میں زیادہ تر جنوبی وزیرستان کے وزیری قبائل کے لوگ ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ کراچی میں ٹریفک کا مسئلہ روز بروز پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا جا رہا ہے اندرون شہر کو بیرونی علاقوں سے ملانے والے راستے جو چند سالوں میں کافی کشادہ متصوّر کئے جاتے تھے اب تنگ درّوں (BOTTLE NECKS) کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ یہ علاقے لیاقت آباد' فیڈرل بی ایریا' گولی مار' ناظم آباد' اورنگی' نئی کراچی' کورنگی' فیصل کالونی' مسعود آباد' ملیر کالونی سے لانڈھی اور اب بن قاسم تک پھیل گئے ہیں ان میں بڑی بڑی آبادیاں بلکہ آبادیاں کیا ہر بستی ایک پورا شہر ہے۔ ان سب کے لئے ٹریفک انہی چند راستوں سے ہو کر گزرتا ہے جو اب ('BOTTLE NECKS') بن چکے ہیں۔ لہٰذا ان علاقوں میں ٹریفک کے حادثات روزانہ کا معمول بن چکے ہیں۔ حادثات میں ڈرائیوروں کی بے پرواہی کا بھی یقیناً بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ چونکہ ملک میں قانون کی پرواہ اب کس کو رہ گئی ہے! کوئی پکڑ دھکڑ نہیں' کوئی جواب طلبی نہیں' چہار سو رشوت کا بازار گرم ہے۔ پھر یہ کہ اکثر ٹرانسپورٹ کے اصل مالکان پولیس والے ہیں اور اکثر پولیس پنجاب کی ہے۔ لہٰذا حادثہ کے ذمہ دار کو سزا نہیں ملتی۔ چنانچہ محض ان ٹریفک کے حادثات کی وجہ سے جو کھچاؤ اور تناؤ (FRICTION) پیدا ہوا اسے بیرونی طاقتوں کی طرف سے 'EXPLOIT' کیا گیا ـــــــ اب یہ صورت حال اردو بولنے والوں اور پشتو بولنے والوں کے مابین نفرت اور پھر تصادم کا سبب بن

گئی ہے۔ میں نے بار بار کہا ہے کہ سات آٹھ ماہ قبل ایک خوفناک انداز میں اس تصادم کا جو آغاز ہوا تھا وہ صرف اندرونی معاملہ نہیں تھا اس میں یقیناً بیرونی قوتوں کا ہاتھ تھا وہ بیرونی تخریب کاری تھی۔ جس طریقے سے وہاں فائرنگ ہوئی ہے۔ اور جس طرح وہاں لوگ قتل کئے گئے ہیں جگہ جگہ آگ لگائی گئی' لوگوں کو زندہ جلایا گیا ہے۔ پھر معصوم ننھے منے بچوں کو اٹھا اٹھا کر بیمانہ طور پر آگ میں جھونکا گیا ہے۔ یہ اندرونی معاملہ نہیں ہو سکتا۔ یہ پاکستان کا لوکل پٹھان س بے رحمی اور درندگی کا مظاہرہ کر سکتا ہے نہ اس قسم کی بربریت کی حرکت کراچی میں بسنے الے مہاجرین کر سکتے ہیں۔ میری یہ رائے اس تصادم کے آغاز کے بارے میں ہے' لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا ہے اور مسلسل ہو رہا ہے وہ جواب آں غزل اور عمل اور اس کا ردعمل اور پھر س ردِعمل کے جوابی ردعمل کا شاخسانہ ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ تصادم کا آغاز جس وحشیانہ نداز میں ہوا اور عرصہ سے نفرتوں کے جو بیج بوئے جا رہے تھے اب ان کو بروئے کار آنے کا پورا موقع مل رہا ہے۔

صورت حال کا تجزیہ

یہ ہیں ملک میں بدامنی' سبوتاژ اور تخریب کاری کے سب سے بڑے اور اہم مظاہر۔ اس میں افغان اور روسی لابی (LOBBY) نمایاں طور پر سرگرم عمل ہے۔ انہوں نے ی الوقت شمال بعید اور جنوب بعید کو اپنا اہم ترین ٹارگٹ بنایا ہوا ہے۔ بھارت کی زیادہ تر توجہات بھی انہی اطراف کی طرف مرکوز ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دشمنوں کی دشمنی اور اشرار سے بچائے۔ میں نے چاہا کہ موجودہ صورت حال کو میں نے جس طور پر سمجھا ہے اسے آپ کے سامنے رکھ دوں۔ میری سوچ کا تانا بانا چونکہ قرآن مجید ہی پر مبنی ہے۔ لہٰذا جب بھی لوئی تشویش ناک صورتحال سامنے آتی ہے' غیر شعوری طور پر کہیں نہ کہیں سے قرآن مجید کے لفاظ اس طریقہ سے ابھر کر میرے ذہن کی سطح پر آ جاتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ؎

"جا ایں جا است"

یسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات تو بالکل اس صورت حال کے لئے فرمائی گئی ہے۔ "اَوَلَمْ یَرَوْا ...ی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ـ ط" اور "اَفَلَا یَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ط" قرآن مجید کے دو مقامات پر وارد شدہ ان الفاظ مبارکہ پر غور کر

لیجئے اور جائزہ لے لیجئے کہ ہماری شامت اعمال اور اللہ سے عہد شکنی کی پاداش میں جس پر مجھے آگے کچھ عرض کرنا ہے۔ دشمنوں کی طرف سے کس طرح ہمارا گھیراؤ ہو رہا ہے اور کس طرح ان کی سازشوں کی وجہ سے ہمارا ملک اندرونی طور پر ہولناک تخریب کاریوں کی زد میں ہے!!

امریکہ کا رویہ۔

اس تناظر میں امریکہ کے رویے اور طرز عمل پر ایک اور زاویے سے بھی غور کر لیجئے۔ اس کی طے شدہ اور اعلان کردہ پالیسی ہے کہ وہ بھارت کی طرف س جارحیت کی صورت میں ہماری کوئی مدد نہیں کرے گا بلکہ وہ بھارت کو بارہا یقین دہانی کروا چکا ہے کہ اس نے ہماری موجودہ حکومت سے یہ مفاہمت کی ہوئی ہے کہ امریکہ کا اسلحہ کبھی بھارت کے خلاف استعمال نہیں ہو گا' وہ پاکستان کو روس اور افغانستان کی جارحیت سے بچانے کے لئے اسلحہ دے رہا ہے۔ یہ امریکہ کی طے شدہ اور واضح پالیسی ہے۔ اس پر اسے الزام دینا بے سود ہے۔ ہمیں سوچنا چاہئے کہ کہ ہم اس کے باوجود اس کی جھولی کے اندر ہیں تو یہ ہماری حماقت ہے اور ہماری خارجہ پالیسی کے نقص اور کمزور ہونے کی علامت ہے۔ فی الوقت وہی صورت حال نظر آ رہی ہے جو چند سال قبل مسٹر کسنجر کی آمد کے بعد نظر آتی تھی۔ مسٹر آرماکوس کی اس وقت پاکستان آمد اور پاکستان کی امداد روک دینے کے سلسلہ میں امریکہ اور پاکستان کے مابین کشیدگی کا پیدا ہونا خاصی تشویش ناک صورت حال ہے جو کسی وقت بھی خوفناک 'TURN' لے
سکتی ہے۔ وہ خوفناک تبدیلی کیا آ سکتی ہے! اسے بھی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ماضی گواہ
سکتی ہے۔ وہ خوفناک تبدیلی کیا آ سکتی ہے! اسے بھی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ماضی گواہ
ہے کہ سپر پاورز کے مابین بین الاقوامی حالات کے مطابق "سودا" طے ہو جایا کرتا ہے۔ چھوٹے ممالک جو ان کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ انہیں کرنسی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے مفادات کی بساط پر چھوٹی طاقتیں مہروں کے طور پر استعمال ہوا کرتی ہیں۔ یہ چھوٹی طاقتیں اس خوش فہمی میں رہتی ہیں کہ فلاں سپر پاور ہماری دوست ہے اور فلاں ہماری ساتھی ہے۔ ۶۷ء میں ہمارے مصری بھائی سبق سیکھ چکے ہیں کہ روس درحقیقت ہمارا ساتھی نہیں ہے' اس نے عین آڑے وقت میں ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ہمارے ساتھ یہی معاملہ امریکہ ۶۵ء اور ۷۱ء میں کر

چکا ہے اور اس وقت محسوس ایسا ہوتا ہے کہ جس تیزی کے ساتھ خلیج کے حالات جو رنگ اختیار کر رہے ہیں اس میں امریکہ بہت پیش قدمی دکھا رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امریکہ اور روس کے مابین کوئی مفاہمت (UNDERSTANDING) ہو چکی ہے ' اندرون خانہ کوئی "یالٹا کانفرنس" ہو چکی ہے۔ درون خانہ کوئی بندر بانٹ عمل میں آچکی ہے واللہ اعلم۔ ہم یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتے لیکن حالات کا رخ یہ بتا رہا ہے کہ شاید امریکہ نے خلیج کے علاقے میں اپنے مفادات کے تحفظ کے پیش نظر افغانستان میں روس کی بالادستی کو قبول کر لیا ہے۔ اسی لئے امریکہ نے پاکستان پر بھارت کی طرف سے لگائے ہوئے اس الزام کی آڑ لے کر کہ پاکستان آئٹم بم بنا رہا ہے پاکستان کو ملنے والی امداد کے سلسلہ کو معطل کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ الزام کوئی نیا الزام نہیں ہے تین چار سال سے مسلسل لگایا جا رہا ہے۔ اگر اس میں کچھ صداقت ہے تو کیا امریکہ جیسے ملک کو یہ بات پہلے سے معلوم نہیں تھی اور اگر اس میں کوئی صداقت نہیں ہے تو کیا وہ امریکہ کے علم سے خارج بات ہو گی! صاف ظاہر ہے کہ یہ محض حیلہ جوئی اور بہانہ سازی ہے کہ پاکستان اپنے پلانٹس (PLANTS) کو معائنۂ عام کے لئے کھول دے۔ یہ سب کچھ محض دکھاوے کے لئے کیا جا رہا ہے اور اپنی پالیسی میں جو تبدیلی (TURN) لانی مقصود ہے اس کے لئے وجہ جواز فراہم کرنے کے لئے یہ ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے ورنہ اگر اس الزام میں کوئی حقیقت ہے تو وہ نہ اس سے پہلے امریکہ سے پوشیدہ ہو گی اور نہ آج ہو سکتی ہے۔ ہمارے اندرونی حالات کے متعلق امریکہ جتنا جانتا ہے اس کا عشر عشیر بھی پاکستانی عوام نہیں جانتے..... صاف ظاہر ہے کہ پاکستان یک طرفہ طور پر اپنے PLANTS کے معائنہ عام کو کیسے گوارا کرے گا! آخر بھارت سے مطالبہ کیوں نہیں کیا جاتا کہ وہ بھی اپنے پلانٹس کو معائنہ کے لئے کھول دے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اندرونی طور پر امریکہ اور روس کے مابین جو خفیہ مفاہمت ہو چکی ہے یہ اسی کا مظہر ہے واللہ اعلم۔ اسی طرح خلیج میں جس طرح امریکہ کی چیرہ دستیاں بڑھ رہی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ روس کی طرف سے اس کے پاس کوئی نہ کوئی ضمانت موجود ہے کہ وہ اس میں کوئی دخل اندازی نہیں کرے گا اور ظاہر بات ہے کہ روس یہ ضمانت کسی معاوضے کے بغیر دینے والا نہیں ہے۔ کوئی بھی اپنے مفادات کے تحفظ کے بغیر ضمانت نہیں دیتا روس کو ہم کیا دوش دیں.....!

اندرونِ ملک حالات کی سنگینی

داخلی تشویش ناک صورت حال کے اعتبار سے اس وقت صرف دو چیزوں کی طرف اشارہ کروں گا۔ ویسے میں ان مسائل پر بڑی تفصیل سے اپنی دو کتابوں "استحکام پاکستان" اور "استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ" میں حالات کا تجزیہ پیش کر چکا ہوں۔ میں فی الوقت دو اہم باتوں کی طرف آپ حضرات کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

نظریہ پاکستان میں ضعف

پہلی بات یہ ہے کہ مسلم قومیت کا وہ تصور جو پاکستان کے وجود میں آنے کی بنیاد، یا سبب بنا تھا آج وہ تصور پاکستان میں جس حال کو پہنچ چکا ہے وہ اظہر من الشمس ہے عصبیتوں کے بہت سے طوفان اٹھ چکے ہیں۔ پہلے بھی اس عصبیت کا فتنہ پختونستان کے نعرے کی صورت میں صوبہ سرحد میں سر اٹھاتا تھا۔ پھر اس فتنے نے بلوچستان میں عظیم تر بلوچستان، (GREATER BALUCHISTAN) کے خواب کے حوالے سے سر اٹھایا۔ لیکن اب ایک آتش فشاں پہاڑ کی مانند عصبیت کے اس فتنے اور عفریت کا سب سے بڑا مرکز صوبہ سندھ بن چکا ہے۔ اس وقت ہمارے لئے اندیشہ کی سب سے بڑی جگہ صوبہ سندھ ہے۔ وہاں عصبیتیں جس تیزی کے ساتھ پروان چڑھی ہیں کہ شاید و باید میں نے اپنی کتاب "استحکام پاکستان" میں پروفیسر مرزا محمد منور صاحب کی فارسی کی ایک نظم کے چند اشعار نقل کئے ہیں۔ اس کا آخری مصرع میرے شعور میں پیوست ہے؟

ع کہ آہوار یقینِ ما بصحرائے گماں گم شد

وہ یقین کی کیفیت جس کے ساتھ امید ہوتی ہے، ولولے اور امنگیں ہوتی ہیں وہ اب گمان و تخمین کے صحرا میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ پاکستان جب بنا تھا تو کتنا جوش و ولولہ تھا۔ عوامی سطح پر ایک طرف یہ جذبہ تھا کہ دہلی کے لال قلعہ پر ہمارا جھنڈا جلد لہرائے گا۔ دوسری طرف عوامی سطح پر یہ جذبہ بھی موجزن تھا کہ ہم سارے تعیشات تج دیں گے سارے عیش و آرام چھوڑ دیں گے۔ ہم محنت کریں گے بڑی سادگی اختیار کریں گے۔ دیانت و شرافت کے ساتھ رہیں گے۔ ملک کو مستحکم بنائیں گے۔ پاکستان کے قیام میں یہ جذبہ بھی تھا کہ یہ ملک

'PAN- ISLAMISM' یعنی اسلامی ممالک کے وسیع تر اتحاد کا پیش خیمہ بنے گا۔
آج کے اس اجتماع میں یقیناً چند ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کو یاد ہو گا کہ گاندھی جی نے کس طرح قائد اعظم سے ہکلاتے ہوئے پوچھا تھا کہ "آپ کے پاکستان کا مطلب 'PAN- ISLAMISM' تو نہیں ہے نا"...... اس لئے کہ یہ ہندوؤں کے لئے کابوس تھا کہ مسلمان صرف ہندوستان ہی میں نہیں ہیں۔ مسلمان تو ایک بہت بڑی عالمی برادری ہے جو کرۂ ارض کے ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔ کہاں انڈونیشیا اور ملائیشیا اور کہاں موریطانیہ...... ! مسلم ممالک کا ایک مسلسل سلسلہ ہے اس لئے کہ درمیان میں جو علاقے آ جاتے ہیں ان میں جہاں مسلمان اقلیت میں بھی ہیں تو وہ اقلیت نظر انداز کی جانے والی اقلیت نہیں ہے۔ آج بھارت میں کم و بیش پندرہ کروڑ مسلمان ہیں۔ چند دن قبل جب میں بیرون ملک دورے پر تھا تو وہاں مجھے بھارت کے دو مسلمانوں سے گفتگو کا موقع ملا۔ ایک دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں اور ایک سیاسی شخصیتوں میں۔ ایک کا تعلق بہار سے اور دوسرے کا تعلق یوپی سے ہے۔ دونوں کانگریس آئی سے منسلک ہیں اس کانگریس سے جس کی بانی و مبانی اندرا گاندھی تھیں ان دونوں کا کہنا یہ تھا کہ بھارت میں پندرہ کروڑ نہیں بلکہ اٹھارہ کروڑ مسلمان ہیں۔ بہر کیف پین اسلامزم ہندو کے لئے سب سے بڑا ہوّا تھا۔ بھارت چونکہ شروع ہی سے جنوبی و سطی ایشیا کی سپر پاور بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ اس علاقے پر بالادستی چاہتا ہے۔ لہٰذا اسے خوب معلوم ہے اس کے اس خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ پاکستان ہے۔

اس اعتبار سے غور کیجئے کہ آج ہمارا حال کیا ہے! اب مسلم قومیت کے نعرے میں کوئی جاذبیت نہیں رہی۔ وہ کھوکھلا نظر آنے لگا ہے۔ اندرا گاندھی کا قول میں آپ کو سنا چکا ہوں جو اس نے سقوط مشرقی پاکستان کے بعد کہا تھا کہ ہم نے دو قومی نظریئے اور خاص طور پر مسلم قومیت کے نظریئے کو غلط ثابت کر دیا۔ اندرا گاندھی کی بات کو چھوڑیئے اسے تو یہ کہنا ہی تھا۔ لیکن یاد کیجئے کہ سقوط مشرقی پاکستان کے بعد ڈاکٹر کمال حسین نے جو بنگلہ دیش کے پہلے وزیر خارجہ بنے تھے کہا تھا کہ اگرچہ دنیا کے تمام مسلمان ممالک میں آبادی کے اعتبار سے بنگلہ دیش میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے...... (میں نہیں کہہ سکتا کہ حقیقت کے اعتبار سے ان کا

یہ دعویٰ صحیح تھا یا غلط) اس کے باوجود ہم یہ پسند نہیں کریں گے کہ بنگلہ دیش کو مسلم ملکوں میں شمار کیا جائے۔ انہوں نے صرف پاکستان سے ہاتھ نہیں دھوئے تھے بلکہ کم از کم ڈاکٹر کمال کے قول کی حد تک یا جو لوگ اس وقت بر سر اقتدار تھے ان کی سوچ کی حد تک انہوں نے "مسلم قومیت" سے بھی استعفیٰ دے دیا تھا تاہم مجھے یقین ہے کہ وہاں کے عوام کی عظیم اکثریت کی یہ سوچ ہر گز نہیں ہو سکتی۔

علاقائی عصبیتوں کا عفریت

دوسری بات یہ ہے کہ آج سے قریباً سولہ سترہ سال قبل جو حالات مشرقی پاکستان کے سقوط کا سبب بنے تھے کم و بیش وہی حالات اس وقت کے پاکستان میں نظر آ رہے ہیں۔ علاقائی عصبیتوں کی وجہ سے مسلم قومیت کے قلعہ میں روز بروز نئے نئے شگاف پیدا ہو رہے ہیں۔ علاقائی عصبیتوں کے عفریت کی گرفت روز بروز مضبوط سے مضبوط ہوتی نظر آ رہی ہے ہم عرصے سے جی ایم سید کی ہرزہ سرائی پر ماتم کناں تھے کہ وہ کھلم کھلا کہہ رہے تھے کہ ہمارا قومی ہیرو راجہ داہر ہے۔ محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کو انہوں نے ڈاکو اور لٹیرا قرار دیا تھا۔ اور صرف زبانی کلامی نہیں بلکہ ان کے لٹریچر میں جابجا یہ باتیں کہی گئی ہیں اور یہ لٹریچر بہت بڑے پیمانے اور منظم طور پر قدیم سندھیوں کی نئی نسل میں پھیلایا جا رہا ہے۔ اس میں صرف سندھی قومیت ہی کا پرچار نہیں ہے بلکہ اسلام پر بھی بڑے ظالمانہ انداز سے حملے کیے جا رہے ہیں۔ لیکن اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ پنجاب میں بھی ایک شخص کو یہ کہنے کی جرات ہوئی کہ "ہمارا اصل ہیرو رنجیت سنگھ ہے۔ اور محمود غزنوی سے لے کر احمد شاہ ابدالی تک سب لٹیرے تھے"۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ؎

"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

ہماری بے حسی

تینتیس پینتیس ۳۵ سال سے سندھ میں موجود پاکستان ہی میں اسلام دشمن عناصر جس طرح کی فکری گمراہیوں کا پرچار کرتے آ رہے ہیں وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ لیکن ہماری بے حسی کا عالم یہ ہے کہ نہ ہمارے اخبارات و رسائل نے اس ہرزہ سرائی کا کوئی نوٹس لیا اور نہ کسی بھی دور کے بر سر اقتدار طبقے نے۔ بلکہ اس دوسرے طویل ترین مارشل لاء کے دور میں تو جی ایم

سید کی خوب پذیرائی ہوئی۔ اس طرح ان کو اپنے پاکستان اور اسلام دشمن نظریات کے پرچار کی کھلی چھٹی مل گئی۔ اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ اب ان پر ہاتھ ڈالنا' ان پر مقدمہ چلانا کوہ ہمالیہ کی کسی چوٹی کو سر کرنے سے زیادہ جان جوکھوں کا معاملہ بن گیا ہے۔ حکومت ان کے خلاف کوئی اقدام کرنے سے انتہائی خوف زدہ ہے۔ اسے یہ خطرہ اور اندیشہ لاحق ہے کہ ایسے کسی اقدام سے سندھ میں بدامنی کا ایسا خوفناک آتش فشاں پھٹ سکتا ہے۔ جو کسی وقت بھی خانہ جنگی کی صورت اختیار کر سکتا ہے جس کے باعث بھارت کو فوجی مداخلت کا بہانہ ہاتھ آسکتا ہے۔ ان تمام باتوں کو جو حضرات تفصیل سے سمجھنا چاہیں ان کو میں مشورہ دوں گا کہ وہ میری کتاب "استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ" کا مطالعہ کریں۔ میرے تجزیوں میں کوئی غلطی پائیں تو مجھے دلائل کے ساتھ مطلع کریں۔ ایسے حضرات مجھے اپنی رائے اور تجزیوں پر نظر ثانی کے لئے ہر وقت آمادہ پائیں گے انشاء اللہ العزیز۔

سندھ کی صورت حال۔ پیچ در پیچ خرابیاں

کراچی میں ۸۰ء کے قریباً وسط میں جو حالات رونما ہوئے تھے ان پر مجھے جو شدید صدمہ ہوا تھا' اسے میرا دل جانتا ہے اور میرا اللہ جانتا ہے۔ میں آپ کو بتا دوں کہ اب کراچی کے معاملات بڑے دگرگوں ہو چکے ہیں مسائل اتنے پیچ در پیچ ہیں کہ جیسے ایک پیچ (SCREW) ہوتا ہے جو ہر حرکت کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اس لئے کہ اس میں چکر کھانے کی صلاحیت ہے۔ آپ اسے ذرا دبائیں گے تو وہ آگے بڑھے گا۔ وہ اسی 'SPIRAL' کے ذریعہ سے اندر گھستا چلا جاتا ہے۔ اسی طریقہ سے آپ نے 'VICIOUS CIRCLE' کی اصطلاح سنی ہو گی۔ جس کا مفہوم ہے ایک چیز کا دائرہ میں گھومنا گردش کرنا۔ ایک خرابی دوسری خرابی کو جنم دیتی ہے۔ پھر وہ خرابی مزید خرابی کو پیدا کرتی چلی جاتی ہے یا پھر پہلی خرابی ہی کو اور شدید بنا دیتی ہے۔ **یہ کیفیت اگر آپ کو دیکھنی ہے تو سندھ، خاص طور پر کراچی کے حالات کو دیکھ لیجئے اور ان کا تجزیہ کر لیجئے۔**

اس کی دو مثالیں آپ کو دے دوں میں نے قریباً دو سال پہلے جب اندرون سندھ کچھ علاقوں کا دورہ کیا تھا تو میری گھوٹکی میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جن کا نام ماسٹر اللہ رکھا ہے۔

معمر ہیں، سفید ریش ہیں۔ تحریک پاکستان کے بڑے پرجوش اور فعال کارکن رہے ہیں۔ اب ایسے بہت سے لوگ مایوس ہو کر کونے کھدروں میں بیٹھ گئے ہیں۔ اب انہیں تمغوں کا لالچ دے کر ڈھونڈنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ کوئی بھی مخلص آدمی تمغوں کے لالچ میں آگے آنا پسند نہیں کرے گا۔ وہ لوگ تو مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو گئے ایسے لوگوں کو تلاش کرنے کے لئے کسی دوسرے مؤثر ذریعہ کی ضرورت ہے۔ بہرحال یہ بات برسبیل تذکرہ درمیان میں آگئی۔ ذکر ہو رہا تھا ماسٹر اللہ رکھا صاحب کا۔ جو قدیم سندھی ہیں۔ انہوں نے ایک بات مجھے بتائی جس سے اس نوع کے دائرے (VICIOUS CIRCLE) کا تصور میرے سامنے آیا۔ انہوں نے بتایا کہ ڈھرکی میں ایک بہت بڑا کھاد بنانے کا کارخانہ لگا۔ جس میں اغلباً سعودی عرب کا بھی سرمایہ ہے۔ اس کارخانہ میں تمام مزدور (LABOUR) مقامی سندھیوں میں سے لئے گئے۔ لیکن پھر وہاں ٹریڈ یونینز کی کارروائی شروع ہوئی اور اس نے جلد ہی سندھی اور غیر سندھی کی کشمکش کا رخ اختیار کر لیا اس لئے کہ انتظامی سطح پر زیادہ تر نئے سندھی (مہاجرین) اور پنجاب کے لوگ تھے۔ سندھی مزدوروں نے ہڑتال کر دی اور کارخانہ بند ہو گیا۔ کارخانہ میں بہت بڑی سرمایہ کاری کی ہوئی تھی، جس میں کافی حصہ بیرونی سرمایہ کا شامل ہے۔ انتظامیہ کو کارخانہ چلانے کے لئے مجبوراً یہ کرنا پڑا کہ انہوں نے پنجاب سے لیبر بلالی۔ اس کے نتیجہ میں وہاں جو سندھی نیشنلسٹ تھے انہوں نے اس کو بطور دلیل خوب استعمال (EXPLOIT) کیا کہ دیکھو ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ یہ کارخانہ سندھ میں لگاتے ہیں تو ان کے لئے مزدور بھی پنجاب سے لے کر آتے ہیں۔ یہ روز روشن والی حقیقت ہے۔ اب اس کی نفی کون کرے گا! کہا جائے گا کہ کارخانہ میں جاکر دیکھ لو کہ کون لوگ کام کر رہے ہیں! کیا مقامی سندھی کر رہے ہیں یا پنجابی مزدور لگے ہوئے ہیں! کس کو غرض پڑی ہے کہ وہ صحیح حالات معلوم کرے۔ اس نوع کے واقعات کو نفرتیں پیدا کرنے کے لئے 'EXPLOIT' کیا گیا اور اس طرح عصبیتوں کے عفریت نے جب سر اٹھایا تو اس کے نتیجہ میں ایک خرابی کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری خرابی پروان چڑھتی چلی جارہی ہے۔

دوسری مثال کراچی کی ہے یاد کیجئے وہاں قریباً ایک ڈیڑھ ماہ قبل کیا ہوا تھا! جس کے نتیجہ میں

وہاں کے حالات روز بروز بگڑتے چلے گئے اور تا حال قابو میں نہیں آتے ہیں۔ کراچی کے قریباً
نصف حصہ پر کرفیو نافذ ہے۔ شہری زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ کروڑوں روپے کے
کاروبار کا روزانہ نقصان ہو رہا ہے۔ اس خوفناک صورت حال کی ابتداء کے متعلق آپ نے
اخبارات میں پڑھا ہو گا۔ لیکن اخباروں میں پوری تفصیل نہیں آتی۔ اس بگاڑ کی شروعات کے
متعلق میرے علم کی حد تک یہ بات ہے۔ کہ وہاں کی ایک گنجان اور اہم بستی کی مقامی آبادی
اور پولیس کے مابین تصادم سے صورت بگڑی۔ یہ بھی خبریں ملی ہیں کہ پولیس نے لوٹ مار کی
اور اس نے بڑی بے دردی کے ساتھ فائرنگ کی اور لوگوں کو قتل کیا۔ یہ بات وہاں کے لوگ
برملا بیان کر رہے ہیں۔ اس میں کتنی صداقت ہے اور کتنی نہیں واللہ اعلم۔ لیکن یہ اپنی جگہ
حقیقت ہے کہ کراچی کی پولیس میں پنجابیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ لہٰذا ہو کیا رہا ہے! فرض کیجئے
کہیں کوئی سیاسی مظاہرہ یا کوئی ہنگامہ ہوتا ہے اور پولیس اس پر قابو پانے اور اسے فرو کرنے کے
لئے وہاں پہنچتی ہے۔ اب اس مجمع کے اندر کچھ تخریب کار بھی موجود ہیں۔ انہوں نے نشانہ لیا
اور دو چار پولیس والے مار دیئے حالانکہ وہاں پولیس آئی تھی نظم و نسق کو بحال رکھنے کے لئے۔
لیکن جب مجمع میں سے ان چند مخصوص تخریب کاروں نے جن کا مقصد ہی عوام اور پولیس میں
تصادم کرانا تھا پولیس کے خلاف اقدام کیا اور فائرنگ کھول دی تو ظاہر بات ہے کہ اس کا نتیجہ
پولیس کی طرف سے ردِ عمل کی صورت میں ظاہر ہو گا اور پھر ردِ عمل کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع
ہو جائے گا اور یہ ہنگامے عوام VERSES (بمقابلہ) پولیس رخ اختیار کر لیں گے۔
اور چونکہ جیسا کہ واقعہ ہے کہ پولیس میں زیادہ نفری پنجابیوں کی ہے اور عوام کی اکثریت
مہاجرین پر مشتمل ہے لہٰذا بڑی عیاری سے تخریبی عناصر کی جانب سے پنجابی مہاجر تصادم کا رنگ
دے دیا جاتا ہے۔ چنانچہ فی الوقت کراچی میں صورت حال یہ بن گئی ہے کہ وہاں کی مہاجر
آبادی کی عظیم اکثریت کی نفرتوں اور عصبیتوں کا رخ بڑی چالاکی سے پنجابیوں کے خلاف موڑ
دیا گیا ہے۔

پھر اندرون سندھ ان پنجابی آباد کاروں کے خلاف قریباً تیس سال سے تحریک موجود ہے۔
جنہوں نے وہاں محنت سے ان بنجر زمینوں کو زرخیز بنایا۔ جن کے لئے مختلف ڈیموں کے ذریعہ
سے پانی فراہم کرنے کا انتظام ہوا۔ ان زمینوں کی تقسیم میں یقیناً کچھ ناانصافی ہوئی ہے اس کے

ذمہ دار وقت کے حکمران رہے ہیں لیکن اس کو باقاعدہ پنجاب کے خلاف مقدمہ بنا کر پنجابیوں کو ہی نفرتوں اور عصبیتوں کا ہدف بنالیا گیا ہے اس سلسلہ میں حال ہی میں قتل کے چند واقعات بھی ہوئے ہیں' اس کے اثرات اندر ہی اندر سلگ رہے ہیں۔

صورت حال کی تشخیص

اس نہایت تشویش ناک صورت حال کی تشخیص کیجئے تو اسے دینوی نقطہ نظر سے ان بے تدبیریوں کا نتیجہ قرار دیا جائے گا جو ہر دور کی وفاقی اور صوبائی حکومتوں سے سرزد ہوئی تھیں لیکن اگر اس کی تشخیص قرآن مجید کی روشنی میں کی جائے اور آپ میرا معاملہ تو جانتے ہیں کہ میرا رہنماء میرا رہبر تو قرآن مجید ہی ہے۔ قرآن مجید سے تشخیص کیجئے تو یہ دراصل اس وعدے کی خلاف ورزی کی سزا ہے جو ہم نے اجتماعی طور پر اللہ سے کیا تھا۔ قرآن مجید میں اللہ کا یہ قانونی بیان ہوا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ کا ہر قانون اٹل ہے۔ سورہ توبہ میں صراحت سے آیا ہے کہ وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ "مسلمانوں میں سے کچھ لوگ تھے جنہوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اللہ ہمیں اپنے فضل سے نوازے گا۔ ہمیں غنی کر دے گا' ہمیں دولت مند کر دے گا تو ہم لازماً صدقہ کریں گے' خیرات کریں گے اور ہم بڑے نیکو کار اور صالح بن جائیں گے۔" آگے ارشاد ہوتا ہے۔ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَ تَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ اور جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا کیا' ان کو غنی کر دیا۔ تو وہ بخل پر اتر آئے۔ اب اس مال و دولت کو جو اللہ نے اپنے فضل خاص سے ان کو عطا کی تھی سینت سینت کر اور سنبھال سنبھال کر رکھ رہے ہیں اور اپنے عہد سے ایسے پھرے کہ انہیں اس کی پرواہ تک نہیں ہے۔ پس اس وعدہ خلافی اور عہد شکنی کی وجہ سے جو انہوں نے اللہ سے کی اور اس جھوٹ کی وجہ سے وہ بولتے رہے اللہ کی طرف سے اس کو یہ سزا ملی کہ ان کے دلوں میں یوم القیامہ تک کے لئے نفاق ڈال دیا گیا۔ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ○ "...... آخرت میں منافقین کو جو سزا ملے گی آپ کو معلوم ہے کہ وہ یہ ہے کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ...... منافق تو آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔ لیکن دنیا میں ان کو یہ سزا ملی

کہ نفاق ان کے دلوں میں پیدا کر دیا گیا

عہد شکنی کی سزا

معلوم ہوا کہ اللہ سے کیے گئے وعدے کی خلاف ورزی، عہد شکنی اور کذب بیانی پر اس دنیا میں نقد سزا یہ ملتی ہے کہ پھر ایسے لوگوں کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا جاتا ہے۔ یہ نفاق ہے جو ہمارے یہاں دو صورتوں میں ظاہر ہوا۔ ایک اخلاق کا دیوالیہ پن، جو پوری شدت سے ہماری قوم پر مسلط ہے۔ ہمارے بنیادی اخلاق کا سرمایہ تباہ ہو گیا ہے۔ دیانت، شرافت، امانت، صداقت کی اقدار کا جنازہ نکل چکا۔ رشوت کا معاملہ یہ ہو چکا ہے کہ پہلے صرف کمتر اور نیچے کے طبقے کے اہل کار لیا کرتے تھے۔ اب ایک بہت بڑے کاروبار کی شکل میں رشوتوں کے سودے ہوتے ہیں، حتیٰ کہ وہ لوگ جو حکومت کے اعلیٰ ترین مناصب پر بطور ملازم فائز ہیں اور بعض وہ لوگ جن کا شمار ملک کی نہایت ممتاز اور نمایاں سیاسی شخصیتوں میں ہوتا ہے کروڑوں روپے کی رشوت کے لین دین میں ملوث پائے گئے ہیں۔ ملک کے اخبارات و جرائد میں بھی تذکرے آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مجھ سے زیادہ تو ان چیزوں سے وہ لوگ واقف ہوں گے جو باقاعدگی سے اخبار و جرائد کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ حضرات اس بات کو خوب جانتے ہیں چونکہ بہت سے واقعات کے تو بڑے ممتاز لوگوں کے ناموں کے ساتھ اخبارات و رسائل میں تذکرے آئے ہیں۔ کم از کم ایک واقعہ کا ذکر کر دیتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ کراچی میں ہیروئن اور اسمگل شدہ نہایت مہلک ہتھیاروں پر قبضہ کرنے کے لئے سہراب گوٹھ پر آپریشن ہوا تھا تو اس کے متعلق بعد میں اخبارات نے صاف صاف طور پر لکھا تھا کہ اس آپریشن کے پورے منصوبے کا علم حکومت سندھ کے صرف چار ذمہ دار ترین اشخاص کو تھا۔ لیکن اس منصوبے کی تفصیلات وہاں ناجائز کاروبار کرنے والوں کو پہلے سے معلوم ہو گئی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے نہایت تیزی کے ساتھ غیر قانونی مال کا بہت کثیر حصہ وہاں سے منتقل کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آپریشن بری طرح ناکام ہوا۔ اس راز سے آج تک پردہ نہیں اٹھ سکا کہ مخبری کرنے والا کون تھا! حالانکہ وہ ان چار ذمہ داروں میں سے کوئی ایک ہی ہو سکتا ہے۔ کراچی میں یہ بات زبان زد عام ہے کہ کروڑوں کی رشوت لے کر اس ناجائز کاروبار کے کرتا دھرتا، لوگوں نے مہاجرین کی بستیوں پر جو قیامت صغریٰ ڈھائی اس کے بھیانک واقعات سن کر سخت سے سخت دل سے بھی خون کے آنسو بہہ نکلے۔ یہ ہمارے اخلاق کا حال ہے جو ہمارے

لئے انتہائی تباہ کن ہے۔ کسی قوم کے زندہ رہنے کے لئے وہ چاہے کافر ہو چاہے مسلم' بنیادی انسانی اخلاق کا کچھ نہ کچھ سرمایہ لازم ہے۔ یہ نہ ہو تو اس قوم کا سفینہ ڈوب کر رہتا ہے۔ وہ قوم آج نہ ڈوبی تو کل ڈوبے گی اگر اس کے اندر عدل نہیں' انصاف نہیں' اصول پسندی نہیں' انسانی ہمدردی نہیں' حقدار کو حق پہنچانے کا مادہ نہیں' فرض شناسی نہیں' اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا احساس نہیں' تو اس قوم کی کیفیت ریت پر بنائے ہوئے محل کی سی ہے جو ہوا کے ایک معمولی تھپیڑے سے بکھر کر رہ جاتا ہے۔ یہ صورت حال ہے جس سے قومی سطح پر ہم دوچار ہیں۔

دوسری طرف نفاق و افتراق ہے اس سے پوری قوم دوچار ہے۔ اردو میں نفاق کا لفظ باہمی افتراق کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ قومی سطح پر' یہ انتشار' یہ باہمی نفرتیں' یہ کدورتیں' یہ عداوتیں اور خانہ جنگی دراصل عذاب کی وہ صورت ہے جس کا سورہ انعام میں ذکر کیا گیا ہے فرمایا۔ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ط۔ "اے نبی ان سے کہہ دیجئے کہ اللہ اس پر قادر ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے کوئی عذاب نازل کر دے یا تمہارے قدموں تلے سے کوئی عذاب نکال دے اور یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر دے اور چکھا دے تم میں سے بعض کو بعض کی قوت اور لڑائی کا مزا ۔" یہاں اللہ تعالٰی نے تین قسموں کے عذاب کا ذکر کیا ہے۔ ایک عذاب اوپر سے آتا ہے۔ یہ اوپر کا عذاب کیا ہے! تیز اور طوفانی آندھیاں' آسمانی بجلی کا گرنا۔ کثرت سے بارشوں کا ہونا۔ یا بارش کا رک جانا اور قحط کی صورت حال پیدا ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔ اور ایک عذاب وہ ہے جو قدموں تلے سے آتا ہے مثلاً زلزلے' سیلاب' آتش فشاں کا پھٹ جانا۔ سائیکلون یعنی سمندری طوفانوں کا ساحل پر یلغار کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اور تیسری قسم کا عذاب وہ ہے جس کی زد میں اس وقت ہم فی الواقع آئے ہوئے ہیں۔ اور اسی عذاب کی طرف سے آپ کی توجہ مبذول کرانے کے لئے میں نے یہ آیت آپ کو سنائی ہے یعنی یہ کہ قوم گروہوں میں تقسیم ہو جائے اور باہم دست و گریبان ہو جائے۔ گروہوں میں تقسیم کی بہت سی سطحیں ہیں۔ یہ مذہبی سطح پر بھی ہو سکتی ہے' فرقہ واریت کی سطح پر بھی یہ تقسیم ہو سکتی ہے۔ یہ گروہی تقسیم' قبائلیت' صوبہ واریت' نسلیت' لسانیت کی بنیادوں پر بھی ہو سکتی ہے۔ اللہ کی نافرمانیوں کی پاداش میں

ان گروہوں کا ایک دوسرے سے متصادم ہو جانا اور قوت کا بے دریغ استعمال ہونا عذاب خداوندی کی بدترین شکل ہے۔ اللہ کو نہ اوپر سے اور نہ نیچے سے کسی عذاب کو بھیجنے کی ضرورت ہے۔ مختلف گروہ آپس ہی میں دست و گریبان ہو جائیں۔ یہ عذاب کی وہ صورت ہے جو ہم پر پورے طور پر مسلط ہے۔ اس وقت کراچی 'جو عروس البلاد کہلاتا ہے وہاں امن و سکون تہہ و بالا ہو چکا ہے۔ پورے شہر پر خوف کی کیفیت طاری ہے۔ کسی کو چین میسر نہیں۔ ایک طرف آپس میں مختلف گروہوں میں مسلح اور خونیں تصادم کے واقعات کی بھرمار ہے دوسری طرف بیرونی تخریب کاریوں کا خطرہ مسلط ہے۔ یہ صورت حال ہر محب وطن کے لئے انتہائی تشویش ناک ہے۔

اب ذرا یہ جائزہ بھی لے لیجئے کہ وہ عہد شکنی کون سی تھی جس کے ہم بحیثیت قوم مرتکب ہوئے۔ وہ کیا کفران نعمت تھا جس کا ہم سے صدور ہوا۔

سورہ ابراہیم میں فرمایا گیا۔ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ○ "اگر تم شکر گزاری کی روش اختیار کرو گے تو میں تمہیں مزید نعمتوں سے نوازوں گا لیکن اگر تم نے ناقدری کی تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔" اللہ نے ہمیں آزادی دی تھی۔ سلطنت خداداد پاکستان دنیا کی عظیم ترین مسلمان مملکت تھی جو ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو معرض وجود میں آئی۔ جو دو بڑے بڑے خطوں پر مشتمل تھی۔ ایک پر امنگ اور ولولوں سے سرشار قوم اس میں آباد تھی۔ جو لوگ منقسم بھارت کے علاقوں سے آئے تھے وہ مستقبل کے بڑے سہانے خواب لے کر آئے تھے کہ پاکستان میں ایک نیا نظام ہو گا۔ وہاں ایک نئی دنیا بسائیں گے۔ بقول قائد اعظم مرحوم کہ!

"ہم عہد حاضر میں پوری دنیا کے لئے اسلام کے اصول حریت و اخوت و مساوات کا پاکستان میں ایک نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اسے روشنی کا مینار (LIGHT HOUSE) بنائیں گے۔ دنیا کی قومیں نظام عدل اجتماعی کی تلاش میں بھٹک رہی ہیں' نئے نئے تجربات کر رہی ہیں اور ٹھوکریں کھا رہی ہیں۔ ہمارے پاس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کردہ وہ امانت ہے جو انسان کے عدل و قسط کے نظام انفرادی و اجتماعی کی ضمانت دیتا ہے۔ اب ہم کوشش کریں

گے کہ اس امانت سے خود بھی متمتع ہوں اور دنیا کے سامنے بھی اسے پیش کریں۔"

لیکن اس کے بعد جب ہم نے ناشکری کی' کفران نعمت کی روش اختیار کی' ہم نے حقیر سے دنیاوی عیش و آرام اور ترقی کے عوض اپنے اس عہد کو فراموش کر دیا کہ ہم پاکستان کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارہ بنائیں گے۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ۔ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَناً قَلِیْلاً۔ "میری آیات کو معمولی قیمت پر نہ بیچو۔" یعنی ان کی صحیح قدر و قیمت کو سمجھو' جانو پہچانو اور ان کا حق ادا کرو۔ اسی طریقہ سے ہم نے آزاد و خود مختار پاکستان جیسی بڑی نعمت کی صرف یہ قیمت لگائی کہ دنیا کی کچھ سہولتیں حاصل کر لیں' کچھ جائیدادیں بنالیں' کچھ کارخانے اور فیکٹریاں لگالیں۔ دنیوی ترقی ہو جائے۔ ہمارے یہاں چمک دمک نظر آئے۔ دنیوی تعیش سے ہم بھی کچھ شاد کام ہو سکیں گے۔۔ جب ہمارا ہدف اور ہمارا مطلوب (GOAL) اتنا نیچے آ گیا' جب ہماری منزل مقصود نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو ہم پر اللہ کا یہ قانون لاگو ہو گیا۔ لَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ۔ "اگر تم کفران نعمت کرو گے تو پھر میرا عذاب بھی بہت سخت ہے۔"

آج ہم کفران نعمت کی پاداش میں دو طرفہ عذاب خداوندی کے حصار میں ہیں۔ دو طرفہ عذاب کو پھر سمجھ لیجئے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ بھارت بھی دو طرفہ یعنی شمال بعید اور جنوب کی جانب سے ہمیں نرغہ میں لینے کے منصوبے بنا رہا ہے اور روس اور افغانستان کی کٹھ پتلی حکومت بھی ہمیں شمال و جنوب سے اپنے گھیرے میں لینے کی تدبیریں کر رہی ہے۔ اسی طرح ہماری بدعہدی' وعدہ خلافی اور ناشکری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا عذاب بھی ہم پر دو طرفہ آیا ہے۔ ایک وہی جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں یعنی اخلاق کا دیوالہ۔ جسے حدیث میں نفاق عملی قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ 'ایۃ المنافق ثلاثۃ اذا حدث کذب واذا وعد اخلف واذا اؤتمن خان۔ "منافق کی نشانیاں تین ہیں۔ جب بولے جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے خلاف ورزی کرے اور جب اسے امین بنایا جائے خیانت کرے۔" یہاں تک صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ ایک ہیں۔ البتہ مسلم شریف کی روایت میں ان الفاظ کا اضافہ ہے کہ۔

ان صلّٰی وَ صَامَ وَ زعمَ انه مسلم۔ "چاہے وہ نماز پڑھتا ہو' روزے رکھتا
اور اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو اور پورا یقین رکھتا ہو کہ میں مسلمان ہوں۔ " جس میں بھی یہ
ن نشانیاں ہیں تو وہ منافق ہے دوسری حدیث حضرت عبداللہ ابن عمر ابن العاص رضی اللہ تعالیٰ
نہا سے مروی ہے اور وہ اور بھی لرزا دینے والی ہے۔ یہ بھی متفق علیہ روایت ہے۔ حضورؐ
ماتے ہیں۔ " اربع من کن فیه کان منا فقا خالصا۔ " چار چیزیں
ی ہیں کہ اگر کسی شخص میں وہ چاروں پائی جائیں تو وہ خالص منافق ہے۔ " ان میں سے تین تو
ی ہیں جو پہلی حدیث میں آپؐ نے بیان فرمائیں اور چوتھی یہ کہ "اذا خاصم فجر"
جنی کہیں اختلاف ہو جائے تو آپے سے باہر ہو جائے' گالم گلوچ پر اتر آئے' فوراً خنجر اور تلوار
ں آئیں۔ ہمارے یہاں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ کہیں کوئی جھگڑا ہوا۔ یا کہیں کسی منی بس سے
ئی حادثہ ہوا تو یہی نہیں کہ صرف اس کو جلا دیا جائے۔ بلکہ جب تک سات آٹھ بسیں' بہت
ں موٹر کاریں اور اسکوٹرز نہ جلا دیئے جائیں ٹھنڈک نہیں پڑتی۔ یہ سب کیا ہے! آپے سے
ہر ہو جانا' پھٹ پڑنا ہے۔ جذبات کا طوفان اتنی شدت سے اٹھتا ہے کہ آدمی اس کے ہاتھوں
ھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جس میں یہ چار خصلتیں ہیں
خالص اور کٹر منافق ہے۔ اور اگر کسی میں ایک خصلت ہے تو اس کے اندر اسی درجہ میں نفاق
وجود ہے' جب تک وہ اپنی اس خصلت و کیفیت سے خود کو پاک نہیں کر لیتا۔ ایک طرف یہ
ملاقی زوال ہے۔ اور یہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں وعدہ خلافی اور عہد شکنی کی سزا کے طور پر
ذاب خداوندی کی ایک شکل ہے۔

اور اس کفران نعمت کی دوسری سزا' جس کا حوالہ میں پہلے دے چکا ہوں' مختلف نوع کی
صیبتوں اور باہم تصادم کی شکل میں ہم پر مسلط ہے۔ کہ ہم ہی میں سے بعض کے ہاتھ ہیں اور
ض کے گریبان ہیں۔ یہ خون کی ہولی جو کھیلی جا رہی ہے اس کے کردار کون ہیں۔ ہم ہی میں
ے کچھ لوگ ہیں جو اپنوں کے خون سے ہاتھ رنگ رہے ہیں۔ مختلف نوعیت کے یہ عذاب ہیں
ن کی گرفت میں ہم آئے ہوئے ہیں۔ لیکن مجھے بڑے دکھ کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ
س خوفناک صورت حال کا صحیح صحیح ادراک و شعور نہ ہمارے برسراقتدار طبقے کو ہے' نہ دانش
روں کو' نہ اخبارات و جرائد کو حتیٰ کہ نہ ہمارے علمائے کرام کو۔ الا ماشاء اللہ۔ قریباً یہ تمام

طبقے ان معاملات کو محض ہنگامی نوعیت کے واقعات سمجھ رہے ہیں اور کوئی ٹھوس قدم اٹھانے کی بجائے اکثر و بیشتر محض وعظ و نصیحت پر مبنی چند بیانات دینے یا فساد زدہ علاقوں میں مختلف انواع کا امدادی سامان پہنچا کر مطمئن ہیں کہ وہ قومی فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ حالانکہ ان واقعات و حالات کے اسباب و علل کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ جس میں سے اہم ترین سبب کا میں قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے اس اجتماعی عہد کی خلاف ورزی کہ۔ " پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ " ہم نے سلطنت خداداد میں اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کے لئے پیش قدمی کی بجائے ان چالیس سالوں میں انفرادی و اجتماعی دونوں سطحوں پر پسپائی اختیار کئے رکھی ہے۔ جس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں اور قومی سطح پر ہمارا حال یہ ہے کہ فی الواقع، کہ ہم آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے ہیں اور اس میں گرا ہی چاہتے ہیں

صحیح علاج اور کرنے کے اصل کام

سوال یہ ہے کہ اس حولناک، مہیب اور خطرناک صورت حال سے بچنے کی شکل کیا ہے! بچاؤ کا راستہ کون سا ہے!! آپ حضرات نے ہماری تنظیم اسلامی کا کوئی نہ کوئی کتابچہ ضرور دیکھا ہو گا۔ ہم تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت کے تعارف کے لئے ایک عبارت استعمال کرتے ہیں وہ ہے۔ " تجدید ایمان ۔ توبہ ۔ تجدید عہد ۔ " آج ۱۴ ر اگست کو یوم استقلال کے ضمن میں اخبارات میں بڑے بڑے لوگوں کے کئی پیغامات آپ حضرات نے پڑھے ہوں گے۔ اس ضمن میں میرا احساس یہ ہے کہ۔

" آج کا دن در حقیقت تجدید عہد کا دن ہے۔ "

ہمارے نزدیک تجدید عہد ہی کا نام توبہ ہے، اور یہی تجدید ایمان کی بنیاد ہے۔ آج سب سے اہم ضرورت اس کی ہے کہ ہم قومی سطح پر پھر اپنے یقین کو تازہ کریں۔ پھر اپنے عزم کو تازہ کریں۔ پھر باری تعالیٰ کی جناب میں توبہ کریں۔ پھر پلٹیں۔ پھر رجوع کریں۔ ؎

کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو

کبھی کبھی نسیان اتنا غالب ہو جاتا ہے کہ انسان اعلیٰ وارفع مقاصد سے غافل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر نیند کے ماتے بروقت جاگ جائیں۔ انہیں اپنی غلطیوں کا شعور وادراک ہو جائے' وہ خلوص واخلاص کے ساتھ اللہ کی جناب میں توبہ کریں تو اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے۔ سچی توبہ کرنے والوں اور سچے دل کے ساتھ پشیمان ہونے والوں کے لئے اس کی رحمت کا دامن بڑا کشادہ اور وسیع ہے۔ وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَ فَضْلاً وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ○۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے اجتماعی توبہ کی تھی اور اس اجتماعی توبہ کا نتیجہ کیا نکلا! پوری انسانی تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا کہ عذاب الٰہی کے آثار شروع ہو چکے تھے لیکن اجتماعی توبہ کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں مزید مہلت دے دی' عذاب ان سے پھیر دیا گیا۔ یہ بات بھی ہو سکتی ہے۔ اس واقعہ میں ہماری لئے امید افزا پیغام ہے۔ ؎

آج بھی ہو جو براہیم کا ایمان پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستان پیدا

آج کا دن دراصل جشن منانے کا دن نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہ ایک نوع کا یومِ تشکر ہے۔ جیسے میں نے قریباً دس روز قبل عیدالاضحیٰ کے موقع پر اپنی تقریر میں عرض کیا تھا ہمارے یہاں "عیدین" کا تصور کیا ہے! دونوں شکرانے کے دن ہیں۔ ہم اگر اپنی آزادی کا کوئی دن منائیں اور وہ بھی یوم تشکر بنے اور یوم تشکر ان دو آیات کے حوالے سے وَ مَنْ یَّشْکُرْ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ وَ مَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ○ اور لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ ○ اس کے حوالے سے آپ آج کی تاریخ کو یوم تشکر کی حیثیت سے سمجھیں۔ اور اس میں اپنے عہد کو تازہ کریں' اور تجدید ایمان کی جانب توجہ دیں تو یہ ہے وہ کام جو کرنے کا ہے۔

اجتماعی توبہ کی ضرورت

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ قومی سطح پر ہم جس عہد شکنی کے مرتکب ہوئے ہیں اس کا معاملہ اجتماعی نوعیت کا ہے۔ انفرادی توبہ بھی لازم ہے اگر کوئی حرام خوری ہو رہی ہے اس سے اپنے دامن کو پاک کرنا ہے۔ اگر دین سے روگردانی ہے' اس پر اللہ سے استغفار کر کے اپنے

رو یے کی اصلاح کرنی ہے۔ اگر ہم نے کہیں سنت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا دامن چھوڑ کر مغربی سنتوں کو اپنی معاشرت میں' اپنی تہذیب میں' اپنی وضع قطع میں اور اپنی نشست و برخاست میں اور اپنے تمدن میں اختیار کر رکھا ہے تو ان تمام چیزوں کو ترک کر کے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مضبوطی سے پکڑنا ہے۔ اس موقع پر مجھے ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ اگرچہ اس میں ایک غیر ثقہ لفظ ہے جس میں میں کچھ ترمیم کر رہا ہوں' لیکن شعر بڑا پیارا ہے۔ مولانا ظفر علی خان مرحوم فرماتے ہیں۔ ؎

تہذیبِ نو کے مونہہ پر وہ تھپڑ رسید کر

جو اس 'خبیث چیز' کا حلیہ بگاڑ دے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب تک ہم یہ رویہ اختیار نہیں کریں گے ہماری اصلاح ممکن نہیں۔ ہم تو ابھی تک اسی تہذیب کے چکر میں ہیں۔ علامہ اقبال نے ہماری اس روش ہی کو یوں بیان کیا ہے کہ ؎

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود !

یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود۔ !

اسی طرح ابلیس کی مجلس شوریٰ نامی نظم میں بالواسطہ طور پر علامہ مرحوم نے اپنا جو پیغام دیا ہے۔ اس میں بڑی خوبصورتی سے ہماری کیفیت کی نقشہ کشی کی ہے۔ ؎

جانتا ہوں میں یہ امتِ حاملِ قرآں نہیں

ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں

بے یدِبیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

ہم سب کو توبہ کرنی ہے۔ جو بھی اپنی جگہ پر جس اعتبار سے بھی دین سے روگردانی کیئے ہوئے ہے۔ اسے اپنی اصلاح کرنی ہے۔ ہم سب کو اپنے گریبانوں میں جھانکنا ہے۔ اپنے کردار پر کڑی تنقیدی نگاہ ڈالنی ہے۔ اپنی آمدنی اور اپنی کمائی کے ذرائع کو کھنگالنا ہے کہ کہاں اس میں ناجائز اور حرام کی آمیزش ہے!۔ پھر اللہ کی جناب میں خلوص سے توبہ کرنی ہے سورہ تحریم میں ارشاد ہوتا ہے يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَصُوحًا" اے اہل

ایمان ' اللہ کی جناب میں توبہ کرو اور یہ توبہ خالص توبہ ہو۔ خلوص دل اور اخلاص کے ساتھ توبہ ہو۔ اور خالص توبہ فی الاصل یہ ہے کہ غلط اور معصیت کے کاموں پر دلی پشیمانی ہو ' اس پر اللہ کے حضور میں اظہار ندامت ہو اور یہ عزم صمیم ہو کہ آئندہ اس معصیت ' اس برائی ' اس گناہ اس بدی کے پاس بھی نہیں پھٹکیں گے۔ یہ ہو گی انفرادی توبہ۔ اجتماعی توبہ کیسے ہو گی! اس کی واحد صورت یہ ہو گی کہ ہم فی الفور اپنے اس عہد کے ایفاء کی کوشش شروع کر دیں جس کی خلاف ورزی کی پاداش میں ہم پر عذاب الٰہی مسلط ہے۔ اور یہ اس طرح ممکن ہو گا کہ ہم وقت ضائع کئے بغیر اس ملک میں اللہ کی شریعت کو نافذ کریں ' اس نظام عدل و قسط کا نفاذ کریں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے رسولؐ کی وساطت سے عطا فرمایا ہے۔ گویا بالفاظ دیگر ہمیں اس مملکت خداداد پاکستان میں ' اسلامی انقلاب ' لانا ہو گا۔ اس کے بغیر اجتماعی توبہ کے کوئی معنی نہیں ہیں

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

ہمارا دین بھی اسلام ہے۔ ہمارا وطن بھی اسلام ہے ... پاکستان اسلام کے نام پر اور اسلام کے عملی نفاذ کے لئے قائم ہوا ہے۔ ہماری قومیت اسلام ہے۔ ہمیں اسلام کے حوالے سے اپنا قبلہ درست کرنا ہو گا۔ جب تک یہ نہیں ہو گا ہماری کوئی چول بھی فٹ نہیں بیٹھے گی اور ٹھیک نہیں ہو گی۔ ہمیں انفرادیت سے بات شروع کر کے ساتھ ہی ساتھ اجتماعیت یعنی اسلامی انقلاب کی طرف پیش قدمی کرنی ہو گی۔

رہا یہ سوال کہ اسلامی انقلاب کیسے آئے گا! تو یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ اس مسئلہ پر سالہا سال کے غور و فکر کا حاصل میں بارہا تفصیلاً بھی اور اجمالاً بھی آپ حضرات کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ "منہج انقلاب نبوی" کے نام سے میری وہ کتاب بھی شائع ہو چکی ہے جو اُن دس تقاریر پر مشتمل ہے جو میں نے اسلامی انقلاب کے موضوع پر مسجد دارالسلام میں کی تھیں۔ مختصراً یہ کہ ہمیں اسلامی انقلاب کے معاملے میں سیرت نبیؐ کی جانب رجوع کرنا ہو

گا۔ بقول اقبال ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

ہمیں تو خود کو پہنچانا ہے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں۔ لہٰذا ہمیں انقلاب کا طریقہ بھی انؐ سے سیکھنا ہو گا۔ ہم اگر کارل مارکس 'لینن سے یا ماؤزے تنگ سے یا کسی اور سے انقلاب کے طریقے سیکھیں گے اور ان کے طور طریقے اختیار کریں گے تو ہم اپنی منزل خود کھوٹی کر دیں گے۔ ہمیں تو سیرت ہی سے رہنمائی حاصل کرنی ہو گی کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے انقلاب برپا کیا! کیسے کایاپلٹ دی! اس لئے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان ہے کہ لا یصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا "اس امت کے آخری حصہ کی اصلاح نہیں ہو سکے گی مگر صرف اس طریقہ پر جس سے پہلے حصے کی اصلاح ہوئی تھی"

لمحۂ فکریہ

اب آگے آپ کا کام ہے 'غور و فکر آپ کو کرنا ہے۔ ایک ایک شخص کے لئے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ افراد الگ الگ رہ کر کوئی مؤثر کام نہیں کر سکتے اس بات کو گرہ میں باندھ لیجئے۔ قوموں کا معاملہ اجتماعی توبہ اور اجتماعی سعی و جہد سے طے ہوتا ہے انفرادی سے نہیں۔ ذرا پیچھے لوٹیے جہاں سے میں نے بات شروع کی تھی کہ جب بنی اسرائیل کو قتال کا حکم ملا اس وقت از روئے قرآن حضرت موسیٰؑ کے ساتھ 'حضرت ہارونؑ حضرت یوشع ابن نونؒ اور ایک اور ساتھی یعنی کم از کم چار ایسے اشخاص موجود تھے۔ جو حکم الٰہی کی تعمیل میں فلسطین کی فتح کے لئے تن من قربان کرنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن بقیہ پوری پوری قوم چونکہ آمادہ نہیں تھی 'اس نے کورا جواب دے دیا کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ ○ لہٰذا انقلاب پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ اور قوم کے اس کورے جواب اور اجتماعی بزدلی کے اظہار پر ان کو سزا دے دی گئی۔ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ ط ان کے لئے ارض مقدس چالیس برس تک کے لئے حرام کر دی

گئی اس عرصہ کے دوران وہ اسی صحرا میں بھٹکتے پھریں گے۔ آپ غور کیجئے کہ دو جلیل القدر پیغمبر موجود تھے۔ دو جاں نثار بھی ساتھ تھے۔ لیکن اس طور پر انقلاب نہیں آیا کرتا۔ یہ عظیم کام چند افراد کے کرنے سے نہیں ہوتا جب تک جمعیت نہ ہو...... جب تک امت مسلمہ پاکستان کی ایک قابل ذکر تعداد اس کام کے لئے کمربستہ نہ ہو جائے جب تک کہ وہ منظم ہو کر سمع وطاعت کے اسلامی اصولوں پر اس کام میں زندگیاں کھپانے کا بیڑانہ اٹھالے یہ کام ممکن نہیں۔ پھر اس اجتماعیت میں شریک ہر فرد جب تک آغاز کار اپنے گھر کے اندر اسلام کو نافذ نہیں کرے گا۔ اپنے وجود پر جب تک اسلام کے اوامر ونواہی کو جاری نہیں کرے گا۔ اپنے پیٹ' اپنے کام و دہن اور اپنے دوسرے جبلی داعیات اور تقاضوں کو اسلام کا پابند نہیں کرے گا اس وقت تک یہ کام نہیں ہو گا۔

آج کے دن کے متعلق اچھی طرح جان لیجئے کہ یہ جشن منانے کا دن نہیں ہے بلکہ اللہ کی جناب میں شکر ادا کرنے کا دن ہے کہ اس نے ہمیں ملک دیا۔ اب بھی اللہ کے فضل و کرم سے بہت بڑا ملک ہے۔ اس میں بے شمار قدرتی وسائل موجود ہیں اور اس کے عوام کے اندر بڑی قوتیں (POTENTIALITIES) ہیں۔ یہاں وہ کاشت کار موجود ہیں جو پوری دنیا سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔ ہمارے کاشت کاروں نے پاکستان ہی میں نہیں امریکہ اور کینیڈا میں جا کر اپنی مہارت کے شاندار مظاہرے کئے ہیں۔ آپ کی فوج دنیا کی بہترین فوجوں میں شمار ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے بھی زیادہ پیچھے نہیں رکھا ہے۔ چونکہ میرا امریکہ کئی بار جانا ہوا ہے میں نے دیکھا ہے کہ آج ہمارے ملک کے بہترین دماغ امریکہ کے کونے کونے میں موجود ہیں۔ حال ہی میں اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکا (.I.S.N.A) کی دعوت پر امریکہ کے ایک اہم مقام سانٹا کلارا جانے کا مجھے اتفاق ہوا تھا۔ وہاں مجھے بتایا گیا ہے کہ روس نے جن علاقوں کو خاص طور پر میزائلی حملوں کے لئے ٹارگٹ بنایا ہوا ہے اور نقشوں پر سرخ ڈاٹ لگا رکھے ہیں تاکہ اگر کبھی جنگ کی نوبت آجائے تو جس علاقے کو سب سے پہلے ہدف بنایا جانا مقصود ہے وہ یہی علاقہ ہے جہاں کمپیوٹر سے متعلق آج کل کی جو اعلیٰ ترین ٹیکنالوجی ہے، اس کی بڑی بڑی فیکٹریاں چل رہی ہیں اور ان فیکٹریوں میں کثیر تعداد میں پاکستانی نوجوان سائنس دان کام کر رہے ہیں۔ الغرض امریکہ میں آنے

والے پاکستان کے ہونہار و باصلاحیت تعلیم یافتہ جوانوں نے ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کے جھنڈے گاڑے ہیں۔

یہ ساری صلاحیتیں درحقیقت اللہ تعالیٰ کی عنایات ہیں۔ لیکن باہمی اختلافات' باہمی تصادم 'نفرتیں'' مذہبی عداوتیں' سیاسی رقابتیں یہ وہ چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کی نفی کرتی چلی جارہی ہیں۔ اس صورت حال کا مداوا کیا ہے!

ع "علاج اسکا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!"

یعنی اس کے لئے صحیح انسانی جذبہ درکار ہے۔ اس لئے کہ انسانی جذبے میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ انسانی جذبہ تاریخ کو شکست دے دیتا ہے۔ جغرافیے سے لڑ جاتا ہے وہ بڑے بڑے کارنامے کر کے دکھاتا ہے۔ اس سے معجزے صادر ہوتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لئے حقیقی جذبہ درکار ہے۔ اس انسانی جذبے کے ساتھ اسلامی جذبہ مل جائے تو نورٌ علیٰ نور اور "سونے پر سہاگہ" والا معاملہ ہو جائے گا۔ اللہ کی راہ میں ذوقِ شہادت وہ جذبہ ہے کہ جس سے زیادہ طاقت جذبے کا تصور ممکن نہیں۔ میں نے اپنی کتاب "استحکام پاکستان" میں تفصیل سے اپنا تجزیہ سامنے رکھا ہے کہ حقیقی انسانی جذبہ بھی ہمارے یہاں نہ نسل کی بنیاد پر پیدا ہو سکتا ہے 'نہ وہ ہمارے یہاں لسان کی بنیاد پر پیدا ہو سکتا ہے۔ رہا کسی قبائلی یا صوبائی عصبیت کا معاملہ تو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ وہ تو توڑنے والی چیز ہے۔ یہ بات بھی اچھی طرح جان لیجئے کہ ہمارے یہاں خالص وطن کے نام پر بھی یہ جذبہ بیدار نہیں ہو گا۔ پاکستان کا تصور پیش کرنے والا وطنیّت پر بڑی کاری ضرب لگا چکا ہے براہیمی ضرب ہے جو علامہ اقبال نے وطنیت کے نظریئے کے بت کے اوپر لگائی ہے۔ وطن کے بارے میں ان کا ارشاد تو یہ ہے کہ ۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

لہٰذا وطن کی دہائی کسی اور قوم کے لئے شاید جذبہ انگیز ہو' ہمارے لئے نہیں ہے۔ ہمارے لئے واحد جذبہ اسلام کا ہے اور اس سے اعلیٰ جذبہ کوئی اور نہیں۔ اس سے اونچا جذبہ کوئی اور موجود ہے ہی نہیں۔ یہ وہ جذبہ ہے جو محیر العقول کارنامے کر کے دکھا سکتا ہے

حقیقی اسلامی جذبہ درکار ہے!

لیکن اب صرف نعروں سے بات نہیں بنے گی۔ نعرے والا جذبہ اس وقت مفید تھا جب ہندو سے براہ راست مقابلہ تھا۔ آج ہماری نئی نسل کو ہندو کی ذہنیت کا پتہ ہی نہیں ہے۔ اس کو ہندوؤں کے عزائم کا اندازہ ہے ہی نہیں۔ بلکہ سرحد پار سے بذریعہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو محبتوں کے زمزمے بہہ رہے ہیں۔ پھر اداکاروں اور اداکاراؤں کے طائفوں کے ذریعے سے محبت و الفت کے پیغامات آرہے ہیں۔ ایوان صدر میں ان کی بار آوری اور پزیرائی ہو رہی ہے۔ ان کو گھنٹوں پر محیط انٹرویو دیئے جاتے رہے ہیں۔ پھر کرکٹ کا کھیل ہے جو ہر سال باقاعدگی کے ساتھ بظاہر بڑے دوستانہ ماحول میں کھیلا جاتا ہے۔ تو بظاہر احوال گویا بھارت کی جانب سے مسلسل پریم کی گنگا بہہ رہی ہے۔ پاکستان کے عام آدمی کو کیسے معلوم ہو کہ بھارت کے کیا عزائم ہیں، کیا ارادے ہیں! ع تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں! لہٰذا وہ جذبہ جو تحریک پاکستان کے دوران قومی بنیاد پر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ آج محض قومیت کی بنیاد پر نہیں، حقیقی اسلام کی بنیاد پر بیدار ہو سکتا اور ابھر سکتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کو کوئی خیر مطلوب ہے۔ اصل فیصلہ کن بات تو اسی کی ہے مَاشَآءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَآءْ لَمْ یَکُنْ "جو اللہ چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے اور جو وہ نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔" سیدھی سیدھی بات ہے کہ پوری کائنات اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ یہاں پتہ تک جنبش نہیں کر سکتا اگر اس کا اذن نہ ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کسی خیر کا ارادہ رکھتا ہے تو ہماری قوم کے اندر انشاء اللہ وہ جذبہ ابھرے گا اور اس خواب کی تعبیر ظاہر ہو گی جو برصغیر کی امت مسلمہ نے دیکھا تھا۔ ہمیں سوچنا چاہئے کہ ہم ان خوابوں کے امین ہیں جو جنوب سے شمال اور مشرق سے مغرب تک ہندوستان کے مسلمانوں نے دیکھے تھے۔ احیاء اسلام کا خواب۔ اس برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی عظمت گذشتہ کی بازگشت کا خواب ہندوستان کے مسلمانوں نے قیام پاکستان کے لئے جو قربانیاں دی تھیں اور آج بھی بھارت کا مسلمان نظریہ پاکستان کی تائید و حمایت کے "جرم" میں جس بہیمانہ تشدد کا شکار ہے اور وہاں مسلمان کے خون سے جو آئے دن ہولی کھیلی جارہی ہے، اس کا بار آج ہمارے کاندھوں پر ہے۔ آج بھارت میں مسلمان جس طرح پس رہا ہے اس کی ذمہ داری ہمیں محسوس کرنی چاہئے آج پاکستان بنوانے کا انتقام بھارت میں

ہندو وہاں کے مسلمانوں سے لے رہا ہے۔ لہٰذا ان کے خون ناحق کی ذمہ داری مجھ پر' آپ پر اور ہماری قوم کے ایک ایک فرد پر ہے۔ اللہ کرے کہ ہمارے نوجوانوں کے اندر صحیح اسلامی امنگ' ولولہ اور جذبہ بیدار ہو جائے۔ خاص طور پر اس نسل کے اندر جو یہاں پیدا ہوئی یہاں پلی بڑھی۔ اس نے کم از کم سیاسی آزادی کے ماحول میں سانس لیا ہے۔ اس میں امنگیں موجود ہیں لیکن وہ غلط رخ پر پڑ گئی ہیں۔ ولولے موجود ہیں لیکن وہ ولولے غلط ہدف کی طرف مڑ گئے ہیں۔ ع

آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

ورنہ آج آپ دیکھئے کہ سندھی نوجوان کتنی تیزی اور محنت کے ساتھ کام کر رہا ہے لیکن کر رہا ہے سندھی نیشنلزم اور سندھو دیش کے لئے۔ آج بھی کراچی کے اندر بسنے والے مہاجرین کی جو ادھیڑ نسل ہے یا ان میں جو بوڑھے لوگ ہیں ان سے بڑھ کر نظریہ پاکستان پر یقین رکھنے اور اس سے محبت کرنے والا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان کے قیام کے بنیادی مقاصد کے لئے ان سے زیادہ جذبہ رکھنے والا آج بھی اور کوئی نہیں ہے۔ لیکن ان کی نئی نسل یعنی اٹھارہ انیس برس سے لے کر تیس برس تک کی نوجوان نسل کا ایک بڑا حصہ نظریہ پاکستان سے ذہناً دستبردار ہو چکا ہے۔ آپ کو علم ہو گا کہ وہاں دو تحریکیں ہیں' ان کے بارے میں' میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ ایک تحریک ایم۔ آئی۔ ٹی ہے۔ مگر وہ تحریک نسبتاً کمزور ہے۔ اس کا دائرہ اثر بہت محدود ہے لیکن اس نے برملا یہ ضرور کہا ہے کہ "ہم اسلام اور پاکستان ان دونوں کے حصار (FRAME WORK) کے اندر اندر اپنے حقوق کی جنگ لڑنا چاہتے ہیں۔ ہمارے جو حقوق ہیں وہ ہمیں ملنے چاہئیں لیکن ہم نہ اسلام کے باغی ہیں نہ پاکستان کے"۔ لیکن ایم۔ کیو۔ ایم (مہاجر قومی محاذ) کی تحریک جس نے زیادہ بڑے پیمانے پر مہاجرین کے نوجوانوں کو متاثر کیا ہے اور انہیں ایک بڑی قوت بنایا ہے' یہ تحریک ان دونوں چیزوں یعنی اسلام اور پاکستان کے ساتھ کسی تعلق کا اظہار نہیں کرتی بلکہ ان کے ساتھ بالعموم اس کا رویہ استہزا اور تمسخر کا ہے۔ جو وہاں ہو رہا ہے۔ یہ صورت حال بہت خوفناک ہے۔ میں یہ باتیں آپ کو اس لئے نہیں بتا رہا کہ آپ کے اندر مایوسی اور بددلی ہو...... میں مایوس نہیں' بددل نہیں۔ میں اب بھی بہتری کی امید ہی نہیں بلکہ اس پر یقین رکھتا ہوں۔

میرے سامنے برصغیر پاک وہند کی چار سو سال کی تاریخ ہے۔ تجدید و احیائے دین کی جتنی جدوجہد ان چار سو برس میں اس برصغیر میں ہوئی ہے پورے عالم اسلام میں کہیں نہیں ہوئی۔ حضرت مجدد الف ثانی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہما اللہ علیہ، یہ دونوں حضرات گیارہویں صدی کے مجددین ہیں۔ پھر امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ جیسا مفکر، عمرانیات کا عظیم ماہر، جدید دور کا فاتح، وہ بھی اسی برصغیر میں پیدا ہوا۔ پھر شہیدین ؒ کی تحریک جس کے ہم امین ہیں کہ ان کا مقدس اور پاک خون ہمارے خطہ بالاکوٹ کی وادی میں جذب ہوا ہے۔ دریائے کنہار کی موجیں اس سے رنگین ہوئی تھیں۔ یہ کوئی ازمنہ قدیم کی بات نہیں ہے۔ ۱۸۳۱ء میں یہ تحریک بالاکوٹ میں کچھ اپنوں کی غداری کی وجہ سے بظاہر ناکام ہوئی۔ بظاہر اس لئے کہہ رہا ہوں کہ دینوی نقطہ نظر سے چاہے یہ تحریک کامیاب نہیں ہوئی لیکن آخرت میں ان شہیدوں کا مقام انشاءاللہ مقام علیین میں ہو گا۔ آخرت میں یہ سرخرو ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے نوازے جائیں گے۔ اس تحریک کو کل ایک سو چھپن سال گزرے ہیں۔ اتنا خالص اور اتنا پاک اسلامی جہاد دور صحابہ کرام ؓ کے بعد پوری اسلامی تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ جتنا شہیدین کی اس تحریک میں ہمیں ملتا ہے۔ خالص اقامت دین کے لئے تنظیم، بیعت کی بنیاد پر تنظیم، اس پر مستزاد یہ کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں کا عکس ہمیں اس تحریک کے وابستگان میں نظر آتا ہے۔ پھر اس دور کے عظیم سرمایہ پر نظر ڈالئے اس دور میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمتہ اللہ علیہ جیسی شخصیت اسی برصغیر میں پیدا ہوئی۔ جن کے متعلق میرا گمان ہے کہ ۱۴ ویں صدی ہجری کے سب سے بڑے مجدد وہ ہیں۔ بدقسمتی سے پاکستان کے اکثر لوگ حضرت شیخ الہند ؒ کی شخصیت سے ناواقف ہیں پھر اسی دور میں علامہ اقبال مرحوم جیسی نابغہ شخصیت اسی برصغیر میں پیدا ہوئی جن کی ملی و اسلامی حدی خوانی میں ایک ولولہ انگیز تاثیر اور ملت اسلامیہ کے لئے ایمان افروز پیغام موجود ہے۔ پھر اسی دور میں ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے دعوت رجوع الی القرآن اور جہاد فی سبیل اللہ کا صور پھونکا اور غلغلہ بلند کیا۔ پھر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی برپا کی ہوئی جماعت اسلامی کی تحریک اور مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ کی تبلیغی جماعت کی تحریک، یہ دونوں عظیم تحریکیں بھی اسی برصغیر پاک و ہند سے

اٹھیں۔ آپ کو ان دونوں تحریکوں کے بڑے گہرے اثرات پورے عالم اسلام میں اور جہاں کہیں بھی مسلمان آباد ہیں نظر آئیں گے۔ تبلیغی جماعت کے متعلق میرا اندازہ ہے کہ آج کے زمانے میں کم از کم ایک لاکھ افراد پوری دنیا میں ہر روز اور ہر وقت حرکت میں ہیں کسی کو ان کے طریق کار سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ ان کے تصور دین کو کوئی محدود کہہ سکتا ہے لیکن ظاہر بات ہے کہ ان کی یہ تمام چلت پھرت اور حرکت ہے تو دین ہی کے لئے۔ اس کا جو فائدہ ہو رہا ہے وہ دین کے کھاتے میں پڑ رہا ہے۔ پھر برصغیر پاک و ہند میں دین پر جو علمی و تحقیقی کام مختلف اداروں کے تحت ہو رہا ہے وہ بھی بڑا قیمتی ہے..... ان تمام چیزوں کو سامنے رکھئے۔ ان تمام کاموں کا مرکز اس علاقے کا ہونا مایوسی کے اندھیروں میں امید کی کرن بن کر ظاہر ہوتا ہے۔

لیکن ان تمام مساعی اور جدوجہد کے بار آور ہونے کا سارا دارومدار اور انحصار اس پر ہے کہ ہم اس میں کتنا واقعی عملی کردار ادا کرتے ہیں! ان تمام کوششوں کا بار امانت اب ہم پاکستانی مسلمانوں کے کاندھوں پر آ گیا ہے۔ یہ شعور اگر پیدا ہو جائے کہ ہم کتنی بیش بہا اور قیمتی متاع کے امین ہیں، کتنی بھاری ذمہ داری کا بوجھ ہمارے شانوں پر ہے!

ع "اپنی خودی پہچان او غافل انسان"

تو ہماری دنیوی او اُخروی بگڑی بن سکتی اور سنور سکتی ہے۔

ہمارے لئے قرآن کا پیغام

قرآن مجید میں سورہ حج کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کا حق ہے۔ اپنے نصیب پر فخر کرو اللہ نے تمہیں چن لیا ہے 'پسند کر لیا ہے ع قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند '

پھر در حقیقت یہ صرف بوجھ ہی نہیں ہے بلکہ بہت بڑا شرف ہے 'بہت بڑا اعزاز ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ البتہ اس کا ہمیں صحیح شعور ہونا چاہئے۔

آپ کو معلوم ہے کہ تمام دنیا میں بہت سے محکوم مسلم ممالک میں آزادی کی تحریکیں چلیں لیکن کہیں بھی اسلام کا نام نہیں لیا گیا سوائے تحریک پاکستان کے غیر منقسم ہندوستان کا چپہ چپہ اس نعرے سے گونج رہا تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ

اس برصغیر میں تحریک قیام پاکستان چلی تو صرف اسلام کے نام پر چلی۔ یہ اس بات کی علامت

ہے کہ مشیئت ایزدی میں اس خطہ ارض کو کسی اعلیٰ تر مقصد کے لئے منتخب کر لیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زمینی حالات کو جب میں دیکھتا ہوں تو مایوسی کے اندھیارے آ جاتے ہیں اور چھا جاتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیئت' تاریخ کا چار سو سالوں کا یہ پس منظر' وہ عظیم شخصیتیں جو برصغیر میں پیدا ہوئیں' وہ تحریکیں جو یہاں برپا ہوئیں' ان کا دائرہ اثر' ان سب کو دیکھتا ہوں تو امید ہوتی ہے کہ شاید مایوسی کے ان اندھیاروں سے کوئی صبح روشن طلوع ہو جائے جیسا کہ علامہ اقبال مرحوم نے کہا تھا کہ ؂

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی

اس خیال سے بھی دل کی ڈھارس بندھتی ہے کہ اس وقت مایوسی کے جو بھی اندھیارے ہیں' شاید وہ اس آیت کا مصداق بن جائیں کہ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ○ شاید کہ ہم جاگ جائیں۔ شاید کہ ہم ہوش میں آ جائیں اب میں اس خواہش کو دعا کی شکل میں پیش کر رہا ہوں۔

پروردگار! ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم جاگیں' ہوش میں آئیں' تو نے ہمیں پاکستان کی صورت میں جو نعمت غیر متوقع اور غیر مترقبہ عطا فرمائی تھی' ہم اس کا حق ادا کریں' اس کا شکر کر سکیں۔ اس کا حق ہم پہچان سکیں۔ پروردگار! ہمیں ہمت عطا فرما کہ ہم کمر کس لیں کہ اس سرزمین میں تیرے دین کا بول بالا کریں گے۔ وہ نظام عدل و قسط جو تو نے ہمیں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے عطا فرمایا ہے' اسی کو پاکستان میں نافذ کریں گے۔ اسلامی انقلاب برپا کریں گے۔ علاقائی عصبیتوں قومیتوں اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر' فرقہ واریت سے بلند تر ہو کر صرف مسلمان کی حیثیت سے بنیان مرصوص بن کر پاکستان میں تیرے دین کا بول بالا کرنے کے لئے تن من دھن لگا دیں گے۔

اللہ تعالیٰ مجھے' آپ کو اور ہر پاکستانی مسلمان کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاءِ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ○
وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ○

افکار و آراء

مکتوب گرامی مولانا الطاف الرحمٰن بنوی مدظلہ، بنوں

مولانا الطاف الرحمٰن بنوی ہمارے حلقے میں تعارف کے محتاج نہیں کہ ان کی علمی کاوشیں ہمارے جرائد کی زینت بنتی رہی ہیں۔ قرآن اکیڈمی کے سکالرز کو بھی ایک عرصہ ان سے استفادہ کا موقع میسر رہا۔ مولانا متداول علوم دینی کے فاضل اور انہی کی درس و تدریس میں منہمک ہیں۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی طرف سے ان کی تازہ کتاب کا ہدیہ وصول پانے پر جو رسید انہوں نے عنایت کی وہ نذر قارئین ہے۔ (ادارہ)

محترم و مکرم جناب ڈاکٹر صاحب زیدت معالیہ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

کتاب "منہج انقلاب نبوی" موصول ہوئی۔ ذرہ نوازی اور شفقت کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ علم و عمل میں برکات در برکات سے نوازے اور اپنی رضا و خوشنودی سے مشرف فرماوے۔ گو جزوی اور غیر منضبط طور پر یہ اکثر تقاریر میری مسموعہ تھیں لیکن باقاعدہ ترتیب و تفصیل کے ساتھ جو اس مجموعے میں پڑھیں تو نیا لطف حاصل ہوا۔ اللہ تعالیٰ پوری امت کی طرف سے آپ کو جزائے خیر عطا فرماوے کہ آپ نے مطالعہ سیرت کے ایک ایسے نئے رنگ ڈھنگ سے لوگوں کو آگاہ و شناسا کیا جس کی طرف باوجود شغل و شغف مطالعہ سیرت مدت العمر اکثریت کی نگاہ اٹھنا مستبعد تھا۔

اللہ تعالیٰ آپ کے عزائم و مقاصد کی تکمیل کا متکفل ہو۔ اور ہمیں بھی کسی درجے میں آپ کا تعاون کرنے کی توفیق عطا فرماوے۔ آمین ثم آمین۔

از الطاف الرحمٰن بنوی۔

مکتوب گرامی ڈاکٹر شیر بہادر خان پنیؒ، پشاور

محترمی، سلامت با صحت کامل باشد

کل ہی ستمبر کا "میثاق" ملا حسب عادت فوراً ورق گردانی شروع کر دی۔ تو آپ کی بیماری کا چوکھٹا نظر پڑا۔ دھچکا لگا اور آپ سے قلبی تعلق نے اس کو اضطراب کی صورت دے دی۔ کیا

کہوں اس عمر میں ذرا سی پریشانی بھی قابل برداشت نہیں۔ اضطراری طور پر مخلصانہ دعا کے لئے ہاتھ بلند ہو گئے۔ خدا آپ کو اس اذیت سے فوری طور پر نجات دے۔ آمین۔

کچھ عرصہ ہوتا ہے۔ عرض کی تھی۔ کام کی زیادتی کو کم کریں اور زندگی کی موم بتی کو دونوں اطراف۔ دماغی و جسمانی۔ سے بہ یک وقت نہ جلائیں

؎ عمر عزیز قابل سوز و گداز نیست

ایں رشتہ را مسوز، کہ چندیں دراز نیست

لیکن میں نے محسوس کیا ہے۔ کہ کچھ عرصہ سے آپ نے اپنے مشن کی گرانباری میں بہت اضافہ کر لیا ہے۔ اور پرانی اور نئی دنیا کے دوروں میں زیادتی فرمادی۔ جو بذات خود ہی کمر شکن تھے۔ لیکن اس عمر میں کہ "چو چہل آمد، خرد ریزد پر و بال"، تو خاص کر۔

خدا آپ کو صحت عاجلہ و کاملہ عطا فرمائے۔ اور اپنے مشن میں کامیاب کرے آمین۔ آپ کی صحت کے لئے ہر وقت دعا کرتا رہوں گا۔

والسلام

دعا گو و دعا جو شیر بہادر پنی (پشاور)

مکتوب گرامی مولانا عبدالغفار حسن مدظلہ، فیصل آباد

عزیز محترم حفظہ اللہ تعالیٰ وعافاہ وأرشدہ الی مافیہ صلاح الدنیا وفلاح الآخرہ

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ، دو روز ہوئے ستمبر کا "میثاق" ملا، اس میں آپ کی علالت کی خبر پڑھ کر انتہائی افسوس ہوا، کل صبح محترم عم مکرم ڈاکٹر محمد عثمان صاحب سے فون پر معلوم ہوا کہ اب قدرے تکلیف میں افاقہ ہے، اللہ تعالیٰ جلد صحت و توانائی سے نوازے، آمین،

بنظر صحت آئندہ اسفار و اشغال میں تخفیف مناسب ہو گی، "اِنَّ لِنَفْسِکَ علیک حقً" پیش نظر رہے۔ اخوان واحباب وعزیزان کو دعا و سلام۔

والسلام

عبدالغفار حسن (فیصل آباد)
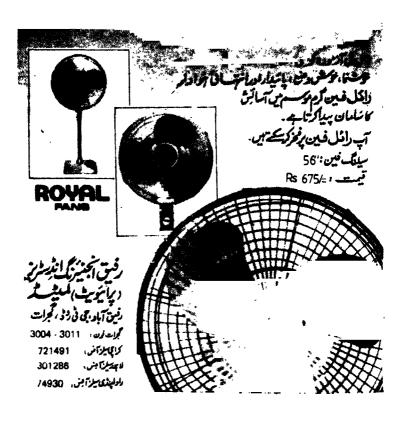
الص اجزا — بہتر شربت
جامِ شیریں
الص، پُرتاثیر، فرحت بخش
رشی کے مشروبات
امِ شیریں، صندل، الائچی، بزوری اورنج ڈرنک
پ کا نبض شناس
شربت
جامِ شیریں

کارمینا
بدہضمی، قبض، گیس،
سینے کی جلن، تیزابیت
وغیرہ کا اچھا علاج ہے۔
Carmina
ہمدرد
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
کارمینا ہمیشہ گھر میں رکھیئے۔
معاف کر دینا بہترین انتقام ہے۔
Adarts CAR-4/84
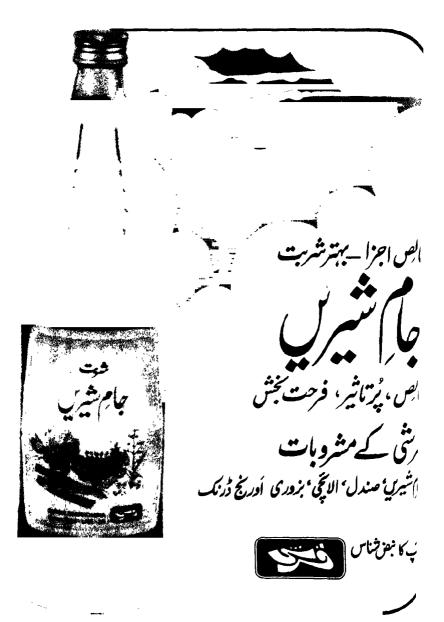
امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک کھلا خط

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

محترمی و مکرمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'!

آپ کے علم میں ہے کہ ان سطور کا ناچیز راقم گذشتہ بائیس سال سے ارضِ لاہور میں قرآن کی دعوت و حکمت کی نشر و اشاعت میں اپنے بہترین اوقات اور بیشتر توانائیاں صرف کر رہا ہے۔ قرآن کی اس خدمت کا ایک نقد صلہ جو مجھے ساتھ ساتھ ملتا رہا ہے وہ یہ کہ میری قرآن کے ساتھ ذہنی مناسبت بھی مسلسل بڑھتی چلی گئی اور اس کے نسخۂ شفاء اور صحیفۂ ہدایت ہونے پر یقین بھی روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالِك

آپ کے علم میں یہ بھی ہوگا کہ میں گذشتہ تقریباً ایک ماہ سے صاحبِ فراش ہوں — اس دوران میں الحمد للہ کہ مجھ پر نبی اکرم ؐ کے اس فرمان کا انکشاف پوری شدت کے ساتھ ہوا کہ موت سے پہلے زندگی اور مرض سے پہلے صحت کو غنیمت جانو!

ان حالات میں جبکہ اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے صحت کی صورت نظر آرہی ہے میں نے توکلاً علی اللہ فیصلہ کیا ہے کہ زندہ دلانِ لاہور کے سامنے میں ایک بار پھر اپنے عمر بھر کے مطالعۂ قرآن کا نچوڑ پیش کر دوں، چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے —— کہ بشرطِ صحت و عافیت:

۱۔ جمعہ ۲۵ ستمبر سے مسجد دارالسلام باغِ جناح میں ہر جمعہ کو ساڑھے گیارہ سے ایک بجے دوپہر تک "حقیقتِ ایمان" کے موضوع پر خطاب ہوگا —— یہ کم از کم آٹھ خطاب ہوں گے جن کے عنوانات بھی درج کئے جا رہے ہیں۔

۲۔ ہفتہ ۲۶ ستمبر سے قرآن اکیڈمی، ۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن لاہور میں ہر ہفتے کو نماز مغرب کے فوراً بعد سورۂ حدید کا سلسلے وار درس ہوگا۔ جو مسلمانوں سے خطاب کے ضمن میں پورے قرآن حکیم کا لبِ لباب اور ذروۂ سنام ہے! —— یہ درس بھی ان شاء اللہ آٹھ ہی نشستوں میں مکمل ہو سکے گا! —— (اس کے اجزاء کی تفصیل بھی اس ہینڈ بل میں درج کی جا رہی ہے!)

آپ کو مخلصانہ دعوت ہے کہ ان پروگراموں میں مداومت اور پابندیٔ وقت کے ساتھ شرکت فرمائیں۔ کیا عجب کہ اللہ تعالےٰ آپ کو "هُوَ اجْتَبٰكُمْ" کے مصداق اپنے دین کی کسی وقیع خدمت کے لئے منتخب فرمالے! ع

"شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را۔"

خاکسار: اسرار احمد عفی عنہ

۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

۱۷ ستمبر ۱۹۸۷ء

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل [illegible] کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

جلد ۳۶
شمارہ ۱۱
ربیع الاول ۱۴۰۸ھ
نومبر ۱۹۸۷ء
فی شمارہ -/۵
سالانہ زرتعاون -/۵۰

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

مینجنگ ایڈیٹر
اقتدار احمد

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوحا، قطر، متحدہ عرب امارات — ۲۵ سعودی ریال یا -/۱۱۵ روپے پاکستانی

ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر۔	۹ امریکی ڈالر یا -/۱۰۰ روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ۔	۹ امریکی ڈالر یا -/۱۵۰ 〃
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۱۲ امریکی ڈالر یا -/۲۰۰ 〃 〃

ترسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور، یونائیٹڈ بنک لیمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ ۱۴ (پاکستان) لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: ۸۵۲۶۸۳
سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی فون ۲۱۶۵۸۶
طابع: چوہدری رشید احمد مطبع: مکتبہ جدید پریس شاہراہ فاطمہ جناح، لاہور

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقتدار احمد

عرض احوال

اِن دنوں مسجد دار السلام باغ جناح لاہور میں نمازیوں کے عظیم اجتماعاتِ جمعہ میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ایمان' اس کے مفہوم اور اقسام و لوازم پر سلسلہ وار نہایت مفید اور پُر مغز لیکچر دے رہے ہیں۔ انہیں جب کبھی مرتب کر کے شائع کیا جاسکا' انشاء اللہ اس اہم ترین موضوع پر ایک ایسی وقیع کتاب وجود میں آ جائے گی جو مسلمانوں کے لئے بالعموم اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لئے بالخصوص گرہ کشا ثابت ہوگی کیونکہ اس میں بحث کو محض علمی حدود میں مقید نہیں رکھا گیا ہے بلکہ خالص عملی پہلوؤں پر بھی رہنمائی میسر ہوگی۔ ایمان ہمارے دین کی اساس ہی نہیں موجودہ زوال پذیر اسلامی معاشرے کا المیہ اور اصل مسئلہ بھی ہے۔ حقیقی ایمان کا عدم وجود ہماری کل انفرادی اور اجتماعی بیماریوں کا واحد سبب ہے اور صحیح مفہوم میں اس کا دلوں میں جاگزین ہو جانا ہی دنیوی و اُخروی فلاح کی کلید ہے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب موصوف کو صحت و سلامتی سے نوازے رکھے کہ وہ ان مباحث کو بلا کسی تعطل کے پورا کر سکیں۔ ان سطور کے صفحۂ قرطاس پر منتقل ہونے تک موضوعِ محولہ بالا پر چار خطبات ہو چکے ہیں اور توقع ہے کہ مزید چار یا پانچ لیکچروں میں بات پوری ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا پورا وقت اسی گفتگو میں لگتا ہے۔ لیکن پچھلے جمعہ اصل خطبے کے اختتام پر انہوں نے جلے دل سے یہ کہہ کر ایک ضمنی بحث کا دروازہ کھول دیا ہے کہ کرکٹ کے معرکوں کے لئے چھٹی کا دن مخصوص کرنا ضروری ہے تو ہفتہ واری تعطیل پھر سے اتوار کو ہی قرار دی جائے تاکہ جمعہ کا تقدس یوں سرِبازار پامال نہ ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ بظاہر تو اتوار کی جگہ جمعہ کو چھٹی قرار دیا جانا' بہت بڑا "اسلامی اقدام" سمجھا گیا تھا لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ یہ تبدیلی کسی خیر پر منتج نہیں ہوئی۔ یہ دن ہفتہ بھر کی نجی ضروریات کی تکمیل' ذاتی مشاغل کی تسکین' سماجی میل جول' خاندانی اور شادی بیاہ کی تقاریب اور میلے ٹھیلوں کی نذر ہونا شروع ہو گیا اور پورے ماہ اکتوبر پر پھیلے ہوئے ورلڈ کپ کرکٹ میچوں

نے تو لٹیا ہی ڈبو دی جس میں اہم ترین جوڑ جمعہ کے دن ہی کے لئے مخصوص کیۓ جاتے رہے ہیں۔ چنانچہ لوگ عجب مشکل میں گرفتار ہیں ' جمعہ کا حق ادا کرنا کجا' محض مسنون خطبہ سننے اور دو رکعت پڑھنے کے لئے بھی مسجد کا رخ کرتے ہیں تو دل ان دلچسپیوں میں اٹکا رہتا ہے اور وقفے کے دوران متفرق مشاغل میں ذرا انہماک ہو جائے تو جمعہ فوت۔ جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت وعیدوں سے عام لوگ بھی بے خبر نہیں۔ اس صورتِ حال نے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ "اسلامی چھٹی" سے تو وہ "غیر اسلامی" چھٹی ہی بھلی تھی۔

ہمارے دین میں شریعت موسوی کی طرح کا کوئی "یومِ سبت" نہیں جس میں کارِ جہاں کی درازی حرام ہو' نہ اختتامِ ہفتہ پر آرام یا سیر و تفریح یعنی "ویک اینڈ" کا کوئی تصور موجود ہے جس کا التزام ضروریاتِ دینی میں شامل ہو۔ قدغن ہے تو صرف اتنی کہ جمعہ کی اذان (اذان اولیٰ یا خطبے کی اذان۔ اس کے تعین میں اختلاف ہے' تاہم مل جل کر ایک فیصلے پر پہنچا جا سکتا ہے) سے لے کر فرض نماز کے اختتام تک کاروبارِ دنیوی کی ہر قسم حرام ہے۔ اس سے پہلے صبح کے وقت جمعہ کے لئے ذہنی تیاری اور بعد دوپہر سے رات تک اللہ کا ذکر دلوں میں جاری و ساری رہنا چاہئے جو ہاتھ پیروں کو کام سے نہیں روکتا۔ ویسے بھی ذکرِ الٰہی سے تو ہمارا کوئی بھی لمحہ خالی نہ ہونا چاہئے...... جو دم غافل سو دم کافر...... چنانچہ اگر ہفتہ وار چھٹی کسی اور دن ہو اور نماز جمعہ کی ادائیگی کے لئے مناسب وقفہ یا نصف یوم کی رخصت دے دی جائے...... جیسا کہ پہلے معمول تھا . توجمعے کے احترام کی مٹی ایسے (نعوذ باللہ) پلید نہ ہو جیسے ان دنوں ہو رہی ہے۔ ہمارے چند جاننے والوں نے پیشانیوں سے عرقِ انفعال کے قطرے پونچھتے ہوئے (کہ وہ بھی گروہِ عاشقاں میں شامل تھے) بتایا کہ لاہور کے پچاس ہزار "فرزندانِ اسلام" نے قذافی سٹیڈیم میں پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان "معرکۂ کفر و اسلام" دیکھتے ہوئے بالکل فراموش کر دیا تھا کہ جمعہ کی دوپہر کوئی نماز بھی پڑھی جاتی ہے اور یہ کہ عصر کا بھی ایک وقت معین ہے۔ نماز کا جو نام نہاد وقفہ کیا گیا تھا وہ خوانچہ فروشوں کی مہربانی سے پیٹ پوجا میں لگا بلکہ بہت سوں نے تو نارسائی کے باعث فاقے میں عافیت سمجھی کہ سٹیڈیم میں جہاں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی' بیٹھنے کی گنجائش پھر کہاں سے پائیں گے۔ رہی سہی کسر ایک اور دلچسپ "ایونٹ"

نے پوری کر دی۔ ایچی سن کالج کے کم سن شہزادوں کی کرکٹ ٹیم کو بین الاقوامی شہرت کے مایہ ناز کرکٹروں نے کھلایا (بلکہ بہلایا)۔ ایسے دلکش منظر کو نگاہوں سے اوجھل کرنے کا متحمل کون ہو سکتا تھا "اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں" .... ہمیں کرکٹ کے کھیل کی ضرورت اور افادیت سے انکار بھی ہو تو کیا۔ جب بچشمِ سر دیکھتے ہیں کہ یہ ملک و قوم کے مستقبل کے لئے اتنی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ حکومت سمیت پوری قوم (الاماشاءاللہ) اس کی دھن میں مست ہے تو یہ درخواست کرنے کو جی چاہتا ہے کہ آئندہ چھٹی اتوار کی رکھ لیجئے تاکہ ان مشاغل سے جمعہ کی نماز کی حرمت بھی متأثر نہ ہو اور ایسے "اہم" مواقع کے لئے حاضرین و ناظرین کی مطلوبہ تعداد بھی فراہم ہو جایا کرے۔

لیکن اگر جمعہ کو ہفتہ واری تعطیل کا دن قرار دینے میں مصلحت یہ تھی کہ چونکہ چھ دن کام کرنے کے بعد ایک دن کا آرام جدید دنیا کے اعصاب شکن حالات کار میں

ع رسمِ دنیا بھی ہے، موقع بھی ہے دستور بھی ہے

تو کیوں نہ اس سے دین کا بھی ایک تقاضا پورا ہو جائے۔ اور یہ کہ چھٹی جمعہ ہی کو ہو تو نہ صرف تکان دور کرنے کا وقت مل جاتا ہے بلکہ "فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہ" کا حق ادا کرنے کا اہتمام بھی کیا جا سکتا ہے۔ تو پھر حکومت اور عوام دونوں سے ہماری دردمندانہ استدعا ہے کہ خدارا اس کے تقدس کا بھی خیال کیجئے۔

افسوس کہ آج کرۂ ارض پر کوئی خطہ ایسا موجود نہیں جسے صحیح معنوں میں اسلامی ملک کہا جا سکے۔ لیکن مسلمانوں کے ملک اور مسلمان حکومتیں تو بحمد اللہ درجنوں ہیں۔ متعدد ایسے ممالک ہم نے خود دیکھے ہیں جہاں ہفتہ واری تعطیل جمعہ کو ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم سعودی عرب کے احوال اپنے قارئین کے سامنے رکھیں گے جہاں ہماری آمدورفت زیادہ رہی۔ وہاں خوش حالی و فارغ البالی اور تفریحات کے وسائل و مواقع یہاں سے دہ چند ہیں۔ فٹ بال ان کا قومی کھیل ہے اور اس کا ذوق و شوق بھی کرکٹ کے سلسلے میں ہماری وارفتگی سے ہرگز کم نہیں۔ سماجی میل جول، تقریبات اور میلوں ٹھیلوں کا رواج وہاں بھی موجود ہے لیکن کیا مجال جو نمازِ جمعہ سے ذرا بھی تغافل برتا جاتا ہو۔ جمعہ کے وقت (خطبے اور نماز کا وقت وہاں شہر بھر کی تمام مساجد میں ایک ہی ہوتا ہے) سڑکیں اور گلیاں سنسان ہو جاتی ہیں۔ لگ بھگ ایک

گھنٹہ پہلے ہی سے انگریزی محاورے کے مطابق تمام راستے مسجدوں کی طرف جاتے نظر آتے ہیں۔ وہاں اس منظر کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا جو یہاں ہر ہفتے خون کے آنسو رلاتا ہے۔ موسم گرما میں جمعہ کو عین نماز کے وقت لاہور کی مشہور و معروف نہر پر ہزاروں نیم عریاں نوجوان نہانے کا شوق پورا کرتے ہیں جبکہ اس کے کنارے متعدد بڑی مساجد سے نماز کی قرأت ان کے کانوں میں پہنچ رہی ہوتی ہے۔ سردیوں میں باغِ جناح کی مسجد دارالسلام اور اس سے ملحق باغیچوں میں ایک طرف لوگ جمعہ کی نماز کے لئے صف بندی کرتے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف سو پچاس گز کے اندر اندر ہمارے عاقل و بالغ بچے کرکٹ کے کھیل میں مصروف پائے جاتے ہیں۔

جمعہ شعائر اسلامی میں سے ایک ہے۔ اس کے احترام کا حق ادا کرنا ہم سب کا فرض ہے اور اس دن کو ہفتہ وار تعطیل قرار دینا فی الحقیقت اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ چنانچہ ہم حکومت سے مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ خود بھی اس بات کا اہتمام کرے اور عامتہ المسلمین کو بھی اس کی ترغیب دے کہ جمعہ کے احترام کا کم از کم وہ معیار یہاں بھی برقرار رہے جو سعودی عرب میں ہر جگہ دیکھا جاسکتا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

ادھر یہ اللّے تللّے ہیں اور مشرق کی سرحد پار سے ایسی خبریں ہمارے اپنے اخبارات کی شہ سرخیاں بن رہی ہیں کہ عرصے سے روزانہ دس بارہ ریل گاڑیاں سامان حرب و ضرب لے کر راجستھان ' پنجاب اور کشمیر کی سرحدات کے رخ رواں دواں ہیں۔ چھاؤنیاں بن رہی ہیں ' ہنگامی بنیادوں پر ہوائی پٹیوں کی تعمیر جاری ہے اور فوج کے ڈویژن کے ڈویژن منتقل کئے جا رہے ہیں۔ "کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے" یا یہ سب کچھ کسی پک نک کی تیاری ہے؟ خبروں کے متن تو یہ تک پرچے لگاتے ہیں کہ اسی نومبر میں پاکستان پر حملہ ہو گا۔ پیش قدمی کا اصل زور براستہ کشمیر ہمارے شمالی علاقوں اور راجستھان کی طرف سے سندھ کے زیریں حصے پر صادق آباد اور رحیم یار خاں تک ہو گا جب کہ وسطی پنجاب میں جہاں سکھوں کی طرف سے عدم تعاون کا اندیشہ ہے محض دفاع کو مضبوط رکھنے کا منصوبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ دشمنوں کے منصوبے خاک میں ملائے لیکن کچھ باتیں ہمارے سوچنے کی بھی تو ہیں۔ یہ حملہ نومبر میں ہو یا دسمبر

میں، جنوری میں ہو یا فروری میں، اس سال ہو یا اگلے یا پھر اس سے بھی اگلے برس، ہندو کی سرشت سے بعید نہیں کہ اس نے آج تک ہمارے وجود کو دل سے قبول نہیں کیا (اور ہم سے زمانے میں پہنچنے کی سی کوئی بات تاحال سرزد نہیں ہوئی)۔ ہمارے ستّار العیوب اور غفّار الذنوب رب کریم نے بارہا ہمیں اس عیار مگرمچھ کا تر نوالہ بننے سے بچایا ہے۔ ہمارے اعمال کی شامت سقوطِ مشرقی پاکستان کی رسوائی کا تو باعث ہوئی لیکن لاہور کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے بھارت کی افواجِ قاہرہ کے قدم کس نے من من بھر کے کر دیئے تھے؟۔ اس کی رحمت سے امید اپنی جگہ، خود ہمارے لچھن کیا ہیں؟...... اے ہم وطن بھائیو! اب بھی ہوش میں آؤ، خدائے واحد کے بندے بنو، ایک رسولؐ کے اتباع کو زندگی کا شعار بنالو، ایک کتابِ ہدایت کو اپنے شب و روز کا وظیفہ اور وطیرہ سمجھو۔ یہی وحدتِ فکر و عمل تمہیں بنیانِ مرصوص بنا سکتی ہے جس سے دشمن نے ٹکر لی تو اپنا ہی سر پھوڑے گا۔ اور اے اربابِ حکومت! ہم ہرگز تمہارے حریف و مد مقابل نہیں، محض حقِ نصیحت ادا کرتے ہیں۔ تم نے اگر فوجی ساز و سامان پر تکیہ کیا تو یہ بہت کمزور سہارا ثابت ہو گا کہ دشمن کی قوت کئی گنا ہے۔ اللہ کی جناب میں اجتماعی توبہ کرو، اس کے نام کو کبریائی اور اس کے کلمے کو عملاً بلندی سے ہم کنار کرو، قوم کے لئے اسی کی طرف رجوع کے اسباب پیدا کرو۔ نہ خود لہو و لعب میں ڈوبے رہو نہ قوم کو غرق کرو۔ قوم کی زبوں حالی حد سے تجاوز کر چکی ہے، پانی اب تو سر سے گذر رہا ہے۔ تخریب کاری میں "بیرونی ہاتھ" کی جھلک تمہیں نظر آئی ہو گی، بد عنوانی، رشوت، غبن اور چوری ڈاکے میں کس کا دخل ہے جن کی چونکا دینے والی خبروں سے ملکی اخبار بھرے ہوتے ہیں۔ نئی نسل کو کھلونے دے کر کون بہلا رہا ہے۔ جس شخص کو تم نے خود مبلّغِ اسلام کہا (اگرچہ یہ سوال ابھی تحقیق طلب ہے کہ وہ ایجا محمد کے "اسلام" کا پیرو کار ہے یا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا) اس کے سامنے مجرے کی بزم آرائی کس نے کی اور پھر اسے جواز کی سند کس کی اسمبلی نے دی۔ عریانی اور فحاشی کو دن دونی رات چوگنی ترقی کون دے رہا ہے۔ چرس، افیون اور ہیروئن کا سرطان کس کے دور میں جسدِ ملت میں جڑ پکڑ رہا ہے؟۔ اپنے عہدے اپنے ہی پاس رکھو، تمہاری کرسیاں تمہیں مبارک! تم ہی اللہ کے قانون کو ارض پاک میں نافذ کر دو۔ تم ہی قوم کے مختلف علاقائی اور لسانی گروہوں کی شکایات کا ازالہ کر کے ان کا اعتماد حاصل کر لو۔ تم

خود ہی اپنے جَل میں سے گندی مچھلیاں نکال باہر کرو۔ اللہ کے عطا کردہ لامحدود وسائل اور قوم کی مسلمہ صلاحیتوں سے استفادہ کرو۔ کاسۂ گدائی پھینک دو' عزت و وقار سے جینا سیکھو اور پھر دیکھو اللہ تعالیٰ کی نصرت کیسے تمہاری دست گیری کرتی ہے۔ اور ہم جیسے ناقد بھی کیسے تمہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔

اے کاش ایسا ہو جائے! کاش اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

جناب احمد دیدات کو پچھلے دنوں عیسائی مبلغ جمی سواگرٹ سے "کیا بائبل اللہ کا کلام ہے" کے موضوع پر بحث کے بعد عرفِ عام حاصل ہوا۔ حال ہی میں انہوں نے پاکستان کا دورہ کیا ہے۔ یہاں انہیں عوام کی طرف سے تو پذیرائی ملنی ہی تھی' حکومت نے بھی قدر افزائی کی۔ لیکن یہ دیکھنا باقی ہے کہ ان کے بعض انکشافات نے متعلقہ لوگوں کی آنکھیں بھی کھولی ہیں یا نہیں۔ سنتے آ رہے تھے کہ افریقہ میں اسلام جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہا ہے' جہاں عرب ممالک کے "پیٹرو ڈالر" اس کارِ خیر میں لگ رہے ہیں وہیں عالمِ اسلام (بشمول پاکستان) کے علماء و صلحاء کے ہاتھوں بھی علاقے کے علاقے مشرف بہ اسلام ہو رہے ہیں۔ لیکن جناب احمد دیدات (جو خود افریقہ میں رہتے بستے ہیں) بتا گئے ہیں کہ وہاں عیسائی مشنریوں نے اپنے پنجے ملحد و بے دین لوگوں پر ہی نہیں خود مسلمانوں کے جسدِ ملت میں بھی اس مضبوطی سے گاڑ دیئے ہیں کہ ان سے گلو خلاصی اب آسان نہیں۔ وہاں کی باتیں کتنے ہی باوثوق ذرائع سے ہم تک پہنچیں' بہرحال شنیدہ ہیں۔ دیدہ حقائق بھی کم روح فرسا نہیں۔ ہمارے اپنے ملک میں "بے ضرر" عیسائی اقلیت جیسے پَر پُرزے نکال رہی ہے اور عیسائی مشنری ادارے جس طرح ظفر مندی و کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہے ہیں' اس سے اغماض ہمیں بھی بہت مہنگا پڑے گا۔ ہماری نظر سے گوجرانوالہ کے ایک مشنری ادارے کی جانب سے شائع ہونے والے ماہنامے کا ایک شمارہ گذرا ہے۔ اسی کے مندرجات جارحانہ ہیں' (علامہ طاہر القادری پر پھبتیاں اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ایک مضمون کے حوالے سے زبان درازی) اگلا شمارہ جس کا انتظار ہے نجانے کس انداز میں بات کرے گا کہ "اگلی اشاعت کے ضروری مضامین" کا چوکھٹا لگا کر جو تین عنوانات دیئے گئے ہیں' ان میں دو "ڈاکٹر اسرار احمد کی انوکھی منطق" اور "ڈاکٹر اسرار

احمد نے مسیحیوں کو گالیاں دینی شروع کر دیں" ہیں۔ یہ مضامین دیکھ کر انشاءاللہ ہم اگلے ماہ نصح و خیر خواہی کے جذبے سے ہی متعلق لوگوں سے گفتگو کریں گے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

مؤقر روزنامہ نوائے وقت میں ایک صاحب نے "شذرات" کے عنوان سے ہفتہ واری کالم لکھنا شروع کیا ہے۔ چند کالموں میں تو انہوں نے سنجیدہ انداز میں کام کی باتیں بھی کیں[1]۔ لیکن اخباری ذریعہ ابلاغ میسر آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہی ہوئے تھے کہ انہیں محسوس ہونے لگا ع

کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کیلئے

اور وہ شاید اس کے بغیر ممکن نہ تھی کہ راہ چلتے لوگوں سے رمز و کنائے میں چھیڑ چھاڑ شروع کریں۔ چنانچہ اسلامی انقلاب کا اپنا فلسفیانہ طریق کار بیان کرتے کرتے جو بگلا پکڑنے کے لئے اس کے سر پر موم رکھ کر پگھلنے کے انتظار سے بھی آسان تھا' انہوں نے منہج انقلاب نبویؐ کی اس تعبیر میں کیڑے نکالنے کے کارِ خیر پر کمر کس لی جس کے ذکر سے قاری کا ذہن خواہی نخواہی ڈاکٹر اسرار احمد اور ان کی تنظیم کی طرف منتقل ہوتا تھا۔ چنانچہ ہم نے جواب میں مؤقر روزنامہ جنگ (۲۰ر ستمبر) کے ذریعے کچھ عرض کرنے کی جسارت کی تھی۔ تاہم یہ احتیاط ملحوظ رکھی کہ نام اس میں کسی کا بھی نہ آنے دیا۔ وہ شاید منتظر ہی تھے کہ ع

اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

اپنے اگلے کالم میں انہوں نے ہدف کو محض نامزد کرنے پر اکتفا نہ کی بلکہ ہمیں مبارزت کے انداز میں دھمکی بھی دے دی کہ "انہوں نے بات شروع کی ہے تو اب دیکھئے کہاں تک پہنچے۔" نجانے وہ رگ و پے میں کون سا زہر اتارنا چاہتے تھے کہ ع

"ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے"

---

[1] بارے اب پھر ان کے کالموں کا رنگ بدلا ہے' اس شمارے کے پریس میں جانے تک ان کا ایک سنجیدہ کالم اسلامی انقلاب کے طریق کار پر شائع ہوا جس کا جواب محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے دیا اور بعد کے دو کالم ان کے پسندیدہ علمی موضوعات پر تھے جن پر ہم کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔ یوں مثبت انداز میں وہ اپنی باتیں کہتے رہیں تو شاید یہی ان کے کالم کا اصل مقصد تھا۔

کی سی لرزا دینے والی تمہید باندھ رہے ہیں ۔

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

وہ علاّمہ دہر ہیں جو عربی صرف و نحو، لغت اور جاہلی ادب سے شغف کے زینے طے کر کے اب ایک فقیہ اور مجتہد کے مقام رفیع پر براجمان ہیں۔ دروغ بر گردن راوی، کئی پتھروں کو جونک لگا کر دیکھ چکے ہیں۔ اپنے نئے ہدف سے بھی انہیں کچھ حاصل نہ ہو گا۔

ہم نے اپنی مذکورہ بالا عرضداشت میں اظہارِ خیال کے لئے جو "لب و لہجہ" اختیار کیا تھا، اس پر انہوں نے ہم سے کوئی گلہ نہ رکھنے کی عالی ظرفی کا مظاہرہ کیا تو ہمیں بھی ہرگز یہ شکایت کرنے کا حق نہیں کہ انہوں نے "ان کے امیر المومنین" کا طرز اشارت کیوں اختیار کیا۔ عوض معاوضہ، گلہ ندارد۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے جو بحث چھیڑ دی تھی، وہ اخباری کالموں کا موضوع نہیں اور جس طرح وہ اسے ذاتیات تک لے آئے، وہ اصل بات کو غتر بود کر دے گی۔ وہ خیر سے اہلِ علم اور قلم کے دھنی ہیں، اپنا جریدہ نکالتے ہیں اور صاحبِ تصانیف بھی ہیں۔ ان سب میں انہوں نے پہلے بھی ڈاکٹر صاحب اور ان کی تنظیم کو کسی موقع پر معاف نہیں کیا، آئندہ بھی مشق ناز فرماتے رہیں ع

"سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی"

ہمارے ساتھی اسی سطح پر ان سے مواجہہ جاری رکھیں گے[1]۔ ہماری طرف سے یہ تحریر حرفِ آخر ہے ۔

انہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے، کیوں لڑیئے
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیئے!

اور چونکہ خواہش اس سلسلے کو ختم کرنے کی ہے لہٰذا ان کے سوالات کا جواب دینے کا ارادہ نہیں، محض چند غلط فہمیوں کی وضاحت پر بس ہے جو شاید ان کی تحریر میں سہواً در آئی ہیں۔

(باقی صفحہ ۸۱ پر)

---

[1] چنانچہ ان کے اگلے کالم کے جواب میں ہمارے بزرگ رفیق جناب شیخ جمیل الرحمٰن کی تحریر مؤقر روزنامہ نوائے وقت میں بھی شائع ہوئی اور ہمارے اس شمارے میں بھی نقل ہوئی ہے۔

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن کا سلسلہ

الہُدیٰ

درس نمبر ۱۱

نشست نمبر ۴۷

مباحثِ عمل صالح

عورت کا روحانی و اخلاقی تشخص

سورۃ التحریم کی روشنی میں

(۵)

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ۝

صدق اللّٰہ العظیم

"اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی ہے کافروں کے لئے نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کی۔ وہ دونوں ہمارے دو نہایت نیک بندوں کے عقد میں تھیں۔ تو انہوں نے ان سے

خیانت کی روش اختیار کی۔ تو وہ دونوں ان (اپنی بیویوں) کو اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکے۔ اور یہ کہہ دیا گیا (ان بیویوں سے) کہ تم دونوں داخل ہو جاؤ آگ میں دوسرے داخل ہونے والوں کے ساتھ۔ اور اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی اہل ایمان کے لئے فرعون کی بیوی کی۔ جبکہ اس نے کہا اے رب میرے؟ میرے لئے اپنے پاس ایک گھر جنت میں بنا اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے اور مجھے نجات بخش ظالموں کی قوم سے ...... اور عمران کی بیٹی مریم کی مثال بیان فرمائی جس نے اپنی عصمت کی پوری حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح میں سے پھونکا اور اس نے تصدیق کی اپنے رب کی تمام باتوں کی اور اس کی کتابوں کی اور وہ ہمارے بہت ہی فرماں بردار بندوں میں سے تھی۔ "

محترم حاضرین اور معزز ناظرین! سورۂ تحریم کی آخری تین آیات کی تلاوت اور ترجمہ ابھی آپ نے سنا۔ یہ بات عرض کی جاچکی ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی پہلی منزل یعنی مرد اور عورت کے مابین رشتۂ ازدواج کہ جس سے خاندان کے ادارہ کی بنیاد پڑتی ہے' اس کے ضمن میں نہایت اہم اور بنیادی ہدایات ہیں جو سورۂ تحریم میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ عائلی زندگی کے بارے میں ایک نہایت اہم مسئلہ یہ ہے کہ عورت کا مقام کیا ہے! ..... آپ کو معلوم ہے کہ اس ضمن میں دنیا میں بہت افراط و تفریط رہی ہے۔ عورت کو یا تو بالکل بھیڑ بکری کی طرح ایک ملکیت قرار دیا گیا' ہمارے یہاں کے ایک عام بول چال کے محاورہ کے مطابق اسے جوتی کی نوک سے تعبیر کیا گیا' یا پھر اسے بازار میں لا بٹھایا گیا۔ اور شمع محفل بنا دیا گیا۔ اور کبھی اسے قلو پطرہ کا روپ دھار کر قوموں کی قسمتوں سے کھیلنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ یہ افراط و تفریط ہے جس میں نوعِ انسانی بالعموم مبتلا رہی ہے۔ ...... اسلام نے عورت کو ایک مکمل قانونی اور اخلاقی تشخص عطا کیا پھر اس کے دائرۂ عمل اور میدانِ کار کا تعین کیا۔ اسلام کی رو سے عورت کا ایک علیحدہ قانونی وجود ہے۔ اس کے قانونی حقوق ہیں۔ عورت کی اپنی ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی اس ملکیت میں تصرف کا کامل اختیار رکھتی ہے۔ لہٰذا عام انسانی حقوق کے اعتبار سے مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

حقوق کے ضمن میں نہایت قابل غور پہلو یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو قانونی تشخص

ینے کے ساتھ ساتھ اخلاقی تشخص بھی عطا کیا ہے۔ یعنی عورت اگر کوئی نیک کام کرتی ہے تو
، کا اجر و ثواب اس کے لئے ہے۔ وہ اس معاملے میں مردوں کے تابع نہیں ہے۔ چنانچہ
ر اپنی بیوی کے نان نفقہ کا کفیل اور ذمہ دار تو ہے لیکن اس کے دین و اخلاق کا کفیل اور
۔دار نہیں ہے۔ نیکی اور بھلائی اگر عورت میں ہو گی تو وہ اس کے لئے ہے۔ کوئی خیر عورت
ے گی تو اس کا صلہ اور اجر و ثواب اسی کو ملے گا۔ اسی طرح کوئی نیکی اگر مرد کماتا ہے تو اس کا
و ثواب اسی کے لئے ہے۔

اس ضمن میں قرآن مجید نے یہ اصل الاصول بیان کیا ہے کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانَ اِلَّا
سَعٰی "کسی انسان کے لئے نہیں ہے مگر وہی کچھ جس کے لئے اس نے محنت کی ہے' جس
۔لئے اس نے مشقت اور بھاگ دوڑ کی ہے" پھر یہ کہ انسان ہونے کے ناطے سے مرد اور
ر ت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۹۵ میں فرمایا گیا اِنِّیْ لَا
ضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ "میں تم میں سے کسی
عمل کرنے والے کے کسی بھی عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں خواہ وہ عمل کرنے والا مرد
خواہ عورت ہو" اور یہ مرد و عورت کا فرق خواہ جسمانی فرق و تفاوت ہو' خواہ نفسیاتی ساخت
فرق ہو۔ یہ فرق تو ہم نے تمدنی ضروریات کے تحت رکھا ہے۔ باقی انسان ہونے کے اعتبار
، تم ایک دوسرے ہی سے ہو۔

یہی اصول قرآن مجید میں سورۃ النساء کی آیت نمبر ۳۲ میں نہایت واضح شکل میں سامنے
ا ہے لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَ لِلنِّسَاءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ "مردوں
ے لئے حصہ ہے اس میں سے جو کمائی انہوں نے کی یعنی جو بھلائیاں' جو نیکیاں' جو خیرات' جو
نات انہوں نے اپنی محنت اور مشقت سے کمائی ہیں' ان کا اجر و ثواب ان کے لئے
ہ ... "اور عورتوں کے لئے حصہ ہے اس میں جو کمائی انہوں نے کی" ... جو بھلائیاں
وں نے کی ہیں' جو نیکیاں انہوں نے کمائی ہیں' اس کا اجر و ثواب ان کے لئے ہے۔ اسی
رح جو برائی اور بدی مرد کمائے گا' اس کا وبال اس پر ہو گا اور جو بدی اور برائی عورت کمائے
' اس کی پاداش اس کو بھگتنی ہو گی۔

اس اصول کو سورۃ تحریم کی آخری تین آیات میں تین مثالوں سے واضح کیا گیا ہے کہ

خواتین اس مغالطہ میں نہ رہیں کہ ان کے شوہران کے دین و اخلاق کے بھی کفیل ہیں اور وہ دین و اخلاق کے معاملہ میں مردوں کے تابع ہیں۔ چنانچہ پہلی مثال دو ایسی عورتوں کی پیش کی گئی جن کے شوہر اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر رسول ہیں۔ ایک حضرت نوح اور دوسرے حضرت لوط علیہما الصّلوٰۃ والسلام۔ ان دونوں کی بیویوں کا ذکر کیا گیا کہ چونکہ دین کے اعتبار سے ان کا معاملہ درست نہ تھا۔ انہوں نے اپنے شوہروں کے ساتھ بیوفائی کی تھی.... لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھ لیا جائے کہ ان سے لازمی طور پر کوئی اخلاقی لغزش سرزد ہوئی ہو۔ اپنے شوہروں کے رازوں کا افشا بھی ایک خیانت اور بیوفائی کا عمل ہے۔ اس لئے کہ اسی سورۃ النساء میں جہاں آیت نمبر ۳۴ میں یہ اصل الاصول بیان کیا گیا کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ وہاں ایک مثالی (IDEAL) بیوی کے یہ اوصاف بھی بیان فرمائے گئے ہیں اَلصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ " "نیک بیویاں وہ ہیں جو فرمانبرداری کی روش اختیار کریں اور اپنے شوہروں کا کہنا مانیں۔ اور ان کے رازوں کی پوری حفاظت کریں"۔ ظاہر بات ہے کہ بیوی سے زیادہ مرد کا راز دار اور کون ہو گا! مرد میں اگر کوئی خامی ہے 'اگر کسی پہلو سے اس میں کوئی پوشیدہ جسمانی عیب ہے۔ تو اس کو بیوی سے بڑھ کر جاننے والا اور کوئی نہیں۔ گویا مرد کی پوری شخصیت عورت کے پاس بطور امانت ہے۔ راز کو بھی امانت کہا گیا ہے۔ لہٰذا اگر شوہر نے کوئی راز کی بات بیوی کو بتائی ہو اور بیوی اس راز کو افشا کر دے تو یہ بھی خیانت ہے چنانچہ "فَخَانَتٰھُمَا" کے لفظ سے یہ لازمی نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ ان دونوں جلیل القدر رسولوں کی بیویاں بدچلن اور بدکار تھیں معاذ اللہ۔ قرآن مجید کا جو اصول ہے اگر اس کو سامنے رکھیں تو یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ کسی رسول کے حبالۂ عقد میں کوئی بدچلن اور بدکار عورت ہو۔

لہٰذا ان خواتین کا یہ طرزِ عمل کہ درپردہ وہ اپنی کافر قوموں کے ساتھ تھیں اور ان کی ہمدردیاں کفار کے ساتھ تھیں 'اسے یہاں خیانت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں جو اصل بات بتانی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ دونوں عورتیں ہمارے رسولوں کے حبالۂ عقد میں تھیں لیکن چونکہ ان دونوں کے اپنے اعمال درست نہ تھے لہٰذا ان کا انجام کافروں کے ساتھ ہو گا۔ رسول کی زوجیت میں ہونا انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔ چنانچہ ان سے کہہ دیا گیا کہ وَقِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ " دوزخ میں داخل ہو جاؤ دوسرے داخل ہونے والوں

کے ساتھ۔" یہاں قیل فعل ماضی مجہول ہے۔ قرآن مجید میں جہاں بھی قیامت کے حالات کا ذکر ہوتا ہے وہاں عام طور پر فعل ماضی استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے کہ فعل ماضی میں قطعیت وحتمیت ہوتی ہے۔ جیسے کوئی کام ہو چکا۔ اور جیسے کوئی چیز ہو چکی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ جتنی یقینی بات وہ ہوتی ہے جو وقوع پذیر ہو چکی ہو اتنی ہی یقینی بات قیامت و آخرت کی ہے۔ لہٰذا آخرت کے احوال بیان کرتے ہوئے قرآن مجید عام طور پر ماضی کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ یہاں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے ہو سکتا ہے کہ اس میں عالم برزخ میں یہ بات کہی جانے کی طرف اشارہ ہو رہا ہو واللہ اعلم بالصواب لیکن یہاں جس حقیقت کی جانب نشاندہی مقصود ہے اسے میں سابقہ درس میں بھی آپ کے سامنے اس حدیث کے حوالے سے بیان کر چکا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لخت جگر' نور نظر حضرت فاطمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے ارشاد فرمایا تھا کہ اے فاطمہ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی۔ اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ اس لئے کہ مجھے تمہارے بارے میں اللہ کے یہاں کوئی اختیار حاصل نہیں ہو گا ۔۔ یہاں فرمایا جارہا ہے کہ حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر آخرت میں اپنی بیویوں کے کام نہ آسکیں گے۔ یہ مثال بیان ہوئی ان دو عورتوں کی جو دو بہترین شوہروں کے حبالۂ عقد میں تھیں۔ لیکن چونکہ وہ خود اہلِ ایمان میں سے نہ تھیں لہٰذا ان کے شوہروں کی نیکی اور بزرگی انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکے گی۔

اب اس کے برعکس ایک مثال سامنے آرہی ہے کہ ایک بدترین شخص کے نکاح میں ایک نہایت نیک اور صالحہ خاتون ہیں۔ فرعون جیسا سرکش و متمرد 'اللہ کا باغی' خدائی کا مدعی! لیکن اس کے عقد میں حضرت آسیہ ہیں۔ اغلباً یہ وہی خاتون ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں بہتے ہوئے صندوق سے نکالا تھا اور فرعون کو آمادہ کر لیا تھا کہ انؑ کی پرورش وہ خود کریں گی ..... وہ یقیناً بنی اسرائیل کی کوئی مومنہ و صالحہ خاتون تھیں' جو فرعون کی بیوی تھیں ــــــــــ ... قرآن مجید کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ ان کی نیکی کا یہ عالم تھا کہ فرعون کا محل اور وہاں کی آسائشیں اور سہولتیں' وہاں کا آرام گویا ان کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ شوہر کی ضلالت' اس کی گمراہی اور بے راہ روی اور اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے وہ عیش و آرام' جو شاہی محل کا جزو لاینفک ہوتا ہے' وہ ان پر دو بھر تھا۔ اور ان کی دعا قرآن نے نقل کی

ہے کہ "پروردگار مجھے جلد سے جلد فرعون سے، اس کے عمل سے اور ظالم و مشرک قوم سے نجات دے کر اپنے پاس بلا اور اپنے جوارِ رحمت میں یعنی جنت میں میرے لئے گھر بنا"۔ اس دوسری مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی عورت کا شوہر خواہ کتنا ہی بدکردار شخص ہو، کافر و مشرک ہو لیکن اگر وہ عورت خود مومنہ اور صالحہ ہے تو اس کا اجر اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔ شوہر کی برائی اسے کچھ نقصان نہ پہنچائے گی۔

اب آگے اس ضمن میں تیسری مثال آ رہی ہے ایک ایسی خاتون کی کہ جنہیں ماحول بھی بہترین ملا اور پھر جن کے خود اپنے اندر بھی نیکی، بھلائی اور حسنات کے بہترین رجحانات اور میلانات بکمال و تمام موجود ہیں۔ گویا وہ نُورٌ علیٰ نُور کی مثال ہیں..... پہلی مثال تھی بہترین شوہروں کے گھروں میں بدترین بیویوں کی۔ دوسری مثال اس کے بالکل برعکس تھی کہ ایک بدترین شوہر کے عقد میں ایک بہترین خاتون ہیں..... اب تیسری مثال نُورٌ عَلیٰ نُور کی آرہی ہے جو حضرت مریم سلام علیہا کی ہے..... جو خود نہایت نیک، صالحہ، عبادت گذار پھر ان کی والدہ کتنی نیک تھیں جنہوں نے ان کی پیدائش سے پہلے ہی اپنی ہونے والی اولاد کو اللہ کی نذر کر دیا تھا جس کا ذکر سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۳۵ میں بایں الفاظ آیا ہے رَبِّ اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لَکَ مَافِیۡ بَطۡنِیۡ مُحَرَّرًا اے رب میرے! میں نے تیرے لئے نذر کیا جو کچھ میرے پیٹ میں ہے۔ دنیا کے تمام بکھیڑوں سے اسے چھٹکارا دلاتے ہوئے"۔ یعنی میں اس کو صرف تیرے دین کی خدمت کے لئے وقف کرنے کا عہد کرتی ہوں۔ تو یہ خاتون ہیں جن کی آغوش میں حضرت مریمؑ نے پرورش پائی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو ان کا مربی اور کفیل بنایا جو اللہ کے نبی اور ہیکل سلیمانی (بیت المقدس) کے مجاور اور نگران بھی ہیں اور رشتے میں حضرت مریمؑ کے خالو ہیں تو گویا یہ نُورٌ عَلیٰ نُور کا معاملہ ہے۔ ایک طرف حضرت مریمؑ کی سیرت اور ان کا کردار ہے جس کی یہاں اللہ تعالیٰ مدح فرما رہے ہیں کہ انہوں نے اپنی عصمت و عفت کی کامل طور پر حفاظت کی۔ پھر امر واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت بڑی آزمائش سے دوچار فرمایا۔ ایک نوجوان خاتون جو ناکتخدا ہو، جس کی شادی نہ ہوئی ہو اور اسے حمل ہو رہا ہو۔ اب آپ خود سوچئے کہ معاشرہ میں کیسی رسوائی کا سامان ہے جو ان کے لئے فراہم ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کس شدید آزمائش میں مبتلا کیا ہے۔ لیکن اس اللہ

کی بندی نے اپنے رب کے ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ یہ ان کی زندگی کا نقشہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے تمام احکام کی تعمیل کی۔ پھر انہوں نے تمام آسمانی کتابوں کی بھی تصدیق کی تورات تو موجود تھی ہی۔ پھر تمام انبیاء کے بہت سے صحیفے بھی موجود تھے انہوں نے سب کی تصدیق کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم دینیہ سے انہیں خصوصی دلچسپی تھی۔ آیت کے آخر میں ان کی مدح پھر ان الفاظ مبارکہ سے فرمائی وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ وہ اللہ کی فرماں برداروں میں سے ایک بندی تھی۔

غور کیجئے کہ یہاں تین مثالوں کے ذریعے تین ممکنہ صورتوں کو بیان کر دیا گیا لیکن ایک امکان ابھی باقی ہے۔ اس عمارت کا ایک کونا ابھی خالی ہے۔ بہترین شوہروں کے یہاں بدترین عورتوں کی مثال حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویاں ہیں۔ بدترین شوہر کے یہاں بہترین خاتون کی مثال حضرت آسیہ ہیں۔ بہترین ماحول میں بہترین خاتون گویا نُوْرٌ عَلٰی نُوْر کی مثال حضرت مریمؑ ہیں۔ اب ایک مثال رہ جاتی ہے کہ شوہر بھی بدترین ہو اور بیوی بھی۔ گویا ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کا نقشہ ہو۔ جسے ہم اپنے محاورہ میں کہتے ہیں کہ کڑوا اور پھر نیم چڑھا۔ چنانچہ اس کی مثال ہمیں قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر ملتی ہے اور وہ ہے سورۃ اللھب اس سورہ مبارکہ میں ابو لہب اور اس کی بیوی دونوں کا ذکر ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝ وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝

اس سورہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو لہب اور آپؐ کی چچی (ابو لہب کی بیوی) ام جمیل کی حضورؐ سے عداوت کا بیان ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے کس کو نبی اکرمؐ سے زیادہ عداوت، بغض اور دشمنی تھی۔ چونکہ دونوں ہی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حضورؐ کی دشمنی، عداوت اور ایذا رسانی میں پیش پیش تھے۔ تو سورۃ اللھب مثال ہے بدترین شوہر اور بدترین بیوی کی۔ اس طرح یہ کونا اور گوشہ بھی پُر ہو جاتا ہے۔ کہ شوہر بھی بدترین ہو اور بیوی بھی بدترین ہو تو اس کی صورت کیا ہو گی۔ چنانچہ ان کے بارے میں

اسی دنیا میں جہنم کا فیصلہ سنا دیا گیا۔

اب ان چاروں مثالوں کو سامنے رکھ کر جو نتیجہ نکلا وہ یہ ہے کہ عورت کا اپنا ایک ذاتی تشخص ہے۔ اس معاملہ میں عورت لازماً اپنے شوہر کے تابع نہیں ہے۔ وہ دینی و اخلاقی طور پر ایک آزادانہ تشخص کی مالک ہے۔ اس کے اندر اگر بھلائی ہے' نیکی ہے' خیر ہے تو وہ اسی کے لئے ہے لیکن برائی ہے' بدی ہے' سرکشی ہے تو اس کا وبال بھی اسی پر آئے گا۔ چونکہ اسلام کے عائلی نظام میں مالی اعتبار سے شوہر بیوی کا کفیل ہوتا ہے لہٰذا ہمارے یہاں بعض خواتین کو غیر شعوری طور پر یہ مغالطہ لاحق ہو گیا ہے کہ شاید نیک کام کرنا' بھلائیاں کمانا' دین کی خدمت کرنا یہ صرف مردوں کے کرنے کا کام ہے۔ اور مرد اگر یہ کام کرلیں تو عورتوں کے لئے کفایت کرے گا۔ اس مغالطہ کی ان آیات مبارکہ کی روشنی میں مکمل اصلاح ہو جانی چاہئے۔ میں پھر وہی الفاظ دوہرا رہا ہوں جو سورۃ النساء کی آیت نمبر ۳۲ میں آئے کہ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ

اب آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کے بارے اگر کوئی سوال یا اشکال ہو تو وہ آپ پیش فرما سکتے ہیں۔

سوال و جواب

سوال..... ڈاکٹر صاحب! ہمارے معاشرے میں بعض خاندانوں میں خواتین کو وراثت سے محروم رکھا جاتا ہے۔ براہِ کرم اسلامی نقطۂ نظر سے اس پر روشنی ڈالئے؟

جواب..... یہ تو بالکل واضح بات ہے کہ اسلام کی رُو سے یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ بہت بڑی ناانصافی ہے۔ اس طرح انسان گویا اللہ تعالیٰ کے احکام میں خود اپنی مرضی کو دخل دے رہا ہے اور انہیں پس پشت ڈال رہا ہے۔ اس روش کے حرام ہونے اور بہت بڑی معصیت ہونے میں کسی بھی فقہی مسلک میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

سوال..... ڈاکٹر صاحب! آج کل کے زمانہ میں لوگ خاندان' دولت اور خوبصورتی کو بڑی اہمیت دیتے ہیں! اسلامی نقطہ نگاہ سے ایک اچھی بیوی میں کیا خوبیاں دیکھی جانی چاہئیں؟

جواب..... آپ نے بہت اچھا سوال کیا ہے اور اس کا جواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کے مفہوم کے حوالہ سے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ حضورؐ نے

فرمایا کہ عورت سے شادی کی جاتی ہے' اس کی خوبصورتی کی بنیاد پر بھی اور اس کی دولت کی بنیاد پر بھی لیکن اے مسلمانو! تمہیں سب سے زیادہ دین داری کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اخلاق کو' کردار کو حسنِ سیرت کو باقی تمام چیزوں پر مقدم رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ آگے جو نسل چلنی ہے اس کے اندر اگر یہی چیزیں نہ آئیں تو ظاہر بات ہے کہ یہ رشتۂ ازدواج دینی اعتبار سے نفع بخش ثابت نہیں ہو گا۔ اگر اولاد میں بھی دین داری اور خیر مطلوب ہے تو انسان کو شادی کرتے ہوئے دین داری کو' اخلاق کو اور حسن سیرت کو مقدم رکھنا چاہئے۔ چونکہ اولاد کی اولین تربیت گاہ اس کی ماں کی آغوش اور اس کی نگرانی ہے۔

حضرات! آج کے درس پر سورہ تحریم کا ہمارا مطالعہ ختم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی کتاب مبین کا صحیح فہم عطا فرمائے اور اس کے مطابق اپنی زندگیوں کے رخ کو عملاً بدلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

****

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝

(الفرقان : ۷۴)

اے ہمارے رب

ہمیں ہماری اولاد اور بیویوں (کی طرف) سے

آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما

اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا دے

□ □ □ □

میاں عبدالواحد

بھگوان سٹریٹ، پرانی انارکلی لاہور

'اِک بندۂ عاصی کی اور اتنی مدارتیں'

ڈاکٹر اسرار احمد

'نوائے وقت' کے ساتھ راقم الحروف کے ذہنی اور قلبی تعلق کا عرصہ اس کی کل عمر سے صرف تیرہ یا چودہ سال کم ہے۔ اس لئے کہ ۴۷۔۱۹۴۶ء میں راقم مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن حصار کے ان کارکنوں میں شامل ہوتا تھا جو ریلوے سٹیشن پر اس ٹرین کا انتظار کیا کرتے جس کے ذریعے "نوائے وقت" کا بنڈل آتا تھا۔

پاکستان کے چالیس سالوں کے دوران بھی اگرچہ راقم کی جماعتی یا تنظیمی وابستگی پر مختلف ادوار آئے لیکن "نوائے وقت' کے ساتھ ذہنی بلکہ اس سے بھی زیادہ قلبی تعلق قائم رہا۔

ادھر کچھ عرصے سے مختلف اسباب کی بنا پر راقم کا نام اخبارات میں آنے لگا تو فطری طور پر "نوائے وقت" کی جانب سے وقتاً فوقتاً تنقید یا ناصحانہ مشورہ ملتا رہا۔ اور اس پر خدا گواہ ہے کہ سوائے ایک بار کے، کبھی دل نے کوئی آزردگی محسوس نہیں کی۔

لیکن جمعرات ۸ر اکتوبر کا شمارہ آیا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ادارتی صفحہ کا پورا نصف زیریں اس عاجز و ناچیز کے لئے وقف ہے۔ اس پر بے اختیار یہ سوال ذہن میں ابھرا کہ آیا "نوائے وقت" کے صفحات کی وقعت کم ہو گئی ہے' یا خدانخواستہ راقم کی شخصیت پر کسی مصنوعی اہمیت کا خول چڑھ گیا ہے کہ ایک اہم قومی روزنامے کے اداتی صفحے پر بیک وقت دو دو مضامین میرے بارے میں شائع ہوئے ہیں ... ساتھ ہی کئی دن تک مولانا محمد علی جوہر کا یہ مصرعہ ذہن میں گردش کرتا رہا کہ ؏

"اک بندۂ عاصی کی اور اتنی مدارتیں!"

....

عجیب اتفاق ہے کہ میرے حالیہ دو ناصحین میں سے ایک کراچی کے میاں ظفیر احمد صاحب ہیں جنہیں میں اپنا بزرگ سمجھتا ہوں اور دوسرے "نوائے وقت' کے ایک تازہ کالم

نگار جاوید احمد صاحب جو خود مجھے اپنا بزرگ قرار دیتے ہیں!

میاں ظفیر احمد صاحب سے ایک سال قبل جب کراچی میں پہلی ملاقات ہوئی تو راقم کو بالکل ویسا ہی احساس ہوا جیسا لگ بھگ بیس سال قبل مرزا محمد منور صاحب سے پہلی ملاقات پر ہوا تھا۔ یہ ۱۹۶۶ء کی بات ہے اور اس وقت میں نے اپنے اور مرزا صاحب کے ایک مشترک دوست کے سامنے اپنا یہ تأثر بیان کیا تھا کہ "بہت عرصے کے بعد ایک خالص اور مخلص مسلم لیگی سے ملاقات ہوئی" .... اس وقت یاد ہو گا کہ مسلم لیگ کا جسد عنصری تین حصوں میں منقسم ہو چکا تھا، یعنی کنونشن لیگ' کونسل لیگ اور قیوم لیگ اور تینوں لیگوں کے اس وقت کے جملہ زعماء میں سے کسی ایک سے بھی مرزا صاحب کو کوئی خاص حسن ظن نہ تھا..... لیکن اس سب کے باوجود قائداعظم اور علامہ اقبال دونوں کے ساتھ والہانہ عشق کی بناء پر مرزا صاحب کا قلبی تعلق "مسلم لیگ" کے ساتھ پوری شدت سے برقرار تھا۔ بالکل یہی کیفیت میاں ظفیر احمد صاحب سے مل کر محسوس ہوئی کہ اب جبکہ وقت کے دریا میں بہت سا پانی مزید بہہ چکا ہے۔ جس کے دوران ملک کے دولخت ہونے کا حادثہ بھی پیش آچکا اور عروج و زوال کے بھی متعدد دور مزید گزر چکے' میاں صاحب کے "مسلم لیگ" کے ساتھ اتنے گہرے ذہنی اور قلبی تعلق سے شدید حیرت ہوئی کہ انہوں نے خود مجھے باضابطہ طور پر مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دی اور اس سے خدا جانتا ہے کہ میرے دل میں ان کی بڑی قدر و منزلت پیدا ہوئی کہ ع

"وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے"

تاہم میاں صاحب سے یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ مسلم لیگ کی تباہی اور بربادی کا سارا الزام دوسروں پر رکھ دینا درست نہیں ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ یہاں معاملہ بالکل وہ ہوا کہ ع

"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

ویسے بھی یہ دنیا کا مسلّم اصول ہے کہ باہر کے حملے اسی وقت کارگر ہوتے ہیں جب اندر شکست و ریخت کے اسباب و آثار موجود ہوں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ پنجاب میں دولتانہ ممدوٹ کشمکش نہ جماعت اسلامی کی پیدا کردہ تھی' نہ کانگریسی یا احراری علماء کی۔ بالخصوص مؤخر الذکر نے تو کم از کم پورے چھ سال سیاست سے علی الاعلان کنارہ کش ہو کر بالکل خاموشی کے ساتھ

بسر کئے تھے............ پھر جب ایک خالص دینی مسئلے پر وہ دوبارہ سرگرم ہوئے تب بھی اس حقیقت سے صرفِ نظر خود فریبی کے سوا کچھ نہیں کہ اس معاملے کو خطرناک اور تباہ کن رخ پر وقت کی صوبائی اور مرکزی حکومتوں کی باہمی کشمکش نے ڈالا تھا............ رہی جماعت اسلامی' تو اگرچہ خود راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ اس کی قیام پاکستان کے بعد کی پالیسی سے نہ صرف یہ کہ مسلم لیگ کو بحیثیت مجموعی شدید ضعف پہنچا بلکہ اس سے بھی اہم تر بات یہ کہ اس کے باعث مسلم لیگ کے ان مخلص اور دیندار عناصر کے ہاتھ کمزور ہو گئے جنہیں خود اپنی ہی جماعت کے لبرل یا سیکولر ذہن کے حامل لوگوں سے مقابلہ درپیش تھا۔ تاہم یہ کہنا کہ جماعت اسلامی نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر اور عواقب و نتائج کے پورے شعور و ادراک کے ساتھ کیا تھا بہت بڑی زیادتی ہی نہیں' محاسبۂ اخروی کے اعتبار سے نہایت نامناسب بھی ہے۔ اس لئے کہ نیتوں کا حال سوائے اللہ کے اور کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا۔

رہا راقم الحروف کے جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے پر میاں صاحب کا رنج و غم تو میرے دل میں اس کی بھی بہت قدر ہے۔ اس لئے کہ خود راقم نے بھی جب تیس برس قبل جماعت کی رکنیت سے استعفا دیا تھا تو اس کے جو جذبات تھے وہ استعفے کی درج ذیل عبارت سے ظاہر ہو جائیں گے کہ:

"اس دس سال کے عرصے میں میری پوری دنیا جماعت ہی کے چھوٹے سے حلقہ میں محدود رہی ہے۔ تعلقات اور دوستیاں' محبتیں اور' الفتیں' حتیٰ کہ رشتہ داریاں تک اسی حلقہ میں محدود رہیں۔ بیٹھنا اٹھنا بھی اسی میں رہا اور ہنسنا بولنا بھی اسی میں رہا۔ اب دفعتاً اس حلقہ سے نکلتے ہوئے دل و دماغ سخت صدمہ محسوس کر رہے ہیں۔ کتنے ہی بزرگوں سے مجھے والہانہ عقیدت ہے اور کتنے ہی ساتھیوں سے بے پناہ محبت ہے۔ جب میں سوچتا ہوں آج کے بعد شاید میرے یہ بزرگ میری عقیدت کی قدر نہ کریں اور میرے دوست میری محبت پر اعتماد نہ کریں تو دل اندر سے پکڑا سا جاتا ہے۔ پھر میں یہ بھی جانتا ہو کہ جماعت کے بہت سے بزرگ مجھ سے بزرگانہ شفقت کا اور کتنے ہی ارکان و متفق مجھ سے حقیقی محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ جب سوچتا ہوں کہ آج اپنے اس اقدام سے میں نہ معلوم کتنوں کے

جذبات کو مجروح کروں گا تو اپنے ہی آپ میں ایک ندامت کا احساس بھی ہوتا ہے
لیکن اس سب کے باوجود اس اقدام پر مجبوراً اس لئے آمادہ ہو گیا ہوں کہ اب اس
کے سوا اور کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا!۔ "

تاہم اس مسئلے کو بھی میاں صاحب نے جس انتہا تک پہنچا دیا ہے وہ ہرگز درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ جماعتوں اور تنظیموں میں شرکت و شمولیت مقاصد کے اشتراک اور طریق کار کے ضمن میں اتفاق کی بنیاد پر ہوتی ہے اور انہی دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے فقدان کے باعث علیحدگی بھی ایک فطری اور منطقی عمل ہے۔ اگرچہ یہ علیحدگی بعد میں نتائج و عواقب کے اعتبار سے صحیح بھی ثابت ہو سکتی ہے اور غلط بھی' مفید بھی ثابت ہو سکتی ہے اور مضر بھی!........ اب اگر کسی شخص کا اپنا مزاج "وفاداری بشرطِ استواری" والا ہو تو جہاں اسے دوش نہیں دینا چاہئے وہاں اسے ایک ناقابل استثناء کلیے کی شکل دے دینا بالبداہت غلط ہے کہ ؏

" حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے!"

کے مصداق کسی شخص کو ایک بار کسی جماعت میں شامل ہونے کے بعد کبھی کسی بھی صورت میں اس سے علیحدہ نہیں ہونا چاہئے........ اس ضمن میں راقم میاں صاحب سے یہ سوال کرنے کی جسارت کرتا ہے کہ اگر قائداعظم انڈین نیشنل کانگریس میں طویل عرصے تک نہایت سرگرمی کے ساتھ شامل رہنے کے بعد علیحدہ نہ ہوتے تو پاکستان نام کا کوئی ملک دنیا کے نقشے پر کبھی رونما ہو سکتا تھا؟

جہاں تک پاکستان کی نوجوان نسل کو ذہنی و فکری انتشار اور مختلف النوع مایوسیوں اور دل شکستگیوں میں مبتلا کرنے میں راقم الحروف یا اس کے قبیل کے لوگوں کی ذمہ داری کا تعلق ہے' راقم ادب کے ساتھ گزارش کرتا ہے کہ اس کا تعلق تو خود اسی نسل سے ہے جو قیام پاکستان کے وقت بالکل نوجوان تھی اور جس نے کم از کم ڈیڑھ دو سال خواہ شعوری خواہ غیر شعوری طور پر تحریک پاکستان کے قائدین کی جوتیاں سیدھی کیں تھی۔ یہاں تک کہ " پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ! " اور "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ! " کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے خود سردار شوکت حیات خان ایسے زعماء کے لئے دیدہ و دل فرش

راہ کئے تھے جواب ان نعروں ہی سے اعلان برأت کر رہے ہیں............ سوال یہ ہے کہ ہمیں کس نے بددل اور مایوس کیا تھا کہ ہم مسلم لیگ کا دامن چھوڑ کر ان دوسری جماعتوں کے دامن سے وابستہ ہونے پر مجبور ہوئے جنہوں نے پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کا نعرہ لگایا۔ اس ضمن میں میاں ظفیر احمد صاحب کا شمار کم از کم میری نسبت سے بزرگوں میں ہونا چاہئے 'لہٰذا وہ سوچیں کہ اس مسئلے میں بھی کہیں معاملہ وہی تو نہیں کہ ؏

" میں الزام ان کو دیتا تھا' قصور اپنا نکل آیا!"

اس ساری قیل و قال سے قطع نظر ہم سب کے سمجھنے کی اصل بات یہ ہے کہ یہ وقت شکووں اور شکائتوں یا باہم ایک دوسرے پر الزام دھرنے کا نہیں ہے بلکہ اس اہم ترین اور نازک ترین مسئلے پر مل جل کر غور کرنے کا ہے کہ اس وقت ملک وملت کی کشتی جس گرداب میں پھنسی ہوئی ہے اس سے اسے کس طور پر سے نکالا جائے؟ ...... گزشتہ چالیس سال میں یہ ملک جس حال کو پہنچا ہے اور جو انجام بد اب سامنے نظر آ رہا ہے اس ضمن میں قصور کسی ایک فرد یا ایک گروہ یا ایک جماعت کا نہیں ہے بلکہ ؏

" ایں خانہ ہمہ آفتاب است!"

کے مصداق اس میں بڑوں اور چھوٹوں اور اپنوں بیگانوں' سب کی غلطیاں شامل ہیں اور اب ہمیں اس قضیئے کو مستقبل کے مؤرخ کے حوالے کر کے کہ ماضی میں کس کا قصور کتنا تھا' اپنی تمام تر توجہات کو حال کی اصلاح اور مستقبل کی تعمیر پر مرکوز کر دینا چاہئے۔

جہاں تک عزیزم جاوید احمد کی 'نوازشات' کا تعلق ہے' ان کی قائم کردہ "تنقیحات" بلکہ "تنبیہات" کے ضمن میں میرے اور ان کے مشترک بزرگ شیخ جمیل الرحمن صاحب جو وضاحتیں کر چکے ہیں" اگر وہ ان پر غور فرمائیں گے تو وہ انشاءاللہ ان کے اطمینان کے لئے کفایت کریں گی ......

("نوائے وقت" شمارہ ۲۲ر اکتوبر میں شائع ہوا)

****

نبی اکرمؐ کی اصل جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو
کوئی نہیں جان سکتا، مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ

"بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر"

ہمارے لیے اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ:—
کیا ہم آپؐ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں؟
اس لیے کہ اسی پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے

اِس اہم موضوع پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف

نبئ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

ہمارے تعلق کی بنیادیں

کا خود بھی مطالعہ کیجئے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجئے

شائع کردہ

مرکزی انجمن خدّام القرآن —— لاہور

"اسلامی انقلاب کے المیے" کا تجزیہ

شیخ جمیل الرحمٰن

مؤقر روزنامہ نوائے وقت کے شمارہ ۸ / اکتوبر میں صاحب شذرات نے "اسلامی انقلاب کا المیہ" کے زیر عنوان سنجیدگی سے اپنا ذہن قارئین کے سامنے کھول کر رکھا۔ ان کی تنقیحات یقیناً توجہ طلب ہیں۔ انہوں نے جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور اور تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے فکر اور اسلامی انقلاب کے اس طریق کار کا خلاصہ بھی ٹھیک ہی بیان کیا ہے جسے ان دونوں حضرات نے منہاج نبوت قرار دیا اور الحمد للہ کہ اس کی تصویب بھی کی۔ اگرچہ ابعادِ انقلاب کی ایک اہم جہت کی طرف انہوں نے التفات نہیں کی اور وہ یہ کہ اس عمل میں چونکہ ایک نافذ و موجود نظام کے پورے سیاسی اور معاشی ڈھانچے کو تبدیل کرنا مقصود ہوتا ہے' لہٰذا مفاد یافتہ طبقات سے کشاکش شروع ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کشمکش اور مجاہدہ افراد یا غیر منظم گروپوں کے بس کی بات نہیں ہوتی' ایک مضبوط تنظیم ہی اس کا بیڑا اٹھانے کا حوصلہ کر سکتی ہے۔ اس طرف صاحب شذرات نے توجہ کی ہوتی تو جن حقائق کی نشاندہی انہوں نے کی ہے اور جو ان کے خیال میں اسلامی انقلاب کے ان داعیوں نے نظر انداز کئے رکھے' ان کی تعداد بھی کم ہو جاتی اور ان سطور کے ناچیز راقم کی گفتگو بھی مختصر ہوتی جو عمر عزیز کا سب سے بیش قیمت حصہ مولانا مودودی مرحوم کی تحریک کی نذر کر چکنے کے بعد اب جسم و جان کی بچی کھچی توانائی ڈاکٹر اسرار احمد کی دعوت قرآنی اور تنظیم اسلامی میں لگا رہا ہے۔ اسے اگرچہ یہ سہولت تو حاصل ہے کہ اپنی گفتگو میں دونوں کوششوں کا حوالہ دے سکے اور دونوں کے پس منظر اور درپیش صورت حال کو بیک وقت سامنے رکھے' تاہم وہ زبان و بیان میں کسی قابل ذکر دسترس کا ہرگز دعویدار نہیں۔ بایں ہمہ یہ تحریر ہی شاید پڑھنے والوں پر غور و فکر کے چند نئے گوشے کھولنے اور کچھ نکات کی وضاحت کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

محولہ بالا کالم میں قائم کردہ ترتیب کے مطابق ہی عرض ہے کہ[1]

۱۔ صاحبِ شذرات نے بجا فرمایا کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح انقلاب کے جملہ مراحل کی اپنی مختصر حیاتِ دنیوی میں تکمیل فرما کر بالفعل اسے برپا کر کے دکھا دیا اس طرح اب قیامت تک کوئی شخص یہ سب کام تنہا نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب تو اس سے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ تاریخ انسانی میں حضورؐ سے پہلے بھی کبھی یہ معجزہ رونما نہ ہوا تھا۔ گویا ابتدائے آفرینش سے قیام قیامت تک یہ اپنی طرح کی واحد مثال رہے گی۔ وہ ہرگز اس زعم میں مبتلا نہیں ہیں وہ تو کیا' کوئی اور مرد میدان بھی اس معجزہ کے صدور کی بقائمی ہوش و حواس اپنے آپ سے توقع نہیں رکھ سکتا۔ لیکن ہمارے آقا و مولاؐ اس بات کو تو ہمیشہ کے لئے ثابت کر گئے ہیں کہ کرنے کا کام اور اس کا انداز یہی ہے کہ انقلاب کے جملہ مقتضیات کے لئے جدوجہد کا حق ایک ہی نظم کی لڑی میں منسلک گروہ کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں کو مختلف افراد یا اداروں کی صوابدید پر چھوڑ دینے سے ربطِ باہم کی صورت پیدا نہیں ہوتی اس کام میں حضورؐ کی رہنمائی منصبِ رسالت کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے براہ راست کی تو بعد میں آنے والوں کے لئے خود حضورؐ کی حیاتِ طیبہ اور اسوۂ حسنہ خضرراہ بنے۔ رہی اتنے ہمہ گیر انقلاب کو عالم واقعہ میں برپا کر کے دکھا دینے کی بات' تو اگرچہ اس کا مکلف تو حضورؐ کا کوئی امتی نہیں' تاہم منہاج نبوتؐ کے اتباع میں اپنی زندگی اس کام میں کھپا دینے کی ذمہ داری ہر اس شخص پر عائد ہوتی ہے جسے قسامِ ازل نے مطلوبہ صلاحیت میں سے کچھ حصہ عطا کیا ہو۔ اس مشن میں کامیابی و ناکامی کا معیار ہی دگر ہے' اور اس کام میں اپنی جملہ صلاحیتیں اور توانائیاں کھپا دینا ہی اصل کامیابی ہے۔

۲۔ یہ تو درست ہے کہ اسلامی انقلاب کے لئے دعوت و جدوجہد کی جہتیں متعدد ہیں اور اپنے مزاج کے لحاظ سے اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ ہر ایک کے لئے مناسب و موزوں افتادِ طبع رکھنے والے لوگ مہیا ہوں لیکن ان کے کام کو مربوط رکھنے کے لئے لازم آتا ہے کہ سب کو کسی ایک جگہ اور ایک ہی شخصیت کے زیرِ سایہ جمع کیا جائے۔ خود مولانا مودودی مرحوم نے

---

[1] ۔ یہ وضاحتی مضمون نوائے وقت کی اشاعت ۲۰ ر اکتوبر میں شائع ہو چکا ہے اور وہاں سے شکریے کے ساتھ نقل کیا جا رہا ہے۔

ماضی قریب میں ان سب طبائع کو اپنی قیادت میں یکجا کر کے دکھا دیا تھا جن کی نشاندہی صاحب شذرات نے بہت سی محترم شخصیتوں کے حوالے سے کی ہے چنانچہ مولانا فراہیؒ کے شاگردِ رشید اور وارثِ علمی مولانا امین احسن اصلاحی نے ۱۷ سال مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے معنوی خلیفہ کی قیادت و سیادت میں بسر کئے' مزید بر آں دیوبند کے حلقے کی مؤقر شخصیت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ اور دبستان شبلیؒ کے گل سر سبد مولانا سلیمان ندویؒ کے شاگردان رشید میں سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اور مولانا مسعود عالم ندویؒ جیسے قد آور رجال دین نے بھی اسی کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور یہ تو محض دو مثالیں ہیں' طوالت کا خوف نہ ہوتا تو یہ عاجز صاحب شذرات کے نامزد تمام آئمہ وا کابر کے نمائندوں کی فہرست دے سکتا تھا جو اقامت دین کی جدوجہد کے لئے ایک چھت کے نیچے جمع ہوئے اور علیٰ وجہ البصیرت جمع ہوئے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جلد یا بدیر "کوئی کارواں سے ٹوٹا' کوئی بدگماں حرم سے........." اس سے زیادہ تفصیل میں جانا فی الحال نہ ضروری ہے اور نہ مناسب کہ ع

"انیس ٹھیس نہ لگ جائے آب گینوں کو"

کسی ایک یا متعدد کوششوں کی ناکامی اس بات کو لازم قرار نہیں دیتی کہ بنیادی طریقِ کار اور منہجِ عمل کی پوری بساط ہی لپیٹ دی جائے۔ اب کسی کو نبوت کی معصومیت اور وحی کی رہنمائی تو میسر نہیں ہوگی' اگلوں کی غلطیوں سے سبق لے کر پیچھے آنے والے اپنے کام کی نوک پلک سنواریں گے اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا تا آں کہ اللہ کی کبریائی روئے ارضی کے کسی خطے پر قائم و نافذ ہو جائے اور اس طرح اسلام کے موعودہ عالمی غلبے کی راہ ہموار ہو جائے۔

۳۔ اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کی حامل شخصیتوں کا تعاون اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے لئے متوقع ہی نہیں شرطِ لازم ہے اور اس بات سے بھی اتفاق کیا جانا چاہئے کہ ان سب سے آزادیٔ رائے کا حق چھیننا مناسب و معقول طرزِ عمل نہ ہو گا' تاہم اس آزادی کی کوئی حد تو ہوگی۔ یہ تو نہ ہونا چاہئے کہ "من چہ سرائم و طنبورہ من چہ می سرائد"۔ ایسی بے حد و بے قید آزادی تو اصل مقصد کے لئے اس سے کہیں زیادہ نقصان دہ ہوگی جس کا اندیشہ صاحب شذرات کو رائے اور عمل کی آزادی سے دستبرداری کے تقاضے کی صورت میں ہے۔ عمل کی آزادی کو کسی بھی عملی جدوجہد میں رائے کی آزادی سے بھی زیادہ پابند حدود و قیود ہونا چاہئے۔ بالخصوص انقلابی

جدوجہد کا مرحلہ نظم و ضبط کی ایک کم سے کم درجے میں پابندی کے بغیر طے نہیں کیا جاسکتا اور نظم و ضبط عمل کی یک رنگی و ہم آہنگی کے بغیر محال مطلق ہے۔ اس ضمن میں قائد اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی مثال بھی رائے اور عمل کی آزادی کے نظریئے پر صادق نہیں آتی۔ حصول آزادی کی جدوجہد علامہ اقبالؒ کی زندگی میں جن ادوار سے گزری 'ان کے فکر اور ان کی شاعری میں وہ سنگ ہائے میل کی طرح نمایاں ہیں۔ مزید بر آں فکر و حکمت میں جس مرتبہ و مقام پر حضرت علامہ فائز تھے اس کے علی الرغم کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ انہوں نے مسلم لیگ کی ایک صوبائی شاخ کی صدارت بھی قبول کی اور عملی سیاست سے مزاج کے کوسوں دور ہونے کے باوصف الیکشن کی بھی بادیہ پیمائی کی۔ مزید بر آں یہ بات بھی پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ تحریک پاکستان کے آخری مرحلے میں علامہ اگر بقید حیات ہوتے تو قائد اعظمؒ کی قیادت کو اسی طرح دل و جان سے قبول کرتے جیسے قبول کرنے کا حق ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ان میں اور پنجاب کے یونینسٹ لیڈروں میں کیا فرق و امتیاز رہ جاتا جو رائے اور عمل کی آزادی کا آخر وقت تک بھرپور استعمال کرتے رہے۔

۴۔ اسلامی انقلاب کے کسی بھی داعی کے لئے قوم کے ذہین عناصر کو ساتھ لے کر چلنا فی الواقع ضروری ہوتا ہے اور اس میں بھی کلام نہیں کہ ان مشوروں سے اغماض برتنے کے وہ ان کا تو کچھ نقصان کرے نہ کرے 'اپنی راہ ضرور کھوٹی کرے گا۔ لیکن شوریٰ کی رائے کے سامنے سر جھکانا ایک تو دستوری اور قانونی انداز میں ہوتا ہے جس میں فیصلہ کن عامل ع

"بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے"

کے مصداق "رائے شماری" ہے اور دوسرا طرز عمل وہ ہے جس سے ایک صاحب امر مشاورت کی روح کو مجروح کئے بغیر اپنے ساتھیوں کو اعتماد میں لے کر آگے بڑھتا ہے۔ بصورت دیگر آخر اسے کون سا فوجی یا حکومتی اقتدار حاصل ہوتا ہے کہ لوگوں کی گردنوں پر سوار رہے اور ان سے فرماں برداری کا خراج وصول کرتا رہے۔

۵۔ اپنی پانچویں بات میں صاحب شذرات کچھ زیادہ کھلے تو معلوم ہوا کہ وہ جس سیاق و سباق میں اور جس حوالے سے بات کر رہے ہیں اس کا دائرہ اصلاح و تربیت اور علوم و معارف کی خدمت کے اداروں تک محدود ہے۔ ایسے اداروں کے لئے قاعدے قرینے لگ بھگ وہی

ہونے چاہئیں جو انہیں دل سے عزیز ہیں لیکن خدارا انہیں اسلام کی انقلابی دعوت پر تو چسپاں نہ کریں۔ جہاں تک جماعت سازی اور کسی کی امارت میں جمع ہو جانے کی دعوت کا تعلق ہے تو اس باب میں ہمارے مہربان کا اپنا ذہن بھی صاف نہیں۔ مسلمانوں کو قرآن و سنت کی رو سے جس ایک جماعت کا ہو کر رہنا چاہئے وہ "الجماعت" ہے اور ڈاکٹر اسرار احمد نے (یا قبل ازیں خود مولانا مودودی مرحوم و مغفور نے بھی) کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ ان کی تنظیم پر کسی بھی درجے میں "الجماعت" کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اس پوری فردِ جرم سے باعزت بری ہو جاتے ہیں جو پانچویں "حقیقت" میں تیار کی گئی ہے۔ انہوں نے دس سال پہلے اور مولانا مودودی نے نصف صدی قبل اقامتِ دین کے لئے ویسی ہی "جماعتیں" بنائی تھیں جیسی جماعت سازی کی صاحب شذرات نے اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ فرق صرف طریق کار میں تھا۔ اس امت کے اجتماعی ضمیر نے اقامتِ دین کی ایسی کوششوں کی ہمیشہ پذیرائی کی ہے' وہ خود حب عاجلہ میں کوئی غلط موڑ مڑ جائیں تو اور بات ہے۔ ایوانِ اقتدار کے دروازے ایسی جماعتوں پر کبھی بھی کھولے نہیں گئے۔ اب تو اندازہ ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کو بھی اپنی دستک کا جواب ملنے کی امید قوی نہیں رہی۔ رہی تنظیم اسلامی تو اس کا تو ہدف ہی مختلف ہے۔

۶۔ چھٹی تنقیح میں مسلمانوں کی طرف سے کافروں کی محکومی سے نجات حاصل کر کے کسی سرزمین میں اپنی آزاد ریاست قائم کرنے کی کوشش میں عدم تعاون پر نفرین ہے۔ اس میں ظاہر ہے کہ روئے سخن کسی اور طرف ہے کیونکہ الحمد للہ 'ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پر یہ الزام نہیں دھرا جا سکتا۔ اس لئے کہ ایک تو وہ اوائل عمر میں تحریکِ پاکستان کے سرگرم کارکن رہے اور دوسرے ان کی حالیہ تصنیف "استحکام پاکستان" اس قوم دوستی اور حبِّ وطن کا منہ بولتا ثبوت ہے جو اس ملک خداداد میں بسنے والے کسی بھی نیک سرشت مسلمان کو پاکستان سے ہو سکتی ہے۔

۷۔ صاحب شذرات کی ساتویں بات فطری طور پر بالکل بجا ہے کہ جب تک علم و تحقیق اور اصلاح و تزکیہ کے میدان میں اتنا کام نہ ہو جائے کہ معاشرے میں نمایاں تبدیلی کے آثار ظاہر ہونے لگیں' اس وقت تک انقلابی قیادت کا نعرہ اور اربابِ اقتدار سے حریفانہ کشاکش کسی تحریک کو اسلامی انقلاب کی منزل سے دور ہی کرنے کا باعث بنے گی لیکن کیا ہمارے ملک کے

مخصوص حالات کسی اضافی حکمت عملی کے متقاضی نہیں؟ یہاں منفی قوتوں کی جو منہ زور آندھیاں چل رہی ہیں ان کے مقابل ایسے مثبت کام کی شمعیں جلیں تو کیوں کر......... ہاں! انقلابی قیادت کا نعرہ جس نے لگایا اپنی صوابدید پر لگایا ہو گا۔ ہم تو قیادت کی نہیں نظام کی تبدیلی کی بات کرتے ہیں، ہم ارباب اقتدار کے حریف بھی نہیں، بتوفیق الٰہی جب بھی اٹھے انشاء اللہ منکر کے خلاف اٹھیں گے اور فی الوقت اس کے لئے ایک مضبوط تنظیم کی اساس مستحکم کرنے میں لگے ہوئے ہیں!

۸۔ آٹھویں حقیقت پر تو یہ عاجز ہی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی طرف سے بلا تامل صاد کرتا ہے۔[۱]

۹۔ نویں اور آخری بات ع

"مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات"

کی مصداق کامل ہے اور شاید صاحب شذرات کے من کی اصل مراد بھی......... کہ بے چارہ مولوی ان کے اعصاب پر سوار ہے ورنہ حمید الدین فراہیؒ نے جو کام قرآن مجید پر کیا ہے اس کی قدر دانی اور اس سے کسب فیض کو ڈاکٹر اسرار احمد اور ان کے ساتھی سعادت سمجھتے ہیں اور اس کے اعتراف بلکہ اظہار و اعلان میں بھی کبھی بخل سے کام نہیں لیتے۔ بایں ہمہ انہیں معارف اسلامی کی تشکیل جدید کے لئے پرانے مدرسوں اور خانقاہوں کی دریوزہ گری میں بھی عار نہیں محسوس ہوتی بلکہ وہ بحمد للہ اسی میں عافیت پاتے ہیں۔ اس معاملے میں بھی وہ علامہ اقبالؒ مرحوم ہی کے طریق کار پر عمل پیرا ہیں جنہوں نے اپنی تمام جلالت علمی و فکری کے باوصف

(باقی صفحہ ۷۲ پر)

---

[۱] ۔ صاحب شذرات کی آٹھویں حقیقت یہ تھی کہ "اس زمانے میں اسلامی انقلاب کے لئے انتقال اقتدار کا مرحلہ وقت آنے پر انتخابی عمل کے ذریعے سے بھی طے ہو سکتا ہے" یہ ہمارے نزدیک ایک ان ہونی سی بات ہے تاہم اتفاق جس امر سے ظاہر کیا گیا ہے وہ یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ "لیکن وقت سے پہلے ہر سیاسی انتخاب کے موقع پر محض دین کی دعوت لوگوں تک پہنچانے کے لئے اس میں حصہ لینے کا فیصلہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو دعوت اور سیاست کو بس اتنا ہی جانتے ہوں جتنا ان دونوں لفظوں کے معنی اردو کی کسی لغت میں دیکھ کر کوئی شخص انہیں جان سکتا ہے"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب بیعت

صحابۂ کرامؓ کا آنحضرتؐ سے بیعت ہونا اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء سے بیعت ہونا اور اقسامِ بیعت

(نوٹ: مغربی فکر اور فلسفے کے ہمہ گیر تسلط اور مادر پدر آزاد تہذیب و تمدن کے عالمگیر غلبے کے زیر اثر مسلمانوں میں جن اہم دینی و اسلامی الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال تقریباً متروک و معدوم کے درجے میں آگیا ہے، اُن میں سے ایک لفظ 'بیعت' بھی ہے۔

قرآن و حدیث اور سیرت و تاریخ کے مطالعے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک اہم دینی اصطلاح ہے اور اسے دین و شریعت کی اساس پر یا اُن کے مقاصد کے حصول کے لئے قائم ہونے والی ہر ہیئتِ اجتماعیہ کے اصل الاصول کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ خواہ تنظیم اور جماعت سازی کا معاملہ ہو، خواہ حکومت اور ریاست یعنی نظامِ خلافت کے قیام کا سب کے لئے واحد منصوص و مسنون اساس 'بیعت' ہی ہے، ــــ حتٰی کہ جب حالات کے تقاضے کے تحت نظامِ حکومت سے علیحدہ اور آزاد سلسلۂ اصلاح و ارشاد کا آغاز ہوا تو اس کے لئے بھی یہی اصطلاح استعمال ہوئی۔

افسوس کہ اِدھر لگ بھگ پچاس ساٹھ سال سے اس اصطلاح کا استعمال صرف آخر الذکر دائرے میں رہ گیا ہے اور چونکہ اس میدان میں بھی ملت کے عمومی زوال اور اضمحلال کے بہت سے مظاہر میں سے ایک مظہر کے طور پر اکثریت پیشہ ور طالبانِ دنیا کی ہوگئی لہٰذا عوام الناس میں عموماً اور جدید تعلیم یافتہ طبقے میں خصوصاً یہ لفظ بدنام ہو کر کم و بیش ایک 'گالی' کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

الحمد للہ کہ امیرِ تبلیغ مولانا محمد یوسف دہلویؒ نے اپنی مشہور کتاب "حیاۃ الصحابہؓ" میں ایک پورا باب بعنوانِ

مندرجہ بالا کے تحت درج فرمایا ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دورِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں یہ لفظ کس کثرت سے مستعمل تھا۔ ہمارے نزدیک یہ مولانا موصوفؒ کی اہم دینی خدمت ہے کہ حدیثِ نبویؐ کے وسیع و عریض ذخیرے سے یہ سارا مواد جمع کر کے پیش فرما دیا ہے۔

البتہ جہاں تک عنوانات کا تعلق ہے یہ حضرت مولاناؒ کا اپنا اجتہاد ہے، جس کے ضمن میں قیل وقال کی گنجائش ہے۔ مثلاً صفحہ ۲۷۶ پر "کہنا سننے اور فرمانبرداری پر بیعت" کے ذیل میں حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے مروی جو متفق علیہ روایت درج ہے، ہمارے نزدیک اس کا صحیح تر عنوان "بیعتِ تنظیم" ہے۔ چنانچہ اسی کو تنظیمِ اسلامی کی اساس بنایا گیا ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ "سمع وطاعت" کے ساتھ "فی المعروف" کے الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اسلیے کہ مطلق اطاعت صرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہو سکتی تھی، خود آپ کے زمانے میں بھی آپؐ کے نامزد کردہ امراء یا آپ کے بعد آپؐ کے خلفاء یا اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے قائم ہونے والی کسی جماعت کے امیر کی اطاعت صرف 'معروف' میں یعنی اللہ اور رسولؐ کے احکام و فرامین کے دائرے کے اندر اندر ہو سکتی ہے۔ بہر حال اس وقت اصلاً اس موضوع پر تفصیلی گفتگو مطلوب نہیں ہے بلکہ قارئین کے سامنے حدیثِ نبویؐ کے مبارک ذخیرے سے جمع شدہ قیمتی مواد پیش کرنا ہے، (ا۔ا۔ر۔ا)

اِسلام پر بیعت

حضرت جریر[1] رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں چیزوں پر بیعت لی جن پر کہ آپؐ عورتوں سے بیعت لیا کرتے تھے۔ جو شخص ہم میں سے آپؐ کی ممنوعات سے اجتناب کرتے ہوئے مر گیا، آپؐ اس کے لئے جنت کے ضامن ہوئے اور جس کی اس حالت میں وفات ہوئی کہ ممنوعات میں سے کسی شے کا ارتکاب کیا اور اس پر حد بھی قائم کی گئی۔ یہ حد اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی تھی اور جس نے اس حالت میں وفات پائی، کہ ممنوعات کا ارتکاب کیا اور اس کی پردہ دری نہ کی، اس کا حساب کتاب اللہ کے ذمہ[2] ہے۔

اسود[3] رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن قرن پہاڑی

[1] اخرجہ الطبرانی۔

[2] قال الہیثمی فی مجمع الزوائد ۶ ص ۳۶ وفیہ سیف بن ہارون وثقہ ابو نعیم وضعفہ جماعۃ وبقیۃ رجالہ رجال الصحیح انتہی۔ واخرجہ ایضاً ابن جریر کما فی الکنز ج ۱ ص ۸۲ وسیأتی الحدیث فی بیعۃ النساء ص ۵۳ واخرج احمد عن عبد اللہ بن عثمان بن خثیم ان محمد بن الاسود بن خلف اخبرہ

کی طرف رخ کئے بیٹھے ہوئے لوگوں سے بیعت لے رہے تھے۔ آپؐ نے لوگوں سے شہادت اور اسلام پر بیعت لی، میں نے پوچھا، شہادت کیا ہے؟ راوی کہتے ہیں کہ محمد بن اسود نے مجھے بتایا کہ حضورؐ نے صحابہؓ سے اللہ پر ایمان لانے کی اور اس بات کی شہادت کی بیعت لی کہ بے شک سوائے اللہ کے اور کوئی عبادت کے قابل نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں[۱]۔

بیہقی کی روایت میں ہے آپؐ کے پاس چھوٹے بڑے، مرد اور عورت آئے۔ آپؐ نے ان سے اسلام اور شہادت پر بیعت لی[۲]۔

مجاشع بن مسعودؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور میرا بھائی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میں نے آپؐ سے عرض کیا کہ آپ ہم سے ہجرت پر بیعت لیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہجرت تو اہلِ ہجرت کے ساتھ ختم ہو گئی (اب ہجرت کا زمانہ نہیں) میں نے عرض کیا کہ پھر آپ کس چیز پر بیعت لیں گے؟ آپؐ نے فرمایا اسلام اور جہاد پر[۳]۔

حضرت زیاد بن علاقہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جریرؓ بن عبد اللہ کو حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے وقت لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے سنا کہ لوگو! میں تم کو وصیت کرتا ہوں، اللہ وحدہ لاشریک لہ سے ڈرنے کی اور وقار اور سکون کی۔ بے شک میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اس ہاتھ سے اسلام پر بیعت کی، اور مجھ پر اس بات کی شرط لگائی کہ میں ہر مسلمان کو نصیحت کروں، ربِّ کعبہ کی قسم میں تم سب لوگوں کو نصیحت کر رہا ہوں اور اللہ پاک سے طلب مغفرت کر رہا ہوں، اس کے بعد منبر پر سے اُتر آئے[۴]۔

اسلامی اعمال پر بیعت

بشیر بن خصاصیہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضورؐ کی خدمت میں بیعت کے ارادہ سے حاضر

---

[۱] کذا فی البدایۃ ج ۴ ص۳۱۶ وقال تفرد بہ احمد وقال الہیثمی ج ۶ ص۳۶ ورجالہ ثقات [۲] کذا فی البدایۃ ج ۴ ص۳۱۶ وبہذا السیاق اخرجہ الطبرانی فی الکبیر والصغیر کما فی مجمع الزوائد ج ۶ ص۳۶ وہکذا اخرجہ البغوی وابن السکن والحاکم وابو نعیم کذا فی الکنز ج ۱ ص۸۲ [۳] واخرج الشیخان [۴] کذا فی العینی ج ۱ ص۱۶۱ واخرجہ ایضاً ابن ابی شیبۃ وزاد قال فلقیت اخاہ فسألتہ فقال صدق مجاشع کذا فی کنز العمال ج ۱ ص۸۲۶ [۵] اخرج ابو عوانۃ فی مسندہ ج ۱ ص۳۶ عن زیاد بن علاقۃ [۶] واخرج البخاری اتم منہ ج ۱ ص۱۴ واخرج البیہقی وغیرہ عن زیاد بن الحارث الصدائی قال اتیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبایعتہ علی الاسلام فذکر الحدیث بطولہ کما تقدم فی باب الدعوۃ حیاۃ الصحابہ عربی ج ۱ ص۱۸۶۔ [۷] اخرج الحسن بن سفیان والطبرانی فی الاوسط وابو نعیم والحاکم والبیہقی وابن عساکر

ہوکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ مجھ سے کس چیز پر بیعت لیں گے؟ آپؐ نے اپنا دستِ مبارک میری طرف دراز کرتے ہوئے فرمایا کہ اس بات کی گواہی دو کہ سوائے اللہ وحدہٗ کے کوئی عبادت کے قابل نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں، صحیح اوقات پر پانچوں وقت کی نماز پڑھو۔ زکوٰۃ فرض کی ادائگی کرتے رہو، رمضان کا روزہ رکھتے رہو اور حج بیت اللہ اور اللہ کے راستے میں جہاد کرو، میں نے عرض کیا کہ یہ سب کچھ میں کروں گا مگر ان میں سے دو باتوں کی مجھ میں طاقت نہیں، ایک تو زکوٰۃ کی، خدا کی قسم، میرے پاس دس اونٹنیاں ہیں۔ انہیں کا دودھ میرے گھر والوں کا ذریعۂ معاش ہے اور یہی اُن کی بار برداری کرتے ہیں، دوسرے جہاد ہے، میں ایک کم زور دل کا انسان ہوں، لوگ یوں کہتے ہیں کہ جس نے جہاد سے پشت پھیری وہ اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹا اور مجھے بہت بڑا خطرہ ہے کہ اگر دشمن سے مقابلہ آپڑا تو مجھ پر ڈر غالب ہوا اور میں بھاگ کھڑا ہوا، تو اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹوں گا۔ یہ سن کر حضورؐ نے دستِ مبارک سمیٹ لیا، پھر آپؐ نے اپنے ہاتھ کو حرکت دیتے ہوئے فرمایا کہ اے بشیر! نہ صدقہ دینے پر تیار ہو نہ جہاد پر تو پھر کیسے جنت میں داخل ہوگے؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ ہاتھ بڑھائیے، میں آپ سے بیعت کرتا ہوں، آپ نے ہاتھ پھیلا دیئے۔ اور میں نے ان تمام باتوں پر بیعت کرلی[۱]

حضرت جریرؓ[۲] فرماتے ہیں کہ میں نے حضورؐ سے نماز کے قائم کرنے، زکوٰۃ کے دینے اور ہر مسلمان کو نصیحت کرنے پر بیعت کی[۳] دوسری[۴] روایت میں آتا ہے کہ حضرت جریرؓ نے کہا کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھ پر شرط لگائیے۔ آپ شرط کو زیادہ جانتے ہیں آپؐ نے فرمایا میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تنہا اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ نماز کو قائم رکھنا، زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کو نصیحت کرنا، اور شرک سے بالکل یک طرف ہو جاؤ۔[۵] حضرت[۶] جریرؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپؐ نے فرمایا اے جریر! ہاتھ بڑھاؤ، جریر نے کہا، کس چیز پر؟ آپؐ نے فرمایا اپنے کو اللہ کے سپرد کر دو اور ہر مسلمان کو نصیحت کرتے رہنا؛ چنانچہ اُنہوں نے آپؐ کے ہاتھوں اس پر بیعت کی، اُدنیٰ انتہائی سمجھ دار رکھے، عرض کیا یا رسول اللہ! جہاں تک مجھ سے ہوسکے گا،

---

[۱] کذا فی کنز العمال ج ۷ ص ۱۲ واخرجہ احمد ورجالہ موثقون کما قال الہیثمی ج ۱ ص ۴۲ [۲] اخرج احمد [۳] واخرجہ ایضاً ابن جریر مثلہ کما فی کنز العمال ج ۱ ص ۲۸ والشیخان والترمذی کما فی الترغیب ج ۳ ص ۲۶ [۴] واخرج احمد من وجہ آخر [۵] و رواہ النسائی کما فی البدایۃ ج ۵ ص ۷۸ واخرجہ ابن جریر مثلہ الا انہ قال وتنصح المسلمین وتفارق الشرک کما فی الکنز ج ۱ ص ۲۸ [۶] واخرج الطبرانی۔

ان کے بعد ہی لوگوں کے لئے یہ آسانی ہوگئی[۱] عوف بن مالک[۲] اشجعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم سات یا آٹھ یا نو آدمی حضورؐ کی خدمت میں موجود تھے، آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگ اللہ کے رسول سے بیعت نہیں کرتے؟ جب آپؐ تین مرتبہ فرماچکے تو ہم لوگوں نے آگے بڑھ کر آپؐ کے ہاتھوں پر بیعت کی اور عرض کیا یا رسول اللہ ہم لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت تو کرلی مگر کس چیز پر بیعت کی؟ آپؐ نے فرمایا، اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، پانچوں وقت کی نماز ادا کرو، اور ایک جملہ آپؐ نے اور آہستہ سے فرمایا کہ لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہ کرو راوی کہتے ہیں کہ میں نے انہیں حضرات میں سے بعض کو دیکھا کہ اگر سواری پر ہے ان کا کوڑا گر گیا ہے تو کسی سے یہ نہیں کہا کہ یہ ہمیں اٹھا کر دے دو[۲]

حضرت[۳] ابو امامہؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کون بیعت کے لئے آمادہ ہے؟ آپؐ کے غلام حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم نے آپؐ کے ہاتھوں پر بیعت کی، عرض کیا یا رسول اللہ! آپؐ نے فرمایا اس شرط سے کہ کسی سے کوئی سوال نہ کرنا حضرت ثوبانؓ نے عرض کیا، اس میں کیا ثواب ہے یا رسول اللہ! آپؐ نے فرمایا اس کا ثواب جنت ہے، چنانچہ حضرت ثوبانؓ نے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرلی ابو امامہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ثوبانؓ کو مکہ کے بھرے مجمع میں دیکھا کہ سواری پر سے ان کا کوڑا گر گیا اور بعض دفعہ تو کسی آدمی کی گردن پر جا رہا وہ آدمی اس کوڑے کو لے کر انہیں دینا چاہتا تھا یہ نہیں لیتے تھے اور خود اُترتے اور کوڑے کو لیتے[۳]

ابو ذر[۴] رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضورؐ نے پانچ مرتبہ بیعت لی اور سات چیزوں کی تاکید فرمائی، اور سات ہی مرتبہ آپؐ نے اللہ پاک کو میرے اوپر گواہ بنا کر فرمایا کہ میں اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہ ڈروں۔ ابو مثنیٰ کی روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت ابوذر فرماتے ہیں کہ مجھ کو حضورؐ نے بلا کر فرمایا کیا تمہیں بیعت ہونے کی رغبت ہے؟ اور تمہارے لئے جنت ہو؟ میں نے عرض کیا، جی ہاں! اور میں نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ آپؐ نے میرے اوپر شرط لگاتے ہوئے فرمایا کہ لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہ کرنا۔ میں نے کہا،

---

[۱] کذا فی الکنز ج ۱ ص ۸۲۔ [۲] اخرج الرویانی وابن جریر وابن عساکر عن عوف بن مالک
[۲] کذا فی الکنز ج ۱ ص ۸۳ واخرجہ ایضاً مسلم والترمذی والنسائی کما فی الترغیب ج ۲ ص ۹۸
[۳] اخرج الطبرانی فی الکبیر [۳] کذا فی الترغیب ج ۲ ص ۱۰۰ واخرجہ ایضاً احمد والنسائی وغیرہما من ثوبان مختصراً وذکر قصۃ السوط لابی بکرؓ کما فی الترغیب ج ۲ ص ۹۹، ۱۰۱ [۴] واخرج احمد

بہت بہتر۔ آپ نے فرمایا کہ کوڑے اُٹھانے کا بھی مطالبہ نہ کرنا۔ اگر تمہارے ہاتھ سے گر پڑے تم خود اُتر نا اور اُس کو اُٹھانا۔ ایک اور روایت میں ہے۔ حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ چھ دن تک آپؐ مجھ سے یوں فرماتے رہے، اے ابوذر! اچھی طرح سمجھ لینا جو تم سے بعد میں کہا جائے گا۔ جب ساتواں روز ہوا، آپؐ نے فرمایا کہ میں تم کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ پس پردہ بھی اور کھلم کھلا بھی، اور جب تم سے کوئی گناہ کا کام ہو جائے تو اس کے بعد بھلا کام ضرور کرنا، کسی سے کسی ادنیٰ شے کا بھی مطالبہ نہ کرنا۔ حتیٰ کہ گرے ہوئے کوڑے کو بھی اُٹھانے کو نہ کہنا اور کسی کی امانت پر قبضہ نہ کرنا[۱]

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اور ابوذرؓ اور عبادہ بن صامتؓ اور ابوسعیدؓ خدری اور محمدؓ بن مسلمہ نے اور چھٹے صاحب اور تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شرط پر بیعت کی کہ ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہ کریں گے۔ ان چھٹے صاحب نے حضورؐ سے بیعت واپس لی، آپؐ نے بیعت واپس کر دی[۲]

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اُن نقیب لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے حضورؐ سے بیعت کی تھی۔ ہم لوگوں نے آپؐ سے اس بات پر بیعت کی تھی کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔ چوری نہ کریں گے۔ زنا نہ کریں گے اور وہ قتل جس کو اللہ پاک نے حرام قرار دیا ہے نہ کریں گے، مگر حکم خداوندی کے مطابق، لُوٹ نہ ڈالیں گے، نافرمانی نہ کریں گے۔ آپؐ نے فرمایا تھا اگر ہم ان کاموں کو بجالائے، تو ہمارے لئے جنت ہے، اور اگر ان ممنوعات میں سے کسی بات کا ہم لوگوں سے ارتکاب ہو جائے تو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے۔ ابن جریرؒ کی روایت میں اس طرح ہے کہ ہم لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضر تھے۔ آپؐ نے فرمایا اس شرط پر بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، چوری نہ کرنا، زنا نہ کرنا جس نے تم میں سے اس وعدے کو وفا کیا، اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اور جس نے اس میں سے کسی چیز کا ارتکاب کیا، اور اللہ نے اس کی پردہ پوشی کی، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، خواہ وہ سزا دے یا اسے معاف فرمائے[۳]

---

[۱] کما فی الترغیب ج ۲ ص ۹۹ [۲] اخرجہ الشاشی و ابن عساکر [۳] کذا فی الکنز ج ۱ ص ۸۲ ۔ واخرجہ ایضاً الطبرانی بنحوہ قال الہیثمی ج ۷ ص ۲۶۳ وفیہ عبدالمہیمن بن عباش وہو ضعیف [۴] واخرجہ مسلم [۵] کذا فی الکنز ج ۱ ص ۸۲

عبادہ[1] بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عقبۂ اولیٰ میں ہم گیارہ آدمی تھے۔ ہم لوگوں نے حضورؐ سے انہیں باتوں پر بیعت کی جن پر عورتیں بیعت کرتی ہیں اور اس وقت تک ہم لوگوں پر جہاد فرض نہیں کیا گیا تھا۔ ہم لوگوں نے آپؐ سے اس بات پر بیعت کی کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گے۔ چوری نہ کریں گے، زنا نہ کریں گے، اور نہ ایسا بہتان باندھیں گے جس کو اپنے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان گھڑا ہو اولاد کو ہم قتل نہ کریں گے، کسی بھلے کام میں اللہ کی نافرمانی نہ کریں گے۔ جس نے یہ وعدہ وفا کیا اس کے لئے جنت ہے، اور جس سے ان ممنوعات میں سے کسی کا ارتکاب ہوا، اس کا فیصلہ اللہ کے حوالہ ہے، اگر چاہے سزا دے، چاہے معاف کر دے، پھر اگلے سال آکر بیعت کی[2]۔

ہجرت پر بیعت

حضرت[3] یعلیٰ بن منیہ فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے دوسرے روز میں نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے باپ سے آپ ہجرت پر بیعت لے لیجئے، آپؐ نے فرمایا کہ ہجرت پر نہیں، میں تو جہاد پر بیعت لوں گا۔ ہجرت فتح مکہ کے بعد ختم ہو گئی۔ ایک[4] اور روایت میں اس طرح ہے' میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم سے ہجرت پر بیعت لیجئے۔ آپؐ نے فرمایا، ہجرت اہل ہجرت کیساتھ چلی گئی اور حدیث[5] جریر میں ہے شرک سے بچنا۔ انہیں کی ایک اور روایت[6] میں فرمایا کہ مومن کے ساتھ خیر خواہی کرنا اور شرک سے بچنا۔ حارث[7] بن زیاد ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں یوم خندق میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپؐ لوگوں سے ہجرت پر بیعت لے رہے تھے۔ میرا گمان ہوا کہ یہ لوگ بیعت کے لئے بلائے جا رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اس سے بھی ہجرت پر بیعت لے لیجئے آپؐ نے فرمایا یہ کون ہیں؟ میں نے کہا کہ میرے چچیرے بھائی حوط بن یزید ہیں، یا یزید بن حوط، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں تم لوگوں سے بیعت نہیں لیتا۔ لوگ تو تمہاری طرف ہجرت کر کے آتے ہیں، تم لوگوں کی طرف ہجرت کر کے نہ جاؤ گے قسم اس ذات کی کہ میرا نفس اس کے ہاتھ میں ہے، کوئی آدمی ایسا نہیں ہے جو انصار سے مرتے دم تک

---

[1] واخرج ابن اسحاق وابن جریر وابن عساکر [2] کذا فی الکنز ج ۱ صـ۸۲ واخرجہ الشیخان نحوہ کما فی البدایۃ ج ۳ صـ۱۵۰ [3] واخرج البیہقی ج ۹ صـ۱۶ [4] وقد تقدم حدیث مجاشع، حیاۃ الصحابہ عربی ج ۱ صـ۲۱۹ [5] حیاۃ الصحابہ ج ۱ صـ۲۲۰ [6] وعند البیہقی ج ۹ صـ۱۳ [7] واخرج احمد والبخاری فی التاریخ وابن ابی خیثمہ وابوعوانہ والبغوی وابونعیم والطبرانی۔

محبت کرے ۔ مگر اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ اس آدمی کو دوست رکھتا ہے اور جو آدمی انصار سے عداوت رکھتا ہے وہ اللہ سے اس حالت میں ملے گا کہ اللہ اس پر غضبناک ہوگا [1]

ابو اسید [2] ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ خندق کی کھدائی کے موقع پر لوگ آپؐ کی خدمت میں ہجرت کی بیعت کرنے کے لئے حاضر ہوئے ، جب آپؐ فارغ ہوگئے ، آپؐ نے فرمایا اے انصاری بھائیو ! تم لوگ ہجرت پر بیعت نہ کرو ۔ لوگ تو تمہاری طرف ہجرت کرکے آرہے ہیں جو آدمی اللہ سے اس حالت میں ملے گا کہ انصار کو دوست رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس آدمی کو دوست رکھے گا اور جو اللہ سے اس حالت میں ملے گا کہ انصار سے عداوت رکھتا ہو ، اللہ اس سے اس حالت میں ملے گا کہ اللہ اس پر انتہائی ناراض ہوگا [3]

نصرت پر بیعت

حضرت جابر [4] رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں دس سال اس طرح پر گذارے کہ لوگوں کے پاس اُن کی منزل گاہوں پر جایا کرتے تھے ، عکاظ اور مجنہ کے بازاروں میں اور حج کے موسم میں اور آپؐ فرماتے کون مجھے ٹھکانا دے گا اور کون میری نصرت کو تیار ہے کہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچا دوں اور اس نصرت کرنے والے کے لئے جنت ہے ۔ کوئی ایک بھی آپؐ کو ٹھکانا دینے اور آپؐ کی نصرت کے لئے تیار نہ ہوتا ۔ یہاں تک کہ اگر کوئی آدمی یمن یا مضر سے مکہ آنے کا ارادہ کرتا تو اس کے پاس اس کی برادری اور قریبی رشتے دار آکر کہتے ، اُس قریشی نوجوان سے بچ کر رہنا ، ایسا نہ ہو کہ تم کو فتنہ میں ڈال دے ۔ آپؐ اُن کے کجاوں کے درمیان سے گذرتے لوگ آپؐ کی طرف اُنگلیوں سے اشارہ کرتے ، یہاں تک کہ اللہ پاک نے یثرب (مدینہ) سے ہم لوگوں کو آپؐ کی خدمت میں بھیجا ہم لوگوں نے آپؐ کو پناہ دی ، اور آپؐ کی تصدیق کی ۔ ہمارے آدمی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے ، آپؐ پر ایمان لاتے ، آپؐ اس کو قرآن پڑھاتے ۔ جب وہ گھر واپس آتا ، اس کے اسلام لانے کی وجہ سے لوگ مسلمان ہوجاتے ۔ یہاں تک کہ انصار کے گھرانوں میں کوئی گھرانہ نہ بچا جس میں آٹھ نو مسلمان اسلام کو ظاہر کرنے والے نہ ہوں ۔ ایک روز ہم سب نے مشورہ کیا اور یہ کہا کہ ہم لوگ حضورؐ کو مکہ میں اس حالت میں کب تک چھوڑے رکھیں گے کہ آپؐ

---

[1] کذا فی الکنز ج ، صـ ۱۳۴ واخرجہ ایضاً ابوداؤد کما فی الاصابۃ ج ۱ صـ ۲۷۹ و قال الہیثمی ج ۱۰ صـ ۳۸ رواہ احمد والطبرانی باسانید ورجال بعضہا رجال الصحیح غیر محمد بن عمرو ، وہو حسن الحدیث انتہی [2] واخرج الطبرانی [3] قال الہیثمی ج ۱۰ صـ ۳۸ وفیہ عبدالحمید بن سہیل ولم اعرفہ وبقیۃ رجالہ ثقات [4] اخرج احمد ۔

پہاڑوں اور وادیوں میں گشت کریں اور لوگوں کے خوف وخطر میں مبتلا رہیں۔ چنانچہ ہم میں سے آپ کے پاس ستر آدمی موسم حج میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم لوگوں نے آپ سے بات چیت کرنے کے لئے عقبہ گھاٹی طے کی۔ ہم لوگ گھاٹی میں ایک ایک دو دو کرکے جمع ہو گئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی، ہم لوگوں نے کہا ہم آپ سے کس چیز پر بیعت کریں؟ آپ نے فرمایا، تم لوگ مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ ہر حال میں تم سنو اور میری اطاعت کرو، جی چاہے یا نہ چاہے۔ تنگی اور فراخی دونوں حالتوں میں خرچ کرو، بھلی باتوں کا حکم کرو اور بُری باتوں سے روکو۔ لوگوں میں اللہ کی باتوں کا چرچا کرنا اور اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہ ڈرنا، تم لوگ میری امداد کرنا اور جب میں تمہارے یہاں آجاؤں، میری حفاظت اسی طرح پر کرنا جس طرح پر کہ تم اپنی اور اپنی اولاد اور ازواج کی کرتے ہو، اگر تم نے ایسا کر لیا تو تمہارے لئے جنت ہے، ہم لوگ آپ کی طرف لپکے اور آپ کا ہاتھ اسعد بن زرارہ رض نے اپنے ہاتھ میں لیا اور یہ ہم لوگوں میں سب میں چھوٹے تھے۔ بیہقی کی روایت میں ہے کہ وہ ستر آدمیوں میں میرے سوا سب سے چھوٹے تھے، اور کہا ٹھہرو اے اہلِ یثرب! ہم لوگوں نے اس سفر میں اونٹوں کے کلیجے محض اس لئے چھلنی کئے ہیں کہ ہم لوگ جانتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں، اور آج آپ کو لے چلنا تمام عرب سے عداوت مول لینی ہے، تمہارے بڑے بڑے لوگ قتل کئے جائیں گے اور تلواریں تمہارے حصے بخرے کر دیں گی، پس اگر تم میں ان امور کے صبر کی طاقت ہے تو آپ کو ہمراہ لے چلو، اور تمہارا اجر اللہ کے ذمہ ہے، اور اگر تم اپنے نفسوں میں کچھ خوف وخطر محسوس کرتے ہو تو آپ کو چھوڑ دو۔ اور آپ سے صاف صاف کہہ دو۔ حضور تم لوگوں کے لئے اللہ پاک سے عذر خواہی کر لیں گے۔ حضرت اسعد رضی اللہ عنہ کی یہ باتیں سن کر لوگوں نے کہا، میاں اسعد! ذرا تم پیچھے ہٹو، خدا کی قسم ہم اس بیعت کو چھوڑنے والے نہیں اور ہرگز یہ بیعت نہ توڑیں گے حضرت جابر رض کہتے ہیں کہ ہم لوگ حضور کے سامنے کھڑے ہوئے اور ہم نے آپ سے بیعت کی۔ آپ نے ہم لوگوں سے کچھ شرطیں لیں اور ان کے وفا کرنے پر آپ نے جنت کا وعدہ فرمایا[1]

کعب[2] بن مالک کی روایت میں اس طرح ہے کہ ہم لوگ گھاٹی میں جمع ہو کر آپ کا انتظار

---

[1] وقد رواہ احمد ایضاً والبیہقی من غیر ہذا الطریق ایضاً، وہذا اسناد جید علی شرط مسلم، ولم یخرجوہ۔ کذا فی البدایۃ، ج ۳ ص۱۶۱ وقال الحافظ فی فتح الباری ج ۷ ص۱۵۶ اسناد حسن وصححہ الحاکم وابن حبان۔ اھ وقال الہیثمی ج ۶ ص۴۶ ورجال احمد رجال الصحیح وقال رواہ البزار وقال فی حدیثہ فواللہ لا نذر ہذہ البیعۃ ولا نستقیلہا [2] اخرج ابن اسحاق۔

کر رہے تھے۔ آپؐ ہم لوگوں کے پاس حضرت عباسؓ کے ہمراہ تشریف لائے۔ حضرت عباسؓ اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے، اپنی قوم کے دین پر تھے۔ مگر انہیں یہ بات زیادہ محبوب تھی کہ اپنے بھتیجے کے کام میں حاضر رہیں، اور آپؐ کی نصرت کریں۔ جب آپؐ تشریف فرما ہوئے تو شروع میں حضرت عباسؓ نے گفتگو کی اور کہا، اے خزرج کے لوگو! جیسا کہ تمہیں معلوم ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم میں سے ہیں۔ ہم نے اپنی قوم سے آپؐ کی حفاظت کی۔ باوجودیکہ میں بھی اس قوم کا ایک فرد ہوں۔ یہ اپنی تمام قوم سے معزز ہیں اور اپنے شہر میں حفاظت سے ہیں اور اُنہوں نے یہاں رہنے سے انکار کیا اور تمہارے ساتھ ملنا اور رہنا چاہتے ہیں، پس تم لوگ اس بات پر غور کرلو کہ اگر تم آپؐ کے ساتھ اس معاملہ میں وفا برت سکتے ہو جس کی طرف تم آپؐ کو لے جا رہے ہو اور آپؐ کی حفاظت آپؐ کے مخالفین سے کر سکتے ہو، پس تم اپنے اُوپر اور اپنی ذمہ داری پر خوب غور کرلو، اگر تم یہ دیکھتے ہو کہ آپؐ کو لے جانے کے بعد دشمنوں کے سپرد کر دو اور آپؐ کی نصرت اور امداد نہ کر سکو تو اسی وقت آپؐ کو چھوڑ دو۔ آپؐ بڑی عزت اور بڑی حفاظت کے ساتھ اپنے شہر اور اپنی قوم میں ہیں، حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں نے عباسؓ سے کہا کہ ہم لوگوں نے آپ کی بات کو سُن لیا، یارسول اللہ! آپ فرمائیے، آپؐ اپنے لئے اور اپنے رب کے لئے جو شرطیں مناسب سمجھیں لے لیں۔ حضورؐ نے کلام کیا، اولاً قرآن شریف کی تلاوت فرمائی۔ اللہ کی طرف دعوت دی۔ اِسلام کے بارے میں رغبت دِلائی اس کے بعد فرمایا، میں تم لوگوں سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم میری حفاظت کرو اسی طرح پر جس طرح کہ تم اپنی عورتوں اور اپنی اولاد کی حفاظت کرتے ہو۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں، براء بن معرورؓ نے آپؐ کا ہاتھ پکڑا اور کہا ہاں یارسول اللہ! قسم اُس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ ہم آپ کی اسی طرح پر حفاظت کریں گے جس طرح پر کہ ہم اپنی ذریّات اور خاندان کی حفاظت کرتے ہیں، ہم سے یارسول اللہ بیعت لیجئے۔ ہم لوگ خدا کی قسم جنگ جو ہیں اور یہ چیز ہماری میراث میں ہمارے بڑوں سے چلی آرہی ہے، ابھی براءؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض و معروض کر ہی رہے تھے کہ بیچ میں ابوالہیثمؓ بن تیہان بول پڑے اور کہا یارسول اللہ! ہمارے اور کچھ لوگوں (یہود) کے درمیان تعلقات ہیں اور ہم اس کو بھی ختم کر دیں گے۔ کہیں ایسا تو نہ ہو کہ اِدھر تو ہم تعلقات ختم کریں اور اُدھر اللہ پاک آپ کو اپنی قوم پر غلبہ دیدے اور آپ ہم لوگوں کو چھوڑ کر اپنی قوم میں چلے آئیں۔ یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دئے، اور

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا، میرا خون تمہارا خون ہے اور میرا مدفن تمہارے مدفن کے ساتھ، میں تم میں سے ہوں، اور تم مجھ سے ہو، میں اُس سے لڑوں گا جس سے تم لڑوگے اور میں اُس سے صلح کروں گا جس سے تم صلح کروگے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے لوگوں میں سے بارہ آدمیوں کو منتخب کرکے میرے پاس بھیج دینا جو اپنی قوم کی طرف سے جو کچھ ان میں مشورہ ہو اس کی اطلاع لائیں، چنانچہ بارہ افراد چنے گئے، نوخزرج میں سے اور تین اوس میں سے[1]

حضرت[2] عروہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (ان حضرات میں سے) جس نے شروع میں آپؐ سے بیعت کی، ابوہیثم بن تیہان رضی اللہ عنہ ہیں، اُنہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمارے اور لوگوں کے درمیان رسی ہے اور وہ رسی قسم اور وعدے ہیں، شاید کہ ہم ان لوگوں سے قطع تعلق کرلیں، اور اس کے بعد آپ اپنی قوم کی طرف لوٹ آویں۔ ایسی صورت میں ہم نے تو رسی کاٹ دی اور لوگوں سے لڑائی بھی مول لے لی۔ (اور آپ سے مفارقت بھی) یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے، آپؐ نے فرمایا، میرا خون تمہارے خون کے ساتھ ہے، اور میرا مدفن تمہارے مدفن کے ساتھ جب ابوالہیثم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی بات کا جواب سن کر راضی ہوگئے تو اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوکر کہا، اے لوگو! یہ اللہ کے رسول ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ سچے ہیں، آپؐ آج کے دن اللہ کے حرم اور اس کی حفاظت کی جگہ ہیں، اپنی قوم اور اپنے خاندان میں ہیں۔ تمہیں واضح ہوجانا چاہیئے کہ اگر تم لوگ آپؐ کو لے گئے تو سارے عرب مل کر تم کو ایک تیر سے نشانہ بنالیں گے پس اگر تم لوگوں کو یہ بات پسند ہے کہ اللہ کے راستے میں شہید ہوجاؤ اور اپنے مال اور اولاد سے ہاتھ دھولو تو آپؐ کو اپنی سرزمین میں لے چلنے کی دعوت دو، خدا کی قسم یہ صحیح ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور اگر تمہیں رسوائیوں کا ڈر ہو تو ابھی کہہ سن لو۔ یہ سن کر انصار نے عرض کیا، ہم لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی ہر اس بات کو مان لیا جو آپؐ نے ہمارے اُوپر پیش کی اور ہم نے اپنی طرف سے آپؐ کی ہر وہ بات منظور کرلی جس کو آپؐ نے ہم سے فرمایا، اے ابوالہیثم! ہمارے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان سے ایک

---

[1] کذا فی البدایۃ ج ۳ صفحہ ۱۶۱ ۔ والحدیث اخرجہ ایضاً احمد والطبرانی مطولا کما فی مجمع الزوائد ج ۶ صفحہ ۴۲ وقد ساقہ بطولہ۔ قال الہیثمی ج ۶ صفحہ ۴۶ ورجال احمد رجال الصحیح غیر ابن اسحاق وقد صرح بالسماع انتہی وقال الحافظ ج ۷ صفحہ ۱۵۱ اخرجہ ابن اسحاق وصححہ ابن حبان من طریقہ بطولہ۔ اھ [2] اخرجہ الطبرانی۔

کنارے ہو جاؤ، تاکہ ہم لوگ آپؐ سے بیعت کریں۔ حضرت ابوالہیثمؓ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے میں نے بیعت کی پھر پیچھے بعد دیگرے ہر ایک نے آپؐ سے بیعت کی۔[۱]

حضرت[۲] عاصم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہل مدینہ جب حضورؐ سے بیعت کے لئے حاضر ہوئے تو عباسؓ بن عبادہ نے جو سالم بن عوف کے بھائی بندوں میں سے ہیں کہا کہ اے برادرانِ خزرج! کیا تم لوگوں کو معلوم ہے کہ تم کس چیز پر اس شخص سے بیعت کر رہے ہو؟ انصار نے کہا، ہاں! معلوم ہے۔ عباسؓ نے کہا کہ تم لوگ اس سے بیعت ہر سرخ و سیاہ انسانوں کی لڑائی پر کر رہے ہو، اگر تم لوگوں کا یہ خیال ہو کہ جب تمہارا مال کسی مصیبت میں ضائع ہو جائے اور تمہارے اشراف قتل کر دیئے جائیں تو تم اس کو (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی قوم کے سپرد کر دو، تو ابھی ایسا کر لو، خدا کی قسم اگر تم نے وہاں سے جا کر ایسا کیا تو دنیا اور آخرت کی رسوائی ہے اور اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم نے جو کچھ آپؐ سے وعدہ کیا ہے اُسے وفا کرو گے خواہ مال تباہ ہوں یا اشراف قتل کر دیئے جائیں تو آپؐ کو اپنے ہمراہ لو، پس خدا کی قسم یہ دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔ انصار نے کہا، ہم آپؐ کو لیتے ہیں خواہ مال تباہ ہو یا اشراف قتل کئے جائیں یا رسول اللہ! اگر ہم اس وعدہ میں پورے اُترے تو ہمارے لئے کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا جنّت ——— انصار نے فرمایا، ہاتھ بڑھایئے۔ یا رسول اللہ! آپؐ نے ہاتھ بڑھایا۔ انصار نے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔[۳]

حضرت[۴] عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو حکم دیا کہ اچھا تم لوگ اپنی اپنی قیام گاہوں پر واپس چلے جاؤ۔ عباسؓ بن عبادہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے اگر آپ چاہیں تو کل صبح ہی صبح اہلِ منٰی پر اپنی تلوار کے ذریعے حملہ کر دیں، آپؐ نے فرمایا، میں تمہیں اس بات کا حکم نہیں دیتا تم تو اپنی منزل گاہوں پر چلے جاؤ۔[۵]

جہاد پر بیعت

حضرت[۶] انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق کی طرف

---

[۱] فذکر الحدیث قال الہیثمی ج ۶ صـ۴۲ و فیہ ابن لہیعۃ و حدیثہ حسن و فیہ ضعف۔ انتہی [۲] و عند ابن اسحٰق۔ [۳] کذا فی البدایۃ ج ۳ صـ۱۶۲ [۴] و اخرجہ ابن اسحاق ایضاً عن معبد بن کعب عن اخیہ [۵] کذا فی البدایۃ ج ۳ صـ۱۶۴ [۶] اخرج البخاری صـ۳۹۷

تشریف لے گئے، مہاجرین اور انصار رضوان اللہ علیہم سخت سردی میں صبح ہی صبح کھدائی میں لگ رہے تھے۔ ان حضرات کے پاس کوئی خادم اور غلام نہ تھے جو اُن کی طرف سے اس کام کو انجام دیتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی اس مشقت اور بھوک کو دیکھ کر یہ رجز فرمایا

اَللّٰهُمَّ اِنَّ الْعَيْشَ عَيْشُ الْاٰخِرَة
فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَة

"اے میرے اللہ بلاشبہ زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ اور اے اللہ ان انصار و مہاجرین کی مغفرت فرما"

"انصار و مہاجرین نے آپؐ کی بات کا جواب دیتے ہوئے یہ رجز پڑھا"

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر جہاد کی بیعت کی ہے جب تک ہم باقی رہیں گے[1]

موت پر بیعت

حضرت[2] سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی پھر ایک درخت کے سائے کے نیچے چلا آیا۔ جب لوگ آپؐ کے پاس سے کم ہوئے تو آپؐ نے فرمایا، اے ابن اکوع! کیا تم بیعت نہیں کرتے؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں تو بیعت ہو چکا، آپؐ نے فرمایا پھر بیعت کرلو، چنانچہ میں نے دوسری مرتبہ آپؐ کے ہاتھوں پر بیعت کی۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے سلمہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا، اے ابو مسلم! تم ان دنوں کس چیز پر بیعت کرتے تھے؟ ابن اکوع رضی اللہ عنہ نے جواب دیا مرنے پر[3]

عبداللہ[4] بن زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حرّہ کی لڑائی کے دنوں میں اُن کے پاس ایک آنیوالے نے آکر کہا کہ ابن حنظلہ لوگوں سے موت پر بیعت لے رہے ہیں۔ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میں کسی کے ہاتھ پر موت کے لئے بیعت نہ کروں گا[5]

---

[1] واخرجہ ایضاً مسلم والترمذی کما فی جمع الفوائد ج ۲ ص۱۵۔ وقد تقدم حدیث مجاشع ص۲۱۸ فقلت علام تبایعنا قال علی الاسلام والجہاد وحدیث بشیر بن الخصاصیۃ ص۲۲۱ یا بشیر لا صدقۃ ولا جہاد فبم اذن تدخل الجنۃ قلت ابسط یدک ابایعک، فبسط یدہ فبایعتہ وحدیث یعلی بن منیۃ ص۲۲۲ فقلت یا رسول اللہ بایع ابی علی الہجرۃ قال بل ابایعہ علی الجہاد [2] اخرجہ البخاری ص۴۱۵ [3] واخرجہ ایضاً مسلم والترمذی والنسائی کما فی العینی ج ۷ ص۱۱۰ والبیہقی ج ۸ ص۱۴۶ وابن سعد ج ۴ ص۳۹ [4] واخرجہ البخاری ص۴۱۵ ایضاً [5] واخرجہ ایضاً مسلم کما فی العینی ج ۷ ص۱۰ والبیہقی ج ۸ ص۱۴۶ ایضاً۔

کہنا سُننے اور فرماں بَرداری پر بیعت

حضرت عُبیدؓ اللہ بن رافع[1] فرماتے ہیں کہ شراب کے مشکیزے لائے گئے حضرت عبادہؓ بن صامت ان مشکیزوں کے پاس گئے اور سب مشکیزوں کو پھاڑ ڈالا اور فرمایا کہ ہم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر سننے اور فرماں برداری کرنے پر بیعت کی تھی خواہ ہم نشاط کی حالت میں ہوں یا کاہلی میں اور کشادگی اور تنگی میں خرچ کرنے پر بھلی باتوں کا حکم دیں اور بُری باتوں سے روکیں اور اللہ کے بارے میں سچ کہیں، کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اس بارے میں ہمارے آڑے نہ آئے ، اور اس بات پر بھی ہم نے بیعت کی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کریں گے۔ جب آپؐ ہم لوگوں کے پاس مدینہ تشریف لے آئیں گے ۔ اسی طریقہ پر جس طرح کہ ہم اپنی اور اپنی ازواج و اولاد کی اعانت کرتے ہیں اور ہمارے لئے جنت ہے ۔ یہ تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ بیعت جس پر ہم لوگوں نے آپؐ سے بیعت کی[2] دوسری روایت[3] میں ہے کہ حضرت عبادہؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ پر بیعت کی کہ آپؐ کا کہا سنیں گے۔ آپ کی فرماں برداری کریں گے۔ آسانی میں بھی اور دشواریوں کے مواقع میں بھی، اور خواہ ہم بحالت نشاط ہوں، یا کراہیت محسوس کر رہے ہوں اور خواہ ہمارے اوپر دوسروں کو ترجیح دی جائے اور یہ کہ ہم کسی کام کو کام کرنے والے سے نہ چھینیں گے، جہاں کہیں بھی ہم ہوں حق بات کہیں گے اللہ کے بارے میں ملامت گر کی ملامت کا خوف نہ کریں گے[4]

حضرت جریر[5] رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنا سننے اور فرماں برداری کرنے اور مسلمانوں کو نصیحت کرنے پر بیعت کی تھی۔ انہیں کی ایک دوسری روایت میں ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں آپ سے بیعت کرتا ہوں، آپ کا کہنا ماننے اور آپ کی فرماں برداری کرنے پر ہر کام میں —— خواہ وہ مجھے پسند ہو یا ناپسند۔ حضورؐ نے فرمایا، کیا تم میں ایسا کرنے کی استطاعت ہے؟ اور کیا تم اس بات کی طاقت رکھتے ہو؟ لہٰذا احتراز کرو، اور اس

---

[1] اخرج البیہقی [2] وہذا اسناد جید قوی ولم یخرجوہ [3] وقد روی یونس عن ابن اسحاق حدثنی عبادۃ بن الولید بن عبادۃ بن الصامت عن ابیہ عن جدہ [4] کذا فی البدایۃ ج ۳ ص ۱۶۳ واخرج الشیخان بمعناہ کما فی الترغیب ج ۴ ص ۳ [5] اخرج ابن جریر۔

طرح کہو کہ جہاں تک مجھ میں استطاعت ہوگی، آپ کی فرماں برداری کروں گا۔ چنانچہ میں نے کہا کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا آپ کی اطاعت کروں گا۔ آپؐ نے مجھ سے اس بات پر اور مسلمانوں کے نصیحت کرنے پر بیعت لی [۱] ایک اور روایت [۲] میں ہے کہ میں نے حضورؐ سے کہنا سننے اور فرماں برداری اور ہر مسلمان کو نصیحت کرنے پر بیعت کی، حضرت جریرؓ کی عادت تھی کہ جب کسی چیز کی خرید یا فروخت کرتے تو یہ ضرور کہہ دیتے کہ جو چیز ہم نے تم سے لی وہ ہمیں زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ جو ہم نے تمہیں دی، اب تمہیں اختیار ہے۔ خواہ بیع و شراء کر دیا نہ کرو [۳]

ابن عمرؓ [۴] رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جب حضورؐ سے کہنا سننے اور فرمان بجالانے پر بیعت کرتے تھے تو آپؐ ہم لوگوں سے فرماتے تھے کہ اس طرح کہو کہ جہاں تک ہم سے ہو سکے گا، اطاعت اور فرماں برداری کریں گے [۵]

عتبہ [۶] بن عبد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضورؐ سے سات بیعتیں کیں ـــــ پانچ فرماں برداری پر اور دو محبت کے بارے میں [۷] (اللہ و رسول اور تمام مسلمانوں سے محبت کرنا)

حضرت انسؓ [۸] رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے انہیں ہاتھوں سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر بیعت کی کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا، آپ کی سنوں گا، اور فرماں برداری کروں گا۔ [۹]

خواتین کی بیعت

حضرت [۱۰] اُمِّ عطیہؓ فرماتی ہیں کہ جب حضورؐ مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے انصاری خواتین کو ایک مکان میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ پھر حضرت عمرؓ بن خطاب کو اُن کے پاس بھیجا، انہوں نے دروازے پر کھڑے ہو کر خواتین کو سلام کیا، خواتین نے سلام کا جواب دیا، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام رساں ہوں، مجھے آپؐ نے تمہارے پاس بھیجا ہے، خواتین نے کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی مرحبا اور

---

۱ کذا فی کنز العمال ج ۱ ص ۸۲۔ ۲ وعند ابی داؤد و النسائی من حدیثہ ۳ کذا فی الترغیب ج ۳ ص ۲۱ ۴ و اخرج البخاری ۵ و اخرجہ النسائی و ابن جریر بمعناہ کما فی الکنز ج ۱ ص ۸۳ ۶ و اخرج البغوی و ابو نعیم و ابن عساکر ۷ کذا فی الکنز ج ۱ ص ۸۳ ۸ اخرج ابن جریر ۹ کذا فی الکنز ج ۱ ص ۸۲ ۱۰ اخرج احمد و ابو یعلی والطبرانی و رجالہ ثقات۔ کما قال الہیثمی ج ۶ ص ۳۸

آپ کے قاصد کے لئے بھی مرحبا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، تم اس بات پر بیعت کرو کہ اللہ تعالےٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، چوری نہ کرو، زنا سے احتراز کرو۔ اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، اور اس قسم کی بہتان بندی مت کرو کہ غیر کی اولاد کو اس طرح کی اپنی اولاد بتاؤ کہ تمہارے ہی ہاتھوں اور پیروں کے درمیان اس کی پیدائش ہوئی اور کسی بھلے کام میں نافرمانی نہ کرنا۔ خواتین نے کہا، ہم سب نے یہ باتیں منظور کر لیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ دروازے کے باہر سے بڑھایا اور خواتین نے اپنے ہاتھ دروازے کے اندر سے (لیکن حضرت عمر اور خواتین میں سے ایک کا ہاتھ دوسرے سے نہیں لگا) اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے اللہ! تو گواہ ہو جا اور ہم لوگوں کو حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ عید اور بقرعید میں حیض والی اور کنواری لڑکیاں چلی جایا کریں (تاکہ دعا میں شرکت ہو جائے، وہ نماز اور مسجد سے دور رہیں گی)، اور ہم لوگوں کو جنازہ کے پیچھے چلنے سے منع کیا، اور یہ بھی فرمایا کہ ہم لوگوں پر جمعہ نہیں حضرت اُم عطیہؓ کہتی ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ سے بہتان کے بارے میں پوچھا اور اُن کے اِس فرمان کو بھی پوچھا کہ بھلی بات میں نافرمانی نہ کریں گے (ان کا کیا مطلب ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نوحہ نہ کرنا[1]

حضرت سلمیٰ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خالاؤں میں سے ایک خالہ ہیں، انہوں نے آپؐ کے ساتھ دونوں قبلوں (بیت المقدس اور بیت اللہ) کی طرف نماز پڑھی ہے یہ قبیلہ بنی عدی بن نجار میں سے تھیں، فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور میں نے مع انصار کی چند خواتین کے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ جب آپؐ نے ہم لوگوں پر یہ شرط پیش کی کہ ہم خدا کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کریں۔ چوری نہ کریں۔ زنا نہ لائیں، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں اور کوئی ایسا بہتان نہ لائیں۔ کہ جس کو ہم اپنے ہاتھ پیر کے درمیان گھڑیں (یعنی غیر کی اولاد کو اپنی حقیقی اولاد بتائیں) اور آپؐ کی کسی بھلے کام میں نافرمانی نہ کریں۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ اپنے شوہروں سے کھوٹ کپٹ نہ برتنا۔ حضرت سلمیٰؓ فرماتی ہیں کہ ہم خواتین نے آپؐ سے ان باتوں پر بیعت کر لی۔ اس کے بعد ہم واپس ہو گئیں۔ میں نے انہیں میں سے ایک عورت سے کہا کہ آپؐ کی خدمت میں لوٹ جا اور آپؐ سے پوچھ آ کہ شوہر کے ساتھ کھوٹ کپٹ نہ کرنے کا کیا مطلب ہے؟

---

[1] اخرجہ ابو داؤد باختصار کثیر۔ کذا فی مجمع الزوائد ج ۶ ص ۳۸ قلت واخرجہ البخاری ایضاً باختصار وقد اخرجہ بطولہ ابن سعد وعبد ابن حمید کما فی الکنز ج ۱ ص ۸۲ واخرج احمد وابو یعلی والطبرانی ورجالہ ثقات کما قال الہیثمی ج ۶ ص ۳۸

چنانچہ اس نے آپؐ سے جاکر دریافت کیا، آپؐ نے فرمایا کہ شوہر کا مال لے کر کسی غیر کو دینا۔[۱]

غفیلہ[۲] بنت عبید بن الحارث رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اور میری ماں قریبہ بنت الحارث عنواریہ جو ہجرت کرنے والی عورتوں میں سے تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئیں اور آپؐ سے بیعت کی۔ آپؐ کنکریلے میدان میں ایک خیمہ میں تشریف فرما تھے۔ آپؐ نے ہم سب سے اس بات پر بیعت لی کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، اور ان ساری باتوں پر جن کا اس آیۃ[۳] میں تذکرہ ہے، آپؐ نے وعدہ لیا ہم سب نے اقرار کیا اور اپنا ہاتھ آپؐ سے بیعت کے لئے بڑھایا، آپؐ نے فرمایا میں عورتوں کے ہاتھوں کو نہیں چھوتا۔ اس کے بعد آپؐ نے ہم لوگوں کو مغفرت کی دعا دی۔ یہ تھی ہم عورتوں کی بیعت۔[۴]

امیمہ[۵] بنت رقیقہ فرماتی ہیں کہ میں چند عورتوں کے ہمراہ آپؐ کی خدمت میں بیعت کے ارادہ سے حاضر ہوئی، اور آپؐ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہم آپؐ سے بیعت کرتے ہیں۔ ان باتوں پر کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔ چوری نہ کریں گے، فعلِ زنا نہ کریں گے، اپنی اولادوں کو قتل نہ کریں گے، اور کوئی ایسی بہتان بندی نہ کریں گے جس کو ہم نے اپنے ہاتھ اور پیر کے درمیان گھڑا ہو، کسی بھلے کام میں آپ کی نافرمانی نہ کریں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ بھی کہو کہ جہاں تک ہم سے ہوسکے گا اور ہم میں طاقت ہوگی ہم نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول ہم سے زیادہ ہمارے نفسوں پر رحم کھانے والا ہے۔ ہم نے کہا آئیے، ہاتھ بڑھائیے یارسول اللہ! ہم بیعت ہوں، آپؐ نے فرمایا میں عورتوں سے ہاتھ نہیں ملاتا۔ میرا کہنا سو[۶] عورتوں سے اسی طرح پر ہے، جیسا ایک عورت سے کہنا (یعنی عورت سے صرف زبانی بیعت ہوتی تھی خواہ سو[۷] ہوں یا ایک۔)

حضرت عبداللہ[۸] بن عمرو فرماتے ہیں کہ امیمہ بنت رقیقہ رضی اللہ عنہا حضورؐ کی خدمت میں اسلام پر بیعت ہونے کے لئے حاضر ہوئیں۔ حضورؐ نے فرمایا میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، چوری نہ کرنا، زنا کی مرتکب نہ ہونا،

---

[۱] اخرج الامام احمد عن عائشۃ بنت قدامۃ بمعناہ فی البیعت علی وفق الآیۃ کما فی ابن کثیر ج ۴ ص ۳۵۳ واخرج الطبرانی فی الکبیر والاوسط [۲] سورۂ ممتحنہ کا آخری رکوع [۳] قال الہیثمی ج ۶ ص ۳۹ وفیہ موسیٰ بن عبیدۃ وہو ضعیف۔ انتہیٰ [۴] واخرج مالک ونحوہ ابن حبان [۵] واخرجہ الترمذی وغیرہ مختصراً کما فی الاصابۃ ج ۴ ص ۲۳۲ [۶] واخرجہ الطبرانی ورجالہ ثقات۔

اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا، اور غیر کی اولاد کو اپنی اولاد بتانے کے لئے بہتان بندی نہ کرنا، نوحہ نہ کرنا اور پچھلی جاہلیت کے طریقے پر یعنی بے پردہ باہر نہ نکلنا[۱]

حضرت عائشہؓ[۲] فرماتی ہیں کہ فاطمہؓ بنت عتبہ حضورؐ کی خدمت میں بیعت ہونے کے ارادہ سے حاضر ہوئیں۔ آپؐ نے اُن سے اس بات پر بیعت لی جس کا تذکرہ سورہ ممتحنہ کی آیات میں ہے کہ شرک نہ کریں، زنا نہ کریں وغیرہ، انہوں نے اپنا ہاتھ شرم کے مارے اپنے سر پر رکھ لیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی یہ بات پسند آئی۔ اُن کی یہ جھجک دیکھ کر حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ اے بی بی! اس کا اقرار کرو، خدا کی قسم ہم سب نے بھی انہیں باتوں پر بیعت کی تھی، حضرت فاطمہؓ نے اقرار کیا، اور آپؐ نے اُن سے اسی آیت کے مضمون پر بیعت لے لی[۳]

عزہ بنت[۴] خائلؓ فرماتی ہیں کہ میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو حضورؐ نے مجھے ان باتوں پر بیعت فرمالیا، زنا کی مرتکب نہ ہونا، چوری نہ کرنا، اولاد کو زندہ درگور نہ کرنا نہ چھپ کر نہ ظاہر ـــــ عزہؓ کہتی ہیں کہ ظاہراً زندہ درگور کرنا تو میری سمجھ میں آگیا مگر چھپ کر زندہ درگور کرنے کا مطلب میں نہیں سمجھی، اور نہ میں نے حضورؐ سے دریافت کیا اور نہ آپؐ نے خود بتلایا، لیکن میرے جی میں اس کا مطلب اس طرح آیا کہ اولاد کو کسی طرح پر خراب نہ کرو (یعنی ہر طرح پر اس کی پرورش کے معاملہ میں خاصی نگہداشت رکھو) اور خدا کی قسم کبھی بھی بچہ کو ضائع نہ ہونے دوں[۵]

فاطمہؓ بنت[۶] عتبہ بن ربیعہ کی روایت ہے کہ ان کو اور اُن کی بہن ہندؓ بنت عتبہ کو ابو حذیفہؓ بن عتبہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیعت کرانے کے ارادہ سے لے کر حاضر ہوئے۔ حضرت فاطمہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ نے ہم لوگوں سے عہد و پیمان لئے میں نے عرض کیا کہ اے میرے چچیرے بھائی! کیا آپ اپنی قوم میں ان عیوب اور نقائص میں سے کوئی بات جانتے ہیں؟ حضرت ابو حذیفہؓ نے مجھ سے کہا، ان باتوں کو چھوڑو۔ اور بیعت ہو جاؤ، آپؐ تو انہیں باتوں پر عورتوں سے بیعت لیتے ہیں اور یہی شرائط منواتے

---

[۱] کذا فی المجمع ج ۶ ص۳۸ واخرجہ ایضاً النسائی وابن ماجہ والامام احمد وصححہ الترمذی کما فی التفسیر لابن کثیر ج ۴ ص۳۵۳ [۲] واخرج احمد والبزار۔ ورجالہ رجال الصحیح [۳] کذا فی مجمع الزوائد ج ۶ ص۳۷ [۴] واخرج الطبرانی۔ [۵] قال الہیثمی ج ۶ ص۳۹ رواہ الطبرانی فی الاوسط والکبیر بنحوہ عن عطاء بن مسعود الکعبی عن ابیہ عنہا ولم اعرف مسعودا وبقیۃ رجالہ ثقات انتہی [۶] واخرج الطبرانی ۲ ص۲۶۲

ہیں۔ ہندؓ نے حضورؐ سے عرض کیا کہ میں چوری کے ترک پر آپ سے بیعت نہیں کرسکتی، (اور ساری باتیں منظور) اس لئے کہ میں اپنے شوہر کے مال سے کچھ چرالیا کرتی ہوں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دستِ مبارک سمیٹ لیا اور انہوں نے بھی اپنا ہاتھ سمیٹ لیا، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوسفیانؓ کو بلوایا، اور ابوسفیانؓ سے اُن کے مال میں سے لے لینے کی اجازت دیدینے کو فرمایا، ابوسفیانؓ نے کہا، کھانے پینے کی چیز کا کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن خشک چیزیں مثلاً سونا، چاندی، اناج وغیرہ کی اجازت نہیں اور نہ اس کے لئے میں ہاں کروں، ہندؓ کہتی ہیں ہم نے پھر آپؐ سے بیعت کرلی، اس کے بعد فاطمہؓ نے کہا کہ (اب سے پہلے) آپ کے خیمہ سے زیادہ مبغوض میرے لئے کوئی خیمہ نہ تھا اور میں پسند نہ کرتی تھی کہ خدا اس خیمہ کو اور اس خیمہ میں رہنے والے کو باقی رکھے، اور اب خدا کی قسم مجھے آپ کے خیمہ سے زیادہ کوئی خیمہ محبوب نہیں اللہ اس کو باقی رکھے، اور اس میں برکت نازل کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قسم کھاکر فرمایا کہ تم میں سے کوئی مومن کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اُسے اس کی اولاد اور اس کے ماں باپ سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔[۱]

حضرت عائشہؓ[۲] فرماتی ہیں کہ ہندؓ بنت عتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیعت کے ارادہ سے آئیں۔ حضورؐ نے اُن کے دونوں ہاتھوں کو دیکھ کر فرمایا کہ اپنے ہاتھوں کو بدل کر کے آؤ چنانچہ یہ گئیں اور مہندی لگانے کے بعد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ آپؐ نے فرمایا میں تم سے ان امور پر بیعت لیتا ہوں کہ اللہ تعالٰی کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، چوری نہ کرنا، زنا کی مرتکب نہ ہونا۔ ہندؓ نے کہا، کیا حُرّہ بھی زنا جیسے فعل کو اختیار کرتی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ اپنی اولاد کو محتاجگی کے ڈر سے قتل نہ کرنا کہنے لگیں کہ آپؐ نے ہمارے لئے کون سی اولاد چھوڑی جس کو ہم قتل کریں؟ راوی کہتے ہیں کہ بہرحال ہندؓ نے آپؐ سے بیعت کی اور اُن کے دونوں ہاتھوں میں سونے کے دو کنگن تھے کہنے لگیں کہ آپ ان دو کنگنوں کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ جہنم کی چنگاریوں میں سے دو چنگاریاں ہیں[۳] (بشرطیکہ زکوٰۃ نہ نکالی جائے)۔

ایک[۴] اور روایت میں خواتین کی بیعت کے تذکرہ میں ہند کی بیعت کا واقعہ ہے کہ جب آپؐ نے عورتوں سے

---

[۱] قال الحاکم ہذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاہ ووافقہ الذہبی فقال صحیح [۲] وعند ابی یعلی [۳] قال الہیثمی ج۶ ص۳۷ وفیہ من لم اعرفہن واخرجہ ابن ابی حاتم مختصراً کما فی ابن کثیر ج۴ ص۳۵۲۔ [۴] وقال فی الاصابۃ ج۴ ص۴۲۵۔

یہ عہد لیا کہ چوری نہ کریں گی۔ زنا کی مرتکب نہ ہوں گی۔ ہندؓ نے کہا کیا شریف زادیاں بھی زنا کی مرتکب ہوتی ہیں؟ اور جب آپؐ نے یہ عہد لیا کہ اولاد کو قتل نہ کریں، ہندؓ نے کہا جب تک اولاد چھوٹی تھی ہم نے پرورش کی اور جب وہ بڑی ہو گئی تو آپ نے مار ڈالا۔ یہ مشہور واقعہ ہے۔

ایک دوسری[1] روایت میں ہے کہ جب آپؐ نے کہا کہ زنا کا ارتکاب نہ کرنا، ہندؓ نے کہا کہیں آزاد عورت بھی زنا کی مرتکب ہوتی ہوگی اور جب آپؐ نے یہ وعدہ لیا کہ اولاد کو قتل نہ کرنا تو ہندؓ نے کہا، آپ ہی نے ان کو قتل کیا ہے۔

ایک[2] دوسری روایت میں ہے کہ ہندؓ نے اس طرح کہا کہ کیا آپؐ نے ہمارے لئے جنگِ بدر میں ہماری کسی اولاد کو چھوڑ دیا؟

ابن مندہ[3] کی روایت میں شروع کا مضمون اس طرح ہے، ہندؓ نے کہا کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کا ارادہ رکھتی ہوں۔ یہ سن کر ابو سفیانؓ نے کہا میں تو تجھے ہمیشہ آپؐ کی بات کا انکار کرتے ہوئے پاتا ہوں، ہندؓ نے کہا، ہاں خدا کی قسم یہی بات تھی، اس مسجد میں آج کی رات سے قبل کسی کو اللہ پاک کی اتنی عبادت کرتے ہوئے نہ دیکھا تھا، خدا کی قسم آج تو ساری رات مسلمانوں نے نماز پڑھنے میں گذار دی، کوئی کھڑا تھا، کوئی رکوع میں تھا، کوئی سجدے میں تھا، ابو سفیانؓ نے کہا، تو نے اب تک جو کچھ کیا، کیا اپنی قوم میں سے اپنے کسی آدمی کو ساتھ لے کر آپؐ کی خدمت میں جا اور آپؐ سے بیعت کر لے۔ یہ حضرت عمرؓ کے پاس گئیں اور ان کی معیت میں آپؐ کے پاس حاضر ہوئیں۔ حضرت عمرؓ نے اُن کے داخلے کی اجازت طلب کی اور یہ چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے اندر تشریف لے گئیں۔ اس کے بعد اصل حدیث میں اُوپر والا مضمون بیان کیا گیا۔ حضرت شعبی نے بیان کیا ہے کہ ہندؓ نے آپؐ سے عرض کیا کہ میں نے اپنے شوہر ابو سفیانؓ کا بہت کچھ مال ضائع کیا ہے۔ حضرت ابو سفیانؓ نے کہا، جو کچھ تم میرا مال خرچ کر چکی ہو، وہ میں نے تمہارے لئے حلال کیا[4]۔ تفسیر[5] ابن کثیر میں اس طرح ہے کہ حضرت ابو سفیانؓ نے فرمایا، جو کچھ تم میرے مال سے لے چکی ہو وہ فنا ہو گیا ہو یا باقی رہا ہو وہ میں نے سب تمہارے لئے مباح اور حلال کر دیا۔ یہ سن کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے اور ہندؓ کو

---

[1] ومن طرقہ ما اخرجہ ابن سعد بسند صحیح مرسل عن الشعبی وعن میمون بن مہران ففی روایۃ الشعبی [2] وفی روایۃ نحوہ [3] اخرج ابن مندۃ وفی اولہ [4] انتہی مختصراً [5] وقد اخرجہ ابن جریر من حدیث ابن عباس بطولہ کما ذکر ابن کثیر فی تفسیرہ ج ۴ ص ۳۵۳

پہچان لیا اور ان کو بلایا، ہندؓ نے آپؐ کا ہاتھ پکڑا، اور عذر خواہی کی۔ آپؐ نے فرمایا، کیا تو ہند ہے۔ ہندؓ نے کہا، اللہ میری گزشتہ خطاؤں کو معاف کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی طرف سے منہ پھیر کر اُن سے بیعت کے عہد و پیمان لئے جب آپؐ نے یہ فرمایا کہ زنا کی مرتکب نہ ہونا، ہندؓ نے کہا، یا رسول اللہ! کیا شریف زادیاں بھی زنا میں مبتلا ہوتی ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا، نہیں خدا کی قسم آزاد شریف عورتیں اس کا ارتکاب نہیں کرتیں، اور جب آپؐ نے اس کا وعدہ لیا کہ اپنی اولادوں کو قتل نہ کریں۔ ہندؓ نے کہا آپؐ ہی نے تو اُن کو یوم بدر میں قتل کرڈالا۔ اب آپ جانیں اور وہ۔ آپؐ نے فرمایا۔ ہاتھ اور پیر کے درمیان کسی بہتان طرازی کو نہ لائیں، اور کسی بھلے کام میں آپؐ کی نافرمانی نہ کریں۔ اور آپؐ نے عورتوں کو نوحہ کرنے سے بھی منع کیا۔ زمانۂ جاہلیت میں عورتیں، کپڑے پھاڑ لیا کرتی تھیں۔ اپنے چہرے نوچ لیتی تھیں، اور سر کے بال کٹا دیتی تھیں، اور بڑی واویلا مچایا کرتی تھیں[۱]۔ (آپؐ نے ان امور سے منع فرمایا)

اُن خواتین[۲] میں سے جنہوں نے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، ایک بیان کرتی ہیں کہ جن چیزوں پر ہم سے حضور علیہ السلام نے عہد و پیمان لیا تھا کہ اس میں یہ بھی تھا کہ ہم کسی بھلے کام میں آپؐ کی نافرمانی نہ کریں گی۔ اپنے چہرے نہ نوچیں گی۔ اپنے بال نہ کٹائیں گی۔ اپنا گریبان نہ پھاڑیں گی۔ واویلا نہ مچائیں گی[۳]۔

نابالغوں کی بیعت

محمد بن[۴] علی بن الحسین رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن حسین۔ عبداللہ بن عباس۔ عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم سے بیعت لی۔ یہ حضرات کم سن تھے۔ زمانۂ جوانی سے ابھی بہت دور تھے۔ بلوغت کو ابھی نہیں پہنچے تھے۔ اور ڈاڑھی چہرے پر نہیں آئی تھی، آپؐ نے کسی بچے سے سوائے ان بچوں کے بیعت نہیں لی[۵]۔

طبرانی میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سات سات[۶] سال کے تھے کہ ان کو آپؐ نے بیعت فرمالیا۔ ان کو آپؐ نے دیکھا اور تبسم فرمایا اور اپنا ہاتھ پھیلایا اور ان

---

[۱] قال ابن کثیر و ہذا اثر غریب [۲] واخرج ابن ابی حاتم عن اسید بن ابی اسید البزار [۳] کذا فی التفسیر ابن کثیر ج ۴ صفحہ ۳۵۵ [۴] اخرج الطبرانی
[۵] قال الہیثمی ج ۶ صفحہ ۴۰ وہو مرسل، و رجالہ ثقات

دونوں سے بیعت لے لی[۳] حضرت عروہؓ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن جعفر یا جعفر بن زبیر حضورؐ سے سات سال کی عمر میں بیعت ہوئے[۴] ہرماس بن زیادؓ فرماتے ہیں کہ میں بچہ تھا میں نے اپنا ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھایا۔ آپ نے مجھ سے بیعت نہیں لی[۵]

صحابۂ کرامؓ کی خلفائے راشدینؓ سے بیعت

ابراہیم بن منتشر[۱] اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ جب آیۃ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ حضور علیہ السلام پر نازل ہوئی تو آپ نے لوگوں سے اس طرح بیعت لی کہ ہم اللہ کے لئے بیعت ہوتے ہیں کہ اس کی فرماں برداری کریں گے اور حق بات مانیں گے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ لوگوں سے اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری پر بیعت لیتے تھے۔ اُن کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور اُن کے بعد کے خلفاء کی بیعت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی طرح تھی[۶]

ابن عفیف[۸] رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لوگوں سے بیعت لے رہے ہیں، جماعت کی جماعت لوگ آپ کے پاس جمع ہوتے تھے، آپ لوگوں سے فرماتے، تم مجھ سے بیعت کرو۔ اللہ کا کہا سننے اور اس کی فرماں برداری کرنے اور اس کی کتاب کے ماننے پر اور امیر کی اطاعت کرنے پر لوگ کہتے، ہاں ہم نے منظور کیا، تو آپ اسی طرح لوگوں سے بیعت لے لیتے۔ میں تھوڑی دیر تک آپ کے پاس کھڑا رہا۔ میں ان دنوں قریب البلوغ تھا یا بالغ ہو چکا تھا میں نے وہ شرطیں یاد کرلیں جو آپ نے لوگوں پر پیش کیں، پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے خود ہی عرض کیا کہ میں آپ کے ہاتھوں پر بیعت کرتا ہوں کہ اللہ کا کہا سننے اور اس کی فرماں برداری کرنے پر اور اس کی کتاب کے ماننے پر، اس کے بعد امیر کی اطاعت کرنے پر، یہ دیکھ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے میری طرف نظر اوپر نیچے کی۔ میں یہ سمجھا کہ میری بات سے

---

[۱] قال الہیثمی ج ۹ ص۲۸۵ وفیہ اسمٰعیل بن عیاش وفیہ خلاف وبقیۃ رجالہ رجال الصحیح
[۲] واخرجہ ایضاً ابونعیم وابن عساکر [۳] فذکر نحوہ کما فی المنتخب ج ۵ ص۲۲۷۔
[۴] واخرج النسائی [۵] کذا فی جمع الفوائد ج ۱ ص۱۳۔
[۶] اخرج ابن شاہین فی الصحابۃ [۷] کذا فی الاصابۃ ج ۳ ص۲۵۸۔
[۸] البیہقی ج ۸ ص۱۴۶۔

ان کو بڑا تعجب ہوا ، اللہ اُن پر رحم کرے ۔

ابو سفرؒ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ جب لوگوں کو ملک شام کی طرف روانہ کرتے اُن سے (کفار کے ساتھ) مرنے مارنے اور طاعون پر بیعت لیتے (کہ ہر حال میں جمے رہیں گے)[1]

حضرت انسؓ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں مدینہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حاضر ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہو چکے تھے ۔ میں نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا آپ اپنا ہاتھ بڑھائیے کہ میں آپ کے ہاتھ پر اس طرح بیعت ہوں جیسا کہ آپ کے ساتھی کے ہاتھ پر آپ سے پہلے بیعت کی تھی یعنی جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا ، اللہ کا کہنا سنوں گا اور فرماں برداری کروں گا[2]

عمیرؒ بن عطیہ لیثی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا اے امیر المومنین اپنا ہاتھ لائیے ، خدا آپ کے ہاتھ کو بلند کرے تاکہ میں آپ سے بیعت کروں ، اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کے لئے ، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور ہنسے اور فرمایا کہ یہ بیعت کچھ حق میرے تم پر اور کچھ تمہارے حق مجھ پر لازم قرار دیتی ہے عبداللہ بن حکیم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے انہیں ہاتھوں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہنا سننے اور فرماں برداری کرنے پر بیعت کی[3] سلیم ابی عامرؒ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حمار کا وفد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا ، اور ان باتوں پر آپ سے بیعت کی اللہ کے ساتھ شرک نہ کریں گے ۔ نماز کو قائم رکھیں گے ، زکوٰۃ دیں گے ۔ رمضان کے روزے رکھیں گے اور مجوسیوں کی عید نہ منائیں گے جب ان لوگوں نے اس بات کا اقرار کیا تو ان کو بیعت کر لیا[4]

مسورؓ بن مخرمہ فرماتے ہیں کہ وہ جماعت جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ چننے کے لئے منتخب کیا تھا مشورہ کے لئے جمع ہوئی ۔ ان لوگوں سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ میں وہ تو نہیں ہوں کہ اس کام کے لئے اپنے آپ کو تم پر ترجیح دوں ۔ ہاں اگر تم لوگوں کا منشا ہو تو تمہیں میں سے ایک آدمی کو منتخب کروں گا ۔ ان حضرات نے یہ تصفیہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کو سونپا ، اور جب ان کو پورا اختیار دے دیا تو لوگوں کی نظریں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی طرف جم گئیں ۔ کوئی بھی اُن حضرات کے پیچھے نہ چلا ۔ ساری رات لوگ حضرت عبدالرحمٰنؓ

---

[1] اخرجہ مسدد [2] کذا فی الکنز ج ۳ ص ۱۴۳ [3] اخرجہ ابن سعد و ابن ابی شیبۃ والطیالسی ۔
[4] کذا فی الکنز ج ا ص ۸۱ [5] اخرج ابن سعد [6] کذا فی الکنز ج ا ص ۸۱ [7] اخرجہ احمد فی السنۃ
[8] کذا فی کنز العمال ج ا ص ۸۱ [9] اخرجہ البخاری

سے مشورہ کرتے رہے ، اور یہ مشورہ اس رات تک رہا جس کی صبح کو ہم لوگوں نے حضرت عثمانؓ سے بیعت کی ۔ حضرت مسورؓ فرماتے ہیں، کچھ رات کے بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا ۔ جب میں بیدار ہوا کہنے لگے تم سو ہی رہے ہو، ہم نے تو اپنی آنکھوں میں نیند کی سلائی بھی نہیں پھیری ۔ جاؤ حضرت زبیرؓ اور حضرت سعدؓ کو بلالاؤ ۔ میں ان دونوں کو بلا لایا ، اور حضرت عبدالرحمٰنؓ نے ان دونوں سے مشورہ کیا ۔ پھر مجھے بلایا اور کہا کہ جاؤ میرے پاس حضرت علیؓ کو بلالاؤ ۔ میں حضرت علیؓ کو بلا کر لایا ان سے بہت رات تک سرگوشی کرتے رہے پھر حضرت علیؓ اُن کے پاس سے اُٹھے اور انہیں خود خلیفہ بن جانے کی امید سی تھی ، حضرت عبدالرحمٰنؓ کو حضرت علیؓ سے اس بارے میں کچھ کھٹکا تھا ۔ اس کے بعد مجھ سے کہا ، میرے پاس حضرت عثمانؓ کو بلالاؤ ، چنانچہ میں حضرت عثمانؓ کو بلا کر لایا ۔ اُن سے سرگوشی میں لگ گئے ۔ جب مؤذن نے صبح کی اذان دی ہے تو یہ دونوں حضرات علیحدہ ہوئے ہیں ۔ جب لوگ صبح کی نماز سے فارغ ہو گئے اور وہ جماعت ممبر کے پاس جمع ہوئی ، (جن کو خلافت کے بارے میں حضرت عمرؓ منتخب فرما گئے تھے) ، تو حضرت عبدالرحمٰنؓ نے جتنے مہاجرینؓ و انصارؓ موجود تھے ان کو آدمی بھیج کر بلوایا اور لشکر کے سرداروں کو بُلوایا ، اور یہ حضرات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج میں آکر مل گئے تھے ۔ جب یہ حضرات جمع ہو گئے تو حضرت عبدالرحمٰنؓ نے کلمۂ شہادت پڑھنے کے بعد کہا ، امابعد ! میں نے اے علیؓ ! اس بارے میں لوگوں کی رائے کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ، لوگ حضرت عثمانؓ کے برابر اس کام کے لئے کسی کا انتخاب نہیں کرتے ۔ آپ اپنے دل میں اس بات سے کوئی میل نہ لائیے ۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ کا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں کہ اللہ کے طریقے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپؐ کے بعد کے دونوں خلفاء کے اُمور کی پابندی (اور اطاعت کروں گا) سب سے پہلے حضرت عبدالرحمٰنؓ نے بیعت کی ۔ اس کے بعد مہاجرین اور انصار نے اور لشکر کے سرداروں نے اور تمام مسلمانوں نے بیعت کی ۔[۱]

---

[۱] واخرجہ البیہقی ج ۸ صـ ۱۴۷ ایضاً بنحوہ

عشقِ رسول ﷺ کا مفہوم اور اس کے تقاضے

ابوالمظفر الحسینی

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن　　دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن[1]

ہم ارکان (برما) میں تھے - سمرقند و بخارا والوں کی مانند، ہم بھی سوشلزم کی برکت سے دیس بدیس ہو گئے - ہم اپنے ملک میں صرف تین کلمات جانتے تھے - کتاب اللہ، حدیث رسول ﷺ اور فقہ امام ابوحنیفہ اور بس - ان تینوں کلمات پر عمل کر کے ہم اللہ تعالےٰ کی عبادت کرتے اور زندگی بسر کرتے تھے - جب ہم مشرقی پاکستان آئے تو سب سے پہلے وہابی بدعتی کا جھگڑا سنا - پھر جب وہاں سے مغربی پاکستان آئے - تو یہاں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ کے اختلافات دیکھے - پھر دیوبندیوں میں کئی فرقے ہیں - پھر کچھ پاکستانی پرویزی اور کچھ قادیانی ہیں - بھانت بھانت کی جماعتیں اور ان کی بھانت بھانت کی آوازیں - مجھے ان گروہوں کے آپس کے اختلافات کا محاکمہ نہیں کرنا ہے - کیونکہ یہ میری بساط سے بالاتر ہے - اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا تصفیہ فرمائے گا -

ایک عجیب و غریب بات جو مجھے یہاں نظر آئی، وہ یہ کہ، کچھ لوگ بے شرع ہیں - ان کی صورت، سیرت، عقائد، اعمال اور طور طریق غیر اسلامی اور سنت رسول صلعم کے خلاف ہیں - اس کے باوجود وہ عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کے دعویدار ہیں، بمصداق، نام زنگی نہد کافور - حالانکہ ایک مسلمان کے لئے سب سے بڑا سرمایہ حیات،

---

[1] عاشقی کیا ہے؟ معشوق کا غلام بننا ہی تو ہے اور اپنا دل دوسرے کے ہاتھ میں دیکر خود حیران و پریشان رہنا ہی تو ہے -

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کو اپنانا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا۔ الاحزاب ۲۱۔ تم لوگوں کے لئے یعنی ایسے شخص کیلئے جو اللہ سے اور روز آخرت سے ڈرتا ہو، اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو رسول اللہ ؐ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے۔ اس اسوۂ کو اپنائے بغیر نجات ناممکن ہے۔

خلاف پیمبر کسے رہ گزید   کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

ان حضرات کے پاس مجھے بطور سرمایہ عشق، بجز دعویٰ عشق، نعت خوانی، محفل میلاد و جلسہ سیرت یا عید میلاد النبی ؐ کے انعقاد کے اور کوئی شئے نظر نہیں آئی۔ رہا اپنے محبوب نبی صلعم کی صورت و سیرت اور طرز زندگی کو اپنانا جیسا کہ اسلام کی ہدایت ہے اور رسول اللہ ؐ کی بتائی ہوئی چیزوں کو کرنا، اور منع کی ہوئی چیزوں سے باز رہنا، جو ایک سچا عاشق رسول ؐ کی شان ہونی چاہیئے، سو اس سے یہ لوگ کوسوں دور ہیں۔

اس مقالہ میں مجھے صرف اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ آیا سنت رسول ؐ اور آپ کے اُسوۂ حسنہ سے انحراف کر کے: صرف نعت خوانی، محفل میلاد اور جلسہ سیرت کا انعقاد، دعویٰ عاشقیت کے ثبوت کے لئے کافی ہیں؟ یا اس دعویٰ کی تصدیق کے لئے سنت رسول ؐ اور آپ کے اُسوۂ حسنہ کو اپنانے کی بھی ضرورت ہے؟ رہی یہ بحث کہ یہ چیزیں یعنی نعت خوانی، محفل میلاد اور جلسہ سیرت کا انعقاد بذات خود طاعت ہیں یا معصیت؟ سو اس کا فیصلہ اس مقالہ کے موضوع سے خارج ہے لہٰذا میں اس سلسلے میں خامہ فرسائی نہیں کروں گا۔

میں اپنے اس جائزے کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔

اوّل عشق رسول اور اس کا دعویٰ - دوسرا اس دعویٰ پر دلیل یعنی آیا اس دعویٰ کے لئے دلیل کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ تیسرا نتیجہ یعنی ہمارے طرز عمل کی رو سے یہ دعویٰ عشق ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟

میں کوئی بڑا متبحر عالم نہیں ہوں اور نہ ہی کوئی ادیب، ٹوٹے پھوٹے، عام فہم اور مختصر الفاظ میں کچھ حقائق قلمبند کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اپنے بندوں کو اس کے پڑھنے، سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور مجھے بھی - اور میری اس حقیر کاوش کو قبول فرما کر میرے لئے ذریعہ نجات بنائے -

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَأْنَا - رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ - وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ - آمین یَا رَبَّ الْعَالَمِیْن -

ابو المظہر الحسینی عفی اللہ عنہ وعن والدیہ والمسلمین آمین

عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کا دعویٰ

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا یہ دین اسلام سراسر عشق رسولؐ سے عبارت ہے - کیونکہ رسول اللہؐ سے محبت کی بدولت ہی آپ کی لائی ہوئی شریعت کی پابندی نصیب ہوتی ہے جس کو آپؐ سے محبت نہ ہو، وہ بھلا ان کی لائی ہوئی شریعت پر کیوں عمل کرے گا - قرآن و حدیث میں رسول اللہؐ سے محبت کے وجوب پر بہت سی آیات واحادیث وارد ہیں - سب کا احاطہ اور استقصا نہ میرے بس کی بات ہے اور نہ اس کی ضرورت، اس لئے ایک آیت اور حدیث بطور مثال ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں - انصاف پسندوں کیلئے یہی کافی ہے، متعنت کے لئے دفتر کا دفتر بھی بیکار -

رسول اللہ صلعم نے فرمایا: لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہٖ وولدہٖ والناس اجمعین - رواہ الشیخان عن

انس رضؓ۔ تم میں سے کوئی اس وقت تک ایماندار قرار نہیں پائیگا تا آنکہ میں اُس کے نزدیک اپنے والد اپنی اولاد اور سارے لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔

اللہ تعالےٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴿ (التوبہ - ۲۴) - آپ کہہ دیجئے اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی، اور تمہاری بیویاں، اور تمہارا کنبہ، اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو، اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو، تم کو اللہ تعالےٰ، اور اس کے رسول، اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں، تو تم منتظر رہو، یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ اپنا حکم بھیجدے، اور اللہ تعالےٰ فاسقوں کو راہ نہیں دکھاتا - اس آیت میں والد اور اولاد کے علاوہ دوسرے ان لوگوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے جن سے عموماً محبت ہوتی ہے - اور اس بات کا بیان ہے کہ آپؐ کو صرف انسانوں سے زیادہ محبوب نہ جانیں بلکہ ہر محبوب چیزوں سے زیادہ محبوب جانیں، پس حدیث میں جو اجمال ہے آیت میں اس کی تفصیل ہے -

اس آیت اور سابقہ حدیث سے اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت کا وجوب ثابت ہوتا ہے - وہ مسلمان ہی نہیں جس کے دل میں اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت نہ ہو - اسی محبت ہی سے قرآن مجید اور حدیث شریف پر عمل کی توفیق ہوتی ہے - اس محبت کا زبان سے اظہار کرنا بمنزلہ اقرار باللسان اپنی جگہ درست طرز عمل ہے اس سے اقرار باللسان کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے مگر یاد رکھئے

نسہ قدم باید اندر محبت نہ دم
کہ اصلے ندارد دمِ بے قدم

دعوئے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر دلائل وشواہد

عشق اور محبت نام ہے میلان قلب کا۔ یعنی دل کی رغبت، توجہ اور رجحان کا۔ یہ چیزیں وجدانی، قلبی اور باطنی کیفیات میں سے ہیں۔ جن کا دوسروں کو احساس اور علم نہیں ہوتا۔ لیکن ان باطنی کیفیتوں کے کچھ ظاہری آثار اور علامات ہیں جو ان باطنی کیفیتوں پر دلالت کرتی ہیں۔ اس لئے ان ظاہری آثار اور علامات کو ان قلبی کیفیتوں کے قائم مقام اور دلائل قرار دیا جاتا ہے۔ عربی زبان کی ضرب المثل ہے کل اناء یترشح بما فیہ۔ ہر برتن سے وہی کچھ چھلکتا ہے جو اس کے اندر ہے۔ میں اس بات کو چند مثالوں سے سمجھاتا ہوں۔ مثلاً بھوک پیاس وجدانی کیفیات ہیں، کھانا پانی طلب کرنا اور کھانا پینا ان باطنی کیفیات کے دلائل اور شواہد ہیں۔ اس لئے جب ہم کسی کو کھانا پانی طلب کرتے ہوئے اور کھاتے پیتے ہوئے دیکھتے ہیں، تو ہم کہتے ہیں کہ اس کو بھوک پیاس لگی ہے۔ کوئی کسی پر عاشق ہوتا ہے تو وہ معشوق کی گلی کوچے میں گھومنا پھرنا اور معشوق کی پسندیدہ صورت وسیرت اپنانا، اور بلاچون وچرا معشوق کے ہر قول وفعل کا اتباع اور تعمیل کرتا ہے، گلی کوچے کی گشت، کسی کی صورت وسیرت کا اختیار کرنا اور اس کے قول وفعل کی تقلید اور تعمیل، عاشقی کے دلائل، شواہد، آثار اور علامات ہیں۔ اسی طرح دل میں جو جو خیالات، تصورات، نظریات، اور منصوبے موجود ہیں۔ انسان زبان سے ان کا اظہار کرتا ہے یہی اظہار کرنا، اس کے قلبی خیالات تصورات، نظریات اور منصوبوں پر دلائل، شواہد آثار اور علامات ہیں۔ اسی کو عربی شاعر اخطل نے اپنے اس شعر میں ظاہر کیا ہے۔

ان الکلام لفی الفواد وانما — جعل اللسان علی الفواد دلیلاً

اصل کلام تو دل ہی میں ہے مگر زبان کو دل کے کلام پر دلیل اور اس کا ترجمان قرار دیا گیا ہے۔

بعینہ یہی مثال ہے اس آگ کی جو راکھ کے ڈھیر میں دبی ہوئی ہو، اور اس سے دھواں

نکل رہا ہو۔ آگ تو نظر نہیں آتی ہے مگر دھواں اس دبی ہوئی آگ کے وجود پر ظاہری علامت اور دلیل ہے۔ اسی طرح سینے کا درد اور بخار باطنی کیفیتیں ہیں۔ مریض کا کراہنا اور حرارت باطنی کیفیات پہ دلائل ہیں۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ہر قلبی اور باطنی کیفیت کی ایک ظاہری علامت ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح عشق و محبّتِ رسول صلعم ایک قلبی کیفیت ہے۔ اس کے لئے ظاہری علامت کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو اسلام نے دنیا کے دستور اور اصول پہ نہیں چھوڑا بلکہ واشگاف الفاظ میں اس کی تصریح بھی کردی۔ چنانچہ قرآن و حدیث میں جابجا رسول اللہ صلعم کی صورت و سیرت کو اپنانے اور آپؐ کے قول و فعل کی تابعداری کرنے اور آپ صلعم کے حکموں کی اتباع کرنے کا تاکیدی حکم آیا ہے۔ میں یہاں پر بھی بطور مشتے نمونہ از خروارے اور بموجب " القطرۃ تنبئ عن البحر" ایک قطرہ بحر ذخار کی نشان دہی کرتا ہے۔ چند آیات و احادیث منصف مزاجوں کے لئے حوالۂ قرطاس کرتا ہوں۔

اللہ تعالٰے قرآن مجید میں فرماتا ہے: وَمَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ " اور رسولؐ تم کو جو کچھ دیدیں وہ لے لو، اور جس چیز سے تم کو روکیں اس سے باز رہو اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔" رسول اللہ صلعم ہمارے پاس اللہ تعالٰی کی طرف سے شریعت لے کر آئے اور ہمیں اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا حکم دیا اور آپ صلعم نے امت کو اس شریعت کی تعلیم دی اور اس پر خود بھی عمل کرکے دکھایا۔ یہی شریعت انسانی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ اس میں عقائد بھی ہیں سیاست بھی۔ اس میں معیشت کا ذکر بھی ہے، معاشرت کا بیان بھی۔ غرض اسی شریعت نے انسانی زندگی کے کسی پہلو کو تاریک نہ چھوڑا۔ اور نہ کسی شعبۂ زندگی کو تشنہ۔ پیدائش سے لے کر موت تک انسان کو جن جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ان سب پر سیر حاصل بحث کی اور سب کی الجھنوں کو بہترین اسلوب میں سمجھا دیا۔ اب مسلمانوں کو اختیار اور اجازت نہیں کہ وہ زندگی کے کسی بھی گوشے میں اسلام کے سوا کسی اور دین اور شریعت کے اصول اور قانون کو اپنائیں۔ جو اپنائے گا اسے نہ صرف عاشق رسول قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ اس کا مسلمان رہنا بھی مشکل ہے۔

حدیث میں آتا ہے: سرکار دو عالم صلعم نے فرمایا: لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعاً لما جئت بہ (رواہ فی شرح السنۃ عن ابن عمروؓ) " تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن قرار نہیں پائے گا، جب تک کہ اس کی خواہشات میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو

یعنی مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ اپنی زندگیاں، آپ صلعم کی شریعت کی ہدایات کے مطابق گزاریں۔ زندگی کے کسی گوشے میں قرآن وحدیث کی ہدایات سے انحراف نہ کریں ورنہ وہ مسلمان نہ ٹھہریں گے۔ چہ جائیکہ عاشقِ رسول صلعم!

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (النور: ۶۳) "سو جو لوگ اللہ تعالے اور اس کے رسول صلعم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو اس سے ڈرنا چاہیئے کہ ان پہ دنیا میں کوئی آفت نہ آپڑے یا آخرت میں کوئی دردناک عذاب نازل نہ ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (آلِ عمران: ۳۱) "آپؐ فرما دیجئے کہ اگر تم خدا تعالےٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو، خدائے تعالےٰ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے سب گناہ معاف کر دے گا اور اللہ بڑا معاف کرنے والا عنایت فرمانے والا ہے۔" جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کا دم بھرتا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کی زبانی حکم دلواتا ہے کہ اگر تم کو اللہ تعالےٰ سے محبت ہے تو میری یعنی رسول اللہ صلعم کی تابعداری کرے کیونکہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اللہ تعالیٰ کے نمایندے ہیں۔ اس لئے رسولؐ کی تابعداری اور اطاعت سے اللہ تعالیٰ سے محبّت کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آخرت کی کامیابی جو اللہ تعالیٰ سے محبّت کا ثمرہ ہے، رسول اللہ صلعم کی اطاعت اور تابعداری پر منحصر ہے۔ آپؐ کی اطاعت اور تابعداری کے بغیر نجات اور جنت کا حصول ناممکن ہے۔ اور رسول اللہ صلعم سے محبّت کے بغیر آپ صلعم کی تابعداری اور اطاعت نہیں ہو سکتی۔ پس التزاماً محبتِ رسولؐ کا وجوب ثابت ہوا۔ یہاں سے ان لوگوں کی قلعی کھل جاتی ہے جو اتباعِ سنّت رسول صلعم کے بغیر دعویٰ معرفت اور محبتِ الٰہی کرتے ہیں۔

نیز جو اللہ تعالےٰ سے محبت کا مدّعی ہے، وہ اس کے رسول صلعم سے محبّت کا بھی مدّعی ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ کسی کو اللہ تعالےٰ سے محبّت ہو اور اس کے نبی صلعم سے محبّت نہ ہو۔ ایسی محبت کا اگر وجود ہو، تو وہ کچھ کارآمد اور مفید نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ کو اللہ تعالےٰ سے محبت کے باوجود، جس کا یہ لوگ اقرار اور دعویٰ کرتے ہیں صرف رسول اللہ صلعم سے محبت نہ ہونے کی وجہ سے جو آنحضرت صلعم پہ ایمان نہ لانے سے معلوم ہوتا ہے، قیامت کے دن نجات

نہیں ملے گی۔ جیساکہ حدیث میں آتا ہے، جو یہودی اور نصرانی، میرا زمانۂ نبوت پاکر، مجھ پر ایمان لائے بغیر مرے وہ دوزخی ہے ۔ اسی مضمون کی متعدد آیات واحادیث وارد ہیں

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (النساء ۵۹)

" اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور تم میں جو لوگ اہل حکومت ہیں ان کی اطاعت کرو۔ پھر اگر کسی کام میں تم باہم اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ تعالےٰ اور اس کے رسولؐ کے حوالے کر دیا کرو ۔ اگر تم اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہو، یہ امور بہتر ہیں اور ان کا انجام خوشتر ہے "۔ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے اپنی اطاعت اپنے رسول صلعم کی اطاعت اور سربراہوں کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اگر کسی کام میں مسلمانوں کے آپس میں اختلاف ہو تو اس اختلاف کا قرآن وحدیث کی روشنی میں تصفیہ کرنے کا حکم دیا ہے ۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول صلعم کی مطلقاً اطاعت کریں اور اولی الامر کی جائز کاموں میں اطاعت کریں ۔ اور زندگی قرآن وحدیث کی روشنی میں گزاریں ۔ یہی اطاعتِ اللہ اور اطاعتِ رسولؐ ہے اور آپس کے جھگڑے قضیے قرآن وحدیث کے ذریعے تصفیہ کرائیں ۔ یعنی عدالت کے فیصلے قرآن وحدیث کے مطابق ہوں ۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۔ (المائدہ ۹۲) اور تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے رہو اور رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو اور ڈرو۔ یعنی اللہ تعالےٰ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت سے ڈرو اور اس سے بچو۔

پس یہ ثابت ہوگیا کہ محبت کے لیے[1] اتباع اور اطاعت لازم ہے ۔ اگر ہمیں رسولؐ سے محبت ہے تو آپ صلعم کی اطاعت اور تابعداری کرنی چاہیئے ۔ یہی محبت رسول کی دلیل اور نشانی ہے ۔ کوئی بھی دعوٰی دنیا میں بغیر دلیل کے ثابت نہیں ہوتا ۔ اگر ہمیں رسولؐ سے محبت کا دعوٰی ہے تو آپ صلعم کی اطاعت کی دلیل کی ضرورت ہے، ورنہ محض دعوی بلا دلیل قابلِ قبول نہ ہوگا ۔

ندارد کسے با تو ناگفتہ کار :: ولیکن چوں گفتی دلیلش بیار

قدم باید اندر محبت نہ دم :: کہ اصلے ندارد دم بے قدم

(جاری ہے)

---

[1] محبت کے لیے عملی ثبوت چاہیے صرف دعوٰی کافی نہیں ہے کیونکہ دعوٰی بغیر دلیل کے کوئی وزن نہیں رکھتا۔

نجومِ ہدایت

سادسُ الاسلام

حضرت خبابؓ بن ارتؓ

تاریخ انسانی کی عظیم ترین اور سب سے کامیاب انقلابی تحریک کے قائد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار ساتھیوں کا ذکر ہمارے لئے نورِ بصیرت ہے۔ تنظیمِ اسلامی کے رفقاء ان کی سیرت کے عمومی نقشے کو ہی مشعل راہ نہ بنائیں بلکہ ان کی ایک ایک ادا کو قابل تقلید سمجھیں تب ہی ان میں بھی مطلوبہ صبغۃ اللہ کا ظہور ہو گا۔ ماہِ ستمبر میں ہم نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کی زندگی کا خاکہ "میثاق" میں پیش کیا تھا۔ اس شمارے کو حضرت خبابؓ بن ارتؓ کی سوانح سے مزین کیا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں ہم جناب طالب الہاشمی کی کتاب "شمع رسالت کے تمیں پروانے" سے استفادہ کر رہے ہیں۔ افسوس کہ پچھلی بار مصنف کا نام تو آیا لیکن ہم کتاب کا ذکر کرنا بھول گئے۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ انقلابی اسلامی تحریک کا ہر کارکن اس کا مطالعہ کرے اور حاصل مطالعہ کو نہاں خانۂ دل میں محفوظ رکھے۔ کتاب مکتبہ چراغ اسلام، اردو بازار لاہور سے چالیس روپے میں حاصل کی جا سکتی ہے (ادارہ)

☆☆☆☆☆

سیدنا ابو عبداللہ خبابؓ بن ارتؓ قبیلہ بنو تمیم کے چشم و چراغ تھے۔ اگرچہ بعض روایتوں میں انہیں خزاعی بتایا گیا ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ وہ تمیمی تھے۔ معلوم نہیں زمانۂ جاہلیت میں ان کے خاندان پر کیا افتاد پڑی کہ وہ غلام بنا کر مکہ میں فروخت کئے گئے۔ ان کے آقا کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت کے مطابق ان کو عتبہؓ بن غزوان نے خریدا تھا اور دوسری

روایت کے مطابق وہ اُمّ انمار بنت سباع الخزاعیہ کے غلام تھے۔ ہماری تحقیق کے مطابق دوسری روایت صحیح ہے۔ عتبہؓ بن غزوان کے ایک غلام کا نام بلاشبہ خبابؓ تھا۔ لیکن وہ ایک دوسرے شخص تھے ان کی کنیت ابو یحییٰ تھی اور وہ ۱۷ھ میں واصل بحق ہوئے۔ اس کے برعکس حضرت خبابؓ بن ارت کی کنیت ابو عبداللہ تھی اور وہ ۳۷ھ میں فوت ہوئے۔ دونوں جلیل القدر صحابی تھے اور سرور عالمؐ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک تھے اس لئے بعض ارباب سیر حضرت خبابؓ بن ارت اور حضرت خبّابؓ مولائے عتبہؓ بن غزوان میں تفریق نہیں کر سکے اور انہیں ایک ہی شخصیت سمجھ لیا۔

مکہ پہنچ کر حضرت خبّابؓ بن ارت نے آہن گری کا پیشہ اختیار کیا اور تلواریں بنا بنا کر فروخت کرنے لگے۔ اس طرح انہیں معقول آمدنی ہو جاتی تھی اور وہ بڑے مزے سے زندگی گذار رہے تھے۔ اسی زمانے میں ان کے کانوں میں کسی ذریعہ سے دعوت توحید کی آواز پڑی۔ اس وقت تک صرف پانچ سعید الفطرت ہستیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ (حضرت خدیجۃؓ الکبریٰ، حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ، حضرت زیدؓ بن حارثہ اور حضرت ابو ذر غفاریؓ) مکہ کی فضا بہت پر آشوب تھی اور مشرکین کو اسلام کا نام سننا بھی گوارا نہ تھا۔ فی الحقیقت اس وقت اسلام قبول کرنا ہولناک مصائب کو دعوت دینے کے مترادف تھا اور بڑے سے بڑا آدمی بھی لوائے توحید تھامنے پر مشرکین کے عتاب سے محفوظ نہ رہ سکتا تھا۔ خبّابؓ ایک غریب الوطن اور بے یار و مددگار غلام تھے لیکن مبداء فیاض نے انہیں نہایت پاکیزہ فطرت اور شیر کا دل گردہ عطا کیا تھا۔ صدائے حق کانوں میں پڑتے ہی انہوں نے نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر اس پر لبیک کہنے میں ایک لمحہ بھی تامّل نہ کیا اور یوں وہ سابقون الاولون کی مقدس جماعت میں "سادس الاسلام" (چھٹے مسلمان) کے عظیم رتبہ اور لقب سے مشرف ہوئے۔ حضرت خبّابؓ سے حالات کی سنگینی مخفی نہ تھی لیکن انہوں نے اپنے اسلام کو ایک دن کے لئے بھی اخفا میں نہ رکھا۔ جونہی انہوں نے اپنے اسلام کا اعلان کیا کفّار کی برقِ عتاب ان کے آستانۂ عافیت پر کوندنے لگی۔ انہوں نے بے کس خبابؓ پر ایسے ایسے بہیمانہ مظالم ڈھائے کہ انسانیت اور شرافت سر پیٹ کر رہ گئی۔ وہ ان کے کپڑے اتروا کر دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹاتے اور سینہ پر بھاری پتھر کی سل رکھ دیتے۔ کبھی انگاروں پر لٹا کر ایک

قوی ہیکل آدمی ان کے سینہ پر بیٹھ جاتا تاکہ کروٹ نہ بدل سکیں۔ خبابؓ صبر واستقامت کے ساتھ ان انگاروں پر کباب ہوتے رہتے حتیٰ کہ زخموں سے خون اور پیپ رس رس کر ان انگاروں کو ٹھنڈا کر دیتی۔ ایسے لرزہ خیز مظالم کے باوجود کیا مجال کہ ان کے پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش آئی ہو۔ اسی طرح ظلم سہتے سہتے کچھ عرصہ گزر گیا تو ایک دن فریاد لے کر سرور کونینؐ کی خدمت میں پہنچے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضورؐ اس وقت کعبہ کی دیوار کے سائے میں ردائے مبارک سر کے نیچے رکھے ہوئے لیٹے تھے۔ خبابؓ نے حضورؐ سے عرض کیا' "یارسول اللہ آپ اللہ پاک سے ہمارے لئے دعا کیوں نہیں کرتے؟" یہ سن کر حضورؐ سنبھل کر بیٹھ گئے' آپ کا چہرہ اقدس سرخ ہو گیا اور آپؐ نے فرمایا۔

"تم سے پہلے گذشتہ زمانہ میں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں کہ لوہے کی کنگھیوں سے ان کا گوشت نوچ ڈالا گیا۔ سوائے ہڈیوں اور پٹھوں کے کچھ نہ چھوڑا گیا۔ ایسی سختیوں نے بھی ان کا دین پر اعتقاد متزلزل نہ کیا۔ ان کے سروں پر آرے چلائے گئے' چیر کر بیچ سے دو کر دیئے گئے تاہم دین کو نہ چھوڑا۔ اللہ اس دین کو ضرور کامیاب کرے گا اور تم دیکھ لو گے کہ اکیلا سوار صنعاء (یمن) سے حضر موت تک جائے گا اور سوائے اللہ عزّوجلّ کے کسی سے نہیں ڈرے گا۔"

حضورؐ کے ارشادات سن کر حضرت خبابؓ کا حوصلہ دوچند ہو گیا اور وہ خاموشی سے اپنے گھر چلے گئے۔

حضرت خبابؓ کی آقا اُمِّ انمار بھی نہایت قَسِیُّ القلب عورت تھی۔ علّامہ ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ حضرت خبّابؓ کو قبول اسلام کی سزا میں کبھی لوہے کی زرہ پہنا کر دھوپ میں لٹاتی اور کبھی تپتے ہوئے لوہے سے ان کا سر داغا کرتی تھی۔ رحمتِ عالمؐ اُمِّ انمار کے مظالم کا حال سنتے تو حد درجہ ملول ہوتے اور خبابؓ کی دلجوئی فرماتے۔ اس بدبخت عورت کو جب حضورؐ کی دلجوئی کا علم ہوتا تو وہ خبابؓ پر اور شدت سے ظلم ڈھانا شروع کر دیتی۔ جب اس کی ستم رانیوں کی کوئی حد و نہایت ہی نہ رہی تو حضرت خبابؓ نے سرور عالمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی۔

"یارسول اللہ دعا فرمایئے کہ اللہ مجھے اس عذاب سے نجات دے۔"

حضورؐ نے دعا فرمائی۔ "الٰہی خبابؓ کی مدد کر۔"
علامہ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ حضورؐ کی دعا کے بعد ام انمار کے سر میں ایسا شدید درد شروع ہو گیا جو کسی طریقے سے کم ہونے میں نہ آتا تھا اور وہ کتوں کی طرح بھونکتی تھی۔ لوگوں نے بتایا کہ جب تک لوہے سے تمہارا سر نہیں داغا جائے گا اس درد میں کمی نہ ہوگی۔ ام انمار شدت کرب سے تڑپ رہی تھی۔ اس نے حضرت خبابؓ ہی کو یہ کام تفویض کیا کہ وہ گرم لوہے سے اس کا سر داغیں۔ چنانچہ جو گرم لوہا حضرت خبّابؓ پر استعمال ہوتا تھا وہی اس پر استعمال ہوا لیکن اس علاج کے باوجود اسے کوئی فائدہ نہ ہوا اور چند دنوں کے بعد وہ تڑپ تڑپ کر نہنگِ اجل کا لقمہ بن گئی۔
مشرکین نے حضرت خبابؓ کو جسمانی ایذائیں دینے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ انہیں مالی نقصان پہنچانے کے لئے عہد شکنی سے بھی دریغ نہ کیا۔ مشہور مشرک عاص بن وائل کو حضرت خبابؓ کا کچھ قرض دینا تھا۔ یہ جب تقاضا کرتے تو وہ کہتا۔ "جب تک تم محمدؐ کا دین ترک نہ کرو گے ایک کوڑی بھی نہ دوں گا۔" خبّابؓ فرماتے' "جب تک تم دوبارہ زندہ ہو کہ اس دنیا میں نہ آؤ گے میں محمدؐ کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔"
عاص کہتا۔ "تو پھر انتظار کرو جب میں مر کر دوبارہ زندہ ہوں گا اور اپنے مال اور اولاد پر متصرف ہوں گا تو تمہارا قرضہ چکا دوں گا۔" عاص کا یہ کہنا مسلمانوں کے عقیدہ نشر و حشر اور ایمان بالآخرت پر ایک طرح کی تعریض تھی۔
مظلوم خبابؓ سالہا سال تک مصائب و آلام کی چکی میں پستے رہے تا آنکہ ہجرت کا حکم نازل ہوا اور وہ ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔ انہوں نے ایذاؤں کے ڈر سے ہجرت نہ کی تھی بلکہ ان کے پیشِ نظر محض رضائے الٰہی کا حصول تھا۔ مسند احمد حنبل میں خود حضرت خبابؓ سے روایت ہے کہ میں نے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ہجرت کی تھی۔ علامہ ابن اثیر صاحبِ "اُسد الغابہ" کا بیان ہے کہ مدینہ میں حضورؐ نے خبابؓ اور خراشؓ بن صمہ کے غلام تمیمؓ کے درمیان مواخاۃ کرا دی۔ لیکن مستدرک حاکم کی روایت کے مطابق ان کی مواخاۃ جبیرؓ بن عتیک سے ہوئی تھی۔ غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت خبّابؓ سرورِ کائنات کی رفاقت میں شروع سے لے کر آخر تک تمام غزوات میں نہایت پامردی سے

شریک ہوئے۔ خلفائے راشدینؓ کے عہد میں جب فتوحات کا دروازہ کھلا تو حضرت خبابؓ بعض اوقات بہت رویا کرتے اور فرماتے:۔

"ہم نے رضائے الٰہی کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی اور ہمارا اجر اللہ کے ذمہ رہا۔ پھر ہم میں سے بعض تو ایسے تھے کہ مر گئے اور دنیا میں اپنے اجر کا کچھ بھی پھل نہ کھایا لیکن بعض کا پھل پک گیا اور وہ اسے توڑ کر کھا رہے ہیں' مصعبؓ نے احد میں شہادت پائی تو ان کو کفنانے کے لئے ایک چھوٹی سی چادر کے سوا ہمارے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ اس چادر سے ان کا سر ڈھانکتے تو ان کے پاؤں ننگے رہ جاتے اور پاؤں ڈھانکتے تو سر برہنہ ہو جاتا۔ آخر حضورؐ کے حکم کے مطابق ہم نے ان کا سر چادر سے ڈھانکا اور پاؤں پر اذخر (ایک قسم کی گھاس) ڈال دی۔ آج یہ حال ہے کہ اللہ کا فضل ہم پر بارش کی طرح برس رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے مصائب کا بدلہ ہمیں کہیں دنیا ہی میں تو نہیں دے دیا۔"

متعدد روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خبابؓ نے آخری عمر میں کوفہ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ وہیں ۳۷ھ میں شدید بیمار ہوئے۔ پیٹ کی کوئی تکلیف تھی جس کے علاج کے لئے پیٹ کو سات جگہ سے داغا گیا اس سے انہیں بہت تکلیف ہوئی اور فرمایا۔

"اگر حضورؐ نے موت کی تمنا کرنے سے منع نہ کیا ہوتا تو میں اپنی موت کی دعا کرتا۔"

اسی نازک حالت میں کچھ لوگ عیادت کے لئے آئے اور اثنائے گفتگو میں کہا۔

"ابو عبداللہ خوش ہو جائیے کہ دنیا چھوڑنے کے بعد حوض کوثر پر اپنے بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے ملاقات کریں گے۔"

یہ سن کر ان پر گریہ طاری ہو گیا اور فرمایا:۔

"واللہ میں موت سے نہیں گھبراتا' تم نے ان ساتھیوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے دنیا میں کوئی اجر نہیں پایا ... آخرت میں انہوں نے یقیناً اپنا اجر پالیا ہو گا لیکن ہم ان کے بعد رہے اور دنیا کی نعمتوں سے اس قدر حصہ پایا کہ ڈر ہے کہیں وہ ہمارے اعمال کے ثواب ہی میں نہ محسوب ہو جائے۔"

وفات سے کچھ دیر پہلے ان کے سامنے کفن لایا گیا تو اشکبار ہو کر بڑی حسرت سے فرمایا

"یہ تو پورا کفن ہے افسوس کہ حمزہؓ کو ایک چھوٹی سی چادر میں کفنایا گیا جو ان کے سارے بدن کو بھی نہیں ڈھانک سکتی تھی۔ پیر ڈھانکے جاتے تو سر کھل جاتا اور سر ڈھانکا جاتا تو پاؤں کھل جاتے تھے آخر ہم نے ان کے پاؤں کو اذخر سے ڈھانک کر کفن پورا کیا۔"

پھر انہوں نے وصیت کی کہ اہل کوفہ کے معمول کے مطابق مجھے شہر کے اندر دفن نہ کرنا بلکہ میری قبر شہر کے باہر کھلے میدان میں بنانا۔ اس وصیت کے بعد انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ وصیت کے مطابق تدفین شہر کے باہر ہوئی اس کے بعد اہل کوفہ نے بھی اپنے مردے ان کی قبر کے قریب دفن کرنے شروع کر دیئے۔ مستدرک حاکم کی روایت کے مطابق حضرت علی کرم اللہ وجہہ 'ان کی تدفین سے پہلے صفین سے کوفہ پہنچ گئے اور انہوں نے ہی نماز جنازہ پڑھائی لیکن ابن اثیر کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ خبّابؓ کی وفات کے کئی دن بعد کوفہ پہنچے اور ان کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر دعائے مغفرت کی۔ وفات کے وقت حضرت خبّابؓ کی عمر بہتر برس کے لگ بھگ تھی۔

سیدنا حضرت خبّابؓ بن اَرَت کا شمار ان جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے جن کے نام بلا کشانِ اسلام کی فہرست میں بہت نمایاں ہیں۔ وہ انتہائی سخت اور صبر آزما حالات میں اسلام کی نعمتِ بے زوال سے مشرف ہوئے اور پھر دنیا کی کوئی سختی اور مصیبت انہیں راہ حق سے نہ ہٹا سکی۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بالکل ابتدائی زمانے میں قرآن پڑھ لیا تھا۔ کچھ راویوں نے حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کے واقعہ میں ان کا نام واضح طور پر لیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ جس زمانے میں سرور عالمؐ اپنے انتالیس جاں نثاروں کے ساتھ حضرت ارقمؓ کے مکان میں پناہ گزین تھے۔ حضرت خبابؓ 'حضرت سعیدؓ بن زید اور ان کی اہلیہ فاطمہؓ بنت خطاب (حضرت عمرؓ کی ہمشیرہ) کے گھر انہیں قرآن پڑھانے جایا کرتے تھے۔ اپنے قبول اسلام سے پہلے حضرت عمرؓ بہن اور بہنوئی کی تنبیہہ کے لئے ان کے گھر پہنچے تو خبابؓ بھی وہاں موجود تھے۔ وہ تو ایک کوٹھڑی میں چھپ گئے اور حضرت عمرؓ بہن اور بہنوئی سے الجھنے لگے۔ جب وہ زخمی ہو گئے تو حضرت عمرؓ نرم پڑ گئے اور ان سے قرآن سنانے کے لئے کہا۔ انہوں نے

سورہ طٰہٰ کی چند ہی آیات پڑھی تھیں کہ حضرت عمرؓ کے دل کی دنیا بدل گئی اور انہوں نے کہا۔ "مجھے محمدؐ کی خدمت میں لے چلو۔" عین اس موقع پر حضرت خبابؓ کوٹھڑی سے باہر آئے اور جوشِ مسرت میں کہا۔

"اے عمرؓ میں تمہیں بشارت دیتا ہوں کہ کل شب پنجشنبہ میں حضورؐ نے دعا مانگی تھی کہ الٰہی عمر اور ابو جہل میں جو تجھے پسند ہو' اس سے اسلام کو قوت عطا فرما۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی دعا تمہارے حق میں قبول ہو گئی۔"

اس کے بعد حضرت عمرؓ کاشانۂ ارقمؓ میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرّف بہ اسلام ہو گئے۔

حضرت عمر فاروقؓ اور دوسرے تمام صحابہ کرامؓ حضرت خبّابؓ کی بے حد تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں خبّابؓ ان کے پاس تشریف لے جاتے تو وہ انہیں اپنی جائے نشست پر اپنے ساتھ بٹھاتے تھے۔ علامہ ابن اثیر کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حضرت خبّابؓ سے اپنی داستان مصائب سنانے کی فرمائش کی۔ . . . حضرت خبّابؓ نے حضرت عمرؓ کو کپڑا اٹھا کر اپنی پشت دکھائی تو وہ حیران رہ گئے۔ ساری پشت اس طرح سفید تھی جیسے کسی مبروص کی جلد ہوتی ہے۔ خبّابؓ نے فرمایا۔

"امیر المومنین آگ دہکا کر مجھے اس پر لٹایا جاتا تھا یہاں تک کہ میری پشت کی چربی اس کو بجھا دیتی تھی۔"

حضرت خبابؓ اکثر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور آپؐ سے دین کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مسند احمد حنبل میں ہے کہ ایک رات حضرت خبابؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپؐ نے ساری رات نماز پڑھتے ہوئے گذار دی۔ صبح ہوئی تو خبابؓ نے عرض کیا۔

"یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان' آج رات آپؐ نے جیسی نماز پڑھی اس سے پہلے کبھی نہیں پڑھی۔"

حضورؐ نے فرمایا۔

"یہ بیم و رجا کی نماز تھی۔ میں نے بارگاہ رب العزت میں اپنی امت کے لئے تین چیزوں کی

دعا مانگی تھی جن میں سے دو چیزیں تو منظور کر لی گئیں اور تیسری قبول نہیں ہوئی جو دعائیں قبول ہوئیں وہ یہ تھیں کہ اللہ دشمنوں کو مجھ پر غلبہ نہ دے اور اللہ میری امت کو کسی ایسے عذاب سے ہلاک نہ کرے جس سے گذشتہ امتیں ہلاک ہوئی تھیں۔

علامہ ابن اثیر کہتے ہیں کہ حضرت خبابؓ باہمہ جلالت قدر بے حد منکسر المزاج تھے۔ ایک مرتبہ وہ بہت سے اصحاب کے درمیان تشریف فرما تھے ان اصحاب نے حضرت خبابؓ سے درخواست کی کہ آپ ہمیں کسی بات کا حکم کریں تاکہ ہم اس پر عمل کریں۔

انہوں نے فرمایا' "میں کون ہوں جو کسی بات کا حکم کروں۔ ممکن ہے کہ میں لوگوں کو کسی بات کا حکم کروں اور خود اس پر عمل نہ کرتا ہوں۔ "

❀❀❀❀

بقیہ : اسلامی انقلاب کے المیہ کا تجزیہ

مولانا سید سلیمان ندوی سے طالب علمانہ استفادے میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔ بہرحال مولوی کی تحقیر صاحب شذرات کو ہی مبارک ہو' ہمارا شیوہ نہیں۔ ہم اس کے بھی احسان مند ہیں کہ ہمارا ناتا قرنِ اول سے بھی علماء کرام ہی کے واسطے سے جڑا ہے جس کے اکابر و آئمہ کو انہوں نے بھی مستند مانا ہے۔ یہ سب اپنی جگہ لیکن اس ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ صاحب شذرات نے ایک تاریخی حقیقت کا کہیں ذکر نہیں کیا اور وہ یہ کہ مولانا فراہیؒ اور علامہ اقبالؒ جیسے زعماء نے بھی فکر و فہمِ قرآن میں نئی راہیں کھولنے کے باوجود اس احتیاط کا التزام کیا کہ نہ فقہیات میں دخل دیں نہ خود مرتبۂ اجتہاد پر فائز ہونے کی کوشش کریں............ شاید وہ اس واقعے سے واقف نہیں ہیں کہ علامہ اقبال کی شدید خواہش تھی کہ اس کام میں پرانے مدارس ہی سے تعلق رکھنے والے مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیریؒ کا تعاون حاصل کریں اور جب مولانا کاشمیریؒ حضرت علامہ کے شدید اصرار کے باوجود لاہور منتقل نہ ہو سکے تو انہوں نے تن تنہا قانونِ اسلامی کی تدوین کا بیڑا اٹھانے کی ہمت نہ کی۔

❀❀❀❀

حدیثِ رسولؐ

وعن

عُبادۃ بن الصّامت رضی اللہ عنہ

قَالَ: بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم

عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ

فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ

وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ

وَعَلَى أَثَرَةٍ عَلَيْنَا

وَأَنْ لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ، إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ

مِنَ اللّٰهِ فِيهِ بُرْهَانٌ،

وَعَلَى أَنْ نَقُولَ بِالْحَقِّ أَيْنَمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ

لَوْمَةَ لَائِمٍ (بخاری ومسلم)

مفہوم: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کہ:

ہم ہر حالت میں اللہ اور رسول اور اُن لوگوں کی جن کو امیر مقرر کیا گیا ہو بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔ خواہ تنگی کی حالت ہو یا فراخی کی اور خوشی کی حالت میں بھی اور ناپسندیدگی کی حالت میں بھی اور اُس صورت میں بھی جب کہ دوسروں کو ہمارے مقابلے میں ترجیح دی گئی ہو۔ امیر سے جھگڑا نہیں کریں گے۔ سوائے اس کے کہ امیر سے کھلا ہوا کفر سرزد ہو۔ اُس وقت ہمارے پاس دلیل ہو گی کہ ہم اُس کی بات نہ مانیں اور جہاں کہیں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے۔ اللہ کے سلسلے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

کہا اقبالؔ نے شیخِ حرم سے
تہہِ محرابِ مسجد سو گیا کون!
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون؟

یکے از مطبوعات
محمد حمید احمد پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۴۱۔ اے شاہراہ پاکستان (لوئر مال) لاہور۔ ۱

فون ۸۔۳۲۰۱۹۶

آزادی اور احتساب

آغا نور محمد پٹھان

اس مقالے کے فاضل مصنف سے قارئین "میثاق" ان دنوں متعارف ہوئے تھے جب محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی کتاب "استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ" پر کھلی بحث جاری تھی اور مقالہ نگار کو بھی اُن محاضرات میں گفتگو کا موقع دیا گیا جو کتاب کے حسن وقبح کی نشاندہی کے لئے منعقد ہوئے۔ ہمیں اُن کے خلوص اور درد کی قدر ہے چنانچہ ان کے خیالات کو من وعن شائع کئے جانے کا مستحق سمجھتے ہیں۔ زبان کی ایک حد تک اصلاح البتہ ضرور کی گئی ہے ان کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ امر ملحوظ خاطر رکھا جائے کہ مقالہ نگار کا تعلق سندھ سے ہے جہاں ہمارے بالغ نظر اور دینی ذہن رکھنے والے بھائی بھی سراپا شکائت بنے ہوئے ہیں۔ ادارے کو ان کی تجاویز سے عمومی اتفاق تو ہے لیکن وطن عزیز کو لاحق عوارض کا اصل علاج وہی ہے جو "استحکام پاکستان" میں شرح وبسط سے بیان ہو چکا ہے

؏

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

(ادارہ)

۱۴ر اگست کی تاریخ کو ہم ہر سال فقط آزادی کے حوالے سے مناتے ہیں لیکن حکومتی سطح پر یا سیاسی وسماجی سطح پر ہم نے کبھی ایک لحظہ رک کر خود احتسابی کی کاوش نہیں کی۔ پاکستان کے نام سے اس سرزمین کو جب حاصل کیا گیا تھا تو اس وقت یہ خطۂ زمین دنیا کا پانچواں بڑا اور اسلامی دنیا کا سب سے بڑا ملک تھا۔ عالم اسلام کی نگاہیں ہمارے اس وطن پر مرکوز تھیں۔ لیکن پچیس سال گزر جانے کے بعد ہی اس مُلک کا ایک حصہ علیحدہ ہو گیا۔ اب چالیس سال گزر جانے کے بعد جب ہم اپنے وطن عزیز کی اکتالیسویں سالگرہ منا رہے ہیں تو ہمارے اندر قومی

انتشار عروج پر ہے۔ گزشتہ چالیس سال کے دوران ہمارا سیاسی و سماجی ڈھانچہ انتہائی ناکارہ اور ناقابل اعتماد رہا ہے جس کے نتیجے میں آج بھی ہم پاکستان کے مستقبل کے متعلق مایوسی اور عدم اطمینان کا شکار ہیں۔ ہمارے سیاست دانوں کی آپس میں نا اتفاقی ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے کی حد تک بڑھتی جا رہی ہے۔ ملک کے اندر جاگیرداری نظام نہایت ہی مستحکم ہے۔ سیاست اور حکومت انہی کے ہاتھوں میں ہے جو اہل ثروت اور دولت مند ہیں نوکر شاہی اس ملک کی واحد منظم جماعت ہے جو اقتدار پر اپنی مرضی کے مطابق قابض ہے۔ گزشتہ چالیس سال میں سے ۲۶ سال یہاں فوجی حکومت رہی ہے۔ اندرونی صورت حال یہ ہے کہ ہم مسلمان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے فخر کے ساتھ لڑتے ہیں اور مختلف قومی گروہ آپس کا ادھار چکانے میں دیر نہیں لگاتے۔ ہماری شہری آبادی حکومتی وسائل کے باوجود شدید مصائب و مشکلات کا شکار ہے۔ امن و امان کا مسئلہ ناقابل برداشت حد تک خراب ہو چکا ہے۔ گزشتہ آٹھ سال کے دوران صرف صوبہ سندھ میں دس ہزار قتل، پانچ ہزار سے زائد اغوا، چھیالیس ہزار آٹھ سو چھ (۴۶۸۰۶) چوریاں اور ۲۸۷ ڈاکوں کی وارداتیں ہو چکی ہیں در آں حالیکہ فقط حکومت سندھ امن و امان کے سلسلے میں ۸٫۵ ملین روپے ماہوار خرچ کر رہی ہے (ڈان ۲۴ ستمبر ۱۹۸۶ء اور سندھ اسمبلی میں سوالات کے جوابات کے حوالے سے)

تعلیم اداروں کے اندر گزشتہ کئی سالوں سے طلبہ یونینوں پر پابندی ہونے کے باوجود تعلیمی ماحول مزید خراب ہوا ہے۔ رشوت ستانی اور بیروز گاری نے خصوصاً نوجوانوں کے اندر بغاوت کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں۔ ڈاکہ زنی کی وارداتوں میں ملوث افراد کی اکثریت بیروز گار نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ ہمارے ملک کے اندر ہر پانچ سال کے بعد ایک پنج سالہ منصوبہ تشکیل دیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ ہر سال صوبائی و قومی بجٹ بنائے جاتے ہیں۔ لیکن خود سرکاری ذریعوں کے مطابق ستر ارب روپے ہماری نوکر شاہی کی جیب میں چلے جاتے ہیں جبکہ ہمارے غریب کسان اور سفید پوش شہری ننگے پاؤں اور زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم اور نوجوان اپنے مستقبل سے مایوس ہیں۔ ہماری خارجہ پالیسی کا حال یہ ہے کہ ہم چاروں طرف سے دشمن کے نرغے میں ہیں۔ جس سپر پاور کے ہم عرصے دراز سے اتحادی ہیں۔ اس نے بھی ہماری اقتصادی امداد ملتوی کر دی ہے۔ یہ ہماری خارجہ پالیسی کا شاخسانہ ہے۔ ہماری حکومت

باہمی اتفاق اور یکجہتی کے متعلق اعلانات اور نعرے بازی تو بہت کرتی ہے۔ لیکن عملاً حکومت خود فرقوں اور نا اتفاقی پیدا کرنے والوں کی ہمت افزائی کر رہی ہے اپنے لئے سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لئے گزشتہ دس سالوں کے دوران فقط یکطرفہ پراپیگنڈہ کیا گیا ہے۔ کہ یہ سارا کچھ غیر مقتدر سیاست دانوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ بلاشبہ ہمارے سیاست دان بھی غلطی سے مبرا نہیں۔ ان سے بھی بڑی فاش غلطیاں ہوئی ہیں لیکن ان بیچاروں کو حکومت کرنے ہی کب دی گئی ہے۔ ہمیشہ سازشوں کے تحت سیاست دانوں کو آپس میں لڑایا گیا۔ غلط فہمیاں پیدا کی گئی۔ سیاست دانوں کی کردار کشی کی گئی۔ کیا تاریخ سے یہ بات اوجھل ہو گئی ہے کہ پہلا دستور جب بنا تو اس سے خوف زدہ ہو کر ہمارے ملٹری اور سول بیورو کریٹس نے مارشل لاء لگوا دیا۔ اس وقت جنرل ایوب خان اور اس کے رفقاء یہ کہتے تھے کہ آئین ہمارا بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ اور وہ ملک کو آئین کے بغیر اور مارشل لاء کے ڈنڈے سے مستحکم کرنے کی بات کرتے تھے۔ میری نظر سے روزنامہ جنگ میں مورخہ ۹ مارچ ۱۹۵۹ء کو جنرل ایوب خان کا ایک بیان گزرا ہے جس میں انہوں نے دستور کا مطالبہ کرنے والوں کو نام نہاد جمہوریت کے تاجر قرار دیا تھا۔ مزید مضحکہ خیز بیان جنرل برکی کا تھا جو اس کی کابینہ میں وفاقی وزیر تھے۔ اور اخبار جنگ مورخہ ۱۹ مارچ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا کہ پاکستان کو مستحکم کرنے کے بعد ملک کے لئے قابل عمل دستور تیار کیا جائے گا۔

اندازہ لگانا چاہئے کہ ہمارے فوجی آمر کسی بھی صورت میں دستور کے حق میں نہ تھے۔ بعد میں جو ایوب خان نے قوم کو دستور عطا کیا وہ بھی اس کی شخصی آمریت اور مارشل لاء کا شاخسانہ تھا۔

۱۹۷۷ء کے مارشل لاء نے جو کارنامہ انجام دیئے ہیں ان پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ پہلے ایوب خانی مارشل لاء کے نتیجہ میں ہی مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کا سامان کیا گیا تھا۔ اور اس مارشل لاء کا نتیجہ کنفیڈریشن کے پروگرام کی شکل میں سامنے آیا ہے جس میں بڑا پوٹینشل ہے۔ فرنٹ والوں نے اس کے لئے نظریاتی اور عملی طور پر کافی ہوم ورک کیا ہے۔ اب قومی سطح پر فقط پیپلز پارٹی فرنٹ کے راستے میں حائل ہے مارشل لاء نے ایڈہاک ازم پر عمل کرتے کرتے دس سال گزار تو دیئے ہیں لیکن ملک کی یکجہتی اور اتحاد کی قیمت پر اقتدار کو

طول دیا۔

اب کیا کرنا چاہئے؟

وطن عزیز کی خیر خواہی رکھنے والے سیاست دانوں کو ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ اس ملک کی زمین کے ساتھ ساتھ اس ملک میں رہنے والے افراد سے بھی محبت کریں یہ خالص فوجی نقطۂ نظر ہے کہ "ہمیں زمین چاہئے لوگوں کی ضرورت نہیں" سامراجی نقطۂ نظر ہے اس نظریہ کو ہم نے مشرقی پاکستان میں استعمال کیا تھا لیکن انسانی تاریخ نے اسے رد کر دیا ہے اب تو افراد کی وجہ سے زمین بھی ہے۔ اللہ نے زمین کو انسانوں کی خاطر ہی بنایا تھا۔ لہٰذا ہمیں پاکستان میں رہنے والے تمام لوگوں کو ان کے مخصوص لسانی و علاقائی تشخص کے ساتھ تسلیم کرنا ہو گا۔ اس کے علاوہ

۱۔ پاکستان کو ایک وفاق تسلیم کرتے ہوئے ہمیں اپنے چاروں صوبوں کو مکمل خود مختاری دینا ہو گی۔ ہر صوبے کو اپنے وسائل مسائل اور انتظام میں خود اختیاری دینا ہو گی۔ پاکستان کا اس وقت نمبر ایک مسئلہ صوبوں کو اختیارات دینے کا ہے۔ کم از کم اتنے اختیارات تو ہمیں دیئے جائیں جتنے انگریز نے ۱۹۳۵ء میں غلام ہندوستان کے صوبوں کو دیئے تھے۔ افسوس کہ آج ہمارے صوبوں کو وہ اختیارات بھی حاصل نہیں ہیں۔ ہماری بہت سی دینی جماعتیں جو شریعت کے نفاذ کی بات کرتی ہیں کہ تمام مسائل اسلامی نظام اور شریعت کے نفاذ سے حل ہو جائیں گے۔ ان کو بھی کم از کم ہمارے دستور کے اندر صوبوں کے اختیارات اور وفاق کے متعلق اپنی پالیسی اور سفارشات ظاہر کرنی چاہئیں کیونکہ یہ بات انتہائی مبہم اور غیر واضح ہے کہ اسلامی نظام سے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ بدقسمتی سے صوبہ سندھ اور بلوچستان میں جو لوٹ کھسوٹ کی گئی وہ سب اسلام اور قومی یکجہتی کے نام پر کی گئی ہے۔ مشرقی پاکستان پر فوجی آپریشن بھی قومی یکجہتی اور اسلام کے نام پر کیا گیا تھا جبکہ بلوچستان پر فوجی آپریشن بھی پاکستان کے نام پر ہوا۔ سندھ کے اندر زرعی زمینیں اور روزگار پر قبضہ کرتے وقت بھی کہا جاتا ہے کہ ایک پاکستانی اور مسلمان کی حیثیت میں کوئی بھی فرد کہیں بھی آ کر روزگار حاصل کر سکتا ہے' زمینیں خرید سکتا ہے۔ یہ بات اصولی طور پر اور نظریاتی طور پر درست ہونے کے باوجود عملی طور پر درست نہیں ہے اس وقت سندھ میں جب بے زمین ہاری اور بیروزگار نوجوان موجود ہیں تو سب سے پہلے حق

ان کا بنتا ہے لیکن انہیں نظر انداز کر کے باہر سے لوگوں کو بلا کر روزگار دینا کسی بھی صورت میں پاکستان کے اتحاد اور اسلام کے حق میں نہیں۔ جب تک باہمی خیر خواہی اور محبت سے ہم ایک دوسرے کو نہیں دیکھیں گے تب تک حب الوطنی اور اتحاد کا جذبہ کیسے پروان چڑھے گا۔ ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے۔ "جو اپنے لئے پسند کرتے ہو دوسروں کے لئے وہی پسند کرو" ہمارے حکمرانوں کی چالیس سالہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہم جو اپنے لئے چاہتے ہیں دوسروں کو اس کا مستحق نہیں سمجھتے۔ ملازمتوں، تجارت، در آمد و بر آمد اور دیگر انتظامی امور میں ہم خود کو ہی اہل سمجھتے ہیں۔ ہمارے حکمران اگر اپنے علاوہ قوم کے باقی افراد کو بھی کچھ اہل سمجھتے تو ملک کا یہ حال نہ ہوتا لہٰذا صوبوں کی خود مختاری پاکستان کی سالمیت کا مسئلہ نمبر ایک ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ انتخابات کے سلسلے میں بھی ہمیشہ یہ مذاق ہوتا ہے کہ جو نیا حکمران آتا ہے وہ قوم اور ملک کو ایک نئے تجربہ گاہ میں پہنچا دیتا ہے اور ہر حاکم اپنی تجویز کردہ جمہوریت کو حقیقی یا بنیادی جمہوریت کہتا ہے۔ یہ سلسلہ لیاقت علی خان مرحوم کے بعد ابھی تک جاری ہے۔ جب بھی معروف جمہوری طریقے سے دستور بنا تو اسے چلنے نہیں دیا گیا۔ موجودہ سیاسی نظام جس کے مطابق ہماری مسلح افواج کا چیف آف آرمی سٹاف ہی ملک کا صدر بھی ہے شاید ہی دنیا میں کہیں اس کی مثال ملتی ہو۔ اس کے نتیجہ میں قوم اور سیاسی جماعتیں ایک عجیب انتشار کا شکار ہیں۔ کچھ لوگ جنرل صاحب کے حوالے سے سیاست کرتے اور کچھ لوگ پیر صاحب پگاڑا اور مسلم لیگ کے حوالے سے زور آزمائی کر رہے ہیں۔ یقیناً اس کے نتیجے میں حکومت کا آگے چل کر غیر مؤثر ہو جانا لازمی امر ہوگا۔ بیورو کریٹس کا رشوت میں پکڑے جانا اخباروں میں روز آتا ہے حال یہ ہے کہ جس گاڑی میں وزیر سواری نہیں کر سکتا اس میں پولیس کا ایک ایس ایچ او گھومتا پھرتا نظر آرہا ہے۔ باہر سے آنے والے تخریب کاروں پر ہماری گرفت بہت کمزور ہے۔ البتہ بیان بازی بڑے زور سے ہو رہی ہے کہ تخریب کاروں کو اب نہیں چھوڑا جائے گا ان کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے گا لیکن نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ فوج کو ملکی سیاست سے یکسر علیحدہ رکھا جائے اور انتظامیہ کے اندر فوجی افسروں کے تبادلے بند کئے جائیں۔ اس وقت سندھ میں فقط پولیس ڈیپارٹمنٹ میں کئی آرمی افسروں کا تبادلہ کیا گیا ہے، جو ایس پی یا ایس ایس

پی کے عہدوں پر کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک بھر کے ۷ اڈویژنوں میں سے آٹھ کے اندر پہلے ہی آرمی افسر پولیس کے اہم عہدوں پر تعینات ہیں۔ جبکہ ان علاقوں میں بہت سے مقامی افسر اپنی جائز ترقیوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ سابق آئی جی سندھ 'جناب بشیر احمد صدیقی کو پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ہی باہر نکال کر شناختی کارڈ بنانے کی ذمہ داری دے دی گئی جبکہ وہ ایک لائق اور ایماندار افسر تھے حال ہی میں ہمارے چیف منسٹر نے ایک نظریاتی کونسل بنائی ہے جس میں کئی افراد کو لیا گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ کونسل ایک نمائشی چیز کے علاوہ اور کچھ نہیں ثابت ہوگی۔ صوبہ کے لوگ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ جس کے پاس اختیارات ہیں وہی کوئی اصلاح کر سکتا ہے۔ ورنہ اسلامی نظریاتی کونسل تو جنرل ایوب خان نے بھی بنائی تھی اس نے کیا کیا؟ اس کے نتیجے میں قوانین کا غیر اسلامی تحفہ (عائلی قوانین) ہمیں عطا ہوا۔ نظریاتی کونسل ہر دور میں رہی لیکن اس دور حکومت میں اس کا بہت زیادہ چرچا ہوا۔ تاہم سینکڑوں قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے باوجود کونسل کی سفارشات اب بھی سرد خانے میں پڑی ہوئی ہیں کہ تازہ تجاویز دینے اور معزز ممبران کی رہنمائی کے کام آسکے۔ پیر صاحب پگاڑا نے جو یقیناً ایک ذہین اور تخلیقی ذہن کے مالک لیڈر ہیں انہوں نے ٹھٹھہ میں کینجھر جھیل کے کنارے پر ہونے والی مسلم لیگ کی تقریب میں اعتراف کیا کہ بیوروکریسی سب سے بڑی منظم جماعت ہے جو ہمیں چلا رہی ہے۔ یہ بات پیر صاحب نے اپنے طویل تجربے اور سیاسی بصیرت کی بنیاد پر کہی تو کیا یہ سب کچھ جو اسلام اور پاکستان کے نام پر کیا جا رہا ہے بیوروکریٹس کے چالیس سال ہیں یا سیاسی دھوکہ بازی ہے۔

۳۔ ہمیں مغربی تہذیب کی رنگینیوں نے اتنا مرعوب کر دیا ہے کہ ہم بحیثیت قوم اسی کو اپنا دین مانتے ہیں اور اس کے ہر نیک و بد اصول اور فیشن کو اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم علمی اور فنی لحاظ سے تو مغرب کے ہم پلہ نہیں بن سکتے ہیں لیکن فیشن اور معیار زندگی میں اس کی پوری نقل اور تقلید کرتے ہیں اور اپنی دینی روایتوں اور اعلیٰ اقدار کو بھلاتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارے گھروں میں خود بچوں کو اب قرآن شریف پڑھنے اور پڑھانے کی اچھی روایت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ دینی تعلیمات کی جگہ آج کرکٹ اور وی سی آر نے لے لی اور باقی کی وڈیو گیم نے پوری کر دی ہے۔ آخر ایسا کیوں نہ ہو ہمارے قومی نشریاتی ادارے گزشتہ دس

سال سے کرکٹ کو جو کوریج دے رہے ہیں اس سے ایسا لگتا ہے کہ یہ بھی نظریہ پاکستان کا کوئی حصہ ہے جس کو فروغ دیا جارہا۔ کرکٹ کا کھیل کوئی برا کام نہیں لیکن پوری قوم کو مستقلاً کرکٹ فوبیا میں مبتلا کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ ہمارے یہاں جمعہ کا دن بھی نہیں چھوڑا گیا اس دن ہمارے ٹی وی والوں نے بارہ ایک بجے تک تو لوگوں کو ویسے ہی معروف رکھا ہوا ہوتا ہے اور نماز و طعام کے وقفہ کے بعد بیہودہ قسم کی ریسلنگ کا کھیل دکھایا جاتا ہے۔ کیا ایسی ریسلنگ اسلامی نقطہ نظر سے جائز ہے۔ جس میں ایک گھر کی عورتوں اور بچوں کے سامنے زائد از نیم برہنہ مرد ایک دوسرے کو برے طریقے سے الٹ پلٹ کرتے ہیں؟ کیا اسلام میں فقط عورت کو اپنا ستر چھپانا ہوتا ہے اور مرد کو ننگا گھومنے کی اجازت ہے؟ اور بچوں پر اس ریسلنگ کا کیا نفسیاتی اثر پڑتا ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر بچے پھر اس پروگرام کی نقل کرتے ہیں۔

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں ہر سطح پر اپنا احتساب کرنا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ ہر غلطی کو حکومت اور سیاست دانوں کے سر تھوپنے کی کوشش کی جائے۔ اور خود ذمہ داری سے بچا جائے۔ یہ انصاف نہیں ہوگا۔ بلاشبہ حکومت تمام معاملات کی ذمہ دار ہے لیکن بحیثیت فرد، سیاسی رہنماء، صحافی، استاد اور منتظم کے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ مثبت سوچ اور سیدھے رخ چلے۔ خود غرضی کی بجائے اجتماعی نظر سے سوچے۔

۴۔ صوبائی اختیارات کے باب میں اکثر لوگوں کو یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ قومیتوں کا تعصب کیوں ابھرا۔ آج ہر شخص اپنے حقوق کو لسانی یا صوبائی حوالے سے حاصل کرنے کی بات کرتا ہے۔ اس کے ردعمل میں ہمارے مضبوط مرکز پسند سیاست دان اس کو صوبہ پرستی اور قوم پرستی کی طرف منسوب کرتے اور آگے بڑھ کر صوبوں کے وجود کی ہی نفی کرتے ہیں کہتے ہیں کہ ہمیں فقط ایک پاکستان اور اسلام کے حوالے سے بات کرنی چاہئے لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ گزشتہ چالیس سالوں میں چھوٹے صوبوں کو اسلام کے حوالے سے ہمارے حکمرانوں نے کون سے حقوق دیئے ہیں یا پاکستان کے حوالے سے ان کے جائز مطالبات کب سنے اور مانے ہیں۔ کیا ان دونوں حوالوں سے چھوٹے صوبوں کے عوام کو فوج، بیوروکریسی، صنعت و تجارت اور سفارت کے اندر جائز حصہ دیا گیا ہے اس کا جواب نفی میں ہے تو وہ اس کی کیا وجہ

بیان کریں گے۔ محروم طبقات کے لئے دو ہی راستے بچ جاتے ہیں یا علیحدگی یا پاکستان کے دائرے کے اندر آئینی خود مختاری جن لوگوں نے فقط صوبے کے اختیارات مانگے، ہمارے مارشل لائی سیاست دانوں اور حکمرانوں نے ان کو بھی غدارِ وطن کہا اور جو وفاق کی حمایت کرتے ہیں ان کو بھی تخریب کار اور ملک دشمن قرار دیا۔ ہماری ہر حکومت اپنے سیاسی مخالفین کو ملک دشمن قرار دینے میں کسر نہیں چھوڑتی اور حب وطن کا مرقع وہ خود کو سمجھتی رہی۔ خدارا ہمیں اپنے سیاسی مخالفین کو انٹی اسٹیٹ نہ قرار دینا چاہئے اور صوبوں کو مکمل اختیارات دے دینے چاہئیں۔ مرکز کی آمدنی میں ہر صوبہ کو جائز حصہ ملنا چاہئے۔ صوبائی انتظامیہ مکمل طور پر صوبائی حکومت کے ہاتھ میں رہنی چاہئے۔ نظام تعلیم کی اسلامی خطوط پر تشکیل جدید کی جائے جو سائنٹیفک اور ہمہ گیر ہو اور کلرک اور وفادار بیورو کریٹس کی بجائے ذمہ دار شہری اور محب وطن ایماندار افسر پیدا کرے۔

۵۔ بیروزگاری کے مسئلے کو منصوبہ بندی سے حل کیا جائے

۶۔ پاکستان کے تمام صوبوں کی زبانوں کو قومی زبانوں کا درجہ دیا جائے۔

۷۔ ملک کی قومی فوج میں کسی ایک صوبہ کی بالادستی نہ ہو اس میں ہر صوبہ کی نمائندگی' خاص طور پر افسروں کی حد تک' ہونی ۔ تاکہ فوج کے متعلق پورے ملک کے اندر اپنائیت کا جذبہ اور احساس پیدا کیا جائے

۸۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی تمام سفارشات کو اسمبلی کے ذریعہ دستور کا حصہ بنایا جائے۔

۹۔ سیاستدانوں میں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہونا چاہئے۔ سیاسی مخالفت کو ذاتی دشمنی میں تبدیل کرنا ملک کے لئے خیر خواہی نہیں ہوگی۔ ریڈیو اور ٹی وی کو عریانیت اور فحاشی سے پاک پروگرام پیش کرنے پر مجبور کیا جائے۔ فار مولا فلموں کی طرح فار مولا اسلامی پروگرام دینے سے پرہیز کرنا ہو گا۔ عوامی شعور کو بڑھانے کی فکر کی جائے لوگوں کو بے مقصد تفریحات میں گم کرنے کی بجائے ان کے اندر ایک ذمہ دار شہری ہونے کا احساس پیدا کرنے کی فکر کرنی چاہئے۔

بقیہ: عرضِ احوال

انہیں ڈاکٹر اسرار احمد پر "نبیؐ کے ساتھ خاص قرآن و سنت کی بعض نصوص کو اپنی ذات کے ساتھ متعلق کرنے کی جسارت" کا گردن زدنی الزام جڑتے ہوئے خوفِ خدا لاحق نہ ہوا جس نے سال ڈیڑھ سال پہلے عین ان کی ناک تلے اپنے ادارے قرآن اکیڈمی (ماڈل ٹاؤن) میں ملک بھر سے اپنے رفقاء (جن پر وہ مریدوں کی پھبتی کستے ہیں) کو جمع کر کے اہل سنت کے جملہ مکاتب فکر کے جید علماء کے سامنے لا بٹھایا تھا کہ اس کے علمی موقف پر ان کی رائے اور تبصرہ پوری توجہ ' خاموشی اور ادب سے سنیں۔ یہ اجتماع کھلے عام کئی دن چلتا رہا اور محترم علمائے دین اور مفتیانِ عظام نے کسی ادنیٰ ترین مداخلت کے بغیر پوری دلجمعی اور آزادی سے اپنی باتیں لاؤڈ سپیکر پر نشر کی تھیں۔ اور جہاں بعض حضرات نے آزادئ اظہار و تقریر کے بھرپور استعمال کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد کے تصورِ فرائض دینی پر نہ صرف برملا تنقید کی تھی بلکہ طنزیہ اور استہزائیہ اسالیب کا بھی دل کھول کر استعمال فرمایا تھا وہاں بہت سے مسلمہ حیثیت کے مالک علماء اور مفتیانِ کرام نے ان کے تصورات کی کامل تصویب فرمائی تھی۔ یہ ساری روداد بہت دنوں پہلے ہمارے جرائد میں شائع ہو چکی ہے اور تا حال کسی صاحبِ علم کی طرف سے تردید نہیں ہوئی۔ لیکن سبحان اللہ ' آج کفر کا فتویٰ (اس "جسارت" سے بڑھ کر کوئی کیا کفر توڑے گا) کس کی طرف سے جاری کیا جا رہا ہے ' قرآن و سنت کی نصوص کے غم میں دبلے ہونیوالے اس قاضی کی طرف سے ' جو رجم کی صدیوں سے غیر متنازعہ طور پر مشروع سمجھی جانے والی حد کو پائے حقارت سے ٹھکرا چکا ہے

سیرتِ طیبہ کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا ہو گا لیکن کبھی کوئی بات رہ بھی جاتی ہے۔ مثلاً وہ سمجھتے ہیں کہ اہلِ یثرب نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ام القریٰ سے ہجرت کر کے اپنی بستی کا اقتدار سنبھالنے کی دعوت دی اور اسی بنا پر حضورؐ نے بیعت سمع و طاعت اور ہجرت و جہاد کا مطالبہ شروع کیا تھا۔ حالانکہ یہ وہ بات ہے ' سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا۔ ہماری تاریخ کا ایک ایک لمحہ آج بھی حضورؐ کے رخِ روشن کی طرح منور ہے۔ جناب رسالت مآب نے بیعت عقبہ ثانیہ کے نتیجے میں یثرب کی طرف ہجرت فرمائی تھی تو وہ ہر گز اقتدار

سنبھالنے یا حکومت کی تشکیل کے لئے نہ تھی (یہ الگ بات ہے کہ نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے بالفعل راستہ اسی کے لئے صاف فرما دیا)۔ اہل یثرب سے عہد و پیمان صرف اس بات کا ہوا تھا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی دعوتی سرگرمیوں میں کفار مکہ کی جس جارحیت کا سامنا ہے' اس کے مقابلے میں انہیں پناہ' حفاظت اور نصرت مہیا کی جائے گی۔ اہل یثرب کو انصار کا نام بھی نصرت کے اس وعدے کے باعث ہی ملا تھا۔ یہی وجہ ہے اس مرحلے پر آنحضورؐ نے یثرب میں اپنا کوئی نائب یا عامل مقرر نہیں فرمایا تھا بلکہ اہل یثرب ہی میں سے بارہ نقباء نامزد فرمائے تھے۔ اور قبل ازیں پہلے مرحلے پر حضرت مصعبؓ بن عمیر بھی حضورؐ کے گورنر یا عامل کی حیثیت میں نہیں' بطور داعی و معلم مقیم رہے تھے۔ علاوہ ازیں بیعتِ عقبہ ثانیہ کے الفاظ کو سامنے رکھا جائے تو اس کا عنوان بیعت حکومت نہیں بلکہ بیعت تنظیم ہی قرار پائے گا۔
رہا یہ اشکال کہ اس سے پہلے حضورؐ نے اپنے پیروؤں سے کبھی سمع و طاعت کی بیعت نہ لی تھی تو اس کا سبب اس حقیقت سے شعوری یا غیر شعوری صرفِ نظر ہے کہ جب تک آنحضورؐ کی جماعت صرف مکہ تک محدود تھی جہاں جناب رسالت مآبؐ بنفس نفیس خود موجود تھے کسی رسمی بیعت کی ہرگز ضرورت نہ تھی۔ یہ ضرورت پیش ہی اس بناء پر آئی کہ اب معاملہ اہل یثرب کا تھا جو نبی اکرمؐ سے براہ راست اور مسلسل تنظیمی رابطہ رکھنے سے معذور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے اس مرحلے پر نقباء مقرر فرمائے اور بیعت میں یہ اقرار بھی لیا کہ اصحاب امر کی تعیین میں آنحضورؐ کو کلی اختیار ہوگا کہ جسے چاہیں ترجیح دیں اور یہ کہ آنحضورؐ سے بیعت کرنے والے آپؐ کے نامزد کردہ امراء و نقباء سے بھی جھگڑیں گے نہیں بلکہ ان کی بھی اطاعت کریں گے۔ جو ظاہر ہے کہ اطاعت فی المعروف ہی ہو سکتی تھی[1]۔
رہی یہ بات کہ "آپ کی سنت یہی ہے کہ اہل ایمان کی کوئی جماعت اگر کسی خطۂ ارض میں اقتدار حاصل کر لے' تو اس کے امیر کو اس جماعت کے افراد سے سمع و طاعت کی بیعت لینی چاہئے۔ اس مرحلے سے پہلے اس طرح کی بیعت ایک بدعت ہے" تو اس "بدعت" کے سب سے پہلے مرتکب تو خود حضورؐ کے نواسے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ تھے' جنہوں نے کسی

---

[1] سیرت مطہرہ سے بیعت کے واقعات پر مشتمل ایک پرانی کتاب کے کچھ صفحات کا عکس اس شمارے میں مختصر تمہیدی کلمات کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔

خطۂ ارض میں اقتدار حاصل کئے بغیر اہل کوفہ سے بیعت لینے کے لئے اپنے نمائندے کو ان کے پاس بھیج دیا تھا۔ آگے حد ادب۔

افسوس کہ کالم نگار یہ بدیہی امر بھی ملحوظ نہیں رکھ رہے ہیں کہ اہل ایمان کا سیاسی اقتدار اسی سرزمین میں قائم سمجھا جاسکتا ہے جہاں حاکیت کا حق صحیح معنوں میں اللہ کو تفویض کر دیا گیا ہو۔ یقیناً ایسی سرزمین میں جہاں مثالی اسلامی حکومت قائم ہو' وہاں کسی مد مقابل کا سمع و طاعت کی بیعت طلب کرنا درست نہیں ہے۔ ان کی اور ہماری سوچ میں فرق صرف اتنا ہے کہ ہم اگر ایک طرف مسلمانوں کے اس وطن میں جہاں حکومت الہیٰہ قائم ہو' اسی کے صاحبِ امر کو بیعت سمع و طاعت کا اہل مانتے ہیں تو دوسری طرف اس کے عدم وجود کی صورت میں اس کی بحالی کی جدوجہد کے لئے تنظیم کی مسنون بنیاد بھی سمع و طاعت (بہر صورت معروف سے مشروط) کی بیعت ہی کو سمجھتے ہیں۔ رہی ہماری سخن فہمی کی بات تو اس طنز کے پردے میں فاضل کالم نگار نے بڑی سادگی اور پرکاری سے کام لیا ہے۔ اپنے کسی پرانے جملے کی ترتیب بدل کر نئے معنی کا جامہ پہنا دینا ' ہاتھ کی صفائی تو کہلائے گا' بیان کی خوبی نہیں۔ ندوہ اور دیوبند سے کسی نسبت و مشابہت کو حاشیہ خیال میں لائے بغیر بطور مثال عرض ہے کہ اگر کوئی کہے کہ تبلیغ اسلام کے لئے ربوہ اور رائے ونڈ جیسے مراکز قائم ہونے چاہئیں تو قائل کا مفہوم تلاش کرنے والا ایک بار تو ضرور چکرا جائے گا۔ ایک اور طرح کی واردات انہوں نے "اپنے ترتیب دیئے ہوئے نصابات" کے ساتھ کی۔ متعلقہ پیرا ہی نہیں 'ان کے کالم کا پورا نصف آخر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ذکر کے لئے مخصوص تھا۔ ایسے میں ان تبلیغی نصابات کا ذکر کہاں سے آگھسا جن سے ذہن تبلیغی جماعت کی طرف منتقل ہوتا ہے ......ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ...... اب تبلیغی نصاب کی ان الفاظ میں صراحت پڑھ کر ہمارا کوئی تبلیغی بھائی برہم ہو جائے تو کالم نگار کو کون یہ کہنے سے روک لے گا کہ میں نے تو تبلیغی جماعت کا نام تک نہیں لیا تھا۔ تاہم مقام شکر ہے کہ انہیں ہمارا منتخب قرآنی نصاب تو پسند آیا جس کی افادیت سے 'اب معلوم ہوا کہ 'انہوں نے کبھی انکار نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں ایسی ہی چند اور مفید باتوں کے اقرار کی بھی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

★★★★★★★★★★

افکار و آراء

دیارِ غیر سے ایک فکر انگیز خط

محترم مدیر ماہانہ میثاق

السلام علیکم

دیار غیر میں پاکستان کے مختلف شہروں میں بموں کے دھماکوں اور ان میں ضائع ہونے والی قیمتی جانوں کے حالیہ واقعات سن کر دلی رنج ہوا۔ ان افسوسناک واقعات میں درجنوں ہم وطنوں بلاکسی تعصبانہ تمیز کے مارے گئے اور بے شمار گھر برباد ہوئے۔ ہلاک ہونے والوں میں اپنے مہاجر ' سندھی ' پنجابی ' پٹھان ' بہاری اور بلوچی شامل تھے جن کا قصور اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ پاکستانیوں کی اکثریت کی طرح ایک وطن میں اسلام کے مضبوط رشتے میں منسلک ہو کر پر امن زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ ان حادثات نے جانی و مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ساتھ قوم کو ایک سبق ضرور دیا ہے وہ یہ کہ ہمارے پاک ملک میں ابھی بھی ایسے سنگدل عناصر موجود ہیں جو صرف اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے بے گناہ اور معصوم شہریوں کی جانوں سے بھی کھیلنے سے دریغ نہیں کرتے۔ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا تھا اور ہمارے رہنماؤں نے اسے اسلام کا قلعہ بنانے کا عظیم بیڑہ اٹھایا تھا لیکن بدقسمتی سے چالیس سال گزرنے کے باوجود ہم اس عظیم منزل تک پہنچنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس ناکامی کا سبب وہ اسلام دشمن قوتیں ہیں جو وطن عزیز میں مختلف رُوپوں میں اپنے ناپاک منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں سرگرم عمل ہیں۔ ہمیں نہ صرف ان اندرونی اسلام دشمن قوتوں سے ہوشیار رہنا چاہئے بلکہ ان بیرونی طاقتوں سے بھی چوکنا رہنے کی ضرورت ہے جو کہ ایک متحدہ پاکستان کو برصغیر میں ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتیں۔ ہمیں یہ حقیقت سمجھ لینی چاہئے کہ پاکستان میں رہنے والی مختلف قومیتوں میں اگر کوئی قدر مشترک ہے تو وہ اسلام ہے۔ نیز اگر پاکستان کو اپنا وجود برقرار رکھنا ہے تو اس میں رہنے والوں کو بلاتمیز رنگ ' نسل اور زبان ' اسلام کے کمزور نہ پڑنے والے رشتے میں بندھ جانے کا عزم کرنا ہو گا۔

اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی نام لیوا جماعتوں کو اپنے چھوٹے چھوٹے غیر ضروری تفرقات بھلا کر ایک اسلام کے جھنڈے تلے ' اللہ کی جماعت کا سرگرم کارکن بننا پڑے گا تاکہ وہ اللہ کی مدد کے اہل

ن سکیں۔ اس وقت اپنے اپنے جماعتی جھنڈوں تلے اسلام کے نعرے لگانے کا وقت نہیں بلکہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام کر 'قرآن وسنت کے جھنڈے تلے 'اسلام اور پاکستان دشمن اندرونی اور بیرونی طاقتوں اور سازشوں کا قلع قمع کرنے کا وقت ہے۔ اگر ہم اسی طرح نفسانفسی میں پڑے رہے تو خدا نخواستہ ہم اپنے دشمنوں کے ہاتھوں اللہ کے غضب کا شکار نہ ہو جائیں۔ اللہ کا غضب جب آئے گا وہ تمام پاکستانی مسلمانوں پر یکساں ہو گا۔ اس وقت ہمارے دشمن یہ نہیں دیکھیں گے کہ کون جماعت اسلامی کا ہے یا تبلیغی جماعت کا ہے یا پھر جمیعت علمائے اسلام یا پاکستان کا ہے۔

ہم اپنے وطن سے ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے یہ امید کرتے ہیں کہ ہماری پاک سرزمین میں ہمارے ان خیالات سے اتفاق کرنے والے ابھی لوگ موجود ہیں۔ یہ لوگ جو پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کا عزم رکھتے ہیں اور اس میں سرگرم عمل بھی ہیں 'ان سے گزارش ہے کہ ہمیں بھی اس نیک کام میں شامل سمجھیں۔ خدارا اگر کسی موقع پر بھی جانی یا مالی ضرورت پڑے تو ان چند درد مند اسلام کے نام لیوا پاکستانیوں کو ضرور یاد رکھیں۔

والسلام

۱۔ محمد پرویز چودھری ۲۔ شکیل مسعود ۳۔ اکبر علی ۴۔ محمد علی ۵۔ محمد عطاء الرحمن خان ۶۔ ذبیح اختر ۷۔ رحمت اللہ کنڈی ۸۔ نعیم رضا معرفت نسیم رضا۔ پوسٹ بکس ۳۴۹۱۔ سانٹا کلارا۔ کیلی فورنیا ۹۵۰۵۵ (امریکہ)

(نوٹ.. اس خط کی کاپیاں مندرجہ ذیل حضرات کو بھیجی جارہی ہیں۔

صدر پاکستان 'وزیر اعظم پاکستان 'امریکہ میں پاکستانی سفیر 'مدیران روزنامہ جنگ 'مشرق 'نوائے وقت 'مسلم 'پاکستان ٹائمز 'جسارت 'ڈان 'مارننگ نیوز 'ہفتہ وار اخبار جہاں 'اخبار خواتین 'اور ماہانہ اردو ڈائجسٹ 'میثاق 'اور ترجمان القرآن)

(۲)

جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کا ٹی وی اور شہادت ذوالنورین

اس مرتبہ شہادت حضرت عثمانؓ کے سلسلہ میں ٹی وی نے تین دنوں میں مجموعی طور پر تقریباً ۴۵ منٹ کا وقت دیا اور اس شان سے دیا کہ پہلے دو دنوں تک دس 'دس منٹ اور تیسرے دن یعنی ۱۸ ذی الحجہ کو جس دن شہید مظلوم کو کئی دن کی بھوک پیاس کے بعد نہایت درجہ سفاکانہ طور پر شہید کیا گیا تھا۔ اس دن ۲۵ منٹ کا وقت دیا گیا اسی آخری دن یوم شہادت اس طرح منایا گیا کہ پچھلے دو دن کا پروگرام دورانیوں کی کمی اور تازہ پروگرام کی سادگی کے باعث ذہن سے محو ہو کر رہ گیا اور پھر اسی دن صبح بھی

ڈرامہ شام بھی ڈرامہ اور طویل نغموں اور دوسرے رنگین پروگراموں سے اسے ایک جشن مسرت آگین کے طور پر منایا گیا۔

کہا جا سکتا ہے کہ یہ ۱۴ راگست کی تاریخ اور جشن آزادی کا دن تھا۔ بجا' لیکن کیا جشن آزادی اس صورت میں بھی اسی طرح منایا جاتا اگر یہ دسویں محرم کا دن ہوتا؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو شہادت عثمانؓ کو جمہوریہ اسلامیہ پاکستان میں کوئی اہمیت کیوں نہ دی گئی۔ جبکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ محرم کے دس دنوں کی طرح جن میں ٹی وی مجموعی طور پر ۱۵ گھنٹہ تک دے چکا ہے شہادت عثمان کی تفصیلات ان تمام ایام میں جب سے کاشانۂ خلافت کا محاصرہ شروع ہوا یوم شہادت تک ٹی وی سے نشر کی جاتیں اور مسلمہ مسلم علماء' مؤرخین اور دانشوروں کی زبانی سنوائی جاتیں۔

سید محمد عمر

۵۰/ درخشاں۔ کراچی ۳۷

(۳)

ایک وضاحت ....

محترم و مکرم جناب اقتدار احمد صاحب

سلام مسنون

"میثاق" ستمبر کا شمارہ نظر نواز ہوا حسب عادت باقی تحریروں سے پہلے "عرض احوال" کے عنوان سے آپ کی ادارتی تحریر پڑھی بحمد اللہ بہت سی باتیں اپنے دل کی آواز محسوس ہوئیں مگر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تنفیذ فقہ حنفی کی تجویز پر بقول آپ کے "معاصرین کی ستم ظریفی کی حد یہ تھی کہ اس رائے پر اہل تشیع و اہل حدیث حضرات نے تو واویلا کیا لیکن حنفی حلقوں سے حمایت میں کوئی آواز نہ اٹھی" [۱]

تصیح کیلئے یہ گذارش ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا یہ تجزیہ صحیح نہیں کہ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کی حمایت میں کوئی آواز نہیں اٹھی بلکہ ملک کے مؤقر ماہنامہ "الخیر" ملتان بابت ماہ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ بعنوان "اعتراف حقیقت" صہ میں ڈاکٹر صاحب کی اس تجویز کو سراہا گیا اور اس کی تائید کی گئی۔ یہ تائید اس اعتبار سے بھی وقیع ہے کہ بانئ جامعہ حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ

---

[۱] توجہ دلانے کا شکریہ! دراصل ذکر اخبارات کا تھا جن میں ایک طرف سے تو کئی بیانات شائع ہوئے لیکن دوسری طرف سے کوئی بات پڑھنے میں نہ آئی۔ ہم اگر معاصرین کی بجائے "معاصر اخبارات" لکھتے تو بہتر تھا (ادارہ)

حنفیت کے عظیم مبلغ تھے ان کے ادارہ کے لئے فقہ حنفی کی تائید بہر صورت ضروری تھی خواہ یہ آواز کہیں سے بھی بلند ہو بہرحال ماہنامہ "الخیر" نے اس سلسلہ میں جس وسعت ظرفی کا مظاہرہ کیا آپ کو اس کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام نہیں لینا چاہئے تھا۔

فقط والسلام

آپ کا مخلص۔ محمود الحسن شاہ مسعودی کاشمیری
بیرون حرم گیٹ ملتان

(۴)

صحافیوں کے نام ایک کھلا خط

۱۲؍ شریف پارک۔ ملتان روڈ۔ لاہور۔ ۱۸ سے ڈاکٹر فرخ شہزاد نے ایک مکتوبِ مفتوح جناب مجید نظامی، مدیر روزنامہ نوائے وقت کو ارسال کر کے اس کی نقول ہمارے علاوہ ملک کے متعدد اخبارات کو بھیجی ہیں۔ اللہ جانے ان میں سے کسی کو اسے شائع کرنے کی توفیق ہوگی یا نہیں۔ ہم بہرحال ذیل میں درج کر رہے ہیں۔ چند ماہ قبل ہم نے بھی اپنے اخبارات و رسائل کو اس طرح متوجہ کیا تھا لیکن

شاید کہ دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے ہم وطن بھائیوں کی ایک بڑی تعداد اسی کرب کا شکار ہے جو اس خط سے ٹپک رہا ہے۔ لیکن اکثر بس جی مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ ایک آواز اٹھی ہے تو اس کا آہنگ بلند کیا جانا چاہئے

(ادارہ)

السلامُ علیکم! ۱۸؍ اگست کو روزنامہ نوائے وقت لاہور میں ریاض الرحمٰن ساغر کا ایک کالم شائع ہوا۔ مڈویک ایڈیشن کے صفحہ اول پر شائع ہونے والے اس کالم کا عنوان تھا "نئی نسل کا پہلا تربیتی ادارہ۔ آغوشِ مادر یا آغوشِ ٹیلی ویژن" اس کالم میں جہاں کالم نویس نے اپنے خیالات ظاہر کئے وہیں ایسے خطوط بھی شائع کئے گئے جن میں ٹیلی ویژن کی بے راہ روی اور مغربیت نوازی پر کڑی تنقید کی گئی اگرچہ اخبارات و رسائل میں ایسے خطوط شائع ہوتے رہتے ہیں جن میں ٹیلی ویژن کے خوفِ خدا سے عاری اربابِ اختیار کے مردہ ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن صمٌ بکمٌ کے مصداق ان کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔

محترم نظامی صاحب ! آپ کا اخبار تعریف کا مستحق ہے کہ اس نے ایک برائی کے خلاف صفحات وقف کئے لیکن میں اس وقت آپ کی توجہ اخبارات میں ہونے والی بے راہ روی کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ مڈویک ایڈیشن میں شائع ہونے والے مذکورہ کالم کا انتہائی کربناک پہلو یہ تھا کہ پورا صفحہ اول اداکاراؤں کی بڑی بڑی رنگین تصاویر سے بھرا پڑا تھا جبکہ اس کالم میں اسی چیز کے خلاف آواز اٹھائی گئی تھی۔ لیکن یہ معاملہ صرف اسی ایڈیشن تک محدود نہیں آج کی صحافت کا مقصود و مطلوب اس کے علاوہ کچھ نہیں رہا کہ اداکاراؤں اور اسی قماش کی شرم و حیاء سے عاری خواتین کی بڑی بڑی رنگین تصاویر شائع کی جائیں ان کے انٹرویو چھاپے جائیں اور انہیں اس طرح پیش کیا جائے کہ جیسے قوم کا سب سے زیادہ قابل فخر اور سب سے قیمتی سرمایہ واثاثہ یہی لوگ ہیں پوری صحافت آج ان کی شہرت کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچانے میں مصروف دکھائی دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنسی جذبات انگیزی کا مقابلہ ہو رہا ہے عورتوں کی تصاویر کے سائز کو بڑے سے بڑا کرنے ان کی رنگینی میں مزید رنگ بھرنے ان کے پوز میں زیادہ سے زیادہ رومانویت بھرنے کے لئے صحافی حضرات ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

محترم ! کیا آپ یہ بتائیں گے کہ یہ سب کچھ کرنے کا مقصد کیا ہے؟ کیا خدا اور رسولؐ کی تعلیمات کی دھجیاں اڑانے والی ' حیا کی قدروں کو تار تار کرنے والی بے حیائی اور جنس کو فروخت کرنے والی یہ اداکارائیں اور حسینائیں آپ کے صفحات پر اسی طرح جگہ پانے کی مستحق ہیں؟ اگر مستحق ہیں تو کس بنیاد پر؟ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ قوم کی اجتماعی بے حسی، بے راہ روی اور ضمیر فروشی کے اس عالم میں صحافت کا ضمیر بھی دم توڑ چکا ہے اپنی دنیوی جائیدادوں کو مزید وسعت دینے اپنی دنیوی دولت کو مزید بڑھانے کے لئے صحافیوں میں اپنے اخبارات ورسائل کی اشاعت کو مزید فروغ دینے کی جو دوڑ ہو رہی ہے اس دوڑ میں صحافی حضرات یہ بھول چکے ہیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے انہیں اپنی صحافت میں خدا اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات کا خیال رکھنا ہے یا وہ یہ بھول چکے ہیں کہ جس طرح وہ روزانہ درجنوں افراد کے مرنے کی خبریں چھاپتے ہیں اسی طرح انہیں بھی ایک دن مرنا ہے اور روزِ آخرت خدا کے حضور اپنی صحافتی زندگی کا بھی حساب دینا ہے کیا ہمارے صحافی یہ سوچیں گے کہ کہیں ان کی موجودہ روش آخرت میں انہیں آگ کے گڑھوں میں دھکیلے جانے کا باعث تو نہیں بن جائے گی؟

محترم ! اگر معاملہ صرف شخصی اور انفرادی گناہ کا ہوتا تو شاید صحافت کا یہ طرزِ عمل مجھے قلم اٹھانے پر مجبور نہ کر سکتا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پورا معاشرہ اس مقابلے کی لپیٹ میں آ رہا ہے جب ٹیلی ویژن اس معاشرے کا حصہ بنا تو حیا نے اسی دن سسکنا شروع کر دیا تھا جب وی سی آر گھروں میں داخل ہوا تو حیا نے

دم توڑ دیا۔ پھر ماں باپ اپنے بچوں کو ساتھ بٹھا کر عورتوں کو برہنہ ناچتے ہوئے دیکھتے رہے لیکن انہیں شرم محسوس نہ ہوئی۔ پھر جس طرح مسلمان کسی زمانے میں قرآن کو سینے سے لگا کر گھومتے تھے اسی طرح وہ وی سی آر کے کیسٹس کو اپنے سینوں سے لگا کر گھومنے لگے اور آج اخبارات کے رنگین صفحات پر نظر پڑتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے حیا کے مردہ جسم کی بے حرمتی کی جا رہی ہے اور بچوں جوانوں اور بوڑھوں کو اس شغل سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کیا جا رہا ہے کیونکہ اسی طریقے سے اخبارات و رسائل کی اشاعت کو بڑھایا جا سکتا ہے۔

محترم ! آج جب میں صحافیوں کو ایک برائی سے روک رہا ہوں تو میں نے خدا کو گواہ بنالیا ہے اور قیامت کے دن جب صحافی حضرات خدا کے حضور پیش ہوں گے تو اس وقت میں پہلا گواہ ہوں گا جو اس خط کی تحریر سے پہلے اور بعد کے صحافتی ادوار کے بارے میں گواہی دوں گا میں کوئی نیک اور پارسا انسان نہیں میں خود گناہ گار ہوں لیکن آج جب معاشرے میں موجود ایک کھلی برائی میری نظر میں کھٹک رہی ہے تو میرا ضمیر مجھے اجازت نہیں دیتا کہ میں صرف اپنے گناہوں کی فکر کرتے ہوئے خاموش رہوں۔

والسلام، فرخ شہزاد

****

جوہر
جوشاندہ
نصف صدی سے معیاری
ادویات کا نشان
فی پیکٹ ایک روپیہ

کھانسی، گلے کی خراش، نزلہ زکام کے لیے
زود اثر
سرفی کول
SURFICOL
COUGH SYRUP
آپ کا نبض شناس
نصف صدی سے معیاری
ادویات کا نشان

کارمینا
بدہضمی، قبض، گیس،
سینے کی جلن، تیزابیت
وغیرہ کا اچھا علاج ہے۔
Carmina
ہم خدمت خلق کرتے ہیں

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۔

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد ۳۶
شمارہ ۱۲
ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ
دسمبر ۱۹۸۷ء
فی شمارہ -/۵
سالانہ زرِ تعاون -/۵۰

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

مینجنگ ایڈیٹر
اقتدار احمد

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

ممالک	زرِ تعاون
سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوحہ، قطر، متحدہ عرب امارات ۔	۲۵ سعودی ریال یا ۱۱۵ روپے پاکستانی
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر ۔	۶ امریکی ڈالر یا ۱۰۰ روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ ۔	۹ امریکی ڈالر یا ۱۵۰ "
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ ۔	۱۲ امریکی ڈالر یا ۲۰۰ "

ترسیلِ زر: ماہنامہ میثاق لاہور، یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶ ۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۔ ۱۴ (پاکستان)، لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون : ۸۵۲۶۸۳

سب آفس : ۱۱ ۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی فون ۲۱۶۵۸۶

طابع : چوہدری رشید احمد مطبع : مکتبہ جدید پریس شاہراہ فاطمہ جناح، لاہور

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقتدار احمد

عرضِ احوال

ڈاکٹر شیر بہادر پنی..... آہ اب انہیں صاحب کی جگہ مرحوم و مغفور لکھنا پڑ رہا ہے..... سے ہمارے
رئین اچھے شناسا ہیں۔ ان کی بعض تحریریں اور بہت سے خطوط "میثاق" میں شائع ہوئے جن میں
موم اہم مسائل کی گرہ کشائی ہوتی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے معاملے میں وہ بالخصوص بہت
دحس اور جذباتی تھے۔ مولانا کے متعلق برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی کسی تحریر یا تقریر میں کوئی بات
جاتی..... اور ایسا ہوتا ہی رہتا تھا..... تو ڈاکٹر پنی کی طرف سے تائید و تصویب ' تنقید و تردید یا تصحیح و ترمیم
بذ ر ابھی کوتاہی نہ ہوتی۔ وہ ہماری جانب مائل ہی مولانا آزاد کے لئے اپنی عقیدت و محبت کی بنا پر ہوئے
تھے۔ برصغیر میں تحریک آزادی کے آخری دنوں میں ہی اپنے سیاسی نظریات اور جماعتی وابستگی کے
عث مولانا کی شخصیت مسلمانان ہند میں متنازعہ بن چکی تھی۔ ان سے بغض و عداوت کی ہوا چلنی شروع ہو
ل گئی تھی تاہم آزادی کے بعد تو ہمارے ملک میں ان کا نام ایک گالی بن گیا۔ نفرت اور اظہار برأت کی
یک آندھی تھی جس نے ان کے سارے علمی کام ' خدمت قرآن اور دعوت الی اللہ کی کل مساعی پر
ردوغبار کی دبیز چادر چڑھا دی۔ الہلال اور البلاغ کا حدی خواں ' جو ایک زمانے میں جسد ملت میں
ل کی طرح دھڑکتا تھا ' یوں فراموش کر دیا گیا جیسے اس کی یاد بھی ایک طرح کا الزام ہو..... ہمارے ہاں
ن کا ذکر آیا تو ڈاکٹر پنی کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا..... ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے بارہا وضاحت
ل ہے کہ وہ جس ابوالکلام آزاد کی حکایات سے لذت کام و دہن حاصل کرتے ہیں اس کا انڈین نیشنل
کانگرس کے صدر اور بعد از آں بھارت کے مرکزی وزیر سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں ان مولانا آزاد
مرحوم کے احسانات کے بار سے وہ سبک دوش نہیں ہو سکتے جو رواں صدی کے آغاز میں گھن گرج کے
ساتھ دعوت قرآنی لے کر اٹھے تھے۔ اس باب میں ڈاکٹر صاحب کے طرز عمل اور انداز فکر سے ہمارے
قارئین بخوبی آگاہ ہیں لہٰذا ہمیں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بتانا صرف یہ مقصود تھا
کہ ہمارے یہاں مولانا آزاد کے ذکر ' ان کے حق میں کلمۂ خیر اور اپنی دعوت رجوع الی القرآن کا تانا ان
کی دعوت قرآنی سے جوڑنے کے باعث ہی ان دونوں بزرگوں میں ربط و ارتباط کی وہ کیفیت پیدا ہوئی کہ
ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی دعوت ڈاکٹر پنی کو اپنے دل کی آواز لگی اور ذاتی علاقہ و محبت میں وہ اخلاص

ولگائمت پیدا ہوئی کہ موخرالذکر نے اپنی سب سے گراں مایہ متاع..... یعنی قیمتی کتب خانہ اور البلاغ اور الہلال کی نادر و نایاب مکمل فائلیں، اول الذکر کو اپنی زندگی میں ہی ہدیہ کر دیں..... ڈاکٹر شیر بہادر پنی پاکستان میں انگلیوں پر گنے جا سکنے والے ان چند افراد میں شامل تھے اور باقیات الصالحات کے اس زمرے میں شامل تھے جن کے کانوں میں اب بھی وہ اذان گونجتی تھی جو ۱۹۱۲ء۔۱۹۱۳ء میں کلکتہ سے بلند ہوئی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون ہم سب اسی راہ کے مسافر ہیں جو ہمارے رب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ "بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں"۔ ڈاکٹر پنی نے لگ بھگ نوے (۹۰) سال بھرپور زندگی گزاری۔ چند سال پہلے تک جوانوں کی طرح اپنے مطب میں فعال و متحرک نظر آتے تھے کہ اہلیہ نے ساتھ چھوڑا، جان جاں آفرین کے سپرد کر دی تو ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ رہا۔ ان کی دختر نیک اختر نے ایبٹ آباد میں ان کا کلینک بند کروا کے انہیں اپنے ساتھ پشاور آ جانے پر آمادہ کر لیا اور یوں والد کی خدمت کر کے اپنے لئے توشۂ آخرت فراہم کیا۔ پشاور سے بھی ہمیں ان کے گرامی نامے موصول ہوتے رہے اور آخری خط وہ تھا جو اسی اشاعت میں شامل ہے۔ اس سن و سال میں جو عمر کا ارذل حصہ کہلاتا اور بجا طور پر کہلاتا ہے، ان کا ذہن اتنا چوکس اور رہوار قلم اس قدر محکم تھا کہ پانچ فل سکیپ سائز کی اس تحریر میں نہ کہیں بے ربطی یا شکستگی نظر آتی ہے اور نہ اس ہاتھ میں رعشہ کے آثار نظر آتے ہیں جس نے قلم تھام رکھا تھا۔ عین ممکن ہے کہ یہ ان کی آخری باقاعدہ تحریر ہو۔ افسوس کہ اس درجہ تعلق قلبی کے باوجود ہم بے خبر رہے کہ جس خط کو "میثاق" کی آئندہ اشاعت میں شامل کرنے کے لئے ہم کمپوز کرا رہے ہیں اس کا لکھنے والا اس جہان فانی اور اس کے جملہ لوازمات سے بے نیاز ہو چکا ہے وہ اب ہماری اگلی اشاعت کا منتظر نہیں۔ اطلاع ملی تو ان کے ایک ہم جلیس کے مکتوب گرامی سے جو ان کے اور ہمارے مراسم سے واقف تھے۔ وہ خط بھی اسی پرچے میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ہم ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر پنی مرحوم کے لئے اب ہم دعائے مغفرت تو کر ہی سکتے ہیں۔ ادارہ اپنے قارئین سے التماس کرتا ہے (اور اس میں برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی درخواست بھی شامل ہے جو بر اطلاع نامہ پانے کے وقت بیرون ملک سفر پر روانہ ہونے کے لئے پابہ رکاب تھے) کہ ڈاکٹر شیر بہادر پنی مرحوم کے لئے خصوصی دعائے مغفرت کریں۔ اللهم اغفر له و ارحمه و ادخله فی رحمتک و حاسبه حسابا یسیرا۔ اللهم نوّر مرقده و اکرم منزله و الحقه بالصالحین آمین یا رب العالمین

قاضی عبدالقدوس صاحب کے خط سے قارئین کے سامنے یہ دل خراش واقعہ بھی آئے گا کہ ان کے تین لائق فائق بیٹوں میں سے کوئی بھی نہ آخری وقت سرہالیں موجود تھا' نہ نماز جنازہ میں شریک ہوا اور نہ شفیق و مہربان باپ کو مٹی دے سکا۔ ہمیں معلوم تھا اور کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر بی مرحوم کے "میثاق" میں شائع شدہ ایک خط کے ذریعے قارئین کے علم میں بھی یہ بات آچکی ہے کہ ان کی کل اولاد نرینہ ایک ایک کر کے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے شوق میں سات سمندر پار چلی گئی تھی اور پھر "سنہری زنجیروں" میں جکڑی گئی۔ ایک عرصہ یوں گزر گیا اور پھر بعد از خرابی بسیار باپ کے پرزور اصرار پر وہ واپسی پر آمادہ ہوئے تو کہانی کا باقی حصہ زیادہ ہی اندوہناک ثابت ہوا۔ انہوں نے یہاں آکر لاکھ ہاتھ پیر مارے کہ ناجائز و ناروا طور طریقوں کو اپنائے بغیر (جس کے وہ طویل عرصہ دیار مغرب میں گزار کر عادی نہ رہے تھے) محض اپنے علم اور فن کے بل پر اپنی معاش کے لئے مناسب و متبادل انتظام کر سکیں لیکن یہاں کا سنگ آستاں زیادہ ہی سنگین تھا' وہ سر پھوڑ تو سکتے تھے' گوہر مراد پانے کی کوئی صورت نہ بنی۔ چنانچہ باپ کو حسرت و یاس کی تصویر بنا چھوڑ کر واپس چلے گئے ...... یہ کہانی اب اتنی نامانوس نہیں رہی' ہمارے اردگرد ایسی بہت سی کہانیاں جنم لے رہی ہیں۔ دعا ہے کہ اب اللہ تعالیٰ انہیں ایسے کام ہی کرنے کی توفیق عطا فرمائے جس سے حرماں نصیب باپ کی روح کو تسکین ہو۔

ڈاکٹر بی مرحوم نے اپنے آخری خط میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے ہاتھ پر مولانا ابوالکلام آزاد اور ان ساتھیوں کی بیعت کے واقعے کو بے بنیاد اور من گھڑت قرار دیا ہے جس کا ذکر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے اس سلسلہ مضامین کے دیباچے میں کیا تھا جو اب " جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی " کے عنوان سے کتابی شکل میں آیا ہے۔ افسوس کہ ڈاکٹر بی مرحوم اس وضاحت کو پڑھنے کے لئے موجود نہیں تاہم افادۂ عام کے لئے عرض ہے کہ اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس اطلاع کے صواب میں کوئی حوالہ نہیں دیا تاہم انہوں نے یہ بات بس ایسے ہی نہیں لکھ دی۔ صورت حال یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب آج سے چار سال پہلے جب حیدر آباد دکن تشریف لے گئے تھے تو وہاں انہوں نے مولانا ابوالکلام انسٹی ٹیوٹ میں بھی سابق گورنر اکبر علی صاحب کے زیر صدارت ایک جلسہ کو خطاب کیا۔ اسی موقع پر انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری سے انہوں نے مولانا آزاد پر چند کتابیں نکلوا کر دیکھیں اور ایک کتاب میں اس اہم واقعہ کا ذکر ان کی نظر سے گزرا تھا۔ یہ پوری بات ان کے ذہن میں محفوظ ہے البتہ یہ سہواً ہوا کہ کتاب کا حوالہ نوٹ نہ کر سکے...... ہمیں معلوم ... ہو جاتا

ہے ' وہاں کے دوست اگر کرم فرمائیں تو ان کتابوں کو نکلوا کر ورق گردانی کریں اور ہمیں حوالہ فراہم کر دیں۔ ویسے بھی یاران نکتہ داں کے لئے صلائے عام ہے ' کسی صاحب علم و دانش کی اس واقعے کے اس سلسلے میں کوئی دید یا شنید ہو تو ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ کتاب کے اگلے ایڈیشن میں وضاحت کر دی جائے۔

☆ ☆ ☆

شادی بیاہ کے ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جو اصلاحی تحریک اپنے گھر سے شروع کی تھی ' لحمد للہ کہ وہ اب برگ و بار لا رہی ہے۔ لاہور میں مجالس نکاح کا مساجد میں منعقد ہونا تو خاصا ہی عام ہوا ' لڑکی والوں کے گھر میں کسی تقریب اور دعوت طعام کا اہتمام نہ ہونا بھی اب...... ایک محدود حلقے ہی میں سہی...... رواج پا رہا ہے۔ بات لاہور سے باہر بھی نکلی اور متعدد شہروں میں خود ڈاکٹر صاحب موصوف نے ایسے بہت سے نکاح پڑھائے ہیں جن میں اس اصلاح کو دل و جان سے قبول کیا گیا۔ لیکن حال ہی میں پشاور اور فیصل آباد میں یکے بعد دیگرے ایسی دو تقاریب ہوئیں جن میں حاضرین کی کثرت اور تاثر کی شدت نے انہیں قابل ذکر بنا دیا ہے۔ پشاور میں تنظیم اسلامی کے رفیق جناب وارث خاں کی شادی خانہ آبادی حسن اتفاق سے انہی دنوں کے لئے طے ہوئی جن دنوں امیر تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو متعدد دوسرے پروگراموں کے سلسلے میں شمالی علاقے میں ہی موجود ہونا تھا۔ ان کا نکاح ڈاکٹر صاحب نے جامع مسجد قاسم علی خاں ' قصہ خوانی بازار میں پڑھایا اور چونکہ حاضری سینکڑوں میں تھی لہٰذا موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اپنی اصلاحی تحریک کا بھرپور تعارف بھی کرایا۔ ملک کے شمالی علاقے میں شادی کی تقریب کا عمومی نقشہ ہمارے دین کے مزاج سے نزدیک تر تو ہے لیکن بس رواج کے طور پر۔ اور غلط نوع کے اضافے بہرحال وہاں بھی موجود ہیں۔ ان لوگوں کو غلط اور صحیح کی تفریق بھی سننے کو ملی اور یہ معلوم کر کے اطمینان بھی ہوا کہ صحیح حصہ دین کی باقیات صالحات میں سے ہے۔ تاہم مسجد میں نکاح ان کے لئے بھی نئی سی بات تھی جس کی برکات کی خوش گواری انہوں نے خود محسوس کی۔

فیصل آباد میں ہمارے محترم ساتھی ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کے ایک دوست ڈاکٹر عامر سرفراز کا نکاح پڑھانے کے لئے امیر تنظیم کو خاصی ہی مشقت جھیلنی پڑی۔ لیکن دولہا کا اصرار اتنا زوردار تھا اور انہوں نے ذاتی طور پر لاہور آ کر انہیں وعدے کے ایسے شکنجے میں کس لیا تھا کہ "بن آئے نہ بنے"۔ کمر کے درد اور مرض کی شدت میں اضافے کا خطرہ مول لے کر انہوں نے خاص اسی مقصد سے یہ سفر کیا۔ وہاں بھی مجلس نکاح مسجد میں منعقد ہوئی۔ دولہا ڈاکٹر اور دلہن کے والد شہر کے معروف وکیل ' ظاہر ہے کہ

حاضری کثیر ہی نہیں ' پڑھے لکھے اور شہر کے سنجیدہ و فہمیدہ طبقے پر مشتمل تھی۔ وہاں بھی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی اصلاحی تحریک کا مختصر تذکرہ کیا اور شرکاء کو تقریب کے اس انداز کی ظاہر و محسوس خوبیوں کا شعور دلایا لیکن اس ساری کدو کاوش کا حاصل وہ تاثر رہا جو دلہن کے والد نے بیان کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ آٹھ بچیوں کے باپ ہیں۔ تین کے ہاتھ پیلے کر چکے ہیں لیکن اس چوتھی بیٹی کی شادی ان کے لئے یادگار رہے گی بایں معنی کہ انہیں نہ کسی طرح کی پریشانی اٹھانی پڑی ' نہ کسی نوع کے ذہنی تناؤ سے دوچار ہونا پڑا ان گنت مسائل اور خرافات سے جان چھوٹی۔ کاش وہ اپنی باقی بچیوں سے بھی ایسے ہی فارغ ہو سکیں اور دوسرے لوگ بھی محض تماشائی نہ رہیں خود تماشا بنیں۔ اللہ تعالیٰ ان جوڑوں کے نئے گھروں کو رحمت و رافت کا گہوارا بنائے ' انہیں بھی اپنا تابع فرمان رکھے اور ان کی اولاد میں سے بھی صالح مسلمان اٹھائے۔ آمین

☆ ☆ ☆

ممتاز کالم نویس ' جناب ارشاد احمد حقانی نے موقر روزنامہ "جنگ" میں "قاضی حسین احمد اور جماعت کی قیادت سے" کے زیر عنوان ایک طویل مقالہ قلم بند کیا ہے۔ ہم اس کی اقساط کے اختتام کے انتظار میں سوکھا کئے۔ خدا خدا کر کے نو (۹) قسطوں میں "ختم شد" کا مرحلہ آیا ہے۔ حقانی صاحب کی محنت اور دل سوزی قابل قدر ہے اور حق یہ ہے کہ ان کے مشاہدات و تاثرات ' تجزیے ' تبصرے اور جماعت اسلامی کی قیادت سے معروضات پر کوئی سرسری سی بات کر دینا ' انصاف کا خون کر دینے کے مترادف ہو گا۔ راقم کا ارادہ تھا کہ اس مقالے کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے اپنی طرف سے بھی کچھ عرض کرے گا لیکن صحت کی مسلسل خرابی اس کی متحمل نہ ہوئی بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ ان اقساط کو تسلسل سے پڑھ بھی نہ سکا۔ اللہ نے صحت اور زندگی کی مہلت عطا فرمائی تو مفصل گفتگو پھر کبھی ' جس میں غالباً رنگ عمومی اتفاق کا ہی ہو گا۔ فی الحال صرف ایک بات کی نشاندہی مقصود ہے جو ابتدائی قسطوں میں ہی آ گئی اور اس وقت تک اپنی صحت بھی اس حد تک نہ گری تھی۔ حقانی صاحب نے آج کے مہذب اور ترقی یافتہ دور میں "ظواہر پرستی" کو دینی حلقوں کے (اور جماعت اسلامی کے بھی) عیوب میں شمار کیا اور انہیں دین کی برتر مصلحت کے خلاف قرار دیا ہے۔ ظواہر پرستی میں انہوں نے وضع قطع ' (کرتہ ٹوپی اور ٹخنے سے اوپر پاجامے وغیرہ) شکل وصورت (بالخصوص داڑھی مونچھ) اور خواتین کے معاملے (حجاب اور برقعہ وغیرہ اور حقوق نسواں) کو کہیں نام لے کر اور کہیں اشارۃً شامل کیا ہے...... اور اپنے موقف کی تائید میں مولانا مودودی مرحوم کی تحریروں میں سے بھی پیرے کے

رے اس وضاحت کے ساتھ نقل کئے ہیں کہ اس روشن خیالی کے باوجود مولانا خود اپنی جماعت میں یہ
ش عام نہ کر سکے "پرانی ڈگر پر ہی چلتے رہے گویا ؎

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم وقیود تھا

اس سلسلے میں ہماری گزارش کا پہلا حصہ تو یہ ہے کہ ہمارا دین ظاہر و باطن سمیت ایک کل ہے۔ اس
و اجزاء میں تقسیم کرنا اور پھر رد و اختیار کا حق طلب کرنا نہ صرف یہ کہ کسی بھی درجے میں قابل قبول نہیں
لکہ اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ دیکھئے خدائی وعید کے کیا تیور ہیں۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ط فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (البقرۃ : ۸۵)

"کیا تم کتاب کے بعض حصے پر ایمان رکھتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو۔ پس ایسے شخص کی جزاء
جو یہ حرکت کرے، اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں اسے ذلیل و خوار کر دیا جائے اور
آخرت میں اسے شدید ترین عذاب کی طرف لوٹا دیا جائے"۔

کہا جا سکتا ہے کہ ایسے ظواہر کو ہم پھر جزو دین بنا رہے ہیں جن کو یہ حیثیت نہ دینے کی کوشش میں
حقانی صاحب نے استدلال کا خاصا زور لگایا ہے۔ لیکن جن ظواہر سے بیزاری مقالے میں جھلکتی ہے اور جو
ہمارے "اسلام پسند" دانشوروں کا بھی مشترک مسئلہ ہیں ان کا مقام دین میں اصول و نصوص کا تو شائد
نہ ہو لیکن ان سے سمت اور تشخص کا ضرور تعین ہوتا ہے ؏

قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

اور ان کی ایک حیثیت اور بھی ہے۔ یہ اس تعلق خاطر، محبت اور اتباع کی خواہش کا بھی مظہر ہیں جو ہر
مسلمان کے دل میں "مرکز ملت" محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے موجود اور روز بروز فزوں تر
ہونی چاہئے۔ حضورؐ سے یہ تعلق نصوص کی رو سے بھی ایمان و اسلام کی شرط لازم ہے اور انسانی فطرت
و جبلت کے اعتبار سے بھی ایک عملی ضرورت...... پھر ذرا یہ بھی خیال فرمائیے کہ ظواہر پرستی کا یہ انداز چودہ
صدیاں پہلے ہی کے مخصوص حالات میں اختیار اور ہمارے لئے معیار مقرر نہیں کیا گیا، آج کی روشن دنیا
میں بھی اسی طرح کی ظواہر پرستی کا رواج ہے۔ مقالہ نگار نے کئی اور زاویوں سے ایرانی انقلاب کی مدح کی
ہے (اور بیشتر بجا بھی ہے) لیکن اس زاویے سے انہوں نے جدید ایران پر نظر کیوں نہ دوڑائی کہ دور

(باقی صفحہ پر)

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن کا سلسلہ

الہدیٰ

درس ۱۱، نسست ۱

مباحثِ عمل صالح

اسلام کا معاشرتی اور سماجی نظام

(سورۃ بنی اسرائیل کی آیات ۲۳ تا ۴۰ کی روشنی میں)

(۱)

السلام علیکم...... الحمد للہ و کفی و الصلوٰۃ و السلام علیٰ عبادہ الذی اصطفیٰ اما بعد

محترم حاضرین اور معزز ناظرین...... مطالعۂ قرآن مجید کے جس منتخب نصاب کا درس ان مجالس میں ہو رہا ہے' اس کا سبق نمبر ۱۳ سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۲۳ تا ۴۰ پر مشتمل ہے۔ یہ آیاتِ مبارکہ اس سورۃ کے تیسرے اور چوتھے رکوع میں شامل ہیں...... اس سبق کا عنوان یا موضوع ہے "اسلام کا معاشرتی اور سماجی نظام۔"

اس درس پر گفتگو کے آغاز سے قبل اگر ہم ان مضامین کا جو اس سے پہلے دروس میں بیان ہو چکے ہیں مختصر طور پر اعادہ کر لیں تو مباحث کی کڑیاں جوڑنے میں آسانی ہو گی۔ آپ حضرات کو یاد ہو گا کہ مطالعۂ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کا پہلا حصہ چار جامع اسباق پر مشتمل تھا۔ جن میں اُخروی نجات کے چار ناگزیر لوازم یعنی ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا بیان تھا۔ دوسرے حصے میں پانچ سبق تھے جن کا 'ایمان' مرکزی موضوع تھا۔ تیسرے حصے میں "عمل صالح" کی تشریح و توضیح چل رہی ہے۔ یعنی قرآنی تعلیمات کا جو

عملی پہلو ہے اس کا بیان جاری ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ہم نے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ انفرادی طور پر ایک بندۂ مومن کی سیرت و کردار میں اللہ تعالیٰ کو کون سے اوصاف محبوب ہیں۔ اس کے لئے ہم نے سورۂ مومنون کی ابتدائی آیات اور سورۂ معارج کی ہم مضمون آیات کے حوالے سے یہ سمجھا کہ انفرادی سیرت کی تعمیر کے ضمن میں قرآن مجید کیا اصول بیان کرتا ہے اس کی کیا اساسات معین کرتا ہے۔ پھر سورۂ فرقان کے آخری رکوع میں ہم نے پوری طرح تعمیر شدہ شخصیت یعنی علامہ اقبال کے مردِ مومن اور قرآن مجید کی اصطلاح میں "عباد الرحمٰن" کی سیرت و کردار کے خدوخال کا مطالعہ کیا کہ وہ کیا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف پہلے قدم یعنی خاندانی زندگی اور عائلی زندگی کے ضمن میں ہم نے پوری سورۂ تحریم کا مطالعہ کیا...... اب ہم ایک قدم اور آگے بڑھ رہے ہیں خاندانوں سے معاشرہ وجود میں آتا ہے جسے ہم سماج سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ اس معاشرے کے ضمن میں قرآن مجید ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے!۔ یا بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ قرآن مجید کی رو سے وہ معاشرتی اقدار کون سی ہیں وہ 'SOCIAL VALUES' کون سی ہیں جنہیں اسلام چاہتا ہے کہ ان کی ترویج و تنفیذ ہو۔ انہیں معاشرے میں رائج PROMOTE کیا جائے۔ اور اس کے برعکس وہ سماجی برائیاں کون سی ہیں! وہ 'SOCIAL EVILS' کون سی ہیں کہ جن کے متعلق اسلام چاہتا ہے کہ ان کو معاشرے سے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے 'ان کا استیصال ہو' ان کو معاشرے میں پنپنے نہ دیا جائے۔ یہ مضامین ہیں جو ان اٹھارہ آیات میں ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔

یہ بات بھی پیش رکھئے کہ سورۂ بنی اسرائیل قرآن مجید کے قریباً وسط' میں وارد ہوئی ہے۔ پندرھویں پارے کا آغاز اسی سورۂ مبارک سے ہوتا ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کے ابتداء اور اختتام پر بنی اسرائیل کی تاریخ کے اہم واقعات کا بیان ہے۔ اور درمیان یعنی تیسرے اور چوتھے رکوعوں میں تورات کی تعلیمات کا خلاصہ درج ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہ بات حبرالامۃ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمائی کہ ان آیات میں تورات کے "TEN COMMANDMENTS" یعنی احکام عشرہ QURANIC VERSION

آ گیا ہے۔

ایک اور بات بھی پیشِ نظر رکھئے کہ زمانۂ نزول کے اعتبار سے سورہ بنی اسرائیل مکی دور کے آخری زمانے میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے چنانچہ اس کی پہلی آیت میں واقعہ معراج کاذکر ہے سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ درمیان میں بھی ایک مقام پر معراج کے واقعہ کا تذکرہ ہے۔ معراج میں ہوا اللہذایہی اس سورہ مبارکہ کازمانہ نزول ہے گویا کہ ہجرت سے متصلاً قبل۔

اب ذرا یہ نوٹ کیجئے کہ مکہ میں مسلمان کمزور تھے۔ وہاں کفر کا پوری طرح غلبہ تھا لیکن ہجرت کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مدینہ منورہ میں ایک آزاد اسلامی معاشرہ وجود میں آنے والا تھا یا یوں کہئے کہ ایک اسلامی حکومت قائم ہونے والی تھی جہاں مسلمان اپنی آزادی اور اپنے اختیار سے جن چیزوں کو چاہیں رائج کریں' ان کی تنفیذ کریں' انہیں PROMOTE کریں اور جن چیزوں کو چاہیں ان کو روکیں' ان کو مٹائیں اور ان کا استیصال کریں۔ اس اعتبار سے جدید اصطلاح میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان آیات مبارکہ میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشور (MANIFESTO) آ رہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ حضورؐ کو غلبہ عطا فرمائے جیسے کہ سورہ حج کی اس آیت میں وارد ہوا اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (آیت ۴۱) "وہ لوگ جنہیں اگر زمین میں غلبہ عطا فرمائیں تو وہ نظامِ اقامتِ صلوٰۃ قائم کریں گے' زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے اور نیکیوں کا حکم دیں گے اور بدیوں سے روکیں گے" ...... گویا یہ اسی آیت کی شرح ہے جو سورہ بنی اسرائیل کی زیر مطالعہ آیات میں ہمارے سامنے آ رہی ہے کہ وہ اوامر کون سے ہیں کہ جن کی وہاں ترویج و تنفیذ ہو گی۔ وہ نواہی کون سے ہیں کہ جن کا اس معاشرے میں استیصال کیا جائے گا۔ اس اعتبار سے اس سبق کی بڑی اہمیت ہے کہ ہم اس کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی حکومت کے قیام کے لئے یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منشور ہے۔

اب آیئے ہم ان آیاتِ مبارکہ کی تلاوت بھی کر لیں اور اس کا ترجمہ بھی ساتھ ساتھ

کرتے چلیں تاکہ پہلے بیک نظر ہمارے سامنے وہ مضامین آجائیں جو ان آیات مبارکہ میں آ رہے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک ایک کو لے کر کسی قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو ہوگی۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ اور تیرے رب نے طے فرمادیا ہے کہ مت بندگی کرو کسی کی سوائے اس کے" وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا "اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو" اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ اَوْ کِلٰھُمَا "اگر پہنچ ہی جائیں تمہارے پاس بوڑھاپے کی عمر کو ان میں سے کوئی ایک یا دونوں" فَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ "تو انہیں اف تک نہ کہو۔" وَلَا تَنْھَرْھُمَا "اور نہ انہیں جھڑکو"۔

وَقُلْ لَّھُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا○ "اور ان سے بات کرو نرمی اور ادب کے ساتھ"۔

وَاخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَۃِ "اور ان کے سامنے اپنے شانیں نیازمندی اور ادب کے ساتھ جھکا کر رکھو"۔ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْھُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا○ "اور یہ دعاء کیا کرو کہ اے رب میرے! ان دونوں پر رحم فرمایئے کہ انہوں نے مجھے پالا پوسا جبکہ میں چھوٹا سا تھا"...... رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِکُمْ "تمہارا رب خوب جانتا ہے جو کچھ کہ تمہارے جی میں ہے"۔ اِنْ تَکُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ "اگر تم واقعتاً نیک ہوئے"۔ فَاِنَّہٗ کَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا تو یقیناً اللہ تعالیٰ رجوع کرنے والوں کے حق میں بہت مغفرت کرنے والا' بخشنے والا ہے"۔ وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّہٗ "اور رشتہ دار کو اس کا حق ادا کرو"۔ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ "اور محتاج کو بھی اور مسافر کو بھی (اپنے مال میں سے دو)"۔ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا "اور اپنی دولت کو نام و نمود اور نمائش کے لئے نہ اڑاؤ" اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ "یقیناً جو لوگ اپنی دولت نمود و نمائش کے لئے اڑاتے ہیں وہ شیطانوں کے بھائی ہیں۔" وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوْرًا○ "اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا اور نافرمان ہے"۔ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْھُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَۃٍ مِّنْ رَّبِّکَ تَرْجُوْھَا "اور اگر تمہیں ان سے اعراض کرنا ہی پڑے اس لئے کہ تم اللہ کی رحمت کے امیدوار ہو"۔ فَقُلْ لَّھُمْ قَوْلًا مَّیْسُوْرًا○ "تو ان سے بات نرمی سے کرو"...... وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ "اور اپنے ہاتھ کو نہ تو

گردن کے ساتھ باندھ کر چھوڑو۔" وَلَا تَبۡسُطۡهَا كُلَّ الۡبَسۡطِ فَتَقۡعُدَ مَلُوۡمًا مَّحۡسُوۡرًا "اور نہ اس کو بالکل ہی کھول دو کہ پھر تمہیں بیٹھ رہنا پڑے تھک ہار کر اور ملامت زدہ ہو کر"۔ اِنَّ رَبَّكَ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَ يَقۡدِرُ‌ؕ "یقیناً تیرا رب ہی رزق کو کشادہ بھی کرتا ہے اور تنگ بھی کرتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے" اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيۡرًۢا بَصِيۡرًا ۞ "یقیناً وہ اپنے بندوں کے حالات سے باخبر بھی ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے"۔ وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ خَشۡيَةَ اِمۡلَاقٍ‌ؕ "اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو"۔

نَحۡنُ نَرۡزُقُهُمۡ وَاِيَّاكُمۡ‌ؕ "ہم ہی ان کو بھی رزق دینے والے ہیں اور خود تمہیں بھی"۔ اِنَّ قَتۡلَهُمۡ كَانَ خِطۡاً كَبِيۡرًا ۞ "یقیناً ان کو قتل کرنا بہت بڑی خطا ہے"۔ وَلَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيۡلًا ۞ "اور زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو یقیناً وہ بڑی بے حیائی اور بہت ہی گھناؤنا راستہ ہے"۔ وَلَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِىۡ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالۡحَـقِّ‌ؕ "اور نہ قتل کرو کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھرایا ہے مگر قانون کے تحت حق کے ساتھ" وَمَنۡ قُتِلَ مَظۡلُوۡمًا فَقَدۡ جَعَلۡنَا لِوَلِيِّهٖ سُلۡطٰنًا فَلَا يُسۡرِفْ فِّى الۡقَتۡلِ‌ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنۡصُوۡرًا "اور جو کوئی مظلومانہ قتل ہو جائے تو ہم نے اس کے ورثہ کو 'اس کے ولی کو ایک اختیار عطا فرمایا ہے تو وہ قتل میں حد سے نہ بڑھے یقیناً اس کی مدد کی جائے گی" وَلَا تَقۡرَبُوۡا مَالَ الۡيَتِيۡمِ اِلَّا بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ حَتّٰى يَبۡلُغَ اَشُدَّهٗ‌ "اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ پھٹکو مگر بہترین طور پر تا آنکہ وہ بالغ ہو جائے"۔ وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ‌ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا ۞ "اور عہد کو پورا کرو 'وعدے کو وفا کرو۔ یقیناً عہد کے بارے میں باز پرس ہو گی"۔ وَاَوۡفُوا الۡـكَيۡلَ اِذَا كِلۡتُمۡ اور جب ماپ کر دو تو پیمانہ پورا بھرو"۔ وَزِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِيۡمِ‌ " اور جب تولو تو سیدھی ڈنڈی کے ساتھ تولو۔ ذٰ لِكَ خَيۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِيۡلًا یہی عمدہ طرز عمل ھے اور انجام کار کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔" وَلَا تَقۡفُ مَا لَـيۡسَ لَـكَ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ "اور اس چیز کی پیروی مت کرو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے"۔ اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۤئِكَ كَانَ عَنۡهُ مَسۡـُٔوۡلًا "یقیناً سماعت اور بصارت اور قلب و ذہن کی جو استعدادات تمہیں عطا کی گئی ہیں 'ان کے بارے میں حساب لیا جائے گا' باز پرس ہو گی" ...... وَلَا تَمۡشِ فِى

الْاَرْضِ مَرَحًا "اور زمین میں اکڑ کر مت چلو"۔ اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا "یقیناً تم نہ تو زمین کو پھاڑ سکتے ہو نہ ہی اونچائی اور بلندی میں پہاڑوں کو پہنچ سکتے ہو"۔ کُلُّ ذٰلِکَ کَانَ سَیِّئُہٗ عِنْدَ رَبِّکَ مَکْرُوْھًا "ان تمام باتوں میں جو برائی کے پہلو ہیں وہ تمہارے رب کو نہایت ناپسند ہیں"۔ ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰٓی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَۃِ "اے نبی! صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں وہ باتیں جو آپؐ کی جانب آپ کے رب کی طرف سے وحی کی گئی ہیں از قسم حکمت' از قسم دانائی"۔ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ "اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود مت ٹھہرا بیٹھنا"۔ فَتُلْقٰی فِیْ جَھَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ "کہ پھر جھونک دیئے جاؤ جہنم میں ملامت زدہ ہو کر دھکے دیئے جا کر"۔ اَفَاَصْفٰکُمْ رَبُّکُمْ بِالْبَنِیْنَ "کیا تمہارے رب نے تمہیں کو چن لیا ہے بیٹوں کے لئے"۔ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ اِنَاثًا "اور خود ملائکہ کی صورت میں بیٹیاں اختیار کر لی ہیں"۔ اِنَّکُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِیْمًا "یقیناً تم ایک بہت بڑی بات کہہ رہے ہو"......
صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْم۔

ان آیات کے ترجمے سے جو مضامین ہمارے سامنے آئے' ان کے ضمن میں مجھے یقین ہے کہ آپ حضرات نے محسوس کیا ہو گا کہ اکثر مضامین وہی ہیں جو اس سے قبل اس منتخب نصاب کے مختلف اسباق میں آ چکے ہیں۔ مثلاً شرک کی مذمت و ممانعت سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں بیان ہو چکی۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر بھی اسی رکوع کے سبق میں آ چکا ہے۔ اقربا' یتامیٰ اور مساکین کے ساتھ نیک سلوک اور ان کی احتیاجوں کے رفع کرنے میں اپنا مال خرچ کرنے کے مضامین آیۂ بر میں بھی آئے جو ہمارا سبق نمبر ۳ تھا اور پھر سورۂ معارج میں آ چکا ہے فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم ۔ اسی طریقہ سے قتل ناحق کی مذمت و ممانعت سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں آ چکی ہے۔ زنا کی شناعت کا ذکر بھی اسی سبق میں آ چکا ہے۔ ایفائے عہد کی تاکید آیہ برّ میں بھی آئی اور اس کا ذکر سورہ مومنون و معارج کی ہم مضمون آیات میں بھی آیا ہے۔ تکبر اور غرور کی مذمت اور تواضع' فروتنی اور حلم کی تلقین سورۂ لقمان کے سبق میں بھی آ چکی ہے اور یہی مضمون سورۃ الفرقان میں مثبت پیرائے میں بایں الفاظ آ چکا ہے وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض

ہو نا " اللہ کے محبوب بندہ وہ ہیں جو زمین پر آہستگی اور فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں۔ "

یہ ہیں وہ مضامین جو بار بار آئے ہیں لیکن میں آج چاہتا ہوں کہ آپ چند باتیں نوٹ کر لیں۔ قرآن مجید میں اگر مضامین کی تکرار آتی ہے تو اس سے اولاً تو ان مضامین کی اہمیت کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے۔ ثانیاً تکرار محض کہیں نہیں ہوتی۔ تکرارِ محض کلام کا عیب شمار ہوتا ہے۔ قرآن مجید اس عیب سے پاک ہے۔ اگر کہیں دوہرا کر مضمون آتا ہے تو اسلوب بدلا ہوا ہوتا ہے۔ وہی بات کہ

ع اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

اس انداز بیان اور اسلوب کے فرق سے اس کلام کی دل نشینی' دل آویزی اور اثر انگیزی اور اثر پزیری میں اضافہ ہوتا ہے۔ ثالثاً یہ بھی آپ کو ملے گا کہ موضوع تو مشترک ہے لیکن کہیں تو وہ انفرادی سیرت کردار کے ضمن میں آرہا ہے اور کہیں وہ ہی بات معاشرتی اور سماجی اقدار کی حیثیت سے سامنے لائی جارہی ہے۔ علاوہ ازیں رابعاً یہ بات ہے کہ جہاں بھی کوئی مضمون دوہرا کر آتا ہے تو اگر اسے نظر غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کوئی نہ کوئی نیا پہلو وہاں مل جائے گا۔ یہ چار امور وہ ہیں کہ اگر قرآن مجید میں کہیں تکرار محسوس ہو تو آپ ان میں سے کسی نہ کسی ایک بات کو وہاں موجود پائیں گے۔ ان سب کو جمع کر کے میں سورۂ زمر کی ایک آیت کی طرف اشارہ کر رہا ہوں" جس میں قرآن مجید ان الفاظ مبارکہ میں اپنا تعارف کراتا ہے کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ "یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے مضامین باہم مماثل ہیں اور دوہرا دوہرا کر آتے ہیں" ۔ بقول

ع شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

اگر اس طرح سمجھ میں نہیں آیا تو شاید دوسرے انداز سے سمجھ میں آجائے۔

آج اسی پر اکتفا کیجئے۔ اب آئندہ نشست میں ان آیات میں جو اہم مضامین آئے ہیں' ان پر ان شاء اللہ العزیز سلسلہ وار گفتگو ہوگی۔ اس وقت جو کچھ عرض کیا گیا ہے' اس کے ضمن میں کوئی وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال وجواب

سوال..... ڈاکٹر صاحب! آپ نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں بعض مضامین کو بار بار

دوہرایا گیا ہے تاکہ لوگوں پر اثرانداز ہو سکیں لیکن اس کے باوجود بھی کوئی شخص اس کی ہدایت پر عمل نہیں کرتا تو اس کے لئے کیا حکم ہے۔ ؟

جواب...... ظاہر بات ہے کہ ہر طرح سمجھانے کے باوجود کوئی شخص نہیں مان رہا تو دو ہی حالتیں ہین یا تو وہ اسلام کے دائرے سے باہر ہے تو گویا وہ کفر ہی میں رہے گا' اسلام کے دائرہ میں نہیں آئے گا۔ اگر مسلمان ہے تو وہ فاسق و فاجر مسلمان شمار ہو گا اور اپنے گناہوں کی سزا اللہ کے یہاں پائے گا۔

سوال...... آپ نے آغاز میں فرمایا تھا کہ ان آیات میں تورات کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے تو کیا شریعت ہر دور میں یکساں رہی ہے ؟

جواب...... اصل میں شریعت کا لفظ ایک معین مفہوم رکھتا ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دین کی بنیادی تعلیمات ہمیشہ ایک ہی رہی ہیں۔ حضرت آدم سے لے کر جناب محمد تک صلی اللہ علیہ وسلم وعلیہ الصلوۃ والسلام۔ البتہ جو دین کا قانون تفصیلی صورت میں ہے اس میں کچھ معمولی تغیر و تبدل ہوا ہے۔ صلواۃ ہمیشہ رہی ہے لیکن اس میں فرق واقع ہوا ہے۔ صوم ہمیشہ سے شریعت کا جزو رہا ہے۔ لیکن صوم کے تفصیلی احکام مختلف ہو سکتے ہیں۔ باقی جہاں تک بنیادی اخلاقیات کا تعلق ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ان میں تو کسی تبدیلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا قرآن مجید کا تو فلسفہ ہے ہی یہ کہ اخلاقی اقدار مستقل ہیں' دائم ہیں۔ 'ETHICAL VALUES' میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ چنانچہ دین کی بنیادی تعلیمات اور اساسی اخلاقیات ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہیں اور انہی کا ایک جامع ملخص ہے جو ان آیات میں ہمارے سامنے آیا ہے۔

حضرات! جیسا کہ میں نے عرض کیا آج سورہ بنی اسرائیل کے تیسرے اور چوتھے رکوعوں کی آیات کا مجموعی طور پر اجمالی جائزہ لینے کے بعد اب آئندہ نشست میں انشاء اللہ ان میں جو اہم نکات ہیں ان پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو ہو گی۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

قرآن وسنّت کی روشنی میں انقلابی تربیّت وتزکیہ

بسلسلہ موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا طریقِ کار، انقلاب نبویؐ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد کے خطباتِ جمعہ کا سلسلہ
ترتیب وتسوید: شیخ جمیل الرحمٰن

(آخری قسط)

اِنفاق کی اہمیت

تیسری چیز مال کی محبت کا دل سے نکالنا ہے جو کسی وقت بھی ترغیب (TEMPTATION) کا سبب بن سکتی ہے۔ دشمن مال کا لالچ دے کر شب خون مار سکتا ہے۔ اس محبت کو قابو میں رکھنے کے لئے اللہ کی راہ میں انفاق کرو۔ مال خرچ کرو، زیادہ سے زیادہ دو۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ میں جس دور کی بات کر رہا ہوں وہ مکی دور ہے۔ اس میں زکوٰۃ کا نظام فرض نہیں ہوا تھا۔ زکوٰۃ کا مکمل نظام مدنی دور میں فرض ہوا تھا۔ پانچ وقتہ نماز کا نظام ۱۱ نبوی میں بنا ہے گویا ہجرت سے ایک ڈیڑھ سال پہلے۔ لیکن زکوٰۃ کا نظام مکی دور میں سرے سے موجود نہیں تھا۔ البتہ اِنفاق پر بہت زور رہا ہے۔ خرچ کرو، اللہ کی راہ میں دو، صدقات اور زکوٰۃ کو جمع کر لیجئے تو یہ انفاق بن جائے گا۔ ہمارے یہاں بعد میں صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ کی جو تقسیم ہوئی ہے وہ اس وقت موجود نہیں تھی، لیکن انفاق کی بڑی تاکید تھی کہ اللہ کی راہ میں لگاؤ اور خرچ کرو تاکہ مال کی محبت دل سے کھرچی جائے اور دشمن کسی وقت بھی مال کی پیشکش کر کے اور لالچ دے کر حزب اللہ کے کسی کارکن کے قدموں کو ڈگمگا نہ سکے۔

شہوانی جذبات پر قابو

کسی مادی انقلاب اور اسلامی انقلاب کے نظام تربیت میں اپنے نظریہ کے ساتھ شعوری اور

والہانہ وابستگی، انقلابی جدوجہد میں فقر و فاقہ کی برداشت اور اس کی راہ میں مال کے انفاق کی ضرورت جیسے اوصاف مشترک نظر آئیں گے البتہ ایک چیز ایسی ہے جس پر مادی انقلاب کے لئے جدوجہد کرنے والوں پر سرے سے کوئی قدغن نہیں لگائی جاتی اور وہ ہے انسان کا جذبۂ شہوت۔ خالص مارکسٹ نظریہ میں اس کا قطعی کوئی تصور نہیں ہے کہ آزاد شہوت رانی کوئی برا کام ہے۔ وہاں تو یہ یہ تصور دیا گیا ہے کہ جیسے انسان کو پیاس لگے اور وہ جہاں سے چاہے پانی پی کر پیاس بجھائے۔ اسی طریقہ سے کامریڈ مرد اور کامریڈ عورتیں جیسے بھی چاہیں اپنے جذبہ شہوت کی تسکین کر لیں۔ اس میں کسی ڈسپلن یا اخلاقی پابندی کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن اسلام کا نظام تربیت اس پر پابندی کو بڑی اہمیت دیتا ہے سورہ مومنون کی ابتدائی آیات میں اہل ایمان میں تزکیہ و تربیت کے اعتبار سے مطلوب اوصاف حمیدہ میں دیگر اوصاف کے ساتھ شہوانی جذبات پر قابو پانے کا ذکر بھی موجود ہے۔

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ○ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ○ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ○ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ○ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ○ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ○ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ○

"یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں، لغویات سے دور رہتے ہیں، زکوٰۃ کے طریقے پر عامل ہوتے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کے ملک یمین میں ہوں کہ ان پر محفوظ نہ رکھنے میں وہ قابل ملامت نہیں ہیں البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔"

اسلام میں جنسی جذبہ کی تسکین اپنی جگہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ اس جذبہ میں بنیادی طور

پر کوئی شر نہیں ہے۔ اس کے غلط راستے اور استعمال میں شر ہے۔ اگر انسان اس جذبہ کو کنٹرول میں نہیں رکھ سکتا تو وہ اسلامی انقلابی جماعت کا کارکن نہیں بن سکتا۔ کسی مادی و دنیوی انقلاب میں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اس جبلی جذبہ پر قدغنیں لگائی جائیں۔ لیکن اسلامی انقلابی تربیت میں اس جذبہ کو کنٹرول میں رکھنے کی بہت اہمیت ہے جو قرآن مجید میں بار بار بڑے شدّومد کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ قرآن میں کبیرہ گناہوں کی جو فہرست گنوائی گئی ہے اس میں ترتیب کے اعتبار سے شرک اور قتل ناحق کے بعد تیسرا بڑا جرم زنا یعنی آزاد شہوت رانی کو قرار دیا گیا ہے۔ جنسی جذبے کی تسکین و تکمیل کے حوالے سے سورہ معارج میں بھی بالکل وہی الفاظ آئے ہیں جو سورہ مومنون میں وارد ہوئے ہیں۔

اسلامی اور خانقاہی نظام ہائے تربیت کا تقابلی جائزہ

قرآن اور سنت رسول سے اسلامی انقلابی جماعت کے نظام تربیت کے جو اجزاء ملتے ہیں وہ سارے ہمارے خانقاہی نظام تزکیہ و تربیت میں بھی موجود ہیں لیکن عموماً ان کا انقلابی اور حرکی پہلو بڑی حد تک معدوم ہو گیا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے اپنے اشعار میں کئی مقامات پر اس فرق کو بڑی عمدگی سے واضح کیا ہے...... مثلاً ۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات!
وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ خدا مست
یہ مذہبِ ملاّ و جمادات و نباتات

یا جیسے انہوں نے کہا ہے کہ ۔

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری!
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری!
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری!
اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری!

اسی بات کو علامہ نے یوں بھی تعبیر کیا ہے کہ ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

کسی عام مسلمان کا گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ اکبر کی تسبیح کی گردان ہے۔ اور ایک مجاہد کا باطل اور طاغوت کو للکارنے کے لئے میدان جنگ میں اللہ اکبر کا نعرہ ہے۔ الفاظ و معانی ایک ہی ہیں لیکن موقع و محل کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مجاہد اس عالم تشریعی میں اللہ کی کبریائی کو بالفعل قائم کرنے کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آیا ہے۔ جبکہ ایک صوفی منش اپنے روحانی ترفع کے لئے کسی گوشہ تنہائی میں اللہ اکبر کی گردان کر رہا ہے۔

کشمکش اور تصادم

انقلابی تزکیہ اور تربیت کا تیسرا عنصر معاشرے میں قائم نظام باطل کے ساتھ کشمکش اور تصادم ہے۔ آپ نے کسی معاشرے میں قائم و رائج نظام کے متعلق جب یہ کہا کہ یہ غلط ہے تو معاشرہ کی طرف سے آپ کے خلاف رد عمل ہو گا آپ کا مذاق اڑایا جائے گا پھر جسمانی تشدد و تعزیب کا مرحلہ آئے گا دست درازی ہو گی' مارا پیٹا جائے گا۔ سوشل بائیکاٹ ہو گا۔ محصوری و اسارت سے واسطہ پڑے گا جب یہ سارے کام ہوں گے تب ہی مطلوبہ انقلابی تربیت ہو گی۔ اگر یہ عنصر سرے سے شامل نہیں ہے تو جان لیجئے کہ انقلابی تربیت ہو ہی نہیں رہی۔ فرض کیجئے کہ ایک خانقاہی نظام ہے' اس میں کوئی بڑے شیخ وقت ہیں...... میں اس وقت کسی دوکاندار پیر یا نام نہاد صوفی کی بات نہیں کر رہا...... بلکہ مثال دے رہا ہوں کسی ایسے شیخ طریقت کی جو واقعی حق پرست ہو۔ خداترس ہو...... ظاہر ہے کہ وہ تو اپنی خانقاہ میں بیٹھے ہیں۔ وہ کسی کے در پر جا کر دستک نہیں دیتے۔ وہ خود دعوت و تبلیغ نہیں فرماتے۔ وہ کہیں سڑک پر اور کسی مجمع میں جا کر باطل کے خلاف صدا بلند نہیں کرتے۔ وہ تو اپنی اس خانقاہ کی چہار دیواری میں ہیں۔ جو طالب ہو گا وہ خود چل کر وہاں آئے گا۔ ظاہر بات ہے کہ تزکیہ و تربیت کا یہ طالب حضرت شیخ کی کچھ خدمت بھی کرے گا۔ دعوت کے انداز میں اس بنیادی فرق کی وجہ سے وہ مصیبتیں جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ کے معدودے چند جان نثار مکہ کی گلیوں میں جھیل

رہے تھے، وہ بھی اس خانقاہی نظام میں پیش نہیں آئیں گی۔ خانقاہ کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر اس کا تزکیہ اور تربیت کرنا اسے سلوک کے مراحل طے کرانا، اسے وظائف اور اوراد واشغال بتانا بالکل مختلف انداز کی تربیت ہے اور میدان عمل میں کشمکش کا سامنا کرنے کی تربیت بالکل اور طرح کی تربیت ہے جیسے آپ کسی شخص کو خشکی پر تیرنے کے تربیت نہیں دے سکتے۔ اسی طرح انقلابی تربیت گوشوں میں بیٹھ کر نہیں ہو سکتی۔ انقلابی تربیت کے لئے پہلے ہی قدم پر میدان میں آنا پڑے گا۔ جیسے ہی آپ نے دعوت و تبلیغ شروع کی، جیسے ہی آپ نے غلط کو غلط کہا۔ جیسے ہی آپ نے احقاق حق اور ابطال باطل کا نعرہ بلند کیا اور اس عزم کا بالفعل اظہار شروع کیا اسی وقت معاشرہ سے آپ کا تصادم شروع ہو جائے گا۔ آپ نے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی باتوں پر روک ٹوک شروع کی کہ اسلام کی رو سے یہ غلط ہیں، یہ بدعات ہیں، یہ تمہاری گھڑی ہوئی بُری رسومات ہیں۔ فوراً تصادم شروع ہو جائے گا۔ یہ تصادم اگر شروع نہیں ہوتا تو انقلابی تربیت کے تیسرے انتہائی اہم عنصر کا مرحلہ آئے گا ہی نہیں۔ البتہ خانقاہی تربیت اس کے بغیر ہو سکتی ہے۔ اس خانقاہی تربیت کے اپنے بہت سے فوائد ہیں۔ میں ان میں سے کسی کی بھی نفی نہیں کر رہا۔ لیکن اس نظام کا تربیت یافتہ شخص میدان میں آکر باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے کبھی للکارے گا نہیں۔ پھر وہی صورت ہو جائے گی۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیلؑ کو حکم دیا کہ فلاں فلاں بستیوں کو ان کے رہنے والوں سمیت تباہ و برباد کر دو۔ حضرت جبرئیلؑ نے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا کہ پروردگار اس بستی میں تو تیرا فلاں نیک بندہ بھی ہے۔ جس نے پلک جھپکنے جتنی دیر بھی کبھی تیری نافرمانی اور معصیت میں زندگی بسر نہیں کی۔ لیکن حضرت جبرئیلؑ کو جواب ملتا ہے کہ پہلے اس پر اس بستی کو الٹو اور پھر دوسروں پر اس لئے کہ میری غیرت و حمیت کی وجہ سے کبھی اس کا چہرہ سرخ نہیں ہوا اور کبھی اس کا خون جوش میں نہیں آیا۔ یہ بے غیرت و بے حمیت اپنے کونے کے اندر بیٹھا رہا اور ۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

کی زندہ تصویر بنا رہا۔ اس خانقاہی تربیت کی معراج یہی ہے جبکہ انقلابی تربیت کا مقصود و مطلوب میدان میں آکر باطل کو للکارنا ہے۔

مسلم اور غیر مسلم معاشرے کا ایک فرق

یہاں تک میں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو طریق تزکیہ و تربیت بیان کیا ہے اس میں اور ہمارے اس وقت کے معاملہ میں بال برابر فرق نہیں ہو گا۔ لیکن اس تیسری سطح پر آ کر ایک فرق واقع ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت صرف کلمہ شہادت ادا کرنے پر مار پڑنی شروع ہو جاتی تھی جس نے اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہا اس نے گویا رائج الوقت نظام کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا جس نے بیت اللہ میں نماز پڑھنے کی جرأت کی اس کی پٹائی شروع ہو گئی کشمکش شروع ہو گئی۔ حضرت ابوذر غفاریؓ جب ایمان لانے کے بعد بیت اللہ میں اپنے ایمان کا اعلان کرنے پہنچ گئے تو صحابہ کرامؓ نے منع کیا کہ تم قرشی بھی نہیں ہو، تمہیں بچانے والا یہاں کوئی نہیں ہو گا۔ لیکن ان کے اندر بڑا جوش تھا...... وہؓ ایک عجیب ہی شخصیت ہیں۔ انؓ کی سیرت پر مولانا مناظر احسن گیلانی کی ایک باقاعدہ تصنیف ہے جو حضرات انؓ کی شخصیت کو جاننے کے خواہش مند ہوں وہ ضرور اس کتاب کا مطالعہ کریں...... انہوںؓ نے بیت اللہ میں جا کر جب بلند آواز سے کلمہ شہادت پڑھا تو وہ مار پڑی ہے کہ کچھ نہ پوچھئے۔ تو وہاں کلمہ شہادت پڑھنے پر مار پڑتی تھی۔ آج آپ کسی چوک میں بیٹھ کر ہزار دانہ تسبیح لے کر ہزار بار کلمہ پڑھ لیں تب بھی کچھ نہیں ہو گا کوئی مار نہیں پڑے گی بلکہ لوگ آپ کے گرویدہ ہو جائیں گے سمجھیں گے کہ کوئی بڑا پہنچا ہوا آدمی ہے، کوئی بڑا اللہ والا ہے۔ نذرانے آنے شروع ہو جائیں گے۔ لوگ ہاتھ چومنا شروع کر دیں گے۔

آج دو چیزوں پر مار پڑتی ہے ایک شریعت پر پوری طرح عمل کرنے پر اور دوسرے بدعات کے رد کرنے پر۔ آپ اپنے گھر میں شرعی پردہ رائج کر کے دیکھئے آپ کی اپنے معاشرہ کے ساتھ کشمکش شروع ہو جائے گی۔ برادری کے ساتھ جنگ شروع ہو جائے گی۔ آپ کے اپنے بھائی بند آپ کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے آپ کا مقاطعہ ہو جائے گا سوشل بائیکاٹ ہو

جائے گا حلال روزی پر اکتفا کر کے دیکھئے آپ کے اپنے بیوی بچے آپ کے دشمن ہو جائیں گے۔ وہ کہیں گے کہ تقویٰ کا ہیضہ تم ہی کو ہو گیا ہے دنیا میں اور لوگ بھی ہیں جو رشوتیں بھی لے رہے ہیں' یہ بھی کر رہے ہیں وہ بھی کر رہے ہیں۔ نمازیں بھی پڑھ رہے ہیں عمرے اور حج بھی کر رہے ہیں یہ تمہارے سر پر تقویٰ کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ اپنے گھر والے دشمن بن جائیں گے۔ اس لئے کہ ان کے تر نوالے ختم ہو گئے ان کے لئے دال روٹی پر گزارا کرنا مشکل ہو جائے گا۔ قرآن میں جو فرمایا کہ اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۔ یہ کب ہو گا۔ ! یہ تب ہو گا جب آپ شریعت پر عمل کریں گے۔

دوسرے آج بدعات کے رد اور ان کی نفی کرنے پر مار پڑتی ہے غلط اوہام پر تنقید کرنے پر جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ مسلمانوں میں کھلم کھلا بت پرستی تو ہو نہیں سکتی۔ لیکن جس طرح کے شرک ہم نے اختیار کئے ہوئے ہیں وہ بت پرستی سے کم تو نہیں ہیں۔ ہمارے ملک میں مزاروں پر جو کچھ ہوتا ہے اس کا حال کسے معلوم نہیں۔ جب آپ دعوت کے میدان میں آئیں گے اور ان تمام چیزوں کی نفی کریں گے۔ تب وہ کشمکش شروع ہو گی جو عملی انقلابی تربیت کا اہم ترین عنصر ہے۔

اسلامی انقلاب کے لئے جو رہنمائی ہمیں سیرت مطہرہ سے حاصل ہوتی ہے اس میں اقدام و تصادم کے مرحلہ میں استنباط و اجتہاد کے سوا پورے نقشہ کو جوں کا توں لینا ہو گا۔ اگر اس میں سر مو بھی فرق ہو گیا تو جان لیجئے کہ اسلامی انقلاب کی طرف پیش قدمی نہیں ہو سکے گی۔

مُسلم معاشرے میں انقلابِ اسلامی کیلئے اقدام کی صُورت

اب سوال یہ ہے کہ اگر ایک مسلم معاشرے میں حکومت کی سطح پر ملک کے اجتماعی نظام کے دائرے میں اسلام کے اوامر و نواہی نافذ نہ ہوں' شریعت اسلامی کے مطابق جملہ اجتماعی معاملات انجام نہ پا رہے ہوں اور پورا اجتماعی نظام اپنے یا دوسروں کے بنائے ہوئے غیر اسلامی نظام ہائے فکر کی اساسات پر قائم ہو تو ایسے معاشرے میں اسلامی نظام یا اسلامی انقلاب کے لئے اقدام کی صورت کیا ہو گی!

چونکہ یہاں سابقہ "مسلمانوں" کی حکومت سے ہے اس کے علاوہ ایک بہت نمایاں فرق یہ ہے کہ عامۃ المسلمین بالکل نہتے ہیں جب کہ حکومت کی پشت پر فوج کا باقاعدہ منظم اور ہر نوع کے اسلحہ سے لیس ادارہ موجود ہے۔ پھر ملک کے ہر دیہات، قصبہ، تحصیل، ضلع اور شہر میں پولیس کے منظم محکمے قائم ہیں۔ جو عام طور پر امن و امان کی فکر سے زیادہ حکومتِ وقت کی وفاداری میں ضابطۂ قانون و اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر عوام الناس پر تشدد کے لئے تیار رہتے ہیں۔

میں اپنی گذشتہ جمعہ کی تقریر میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلامی انقلاب کے لئے ہمیں تین مراحل یعنی دعوت و تبلیغ۔ تربیت و تزکیہ اور جماعت و تنظیم کے لئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا مکمل طور پر اتباع کرنا ہو گا۔ البتہ اقدام کے لئے ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و فرمودات اور آپؐ کے کی دور کے اسوۂ مبارکہ کو سامنے رکھ کر ان تمام چیزوں سے استنباط و اجتہاد کرنا ہو گا۔ میں نے گذشتہ تقریر میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اندھیروں میں ٹھوکریں کھانے کے لئے نہیں چھوڑ گئے۔ بلکہ ایک مسلمان معاشرہ میں ایسی مسلم حکومت کے خلاف جو اسلامی نظام کی تنفیذ و ترویج کے بجائے غیر اسلامی نظام کی ترویج و تنفیذ کر رہی ہو "اِقدام" کے لئے حضور کے فرمودات سے رہنمائی اخذ کی جا سکتی ہے۔ اس کے ضمن میں میں نے مسلم شریف کی دو احادیث پیش کی تھیں جن پر غور و تدبیر سے ایک ایسے مسلم معاشرہ میں حکومت کے خلاف "اِقدام" کے لئے رہنمائی مل جاتی ہے جس میں حکومت اسلامی قوانین، حدود تعزیرات کے نفاذ کے بجائے غیر اسلامی قوانین کی ترویج و تنفیذ کر رہی ہو اور معروفات کے بجائے منکرات کو فروغ دے رہی ہو۔ موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے میں آج بھی انہی احادیث کو پیش کئے دیتا ہوں۔

منکرات کے خلاف جہاد

ان احادیث کا مرکزی موضوع جہاد عن المنکر ہے۔ پہلی حدیث حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَن رأی منکم منکراً فلیُغیّرہ بیدہٖ و ان لم یستطع فبلسانہٖ و ان لّم یستطع

فبقلبہ و ذٰلک اضعف الایمان

"جو کوئی تم میں سے برائی کو دیکھے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ یعنی طاقت سے بدل دے۔ اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے اسے برا کہے اور اسے بدلنے کی کوشش کرے۔ اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے دل سے برا جانے اس پر دلی کرب محسوس کرے۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے......"

دوسری حدیث حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ

اَنَّ رَسُولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ و سلم قال: مَا مِنْ نَبِیّ بَعَثَہُ اللّٰہُ فِی اُمّتِہٖ قبلی الاّ کان لہ من امّتہٖ حوار یّون و اصحابٌ یأخذون بسُنّتِہٖ و یقتدون بِامرہٖ ثم انّھا تخلفُ مِن بعدھِمْ خُلوفٌ یقُولُون مالاَ یفعلون ' و یفعلونَ مالا یؤمَرون فمن جاھدھُم بیدہٖ فھو مؤمِنٌ ' و من جاھدھم بلسانہٖ فھو مومنٌ ' وَمَنْ جَاھدَ ھمُ بِقلبِہٖ فھُوَ مُؤمِنٌ ' لیسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الایمانِ حَبّۃُ خَردلٍ

"رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کے بعد اس کی امت میں اس کے حواریوں اور اصحاب نے اسکی سنت کو قائم نہ کیا ہو اور اس کے احکام کی پیروی نہ کی ہو۔ پھر ان کے جانشین ایسے لوگ بن جاتے ہیں جن کے قول اور فعل میں تضاد ہوتا ہے اور وہ ایسے کام کرتے ہیں جن کا انہیں حکم نہیں دیا گیا بس جو ان کے خلاف ہاتھ (قوت) سے جہاد کرے وہ مومن ہے' جو ان کے خلاف زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو ان کے خلاف دل سے جہاد کرے (یعنی دل میں انہیں برا سمجھے) وہ مومن ہے مگر اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔

موجودہ دور میں نہی عن المنکر کی عملی صورت

میرے نزدیک ان دونوں احادیث کو ہمارے مسئلہ کے حل کی کلید کی حیثیت حاصل ہے۔ پاکستان میں اگر عملاً کامل اسلامی انقلاب آئے گا تو اس طور پر کہ اگر کوئی ایسی جماعت وجود میں آ جائے جو ایسے معتدبہ افراد پر مشتمل ہو کہ جس سے تعلق رکھنے والا ہر فرد دل و جان سے تقویٰ اور اسلام کی روش پر کاربند ہونے کے لئے کوشاں ہے' حبل اللہ یعنی قرآن مجید سے اس کا تعلق مضبوط ہوتا چلا جا رہا ہے' ہر نوع کی فرقہ بندی سے اس کا دامن محفوظ ہے' یہ جماعت.

اقتدار کو چیلنج کرے گی کہ منکرات کا کام پاکستان میں نہیں ہونے دیں گے۔ یہ کام ہماری لاشوں ہی پر ہو گا۔ منکرات وہ سامنے رکھے جائیں جو ہر فقہی مسلک کے نزدیک صریح منکر ہوں۔ جیسے بے پردگی، فحاشی اور سودی معیشت وغیرہ وغیرہ۔ اس کے لئے پرامن اور منظم مظاہرے ہوں گے۔ ایجی ٹیشن ہو گا۔ ضرورت لاحق ہوئی تو کفو اا ید کم کے اصول پر پکٹنگ ہو گا۔ اس کام کے لئے جماعت کی طرف سے کسی قسم کے تشدد کے خلاف کوئی جوابی کاروائی نہیں ہوگی۔ لاٹھیاں برسیں گی تو سر حاضر ہوں گے۔ گولیاں چلیں گی تو وہ سینوں پر کھائی جائیں گی۔ دار و رسن کا مرحلہ اگر آئے گا تو اسے خوشی خوشی لبیک کہیں گے۔ الغرض اس راہ میں جو مصائب بھی آئیں گے، ان کو خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے۔ اس ابتلاء و امتحان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور بالخصوص آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اس اسوہ حسنہ کو اپنے سامنے رکھیں گے جو سیرت مطہرہ میں مکی دور میں نظر آتا ہے کہ حضرت یاسرؓ اور ان کی اہلیہ حضرت سمیہؓ نہایت بہیمانہ طور پر شہید کر دیئے گئے، حضرت بلالؓ کو سفاکانہ طور پر مکہ کی سنگلاخ اور تپتی زمین پر گھسیٹا گیا۔ حضرت خبابؓ کو دہکتے انگاروں پر ننگی پیٹھ لٹا دیا گیا، حضرت عثمانؓ کو چٹائی میں لپیٹ کر انؓ کی ناک میں دھونی دی گئی کہ سانس گھٹنے لگا لیکن کسی ایک نے بھی جواب میں ہاتھ نہیں اٹھایا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ خود محبوبِ رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں کانٹے بچھائے گئے، آپؐ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر اس طرح بل دیئے گئے کہ چشم ہائے مبارک ابل پڑنے کو ہوئیں۔ عین سجدے کی حالت میں آپؐ کے شانہ مبارک پر اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی رکھ دی گئی۔ طائف کی گلیوں میں حضورؐ پر پتھروں کی ایسی بچھاڑ کی گئی کہ جسد اطہر لہولہان ہو گیا۔ خون سے نعلین میں پائے مبارک جم گئے۔ حضورؐ کے پورے خاندان کو شعب بنی ہاشم میں پورے تین سال تک محصور رکھا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ آس پاس کی تمام جھاڑیوں کے پتوں سے پیٹ کی آگ بجھائی گئی۔ معصوم بچوں کے حلق میں سوکھے چمڑے کو پانی میں بھگو کر نچوڑا گیا۔ جب آزمائشوں کی ان بھٹیوں سے محمد الرسول اللہ اوالذین معہ صبر و ثبات اور استقامت سے گزر گئے تو اللہ کی نصرت آئی اور مدینہ منورہ کی طرف اللہ تعالیٰ نے کھڑکی کھول دی۔ آج لوگ اپنے سیاسی اور معاشی حقوق کے لئے، کسی دنیوی سہولت کے لئے اور دوسری دنیوی مراعات کے حصول کے لئے مظاہرے کرتے ہیں۔ اگر یہی ایجی ٹیشن

نظم اور پرامن طریقوں پر صرف دین کے لئے اور نہی عن المنکر کے لئے ہوں کہ ہم یہ منکر کام یہاں نہیں ہونے دیں گے۔

تو یہ ہے میرے نزدیک ایک مسلمان ملک میں نہی عن المنکر کے لئے جہاد بالید کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی تعبیر اور اقدام کی شکل جو ان دو حدیثوں کے ذریعے سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ البتہ اس اقدام کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ مظاہروں اور ایجی ٹیشن سے متعلق سارے کام بالکل پرامن ہوں۔ بدامنی اور توڑ پھوڑ سے کلی طور پر اجتناب کیا جائے۔ ایسی صورت میں یہ جماعت عامۃ المسلمین حتیٰ کہ فوج اور پولیس کی ہمدردیاں بھی حاصل کر سکے گی اور اللہ نے چاہا تو اس طرح یہ طریقہ پانسہ پلٹ کر رکھ دے گا اور اسلامی انقلاب کی راہ ہموار ہو جائے گی۔

انتخابی عمل سے انقلاب نہیں آسکتا

یہ بات دو اور دو چار کی طرح اظہر من الشمس ہے کہ انتخابی عمل رائج الوقت نظام میں چند اصلاحات تو کر سکتا ہے' اسے بیخ و بن سے اکھاڑ کر خالص اسلامی نظام میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ اسلامی انقلاب کے نقطۂ نظر سے اس طریق کار میں بہت سی خرابیاں مضمر ہیں۔ محدود وقت کے پیش نظر چند کی طرف اشارات پر اکتفا کروں گا۔ انتخابی عمل میں اصل ہدف حصولِ اقتدار ہوتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہمارے ملک میں مراعات یافتہ طبقات کی ملک کی عظیم اکثریت پر اتنی مضبوط گرفت ہے کہ ووٹوں کے ذریعہ سے ان کو شکست دینا قریباً محال ہے۔ پھر چونکہ یہ طبقہ مسندِ اقتدار پر پہلے سے قابض ہوتا ہے لہٰذا انتظامیہ پر اس کا تسلط بہت مضبوط ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ انتظامیہ کی عظیم اکثریت برسراقتدار طبقے کے استحصالی طور طریقوں سے خود بھی ناجائز طور پر منفعت حاصل کرتی رہتی ہے لہٰذا اس کی ہر جائز و ناجائز حمایت مراعات یافتہ طبقات کو حاصل ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ جب کوئی جماعت اسلام کے نام پر ووٹوں کی بھیک مانگنے عوام کے سامنے کھڑی ہوتی ہے تو وہ عام لوگوں کے غلط عقائد اور غلط اعمال پر تنقید نہیں کر سکتی۔ وہ لوگوں سے یہ نہیں کہہ سکتی کہ تم فلاں فلاں کام خلاف اسلام کر رہے ہو اور فلاں فلاں کام خلافِ قانون کر رہے ہو چونکہ انہی لوگوں سے تو اس نے ووٹ لینے ہیں۔ لہٰذا انتخابات میں حصہ لینے والی ہر جماعت عوام کے خلافِ اسلام کاموں پر نکیر اور تنقید سے پہلوتہی اور صرفِ نظر کرتی ہے۔ اب اسلام کے نام پر الیکشن میں حصہ لینے کی صورت میں خود اسلام کے حق میں آخری

خرابی کی بات بھی سن لیجئے۔ جب بھی کوئی جماعت الیکشن میں اسلام کے نام پر ووٹ مانگے گی اور کوئی دوسری جماعت بھی اسلام کے نام پر ووٹ مانگے گی تو دو اسلام ہو گئے یا نہیں؟ تین یا چار جماعتیں اسلام کے نام پر الیکشن میں حصہ لے رہی ہوں تو تین یا چار اسلام ہو جائیں گے یا نہیں؟ ہمارے معاشرے میں مذہبی فرقہ واریت جس شدت کے ساتھ بڑھ رہی ہے اس کا سب سے بڑا سبب اسلام کے نام پر "الیکشن لڑنا" ہے۔ ہر گروہ اپنے مخصوص شعائر کا جن کا اسلام سے یا تو سرے سے کوئی تعلق نہ ہو یا اگر ہو تو محض فروعی ہو اس طرح پروپیگنڈہ کرے گا گویا یہی اصل اسلام ہے۔ اس طرح ہمارے عوام الناس انتشارِ ذہنی میں مبتلا ہوں گے یا نہیں؟ اور ہمارے خواص بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو پہلے ہی سے دین کے معتقدات و اساسات کے بارے میں تشکیک میں مبتلا ہے تو یہ تمام عناصر ان جماعتوں کا ساتھ دیں گے یا انہی جو سیکولر (لادینیت) ذہن کی حامل اور علم بردار ہیں! ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں جس سے زیادہ 'FAIR' (صاف ستھرا) الیکشن پاکستان میں تاحال نہیں ہوا یہ نتیجہ سامنے آچکا ہے یا نہیں؟ اس طرح وہ دینی جماعتیں جو اسلامی نظام کے بارے میں مخلص ہیں اپنی قوتوں، صلاحیتوں اور سرمایہ کا اس الیکشن بازی میں ضیاع کرتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی نظام اس راستہ سے آہی نہیں سکتا۔ البتہ اس طرح یہ نقصان ہوتا ہے کہ جماعتوں کے تحزب و تخالف اور ملی اتحاد میں ایسے رخنے پیدا ہو جاتے ہیں کہ انتہائی کوشش کے باوجود ان کا بھرنا ممکن نہیں رہتا۔ بلکہ یہ جماعتی عصبیتیں اور تحزب و تخالف بسا اوقات باہمی نفرت و عداوت کا رخ اختیار کر لیتا ہے جسکی تباہ کاریوں سے ہم میں سے کون ہو گا جو واقف نہ ہو۔

ممکنہ نتائج

نہی عن المنکر کے خلاف ایک امیر اور ایک تنظیم کی کمان میں پرامن مظاہروں کے تین ممکنہ نتائج نکل سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ حکومتِ وقت پسپائی اختیار کرے اور اس جماعت کے مطالبات مان لے۔ منکرات ختم ہوں اور ان کی جگہ معروفات لے لیں۔ اسی طرح درجہ بدرجہ منظم اور پرامن مظاہروں کے ذریعہ سے پوری شریعت نافذ ہو جائے گی چونکہ اربابِ اقتدار کو یہ اطمینان ہو گا کہ یہ جماعت اپنا اقتدار نہیں چاہتی بلکہ اس کا مقصود و مطلوب صرف اسلام کا عملاً نفاذ ہے چنانچہ ان ہی کے ہاتھوں اسلام قائم اور نافذ ہو جائے گا اور

فهو المطلوب۔ یادوسری شکل یہ ہوگی کہ حکومت مزاحمت کرے 'اسے اپنے مفادات کے تحفظ اور اپنی بقا کا مسئلہ بنالے اور مسندِ اقتدار یا ایوان کی اکثریت بظاہر ایسے ان لوگوں پر مشتمل ہو جو زبانی کلامی اسلام اور اس کے نظامِ عدل و قسط کے بڑے قصیدہ گو اور مداح سراہوں 'لیکن درحقیقت وہ نہ خود پورے اسلام پر عمل کرتے ہوں نہ معاشرے میں اسلام کو بحیثیت نظامِ حیات کے نافذ دیکھنے کے روادار ہوں تو ان کی طرف سے مزاحمت ہوگی۔ تحریک کو کچلنے کے لئے تشدّد ہو گا۔ طاقت کا استعمال ہو گا۔ مظاہرین پر لاٹھی چارج ہو گا۔ گولیوں کی بوچھاڑ ہو گی۔ ان کو جیلوں میں ٹھونسا جائے گا۔ دارورسن کے مراحل آئیں گے۔ ان سب کو اگر یہ جماعت پرامن طریق پر جھیل جائے۔ وہ مشتعل نہ ہو۔ کوئی جوابی کاروائی نہ کرے۔ اس کی طرف سے کوئی توڑ پھوڑ نہ ہو۔ نہ سرکاری املاک اور نہ نجی املاک کو کوئی نقصان پہنچے تو ان شاءاللہ پھر دو ہی صورتیں ہوں گی۔ یا تو وہ جماعت اس راہ میں قربان ہو جائے گی۔ یہ قربانی اللہ کی راہ میں قربانی ہوگی اور دنیا میں خواہ وہ ناکام رہی ہو لیکن آخرت کے اعتبار سے یہ بہت بڑی کامیابی ہے بلکہ اصل کامیابی یہی ہے۔ ذالک ھو الفوز العظیم جیسے تحریک شہیدین میں شامل مجاہدینِ بالاکوٹ میں اپنے خون سے دریائے کنہار کے پانی کو لالہ زار کر کے اللہ کی راہ میں قربان ہو کر سرخرو ہو گئے۔ دنیوی اعتبار سے تحریک ناکام ہو گئی لیکن اُخروی اعتبار سے اس راہ میں گردن کٹانے والے اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین بندوں میں شامل ہو گئے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اور دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اس جماعت کے نظم و ضبط' صبر و ثبات خلوص و اخلاص اور للّٰہیت سے عوام الناس کی عملی ہمدردیاں اس جماعت کو حاصل ہو جائیں اور عوام پوری طرح اس تحریک کا ساتھ دیں۔ مزید براں ایسا مرحلہ آسکتا ہے کہ سرکاری اداروں خاص طور پر فوج اور پولیس کی عملی ہمدردیاں بھی اس اسلامی انقلابی جماعت کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ یہ صورت حال ان شاءاللہ العزیز پانسہ پلٹ دے گی اور جس طرح ایران کے جابر و مطلق العنان شہنشاہ کو ایسی ہی صورت حال میں ملک سے فرار ہونا پڑا اور حکومت کی زمام کار انقلابی رہنماؤں کے ہاتھ میں آ گئی۔ اسی طرح یہ صورت حال پاکستان میں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا"۔

اور "اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا لیکن اگر تم نے اللہ کی مدد سے منہ موڑا تو اس کے بعد تمہاری مدد کرنے والا کوئی نہیں ہو گا۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ

اور اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ بَعْدِہٖ

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اللہ کی مدد سے مراد اس کے دین کی مدد ہے۔ اس کے قیام کے لئے مجاہدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو لوگ خلوص کے ساتھ اللہ کے دین کی اقامت کی جدو جہد کریں گے اس کے لئے قربانیاں دیں گے' اس کیلئے تن من دھن لگائیں گے' سرفروشی دکھائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے گا۔ علامہ اقبال نے اس بات کو کیا خوب کہا ہے۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

نجومِ ہدایت

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

طالب ہاشمی

خیر البشر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن چند صحابہ کرامؓ کے درمیان رونق افروز تھے کہ گہرے سانولے رنگ کے ایک کشیدہ قامت آدمی، جن کے سر اور ڈاڑھی کے بال سفید ہو چلے تھے، حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایسے لہجے میں سلام کیا جس میں بے پناہ عقیدت اور محبت پائی جاتی تھی۔ انہیں دیکھ کر سرورِ عالمؐ کے روئے انور پر بشاشت پھیل گئی اور لسانِ رسالت پر یہ الفاظ جاری ہو گئے۔

"ما اظلت الخضراء و ما اقلت الغبراء اصدق لهجة من ابی ذرٍ"

اور کائنات کے ذرہ ذرہ نے شہادت دی کہ بیشک سید المرسلینؐ نے سچ فرمایا۔

ابوذرؓ نے اس وقت اسلام کی صداقت کی گواہی دی تھی جب خدیجۃ الکبریٰ ابو بکر صدیقؓ، علی مرتضیٰؓ اور زید بن حارثہؓ کے سوا کسی نے اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمد رسول الله نہیں کہا تھا اور پھر زندگی بھر کسی نے ابوذرؓ کی زبان سے حق کے سوا کوئی دوسری بات نہ سنی۔ یہاں تک کہ ان کی حق گوئی اور بے باکی نے ارض و سما میں تلاطم برپا کر دیا۔

حضرت ابوذرؓ جن کا اصل نام باختلاف روایت بریر یا جندب تھا۔ قبیلہ بنو غفار سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ قبیلہ کنانہ بن خزیمہ کی نسل سے تھا جو پندرھویں پشت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِّ اعلیٰ تھے۔ غفار بن میل، حضرت ابوذرؓ کی ساتویں پشت میں ایک سربر آوردہ شخص تھا۔ اسی کے نام کی نسبت سے کنانی النسل عربوں کا یہ گروہ غفاری کہلانے لگا۔ غفار تک حضرت ابوذرؓ کا شجرہ نسب یہ ہے۔

ابوذر (جندب یا بریر) بن جنادہ بن قیس بن عمرو بن ملیل بن صعیر بن حرام بن غفار۔ ماں کا نام رملہ بنت ربیعہ تھا۔ وہ بھی قبیلہ غفار سے تھیں۔ بنو غفار کا مادی اور مسکن مدینہ منورہ سے اسّی

میل کے فاصلے پر بدر کے نواح میں تھا ان کے قریب ہی وہ کاروانی راستہ واقع تھا جو مکہ مکرمہ کو شام و فلسطین سے ملاتا تھا۔ بنو غفار بڑے مفلس لوگ تھے اور بصد مشکل گزر اوقات کرتے تاہم انہوں نے مدتوں صبر و قناعت کو اپنا شعار بنائے رکھا لیکن پھر ایک ایسا وقت آیا کہ مفلسی اور بدحالی نے ان کو گمراہ کر دیا اور انہوں نے ڈاکہ زنی اور قزاقی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ وہ نہ صرف مکہ اور شام کے درمیان آنے جانے والے تجارتی قافلوں کو لوٹ لیتے تھے بلکہ نواحی قبائل کو بھی وقتاً فوقتاً اپنی ترکتازیوں کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔ حضرت ابوذرؓ نے اسی ماحول میں ہوش کی آنکھیں کھولیں۔ جب دیکھا کہ قبیلے کے نوجوان نت نئی مہموں پر جاتے ہیں اور انواع و اقسام کے مال و اسباب سے لدے پھندے واپس آتے ہیں تو وہ بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے لیکن قدرت کو ان سے کوئی اور ہی کام لینا منظور تھا۔ معلوم نہیں کیا سبب ہوا کہ یکایک ان کی زندگی میں انقلاب پیدا ہو گیا اور طبیعت لوٹ مار، قتل و غارت اور رہزنی سے سخت متنفر ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ قبیلہ کے دیوتاؤں، دیویوں اور بتوں سے بیزار ہو گئے۔ رب اکبر نے انہیں توحید کا راستہ سجھا دیا اور وہ شب و روز خدائے واحد کی عبادت میں مشغول رہنے لگے۔ خود ہی نماز کی کوئی صورت معیّن کر لی اور جدھر اللہ تعالیٰ جھکا دیتا اسی طرف منہ کر کے پڑھ لیتے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ ابوذرؓ پر قبول اسلام سے پہلے ہی خشیتِ الٰہی مسلط ہو چکی تھی۔ خود ان سے روایت ہے کہ۔

"میں رات کی نماز کے لئے کھڑا ہوتا اور کھڑا رہتا، یہاں تک کہ صبح کاذب ہو جاتی۔ اس وقت میں اپنے آپ کو زمین پر ڈال دیتا اور اس طرح پڑا رہتا جیسے کوئی کپڑا پڑا ہوا ہے۔ جب مجھ پر دھوپ پڑنے لگتی تو اٹھتا۔"

غفار کے لوگ ان کی زبان سے لا الہ الا اللہ کا ورد سنتے تھے اور حیران ہوتے تھے۔ کہ یہ کس جنون میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اس وقت مکہ سے خورشیدِ اسلام کا طلوع ہو چکا تھا اور ہادیٔ برحق نے دعوت توحید کا آغاز فرما دیا تھا۔ ایک دن قبیلہ غفار کا ایک شخص مکہ گیا۔ وہاں اس کے کانوں میں دعوت حق کی بھنک پڑ گئی۔ واپس آ کر حضرت ابوذرؓ سے ملا اور کہنے لگا۔ "ابوذرؓ تمہاری طرح مکہ میں بھی ایک شخص لا الہ الا اللہ کہتا ہے اور لوگوں کو بت پرستی سے منع کرتا ہے۔" ابوذرؓ تو پہلے ہی کسی ہادی و رہنماء کی تلاش میں تھے۔ یہ خبر سن کر بیتاب ہو گئے۔

اسی وقت اپنے بھائی انیس کو یہ کہہ کر مکہ روانہ ہو گیا کہ جا کر اس شخص کو ملو جو لوگوں کو خدائے
راحد کی طرف بلاتا ہے اور پھر واپس آ کر اس کے حالات بتاؤ۔ انیسؓ ایک بلند پایہ شاعر اور
نہایت زیرک آدمی تھے۔ مکہ پہنچ کر انہوں نے سرور عالمؐ کے ارشادات گرامی سنے تو
بے حد متاثر ہوئے۔ واپس آئے تو ابوذرؓ نے پوچھا۔ "تم نے مکہ کے داعیٔ توحید کو کیسا پایا؟"
انیسؓ نے جواب دیا۔ "لوگ اسے شاعر، کاہن اور جادوگر کہتے ہیں لیکن خدا کی قسم میں
نے ایسا نہیں پایا۔ وہ شاعر ہے نہ کاہن اور نہ جادوگر، وہ تو لوگوں کو محض بھلائی کی طرف بلاتا
ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔"

اس مختصر جواب سے حضرت ابوذرؓ کی تسلی نہ ہوئی اور وہ خود تحقیقِ احوال کے لئے عازم مکہ
ہو گئے۔

مکہ پہنچ کر حضرت ابوذرؓ نے کعبہ میں قیام کیا۔ سرور عالمؐ کو پہچانتے نہ تھے۔ کسی سے
پوچھنا خلاف مصلحت سمجھا۔ اللہ کی طرف دھیان تھا کہ وہی داعیٔ حق سے ملا دے گا۔ کئی دن
اسی طرح گزر گئے ایک دن حضرت علی المرتضیٰؓ انہیں ایک طرف لے گئے اور پوچھا "بھائی
میں تمہیں کئی دن سے یہاں دیکھ رہا ہوں تم کس چیز کی تلاش میں ہو۔" حضرت ابوذرؓ نے
جواب دیا، "اگر تم وعدہ کرو کہ مجھے میری منزل مقصود تک پہنچا دو گے اور زبان بند رکھو
گے تو بتائے دیتا ہوں۔"

حضرت علیؓ نے فرمایا، "تم مطمئن رہو تمہارا راز افشا نہ ہو گا"۔

اب حضرت ابوذرؓ نے اپنا مقصد بتایا۔ حضرت علیؓ نے ان کی بات سن کر فرمایا، "تم نے
ہدایت کا راستہ پا لیا جن کی تلاش میں تم آئے ہو بے شک وہ خدا کے سچے رسولؐ ہیں۔"
حضرت ابوذرؓ پر رقت طاری ہو گئی۔ انہوں نے حضرت علیؓ سے درخواست کی۔ "للہ مجھے
ان کی ذات اقدس تک پہنچا دیجئے۔" [1]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ انہیں لے کر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ کا جلالِ نبوت
سے منور چہرہ مبارک دیکھ کر ابوذرؓ کے دل نے گواہی دی کہ یہ واقعی خدا کے سچے رسول ہیں۔

---

[1] ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ پہلے دن بغیر کچھ پوچھے حضرت ابوذرؓ کو اپنے گھر لے گئے۔ رات گزار کو ابوذرؓ پھر کعبہ پہنچے۔ دوسرے دن حضرت علیؓ پھر انہیں اپنے گھر لے گئے اور کعبہ میں قیام کا مقصد پوچھا۔ حضرت ابوذرؓ نے ان سے رازداری کا وعدہ لیا اور پھر اپنے حالات بلا کم و کاست بیان کر دیئے اور کہا کہ میں یہاں محض مکہ کے داعیٔ حق کی تلاش کے لئے مقیم ہوں۔

بے تابانہ عرض کی ' " اے اللہ کے رسولؐ مجھے اپنی دعوت کی تفصیل بتائیے۔ "
حضورؐ نے ایسے بلیغ انداز سے ابوذرؓ کے سامنے اسلام پیش کیا کہ ان کا دل جوشِ ایمان سے لبریز ہو گیا۔ اسی وقت کلمۂ شہادت پڑھ کر اسلام کا پانچواں ستون بن گئے۔ ان سے پہلے صرف چار پاکباز ہستیاں نعمتِ ایمان سے سعادت اندوز ہوئی تھی۔ ام المومنین خدیجہؓ ' صدیق اکبرؓ ' علی المرتضٰیؓ اور زیدؓ بن حارثہ............ اب حضورؐ نے ابوذرؓ سے پوچھا۔
" غفاری بھائی اتنے دن تمہاری خورد و نوش کا کیا انتظام رہا۔ "
عرض کی ' " یارسول اللہ کھانے کو تو کچھ ملا نہیں۔ چاہ زمزم کا پانی پی کر پیٹ بھر لیتا تھا۔ "
اس وقت حضرت صدیق اکبرؓ پاس ہی تھے۔ انہوں نے عرض کی ' " یارسول اللہ اگر اجازت ہو تو میں ابوذرؓ کو کچھ کھلاؤں ؟ " حضورؐ نے فرمایا ' " ہاں ہاں ضرور۔ "
صدیق اکبرؓ حضرت ابوذرؓ کو اپنے ہمراہ گھر لے گئے۔ رسول اکرمؐ بھی ساتھ گئے۔ وہاں صدیق اکبرؓ نے طائف کے خشک انگور جناب رسالت مآبؐ اور ابوذر غفاریؓ کی خدمت میں پیش کئے۔ یہ پہلی غذا تھی جو مکہ میں پہنچ کر ابوذرؓ کو نصیب ہوئی پھر رسول کریمؐ نے ابوذرؓ سے فرمایا۔
" ابوذرؓ اب تم اپنے قبیلے میں واپس جاؤ اور اسے دعوت توحید دو۔ جب دعوتِ حق کے آشکار ہونے کی خبر ملے اس وقت پھر یہاں آ جانا۔ فی الحال تم بھی مکہ میں اپنا اسلام پوشیدہ رکھو۔ "
ابوذرؓ کا دل جوشِ توحید سے معمور تھا۔ عرض کی۔
" یارسول اللہ.......... خدا کی قسم آپ اجازت دیجئے میں مکہ میں اپنے اسلام کا اعلان کر کے جاؤں گا۔ "
حضورؐ ان کا جوش اور ولولہ دیکھ کر خاموش ہو گئے۔
ابوذرؓ سیدھے حرم کعبہ میں تشریف لے گئے وہاں مشرکین کا مجمع تھا۔ ابوذرؓ نے مشرکین سے مخاطب ہو کر بآواز بلند کہا۔
" لوگو خدائے واحد کے سوا کوئی پرستش کے لائق نہیں اور محمدؐ خدا کے سچے رسول ہیں۔ "
ابوذرؓ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ مشرکین چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور مار مار

کر لہولہان کر دیا۔ اتنے میں عباسؓ بن عبدالمطلب آپہنچے۔ ایک غریب الوطن کو اس حال میں دیکھ کر دل بھر آیا۔ ابوذرؓ کے اوپر گر پڑے اور مشرکین سے کہا "اپنا ہاتھ روکو کیوں ناحق اس غریب کی جان لیتے ہو۔" عباسؓ ابھی ایمان نہیں لائے تھے اس لئے مشرکین کو ان کی بات کا بڑا پاس تھا۔ اُن کے کہنے پر انہوں نے ابوذرؓ کو چھوڑ دیا۔ لیکن توحید کے متوالے ابوذرؓ دوسرے دن پھر کعبہ جا پہنچے اور مشرکین کو دعوت توحید دینے لگے۔ مشرکین نے انہیں پھر پکڑ لیا اور زد و کوب کرنا شروع کر دیا۔ اس وقت بھی عباسؓ ان کے آڑے آئے اور مشرکین کو سمجھایا کہ یہ شخص غفار کے جنگجو اور خون آشام قبیلے کا فرد ہے۔ اگر تم نے اسے ہلاک کر دیا تو تمہارا کوئی قافلۂ تجارت منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے گا۔ غفاریوں سے خواہ مخواہ کی دشمنی کیوں مول لیتے ہو۔"

مشرکین کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور انہوں نے ابوذرؓ کو چھوڑ دیا۔ ابوذرؓ نے اب سوچا کہ ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے ان پر میری بات کا اثر نہیں ہو گا۔ انہیں خدا کے سچے رسولؐ ہی راہ ہدایت پر لا سکیں گے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ میں اپنے حلقۂ اثر میں جا کر تبلیغ کروں۔ یہ سوچ کر انہوں نے اپنے وطن کی راہ لی۔ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے اپنے بھائیوں اور والدہ کو دعوت توحید دی۔ ان تینوں نے فوراً اس پر لبیک کہا۔ پھر انہوں نے اپنے قبیلہ کو اسلام کی طرف بلایا۔ آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہو گیا اور آدھا ہجرتِ نبویؐ کے بعد دولتِ ایمان سے بہرہ یاب ہوا

حضرت ابوذرؓ عرصہ دراز تک اپنے قبیلہ کے لوگوں کو اسلام کی تعلیم دیتے رہے جب بدر، احد، خندق وغیرہ کے غزوات گزر چکے تو انہوں نے بھی اپنے وطن سے ہجرت کی۔ مدینۃ الرسول پہنچ کر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور اپنے آپ کو سرکارِ دوعالمؐ کی خدمت کے لئے وقف کر دیا[۱]۔ جب غزوہ تبوک پیش آیا تو ابوذر غفاریؓ بھی اپنے آقا کی معیت میں تبوک کے سفر پر روانہ ہوئے۔ راستے میں ان کا اونٹ سست پڑ گیا اور وہ لشکر اسلام سے بچھڑ گئے۔

---

[۱] ایک روایت میں ہے کہ رسول اکرمؐ نے بتیس شیر دار اونٹنیاں حضرت ابوذرؓ کے سپرد کی تھیں وہ انہیں لے کر مدینہ منورہ سے بارہ میل کے فاصلے پر ذی قرد کے قریب ایک جنگل میں مقیم ہو گئے۔ ان کی زوجہ لیلیٰ اور بیٹا ذرؓ بھی ساتھ تھے۔ ربیع الاول ۶ھ میں بنو غطفان کے لٹیروں نے عیینہ بن حصن فزاری کی سرکردگی میں چھاپہ مارا۔ ذرؓ کو شہید کر ڈالا اور تمام اونٹنیاں حضرت ابوذرؓ کی زوجہ سمیت ہنکا لے چلے۔ صحابہؓ کو بروقت خبر ہو گئی انہوں نے تعاقب کیا اور سب کو چھڑا لائے۔ یہ واقعہ غزوہ ذی قرد کے نام سے مشہور ہے۔

ں جہاد موجزن تھا۔ اونٹ کو وہیں چھوڑا اور سارا سامان پیٹھ پر لاد کر پیادہ پا منزلِ
رف روانہ ہوئے۔ آگے جا کر لشکر اسلام نے ایک جگہ قیام کیا۔ ایک شخص نے
عرض کی "یارسول اللہ وہ دور سے ایک شخص آرہا ہے معلوم نہیں کون ہے۔" حضورؐ
بوذرؓ ہوں گے۔"
نے دیکھا تو وہ واقعی ابوذرؓ تھے۔ رسول کریمؐ سے عرض کی۔ "یارسول اللہ خدا کی
ؓ ہی ہیں۔"
نے فرمایا "ابوذرؓ اکیلے ہی چلتے ہیں۔ اکیلے ہی مریں گے اور قیامت کے دن اکیلے
گے۔"
ت ابوذرؓ غفاری کے زہد و تقویٰ اور خدا اور رسولؐ سے عشق کا یہ عالم تھا کہ سرورِ
نے انہیں مسیح الاسلام کا لقب عطا فرمایا۔
دن حضرت ابوذرؓ نے رسول اکرمؐ کی خدمت میں عرض کی۔ "یارسول اللہ ایک
ں ہستیوں سے محبت رکھتا ہے لیکن ان کے اعمال کو اپنانے کی طاقت نہیں رکھتا اس
ں کیا ارشاد ہے۔"
ؐ نے فرمایا "وہ شخص جن کے ساتھ محبت رکھتا ہے انہی کے ساتھ ہے۔" ابوذر
رض پیرا ہوئے "یارسول اللہ میں صرف آپ اور اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتا ہوں۔"
فرمایا تم یقیناً اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ ہو۔
کائناتؐ ابوذر غفاری پر اتنی شفقت فرماتے تھے کہ مرض الموت میں بھی انہیں بلا
ذرؓ بارگاہ نبویؐ میں پہنچے والہانہ حضورؐ کے اوپر جھکے حضورؐ نے اُنکا دست مبارک اپنے جسم اطہر کے
یا۔ ابوذرؓ پر وارفتگی کا عالم طاری ہو گیا۔ جب حضورؐ نے وفات پائی تو ابوذرؓ کے دل
لئی۔ مدینہ چھوڑ کر ارض شام میں جا بسے۔ ان کی زندگی زہد و ورع اور فقر و قناعت کا
ہ تھی۔ جو کچھ ہاتھ آتا اسے راہ خدا میں لٹا دیتے۔ محض ایک چادر زیب بدن ہوتی
ین ؓ کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ لوگوں میں مال و دولت سے رغبت پیدا ہو گئی
دہ لباس کی جگہ پر تکلف ملبوسات کا استعمال شروع ہو گیا ہے۔ فتوحات اور مالِ
کثرت نے خزانوں کی بنیاد رکھ دی ہے۔ سادہ مکانات کے بجائے محلات کی تعمیر

شروع ہو گئی ہے۔ ابوذرؓ یہ حالات دیکھ کر بے چین ہو گئے۔ انہوں نے پوری قوت سے مسلمانوں کو پکارا کہ بھائیو مال دولت جمع کرنے اور عیش و نعم کی زندگی گزارنے میں سراسر ہلاکت ہے اللہ کا حکم ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ

اگر تم نے اللہ کے حکم سے روگردانی کی تو اس کا وعدہ کبھی نہیں ٹل سکتا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ جس انداز سے اس آیت کی تفسیر کرتے تھے، حضرت امیر معاویہؓ والیٔ شام اور اکثر دوسرے صحابہؓ کو اس سے اختلاف تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ اس آیت کا تعلق اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے ہے۔ لیکن ابوذرؓ فرماتے تھے کہ ہرگز نہیں یہ آیت یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں سب کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ اپنی اس رائے پر سختی سے جمے رہے اور ترغیب و تخویف کا کوئی حربہ بھی انہیں اپنی رائے کے برملا اظہار سے باز نہ رکھ سکا۔ ان کے پیغام کا خلاصہ یہ تھا۔

"اے دولت مند مسلمانو! تم اگر اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو قیامت کے دن تمہاری جمع کی ہوئی دولت سے تمہارے چہروں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یاد رکھو مال میں تین چیزیں شریک ہیں۔ (۱) وارث جو اس کا منتظر ہے کہ تو کب اس دنیا سے رخصت ہو اور وہ تیرے اندوختہ پر قبضہ کرے۔ (۲) تقدیر جو تجھ سے پوچھے بغیر اپنے فیصلے صادر کر دیتی ہے (۳) خود تو............ اگر تو ان دونوں سے بازی لے جانے پر قادر ہے تو ضرور ایسا کر۔ اللہ فرماتا ہے تم نیکی اور بھلائی کو بھی نہیں پا سکتے جب تک تم اپنی مرغوب چیزوں کو سب کے لئے عام نہ کر دو۔"

"مت بھولو کہ آدمی کے مرنے کے بعد صرف تین چیزیں اس کے کام آئیں گی۔ (۱) نیک اولاد جو اس کے لئے دعائے مغفرت کرے (۲) صدقہ جاریہ (۳) علم جس سے لوگ فیض اٹھائیں۔"

غریب لوگ تو ابوذر غفاریؓ کا پیام سن کر ان پر پروانوں

کی طرح گرے لیکن اغنیاء اُن سے کھٹکنے لگے۔

جب امیر معاویہؓ اور حضرت ابو ذرؓ غفاری کے درمیان کشیدگی بہت بڑھ گئی تو امیرالمومنین حضرت عثمان ذوالنورینؓ نے حضرت ابوذرؓ غفاری کو مدینہ بلا بھیجا۔ وہاں بھی انہوں نے اپنا مخصوص پیغام لوگوں کو سنانا شروع کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے ان کے انتہاپسندانہ خیالات دیکھ کر انہیں فتویٰ دینے سے منع کر دیا لیکن حضرت ابوذرؓ کو یہ پابندی گوارا نہ ہوئی۔ انہوں نے فرمایا۔ " خدا کی قسم اگر میری گردن پر تلوار بھی رکھ دی جائے اور مجھ کو یقین ہو جائے کہ گردن کے کٹنے سے قبل جو کچھ سرورِ کائناتؐ سے سنا ہے سنا سکوں گا تو یقیناً سنا دوں گا۔ " حضرت عثمانؓ نے ابوذرؓ کو مشورہ دیا کہ آپ " ربذہ " چلے جائیں۔ ربذہ صحرائے عرب میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ابوذرؓ غفاری خود بھی تنہائی پسند کرتے تھے۔ اپنے اہل و عیال کو ساتھ لیا اور بخوشی ربذہ جا بسے۔

عراق کے لوگوں کو حضرت ابوذرؓ کے قیامِ ربذہ کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے آپ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ عثمانؓ نے آپ کے ساتھ نامناسب سلوک کیا ہے اگر آپ ہماری قیادت فرمائیں تو ہم عثمانؓ کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کریں۔

حضرت ابوذرؓ غفاری نے جواب میں کہلا بھیجا۔

> " عثمانؓ نے جو کچھ کیا میں اسی میں بھلائی سمجھتا ہوں۔ تم لوگ اس میں مت دخل دو اور امیرالمومنینؓ کے خلاف منصوبے نہ بناؤ کیونکہ جو اپنے امیر کو ذلیل کرتا ہے۔ خدا اس کی توبہ قبول نہیں کرتا۔ "

عراقی خاموش ہو گئے اور حضرت ابوذرؓ غفاری ہنگامہ ہائے دنیا سے الگ تھلگ اپنی زندگی کے دن صبر و قناعت سے کاٹنے لگے۔ ۳۱ھ یا ۳۲ھ کے ایام حج میں حضرت ابوذرؓ غفاری مرض الموت میں مبتلا ہوئے۔ ربذہ کے تمام لوگ حج کے لئے روانہ ہو گئے تھے اور ابوذرؓ غفاری کے پاس صرف ان کی رفیقہ حیات اور ایک لڑکی موجود تھی۔ ابوذرؓ غفاری پر نزع کی حالت طاری ہوئی تو ان کی اہلیہ رونے لگیں۔ ابوذرؓ نے نحیف آواز میں پوچھا۔ " روتی کیوں ہو۔ "

اہلیہ نے جواب دیا۔ " آپ ایک ویرانہ میں دم توڑ رہے ہیں نہ میرے پاس اتنا کپڑا ہے کہ آپ کو کفن دے سکوں، نہ میرے بازوؤں میں اتنی طاقت ہے کہ آپ کی ابدی خوابگاہ تیار

کر سکوں۔"

حضرت ابوذرؓ غفاری نے فرمایا' "سنو ایک دن ہم چند لوگ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر تھے۔ حضورؐ نے فرمایا تم میں سے ایک شخص صحرا میں جاں بحق ہوگا اور اس کے جنازے میں مسلمانوں کی ایک جماعت باہر سے آکر شرکت کرے گی۔ اس وقت جو لوگ موجود تھے وہ سب شہری آبادیوں میں وفات پا چکے ہیں اب صرف میں ہی باقی رہ گیا ہوں اور کوئی وجہ نہیں کہ رسول اکرمؐ کی پیشگوئی کا مصداق نہ بنوں۔ تم باہر جا کر دیکھو۔ حضورؐ کے ارشاد کے مطابق مسلمانوں کی کوئی جماعت ضرور آتی ہوگی۔" پاس ہی ایک ٹیلہ تھا۔ حضرت ابوذرؓ کی اہلیہ اس پر چڑھ کر انتظار کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد دور گرد اڑتی نظر آئی۔ پھر اس میں سے چند سوار نمودار ہوئے۔ جب قریب آئے تو ابوذرؓ کی زوجہ نے انہیں پاس بلا کر کہا۔ "بھائیو! قریب ہی ایک مسلمان سفرِ آخرت کی تیاری کر رہا ہے اس کے کفن دفن میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔" قافلے والوں نے پوچھا "وہ کون شخص ہے۔" جواب دیا' "ابوذرؓ غفاری۔" ابوذرؓ کا نام سنتے ہی قافلے والے بے تاب ہو گئے اور "ہمارے ماں باپ ان پر قربان ہوں۔" پکارتے ہوئے ان کی طرف لپکے۔

ادھر ابوذرؓ نے اپنی صاحبزادی سے فرمایا' "جانِ پدر ایک بکری ذبح کر اور گوشت کی ہنڈیا چولہے پر چڑھادے۔ کچھ مہمان آنے والے ہیں جو میری تجہیز و تکفین کریں گے۔ جب وہ مجھے سپردِ خاک کر چکیں تو ان سے کہنا کہ ابوذرؓ نے آپ لوگوں کو خدا کی قسم دی ہے کہ جب تک آپ یہ گوشت نہ کھالیں یہاں سے رخصت نہ ہوں۔"

جب قافلے والے حضرت ابوذرؓ کے خیمہ میں داخل ہوئے تو ان کا دم واپسیں تھا۔ اکھڑی ہوئی آواز میں فرمایا۔ "تم لوگوں کو مبارک ہو کہ تمہارے یہاں پہنچنے کی خبر سالہا سال پہلے ہادیٔ برحق نے دے دی تھی۔ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ "مجھے کوئی ایسا شخص نہ کفنائے جو حکومت کا عہدہ دار ہو یا رہ چکا ہو۔" اتفاق سے اس قافلہ میں ایک انصاری نوجوان کے سوا سب لوگ کسی نہ کسی صورت میں حکومت سے متعلق رہ چکے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ "اے رسول اکرمؐ کے محبوب رفیق میں آج تک حکومت کی ملازمت سے بے تعلق ہوں میرے پاس دو کپڑے ہیں جو میری والدہ کے ہاتھ کے کتے بنے ہوئے ہیں۔ اجازت ہو تو

ان میں آپ کو کفنادوں۔ "

حضرت ابوذرؓ نے اثبات میں سرہلایا اور پھر " بسم اللہ و باللہ و علی ملتہ رسول اللہ " کہہ کر جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

اس قافلہ کے اکثر لوگ یمن کے رہنے والے تھے۔ اتفاق سے ان کے ساتھ فقیہ امت حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ بھی تھے۔ انہوں نے نماز جنازہ پڑھائی اور پھر سب نے مل کر اس آفتاب رشد وہدایت کو سپرد خاک کر دیا۔ جب چلنے لگے تو حضرت ابوذرؓ غفاری کی صاحبزادی نے قسم دے کر انہیں کھانا کھلایا۔ علامہ طبریؒ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے چلتے وقت حضرت ابوذرؓ کے اہل و عیال کو ساتھ لے لیا اور مکہ معظمہ پہنچ کر انہیں حضرت عثمانؓ کے حوالے کر دیا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ حج سے واپسی پر حضرت عثمانؓ انہیں خود ربذہ سے مدینہ منورہ لے گئے اور پھر ہمیشہ انکے کفیل رہے۔ سیدنا ابوذرؓ غفاری کا شمار ان کبار صحابہ میں ہوتا ہے جن کے علوِ مرتبت پر ملت اسلامیہ کے ہر فرد بشر کا کامل اتفاق ہے۔

تقدم فی الاسلام' حبِ رسولؐ' شغفِ قرآن و حدیث' فقر و زہد' ایثار و قناعت' تقویٰ و توکل' تبلیغ و ارشاد اور حق گوئی و بے باکی حضرت ابوذرؓ کی کتابِ سیرت کے نمایاں ابواب ہیں۔ علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ سیدنا عمر فاروقؓ ان کو علم میں حبر الامۃ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے برابر سمجھتے تھے۔ باب مدینۃ العلم حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے کہ ابوذرؓ نے اتنا علم محفوظ کر لیا ہے کہ لوگ اس کے حاصل کرنے سے عاجز تھے اور اس تھیلی کو اس طرح بند کر دیا کہ اس میں سے کچھ بھی کم نہ ہوا۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوذرؓ پر بے حد شفقت فرماتے تھے۔ جب وہ مجلس نبوی میں موجود ہوتے تو حضورؐ سب سے پہلے انہیں کو مخاطب فرماتے' اگر موجود نہ ہوتے تو انہیں تلاش کر کے لایا جاتا اور حضورؐ ان سے مصافحہ فرماتے۔

بارگاہ نبوی میں بہت کم صحابہ ایسے تھے جو حضورؐ سے بے تکلفانہ سوال پوچھ سکیں لیکن حضرت ابوذرؓ کے لئے رحمت عالمؐ کی شفقت ایسی بے پایاں تھی کہ وہ آزادی کے ساتھ معمولی سے معمولی چیزوں کے بارے میں بھی سوال پوچھا کرتے تھے۔ مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ رسول اکرمؐ سے حضرت ابوذرؓ کی عقیدت اور محبت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ مدینہ آنے

کے بعد ان کے وقت کا بیشتر حصہ رسول اکرمؐ کی خدمت اقدس میں گذرتا تھا اور حضورؐ کی والہانہ خدمت ہی ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اسی خدمت کی بدولت انہیں بارگاہِ رسالتؐ میں ایسا درجہ تقریب اور اعتماد حاصل ہو گیا تھا کہ حضورؐ انہیں راز کی باتیں بھی بتادیا کرتے تھے اور وہ بھی راز داری کا حق پوری طرح ادا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت ابوذرؓ مدینہ کی ایک مسجد میں لیٹے تھے کہ سرور عالمؐ تشریف لائے اور فرمایا

"ابوذر اگر ایسا وقت آیا کہ تم اس مسجد سے نکالے جاؤ تو کیا کرو گے؟"

عرض کیا' "یا رسول اللہ مسجد نبویؐ میں چلا جاؤں گا یا اپنے گھر بیٹھ رہوں گا۔"

فرمایا' "اگر وہاں سے بھی نکالے گئے تو پھر کیا کرو گے؟"

عرض کی۔ "تلوار نکال لوں گا۔"

حضورؐ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تین مرتبہ فرمایا۔

"اللہ تمہیں بخشے۔ تلوار نہ نکالنا بلکہ صبر سے کام لینا اور جہاں تمہیں جانے کو کہا جائے چلے جانا۔"

حضرت ابوذرؓ نے حضورؐ کے اس ارشاد پر آخری دم تک عمل کیا۔ اپنی رائے کا اظہار تو بلا خوفِ لومتہ لائم ہر حال میں کرتے رہے لیکن حاکمِ وقت کے خلاف کبھی تلوار نہ اٹھائی۔ فی الحقیقت صرف اسی ارشاد پر موقوف نہیں بلکہ وہ جو کچھ بھی حضورؐ سے سنتے تھے اسے حرزِ جاں بنا لیتے تھے اور نہ صرف خود اس پر عمل کرتے تھے بلکہ لوگوں کو بھی اس پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتے تھے۔ کوئی حدیث بیان کرتے تو اس کا آغاز یوں کرتے عهد الی خلیلی رسول الله یا سمعت خلیلی رسول الله یعنی میرے خلیل (دوست) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے یہ وعدہ لیا یا میں نے اپنے خلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا...... حضورؐ کے وصال کے بعد کبھی آپ کا ذکر آجاتا تو حضرت ابوذرؓ کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو جاتا اور شدتِ جذبات سے آواز نہ نکلتی۔

حضرت ابوذرؓ اگرچہ سالہا سال تک فیضانِ نبویؐ سے بہرہ یاب ہوئے لیکن ان سے مروی احادیث کی تعداد صرف ۲۸۱ ہے۔ اس کی وجہ ان کی کم آمیزی اور عزلت گزینی تھی۔ انہوں نے حضورؐ کے جو ارشاداتِ مقدسہ امت تک پہنچائے ان میں سے بیشتر کا تعلق توحید اور اخلاق

سے ہے۔ ان سے مروی چند احادیث کا خلاصہ تبرکاً یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۱...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اے ابوذرؓ کسی بھی نیک کام کو حقیر اور معمولی سمجھ کر نہ چھوڑنا۔ مثلاً یہ بھی نیکی ہے کہ تو اپنے بھائی سے کشادہ پیشانی کے ساتھ ملے۔" (مسلم)

۲...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوذرؓ جب تو سالن پکائے تو شوربا زیادہ کیا کر اور جو ہمسایہ امداد کے قابل ہو اس کے ہاں مناسب حصہ بھیجا کر۔ (مسلم)

۳...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے خدمت گار تمہارے بھائی ہیں ہر مسلمان کو چاہیئے کہ جو خود کھائے اپنے خادم کو بھی کھلائے، جو خود پہنے اس کو بھی پہنائے اور ایسے کام کی اس کو تکلیف نہ دے جو اس کی بساط سے باہر ہو ایسے کام کے لئے اسے کہے تو اس میں خود اس کی مدد کرے۔ (بخاری)

۴...... نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی کو فاسق یا فاجر کہتا ہے اگر اس کا مقابل ایسا نہ ہو تو یہ کلمہ کہنے والے پر پڑ جاتا ہے۔ (بخاری)

۵...... میں نے رسولؐ اللہ سے دریافت کیا کہ سب سے بہتر کون سا عمل ہے۔ آپؐ نے فرمایا، خدا پر ایمان لانا اور راہ خدا میں جہاد کرنا۔ میں نے عرض کیا اس کے بعد کون سا عمل بہتر ہے۔ فرمایا، غلام آزاد کرنا۔ میں نے عرض کیا کس غلام کو آزاد کرنا سب سے بہتر ہے۔ فرمایا، جو غلام سب سے بیش قیمت ہو اور مالک کو سب سے زیادہ پسند ہو اس کو آزاد کرنا ہی سب سے افضل ہے۔ میں نے عرض کیا، اگر میں یہ نہ کر سکوں، فرمایا تو اس حاجت مند کی مدد کرو جو کوئی مزدوری یا پیشہ کر رہا ہو یا کسی بے ہنر کو کام بتادو۔ میں نے عرض کیا، اگر میں یہ بھی نہ کر سکوں۔ فرمایا، تو ایسے زندگی گذار کہ لوگوں کو تم سے کوئی آزار نہ پہنچے کیونکہ تیرے لئے یہ تمام باتیں صدقہ ہیں۔ (بخاری)

۶...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ ایک آنے والے نے پروردگار کے پاس سے آکر مجھے خبر دی ہے کہ جو شخص میری امت میں سے مرجائے اور خدا کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناتا ہو تو وہ بہشت میں داخل ہوگا۔ میں نے عرض کیا اگرچہ اس نے زنا اور چوری کی ہو۔ فرمایا، ہاں، اگرچہ زنا اور چوری بھی کی ہو (وہ جنت میں ضرور داخل ہوگا) (بخاری)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے حضورؐ سے چار مرتبہ یہی سوال کیا اور آپؐ نے ہر مرتبہ ایک ہی جواب دیا۔ البتہ چوتھی مرتبہ آپؐ نے ان الفاظ کا اضافہ فرمایا گرچہ ابوذرؓ کو کتنا ہی ناگوار گذرے۔ حضرت ابوذرؓ کی عادت تھی کہ جب وہ حدیث بیان کرتے تو حضورؐ کا یہ فقرہ بھی ضرور نقل کرتے۔

۷...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' اللہ تعالیٰ کہتا ہے جو ایک نیکی کرے گا اس کا دس گنا بدلہ ملے گا اور میں اس پر بھی اضافہ کروں گا اور جو برائی کرے گا اس کو صرف ایک برائی کا بدلہ ملے گا اور امکان یہ ہے کہ اسے معاف کر دوں جو میری طرف ایک بالشت قریب آئے گا میں اس کی طرف ایک ہاتھ قریب آؤں گا اور جو مجھ سے ایک ہاتھ قریب ہو گا میں اس کے دو ہاتھ قریب ہوں گا اور جو میری طرف آہستہ خرامی سے آئے گا میں اس کی طرف لپکتا ہوا آؤں گا۔ جو مجھ سے زمین کے برابر گناہ کر کے ملے گا میں اس سے اتنی ہی بڑی مغفرت لے کر ملوں گا بشرطیکہ اس نے کسی کو میرا شریک نہ ٹھہرایا ہو۔ (مسلم)

۸...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' اے ابوذرؓ سب سے پہلے نبی آدمؑ تھے اور سب سے آخر میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ (ترمذی۔ ابن حبان۔ ابو نعیم۔ ابن عساکر)

حضرت ابوذرؓ غفاری کی سیرت کا سب سے نمایاں پہلو ان کا زہد و تقویٰ اور صبر و قناعت ہے وہ طبعاً نہایت سادہ مزاج اور فقیر منش آدمی تھے۔ ان کی زاہدانہ اور متوکلانہ زندگی کو دیکھ کر خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ ابوذرؓ میں عیسیٰؑ بن مریمؑ جیسا زہد ہے۔

حافظ ابن حجرؒ نے "اصابہ" میں لکھا ہے کہ حضرت ابوذرؓ کی زندگی پر آخری دم تک یہی زاہدانہ رنگ غالب رہا۔ فتوحات کی کثرت سے مسلمانوں کی معاشرت میں جس تبدیلی نے راہ پائی' حضرت ابوذرؓ نے اس کا ذرہ برابر اثر قبول نہ کیا۔ جس طرح عہدِ رسالت میں زندگی بسر کی بعد میں بھی ہمیشہ اسی روش پر قائم رہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے رسول اکرمؐ سے امارت کی خواہش کی تھی تو حضورؐ نے فرمایا تھا "ابوذر تم امارت کا بوجھ نہ اٹھا سکو گے۔ تمہارے لیے وہی چیز پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں"۔ اس کے بعد انھوں نے زندگی بھر کسی عہدہ کی آرزو نہیں کی۔ چار ہزار درہم وظیفہ تھا اس میں سے سال بھر کے ضروری اشیاء خرید لیتے اور باقی سب حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے گھر میں نقد روپیہ رکھنے کے سخت خلاف تھے اور لوگوں کو بھی اس سے منع فرمایا کرتے تھے۔ "کنز العمال" میں ہے کہ وہ لوگوں سے کہا

کرتے تھے کہ دنیا میں صرف دو کاموں سے غرض رکھو۔ ایک طلب آخرت اور دوسرا کسب حلال۔ اس کے سوا کسی تیسرے کام کا ارادہ نہ کرو۔ اگر تمہارے پاس حلال ذریعہ سے دو درہم آجائیں تو ایک درہم اپنے عیال پر خرچ کرو اور ایک درہم راہ خدا میں دے دو۔ تیسرے درہم کا کبھی ارادہ نہ کرو کیونکہ تمہیں نقصان دے گا۔ مسند احمد حنبل" میں حضرت ابو اسماءؓ سے روایت ہے کہ وہ ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ کے پاس ربذہ گئے دیکھا کہ ان کی اہلیہ بڑی خستہ حالت میں تھیں اور حضرت ابوذرؓ کہہ رہے تھے کہ دیکھو یہ اللہ کی بندی مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں عراق جاؤں اور میں جب عراق جاؤں گا تو لوگ اپنی دنیا لے کر میری طرف مائل ہوں گے۔ اسے معلوم نہیں کہ میرے خلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا ہے کہ پل صراط سے ورے ایک پھسلن والا راستہ ہے۔ جس سے پاؤں رپٹ رپٹ جائیں گے تم سب کو اس راستے سے گزرنا ہے اگر تمہارا بوجھ اپنی طاقت کے مطابق ہوا اور تم ہلکے پھلکے ہوئے تو آسانی سے یہ راستہ پار کر جاؤ گے نسبت اس کے کہ تم پر اونٹ کی طرح بوجھ لدا ہو۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جو عراق کے گورنر تھے حضرت ابوذرؓ سے ملنے گئے۔ وہ ان کو یا اخی یا اخی کہہ کر پکارتے تھے اور حضرت ابوذرؓ کہتے تھے کہ اس عہدہ کے بعد تم میرے بھائی نہیں رہے۔ حضرت ابو موسیٰؓ نے پوچھا' آخر کیوں؟ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا۔ "مجھے معلوم نہیں کہ عامل بننے کے بعد تم نے کیا کیا؟ پہلے یہ بتاؤ تم نے کوئی بڑی عمارت تو نہیں بنائی' مویشیوں کے گلے تو نہیں جمع کئے' زراعت کر کے غلے کا ذخیرہ تو نہیں کیا۔ جب حضرت ابو موسیٰؓ نے ہر بات کا جواب نفی میں دیا' "ہاں اب تم میرے بھائی ہو۔" ایک دفعہ کسی شخص نے حضرت ابوذرؓ کو اس حالت میں نماز پڑھتے دیکھا کہ ایک ہی چادر زیب بدن تھی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو اس نے پوچھا کیا آپ کے پاس ایک ہی چادر ہے۔ فرمایا' "ہاں"۔ اس نے کہا کچھ دن ہوئے میں نے آپ کے پاس دو کپڑے دیکھے تھے فرمایا' "ہاں ان میں سے ایک اپنے سے زیادہ فرورتمند کو دے دیا"۔ اس نے کہا۔ "آپ کو تو خود اس کی ضرورت تھی"۔ فرمایا' "اللہ تمہاری مغفرت کرے تم مجھے دنیا کے جنجال میں پھنسانا چاہتے ہو' ایک چادر میرے پاس ہے' کچھ بکریاں ہیں جن کا دودھ پیتا ہوں۔ کچھ خچر ہیں جو سواری کے کام آتے ہیں۔ ایک خادم ہے جو کھانا پکا دیتا ہے اس سے زیادہ اور کیا نعمتیں مجھے چاہئیں۔ کتب سیر میں حضرت ابوذرؓ کے بارے میں اس قسم کے بیسیوں واقعات ملتے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوذرؓ میں زہد و قناعت کے علاوہ ایثار' سخاوت' مہمان نوازی اور انکسار و تواضع جیسے محاسن بھی بدرجہ اتم موجود تھے۔ فی الحقیقت حضرت ابوذر غفاریؓ ایک جامع صفات ہستی تھے اور ان کی سیرت کا ہر پہلو ملت اسلامیہ کے لیے مشعل راہ ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

قسط (۲)

عشق رسول ﷺ کا مفہوم اور اس کے تقاضے

ابوالمظہر الحسینی

اب میں دعویٰ اور دلائل پر گفتگو کرنے کے بعد نتیجہ پر گفتگو کروں گا یعنی یہ ثابت کرنا چاہوں
گا کہ آیا ہمارے دعویٰ عشق رسول ﷺ کی مذکورہ بالا دلائل کی رو سے تصدیق ہوتی ہے یا تکذیب! عشقِ رسول صلعم
ہمارا دعویٰ تھا، دعویٰ پر دلیل یہ تھی کہ ہر عاشقِ رسول صلعم کو آپؐ کی اطاعت اور تابعداری لازم ہے
ہمارے اندر رسول صلعم کی اطاعت اور تابعداری نہیں ہے لہٰذا ہمارا دعویٰ غلط ہوگا۔ میں آئندہ
سطور میں ہماری زندگی کے بے شمار گوشوں میں سے چند گوشوں پر روشنی ڈالوں گا، جس سے ہمارا
شق غلط ہونا ثابت ہوسکتا ہے۔

(۱) ہمارے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (رواہ ابوداؤد)
جو آدمی جس قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے، اس کا شمار اسی قوم سے ہوتا ہے۔" اس حدیث کی
ید اس زمانہ کی وردی اور یونیفارم سے بھی ہوتی ہے۔ ایک پاکستانی فوجی ہندوستانی فوجیوں کی
دی پہن لے تو دیکھنے والا بلا تامل کہہ دے گا کہ یہ ہندوستانی فوجی ہے۔ ہر ہر اسکول میں طلبہ کی
یفارم جدا جدا ہے۔ ایک سکول کا طالب علم دوسرے اسکول کی یونیفارم پہن لے تو دیکھنے والا
ں کو اس اسکول کا طالب علم سمجھے گا جس کی یونیفارم اس نے پہن رکھی ہے۔ اسلام نے بھی اپنے
ؤں کے لئے ایک وردی مقرر کر رکھی ہے جس سے مسلمان غیر اقوام سے ممتاز ہوجاتے
ں۔ یہ وردی اسلام کی زندگی کے تمام شعبوں میں اپنی مخصوص ہدایات اور طرزِ عمل ہیں۔ چنانچہ
ام نے مسلمانوں کو سیاست، تجارت، معیشت اور معاشرت حتیٰ کہ پاخانہ پیشاب میں بھی
ضع قطع میں اپنی مخصوص اور ممتاز ہدایات دے رکھی ہیں۔ اسی مخصوص اور ممتاز ہدایات
کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یوں کہا ہے: صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ
غَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (البقرہ ۱۳۸) " اللہ تعالیٰ کے رنگ کو لازم کرلو۔

رنگنے کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ سے بہتر رنگنے والا اور کون ہوگا اور ہم اس کی عبادت کرنے والے ہیں ؛ یہاں دین اسلام کو رنگ سے تشبیہ دیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ ایسا اسلام اختیار کرو جو سارے ادیان اور اقوام سے تمہیں نرالا اور ممتاز بنا دے ۔ سرکار دو عالم کی حدیث شریف اور آیت قرآنی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے جائز نہیں غیر قوموں کی وضع قطع ، رفتار گفتار ، طور طریق اور چال چلن اختیار کریں ۔ انہیں زندگی کے ہر شعبے اور گوشے میں دوسری قوموں سے الگ اور ممتاز رہنا چاہیئے ۔ برخلاف اس آیت اور حدیث کے ہماری سیاست ، ہماری معیشت ہماری تہذیب و تمدن ، ہمارا طور طریق غرض چند مخصوص عبادات مثلاً نماز ، روزہ ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ کے علاوہ باقی سارے پہلو ہماری زندگی کے یہود و نصاریٰ ، ہندو ، بودھ اور مجوس کی تہذیب و تمدن اور طور طریق سے مشابہ ہیں ۔ مار پڑے ایسی عاشقی پر جس عاشقی میں معشوق کی اطاعت اور تابعداری نہ ہو ۔

چونکہ اسلام کی بنیاد ہی یہود اور نصاریٰ کی مخالفت پر ہے ، جیسا کہ آیت غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ (الفاتحہ : ۷) ان کا راستہ نہیں جن پر آپ کا غضب نازل ہوا یعنی یہود اور نہ ہی ان کا راستہ جو گمراہ ہوئے یعنی نصاریٰ ۔ یعنی اے اللہ ہمیں وہ سیدھا راستہ دکھا جو نبیوں ، صدیقوں ، شہداء اور صالحین کا ہے ۔ نہ یہود کا راستہ اور نہ ہی نصاریٰ کا ۔ اس لئے مسلمانوں کو قرآن و حدیث میں جا بجا ان کی مخالفت کی تاکید کی گئی ہے ۔ ان سے دوستی کرنے سے منع کیا گیا ہے ، ان کی وضع قطع اور طور طریقے اور تہذیب و تمدن کو اپنانے سے روکا گیا ہے ۔ اس کی توثیق اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرت صلعم جب کسی جنازہ کے پیچھے چلتے تو جب تک میت کو قبر میں نہ رکھا جاتا آپ صلعم نہ بیٹھتے ۔ آپؐ سے یہود کے کسی عالم کی ملاقات ہوئی اور اس نے کہا کہ ہم بھی ایسا ہی کرتے ہیں ۔ اس کے بعد آنحضرت صلعم کا یہ طرز عمل رہا کہ آپ میت کو قبر میں رکھنے سے پہلے ہی بیٹھ جاتے اور فرماتے کہ بیٹھ جایا کرو اور یہود کی مخالفت کرو (رواہ ابوداؤد والترمذی و ابن ماجہ عن عبادہ ابن صامت ۔

(۲) اسلام نے سود اور جوا اور شراب سے منع فرمایا ۔ سود خوری کو نہ صرف حرام قرار دیا ہے ، بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ سے جنگ قرار دیا ہے ۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ یایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربا ان کنتم مومنین فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ ، البقرہ : " اے ایمان والو اللہ سے ڈرو

اور جو سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو پھر اگر تم اس پر عمل نہ کرو گے تو اشتہار سن لو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے۔ سود خوروں کو اللہ تعالےٰ الٹی میٹم دے رہا ہے کیا یہ کوئی معمولی گناہ ہے! حدیث میں آتا ہے سود خوری میں ستر گناہ ہیں سب سے ادنیٰ گناہ اپنی والدہ سے بدفعلی کرنے کے برابر ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالےٰ سود کے سلسلے میں چار آدمیوں پر لعنت کرتا ہے۔ سود کھانے والے پر، سود کھلانے والے پر، سود کے حساب کتاب لکھنے والے پر، سود کی دستاویزات پر گواہی دینے والے پر۔ آج اگر جائزہ لیا جائے تو معاشرے میں بہت کم لوگ ایسے نظر آئیں گے جو ان چاروں میں سے کوئی نہ ہو۔ کیونکہ یا وہ سودی بنک میں اپنی رقم جمع رکھتا ہے۔ اگر خود سود نہیں لیتا ہے، تو اس رقم سے دوسروں کو سود ملتا ہے یا بنکوں میں ملازمت کر رہا ہے جس میں سودی کاروبار کی اعانت ہوتی ہے۔

آج ایکسپورٹ امپورٹ کے سلسلے میں بندرگاہوں میں سٹہ وغیرہ کے نام سے طرح طرح کے کاروبار ہوتے ہیں جو بیع قبل القبض یعنی قبضہ کرنے سے پہلے فروخت کرنا اور جوا وغیرہ مفاسد کو شامل ہونے کی وجہ سے کاروبار ناجائز ہو جاتا ہے۔ ریس کورس وغیرہ میں تو کھلا جوا ہوتا ہے۔

مے نوشی کے بارے میں قرآن و حدیث میں بہت سی آیات و احادیث وارد ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے اللہ تعالےٰ شراب کے سلسلے میں دس آدمیوں پر لعنت کرتا ہے۔ منجملہ ان کے شراب پینے والا، پلانے والا، فروخت کرنے والا، خریدنے والا اور بنانے والا ہے آج ہماری نئی تہذیب کے دلدادہ کہہ رہے ہیں کہ شراب پینے کے بعد آدمی سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ اچھے اچھے مضامین کا ورود ہوتا ہے۔ اور آسانی سے عمدہ عمدہ اشعار کہے جا سکتے ہیں۔ اسلام کی نظر میں ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ حضرت ابو موسیٰؓ فرماتے ہیں کہ میں مے نوشی اور بت پرستی میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ ایک حدیث حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ آپ صلعم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے مجھے دنیا والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے اور ان کے لئے ہدایت بنا کر اور میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ آلاتِ لہو و لعب باجہ، سارنگی ڈھول وغیرہ بتوں اور صلیبوں کو توڑ دوں اور جاہلیت کی رسوم و رواج کو مٹا دوں اور میرے رب نے قسم کھائی ہے کہ میری عزت و جلال کی قسم میرا کوئی بندہ ایک گھونٹ شراب پئے گا تو میں اس کو اس کے برابر جہنم کی پیپ پلاؤں گا۔ اور جو بندہ میرے خوف سے اس کو چھوڑ دے میں اس کو حیاض القدس جنت کے حوض سے پلاؤں گا۔ شراب، سود اور جوا سے اس کو

ممانعت میں بے شمار آیات و احادیث وارد ہیں۔ طالبِ ہدایت کے لئے یہی کافی ہے جو مذکور ہوا۔ متعنت کے لئے ہزاروں دفتر بے سود۔

(۳) قرآن و حدیث میں اللہ تعالےٰ اور اس کے پیارے رسول صلعم نے نماز کی پابندی کرنے کی کتنی تاکید کی اور نماز چھوڑنے پر وعیدیں سنائیں۔ آج ہمارے بہت سے عاشقانِ رسول ؐ نماز نہیں پڑھتے یا اس میں سستی کرتے ہیں۔ اچھے سے اچھے مضمون کو نعت بنانے کی کوشش میں شراب بھی پی لیتے اور نمازیں چھوڑ دیتے ہیں۔ سرکار دوعالم صلعم کے واضح ارشاد ہیں من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر "جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی۔ اس نے کفر کیا ہے۔ اسلام میں نماز کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنی ثقیف مسلمان ہو کر مدینہ منورہ میں آکر اور آنحضرت صلعم سے ایک سال تک نماز چھوڑنے کی مہلت مانگی۔ آپؐ نے انکار فرمادیا۔ پھر ایک مہینہ پھر ایک ہفتہ کی مہلت مانگی آپ نے اجازت نہیں دی اور فرمایا: لاخیر فی دین لا صلوٰۃ فیہ۔ جس دین میں نماز نہیں ہے اس میں کوئی خیر نہیں۔ حدیث میں آتا ہے ہر چیز کی ایک علامت ہے۔ ایمان کی علامت نماز ہے۔ گویا بے نمازی مسلمان ہے۔ اسی لئے علمار نے بے نمازی کو قتل کر دینے یا قید کر دینے کا فتویٰ دیا ہے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ادھر مساجد میں نمازیں ہو رہی ہیں ادھر بازاروں اور سڑکوں ہوٹلوں اور جلسوں اور جلوسوں میں مسلمان بھرے پڑے ہیں اور مساجد کا رُخ نہیں کرتے۔ عین وقتِ نماز میں محفلِ نعت جاری ہے۔ کیا یہی عاشقی ہے؟ ہمارے محبوب نبیؐ نماز کے بارے میں فرماتے ہیں: قرۃ عینی فی الصلوٰۃ. نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ وہی نماز ہم عاشقوں کے لئے آنکھ کا تنکا بن گئی ہے۔ بہت سے عشاق نماز تو پڑھتے ہی نہیں۔ تھوڑے عاشق پڑھتے تو ہیں مگر جب نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو گویا قید کئے گئے ہیں کس طرح جلدی سے اس قید سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں جو آدمی نماز میں سستی کرے گا وہ دوسرے دینی کاموں میں بدرجۂ اولیٰ سستی کرے گا۔

(۴) نزولِ قرآن مجید اور بعثتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا واحد مقصد ایامِ جاہلیت کی خانہ ساز رسومات جو تعلیماتِ قرآن و حدیث سے متصادم ہیں، کا قلع قمع کر کے ایک اللہ تعالےٰ کی عبادت اور بندگی کا رواج دینا ہے۔ یہ کفر، شرک، بدعات اور باپ دادا کی رسم و رواج، ساری آسمانی کتابوں اور انبیا علیہم السلام کی تعلیمات کے خلاف ہیں اور خانہ ساز رسومات ہیں۔ اس وقت کچھ

رسومات ہمارے معاشرے اور سماجوں میں بطور عبادت رائج ہیں اور کچھ بطور عادت۔ ان رسومات کے عوام اور خواص اس قدر پابند ہیں کہ ان کی پابندی کے سلسلے میں قرآن و حدیث کی مطلقاً پروا نہیں کیجاتی۔ بعض باتیں ان میں ایسی ہیں کہ جن کی قرآن و حدیث میں حلت اور اباحت موجود ہوتے ہوئے مسلمان ان کو حرام اور ناجائز سمجھ رہے ہیں۔ اور بعض ایسی ہیں کہ قرآن نے انہیں صراحۃً حرام قرار دیا ہے مگر مسلمان ان کو حلال سمجھ کر کر رہے ہیں۔ وہ مسلمان کیا ہے کہ جو قرآن و حدیث کی تحلیل اور تحریم کو باپ دادا کی تحلیل و تحریم کے مقابلے میں ہیچ سمجھتے ہیں اور آخر الذکر کو اوّل الذکر پر ترجیح دیتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے جو قرآن مجید کے حرام کئے ہوئے کاموں کو کرے وہ اس پر ایمان نہ لایا۔

علماء جانتے ہیں کہ آیت ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین (الاحزاب: ۴۰) محمد صلعم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور آخری نبی۔ جاہلیت کی اس رسم کو مٹانے کے لئے نازل ہوئی ہے کہ مطلقاً بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنا ناجائز ہے۔ خواہ نسبی بیٹے ہوں خواہ متبنی یعنی لے پالک بیٹا۔ اسلام نے نسبی بیٹوں کی بہوؤں سے نکاح ناجائز اور متبنی کی بہو سے نکاح جائز قرار دیا ہے۔ زیدؓ آنحضرت کا متبنی تھا۔ جب زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلعم کا نکاح زینبؓ سے کر دیا۔ اس پر چہ میگوئیاں کو ختم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ قدیم یہودی رسم و رواج کے مطابق مسلمان ہونے کے بعد بھی اونٹ کے گوشت نہیں کھاتے اور ہفتہ کے روز کی تعظیم کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس رسم کو مٹانے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی: یاایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطان انہ لکم عدو مبین (البقرہ: ۲۰۸) "اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ شیطان کے قدم بقدم مت چلو۔ واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔" اسی طرح کی آیات قرآن مجید میں بھری پڑی ہیں جو آباء و اجداد کی رسومات کی تردید میں وارد ہیں۔

منجملہ ان کے یہ آیت ہے: واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ آباءنا اولو کان آباءھم لا یعقلون شیئاً ولا یھتدون: "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ نے جو نازل کیا اس کا اتباع کرو تو وہ کہتے ہیں بلکہ ہم تو اس کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ کیا وہ باپ دادوں کی پیروی کریں گے گو کہ ان کے باپ دادے ناسمجھ

اور غیر ہدایت یافتہ ہوں؟

آج مسلمان شدت سے باپ دادوں کی تقلید کرتے ہوئے خانہ ساز رسومات کی پابندی کر رہے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے ہیں کہ آیا قرآن و حدیث کی رو سے یہ رسم جائز ہے یا ناجائز۔ ایک کام کو اسلام جائز بتائے مسلمان اس کو ناجائز سمجھ کر نہ کریں۔ ایک کام کو اسلام ناجائز بتائے۔ مسلمان اس کو جائز سمجھ کر کریں۔ یہ قرآن و حدیث سے صریح مخالفت اور اللہ و رسول سے مقابلہ کرنا ہے۔ ایسے مسلمانوں کو اپنے ایمان کا جائزہ لینا چاہیئے۔ چہ جائیکہ دعوائے عاشقی!

(۵) آج مسلمان عورتیں پردوں سے نکل گئیں۔ زیب و زینت کے ساتھ بازاروں میں آتی ہیں۔ جبکہ اسلام کا حکم یہ ہے: وقل للمؤمنٰت یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن، ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن او آبائھن او آباء بعولتھن او ابنائھن او ابناء بعولتھن او اخوانھن او بنی اخوانھن او بنی اخواتھن او نسائھن او ما ملکت ایمانھن او التابعین غیر اولی الاربۃ من الرجال او الطفل الذین لم یظھروا علی عورات النساء ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن وتوبوا الی اللّٰہ جمیعا ایُّہَ المؤمنون لعلکم تفلحون: (النور: ۳۱)

"اور آپ اے نبی مسلمان عورتوں سے کہدیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کے مواقع کو ظاہر نہ کریں مگر اس میں جو کھلا رہتا ہے اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں اور اپنی زینتوں کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے باپ پر یا اپنے شوہر کے باپ پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر یا اپنے بھائیوں پر یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں پر یا اپنی بہنوں کے بیٹوں پر یا اپنی مسلمان عورتوں پر یا اپنی لونڈیوں پر اور ایسے طفیلی مردوں پر جنہیں عورتوں کی ضرورت نہیں یا ایسے لڑکوں پر جو پردوں کی باتوں سے ابھی ناواقف ہیں۔ اور اپنے پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ ان کا مخفی زیور معلوم ہو جائے۔ مسلمانو! اللہ تعالٰے کے سامنے اپنی کوتاہیوں سے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

یانساء النبی لستن کاحد من النساء ان اتقیتن فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض وقلن قولا معروفا۔ وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولیٰ واقمن الصلوٰۃ واٰتین الزکوٰۃ واطعن اللّٰہ ورسولہ۔ (الاحزاب)

"اے نبی کی بی بیو! تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو تم بولنے میں نزاکت مت کرو۔ پس جس کے دل میں خرابی ہے اس کے دل میں برا خیال پیدا ہوگا اور گناہ کا ارادہ کرے گا اور تم قاعدے کے موافق بات کرو اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو۔ قدیم زمانۂ جاہلیت کے دستور کے موافق مت نکلا کرو اور تم نمازوں کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔" یہ حکم ساری عورتوں کے لئے ہے۔ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا: کل عین زانیۃ وان المرأۃ اذا استعطرت فمرت بالمجلس فھی کذا وکذا یعنی زانیۃ۔ رواہ ترمذی وغیرہ عن ابی موسیٰ "ہر آنکھ زنا کرتی ہے اور جو عورت خوشبو لگا کر نکلتی اور مردوں کی مجلس کے پاس سے گزرتی ہے وہ زناکار عورت ہے۔"

آج مسلمان عورتیں مغربی تہذیب کی تقلید کرتی ہوئی کھلے بندوں سڑکوں اور بازاروں اور دفتروں میں پھر رہی ہے۔ مردوں سے بھری محفل میں ناچ رہی ہیں گا رہی ہیں۔ کوئی قانون نہیں جو ان کو پردوں میں دھکیلے۔ واعظ، خطیب مدرس، مرشد اور سیاسی اور مذہبی پیشوا بہت کم ان پر نکیر اور اعتراض کرتے ہیں۔ کیسے کہیں کہ خود ان کے گھروں میں بھی پورے پردے کا اہتمام نہیں ہے۔ اسلام کے اس حکم سے جو بے احتیاطی برتی جا رہی ہے اس سے کچھ یوں اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اس حکم کو معطل کر دیا اور حکم سے بائیکاٹ کیا ہے۔ مسلم معاشروں میں ان نیم برہنہ عورتوں کا بہت بڑا دخل ہے۔ عورتوں کا اس طرح گھومنا پھرنا مردوں کی غیرت کو چیلنج ہے۔ عورتوں کو اسلام نے جو سہولتیں عطا کریں۔ خدا کی قسم دنیا کی کسی قوم نے یہ سہولتیں نہیں دی۔ چنانچہ تاریخ سے واقفیت رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔ اس کے باوجود اسلام پر اعتراض کہ اس نے عورتوں کا استحصال کیا ہے بڑا شرمناک ہے۔ یہ اعتراض کرنے والی عورتیں حقیقت میں مسلمان ہی نہیں رہی۔ کیونکہ یہ قرآن وحدیث کا انکار ہے۔

(۶) ہمارے محبوب نبی صلعم نے فرمایا "الحمو الموت"۔ عن عقبہ بن عامر پوری حدیث یوں ہے۔ آپ صلعم نے فرمایا اجنبی عورتوں کے پاس مت جایا کرو۔ کسی نے سوال کیا یارسول اللہ! دیور جیٹھ وغیرہ سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ تو آپ نے فرمایا۔ دیور جیٹھ تو موت ہے۔ یعنی موت سے جس طرح بھاگتے ہو۔ عورتوں کو دیور اور جیٹھ وغیرہ سے اس طرح بھاگنا چاہیے۔

ہمارے نبی صلعم نے فرمایا: الدیوث لا یدخل الجنۃ ؛ دیوث جنت میں نہیں جائیگا
ہمارے بہت سے گھرانے ایسے ہیں۔ جن میں عورتیں، دیور، جیٹھ، چچازاد، ماموں زاد، خالہ زاد
پھوپی زاد بھائیوں سے بے حجاب روبرو ملتی اور بات کرتی ہیں - اسی طرح مرد بھاوجوں اور
سالیوں سے بے حجاب ملتے جلتے ہیں۔ بالکل حرام اور ناجائز ہے۔ دیوث عربی زبان میں
اس آدمی کو کہتے ہیں جو اپنی بیوی، ماں، بہن، بیٹی اور دوسری محرمات کو ایسے مردوں سے پردہ
نہ کرائے جن سے ان عورتوں کا نکاح ہو سکتا ہے۔ کیا یہ ہیں مسلمان عورتیں اور یہ ہے اسلام!
یہ کم از کم وہ اسلام تو نہیں ہے جو آنحضرت صلعم اللہ تعالے کی طرف سے لے کر آئے ہیں اور ۲۳ سال
تک جس کی تبلیغ کی اور تعلیم دی۔

(۷) اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: ومن لم یحکم بما انزل اللہ فأولئك هم
الظالمون (المائدۃ - ۴۷، ۴۸، ۵۰) "جو لوگ اللہ تعالے کے نازل کئے ہوئے قانون
کے مطابق حکومت نہ کریں وہی لوگ کافر، فاسق اور ظالم ہیں" ایک اور آیت میں آیا ہے۔ فلا و
ربك لا یومنون حتی یحکموك فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی انفسهم
حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما (النساء: ۶۵) "پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ
لوگ ایمان دار نہ ہوں گے جب تک کہ ان کے آپس کے جھگڑے قضیئے آپ سے تصفیہ نہ کرائیں۔
پھر آپؐ کے فیصلے سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور آپؐ کے فیصلے کو خلوص دل سے تسلیم
نہ کرلیں" ہمارے نبی صلعم پر جو قرآن نازل ہوا اس کا فیصلہ ہے اور آپؐ نے اس پر عمل کرکے
دکھایا کہ مسلمان اللہ تعالے کے دستور کے سوا کسی اور دستور کے ساتھ حکومت نہیں کر سکتے۔
مسلمانوں کے مقدمات سوائے قرآن و حدیث کے کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ نہیں ہو
سکتے۔ آج اللہ تعالے اور اس کے رسول صلعم کی ہدایت کے برخلاف ہماری حکومت انگریزی
قانون پر چل رہی ہے۔ ہماری عدالتوں میں ہمارے مقدمات انگریزی قانون کے مطابق فیصلے
کئے جا رہے ہیں۔ مسلمان نماز نہیں پڑھ رہے ہیں، سود کھا رہے ہیں، ہماری خواتین بازاروں،
سڑکوں پر نیم برہنہ گھوم رہی ہیں۔ بےحیائی اور عریانی روز بروز عام ہوتی جا رہی ہیں۔ کوئی قانون نہیں کہ جس سے
ان کا انسداد کیا جائے۔ عورتوں کو بموجب فرمانِ خداوندی "وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن
تبرج الجاهلیۃ الاولی (الاحزاب: ۳۳) مسلم خواتین! گھروں میں آرام اور وقار کے
ساتھ بیٹھی رہیں، زمانۂ جاہلیت کے دستور کے مطابق بناؤ سنگار کرکے نہ نکلیں۔ مگر یہاں

پارکوں، بازاروں، سڑکوں اور محفلوں میں مسلم خواتین موجیں مار رہی ہیں۔ افسوس صد افسوس! یہ سارے کارنامے ہم جیسے عاشقانِ رسول صلعم کے ہاتھوں سرانجام پا رہے ہیں۔ ہم عملاً قرآن و حدیث کو معطل کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اس پر دعویٰ عاشقی رسول صلی اللہ علیہ وسلم!
حدیث میں آتا ہے جس نے قرآن مجید کے حرام کئے ہوئے کاموں کو کیا وہ اس پر ایمان نہ لایا

ایک اسلامی حکومت کی سب سے بڑی اور اہم ذمہ داری 'امر بالمعروف اور نھی عن المنکر' ہے، اس سے معاشرے کی تطہیر اور ملک میں امن وسلامتی قائم ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے: الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلاۃ وآتوا الزکوٰۃ وأمروا بالمعروف ونھوا عن المنکر. (الحج) یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دیں گے تو یہ لوگ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیک کاموں کا حکم دیں گے۔ اور بُرے کاموں سے روکیں گے۔

حدیث شریف میں آیا ہے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا: من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ وان لم یستطع فبلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ و ذٰلک اضعف الایمان۔ (رواہ مسلم عن ابی سعید الخدری) "تم میں سے کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اسے چاہیئے اس کو زور سے دبادے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو زبان سے منع کرے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل سے اس کو بُرا سمجھے۔ یہ ایمان کا ادنیٰ درجہ ہے۔ قوت سے منکرات اور مفاسد کا انسداد کرنا حکومت اور صاحب اقتدار کا فریضہ ہے۔ آج ہماری حکومت اس فرضِ منصبی سے پہلو تہی اور کنارہ کشی نہ کرتی، تو ہمارا معاشرہ امن وامان کا گہوارہ اور جنت نشان بن چکا ہوتا۔ کہاں ہے اسلام اور کہاں ہے مسلمان! جتنی برائیاں پروان چڑھ رہی ہیں وہ ساری کی ساری یا حکومت کی سرپرستی یا غفلت کا نتیجہ ہے۔ جن کی خود حکومت ذمہ دار ہے۔

(۸) حدیث میں آتا ہے سرکارِ دوعالم صلعم نے فرمایا: خالفوا المشرکین اوفروا اللحیٰ واحفوا الشوارب۔ وفی روایۃ انھکوا الشوارب واعفوا اللحیٰ۔ رواہ الشیخان عن ابن عمرؓ ڈاڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں کتراؤ، مشرکوں کی مخالفت کرو ــــ واہ رے امّت اپنے نبیؐ سے مخالفت اور اپنے نبیؐ کی نافرمانی پر تمہاری یہ جسارت کہ تم نے اپنے محبوب نبیؐ کے فرمان کے برخلاف یہود ونصاریٰ کی تقلید میں مونچھوں کو بڑھانا اور ڈاڑھیوں کو منڈوانا شروع کر دیا۔ پھر تمہارے دعویٰ عاشقیت! لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ صرف

یہی ڈاڑھیوں کا بڑھانا اور مونچھوں کا کترانا مستقل یونیفارم کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اسی سے مسلمان، سکھ وغیرہ ڈاڑھیاں رکھنے والی قوموں سے ممتاز ہو جاتے ہیں ۔ ڈاڑھی منڈوانا تمام مسلمانوں کے نزدیک حرام ہے۔ ڈاڑھیاں منڈوانے والوں کو علماء نے فاسق معلن قرار دیا ہے ۔ لہٰذا اسلامی عدالتوں میں ان کی گواہی قبول نہیں کی جاتی ہے ۔

ایک اور حدیث زید بن ارقم سے مروی ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا من لم یأخذ شاربہ فلیس منا رواہ الترمذی ۔ جو شخص اپنی مونچھ نہ کتروائے وہ میری امت میں سے نہیں ہے ۔ مونچھ کترانے سے مراد بالکل چھوٹی کر لینا ہے ، حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ڈاڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں کتراؤ ۔ یہود اور نصاریٰ کے مشابہ نہ ہو ۔ رواہ احمد ۔

(۹) حدیث میں آتا ہے : سرکار دوعالم صلعم نے فرمایا : ان الیھود والنصاریٰ لایصبغون فخالفوھم ۔ رواہ الشیخان عن ابی ہریرۃؓ ۔ یہود اور نصاریٰ ڈاڑھیوں میں خضاب نہیں لگاتے ہیں ، تم ان کی مخالفت میں ڈاڑھیوں کو حنا سے خضاب لگایا کرو ۔

(۱۰) حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ آپ صلعم نے مجھ پر دو کپڑے کسم سے رنگے ہوئے دیکھے تو فرمایا : ان ھذہ من ثیاب الکفار فلا تلبسھا وفی روایۃ قلت اغسلھا قال : بل احرقھا ۔ رواہ مسلم عن عبداللہ بن عمرو ۔ یہ کافروں کے کپڑے ہیں ان کو مت پہنا کر ۔ راوی نے عرض کیا حضورؐ ! ان دونوں کو دھو ڈالوں ؟ فرمایا کہ نہیں بلکہ دونوں کو جلا دو ۔ دیکھا آپ نے اے عاشقِ رسول صلعم ۔ آپ کے معشوق نے ایسے کپڑے جو کفار پہنتے ہیں دھو کر پہننے کی بھی اجازت نہیں دی ۔ بلکہ ان کو جلا دینے کا حکم دیا ۔ انصاف سے فرمائیے آپ کو یہود و نصاریٰ کا لباس کوٹ ، پینٹ اور ٹائی پہنتے ہوئے دیکھیں گے ، کیا فرمائیں گے ؟ یہی فرمائیں گے تاکہ تم اگر میری امت ہو ، میرے عاشق ہو تو یہ لباس فوراً اتار لو اور جلا دو ۔ ڈاکٹر اقبال نے کیا خوب کہا ہے وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ دو ڈاڑھیاں منڈوائے ہوئے مجوسی آنحضرت صلعم کے پاس آئے ۔ آپؐ نے ان کی طرف دیکھنا گوارا نہ فرمایا : ان دونوں سے فرمایا : ناس ہو تمہارا تم نے یہ کیا صورت بنا رکھی ہے ؟ انھوں نے کہا اسی کا ہمارے رب یعنی کسریٰ بادشاہ نے ہمیں حکم دیا ہے ۔ آپ صلعم نے فرمایا : لیکن میرے رب نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ اپنی ڈاڑھی بڑھاؤں اور مونچھ کتراؤں ۔

یہود و نصاریٰ کی مخالفت اور ان سے دوستی سے ممانعت میں بہت سی آیات و احادیث وارد ہیں منجملہ ان کے چند یہ ہیں: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (المائدہ: ۵۱) فَتَرَی الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یُّسَارِعُوْنَ فِیْهِمْ یَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓی اَنْ تُصِیْبَنَا دَآئِرَةٌ (المائدہ ۵۲)

"اے ایمان والو تم یہود اور نصاریٰ کو دوست مت بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے گا بے شک وہ ان ہی میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ تعالےٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ آپ دیکھیں گے کہ جن لوگوں کے دلوں میں شک و نفاق ہے (ایمان اور اخلاص نہیں) وہ لوگ ان سے دوستی کرنے میں جلدی کریں گے۔ بطور بہانہ کہیں گے ہم ان سے دوستی نہ کریں گے تو ہم پر کوئی آفت اور حادثہ واقع ہو سکتا ہے۔" دیکھا آپ نے اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ یہود اور نصاریٰ سے دوستی کرنے والے وہی لوگ ہوں گے جن کے دلوں میں نفاق ہے۔ شک ہے۔ ایمان اور اخلاص نہیں۔ کوئی امتی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اپنے معبود اور نبی صلعم کے حکم کے برعکس یہود و نصاریٰ سے دوستی کرے ان کے طور طریق اور وضع قطع اپنائے، چہ جائیکہ عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

دفتاِر کار

حلقہ جنوبی پنجاب (ملتان) کا قیام
اور ــــ امیر تنظیم اسلامی کا پیغام

ــــــــ مرتب: مختار حسین فاروقی (امیر حلقہ جنوبی پنجاب) ــــــــ

الحمدللہ کہ تنظیم اسلامی کی تاریخ میں اس حلقہ جاتی نظام سے ایک نئے باب کا اضافہ ہو رہا ہے اور توسیع واستحکامِ دعوت کا عمل ہر چہار گوشوں میں بڑھے گا اور رنگ لائے گا۔ ان حلقوں میں جنوبی پنجاب کا حلقہ سرائیکی علاقہ اور دوسرے ملحقہ اضلاع پر مشتمل ہے جن کی تعداد (۱۳) ہے۔ امیرِ محترم نے اس حلقہ کا نام "حلقہ جنوبی پنجاب تجویز فرمایا ہے اور اس کا دفتر ملتان میں قائم کر دیا ہے۔ جیسا کہ احباب اور قارئینِ میثاق بخوبی واقف ہیں امیرِ محترم کے نزدیک ملتان پاکستان کا جغرافیائی وسط ہی نہیں تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے چاروں صوبوں کا مرکزِ اتصال ہے۔

یہ فیصلہ وسط ستمبر میں ہوا اور ابتدائی انتظامات میں ہماری تمام تر کوشش کے باوجود پندرہ روز سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا۔ اس دوران ڈاکٹر منظور حسین صاحب (جو حلقہ ملتان کے قیم کے طور پر کام کریں گے) بھی ملتان تشریف لائے اور ڈاکٹر غلام حیدر ترین صاحب سے مشورہ کے بعد پہلا کام جو پیش نظر تھا وہ اس حلقہ میں موجود تمام رفقاء کو ایک دفعہ مرکزِ حلقہ میں جمع کرنے کا تھا۔ اس موقع کی اہمیت و مناسبت سے سب کو انفرادی خطوط کے ذریعے اطلاع دی گئی اور ۲/ اکتوبر بروز جمعۃ المبارک شام ساڑھے چار بجے، ۲۵ آفیسرز کالونی ملتان میں پہنچنے کی درخواست کی گئی۔

امیرِ محترم کی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے ہمت تو نہیں پڑ رہی تھی مگر بالا آخر حلقہ جنوبی پنجاب کے اس تاسیسی اجتماع میں قدم رنجہ فرمانے کے لئے راقم نے درخواست کی جسے منظور کر لیا گیا۔ اس دل افروز تبدیلی سے تمام رفقاء کو دوبارہ خطوط کے ذریعے اطلاع بہم پہنچائی گئی اور امیر محترم کا نمازِ جمعہ کے بعد پہلی پرواز سے ملتان روانگی اور ہفتہ کے روز واپسی طے پا گئی۔

....

بالآخر ۲، اکتوبر کا دن آن پہنچا۔ دفتر حلقہ میں چہل پہل تھی اور متبسم چہرے ایک

دوسرے کا استقبال کرتے اور خیریت دریافت کرتے نظر آرہے تھے نماز عصر میں پچاس کے لگ بھگ احباب تھے لاہور سے میاں نعیم صاحب اور شمس الحق اعوان صاحب بھی تشریف لے آئے تھے۔ مغرب میں حاضری ۱۰۰ سے تجاوز تھی (یاد رہے کہ اس حلقہ میں کل ۸۳ رفقاء ہیں) شرکاء میں باہمی اعتماد اور نظم کی کیفیت قابل دید تھی اس لئے کہ اس محفل میں انہیں اپنا محبوب قائد نظر نہ آنے کے باوجود کوئی ہیجان یا بد نظمی نہیں تھی۔ دراصل امیر محترم اپنی کوشش اور ارادے کے باوجود معالجین کے منع کرنے پر ملتان تشریف نہیں لا سکے بلکہ میاں نعیم صاحب کے ذریعے ایک کیسٹ میں بیس منٹ کے ریکارڈ شدہ پیغام کے ذریعے رفقاء سے خطاب فرمایا۔ اس اجتماع میں حسب ذیل پروگرام شامل تھے۔

(۱) سیرت صحابہؓ کا مطالعہ (۲) حلقہ جاتی تشکیل کی ضرورت اور حلقہ ملتان کی تاسیس (۳) اجتماعی مذاکرہ (۴) امیرِ محترم کا خطاب (بذریعہ کیسٹ) (۵) حلقہ ملتان کے لئے ایک مجلسِ مشاورت کی تشکیل (۶) امیر محترم کا ایک ویڈیو خطاب

یہ اجتماع رات بارہ بجے تک جاری رہا۔ کچھ رفقاء رات ہی واپس روانہ ہو گئے۔ تیس کے قریب رفقاء وہیں قیام پذیر ہوئے اور ناشتہ کے بعد روانگی ہوئی۔

رات کی مجلس میں نامزد مجلس مشاورت کا پہلا اجلاس ۳ اکتوبر کو بعد نماز فجر منعقد ہوا۔ شرکاء کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) جناب عبدالماجد خاکوانی ملتان (۲) جناب محمد سعید بہٹہ صاحب 'ملتان
(۳) جناب سلیم اختر صاحب 'بہاولپور (۴) راؤ محمد جمیل صاحب 'وہاڑی
(۵) رانا غلام اکبر صاحب 'رحیم یار خان (۶) جناب شوکت مند صاحب 'مظفر گڑھ
(۷) مرزا قمر سعید صاحب شجاع آباد (۸) ڈاکٹر منظور صاحب (۹) اور راقم

اس اجلاس میں آئندہ کا لائحہ عمل اور پروگرام طے پایا۔ نیز دعوت کی توسیع کے لئے رفقاء کی تربیت کے پیش نظر ایک ہفت روزہ تربیت گاہ ۱۶ 'اکتوبر تا ۲۳ اکتوبر منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا تاکہ رفقاء اس سے استفادہ کر کے آئندہ کے مراحل میں زیادہ خود اعتمادی کے ساتھ دعوت دے سکیں۔

....

حسب پروگرام ۱۵ 'اکتوبر کو عبدالماجد خاکوانی صاحب کے ساتھ شجاع آباد جانا ہوا۔ نماز عشاء کے بعد شاہی مسجد میں آدھ گھنٹے کا خطاب ہوا۔ بنیادی دعوت یعنی دعوت اجوع الی

القرآن کی وضاحت کی بعدازاں سوال وجواب کی نشست میں لوگوں نے از حد دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ بعض احباب نے جمعہ کو صبح ۱۰ بجے دفترِ تنظیم میں آنے کی درخواست کی گئی ۱۶ اکتوبر نماز فجر کے بعد کمیٹی کی مسجد میں سورۃ عصر کا درس ہوا۔ صبح آٹھ بجے دفتر میں رفقاءِ تنظیم کا اجتماع تھا اس کے بعد سوال وجواب کی نشست ہوئی۔ رات کو جن احباب سے گزارش کی گئی تھی وہ تشریف لے آئے اور ساڑھے گیارہ بجے تک گفتگو رہی۔ قریبی اسٹیشن ظریف شہید کی آبادی میں خطبۂ جمعہ کا موقع ملا جہاں حکمت واحکامِ جمعہ کے موضوع پر خطاب ہوا اور قرآن مجید کے تعلیم وتعلم پر زور دیا گیا۔

....

۱۶ اکتوبر شام سے ۲۳ اکتوبر تک ہفت روزہ تربیت گاہ منعقد ہوئی جس کی رپورٹ الگ منسلک کی جارہی ہے۔

....

تنظیم اسلامی ملتان کا ہفتہ وار اجتماع پہلے سے جمعہ کی شام کو مغرب تا عشاء چل رہا تھا۔ اس کی افادیت میں اضافے اور ایک عوامی درسِ قرآن کے پیش نظر اب یہ اجتماع ہر جمعہ کو عصر تا رات ۱۰ بجے ہوتا ہے جس میں مغرب تا عشاء عام درسِ قرآن ہوتا ہے (منتخب نصاب زیرِ مطالعہ ہے) اجتماعی کھانے میں رفقاء وشرکاء گھر سے اپنا کھانا لاتے ہیں۔ ذاتی ملاقاتوں کے ذریعہ رفقاء سے از سرِ نو رابطہ استوار کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے اور اب ہفتہ وار پروگراموں میں شرکاء کی تعداد کافی بہتر ہے اور الحمد للہ حاضری بتدریج بڑھ رہی ہے۔

....

۵ نومبر کو بارہ ربیع اول کی تعطیل تھی مغرب تا عشاء مجلسِ مشاورت کا دوسرا اجلاس بلایا گیا تھا۔ جس میں الحمد للہ تمام اراکین نے شرکت فرمائی بلکہ لاہور سے ڈاکٹر طاہر خاکوانی اور ملتان سے عبدالرحمٰن خاکوانی صاحب بھی شریک ہوئے۔

یہ نشست رات ساڑھے نو بجے تک جاری رہی جس میں مندرجہ ذیل فیصلے متفقہ طور پر ہوئے۔

۱۔ تنظیم کی دعوت کو عام کرنے کے لئے نمازِ جمعہ کے بعد اپنی کتابوں کے زیادہ سے زیادہ سٹال لگائے جائیں۔

۲۔ آئندہ ماہ کے لئے راقم کے مندرجہ ذیل پروگرام طے ہوئے۔

۶ر نومبر	جمعۃ المبارک	وہاڑی	مسجد اہلحدیث لکڑ منڈی
۱۲-۱۳ر نومبر	جمعرات جمعہ	مظفر گڑھ	
۱۹-۲۰ر نومبر	جمعرات جمعہ	بہاول پور	
۲۶-۲۷ر نومبر	جمعرات جمعہ	ملتان	
۳-۴ر دسمبر	جمعرات جمعہ	رحیم یار خان	

۳۔ بعض رفقاء جو پہلی تربیت گاہ میں بوجوہ شریک نہیں ہو سکے ان کے سہولت کے لئے ۲۵ دسمبر تا ۳۱ دسمبر ۸۷ ایک اور ہفت روزہ اقامتی تربیت گاہ کا فیصلہ ہوا

۴۔ تنظیم کی دعوت کو پھیلانے اور خود اعتمادی کے لئے ہمارے جن رفقاء کے کاروباری وزٹنگ کارڈز ہیں ان سے درخواست کی گئی کہ وہ کارڈ کی دوسری طرف مقامی تنظیم اسلامی کا پتہ ضرور تحریر کروائیں۔

۵۔ توسیعِ دعوت کے ضمن میں حلقۂ درس کے دو حلقے قائم کئے گئے۔

(۱) شجاع آباد جہاں جناب محمدؐ سعید بھٹہ صاحب ہر جمعرات مغرب تا عشاء تشریف لے جایا کریں گے۔

(۲) ۔ وہاڑی جہاں محترم ڈاکٹر منظور حسین صاحب اتوار کو عصر تا بعد عشاء جایا کریں گے۔

۶۔ تنظیم اسلامی کا سالانہ اجتماع جو اوائل اپریل میں لاہور میں ہوتا ہے اس سے متعلق غور کیا گیا کہ آیا ملتان میں ہو سکتا ہے یا نہیں؟۔ ایک گھنٹے کی تفصیلی گفتگو کے بعد متفقہ طور پر طے پایا کہ یہ اجتماع جس میں ۷۰۰ کے لگ بھگ رفقاء کی شرکت متوقع ہے ملتان میں منعقد کیا جا سکتا ہے۔ اگر مرکز بھی اعانت کرے تو مقامی تنظیم اور رفقاء اس ذمہ داری کو بخوشی قبول کرنے کو تیار ہیں۔ اس سلسلے میں طے پایا کہ یہ پیشکش امیر محترم کو کر دی جائے کہ آئندہ مجوزہ سالانہ اجتماع ملتان میں منعقد کیا جائے۔

.. ..

۶ نومبر کو جمعۃ المبارک کے دن مسجد اہلِ حدیث لکڑ منڈی وہاڑی میں راقم کو خطاب کا موقع ملا سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے تنظیم کی دعوت پیش کی گئی۔ مقامی رفقاء اس سے مطمئن تھے۔ اللہ کرے کہ یہ دورہ اور جناب ڈاکٹر منظور صاحب کا ہفتہ وار خطاب اور ملاقاتیں لوگوں کو اور قریب لانے اور تنظیم کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ کر سکیں۔

جھنگ صدر (جہاں راقم کی رہائش ہے) میں اگرچہ ابھی تک حلقہ ملتان کا کوئی پروگرام منعقد نہیں ہو سکا۔ تاہم اس درس قرآن کی ھفت وار نشست کا تذکرہ ضروری ہے جو ہر سوموار کو جھنگ شہر میں برادرم آفتاب اقبال صاحب (رفیق تنظیم ریاض حال مقیم جھنگ شہر فون ۲۷۵۸) کے مکان پر ہوتی ہے منتخب نصاب زیر درس ہے آج کل سورۃ تغابن کا مطالعہ جاری ہے حاضری ' الحمد للہ ۳۵۔ ۳۰ افراد پر مشتمل ہے جس میں سے اکثر شرکاء کافی باقاعدگی سے تشریف لا رہے ہیں۔ مقامی زبان ہی اس درس میں ابلاغ کا ذریعہ ہے۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ دوسری ھفت روزہ تربیت گاہ جو انشاءاللہ ۲۵ دسمبر تا ۳۱ دسمبر ۸۷ ملتان میں منعقد ہوگی اس کے متصلاً بعد حلقہ ملتان کے تمام رفقاء کے لئے یکم جنوری ۸۸ کو بروز جمعۃ المبارک صبح ۹ بجے یک روزہ اجتماع منعقد ہو گا جس میں امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے شرکت قبول فرمائی ہے۔ تمام رفقاء کو اس اجتماع کی اطلاع بھجوائی جا چکی ہے۔ اللہ کرے ہم اس تربیت گاہ اور اجتماع سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔

اس تربیت گاہ اور اجتماع کے بارے میں دوسرے حلقوں اور تنظیموں سے بھی گزارش ہے کہ جہاں سے بھی کوئی رفیق ان پروگراموں میں شرکت کا خواہش مند ہو اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

امیر محترم نے زبانی طور پر بھی اور کیسٹ کے ذریعے پیغام میں بھی اس حلقہ ملتان سے اپنی سب سے زیادہ توقعات وابستہ فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی دلی توقعات پر پورا اترنے کی توفیق بخشے تاکہ ہم ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان کر سکیں۔ یہ کام اب ہم سب کے مل کر کرنے کا ہے رفقائے حلقہ اپنی صلاحیتوں اور اوقات کے ذریعے اور بیرون حلقہ رفقاء اور اکابرین دعاؤں کے ذریعے ہماری ھمت بڑھائیں تو ہی اس کام میں سرخروئی ہو سکتی ہے۔ اور اگر ہماری روایتی سستی اور کاہلی آڑے آگئی اور خیریت جان اور صحت داماں کی فکر ہی دامن گیر رہی تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ وسلم کی ناراضگی کے ساتھ ساتھ اپنے محبوب قائد کی ناراضگی کا بھی خطرہ ہے اس لئے کہ ۔

وہ نگاہ جو مست رکھتی ہے رندوں کو
بڑا غضب ہے کبھی محتسب بھی ہوتی ہے۔

وما النصر الا من عند اللہ

❁❁❁❁

حلقہ جنوبی پنجاب کے تاسیسی اجتماع (۲ اکتوبر ۸۶ء) کے موقع پر

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا پیغام

مرتب: شیخ جمیل الرحمٰن

محترم رفقاء گرامی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ آپ حضرات کی توقع ہوگی کہ میں حلقہ ملتان کے اس تاسیسی اجتماع میں بذات خود شریک ہوں گا لیکن میری غیر حاضری سے یقیناً آپ حضرات کو افسوس ہوا ہو گا۔ واقعہ یہ ہے کہ ادھر خود مجھے بھی افسوس کچھ کم نہیں ہے۔ میری اپنی شدید دلی خواہش تھی کہ اس موقع پر آپ حضرات کے مابین میں بھی موجود ہوتا اور براہ راست آپ لوگوں سے ملاقات بھی ہوتی اور گفتگو بھی۔ اسی مقصد کے لئے ہوائی جہاز میں سیٹ بک کرائی گئی تھی لیکن پچھلے جمعہ اور ہفتے سے میں نے خطاب جمعہ اور درس قرآن کا جب دوبارہ سلسلہ شروع کیا تو میری کمر کے درد میں کچھ ٹیسیں پھر محسوس ہوئیں۔ اگرچہ اس وقت یہ درد اتنا شدید نہیں ہے کہ اس کی بنا پر میں حرکت نہ کر سکوں۔ اس سے پہلے میں اس قسم کے درد کو خاطر میں نہیں لایا کرتا تھا بلکہ چند ادویات استعمال کر کے اپنی مصروفیات جاری رکھتا تھا۔ لیکن اس مرتبہ مرض کا جو شدید حملہ مجھ پر کراچی میں ہوا تھا اور میرے بیس دن اسی کیفیت میں گزرے ہیں کہ میں اس عرصہ کے دوران کافی دنوں تک حقیقی معنوں میں صاحبِ فراش رہا ہوں تو اس بنا پر واقعہ یہ ہے کہ اب سفر کے معاملہ میں ایک خوف سا ذہن میں بیٹھ گیا ہے۔ اگر لاہور میں رہتے ہوئے درد میں اضافہ بھی ہو جائے تو شاید میرے لئے اتنی پریشان کن بات نہ ہوتی جتنی اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ کہیں باہر یا دورانِ سفر تکلیف میں شدت کا سلسلہ پیدا ہو جائے تو خدانخواستہ پھر کہیں وہ شکل نہ بن جائے کہ مجھے اسٹریچر پر ہوائی جہاز سے لاہور واپسی کے لئے سفر کرنا پڑے جیسا کہ کراچی سے لاہور واپسی کے موقع پر ہوا تھا۔ چنانچہ اس وقت جو دو حضرات میرے معالجین ہیں' جن کے نام بھی تازہ میثاق میں آگئے ہیں ایک ڈاکٹر عبدالرزاق قاضی صاحب جو آرتھوپیڈسٹ سرجن ہیں اور دوسرے ڈاکٹر منور حیات صاحب جو نیورو فزیشن ہیں' ان دونوں کی رائے اور مشورہ یہ ہے کہ ابھی میں زیادہ سے زیادہ آرام کروں اور سفر سے پرہیز کروں۔ لہٰذا مجھے ملتان کے سفر کو منسوخ کرنا پڑا۔

اب عربی کے اس مقولہ کے مطابق کہ مالا یدرک کلہ لا یترک بعضہ یعنی جو چیز پوری کی پوری اور کل کی کل حاصل نہیں ہو سکتی وہ پوری کی پوری اور کل کی کل چھوڑ دینی بھی نہیں چاہئے۔ جو کچھ میسر آجائے اسے غنیمت سمجھنا چاہئے۔ لہٰذا اس موقع پر میں آپ حضرات سے بذریعہ کیسٹ مخاطب ہوں اور آپ حضرات بالکل یہ محسوس کیجئے کہ میں اپنے احساسات اور دلی جذبات کے اعتبار سے واقعتاً اس وقت آپ ہی کے مابین موجود ہوں۔ لاہور میں جب مجھے رفقاء تنظیم سے خطاب کا موقع ملا تو میں نے عرض کیا تھا۔ اور ہو سکتا ہے کہ میرے کیسٹ کے ذریعے سے آپ میں سے بھی بہت سارے حضرات تک میری بات پہنچ چکی ہو۔ کہ یہ بیماری جہاں ہمیں بظاہر ایک شر نظر آتی ہے وہاں اس میں یقیناً اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خیر ہے۔ اس پر ہمیں دلی یقین ہونا چاہئے' یہ ہمارے ایمان کا تقاضہ ہے کہ ہم پورے شعور کے ساتھ یہ یقین رکھیں کہ اس میں کوئی خیر ہی مضمر ہے۔

ایک خیر تو ہمیں خود بھی اپنی آنکھوں سے نظر آرہا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری تحریک اور تنظیم کے بارے میں ایک تصور بہت ہی عام ہے کہ یہ "One Man Show" ________ ہے کہ شاید ایک ہی شخص ہے جس کے بل بوتے پر یہ پوری تحریک و تنظیم قائم ہے۔ اور ہماری اس چھوٹی اور حقیر سی تحریک و تنظیم کی جو بھی ساکھ اور نیک نامی ہے وہ ایک ہی شخص کے دم کے ساتھ ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ میری اس بیماری کی وجہ سے اس وقت مجھے ایک نوع کی جو معذوری ہو گئی ہے اس کے ذریعہ سے ایک موقع ملا ہے کہ تنظیم اس بات کو ثابت کرے کہ اس میں جو لوگ شریک ہیں وہ اپنے شعوری فیصلے کے ساتھ اور اپنے احساسِ فرض کے ساتھ شریک ہیں اور اگرچہ جب میں حرکت میں ہوتا ہوں اور میری تقاریر اور دروس کا سلسلہ جاری رہتا ہے تو یقیناً دوسرے ساتھیوں کو اطمینان ہوتا ہے کہ کام ہو رہا ہے۔ پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق سے بیس سالہ کام کی بدولت میرا جو تعارف ہو چکا ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ میرا درس یا تقریر سننے کے لئے لوگ زیادہ جمع ہو جاتے ہیں۔ لیکن مجھے توقع ہے کہ اس بیماری کی وجہ سے میری مصروفیات میں جو وقفہ پڑے گا تو ان شاء اللہ ہمارے ساتھیوں کو یہ ثابت کرنے کا موقع ملے گا کہ بحمد اللہ ہماری صفوں میں بہر حال چند اور بھی باصلاحیت اور باہمت لوگ موجود ہیں جو اللہ نے چاہا تو اس تحریک کو آگے بڑھانے اور اس کی بیش از بیش ترقی و توسیع اور استحکام میں کماحقہ حصہ ادا کر سکتے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس بیماری میں خیر کا یہ پہلو ہے اور ہمیں اس خیر سے زیادہ سے زیادہ

فائدہ اٹھانا چاہئے اور یہ اسی وقت ممکن ہو گا جب آپ میں سے ہر رفیق یہ سمجھے کہ وہ از خود اس سے پہلے جو کام بھی اس تحریک اور تنظیم کے لئے کر رہا تھا اور اپنا وقت دے رہا تھا اب اسے لامحالہ مزید حصہ میرے نام بھی ڈالنا ہو گا۔ اس میں دعوتی و تنظیمی کاموں کے اوقات میں اضافہ کرنا ہو گا۔ اس تحریک کے لئے جو کچھ بھی میرا حصہ تھا 'اس کو اب تمام رفقاء نے مل جل کر پورا کرنا ہو گا۔ لہٰذا ہر رفیق کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس اضافی فرض کا احساس اور شعور اپنے قلب و ذہن میں ثبت کرے اور اس کے مطابق اپنی COMMITMENT ______ 'اپنی ذمہ داری 'اپنی وابستگی 'اپنے وقت اور پیسے کے صرف میں اضافہ کرے۔

ایک اور بات بھی کافی عرصہ سے آپ حضرات کے سامنے آتی رہی ہو گی اور وہ یہ کہ میں کئی مرتبہ یہ بات سوچ چکا ہوں کہ اب مجھے اپنے سفر اور دورے کم کر دینے چاہئیں ساتھ ہی دروس و تقاریر کے سلسلہ میں بھی کمی کرنی چاہئے۔ اور زیادہ وقت کچھ لکھنے کی طرف دینا چاہئے۔ مزید یہ کہ قرآن اکیڈمی میں بیٹھ کر ان نوجوانوں کی تربیت کی طرف متوجہ ہونا چاہئے جو ہمہ وقت و ہمہ تن اس کام کے لئے خود کو وقف کر چکے ہیں۔ لیکن عقلی اور شعوری طور پر اس فیصلہ تک بارہا پہنچ جانے کے باوجود اس پر عمل در آمد نہیں ہو پایا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ جب احباب کے تقاضے آتے تھے اور نہ صرف احباب کے بلکہ دوسرے اداروں کی طرف سے دعوت موصول ہوتی تھی اور دعوت کے ساتھ بہت زیادہ اصرار اور بعض اوقات خوشامد تک کا انداز ہوتا تھا تو میں اپنی مزاجی کمزوری کی بنا پر انکار کر نہیں پاتا تھا اور جب کسی ایک دعوت کو قبول کر لیتا تھا تو یہ گویا مزید کسی دعوت کو قبول کرنے کے لئے دلیل بن جاتی تھی۔ اس طرح یہ سرکل ٹوٹنے میں نہیں آ رہا تھا۔ لہٰذا میں یہ سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ جو صورت پیدا فرمائی ہے تو اس میں یہ حکمت ہو کہ میں اب مجبور ہو کر اس کام کی طرف متوجہ ہو سکوں جس کی بڑی افادیت ہے یعنی کچھ تحریر کا کام کروں اور اپنا زیادہ سے زیادہ وقت قرآن حکیم کی روشنی میں ان نوجوانوں کی ذہنی و عملی تربیت کے لئے نکال سکوں جو قرآن مجید کی تعلیم و تعلم میں زندگیاں لگانے کا شعوری طور پر فیصلہ کر چکے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ نوجوان ہماری اسلامی انقلابی تحریک اور دعوت و تبلیغ دین کے لئے بیش بہا سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان نوجوانوں کو استقامت اور توفیق عطا فرمائے کہ وہ خلوص و اخلاص کے ساتھ دین متین کی خدمت ہی میں اپنی توانائیاں اور صلاحیتیں صرف کریں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ اپنی حکمتوں اور

مصلحتوں سے کماحقہ واقف ہے ہم لوگوں کو اجمالاً ایمان بالغیب رکھنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی ہم پر وارد ہو ہمارے ایمان کا تقاضہ ہے کہ ہم اسے خندہ پیشانی سے قبول کریں۔ اس پر کوئی شکوہ اور شکایت نہ ہو اور دل میں یہ یقین رکھیں کہ ع ہر آں کہ ساقیِ ما ریخت عین الطاف است۔ یعنی ہمارے پیالہ میں ہمارا مالک جو کچھ بھی ڈال دے وہ اس کا لطف و کرم ہے اور ہمیں اسے دلی شکریہ کے ساتھ قبول کرنا چاہئے۔

آپ کا یہ اجتماع جو اس وقت منعقد ہو رہا ہے' اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ حلقہ جاتی نظام کا جو آغاز ہم نے حال ہی میں کیا ہے اس کے ضمن میں حلقۂ ملتان (جنوبی پنجاب) کی اس اجتماع کی صورت میں گویا تاسیس ہو رہی ہے اور اس کے دفتر کا افتتاح ہو رہا ہے۔ اس ذیل میں ہم سب پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی شکر واجب ہے کہ اس کی توفیق و تائید سے یہ دعوت آگے بڑھ رہی ہے اور اسی توسیع دعوت کے فطری تقاضے کے مطابق اس نے یہ فیصلہ کرنے میں ہماری رہنمائی فرمائی کہ اب علاقہ جات نظام کا باقاعدہ ایک سلسلہ شروع ہو جانا چاہئے۔ یہ گویا تنظیم کے آگے بڑھنے کی ایک علامت ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس اٹھے ہوئے قدم کو مضبوط اور مستحکم بنائے اور اسے قدموں کے مزید آگے بڑھنے کی تمہید بنائے۔

اب میں آپ حضرات سے حلقہ ملتان کی اہمیت کے بارے میں خاص طور پر چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حلقہ ایک اعتبار سے پاکستان کا قلب ہے۔ ویسے تو لاہور کو پاکستان کا قلب کہا جاتا ہے۔

پاکستان کے مختلف علاقوں کی مختلف پہلوؤں سے توصیف کی جاتی ہے۔ بلاشبہ بہت سے پہلوؤں کے پیش نظر لاہور کو پاکستان کا قلب کہنا درست ہے لیکن میں اس حلقہ کو پاکستان کا قلب اس اعتبار سے کہہ رہا ہوں کہ جغرافیائی اعتبار سے یہ پاکستان کا قریباً وسط ہے۔ درمیانی حصہ ہے۔ پھر تہذیبی' تمدنی اور لسانی اعتبار سے بھی یہ حلقہ پاکستان کا درمیانی اور مرکزی حصہ بنتا ہے۔ پاکستان میں جتنی بھی تہذیبیں ہیں اور جتنی بھی زبانیں ہیں وہ سب جہاں آکر ملتی ہیں تو ان کا نقطۂ اتصال اور ان کا مرکزی علاقہ بنتا ہے اور یہ علاقہ اس اعتبار سے پاکستان میں ایک خصوصی اور امتیازی اہمیت کا حامل ہے۔

یوں تو پورے پاکستان میں ہمارے کام کی کوئی زیادہ وسعت نہیں ہوئی ہے لیکن اس علاقہ میں ابھی ایسے بڑے بڑے حصے ہیں جہاں ہماری دعوت بالکل پہنچ نہیں پائی ہے۔ دعوت کا تعارف اگرچہ مختلف ذرائع ابلاغ کے ذریعے ہو چکا ہو گا اور میرا شخصی تعارف بھی یقیناً اس حلقہ

کے چند دوسرے بڑے شہروں اور بڑے بڑے قصبات کے اندر موجود ہے لیکن اس پورے حلقہ میں بہت سے ایسے مقامات اور بہت سے ایسے حصے ہیں جن تک تنظیم کا تنظیم کے اعتبار سے نہ تعارف موجود ہے اور نہ ہی اس کی اسلامی انقلابی دعوت نے وہاں کوئی جڑ پکڑی ہے۔ اس اعتبار سے اب آپ حضرات کے لئے یہ ایک چیلنج ہے۔ اور زندگی دراصل نام ہی اس کا ہے کہ ہر آن ایک نیا چیلنج ہو اور ہر نئے چیلنج کا آدمی مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ رہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو جو بھی توانائی' صلاحیت اور قوت عطا فرمائی ہے خواہ وہ ذہنی ہو خواہ جسمانی ہو' ان سب کو اس چیلنج کو قبول کرنے میں بروئے کار لائے۔ تو اس حلقہ کی اہمیت کے اعتبار سے آپ حضرات کے لئے یہ خصوصی چیلنج ہے اور اسے آپ کو مومنانہ جذبہ اور ولولہ کے ساتھ قبول کرنا ہے۔

اس حلقہ کی امارت کے لئے میں نے جب اپنے رفقاء پر نگاہ دوڑائی تو وہ مختار حسین فاروقی پر جاکر جم گئی وہ اس حلقے میں ہمارے سب سے زیادہ پرانے سب سے زیادہ تجربہ کار اور سب سے زیادہ باصلاحیت رفیق ہیں۔ شاید بہت سے رفقاء کو اس بات کا علم نہیں ہو گا کہ مختار حسین فاروقی صاحب میرے کام کے قریباً ابتدائی ساتھیوں میں سے ہیں۔ میں نے جب ۶۸ - ۶۷ء میں لاہور کے مختلف علاقوں میں متعدد حلقہ ہائے مطالعہ قرآنِ حکیم قائم کئے اور ان میں منتخب نصاب کے دروس کا سلسلہ شروع کیا تو فاروقی صاحب جو اس زمانہ میں کالج کے طالب علم تھے اسی زمانہ میں دعوتِ قرآنی سے متعارف ہوئے اور اس سے متاثر ہو کر میرے فعال ساتھیوں میں شامل ہو گئے۔ میرے خیال کے مطابق نوجوانوں میں سب سے پہلے اس دعوت پر لبیک کہنے اور اس کو حرزِ جاں بنانے والے نوجوان فاروقی صاحب تھے۔ پھر سب سے پہلے ہمارے حلقوں میں خطاب اور درس کی کچھ صلاحیت جس نوجوان نے حاصل کی وہ یہی مختار حسین فاروقی تھے۔ لاہور میں میری عدم موجودگی میں دروس اور خطابات میں یہی میری نیابت کرتے تھے۔ مرکزی انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے تاسیس میں بھی ان کا پورا تعاون حاصل رہا ۷۷ء کے اوائل تک یہ تنظیم کے ساتھ وابستہ رہے۔ پھر انہوں نے اپنی چند ذاتی اختلافی آرا کی بنیاد پر تنظیم سے علیحدگی اختیار کر لی۔ بعد ازاں یہ کراچی چلے گئے۔ وہاں انہوں نے تعمیرات کا کام جمایا۔ اگرچہ یہ تنظیم سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ لیکن تنظیم کی دعوت سے ان کو نہ اختلاف تھا نہ بُعد۔ بلکہ یہ انفرادی طور پر دعوتِ رجوع الی القرآن اور تحریک کا کام کرتے رہے اور انہوں نے اپنے طور پر کورنگی میں درس قرآن کا حلقہ قائم کیا۔ ان کے مجھ سے اور تنظیم کے بہت سے رفقاء سے نہایت اچھے تعلقات قائم رہے۔ کراچی میں جب بھی میرے

درد س وقار یر کے پروگرام ہوتے تھے ان میں سے اکثر میں یہ شریک ہوتے تھے۔ قریباً ڈیڑھ دو سال قبل اللہ تعالیٰ نے ان کو شرح صدر عطا فرمایا اور یہ بیعت کر کے تنظیم کے بھی رفیق بن گئے۔ الحمد اللہ یہ بھی بہت عمدہ مثال ہے۔ میں نے ان کو کراچی کی تنظیم کا نائب امیر مقرر کیا اور انہوں نے بڑی لگن ' تن دہی اور ذمہ داری کے ساتھ تفویض کردہ کام انجام دیا اور مقامی امیر کے دست و بازو ثابت ہوئے۔ قریباً چھ ماہ قبل یہ کراچی سے اپنا کام سمیٹ کر مستقل طور اپنے آبائی وطن جھنگ منتقل ہو گئے۔ جب حلقہ جاتی نظام کو عملی شکل دینے کا مرحلہ آیا تو حلقہ ملتان (جنوبی پنجاب) کی امارت کے لئے میری نگاہِ انتخاب فاروقی صاحب پر پڑی اور میں نے ان کو اس حلقے کا امیر نامزد کر دیا۔

میں نے فاروقی صاحب کے قدرے تفصیل سے تعارف کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ آپ میں سے کچھ رفقاء یہ نہ سمجھیں کہ امارت کا اہم اور ذمہ داری کا منصب ایک نووارد کو دے دیا گیا ہے۔ اصل وجوہ وہی ہیں جن کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔ اگرچہ ابھی ان کی رہائش جھنگ میں رہے گی لیکن ان شاء اللہ العزیز وہ ہفتہ میں تین دن ملتان رہا کریں گے اور اس طریقہ سے اس حلقہ کو بھرپور وقت دیں گے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ کام اصلاً ان رفقاء کو کرنا ہے جو ملتان میں ' شجاع آباد میں ' وہاڑی میں اور دوسرے مقامات پر منفرد رفقاء مقیم ہیں۔ وہ فاروقی صاحب سے رہنمائی لے کر خود اپنے طور پر توسیع دعوت کے لئے کام کریں گے تو گاڑی آگے چلے گی۔ میں نے تنظیم کے ایک مناسب ترین اور بہت سے اعتبارات سے ایک باصلاحیت ' تجربہ کار رفیق کی توانائیوں اور قوتوں کو آپ کے حلقہ کے حوالے کیا ہے۔ لیکن ان سے بھرپور فائدہ اٹھانا درحقیقت آپ کا کام ہے۔ اگر آپ آگے بڑھ کر ذمہ داری کا اپنا حصہ ادا نہیں کریں گے تو ظاہر بات ہے کہ فاروقی صاحب معذور رہیں گے۔ اور چونکہ وہ ملتان میں قیام پذیر بھی نہیں ہوں گے لہٰذا وہ آپ حضرات کے تعاون کے بغیر زیادہ کام نہیں کر پائیں گے۔

________ اب یہ آپ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ ان کے وقت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں اور اسے زیادہ سے زیادہ بار آور بنائیں۔

اب میں جو بات عرض کرنا چاہتا ہوں اس کے متعلق پیشگی عرض کرتا ہوں کہ واقعہ یہ ہے کہ میں کسی تصنع اور تکلف سے کام نہیں لے رہا۔ وہ یہ کہ میں سب سے زیادہ توقع اسی حلقہ ملتان سے وابستہ کر رہا ہوں۔ اپنی جگہ یہ حقیقت ہے کہ اس حلقہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف

سے ہمارے لئے بہت سی سہولتیں بہم پہنچ گئی ہیں۔ ریٹائرڈ کرنل ڈاکٹر غلام حیدر ترین صاحب نے اپنی کوٹھی میں دفترِ تنظیم کے لئے معقول جگہ دی ہے۔ ہمارے ایک مستقل کارکن قیم حلقہ کی رہائش کے لئے وہاں بندوبست اور قیم کی ذمہ داری میں نے ڈاکٹر منظور حسین صاحب کے سپرد کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لاہور میں گڑھی شاہو والے مرکز میں بڑا مفید کام کر رہے تھے لیکن حلقہ ملتان کی اہمیت کے پیش نظر قیم کی ذمہ داری کے لئے ایک تجربہ کار رفیق کی ضرورت تھی لہٰذا میں نے ان کی خدمات بھی اس حلقہ کے سپرد کر دی ہیں۔ گویا اس حلقہ کے لئے ایک ہمہ وقت فعال رفیق بھی اللہ تعالیٰ نے مہیا کر دیا ہے۔ اب ان شاء اللہ یہ ہمارا ایک ایسا مرکز ہو گا کہ ہمارا کوئی ساتھی کہیں سے بھی آئے اسے ایک معین جگہ معلوم ہو گی جہاں ہمارے ایک تجربہ کار رفیق ہر وقت موجود ملیں گے اور اس طریقے سے اسے ہمارے ایک 'NERVE CENTRE' ——— کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی سہولت پاکستان بھر میں تنظیم کو صرف لاہور میں حاصل ہے۔ کراچی میں بھی یہ سہولت حاصل نہیں ہے۔ کراچی میں اگرچہ ہمارا دفتر ہے لیکن جس طرح مشہور شاہراہ پر دفاتر ہوتے ہیں اسی طرح کا دفتر ہے۔ وہاں کسی کا مستقل قیام نہیں ہے۔ وہاں کسی باہر سے آنے والے کے لئے قیام کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ الحمد اللہ یہ سہولت ہمیں لاہور میں اب دو جگہ بہم پہنچ چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے قرآن اکیڈمی بھی مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی طرف سے ہمارے لئے ہر وقت کھلی ہوئی ہے۔ اور ہماری 'DISPOSAL' پر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ گڑھی شاہو میں بھی اس طرح کا مناسب بندوبست مہیا ہو گیا ہے۔ ان کے علاوہ پورے پاکستان میں کہیں اور اس طرح کی سہولت موجود نہیں ہے۔ حلقہ ملتان کے لئے ڈاکٹر غلام حیدر ترین صاحب نے سہولت بہم پہنچا کر یقیناً اس کار خیر میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ لیکن اس سے در حقیقت صحیح طور پر فائدہ اٹھانا رفقاء کی اپنی محنت' مشقت' تحریک اور دعوت کیلئے بھاگ دوڑ اور زیادہ سے زیادہ وقت دینے پر منحصر ہو گا۔ اگر وہ وقت نہ نکالیں اور اسے ایک 'THROBING CENTRE' ——— نہ بنا دیں کہ معلوم ہو کہ اس مرکز میں ہر وقت حرکت ہے' لوگوں کی آمد و رفت ہے اور یہ ایک زندہ اور فعال دینی انقلابی تحریک کا مرکز ہے۔ اگر عملاً یہ شکل پیدا نہ ہوئی تو ان ساری سہولتوں کا بھی حق ادا نہیں ہو گا اور یقیناً ہم اللہ تعالیٰ کے یہاں کفرانِ نعمت کے لئے جواب دہ ہو جائیں گے۔

میں اس وقت صرف انہی امور کے بیان پر اکتفا کر رہا ہوں اور دعا کر رہا ہوں کہ اس حلقہ کے قیام کی صورت میں جن ذمہ داریوں کا بوجھ آپ حضرات کے کاندھوں پر آن پڑا ہے اللہ تعالیٰ آپ تمام حضرات کو ان ذمہ داریوں سے کماحقہ عہدہ برا ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ ہم سب کی ہدایت میں اضافہ فرمائے' ہمیں استقامت عطا فرمائے اور ہمیں زیادہ سے زیادہ توفیق دے کہ ہم اس کے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کریں اور اس کام میں زیادہ سے زیادہ ایثار سے کام لیتے ہوئے اپنا زیادہ سے زیادہ وقت' صلاحیت اور مال لگائیں۔

اقول قولی ھٰذا استغفر اللہ لی ولکم ولسائرین المسلمین والمسلمات

****

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا
قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا ۝

(الفرقان : ۷۴)

اے ہمارے رب
ہمیں ہماری اولاد اور بیویوں (کی طرف) سے
آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما
اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا دے

□ □ □ □

میاں عبدالواحد

بھگوان سٹریٹ، پرانی انارکلی لاہور

افکار و آراء

ڈاکٹر شیر بہادر خان پنیؒ رحلت فرما گئے

مکتوب گرامی قاضی عبدالقدوس صاحب، ایبٹ آباد

مکرمی اقتدار احمد صاحب

مینجنگ ایڈیٹر ماہنامہ میثاق لاہور

السلامُ علیکم۔ عرصہ ایک سال سے آپ کے ماہنامہ کا باقاعدہ قاری ہوں۔ اور جس طرح انہوں نے دنیاوی تاریکیوں میں میں روشنی کی کرن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور کر رہے ہیں ان ہی کا حصہ ہے۔ اس ماہنامہ میں گزشتہ چند اشاعتوں میں میرے بزرگ اور پڑوس میں بسنے والے ڈاکٹر شیر بہادر صاحب کے خطوط بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی نرینہ اولاد کو توان کی بڑھاپے میں خدمت کا موقع میسر نہ آسکا صرف ان کی ایک بچی ان کو ایبٹ آباد سے اس وقت اپنے پاس پشاور لے گئی جب ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی بھی باقی نہ رہا۔ ڈاکٹر صاحب کی اپنے مکان واقع ایبٹ آباد سے روانگی بڑے صدمہ کا باعث تھی ہمارے لئے بھی اور خود ڈاکٹر صاحب کے لئے بھی۔

چونکہ میرا ڈاکٹر صاحب سے قلبی لگاؤ تھا اس لئے کبھی کبھی بذریعہ خط ان کی خیریت پوچھتا رہتا تھا۔ وہ خود بھی مہینہ میں ایک آدھ بار یہاں آیا کرتے تھے۔

آخری بار وہ اکتوبر ۸۷ کے آخری ہفتہ میں تشریف لائے تمام دوستوں سے ملاقات کی اور واپس چلے گئے۔ مجھے بطور خاص اپنی تصنیف کردہ دو کتب "سفر نامہ حج" اور "دیدہ وشنیدہ" عطا فرمائیں۔ میرا شکریہ کا تحریری خط ان تک اجل نے نہ پہنچنے دیا۔

مجھے کل مورخہ ۸۷-۱۱-۹ صبح کی نماز میں مسجد میں اطلاع ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب ۸ اور ۹ کی درمیانی رات بوقت پونے تین بجے حرکت قلب بند ہونے کی بناء پر ہم سے رخصت ہو گئے۔

مرحوم کو ۳ بجے بعد از نماز ظہر دفن کر دیا گیا۔ جنازہ میں ان کے محلہ والوں کے علاوہ ڈاکٹر دانشور۔ علماء اور ان کے اپنے آبائی گاؤں پنیاں سے ان کے اعزہ اور اقارب نے شرکت کی۔ اگر کسی کو حاضر نہ پایا تو وہ صرف ان کے اپنے تین بیٹے تھے جو امریکہ برطانیہ اور سویڈن میں قیام پذیر ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ سے استدعا ہے کہ آپ اپنے رسالہ کے تمام قارئین سے ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی کی مغفرت کے لئے دعا کی درخواست کریں۔ خداوند کریم آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

مرحوم مسجد کے کام میں فیاضی سے خرچ کرتے تھے۔ یتیموں اور بیواؤں کی دستگیری فرماتے تھے۔ اور نماز پنجگانہ با جماعت ادا فرماتے

اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو جنت الفردوس میں بلند ترین مقام عطا فرمائے آمین۔ فقط والسلام

عبدالقدوس خریداری نمبر ۷۶ ر ۱۱

ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی مرحوم کا مدیر 'میثاق' کے نام آخری خط

محترم گرامی زاد عشائیہ

اسلام علیکم۔ امید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہو گا۔ چند دنوں سے میری طبیعت ناساز ہے۔ لیکن عادتِ مطالعہ سے باز نہیں رہ سکتا۔ آپ کی کتاب " جماعتِ شیخ الہند " اور تنظیم اسلامی ملتے ہی پڑھنی شروع کی اور پڑھ کر ہی دم لیا۔ اس کا مواد "گو "میثاق " میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس سب کا صحیح اندازہ میں یکجا شائع ہونے سے آپ کی دعوت کا پس منظر اور نکتۂ نظر صحیح طور پر واضح ہو جاتا ہے کتاب کے مندرجات فکر انگیز اور معلومات افزا ہیں۔

ساری کتاب میں ایک دو جگہ آپ کی نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔

۱...... حضرت شیخ الہندؒ کے ہاتھ پر بمعہ متبعین مولانا آزاد کا بیعت کرنا یہ روائت موضوع درایتاً غیر معقول اور واقعات کے لحاظ سے غلط ہے[1]۔ اس میں یقیناً کوئی شک نہیں کہ مولانا آزادؒ کی ارادت حضرت شیخ الہندؒ سے قلباً ، بہت زیادہ تھی۔ اور معاملہ کچھ ایسا تھا ۔

---

[1] اس سلسلے میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی طرف سے وضاحت اِس شمارے کے 'عرضِ احوال' میں کر دی گئی ہے۔

میان عاشق و معشوق رمزے ست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

گو کہ جب حضرت شیخ الہند نے مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعتِ امامت کرنی چاہی تو ان کے متبعین خاص اس پر آمادہ نہ ہو سکے۔ لیکن ان کا اصرار دمِ آخر تک رہا اور خود ہی اس حسرت کو اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ اس وقت کے طبقہ علماء میں نہ اس امر کا احساس ہی تھا اور نہ ہی اس راز سے واقف تھے۔ کہ مولانا آزاد نے ہی حضرت شیخ الہند کی خواہشات کو عملی جامہ پہنایا اور اپنی عمرِ عزیز کا غالب حصہ نظرِ زندان کر دیا

اس راز سے مولانا آزادؒ نے خود ہی پردہ اٹھایا۔ وہ ترجمانِ قرآن کی جلد دوم صفحہ ۹۵ پر لکھتے ہیں...... "...... ۱۹۱۴ء کی بات ہے۔ کہ مجھے خیال ہوا ہندوستان کے علماء و مشائخ کو عزائم و مقاصدِ وقت پر توجہ دلاؤں۔ ممکن ہے چند اصحابِ رشد و عمل نکل آئیں چنانچہ میں نے اس کی کوشش کی لیکن ایک تنہا شخصیت کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد سب کا متفقہ جواب یہی تھا، کہ یہ دعوت ایک فتنہ ہے اِئذن لی و لا تفتنی یہ مستثنیٰ شخصیت مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کی تھی۔ جواب جوارِ رحمتِ الٰہی میں پہنچ چکی ہے"۔

اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ ملک سے باہر رہے کچھ عرصہ حجاز میں اور کچھ بحیثیت اسیر مالٹا میں۔ جب وہ واپس تشریف لائے تو ان کی زندگی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اور وہ اصرار کرتے رہے۔ کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ بیعت امامتِ ہند کی جائے اور خود وہ اس قدر مضطرب تھے۔ کہ حکم دیا۔ کہ ان کی چارپائی جلسہ گاہ میں اس غرض کے لئے لے جائی جائے مگر ان کی خواہش کو علماء وقت نے پورا نہ ہونے دیا اور وہ جنت الفردوس کو روانہ ہو گئے۔ یہ حسرت دل میں لئے ہوئے۔

اگر اس وقت امام الہند کے ہاتھ پر بیعت ہو جاتی تو یقینِ غالب ہے۔ کہ جس طرح اس سے پہلے مسلمانوں کی حکومت ایک ہزار سال تک ہندوستان پر رہی۔ اسی طرح سارے ہند و پاک پر اسلام کی حکومت تاابد نہیں تو ایک ہزار سال تک ضرور رہتی۔

۲...... آپ نے مولانا آزادؒ کو علامہ شبلی نعمانی کا شاگرد لکھا۔ جو حقیقت نہیں یہ تو دو اَجل علماء کا قران السعدین تھا۔ جن میں سے ایک کی زندگی کے ایام کسب علم اصول و فنونِ اسلامی مین

گزرے اور دوسرے نوجوان عبقری جن کے دل ودماغ کو خدا نے وہی نور علم سے منور کر رکھا تھا۔ ان کی یک جائی افاضہ واستفاضہ کا سلسلہ تھا۔ جس سے امتِ مسلمہ کو فیض پہنچا اس کا اعتراف خود علامہ شبلیؒ نے کیا۔ وہ کہتے ہیں "ابو الکلام الخطاب کا بادشاہ ہے اور میں ایجاز کا" اس سے استادی شاگردی کا سلسلہ کس طرح معلوم ہو گیا۔

آخر میں مودبانہ عرض ہے کہ آئے دن آپ اور محترم شیخ جمیل الرحمٰن اخبارات میں ذاتی اعتراضات کے جواب لکھتے رہتے ہیں اور اپنی صفائی پیش کرنے میں اپنا وقت ضائع کرتے اور اپنی راہ کھوٹی کرتے رہتے ہیں اس کا کیا فائدہ؟ آپ کا کوئی جلیل القدر پیش رو اس جواب بازی کا قائل نہ تھا۔ ہاں مگر کسی علمی مذاکرہ کی بات ہو نہ کہ مجادلہ کی ۔

حسود را نتواں کرد از جدل خاموش
مگر زتیغ تغافل زبان بریدہ شود

مولانا ابو الکلام آزادؒ نے تو اس بارے میں علی الاعلان لکھوا دیا تھا۔

بہ یُمنِ عشق زکونین صلح کل کردم
تو خصم باش و ز من دوستی تماشا کُن

ایک اور بات یاد آ گئی۔ آپ نے مجھے مولانا آزاد کے عاشق صادق کے خطاب سے نوازا۔ شکریہ۔

نازم بہ ایں خطاب کہ مجنون ابو الکلام

ان کی سیرت نے جس میں اول سے آخر تک کوئی جھول نہیں اور ان کی تحریر نے جس میں قرآن کا سحر اور خوشبو ہے۔ شروع سے ایسا رنگ چڑھا دیا۔ کہ کوئی دوسرا رنگ اس پر آج تک چڑھ نہ سکا۔ اور اب یہی رنگ لحد تک ساتھ جائے گا۔

آپ نے اس کتاب میں نوائے وقت کا ایک اداریہ درج فرمایا جس میں مدیر محترم نے آپ کے مولانا آزاد سے اظہارِ محبت وعقیدت پر شدید تنقید کی ہے ۔

ان اصحاب کی ناراضی صرف ایک وقتی سیاسی مسئلہ کی وجہ سے تھی۔ اور یہ معلوم ہے کہ سیاسی آراء کسی وحی پر مبنی نہیں ہوتیں۔ کہ ان پر ایمان لانا فرض ہو۔ جب مولانا کی سیاسی رائے کو قوم نے رد کر دیا' اور پاکستان بن گیا تو انہوں نے علی الاعلان...... بھارت کے وزیر ہوتے ہوئے' پاکستان کو دل سے تسلیم کیا۔ اس کے استحکام کے لئے دردِ دل سے دعا کی۔ اور اس کو

کامیاب کرنے کے لئے قابل ترین افسران کو ہندوستان سے بھیجنے کی سعی کی اور کرتے رہے۔
جب کراچی آئے تو ناموافق ماحول کراچی کے اندر قائد کے مزار پر حاضری دی۔
پھولوں کی چادر چڑھائی اور فاتحہ پڑھی۔ یہ انسانی اخلاق کی عظمت کی انتہا ہے۔ اَلْعَظْمَۃُ لِلّٰہِ۔
تحریر طویل ہو گئی ختم کرتا ہوں وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

بندہ عاصی ڈاکٹر شیر بہادر خان

بقیہ : عرضِ احوال

جدید کے بعض تقاضے کماحقہ ' پورا کرنے کی کوشش کے ساتھ وہاں لوگوں نے چہروں کو داڑھیوں سے بھی سجالیا ہے۔ سکرٹ پس پردہ چلی گئی اور چادر بھرپور انداز میں واپس آگئی ہے۔ کم سن بچیوں کو بھی حجاب کا عادی بنایا جارہا ہے۔ و قس علی ھذا۔ یہ مثال اگر کافی نہیں تو کیا اس بات پر بھی غور نہ فرمایا جائے گا کہ بیسویں صدی میں ماؤ نے چین میں جو انقلاب برپا کیا اسے بھی ظواہر پرستی کی احتیاج محسوس ہوئی۔ نظریاتی اور اور ہمہ گیر عملی تبدیلیوں کے بعد آخر اس بات کی کیوں ضرورت محسوس کی گئی کہ ایک ہی رنگ اور ایک ہی طرز کا لباس ہر مرد و زن کو بلا لحاظ عہدہ و مرتبہ اور پیشے یا فرائض منصبی کی نوعیت کا امتیاز رکھے بغیر پہنا دیا جائے۔ سب مردوں کی حجامت ایک سی کیوں رہی۔ عورتوں کے بالوں کا "سٹائل" شعوری طور پر یکساں کیوں رکھا گیا۔ اور حقانی صاحب جو کم از کم دو بار عوامی چین کا تفصیلی دورہ کر چکے ہیں راقم سے جو دو ڈھائی سال پہلے صرف ہفتے بھر کے لئے وہاں گیا تھا' زیادہ بہتر طور پر اس بات کا مشاہدہ کر چکے ہیں کہ وہاں لباس میں تنوع پیدا ہوا ہے تو ساتھ ہی نظریات کی گرفت بھی کمزور ہو گئی...... ٹائی ' سوٹ ' سکرٹ اور "ہائی ہیل" کے ساتھ ساتھ وہاں اب ڈسکو کلچر بھی آرہا ہے ' نائٹ کلب بھی کھل رہے ہیں...... انقلابی تبدیلیوں کے برفانی تودے پگھل رہے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ سرخ چین گلابی تو ہو ہی گیا ہے۔ اگر ظواہر سے اعتناء جاری رہا تو چند برسوں بعد اس کا سفید ہو جانا بھی بعید از قیاس نہیں۔

الغرض ہمارے نزدیک ظواہر کی اہمیت کو گھٹانا نظریے سے وابستگی اور اس کے ساتھ اپنے تشخص کو کم کرنا ہے جو کسی زوال پذیر معاشرے کے اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ہمیں اگر اپنے دین کو ایک اعلیٰ و ارفع نظام زندگی کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے تو ظواہر کو بھی دانتوں سے پکڑنا ہو گا تاکہ ہمارا تشخص بحال ہو اور دیکھنے والے دور سے ہمیں پہچاننے لگیں......

☆ ☆ ☆

حدیثِ رسولؐ

وَعَنْ

عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ

قَالَ: بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم

عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ

فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ

وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ

وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا

وَاَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ، اِلَّا اَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ

مِّنَ اللّٰهِ فِيْهِ بُرْهَانٌ،

وَعَلٰى اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ

لَوْمَةَ لَائِمٍ (بخاری و مسلم)

مفہوم: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کہ:

ہم ہر حالت میں اللہ اور رسول اور اُن لوگوں کی جن کو امیر مقرر کیا گیا ہو بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔ خواہ تنگی کی حالت ہو یا فراخی کی اور خوشی کی حالت میں بھی اور ناپسندیدگی کی حالت میں بھی اور اُس صورت میں بھی جب کہ دوسروں کو ہمارے مقابلے میں ترجیح دی گئی ہو۔ امیر سے جھگڑا نہیں کریں گے۔ سوائے اس کے کہ امیر سے کھلا ہوا کفر سرزد ہو۔ اُس وقت ہمارے پاس دلیل ہوگی کہ ہم اُس کی بات نہ مانیں اور جہاں کہیں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے۔ اللہ کے سلسلے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

معاف کر دینا بہترین انتقام ہے۔

Adarts CAR-4/84

SURFICOL
COUGH SYRUP

ضمیمہ

اشاریۂ میثاق

(جلد ۳۲ تا ۳۶)

جنوری ۱۹۸۳ء سے دسمبر ۱۹۸۷ء تک شائع شدہ مضامین کی مکمل فہرست

مرتب: حافظ خالد محمود خضر

قرآنیات

آزاد، مولانا ابوالکلام

اسرار احمد، ڈاکٹر

الہدیٰ (منتخب نصاب کے سلسلہ وار دروس)

مباحثِ ایمان

مباحث عملِ صالح

خسرانِ اُخروی سے بچنے کا راستہ، سورۃ العصر کی روشنی میں (۲)　مارچ ۸۴ء　ص۴۳

حدیث و سُنّت

اقبال واحد، ملک

اسلام میں عملی زندگی، ارشاداتِ رسولؐ کی روشنی میں (۱)　مئی ۸۴ء　ص۲۳

〃　〃　〃　〃　〃　(۲)　جولائی ۸۴ء　ص۷۹

〃　〃　〃　〃　〃　(۳)　اگست ۸۴ء　ص۷۵

〃　〃　〃　〃　〃　(۴)　اکتوبر ۸۴ء　ص۵۹

الطاف الرحمٰن بنوی، مولانا (مترجم)

فرمانِ نبویؐ ائمۃ کہ بغضب (شرح ملّا علی قاریؒ)　اپریل ۸۲ء　ص۳۵

جنجوعہ، محمد یونس

کل بدعۃ ضلالۃ　جنوری ۸۵ء　ص۶۹

عبدالسمیع، ڈاکٹر

درسِ حدیث　جولائی ۸۴ء　ص۴۹

علوی، مولانا سعید الرحمٰن

نظمِ دین اور سنّتِ نبویؐ　دسمبر ۸۵ء　ص۷

محی الدین لکھوی، مولانا

ایک اہم خط اور
تعلیم نبویؐ کا اہم موتی　اپریل ۸۶ء　ص۱۰

انقلابِ محمدیؐ کا بین الاقوامی مرحلہ۔ ۱ (بسلسلہ اسلامی انقلاب) — مارچ ۸۷ء — ص ۶۵

〃 〃 〃 〃 〃 ۲ 〃 〃 〃 — اپریل ۸۷ء — ص ۲۱

موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا طریق کار
سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں (۱) — جون ۸۷ء — ص ۲۱

〃 〃 〃 〃 〃 (۲) — جولائی ۸۷ء — ص ۴۹

قرآن وسنت کی روشنی میں انقلابی تربیت وتزکیہ
بسلسلہ موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا طریق کار (۳) — اگست ۸۷ء — ص ۴۹

موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا طریق کار
سیرتِ نبویؐ کی روشنی (۴) — دسمبر ۸۷ء — ص ۱۷

الحسینی، ابوالمظہر

عشقِ رسولؐ کا مفہوم اور اس کے تقاضے ۔ (۱) — نومبر ۸۷ء — ص ۵۷

〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۔ (۲) — دسمبر ۸۷ء — ص ۴۵

محمد یعقوب

انقلابی جماعت کی تربیت سفرِ تبوک کی روشنی میں — اکتوبر ۸۶ء — ص ۴۲

محمد یوسف کاندھلوی، مولانا

سیرتِ رسولؐ اور بیعت — نومبر ۸۷ء — ص ۳۴

سوانحِ صحابہؓ / تاریخِ اسلام

اسرار احمد، ڈاکٹر

جاں نثارانِ محمدؐ — اکتوبر ۸۳ء — ص ۱۷

شہادتِ عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ کا تاریخی پس منظر
فلسفۂ انقلاب کی روشنی میں — نومبر ۸۳ء — ص ۳۷

یزید کی ولی عہدی اور سانحۂ کربلا کا تاریخی پس منظر
فلسفۂ انقلاب کی روشنی میں — دسمبر ۸۶ء — ص ۵۷

فقہ و اخلاق

اسلامی نظام معاشرت

اسرار احمد، ڈاکٹر

احمد افضال

جنجوعہ، محمد یونس

شبلی نعمانی

علوی، سعید الرحمٰن

وصی مظہر ندوی، مولانا

دعوت و تحریک

احمد یعقوب چوہدری

اسرار احمد، ڈاکٹر

شیخ الہندؒ کی شخصیت

ابوسلمان شاہجہانپوری

شیخ الہندؒ کی عظمت کے عناصرِ ترکیبی	اپریل ٨٦ء	ص٨٩

حمید انصاری

حضرت شیخ الہند — ایک بھولی بسری شخصیت	اپریل ٨٧ء	ص٥٩

ملکی، ملی و سیاسی مسائل

اسرار احمد، ڈاکٹر

صدر پاکستان کے نام ایک خط	فروری ٨٣ء	ص٩
خطاب بہ صدرِ مملکت	"	ص٢١
تقدیم بر تالیف "اسلام اور پاکستان"	"	ص٥٣
کرکٹ کے بارے میں وضاحت	مارچ ٨٣ء	ص٥٩
پاکستان اور اسلام	اگست ٨٣ء	ص٥٣
پاکستان کی نئی سیاسی صورتِ حال	ستمبر ٨٣ء	ص٥
تصریحات و توضیحات	"	ص٣٧
شذرات — قادیانیوں سے متعلق آرڈیننس	جون ٨٤ء	ص٣٤
تذکرہ و تبصرہ — ہمارے معاشرے کی اصل کمزوری		
قصاص و دیت کا مسودۂ قانون	نومبر ٨٤ء	ص٧
کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے؟	جنوری ٨٥ء	ص١٣
تذکرہ و تبصرہ — قادیانی مسئلہ اور اس کا نیا اور پیچیدہ تر مرحلہ	مارچ ٨٥ء	ص٤٢
١٩٧٤ء کی تحریک ختم نبوت اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے فیصلے پر تبصرہ (تذکرہ و تبصرہ شائع شدہ نومبر ٨٤ء)	"	ص٤٦

سندھ کا مسئلہ	جنوری ۸۷ء	ص ۱۷
استحکامِ پاکستان اور مسئلہ سندھ	فروری ۸۷ء	ص ۹
"مسئلہ سندھ" — چند اہم گوشے	اپریل ۸۷ء	ص ۳۷
یومِ استقلالِ پاکستان — تجدیدِ عہد اور اجتماعی توبہ کا دن	اکتوبر ۸۷ء	ص ۴۲
شریعت بل کا المیہ اور اس کی ذمہ داری	"	ص ۹
ایک بندۂ عاصی کی اور اتنی مدارائیں میاں ظفر احمد صاحب کی خدمت میں چند گذارشات	نومبر ۸۷ء	ص ۲۱

برکاتی، حکیم محمود احمد

استحکامِ پاکستان — ایک جائزہ	جون ۸۶ء	ص ۱۵

بھٹو، محمد موسیٰ

مسئلہ سندھ، ایک تجزیاتی مطالعہ	جون ۸۷ء	ص ۱۷

چاچڑ، مولانا عبدالوہاب

سندھ بنام پنجاب	مئی ۸۷ء	ص ۳۸

حامد میاں، مولانا سید

مارشل لاء کی حقیقت اور اس کی افادیت یا مضرت	دسمبر ۸۴ء	ص ۴۵
شریعت بل یا فقہ حنفی (۱)	اگست ۸۷ء	ص ۴۷
" " " " (۲)	ستمبر ۸۷ء	ص ۳۴

خلیق احمد، مولانا

"استحکامِ پاکستان"، ایک ہمہ گیر مرقع	جون ۸۶ء	ص ۵۹

سراج منیر

تاریخ کی قرآنی تعبیر ۔ "استحکام پاکستان" پر تبصرہ — جولائی ۸۶ء — ص۴۷

سلیمی، محمد حنیف

پنجاب کی فریاد — جون ۸۷ء — ص۶۱

صدیقی، اقبال احمد

"استحکام پاکستان" پر ریڈیو پاکستان کا تبصرہ — جون ۸۶ء — ص۶۷

عابد، عبدالکریم

پاکستانی سیاست اور مسئلہ سندھ — جون ۸۷ء — ص۱۱

عبدالخالق، ڈاکٹر

استحکام پاکستان پر چند خیالات — جون ۸۶ء — ص۵۱

علی ندوی، ابوالحسن

مسلم پرسنل لاء کی صحیح نوعیت و اہمیت — دسمبر ۸۵ء — ص۵۷

غلام مصطفیٰ شاہ، سید

تاریخ سندھ پر طائرانہ نظر — جون ۸۷ء — ص۵۸

محمد ذکریا

علماء کب اٹھیں گے (حسنِ انتخاب) — مئی ۸۵ء — ص۶۲

محمود مرزا ۔ ایڈووکیٹ

قومیتی مسئلہ (بسلسلہ مسئلہ سندھ) — مئی ۸۷ء — ص۳۹

مقبول الرحیم مفتی (مرتب)

باب الاسلام سندھ: مسائل اور ان کا حل
جناب اسد اللہ بھٹو کا انٹرویو — نومبر ۸۶ء — ص۶۷

ہندوستان میں مسلمانوں کی صورتِ حال اور عائلی قوانین کا مسئلہ
(کل ہند مجلس تعمیر ملت کے جنرل سیکرٹری عبدالرحیم قریشی
سے انٹرویو) — جولائی ۸۶ء — ص ۱۹

کیا انتخاب تبدیلی کا واحد راستہ ہے؟
(نوائے وقت کا اداریہ اور اس کا جواب) — مئی ۸۷ء — ص ۱۷

مہمند، عبدالرحمٰن خان

ایس ایچ بوالعجبیت — فروری ۸۴ء — ص ۸۵

نور محمد پٹھان

آزادی اور احتساب — نومبر ۸۷ء — ص ۸۵

نیازی، عبدالستار خاں

اتحادِ ملت کے لئے چار نکاتی فارمولا — مارچ ۸۳ء — ص ۵۹

فریاد ہے فریاد!
ارتضیٰ حیدر کے کتابچے سے انتخاب — دسمبر ۸۶ء — ص ۶۷

"استحکامِ پاکستان" پر اُردو ڈائجسٹ کا تبصرہ — اپریل ۸۷ء — ص ۸۵

سندھ کا مسئلہ اور قارئین — جنوری ۸۷ء — ص ۹
مسئلہ سندھ اور قارئین — فروری ۸۷ء — ص ۱۷
" " " " — مارچ ۸۷ء — ص ۵۸

ہندوستان میں پرسنل لاء کا مسئلہ
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ایک خصوصی انٹرویو — جنوری ۸۶ء — ص ۱۸

امیرِ تنظیم اسلامی کے انٹرویوز

توضیحات و تنقیحات

اسرار احمد، ڈاکٹر

برکاتی، حکیم محمود احمد

حامد میاںؒ مولانا سید

حساس

"حسن تو سبھی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟" — ستمبر ۸۵ء، ص ۹۷

شمس الحسن تھانوی

مولانا اشرف علی تھانویؒ پر تنقید کا جائزہ — مارچ ۸۶ء، ص ۷۵

افکار و آراء (مراسلات وغیرہ)

ابڑو، عبدالغفار

اندرونِ سندھ اسلامی جمعیت طلبہ کا خاتمہ کیسے ہوا! — فروری ۸۷ء، ص ۷۱

ادیب، سید مظہر علی

غیرت و حمیتِ دینی — اپریل ۸۵ء، ص ۱۰۱

خاتونِ خانہ کا کردار — ″ ص ۱۰۱

کیا عورت اسلامی مملکت کی سربراہ ہو سکتی ہے؟ — اپریل ۸۷ء، ص ۸۴

آفتاب فریدی

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے حلقۂ احباب کی خدمت میں ایک گذارش — جولائی ۸۵ء، ص ۸۷

افتخار فریدی

مجاہدینِ احرار کے بارے میں غلط فہمی — اگست ۸۳ء، ص ۶۹

مولانا محمد مالک جامعی کے درد و تڑپ کی مدینہ منورہ سے پکار — ″ ص ۷

بھارت سے ایک خط — مارچ ۸۴ء، ص ۷۹

مراد آباد (بھارت) سے ایک مکتوب — مئی ۸۵ء، ص ۸۷

″ ″ ″ ″ ″ ″ — ستمبر ۸۷ء، ″

محمد صدیق خاں

ملتِ اسلامیہ کا المیہ اپریل ۸۴ء ص ۶۳
بقائے امت کا راز اکتوبر ۸۵ء ص ۱۰۹

محمد عبدالبرّ

"قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات ....." پر تبصرہ نومبر ۸۴ء ص ۸۲

محمد عمر سعید

ٹی وی کی من مانیاں اور ریشہ دوانیاں نومبر ۸۶ء ص ۹۴
جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کا ٹی وی اور شہادت ذوالنورینؓ نومبر ۸۷ء ص ۸۶

محمد مراد، مولانا

بسلسلہ سندھ کا مسئلہ اور قارئین مارچ ۸۷ء ص ۵۰

محمد مرسلین

عورت اور اسلامی قانونِ شہادت اپریل ۸۲ء ص ۶۳

مسعود احمد خان

بے حسی کی انتہا : ایک لمحۂ فکریہ اگست ۸۶ء ص ۸۳

مسعودی، محمود الحسن

وضاحتی مکتوب نومبر ۸۷ء ص ۸۷

مصباح الایمان

کھیلوں کے پردے میں فحاشی اپریل ۸۷ء ص ۹۱

م۔ ش

خراجِ زمین جون ۸۵ء ص ۸۹

"فہم قرآن" پر روزنامہ "جسارت" کراچی کا تبصرہ	جنوری ۸۳ء	صفحہ ۴۲
"افسوسناک بے طرفی" ـــــ اداریہ روزنامہ "شہباز" پشاور	مارچ ۸۳ء	صفحہ ۹
"اس تحریک کے اصل خدوخال" ـــــ اداریہ روزنامہ "جسارت" کراچی	اپریل ۸۳ء	صفحہ ۶
پہلے خلانورد کا قبول اسلام ـــــ شذرہ روزنامہ "جسارت" کراچی	" "	۶۵
غلط خبر ـــــ ماہنامہ "الرسالہ" دہلی	جولائی ۸۳ء	صفحہ ۶۷
اشارات (ماخوذ) ـــــ ترجمان القرآن لاہور	اگست ۸۳ء	"
"راستہ چھوڑ دیجئے" اسلام آرہا ہے" ۔ حکیم عبدالرحمٰن خلیق (ماخوذ از ہفت روزہ "تنظیم اہلحدیث" لاہور)	اکتوبر ۸۴ء	صفحہ ۴۲
"اسلام میں عورت کا مقام" پر "آنچل" کراچی کا تبصرہ (مبصرہ: زیب النساء، مدیرہ)	"	صفحہ ۴۷
اقتباس از گفتنی ناگفتنی، ہفت روزہ "چٹان" لاہور	دسمبر ۸۴ء	صفحہ ۸۷
میثاق اگست پر تبصرہ ـــــ ہفت روزہ "تنظیم اہلحدیث" لاہور	"	صفحہ ۸۹
"استحکام پاکستان" پر روزنامہ "مشرق" لاہور کا تبصرہ (مبصر: محمود جلال آبادی)	اگست ۸۶ء	صفحہ ۸۱
ٹیلی ویژن کی مجرائی ثقافت ـــــ ماخوذ از "تکبیر" کراچی	ستمبر ۸۶ء	صفحہ ۸۷
"استحکام پاکستان" پر "اردو ڈائجسٹ" کا تبصرہ (مبصر حافظ افروغ حسن)	اپریل ۸۷ء	صفحہ ۸۵

یادِ رفتگاں

اسرار احمد، ڈاکٹر

حاجی عبدالواحد کا انتقال	فروری ۸۶ء	صفحہ ۲۶
منصور احمد شبلا مرحوم (تعزیتی خطاب)	جون ۸۷ء	صفحہ ۴۲

افروغ حسن، حافظ

صبر جمیل کی کہکشاں	جنوری ۸۷ء	صفحہ ۹۲

۴۔ جناب مولانا محمد اسحٰق الصدیقی، کراچی	نومبر ۸۶ء	ص۸۵
۵۔ جناب محمد شفیع (م۔ش) لاہور	〃	ص۸۶
۶۔ جناب اقبال احمد صدیقی، کراچی	〃	〃
۷۔ جناب پروفیسر احمد الدین مارہروی، کراچی	〃	ص۸۸
۸۔ جناب شنیخین صابر، لاہور	〃	ص۸۹
۹۔ جناب خسروی صاحب، کراچی	〃	〃
بذریعہ تار و خطوط تعزیت کرنے والے دیگر حضرات کے اسماءِ گرامی	〃	ص۹۰

تعزیتی خطوط — جنوری ۸۷ء ص۸۷

۱۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، رائے بریلی

۲۔ ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی، پشاور

رفتارِ کار و تنظیمی سرگرمیاں

امیرِ تنظیمِ اسلامی کے دعوتی و تربیتی دورے

امریکہ و کناڈا میں ایک چلّہ (آخری قسط)	قاضی عبدالقادر	جنوری ۸۳ء	ص۵۹
امیرِ تنظیمِ اسلامی کی کراچی میں مصروفیات (۱)	حافظ محمد رفیق	فروری ۸۳ء	ص۴۵
〃 〃 〃 (۲)	〃	مارچ ۸۳ء	ص۴۵
امیرِ تنظیمِ اسلامی کی لالہ موسیٰ، سرگودھا، میانوالی اسلام آباد، راولپنڈی، کراچی اور لاہور میں دعوتی مصروفیات	〃	〃	ص۴۳
امیرِ تنظیمِ اسلامی کی سیالکوٹ، فیصل آباد، ملتان مانسہرہ / اوگی اور راولپنڈی / اسلام آباد میں دعوتی مصروفیات کی روداد یں		اپریل ۸۳ء	ص۴۷

امیر تنظیم کا دورۂ گوجرانوالہ اور خطبۂ جمعہ	رحمت اللہ بٹر	"	
چار شہر پانچ دن — امیر تنظیم کے جہلم تا بنوں کے دورے کی اجمالی رپورٹ	حافظ محمد رفیق	اپریل ۸۴ء	ص۷۵
امیر تنظیم کے گوجرانوالہ، حویلیاں، پشاور، کوہاٹ اور سندھ کے دوروں کی رپورٹیں		اپریل ۸۴ء	ص۷۹
امیر تنظیم کے فیصل آباد، ملتان و وہاڑی، بالاکوٹ، گڑھی حبیب اللہ اور مظفر آباد کے دوروں کی رپورٹیں		مئی ۸۴ء	ص۸۳
ہندوستان میں پندرہ دن	ڈاکٹر عارف رشید	جون ۸۴ء	ص۷۳
امیر تنظیم اسلامی کا حالیہ دورۂ شمالی امریکہ	ڈاکٹر ابصار احمد	اکتوبر ۸۴ء	ص۷۳
امیر تنظیم کی ایبٹ آباد، مانسہرہ، مظفر آباد اور راولاکوٹ میں دعوتی مصروفیات	رحمت اللہ بٹر	"	ص۸۳
امیر تنظیم کے دورہ ہائے پشاور، سوات و دیر اور سکھر کی رپورٹیں		دسمبر ۸۴ء	ص۹۱
امیر تنظیم کا دورۂ ملتان و بہاولنگر	نعیم الدین احمد	جنوری ۸۵ء	ص۸۱
امیر تنظیم کا دورۂ کوئٹہ	اشفاق احمد میر	"	
امیر تنظیم کا دورۂ کراچی و حیدرآباد	رحمت اللہ بٹر	فروری ۸۵ء	ص۸۹
امیر تنظیم کا نو روزہ دورۂ بلوچستان	سید برہان علی	اکتوبر ۸۵ء	ص۸۵
ہندوستان میں پندرہ دن (۱)	عاکف سعید	جنوری ۸۶ء	ص۹۷
" " " (۲)	"	فروری ۸۶ء	ص۹۷
کراچی میں امیر تنظیم کی مصروفیات	ضمیر اختر	مارچ ۸۶ء	ص۸۹
امیر تنظیم اسلامی کا دورہ سکھر و اندرون سندھ	نجیب صدیقی	جون ۸۶ء	ص۷۱
سکنڈے نیوین ممالک کے دس روزہ دورہ کے تاثرات	ڈاکٹر اسرار احمد	جولائی ۸۶ء	ص۱۱
دس دن سکنڈے نیوین ممالک میں		"	ص۸۵

عمومی رپورٹیں

عنوان	مصنف	تاریخ	صفحہ
چالیس روزہ تربیتی پروگرام	رحمت اللہ بُٹر	فروری ۸۵ء	ص ۸۶
…ام الہدیٰ لاہور	شیخ جمیل الرحمٰن	″	ص ۹۳
تنظیم اسلامی کا دسواں سالانہ اجتماع (اطلاع)	ڈاکٹر اسرار احمد	مارچ ۸۵ء	ص ۲
تنظیم اسلامی کے سہ روزہ اجتماع کی روداد	عبدالرزاق	ستمبر ۸۵ء	ص ۸۱
سہ روزہ علاقائی اجتماع صوبہ سندھ و بلوچستان	سید برہان علی	اکتوبر ۸۵ء	ص ۸۵
پشاور میں تنظیم اسلامی کا سہ روزہ علاقائی اجتماع	راجہ سردار احمد	نومبر ۸۵ء	ص ۵۹
حیدرآباد میں تنظیم اسلامی کا سہ روزہ علاقائی اجتماع	سید واحد علی رضوی	دسمبر ۸۵ء	ص ۹۹
تنظیم اسلامی کی خصوصی تربیت گاہ اور گیارھواں سالانہ اجتماع (پروگرام)		مارچ ۸۶ء	ص ۳
کراچی میں سہ روزہ قرآنی تربیت گاہ	ضمیر اختر	″	ص ۸۹
تنظیم اسلامی کا گیارھواں سالانہ اجتماع ایک جائزہ اور اہم فیصلوں کا اعلان	چوہدری غلام محمد	مئی ۸۶ء	ص ۸۳
سالانہ رپورٹ تنظیم اسلامی پاکستان	چوہدری غلام محمد	جون ۸۶ء	ص ۷۹
لاہور میں توسیعِ دعوت کے پروگرام	چوہدری غلام محمد	دسمبر ۸۶ء	ص ۸۹
لاہور میں تربیت اور توسیعِ دعوت کے نئے پروگرام	چوہدری غلام محمد	فروری ۸۷ء	ص ۶۵
تربیت و تزکیہ اور توسیعِ دعوت — قدم بقدم	چوہدری غلام محمد	مارچ ۸۷ء	ص ۹۳
لاہور میں حلقہ ہائے درسِ قرآن کا اجراء اور بیرون لاہور توسیعِ دعوت کے پروگرام	چوہدری غلام محمد	اپریل ۸۷ء	ص ۷۷

ہدایات و مشورے

تبصرۂ کتب

THE DIVINE QURAN

انگریزی ترجمہ : سردار عبدالمجید دسمبر ۱۹۸۳ء ص ۶۳

(نوٹ: دسمبر ۱۹۸۳ء کے بعد تبصرۂ کتب کا سلسلہ "میثاق" میں بند کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ بعد میں اس ضمن میں جو کتابیں ادارے کو موصول ہوئیں اُن پر تبصرہ ماہنامہ "حکمتِ قرآن" میں شائع کیا جاتا رہا ہے۔)

ادارتی مضامین

ادارتی صفحات پر "عرضِ احوال" کے مستقل عنوان کے تحت اکثر و بیشتر شیخ جمیل الرحمٰن اور کبھی کبھی ڈاکٹر اسرار احمد یا حافظ عاکف سعید ادارتی مضامین تحریر کرتے رہے ہیں۔ دسمبر ۸۶ء سے 'عرضِ احوال' جناب اقتدار احمد کے قلم سے تحریر ہوتا ہے۔

مزید برآں بعض اداریے "تذکرہ و تبصرہ" کے زیرِ عنوان ڈاکٹر اسرار احمد کی تحریروں پر مشتمل ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

تذکرہ و تبصرہ	ڈاکٹر اسرار احمد	ستمبر ۸۵ء
" "	" " "	اکتوبر ۸۵ء
" "	" " "	فروری ۸۶ء
" "	" " "	مارچ ۸۶ء
" "	" " "	اپریل ۸۶ء

خطباتِ جمعہ

پچھلے ۲ ماہ کے دوران

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

نے مسجد دارالسلام لاہور میں مسلسل آٹھ خطباتِ جمعہ میں

حقیقتِ ایمان

کے موضوع پر جو نہایت جامع اور مؤثر تقاریر فرمائی ہیں

اُن تقاریر کی کیسٹوں کا سیٹ تیار کر لیا گیا ہے

ہدیہ مکمل سیٹ -/۱۴۰ روپے علاوہ محصول ڈاک

عنوانات

۱۔ ایمان کے لفظی معنی اور اصطلاحی مفہوم

۲۔ ایمان کا موضوع ۔ مابعد الطبیعاتی مسائل

۳۔ ایمانیاتِ ثلاثہ، اور ان کا باہمی ربط

۴۔ ایمان کی دو قسمیں: قانونی اور حقیقی

۵۔ ایمان اور عمل کا باہمی تعلق

۶۔ ایمان حقیقی اور جہاد فی سبیل اللہ کا باہمی لزوم

۷۔ ایمان کا اصل حاصل: ذہنی اطمینان اور قلبی سکون

۸۔ ایمان کی تحصیل کے دو طریق: تقلیدی اور اکتسابی

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور فون: ۸۵۲۶۸۳

Vol. 36 No. 12

DECEMBER 1987